جون ۱۹۵۳ء

بتقریب ۱۵ اگست

ادبی دنیا

اشاعت خاص

جون [illegible]

[illegible]

نیا دور

[illegible]

۲۸ لد | نمبر ۳

جون ۱۹۷۲ء
جیشٹھ ۱۸۹۴ شک

سالانہ: پانچ روپے
چندہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر
ا خورشید احمد

پبلشر
سومنی شرما
اعات۔ اُترپردیش

ینٹلی

ت در

پرنٹنگ و سٹیشنری۔ یو۔پی

مطبوعہ

ٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

ا ایتم ۱ نہ ۵

عات۔ اُترپردیش

عنوانات

جیشٹھ ۱۸۹۴ شک

جلد | نمبر ۳

ستمبر ۱۹۷۲ء
۱۸۹۴ شک
سالانہ: پانچ روپے
...: پچاس پیسے
ایڈیٹر
رشید احمد
پبلشر
سروجنی شرما
اطلاعات۔ اترپردیش
...
...ت در
پرنٹنگ و اسٹیشنری یو۔پی
مطبوعہ
...پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ
...ات۔ اترپردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہرحال متفق ہو

جیشٹھ ۱۸۹۴ شک

اپنی بات

وزیر مال شری ادت نرائن شرما نے ۹ مئی ۱۹۷۲ء [illegible] شہری جائداد کی بالائی حد مقرر کرنے کی غرض سے الگ الگ دو بل اتر پردیش ریاستی اسمبلی میں پیش کیے۔ زرعی آراضی حد بل ۱۹۷۲ء کی رو سے شوہر، بیوی اور تین نابالغ بچوں پر مشتمل ایک خاندان کے لیے ان علاقوں میں جہاں آبپاشی کی سہولت میسر ہے جوت کی زیادہ سے زیادہ حد ۷.۳۰ ہیکٹر رکھی گئی ہے جو ۱۸ ایکڑ سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ بل دراصل اس قانون میں ترمیم کا بل ہے جو پردیش میں گزشتہ گیارہ سال سے نافذ ہے اور جس کی رو سے ۵ افراد پر مشتمل خاندان کے لیے جوت کی حد قسم زمین کے لحاظ سے ۴۰ تا ۱۲۰ ایکڑ تھی۔ لیکن زیر نظر ترمیمی بل میں یہ حد گھٹا کر ۱۸ ایکڑ کر دی گئی ہے اور افراد خاندان کی تعداد بھی جوت کی انتہائی حد کے مقصد سے ۱۵ سے گھٹا کر ۵ کر دی گئی ہے جن میں شوہر اور بیوی کے علاوہ تین نابالغ بچے شامل کیے گئے ہیں۔ البتہ سہولت کے خیال سے ہر خاندان میں بالغ لڑکوں کے لیے ۵ ایکڑ فی بالغ کے حساب سے مزید آراضی رکھنے کی اجازت دی گئی ہے مگر یہ مزید آراضی مجموعی طور سے ۱۵ ایکڑ سے زائد نہ ہوگی۔ غیر آبپاشی والے علاقوں میں یہ حد آبپاشی والے علاقے کی حد کی ڈیوڑھی اور باغات کے معاملے میں دوگنی ہوگی۔ بندیل کھنڈ اور بعض دوسرے علاقوں میں یہ حد ۴۵ ایکڑ تک رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس بل کے ذریعے بہت سے مستثنیات جو سابقہ قانون میں رکھے گئے تھے ختم کر دیے گئے ہیں۔

اسی طرح شہری جائداد انتہائی حد بل ۱۹۷۲ء میں پانچ افراد پر مشتمل خاندان کے لیے جائداد کی حد تین لاکھ روپے رکھی گئی ہے اور مزید سہولت بہم پہنچانے کے خیال سے ہر خاندان کو فی بالغ ایک لاکھ روپے کی مزید جائداد رکھنے کی اجازت ہوگی۔ مگر زرعی آراضی حد کی طرح شہری جائداد کے سلسلے میں بھی مزید جائداد ۳ لاکھ روپے سے زائد نہ ہونا چاہیے۔

ہم نے اپنا نصب العین سوشلزم بنایا ہے اور سوشلزم ہی کے راستے ملک کو ترقی کی جانب لے جانا اور اسے خوش حال بنانا چاہتے ہیں۔ خوش حالی کے لیے نابرابری کو ختم کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری ملک کو غیر ملکی اقتدار سے نجات دلانا اور اسے آزاد کرانا تھا۔ حصول آزادی اس طرح پہلا قدم تھا۔ دوسرا قدم عدم مساوات اور سماجی و اقتصادی نابرابری کو دور کرنا ہے اور حد بندی کے مجوزہ دونوں قانون اس سمت خاصے بڑے قدم ہیں جو حکومت اتر پردیش نے اٹھائے ہیں۔

● اتر پردیش اردو اکاڈمی نے پورے خلوص اور انہماک سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا ثبوت وہ کام ہیں جو اس نے اپنے قیام کی قلیل مدت کے دوران انجام دیے ہیں۔ ان کاموں کی جانب وزیر ریاست برائے سماجی و ہریجن بہبود، سیاحت و یک جہتی اتر پردیش اور اردو اکاڈمی کی صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ نے ایک جلسے میں کیا جو حال ہی میں لکھنؤ میں اردو کو مقبول عام بنانے کے ذرائع اور وسائل دریافت کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا۔ اردو اکاڈمی نے اس عرصے میں مختلف شعبوں میں کام کرنے کے لیے متعدد ذیلی کمیٹیاں قائم کی ہیں۔ ان ذیلی کمیٹیوں میں علاوہ دیگر کمیٹیوں کے ایک ترجمات ذیلی کمیٹی، ایک تعلیمی ذیلی کمیٹی، ایک کتب خانوں و دارالمطالعوں کو مالی امداد دینے کی ذیلی کمیٹی، ایک کتابوں پر انعام دینے کی ذیلی کمیٹی اور ایک مصنفین کو مالی امداد دینے کی ذیلی کمیٹی شامل ہے۔ بیشتر ذیلی کمیٹیوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ انعام ذیلی کمیٹی کی سفارش پر اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ نے اردو کے گیارہ مصنفوں کو ان کی کتابوں پر جو یکم دسمبر ۱۹۷۰ء اور ۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء کے درمیان شائع ہوئی تھیں مجموعی طور سے دس ہزار سات سو روپے کے انعامات دیے ہیں۔ یہ کتابیں اردو اکاڈمی کے قیام کے بعد ڈائرکٹر تعلیمات اتر پردیش کی معرفت اکاڈمی کو موصول ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کے علاوہ اکاڈمی اردو کی دوسری کتابوں پر بھی انعامات دے گی۔ اس سلسلے میں اکاڈمی کی جانب سے قواعد و ضوابط اور مزید کتابیں بھیجنے کی تاریخ کا عنقریب اعلان ہونے والا ہے۔ ڈائرکٹر تعلیمات کی معرفت موصولہ جن کتابوں پر اکاڈمی نے انعامات دیے ہیں ان کے نام مع مصنفین اور رقوم انعام یہ ہیں: بعنوانات میر درد از ڈاکٹر وحید اختر ... ۲۰۰ روپے، دھان زخم از اختر انصاری ... ۲۰۰ روپے، اشعار از حسن نعیم ... ۱۰۰ روپے، عراقی اینتھ میں جذباتی تادیل از ڈاکٹر سلام سندیلوی ... ۱۰۰ روپے، یاد کی خوشبو از خورشید احمد جامی ... ۲۰۰ روپے، لاہور کا جو ذکر کیا از گوپال متل ... ۲۰۰ روپے، گھر آنگن از جاں نثار اختر ... ۲۰۰ روپے، دو قدم ایک منزل از شایاں قدوائی ... ۲۰۰ روپے، آج کی سائنس از اندجیت لال ... ۲۰۰ روپے، جنبش لب از ایاز بگرامی ... ۲۰۰ روپے اور جنرل سائنس از عزیز احمد قاسمی ... ۵۰۰ روپے۔

کتب خانوں اور دارالمطالعوں سے مالی امداد کے لیے اکاڈمی کے منظور شدہ فارم پر درخواستیں طلب کی جائیں گی۔ اس اثنا میں اکاڈمی کو نظامت تعلیم کی وساطت سے جو درخواستیں موصول ہو چکی ہیں ان پر امداد کے لیے لائبریری ذیلی کمیٹی غور کرے گی۔ اسی طرح مصنفین کو مالی امداد دینے سے متعلق ذیلی کمیٹی بھی جلد ہی ضروری قواعد وضع کرے گی اور ضرورت مند مصنفین کو مالی امداد دینے کی سفارش کرے گی۔

اردو اکاڈمی نے اپنا کام باقاعدہ طور سے شروع کر دیا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی ترقی سے دلچسپی رکھنے والے اپنے مفید مشوروں سے اکاڈمی کے ساتھ تعاون کریں تاکہ وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکے اور ماضی کی طرح اردو زبان جدید ہندستان کو مستحکم، خود کفیل اور خوش حال بنانے میں ایک اہم رول ادا کر سکے۔

ایڈیٹر

نکہت و رنگ

جمیل مظہری

بوے گل سے یہ رنگِ گل نے کہا
تو وطن کو چلی بہ دوشِ صبا

اور میں ہوں ہنوز اسیرِ قفس
مجھ کو بھی اپنے ساتھ لیتی چل

پھول کا ہو چکا ہے سینہ چاک
آ چکا اس کی زندگی میں خلل

میں بھی مہماں ہوں چند لمحوں کا
میرا اک لمحہ انتظار تو کر

قفسِ گل کی تیلیاں ٹوٹیں
ہو مبارک تجھے نشاطِ سفر

بوے گل بولی : اے رفیق مرے!
تجھ میں یک گونہ جو کثافت ہے

یہی اس زندگی کی لعنت ہے
ہے اسی سے ترے قیام کو طول

ایک لمحہ ہو یا کہ دو لمحہ
جھیلنی ہے تجھے یہ قیدِ فضول

یوں بھی کیا ہے سوالِ ہمسفری
ہے یہ گلزارِ دو جہاں گلزاری

موجِ مے، موجِ آب، موجِ نسیم
زلفِ پُرپیچ و عنبریں کی شمیم

نکہت و رنگ ہو کہ شعلۂ دود
اک سفر ہے یہ کاروانِ وجود

فائدہ کیا ہے ساتھ چلنے کا
جب نہ منزل، نہ راستا معلوم

کس کی منزل کہاں ہو کیا معلوم
ہم کہاں، تو کہاں، خدا معلوم

عین ممکن ہے یہ کہ ہم اے دوست
ہوں گرفتارِ زلفِ مشکیں میں

تو مقید ہو ریشِ رنگیں میں
پھر ہے کیا شود ہم عنانی کا

ہر اثر اس جہانِ فانی کا
اک مرقع ہے بہتے پانی کا

ہم تو ملتے ہی ہیں بچھڑنے کو
تیز ہیں بحرِ وقت کے دھارے

میں چلی، الفراق! اے پیارے

جون ۱۹۴۲ء

جینظرمہد اشک

عظمت اللہ خاں کا نظریۂ شاعری اور شاعری

بشیر بدر

[نیا دور بابتہ اپریل ۱۹۷۲ء میں عظمت اللہ خاں کے نظریات شاعری پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ زیر نظر حصے میں ان کی شاعری سے بحث کی گئی ہے ــــ ایڈیٹر]

مرحوم کی روح اگر میرے خلوص سے بدگمان نہ ہو تو میں اسی گردن زدنی صنف سخن کا یہ شعر پڑھوں ؎

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

اچھے شاعر کا فن اس کا شعر ہے۔ اس کی نثر اسے سمجھنے میں ضرور مدد دے سکتی ہے لیکن اُسے غلط سمجھنے میں بھی مدد دے سکتی ہے۔ خاص طور پر جب شاعر باغی اور رومانی ہو۔ عظمت اللہ خاں کی رومانی سفاکی غزل سے زیادہ اُن کی اپنی شاعری پر ظلم کرتی ہے۔ یہ رومانی ان کی عقل سے وہ بڑا کام لینا چاہتی ہے جس کے وہ اہل نہیں۔ ایک خوبصورت شاعر کے لیئے یہ کم نصیبی زیادہ عیب بھی نہیں۔ عظمت اللہ خاں میں ناقدانہ بصیرت اور فلسفیانہ بلوغت نہیں ہے۔ مگر سخن کی ایک خوبصورت دُنیا تخلیق کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ دنیا محبت کی مختصر دُنیا ہے۔

اچھی اور عظیم شاعری جذبہ و فکر کا امتزاج ہوتی ہے اس میں درد دل کے کوندے، فکر و حکمت کے وزن کی وجہ سے اسی مادی خرنصیبا کے آس پاس چمکتے ہیں، غیر مادی یا ماورائی نہیں ہو جاتے ہیں۔ پوری زندگی کی ترجمان شاعری بہت معصوم اور رومانی نہیں ہو سکتی۔ دُنیا میں عقل و حکمت کا بھی حُسن ہے۔ غور و فکر نے بھی اسے سنوارا ہے۔ اس لیئے زندگی کی عکاس شاعری میں اپنا دَور، ماضی، مستقبل، اُن کے تفکرات، یادداشت اور تجربات ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی شاعری جس میں بچپن کی یادیں، نوجوانی کے رومانی تجربے، زندگی اور حسن کو چھونے اور پانے کی لذت اور تمنا ہو یا شادی کے بعد اپنے گھر کی پاک مسرتیں ہوں، خوبصورت اور حقیقی ہوتے ہوئے بھی فلسفیانہ غور و فکر کی شرط نہیں رکھتی۔ ان کیفیاتی منظروں کا عکاس ہماری وسیع دُنیا کے ایک خوبصورت حصے کا عکاس ہوتا ہے جو آج بھی انسان حسن و محبت میں معصوم نظر آتا ہے۔ عظمت اللہ خاں کی کافی نظمیں اسی معصوم محبت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی خوبصورت منظریہ ہیں۔ وہ اس شعری دُنیا کی تخلیق کرتے ہیں جس میں 'موہنی صورت موہنے والی'، 'پیا را پیارا گھر اپنا'، 'من موہن بن روشنی آتا کے سورج کو'، 'مرے محسن کے لیے کیوں مرے'، 'دام میں یاں نہ آیئے'، 'پیت کی ماری ستی'، 'خاوہ رو یا متی'، 'بالی بیوی سے'، 'وہ پھول ہوں جس کا پھل نہیں'، 'مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا'، 'تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'، 'بہار کی رات دکن میں' جیسی خوبصورت نظمیں ہیں۔

عظمت اللہ خاں نے خوبصورت دنوں کی خوبصورت یادوں کی شعری کہانی لکھی ہے۔ اُن کی کہانی یادوں کی کہانی ہے جو بچپن کی محبت سے عبارت ہے۔ اس معصوم محبت کی نرم و گرم جھلکیاں ہم

اُردو میں دیکھتے ہیں۔ عظمت اللہ ہمیں بچپن کی اس
دُنیا میں لے جاتے ہیں جہاں معصومیت، بے فکری اور بھولی
بھالی یادیں ہیں۔ دو تین گھروں کا آپس میں میل جول۔ اینٹیں
جما کر بنائی ہوئی گھرُکی۔ بچپن کے کھیل۔ گُڑیا گُڈّے کی شادی۔
آنکھ مچولی۔ چھوٹے لڑکے، لڑکیوں کی غیر شعوری کشش۔ یہ تصویریں
پہلی بار کامیابی کے ساتھ عظمت اللہ کی نظم "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"
میں ملتی ہیں۔

تھے پڑوسی ہم یہ یہ حال تھا کہ گھروں میں کھڑکی بنائی تھی
تھے عزیز ہم۔ یہ خیال تھا کوئی شے نہ ہم میں پرائی تھی
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ لڑائیاں بھی کبھی کبھی کبھی روٹھنا، کبھی من گئے
ابھی کٹیاں تو ملاپ ابھی ابھی چٹکیاں ابھی قہقہے
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ تمھاری گُڑیا کی شادیاں وہ مِرا برات کا انتظام
مِرا باجہ ٹین کا سیٹیاں بڑا شور و غل بڑی دھوم دھام
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

لیکن تعلیم نے اس پیار کو دبا دیا۔ محبت وہی ہے جو مٹی میں
دبے تو جڑ پکڑ جائے۔ جب دونوں کے راستے بھی جُدا جُدا
ہوئے، اس وقت بھی بچپن کی یاد ٹیس بن کر دلوں میں بسی رہی۔
پیار اُن کے یہاں درد کے کونپل کی طرح بچپن میں پھوٹتا ہے اور جوانی
تک درد کا خنجر ہو جاتا ہے۔ اس درد میں نہ وہ جنون و دیوانہ پن
ہے جو ساری دُنیا سے الگ کرکے روایتی مجنوں اور لیلیٰ بنا دے،
بلکہ یہاں درد محبت کا ر جہاں میں روشنی کا نشتر بن کر کانٹے کی طرح
کلیجے میں چبھتا رہتا ہے۔ سب سے بیت کا یاں کوئی پھل نہ لا، بھی
عورت کی دبی د   کا نغمہ ہے۔ وہ محبت جو اپنے خاندان کے
لڑکے لڑکیوں کے درمیان کھیل ہی کھیل میں اپنے "تایا کے پوتے"
سے ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ اُسی لڑکی کی زبانی
سے سُنیے۔

تھے تو بالے ہی تم یہ تھا تم کو بڑا مِرا دھیان۔ کس کی مجال تھی
مجھے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے ذرا مجھے کھیل میں بھی نہ دُکھی کیا

اس محبت کی پیکر نے بچپن ہی میں اپنے دل میں کسی کو بسا لیا تھا۔

بھرے سر میں تمھارا ہی دھیان بسا مِری چاہ کے راج دُلارے بنے
تمھیں دیوتا مان کے میں نے رکھا مِری بھولی سی آنکھوں کے تارے بنے

اس کی چچی نے اس پیار کو اور ہوا دے دی:

مِرا چتّو ابھی سے ہے اس پہ فدا یہ کھولی ہے موہنی میری بہو
یہ چچی کا کہا مِرے دل نے سُنا وہیں دوڑ گیا مِرے مُنہ پہ لہو

اسی بات کے گھر میں چرچے ہوئے سبھی کہتے تھے مجھ کو تمھاری دُلھن
مجھے تم نے بھی اپنے لگا کے گلے کئی بار کہا۔ میری پیاری دُلھن

لیکن "تایا" گھر کی معصوم دُنیا کے علاوہ باہر کا زمانہ بھی دیکھے
تھے۔ انھوں نے اپنے ہونہار لڑکے کے لئے کوئی اونچا گھرانا ڈھونڈ
لیا۔ اس درد کی کلی نے بھی اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ شادی
کے کاموں میں ایسا کھوئی کہ دُنیا کو اس کے پیار کا گمان تک نہ ہوا
لیکن درد کی یہ ہوا بڑے بڑے جنگلوں کو جُھلسا دیتی ہے۔ گُلاب کی
نوخیز کلی کب تک مقابلہ کرتی۔ چپکے چپکے وہاں پہنچ گئی جہاں بیت کی
آگ سارے تن کو جلا رہی ہے۔ آخری وقت ہے:

مِرا آخری وقت ہے آن لگا کوئی اور ہے تمھاری پیاری دُلھن
مجھے اب بھی تمھارا ہی دھیان لگا یہ بنی یہ رہی ہوں تمھاری دُلھن

عظمت اللہ کی جن نظموں میں پیار کی ابتدا کھیلنے کودنے کے
دنوں سے ہے، اُن میں دلوں کی معصوم کشش ہے۔ بھرپور جوانی کی
لہک اور بدن کی لپک نہیں۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ابتدائے جوانی
یا عین جوانی میں وصال نہیں ہوتا۔ بلکہ ہجر و دوری ہوتی ہے خواہ وہ
تایا، کی زمانہ سازی سے ہو یا دُنیا کی رُکاوٹ، اور فریق ثانی کی
بے وفائی سے، مگر یہ لڑکے لڑکیاں جنوں کی گرفت میں نہیں ہیں۔
اُن کے یہاں مثالی محبت کا وہ دیوانہ پن نہیں بلکہ اسی دُنیا میں
رہ کر پیار کرنا ہے۔ پیار کے ساتھ ساتھ سماجی اور اخلاقی تصوّر
انھیں اپنا دِل مسوس کر رہ جانے، ضبط کر جانے یا ضبط کرتے کرتے
خاک ہو جانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح بچپن کی سرشاریاں جوانی

یمک آتے آتے اکثر حزنیہ کسک میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

'مرے حُسن کے کیوں لیے مزے' ایک ایسی ہی لڑکی کی داستان ہے جس نے دل و جان سے اپنے محبوب کو چاہا ہے اور اپنا سب کچھ اس پر نثار کر دیا ہے۔

مری چاہ لی۔ مرا دل لیا جو طلب کیا وہ تمھیں دیا
جوں ہی حُسن سے مرے دل بھرا وہ پھری نگاہ وہ دل پھرا
مرے حُسن کے لیے کیوں مزے
نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

لڑکے کی بے وفائی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے صرف طلب حُسن و جسم تھی۔ وہ بے وفا تھا۔ مگر لڑکی وفا کی پتلی تھی۔ اس بے وفا سے نفرت تو کیا کرتی بھلا تک نہ سکی۔

تمھیں چاہ اور کی جب ہوئی مری وہ بہشت تو جا چکی
مگر آرزو یہ ضرور تھی تمھیں دیکھ لیتی کبھی کبھی
مرے حُسن کے لیے کیوں مزے
نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

اسی طرح ایک نظم "دام میں یاں نہ آئیے" میں مرد کی سچی محبت اور عورت کی جنسی تفریح ہے۔ یہ نوجوان مرے حُسن کے کیوں لیے مزے کی ہیروئن کی طرح معصوم ہے۔ محبت اس کی ضرورت نہیں فطرت ہے۔ برخلاف اس کے اُس کی ہیروئن دُنیا دار ہے۔ شروع میں محبت کی پینگ بڑھاتی ہے۔ اس کے دل کو محبت کا پہلا سبق پڑھاتی ہے۔ لڑکپن کو مرد کرتی ہے۔ لڑکے نے اس اتصال جسم سے زیادہ اتصال روح و جسم کو سمجھا لیکن عورت دُھن والی تھی اسے دُنیاوی جاہ اور جنونِ زر تھا۔ ایک کبر سن رئیس اس کے دامِ حُسن میں گرفتار ہوا۔ اس نے اُس سے شادی کر لی اور اس نظم کے معصوم نوجوان کو دُنیا داری سکھانا چاہتی ہے کہ شادی تو دُنیا داری ہے۔ کرلی۔ ورنہ دل سے اب بھی مَیں تمھاری ہوں۔ ہمارے عیش وصال بدستور رہیں گے۔

مجھ سے کہا کہ کیا ہوا اب بھی ہوں تم پہ مَیں فدا
عیش مزے وہی رہیں وہی رہے معاملا

اس نوجوان کے یہاں محبت کا تصوّر خالص جسمانی نہیں بلکہ وہ روح و جسم کا اتصال ہے۔ اس کی اس ریاکاری پر اس کے جی پر آیا۔ ؎

گھُنتے ہی جی میں آئی یہ گھونٹ دوں بے وفا کا گلا
خون کا گھونٹ پی کے میں واں سے چلا یہ کہہ چلا
دام میں یاں نہ آئیے۔ دل نہ یہاں لگائیے

یہ بات پوری یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اُن کے یہاں بچپن اس سے وابستہ گھر، کھیل، تماشے، انھیں میں دو بچوں کا روحانی پیار اُن کی سب سے عزیز یادیں ہیں لیکن عظمت اللہ خاں ایک دل گداز اور ذہن رسا رکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں نظموں کے کردار رومانی تخیّر نہ ہی کیسر تخیّل زدہ ہیں۔ تخیّل، رومان اور حقیقت کا عکس اُن کے کرداروں کی زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں یکسانیت کا ذ نہیں ہے بلکہ مختلف شکلیں ہیں، نہ فارمولا ہے کہ مرد بے وفا ہوتا یا عورت باوفا ہوتی ہے۔ ایک نظم میں ہم نے مرد کی بے وفائی دیکھی تو دوسری میں عورت کی عیاری۔ اس طرح عظمت اللہ کے یہاں واقعات اور کردار کا تنوع اپنی مخصوص دُنیا میں ہے لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ وہ صرف محبت کے شاعر ہیں، محبت جو بچپن میں معصوم ہے، جوانی میں لہک ہے۔ بے وفائی میں درد اور حقیقت میں امر ہے یہی محبت میاں، بیوی کے روپ میں ایک خوش حال گھر بناتی ہے۔

بچپن کی یادوں اور نوجوانی کی رومانی محبت سے اُن کا قدم اور آگے بڑھتا ہے اب وہ میاں بیوی کی محبت کو اپنے شعری قصوں کا نغمہ بناتے ہیں۔ عظمت اللہ اپنی تمام نمایندہ نظموں میں رومانی نظر سے زندگی کی حقیقتوں کو دیکھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں بچپن سے لے کر گھر بس جانے تک کی اُس زندگی کی پُرخلوص عکاسی ہے جو محبت اور حُسن کی زندگی ہے۔ ان کا مزاج رومانی لے کا اظہار ہے۔ اس رومانی معصومیت میں ذہانت یا کتابی رہنمائی سے شامل کی ہوئی زندگی کی سنجیدہ حقیقتوں کا امتزاج غیر فطری ہوتا ہے۔ رومانی لہر کا یہ دھیما سا حُسن، جوانی اور اپنے گھر کے محدود حلقے میں رہ کر سچا ہے کہ اس میں تجربہ کی سچائی ہے، اظہار کی سادگی

ہے۔ اس کی لذت میں جہاں دیدہ ہوسناک لذتیت نہیں بلکہ ایک متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ رومانی نوجوان کی لذتیت ہے۔ اُن کے درد میں تیز نشتر کی کاٹ نہیں بلکہ کسک ہے۔ یوں بھی عظمت اللہ کے یہاں جذبہ کا وہ جنون نہیں جو بے خطر آتش نمرود میں کود پڑے، نہ ہی درد کی گہرائی ہے۔ دبیر کی نشتریت ہے نہ اقبال کی حرکت۔ عظمت اللہ خاں کیٹس کی طرح حُسن کے تصور میں سرتاقدم پگھلتا ہوا احساس نہیں ہو جاتے بلکہ اُن کی دھیمی لے، جاڑوں کی نرم دھوپ ہے یہ محبت بن کر دل کو گرم اور روشن رکھتی ہے ایسی سلامت روی جذبہ کے جِنک کے بجائے جذبوں کی کہانی سُنا سکتی ہے، سپردگی چاہت کی خدمت، کیفیت کا ایک نشتر لگا سکتی ہے لیکن یاد یا درد کہانی بن کر ندی کی طرح چُپ چاپ 'دور تک' دیر تک رواں رہے اس کے لیے عظمت اللہ خاں جیسے مخصوص، نرم رومانی جذبہ کی ضرورت ہے۔ عظمت اللہ کی یہ انفرادیت ہے کہ متوسط طبقے کی وہ تصاویر، اُن کے رومانی مسائل، مسلم گھرانوں میں رشتہ دار بھائی بہنوں سے پُرخلوص پیار، ناکامی پر خاموشی سے کڑھنا، جلنا، اُن کے شعروں میں مل جائیں گی۔ یہ اس دور کے نمایندہ ادبی رجحانات تھے۔ یہ کہانیوں کی فضا تھی جو عظمت اللہ خاں کے یہاں اتنی معصومیت اور خلوص کے ساتھ نظر آتی ہے۔

چند نظموں میں عظمت اللہ اپنی انھیں تمام صفات کے ساتھ ایک قدم اور آگے بڑھے۔

یہاں محبت کامراں ہے۔ یہ محبت نئے شادی شدہ جوڑے کی ہے۔ اس میں پیار کو نباہنے کی آرزو، چاہے اور چاہے جانے کی طلب، حُسن کی شرمساری، عشق کی شرم دشمنی، شعری مرقعے بن جاتی ہیں۔ 'بالی بیوی سے' اور 'پہلا آمنا سامنا' موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بہت ملتی جُلتی نظمیں ہیں۔ دونوں میں شادی کے بعد کی اجنبیت، شرم، فطری چاہت موجود ہے۔ 'بالی بیوی سے' میں حسن نوبہار کا یوں نقشہ کھینچا ہے:

تو کلی ہے نئی نئی ابھی بند ہیں پنکھڑیاں
ابھی سال کٹیں کئی کہ چٹک پڑیں انکھڑیاں
ابھی آنکھ ڈری ڈری سی ہے ابھی آگ دبی دبی سی ہے

یہ سراپا ملاحظہ ہو:

ترے ہونٹ یہ لال ہیں نہیں سانس میں گرمیاں
ترے پھول سے گال ہیں نہیں باس میں مستیاں
ابھی آنکھ ڈری ڈری سی ہے ابھی آگ دبی دبی سی ہے

یہ نظم اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے بےحد متوازن ہو جاتی ہے۔ شاعر کی اس خود کلامی میں ایک نیک آرزو ہے کہ میں اپنی محبت سے اپنی بیوی کی روح جیت لوں تب ہی محبت کی زندگی واقعی ملے گی۔

ترے کھلنے کے ساتھ ساتھ ترے دل میں ہو گھر مرا
تری روح جو آئے ہاتھ مجھے زیست کا پھل ملا
ابھی آنکھ ڈری ڈری سی ہے ابھی آگ دبی دبی سی ہے

'پہلا آمنا سامنا' میں نسبتاً شوخی زیادہ ہے لیکن محبت کی شرافت سے یہ نظم اسی طرح روشن ہے۔ 'پہلا آمنا سامنا ہوا ہے' دُلھن سے گھونگھٹ اُٹھانے کی فرمائش ہو رہی ہے؛

بڑی اس دن کی تھی آرزو کہ ہوں اس رنگ سے روبرو
تو ہو دل کھول کے گفتگو ابھی بس شرم اُٹھاؤ تم
مری نینوں میں سماؤ تم مرے من میں بسو آؤ تم

"تمھیں یاد ہیں وہ دن بھی" زن و شوہر کے اہم مسئلہ پر مبنی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے جاں نثار ہیں مگر اولاد سے محروم ہیں۔ بیوی میاں کو دوسری شادی پر مجبور کرتی ہے۔ دوسری بیوی سے بچے ہوتے ہیں۔ زندگی کی یہ ضرورت بھی پوری ہو جاتی ہے پہلی بیوی کا یہ ایثار اسے اپنے شوہر کو اور جیت لیتا ہے۔ اس کا یوں اعتراف ہے:

ہوے مجھ کو بال بچے مرا دل رہا تمھارا
بنے ہم وہ دوست سچے کہ جہاں ہے ہیچ سارا
مری آتما تمھاری مری آتما کی پیاری

عورت کا یہ ایثار، محرومی کا یہ خوبصورت حل، مرد کی وفاداری غیر حقیقی تو نہیں ہیں لیکن رومانی افکار کی دین ہیں۔ رومانی افکار کی یہ معصومیت بذات خود ایک حسن ہے۔

"برسات کی رات دکن میں" ایک پُرسکون گھر کی ایک شب مسرت کا خوبصورت نقشہ ہے۔ اس سطحی گھریلو محبت کی تصویر کو کسی بھی ڈراما ئی، پُرجوش اور پُرجنون محبت کے مرقعے سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا حسن سادہ وہ پھول ہے جس میں کوئی بیل بوٹا نہیں ہے۔ عظمت اللہ کے اندر کے کہانی کار اور شاعر دونوں نے مل کر اس کی تصویر کشی کی ہے۔

دکن کی ایک رات۔ برسات کی رم جھم سے پُراسرار ہے۔ زندگی کے پھول اور تتلیاں بستر پر سو رہے ہیں۔ سندر چترا گھر کے کاموں کو نبٹا چکی ہے۔ بچھونا بچھاتی ہے۔ پان کھلاتی ہے۔ پھر گھر کی چھوٹی موٹی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ کمرے میں آسودہ پیار کی نرم روشنی ہے۔ باہر بادل کی گرج اور بجلی کی چمک ہے۔ آنگن جل تھل ہو رہا ہے۔ ہوا میں خنکی رچی جاتی ہے۔ شاعر یہاں تک لا کے صرف چند مصرعوں میں گھر کے پیار کی آسودگی بانٹ دیتا ہے:

> بچّوں کو اُڑھا ئی ہے دُلائی
> اب نیند کی ہے راج دُہائی
> کیا ہی بھلی سانس کی گرمائی
> جسم کی گرمی اپنی۔ اُن کی

اور وہ نظم یوں تمام ہوتی ہے:

> گھر میں بالک آبادی ہو
> چاہنے والی گھر والی ہو
> ہنسی خوشی گذر جاتی ہو
> یوں ہی برسیں برسات کی راتیں

بچپن کی یادوں اور جوانی کے آسودہ گھر سے نکل کر اُن کی محبت دُنیا کے بازار میں نہیں گئی۔ اور یہ کوئی بُری بات نہیں۔ ہر فنکار کے اپنے حدود ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے حدود سے نکلنا بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ گھوڑے، بیل کی اہمیت ہرن سے قطعی کم نہیں مگر ہرن پر گھاس نہ لادنا ہی انصاف ہے۔ اپنی اس گھریلو دُنیا سے نکل کر عظمت اللہ جب روایتی کہانیوں، تاریخی قصوں کی دُنیا میں پہنچے تو وہ بھی انھیں حُسن و محبت کا پیکر ملی۔ وہ بیت کی ماری

ستی، شاعرہ روپا متی تھی۔ روپا متی میں انھیں جیسے اپنے تصور کا آئیڈیل مل گیا۔ وہ کامنی، حسین کوئل کے میٹھے سروں کی شاعرہ تھی۔ اپنے محبوب شوہر سے چھُٹ کر دوسرے کی نہیں ہوئی۔ عظمت اللہ کے دل کے تار اس کی عقیدت میں تھرتھرا اُٹھے۔ اس کے حسن، صفا، وفا کی کہانی، عظمت اللہ کی کامیاب نظم ہوگی۔ چار مختصر مصرعوں کے بعد:

> "بیت کی ماری ستی شاعرہ روپا متی"

کی تکرار اِک کراہ بازگشت کی طرح گونجتی ہے۔

بدقسمتی سے عظمت اللہ خاں کا عین عالم جوانی میں انتقال ہوگیا۔ عظمت اللہ اپنی خوبصورت دُنیا کے خالق تھے۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ ورڈسورتھ کی نظم CUCKOO بائرن کی نظم ISLES OF GREECE میرڈتھ کی نظم THE YOUNG USURPER براؤننگ کی نظم WOMAN'S LAST WORDS مترجم کی حیثیت سے ٹھیک ہیں مگر میں اُن کا زیادہ قائل نہیں۔ مثلاً CUCKOO میں جو سادگی، روانی، یادوں کی نرمی، وہی ہے اس کا حق ادا نہیں ہوتا۔ آپ کہیں سے دیکھ لیں۔

> O BLESSED BIRD! THE EARTH WE PACE
> AGAIN APPEARS TO BE
> AN UNSUBSTANTIAL FAIRY PLACE
> THAT IS FIT HOME FOR THEE

ان رواں مصرعوں کا ترجمہ مجروح اور تھکا تھکا سا لگتا ہے۔

> مبارک پرندے، یہ دُکھیاری دُنیا
> نظر میں مرے پھر ذرا کی ذرا
> پرستان ہے یا تخیل کی نگری
> ترے آشیانہ کی موزوں جگہ

اسی طرح براؤننگ کی نظم میں جو عورت کی تہ داری اور عورت پن ہے وہ بھی ترجمے میں قائم نہیں رہ سکا۔

منظر کشی کی بہترین مثال پیپل، صبح اور برکھارت کا پہلا میلہ ہیں۔ ان نظموں میں گیتوں کے نغمے سے زیادہ محاکاتی نظموں

منظر کشی ہے۔

اُن کی نظم "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں" اگرچہ فنی حیثیت سے بہت اہم نہیں لیکن اس کا موضوع عظمت اللہ خاں کی دوسری نظموں سے الگ ہے۔ ایک لڑکی کو حالات نے طوائف بنا دیا ہے۔ اس کا اخلاق اور اصول وغیرہ کے بارے میں مشکوک نظریہ اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ عظمت اللہ محبت کی پُرخلوص دُنیا سے آگے نکل کر بازار کی فضا کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے، لیکن موت نے انھیں مہلت نہیں دی۔

عظمت اللہ خاں کی نمائندہ نظمیں پاکیزہ مادی محبت کی خوبصورت دُنیا ہیں جہاں بچپن آنگن میں کھیلتا ہے۔ نوجوانی میں محبت کی مہک اور بدن کی بہک ہے۔ شادی کے بعد شرمائی لجائی گل گاسنی ہے۔ زندگی کے پھول اور تتلیاں ہیں۔ عورت کا آسودہ پیار ہے، گھر کی فضا ہے۔ ان کے لیے عظمت خاں نے سادہ پُرخلوص اسلوب برتا۔ عظمت کی شاعری رات کے خاموش نغمے کی طرح ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اب مزید فکر و تجزیہ سے اسے مجروح نہ کیا جائے۔ مگر بے بسی یہ ہے صبح، تیشے کے کرن کی منتظر رہتی ہے۔

عظمت اللہ کی شاعری یادوں کا خوبصورت گھر ہے۔ اس کا خالق رومانی ذہن کا توازن ہے۔ برخلاف اس کے ان کا مضمون اسی رومانی ذہن کی غیر متوازن بغاوت ہے۔ عظمت اللہ کے یہ دو متضاد رنگ ایک طالب علم کے لیے پریشان کن ہیں، لیکن پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے مضامین میں اس رومانیت کی متضاد کارفرمائیوں کی اکثر وضاحت کی ہے۔ انھیں کا ایک فقرہ ہے کہ "رومانیت کبھی مضحک بھی ہوتی ہے"۔ اب عظمت اللہ خاں کے تضاد کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

عظمت اللہ خاں کی معصوم اور پُراثر شاعری کو سمجھنے میں جو سب سے زیادہ گمراہ کرنے والی بات ہے وہ اُن کے مضمون کی عروضی ورزش اور اونچے بول کا لہجہ ہے۔ ہر شاعر اس کا یقین کرے گا کہ جب عظمت اللہ نے اپنی اچھی نظمیں کہی ہوں گی تو عربی، ہندی یا انگریزی عروض کے زور سے نہیں کہی ہوں گی۔ پھر عروض کا مسئلہ شعر سے متعلق ہوتے ہوئے بھی خالص شعر کا مسئلہ نہیں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کی کامیاب نظمیں خالص عربی عروض میں ہیں مثلاً

۱۔ نہ بھلے کی تھی نہ بُرے کی تھی مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی
بحر کامل مثمن سالم۔ متفاعلن ۴ بار

۲۔ مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا۔ بحر متدارک مخبون فعلن چار بار۔

"بِرکھا رت"، جس پر محترم عبدالحق کا بھی نوٹ ہے کہ یہ خالص ہندی کی بحر میں ہے وہ بھی اُردو کی بحر متدارک مخبون دو ہزار رکنی ہی میں ہے۔ ہم اگر عظمت اللہ کے مضمون کی باتوں پر اُن کی شاعری کو جانچیں تو اُن کی خوبصورت نظمیں قوافی کی زیادتی میں گردن زدنی معلوم ہوں گی مثلاً یہ بند ہے:

عشق کی دیوی تھی تو
شعر میں یکتا تھی تو
حُسن کی پُتلی تھی تو
اِک کویتا تھی تو

اس بند پر اُن کے نقطۂ نظر سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ پہلے اور تیسرے مصرعے اور دوسرے اور چوتھے مصرعے کو اس لیے دور کیا گیا کہ وہ قافیوں کی بازی گری ہیں ورنہ مضمون کے لحاظ سے اس بند کو یوں ہونا چاہیئے تھا:

عشق کی دیوی تھی تو
حُسن کی پُتلی تھی تو
شعر میں یکتا تھی تو
اِک کویتا تھی تو

پھر ان مختصر مصرعوں میں ردیف اور قافیے کے کھیل کے علاوہ کیا ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں ذہانت کا ٹیڑھا پن ہوتی ہیں جس طرح شعر احساس کی قوت سے شعر ہوتا ہے اسی طرح سخن فہمی کے لیے بھی احساس کی شرافت، معصومیت اور ہمدردی کی شرط ہے۔ اسی طرح اُن کی نظم "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں" میں ہر دو مصرعے

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

غزل

جاں نثار اختر

موجِ گل، موجِ صبا، موجِ سحر لگتی ہے
سر سے پا تک وہ سماں ہے کہ نظر لگتی ہے

لمحے لمحے میں بسی ہے تری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

ہم نے ہر گام پہ سجدوں کے جلائے ہیں چراغ
اب تری راہ گزر، راہ گزر لگتی ہے

واقعہ شہر میں کل تو کوئی ایسا نہ ہوا
یہ تو اخبار کے دفتر کی خبر لگتی ہے

کوئی آسودہ نہیں اہلِ سیاست کے سوا
یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

لکھنؤ کیا تری گلیوں کا مقدر تھا یہی
ہر گلی آج تری خاک بسر لگتی ہے

اڑیا ڈرامے کا ارتقا

مظہر امام

اُڑیا ڈرامے کا آغاز دراصل دوسری صدی عیسوی میں ہی ہوگیا تھا۔ بھوبنیشور کے نزدیک اُودے گری کے ایلیفینٹا غاروں میں کھدے ہوئے نقوش اسی بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ قدیم تعمیرات نے رقص کرتی ہوئی شکلوں کے ذریعے مندروں کی دیواروں پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ پوری، بھوبنیشور اور کونارک کے مندروں میں یہ نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ بھارت منی نے اپنی عیرفانی تصنیف "ناٹیہ شاستر" کے چودھویں باب میں "اودرا پربرتی" کا ذکر کیا ہے۔

پندرہویں صدی میں اڑیسہ کے مہاراجہ کپلندر دیو نے "پرشورام میاجوگ" نام کا ایک سنسکرت ڈرامہ لکھا اور پیش کیا۔ اس کے مکالمے سنسکرت میں تھے لیکن گانے اُڑیا میں تھے۔ اَن پڑھ طبقے میں ڈرامے کو کامیاب بنانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔ سولھویں صدی میں رائے رامانند پٹنائک نے "جگن ناتھ ولبھ" نام کا سنسکرت ڈرامہ لکھا اور پیش کیا۔ یہ ڈرامہ مہاراج پُرشوتم دیو کے دربار میں اسٹیج کیا گیا۔ مرد اداکاروں کے علاوہ اس میں عورتوں نے بھی اداکاری کی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بھی اڑیسہ کی خواتین اداکارانہ صلاحیتوں کے اظہار پر قادر تھیں۔ آپیرا یا سنگیت ناٹکوں میں رام لیلا اور کرشن لیلا کو زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ یہ سنگیت ناٹک عوام کے لیے تفریح کا واحد ذریعہ تھے۔ سترہویں صدی میں یہ سنگیت ناٹک اپنے اڑیا گانوں کی وجہ سے گاؤں میں بھی مقبول ہونے لگے۔ رام لیلا میں چھوٹے چھوٹے مکالمے ہوتے تھے جنھیں عام لوگ بےحد پسند کرتے تھے۔ "جاترا" کی شکل یہیں سے پیدا ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں مرہٹوں نے اڑیسہ پر حملہ کیا اور حکومت کرنے لگے۔ مہاراجہ براکشور دیو نے ایک ڈرامہ "پدماوتی ہرن" لکھا۔ گنجام اور کوراپٹ اضلاع ۱۸۶۰ء میں اڑیسہ سے علیحدہ کرکے صوبہ مدراس میں ملحق کردیے گئے۔ پھر بھی جنوبی اڑیسہ کے رجواڑوں خلاّ پرلا، چکتی، منجوسا، سُرنگی وغیرہ کے راجاؤں نے ڈرامے لکھے اور اپنے دربار میں پیش کیے۔ رگھوناتھ پریچھا کا لکھا ہوا ڈرامہ "گوپی ولبھ" اس زمانے میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ انیسویں صدی میں جگو موہن لالہ نے "باباجی" اور رام شنکر رائے نے اپنی غیرفانی تخلیقات "کانچی کاویری" اور "چیتنیہ لیلا" پیش کیں۔ یہ ڈرامے اُڑیا زبان میں لکھے گئے تھے۔ ناٹیہ شاستر کے اصولوں کے مطابق استردھار، ناٹی، ناٹی اور اودُرشیہ کاری نے ان ڈراموں میں حصہ لیا۔ مکالمے معرا نظم میں اور بےحد طویل ہوتے تھے۔ آج کے دور میں یہ غیر دلچسپ معلوم ہوں گے۔ لیکن اس زمانے میں وہ حیرت انگیز طور پر مقبول تھے۔ اُن دنوں جاترا کی مقبولیت بڑھ رہی تھی۔ اس زمانے میں جاترا کا سب سے ہردلعزیز اور نامور مصنف، اداکار اور ہدایت کار گوپال داس تھا۔

کپل مصرا نے رام شنکر رائے کے رنگ میں دو ڈرامے "ستیا بھاما" اور "بسنت لیکا" لکھے۔ زبان آسان تھی اور سماجی ڈراموں کی طرف ان کا رجحان نظر آتا تھا۔ ہرچند کہ معرا نظم میں جذبہ دلیری (ویر رس) کا اظہار کیا گیا تھا۔

گاؤں میں "جاترا" روز بروز مقبول ہو رہے تھے۔ زبان آسان

سے آسان تر ہوگئی۔ لوک ناٹک گانے، ناچ اور مزاح سے پُر ہوتے تھے۔ کبھی کبھی گندے اور فحش گانے اور مزاح بھی ان میں ہوا کرتے تھے۔ اس رجحان کو روکنے اور لوک ناٹکوں کو بہتر اور صحت مند بنانے کا کام مقبول ترین مصنف، اداکار اور ہدایت کار ویشنب پانی اور بالا کرشن مہنتی نے انجام دیا۔ یہ دونوں جدید 'جاترا' کے باوا آدم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ڈراموں کی مقبولیت اور مانگ کے باعث اندھا دھند بنگالی ڈراموں کے ترجمے پیش کیے جانے لگے۔ پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں نے ڈرامے لکھنے کی طرف توجہ دی۔ پنڈت گوداورش مصرا کے ڈرامے "پرشوتم دیو" میں بڑی صحیح زبان استعمال ہوئی، لیکن اسٹیج کے مطابق کے لحاظ سے یہ ڈرامہ کچھ زیادہ مناسب نہیں تھا۔ بھکاری چرن پٹنائک نے "کٹک وجے"، "نند کیشوری" کے علاوہ مشہور سماجی ڈرامہ "سوتیلا" لکھا۔ اپنے خوبصورت مکالموں، اسٹیج کی ضروریات سے مطابقت اور اپنی ندرت کے باعث "سوتیلا" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

پیشہ ور تھیٹریکل انجمنیں معرض وجود میں آئیں۔ آنجہانی بنمالی جی نے رادھا کرشن تھیٹر قائم کیا۔ اس کے لیے اسوینی کمار گھوش ڈرامے لکھا کرتے تھے۔ تاریخی اور اساطیری ڈراموں میں اب تک کوئی ان کا مد مقابل پیدا نہیں ہوا۔ "کالا پہاڑ"، "کونارک" اور "میر قاسم" کو اب تک ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ زبان آراستہ پیراستہ ہے اور ڈرامائی جذبات کا اظہار ہمیشہ غیر مقفیٰ شاعری میں کیا گیا ہے۔ ان ڈراموں کی بنیاد خاص طور پر دلیرانہ اور عزم انگیز واقعات و حادثات پر رکھی گئی ہے۔ "کالا پہاڑ" کے آخری منظر میں اسٹیج پر ہیرو کو پانچ مُردوں کے درمیان بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس زمانے میں اس تاثر کو جو اسٹیج پر کھیل سے حاضرین پر مرتب ہو (STAGE EFFECT) بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ہیرو کا خواب میں ہیروئن کو آسمان پر اڑتے ہوئے دیکھنا، کونارک مندر کی تعمیر، "میر قاسم" میں بجلی گرنے اور آگ لگنے کا منظر، "بندھو مہنتی" اور "سری لوک نرتیہ" کے خاص مناظر اب تک یاد کیے جاتے ہیں۔ اساطیری اور نیم اساطیری ڈراموں میں جوڑ توڑ (TRICKS) سے کام لینا ہی پڑتا تھا۔ میلو ڈرامہ کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اسوینی کمار گھوش نے ناٹیہ سیواد تقریباً ۱۹۱۰ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۴۰ء تک وہ اڑیسہ کے اہم ترین ڈرامہ نگار رہے۔

گووند چندر سُر دیو نے ۱۹۱۶ء میں ایک رس پارٹی قائم کی۔ "رس" کی زندگی اور روح نغمہ و رقص ہیں۔ اس میں عموماً شری کرشن کی زندگی کے متعلق واقعات پیش کیے جاتے ہیں اور گیت، موسیقی اور ناچ کو نمایاں اہمیت دی جاتی ہے۔ مکالمے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان "رس" کی چار پارٹیاں اڑیسہ میں سرگرمی کے ساتھ اپنے ڈرامے اسٹیج کیا کرتی تھیں۔ اپنے خوبصورت گیتوں اور اڑیسی سُر کی بنا پر یہ بہت پسند کیے جاتے تھے۔ اس کے مصنف کو ایک ڈرامہ نگار سے زیادہ ایک باکمال شاعر ہونا پڑتا تھا۔ صرف ایک تھیٹر "اناپورنا تھیٹر" تھا۔ جو اب اسی نام کے "اے گروپ" کی حیثیت سے قائم ہے۔

کوی چندر کالی چرن پٹنائک نے ۱۹۳۹ء میں اپنی "رس پارٹی" ختم کر کے "اڑیسہ تھیٹر" کے نام سے ایک تھیٹریکل کمپنی قائم کی۔ کوی چندر کو اڑیا ادب پر عبور حاصل تھا۔ اس وقت نیو تھیٹر اور بمبئی ٹاکیز کی سماجی فلمیں بہت مقبول ہو چکی تھیں۔ اس لیے کوی چندر نے اڑیا ڈرامے میں ایک نئے رجحان ـــــ جدید معاشرتی رجحان کا آغاز کیا۔ ہر چند کہ ہندستانی فلموں اور بنگالی ڈراموں کا اثر ان کے ڈراموں میں نمایاں تھا، پھر بھی اپنی حقیقت پسندانہ نمائندگی کے باعث انھیں بے حد سراہا گیا۔ کوی چندر نے منہ پھیر کر بولنے کی تکنیک کبھی نہ ختم ہونے والی تقریروں اور خود کلامی سے دامن چھڑانے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی پہلی تخلیق "گرلس اسکول" نے ۱۲۰ راتوں کا ریکارڈ قائم کیا، جبکہ ہفتے میں ساتوں دن ڈرامہ دکھایا جاتا تھا۔ پھر ان کے پیش کردہ "بن مالا"، "جیبن"، "بھاٹا"، "چکری"، "ابھینا"، "بجے دیو" اور کئی دوسرے ڈرامے منظر عام پر آئے۔ تقریباً دس سال کے عرصے میں کالی چرن پٹنائک نے اڑیسہ میں نئے انداز کے ڈراموں کی بھرمار کر دی۔ "اناپورنا تھیٹر" اب تک اسوینی کمار کے لکھے ہوئے تاریخی، اساطیری اور معاشرتی اساطیری ڈراموں کو پیش کر رہا تھا۔ نئے ڈراموں

کی ہر دلعزیزی کے باعث اسوپی کمار کی مقبولیت کم ہو گئی اور جب کالی چرن پٹنائک کا "اڑیسہ تھیٹر" دس سال تک شاندار کارنامے انجام دینے کے بعد بند ہو گیا تو ان کی تخلیقی سرگرمیاں بھی ماند پڑ گئیں۔

اس کے بعد مقبول ناول نگار کنہی چرن نائیک نے اپنے ڈرامے "دھرم تینی" "لال چابک" اور "نیجر" پیش کیے۔ ان ڈراموں میں عورت، شراب اور پستول کو نمایاں جگہ حاصل تھی۔ یہ ڈرامے تماشہ دیکھنے والوں میں اپنی تیز رفتاری اور SUSPENSE کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ اننا پورنا تھیٹرز اڑیسہ تھیٹر کے آرٹسٹوں کو لے کر اپنا "بی گروپ" قائم کر لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نئے تھیٹر کو جس میں پہلے کالی چرن پٹنائک کے ڈرامے کھیلے جاتے تھے، نئے ڈرامہ نگاروں کی ضرورت محسوس ہوئی جو کوی چندر کی خالی جگہ کو پر کر سکیں۔ دو نوجوان لکھنے والے رام چندر مصرا اور بھنج کشور پٹنائک سامنے آئے۔ شری مصرا کے ڈراموں "مونیا" "بھائی بھوج" "گھر سنسار" وغیرہ نے بے مثال کامیابی حاصل کی۔ شری مصرا کی سحر کاری کا راز ان کے سادہ لیکن پُر اثر مکالموں اور جذباتی مناظر میں تھا۔ انھوں نے ایسے کردار کی تخلیق کی جو فطری ہمدردی پیدا کر سکیں اور ایسے مناظر پیش کیے جو اپنی جذباتی تاثر انگیزی کے باعث آنکھوں میں آنسو لا سکیں۔ ان کے ڈرامے شہر اور گاؤں دونوں میں مقبول تھے بلکہ اب تک ہیں، کیونکہ ان میں عام انسانی مسائل کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

ایک خاندان کے مختلف افراد سے متعلق ڈراموں کو بھی اسی دور میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ بھنج کشور پٹنائک نے اننا پورنا تھیٹرز کے "بی گروپ" کے لیے "پہلی رجہ" (پہلا تہوار)، "مانیکا جوڑی"، "بیراگیا سنسار"، "اتیمی" وغیرہ ڈرامے لکھے جو رواج کے مطابق فیملی ڈرامے تھے۔ ان میں جذبات، کردار نگاری اور خصوصاً مزاح پر زور دیا گیا تھا۔ انکے ڈرامو "زہر" اور "بجے مالا" کو مسائلی ڈرامہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اول الذکر میں سماجی مسائل کو پیش کیا گیا ہے اور موخر الذکر میں ادیبوں اور شاعروں کے مسائل کو۔ ان کا ڈرامہ "بجے مالا" دورِ جدید کا واحد المیہ ناٹک ہے۔ پیشہ ور تھیٹر ٹریجڈی کو "خطرناک" سمجھتا ہے!

ایک دوسری تھیٹریکل کمپنی معرضِ وجود میں آئی جس کا نام پہلے "روپا سری" تھا اور پھر "جنتا رنگ منچ" میں تبدیل ہو گیا۔ یہ اپنے ڈرامے اس وقت کٹک میں اسٹیج کر رہی ہے۔ نئی تھیٹریکل کمپنیوں کے وجود نے نئے لکھنے والوں کی ضرورت بھی پیدا کر دی۔ نئے ڈرامہ نگار نئے پلاٹ کے ساتھ پیشہ ورانہ اسٹیج پر اپنے کارنامے دکھلانے کے لیے منظرِ عام پر آئے۔

منو موہن داس کا "بخشی جگبندھو" غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ یہ ایک تاریخی ڈرامہ تھا اور بنگلہ اسٹیج کے "سراج الدولہ" اور "ٹیپو سلطان" کی یاد دلاتا تھا۔ اندرا شنکر داس کا "سادھبی" اور دھرنند مہنتی کا "جوتھی راتی" اسٹیج کیے گئے اور بہت کامیاب رہے۔ اندرا شنکر کے ڈرامے "جوتکا" (جہیز) "لوہا سکولی" (لوہے کی زنجیر) "چکا بھونری" مقبول ڈرامے ہیں جو سماجی مسائل سے بحث کرتے ہیں۔ ان کی قابلِ ذکر تخلیق "بولو استاد" ہے جو بچوں سے متعلق ہے اور اسٹیج پر اپنی نوعیت کا واحد ڈرامہ ہے۔

اس دوران میں ایک اور ہونہار ڈرامہ نگار گوپال چھوٹرائے نے اپنی تخلیقات "پھیری آ" (واپس آ) اور "بھروسہ" (بھروسہ) سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سادہ لیکن انتہائی اثر انگیز مکالمے لکھتے ہیں۔ ان کا "پرکلم" (پرکا قلم) واحد سیاسی ڈرامہ ہے جو صوبے کے وزیر اعلیٰ کی بابت بے باکی سے اظہارِ خیال کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں اسمبلی سیشن کو بھی دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اوڑیا ڈراموں میں اسے عہد آفریں سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد گوپال چھوٹرائے نے اڑیا کے مقبول ترین ناولوں کو ڈرامہ کا روپ دینا شروع کیا۔ "جھنجھا" (طوفان)، "امڑا باٹ"، "ملاجہنہ" (مُردہ چاند) کے ADAPTATIONS اسٹیج پر بہت کامیاب ہوئے کیونکہ اصل ناولوں کا تاثر ان ڈراموں میں کسی طرح کم نہیں ہوا ہے۔

کارتک کمار گھوش کا معاشرتی اساطیری ڈرامہ "لاکھیہ ہیرا" انتہائی خوبصورت تخلیق ہے جس نے تمام اڑیسہ میں شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے۔ شری گھوش کی دوسری کامیاب پیش کش "بچا" ہے۔ "لاکھ ہیرا" کا تاثر اس کے جذباتی مناظر کے سبب ہے۔

بلرام مصرا، بے مصرا، دھنیشور پٹنائک، نرسنگھ مہاپاترا، جتے کار

وغیرہ ڈرامہ نگاروں نے ہنوز ایسی کوئی تخلیق پیش نہیں کی ہے جسے ناقابلِ فراموش کہا جاسکے۔

اس وقت کے مقبول اور سرگرمِ عمل ڈرامہ نگار کمل لوچن مہنتی اور بھوبنیشور مہاپاترا ہیں۔ اپنے ڈراموں اور ان کی مقبولیت کے لیے ان ڈرامہ نگاروں کے اپنے اصول وضوابط ہیں۔ کمل لوچن مہنتی کے ڈرامے تنقیدی ہوتے ہیں۔ وہ براہِ راست حکومت کی پالیسی اور سماج پر راو روی پر تنقید کرتے ہیں۔ عوام اس براہِ راست حملے کو پسند کرتے ہیں کیونکہ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ اسٹیج پر ان کے دل کی آواز سنائی دے رہی ہے "کرانی" "سوامی استری" اور "ڈاک بنگلہ" کی مقبولیت انھیں بے باکانہ تنقیدوں کے باعث ہے۔ بھوبنیشور مہاپاترا کے ڈراموں کی بنیاد جرائم اور جاسوسی پر ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اڑیسہ کے واحد جاسوسی اور SUSPENSE ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے ڈرامے "نوتھ یتھی" "کا چہ کا یخنہ" (شیشہ اور سونا) اور "موتی محل" اپنے سنسنی خیز پلاٹ اور کلائمکس کے باعث مقبول ہوئے۔

بیومکیش ترپاٹھی نے "ایک دو تین" اور "ہریش چندر" لکھے ہیں اور انھیں پیش بھی کیا ہے۔ انھوں نے "ایک دو تین" میں ایک ہی سیٹ میں تین ایکٹ پیش کرنے کی جدید ٹکنیک کا تجربہ پہلی بار کیا ہے۔ یہ ڈرامہ شروع سے آخر تک طنزیہ طربیہ ہے جو اڑیسہ کے عوام کے لیے بالکل نئی چیز ہے۔ یہ محض ایک تجربے کے طور پر لکھا گیا تھا اور اس کے ردِ عمل کا مطالعہ توجہ سے کیا گیا تھا۔ سامعین کا صرف پڑھا لکھا طبقہ اس سے پوری طرح محظوظ ہوسکتا ہے کیونکہ صرف وہی اس کے طنزیہ مکالموں کو سمجھ سکتے ہیں۔ پھر بھی یہ ڈرامہ اپنی ندرت کے باعث کافی مقبول ہوا۔

اس رجحان کو کمل لوچن مہنتی نے "ڈاک بنگلہ" میں اپنایا۔ پہلی ڈرامے کے پروڈیوسر نے اسے بالکل اسی طرح پیش کرنے کی ہمت نہ کی۔ اس لیے اس کے مصنف نے درخواست کی کہ اس میں چند اور مناظر جوڑ دیے جائیں۔ چنانچہ اس اضافہ کے بعد یہ ڈرامہ اسٹیج ہوا۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈرامہ نگار موجودہ رجحان سے واقف ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ جدید رنگ کے ڈرامے لکھنے کی ہمت نہیں کرتے کیونکہ پروڈیوسر اور تھیٹریکل کمپنیوں کے مالک انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اڑیا ڈراموں میں نیا رجحان آہستہ آہستہ داخل ہو رہا ہے، ارتقا سست رفتار ہے، اسٹیج کے سازوسامان اطمینان بخش نہیں ہیں اور پروڈیوسر نئے انداز کے ڈراموں کے عادی نہیں۔ رولنگ (ROLLING) مناظر اور روشنی کے لیے معمولی بلب عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں لکھنے کی تکنیک وہی استعمال ہوتی ہے جسے مقامی طور پر "کھولو بند کرو" کی تکنیک کہتے ہیں۔ یہ اسٹیج کے لیے مناسب ہے۔ سامنے اور درمیان کا اسٹیج، اسٹیج کا منظر آراستہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ منظر اختتام پذیر ہوتا ہے تو کسی دوسرے منظر کا پردہ نیچے گرتا ہے تاکہ سامنے کے اسٹیج کو پوشیدہ کر دے۔ ہر لکھنے والے کو اس طریقِ کار کی پابندی کرنا پڑتی ہے کیونکہ اس سے ڈرامے کی رفتار قائم رہتی ہے اور اسٹیج کی ترتیب و تنظیم کے لیے زیادہ وقت ضائع نہیں ہوتا۔ شیکسپیئر کے انداز کے سین اور ایکٹ اب تک مستعمل ہیں۔ عام طور پر ہر ڈرامے میں تین ایکٹ ہوتے ہیں اور ہر ایکٹ میں پانچ سے سات تک مناظر۔ یہ اسٹائل بھوبنیشور مہاپاترا استعمال نہیں کرتے۔ وہ اپنے ڈراموں میں ایک ہی وقفہ (انٹرول) دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ تکنیک فلموں سے لی گئی ہے، ہرچند کہ مناظر ہر دس یا بیس منٹ پر بدلتے ہیں، لیکن ڈرامے کی رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور سامعین اپنی دلچسپی نہیں کھوتے، بلکہ اگر بیس منٹ میں بھی منظر تبدیل نہیں ہوتا تو ناظرین مصنف اور پروڈیوسر کی اس خلافِ معمول حرکت پر حیرت کرنے لگتے ہیں۔ ہرچند کہ یہ تکنیک پرانی ہے، لیکن یہ پبلک کی تفریح کا سامان فراہم کرتی ہے اور چاروں پیشہ ور تھیٹر میں سال بھر اس کے باعث رونق ہوتی رہتی ہے۔

پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ایک ڈرامے میں کم از کم چار "رس" ہونے چاہییں۔ ان میں سب سے زیادہ ضروری کرودھ (غصہ) ہاسیہ (مزاح)، سرنگار (عاشقی) اور ویر (دلیری) یا بھیانک (دہشت) رس ہیں۔ پروڈیوسر ڈرامہ کی کامیابی کے مایوس کن انجام کی بابت بہ آسانی پیش گوئی کر سکتے ہیں، اگر ان میں سے کسی ایک رس کی کمی ہو۔ حتیٰ کہ اصل پلاٹ کے ساتھ ساتھ ایک ضمنی پلاٹ بھی چلتا رہتا ہے تاکہ ہاسیہ رس کی تکمیل ہوسکے۔ گانے اور ناچ بھی اسی قدر

ضروری ہیں، یہاں تک کہ وہ کردار بھی جو اصل پلاٹ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، بلکہ وہ گانے اور ناچ کے لیے لائے جاتے ہیں۔ پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار ان کرداروں کی آمد کے لیے عجیب و غریب بہانے نکالتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بہرحال "ضروری" ہیں ورنہ سامعین یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار نے انھیں قصداً دھوکا دیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ "رس" کا رسیا کسی منظر کی تبدیلی کے وقت چلا اٹھتا ہے "ایک ناچ، ایک ناچ" یا "ایک مذاق، ایک مذاق"۔ گاؤں والوں پر جاترے اور رس کا یہ اثر ہے۔ تفریح پسند عوام کی تسکین بہرحال ضروری ہے اور یہ پروڈیوسر کا کام ہے کہ اس کی تکمیل کرے۔ اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ ڈرامہ نگار ناچ گانے اور مزاحیہ کرداروں کو ذہن نشین رکھتے ہیں جب وہ ڈرامے کے عروج، ارتقا کی بابت سوچتے ہیں۔ بیشتر ڈراموں میں گوپال چھوٹرے کا "امڑا بانہ" واحد ڈرامہ ہے جس میں گانوں اور ناچ کو خیرباد کہنے کی جرأت کی گئی۔

عام طور پر ڈرامہ لکھنے والوں کو اسٹیج سے متعلق آرٹسٹوں کی واقفیت ہوتی ہے جب وہ کسی مخصوص تھیٹریکل کمپنی کے لیے لکھتے ہیں تو وہ اس کمپنی کے آرٹسٹوں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ احساس رہتا ہے کہ وہ جن کرداروں کی تخلیق کر رہے ہیں وہ فلاں فلاں ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے لیے ہیں۔ اس لیے ان کے کردار آرٹسٹوں کی مناسبت سے تخلیق کیے جاتے ہیں جن سے آرٹسٹوں کو بڑی سہولت مل جاتی ہے۔ اگر یہ رول آرٹسٹوں کی مناسبت سے نہ لکھے جائیں تو انھیں تبدیل کر دیا جاتا ہے، ان میں کوئی ترمیم کر دی جاتی ہے، یا بعض حلقوں میں انھیں از سر نو لکھا جاتا ہے تاکہ وہ آرٹسٹوں کے مطابق ہوں۔ تھیٹر کا مالک یا منیجر بھی کبھی پروڈیوسر کو مجبور کرتا ہے کہ فلاں آرٹسٹ کو اہم رول دیا جائے۔ اس لیے پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور "معاشی مفاد" کے پیش نظر کوئی نہ کوئی صورت نکالتے ہیں۔

بہرحال انڈیا ڈراموں کی سمت آتا ہوا انقلاب نمایاں ہے "ایک دو تین" اور "ڈاک بنگلہ" کی روایت کو بڑھانا ہے۔ اسٹیج بذاتِ خود ایک بڑا نقص ہے۔ آرٹسٹ، پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار پرانے رجحان کو خیرباد کہہ دیں گے، بشرطیکہ اسٹیج کا معیار اونچا ہو اور اس کے لیے تازہ ترین ساز و سامان مہیا کیے جا سکیں سرِ دست تو اصول یہ ہے کہ ——

"عوام کو مطمئن کرو اور پروڈکشن کے اخراجات کو پورا کرو۔ تھیٹر کا وجود اور آرٹسٹوں کی زندگی قائم رہنا چاہیے۔ ڈرامہ نگار کو پہلے ان کے بارے میں سوچنا ہے اور نئے خیالات کو جہنم رسید کرنا ہے۔ ہم لوگ نئے تجربات، نئے خیالات اور نئی تمثیلوں کے بارے میں اس وقت سوچیں گے جب ہمارے پاس نیا اسٹیج ہوگا لیکن سرِ دست روشنیوں کو جلتے رہنے دو۔"

عظمت اللہ خاں کا نظریۂ شاعری اور شاعری —— (صفحہ ۹ کا بقیہ)

کے بعد یہ مصرعہ "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کا کل نہیں ہے" ٹیپ کے بند کی طرح ۲۳ شعروں کی نظم میں ۲۳ بار آتا ہے۔ ٹیپ کا یہ مصرعہ اس سے لگایا گیا ہے کہ عظمت صاحب کو اپنی نظموں کو گیت کہنے پر اصرار ہے۔ اگر میں یہ اعتراض کروں تو یہ میری انتہا پسندی ہوگی۔

اس مضمون میں نظموں کو گیت نہ کہہ کر نظم کہا گیا ہے۔ گیت کے لیے جس سپردگی، والہانہ پن اور انکسار کی روایت ہے وہ ان نظموں میں نہیں ہے۔ اور جب یہ اپنے موضوع، اسلوب اور بحر کے لحاظ سے نظم کی دنیا بناتی ہیں تو انھیں میرے نزدیک نظم ہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ چند نظمیں عورت کی زبان سے ادا کی گئی ہیں یہ گیت کی روایت ہے لیکن حالی کی نظم "مناجاتِ بیوہ" بھی تو عورت ہی کی زبان سے ادا ہوئی ہے، صرف اتنی سی بات پر نظم گیت نہیں کہی جا سکتی۔

عظمت اللہ کا نظریہ شعر رومانیت زدہ، غیر متوازن ذہن کا باغیانہ اعلان نامہ ہے۔ اس میں ذہانت کی معصومیت کبھی قابلِ برداشت ہے اور کبھی مضحک۔ برخلاف اس کے اُن کی نظمیں ایک مختصر، حسین، اجنبی اور جانی پہچانی دُنیا کی تخلیق کرتی ہیں۔ وہ دُنیا ہمارے حقیقت کے خوابوں کی طرح خوبصورت ہے۔ عظمت اللہ خاں کی عظمت میر، غالب اور اقبال کی طرح بھلے ہی نہ سہی مگر وہ اُس دُنیا کے خالق ہیں جو اُن کی اپنی ہے۔ اور بیسویں صدی کے اوائل کے متوسط طبقے کے پڑھے لکھے گھرانے کے نوجوانوں کی دُنیا ہے۔ اُن کے یہاں وہ خوبصورت جادو ہے جسے محبت کہتے ہیں۔ محبت وہ قوت ہے اپنے عہد اور وقت کے قیود میں رہ کر اُن سے آزاد بھی رہتی ہے۔ عظمت اللہ خاں اسی محبت کے شاعر ہیں۔ اردو کے تیسرے درجے کے اچھے شاعروں میں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ادب میں یہ سعادت بھی بزورِ بازو نہیں مل سکتی ہے۔

وطن کی زمین

ظہور رضوی

کس قدر دل رُبا کس قدر دل نشیں   میرے تخئیل کی اے بہشت بریں
چاندتاروں کی دنیا سے زیادہ حسیں   خم ہے تیرے لیے کہکشاں کی جبیں
تیرے ذرات ہیں آسماں آفریں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

تیرے دامن میں کرتی ہیں اٹھکیلیاں   پاک گنگا و جمنا کی رعنائیاں
گلشنوں میں بہاروں کی انگڑائیاں   حسن فطرت کی معصوم پرچھائیاں
دل کشی کون سی ہے جو تجھ میں نہیں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

تیری دل کش سحر، تیری رنگین شام   زندگی کے لیے اک مقدس پیام
وہ بہاروں کا گلشن میں طرز خرام   اک سرورِ مسلسل نشاطِ دوام
جیسے روئے زمیں پر بہشت بریں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

تیرے دریاؤں میں فیضِ قدرت رواں   تیرے پربت تری عظمتوں کے نشاں
لہلہاتی ہوئی یہ تری وادیاں   کلکِ فطرت کی رنگین گل کاریاں
کس قدر خوش نما اور کتنی حسیں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

نازپروردۂ حُسنِ فطرت ہے تو   کتنے رنگیں نظاروں کی جنت ہے تو
مختلف مذہبوں کی امانت ہے تو   اپنی کثرت میں بھی ایک وحدت ہے تو
تیری تہذیب ہے شان دار و حسیں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

تیرے دیوانے میداں میں آجائیں گے   متحد ہو کے دشمن پہ چھا جائیں گے
جان تک کی یہ بازی لگا جائیں گے   مسکراتے ہوئے سر کٹا جائیں گے
تیری عزت پہ حرف آئے ممکن نہیں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

(افسانہ)

بادشاہ

رضیہ سجاد ظہیر

اگر آپ کسی کالونی میں آٹھ سال سے رہ رہے ہوں، آپ کو یہ بھی خوش فہمی ہو کہ آپ کا مشاہدہ کافی تیز ہے، روز دن میں دو نہیں تو کم از کم ایک بار آپ بازار کا پھیرا کرتے ہوں، کبھی کبھی الیکشن یا کسی اور چکر میں آپ گھر گھر، دوکان دوکان گھومے بھی ہوں اور پھر بھی آپ کو کسی دن یہ پتہ چلے کہ اس کالونی کی سب سے دلچسپ شخصیت کو تو آپ نے اب تک دیکھا ہی نہیں تھا، تو جو آپ پر گزرے گی کچھ ویسی ہی مجھ پر بھی گزری جب بالکل اتفاق سے میری ملاقات ایک دن بابو لال سے ہو گئی۔

ملاقات بھی یوں تھوڑا ہی ہوئی کہ کسی نے تعارف کروایا۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ میرے گھر میں صرف دو عدد کرسیاں ہیں اور ان میں سے بھی ایک کا بید، یعنی کہ جسے اب پلاسٹک کہنا چاہیے، وہ ٹوٹ گئی تھی۔ بازار میں فرنیچر کی ایک ہی دوکان ہو تو اس کے مالک کا نخرہ معلوم۔ ایسے میں میں اپنی گلی میں کھلنے والے دروازے پر کھڑی دور سے جلوہ دکھاتے کسی سبزی والے کی منتظر تھی کہ بابو لال کو میں نے سائیکل پر سوار گزرتے دیکھا اور جیسے ہی مجھے اس کے کندھے پر لٹکے پلاسٹک کے لچھوں کی جھلک دکھائی دی، میں نے بیقرار ہو کر اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ اس نے فوراً سائیکل موڑی اور قبل اس کے کہ میں اس سے کچھ کہتی وہ یوں مجھ سے مخاطب ہوا جیسے نہ جانے کب سے مجھے جانتا تھا۔ "اجی، ج ج نجے ہند — تم آواز دے رہی ہو نہ؟"

"ہاں بھئی،" میں نے اس کی بے تکلفی پر ذرا کھسیا کے کہا، "آپ کرسی بُن دیں گے؟"

وہ فوراً ہی کھڑا سائیکل میری دو سیڑھیوں پر چڑھا کر اس زور سے اندر آیا کہ میں بوکھلا کے پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے سائیکل دیوار سے لگائی اور کندھے پر سے پلاسٹک کے لچھے اتارتے ہوئے فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور مجھے حکم دیتا ہوا بولا، "نکالو کرسی، اپ پ پہلے ہم دیکھیں گے!!"

میں نے ذرا ڈر کے پوچھا "مگر آپ کو آتا ہے نہ کرسی بننا؟ باریک بُننا ہے؟"

اس نے میری طرف بڑی حقارت سے دیکھا "یہ پ پ پوچھو ہمیں کیا نہیں آتا۔ ک ک کرسی ہم بنیں، بجلی ہم ب ب بنائیں، پانی کا ن ن نل ٹھیک کریں — اور تو، اس کا کیا نام، ک ک کھانا اچھے سے اچھا پ پ پکائیں — درزی کا کام..."

میں نے گھبرا کے فوراً کرسی باہر نکال دی "دیکھیے — یہ ہے کیا لیجیے گا اس کی بنوائی؟ ایسی ایک اور ہے۔"

اس نے ایک بار مجھے غور سے دیکھا، پھر کرسی کے معائنے میں لگ گیا۔ پھر دیکھ دیکھ کے بولا "ہوں۔"

"تو کیا ہو گی بنوائی؟"

اس نے اوزاروں کے تھیلے میں سے ایک چمٹا سی نکالی اور کرسی کو گھمایا، بولا، "جس کسی نے بھی ب ب بنی تھی، اچھی ب ب بنی تھی۔"

"مگر آپ کیا دام لیں گے؟" میں نے تیسری بار پوچھا۔

اس نے یوں مجھے دیکھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو میں کیا

کہہ رہی ہوں"۔ پ پ پیسے کو پوچھ رہی ہو ؟"

میں نے دھیرے سے کہا: "ہاں، کیا دام ہوں گے ؟"

وہ ہنسنے لگا "اجی، د دَدام کی فکرمت کرو۔ دام تو مَ مَ میں نے یہاں گلی بھر پہ چھوڑ رکھے ہیں۔ ک ک کبھی آیا، نہیں دیے، ج ج چلا گیا کہ جی پھر دے دینا۔"

اور بس وہ اتنا کہہ کر کرسی میں جٹ گیا۔

اس کی عمر کوئی چالیس پچاس کے بیچ ہوگی۔ خاکی رنگ کا بہت ہی میلا، گھٹنوں پر سے پھٹنے کی حد تک گھسا ہوا نیلون، جس کے آگے والے دو بٹن کھلے ہوئے تھے، ہرے رنگ کی قمیص، یعنی کہ جو کبھی ہرے رنگ کی رہی ہوگی جس کی پوری آستینیں کف میں بٹن نہ ہونے کی وجہ سے کہنی کے پاس سے جھول رہی تھیں، ننگے سر، سوکھا جسم، روکھے بال، جلے تانبے کا سا رنگ، بات کرنے میں تھوک کی چھینٹیں اڑاتا ہوا دہانہ، لمبی سی ناک، طنز سے بھری چھوٹی چھوٹی جھکتی ہوئی آنکھیں ——— سائیکل میں اوزاروں کا پھٹیچر تھیلا اور کئی عدد اور نہ جانے کیا الم غلم سی، سائیکل کے پاس جوتا، بے رنگ، مٹی سے بھرا، جس میں رنگ برنگے چمڑے کی چپیاں زیادہ تھیں اور اصل جوتا کم تھا۔

میں آنگن میں پڑے ایک پلنگ پر بیٹھ کر اس کو دیکھنے لگی، کچھ دیر بعد مجھ سے رہا نہیں گیا۔ آہستہ سے بولی: "آپ کون ہیں مستری جی ؟"

اس نے میری طرف دیکھا نہیں، ہنستے ہوئے جواب دیا "ک ک کون کیا ؟ آدمی ہیں، م مستری ہیں۔ ک ک کام کرتے ہیں"

پھر ایک دم ہنس پڑا "اچھا ——— م م میں سمجھا ——— میرا نام ہے بابولال ——— بابولال کے معنی سمجھتی ہو ؟ ب ب بابو کا بیٹا۔ تم کو جی نہ تو کیا تھا ——— م م مسلمان ہوتا تو سلام کرتا، ہ ہ ہندو ہوتا تو نمسکار ——— م م میں نے کہا دونوں کو گ گ گولی مارو، جے ہند سب سے اچھا..."

میں بے انتہا شرمندہ ہوتے ہوئے بولی: "یہ تو بہت عمدہ بات ہے ——— اچھا کتنا کما لیتے ہیں آپ ؟" "ب ب بہت، دینے والے نے م م مجھے اتنا دیا ہے کہ س س سمجھ میں نہیں آتا رکھوں کہاں ؟"

میں دنگ رہ گئی ——— یہ پھٹیچر کپڑے، یہ کٹے پھٹے، کھردرے ہاتھ پاؤں، یہ ستر جوڑ بہتر پیوند کا جوتا، یہ کھڑ کھڑا سائیکل اور اس پر اوزار کا چھوٹا تھیلا ——— اور یہ استغنا!

"تو پھر آپ ڈھنگ کے کپڑے کیوں نہیں پہنتے بابولال" میں نے کہا۔

"اجی، ب ب بات یہ ہے کہ امیروں میں کام کرتا ہوں نہ، ان کے ہاں اچھا کپڑا پ پ پہن کے جاؤ تو ج ج جلتے ہیں"

میں ایک دم ہنس پڑی "تو جلا یئے"

اس نے میری طرف حیران ہو کر دیکھا اور پھر زبان کی نوک نکال کے بولا "نہ... نہ نہ نہیں، ہم ک ک کسی کو نہیں جلاتے"

میرے شوہر پاس ہی دیوار میں لگے تسلے کے سامنے کھڑے شیو بنا رہے تھے، دھیرے سے بولے "یہ تو کوئی پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں"

جب کام ختم ہو گیا تو میں دو کرسیوں کی بنوائی ساڑھے دس روپے اس کو دینے لگی۔ وہ بولا "اٹھنی ب ب بیبی کیوں دے رہی ہو ؟"

"تو کیا ہوا رکھ لیجیے" ——— میں نے کہا۔

"ن ن نہیں ——— ہم خ خ خیرات نہیں لیتے، محنت کے ل ل لیتے ہیں" اور یہ کہہ کر اس نے اٹھنی کو یوں چٹکی سے پکڑا جیسے وہ کوئی بہت ہی گندی چیز تھی اور میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔

میں اپنا سا منھ لے کے رہ گئی!

سائیکل باہر نکالتے وقت وہ بڑبڑایا "ت ت تمھارے کام میں اس کے ق ق قیمہ کو دیر ہو گئی، ب ب بیٹھی ہو گی انتظار میں..."

"کون؟ آپ کی بیوی ؟"

"ن ن نہیں جی، وہ میری ب ب بلی ——— روز اس کے لیے ق ق قیمہ لاتا ہوں نہ، وہ یہی ک ک کھاتی ہے..... ن ن نہیں لاتا تو خ خ خفا ہو جاتی ہے"

جب وہ روانہ ہونے لگا تو میں نے کہا "بابولال ——— آپ کہاں ملتے ہیں، کبھی کوئی کام ہو تو"

"اجی، وہ س س سبزی والا سردار ہے نہ، وہیں میری دوکان بھی ہے.... ج ج جے ہند" ——— اور وہ فوراً سائیکل پر بیٹھ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ واضح رہے کہ اس پوری گفتگو میں وہ مجھے برابر 'تم' کہتا رہا، میں اسے آپ کہتی رہی۔

دو تین دن بعد ایک روز شام کو میں بازار گئی تو سب سے پہلے سبزی والے سردار کی دوکان پر گئی اور میں نے دیکھا کہ اس سے دو ہی چار قدم دور، ایک ٹاٹ زمین پر بچھا ہے اور اس پر کچھ عجیب و غریب چیزیں ملی جلی رکھی ہیں۔ مثلاً بچوں کے رنگ برنگے پلاسٹک کے کھلونے، کیلیں اور پیچ، تالے کنجیاں، بے حد خراب چھپی ہوئی جنتریاں، گھٹیا قسم کا خضاب، سائیکل کی پرانی گدیاں، جوڑن کی پٹریاں، ربر کی مٹی مٹی چپلیں، چاندی یا کسی گھٹی دھات کی انگوٹھی چھلے ـــــ اور پتہ نہیں کیا کیا الم غلم ـــــ منظر یہ تھا کہ ایک تو بابو لال کھڑا تھا، دوسرے ایک خوبصورت سی مگر غریب سی نوجوان ماں کھڑی تھی اور تیسرا ایک سال بھر کا ننھا سا بچہ تھا جو اپنی ماں کی کمر پر لٹک رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا رنگین پلاسٹک کا جھنجھنا تھا۔ ماں اس سے وہ جھنجھنا لینے کی کوشش کر رہی تھی اور بابو لال ماں کو لیکچر دے رہے تھے "اجی، ت ت تمھارا بچہ مجھے پ پ پیارا لگ رہا ہے تو تو م میں دے رہا ہوں۔"

ماں نے کہا "مگر بھیا، میں اتنا مہنگا تو نہیں لے سکتی۔"

بابو لال خفا ہو کے بولے "تو د دام تم سے کون مانگ رہا ہے ـــــ د د دام س س سرے کا کیا ہے، دینے والے نے م م مجھے اتنا دیا ہے، اس س سمجھ میں نہیں آتا۔ رکھوں کہاں۔"

میں نے آگے بڑھ کر دھیرے سے کہا "بابو لال جی، کل ذرا آجائیے گا، کچھ بجلی کی چیزیں بنا دیجیے گا" ـــــ میری بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک سفید سیاہ چتیوں والی بلی پیڑ کی آڑ سے نکل آئی۔ وہ میری بات سننے کے بجائے بلی کی طرف مخاطب ہو گیا "ک ک کل میں ان کے ہاں جاؤں گا، س س سامان ٹھیک کرنے ـــــ ب ر ر دیکھو مت" ـــــ پھر مجھے حکم دیتا ہوا بولا "ن ن نکال رکھنا سامان ـــــ کبھی ب ب بار ایک بجوا دو ـــــ ب ب پھر میری بلی کے ق ق قیمے کو دیر ہو جائے گی۔"

اگلے دن وہ صبح آٹھ ہی بجے آ گیا۔ میں نے کئی ایک بگڑی ہوئی چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں ـــــ گیارہ بجتے بجتے اس نے سب بنا دیں اور پیسے لے کر اٹھ ہی رہا تھا کہ میرے شوہر آ گئے اور بولے "ارے بھئی مستری جی آپ کا بہت شکریہ جو آپ نے یہ سب کام کر دیا مگر یہ بھی تو بتائیے کہ یہ سب چلیں گی کتنے دن، بگاڑ تو نہیں کیا ہے؟"

وہ بڑے طنز سے مسکرایا "اجی، گ گ گارنٹی تو رب نے آدمی کی ہی نہیں دی کہ ک ک کتنے دن چلے گا ـــــ ج ج جے ہند۔"

اس فلسفیانہ تاویل پر ہم دونوں میاں بیوی لا جواب ہو کر رہ گئے!

پھر تو یہ ہونے لگا کہ میں بازار میں آتے جاتے اس کی دکان پر ضرور حاضری دیتی ہوں مگر وہ اکثر وہاں نہیں ملتا ـــــ دوکان کھلی ہوئی ہے، ایک بلی بیٹھی اونگھ رہی ہے، دو تین کتے کے پلے، کوئی ٹہل رہا ہے، کوئی بچوں پر تھوتھنی جمائے سو رہا ہے۔ ایک دن وہ مجھے مل گیا تو میں نے کہا "بابو لال جی، آپ کوئی خاص وقت طے کر لیجیے اس وقت دوکان پر بیٹھا کیجیے، ہم آتے ہیں، چلے جاتے ہیں، کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس وقت آپ ملیں گے۔"

وہ برا مان گیا "اجی واہ، وہ ہم کیا کوئی سرکاری نوکر ہیں جو ٹ ٹائم پر ڈیوٹی دیں، ہم بادشاہ ہیں، ب ب بادشاہ ـــــ ج ج جی میں آیا آئے، ن ن نہیں آیا نہیں آئے۔"

اب آپ ہی کہیے میں اس بات کا کیا جواب دے سکتی تھی!

ایک دن وہ میرے یہاں پانی کا نل ٹھیک کرنے آیا تو یوں ہی اس سے پوچھا "بابو لال آپ کیا ہمیشہ سے ہکلاتے ہیں یعنی کہ کیا بچپن سے آپ....."

وہ نل کھول کر اس میں نیا واشر لگا رہا تھا، بولا "ک ک کام کر لوں تو بتاؤں" ـــــ اس نے واشر کو اپنی جگہ پر بٹھا کر اس پر ٹونٹی رکھی، اسے کسا اور پھر بولا "اب دیکھو" اور یہ کہہ کر اس نے دھیرے سے نل کھولا، پانی کی دھار بالکل برابر سے گرنے لگی ـــــ اور پھر اس نے نل کو خوب کھول دیا ـــــ پانی کی دھار زور زور سے گرنے لگی، وہ خود بھی بھیگ گیا، مجھ پر بھی چھینٹے پڑے اور غسل خانے کے فرش پر تو خیر بالکل ہی سیلاب آ گیا۔

"لو بو لو" ـــــ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

میں اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کچھ نہیں سمجھی، ہنسا اور اپنے سر کو ایک انگلی سے ٹھونکتا ہوا بولا "ج ج جن لوگوں کے یہاں کنارہ ہتا ہے، وہ دھیرے دھیرے بولتے ہیں...... اور جو د دماغ کھلا ہو تو...."

میں نے سر ہلا کے کہا "میں سمجھ گئی مستری جی آپ کا دماغ زیادہ تیز دوڑتا ہے، زبان اتنی تیز نہیں دوڑ سکتی، بس ٹھوکر کھا جاتی ہے ـــــ ہے نہ"؟

(بقیہ صفحہ ۳۴ پر)

ارتقا کا سفر

حرمت الاکرام

فسانہ منزلِ دشوار کا نہ دہراؤ!
لگا کے جان کی بازی قدم بڑھائے ہیں
یہ راہ کتنی ہی پُر خار ہے تو غم کیا؟
کہ ہم تو شعلوں پہ چل کر یہاں تک آئے ہیں
عظیم راہرو ! ہے یہ ارتقا کا سفر
فراز وقت پہ سورج کی طرح بڑھنا ہے
دلوں کی زخم نصیبی بجا سہی لیکن
غبارِ راہ کو مرہم سمجھ کے بڑھنا ہے
نئی فضائیں، نئی زندگی نیا ماحول
یہ اہتمام ضروری ہے دورِ نو کے لیے
نچوڑ لی ہے ضیا ماہتاب و انجم کی
اک ایک شمع کی افسوں طرازِ نو کے لیے
یہ کہہ رہی ہیں زمانے کی منچلی نظریں
حقیقتوں کو نئی زندگی عطا کر دو
تقاضا ہے سحرِ تازہ کی شعاعوں کا
ہمارے جلووں کو پابندگی عطا کر دو
سرشتِ فتنہ گری ہے تغیر آمادہ
سرابِ سے کہتے ہیں ہم پھول بن کے مہکیں گے
یہ کہہ رہے ہیں اندھیرے کہ رات کے آثار
تجلیوں کا نیا رنگ پا کے مہکیں گے
تڑپ رہی ہیں امنگوں کی بجلیاں دل میں
ستارے ناچ رہے ہیں دہکتے ہاتھوں پر
عزائم اپنی بلندی پہ ناز فرما ہیں
حیات کرتی ہے بیعت ہمارے ہاتھوں پر
غمِ حیات کے مارے ہو! دوستو! نہ گھبراؤ
بھٹکنے والوں کو ہم مستقل خوشی دیں گے
اٹھو ادا ٹھ کے کرو صبحِ نو کا استقبال
ہم آفتاب ہیں دنیا کو روشنی دیں گے

رباعیات

شوکت پردیسی

(۱)

صد احتیاطِ حیا سے قدم اٹھائے ہوئے
چہرے کو نقابِ عارض سے چھپائے ہوئے
اپنی نظر سے بچ کے یہ گزرا ہے کون
ہر اک کی نگاہ میں مگر سمائے ہوئے

(۲)

اڑتا ہوا بادل کہیں ہاتھ آیا ہے
چھوٹا ہوا آنچل کہیں ہاتھ آیا ہے
بکھری ہوئی خوشبو کبھی سمٹی ہے کہیں؟
گزرا ہوا اک پل کہیں ہاتھ آیا ہے

(۳)

جینے کی کوئی آس نہیں ہو جیسے
یا شعلۂ انفاس نہیں ہو جیسے
یوں دردِ محبت سے ہے اب دل خالی
انسان کو احساس نہیں ہو جیسے

(۴)

ہم تم تو محبت کے پرستار رہے
حالات کی گردش سے بھی دوچار رہے
اب وقت سے اتنا بھی نہ جھگڑن ہو گا
دو دل جو ہم ساتھ رہیں پیار رہے

(۵)

کب خوگرِ بیداد رہا کس سے کہوں
کیوں مائلِ فریاد رہا کس سے کہوں
جب تم کو بھی کچھ ہوش نہیں ہے میرا
میں شاد کہ ناشاد رہا کس سے کہوں

(۶)

ہم تیرے تغافل کا گلہ کیا کرتے
کس طرح محبت کا تقاضا کرتے
جب بیچ میں تھی وقت کی دیوار کھڑی
کرتے بھی تو کیا شرحِ تمنا کرتے

(۷)

دھرا کی کوئی تان ہے یا انگڑائی
کونپل کی یہ مسکان ہے یا انگڑائی
یہ سر سے اچانک ترے گرتا آنچل
اٹھتا ہوا طوفان ہے یا انگڑائی

یحییٰ اعظمی — ایک تاثر

ضیاء الدین اصلاحی

جناب یحییٰ اعظمی کا ۲۲ فروری ۱۹۷۶ء کو مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ بڑے پختہ مشق اور خوش فکر شاعر اور پکے قوم پرور اور محب وطن مسلمان تھے۔ ان کی عمر ساٹھ اور ستر کے بیچ میں تھی۔ ابتداءً وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکول میں معلم تھے۔ یہ ترکِ موالات کی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا، جب ترکی کے واقعات نے مسلمانانِ ہند میں بڑی شورش و ہیجان برپا کر دیا تھا اور مجلس خلافت کی شاخیں پورے ملک میں آناً فاناً قائم ہوگئی تھیں اور خلافت و کانگریس کے مشترکہ پلیٹ فارم نے ہندستان کے ہر ہر گوشے میں برطانوی استبداد و آمریت کے خلاف منافرت اور بغاوت کے جذبات بیدار کرکے اتحاد و یک جہتی اور آزادی و حریت کی لہر دوڑادی تھی۔ یحییٰ اعظمی کے دل میں بھی قوم و وطن کا درد تھا۔ انھوں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کی معلمی کی نیم سرکاری ملازمت ترک کرکے ۱۹۲۵ء کے اوائل میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کے دفتر میں ملازمت کرلی۔

دارالمصنفین ایک خالص علمی و تحقیقی ادارہ ہے۔ اس کو ملک و قوم کے عام عملی کاروبار اور ہنگامہ آرائی جد و جہد سے زیادہ سروکار نہیں لیکن ایسے نازک اور پر آشوب دور میں قوم و وطن کی آزادی و اتحاد کی تحریک سے الگ تھلگ رہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ دارالمصنفین کے بانی و موسس علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی طرح ان کے لائق جانشینوں نے بھی ملک کی آزادی و اتحاد کی تحریک کا ساتھ دیا اور اس کے اس زمانے کے کارپردازوں، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی نے جنگ آزادی کے رہنماؤں اور قائدین کے دوش بدوش اس میں بڑھ چڑھ کر نمایاں حصہ لیا۔

دارالمصنفین کا یہ علمی و ادبی اور نیم سیاسی ماحول یحییٰ اعظمی کے مزاج کے مطابق تھا۔ اس میں ان کو اپنے ذوق کی تسکین اور ذہن کے سکون کا پورا سامان ملا اس لیے وہ اس سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ اب موت ہی ان کی وابستگی اور تعلق کا خاتمہ کرسکی ہے۔

یہیں ان کی مولانا شبلی کے ممتاز شاگرد مولانا اقبال سہیل سے ان کی ملاقات ہوئی جو شعر و ادب کے امام، علم و فن میں یکتا، ذہانت و طباعی کا حیرت انگیز نمونہ اور قدرت کے انعامات اور بخششوں کا عجوبہ تھے۔ ان کی صحبت اور دارالمصنفین کے علم و ادب پرور ماحول میں رہ کر یحییٰ اعظمی کی شاعری کی دبی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔

یحییٰ اعظمی کی تعلیم اگرچہ ایسی کچھ زیادہ نہ تھی مگر ان میں شعر و سخن کا ملکہ فطری اور خداداد تھا۔ علاوہ ازیں یحییٰ صاحب کو دو ناموران فن اور اصحاب کمال سے نسبت کا شرف بھی حاصل ہے یعنی علامہ شبلی اور مولانا سہیل سے۔ اول الذکر سے اگرچہ ان کو براہِ راست استفادہ کا موقع نہیں ملا، مگر موخر الذکر سے جن کے حصے میں شبلی کی شعری و ادبی وراثت زیادہ آئی تھی، خاص تعلق تھا اور وہ ان کو فخر سے "فرزند معنوی" کہتے تھے۔ سہیل کی صحبت نے ان کی فطری صلاحیتوں میں نہ صرف جلا پیدا کی بلکہ ان میں شعر و سخن کا ایسا پختہ اور رچا ہوا ذوق پیدا کر دیا کہ ان کے اور سہیل کے کلام میں

فرق و امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔

یحییٰ اعظمی نے خیالات اور طرز ادا دونوں میں شبلی اور سہیل کا تتبع کیا خصوصاً موخر الذکر کا رنگ سخن تو انھوں نے پوری طرح اپنا لیا تھا۔ چنانچہ اقبال سہیل ان کے پہلے مجموعۂ کلام نوائے حیات کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ مجموعہ جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہے تمام تر ان ہی کا نتیجۂ فکر ہے۔ مگر یہ ان کے تتبع کا کمال ہے کہ بعض سے ان کی نظموں پر اہل نظر کو بھی استاذ کے نقش قلم کا دھوکہ ہوتا ہے..... کچھ تو ان کی فطری استعداد اور کچھ مذہبی و سیاسی رجحانات اور ادبی ذوق میں استاذ کے ساتھ ہم آہنگی، ان کی فنی ترقی میں بہت مساعد ہوئی اور اب تو یہ عالم ہے کہ ان کی تراوش قلم کو میری ذہنی مخلوقات سے ممتاز کرنا بڑے بڑے مبصرین کے لیے بھی دشوار ہے۔"

یحییٰ اعظمی نے خود بھی نہایت فراخ دلی اور جذبہ احسان مندی کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ

"ارباب نظر واقف ہیں کہ میرا ذوق و وجدان شبلی و سہیل سے متاثر ہے اور موخر الذکر اور اس ناچیز کے درمیان تو آفتاب و ذرہ کا ربط رہا ہے اور بلا تامل عرض ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب اسی آفتاب دانش کی ضیا بخشی کا نتیجہ ہے ؎

شعاع فیض کی ہیں یہ نوازشیں ورنہ
کہاں یہ ذرہ، کہاں مہر ضوفشان سہیل"

یہ تو استاد و شاگرد کے اپنے بیانات ہیں اس سلسلے میں بعض اور مبصرین اور اہل نظر کے آرا نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ مولانا سید سلیمان فرماتے ہیں:

"شاعر کے کلام پر نمایاں اثر شبلی اور شبلی کے خوش گو شاگرد حضرت سہیل کا ہے۔ وہی اردو میں فارسی ترکیبوں کا ذخار، وہی جذبات کا جوش و خروش اور ہر نظم میں مذہب و سیاست کا رجز، الفاظ کا شکوہ، جذبات کا جوش اور حق و صداقت کا جز اس کے کلام کے خصوصیات ہیں۔"

سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم رقم طراز ہیں:

"مجھ کو طالب علمی کے زمانے میں سہیل کی رفاقت نصیب ہوئی۔ ان کی قدرت کلام نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ اس قدرت کلام کی جھلک مجھے یحییٰ صاحب کے کلام میں دکھائی دیتی ہے جنھیں سہیل سے گہرا تعلق تھا۔ مجھے تو ان کی بعض نظموں کو پڑھتے ہوئے ایسا گمان ہوتا ہے کہ سہیل کی نظم پڑھ رہا ہوں۔"

وہ شبلی و سہیل کے رنگ سخن کے بھرپور نمائندہ تھے اور ان پر اس انداز کلام کا خاتمہ ہو گیا ؏ افسوس کہ از قبیلۂ مجنوں کسے نہ ماند۔

اقبال سہیل کی طرح یحییٰ اعظمی کو بھی نظم سے زیادہ اور حقیقی مناسبت تھی لیکن ان کا گلستان شاعری تغزل کے زمزمہ سے خالی نہیں ہے۔ ان کی غزلوں میں کیف و حلاوت، سوز و اثر، لطافت و پاکیزگی، قلبی واردات و تاثرات، خیالات کی رنگینی و مستی اور طرز ادا کی رعنائی و دلکشی موجود ہے۔ مگر ان کا اصل سرمایہ فخر و کمال نظمیں ہیں۔ ان میں مختلف قومی و ملی اور سیاسی مسائل و امور پر پرشکوہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے اور یہ مذہبی روح، قومی غیرت، ملی حمیت، سیاسی رجز، حب الوطنی، سبق آموزی اور درس اخلاق وغیرہ سے معمور اور شاعرانہ محاسن، مشق و مہارت کی پختگی، قوت تخیل کی رفعت و نزاکت، انداز بیان کی حلاوت و دلآویزی، احساسات کی شدت، مشاہدات کی گہرائی اور اقبال سہیل کی طرح زبان و بیان پر غیر معمولی استادانہ قدرت کا نمونہ ہیں۔

یحییٰ اعظمی نے قوم و ملت اور ملک و وطن کی مقدس و مایہ ناز ہستیوں کے شاندار اور پرشکوہ کارنامے اور گزشتہ زریں تاریخ کے عظیم الشان اور پرعظمت واقعات بیان کر کے قوم و وطن میں بیداری کی نئی روح پھونکی ہے۔ ان کے ابتدائی دور کا کلام در اصل قومی رجحانات و میلانات کا عکس اور سیاسی حقائق و کوائف اور مجاہدین آزادی کے کارناموں اور خدمتوں کا مرقع ہے۔ ان کی نظموں میں ہم عصر مشاہیر علم و فن اور قوم و وطن کے اکابر کے اوصاف و کمالات بھی جوش و ولولہ کے ساتھ

بیان کیے گیے ہیں۔ انھوں نے مرحومین کے پر درد نوحے اور دل دوز مرثیے بھی کہے ہیں جو شدتِ تاثر، جوشِ غم اور جذبۂ عقیدت سے معمور ہونے کے علاوہ شاعر کی علم وادب شناسی اور قوم و وطن پروری کا ثبوت اور موجودہ نسل کے لیے درسِ عبرت اور پیام موعظت ہیں۔ آزادی کے بعد کی نظموں میں انھوں نے خاص طور پر ہندستان کی برق رفتار ترقی، اس کے درخشاں مستقبل اور عظیم الشان تعمیری و فلاحی منصوبوں کا ذکر کیا ہے۔

یحییٰ اعظمی ہمیشہ سے قوم و وطن پرور رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان کی آزادی سے پہلے بھی وہ آزادی و اتحاد کی تحریک کے اتنے ہی پرجوش حامی تھے جتنے خود غرض، مفاد پسند اور فرقہ پرست عناصر کے مخالف تھے۔ اس زمانے میں ان کا قلم ملک کی مظلومی و غلامی پر نوحے لکھتا اور ان سرفروشانِ وطن کو ہدیہ تبریک اور نذرِ خلوص پیش کرتا رہا جو غیر ملکی سامراج کے خلاف صف آرا اور سرگرم عمل تھے۔ اور جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو ان کا دل مسرت و شادمانی سے معمور ہو گیا اور وہ دل و جان سے قوم و وطن کی تعمیر و ترقی کے آرزو مند بن گیے۔ اس زمانے میں ان کی شاعری کا مطمح نظر ان قومی رہنماؤں کو تہنیت و عقیدت پیش کرنا اور ان کے ہاتھ مضبوط کرنا بن گیا جو ملک میں جمہوریت، سیکولرزم، مساوات، سوشلزم اور عدل و انصاف کو فروغ دے کر بھید بھاؤ، اونچ نیچ، امیری و غریبی کا فرق، ذات پات کا بندھن اور فرقہ وارانہ آویزش کی لعنت مٹانا اور سماجی و معاشی ناہمواری اور ناانصافی و بدعنوانی کا انسداد کرنا اور پورے ملک کو اتحاد و یکجہتی اور میل ملاپ کا گہوارہ بنانا چاہتے تھے۔

علم و ادب اور سیاست کے جن مشاہیر سے ان کو غیر معمولی عقیدت و محبت تھی اور جن کے علمی و ادبی کمالات اور قومی و ملی اور سیاسی خدمات کا انھوں نے شاندار اور پر اثر انداز میں ذکر کیا ہے ان میں علامہ شبلی و سہیل کے علاوہ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، لال بہادر شاستری، اور شریمتی اندرا گاندھی کے نام خاص طور سے لائق ذکر ہیں۔ ان لوگوں کے معاملے میں ان کے جذبات نہایت نازک تھے اور وہ ان کے خلاف کوئی بات پسند نہیں کرتے تھے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے یحییٰ اعظمی کے کلام کی بڑی تحسین کی ہے، جو ان کے لیے بڑی سند ہے۔ مولانا ابوالکلام نے قومی و وطنی شاعری کے صلہ میں ان کے لیے حکومتِ ہند سے سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کرا دیا تھا جو تاحیات ان کو ملتا رہا۔

شریمتی گاندھی کی عظمت کا نقش بھی ان کے دل پر ثبت تھا۔ وہ اپنی کم آمیزی کی بنا پر جلسے جلوس میں شرکت کرنے کے بالکل عادی نہیں تھے۔ مگر یہ اندرا گاندھی کی شخصیت کی کشش اور جادو تھا کہ وہ جب جب اعظم گڑھ آئیں تو یہ ان کے جلسوں میں ضرور بڑے شوق اور پابندی سے گئے۔ ایک دفعہ اعظم گڑھ میں ان کی آمد کے موقع پر انھیں دار المصنفین میں مدعو کیا گیا جس کو اندرا جی نے شدید مصروفیت کے باوجود غالباً اس تعلق کی بنا پر جو ان کے والد اور دادا کو دار المصنفین اور اس کے قدیم کارکنوں سے رہا ہے خوشی سے منظور کر لیا۔ یحییٰ اعظمی نے اس موقع پر ایک نظم کہہ کر ان کا خیر مقدم کیا۔

شریمتی گاندھی نے گزشتہ چند سالوں کے اندر جو عظیم الشان اقدامات، حیرت انگیز انقلابی فیصلے کیے ہیں اور جرأت مندانہ و ترقی پسندانہ کارنامے انجام دیے ہیں ان کے یحییٰ اعظمی بڑے معترف اور مداح تھے۔ حال میں بنگلہ دیش کی آزادی اور وہاں کے مظلوموں کی ہمدردی میں ملک نے اندرا جی کی قیادت میں جو رول ادا کیا ہے اس سے بھی وہ بہت متاثر تھے۔ چنانچہ اس موقع پر انھوں نے انھیں تبریک و عقیدت کی ارمغان پیش کی۔ یہی ان کی آخری نظم تھی جو "فتح عظیم" کے عنوان سے انھوں نے لکھی تھی۔

ان کا کلام معارف اعظم گڑھ، آج کل دہلی، نیا دور لکھنؤ، اور قومی آواز لکھنؤ میں برابر چھپتا تھا اور دو مجموعے بھی نوائے حیات اور نوائے عصر کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ اس مضمون میں ان کی شاعری پر مفصل تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ آئندہ کبھی اس کے مختلف پہلوؤں اور قومی و سیاسی رجحانات اور حب الوطنی کے

نقوش اُجاگر کیے جائیں گے۔ وہ فرقِ مراتب کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ ان کی نقلیں افراط و تفریط اور بے احتیاطی سے پاک ہیں۔

یحییٰ اعظمی بڑے لطافت پسند تھے۔ سادگی کے باوجود ان کی زندگی میں خوش سلیقگی اور تناسب تھا۔ ان کے مکان اور دفتر کے کمرے بہت صاف ستھرے رہتے تھے اور ان کی ہر چیز بڑے قرینے اور سلیقے سے رکھی ہوئی ہوتی تھی اور میز کی تمام چیزیں بہت مرتب رہتی تھیں۔ لباس موٹے جھوٹے کھدر کا نہایت صاف ستھرا پہنتے تھے۔

وہ طبعاً کم آمیز، خاموش اور عزلت پسند تھے۔ ان میں نام و نمود کی ہوس اور تکلف و تصنع کا شائبہ نہیں تھا۔ ناموری اور شہرت طلبی کے مواقع سے ہمیشہ دور رہتے، مشاعرے اور جلسے تو درکنار نجی محفلوں اور مخصوص ادبی و شعری نشستوں میں بھی شریک ہونے سے احتراز کرتے تھے۔ لوگوں سے ملنے ملانے میں ان کو بڑا تکلف اور سخت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ مگر یہ ان کے افتادِ طبع کا نتیجہ تھا ورنہ مزاج میں ترفع کی بجائے خاکساری اور فروتنی تھی۔ اس لیے جب کسی سے ملتے تو انکسار اور خندہ پیشانی سے ملتے اور چھوٹوں سے بھی شفقت و مروت سے پیش آتے۔

شرم و حیا اور پاکبازی میں بے مثال تھے۔ اپنے بے تکلف دوستوں کے سامنے بھی ان کی جھجک قائم رہتی اور کوئی بات سنجیدگی و متانت کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ امانت و دیانت، فرض شناسی اور اوقات کی پابندی کا خاص خیال رکھتے تھے اور اپنے متعلقہ فرائض بڑی ذمے داری اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ دارالمصنفین میں ہزاروں روپے کے کاروبار کا حساب کتاب تنہا ان ہی کے ذمے تھا۔ لیکن اس میں کبھی ایک حبّہ کا فرق نہیں ہوتا تھا۔

استقامت و استقلال کا یہ حال تھا کہ تحریک خلافت اور نان کو آپریشن کے زمانے میں انھوں نے جو عقیدہ اور سیاسی مسلک اختیار کر لیا تھا، اس پر ہمیشہ استوار اور قائم رہے، اور بڑے سے بڑا طوفان بھی ان کے قدم کو متزلزل نہیں کر سکا۔ زندگی کے دوسرے اشغال و معمولات میں بھی ان کی وضعداری، رکھ رکھاؤ اور استقامت کا یہی حال تھا۔

یہ حسن اتفاق ہے کہ مولانا ابوالکلام کے مداح و عقیدت کیش نے بھی اسی تاریخ کو اس جہانِ فانی کو الوداع کہا جس تاریخ کو چودہ سال پہلے خود مولانا نے الوداع کہا تھا۔

★

تصحیح

نیا دور کے جنوری۔ فروری سنہ ۷۲ء کے مشترکہ شمارے میں ایک تصویر شائع ہوئی ہے جو گزشتہ سال کی ہند پاک جنگ کے دوران "جن جاگرن" پروگرام سے متعلق ہے۔ جن جاگرن کا یہ پروگرام سچنا دبھاگ اتر پردیش کے زیر اہتمام سوچنا کیندر حضرت گنج لکھنؤ سے روزانہ شام کو نشر ہوا کرتا تھا۔ غلطی سے تصویر کی سرخی میں اس پروگرام کے ہندی۔ اردو ونگ کے زیر اہتمام ہونا لکھ گیا ہے جس کا افسوس ہے۔

—— ایڈیٹر



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲۲ اپریل ۱۹۸۲ء کو بڑہل گنج (گورکھپور) میں ایک بڑے جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے



بہار کے وزیر اعلیٰ شری کیدار پانڈے ۲۶ اپریل ۱۹۸۲ء کو وزیر اعلیٰ اترپردیش شری کملاپتی ترپاٹھی سے ان کے دفتر میں بات چیت کرتے ہوئے



اتر پردیش سنگیت ناٹیہ اکادمی کی جانب سے ۱۵ فنکاروں کو انعامات دینے کی ایک تقریب رویندرالیہ
لکھنؤ میں ۲۸ مارچ ۷۸ء کو منعقد ہوئی۔ تصویر میں گورنر ڈاکٹر چی گوپال ریڈی ہندی کے ممتاز ادیب
شری امرت لال ناگر کو انعام دیتے ہوئے



شری کے۔ سی۔ پنت وزیر ریاست
برائے امور خارجہ حکومت ہند نے
حال ہی میں ہنی کو اے بندرگاہ
کا افتتاح کیا۔ تصویر میں شری پنت
اس موقع پر ہونے والی دستکاریوں
کی نمائش دیکھ رہے ہیں



وزیر اعلیٰ کملاپتی ترپاٹھی یوپی پولیس کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل کے سالانہ جلسے کو لکھنؤ میں ۲۵ مارچ ۷۲ء کو خطاب کرتے ہوئے۔ نائب وزیر داخلہ شری رام کرشن دویدی بھی وزیر اعلیٰ کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ہیں



وزیر آبپاشی اتر پردیش شری رام لکھن کوری ضلع باندہ میں چیلی نل کلی پمپ نہر کا ۱۲ اپریل کو سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے



اس سال میونخ میں ہونے والے اولمپک ہاکی میچ کے لیے ہندستانی ٹیم کے کھلاڑیوں کے انتخاب کے واسطے اپریل میں لکھنؤ میں ہاکی کے ممتاز کھلاڑی اور سابق کپتان شری دگوجے سنگھ (بابو) کی نگرانی میں ایک ماہ کا تربیتی کیمپ منعقد ہوا۔ تصویر میں (بائیں) کیمپ میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں کا گورنر ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی سے تعارف اور (دائیں) شری بابو ہاکی استعمال کرنے کا صحیح طریقہ بتا رہے ہیں

مرکزی وزیر شری فخرالدین علی احمد لکھنؤ میں سیلون اور ہندستان کے درمیان ہونے والے ڈیوس کپ لان ٹینس کا دوسرے دن (۳ اپریل ۷۲ء) کا میچ دیکھ رہے ہیں۔ ہندستان کے شری جے دیپ مکرجی اور شری پریم جیت لال نے میچ جیتا



مشرقی اتر پردیش کی ترقی میں ایک اور اہم کڑی

دوہری گھاٹ کا پُل

وارانسی۔ گورکھ پور قومی شاہ راہ نمبر ۲۹ پر دوہری گھاٹ کے قریب نو تعمیر گھاگھرا کا پل، جس کا افتتاح وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۲۲ر اپریل ۱۹۷۶ء کو کیا، گورکھ پور، دیوریا اور بستی کے ضلعوں کو اعظم گڑھ، غازی پور، سلطان پور، وارانسی اور جون پور ضلعوں سے براہ راست ملاتا ہے۔ یہ پل پردیش کے اس پس ماندہ علاقے کی معاشی ترقی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہوگا۔ دریائے گھاگھرا نے اب تک مشرقی اتر پردیش کے سب سے گھنی آبادی کے اس وسیع علاقے کو تقریباً دو حصّوں میں بانٹ رکھا تھا۔ ان دونوں حصّوں کو جوڑنے کی پہلی کڑی تھی فیض آباد کے قریب پکے پل کی تعمیر اور دوسری اہم کڑی ہے یہ دوہری گھاٹ کا پل۔

گھاگھرا کا پل ہر موسم میں آمد و رفت اور بار برداری کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرکے صنعت، تجارت اور زراعت کو فروغ کی نئی سمت اور نئی رفتار عطا کرے گا۔

اب مشرقی اتر پردیش کے یہ ضلعے بہار، مغربی بنگال اور نیپال سے براہ راست رابطہ قائم کرکے اپنی ضرورتیں پوری کر سکیں گے اور اپنی مصنوعات اور پیداوار دور دراز کی منڈیوں تک لے جا سکیں گے۔

اس پل کی عدم موجودگی میں اب تک پیپے کے پل کے ذریعہ دریائے گھاگھرا کو پار کیا جاتا تھا۔ برسات کے موسم میں تقریباً چھ مہینے تک پیپے کا پل ہٹا دیا جاتا تھا اور اس زمانے میں اس بڑے دریا کو صرف کشتیوں کے ذریعہ پار کیا جا سکتا تھا۔ یہ انتظام بے انتہا پریشان کن اور ساتھ ہی گراں خرچ تھا۔ اس میں وقت بھی زیادہ لگتا تھا۔ گھاگھرا پل کے بن جانے سے یہ دشواری ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی ہے۔ اس پل پر آمد و رفت کے لیے ٹول ٹیکس نہیں لگایا جائے گا۔

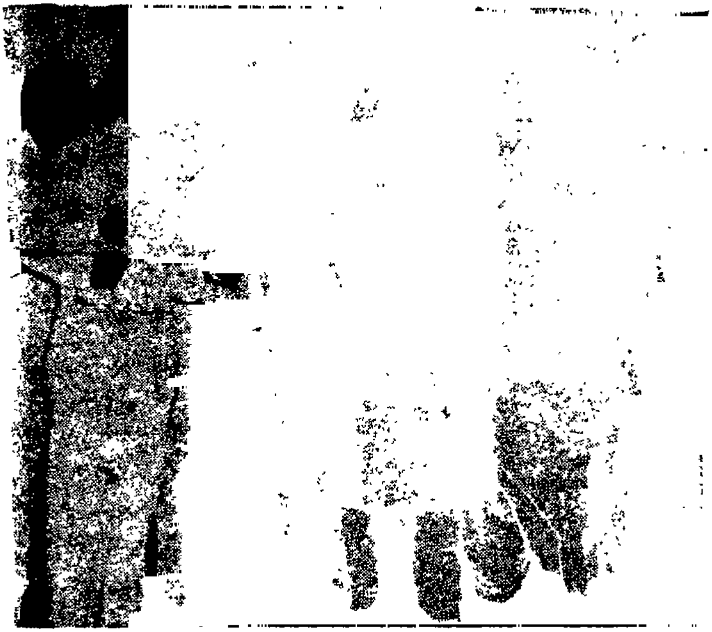
گورکھ پور کے کھاد کے کارخانے کے لیے کچا مال اور دوسری ضروری اشیاء دور دور کے مشرقی پردیشوں سے لانا پڑتی ہیں اور تیار شدہ کھاد اتنے ہی دور دراز کے علاقوں تک پہنچانا

گھاگھرا کا پُل خوش حالی کا راستہ ہوگا

وزیر اعلیٰ کا پیغام

دوہری گھاٹ میں گھاگھرا کے نو تعمیر پل کے افتتاح کے موقع پر وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی نے حسب ذیل پیغام دیا تھا:

"گھاگھرا کا پل، جس کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جا رہی تھی اس کے بن جانے سے جو خوشی ہو رہی ہے اس کا اظہار لفظوں میں مشکل ہے۔ لوہے اور سیمنٹ سے بنا ہوا یہ پل ایک مادّی پل ہی نہیں بلکہ سماجی، جغرافیائی اور معاشی پروگراموں کو مربوط کرنے اور خوش حالی لانے والا پل بھی ثابت ہوگا۔ اس کی تکمیل سے ایک بہت بڑی کمی دور ہوگئی ہے۔ قرنوں سے پسماندہ پردیش کے دو حصّے اب ایک ہو گئے ہیں۔ ہمارے راشٹر کی وزیر اعظم اندرا جی اس کا افتتاح کر رہی ہیں۔ اس سے بھی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس پل کے ذریعہ مشرقی ضلعوں کی خوش حالی اور ترقی کے دروازے کھل گئے ہیں۔"



دوہری گھاٹ کا نو تعمیر پل
وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲۲ر اپریل سنہ ۷۰ء کو پل کا افتتاح کرتے ہوئے تصویر میں مرکزی وزیر شری فخرالدین علی احمد اور وزیر اعلیٰ یو۔ پی شری کملا پتی ترپاٹھی بھی دکھائی دے رہے ہیں

پڑتا ہے۔ ریلوے ویگنوں کی کمی اور وقت سے ان کے نہ مل پانے کے باعث گھاگھرا کے جنوب میں واقع پردیش کے مختلف ضلعوں کو کیمیاوی کھاد وقت پر اور مناسب مقدار میں نہیں مل سکتی تھی اسی کے ساتھ گورکھپور کے کارخانہ کی کھاد گنگا کے جنوب میں واقع ریاست بہار کے وسیع علاقے تک بھی دشواری کے ساتھ پہنچ پاتی تھی لیکن گھاگھرا کے پل نے کچے مال اور تیار کھاد کے نقل و حمل کو بے حد آسان بنا دیا ہے۔

دوہری گھاٹ اور اس کے قرب و جوار کے علاقے کھادی اور دوسری دیہی صنعتوں کے لیے مشہور ہیں۔ یہاں ایک ترقیاتی بلاک بھی قائم کیا گیا ہے۔ بستی اور گورکھپور کے اضلاع بھی کافی مقدار میں کھادی اور ہینڈلوم کا سامان تیار کرتے ہیں۔ گھاگھرا کا پل اس مال کے لیے بازار مہیا کرے گا، مال تیار کرنے والوں کو معقول پیسہ دے گا اور ان کی ہمت افزائی کریگا۔

پردیش کے مختلف قابل دید مقامات کی سیر کے لیے ہر سال ملکی اور غیر ملکی سیاح لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں۔ وہ بنارس اور بودھی تیرتھ استھان سارناتھ تو لازماً آتے ہیں اور وہاں سے بودھوں کے مذہبی مقامات لمبنی، کشی نگر اور آوستی جاتے ہیں۔ اب تک اس سفر میں دریائے گھاگھرا اور اس کی بیقرار موجیں حائل رہتی تھیں لیکن گھاگھرا تو تعمیر پل نے ان یاتریوں اور سیاحوں کے سفر کو بہت ہی آسان بنا دیا ہے۔

گورکھپور، دیوریا اور بستی سے الہ آباد پہنچ جانے پر وہاں سے باندہ اور جھانسی یعنی بندیل کھنڈ جانے کا راستہ کھل جاتا ہے یہ سہولت بھی اس پل کے بن جانے سے مہیا ہوئی ہے۔

اس پل کی تعمیر کے لیے حکومت ہند نے سنہ ۱۹۶۵ء میں ایک

اسکیم منظور کی تھی۔ خاص پل کی تعمیر پر ۱۸۳ء۲۲ لاکھ روپے کی لاگت آئی ہے۔ تفصیلی سروے کے بعد دوہری گھاٹ سے متصل موجودہ ناؤ گھاٹ سے ۳۰۰ میٹر نیچے کی جانب یہ جگہ پل کی تعمیر کے لیے موزوں پائی گئی۔ یہاں دریا کا بہاؤ سیدھا ہے۔

اس مقام پر دریائے گھاگھرا کے پانی کا انتہائی بہاؤ ۲۰۸۰۰ مربع میٹر فی سکنڈ ہے۔ اتنی مقدار میں پانی کے بہاؤ کے لیے ۶۲۰ میٹر لمبا پانی کا سیدھا راستہ درکار ہے۔ پل میں کنکریٹ کے ۱۳ پائے ہیں جو سیمنٹ کنکریٹ کے کنوؤں پر تعمیر کیے گئے ہیں۔

گھاگھرا پل پر سڑک کی چوڑائی ۷ء۵ میٹر ہے جس پر بھاری گاڑیاں بیک وقت دونوں جانب سے گزر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ پیدل چلنے والوں کے لیے دونوں طرف ۱ء۵۲ میٹر چوڑے فٹ پاتھ بنائے گئے ہیں۔ اس پل کی تعمیر کا کام ۱۲ مارچ ۱۹۶۷ء کو شروع ہوا تھا اور مکمل ہونے کے بعد ۲۲ اپریل ۱۹۷۲ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے عام آمد و رفت کے لیے اس کا افتتاح کیا۔

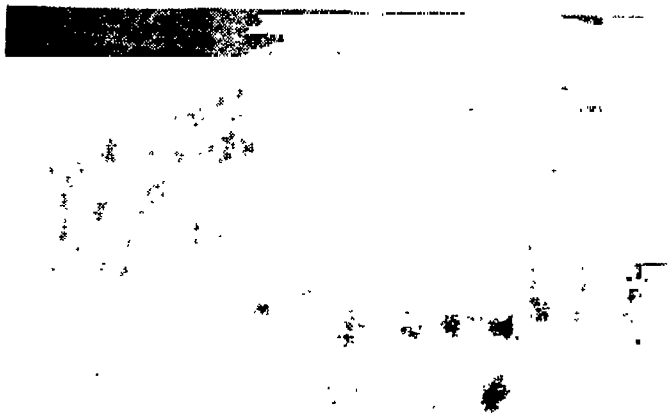
گاڑیاں بیک وقت دونوں جانب سے گزر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ پیدل چلنے والوں کے لیے دونوں طرف ۱ء۵۲ میٹر چوڑے

دفاعی فنڈ میں ایک کروڑ کا عطیہ

پل کے افتتاح کے موقع پر ہونے والے جلسۂ عام میں وزیر اعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی نے دفاعی فنڈ کے لیے ایک کروڑ روپے کی تیسری قسط وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو پیش کی۔

وزیر اعلیٰ نے قومی دفاعی فنڈ کے ۲ء۱۵ کروڑ روپے کی پہلی قسط ۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ کے ایک جلسۂ عام میں وزیر اعظم کو پیش کی تھی۔ دفاعی فنڈ کے لیے ایک کروڑ کی دوسری قسط وزیر اعلیٰ نے وزیر اعظم کے دورہ رائے بریلی کے موقع پر ۲۴ جنوری ۱۹۷۲ء کو پیش کی تھی۔ اس طرح قومی دفاعی فنڈ میں اتر پردیش کا عطیہ ۴ء۱۵ کروڑ روپے کا ہو گیا۔ اس فنڈ میں عوام کے عطیات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

★



دوہری گھاٹ پل کی ۷ء۵ میٹر چوڑی سڑک اور دونوں جانب کے فٹ پاتھ کا ایک حصہ

غزل

ہزار لکھنوی

نہ جانے کتنی دہلیزوں پہ سر رکھنا پڑا مجھ کو
ترے دھوکے نے دنیا بھر کا بندہ کر دیا مجھ کو

بہت اکسا رہی تھی جرأتِ عرضِ وفا مجھ کو
مگر کچھ بات ایسی تھی کہ چپ رہنا پڑا مجھ کو

گنہ گارِ محبت کو یہ اطمینان کیا کم ہے
کم از کم اپنا بندہ تو سمجھتا ہے خدا مجھ کو

صدائے بازگشت آتی ہے یا وہ گنگناتا ہے
غزل پڑھتے ہوئے شاید کسی نے سن لیا مجھ کو

محبت جرم ہے تو عمر بھر میں نے خطا کی ہے
اب اس کے بعد جو مرضی ہو وہ دیجے سزا مجھ کو

زمین و آسماں کو جب متحمل نہیں پایا
مرے مالک نے سارا غم اٹھا کر دے دیا مجھ کو

ہزار اپنا تو سر ظالم کے آگے خم نہیں ہوتا
کہوں کیا شکر کی توفیق دیتا ہے خدا مجھ کو

غزل

خضر برنی

سوائے درد و غم سود و زیاں تک بات جا پہنچی
گماں تک بھی نہ تھا جس کا وہاں تک بات جا پہنچی

مرے ذوقِ طلب نے راہ میں منزل کے دم توڑا
تماشا بن گیا آہ و فغاں تک بات جا پہنچی

صبا گلشن میں چپکے سے یہ غنچوں کو بتا دینا
تبسم کی تمہارے باغباں تک بات جا پہنچی

غمِ بیچارگی میں اشک پلکوں پر سمٹ آئے
برا ہو عاشقی کا داستاں تک بات جا پہنچی

نشیمن سے دھواں اٹھ کر سرِ افلاک جا پہنچا
ارے توبہ مرے غم کی کہاں تک بات جا پہنچی

کبھی سوچا ہے کچھ تو نے تماشا دیکھنے والے
ترے چھپنے سے ناقوس و اذاں تک بات جا پہنچی

بلا نوشو! یہ میخانے کے در اب وا نہیں ہوں گے
سنا تم نے خضرؔ پیرِ مغاں تک بات جا پہنچی

مثنوی سحرالبیان کا محاکاتی پہلو

مرزا احسن بیگ

میر حسن کی مثنوی سحرالبیان اردو ادب کا لافانی شاہکار ہے۔ میر حسن نے یوں تو کئی مثنویاں لکھی ہیں لیکن جو قبول عام سحرالبیان کو نصیب ہوا اور کسی مثنوی کے حصے میں نہ آیا۔ بقول میر حسن انھوں نے اس کہانی میں اپنی عمر صرف کر دی تب کہیں جا کے بڑھاپے میں یہ مثنوی لکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میر حسن کی یہ تصنیف ادب العالیہ میں شمار کی جاتی ہے اور بقول مولانا حالی اردو کی عشقیہ مثنویوں میں آج تک ایسی مثنوی نہیں لکھی گئی۔

مثنوی سحرالبیان پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین صاحب لکھتے ہیں :

"اگر سحرالبیان کے بارے میں یہ بات کہی جائے کہ یہ اردو زبان کی اچھی مثنوی ہے تو کہیں نہ کہیں سے یہ آواز ضرور آئے گی کہ یہ رائے درست نہیں، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ مثنوی اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے تو شاید کسی کو شدت کے ساتھ اختلاف نہ ہوگا کیونکہ اس کی کہانی اور انداز بیان میں ضرور کچھ ایسے عناصر ہیں جن کا مطالعہ اس کی عظمت کا پتہ دیتا ہے"[1]

مثنوی سحرالبیان کے متعلق میر شیر علی افسوس دیباچہ میں لکھتے ہیں :

"مثنوی اسم بامسمیٰ ہے کیونکہ اس کا ہر شعر اہل مذاق کے دلوں کا موہنی منتر اور اس کی ہر داستان سحر سامری کا دفتر ہے"

مثنوی سحرالبیان میں میر حسن نے اپنا فن سمو دیا ہے اور اپنی محنت اور کمال کا انھیں خود بھی احساس تھا ورنہ وہ یہ دعویٰ نہ کرتے :

نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجھڑی
مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں
نہیں مثنوی ہے یہ سحرالبیاں
رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام
کہ ہے یادگار جہاں یہ کلام
ہر اک بات پر دل کو میں خوں کیا
تب اس طرح رنگیں یہ مضموں کیا

اس مثنوی کے پلاٹ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تخت و تاج کا وارث نہ ہونے کی وجہ سے ایک بادشاہ کی زندگی قبر کی طرح سنسان ہے۔ وہ دنیا سے قطع تعلق میں ہی سفر دیکھتا ہے اور عقلمند وزراء اسے مناسب مشورہ دیتے ہیں۔ بہت سے قصوں کی طرح یہاں بھی فقیر، برہمن، نجومی ایک لڑکے کی پیشین گوئی کرتے ہیں لیکن اس خطرے سے بھی آگاہ کر دیتے ہیں کہ عمر کے ایک خاص سال میں سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح پری کا شہزادے کے اوپر عاشق ہونا، کل کا گھوڑا، خواب میں رازوں کا انکشاف ہونا اور وزیر زادی کا مشکلیں اٹھانا شروع سے آخر تک بہت سی ایسی منزلیں ہیں جن کے سہارے مثنوی کا پلاٹ آگے بڑھتا ہے لیکن یہ ساری چیزیں قدیم

---

[1] تنقیدی جائزے ص۵۵

داستانوں اور روایتوں سے ماخوذ ہیں۔ پھر بھی اس میں ایسی دل کشی اور صناعی موجود ہے جو کسی دوسرے مثنوی نگار کو نصیب نہ ہو سکی۔ دراصل اس ادب پارے کو آج کل کے سماجی ڈھانچے میں پرکھنے کے بجائے اودھ کے اس ماحول میں جانچنا چاہیے جہاں موضوع اور پلاٹ میں ندرت تلاش کرنا مفید نہ ہوگا۔ اس کے بجائے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس میں فنی دل کشی اور ادبی محاسن کس حد تک موجود ہیں۔

ہندستان میں میر حسن کا زمانہ موجودہ زمانے سے بہت مختلف تھا۔ شاہی نظام اور جاگیردارانہ معاشرت اپنے زوال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لکھنؤ کے نوابوں، بادشاہوں کی دریا دلی، علوم پرستی، شعر و ادب سے دلچسپی یہ چیزیں زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں لیکن ان میں عیش و عشرت کے جو عناصر داخل ہو چکے تھے ان کی وجہ سے نئے تصورات کو اپنانے کی طرف دھیان نہیں دیا جا سکتا تھا بلکہ قدیم روایات اور خیالی و فنی دل کشی ہی سب کچھ سمجھ لی گئی تھی۔ ایسی حالت میں کسی شاعر سے یہ امید کرنا کہ وہ بگڑے حالات سے منہ موڑ کر اپنی ذہنی کیفیت کو نئے سانچے میں ڈھال لے گا غلط ہوگا۔ آصف الدولہ کے عہد حکومت نے سرپرستی، سخاوت اور داد و دہش کا ایک وقتی اور مصنوعی ڈھانچہ ضرور کھڑا کر دیا تھا لیکن اس میں جد و جہد کی ایسی قوت نہیں تھی کہ خیال و تصورات کی بنیادوں کو بدل کر نئی حقیقت پیدا کی جا سکے۔ میر حسن نے اسی دور میں پرورش پائی۔ اس وقت تک سائنس نے نہ اتنی ترقی کی تھی نہ معلومات کی اتنی روشنی بڑھی تھی۔ سادہ طبع لوگ ان باتوں پر اعتبار رکھتے تھے جو آج مضحکہ خیز معلوم ہوں گی۔ چنانچہ کہانیوں کو دلچسپ بنانے کے لیے ضروری تھا کہ مافوق الفطرت عناصر (SUPER-NATURAL ELEMENT) اور ان کی حرکتوں کا ذکر کر کے کہانی میں حیرت کا عنصر پیدا کیا جائے۔ قصے کی دل کشی میں اضافے کے لیے ان چیزوں سے مدد لی جاتی تھی جو انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ داستانوں اور مثنویوں کی مقبولیت کے لیے ان چیزوں سے مدد لینا ایک خاص زمانے تک ہر ادبی تخلیق کے لیے ضروری تھا جس سے الگ کر کے سحر البیان کا مطالعہ کرنا سخت ناانصافی ہوگی۔ چنانچہ میر حسن نے جب مافوق الفطرت عناصر (SUPERNATURAL ELEMENT) یا غیر انسانی عناصر کو پیش کیا تو اس سے مثنوی کی فنی خوبیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بارہ سال کی عمر میں بے نظیر کا تمام علوم پر قدرت حاصل کر لینا، دیو پری کا وجود، عجیب و غریب پھولوں کا ذخیرہ، جواہرات کی بہتات، پریوں کا انسانی خصائل اختیار کرنا، یہ سب غیر فطری واقعات ہو سکتے ہیں لیکن میر حسن کے لیے اس کے بغیر مثنوی کو مقبولیت دینا ممکن نہ تھا اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان چیزوں کے درمیان انھوں نے اپنے دور کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی ایسی دلکش اور مکمل تصویر پیش کر دی کہ مافوق الفطرت عناصر کا تذکرہ پس پشت رہ جاتا ہے۔ حسن کا بیان اور سماجی زندگی کی عکاسی ایسی تیز روشنی پھیلا دیتی ہے کہ ساری مثنوی پر وہی چھائے رہتے ہیں جس سے یہ حقیقت سے قریب ہو کر ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لیتی ہے۔

سحر البیان کی جس خصوصیت نے میر حسن کو سب سے زیادہ شہرت بخشی وہ اس کی کردار نگاری کا حسن ہے۔ ممکن ہے میر حسن نے شعوری طور پر اس پہلو کی طرف دھیان نہ دیا ہو، نہ ان کے زمانے میں کردار نگاری کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ وہ اسے جان بوجھ کر سنوارتے لیکن جدید نقادوں کی نظر میں یہی اس مثنوی کا سب سے بڑا حسن ہے اور اسی میں بقیہ تمام صناعی و فن کاری سمٹ کر آ گئی ہے۔ سحر البیان جن کرداروں کے گرد گھومتی ہے ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ "کوئی بادشاہ"، بے نظیر، ماہ رخ، بدر منیر، مسعود شاہ، نجم النسا یہی چند کردار کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔ ان میں بھی بادشاہ مسعود شاہ ضمنی حیثیت رکھتے ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں اور اس طرح قصے کو آگے بڑھانے اور اس میں حسن و خوبی پیدا کرنے کے لیے صرف چار کردار باقی رہ جاتے ہیں۔ عام سماجی تقاضوں کے تحت عجیب و غریب مردوں اور عورتوں کا ذکر ضروری تھا ورنہ اس دور میں مقبولیت کیسے حاصل ہوتی۔ درمیان میں بھی خادماؤں، خواصوں اور لونڈیوں کی فراوانی اس شاہانہ تمدن کا پتہ دیتی ہے جس سے قصے کی ابتدا کی گئی ہے۔ قصے کے ارتقا کے لیے ان چیزوں کا ذکر بھی ضروری تھا لیکن میر حسن نے جہاں بھی کرداروں کو پیش کیا ہے وہاں ان کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

بے نظیر کہانی کا ہیرو بارہ سال کی عمر میں یوسف سے زیادہ خوبصورت، رستم سے زیادہ طاقت ور اور بڑے بڑے علما سے زیادہ عالم ہے۔ یہ شہزادے یعنی ہونے والے بادشاہ کا ذکر ہے جس کے لیے ان خصوصیات

کا ہونا ضروری تھا۔ اس کردار کے سلسلے میں جب عملی منزل شروع ہوتی ہے تو میر حسن کا فن اور زیادہ ابھر آتا ہے۔ کہانی میں جتنی پیچیدگی بڑھتی ہے، جتنی گتھیاں پڑتی جاتی ہیں اتنی ہی کرداروں کی اہمیت بڑھتی ہے چنانچہ بے نظیر ان خوبیوں اور اوصاف کا مالک ہوتے ہوئے بھی پری کی طاقت کا شکار ہو جاتا ہے جو اسے سوتے میں اٹھا لے جاتی ہے۔ محبت کے سارے زور صرف کرتی ہے۔ بے نظیر اجنبی ماحول میں خوف و ہراس محسوس کرتا ہے لیکن میر حسن چونکہ پہلے اسے غیر معمولی طاقت ور اور بہادر بتا چکے ہیں اس لیے یہاں بھی بڑی چابک دستی سے یہ خوف و ہراس اس کے چہرے پر عیاں نہیں ہونے دیتے۔ کل کے گھوڑے کی مدد سے بدر منیر سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہیں سے اس کی زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے جس میں عشق کا جذبہ غالب آ جاتا ہے۔ بدر منیر اسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرتی ہے ؎

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

بے نظیر شروع میں اظہار عشق سے دور رہتا ہے لیکن شراب پینے کے بعد ساری کہانی بدر منیر کو سنا دیتا ہے۔ پری غیر مخلوق تھی اس لیے اس سے محبت نہ کر سکتا تھا۔ لیکن بدر منیر انسانی حسن و جمال کا نمونہ تھی۔ اس کے قدموں پر سر رکھ سکتا تھا۔ انسانی فطرت کا یہ خاکہ بے نظیر کے کردار میں بڑی بلندی پیدا کر دیتا ہے۔ ایک دن کوئی دیو اس پری ماہ رخ سے بدر منیر اور بے نظیر کے عشق کا حال بتا دیتا ہے۔ بے نظیر قید کر دیا جاتا ہے۔ کنویں میں جب نجم النسا کی مدد اور تدبیروں سے کنویں سے باہر آتا ہے تو قطری دیو پر اس کا سے لپٹ کر رو دیتا ہے۔ محبت میں کامیابی حاصل کر کے بدر منیر سے شادی کر لیتا ہے۔

بدر منیر کا کردار بے نظیر سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے حسن کے سامنے آفتاب و ماہتاب کی حقیقت نہیں۔ اس کا ہر انداز انتہا سے زیادہ پیارا ہے۔ اس میں ایسی متانت اور وقار ہے جو شہزادیوں کے لیے ضروری ہے البتہ اس میں عشق کے معاملے میں جرأت کی کمی ہے جو محبت کو کامیاب نہ ہونے دے۔ اسے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا:

سرہانے مجلد دھری ہے کتاب ظہوری نظیری کا کل انتخاب
بھری اک بیاض اور رشک چمن پر از شعر سودا و میر حسن

بے نظیر اس سے پری کا ذکر کرتا ہے تو عورت کی فطرت کے مطابق ساری سنجیدگی بھول کر وہ رشک و حسد کی آگ میں جلنے لگتی ہے۔ لیکن دل میں محبت کا جذبہ بے قرار ہے۔ یہی جذبہ اسے جلد بے تکلف بنا دیتا ہے۔ وہ آزاد طبیعت کی مالک ہے۔ اس طرح بدر منیر کی محبت میں پرانے انداز کی سچی محبت کا پتہ چلتا ہے۔ کسی وقت بے نظیر سے غافل نہیں یہی یہاں تک کہ خواب میں بھی بے نظیر کو کنویں میں دیکھ کر اپنی ہم راز نجم النسا سے سارا قصہ سناتی ہے۔ پھر بھی بدر منیر اور بے نظیر دونوں کا کردار ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

سحر البیان میں سب سے اہم کردار نجم النسا کا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ سحر البیان ہی میں نہیں اردو کی تمام مثنویوں میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ ایک زندہ حقیقت ہے جو بے عملی میں عمل اور جمود میں حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ میر حسن شعوری طور پر نجم النسا کی فطرت کو کہانی کی ایک ایسی اہم کڑی بنا دیتے ہیں جو آگے چل کر قصے کو ختم ہونے سے بچا لے۔ پہلی دفعہ جب نجم النسا سامنے آتی ہے تو وہ ایک عملی کردار کی طرح کہانی کے خاص موقعوں پر کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بے نظیر جب بدر منیر کے باغ میں پہنچتا ہے، بدر منیر خواصوں کے جھرمٹ میں نظر آتی ہے۔ عشق کا تیر پار ہو چکا ہے بے نظیر غش کھا کر گر چکا ہے، بدر منیر بھی بے ہوش ہو چکی ہے، خواصیں، سہیلیاں سہمی ہوئی کھڑی ہیں کہ اسی عالم میں نجم النسا ظاہر ہوتی ہے۔ کہانی میں بے ہوشی کی حالت زیادہ دیر تک نہیں دکھائی جا سکتی ہے۔ اس لیے اختصار کا کمال دکھاتے ہوئے میر حسن نے نجم النسا کی صورت اور سیرت کا نقشہ صرف دو شعروں میں پیش کیا ہے:

تھی ہم راہ اک اس کی دخت وزیر نہایت حسین و قیامت شریر
زبس تھی ستارہ سی وہ دلربا اسے لوگ کہتے تھے نجم النسا

ان دونوں شعروں میں مثنوی نگار نے نجم النسا کا سارا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ وہ گھبراتی نہیں ہے۔ بے ہوش دیکھ کر دونوں کو ہوش میں لاتی ہے۔ دونوں کے دلوں کے حجاب کا اندازہ لگا لیتی ہے۔ شراب پلا کر شرم حیا کی اس کیفیت کو دلوں سے دور کرتی ہے۔ اس طرح جہاں کہیں کہانی میں جمود کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے، نجم النسا اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ نجم النسا شریر ہے وہ وزیرزادی ہونے کی وجہ سے بدر منیر سے زیادہ

بے تکلف ہے۔ اسے چھیڑتی ہے، اس کا امتحان لیتی ہے۔ جب اس کی محبت کا یقین ہو جاتا ہے تو طے کر لیتی ہے کہ دوست کی حیثیت سے بدر منیر کی مدد کرنا اس کا فرض ہے۔ اس کا ذہن اتنا تیز تھا کہ بدر منیر کے خواب پر بے نظیر کو تلاش کرنے نکلتی ہے۔ پریوں کی دنیا میں پہنچ کر بھی اس کی ذہانت اور تیزی قائم رہتی ہے۔ اس کا عزم متزلزل نہیں ہوتا۔ اس کے ارادے میں کمزوری نہیں۔ وہ دوست کے لیے ہر قربانی دے سکتی ہے۔ اس میں ایسی ہمدردی ہے کہ مستقبل سے بے پروا ہو کر بدر منیر کے کام آنا چاہتی ہے۔ وہ عورت ہو کر جرأت کا سبق دیتی ہے۔ جوگن بن کر نکلنا ایک خاص معنی رکھتا ہے، جس میں تیاگ، ایثار سبھی کچھ شامل ہے۔ پھر اس بہروپ میں شاہانہ شان ہے۔ جلے ہوئے موتیوں کا غبار مل کر اس کا چہرہ بہت حسین ہو گیا۔ اپنے حسن سے فیروز شاہ کو قابو میں کر لیتی ہے۔ اسے بھیس بدلنے پر ایسا کمال حاصل ہے کہ پریزاد بھی اس کا بھید نہیں پاتا جو نجم النسار عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن پہلے اپنا مقصد پورا کر لینا ضروری سمجھتی ہے۔ اس کا جادو کبھی خالی نہیں جاتا۔ اس کا منتر ہر جگہ کام آتا ہے۔ فیروز شاہ کی مدد سے بے نظیر مل جاتا ہے۔ پھر پریزاد کو بدر منیر کے سامنے لاتی ہے جس سے اس کے عشق کا اظہار ہوتا ہے۔ فنی حیثیت سے یہ حصہ میر حسن کے لیے بہت نازک تھا۔ وہ بدر منیر اور بے نظیر کو بے قابو ہونے سے روکتی ہے۔ یہ وہ وقت ہے کہ کسی کو اس کے حکم کی سرتابی کی ہمت نہیں۔ وہی سب کچھ ہے۔ وہ کہانی کو جس طرف موڑتی ہے مڑ جاتی ہے۔ نجم النسا کی تخلیق میر حسن کا بہت بڑا کمال ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہت سی دوسری خصوصیت کے ساتھ اس مثنوی کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایسی کردار نگاری اردو کی کسی دوسری مثنوی میں اتنے اعلیٰ پیرایے میں نظر نہیں آتی۔

سارے قصے کے درمیان میر حسن نے واقعہ نگاری، منظر کشی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جس عمدگی سے پیش کیا ہے وہ بھی ان کی انفرادیت اور ذہنی قوت کا پتہ دیتی ہے۔ اس دور میں جاہ و ثروت اور شان و شوکت کی جو فضا اور معاشرتی زندگی کی جو کیفیات تھیں میر حسن نے اس کے ایک ایک پہلو کو اس طرح پیش کر دیا ہے کہ اس کی ہو بہو تصویر سامنے آجاتی ہے۔ انھوں نے شہزادے کی پیدائش کے موقع پر جشن کی جو مصوری کی ہے اور ان محفلوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کی کیفیت آج بھی اسی طرح محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی جزئیات کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ہر تصویر میں اس قدر خوبصورتی سے رنگ بھرتے ہیں کہ ایک ایک نقش ابھر آتا ہے۔ نجومیوں، رمالوں اور برہمنوں کا ذکر جس طرح کیا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ساری عمر جیوتش اور رمل کا علم حاصل کرنے میں صرف کی۔ موسیقی کا ذکر کرنے میں تو اس فن کے سب سے بڑے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ آتش بازی کا ذکر، محل اور باغ کی دل کشی، فانوس اور شمع کی سجاوٹ، نوکروں، خدمت گاروں اور کنیزوں کی بھیڑ بھاڑ، طوائفوں کی رنگینیاں، جادوگری اور جوگی غرضیکہ جو کچھ جہاں مناسب ہوا اس کی پوری عکاسی کر دی اور ایسی مکمل مصوری کی کہ اس موقع کا میر حسن سے بڑھ کر کوئی دوسرا صناع نظر نہیں آتا۔ اس طرح ایک مختصر سی مثنوی ہوتے ہوئے بھی یہ معلومات اور علمی باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ شاعر نے اس مثنوی کو سنوارنے، سجانے اور نوک پلک سے درست کرنے میں زندگی کا کتنا بڑا حصہ صرف کیا ہوگا اور کتنی عرق ریزی کرنا پڑی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ وہ ہر فن کی ایک ایک کیفیت اور اس کے ایک ایک جز پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ بچے کی ولادت پر دائی جنائی، مغلانی، خواص ہر ایک کے ذمے ایک خاص خدمت ہوتی ہے۔ ان سے محل کی زندگی کا ایک رخ معلوم ہوتا ہے۔ لونڈیوں اور کنیزوں کے نام کے انتخاب میں چنبیلی، رنگیلی، کام روپ، چت لگن، دل لگن، کیتکی، ماہتاب، ہنس مکھ وغیرہ محض عرفیت کے لیے یا پیار کے نام کے طور پر نہیں گنوائے گئے ہیں بلکہ ان ناموں کے ساتھ ان کی خدمات، امتیازی خصوصیات اور ان کے آقاؤں کی زندگی اور ان کے رجحانات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

میر حسن نے اپنے دور کے رسم و رواج کی مصوری کر کے پورے معاشرے اور تہذیبی زندگی کی عکاسی کر دی ہے۔ بچے کی پیدائش پر نجومی اور رمال کا فال دیکھنا، انعام و اکرام پانا، خوشیاں منانا، مسجد میں چراغ روشن ہونا، بھانڈوں اور قوالوں کا مبارک سلامت کی دھوم مچانا، انعامات اور خلعتوں کی تقسیم، خیر و خیرات کا سلسلہ، نذر و نیاز غرضیکہ جزئیات پیش کرنے کا یہ عالم ہے کہ میر حسن چھٹی کی رسم، برس گانٹھ، دودھ بڑھانا، بسم اللہ کی رسم کسی چیز کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس طرح ہر موقع پر اختصار کے باوجود کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ مختلف رسومات و

سقائد، رہن سہن کے طریقے، محل، دربار، عوام سب کی منہ بولتی تصویریں
نظر آتی ہیں۔ میر حسن اپنی ذہانت اور تخیل سے بڑے بڑے کام لیتے ہیں۔
ہر منظر کو حسن مناسبت سے بیان کرتے ہیں اور یہی خصوصیت ان کی تخلیقی
قوت اور مشاہدے کی گہرائی کا پتہ دیتی ہے۔

میر حسن نے اس مثنوی کی کامیابی کے لیے زبان و بیان اور دلکش
انداز سے بہت مدد لی۔ اس کا انداز بیان ایسا دلکش ہے کہ سلاست و
روانی کے لحاظ سے یہ آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ میر حسن کی سادہ بیانی
اور روزمرہ کو دیکھ کر محمد حسین آزاد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

"کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی تھیں کہ جو کچھ
کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو اب ہم تم بول رہے ہیں۔"

محاورے اور الفاظ کی شیرینی، تراکیب کے استعمال یہ سب میر حسن
کی قادر الکلامی اور جمالیاتی شعور کے شاہد ہیں۔ انھوں نے ایک ایک مصرعے
سے جو نغمہ اور حسن پیدا کر دیا ہے اس کی مثال کسی دوسری جگہ ملنا مشکل ہے
اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے مثنوی کو عظمت و بلندی بخشنے میں بڑی مدد کی
فصاحت و بلاغت کا ایک دریا بہتا چلا آتا ہے جس سے قاری متاثر ہوئے
بغیر نہیں رہتا۔ ایک ایسے دور میں جب پر شکوہ الفاظ، ایہام گوئی اور
صنعت گری زبان و بیان کی خوبیاں سمجھی جاتیں، میر حسن کا اس قدر سلیس
زبان استعمال کرنا حیرت خیز ہے۔

مختصر یہ کہ سحر البیان کا انداز بیان، اس کی تفصیلات، اختصار،
محاوروں کا برمحل استعمال، اس کی رنگینی و دل کشی کسی دوسری مثنوی میں
نہیں پائی جاتی اور سب سے بڑھ کر اس میں کردار نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ ملتا
ہے۔ اس طرح انسانی اعمال و افعال کی تصویر کشی کے سامنے مافوق الفطرت
عناصر اور طلسمی دنیا بہت پست درجے کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں اور یہی
چیز سحر البیان کی عظمت کی بہت بڑی دلیل ہے۔

زبان کی صفائی اور اس کی شگفتگی کا اعتراف کلیم الدین جیسے نقاد
تک کو ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ۔

" محاورات ہر جگہ رواں نظر آتے ہیں لیکن زبان کی مثال کسی حسین
زیور کی نہیں بلکہ یہ حسین فطری پھول معلوم ہوتی ہے۔"

اس مثنوی میں خوبیوں کے ساتھ کچھ معائب بھی ہیں۔ ان پر ڈاکٹر
جبین نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ کہتے ہیں:

"کون سا پھول ہے جس میں کانٹے نہ ہوں۔ مذاق سلیم کو اس
مثنوی میں بہت سی باتیں کھٹکتی ہیں۔ سحر البیان میں متروکات
کثرت سے ہیں بلکہ کئی موقعوں پر بھرتی کے الفاظ، ڈھیلی بندشیں اور
قواعد کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ . . ."

آخر میں ڈاکٹر جبین نے ایک ایمان دار محقق کی طرح جو رائے پیش
کی ہے وہ ایک فیصلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

" اس مثنوی کے معائب کثرت محاسن کی چکا چوند میں نظر سے
غائب ہو جاتے ہیں۔ سحر البیان کو کتنی ہی ہٹ دھرمی سے پڑھا
جائے کتنی ہی معترضانہ اور معاندانہ نظر سے دیکھا جائے لیکن جیسے
جیسے اس مثنوی کو پڑھا جائے گا سخت سے سخت نقاد بھی بانی ہو جائے گا۔"

بادشاہ —— (صفحہ ۱۹ کا بقیہ)

وہ خوش ہو کے بولا "ہاں ہاں، بس بس" —— جے جے ہند!"
ابھی دو تین دن ہوئے کوئی مغرب کا وقت ہوگا جو میں بازار گئی۔
وہاں اس وقت خوب چہل پہل تھی۔ موٹروں اور اسکوٹروں اور دیگر
سواریوں کا غل، دوکانداروں، چھابڑی والوں کی صدائیں، لوگوں کی
چیخ پکار —— اور اس سب کے بیچ میں بابو لال اپنی دوکان کے
ٹاٹ پر ایک ہاتھ کا تکیہ بنائے، گھٹنوں کو پیٹ میں سکیڑے نڈھال
سو رہا تھا۔ بلی اس کے سینے سے لگی آرام کر رہی تھی۔ سرہانے ایک کتا
پنجوں پر تھوتنی جمائے اونگھ رہی تھی اور پاؤں کے پاس دو منے منے پلے
یوں ایک دوسرے سے لپٹے پڑے تھے جیسے کوئی دوسرا دن نہ آنے والا ہو
ہو —— دوکان کا سامان اسی طرح، ذرا آگے کو رکھا تھا —— آدھا ٹاٹ
پر اور آدھا زمین پر۔ کوئی چاہتا تو سب کچھ بھاڑ لے جاتا۔

میرا بے اختیار دل چاہا کہ اس کے نزدیک جاؤں اور آہستہ سے
اس سے کہوں "بابو لال تم واقعی بادشاہ ہو —— بھلا بادشاہوں کو بھی
یہ نیند کہاں میسر؟ یہ تو اسی کا حصہ ہے جس کے دل میں قناعت کا نور
ہو، سر میں ہنر اور محنت کا غرور، پھر چاہے وہ چیتھڑوں میں لپٹا ہو مگر وہ
بادشاہ نہیں تو پھر کون بادشاہ ہے!"

غزل

[illegible] گورکھپوری

ہے صبح کا عالم چار طرف پھوٹی ہے کرن میخانے میں
تصویرِ خمارِ ساقی ہے ہر چھلکے ہوئے پیمانے میں

اک پیکر تھا اک قالب تھا الفت و محبت کیا کہیے
یہ جوشِ جنوں کی فتنہ گری دل شہر میں ہم ویرانے میں

تقلیدِ جنوں اور چھوڑ دیں ہم ناصح یہ ہوا کیا ہے تجھ کو
کیوں وقت گنوائے دیتا ہے دیوانوں کو سمجھانے میں

بس شب تک گہما گہمی تھی جب صبح ہوئی دونوں نہ رہے
کیا آگ تھی شمعِ محفل میں کیا شعلہ تھا پروانے میں

آنسو تو گرا دامن پہ کوئی سرخی تو بنا الفت کی کوئی
ناکامیِ حسرت اب بھی ہے کچھ تیرے حسیں افسانے میں

ساقی کی نظر کس طرح اٹھی یہ ہوش کسے جو بتلائے
اک جوش سا ہے پیمانے میں اک لہر سی ہے میخانے میں

ہاں حسنِ مجازی پر پہلے دنیا کی نگاہیں اٹھتی تھیں
اب اتنی حقیقت ملتی ہے بس نام شباب افسانے میں

غزل

صدیق احمد یاور

اے جنوں آوارہ گردی سے گزر میرے لیے
گنبدِ نیلی سے آگے ڈھونڈھو گھر میرے لیے

صبحِ عشرت کے تصدق، شامِ غربت کے نثار
اک تماشا بن گئے شام و سحر میرے لیے

میرے لب پر تو نہ تھی زلف و قمر کی بات بھی
جانے کیا کچھ لے اڑے افسانہ گر میرے لیے

زندگی محرومیوں کے جائزے لینے لگی
موت نے آواز دی بس بس ٹھہر میرے لیے

دل شکستہ ہی سہی، محرومِ الفت ہی سہی
ہر شکستِ فاش ہے فتح و ظفر میرے لیے

سرگزشتِ زندگانی پوچھنے والوں کی خیر
مفت کیوں یاد آ کوئی نے دردِ سر میرے لیے

(مزاحیہ)

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ایم۔ اے۔ حنان

ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ نہ ہم نیند کی گولیوں کے استعمال کے عادی ہیں اور نہ خوش قسمتی سے کسی محبوبۂ دل نواز کی یاد میں کروٹیں بدلتے اور ستارے گنتے رہتے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ دن میں خوب سوتے ہوں۔ اور ایسا تو ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ ہم عبادت گزار واقع ہوئے ہوں۔ وہم مرض بے خوابی کا شکار بھی نہیں ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر "نیند" نہ آتی ہو تو کس قدر حیرت اور دکھ کی بات ہے۔ ہمارے لیے تو یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کی کربناکی اور وحشت کا اندازہ اس بات سے بآسانی ہوتا ہے کہ ہم مالکِ دو جہاں سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں مال و زر نہیں جاہ و جلال نہیں، امارت ثروت اور اعلیٰ مرتبہ نہیں بلکہ ایک رات کی گہری نیند عطا فرمائے ہمارے حق میں احسانِ عظیم ہوگا۔ لیکن "آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک" کے مصداق اس کے شرفِ قبولیت بخشے جانے تک ہم ابدی نیند سو جائیں گے۔ کچھ کیے نہ بنے کچھ کیے بنے۔ ڈاکٹر کے پاس جاؤ تو وہ نیند کی گولیاں دیدیتا ہے، جو مستقبل میں بذاتِ خود نیند کو اڑانے والے عناصر کا آلۂ کار ثابت ہوتی ہیں۔ کسی یار دوست کو حالِ دل سناؤ تو وہ کسی بُت کافر کے دامِ الفت میں گرفتار گردانتا ہے۔ کسی بزرگ حضرت کے گوش گزار کریں تب وہ شادی کا مشورہ دیتے ہیں۔ (حالانکہ ہماری ایک شادی ہو چکی ہے) اور لوگ کچھ ایسی تیکھی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں کہ ہم شرم سے دوہرے ہوئے جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات ہم آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نیند کی دیوی کو راضی کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ بستر کا خاصا اہتمام کرتے ہیں، موسم کا خیال رکھتے ہیں، ماحول کو مدِنظر رکھتے ہیں۔ غرض کہ اگر دن میں سونا مقصود ہو تو رات کا سماں بآسانی پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تجربہ کار اور اس "فن" میں ماہر حضرات کی کہی اور بے کہی ہوئی باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے کئی کئی بار اُن کی آزمائش کر ڈالتے ہیں۔ یہاں تجربہ کار حضرات سے مراد وہ اشخاص ہیں جو ہر وقت نیند میں ہوتے ہیں۔ باتیں کم کرتے اور اونگھتے زیادہ ہیں۔ اور باتیں کرتے کرتے یکایک دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں، اور خراٹے بھرتے ہوئے اس فانی دنیا سے اپنا تعلق قطعی منقطع کر لیتے ہیں، جن کے ہاں موسم مقام وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔ لائبریری ہو یا پارک، ہوٹل ہو یا گرجا گھر، مندر، مسجد، اسکول موقع پاتے ہی نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

طبّی اور نفسیاتی طریقوں سے یہاں مُراد یہ ہے کہ بعض اطبا یا واقف کاروں کا قول ہوتا ہے، یا کتابوں میں لکھا ہوتا ہے کہ سونے سے پہلے ٹھنڈے پانی سے پاؤں دھو لینے یا بستر میں جانے سے قبل ایک گلاس دودھ پی لینے سے نیند کی دیوی بہت جلد مہربان ہو جاتی ہے اور بڑی گہری نیند آتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ آپ کی اطلاع کے لیے عرض کیے دیتے ہیں کہ نہ صرف ہم نے ان حکایات پر ہو بہو عمل کیا، بلکہ انھیں کچھ زیادہ ہی موثر انداز سے برت کر دیکھا۔ مثال کے طور پر ٹھنڈے پانی

میں ہم نے برف کا اضافہ کرلیا اور دودھ میں بالائی کا خاص خیال رکھا۔ لیکن پھر بھی ناکامی اور مایوسی ہی اپنا حصہ رہی۔ اور ہم "نیند پائے" نہ جاسکے۔

ٹھیک کسی ماہر نفسیات کے بتلائے ہوئے اصول پر، بستر پر جانے سے قبل دنیا کی ہر شے کو ذہن سے نکال باہر کیا۔ کسی بات پر سوچ بچار اور غور و فکر کرنا تو دور کی بات ہے، اپنے ماں باپ، بھائی بہن، رشتہ دار، دوست احباب سب کو یکسر بھلادیا اور ایسے میں کوئی آفت کا مارا آ بھی گیا تب بھی اسے پہچاننے سے صاف انکار کردیا۔ غرض کہ خالی الذہن ہوکر اور نیند نہ آنے کے خیال کو ذہن سے نکال کر رات بھر یہی سوچتے رہے کہ ہم کو تو بڑی گہری نیند آتی ہے یوں بستر پر لیٹتے آنکھیں موندیں اور دیکھتے ہی دیکھتے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔ اور یہی سوچتے سوچتے صبح تک بڑا برا حال رہا کہ "ہم کو تو بڑی گہری نیند آتی ہے" اور "ہم گہری نیند سو گئے ہیں"۔

تھک ہار کر اور کافی سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم کو بھی دوسرے صحت مند انسانوں کی طرح بڑی اچھی نیند آتی ہے لیکن اس موقع پر چند ایسے عناصر آن دھمکتے ہیں کہ اسے بھاگنے میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔

چنانچہ ہمارا یہ روز کا معمول ہے کہ دس بجتے ہی ہم بتی بجھا کر بستر پر دراز ہوجاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ رگ پٹھوں اور دیگر اعضا میں سکون و فرحت کی کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے اور بے خبری و غنودگی طاری ہونے لگتی ہے کہ یکایک زلزلہ آجانے کا گمان ہوتا ہے جس میں زمین نہیں پھٹتی، درخت نہیں اکھڑتے، عمارتیں سجدہ ریز نہیں ہوتیں بلکہ ہمارے دولت کدہ کے اطراف و اکناف کی دکانیں بند ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ "شٹرس" کچھ اس طرح گرائے جاتے ہیں کہ بمباری کا گمان گزرتا ہے پھر کیوں اور دروازوں کی دل ہلادینے والی کھڑکھڑاہٹ ہوش گم کیے دیتی ہے۔ اور شاید یہی وقت ہوتا ہے کہ دکان دار کو بیٹھے بٹھائے اپنے قفلوں کی وفاداری پر شک گزرتا ہے اور وہ ان کی آزمائش کرتے ہوئے ایک ایک قفل کو اس قوت سے جھٹکے دینے لگتا ہے کہ ادھر بستر پر ہم ایک ایک فٹ اوپر اچھل پڑتے ہیں۔ پھر بھی ہم انتہائی صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے سونے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی کوشش میں کچھ کامیاب بھی ہوجاتے ہیں اور نیند آرہی ہوتی ہے کہ دفعتاً دروازہ پر ایک زوردار دستک ہوتی ہے۔ ہماری خفگی کا اندازہ کرکے ہمارا لڑکا دروازہ کی جانب دوڑتا ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ کوئی خاکسار سے شخصی طور پر ملاقات کرنے کا خواہشمند ہے۔ ملاقات پر پتہ چلتا ہے کہ کوئی "سائل" ہے۔ دو دن سے بھوکا ہے اور کچھ خیرات کا طالب ہے۔ سخت برہمی کے عالم میں ہمارا ذہن یہ فیصلہ صادر کرتا ہے کہ انہیں بغیر کچھ دیئے ہی لوٹا دیا جائے۔ یہ بات وہ ہمارے لڑکے سے بھی کہہ سکتے تھے۔ شاید وہ ہمارے بیدار ہوجانے کے خوف سے کچھ دے بھی ڈالتا۔

اب تو یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم بیدار بیٹھے ہوتے ہیں اور گھڑی پر نظر ڈالتے ہیں۔ تب رات کے کوئی گیارہ بجے ہوتے ہیں۔ یہ جانی میاں موٹر سائیکل مستری کے گھر لوٹنے کا وقت ہوتا ہے جن کی آمد کا خیال کرکے نیند تو نیند دل بیٹھنے لگتا ہے۔ 'جانی میاں' کے گھر لوٹنے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہر شریف آدمی رات اپنے گھر پر ہی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ سائیکل پر گھر آئیں تو اس سے بہتر کیا۔ رکشہ میں آئیں تب کرایہ ہمیں تھوڑے ہی چکانا ہے۔ لیکن اگر یہ پیدل آئیں تب تاعمر ہم ان کے احسان مند رہیں۔ لیکن یہ تو اپنی چہیتی موٹر سائیکل پر آتے ہیں۔ جو دیکھنے میں پرانے زنگ آلود لوہے کا ڈھیر معلوم ہوتی ہے جس کا کوئی پرزہ پوری طرح درست ہوتا ہے اور نہ ہی پوری طرح خراب۔ چنانچہ ان دونوں کی درمیانی حالت میں دراصل موٹر سائیکل پر آدھی بات کے خوفناک سناتے ہیں جبکہ پرندہ بھی 'پر' نہیں مارتا، آپ بارن پر بارن دیئے جاتے ہیں اور ایک خوفناک "گھڑ گھڑاہٹ" کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ ان کی موٹر سائیکل عین ہمارے گھر کے سامنے آکر باقاعدہ اور بلاناغہ "فیل" ہوجاتی ہے

بلا تاخیر ثانیہ آلات حرکت میں آجاتے ہیں اور درستگی کا ناقابل بیان عمل شروع ہو جاتا ہے۔ سنا ہے کہ جہاں وہ کام کرتے ہیں ابھی میکانکی کے ابتدائی دور میں ہیں، اور ان سے صرف موٹر سائکلیں پونچھ پانچھ کر صاف کرنے کا کام لیا جاتا ہے لیکن یہاں تو وہ اسے "چیمپئن" کر رکھ دیتے ہیں۔ ہم نے ان سے صاف طور پر کہدیا ہے کہ اگر انھیں موٹر سائکل چلانا ہی ہیں اور وہ بھی اتنی رات گئے تو کیوں نہ ہمارے اوپر ہی سے چلا دیتے لیکن وہ ہم سے ہماری جان عزیز کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہونے سے قبل اپنی جان پر کھیل جانے کا سرسری تذکرہ کر چکے ہیں۔ چنانچہ ان کی آمد سے نہ صرف ہم بلکہ ہمارا سارا گھر بیدار ہو جاتا ہے۔ منے کو تو دودھ کی ایک عدد بوتل کی رشوت دے کر چپ کرایا جاتا ہے۔ منے کی ماں تو ننھے کے بیدار ہونے کے خوف سے ہی نیند کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔ دادی جان کو بھی تھوڑی سی جد و جہد کے بعد چپ کرایا جاتا ہے اور ہم چادر تان کر داخلی اور خارجی معاملات سے قطعی رشتہ منقطع کرتے ہوئے سونے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ لیکن وقت کا ذرا غلط انتخاب ہوتا ہے اور "سکنڈ شو" چھوٹتا ہے۔ پھر گانا بجانا مکالمے ڈائرکشن، ڈانس، ایکٹنگ بیک وقت شروع ہو جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کوئی مکالموں کو فحش گالیوں میں بدل دیتا ہے تو کوئی "رفیع" کی تان سے سُر ملاتے ہوئے دل دوز چیخ مارتا ہے اور عین ہمارے گھر کے سامنے "فائٹنگ" شروع ہو جاتی ہے۔ غرض کہ وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ہماری نیند بھگانے کے لیے کافی ہے۔

اور یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ کمزور آدمی کی کمزوری سے ہر شخص فائدہ اٹھاتا ہے لیکن ملاحظہ ہو اس حقیر کیڑے کھٹمل کی بیباکی کو کہ وہ ہم سے الجھنے کی جرأت کر بیٹھتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ایک بڑی بھاری فوج ہم پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ حالات کے سنگین ہو جانے پر ہم "مارشل لا" نافذ کر دیتے ہیں اور دکھائی دیتے ہی شوٹ کر دینے کے احکام صادر کر کے ان پر قابو پا لیتے ہیں ــــ کہ اب دشمن کا فضائیہ حرکت میں آجاتا ہے۔ چنانچہ اس کا بھی سخت تعاقب کر کے مار بھگایا جاتا ہے اور اسی تگ و دو میں رات کا بیشتر حصہ گزر جاتا ہے اور کوئی تین بجے ہوتے ہیں کہ پبلک نل پر پانی بھرنے والوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ مرد، عورتیں، جوان، بچے، بوڑھے اپنی اپنی عمر، مزاج، بساط کے مطابق کھانستے، کھنکھارتے، چیختے، پکارتے، آنے شروع ہو جاتے ہیں ــــ بالٹی، صراحیاں، گھڑے رکھے نہیں گئے کہ شروع ہو جاتے ہیں "کیو" بننے لگتا ہے جس کا آخری آدمی کسی نہ کسی طرح ہمارے گھر تک آجاتا ہے۔ پھر جیسے ہی نل کھلتا ہے کیو میں کچھ بد نظمی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے سامنے والے شخص سے پہلے آنے کا دعوے دار ہو جاتا ہے اور سب بہ یک وقت نل پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس گڑبڑ میں دو چار گھڑے بآسانی شہید ہو جاتے ہیں۔ کوئی پانی بھرنا چاہتا ہے تو کوئی میلے کپڑوں کے ڈھیر کو سینے سے لگائے آہیں بھرتا نظر آتا ہے تو کوئی پورے جسم کو صابن لگا کر اُف اُف کرتے ہوئے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ــــ اتنے میں "ملک بودھ" والا آجاتا ہے۔ نیلے کاگ کی بوتل، سرخ کاگ کی بوتل، بینسٹھ پیسے، ستر پیسے کا وِرد آمدِ سحر کا پیغام لاتا ہے۔

جس دن خوش قسمتی سے ان میں سے کچھ نہیں ہوتا اس دن ہمارے کوئی پڑوسی زندگی میں پہلی بار عزمِ سفر کر بیٹھتے ہیں اور آدھی رات سے بیدار ہو کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں یا کوئی جلسہ عام منعقد ہو جاتا ہے یا قوالی کی محفل رنگ جما دیتی ہے یا پھر کوئی کنوارہ بیاہ رچا لیتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر بجنے لگتا ہے اور بینڈ باجہ والے سامعہ نوازی شروع کر دیتے ہیں ــــ !!!

★

منی پور کی دستکاریاں

از: ابو عباد اعظمی

ریاست منی پور ہندستان کے مشرقی حصے میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں مشرق اور جنوب میں برما سے، شمال میں ناگالینڈ سے اور مغرب میں صوبہ آسام کے ضلع کچھار سے ملتی ہیں۔

ریاست منی پور کو مشرقی ہندستان کا خطہ کشمیر کہتے ہیں۔ ریاست کا مجموعی رقبہ ۸۶۲۰ مربع میل ہے جو ایک خوشنما وسطی وادی اور پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ یہ وسطی وادی مستطیل شکل کی ہے جو سطح سمندر سے ۲۶۰۰ فٹ بلند ہے۔ اس وادی میں ایک چھوٹی سی مگر خوب صورت جھیل لوک تک نامی واقع ہے۔ اس جھیل کا رقبہ ۲۵ مربع میل اور وادی کا مجموعی رقبہ ۷۰۰ مربع میل ہے۔ یہ وادی ناگا پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہے جو شمال جنوب پھیلی ہوئی ہیں اور جن کی اوسط اونچائی چھ ہزار فٹ ہے۔ البتہ شمالی سرحد کی پہاڑیاں آٹھ ہزار فٹ اونچی ہیں۔ یہ ساری پہاڑیاں گھنے درختوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں بانس کے جنگل پائے جاتے ہیں۔ وادی کی آب و ہوا معتدل اور پہاڑیوں کی سرد ہے۔ بارش کا سالانہ اوسط ۶۵ انچ ہے۔ دھان یہاں کی خاص فصل ہے۔ دھان کے علاوہ مکا کی بھی کاشت کی جاتی ہے۔ یہاں کی اشیائے خام میں دھان اور ریشم کی تجارت کا ایک خاص مقام ہے۔

ریاست کی آبادی لگ بھگ دس لاکھ ہے۔ عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ میتائی قبیلے پر مشتمل ہے۔ اس قبیلے کے علاوہ یہاں بہت سے مختلف قبائل کے لوگ بھی آباد ہیں۔ پوری آبادی ناگا اور کوکی قبائل سے نسبت رکھتی ہے۔ ہر قبیلے کی الگ الگ بولیاں ہیں مگر منی پوری اور انگریزی دو سرکاری زبانیں ہیں۔ خواندگی کا اوسط تقریباً ۳۱ فیصد ہے۔ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے اس ریاست میں ۱۳ ڈگری کالج، ۱۲۲ ہائر سکنڈری اسکول، ۳۰۴ سینیر بیسک اسکول اور ۲۱۲۰ پرائمری مدرسے کھولے جا چکے ہیں اور مزید کھلتے جا رہے ہیں۔ یہ ریاست پانچ ضلعوں میں منقسم ہے۔ امپھال یہاں کی راجدھانی اور ایک خاص شہر ہے۔

یہاں کے لوگ آزاد اور بے فکر رہ کر رقص و سرود میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ منی پور اپنے رنگین رقص اور اپنی دلکش موسیقی کے لیے سارے ہندستان میں مشہور ہے۔

تاریخی پس منظر۔ ریاست منی پور کا تعلق برٹش انڈیا سے اس وقت ہوا جبکہ ۱۸۱۹ء میں برما نے اس پر چڑھائی کر دی۔ یہاں کے راجہ نے برطانی حکومت سے مدد مانگی۔ ایک کمک مدد کے لیے بھیج دی گئی جس نے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا۔ دوبارہ ۱۸۲۴ء میں منی پور کے راجہ نے برما کی پہلی جنگ کے وقت مدد مانگی جو اسے دی گئی۔

ریاست منی پور میں تخت نشینی کے لیے مستقل جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ ۱۸۹۰ء میں اس وقت کے راجہ کا ایک بھائی سیناپتی تھا۔ اس نے راجہ کو گدی سے اتار کر اس کے ایک نابالغ بیٹے کو گدی پر بٹھا دیا اور سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ معزول راجہ نے انگریزوں سے مدد مانگی۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء میں آسام کے

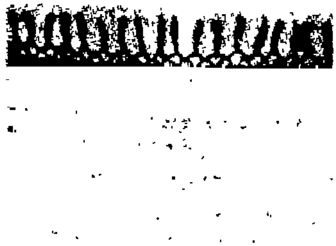
بقیہ صفحہ ۱۱۶ تک

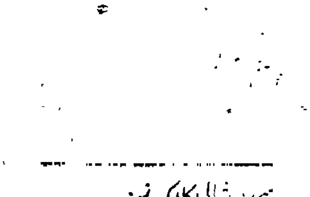
منی پور کی دستکاریوں کے نمونے



ہاتھی دانت کے ظروف کے نمونے

کشیدہ کاری کے نمونے





منی پوری شال کا ایک نمونہ

PICTURES TAKEN FROM MIRROR- SEP. 1968. (BADIUZZAMAN)

چیف کمشنر چار سو گورکھا سپاہیوں کی پلٹن لے کر منی پور اس غرض سے گئے کہ سینا پتی کو ہٹا کر راجہ کو گدی واپس دلادیں۔ سینا پتی کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی مگر وہ مفرور ہو گیا۔ منی پور کے لوگوں نے ریذیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ مگر ان پر جلد ہی قابو پا لیا گیا۔ ایک صلح نامہ کی رو سے چیف کمشنر آسام مسٹر جیمس ولیس کوئنٹن پولیٹیکل ریذیڈنٹ اور تین اعلیٰ افسروں کے ہمراہ باغی سرداروں سے بات چیت کرنے کے لیے قلعہ میں گئے۔ مگر باغی گروہ نے خفیہ سازش کے تحت دھوکے سے ان لوگوں کو مار ڈالا۔ پھر کیا تھا منی پور پر فوج کشی کی گئی۔ باغی گروہ کے افراد مقابلے کی تاب نہ لا کر کچھار کی طرف بھاگ گئے۔ اس طرح پوری ریاست پر قبضہ ہو گیا۔ سینا پتی گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اسے پھانسی دے دی گئی۔ شاہی خاندان کا ایک پانچ سالہ بچہ مسمی چورا چند گدی پر بٹھا دیا گیا۔ اس کی نابالغی کے زمانے میں حکومت کا کام ریذیڈنٹ کرتا رہا بہت سے اصلاحی کام عمل میں آئے۔ غلامی ختم کر دی گئی۔ تعلیم کو فروغ دیا گیا۔ صنعت و حرفت کو ترقی دی گئی نئی نئی سڑکیں نکالی گئیں ایک سڑک آسام بنگال ریلوے لائن سے جوڑنے کے لیے منی پور سے دیما پور تک تعمیر کی گئی جو تجارتی شاہراہ کا درجہ رکھتی ہے۔

چورا چند کے بالغ ہو جانے کے بعد ۱۹۰۷ء میں سارا اقتدار راجہ کو سونپ دیا گیا۔ راجہ کی مدد کے لیے ایک کونسل بنا دی گئی۔ انڈین سول سروس کے ایک افسر کو اس کا نائب صدر بنا دیا گیا۔ ہندستان کو آزادی ملنے کے دو برس بعد ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو یہ ریاست ہند یونین میں شامل ہو گئی۔ اب یہاں پر پارلیمانی طرز کی حکومت رائج ہے۔ شری بی۔ کے۔ نہرو یہاں کے گورنر اور ۱۹۷۲ء کے حالیہ انتخاب کے بعد پیوپلز پارٹی کے لیڈر شری محمد علیم الدین چیف منسٹر ہیں۔

دستکاریاں۔ یہاں کی دستکاریوں کے نمونے اپنی مثال نہیں رکھتے دستکاری اہل منی پور کی زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ قدرت نے اس ریاست کو قدرتی مناظر سے فیاضی کے ساتھ نوازا ہے۔ ہرے بھرے پہاڑی سلسلے، خوب صورت جھیلیں، سرسبز و شاداب وادی اور انواع و اقسام کے خوشنما پھول پودے قدرت کے عطیات ہیں۔ ان قدرتی مناظر کا عکس یہاں کی عام زندگی اور مصنوعات پر نمایاں رہتا ہے۔ یہاں کے دستکار طرح طرح کی دستکاریوں کے نمونے پیش کرتے رہتے ہیں جو اپنی جاذبیت سے نہ صرف ہندستان میں بلکہ بیرون ہند بھی مقبول ہیں۔ یہاں کی دستکاریوں میں پارچہ بافی کشیدہ کاری، گڑیاں اور کھلونے کا کام، ہاتھی دانت کا کام، پتھر پر کھدائی، لکڑی پر نقش و نگار کی کھدائی، بانس اور بید کی صنعت دھات کے ظروف بنانے کا کام، مصنوعی پھول اور زیورات سازی اور دیواروں پر آویزاں کرنے کے لیے ہرن کی سینگوں کو تیار کرنا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

پارچہ بافی۔ یہ یہاں کی قدیم اور سب سے بڑی صنعت ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کپڑے کی صنعت ایک ایسے محور کی حیثیت رکھتی ہے جس پر ان کا معاشرہ گردش کرتا ہے کیونکہ یہ پیشہ کسی خاص قبیلے یا کسی خاص طبقے سے منسوب نہیں ہے۔ کرگھے پر تیار کیے گئے کپڑے زبان حال سے ان کے کمال فن کی شہادت دیتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے سوتی اور ریشمی کپڑوں کے علاوہ چادریں اور پردے وغیرہ بھی یہاں تیار کیے جاتے ہیں جو بہترین ڈیزائن کے نمونے ہوتے ہیں۔

کشیدہ کاری۔ قبائلی قبیلے کی عورتوں کی پوشاک پر ریشمی دھاگوں سے کشیدہ کاری کا کام ایک ضروری جزو مانا جاتا ہے۔ خاص کر شال نما چادروں پر بیل بوٹے بنانا اور انھیں ہاتھی، گھوڑے اور پرندوں کے شکار کی تصویروں یا قبائلی لڑائیوں کی شکلوں سے مزین کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ شال کے حاشیے رنگ آمیزی کے شاہکار مانے جاتے ہیں۔ اسی انداز پر ساڑیوں، چادروں، پردوں، میز پوشوں، ٹی کوزیوں، گدّوں کے غلاف اور تکیے کور کو بھی آراستہ کیا جاتا ہے۔

ناچ کا لباس۔ منی پور کا کلاسیکل رقص سارے ہندستان میں پسند کیا جاتا ہے۔ اُن کا رقص اُن کے لیے ان کے جیون موتی کا روپ رکھتا ہے۔ رقص کی زرق برق پوشاک جس پر سونے اور چاندی کے تاروں کا کام ہوتا ہے، گویا دلکشی و دل آویزی اور خوب صورتی کا پیکر ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ہر جوان لڑکی سندر سپنا دیکھتی رہتی ہے۔

گڑیا سازی کا فن۔ یہاں کی بنی ہوئی گڑیاں رقص کی پوشاک
میں ملبوس رہتی ہیں۔ وہ راس لیلا یا ناگا رقاصاؤں یا قبائلی ناچ
رقی کی شبیہہ ہوتی ہیں۔ ایسی بھی گڑیاں بنائی جاتی ہیں جو یہاں
کے قبائل اور قبائلی تمدن کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ یہ گڑیاں منی پور
کے حدود کے باہر منہ مانگے داموں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی
ہیں۔ اس صنعت کا مستقبل بہت ہی درخشندہ ہے۔

زیور سازی۔ رقص کرنے والی لڑکیوں کو بھڑکیلی پوشاک کے
علاوہ جگمگاتے ہوئے زیورات سے بھی آراستہ کیا جاتا ہے۔
ولڈ گولڈ کے گلوبند، ہار اور بازوبند بنائے جاتے ہیں۔ ان کے
علاوہ چوڑیاں، نتھ اور بالیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ گلوبند اور
ہار پر کوڑیوں اور سنکھ کے نمونے تراشے جاتے ہیں اور بازوبند
پر سانپ کے منہ بنے رہتے ہیں۔ یہاں کے بنے ہوئے زیورات
کی مانگ ہندستان کے باہر دوسرے ملکوں میں زیادہ ہے۔

بانس اور بید کی صنعت۔ بانس اور بید منی پور کے لیے قدرت
کی ایک دین ہے۔ ان سے مختلف اقسام کی، مختلف رنگ کی اور
مختلف کاموں میں استعمال ہونے والی ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔
یہ صنعت بھی یہاں کی ایک قدیم صنعت ہے۔ ٹوکریوں میں پھروک
(بالٹی کی شکل کی)، چنگث بول (مربع کی شکل کی)، ین پاک (چھتری
کی شکل کی ٹوپی)، شنگول (مچھلی پکڑنے کا ناپا) مخصوص ہیں۔ ان کے
علاوہ اور بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں جیسے چھڑی، بائیسکل کی
ٹوکریاں، سوٹ کیس، ہینڈ بیگ، گلدان، ایش ٹرے، کیلنڈر
اسٹینڈ، چڑیوں کے پنجرے وغیرہ۔ عمدہ قسم کے بانس اور بید
سے ڈرائنگ روم فرنیچر بھی بنائے جاتے ہیں جیسے میز، کرسیاں،
ریک وغیرہ۔ مختلف قسم کے باجے، تیر و کمان، تمباکو کے پائپ
اور کھلونے بھی بانس ہی کے بنائے جاتے ہیں۔ غرض یہاں کے
معاشرے میں بانس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔

گھنٹہ بنانے کی صنعت۔ یہاں کا بجروں کا ایک طبقہ ایسا
بھی ہے جس نے گھنٹے بنانے کی صنعت کو اپنا لیا ہے۔ یہ لوگ ایک
مخصوص علاقے میں رہتے ہیں۔ گھنٹہ بنانے کے علاوہ یہ لوگ سنگاردان
کی قسم کا زیورات رکھنے کا صندوقچہ بنانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔
ڈلی رکھنے کے لیے اسی دھات کی ایک خاص قسم کی ڈبیہ بھی بناتے
ہیں۔ یہ دونوں اشیا ان کے فن کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کی
نمائشیں شادی بیاہ اور مذہبی تہواروں کے موقع پر خاص طور پر کی جاتی ہیں۔

نقاشی کا کام۔ ہاتھی دانت، پتھر اور لکڑی پر نقاشی کا کام یہاں کی
عام صنعت ہے۔ مکانوں کے دروازوں اور کھڑکیوں پر اعلیٰ درجہ کی
نقاشی کی جاتی ہے۔ ہاتھی دانت کی چوڑیاں، کھلونے اور سجاوٹ کے
لیے انواع و اقسام کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے
یہ صنعت بہت زیادہ ترقی پر تھی۔ فی الحال ایسے سامان تیار کیے جاتے
ہیں جن سے مکانوں کی سجاوٹ ہو سکے۔

دیواروں پر آویزاں کرنے کے لیے ہرن کی سنگین اس طرح تیار
کی جاتی ہیں کہ دیکھنے میں جاذب نظر معلوم ہوں۔ بانس کی چھڑیاں
جن کے دستانوں پر نقش و نگار بنے ہوتے ہیں، منی پور کی ایک خاص
صنعت ہے۔ یہ اشیا تحائف دینے کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہیں۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جب یہ علاقہ آمد و رفت کی سہولتوں
میں اضافے کے باعث ہندستان کے مختلف علاقوں سے جڑ جائے گا تو
یہاں کی جملہ دستکاریوں کے فروغ کی راہیں نکل آئیں گی۔ ملک کے
بڑے بڑے شہروں جیسے کلکتہ، بمبئی، مدراس، دلی وغیرہ میں
یہاں کی حسین مصنوعات کی مانگ اور کھپت کے بڑھنے
کے ساتھ ساتھ اہلِ منی پور کی خوشحالی اور فارغ البالی میں بھی
اضافہ ہوتا جائے گا۔

★

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

امداد باہمی قرضہ پالیسی میں انقلابی تبدیلی — غریبوں کو بلا ضمانت قرضہ ... قومی بچت اسکیموں کے تحت نشانے سے زیادہ رقم جمع ... مرمت مکان کے لیے پیشگی رقم کی انتہائی حد میں اضافہ ... اسکولی عمارتوں کے لیے تقریباً ۵ لاکھ روپیہ منظور ... سرکاری اسپتالوں میں طبی اسقاط حمل کی سہولتیں ... اردو کتابوں پر انعامات — اردو اکادمی کا فیصلہ ... جنگ کے سورماؤں کے لیے آگرہ میں مکانات کی تعمیر ... دفاعی فنڈ میں عطیات ... فیکٹری انسپکٹروں کی ملازمت کے قواعد میں ترمیم ... وارانسی میں دو لفٹ نہروں کی تعمیر ... گورکھپور پالی ٹکنیک میں ریفریجریشن اور ایرکنڈیشننگ کورس کا انتظام ... ۲۸۰۰ بستیوں کو بجلی کی فراہمی ... ساڑھے گیارہ لاکھ ایکڑ اراضی کے لیے آب پاشی کی سہولتیں ... متفرقات

اس سال سے شروع ہونے والے "سفید انقلاب" کے پروگرام کے تحت سماج کے کمزور اور نادار طبقے کے افراد کو بڑے پیمانے پر بلا ضمانت قرضہ دینے کا بندوبست کیا جارہا ہے۔ یہ اقدام امداد باہمی قرضہ پالیسی میں ایک انقلابی تبدیلی ہے۔ یہ قرضے ممبروں کو بھینسوں کی شکل دیے جائیں گے۔

وزیر امداد باہمی شری لکشمی شنکر یادو نے امداد باہمی قرضہ پالیسی میں اس تبدیلی کا ذکر دیہی بے روزگاری دور کرنے کے سلسلہ میں "سفید انقلاب" کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کیا۔ وزیر موصوف جونپور سے تقریباً ۴۵ کلومیٹر دور موضع تاسی میں ایک عام جلسے کو خطاب کر رہے تھے۔

وزیر امداد باہمی نے کہا کہ بینکنگ کے موجودہ طریقہ کار میں اب تک ناداری کو سب سے بڑی نا اہلی تصور کیا جاتا تھا لیکن امداد باہمی قرضوں کے ذریعے اپنے لیے روزگار کے متلاشی افراد کے لیے اب ان کی ناداری ہی سب سے بڑی اہلیت اور ضمانت بن جائے گی۔

شری یادو نے کہا کہ امداد باہمی بینکوں نے رکشا چلانے والوں کی امداد باہمی انجمنوں کے ہزاروں ممبروں کو بلا ضمانت قرضے کی شکل میں رکشے فراہم کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ناداروں کو بلا ضمانت قرضہ دینے کے سلسلے میں خطرہ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایسی ایک بھی شکایت موصول نہیں ہوئی ہے کہ رکشا چلانے والا رکشا لے کر بھاگ گیا ہے یا اس نے قرضے کی یومیہ قسط کی ادائیگی میں کوئی گڑبڑی کی ہو۔

شری یادو نے کہا کہ "سفید انقلاب کے پروگرام کے تحت دیہی امداد باہمی دودھ انجمنوں کے ہریجن اور بے زمین ممبروں کو بلا ضمانت قرضے کی شکل میں بھینسیں دی جائیں گی۔ موٹے طور پر تخمینہ لگایا گیا ہے کہ فی بھینس ۱۵۰ روپیہ سے لے کر ۲۰۰ روپے ماہانہ تک کی خالص آمدنی ہوگی۔ سفید انقلاب پروگرام کے تحت اضلاع میں کم سے کم ۲۰۰ دودھ امداد باہمی انجمنیں قائم کی جائیں گی اور ہر انجمن میں ممبروں کی تعداد ۲۰ سے زیادہ ہوگی۔

x x x x

اتر پردیش نے ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران ۱۱۶ء۴۰ کروڑ روپے کی رقم جمع کی ہے جب کہ بنیادی نشانہ ۲۹ کروڑ روپے کا مقرر کیا گیا تھا۔

ریاستی حکومت نے گزشتہ ۱۱ نومبر کو منعقدہ ریاستی مشاورتی بورڈ کے جلسے میں ۴۰ کروڑ روپے کے نظر ثانی شدہ نشانہ کا اعلان کیا تھا۔

اضلاع میں سیتاپور نے اپنے بڑھتے ہوئے نشانہ کی ۱۵۵

فی صد رقم جمع کرکے پہلا مقام اور میرٹھ نے ۱۳۹٫۲۴ فی صد رقم جمع کرکے دوسرا مقام حاصل کیا ہے۔ تیسرا مقام مظفر نگر نے حاصل کیا ہے جہاں مقررہ نشانہ کی ۱۳۷٫۲۴ فی صد رقم جمع کی گئی ہے۔ اس طرح ریاست میں چھوٹی بچت اسکیموں کے تحت رقمیں جمع کرنے کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے۔

دیگر اضلاع جنہوں نے قومی بچت اسکیموں کے تحت مقررہ نشانوں سے زیادہ رقمیں جمع کی ہیں حسب ذیل ہیں:

مرزا پور ۱۱۶٫۸۷ فی صد، سہارن پور ۱۱۵٫۷۵ فی صد، ایٹہ ۱۱۲ فی صد، نینی تال ۱۱۱ فی صد، دہرہ دون ۱۱۰٫۳۳ فی صد، چمولی ۱۰۸٫۵۷ فی صد، پوڑی گڑھوال ۱۰۶ فی صد، پتھورا گڑھ ۱۰۳ فی صد، بلند شہر ۱۰۱ فی صد اور دیوریا ۱۰۰ فی صد۔

اس کے علاوہ حسب ذیل ۱۸ ضلعوں نے ریاست کے ۲۹ کروڑ روپے پر مبنی اپنے بنیادی نشانہ سے زیادہ رقم جمع کی ہے۔

پتھورا گڑھ ۱۴۶ فی صد، وارانسی ۱۲۸ فی صد، بجنور ۱۲۷٫۴۴ فی صد، بارہ بنکی ۱۲۰٫۲۰ فی صد، گونڈہ ۱۱۴ فی صد، الموڑہ ۱۱۱ فی صد، سلطان پور ۱۰۸٫۲ فی صد، اتر کاشی ۱۰۷٫۱۲ فی صد، بہرائچ ۱۰۶٫۵ فی صد، پیلی بھیت ۱۰۵٫۹۵ فی صد، بلیا ۱۰۵٫۵۶ فی صد، الہ آباد ۱۰۴٫۴ فی صد، غازی پور ۱۰۳٫۹ فی صد، فتح پور ۱۰۳٫۴۳ فی صد، علی گڑھ ۱۰۲٫۳۳ فی صد، رام پور ۱۰۲ فی صد، گورکھپور ۱۰۰ فی صد اور ٹہری ۱۰۰ فی صد۔

× × × ×

ریاستی حکومت نے اپنے ملازمین کو مکانات کی مرمت کے لئے منظور کی جانے والی رقم کی انتہائی حد میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ ریاستی کابینہ نے اپنے ایک حالیہ جلسے میں کیا ہے۔

اس فیصلے کے مطابق ۴۵۰ روپے ماہانہ تک تنخواہ پانے والے ملازمین کو مکان کی مرمت کے لیے ان کی تنخواہ کے ۲۴ گنا تک پیشگی رقم منظور کی جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ انتہائی حد ۱۰۰۰۰ روپے سے تجاوز نہ کرے۔ وہ ملازمین جو ۴۵۰ روپے ماہانہ سے زیادہ تنخواہ پا رہے ہیں انھیں یہ رقم ان کی تنخواہ کے ۱۲ گنا تک کے بقدر منظور کی جاسکے گی لیکن اس کی انتہائی حد ۳۵۰۰۰ روپئے ہوگی۔ ملازمین ان پیشگی رقموں کی ادائیگی بالترتیب ۹۶ اور ۴۸ قسطوں میں کریں گے۔

کابینہ نے یہ فیصلہ مکانات کی مرمت کے لیے درکار ساز و سامان کی قیمتوں میں اضافے کے پیش نظر کیا ہے۔ اب تک مکان کی مرمت کے لیے پیشگی رقم بنیادی تنخواہ کے ۱۲ گنا تک منظور کی جاتی تھی اور اس کی ادائیگی ۴۸ قسطوں میں کی جاتی تھی۔

× × × ×

ریاستی حکومت نے دیہی علاقوں میں ضلع پریشدوں کے ۵۸۸۲ جونیر بیسک اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر کے لیے ۴۹۹۷۰۰۰ روپے کی رقم منظور کی ہے۔ پریشدوں کو ان اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر کا کام ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء تک مکمل کر لینا ہوگا۔ مذکورہ بالا منظور شدہ رقم میں سے ضلع پریشدوں کو ہر اسکول کی عمارت کی تعمیر کے لیے ۸۵۰۰ روپے کی بطور امداد دیے جائیں گے۔

اس رقم سے حسب ذیل ۱۱۶ ضلعوں میں اسکول کے لیے عمارتیں تعمیر کی جائیں گی:

مین پوری، بہرائچ، گورکھپور، الموڑہ، کھیری، اناؤ، سیتاپور، دہرہ دون، بریلی، بدایوں، شاہجہاں پور، مرزا پور اور وارانسی۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل ۱۱۵ ضلعوں میں بھی اسکولوں کے لیے عمارتیں تعمیر کی جائیں گی۔

آگرہ، علی گڑھ، ایٹہ، متھرا، الہ آباد، اٹاوہ، فرخ آباد، فتح پور، کانپور، بارہ بنکی، فیض آباد، گونڈہ، پرتاپ گڑھ، سلطان پور، پوڑی گڑھوال، ٹہری گڑھوال، اعظم گڑھ، بستی، دیوریا، باندہ، ہمیر پور، جالون، جھانسی، نینی تال، ہردوئی، لکھنؤ، رائے بریلی، بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور، بجنور، مرادآباد، پیلی بھیت، رام پور، بلیا، غازی پور اور جونپور۔

× × × ×

ریاست میں طبی اسقاط حمل سے متعلق سنہ ۱۹۷۱ء ایکٹ

یکم اپریل ۱۹۷۲ء سے نافذ کر دیا گیا ہے۔

ریاستی گزٹ کی ایک غیر معمولی اشاعت میں شائع شدہ "اتر پردیش طبی اسقاط حمل ضوابط" کے تحت قانونی اسقاط حمل کی سہولتیں ریاست کے منتخب اسپتالوں کو اور مصدقہ نجی مقامات پر حاصل ہوں گی۔

حکومت نے اسقاط حمل کے سلسلے میں رجسٹرڈ معالجین اور مصدقہ نجی مقامات کی سفارش کرنے کے لیے ایک تصدیق بورڈ کی تشکیل کی ہے۔

اتر پردیش کے علاج و صحت کے محکمہ کے ڈائرکٹر باعتبارِ عہدہ اس بورڈ کے بالترتیب چیرمین ہوں گے اور جوائنٹ ڈائرکٹر (خاتون) سکریٹری۔ کے۔ جی میڈیکل کالج لکھنؤ کے متعلقہ مضامین کے پروفیسر اور انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن اتر پردیش کی ریاستی شاخ کے صدر بورڈ کے ممبران ہوں گے۔

ریاست کے تمام اسپتالوں میں چونکہ اسقاط حمل کے علاج سے متعلق تربیت یافتہ ڈاکٹر اور دیگر ضروری ساز و سامان دستیاب نہیں ہیں اس لیے اسکیم کے پہلے مرحلے میں اس کے لیے جن اسپتالوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:

لیڈی لیال اور ڈفرن اسپتال آگرہ، اے ایچ۔ ایم اینڈ ڈفرن اسپتال کانپور، ایشوری میموریل اسپتال وارانسی، ڈفرن اسپتال لکھنؤ، ڈفرن اسپتال الہ آباد، میڈیکل کالج الہ آباد، میڈیکل کالج کانپور، میڈیکل کالج آگرہ اور میڈیکل کالج میرٹھ۔

× × × ×

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے گذشتہ سال شائع شدہ کتابوں پر جو اکاڈمی کو موصول ہو چکی ہیں، انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

اکاڈمی کی مجلس عاملہ نے جس کا جلسہ گذشتہ ۸ر اپریل کو ہوا تھا، یہ بھی محسوس کیا کہ گذشتہ سال کے دوران شائع شدہ کتابوں پر انعامات دینے کے علاوہ یکم دسمبر ۱۹۶۸ء سے ۳۰ر نومبر ۱۹۷۱ء کے درمیان میں شائع شدہ کتابیں بھی انعامات دینے کے لیے غور کرنے کے واسطے طلب کی جانا چاہیے۔

یاد ہوگا کہ کتابوں پر انعامات دینے کی اسکیم ایک لاکھ روپیے کی رقم کے ساتھ حال ہی میں نظامت تعلیم سے اتر پردیش اردو اکاڈمی کو منتقل کر دی گئی ہے۔ بنیادی اسکیم کے تحت صرف یکم دسمبر ۱۹۷۰ء سے ۳۰ر نومبر ۱۹۷۱ء تک کے دوران شائع شدہ کتابوں پر بھی انعام کے لیے غور کیا جانا تھا۔

مجلس عاملہ نے اردو کتب، اخبارات اور جرائد کی خریداری کے لیے لائبریری ذیلی کمیٹی کے قواعد و ضوابط کی بھی منظوری دی۔

مجلس عاملہ نے اردو تعلیم کا کام دیکھنے کے لیے ایک تعلیمی ذیلی کمیٹی اور مصنفین کو مالی امداد دینے کے لیے ایک ذیلی کمیٹی بھی مقرر کی۔

× × × ×

جنگ کے سورماؤں کی بیواؤں اور معذور ہو جانے والے فوجی جوانوں کو رہائش کی سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے آگرہ میں مکانات کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا ہے۔

تعمیراتی پراجیکٹ کا افتتاح وزیر ریاست برائے صحت شری دیو کی نندن وبھو نے کل آگرہ میں کیا۔ اس تقریب میں بری، بحری اور فضائی افواج کے سینیر افسروں نے شرکت کی۔ اسی طرح کی ایک کالونی لکھنؤ میں تعمیر کی جا چکی ہے۔

وزیر موصوف نے جنگ کے سورماؤں کے لیے تعمیر مکانات کے پراجیکٹ کے واسطے تقریباً ۱۵ لاکھ روپیہ جمع کیا تھا جس میں سے کانپور نے ۵،۵ لاکھ روپیہ اور میرٹھ نے ۳،۵ لاکھ روپیہ دیا تھا اور بقیہ رقم دیگر اضلاع نے دی تھی۔ یہ کل رقم وزیر اعلیٰ دفاع فنڈ میں دیدی گئی ہے۔

× × × ×

۱۹۷۱ء

اتر پردیش ریاستی شہری کونسل نے یکم اپریل اور ۱۵ر اکتوبر کے درمیان ۳۰ اضلاع سے ۳،۴۲ لاکھ روپے سے زیادہ کے عطیات جمع کیے۔ اس کے علاوہ ہندستان کمرشیل بینک میں کونسل کے کھاتہ میں ۲،۴۵ لاکھ روپے کی رقم پہلے سے ہی جمع تھی۔ اس طرح کل رقم ۵،۶۷ لاکھ روپے سے زیادہ ہو گئی۔

یہ اطلاع وزیر اعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی نے حال ہی میں ودھان پریشد کے ممبران کو دی اور مزید بتایا کہ شہری کونسل نے وزیر اعظم قومی امدادی فنڈ میں ۴۰۹۰۰۱ روپے کا عطیہ دیا اور بنگلہ دیش کے پناہ گزینوں کی امداد پر ۱۵۴۵۸ روپے کی رقم خرچ کی۔ دیگر اخراجات میں مصیبت زدہ افراد کی امداد کے لیے دی جانے والی ۱۱۰۰۰ روپے کی رقم بھی شامل ہے۔

اترپردیش ریاستی شہری کونسل کے ورکنگ صدر شری رام کمار شاستری کی اطلاع کے مطابق اپریل ۱۹۷۲ء تک اس ضلع میں دفاع فنڈ کے لیے ۱۱،۵۰ لاکھ روپیہ جمع کیا جا چکا ہے۔

ضلع کی رفتار ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے شری شاستری نے کہا کہ وہاں چھوٹی بچت اسکیم کے تحت ایک کروڑ روپے کی رقم جمع کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تیز رفتار پروگرام کے تحت سڑک کی تعمیر کے کام میں کافی ترقی ہوئی ہے۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مسرکھ میں مچھلیوں کی ترقی کے لیے ایک خوب صورت تالاب تعمیر کیا گیا ہے۔

اترپردیش ریاستی بجلی بورڈ کے افسروں اور ملازموں نے وزیر اعلیٰ دفاعی فنڈ میں اب تک ۴۵۱۶۱۴۱ روپے کا عطیہ دیا ہے۔ اس سے قبل ۲۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بورڈ کے افسروں اور ملازموں نے ۳۷۳۰۰ روپے کی تھیلی وزیر اعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی کو پیش کی تھی۔ اس کے بعد ۷۸۶۱۴۱ روپے کی مزید رقم جمع کر کے وزیر اعلیٰ دفاع فنڈ میں دی گئی ہے۔

× × × ×

حکومت اترپردیش نے انسپکٹر آف فیکٹریز کی آسامیوں پر تقرری کے لیے عمر کی انتہائی حد اور لازمی متبادل تعلیمی استعداد سے متعلق ضوابط میں ترمیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

مجوزہ ترمیمات کے مطابق وہ افراد بھی انسپکٹر آف فیکٹریز کی آسامی پر تقرری کے حق دار ہوں گے جنھوں نے کوئی ایسی ڈگری یا ڈپلوما حاصل کیا ہے جسے انجینئرنگ یا ٹیکنالوجی کی کسی شاخ میں ہندوستان میں قانون کے تحت قائم شدہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری کے مساوی تسلیم کیا جاتا ہو بشرطیکہ وہ دیگر شرائط بھی پوری کرتے ہوں۔

جہاں تک عمر کا تعلق ہے امیدواروں کی عمر کی انتہائی حد آسامی کے مشتہر ہونے کی تاریخ کے بعد پڑنے والی یکم جنوری کو ۴۰ سال سے گھٹا کر ۳۰ سال کر دی گئی ہے۔

اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے امیدواروں کے لیے عمر کی انتہائی حد بہر حال ۳۵ سال رکھی گئی ہے۔

× × × ×

کسانوں کو آب پاشی کی سہولت فراہم کرنے کے لیے ضلع وارانسی کی چندولی کی تحصیل میں دو نئی لفٹ نہروں کی تعمیر مکمل ہو گئی ہے۔

ان میں سے ایک ۲۴،۵۰ لاکھ روپے کی لاگت کی ملکی پور پمپ نہر جو موضع ملکی پور کے قریب واقع ہے اور جس سے ۲۰ کیوسیکس کے حساب سے ۱۳۰۰ ایکڑ کی آب پاشی کی جائے گی۔ دوسری نہر ۱۱،۶ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کی جانے والی کنڈا کلاں پمپ نہر جو موضع کنڈا کے نزدیک واقع ہے اور جس سے ۵ کیوسیکس کی شرح سے ۷۵۰ ایکڑ کی آبیاری کی جائے گی۔

ان دونوں نہروں کے لیے گنگا ندی سے پانی حاصل کیا جائے گا اور کسانوں کو ان نہروں کے ذریعے فراہم کیا جائے گا۔

× × × ×

گورنمنٹ سیانی ٹیکنیک، گورکھپور میں آیندہ تعلیمی سال سے ریفریجریشن اور ایرکنڈیشننگ میں ایک سال کا پوسٹ ڈپلوما کورس شروع کیا جائے گا۔

کولڈ اسٹوریجوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور بڑے پیمانے پر ایرکنڈیشننگ کے ساز و سامان کی تیاری کے پیش نظر اس کورس کو شروع کرنا مناسب سمجھا گیا کیونکہ اس قسم کا ساز و سامان تیار کرنے اس کو درست حالت میں رکھنے اور استعمال کرنے کے لیے بڑی تعداد میں ہنر مند مزدوروں اور انجینیروں کی ضرورت ہو

متفرقات

خصوصی علاقائی پراجیکٹ ۔ ریاستی حکومت نے دہرہ کلسی اور رکھیری میں جنگلات کے علاقہ میں قبائل مندرجہ فلاح کے لیے خصوصی علاقائی پراجیکٹ بروئے کار لانے مزید ۲۰۰ء۴ روپے کی منظوری کی ہے۔

ان پراجیکٹوں میں زراعت، باغبانی کی ترقی، نقل و حمل، پیمانے کی آبپاشی، اجتماعی ترقی، تعلیم اور ترقیاتی مرکز وغیرہ اسکیمیں شامل ہیں۔

ممتاز اُردو مصنف کو علاج کے لیے مالی امداد ۔ اتر پردیش اُردو اکاڈمی نے اُردو کے معمر ممتاز مصنف اور شاعر حامد اللہ افسر کو علاج کے لیے ۵۰۰ روپے کی مالی امداد کا فیصلہ کیا ہے۔ شری افسر کچھ عرصے سے علیل اور بالکل صاحب فراش جنوری تک ۲۲۰۱۱ مواضعات میں بجلی ۔ وزیر مالیات نارائن دت تیواری نے ودھان پریشد کے حالیہ اجلاس کے دوران ایوان کو مطلع کیا کہ ریاست میں گزشتہ ۳۱ جنوری تک ۲۲۰۱۱ مواضعات کو بجلی فراہم کی جا چکی تھی اور بقیہ مواضعات کو بھی بجلی فراہم کرنے کی اسکیم تیار کر لی گئی ہے۔

وزیر موصوف نے ایوان کو مزید مطلع کیا کہ ۷۳-۱۹۷۲ء میں ۳۰۰۰ مواضعات کو اور ۷۴-۱۹۷۳ء میں ۳۰۰۰ مواضعات کو بجلی فراہم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کا مقصد ۱۹ء تک اتر پردیش کے ۲۶۲۴۱۱ مواضعات کو بجلی فراہم کرنا ہے۔

شری تیواری نے کہا کہ پانچویں منصوبے میں دیہی بجلی فراہم کرنے اور دیہی سڑکوں کے کام کو اولیت دی جائے گی۔

لکھنؤ گورنمنٹ پالی ٹیکنک میں نیا کورس ۔ گورنمنٹ گرلز پالی ٹیکنک لکھنؤ میں سال رواں کے دوران پوشاکوں کے اور ملبوسات کی تیاری سے متعلق تین سال کی مدت کا ایک کورس شروع کیا جائے گا۔

اس کورس کے لیے چوتھے منصوبے میں ۱۰۹۷۰۰ روپیہ چھٹے منصوبے کے دوران اس کورس کو چلانے پر ۲۴۹۳۰۰ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ اس کورس کے لیے ریاست کے ۷۳-۱۹۷۲ء کے بجٹ میں ۷۰، ۱۱ لاکھ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ریاست میں گزشتہ مارچ کے دوران ٹہری، پوڑی اور الموڑہ کے ضلعوں میں جن ۲۸ بستیوں کو بجلی فراہم کی گئی ہے، ان میں سے دو بستیاں ضلع ٹہری کی، ۸ بستیاں ضلع پوڑی کی اور ۱۸ بستیاں ضلع الموڑہ کی ہیں۔ ان بستیوں کے نام یہ ہیں ــــ

چھام اور ڈویرا (ٹہری) ایٹھا نانگ، پدم پور، ستادر پور، بلبھدر پور، شمبھو نگر دوی، کشن پور، لوک مانی پور، اور بجے دیو پور (پوڑی) اور ستکورا، کھرکہ کارکی، پامیٹ، ماڈلیکھ پانڈے، مجکارکی، تکنترا، کھارکین، پاتنوڑ، تھاٹن، موہر، چوسل، کوبی ٹھیکہ، سیناہاٹ، تالی ہاٹ، پایا، کمڈٹ، دارمر، چوکھٹیا اور گنائی (الموڑہ)

× × × ×

چھوٹے پیمانے پر آب پاشی کی نجی اسکیموں کے تحت گزشتہ فروری کے آخر تک ۱۱ لاکھ ۳۳ ہزار ایکڑ مزید آراضی کو آب پاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ان اسکیموں میں کنوؤں اور گولوں کی تعمیر، پمپنگ سیٹوں کی تنصیب نجی اور سرکاری ٹیوب ویلوں وغیرہ کی تعمیر شامل ہے۔

زیر نظر مدت کے دوران دیگر کاموں کے علاوہ ۲۱۸۵۱ پکے کنوؤں کی تعمیر کی گئی، ۲۰۳۲۹ پمپنگ سیٹ لگائے گئے، ۴۰۲۷۶ نجی ٹیوب ویلوں کی تعمیر کا کام پورا کیا گیا اور ۶۶،۴۷۲ پمپنگ سیٹوں اور ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کی گئی۔

اس کے علاوہ ۳۳۵۹، ۷ ایکڑ آراضی پر نجی اور گاؤں سبھا کی بندھیوں کی تعمیر کی گئی۔ پہاڑی اضلاع میں ۱۲۵۶ ایکڑ زمین کو آب پاشی کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے گولوں اور ذخیرہ ہائے آب کی تعمیر بھی کی گئی۔

× × × ×

رقم رکھی گئی ہے اس میں ۷۲-۱۹۷۱ء کے لیے ۲۵۰۰۰ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

اتر کاشی کے لیے دوسرا ٹاؤن ایریا۔ حکومت اتر پردیش نے سرحدی ضلع اترکاشی کی بارکوٹ گرام سبھا کا درجہ بلند کر کے اس کو مارچ ۱۹۷۲ء سے ٹاؤن ایریا کمیٹی بنا دیا ہے۔ ضلع میں یہ دوسری ٹاؤن ایریا کمیٹی ہوگی۔ پہلی ٹاؤن ایریا کمیٹی بھٹواری کی ہے۔

مرزاپور میں دنیا کا سب سے بڑا قالین کورگھا۔ مرزاپور میں دنیا کا سب سے بڑا قالین لوم ہے جو کسی بھی مطلوبہ لمبائی کا ۴۰ فٹ تک کا چوڑا قالین تیار کر سکتا ہے۔ یہ انکشاف وارانسی میں اس سے قبل ہفتہ کے دوران منعقدہ قالین سازی کی صنعت سے متعلق ایک سیمینار میں کیا گیا۔

مرزاپور بھدوہی اور نواحی علاقوں میں عالمی بازار کے لیے ۱۲ کروڑ روپے سالانہ مالیت کے قالین تیار کیے جاتے ہیں۔

تربھون یونی ورسٹی کی ڈگریاں تسلیم۔ حکومت اتر پردیش نے ریاستی ملازمتوں اور آسامیوں پر تقرری کے لیے تربھون یونیورسٹی کاٹھمنڈو کی ڈگریوں اور سرٹی فکٹوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ فیصلہ حال ہی میں اتر پردیش کابینہ کے ایک جلسے میں کیا گیا۔

تربھون یونی ورسٹی کی طرف سے دی جانے والی ڈگریوں اور ڈپلوما کو کسی بھی ہندستانی یونی ورسٹی کی ڈگریوں اور ڈپلوما کے مساوی تصور کیا جائے گا۔ حکومت ہند نے بھی اس یونیورسٹی کی ڈگریوں اور ڈپلوما کو تسلیم کر لیا ہے۔

قیدیوں نے پیتل کے ۹۰۳۰۴ برتن تیار کیے۔ سنٹرل جیل وارانسی کے قیدیوں نے ۱۹۷۱ء کے دوران جیل کے محکمے کے استعمال کے لیے ۳۰۲۴۴ روپے مالیت کے مختلف قسم کے پیتل کے ۹۰۳۰۴ برتن تیار کیے ہیں۔ زیر نظر سال کے دوران اس کام میں اوسطاً روزانہ ۲۷ قیدیوں نے حصہ لیا۔

★

اتر پردیش اردو اکاڈمی کی جانب سے کتب خانوں کو مالی امداد
نئی درخواستیں نئے فارم پر ۳۱ راگست ۱۹۷۲ء تک مطلوب

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے کتب خانوں اور دار المطالعوں کو اردو کتابیں، اخبارات اور رسائل کی خریداری کے لیے ۳۶،۷۵۰ روپے کی مالی امداد منظور کی ہے۔ ان کتب خانوں اور دار المطالعوں کی درخواستیں نظامت تعلیمات کی معرفت اردو اکاڈمی کو موصول ہوئی تھیں۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے آئندہ مالی امداد منظور کرنے کے لیے نئے شرائط اور نئے قواعد تیار کیے ہیں اور کتب خانوں / دار المطالعوں سے اپنے مقررہ فارم پر نئی درخواستیں طلب کی ہیں۔ یہ فارم سکریٹری، اتر پردیش اردو اکاڈمی ۱۱ حضرت گنج لکھنؤ سے طلب کیے جا سکتے ہیں۔

درخواستیں فارم کی خانہ پری کر کے اور ضروری تصدیق کر کے سکریٹری اتر پردیش اردو اکاڈمی کو اس طرح بھیجی جائیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ ۳۱ اگست ۱۹۷۲ء تک انہیں مل جائیں۔ صرف وہی کتب خانے و دار المطالعے درخواستیں بھیجیں جو اردو اکاڈمی کے مقرر کردہ شرائط کو پورا کرتے ہوں۔ تاریخ مقررہ کے بعد موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔ وہ ادارے بھی اکاڈمی کے فارم بھر کر مالی امداد کی درخواستیں بھیج سکتے ہیں جو مستقبل قریب میں کتب خانے اور دار المطالعے کھولنے والے ہوں۔

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

علی جواد زیدی

کربل کتھا کا لسانی مطالعہ: (از ڈاکٹر خلیق انجم و ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)

ناشر: مکتبہ شاہراہ، اردو بازار دہلی۔ صفحات ۱۱۰۔ قیمت چار روپے

"کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" خلیق انجم اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مشترک کارنامہ ہے۔ اکہتر صفحات کا یہ مختصر رسالہ نثر اردو کی اولین تصنیف "کربل کتھا" کی لسانی خصوصیات اور اہمیتوں کو ظاہر کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ اصل کتاب کا مصنف فضل علی فضلی دور محمد شاہی کے دہلوی مرثیہ نگاروں میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ "کربل کتھا" اردو زبان میں پہلا ترجمہ ہے۔ ترجمے کی زبان، وہ بھی جب اصل زبان کی معاون زبان سے ترجمہ کیا گیا ہو، اکثر معاون زبان کے الفاظ و تراکیب سے بوجھل ہو جاتی ہے۔ فارسی کتابوں کے اردو ترجموں میں یہ بات عام طور سے دیکھنے میں آتی ہے۔ پھر بھی زبان اپنی خصوصیات تو ظاہر کرتی ہی ہے۔ فضلی اچھے مترجم ہیں اور زبان پر عبور رکھتے ہیں۔ فارسی اور عربی سے واقف ہیں۔ عام فہم زبان لکھنے پر بھی قادر ہیں۔ ڈھائی سو برس کی زبان کی بہت سی خصوصیتیں "کربل کتھا" کے آئینے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مصنفین نے یہ ثابت کیا ہے کہ "کربل کتھا" کی زبان پنجابی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کے اثرات کی حامل ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے صوتی، صرفی، نحوی، لفظی اور املائی تبدیلیوں کی تفصیلی نشاندہی کی ہے۔ بعض لسانی خصوصیات پر "کربل کتھا" کے مرتبین مالک رام اور مختار الدین احمد نے بھی روشنی ڈالی تھی۔ اس وقت تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ بہت سی خصوصیتیں جو پنجابی سے وابستہ قرار دے لی گئی ہیں وہ یوپی کے مشرقی اضلاع میں بولی جانے والی زبان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہی بات اب بھی دہرانا چاہتا ہوں۔ مصنفین نے بعض الفاظ میں سادہ بندشی آوازوں کو ہنکار بنا دینے کی چند مثالیں دی ہیں۔ مثلاً ڈھونڈھنے کی بجائے ڈھونڈنے اور پھوپھیاں کی بجائے پھوپیاں۔ یہ استعمال مشرقی اور کسی حد تک وسطی اتر پردیش میں بھی عام ہیں۔ کل کی بجائے کلھ (یعنی ایک مزید ہکار آواز) کا استعمال بھی مشرقی اضلاعِ اتر پردیش میں ہوتا ہے۔ دال کی جگہ ڈال کا استعمال جیسے داڑھ کی جگہ ڈاڑھ بھی مشرقی اتر پردیش میں مستعمل ہے۔ بعض مصمتوں کے اضافے کی مثالیں بھی مشرقی اتر پردیش میں مل جاتی ہیں مثلاً "بیٹھنا" "پوچھنا"۔ گیارہ سے اٹھارہ تک اعداد ترتیبی کو نونِ غنّہ کے اضافے کے ساتھ استعمال کرنا مثلاً گیاراں، باراں وغیرہ بھی اودھ بالخصوص لکھنؤ میں عام ہیں۔

دلّی جو قوموں اور زبانوں کی گزرگاہ تھی وہاں پنجاب اور برج کے علاقوں کے اثرات کے علاوہ پوربی، بھوج پوری، اودھی وغیرہ کے اثرات بھی برابر پہنچتے رہتے تھے۔ اردو اور ہندی کے ماہرین لسانیات کا فرض ہے کہ وہ ان اثرات پر بھی غور فرمائیں اور ایک سائنسی نقطۂ نظر عام کرنے میں مدد دیں۔

ڈاکٹر نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ کوشش مشکور ہے۔ دہلی مراثی اور بعض دوسرے قدیم منظومات کا مطالعہ بھی اس سلسلے میں مفید نتائج کا حامل ہوگا۔ اگر یہ ان دونوں صاحبانِ بصیرت کی طرح دوسرے اصحاب بھی اس میدان میں داد تحقیق دیتے رہے تو بہت سے لسانی مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور ادبی مورخین و ناقدین کے لیے بھی راہ ہموار ہو جائے گی۔



23

نیا دور

جلد ۳۰ نمبر ۴

جولائی ۱۹۷۲ء

اساڑھ ۱۸۹۴ شک

چندہ سالانہ: پانچ روپے

فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر

خورشید احمد

پبلشر

شرومنی شرما

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش

پرنٹر

اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یو پی

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش

عنوانات

سرورق:
جھوم کے آئی گھٹا......
فوٹو: کرشن سروپ سکسینہ

اپنی بات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق زیرِ غور ترمیمی بل لوک سبھا نے یکم جون ۱۹۷۲ء کو منظور کر دیا اور دو سال چار ماہ بعد صدر جمہوریہ ہند کی منظوری حاصل کر کے یہ بل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۲ء کے نام سے نافذ العمل ہو گیا ہے۔ اس کے خلاف جو آواز اٹھائی جا رہی ہے اور اس کی جو مخالفت کی جا رہی ہے اس کے سلسلے میں غور طلب امر یہ ہے کہ کیا واقعی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کے مضمرات اور اثرات اس عظیم ادارے کے بانی کے مقصد اور نصب العین سے ٹکراتے ہیں اور اس لحاظ سے ایکٹ کی مخالفت جائز اور درست ہے؟ واضح رہے کہ اس ایکٹ کی مخالفت ان "اندیشہ ہائے دور و دراز" کی بنیاد پر ہو رہی ہے کہ اول اس کے ذریعے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ختم کیا جا رہا ہے دوسرے یہ کہ یونیورسٹی کی خود مختاری سلب کی جا رہی ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس عظیم ادارے کے بانی مرحوم سرسید احمد خاں کے پیش نظر کوئی پروگرام یا منصوبہ اسے اقلیتی کردار عطا کرنے کا تھا اور کیا اس درسگاہ کا کوئی ایسا کردار رہا ہے جسے اقلیتی کردار کہا جا سکے؟ درحقیقت سرسید احمد خاں "مغربی تعلیم اور سماجی اصلاح کے ذریعے مسلمانوں کی بہبود و بہتری" کے خواہاں تھے اور انھیں کس مپرسی، ذلت و رسوائی اور معاشی بدحالی و فلاکت کے اس گہرے غار سے نکالنا چاہتے تھے جس میں وہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں غیر ملکی حاکموں کے کامیاب ہونے اور اس کے نتیجے میں بے پناہ جبر و تشدد کا نشانہ بننے کے باعث پڑے ہوئے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سرسید نے اتر پردیش کے مختلف مقامات پر مدارس قائم کیے۔ پھر ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی جو ترقی کر کے جنوری ۱۸۷۷ء میں ایم۔ اے۔ او کالج بنا۔ لیکن وہ اس کالج کو کسی خاص فرقے یا فرد کی جاگیر نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اسی لیے اس کے دروازے انھوں نے ہر ہندستانی کے لیے کھلے رکھے اور مدرسہ اور کالج کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید احمد نے کہیں یہ کہا کہ "اس مدرسے کے جو قواعد تعلیم قرار پائے ہیں ان کے موافق ہندو اور مسلمان دونوں اس مدرسے میں تعلیم پائیں گے" نیز یہ کہ "ہندو اور مسلمان دونوں برابر ترقی کریں اور علم و ہنر سے فیض یاب ہوں" کہیں یہ فرمایا کہ "مدرسۃ العلوم قومی مدرسہ ہو گا جس میں ہر فرقہ کے لوگ تعلیم پائیں گے" کسی جگہ یہ وضاحت کی کہ "مجھے افسوس ہو گا اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ یہ کالج ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان امتیاز ظاہر کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا ہے ... کالج میں دونوں بھائی ایک ہی سی تعلیم پاتے ہیں۔ کالج کے تمام حقوق جو اس شخص سے متعلق ہیں جو اپنے تئیں مسلمان کہلاتا ہے بلا کسی قید کے اس شخص سے بھی متعلق ہیں جو اپنے تئیں ہندو بیان کرتا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذرا بھی امتیاز نہیں ہے" چنانچہ جب پہلی بار ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو کالج کا جب یہ مدرسۃ العلوم کے نام سے موسوم تھا معائنہ کیا اور اس کے قومی کردار سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اسے ایک سند دی جس میں مدرسہ کو علوم عقلی کی تعلیم کے واسطے ۱۸ سو روپیہ سالانہ کی امداد منظور کی اور لکھا کہ "جب تک یہ مدرسہ قائم رہے اور اس کا یہ مقصد بھی قائم رہے کہ ہندو مسلمان بلا قید مذہب اس میں علوم عقلی حاصل کر سکیں یہ ... ... جاری رکھی جائے۔"

مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے جنوری ۱۸۷۷ء میں ایم۔ اے۔ او کالج بن جانے کے بعد بھی سرسید کے اس نصب العین میں تبدیلی نہیں آئی۔ پھر جب سنہ ۱۹۲۰ء میں کالج نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا اس وقت بھی اسے کسی خاص فرقے کا ادارہ قرار دے کر اقلیتی کردار عطا نہیں کیا گیا۔ چنانچہ وہ شخص جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پہلا گریجویٹ ایک ہندو تھا بلکہ تقریباً ایک دہائی تک یہاں اکثریت ہندوؤں کی رہی۔ یہ حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ ابتدا سے اس ادارہ کا کردار قومی رہا ہے اور اب ترمیمی ایکٹ کے ذریعے بھی تاریخی کردار برقرار رکھنے اور یونیورسٹی کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے اور ملک کے تعلیمی نظام میں اسے ایک اہم رول ادا کرنے کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے اس کی مخالفت کی نہ کوئی وجہ نظر آتی ہے اور نہ کسی اندیشے کا محل۔ اس سلسلے میں پروفیسر بشیر الدین صاحب صدر شعبہ لائبریری سائنس یونیورسٹی کے خیالات اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کہ پروفیسر موصوف کی ۵۰ سالہ ملازمت میں ایم۔ اے۔ او کالج کے بھی دو سال شامل ہیں اور اتنی قدیم مدت تک علی گڑھ یونیورسٹی سے بھی بہت قریبی رابطہ رہا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کوئی ایسا اقدام نہیں ہے جو عجلت میں کیا گیا ہو اور یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ بھارت میں بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں مسلمانوں کی بہبود کے لیے فکر مند کوئی بھی شخص کس طرح اس اقدام کو چیلنج یا اس کی مذمت کر سکتا ہے۔ یونیورسٹی کا نام تبدیل نہیں کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے ثقافتی کردار کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ سنی اور شیعہ دینیات کے شعبوں اور شعبہ علوم اسلامی کو نہیں چھیڑا گیا ہے۔ میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں نشستوں کی نصف تعداد کو علی گڑھ کے طلبا کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ مختلف اکیڈمک تنظیموں میں اساتذہ کو پہلے سے زیادہ موثر مقام دیا گیا ہے۔ ملک میں کسی بھی یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ طلبا کی تنظیم کو کورٹ میں نمائندگی دی گئی ہے اور اس طرح ان کے مفادات پر اثر انداز ہونے والے معاملات میں ان کو موثر رول ادا کرنے کو کہا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نئے ایکٹ کی رو سے وائس چانسلر کے اختیارات کو بڑھا دیا گیا ہے لیکن یہ کمیٹی کے خصوصی حالات کے پیش نظر ضروری تھا۔ اس طرح کے اختیارات کی عدم موجودگی میں موثر اور فوری اقدامات ممکن نہ ہوتے۔

"قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں جس قدر بھی اعتراضات ہوئے ہیں اُن کا کوئی اصولی جواز نہیں ہے۔ یونیورسٹی میں ہمارا واسطہ خالصۃً علمی ترقی سے ہوتا ہے چنانچہ اس مقصد کے حصول کے ضمن میں پردھان منتری نے صحیح ہی کہا ہے کہ "جب تک مسلمان عوام کی صف میں ان کے دوش بدوش نہیں کھڑے ہو جاتے تب تک وہ ترقی کی راہ پر گامزن عوام سے قدم ملانے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

"اگر پردھان منتری کے مندرجہ بالا قول کی وضاحت کی جائے تو یہ علیحدگی پسندی کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ہے اور اس ایکٹ کے نافذ کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کمی کو دور کیا جائے۔ ہم نے اس عادت سے ماضی میں بھی بھاری نقصان اٹھایا ہے اگرچہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بہت زیادہ سنگین نتائج ظاہر نہ کرتی ہو تاہم تعلیم کے معاملے میں تو یہ سم قاتل ہے کیونکہ لازم کی فضا میں بسنے کے لیے خود کو مقابلے کے لیے تیار کرنا ضروری ہے تاہم اس عادت کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم میں مقابلے کا جذبہ پیدا نہیں ہو گا۔ یونیورسٹی میں اس قسم کی پالیسی کو دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اگر ہم اس طرح کی پالیسی کے خطرناک نتائج سے سبق لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو یہ اقدام خودکشی کے مترادف ہو گا۔ کوئی شخص خواہ کچھ بھی کیوں نہ کہے مجھے اس کے کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ پردھان منتری نے یونیورسٹی کو ایک اقلیتی ادارہ بنانے کی مانگ پر کان نہ دھر کر مسلمانوں کی زبردست خدمت کی ہے۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس انداز نظر کو زیادہ وسیع پیمانے پر توسیع نہیں دی گئی ہے۔"

"دوسرے یہ کہ بھارت کے وزیر تعلیم یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہیں کہ "مسلم یونیورسٹی کے سامنے جو مقصد ہے وہ ہے جدید تعلیم کو فروغ دینا" اس طرح سے وہ سرسید کے اس مقصد کو یاد دلا رہے ہیں جو انھوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے اپنایا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس ایکٹ کا مقصد یہ ہے کہ اس ادارے سے رجعت پسندانہ اور ظلمت پسندانہ سرگرمیوں کو خارج کر کے اسے جدید تعلیم کے فروغ کا ذریعہ بنایا جائے۔"

اس مختصر سے جائزہ کے بعد ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم سنجیدگی سے غور کریں کہ مسلم یونیورسٹی ایکٹ کی مخالفت یا اس کے سلسلے میں احتجاج کی پشت پر کوئی خاص مقصد یا مفاد تو کار فرما نہیں ہے اور اس لیے ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟

——— ایڈیٹر

دگیر مرثیہ گو کا مذہب اور ہندوؤں کے اسلامی نام

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب

ماہ نامہ نیا دور بابتہ دسمبر ۷۶ء میں جناب کالیداس گپتا رضا کا ایک مقالہ لکھنؤ کے مشہور و مقبول مرثیہ گو دگیر کے حال میں شائع ہوا ہے۔ اُس میں کئی باتیں ایسی آگئی ہیں جو حقیقت کے خلاف ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ دگیر جو اصلاً ہندو تھے بعد کو مسلمان ہو گئے تھے۔ رضا صاحب اس کو قطعاً غلط سمجھتے ہیں۔ سرور نے فسانۂ عجائب میں دگیر کو میاں دگیر اور شاد نے فخر بلیغ میں مرزا دگیر لکھا ہے جس سے اُن کے مسلمان ہو جانے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ رضا صاحب اس خیال کو باطل ثابت کرنے کے لیے تحریر فرماتے ہیں:

"سرور نے دگیر کو میاں دگیر تحریر کیا ہے۔ آج کل سوء اتفاق سے میاں کا لفظ کم و بیش مسلمانوں سے متعلق ہو گیا ہے۔ مگر سرور کے زمانے میں میاں صرف عزت اور محبت کا لفظ تھا اور ہندو مسلمان سب ہی کے نام کے ساتھ لگایا جاتا تھا۔ سرور نے بھی میاں انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے جس کے معنی جناب یا حضرت کے علاوہ کچھ نہیں۔"

سوال یہ ہے کہ کیا ایسی ایک مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے جہاں میاں کا لفظ کسی ہندو کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ اگر ایسی کوئی مثال نہ مل سکے تو لفظ میاں دگیر کے مسلمان ہو جانے کی دلیل قرار پائے گا۔

رضا صاحب لکھتے ہیں:-

"یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی کہ شاد نے دگیر کو مرزا کیوں تحریر کیا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ دگیر ہندو تھے۔ پھر اُن کا مرزا یا مغل ہونا کیونکر ممکن ہو سکا۔ اگر بالفرض وہ مسلمان بھی ہو جاتے تب بھی ان کی مرزائیت کا کوئی امکان نہ تھا۔ نو مسلم مرزا نہیں ہو سکتے۔"

نو مسلم کو مرزا کہنے کی بہت نمایاں مثال موجود ہے یعنی مرزا قتیل۔ مرزا کے لیے مسلمان ہو جانے کی شرط بھی نہیں ہے۔ غالب کے مشہور شاگرد مرزا ہرگوپال تفتہ کی مثال سامنے موجود ہے۔

دگیر کے تبدیل مذہب کے خلاف رضا صاحب نے ایک مضبوط اور بدیہی دلیل یہ پیش کی ہے کہ "ہمیں کسی تذکرے یا تالیف میں دگیر کا کوئی اسلامی نام نہیں ملتا۔" یہ بات درست نہیں کیونکہ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کے ایک قدیم قلمی نسخے میں جو پٹنے میں موجود ہے اُن کا اسلامی نام غلام حسین لکھا گیا ہے۔

اسی سلسلے میں رضا صاحب لکھتے ہیں:- "دیوانِ اودھ افتخار الدولہ مہاراجہ میوارام تو بہرحال ہندو تھے اور دگیر اُنھیں کے مصاحب تھے۔" آگے چل کر رقم طراز ہیں کہ "ایک ہندو مہاراجہ کے ملازم ہوتے ہوئے اُن کا ہندو مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو جانا کتنا احمقانہ خیال معلوم ہوتا ہے۔" یعنی رضا صاحب کے خیال میں دگیر کے مسلمان نہ ہونے کا بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُن کے سرپرست مہاراجہ میوارام ہندو تھے۔ لیکن ان کو خبر نہیں کہ میوارام خود مسلمان ہو گئے تھے۔ ذیل میں تاریخ اودھ جلد چہارم کے دو اقتباس نقل کیے جاتے ہیں:

"نصیرالدین حیدر نے اپنے جلوس کے بعد میوا رام پسر نول کرشن بن دیا کرشن کو مہاراجہ افتخار الدولہ کا خطاب دیا اور دیوانی کا عہدہ بخشا اور تین لاکھ روپیہ نقد صیغۂ انعام میں مرحمت کیا۔"[1]

"مہاراجہ میوا رام نے ہندو مذہب کو چھوڑ کر دین اسلام میں قدم رکھا تھا۔ دو تین لاکھ روپیہ سالانہ عشرۂ محرم اور ایام وفات ائمہ اطہار وغیرہ میں خرچ کرتے تھے اور دیوانی کا کام کرتے تھے۔ ان کا درماہہ سات ہزار روپیہ ماہوار تھا۔"[2]

میوا رام کا اسلامی نام ہدایت علی تھا۔[3]

دلگیر نے ایک جگہ مہاراجہ میوا رام کی بیوی کو بیگم صاحبہ لکھا ہے۔

آگے اے دلگیر کر درگاہ حق میں یہ دعا — افتخار الدولہ پر سایہ رب اللہ کا
حشمت و اقبال سے قائم رہے وہ دائما — اور بیگم صاحبہ پر بھی رہے فضل خدا

اس کے بارے میں رضا صاحب فرماتے ہیں کہ "مہاراجہ میوا رام کی بیوی کو دلگیر مہارانی نہیں بیگم صاحبہ کہہ رہے ہیں جو خالص اودھ کی تہذیب ہے۔" گزارش ہے کہ ہندو رانی کو بیگم کہنا اودھ کی تہذیب نہیں ہے اور اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اودھ میں چھوٹی بڑی بہت سی ریاستیں تھیں جن کے مسلمان والیان ریاست راجہ اور مہاراجہ اور اُن کی بیویاں رانی اور مہارانی کہلاتی تھیں اور اس کی بیسیوں مثالیں اس وقت بھی موجود ہیں۔

رضا صاحب فرماتے ہیں کہ "دلگیر کے مذہب بدلنے کا سوال لغو ہے اور اس کے لیے ہمارے پاس کوئی قطعی شہادت نہیں۔" لیکن اس کی قطعی شہادت بھی موجود ہے۔ دلگیر اپنی ایک منظوم عرضداشت میں جو انھوں نے محمد علی شاہ فرماں روائے اودھ کے حضور میں پیش کی تھی اپنے مسلمان ہو جانے کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

محمد علی شاہ کیواں مکاں — فلک آستان و ملک پاسباں
ہمیشہ ہیں اس در پہ جو جبہ سا — یہ ہے اُن کی خدمت میں اب التجا
ہوا میں جو مشہور مداح شاہ — کہ آگہ ہوئے جنت آرام گاہ[4]
یہ سُن کر کیا آپ نے سرفراز — دیا مجھ کو ہم چشموں میں امتیاز
پڑھا جب کہ معروضۂ خانہ زاد — کرم سے کیا نام بندے پہ صاد
اسی طرح برسوں ملازم رہا — دُعا گو ہمیشہ یہ خادم رہا
زمانہ جو شاہ زمن[5] کا ہوا — مشرف با اسلام بندہ ہوا[6]

دلگیر کے مسلمان ہو جانے کا اس سے زیادہ قطعی ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔

رضا صاحب نے ایک فٹ نوٹ میں گنیت سہاے سرواستو کے حوالے سے لکھا ہے کہ دلگیر کا دیوان نایاب ہے۔ مگر یہ اطلاع بھی درست نہیں ہے۔ دیوان دلگیر کا ایک قلمی نسخہ ریاست محمود آباد ضلع سیتاپور کے کتب خانے میں موجود ہے جس کو مرتب کر کے ایک مبسوط تحقیقی مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کاشمیری نے ۱۹۷۰ء میں منظومات میاں دلگیر کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ حیدری صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں دلگیر کی کوئی غزل یا مرثیہ نہیں ہے بلکہ چند مثنویاں، مسدس، ترجیع بند اور قطعات شامل ہیں۔ دلگیر نے جب مرثیہ کہنا شروع کیا تو اپنا دیوان غزلیات موتی جھیل میں ڈبو دیا تھا۔ اُن کے موجود دیوان میں اُن کی غزلیں کیوں کر شامل ہو سکتی تھیں۔

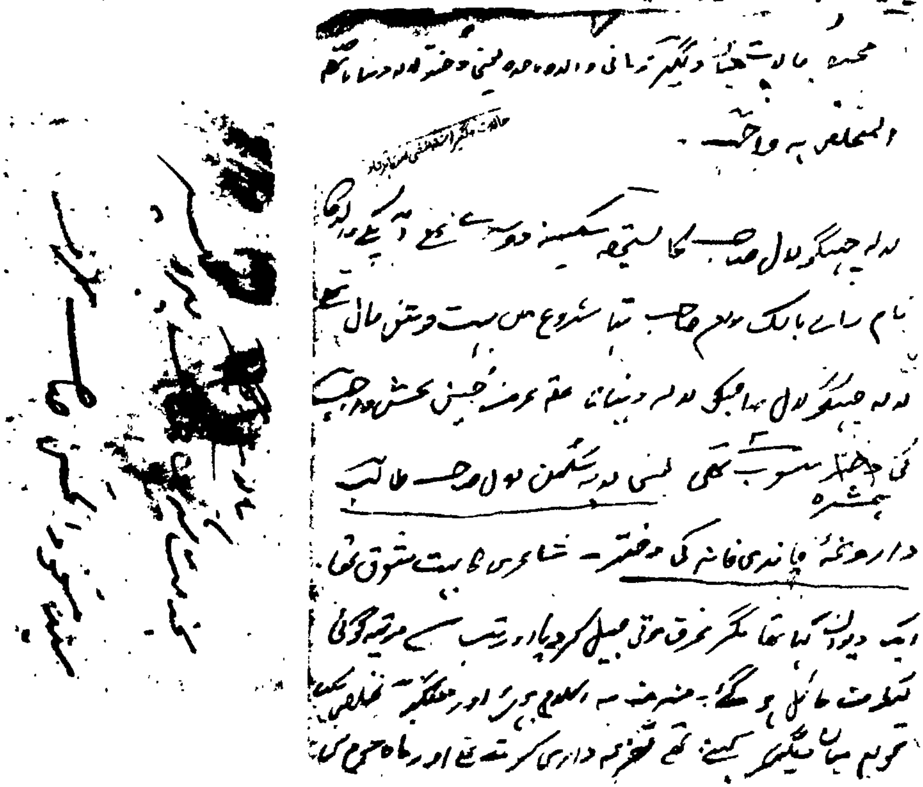
میں نے آج سے کچھ کم چالیس برس پہلے اکتوبر ۱۹۳۲ء میں دلگیر کے حالات اُن کے خاندان کے دو بزرگوں سے دریافت کر کے لکھ لیے تھے۔ ایک بزرگ لالہ دینا ناتھ عرف حسین بخش واجب کے نواسے منشی امبکا پرشاد سکینہ تھے اور دوسرے بزرگ واجب کے پوتے منشی کھنو لال تاثیر تھے۔ منشی امبکا پرشاد قدیم کمیاب کتابوں کی تلاش میں میری مدد کیا کرتے تھے۔ اُن کی

---

[1] تاریخ اودھ جلد چہارم ـ نجم الغنی، ص ۲۱۶-۲۱۷ [2] ایضاً ص ۲۰ [3] منظومات میاں دلگیر ص ۷ ـ حاشیہ ۱ [4] جنت آرام گاہ ـ نواب سعادت علی خاں ۱۲۱۲ - ۱۲۲۹ھ [5] شاہ زمن ـ غازی الدین حیدر ۱۲۲۹ - ۱۲۴۳ھ [6] منظومات میاں دلگیر ـ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۷۰ء ص ۴۵

والدۂ گرامی دلگیر کی بھتیجی تھیں یعنی دلگیر اُن کے پھوپھا تھے۔ منشی صاحب مرحوم نے میری فرمائش پر دلگیر کے حالات اپنی نہایت معمر والدہ سے دریافت کر کے لکھ دیے تھے جو انھیں کے قلم سے لکھے ہوئے میرے پاس موجود ہیں اور ذیل میں لفظ بہ لفظ نقل کیے جاتے ہیں۔

تھے۔ لالہ چھنگولال صاحب کو لالہ دینا ناتھ عرف حسین بخش واجب کی ہمشیرہ منسوب تھیں یعنی لالہ سکھن لال صاحب طالب داروغۂ چاندی خانہ کی دُختر۔ شاعری کا بہت شوق تھا۔ ایک دیوان کہا تھا مگر غرق ہوتی جھیل کر دیا اور تب سے مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ مشرف بہ اسلام ہوئے اور


محترمہ حالات میاں دلگیر زبانی والدۂ ماجدہ یعنی حضرت لالہ دینا ناتھ المتخلص بہ واجب۔

لالہ چھنگولال صاحب کا نستہ سکسینہ دوسرے تھے آپ کے والد کا نام رائے بالک رام صاحب تھا شروع میں بہت خوشحال تھے لالہ چھنگولال صاحب کو لالہ دینا ناتھ عرف حسین بخش واجب کی ہمشیرہ منسوب تھی یعنی لالہ سکھن لال صاحب طالب داروغہ چاندی خانہ کی دختر۔ شاعری کا بہت شوق تھا۔ ایک دیوان کہا تھا مگر غرق ہوتی جھیل کر دیا اور تب سے مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ مشرف بہ اسلام ہوئے اور دلگیر تخلص کیا عوام میاں دلگیر کہنے لگے تعزیہ داری کرتے تھے اور ماہ محرم کی

حالات میاں دلگیر زبانی والدۂ ماجدہ یعنی لالہ دینا ناتھ صاحب المتخلص بہ واجب

لالہ چھنگولال صاحب کا نستہ سکسینہ دوسرے تھے۔ آپ کے والد کا نام رائے بالک رام صاحب تھا۔ شروع میں بہت خوشحال

دلگیر تخلص کیا۔ عوام میاں دلگیر کہنے لگے۔ تعزیہ داری کرتے تھے اور ماہ محرم میں بڑی عقیدت کے ساتھ ماتم داری و عزاداری کیا کرتے تھے۔ تعزیہ اُٹھنے پر خود و شاگرد و دیگر صاحبان مرثیہ گوئی کرتے تھے۔ مرثیہ گوئی میں ایسا نام پیدا کیا کہ

آج تک لوگوں کی زبان پر ہے۔

میاں دلگیر کے پانچ بیٹے تھے (۱) لالہ بانکے لال عرف بکو (۲) لالہ سمن لال (۳) اودھ بہاری عرف ابدو (۴) عیوض علی (۵) جسونت رائے عرف جعفر۔ دو لڑکیاں تھیں ایک لڑکی لالہ بانکے لال صاحب ساکن سرائے معالیخاں کو منسوب تھی، دوسری لڑکی لالہ بجی لال کو منسوب تھی۔ لالہ بجی لال صاحب دیوان سُندر لال کے بیٹے تھے۔

مسلمان ہوجانے پر بال بچوں اور اہل خانہ کا خورد و نوش علیحدہ ہوگیا۔ میاں دلگیر کو دونوں وقت کھانا پکا کر دیدیا جاتا تھا۔ شروع میں سسرال میں بڑی خاطرداری و مدارات ہوتی تھی۔ مسلمان ہوجانے پر آتے جاتے ضرور رہتے، لیکن وہ بات نہ رہی۔ مکان اُن کا بجی گنج کے چوراہے پر نان بائی کی دوکان کے پاس تھا۔ شادی کے وقت بہت کم سن تھے۔ بیوی کو چھٹا سال تھا۔ لالہ سمن لال مسلمان ہوگئے تھے۔ لالہ بانکے لال عرف بکو نے ایک مغلانی ڈال رکھی تھی۔

میاں دلگیر مرنے پر مثل اہل شیعہ اُٹھائے گئے۔ مجمع کثیر تھا۔

میاں دلگیر کے والد کی دو شادیاں ہوئی تھیں چھنگولال کی وجہ تسمیہ دو انگوٹھے ہونے سے پڑی۔ سب لڑکے اور لڑکیاں انتقال کر گئے۔

لالہ بانکے لال کے ایک لڑکا ہندو بیوی سے کپتو لال تھا جو O.R.R. میں بطور گارڈ تھا۔ شادی نہیں ہوئی اور انتقال کر گیا۔ میاں دلگیر کی لڑکیوں کی پرناتی اور نواسی اب بھی موجود ہیں۔

بڑی برسات میں کچھ حصہ قلمی مرثیوں کا کوٹھری میں پانی بھر جانے سے تلف ہوگیا تھا جس کا بہت روز تک قلق رہا۔ بہت کچھ پھر تیار کرلیا۔ کوئی سن یعنی وفات و پیدائش کا نہیں یاد ہے۔ فقط

منشی کھنّولال تائب ایک چھوٹے سے دستی پریس مطبع بہار اودھ کے مالک تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جب میں اُن سے ملا تو وہ بہت ضعیف ہوچکے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر انھوں نے دلگیر کے جو حالات بیان کیے تھے وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

دلگیر کا نام چھنّولال اور تخلص طرب تھا۔ ابتدا سے اُن کا رجحان اسلام کی طرف تھا۔ چنانچہ عالم شباب ہی میں وہ مسلمان ہوگئے تھے۔ اُن کے دو صاحبزادے تھے چھنگولال اور مہنگولال۔ مہنگولال بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ علموں پر عربی عبارت کندہ کرنا اُن کا پیشہ تھا اور اس فن میں اُن کو بڑی مہارت تھی۔ میں نے ان دونوں کو دیکھا ہے۔ چھنگولال واجب کے بہنوئی تھے۔ دلگیر کا اسلامی نام کسی سے نہیں سُنا۔ اُن کو سب لوگ میاں دلگیر کے نام سے یاد کرتے تھے۔ چھنگولال کے یہاں تعزیہ داری ہوتی تھی۔

خاندانِ دلگیر کے ان دونوں بزرگوں کے بیانوں میں کچھ اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ سن کی زیادتی، حافظے کی کمزوری اور ناموں میں جزوی مماثلت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ منشی کھنّولال نے دلگیر کا نام چھنّولال بتایا ہے اور منشی امبکا پرشاد کی والدہ نے اُن کا نام مع وجہ تسمیہ چھنگولال بتایا ہے۔ ان کے ایک ہاتھ میں دو انگوٹھے تھے یعنی چھ انگلیاں تھیں۔ ایسے چھ انگلیوں والے لوگ چھنگا کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ میرے ایک ننہالی بزرگ خورشید علی کا عرف چھنگا تھا۔ لکھنؤ کے ایک عالی خاندان مگر اَن پڑھ مرثیہ گو صادق حسین حسین چھنگا صاحب کہلاتے تھے۔

منشی تائب کا بیان ہے کہ لکھنؤ کے بعض کائستھ خاندانوں میں دو نام رکھنے کا رواج تھا ایک ہندوانہ ایک اسلامی۔ واجب کے خاندان کے علاوہ ایک دوسرے خاندان میں بھی عابد حسین اور غلام عباس تھے۔ عابد حسین کے دادا کو شاہ اودھ کی سرکار سے آدھ راج کا خطاب مرحمت ہوا، یہ خطاب مہاراجگی کے خطاب سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس بیان کی تائید میں چند باتیں اور پیش کی جاتی ہیں۔

تائب کا ایک قصیدہ جو کسی راجہ کے فرزند کی گھوڑے چڑھائی کی تقریب پر ۱۳۱۰ھ میں کہا گیا تھا اور انھیں کے مطبع بہار اودھ میں جون ۱۸۹۱ء میں چھپا تھا میرے پاس موجود ہے۔ انھوں نے اس قصیدے کے آخر میں اپنا نام یوں لکھا ہے "خیر سگال کھنولال تائب خلف مرحمت حسین ناصب ولد منشی حسین بخش واجب ابن منشی سکھی لال طالب داروغہ نقرہ خانہ سلطان غازی الدین حیدر بہادر"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تائب کی شاعری تین پشتوں کی میراث تھی۔ ان کے والد دادا اور پردادا سب شاعر تھے۔

یہاں تائب نے اپنے والد کا صرف اسلامی نام مرحمت حسین لکھا ہے۔ لیکن ایک دوسرے موقع پر ان کا ہندوانہ نام جھاؤلال بتایا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات میں چند ہندو کائستھوں کے اسلامی نام آگئے ہیں یعنی حسین بخش، عیوض علی، مرحمت حسین اور جعفر۔ بخشی الملک راجہ الفت رائے بہادر الفت کی کتاب انشائے الفت[1] میں ان کے علاوہ چند اور نام ملتے ہیں یعنی لالہ امام بخش، حسن بخش صاحبزادہ رائے گنگا پرشاد اور غلام عباس صاحبزادہ رائے گنگا پرشاد۔

تفنن طبع کے لیے یہ لطیفہ سن لیجیے کہ لکھنؤ میں کائستھوں کا ایک بڑا خاندان تھا جس کے بیشتر افراد شاعر تھے اور ان کے تخلص ہم وزن و ہم قافیہ تھے۔ دینا ناتھ واجب، جھاؤلال ناصب، کھنولال تائب، سکھی لال طالب، برجن لال قالب، پھندن لال کاتب، سیتارام جاسب، آخری تین نام حسین بخش واجب کی مثنوی بہارستان شادی[2] کے قطعات تاریخ میں ملتے ہیں۔

ضمیمہ

منشی امبکا پرشاد اور منشی کھنولال تائب

منشی امبکا پرشاد کے بزرگ ذی عزت اور خوشحال تھے۔ ان کے والد دیوان رمن لال کا پھاٹک محلہ نواز گنج میں میں نے دیکھا تھا۔ ان کے بڑے بھائی ماتا پرشاد عتیقہ فروش تھے، قلمی کتابوں اور تصویروں وغیرہ کی تجارت کرتے تھے۔ میں ایک دفعہ ان سے ملنے گیا تھا۔ ان کے مکان کے وسیع کمپاؤنڈ میں ایک طرف چھوٹی سی مسجد تھی جس کی دیکھ بھال وہ خود کرتے تھے اور نماز کے لیے چٹائیاں اور وضو کے لیے پانی موجود رکھتے تھے۔ ان کی عنایت کی ہوئی ایک قلمی تصویر اب بھی میرے پاس ہے جس پر "قدسیہ محل" لکھا ہوا ہے۔ یہ لوگ لکھنؤ کی ہندو مسلم مشترک تہذیب کے باقیات الصالحات تھے۔

منشی کھنولال تائب کے بارے میں اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ان کے والد، دادا اور پردادا شاعر تھے اور ان کے تخلص ترتیب وار ناصب، واجب اور طالب تھے۔ اب انھیں کی بتائی ہوئی دو چار باتیں اور لکھی جاتی ہیں۔ انھوں نے آٹھ مرتبہ حیدرآباد دکن کا سفر کیا۔ پہلا سفر ۱۳۰۹ھ میں ہوا۔ پانچ چھ مرتبہ نظام دکن کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ حیدرآباد میں ان کے متعدد شاگرد تھے، جن میں مشرف یاور جنگ خانہ نقاریب سلطانی و سررشتہ دار افواج نظام راجہ سری پرشاد احقر اور سرجن جمعیت نظام محبوب دکن مرزا داؤد بیگ مرزا سب سے ممتاز تھے۔

★

[1] انشائے الفت۔ مطبع علوی، لکھنؤ ۱۲۸۰ھ صفحات ۵۹، ۹۲ و ۹۴ - [2] بہارستان شادی۔ مطبع علوی، لکھنؤ، ۱۲۷۰ھ

کل رات

جلال ملیح آبادی

تھی کوئی زہرہ جبیں، شمعِ شبستاں کل رات
مدتوں بعد، زمانہ تھا غزل خواں کل رات

زلف بکھرائے ہوئے دوش پہ ناہیدِ بہار
تھی فضائے شبِ مہتاب میں رقصاں کل رات

طلعتِ ماہ میں شبنم سے فروزاں تھا چمن
گل پہ گل لالہ پہ لالہ تھا چراغاں کل رات

حسن کو عشق کا وہ پاس تھا اللہ اللہ
ناز بردار تھی وہ نازشِ دوراں کل رات

شوق شاداب تھا پلکوں کے حسیں سائے میں
زلف کی چھاؤں میں سرشار تھے ارماں کل رات

نکہتِ کاکلِ شب رنگ سے تھے عطر فروش
سوسن و نسترن و لالہ و ریحاں کل رات

گلستاں رنگ تھی اک لیلیٔ شیریں کل شب
کہکشاں تاب تھی اک زلفِ پریشاں کل رات

حسن سا حسن تھا؟ رعنائی سی رعنائی تھی؟
پیکرِ رنگ تھی اک جانِ بہاراں کل رات

شعلۂ بادہ جو گرتا تھا تو لو اٹھتی تھی
رنگِ مے سے مرا ساغر تھا فروزاں کل رات

خلد زار چمنستاں میں مرے دوش بہ دوش
کوئی سلمائے دل آرا تھی خراماں کل رات

غزل کا مختصر جائزہ
میرے حافظے کی روشنی میں

شیام موہن جگر بریلوی



مصنف

اردو اصناف سخن میں غزل کو جو مقبولیت حاصل ہوئی کسی اور صنف کو حاصل نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں نیرنگی بھی بہت ہے۔ یہی شعرا کا معیار ٹھہری، اسی سے ان کا مرتبہ قائم ہوا اور اسی سے ان کے مخصوص رنگ پر مُہر لگی۔ میں جب غزل کی خوبیوں، اس کی نیرنگیوں اور وسعت پر غور کرتا ہوں حیرت میں ڈوب جاتا ہوں۔ اس کا راز غزل کے معنی میں ملتا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی صاحب غیاث اللغات یوں لکھتے ہیں "بازی کردن محبوب وحکایت کردن از جوانی وحدیث محبت عشق و زنان" اس کا مطلب مختصراً یہ ہوا "محبوب عورتوں سے جوانی کی، عشق ومحبت کی باتیں کرنا" یہ باتیں کون نہیں کرتا اور کون کرنا نہیں چاہتا۔ مگر یہ باتیں خلوت میں بھی ہوتی آئی ہیں اور جلوت میں بھی۔ خلوت کا مطلب ہے پردہ اور حجاب، جلوت کے معنی ہیں بے پردگی اور بے حجابی، جس کے لیے بازاروں کے کوٹھے مخصوص ہیں۔ یہاں حظ لینے والے شرم وحیا کے پردے چاک کر ڈالتے ہیں اور وہ عریانیت و رکاکت نظر آتی ہے کہ الٰہی توبہ! غزل کی دو نوں تصویریں ہیں۔ میں پہلے اچھی تصویر کے خط و خال پیش کرتا ہوں۔

ابتدا میں غزل نے نشو ونما دو ہی دبستانوں دلی اور لکھنؤ میں پائی، جس میں دلی کو فوقیت حاصل ہے۔ لہٰذا دلی سے ابتدا کی جاتی ہے۔

خدائے سخن میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ٹکڑے ٹکڑے تھیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز اسی خانہ خراب کی سی ہے

میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں یوں نہ کرتا تھا پائمال ہمیں

دور بیٹھا غبار میر اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مندرجہ بالا شعروں میں کتنی خستگی، مسکینی اور درد ہے۔ ذیل کا شعر داد سے مستثنیٰ ہے۔ یہ دردل بینی اور عشق کا کرشمہ ہے۔ ذرا غور فرمائیے۔

ہائے غیوری جس کی دیکھی جی ہی نکلتا ہے اپنا
دیکھتے اس کی اور نہیں پھر یہ بھی عشق کی غیرت ہے

اس شعر کو ذہن میں رکھیے تو ذیل کا شعر بخوبی سمجھ میں آ جائیگا۔

محروم سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے جوش حیا سے جھکنے وہ آستاں نہ پایا

یہ شعر بھی انھیں کا ہے ؎

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

میر بالکل بجا فرماتے ہیں ؎

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر یہ ہماری زبان ہے پیارے

ان سے گفتگو کرنے کا ہر شخص اہل نہیں۔

میرؔ کے بعد مومنؔ کو دیکھیے۔ یہ غزل کے بادشاہ تھے۔ کوئی ان سے بڑھ کر غزل نہ کہہ سکا۔ ذیل کے شعر کا تو جواب ہی نہیں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اور دیکھیے:

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

چلی شوخی نہ کچھ بادِ صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اُس کی بنا کی

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

بہیم سجود پائے صنم پر دم وداع مومنؔ خُدا کو بھول گئے اضطراب میں

یہ عذرِ امتحان جذب دل کیسا نکل آیا

میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

یہ شعر تو مدت سے ضرب المثل ہے

عمر تو ساری کٹی عشق بُتاں میں مومنؔ

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

اب غالبؔ کو دیکھیے ان کا رنگ سب سے جُدا سب سے انوکھا ہے۔ ایسے شعر بھی کثیر تعداد میں ہیں جن کو سوا چیستان کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا:

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ

جز نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں

کہ ہے سر پنجۂ مژگان آہو پشت خار اپنا

اور ایسے بھی جو غزل کا اچھا نمونہ ہیں:

کوئی اُمید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معیّن ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

پہلے آتی تھی حال دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو

نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

اب داغؔ کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ ہر طرف داغؔ کی دھوم ہے۔ انھوں نے غزل کو ایسے رگڑے دیے کہ بیچاری کی ہڈی پسلی سب ٹوٹ گئی۔ بقول چکبستؔ داغ کی شاعری عیاشانہ شاعری ہے:

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب

وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

عیاشی کی بھی حد ہو گئی فرماتے ہیں:

حوروں کا انتظار کرے کون خُلد تک

مٹی کی بھی ..... تو روا ہے شباب میں

داغؔ نے چار دیوان لکھے۔ بہت شہرت پائی۔ ان کے ہزاروں شاگرد تھے جنھوں نے اپنے اُستاد کا رنگ ملک کے اطراف و جوانب خوب پھیلایا۔ گھروں میں، محفلوں میں، گلی کوچوں میں، بازاروں کے کوٹھوں پر ہر جگہ انھیں کے راگوں کی دھوم ہے۔ آخر مولانا حالیؔ نے فتویٰ صادر فرمایا:

غزل اور قصیدے کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بڑھ کر

داغؔ کے بعد دلّی میں کوئی قابلِ ذکر شاعر نہیں ہوا اور غزل کا جنازہ نکل گیا۔ اب دبستان لکھنؤ کی سیر کیجیے۔ یہاں سر آمد شعرا افصح الفصحا خواجہ حیدر علی آتشؔ پر سب سے پہلے نظر جاتی ہے۔ آتشؔ عارف باللہ ہیں۔ ان کا کلام سُنیے اور وجد کیجیے:

خُدا سرو سے دے سودا دے تیری زُلفِ پریشاں کا

جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

حُسنِ پری اِک جلوۂ مستانہ ہے اُس کا ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اُس کا

وہ یاد ہے اُس کی کہ بھلا دے دو جہاں کو حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُس کا
گل کہتے ہیں ہستی میں عدم سے ہم تو گزرے بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا

تصوّر سے کسی کے ہم نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویرِ خیالی رو برو برسوں

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلےٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

چشمِ نامحرم کو برقِ حُسن کر دیتی تھی بند
دامنِ عصمت ترا آلودگی سے پاک تھا

حشر کو بھی دیکھنے کا اُس کے ارماں رہ گیا
دن ہو ابرِ آفتاب آنکھوں سے پنہاں رہ گیا

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے
موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

اب منشی نوبت رائے نظرؔ آتے ہیں۔ یہ شاعر ہی نہیں، ہرفن مولا ہیں یعنی ادیب، نقاد، محقق، مصوّر۔ ان کے تنقیدی مضامین بڑے بصیرت افروز ہوتے ہیں اور بہت بلند معیار کے۔ ان کا ایک بسیط مضمون مصوّرانِ لکھنؤ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی سی جامع کمالات ہستیاں کم پیدا ہوتی ہیں۔ ان پر دو کتابیں لکھی گئیں۔ یادگارِ نظرؔ[1] راقم نے لکھی اور نقدِ نظرؔ مختار احمد مانی ایم۔ اے مرحوم نے۔ یہ دراصل وہ مقالہ ہے جو مرحوم نے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لیے لکھا تھا مگر یونیورسٹی میں پیش نہ کر سکے کہ پیامِ اجل آگیا۔ ان کی وفات کے بعد یہ مقالہ ان کے بڑے بھائی افتخار احمد ایڈوکیٹ نے شائع کر دیا۔ نظرؔ کا کلام تمام تر داخلی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

سُن لو کہ رنگِ محفل کچھ معتبر نہیں ہے ہر اِک زبانِ گویا شمعِ سحر نہیں ہے
مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے وہ اِک سکونِ خاطر جو بیشتر نہیں ہے
دل تھا تو جو رہا تھا احساس زندگی کا مُردہ ہوں اب کہ زندہ یہ بھی خبر نہیں ہے
آہیں بھریں بہت کچھ دم توڑتا ہے باقی اس آہ میں بھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے

کوئی مجھ سا مستحقِ رحم و غمخواری نہیں سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں

ضبط سے دل نزار رہتا ہے اندرونی بخار رہتا ہے
قطعِ اُمید ہو تو کیونکر ہو روز اِک انتظار رہتا ہے

وہ ایک تم کہ سراپا بہار و نازشِ گل وہ ایک میں کہ نہیں صورت آشنائے بہار

یاس سے ویرانیٔ حسرت کبھی ایسی نہ تھی دل میں سناٹا نہ تھا وحشت کبھی ایسی نہ تھی

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی اب یہ دُنیا نہیں بدلنے کی

زمانے کی ناقدردانی کے لیے دل کو یوں سمجھاتے ہیں ؎

نظرؔ اپنی تسلّی کے لیے کافی ہے یہ مصرع کہاں تک دہر میں بیقدریٔ جنسِ ہنر ہوگی

نظرؔ کے بہت دن بعد اُستاذی لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی آتے ہیں۔ ان کے یہاں بڑی تابناکی بلکہ جلال ہے ؎

یہ آج کس کی جوانی کو میں نے دیکھا تھا
مری نگاہ کو تکتے ہیں آشنائے بہار

ذیل کا شعر یقیناً لافانی ہے ؎

خامۂ قدرت نے دل کا نام یہ کہہ کر لکھا ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائیں گے

جھینپتے کیوں ہو جو سرتا بقدم دیکھتے ہیں یہ کوئی اور نہیں ہے تمھیں ہم دیکھتے ہیں

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

انگڑائی پر بہت شعر نظر سے گذرے مگر اس شعر کا عالم ہی

---

[1] مطبوعہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ۔

نرالا ہے۔ دلی اور لکھنؤ کی سحر بیانیاں ختم ہوئیں۔ اب کچھ ان اہلِ کمال کی جادو بیانیاں دیکھیے جو اِن سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ باہر کے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے شادؔ عظیم آبادی کا نام و کلام زبان پر آتا ہے۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں پاؤ گے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہمنفسو وہ خواب ہیں ہم
میں حسرت و حیرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

ذیل کا شعر کس بلا کا ہے کہ سُننے والا تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ میری نظر سے اُردو میں اس مفہوم کا کوئی شعر نہیں گذرا۔ ؎

مُرغانِ قفس سے پھولوں نے اے شادؔ یہ کہلا بھیجا
آنا ہو اگر تو آجائیں ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

اگر لب پر نہ مرتے دم بھی تیرا نام آئے گا
میں اس جینے سے درگذرا مِرے کس کام آئے گا

ان کے بعد انھیں کے پیرو مرزا واجد حسین یاسؔ یگانہ چنگیزی غزل سرائی کرتے ہوئے بڑے دم خم کے ساتھ لکھنؤ میں قدم رکھتے ہیں۔ یہ ایک طرف اہلِ لکھنؤ کو کڑک کر للکارتے ہیں دوسری طرف بانگ دُہل غالبؔ کے بخیے اُدھیڑنا شروع کرتے ہیں اور اُس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک ایک پوری کتاب غالب شکن نہیں لکھ ڈالتے۔ لکھنؤ والوں سے مُدت تک ان کی جنگ رہی جس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ ان کا دیوان آیات وجدانی ایک زمانہ ہوا نظر سے گذرا تھا۔ ان کے اشعار بڑے مضبوط، کھرے اور جاندار ہوتے ہیں۔ ؎

لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے
پلٹ کر اِک سلامِ شوق کرلیتا ہوں منزل سے

دُھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا
نگاہِ شوق سے آگے تھا قافلہ دل کا

چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا
دلیل راہِ محبت ہے فیصلہ دل کا

سلامت رہیں دل میں گھر کرنے والے
اس اُجڑے مکاں میں گذر کرنے والے

گریباں میں مُنہ ڈال کر خود تو دیکھیں
بُرائی پہ میری نظر کرنے والے

وقت کٹنے کے لیے ہے عمر گھٹنے کے لیے
مُفت دن گننے کو ہم پیدا ہوئے بیگار میں

بیگار ایسے مبتذل لفظ کو دو زبردست حقیقتوں سے وابستہ کرکے کتنا جاندار بنا دیا۔ اسے مسیحائی کہتے ہیں۔ پھر انھیں کا حصہ ہے۔ سبحان اللہ!

یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانے میں
یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

ذیل کے شعر سے لکھنؤ والوں سے ان کی معرکہ آرائیاں ظاہر ہیں ؎

مرزا یاسؔ یہ کرتے ہیں شکر کے سجدے
دُعائے خیر تو کیا اہلِ لکھنؤ کرتے

اب جگرؔ مُرادآبادی تشریف لاتے ہیں۔ انھوں نے بقول خود اپنا معاشقہ کیا ہے۔ ان کی غزل داغؔ کی صدائے بازگشت ہے۔ زبان البتہ خاندانی ہے۔ اس میں فارسیت کی نمود ہے۔ داغؔ کے بعد ان کو پڑھے لکھے لوگوں میں اچھی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کا دیوان شعلۂ طور پچیس سال کے قریب ہوئے دیکھا تھا، مگر شعر ایک بھی یاد نہیں۔ بیگم اختر کی زبانی ریڈیو پر ایک غزل ان کی سُنی تھی اس کا مطلع یاد رہ گیا ہے۔ ؎

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُن کو پیار آ ہی گیا

اب شوکت علی خاں فانیؔ بدایونی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ یہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی بھی ہیں۔ ان سے اُمید کی جاتی تھی کہ غزل کے دامن پر جو دھبے آگئے تھے وہ صاف ہوجائیں گے اور کچھ دماغی آسودگی و مسرت کا سامان بہم پہنچے گا۔ مگر باوجود اُس روشن خیالی کے جو انگریزی تعلیم کی بدولت ان کو حاصل تھی انھوں نے ایک اندھیرے کمرے میں قدم رکھا۔ ایسے کمرے میں کہ جتنا یہ آگے بڑھتے گئے اندھیرا گہرا ہوتا گیا یہاں تک کہ سوا ظلمت و تاریکی کے کچھ نہ رہا۔ دُنیا اور اُس کی جلوہ سامانیاں سب اسی میں

ب گئیں وکالت بھی دُنیا کی چیز تھی وہ کیا اُبھرتی مگر معاش کے لیے
کو قائم رکھنا اور اُبھارنا لازمی تھا۔ اس سے بے نیازی
کی بات نہیں تھی۔ پہلے اپنے وطن میں پھر بریلی میں قسمت آزمائی
مگر ڈھاک کے تین پات کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر حیدرآباد
پہنچے۔ نظام حیدرآباد کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ مگر فانی الشعر
چکے تھے۔ وہاں کی آب و ہوا بھی سازگار نہ ہوئی بے نیل مرام
پس آئے۔

ان کا کلام ان کی طبیعت کا آئینہ ہے۔ جو قنوطیت طبیعت
سرایت کر چکی تھی وہی لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ ہاں فارسی ترکیبوں
افراط ہے اور غالب کا تتبع ہے۔ راقم کی ملاقاتیں بھی ان سے
ہیں۔ ان کا کلام بھی ان کی زبانی سنا۔ جیسا کلام تھا پڑھتے بھی
ویسے تھے مگر گاتے نہیں تھے۔ ان کا دیوان باقیات فانی شائع
ہو چکا ہے۔ ان کی غزل عام فہم نہیں عام پسند نہیں پھر بھی ایک
رنگ خاص رکھتی ہے جو ابتذال سے پاک ہے۔ فانی سراپا غم تھے۔
ان کو ہنسی شاید عمر بھر نہیں آئی۔ صورت سے حسرت و یاس ٹپکتی
تھی۔ زمانے نے ان کے کلام پر قنوطیت کا فتویٰ صادر کیا۔

مآلِ سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اُٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

چلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

وہ اُٹھا شورِ ماتم آخری دیدار میت پر
اب اُٹھا چاہتی ہے لاشِ فانی دیکھتے جاؤ

کون اُٹھائے مری وفا کے ناز　دل ستم دوست وہ رقیب نواز

تو جانِ مدعائے دل اور دل جگہ جگہ
ہے ایک شمع رونق محفل جگہ جگہ

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا
فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا
اُس نے عدو کا سوگ کیا یاں اُس سے وفا کی آس بندھی
رنگ تمنا رنگ حنا کی دیکھا دیکھی چھوٹ گیا

نہیں معلوم حضرت رقیب کا اُردو شاعری سے کب پیچھا چھوٹے گا
اور وہ کب تشریف لے جائیں گے۔ انھوں نے غزل کا دامن
بالکل سیاہ کر رکھا ہے۔ فانی کے دو شعر اور یاد آگئے سُن لیجیے

خوشی سے رنج کا بدلہ یہاں نہیں ملتا　وہ مل گئے تو ہمیں آسماں نہیں ملتا

دُنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مُفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آخری شعر سے ان کی طبیعت کا رنگ آئینہ ہے۔

★

غزل

صرفی حیدرآبادی

کیا بتاؤں، ہے کس غضب کی بات؟
جب وہ کرتا ہے اپنے ڈھب کی بات

ہر ادا اُس کی ہے عجیب و غریب
اُس کی ہر بات ہے غضب کی بات

جانے، کیا مُنہ سے اور کب نکلے!
بیٹھے چُپ سُن رہا ہوں سب کی بات

لاکھ مَیں نے کُرید کی لیکن
دل سے لب تک نہ آئی ڈھب کی بات

ذکرِ وعدہ پہ یہ ہوا ارشاد
یہ کہاں کی، کدھر کی، کب کی بات؟

کھُل نہ جائے کہیں زباں میری
ہو جو ایسا تو ہے غضب کی بات

ذکرِ لطفِ قدیم اور اُس سے!
صبح جو بھول جائے شب کی بات

عمر بھر سر دھنو اگر سُن لو
میرے کانوں سے اُس کے لب کی بات

کتنی بے جوڑ بات ہے، توبہ!
مُنہ مرا اور اُس کے لب کی بات!

چُپ رہو بھی کہ بات رہ جائے
آپ کا مُنہ اور اُس کے لب کی بات

بات پر بات یاد آتی ہے
دہن اُس کا اور اُس کے لب کی بات

کوئی پہنچائے اُس مسیحا تک
بات اور مجھ سے جاں بلب کی بات

ذکر اُس کے دہن کا ہر لب پر
ہر زباں پر ہے اُس کے لب کی بات

دور پہنچی ہے، یہ نہ ہوتا، کاش!
رہتی مجھ تک ہی اُس کے لب کی بات

پھر سنوں مَیں خدا کرے، صرفی
اُس کے مُنہ سے اُسی کے لب کی بات

غزل

یادؔ دہلوی

صبح بہاراں یوں آئی ہے جادوئے شب جب ٹوٹا ہے
غنچۂ و گُل کی رنگینی کو دستِ صبا نے لوٹا ہے

گریۂ شب بھی زخمِ جگر کا کوئی مداوا کر نہ سکا
اوس کی بوندوں میں پھولوں کا رنگ بھلا کب چھوٹا ہے

نقشِ قدم پر پھول کھلے ہیں تشنہ لبیٔ خار مٹی
راہِ طلب میں پائے جنوں کا آبلہ جب بھی پھوٹا ہے

آج کی اس بے حِس دنیا میں غم کا ساتھی کوئی نہیں
سب کے چہرے نقلی ہیں اور سب کا تبسّم جھوٹا ہے

شہرِ وفا میں اہلِ جنوں کو فرقِ وصال و ہجر نہیں
اُن کا تصوّر ساتھ رہا ہے اُس کا دامن چھوٹا ہے

اہلِ سخن میں اپنی غزل کے آج یہ کیونکر چرچے ہیں
یادؔ کا اُن کی عکس پڑا ہے اُن سے جو رشتہ ٹوٹا ہے

تلسی داس کی رامائن

ڈاکٹر انصار اللہ نظر

لفظ بھاکا یا بھاشا کے متعلق بعض بزرگوں کی تحریر دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ برج بھاشا کے لیے مخصوص تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندستان کی کم و بیش سبھی مقامی بولیوں کیلیے یہ لفظ ایک مشترک نام کی حیثیت سے مستعمل رہا ہے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی نے لکھا ہے :

" بھاشا شاعری کی زبان تھی اور اس میں ہر ہندی شاعر عام اس سے کہ وہ اودھی ہو یا گجراتی، مالوی یا بہاری شعر لکھتا تھا ... مسلمانوں کے لیے جہاں فارسی شاعری اور ادب کی زبان تھی اسی طرح بھاشا موسیقی اور شعر کی زبان تھی۔ اہل اسلام کی شعر دوستی نے بھاکا کی شاعری کو بہت کچھ تقویت دی ہے۔ انہی کے زمانے سے اس زبان میں شعر و ادب پیدا ہوتے ہیں گویا اہل اسلام کے پاس تین زبانیں تھیں اوّل فارسی جس میں وہ شعر و ادب، تاریخ و انشا لکھتے رہے، دوسری اردو جس کو اپنے ساتھ پنجاب سے لے کر گئے۔ تیسری بھاکا یا بھاشا جس میں موسیقی اور شعر لکھتے رہے ۔" (پنجاب میں اردو ص ۱۳۶)

اس اقتباس سے درج ذیل امور سامنے آتے ہیں :

۱۔ بھاشا یا بھاکا اردو سے مختلف کوئی زبان تھی، یہ کوئی ایسی زبان تھی جو برج، کھڑی، قنوجی وغیرہ سے الگ یا ان سب سے مرکب تھی اور ہر علاقے میں موسیقی اور شعر کی مشترکہ زبان تھی، ایسی کسی ایک مشترک زبان کے وجود کے لیے نہ کوئی قطعی ثبوت ملتا ہے اور نہ اس کا کوئی امکان ہی معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ اردو اس زمانے میں بھی مستقل زبان کی حیثیت رکھتی تھی جب مسلمان ہندستان میں نوارد تھے۔ یہ بات بھی حقیقت سے بعید ہے۔ مزید براں اگر اردو کی جداگانہ حیثیت بھی تسلیم کی جائے تو اقتباس بالا میں یہ نہ بتایا گیا کہ یہ زبان کس مقصد کے لیے استعمال میں آتی تھی اور مسلمان اس کو کب پنجاب سے لے کر گئے۔

۳۔ بھاشا میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے شعر و ادب نہ تھا۔ اردو کا بھی یہی حال تھا۔ پھر دونوں کی حیثیت میں کیا فرق تھا؟ کیا دونوں بول چال ہی کی زبانیں تھیں؟

حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے کی لسانی کیفیت اس اقتباس میں زیر بحث ہے اس وقت اردو کی موجودہ صورت کے وجود میں آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ البتہ " دیار مشرق " میں جہاں مسلمان شمالی ہند میں سب سے پہلے باقاعدہ طور پر سکونت پذیر ہو چکے تھے، اس زبان کے خد و خال سب سے پہلے ابھرے اور اس زبان کے اسی علاقے میں پہلے ادبی نقوش ملتے ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے اس حقیقت کا ذکر اس طور پر کیا ہے :

" ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ بھاشا کے میدان میں مسلمان کے نام ہندو شعرا سے اقدم ہیں۔ ہندی کا بڑا شاعر کبیر ہے جو نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے ہندو شعرا زیادہ تر دسویں صدی ہجری میں پیدا ہوتے ہیں ۔" (پنجاب میں اردو ص ۱۴۳)

ہندستان کے اہلِ علم سنسکرت، پراکرت اور پھر زیادہ سے زیادہ اپ بھرنش کو علمی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بھاشاؤں کی ان کے نزدیک کوئی علمی یا ادبی اہمیت نہ تھی البتہ مسلمانوں کی مصلحتوں نے انھیں بھاشاؤں سے دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔ عوام سے رابطے کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہ تھی کہ ان کی بول چال کی زبان کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ شارح اکھروتی کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ :

"ہریکی از اولیا بدیں لسان تکلّم می فرمودند تا کہ عہد خلافت ایشاں بامحقق لاحق (مراد از ملک محمد جائسی) رسید دوی دریں زبان بسیاری از مصنفات از رسائل و مطولات تصنیف فرمودہ"۔ (اردو کی ابتدائی نشو نما ص)

مسلمان بزرگوں کے اقوال کو قلمبند کرنے کا سلسلہ بھی اغلب ہے کہ ان کے یہاں پر باقاعدہ قیام کے فوراً بعد شروع ہو گیا ہوگا اور اسی نے بالآخر تالیف و تصنیف کے سلسلہ کی صورت اختیار کر لی۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان پنجاب کے راستے سے آئے تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ سیاسی اعتبار سے دلّی مرکزی مقام تھا اور اسی سبب سے سیاسی استحکام کے ساتھ ساتھ اس شہر کو علما اور ادبا کے مرجع کی حیثیت بھی حاصل ہوئی لیکن ایک مدت تک اس علاقے میں جنگی معرکوں کا سلسلہ جاری رہا اور دہلی کی حیثیت "سیاسی چھاؤنی" کی رہی۔ اسی لیے یہاں کے مقابلے میں "پورب دیس" میں مسلمانوں کے زیر اثر جلد تر وہ زبان وجود میں آئی جس پر بالآخر اردو کی بنیاد قائم ہوئی۔

بھاشا یا بھاکا کی اصطلاح "پورب دیس" کی بولی کے لیے بھی استعمال میں آتی رہی ہے۔ خواجہ امیر خسرو نے بھی اودھی کی مستقل اور انفرادی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس زبان کی بیشتر اہم تصانیف کے قدیم ترین مخطوطے فارسی رسم الخط میں دریافت ہوئے ہیں۔ مسلمان مصنفین نے اسی زبان کو سب سے پہلے اپنایا تھا۔ چنانچہ کچھ ہی عرصے کے بعد اس زبان کو علمی اور ادبی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔ شارح اکھروتی نے ملک محمد جائسی کو "محقق اور مدقق" کہا ہے۔ زبان کی تحقیق و تدقیق کی گنجائش اسی صورت میں ہو سکتی تھی جب زبان کو علمی حیثیت حاصل ہو چکی ہو۔ پروفیسر محمد حسین آزاد نے جائسی کی 'پدماوت' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اس کی بحر بھی ہندی رکھی ہے اور ورق کے ورق الٹے چلے جاؤ فارسی عربی کا لفظ نہیں ملتا، مطلب اس کا آج مسلمان بلکہ ہندو بھی نہیں سمجھتا"

(آب حیات ص ۲۸)

عربی اور فارسی کے الفاظ سے اس حد تک شعوری طور پر اجتناب برتنا شاعر کی زبان پر حاکمانہ قدرت کے علاوہ خود زبان کی استعداد اور وسعت پر بھی دال ہے۔ پدماوت کی زبان مصنف کی شعوری کوشش کے سبب پرتکلف اور مصنوعی ہے۔ یہ علمی اور ادبی تصنیف کی زبان ضرور ہے لیکن اسے عوام کی بول چال کی زبان سمجھنا غلط فہمی کا سبب ہو سکتا ہے۔ جائسی اور ان کے ہم مسلک لوگوں کی کوششوں سے زبان اور ادب جس نہج پر ترقی کر رہا تھا اس کے خلاف ردّ عمل کی صورت بھی جلد ہی پیدا ہوئی چنانچہ پروفیسر شیرانی نے اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے :

"قطبن، ملک محمد جائسی اور شیخ عثمان غازیپوری نے عام مذاق تصنیفیں لکھ کر ہندی شاعری کو عالمگیر مقبولیت کی شاہراہ پر گامزن کر دیا تھا لیکن افسوس ہے کہ بعد کے آنے والے شعرا نے اس کو مذہبی رنگ میں رنگ دیا۔ تلسی داس اور سور داس نے زبان کو مذہبی تنگنائے میں محصور کر کے مناقب سری رام چندر اور سری کرشن کے لیے وقف کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی شاعری مذہب کی جکڑ بندیوں سے کبھی آزاد نہ ہو سکی"

(پنجاب میں اردو ص ۱۳۶)

جہاں تک مذہبی رنگ کا معاملہ ہے میرا خیال ہے کہ مسلمانوں نے مقامی بولی کو جس وقت اختیار کیا تھا اس وقت ان کا ایک مقصد بہرحال اس زبان کے ذریعے اپنے عقائد کی تبلیغ و ترویج تھا اس لیے مذہبی رنگ تو قطبن، جائسی اور عثمان کے یہاں بھی ملتا ہے فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے عقائد کو زیادہ پرکشش اور قابلِ قبول

اندازمیں پیش کرنا تھا۔ انھوں نے مقامی مصلحتوں اور ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ یوں ان کے یہاں فکر و نظر کی وسعت زیادہ تھی۔ ہندو علما کا مسئلہ اپنے مذہب اور اپنی قدروں کی حفاظت کا تھا۔ بیرونی اثرات سے بچاؤ کے لیے اپنے گرد حصار کھینچ لینا ناگزیر ہوتا ہے۔ اس حصار کو زیادہ مضبوط بنانے کے لیے خود اپنی بعض ایسی چیزوں کو ترک کرنا پڑتا ہے جن میں بیرونی اثرات کا کوئی شائبہ بھی معلوم ہو۔ چنانچہ تلسی داس وغیرہ کے یہاں اگر "جکڑبند یوں" کا احساس ہوتا ہے تو یہ مذہب کے سبب نہیں بلکہ ان کے مخصوص حالات کے سبب تھا۔ ان کی ان تصانیف میں بھی یہ صورت ملے گی جو خالص مذہبی نہیں ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے جائسی اور تلسی داس کی زبان کو ایک ہی خانے میں رکھا ہے :

"کبیر کی پوربی تلسی داس اور جائسی کی پوربی بولی سے مختلف ہے.... کبیر کے کلام میں .... کھڑی بولی، راجستھانی اور پنجابی تک کے اثرات جھلکتے ہیں۔"

(مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۳۵)

پروفیسر شیرانی بھی تلسی داس کی بولی کو کبیر کی زبان سے مختلف سمجھتے ہیں لیکن ان کے نزدیک فرق مختلف ہے :

"تلسی داس اور سور داس اگرچہ کبیر کے بہت بعد گزرے ہیں لیکن ان کا کلام اس قدر دقیق اور عالمانہ ہے کہ ہم اس کا اکثر حصہ سمجھنے سے قاصر ہیں لیکن کبیر کے ہاں یہ دقت محسوس نہیں ہوتی ۔"

(پنجاب میں اردو ص ۱۷۹)

لیکن یہ دونوں ہی رائیں ایسی ہیں جن سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ کسی زبان میں اگر کسی دوسرے کے کسی قدر اثرات داخل ہو جائیں تو محض اتنی سی بات سے وہ زبان کچھ اور نہیں ہو جاتی۔ بلکہ کبیر کے یہاں راجستھانی اور پنجابی کے قابلِ ذکر حد تک اثرات پائے جانے میں بھی شک ہے۔ اسی طرح کسی شخص کا کلام اگر دقیق اور عالمانہ ہو تو اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس کی زبان بھی بدل گئی۔ کبیر اپنی زبان کو پوربی کہتے ہیں جائسی اور تلسی داس کی زبان بھی پوربی ہے۔ البتہ معمولی مقامی فرق ضرور ہے اور وہ اودھی اور بھوجپوری کے علاقوں سے متعلق ہونے کے سبب ہے۔

تلسی داس کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حالات کے بدلتے ہوئے رخ کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ اب ترقی پذیر اور زندہ زبان اودھی ہے اور اسی کو علمی اور ادبی حیثیت حاصل ہونا چاہیئے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ برہمن تھے۔ ان کے نزدیک وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہی تھی کہ مذہبی روایات کو اس ترقی پذیر زبان میں منتقل کر دیں۔ اگر وہ اس ضرورت کو محسوس نہ کرتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ شری رام چندر کے واقعات آج اسی طور پر عوام میں رائج رہتے جیسے کہ ہیں۔ تلسی داس نے اپنے عقائد اور مذہبی روایات کو اپنے عہد کی ترقی پذیر عوامی زبان (اودھی) میں پیش کرنے پر اپنی صلاحیتوں کو صرف کیا تھا۔ اصولاً انھوں نے عربی اور فارسی لفظوں سے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی بھی کم و بیش شعوری کوشش کی ہوگی۔ پھر وہ سنسکرت کے عالم بھی تھے۔ اس کے باوجود ان کی رامائن کی بابت پروفیسر محمد حسین آزاد نے لکھا ہے :

"سترھویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن ضلع باندہ کے رہنے والے کہ پنڈت بھی تھے، شاعر بھی تھے، فقیر بھی تھے، انھوں نے رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ وہ لاثانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوئی۔ ان کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں الفاظ فارسی عربی کے موجود ہیں۔"

(آبحیات)

رامائن میں عربی اور فارسی کے الفاظ کا ملنا اس حقیقت کے لیے کافی شہادت ہے کہ اس زمانے تک ان زبانوں کے اثرات اودھی میں اس حد تک رائج ہو چکے تھے کہ ان کو حذف کرنا معمولاً ممکن نہ تھا۔ البتہ اتنی بات تھی کہ لفظوں کا تلفظ مقامی بول چال کے مطابق بدل گیا تھا۔ خ کی جگہ کھ، ذ کی اور ز وغیرہ کے مقام پر

ج، ش کی جگہ بیشتر س اور ق کے محل پر ک وغیرہ بولتے اور لکھتے تھے۔ مقامی الفاظ میں حروف ثقیلہ ٹ، ڈ، ڑ کے علاوہ بھ پھ تھ ٹھ ڈھ وغیرہ کا استعمال بھی عام تھا۔ اودھی کے مسلمان مصنفین کے یہاں بھی ان آوازوں کا استعمال ملتا ہے۔ پروفیسر محمد حسین آزاد نے تلسی داس کا جو کلام بطور نمونے کے پیش کیا ہے، اس میں الفاظ باگ (باغ)، گریب (غریب)، نواجے (نوازے) اور کلہ (کلاہ: ٹوپی) نظم ہوئے ہیں۔ پروفیسر آزاد نے راماین کی زبان کو "بھاشا" کہا ہے۔ میرے پیش نظر اس کتاب کا جو نسخہ ہے اس کے سر ورق پر جو عبارت درج ہے اس میں بھی اس کی زبان "بھاشا" ہی بتائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھاشا سے مراد اودھی بھاشا ہے اسے برج بھاشا نہیں کہا جا سکتا۔ سر ورق کی عبارت من و عن نقل کی جاتی ہے:

شری[1] مد راماین آنند پرکاش اور دو
اجودھیا کانڈ سٹیک
یعنے
شری گوسوامی تلسی داس کرت شری راماین کا
ترجمہ اردو زبان میں
پنڈت لچھمی دت ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ ساکن
میرٹھ نے ہری بھگتوں کے شوق کے لیے اپنی بنائی ہوئی
تلسی کرت سٹیک راماین سے جو زبان بھاشا میں تھی اردو ترجمہ کیا
رام پریس میرٹھ میں پنڈت رام ناتھ کے مکان پر چھپا

اس کتاب کے مطالعہ سے کئی نہایت دلچسپ امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ انکار کے لیے بیشتر لفظ "جن" بہ کسرۂ اول آیا ہے [اعظم گڑھ وغیرہ میں یہ لفظ اب بھی اس معنی میں اکثر سنا گیا ہے[2]] لیکن ساتھ ہی اکثر "نہ" بھی نظم ہوا ہے اور انکار کے لیے فارسی میں بھی "نہ" ہی آتا ہے۔

۲۔ اعداد شمار میں ایک (اور یک بھی)، دو، چار (ا بھی) آئے ہیں جو فارسی میں بھی ملتے ہیں۔

۳۔ حرف "کہ" (بمعنی جو) بھی جگہ جگہ آیا ہے بعض پر "یا" کے معنی میں بھی نظم ہوا ہے مثلاً

~~ دیھو اتر اس کھو کہ ناہیں

۴۔ اودھی کا عام قاعدہ ہے کہ قافیہ کے لفظ کی آخری کو اکثر طول دیتے ہیں، عربی اور فارسی کے لفظوں کے ساتھ صورت رائج رہی ہے، جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظا

~~ کرن دھارتم اودھی جہاجو   چڑھے او سکل پرے نیک
~~ بھئی بڑ بھیڑ بھوپ دربارا   برنی نہ جائے بھا و ا
~~ جا سو نام سمرت یک بارا   اتر ہیں نر بھو سا دھوا

فارسی میں اچھے کے معنی میں "نیک" آتا ہے۔ اودھی میر یائے معروف کے ساتھ ملتا ہے۔

~~ یہ کل ریتی رام کھنہ ٹیکا   سبھی سہلے ہوہے س~~
~~ جو یا نجھئی مت لاکھئی نیکا

عربی میں رخصت کے معنی میں لفظ وداع آتا ہے او میں "بدا" (مکسور الاول) کہتے ہیں۔ پھر اس سے "بدائی"، "بدائیگی" بھی بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح فارسی کے مصدر ت کے مشتقات بھی یہاں قدرے مختلف صورت سے ملتے تپ کی جگہ تاپ اور پھر تپنا اور تاپنا اغلب ہے کہ ا قبیل سے ہیں۔

۵۔ ضمایر کا معاملہ بھی توجہ طلب ہے۔ فارسی میں غائب ضمیریں (ایں، او، وے ہیں)، اودھی میں آخر الذکر دونوں طور پر مستعمل ہیں۔ البتہ "ایں" کی جگہ "ای" (بہ حذف نون

---

[1] یہ کتاب عزیز محترم جناب مہر الہی کی عنایت سے مجھے دستیاب ہوئی، میں ان کا شکر گزار ہوں۔ (انصار اللہ)
[2] اعظم گڑھ وغیرہ میں لفظ انکار کے معنے میں نہیں بلکہ روکنے اور منع کرنے کے موقع پر عوام استعمال کرتے ہیں مثلاً کھٹی چیز نہ کھاؤ، دھوپ میں مت جاؤ۔ ان مثالوں اور مت کی بجائے جن کہیں گے۔ (ایڈیٹر)

آتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان تینوں کی جگہ 'یہ' اور 'وہ' بھی (واحد اور جمع دونوں صورتوں میں) مستعمل ہیں۔ اردو میں 'ای' 'او' 'وے' متروک ہوئے اور "یہ" اور "وہ" رہ گئے۔ یہ صورت حال بالخصوص توجہ طلب ہے۔ حاضر کی ضمیر "تو" فارسی اودھی اور اردو میں مشترک ہے۔

اودھی میں جو مختلف آوازیں رائج ہیں ان پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ 'ڈ' 'ڈھ' 'ڑ' 'ڑھ' کے متعلق بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ بعد کا ارتقا ہیں۔ بہر حال تلسی داس کی رامائن میں یہ آوازیں ملتی ہیں:

ع پڑھ رہے سے بہت دوار بھائی چلے ہردے اودھی شرنائی
ع سن گوہ کہے نیک کہ بوڈھا سہا کر بچتا ہیں بوڈھا
ع تیہوتنہ بولی چیری بڈ پاپنی جھاڑی سوانس کاری جنوسانپنی

اردو میں ہائے مخلوط کے ساتھ مختلف حروف انھیں آوازوں کے اظہار کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔

اودھی میں 'والا' کے معنی میں 'ہار' یا 'ہارا' کے لاحقہ کا استعمال بھی عموماً ملتا ہے' جیسے پالن ہار وغیرہ۔ اسی طرح 'موہے' بمعنی 'مجھ کو' بولتے ہیں۔ جمع کی صورت میں یہ 'ہے' بدل کر 'ہیں' ہو جاتا ہے۔

ع دھن کہے او موہے ددی بروانا مانگے او جو کچھ موہے سہانا

اودھی کے ضمائر میں بھی ان دونوں لاحقوں کا صرف ملتا ہے۔ مختلف ضمائر اس طرح ہیں:

(الف) غائب کے لیے: وہ' او' یہ' ای' وے' یے

چَو بھاسنی بھئے او دودھ کی ماکھی
ع جیہہ سوامی سیوک لگو بھائی یہ دنکر کل ریتی سہائی
جو بے منی پٹ دھر جیٹل سندر ستی سو کمار

(ب) حاضر کے لیے: رواں' تو' تم ــــ ان میں سے "رواں" اب بھی اس علاقے کی بول چال میں رائج ہے لیکن اردو میں بالکل متروک ہے۔ یہاں اس موقع پر "آپ" کہتے ہیں البتہ آخر الذکر دونوں کی مختلف صورتیں مروج ہیں۔ قدیم اردو اور اودھی میں بھی 'تو' کے مقام پر لفظ 'تیں' کا استعمال اگرچہ ملتا ہے لیکن جدید اردو میں یہ متروک ہے:

ع دن پر تی دکھوں رات کو پینے کہوں نہ تو ہے موہ بش اپنے
ع کدرو نبتی دینہہ دکھ تمھیں کوشلیا دیو

ان مثالوں میں دوسری صورت میں "تم" کے ساتھ "ہیں" کے الحاق سے "تمھیں" (یعنی تم کو) وضع کیا گیا۔ اسی طرح "تو ہے" کا معاملہ ہے۔ اردو میں پہلی صورت یعنی "تمھیں" تو مستعمل ہے لیکن "تو ہے" کا "تجھے" (= تجھے) کس طرح ہو گیا یہ نہیں کہا جا سکتا۔ ضمائر کی فاعلی صورت "ہار" اور "ہارا" کے الحاق سے منتج ہے۔ چنانچہ 'تو' سے توہار یا تہار اور توہارا یا تہارا اور "تم" سے تمھار اور تمھارا بنتا ہے۔ اردو میں 'تو' کا استعمال اب کم ہو چلا ہے۔ چنانچہ تہار یا تہارا بھی متروک ہیں۔ البتہ تمہار اور تمہارا میں ہائے ہوز کی آواز میم ماقبل سے مخلوط ہو کر تمھار اور تمھارا ہو جاتا ہے۔ ان میں تمھار اب متروک ہے۔ اودھی میں یہ سب صورتیں بدستور رائج ہیں:

چَو ہیں تمری سیوا بش راو
ع جو سن شر سم لاگ تمھارے کاہے نہ بولے اذیکن سنبھارے
ع جارے پگ سبھاو ہمارا رن بھل دیکھ نہ جائے تمھارا

(ج) متکلم کے لیے: میں' ہم آتے ہیں لیکن فاعلی اور مفعولی وغیرہ حالتوں میں 'میں' کی جگہ 'مو' لے لیتا ہے چنانچہ 'موہے' 'مورا' آتا ہے۔ 'مورا' کے متعلق خیال ہے کہ یہ "موہارا" کا مخفف "موہرا" ہے کثرت استعمال سے "توہرا" کی طرح اس میں بھی "ہائے ہوز" حذف ہو گیا اور "مورا" بر وزن "تورا" رائج ہوا۔ مورا اور تورا دونوں میں الف آخر کے حذف کا رواج بھی ہے چنانچہ 'مور' اور 'تور' بھی مروج ہیں۔ جمع کی صورت میں "ہمہارا" (= ہم ہارا) میں دوسرا 'ہ' تخفیف ہو کر حذف ہو جاتا ہے اور 'ہمارا' رہ جاتا ہے۔ یہاں بھی الف آخر کو حذف کرنے کا قاعدہ ہے چنانچہ 'ہمار' بھی آتا ہے۔ اردو میں 'مور' 'مورا' 'ہمار' 'ہمرا' وغیرہ نہیں آتے البتہ "ہمارا" آتا ہے۔ واحد کی صورت میں "میرا" بولتے ہیں۔ اغلب ہے کہ یہاں 'میں' اودھی کی طرح 'مو' میں نہیں بدلتا چنانچہ

موہا کی جگہ میرا ہی باقی رہتا ہے۔ اردو میں موہے کی جگہ مجھے آتا ہے اور یہ اس قاعدے کے مطابق ہے جس قاعدے کی رو سے توہے کا تجھے ہو جاتا ہے۔ جمع کے مقام پر "ہمیں" اودھی اور اردو دونوں میں مشترک ہے :

مثلاً آج ہمیں بڑا اچرج لاگا

یہ امور اس لیے زیادہ توجہ طلب ہیں کہ زبانوں کے صحیح رشتے کو بتانے کے لیے ضمائر کی اہمیت کو متفقہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

اضافت کے لیے اردو میں 'کا'، 'کی'، 'کے' آتے ہیں۔ اودھی میں کی اور کے تو عام ہیں لیکن 'کا' کے مقام پر قدیم اودھی میں 'کر' ملتا ہے۔

کی — مثلاً بہامنی بھئے اد دودھ کی ماکھی

کے — مثلاً لچھمن رام کے بنو

کر — مثلاً راکھے رام جاے رکھو — ہم سب کر ہت ہوے

چنانچہ ضمائر کے ساتھ بھی انھیں حروف کا استعمال ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اودھی میں ضمیر بیشتر اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہے مثلاً "اوکر" (= اسکا)، اوکی (= اسکی) وغیرہ۔ لیکن اردو میں "وہ" اور "یہ"، "اُس (مضموم الاول) اور اِس (مکسور الاول) کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

حرف عطف بھی اردو اور اودھی میں "اور" ہے۔ پنجابی اور دکنی میں یہ "ہور" ہو جاتا ہے :

— ہنوپن ہیں اور پیادے ہی پلے — شنکر ساکھی لیہے اون اہی کھاے

— شیو اور اشمبو کرم انو ہاری — دے ایش پھل ہردے بچاری

اسی طرح "سے" کے لیے "تیں" اور "تے" بھی آتا ہے۔ اس حرف کی یہ دونوں صورتیں دکنی میں بھی پائی جاتی ہیں۔

— پران تیں ادھک رام پریہ مورے — تکے تلک چھوبو کس تورے

حالت فاعلی کے لیے اردو میں "نے" کا التزام کیا جاتا ہے۔ اودھی میں اس کا استعمال کم ہے۔ البتہ پنجابی میں یہ حرف کبھی فاعل کے لیے اور کبھی مفعول کے لیے بھی آتا ہے۔ اودھی میں مفعول کے لیے یہ کبھی نہیں آتا اور اس لحاظ سے اردو اور اودھی زبانوں میں اشتراک کی صورت ہے — حرف 'نے' کے حذف کی مثال یہ ہے :

— میں سب کنیہ توہے بنو پوچھے — تلتے پہے اومنورتھ پوچھے

اودھی میں 'کو' کے علاوہ اسی معنی میں حرف 'کا' بھی آتا ہے :

مثلاً دن پہلی دیکھوں رات کو سپنے

— سنہو پران پتی بھاوت جی کا — دیہو ایک بر بھرتی ٹیکا

اور "ہم کا" بابر سے منسوب اس شعر میں بھی ہے جس کا پہلا مصرع اس طور پر بنایا گیا ہے

مثلاً بج کا نہ ہوا کچھ ہوس مانک وموتی

ماہرین لسانیات کا اتفاق ہے کہ زبانوں کے رشتے متعین کرنے میں اعداد کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اودھی اور اردو میں اعداد بہت حد تک ایک جیسے ہیں اور اس سے بھی ان دونوں زبانوں کا قریبی تعلق ظاہر ہے۔

ضمائر، حروف اور اعداد کے بعد سب سے زیادہ اہمیت افعال کو حاصل ہے۔ عام طور پر خیال کیا گیا ہے کہ اودھی میں فعل کے آخر میں 'یا' کی بجائے 'وا' آتا ہے اور اس خیال کے سبب دونوں زبانوں میں فرق کیا گیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اردو میں صرف ان مصادر کے ماضی کی علامت 'یا' ہے جن میں علامت مصدر 'نا' سے پہلے الف ہو جیسے آنا سے آیا، کھانا سے کھایا وغیرہ۔ اودھی میں ان مصادر کے ماضی میں 'وا' ہوتا ہے چنانچہ آوا اور کھاوا کہتے ہیں لیکن باقی تمام مصادر کے ماضی دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ جیسے چلنا سے چلا، اٹھنا سے اٹھا، کھلنا سے کھلا، پڑھنا سے پڑھا، دیکھنا سے دیکھا وغیرہ۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ماضی میں "یا" ہو یا "وا" دونوں صورتوں میں "آ" کی آواز مشترک ہے اس طرح دونوں زبانوں کے ماضی میں فرق بہت تھوڑا رہ جاتا ہے

زبان اردو کی اصلاح میں شیخ ناسخ اور ان کے تلامذہ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کے اعادہ کی اس موقع پر ضرورت نہیں۔ البتہ بعض امور کی طرف توجہ کرنا مفید ہو سکتا ہے۔ ذیل

کلب حسین خاں نادرؔ نے لکھا ہے :

" اکثر شعرا بٹھانا اور بِٹھانا بمعنی نشانیدن و برنشانیدن استعمال کرتے ہیں مگر میر رشک صاحب نے اس کو ترک کیا اور فرماتے ہیں کہ بعد باے عربی کے یاے حطی اور لفظ ثانی میں بعد باے فارسی کے ہاے ہوز کا ہونا ضروری ہے۔" (تلخیص معلّی)

تلسی داس نے ان دونوں لفظوں کا تلفظ وہی نظم کیا ہے جسے میر رشک نے بعد میں صحیح قرار دیا :

مثل سہت سینہ نکھٹ بیٹھاری

مثل کھاے پہرے راج بٹھارے

" پہرنا " مصدر اردو میں " پہننا " ہو جاتا ہے اور اس کا ماضی قدیم اودھی میں " پہرا " اور اردو میں " پہنا " ہے۔ چنانچہ " پہنانا " کے مقابلے میں " پہنانا " قابل ترجیح ہے۔

محمد حسین آزادؔ نے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا محاکمہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :

" شیخ صاحب اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دلّی کی قید و پابندی سے آزاد کر کے استقلال کی سند دی اور وہی مستند ہو گئی۔ اب جو چاہیں کہیں، ہم نہیں روک سکتے چنانچہ شیخ ناسخؔ صاحب فرماتے ہیں

مثل چاندنی تام ہے شب دیز کی اندھیاری کا

اگر دلّی میں بچے سے بوڑھے تک اندھیری رات کہتے ہیں مگر لکھنؤ والوں کو روکنے کا منہ نہیں۔" (آب حیات)

یہ لفظ بھی تلسی داس نے اسی طور پر نظم کیا ہے چنانچہ اودھ کی بول چال یہی ہے :

لاگت اودھ بھیانک بھاری مانہو کال رات اندھیاری

آزادؔ نے رشکؔ تلمیذ ناسخؔ کی اصلاحات زبان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

" فرماتے تھے یہاں، وہاں بجز ان جاں نہ ہو بروزن جہاں ہو۔" (آب حیات)

یہ الفاظ بھی اصلاً اودھی ہیں۔ " ہاں " جگہ کے معنی میں آتا ہے چنانچہ واہاں، یاہاں، جاہاں اسی لاحقہ کی مدد سے وضع کیے گئے۔ الف کشیدہ خفیف ہو کر وہاں، یہاں، جہاں رہ گیا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے سایہ کے معنی میں چھانو (= چھاوں) کو صحیح اور " چھانہہ " کو غلط کہا ہے۔ اودھ کی بول چال میں یہ لفظ " چھانہہ " ہی ہے۔ چنانچہ تلسی داس کہتے ہیں :

چھانہہ کرہیں گھن بیدھ کی برکھیں سمن سہاہیں

تلسی داس کی راماین کی اہمیت مسلّم ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ کتاب ایک سے زاید بار فارسی رسم خط میں شائع ہو چکی ہے جبکہ بنیادی طور پر اغلب ہے کہ یہ دیوناگری رسم خط میں لکھی گئی تھی۔ بہر حال میری اس عبارت کے بعد امید ہے کہ ایسے اہل علم حضرات بھی اس کتاب کی طرف متوجہ ہوں گے جو اس کام کے واقعی اہل ہیں یقین ہے کہ ان کی توجہ سے زبان اردو کے بارے میں بہتر اور صحیح تر معلومات سامنے آئیں گی۔

★

یہ سرزمینِ وطن

خورشید افسر

جواں کیا ہے اسے مدبھری ہواؤں نے
بھری ہے مانگ بھی فطرت کی اپسراؤں نے
بڑی لگن سے سنوارا ہے دیوتاؤں نے
یہ مسجدوں کی اذانیں، یہ مندروں کے بھجن

یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

کبھی ہواؤں کے جھونکوں میں برق کی للکار
شرر فشاں کبھی موسم، کبھی فضا گلبار!
کبھی جوان بگولے، کبھی حسین پھوار
کئی رُتوں نے بنایا ہے اس کومل کے دلھن

یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

کبھی یہ گوتم و نانک کو جنم دیتی ہے
کبھی یہ سرمد و چشتی کو گود لیتی ہے
یہی تو گاندھی و ٹیگور کی بھی جیتی ہے
دیا ہے نذرل و اقبال نے خراجِ سخن

یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

یہ سرخ قلعۂ دلی، یہ حسنِ تاج محل
یہ الورا، یہ اجنتا، یہ شالیمار، یہ ڈل
اودھ کی شام، بنارس کی صبح سب کا بدل
جو نرم نرم ادائیں تو سرخ سرخ بدن

یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

یہ سحر کاریِ راگنی یہ حسنِ نینی تال
یہاں ہے شوخیِ پنجاب و جادوے بنگال
یہ ہیر، اور یہ رانجھا یہ سوہنی مہوال
یہ رام و شیام کی دھرتی یہ پیار کا آنگن

یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

یہاں سبھی کے لیے ہے بہار کا پیغام
گلے ملو کہ ہے یہ اس دیار کا پیغام
اک ایک لہر سناتی ہے پیار کا پیغام
مچل مچل کے گلے مل رہے ہیں گنگ و جمن

یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

غزل

زخموں کا بازار سجائے دُنیا کی پرخاش لیے
گھوم رہے ہیں اپنے سر پر ہم غم کا آکاش لیے

ہر لمحہ ہے کتنا زریں پوچھو ہم معماروں سے
وہ کیا جانیں وقت کی قیمت جو بیٹھے ہیں تاش لیے

جس آپے پر ناز ہے تم کو خاک میں وہ مل جائے گا
جب پہنچیں گے ہم دیوانے اپنا حالِ فاش لیے

توڑ دو لے کر عزم کا تیشہ راہ کی ان چٹانوں کو
بیٹھے کیوں روتے ہو یارو تم قسمت کی لاش لیے

جس منزل پر لوگ پہنچ کر خود منزل بن جاتے ہیں
اُس منزل تک تم بھی آتے رہبرؔ ہم کو کاش لیے

منہاج احمد رہبرؔ جونپوری

افسانہ

فیملی فرینڈ

رام لعل

مسز پربھا سرن اپنے بچے کو اسکول سے لانے کے لیے جلدی جلدی تیار ہوئی۔ تین بج چکے تھے۔ اس کی سوا تین بجے چھٹی ہو جاتی تھی۔ اسکول بس کے خراب ہو جانے کی ہی وجہ سے اسے خود جانا پڑ رہا تھا۔ گزشتہ روز منٹی اسکول سے واپس آیا تھا تو اس کی ایک کاپی میں اس کی ٹیچر نے یہ لکھ بھیجا تھا — "کل سے اسکول کی بس ورکشاپ میں اوورہالنگ کے لیے بھیجی جا رہی ہے۔ مہربانی کر کے دو دن کے لیے اپنے بچے کو خود ہی اسکول تک پہنچانے اور یہاں سے لے جانے کا انتظام کر لیں۔"

آج صبح وہ خود ہی منٹی کو وہاں چھوڑ آئی تھی۔ اس کا پتی چندر سرن دہلی سے باہر تھا۔ ورنہ وہ خود ہی یہ سب کرتا۔ صبح دفتر جانے سے پہلے منٹی کو اپنی اسکوٹر پر بٹھا کر لے جاتا اور سہ پہر میں دفتر سے شارٹ لیو (SHORT LEAVE) لے کر پھر اس کے اسکول پہنچ جاتا۔ مسز سرن اسکوٹر چلانا نہیں جانتی تھی ورنہ اُسے اتنی دقت ہرگز نہیں اٹھانا پڑتی۔ کپڑے بدل کر وہ باہر نکل آئی۔ سڑک پر اچانک تیز دھوپ کا احساس ہوا تو اس نے پرس میں سے کالا چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگا لیا۔ سخت گرمی کی وجہ سے ترشے ہوئے بال پسینے سے بھیگ جاتے ہیں۔ گردن پر چپکنے لگتے ہیں۔ اسی لیے اس نے اپنے بالوں کو گردن کے پیچھے ایک کلپ کے ذریعے اکٹھا کر لیا تھا۔

اس نے اِدھر اُدھر ٹیکسی کے لیے دیکھا۔ بس اسٹاپ بھی اگرچہ زیادہ دور نہیں تھا، لیکن اس کا کیا بھروسہ کہ بس فوراً مل ہی جائے گی! کبھی کبھی تو فوراً مل جاتی ہے۔ انتظار بھی نہیں کرنا پڑتا لیکن کبھی کبھی بہت زیادہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آج تو وہ کوئی چانس نہیں لے سکتی۔ دیر ہو گئی تو منٹی بے چارہ اسکول کے گیٹ پر کھڑا کھڑا پریشان ہو جائے گا۔ اسے نہ پا کر روہانسا ہو اٹھے گا۔ سات سال کا ہی تو ہے! اس کے ہم جماعت لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے گارجینز کے ساتھ چل دیں گے تو اس کا من یقیناً دکھی ہو اٹھے گا۔

مسز سرن کو کوئی بھی ٹیکسی آتی ہوئی دکھائی نہ دی تو وہ خود گھبرا اٹھی۔ بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ تو ملے اسکول تک پہنچنے کے لیے! بڑی تیزی سے آتی ہوئی دو تین کاریں اس کے قریب پہنچ کر دھیمی ہو گئیں۔ شاید کار والے یہ توقع کر بیٹھے کہ وہ ان سے لفٹ کے لیے کہے گی! لیکن اس نے منہ پھیر لیا۔ وہ لفٹ چاہتی ہی نہیں ہے کیا معلوم کون شریف صورت آدمی اچانک اپنے سنجیدہ وجود میں سے باہر نکل کر اس کا ہاتھ پکڑ لے! مرد کی فطرت کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ عورت کو وہ عام طور پر ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ عورت صرف ایک عورت ہے۔ راحت کا ذریعہ ہے! اگر دلکش بھی ہے تو پھر تو کہنا ہی کیا!

اس نے دور سے آتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو دیکھ کر رکنے

یسے ہاتھ اٹھا دیا لیکن ڈرائیور نے کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ سیدھا
یتا ہوا نکلا چلا گیا۔

"کرؤئل !" (CRUEL) اس کی زبان سے بے اختیار
ل گیا۔ غیر مرد مہربان ہونے پر اتر آئے تب بھی وہ ظالم ! پردا
رسے تب بھی وہ ظالم ہی کہلانے کا حق دار ہو سکتا ہے ! مسز
بھاسرن کو اپنی حماقت پر بس لمحہ بھر کے لیے ہی کڑھن ہوئی۔
ں کے بعد وہ ایک اور ٹیکسی کی طرف متوجہ ہو گئی۔ لیکن وہ بھی
ی طرح نکلی ہی چلی گئی۔ در اصل اس میں ایک سواری موجود
ی۔ دور سے دکھائی نہیں دی تھی۔

اس نے سمجھ لیا وہ وقت پر منٹی کے اسکول تک نہیں پہنچ
تی ہے۔ اب یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں رہا۔ بس اسٹاپ بھی خالی
ہ۔ دور دور تک کسی بس کی جھلک دکھائی نہیں دیتی لیکن اچانک
منے سڑک کے پار ایک آدمی کو اپنی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے دیکھ
۔ وہ جلدی سے اسکوٹر گھما کر اسی کے پاس آنے کے لیے اشارہ
رہا تھا۔ اسے پہچان کر وہ حیران سی رہ گئی۔ لمحہ بھر کے لیے
)۔ پھر لمحہ بھر کے لیے وہ خوش بھی نظر آئی۔ لیکن ساتھ ساتھ
ں کا دل بھی ڈوبنے لگا (یہ تو بیری ہے ! کہاں سے ٹپک پڑا ؟)

اگلے چند لمحوں میں تیس بتیس برس کا ایک خوبصورت خوش
ش آدمی اس کے بالکل پاس اپنی اسکوٹر روک کر کھڑا مسکرا
تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھوں پر سے اپنا دھوپ کا چشمہ بھی
یل سا لیا۔ جیسے وہ اسے اپنی ننگی آنکھوں سے اور بھی واضح
ر پر دیکھ لینا چاہتا ہو !

"کہاں جانا ہے مسز سرن آپ کو ؟"

"اوہ !" مسز سرن نے خود کو متوازن کر لینے میں بس دو
نا ہی لمحے لیے۔ پھر وہ بولی ــــ "جی مجھے منٹی کے اسکول تک ہی
نا ہے۔ آج اسکول بس آؤٹ آف آرڈر ہے۔ سوا تین بج چکے
ں۔ وہ میرا انتظار ہی کر رہا ہوگا ! لیکن بس یا ٹیکسی کچھ بھی تو
نا مل رہی ہے !"

"تو آیئے۔ میں پہنچا دیتا ہوں"

(یہ تو تم نے ٹھیک ہی کہا ہے ! میں واقعی اس طرح وہاں فوراً
پہنچ جاؤں گی !) لیکن وہ کچھ پس و پیش میں پڑ گئی۔ بولی "جی نہیں۔
آپ کو بے کار تکلیف کیوں دوں ؟ پتہ نہیں آپ کیسے ضروری
کام سے جا رہے تھے۔ اچلی جاؤں گی۔ کوئی نہ کوئی کنوینس
(CONVEYANCE) مل ہی جائے گی۔ تھینک یو !"

(بھگوان کے لیے اب یہاں سے چل ہی دو نا !) وہ من
ہی من میں منانے لگی۔)

"مجھے کوئی بھی ضروری کام نہیں ہے اس وقت۔ ہوتا
تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ آپ کہیں تو میں ہی جا کر منٹی کو لے
آؤں۔ ؟ آپ گھر جایئے"

(اوہ ! یہ آدمی آج میرے گھر ہی آ کر رہے گا ! منٹی کو
پہنچا دینے کا اسے بہانہ مل رہا ہے نا !) وہ کھڑی سوچتی رہ گئی۔
فوراً کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

"منٹی اسی ٹائنی ٹاٹس اسکول میں پڑھتا ہے نا ؟ گول مارکٹ
کے پاس !" بیری نے پھر سے آنکھوں پر چشمہ لگا کر اسے گھورا اور
مسکرانے لگا۔ اسکوٹر بھی اسٹارٹ کرتا رہا۔ پاؤں مار مار کر۔

"اچھا تو چلیے۔ آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں میں۔ آپ کو
پھر سے اتنی دور سے لوٹنے کی تکلیف کیوں دوں ؟"

(یہی اچھا ہوگا ! تھوڑی دور تک بیری کا ساتھ برداشت
کر ہی لوں گی۔ گھر پر بلا کر تو نہ صرف گھنٹے بھر تک اس کی نظروں
کے سامنے بیٹھے رہنا ہوگا بلکہ دو دن بعد ان کے سامنے بھی جوابدہ
ہونا پڑے گا ! پھر وہ کئی روز تک روٹھے روٹھے پھریں گے !)

بعض لمحے ایسے جذباتی حادثے سے ہمکنار ہو جاتے ہیں جن کا
اثر فوراً محسوس ہونے لگتا ہے۔ بیری کے پیچھے اسکوٹر پر بیٹھتے ہی
مسز سرن کو احساس ہو گیا کہ دھوپ میں جلتی ہوئی کول تار کی
یہ سڑک ایک سیاہ فیتہ بن کر اس کی آئندہ زندگی کے گرد لپٹتی
جا رہی ہے۔ تو در تو ! اسے اچانک اپنے آدمی جیسے ایک اور
خوبصورت اور پورے مرد کے مضبوط کندھے پر ہاتھ رکھ کر
بیٹھنا پڑ گیا ہے۔ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ ان

لوں میں اجنبی آدمی کا سہارا نہ لے تو کہیں بھی ہلکا سا جھٹکا کھا کر وہ گر پڑے گی۔ لیکن وہ اپنا ہاتھ جلتا ہوا سا محسوس کرنے لگی۔ (اف! اس آدمی کے بدن میں کتنی آگ ہے!)

" سرن کہاں ہوگا اس وقت؟ اپنے آفس ہی میں نا!"

(لو! اسے اب بتانا ہی پڑے گا سب کچھ!) بولی ——

" جی وہ ایک ضروری کام سے امرتسر گئے ہیں "

" اچھا! کب لوٹیں گے؟"

" دو روز بعد!"

" بہت دنوں سے وہ ملا نہیں مجھ سے!"

(اس کا سبب تو میں بھی جانتی ہوں اور تم بھی! ہم اب لمبے لمبے عرصے تک کیوں نہیں مل پاتے!)

بہت تیز رفتار سے جاتی ہوئی اسکوٹر کی وجہ سے بہت سے الفاظ اڑ اڑ جاتے انھیں جھپٹنا پڑتا اور جواب دینے کے لیے اسے اونچا بھی بولنا پڑتا۔ دو ایک بار اس نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ کوئی جواب ہی نہ دیا۔ (یہی ٹھیک ہے۔ سڑک پر جاتے ہوئے کون گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتا ہوا جائے! اور پیچھے سے اس کی گردن سے اپنا کان سٹا کر سُنے!) لیکن خاموش رہ کر بھی وہ دُزدیدہ نگاہوں سے اس کی گھنے سیاہ بالوں سے ڈھکی ہوئی گردن کو دیکھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکی۔

ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ چندر دو سال پہلے اچانک اپنے بہت ہی قریبی دوست کو اپنے سے الگ کرنے لگا تھا۔ وہ ان کے گھر آجاتا تو بظاہر تو چندر اس کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتا، لیکن اس کے کچھ رویے ایسے بھی تھے جن سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ اسے دور کر دینا چاہتا ہے۔ جب وہ اس کی کسی پیشکش کو قبول نہ کرتا۔ کوئی بہانہ بنانے لگتا۔ جہاں تک ممکن ہوتا اسے وہ اپنے یہاں بلانے سے گریز ہی کرتا۔ اس کی پسند کی کبھی تعریف نہ کرتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلاف کر کے بات کو بہت بڑھا دیتا جس سے ایک ناخوشگوار سی فضا بھی پیدا ہو جاتی۔ دوست چلا جاتا تو وہ اس کی برائیاں کرنے بیٹھ جاتا۔ چندر کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ پربھا بھی اس کے ساتھ اتفاق ضرور کرے۔ وہ ایسا نہ کرتی تو چندر اس سے خفا ہو جاتا۔ پربھا کو بہت حیرانی ہوتی۔ شادی کے موقعے پر تو چندر نے اپنے دوست کا تعارف یہ کہہ کر کرایا تھا کہ "میرا سب سے اچھا اور ہمدرد فرینڈ بیری ہی ہے" اس کے بعد کئی سال تک وہ بیری کی ویسی ہی قدر کرنے کے لیے اسے مجبور کرتا رہا جیسی قدر وہ خود اس کی کرتا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ بیری نے ہر موقعہ پر ان کی مدد کی تھی۔ مدد کے حدود نہیں ہوتے۔ جب کوئی پورے خلوص سے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیتا ہے تو ان کے گھیرے میں کیا کچھ نہیں سمٹ کر آجاتا!

پربھا کو پرائیویٹ بی۔ اے کرتے وقت اکونمکس میں چند نمبروں کی سخت ضرورت پڑ گئی تھی۔ ورنہ وہ پاس نہیں ہو سکتی تھی۔ اس وقت بیری نے ہی یونیورسٹی کے کارپردازوں کو درخواست دے کر اس کے نمبروں کی دوبارہ جانچ کرا دی تھی۔ پھر جب اس کے سامنے ایک آفس میں سروس کا مسئلہ آ کھڑا ہوا تھا، وہاں بھی بیری کی ہی سفارش کام آئی تھی، اگرچہ بعد میں منٹی کی پیدائش کے بعد اس نے سروس کو خیرباد ہی کہہ دیا۔ جب چندر کے والد گذر گئے تھے اس وقت چندر دہلی میں نہیں تھا۔ اس کی غیر حاضری میں ساری ذمّے داری بیری نے ہی سنبھالی تھی۔ ایک بار چندر کا تبادلہ دہلی سے باہر ایک اور شہر میں کر دیا گیا تھا۔ چندر وہاں نہیں جانا چاہتا تھا اس تبادلے کو منسوخ کرانے والا بھی بیری تھا۔ اس کے بغیر یہ کام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کوئی کوئی خاندان ایسا ہوتا ہے جہاں صرف دوست ہی زیادہ اہم سمجھے جاتے ہیں، رشتے داروں کی اہمیت بالکل نہیں ہوتی۔ اس کے پتی کا خاندان بھی اسی قسم کا تھا۔ اس خاندان میں کون کون سے دور یا نزدیک کے رشتے دار ہیں، پربھا کو کبھی بھی معلوم نہ ہو سکا۔ اسے تو لگتا تھا یہ خاندان، خاندان کے صحیح معنوں پر پورا ہی نہیں اترتا ہے۔ یہ تو صرف دو چار ہی افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر ہے جہاں اس کے پتی کے صرف دوست ہی دوست دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ واجبی

قسم کے دوست۔ کچھ اچھی قسم کے دوست کچھ بہت اچھی قسم کے دوست لیکن اس کا سب سے اچھا اور قریبی دوست وہی تھا۔ لوگ دھیان بیری جسے نہ جانے کیوں اس کا پتی رفتہ رفتہ الگ ہی کر دینے پر تل گیا تھا۔ لیکن پربھا کو یہ جان لینے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ اس کے پتی کے یہاں درحقیقت کون سا جذبہ کام کر رہا ہے۔ چندر کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے دوست سے جس قدر محبت کرتا ہے، اس میں اس کی بیوی بھی حصہ دار بن رہی ہے۔ وہ بھی سے اسی قدر پسند کرنے لگی ہے۔ مسز پربھا جانتی تھی یہ سراسر غلط ہے۔ وہ اپنے پتی کی وجہ سے ہی اس کی عزت کرتی ہے۔ چندر سرن جس قدر اپنے دوست کو چاہتا ہے اسے دیکھ کر اگر پربھا نے حسد یا جیلسی (JEALOUSY) کا رویہ اپنا لیا ہوتا تو شاید چندر اسے کبھی برداشت نہ کر سکا ہوتا، جس طرح عام طور پر اپنے دوستوں سے محبت کرنے والے پتی اپنی بیویوں کے اس طرح کے رویے پر برا مان جاتے ہیں۔ اس نے بیری کے تئیں حسد کا جذبہ نہ اپنا کر اپنے پتی کو محض خوش کرنے کے لیے ہی اس کی ہمیشہ تعریف کی تو چندر خود ہی حسد کا شکار ہو گیا۔ عورتیں بعض معاملوں میں مردوں سے کہیں زیادہ فراخ دل ہوتی ہیں۔ وہ اپنے گھر کے سکون کی خاطر اپنے پتی کی کتنی کمزوریوں کو معاف کر سکتی ہیں۔ اپنے من کو سمجھا سکتی ہیں۔ اسی ماحول میں رہنا بخوشی قبول کر سکتی ہیں جو ان کے لیے ان کے آدمی بنا کر دیتے ہیں۔ وہ بھی ایسا کیوں نہ کرتی!۔

جن دنوں بیری اپنے لیے کسی لڑکی کا انتخاب کر لینا چاہتا تھا اس میں وہ پربھا اور چندر دونوں کی رائے لینا چاہتا تھا۔ انھیں بھی لڑکی دکھا کر چندر نے ہی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اسی لیے پربھا کو بھی مجبوراً لاتعلق بننا پڑا تھا۔ من سے تو وہ یہاں تک چاہتی تھی۔ بیری جیسے برسرِ روزگار، خوبصورت اور سوشل نوجوان کے سامنے اپنی چھوٹی بہن سروجا ہی کا نام تجویز کر دے جو خوبصورت اور تعلیم یافتہ بھی تھی۔ ہر لحاظ سے بیری کے لیے موزوں تھی لیکن وہ اپنے پتی کے عجیب و غریب رویے کی ہی وجہ سے ایسا نہ کر سکی۔ جب بیری کی شادی ہو گئی تو اس میں صرف چندر ہی جا کر شریک ہوا اپنے ساتھ پربھا کو لے کر نہیں گیا تھا وہ۔ شادی کے بعد چندر نے اپنے دوست اور اس کی بیوی کو اپنے یہاں مدعو کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ یہ بھی اس کے پتی کی ایک غیر شریفانہ حرکت تھی جس پر وہ دل میں بہت کڑھی۔ پھر ایک روز اچانک بیری اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ان کے یہاں چلا آیا۔ ویسے تو پربھا اور چندر دونوں نے ہی ندامت سی محسوس کی لیکن اس کے پتی نے فوراً ہی اپنے اس احساس پر قابو پا لیا۔ جب کہ وہ ایسا نہ کر سکی۔

اب تو بیری کو بھی صاف صاف دکھائی دینے لگا تھا کہ چندر اس سے کھنچتا جا رہا ہے۔ اس پر بھی اس نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ خود ہی آ کر کبھی کبھی مل لیتا تھا۔ چندر نے بیری کی جگہ پُر کرنے کے لیے کچھ اور دوستوں کو قریب کر لیا تھا۔ پربھا دیکھتی رہتی تھی۔ یہ گھر دوستوں کے ہی کندھوں پر کھڑا ہے۔ دوست ہی ستون بن کر اسے سہارا دیے ہوئے ہیں۔ یہ سب نہ ہوں تو اس گھر کے اندر ایک ناقابلِ برداشت قسم کا سناٹا بھر جائے! لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہی تھی کہ بیری کے سوا اور کوئی بھی شخص اپنی جھولی میں پُرخلوص اور بے لوث قہقہے بھر کر اس گھر میں نہیں آیا۔ وہی سب کو ہنسایا کرتا تھا۔ وہی اپنے اخلاق سے سب کا من بھی موہ لیا کرتا تھا۔ دوسرے جتنے بھی دوست تھے اپنی کوئی نہ کوئی غرض ہی لے کر آئے۔ جب پوری نہ ہو سکی تو گلہ شکوہ کر کے الگ ہوتے چلے گئے۔

اپنے پتی کی دیکھا دیکھی پربھا سرن نے بھی ایک فیملی فرینڈ بنانے کی جرأت کی تھی۔ ان کے گھر کے سامنے دو ادھیڑ عمر میاں بیوی رہتے تھے۔ مرد کسی ایسے دفتر میں ملازم تھا جہاں اسے دوپہر کے بعد پوری چھٹی ہو جاتی تھی۔ اس کی بیوی روزانہ پانچ کے بعد پربھا سے اخبار مانگ کر لے جاتی تھی۔ پربھا نے کبھی انکار نہ کیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے آدمی کے لیے ہی اخبار لے جاتی ہے۔ وہ خود اخبار کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا یا اس نے ابھی تک ایسا کرنے کی عادت ہی نہیں ڈالی ہے۔ اس آدمی کو وہ شکل و صورت سے انتہائی نیک، ہمدرد اور قابلِ رحم سمجھتی۔ اس نے

سوچا کیوں نہ اس آدمی کو وہ اپنے گھر کے قریب تر کر لے۔ وقت بے وقت کام بھی آئے گا۔ اس کی عورت تو اس کے قریب تھی ہی۔ دن میں ایک دو بار ضرور اس سے ملنے کے لیے آ جاتی تھی۔ گھنٹہ دو گھنٹے پاس بیٹھ کر اپنی اور دنیا جہان کی کتھا سنا جاتی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس کے کام کاج میں بھی ہاتھ بٹاتی رہتی، جو بھی کام اس وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ وہ ترکاری چھیل رہی ہوتی تو اسی کو اپنی طرف سرکا لیتی۔ پربھا کوئی کپڑا سی رہی ہوتی تو وہ اس سے مشین لے کر خود ہی سینے بیٹھ جاتی۔ سلائی کڑھائی کے کام میں وہ خاصی ماہر تھی۔ جن دنوں اس کا منٹی پیدا ہونے والا تھا، وہی عورت اس کی سب سے بڑی مددگار ثابت ہوئی تھی۔ تجربہ کار عورتوں کی طرح اس نے پربھا کو ساری اونچ نیچ ذہن نشین کرا دی۔ اس کے ساتھ اسپتال بھی پہنچی۔ ڈلیوری کے وقت بھی وہ اس کے ساتھ تھی۔ ایسی عورت کے آدمی کی وہ عزت کیوں نہ کرتی؟ اسے جب معلوم ہو گیا کہ وہ مطالعے کا بے حد شوقین ہے تو وہ اس کے گھر روزانہ اخبار کے علاوہ کئی رسالے اور کتابیں بھی بھجوانے لگی۔ اس کے گھر میں ایسی چیزوں کی کمی نہیں تھی۔ چندر اور وہ دونوں ہی کتابوں اور رسالوں کے شوقین تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ اکثر کھانے پینے کی چیزیں بھی ان کے ہاں بھجوانے لگی۔ جو بھی خاص چیز وہ گھر پر تیار کرتی مثلاً سموسے، آئس کریم، گاجر کا حلوہ وغیرہ، ان کے لیے ضرور بھیجتی۔ پھر رفتہ رفتہ پربھا نے اس آدمی کو اپنے گھر پر بلانا شروع کر دیا۔ کبھی کسی کام کے بہانے سے کبھی کبھی خاص طور پر چائے پر ہی مدعو کر لیتی۔ چندر بھی اس سے مل کر بے حد خوش ہوا۔ اس کے آنے جانے پر وہ کبھی بھی معترض نہ ہوا۔ وہ آدمی اگرچہ بے حد باتونی نکلا، اپنی بیوی سے بھی زیادہ۔ وہ ان کے منٹی سے چونکہ بہت محبت کرتا تھا، اسی لیے اس کی زیادہ بولنے کی عادت کو پربھا نے نظر انداز ہی کر دیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اچانک وہ اس آدمی سے بے اعتنائی برتنے لگی۔ اسے اچانک احساس ہو گیا کہ وہ آدمی چپکے چپکے اس سے محبت کر رہا ہے۔ اس کی طرف بڑے جذبے سے تاکتا ہے اور سر جھکا لیتا ہے۔ اپنے مکان کی کھڑکی میں سے پردے کے پیچھے کھڑا ہو کر اکثر اسے گھورا کرتا ہے۔ پہلے تو پربھا من ہی من میں خوب ہنسی۔ یہ آدمی کتنا عجیب نکلا! لیکن پھر ایک روز اس نے اس آدمی کو ایک اور چوری کرتے ہوئے بھی پکڑ لیا۔ وہ ان کے ڈرائنگ روم میں سے ایک فریم میں رکھی ہوئی اس کی فوٹو نکال کر لیے جا رہا تھا۔ پربھا نے ہاتھ بڑھا کر اس سے اپنی فوٹو واپس لے لی اور اس کی طرف بڑی خفگی سے دیکھا۔ بس اتنا ہی کیا تھا اس نے۔ وہ آدمی اتنے ہی سے بے حد شرمندہ ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے پربھا کی طرف دیکھنے کی کبھی جرأت نہ کی۔ ان کے گھر آنا بھی چھوڑ دیا۔ اپنا الگ اخبار بھی منگوانے لگا۔ یہ دیکھ کر پربھا نے اطمینان کی سانس لی۔ چلو بہت سستے میں جان چھوٹ گئی! اپنے پتی کو اس نے جب یہ واقعہ سنایا تو وہ بھی خوب ہنسا اگرچہ وہ اس آدمی کے ساتھ پہلے کی طرح بڑی مہربانی سے ہی پیش آتا رہا۔

مسز پربھا سنہا بیری کے ساتھ سکول پہنچی تو منٹی کو اس نے پیچ گیٹ کے سامنے ہی اپنی کتابوں کے بکس پر بیٹھا ہوا پایا۔ روتی سی صورت بنائے جیسا کہ اس کا اندازہ تھا۔ گرمی کی شدت سے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس گئی اور اسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ بڑے پیار سے اسے بتلانے لگی — "مجھے ٹیکسی نہیں مل سکی منٹی! اسی لیے دیر ہو گئی۔ پھر یہ تمہارے انکل آ گئے۔ انھوں نے ہی میری مدد کر دی اور میں تمہارے پاس فوراً پہنچ گئی!"

منٹی ماں کے گلے میں باہیں ڈالے بیری کو گھورنے لگا جو ابھی تک اپنی اسکوٹر پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

اس وقت اگر منٹی کا باپ یہاں ہوتا تو وہ بھی اپنے بچے کی طرف ایسی ہی محبت بھری مسکراہٹ سے دیکھتا۔ کسی کسی مسکراہٹ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ چاہے وہ باپ کی ہو یا باپ کے کسی

دوست کی۔

"ہیلو منٹی!"

بیری کا اشارہ پاکر منٹی اس کے ساتھ ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھ گیا تو پربھا بہت خوش ہوئی۔ منٹی سے بولی — "دیکھو منٹے! اپنے انکل کو اب تھینک یو بھی کہہ دو، کیوں کہ انھوں نے مجھے تمھارے پاس پہنچایا ہے نا!"

"تھینک یو انکل!" بے حد شرمیلے اور دھیمے لہجے میں اس نے بیری کا شکریہ ادا کیا۔

"اور انکل سے اب یہ بھی کہو آپ اب جائیے۔ میں اپنی ممی کے ساتھ گھر چلا جاؤں گا۔"

منٹی نے وہی بات بڑی معصومیت سے دہرادی تو پربھا بھی کہہ اٹھی — "آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

"اس طرح کہ آپ دونوں اب میرے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں چلیے۔ منٹی کو بہت پیاس لگ رہی ہے شاید! اسے وہاں کچھ کھلایا پلایا جائے! کیوں منٹی؟"

بیری نے براہ راست منٹی کو بھی مدعو کرنا مناسب سمجھا "چلو گے نا میرے ساتھ آئس کریم کھانے؟"

مسز سرن نے جلدی سے اپنی ساڑی کے پلو سے ہی منٹی کا چہرہ پونچھتے ہوئے کہا — "آپ تکلیف نہ کیجیے۔ دیر ہو جائے گی۔ اب آپ جائیں؟"

"نہیں نہیں! کچھ بالکل دیر نہیں ہوگی۔ جہاں جاکر بیٹھیں گے وہیں سے میں اپنے آفس کو فون کرلوں گا۔ آیئے۔ بیٹھ جایئے پیچھے۔ منٹی بیٹے، تم آگے آجاؤ۔ یہاں کھڑے ہو جاؤ۔ اپنا بکس ممی کو دے دو۔"

منٹی جیسے یہی چاہتا تھا۔ جھٹ سے اپنا بکس پربھا کے ہاتھ میں دے کر بیری کے آگے اس کی ٹانگوں کے درمیان کھڑا ہوگیا۔ پربھا کے لیے اور کوئی چارہ ہی نہیں رہ گیا۔ اسے بھی اسکوٹر پر پیچھے بیٹھنا پڑا۔ پہلے کی طرح بیری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر، لیکن اب اسے وہ کندھا پہلے سے بھی زیادہ سخت لگا۔

چبھتا ہوا سا بھی۔ حد سے بڑھا ہوا خلوص کبھی کبھی ایسا ہی محسوس ہونے لگتا ہے۔

اسکوٹر چل پڑا تو منٹی نے بڑے مسرور لہجے میں پوچھا:

"انکل، ہم کہاں جارہے ہیں"؟

"آئس کریم کھانے۔ کھاؤ گے نا؟"

"کھاؤں گا!" اس نے بڑے ادھیکار سے کہا۔

"اور کیا کیا کھاؤ گے؟"

"جو بھی کھلائیں گے آپ۔"

بیری نے اس کے سر پر بڑے پیار سے بوسہ دیدیا۔ کہا — "میرے ساتھ دوستی کروگے تو بہت سی چیزیں کھلاؤں گا سمجھے؟"

"اچھا تو آپ کی اور میری دوستی پکی! ہاتھ ملاؤں؟"

"ارے نہیں۔ ابھی نہیں! جب اسکوٹر سے اتریں گے نا تب ہاتھ ملائیں گے۔ بڑے زور سے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے انکل!" وہ کھل کھلاکر ہنس بھی پڑا۔

(یہ شریر کتنی جلدی دوستی کرنے پر آمادہ ہوگیا ہے! معلوم ہوتا ہے اسے یہ خاصیت اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہے) پربھا من ہی من میں کچھ خوش ہوئی کچھ پریشان بھی!

قرول باغ میں ایک ایرکنڈیشنڈ ریسٹوران کے سامنے پہنچ کر بیری نے اسکوٹر روک لی۔ منٹی نے اترتے ہی پہلے اس کی طرف ہاتھ بڑھادیا۔ "انکل اب ہاتھ ملایئے۔ پہلے دوستی کریں!"

ہاتھ ملاکر دوستی کا اقرار کرنے کا طریقہ اسے اس کے ڈیڈی نے ہی سکھا رکھا تھا۔ پربھا نے اپنے ننھے منے بچے کو ایک پورے مرد کے سے رویے کے ساتھ بیری کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارتے ہوئے دیکھا، اور پھر دونوں کو آگے آگے ہنستے ہوئے اندر جاتے ہوئے۔ پربھا کو یاد آیا کہ اسی ریسٹوران میں وہ، چندر اور بیری بیسیوں بار آچکے ہیں۔ کافی عرصہ پہلے۔ یہاں انھوں نے کتنی دعوتیں اڑائی ہیں۔ ہنستے ہنستے، ایک دوسرے سے جرمانے کے طور پر وصول کی گئی دعوتیں۔ جرمانہ کسی بھی غلطی کی بنا پر کر لیا جاتا تھا۔ معمولی سے معمولی غلطی پر بھی۔ دراصل جرمانہ



وزیراعظم شری متی اندرا گاندھی، ۲ مئی ۱۹۷۲ء کو الموڑہ میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری کملا پتی
ترپاٹھی ۵ مئی ۱۹۷۲ء کو لکھنؤ میں
راج رشی پرشوتم داس ٹنڈن
ہندی بھون کا افتتاح کرتے ہوئے



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی، مئی سنہ ۷۲ء کو الموڑہ میں ترقی سیمینار کو خطاب کرتے ہوے



نیپال کے وزیر اعظم شری کرتی ندھی بشٹ ۲ مئی سنہ ۷۳ء کو پنت نگر (نینی تال) یونیورسٹی دیکھنے تشریف لائے۔ تصویر میں موصوف ایک ترقی یافتہ چقندر کا معائنہ کرتے ہوے



وزیر اعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی جنگ میں کام آنے والے سورماؤں کے خاندانوں کے لیے لکھنؤ میں تعمیر کیے جانے والے "شہید دھام" کا ۱۷ مئی سن ۲۰۰۲ء کو افتتاح کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ ۲۰ مئی سن ۲۰۰۲ء کو لکھنؤ کے شہید دھام کے ایک کوارٹر کے قبضے کا اجازت نامہ ایک شہید کی بیوہ کو سونپتے ہوئے



اتر پردیش تنخواہ کمیشن کی نشست ۱۱ مئی سن ۲۰۰۲ء کو تلک ہال کونسل ہاؤس لکھنؤ میں ہوئی۔ کمیشن کے ممبران آپس میں صلاح و مشورہ کرتے ہیں



اسپورٹس کے وزیر شری اجیت پرتاپ سنگھ ۱۶ مئی ۸۲ء کو لکھنؤ میں ہونے والے شیش محل کرکٹ ٹورنامنٹ کا افتتاح کرتے ہیں



سیمی فائنل کا ایک منظر جس میں روسی مودی ٹیم کے روہت کرجی کو حیدرآباد ٹیم کے عبد لحئی نے بولڈ آؤٹ کر دیا



فائنل میچ جیب فلیش لائٹ الہ آباد اور روسی مودی الیون ناگپور کے درمیان ہوا جس میں روسی مودی کو تیسرے سال بھی کامیابی ہوئی۔ تصویر میں سلیم درانی (جیب فلیش) کے مخالف بالنگ پر صاف بولڈ آؤٹ ہونے کا منظر

کرنے کے لیے غلطیاں تلاش کی جاتی تھیں یا خود ہی جرمانہ ادا کرنے کے لیے کوئی غلطی کرلی جاتی تھی۔

پربھا سرن نے قہقہوں سے بھرے ہوئے اور فلمی گانوں سے بجتے ہوئے ریسٹوران کے اندر پہنچ کر اچانک خود کو اداس محسوس کیا میں خوش کیوں نہیں ہوں؟ یہ سارے لوگ، مرد اور عورتیں کس قدر مسرور ہیں! ایک دوسرے کی طرف کتنی محبت سے تاک رہے ہیں!)

وہ ابھی میز کے سامنے جاکر بیٹھی ہی تھی کہ منٹو اور بیری دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کر آئس کریم کے بڑے فیرج کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ بیری کے کہنے پر بیرے نے فیرج کا ڈھکن اٹھا دیا اور منٹو اپنی پسند کی آئس کریم دیکھنے لگا۔ پربھا سرن بیری کی پشت پر سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکی۔ اسے ایسا لگا منٹو کا ڈیڈی وہی ہو!۔ اس کا آدمی بھی وہی ہو! لیکن یہ سوچ کر وہ کانپ کانپ بھی گئی۔ اس کا جی چاہا جلدی سے اٹھ کر وہاں سے چل دے۔ انھیں بتائے بغیر ہی لیکن وہ ایسا نہ کرسکی۔ وہ دونوں اپنے ہاتھوں میں آئس کریم کے دو دو کپ لیے ہوئے واپس آگئے۔ سارے کپ اس کے سامنے پھیلا کر رکھ دیے۔ منٹو نے اپنی نیکر کی جیبوں میں سے بون بون کی دو ڈبیاں بھی نکال کر اسے دکھائیں اور کہا ـــــ "ممی! انکل کتنے اچھے ہیں"۔

بیری نے مسکرا کر پربھا کی طرف دیکھا لیکن وہ اس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔ بس گھبرائی گھبرائی سی اپنے بیٹے کے خوش و خرم چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ منٹو نے پھر کہا۔

"انکل اچھے ہیں نا ممی!"

پربھا کو مجبوراً سر ہلا کر کہنا ہی پڑا۔ "ہاں ہاں بہت اچھے ہیں۔ بہت ہی اچھے! لیکن اب تم جلدی سے یہ سب کھالو۔ پھر گھر چلیں گے!"

"یہ سب میں تھوڑی کھا پاؤں گا!" منٹو نے حیرت سے قدرے چیخ کر کہا۔

بیری نے دو کپ اس کے سامنے بھی سرکا دیے۔

"یہ دو آپ کے لیے ہیں مسز سرن! اور یہ دو میرے۔ اور یہ ہمارے منٹو کے! کیوں؟"

(اس نے ہمارے منٹو اتنی آسانی سے کیسے کہہ دیا ہے؟ جیسے سچ مچ ایسا ہی ہو!) پربھا نے فوراً احتجاج کرنا چاہا لیکن وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی ـــــ "میں صرف ایک ہی کپ لوں گی۔ بس!"ـــــ اور دوسرا کپ اس نے بیری کے سامنے واپس رکھ دیا۔

"لیجیے لیجیے نا۔ بہت زیادہ نہیں ہے۔ دیکھیے ہم بھی تو دو کھائیں گے۔ کیوں منٹو!"

"ہاں اور نہیں تو کیا!" منٹو نے فوراً اس کی تائید کردی۔

منٹو کو بیری کے اس قدر قریب ہوتا دیکھ کر پربھا کو ایک اور خطرے کا احساس ہوا۔ وہ بیری کو پھر سے پہلی سی بے تکلفی کے ساتھ گھر میں آنے کے لیے حوصلہ دیگا۔ چندر اس بات کو کبھی پسند نہیں کرے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو ان دونوں میں کبھی جھگڑا ہو جائے! ایسی نوبت آسکتی ہے۔ وہ اپنے پتی کا مزاج جانتی ہے۔ خود تو اس نے ایسا کبھی نہیں چاہا کہ بیری کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے۔ اسی لمحے میں وہ اپنے دل میں بیری کے لیے ایک بے حد نرم گوشہ محسوس کرکے کانپ بھی گئی۔ (یہ محبت ہے! یہ محبت ہے!! یہ محبت ہے!!!) کوئی چپکے چپکے جیسے دستک دے دے کر اسے یہ احساس دلانے لگا۔ اس سے وہ انکار نہ کرسکی۔ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ دھیرے دھیرے آئس کریم بھی کھاتی رہی۔ بہت دیر تک اس نے سر اٹھا کر بیری کی طرف نہ دیکھا۔ اس کی صرف آواز ہی سنتی رہی۔ منٹو کو وہ کیسی کیسی دلچسپ باتیں سنا سنا کر ہنسا رہا ہے!

"اپنی آنٹی سے ملو گے؟ تمھارے ساتھ وہ بھی دوستی کرنا پسند کرے گی!"

"کیا آنٹی بہت سندر ہے؟"

"ہاں بہت سندر!"

"میری ممی کی طرح؟"

یہ سن کر بیری مسکرا دیا اور پربھا سرن کی طرف دیکھنے لگا۔ پربھا غور سے۔ پربھا گھبرا گئی۔ پھر اس نے بیری کو کہتے ہوئے سُنا۔ "ہاں بالکل تمھاری ممی کی طرح !"

منٹی بولا — "میرے ڈیڈی تو ممی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ کیا آپ بھی آنٹی سے بہت پیار کرتے ہیں ؟"

بیری ہنستے ہنستے دوہرا ہوگیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں منٹی کا چہرہ بھر کر بولا — "ہاں بہت۔ وہ ہے ہی اتنی اچھی !"

پربھا کو اچانک ایک صدمہ سا ہوا۔ اس کا جی پھر چاہا کہ وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلی جائے۔ (جس آدمی کو میں نے ہمیشہ اپنے گھر کے قریب تر دیکھنے کی آرزو کی ہے اسی سے یک بیک دور ہو جانے کی خواہش اس قدر تیز کیوں ہو گئی ہے ؟) اس نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے قریب بیٹھی ہوئی ایک خوبصورت اور جوان عورت کے وجود سے بالکل بے پروا ہو کر ایک ننھے اور معصوم بچے کے سامنے اپنی بیوی کی تعریف کرنے میں لگا ہوا ہے۔ وہ کیسے کپڑے پہنتی ہے ! کیا کھاتی ہے ! کیا پیتی ہے ! اس کے شوق، اس کی پسند و ناپسند ! اس اثنا میں بیری نے ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی باتوں کا پربھا پر کس قسم کا ردِ عمل ہو رہا ہے یا وہ کیسی کیسی سوچوں میں کھو گئی ہے !

پربھا کو اس کے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت دکھائی دی۔ وہی معصومیت اور خوشی اور حیرت جو منٹی کے چہرے پر نمایاں تھی۔ وہ اسے جلانے کے لیے ہی یہ سب نہیں کہہ رہا ہے۔ وہ تو اپنی ہی خوشیوں میں کھویا ہوا ہے، بے حد مسرور ہے، بے حد مطمئن ہے۔ لیکن پربھا کے اندر صدمے کا احساس بڑھتا ہی گیا۔ اس کے چہرے پر بے چینی اور گھبراہٹ اور زیادہ نمایاں ہوتی گئی۔

(میں اپنے آپ سے اب جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں ! میں ہی اس سے محبت کرتی ہوں ! میں ہی اس سے خوف بھی کھاتی ہوں ! اسے تو کچھ احساس بھی نہیں ہے !)

اس نے اچانک ایک فیصلہ کر لیا۔ آئس کریم کا پہلا کپ ختم کر کے اس نے اپنے آپ ہی دوسرا کپ بھی اپنے آگے سرکا لیا۔ بولی — "آپ کو یاد ہے ایک مرتبہ آپ نے میرے پتی کا ٹرانسفر کینسل کرنے میں بڑی مدد کی تھی ؟"

"ہاں خوب یاد ہے۔ کیا سرن کا پھر کہیں تبادلہ ہو گیا ہے ؟ اس بار بھی رکوا دوں گا۔ میرے ہوتے ہوئے انھیں یہاں سے باہر کون بھیج سکتا ہے ؟" بیری نے بڑے غرور سے کہہ ڈالا۔

پربھا نے آئس کریم کا ایک بھرپور چمچ نکالا، پورا منھ کھول کر اندر ڈالا پھر اس کی ساری ٹھنڈک کو دھیرے دھیرے رگ و پے میں محسوس کرتی ہوئی بولی —

"ان کا ٹرانسفر ابھی تو کہیں نہیں ہوا ہے، لیکن میں چاہتی ہوں کہیں نہ کہیں فوراً ہو جائے۔ اِدھر دون، آگرہ، لکھنؤ — کہیں بھی ! اب یہاں میرا من نہیں لگتا ہے۔ بس اس کام میں میری مدد کر دیجیے۔ انھیں معلوم بھی نہ ہونے پائے۔ کینسل کر دینے کے لیے وہ آپ سے کہیں تو آپ انکار کر دیجیے گا !"

بیری ہکا بکا سا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں جیسے کچھ نہ آ سکا۔ پربھا جلدی جلدی آئس کریم ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی "آپ کا بڑا اپکار مانوں گی۔ یہ کام صرف آپ ہی کرا سکتے ہیں !"

★



کلام انیس میں تغزل

سخی حسن نقوی

مصنف

انیس نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن بہت جلد اپنے والد میر خلیق کے مشورے سے جو خود ایک اچھے مرثیہ گو ہونے کے ساتھ ایک اچھے غزل گو بھی تھے، غزل ترک کرکے مرثیہ کا میدان اختیار کرلیا[1] اور اسی کے ہو کے رہ گئے۔ اسکے بعد انھوں نے اپنی طبیعت کی تمام تر رنگینیاں اور جولانیاں مرثیے پر صرف کر دیں اور نتیجے میں مرثیے کا، اور اسی کے ساتھ مرثیہ گو شاعر کا، درجہ اتنا بلند کر دیا کہ لوگ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کہنا بھول گئے، بلکہ مرثیہ گو شاعر کو "اصلی شاعر" تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔[2]

چنانچہ انیس مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں؛ لیکن انھوں نے سلام بھی کہے اور رباعیاں بھی کہیں۔ سلام بہ اعتبار ہیئت، اگر اس میں سے مدحیہ اور مبکی اشعار کو نکال دیا جائے تو مکمل و مجسم غزل ہوتا ہے، اور رباعی میں بھی تغزل کا رنگ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں بھی تغزل رچا ہوا ہے جس کی مرثیے میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ بقول پروفیسر مسعود حسن رضوی "اس وقت غزل کا مذاق عام طور پر دلوں میں ایسا بس گیا تھا کہ مرثیوں میں بھی تغزل کا محل پیدا کر لیا گیا"۔[3] ایسا کرکے انیس نے وقت کے تقاضوں کو پورا کیا، اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید مرثیے کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکتی تھی جو اُسے حاصل ہوئی اور جو آج تک حاصل ہے۔

غالب مومن کے اس شعر کے بدلے ـــ

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اپنا پورا دیوان مومن کو دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔[4] انیس کے مرثیوں میں بے شمار مقامات ایسے ملتے ہیں جن پر غزل گویوں کے دیوان کے دیوان نثار کیے جا سکتے ہیں۔ انیس کا تغزل، خواہ سلام میں، رباعی میں، یا مرثیے میں، قریب قریب اُن تمام خصوصیات کا حامل ہے جو غزل گو شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

---

[1] محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ایک روایت نقل کی ہے (ص۵۵۵) کہ میر انیس ایک مرتبہ مشاعرے میں گئے اور غزل پڑھی۔ اس کی بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ دل میں خوش ہوا مگر تجاہل کے طور پر بیٹے سے پوچھا "رات کہاں گئے تھے؟" سعادتمند بیٹے نے باپ کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اسکے بعد باپ نے بیٹے سے کہا "اب اس غزل کو سلام کرو"۔ اس فقرہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس غزل کو سلام بنا دو۔ دوسرا یہ کہ غزل کہنا چھوڑ دو۔ سعادت مند بیٹے نے دونوں باتوں پر عمل کیا۔ [2] انیس مرثیہ کے مقابلے میں صنف غزل کو پست سمجھتے تھے۔ میر مہدی احسن نے واقعات انیس میں ایک روایت نقل کی ہے (ص۹۵) کہ ایک مجلس میں میر انیس کے بڑے فرزند میر نفیس مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ سامعین میں کاملین شامل تھے۔ میر انیس منبر کے پیچھے بیٹھے بیٹھے کے شاعرانہ مضامین کی داد دے رہے تھے۔ مجلس کے ایک گوشہ میں چند شعرا نے آپس میں چہ میگوئیاں شروع کر دیں۔ میر انیس کو شبہ ہوا کہ کلام پر نکتہ چینی ہو رہی ہے۔ آداب مجلس کی یہ توہین ان سے برداشت نہ ہوئی اور وہ زانو ٹیک کر نصف قد سے کھڑے ہو گئے، علماء ان لوگوں سے فرمایا "یہ گیارہ شعر کی غزل نہیں جس میں کنگھی چوٹی کا ذکر کرکے دل خوش کر لیتے ہو۔ اس میدان میں شاعر قدم رکھتا تو کلیجہ خون ہو کر بہ جاتا ہے"۔ اس کے بعد بیٹے سے کہا کہ مرثیہ پڑھنا بند کر دیں۔ اس ڈانٹ پھٹکار پر اہل مجلس کی زبانیں بند ہو گئیں۔ چیں تو شاید دور آمد کے بعد میر انیس راضی ہو گئے اور بیٹے کو مرثیہ ختم کیا جاتا ہے۔
[3] مسعود حسن رضوی: "انیس بحیثیت غزل گو" آجکل جون ۱۹۷۰ء
[4] ملاحظہ ہو "یادگار غالب" از مولانا حالی، ص۔

مثلاً معشوق کا سراپا، تصوف، اخلاق وحکمت، ضرب المثل، آفاقی حقیقت، قلندری، بے ثباتیٔ دنیا، شاعرانہ تعلّی وغیرہ وغیرہ۔

غزل کے ارتقا میں پہلی منزل عاشقانہ شاعری کی ہے۔ تمام غزل گو شعرا کا معشوق دو قسم کا ہوتا ہے۔ مجازی اور حقیقی۔ جب معشوق مجازی ہوتا ہے تو اُس کا سراپا عجیب ہیئت کذائی اختیار کر لیتا ہے۔ غزل گو شعرا اپنے معشوق کی آنکھوں کو نرگس و بادام سے، ابرو کو کمان سے، مژگاں کو تیر سے، رخسار کو گلاب سے، دانتوں کو موتیوں سے، لبوں کو برگ گل سے، دہن کو غنچہ سے، گردن کو صراحی سے، کمر کو عدم سے تشبیہ دیتے ہیں[1]۔

محبوب انیس بھی رکھتے ہیں؛ لیکن ان کے "محبوب" کا تصور عام غزل گو شعرا کے محبوب کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے محبوب کی داخلیت حقیقی اور خارجیت مجازی ہے۔ وہ اپنے حسینوں کو دیکھ کر درود پڑھواتے ہیں:

پڑھے درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو ‏ ‏ ‏ ‏ خیالِ صنعتِ صانع ہے پاک بینوں کو

کربلا کے تمام بوڑھے، جوان، لڑکے بچے سب ان کے محبوب ہیں اور ان سب کی تعریف انیس اس والہانہ انداز میں کرتے ہیں کہ غزل گو شعرا کے تمام مجازی محبوب پست اور ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ انیس کے یہاں بڑے حبیب ابن مظاہر کے ابرو کمان ہیں اور مژگاں تیر۔ ان کی آنکھوں پر غزالانِ حرم قربان ہوتے ہیں۔ ان کی ضیائے رُخ مہ و خورشید سے افزوں ہے اور ع

"لب ایسے کہ یاقوت بھی گر جائے نظر سے" عباس کا سراپا وہ اس طرح نظم کرتے ہیں:

جلتے ہیں کیونکر نہ مہ و خور سحر و شام ‏ ‏ ‏ ‏ ہے حُسن کی آتش سے بھبھو کا رُخِ گلفام
خال اور خطِ سبزہ وہ دانہ ہے تو یہ دام ‏ ‏ ‏ ‏ ہے سب دلِ عالم کی اسیری کا سرانجام

بینی کو تو دیکھو کہ عجب شوکت و شاں ہے
یہ حُسن علمدار کے لشکر کا نشاں ہے

نوجوانوں میں علی اکبر کا سراپا نظم کرنے میں کس قدر نادر تشبیہوں سے کام لیا ہے:

شبنم ہیں یا ہیں ماہ پہ ٹکڑے سحاب کے ‏ ‏ ‏ ‏ رُخسار ہیں کہ پھول کھلے ہیں گلاب کے

پتلی نہیں یہ چشم سیہ کے حجاب میں ‏ ‏ ‏ ‏ پنہاں ہے رُخِ حضرت یوسف نقاب میں

یا ایک دوسری جگہ علی اکبر کا سراپا اس طرح نظم کیا ہے:

چہرہ کو اگر بیچ کہیں زلف کو گر رات ‏ ‏ ‏ ‏ دن ہوتے ہیں جب خلق سے کرتی ہے سفر رات
دنیا میں سدا شام سے ہے تا بہ سحر رات ‏ ‏ ‏ ‏ یاں بیچ میں خورشید ادھر رات اُدھر رات

گیسوئے رسا روئے دل افروز بہم ہے
کیا قدرتِ حق ہے کہ شب و روز بہم ہے

عون و محمد کی پیشانیاں مہ انور سے زیادہ روشن، ابرو خنجر سے زیادہ خم اور پلکیں نشتر سے زیادہ تیز ہیں۔ اور آنکھوں نے

آفت میں غزالوں کو گرفتار کیا تھا ‏ ‏ ‏ ‏ نرگس کو انھیں آنکھوں نے بیمار کیا تھا

قاسم کی پلکیں "سرپنجۂ شہباز لنظر" معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے چہرے پر جو گیسو لہرا رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے چاند گہن میں آگیا ہے۔ رخسار دو آئینۂ نور ہیں جن کی صفا پر نظر ہود نہیں ٹھہرتی۔ شمع سر طور میں وہ ضیا نہیں جو ان کی بینی میں ہے۔ لبوں کو لعل سے تشبیہ دینا عقل سے دور ہے، کیونکہ

وہ سنگ ہے پھر سنگ میں گویائی کہاں ہے
گویائی بھی یک سو یہ مسیحائی کہاں ہے

قاسم کی کمر کی تعریف میں لکھتے ہیں:

باریک ہے کیا ذہن میں وصفِ کمر آئے ‏ ‏ ‏ ‏ سوزن کے ناکہ میں اُسے جو نظر آئے
یہ فکر رسا جائے کہاں اور کدھر آئے ‏ ‏ ‏ ‏ ممکن ہی نہیں یہ کہ عدم کی خبر آئے

واں پیکِ خرد علم رسائی نہیں دیتا
یاں تارِ نظر ہے کہ دکھائی نہیں دیتا

انیس جس والہانہ انداز میں اپنے محبوب کرداروں کا سراپا نظم کرتے ہیں اُسی چاؤ اور چونچلے سے اُن کرداروں کے گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں اپنی طبیعت کی تمام تر رنگینیاں صرف کر دیتے ہیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ ایسے الفاظ، تراکیب اور تشبیہات استعمال کرتے ہیں کہ اس تعریف میں تغزل کا رنگ صاف جھلکنے لگتا ہے۔ اُن کا گھوڑا چھل بل میں عجیب ناز دکھاتا ہے۔ اس کی رفعت کے مقابلے میں حوصلۂ کبکِ دری پست ہے۔ کہیں اس کے ناز پر غزالِ ختن رشک کرتے ہیں تو کہیں اس کا جھکڑا پری جیسا نظر آتا ہے۔ اس کے ہر گام پر معلوم ہوتا ہے طاؤس سیرِ چمن کو جا رہا ہے، اور کہیں:

---

[1] ملاحظہ ہو مقدمہ شعر و شاعری از مولانا حالی ص ۱۰۰

افزوں ہے زلف عارض سے خوشبو ایال کی — دیکھیں تو لیں بلائیں سدا یاں بال کی
پریاں خرام ناز میں شاگرد چال کی — خفتہ میں جست شیر کی شوخی غزال کی

وہ حُسن تن پہ ساز کا جوبن یراق کا
مولاؔ کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ بُراق کا

دُلدل کی تعریف میں تغزل کا رنگ اس سے زیادہ نمایاں ہے۔ کہیں وہ گھوڑے کو "لیلیٰ طفرراہ" کہتے ہیں تو کہیں "سلیمان کی پری"۔ اس کے خم کو دیکھ کر سرِ نو مرّم سے کٹ جاتا ہے، اور جب وہ "معشوق سبز رنگ" بن جاتی ہے تو اُس کے لبوں پر لہو سے پان کی لالی جمی ہوئی دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس جیسی گرمی اور لگاوٹ کسی حور میں دیکھنے میں آئی نہ پری میں۔ اس کی عشوہ گری نے لاکھوں کو بے دم کر دیا۔ جب وہ اپنی فطری کج روی کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی اِدھر سے اُدھر نکل جاتی تو اُس کی پھبک دیکھ کر سیکڑوں بسمل ہو جاتے تھے ۔

زخم سینوں پہ گریباں کی طرح پھٹتے تھے — چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

ذیل کے دو بند تغزل کے رنگ میں خاص طور سے ملاحظہ کے قابل ہیں :

کاٹھی تھی ذوالفقار کی یا تھا اجل کا گھر — حجلہ تھا یا نقاب رخ لیلیٰ ظفر
گھونگھٹ اُٹھا کہ برق سی چمکی اِدھر اُدھر — گو یا دُلھن حجاب سے نکلی جھکا کے سر

دکھلائی سب کو مُنہ کی صفائی لڑائی میں
جانیں ہزار دیں سے لیں رونمائی میں

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جُدا — جیسے کنار شوق سے ہو خوب رو جُدا
مہتاب سے شعاع جدا گُل سے بو جدا — سینے سے دم جُدا رگِ جاں سے لہو جدا

گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

ایک دوسرے مرثیے میں تلوار کے بارے میں کہتے ہیں :

زیبا تھا دم جنگ پری وش اسے کہنا — معشوق نبی سُرخ لباس اُس نے جو پہنا
اِس اوج پہ وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا — جو ہر تھے کہ پہنے تھی دلہن پھولوں کا گہنا

سیب چمن خلد کی بو باس تھی پھل میں
رہتی تھی وہ شبیر سے دولہا کی بغل میں

یہ سب خالص تغزل ہے۔ لیکن "ابتذال" اس کے قریب سے ہو کر نہیں گذرا۔ "شاہد بازی" سے اس کا دور کا بھی علاقہ نہیں اور "ہوا پرستی" کی اُسے ہوا تک نہیں لگی، جو عام غزل گو شعرا کی محبوب روش اور لکھنؤ اسکول کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انیسؔ کے کلام میں شروع سے آخر تک ثقاہت، متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ۔ ع

"بات جو مُنہ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے"

اُنھوں نے کبھی گالیاں کھا کر دعائیں صرف دربان نہیں کیں اور نہ وہ کبھی وصل میں خوف رقیب سے مضطرب ہوئے۔ اسی لیے انھوں نے "غزل کو سلام" کر کے مرثیہ اختیار کر لیا اور اپنی تمام فنی صلاحیتیں مرثیہ ہی پر صرف کر دیں۔

مولانا حالیؔ لکھتے ہیں "غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا، یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور عارفانِ باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں ..... ان کی غزل کا موضوع .... عشق مجازی نہ تھا، بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں ظاہر کرتے تھے"[1] لیکن اس کا کیا جائے کہ ایسے شعرا کے حقیقت والے اشعار پر مجاز کا دھوکا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا؛ اور عام لیاقت کا آدمی کچھ سوچ کر ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ شعر حقیقت میں ہے یا مجاز میں ؛ اور اکثر و بیشتر حقیقت کو مجاز سمجھ بیٹھتا ہے۔ انیسؔ کے تغزل کی شان ہی نرالی ہے ان کے تغزل پر مجاز کا گمان ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ حقیقت مجرد ہے اور مجاز کی گھناؤنی پرچھائیں بھی اُس پر نہیں پڑ سکتی۔

غزل کے ارتقا میں دوسری منزل تصوّف کی ہے، یعنی وہ منزل جس میں شاعر کا محبوب حقیقی ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ شعرا نے عاشقانہ مضامین سے گذر کر معرفت کے مضامین غزل میں باندھنا شروع کر دیے۔ یہ منزل غزل کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مدرسۂ فکر کے فارسی شعرا میں سعدیؔ اور حافظؔ اور اُردو شعرا میں میرؔ اور دردؔ امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سعدیؔ کا مشہور شعر ہے ۔ ؎

برگ درختانِ سبز درنظر ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

فارسی کا ایک اور مشہور شعر ہے ؎

---

[1] مولانا حالیؔ : مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۲۱

بہ ہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش   من اندازِ قدت را می شناسم[1]

اسی مضمون کو میر نے اس طرح باندھا ہے۔ ؎

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا   جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

اسی خیال کو میر درد نے اس طرح ادا کیا ہے۔ ؎

جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اور میر انیس نے اسی خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ ؎

اُسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا   اُسی کی شان نظر آگئی جدھر دیکھا

اُٹھ گئے، مابین کے سارے حجاب   ایک نقطہ آنکھوں کا پردہ رہ گیا

اسی مضمون کو رباعیوں میں اس طرح باندھا ہے :

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے   بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا   جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں   یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے   حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو   آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
ہے قرب رگِ جاں سے اس پہ یہ بُعد   اللہ اللہ! کس قدر دور ہے تو[2]

سلاموں اور رباعیوں کی حد تک بھی بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ انیس کے مرثیوں میں بھی معرفت کے اشعار اس قدر کثرت سے بکھرے ہوئے ہیں کہ انھیں احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ مندرجہ ذیل بند ملاحظہ فرمائیے۔ ان سے اندازہ ہوگا کہ حمد باری کا جو اسلوب انیس نے اختیار کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اُن کا اپنا ہے بلکہ عام غزل گو شعرا کے کلام میں ذرا کم دستیاب ہو سکتا ہے :

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے، ہجوم   کو کو کا شور، نالۂ حق سرہ کی دھوم
سُبحانَ رَبّنا کی صدا تھی علی العموم   جاری تھے وہ، جو اُن کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رَبِّ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار   اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیُّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار   تسبیح تھی کہیں، کہیں تہلیل کردگار
انساں زمیں پہ محو، ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرتِ حق ہر زبان پر[3]

غزل گو شعرا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں اخلاقی اور حکیمانہ مضامین بھی نظم کرتے ہیں۔ مولانا عبدالحق نے کلام میر کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اُن کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اپنے رنگ میں ایسی سادگی، صفائی اور خوبی سے ادا کر جاتے ہیں جس پر ہزار بلند پروازیاں اور نازک خیالیاں قربان ہیں[4]۔" کلام انیس میں بھی اخلاق و حکمت کے فلسفیانہ نکتے جا بجا ملتے ہیں؛ اور کمال یہ ہے کہ اگرچہ وہ نکتے پند و نصیحت کا حکم رکھتے ہیں، پھر بھی اُن میں موعظہ کی تلخی اور خشکی نہیں بلکہ تغزل کی تری اور شیرینی رچی ہوئی ہے۔ ان مقامات پر انیس اظہار خیال کے لیے اتنا خوبصورت، پُر اثر اور صاف و سادہ پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں کہ عام متغزلین کے یہاں اُس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کا یہ کہنا کہ میر انیس کسی طرح مفکر نہ تھے اور اس لیے اُن کے مرثیے اُن لوگوں کے لیے کسی خاص دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتے "جو شاعری میں غور و فکر کے عنصر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں"۔ نیز یہ کہ "اُن کی رباعیوں اور سلاموں میں ایک آدھ شعر ایسے ضرور آگئے ہیں جن میں کچھ فکر کا پہلو پایا جاتا ہے[5]" انیس ناشناسی کی دلیل ہے۔ لیکن اس کے بعد انیس کے سلام میں دو شعر نقل کر کے، جو اُن کے نزدیک فکر انگیز ہیں، انھوں نے اپنے قول کی خود ہی تردید کر دی ہے اور اس بات کا ثبوت دے دیا ہے کہ انیس کا کلام اخلاق و حکمت کے عنصر سے بہرحال یکسر خالی نہیں ہے۔

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں   ہوا کا جیب کوئی جھونکا چلا حباب تھا
تڑپ تھی برق کی یہ یا کہ تھی شرر کی لپک   ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

---

[1] شاعر کا پتہ نہ چل سکا۔ اگر کوئی صاحب شاعر کے نام کی طرف میری رہنمائی کریں گے تو ممنون گزار رہوں گا۔ [2] میر کہتے ہیں ؎ پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں   معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
[3] اس بند میں چار دو شعر ایک بند سے انتخاب کیے گئے ہیں اور بیت ایک دوسرے بند سے۔ [4] مولانا عبدالحق: انتخاب کلام میر (مقدمہ)، ص۱۲
[5] ڈاکٹر محمد احسن فاروقی: مرثیہ نگاری اور میرزا انیس، ص۹۲

لیکن انیسؔ کے یہاں ایک سے زیادہ مقامات ایسے ملیں گے جہاں شاعری میں غور و فکر کے عنصر کا متلاشی اپنے ذوق کی جی بھر کے تسکین کر سکتا ہے۔ سلام کے چند شعر اور ملاحظہ فرمائیں:

ہر اک کے ساتھ ہے روشن دلِ طلوع و غروب ۔ سحر کو چاند نہ تھا شب کو آفتاب نہ تھا
نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں ۔ وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں
خود لذیذ زندگی لائی قضا میرے لیے ۔ شمعِ کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

اسی مضمون کی رباعیاں ملاحظہ فرمائیے:

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے ۔ جاگو جاگو کہ خوف اسی راہ میں ہے
اٹھو اٹھو یہ خوابِ غفلت کب تک ۔ دیکھو دیکھو اجل کمیں گاہ میں ہے

کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے ۔ جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگ دل ہوتے ہیں ۔ دنداں صف بستہ ہیں زباں کے آگے

گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے ۔ پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے ۔ غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

سلاموں اور رباعیوں کی حد تک ڈاکٹر فاروقی بھی مانتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں "مرثیوں میں ایسے خیالات کہیں نہیں ہیں۔"[1] یہ دعویٰ بے بنیاد ہے۔ انیسؔ نے مرثیوں میں بھی جا بجا حکیمانہ انداز اختیار کیا ہے۔ مندرجۂ ذیل بند میں میر انیسؔ نے فلسفۂ حیات و ممات، اعمالِ نیک اور فشارِ قبر وغیرہ جیسے فلسفیانہ موضوعات پر انسان کو للکارا ہے، فکر انگیز ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا، تغزل کی چاشنی نے ناصحانہ تلخی کو شیرینی میں تبدیل کر دیا ہے اور اس قدر خوشگوار و خوش آیند بنا دیا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی صاحبِ نظر ہوگا جو اثر قبول نہ کرے اور وجد میں آکر سر نہ دھننے لگے:

اس باغ میں بے درد ہے کوئی اور کوئی زرد ۔ صحت سے کوئی، صورتِ نرگس کوئی بیمار
آزاد ہے گر سرو تو قمری ہے گرفتار ۔ گل ہیں جو چمن میں کسی جا پر تو کہیں خار
اشکوں سے رخِ گل کو سدا دھوتی ہے شبنم
غنچے تو ہنسے دیتے ہیں اور روتی ہے شبنم

بھاتی ہو کہ بیٹا ہو گدا ہو کہ شہنشاہ ۔ جز نیک عمل جا نہیں سکتا کوئی ہمراہ
وہ راہ ہے دھڑکا سحر و شام ہے جس کا
پہلی ہے وہ منزل کہ لحد نام ہے جس کا[2]

ایک دوسرے مرثیے کے حسبِ ذیل بند بھی اسی قبیل کے ہیں:

امید نہیں جینے کی یاں صبح سے تا شام ۔ ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشیدِ لبِ بام
یاں کام کرو ایسا کہ آئے جو وہاں کام ۔ آ پہنچے خدا جانیے کب موت کا پیغام
اپنی نہ کوئی ملک نہ املاک سمجھنا
ہونا ہے تمہیں خاک یہ سب خاک سمجھنا

اس زیست پہ پھولو نہ، اجل کو بھی کرو یاد ۔ گھر سیکڑوں یاں سیلِ فنا نے کیے برباد
دنیا میں عمارت نہ بنا کر ہو کوئی شاد ۔ اس قالبِ خاکی کی عجب سست ہے بنیاد
کل اوج پہ جو لوگ تھے وہ زیرِ زمیں ہیں
ہے خاک کا ڈھیر اب نہ مکاں ہے نہ مکیں ہیں

کس کس گلِ رنگیں کی نہ اس باغ میں تھی دھوم ۔ اک آن میں شبنم کی طرح ہو گئے معدوم
دکھلا رہی ہے رنگ عجب ہستیِ موہوم ۔ کیا قصد ہے گلچینِ اجل کا نہیں معلوم
اس باغ میں جس سرو کو دیکھا تو دولی ہے
جس گل پہ بہار آج ہے کل اس پہ خزاں ہے[3]

بے ثباتیِ دنیا کا موضوع بھی حکیمانہ شاعری کے تحت آتا ہے۔ اردو کے تمام بڑے شاعروں نے اس موضوع پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ کلامِ انیسؔ میں بھی اس موضوع پر جا بجا اشعار ملتے ہیں۔ لیکن انیسؔ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی

---

[1] ڈاکٹر محمد احسن فاروقی: مرثیہ نگاری اور میر انیس ص ۹۴ [2] اس موضوع پر میر تقی فرماتے ہیں۔ ـــ موت اک ماندگی کا وقفہ ہے ۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

[3] اس مضمون کو میرؔ نے اس طرح باندھا ہے:

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا ۔ جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا
جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا ۔ کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آنکھ نہ تھا زور سر جن کا کل آسماں سے ۔ ہیں ٹھوکروں میں اُن کے آج استخواں یہاں پر

کہتے ہیں اس میں زبان کا چٹخارہ ضرور ہوتا ہے، اور روزمرہ کو وہ کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ سلام کے چند شعر اس موضوع پر ملاحظہ فرمائیے :

جو عدم سے آگیا دُنیا میں ہوئی ہنس کے موت   اور تو دو چار دن کے یہاں پیدا ہوے

مقام یوں ہوا اس کارگاہِ دنیا میں   کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آکے چلے
انیسؔ دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ   چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

اسی مضمون کی رباعیاں ملاحظہ ہوں :

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے   جو چیز ہے کم اسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانند حباب   غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

اب گرم خبر موت کے آنے کی ہے   نادان تجھے فکر آب و دانے کی ہے
ہستی کے لیے ضرور اک دن ہے فنا   آنا تیرا دلیل جانے کی ہے

پرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے   ہر گُل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا   رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے[1]

انیسؔ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اُس پر جاگیردارانہ نظام چھایا ہوا تھا۔ بادشاہوں، نوابوں اور رئیسوں کی شان میں قصیدے کہنا اس عہد کے شعرا کا عام شعار تھا۔ یہاں تک کہ میرؔ جو فقر و فاقہ، خودداری، خود پسندی اور "بد دماغی" کے لیے بدنام ہیں، انھوں نے بھی ایک قصیدہ نواب آصف الدولہ کی شان میں کہا۔ غالبؔ نے تعریف و خوشامد کی حد گذار دی کہ معمولی رئیسوں اور انگریزوں کی شان میں بھی قصیدے کہے۔ بہادر شاہ کی غلامی پر انھوں نے فخر کیا۔ ایک قصیدہ میں بادشاہ کے حضور اپنی غریبی، فاقہ کشی اور قرض داری کا دُکھڑا رو کر اپنی تنخواہ ماہ بماہ کرنے کی درخواست کی۔ ایک غزل میں کہتے ہیں :

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے   بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا   کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
نصیرِ دولت و دیں اور معین ملت و ملک   بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لیے

لیکن انیسؔ اپنے عہد کے اس ماحول اور نظام سے متنفر تھے۔ انھوں نے کبھی کسی بادشاہ یا نواب وغیرہ کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ وہ خود کہتے ہیں۔ ع "دل سے کبھی مدح امرا کی نہیں میں نے"۔ اس اعتبار سے انیسؔ کا مقام منفرد ہے۔ میرؔ کے مقابلے میں بھی ان کا پلّہ بھاری ہے اور غالبؔ تو ان کے سامنے پست اور ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی شان استغنا یہ ہے :

کسی کے سامنے کیوں جا کے ہاتھ پھیلاؤں   مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

میر مہدی احسنؔ نے جو خود میر انیسؔ کے بڑے فرزند میر نفیسؔ کے شاگرد اور جن کے والد میر انیسؔ کے دوستوں میں سے تھے، واقعاتِ انیسؔ[2] میں ایک روایت نقل کی ہے، جس کی تائید تھوڑے سے تغیر کے ساتھ مولوی اشہری نے حیاتِ انیسؔ میں کی ہے کہ ایک مرتبہ نواب واجد علی شاہ کی والدہ ملکہ کشور جہاں نے مرزا دبیرؔ اور میر انیسؔ دونوں کو مجلس پڑھنے کی دعوت دی ——— میر انیسؔ نے صاف صاف کہہ دیا کہ ذاکری کی حالت میں دربار داری کا حفظ مراتب مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی روزمرہ

---

[1] اس موضوع پر میرؔ فرماتے ہیں:

موجیں کرے ہے بحرِ جہاں میں ابھی تو تُو   جانے گا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا
ہستی اپنی حباب کی سی ہے   یہ نمائش سراب کی سی ہے
کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات   کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

غالبؔ کہتے ہیں :

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے   نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب پر

[2] سید مہدی احسن : واقعاتِ انیس، ص۴۵

پوشاک میں مجلس پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ مرزا دبیر درباری قبا پہنے عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ انھوں نے منبر پر پہنچ کر پہلے بادشاہ کی شان میں کچھ اشعار مدحیہ کے پڑھے اور اس کے بعد مرثیہ شروع کیا۔ بعد ازاں انیس کی باری آئی۔ انیس نے اول ایک سلام پڑھا جس کا مطلع یہ تھا[1]

غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہو کر   مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر[2]

اس عہد میں اس قسم کی اخلاقی جرأت ایک عدیم المثال کارنامہ ہے[3]

انیس طبعاً درویش صفت اور فقیر منش واقع ہوئے تھے[4] وہ ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے جنھوں نے دولت حاصل کرنے کے لیے ناجائز طریقے استعمال کیے تھے۔ ان کا قول تھا کہ گنہ گاروں کے مکروہ چہرے کو دولت مندی کی نقاب نہیں چھپا سکتی اور نہ شرافت کے جوہرِ اصلی کو مفلسی کا مورچہ کھا سکتا ہے[5] وہ اس کے قائل تھے کہ "قاتل یا جواری اصلی مجرم نہیں بلکہ وہ ہے جو اپنی دولت کے ذریعے سے غریبوں کی جانوں کا شکار کھیلتا ہے"[6] یعنی جدید اصطلاح استعمال کی جائے تو بہ الفاظ دیگر غریبوں کو "اکسپلائٹ" کرتا ہے[7]

در اصل انیس کو اپنی اس قلندری پہ ناز تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دولتِ فقر کے مقابلے میں دولتِ دنیا ہیچ ہے۔ وہ اللہ سے دعا کرتے ہیں ۔ " ع " دولت کے عوض فقر کی جاگیر عطا کر" ان کے نزدیک دولتِ فقر حاصل کرنے کے بعد معمولی انسان بھی تونگر بن جاتا ہے ورنہ بادشاہ بھی ہو تو گدا کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی ان کا نظریۂ زندگی تھا اور یہی ان کا فلسفۂ حیات۔ اس جہت سے اگر دیکھا جائے تو انیس اپنے عہد سے آگے جا رہے تھے۔ فقر، فقیری اور قلندری کی فضیلت اور شاہی اور ریاست و امارت کی تحقیر و مذمت میں انیس نے جتنا کچھ کہہ دیا اور

---

[1] اور اس کے بعد جب میر انیس نے سلام کا تیسرا شعر پڑھا ؎

زلفِ اکبر کو جو دیکھا سرِ نیزہ پُر خوں   رو کے سر کھول دیے ماں نے پریشاں ہو کر

تو جلسہ اُٹھا کر بادشاہ باہر محل آئے اور بیساختہ فتح الدولہ برق سے مخاطب ہو کر فرمایا کیوں فتح الدولہ میں نہ کہتا تھا کہ میر انیس لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں دیکھا تم نے یہ زبان انھیں کے لیے خاص ہے۔ بعد ختم مجلس علی نقی خاں کو حکم دیا کہ میر صاحب کو دروازہ تک رخصت کرنے کی رسم پوری کریں۔ (میر مہدی احسن: واقعات انیس ص۱۰۱)

[2] میر مہدی احسن نے ایک اور واقعہ میر انیس کے متعلق حیدرآباد کا لکھا ہے جو انیس کی اخلاقی جرأت کا مظہر ہے۔ میر انیس کی ایک مجلس میں ایک نواب صاحب تشریف لائے چونکہ لوگ ان کی شخصیت سے واقف تھے اس لیے سروقد تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور ہاتھوں ہاتھ منبر تک پہنچا دیا۔ میر صاحب نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی اور صرف اتنا کہا بسم اللہ پھر میر انیس منبر پر گئے اور ایک سلام پڑھا جس کا مطلع یہ تھا ؎

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے   اُڑ گیا جب رنگ رُخ سے استخواں پیدا ہوئے

اس کے بعد میر انیس نے نواب صاحب سے مخاطب ہو کر کہا، سنیے یہ آپ کے سننے کے شعر ہیں:

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں   خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں   اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

حیدرآباد ہی سے متعلق ایک روایت یہ مشہور ہے کہ میر انیس حیدرآباد گئے تو نظام سے ملنے نہیں گئے۔ نظام ان کی مجلس میں از خود تشریف لائے۔ انیس نے ان کے سامنے معمولی سامع کا سا برتاؤ کیا اور مجلس ختم کرنے کے بعد سیدھے اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اس کے بعد نظام میر انیس سے ملنے ان کے کمرہ میں خود گئے وہاں کچھ دیر صحبت رہی جس کے دوران میر انیس کی فرمائش پر نظام نے اپنا کلام بھی سنایا۔ طبقۂ شعرا میں اس قسم کی مثالیں اس عہد میں نایاب ہیں۔ [3] میر مہدی احسن: واقعات انیس ص۹۵ [4] ایضاً

[5] انیس کی زندگی میں بے شمار واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس نوابوں اور رئیسوں کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ ایک دن میر حسن علی رئیس اپنی گاڑی میں سوار میر مہدی احسن کے والد کے مکان کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ میر انیس اس وقت کھلی ہوا میں وہاں سامنے ہی بیٹھے تھے۔ رئیس نے کوچوان کو حکم دیا کہ گاڑی آہستہ کر دے تاکہ میر انیس انھیں دیکھ کر سلام کریں۔ جب ان کی سواری قریب آئی تو میر انیس نے اس طرف سے منہ پھیر لیا۔ بعد میں لوگوں نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو میر صاحب نے بتایا کہ "اس شخص نے ہزاروں بے گناہوں کی گردن پر چھری پھیری ہے۔ مجھے اس شخص کی صورت سے نفرت ہے۔" (میر مہدی احسن: واقعات انیس ص۹۳)

کر دکھایا وہ ایک عظیم کارنامہ ہے جس کی نظیر معاصر عہد میں تلاش کرنا مشکل ہے۔ اُن کے ارشادات کو جن سے حق گوئی، خودداری، اور اخلاقی جراُت کی بڑی تیز خوشبو آرہی ہے، ہم ہر لحاظ سے۔ جدید اصطلاحی معنوں میں "انقلابی" نہیں تو کم از کم انقلاب آفریں ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس عہد میں جب کہ تمام اگلے اور معاصر شعرا دولت مندوں کی خوشامد میں لگے ہوئے ہیں، انیسؔ بہ بانگِ دہل کہہ رہے ہیں

جز خدا جھکتے نہیں ہم بادشا کے سامنے   ہاتھ پھیلائے تونگر کیا گدا کے سامنے!

فقر کی دولت کو کیا خالق نے بخشا ہو وقار   ہاتھ پھیلائے سلطاں بھی گدا کے سامنے

در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے   سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں

یہ اوج یہ مرتبے ہما کو نہ ملے   یہ دلق مرقع امرا کو نہ ملے

بخشی ہے خدا نے ہم کو یہ دولتِ فقر   برسوں ڈھونڈھے تو بادشاہ کو نہ ملے

بے شک انیسؔ کوئی انقلابی شاعر نہیں ہیں اور نہ انھیں کسی بھی اعتبار سے "اشتراکی" کہا جا سکتا ہے۔ یہ اصطلاحیں دورِ جدید کی یعنی انیسؔ سے تقریباً نصف صدی بعد کی پیداوار ہیں۔ لیکن انیسؔ کا یہ طرزِ فکر جو متقدمین و معاصرین سے یکسر مختلف ہے، یقیناً انقلابی ہے اور اس نسبت سے ہم انھیں جاگیردارانہ نظام کا پہلا حریف، اور بعد میں آنے والے انقلابی شاعروں کا "امام" ضرور کہہ سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل رباعیوں اور سلاموں کے جستہ جستہ اشعار سے ان کی قلندرانہ شان، انقلابی ذہنیت اور فلسفیانہ طرزِ فکر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں،

دولت کا خیال ہمیں آتا ہی نہیں   یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں

لبریز ہیں یہ دولتِ استغنا سے   آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں

قناعت و گوہرِ آبرو و دولت دیں   ہم اپنے کیسۂ خالی میں کیا نہیں رکھتے

سلام کے شعر ہیں:

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو   کبھی جو ہو گیا پھیرا صدا سنا کے چلے[1]

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے   فقیر ہوں یہ نہیں عادتِ سوال مجھے

انیسؔ مخمل و دیبا سے کیا فقیروں کو   اسی زمیں کو ہم فرشِ خواب سمجھے ہیں

نہ پھیلاؤ ہاتھ ہرگز انیسؔ   فقیری میں بھی دل تونگر رہے

فقیروں کی کیا موت کیا زندگی   جگہ جس جگہ مل رہی سو رہے[2]

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی رائے ہے کہ "بہترین شعر ایک طرح پر وہ ہے جو ضرب المثل بن جائے .... کسی شاعر کے مقبول ہونے کی ایک کسوٹی یہ بھی ہے کہ اس کے کتنے اشعار ضرب المثل بن گئے .... غزل ضرب الامثال کی دار الضرب ہوتی ہے۔ بہ الفاظ دیگر غزل ضرب الامثال تصنیف کرنے کی کوشش ہے[3]"۔ رشید صاحب نے بڑی سچی اور بہت خوبصورت بات کہی ہے۔ مگر اس میں انھوں نے ایک کسر بھی چھوڑ دی ہے، اور وہ شاید اس لیے کہ انھیں یہ اندیشہ لاحق ہوگا کہ آگے چل کر کوئی شخص انھیں دھوکے

---

[1] اسی مضمون کو میرؔ نے اس طرح باندھا ہے:

فقیرانہ آئے صدا کر چلے   میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

خوبی کیا جو اہلِ کرم کے جود کا کچھ نہ خیال کیا   ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے بھی ترکِ سوال کیا

میرؔ بندوں سے کام کب نکلا   مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

[2] اس شعر کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ واجد علی شاہ نے چاہا کہ شاہنامہ کے طور پر اپنے خاندانی حالات نظم کرائیں۔ اس خدمت کے لیے پانچ شاعر تجویز ہوئے جن میں ایک انیسؔ بھی تھے۔ میر انیسؔ دربار میں طلب ہوئے تو انھوں نے اخلاقاً اقرار کر لیا۔ بادشاہ نے علی نقی خاں وزیر کو اشارہ کیا کہ میر انیسؔ کو مصاحب منزل کے کمرے دکھائیں۔ جو کمرہ میر صاحب پسند فرمائیں ان کے قیام کے لیے اسباب راحت وغیرہ جمع کر دیا جائے۔ میر انیسؔ کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس خدمت کے لیے دن رات وہاں رہنا پڑے گا تو بددل ہو گئے، لیکن اخلاقاً علی نقی خاں کے ہمراہ ہو لیے اور مصاحب منزل کے کمرے دیکھنے لگے۔ علی نقی خاں ہر کمرہ دکھاتے اور میر صاحب سے پوچھتے "یہ آپ کو پسند ہے؟" آخر میر انیسؔ نے پریشان ہو کر فرمایا "صاحب ــ فقیروں کی کیا موت کیا زندگی   جگہ جس جگہ مل گئی مر رہے" (میر مہدی حسن: واقعاتِ انیسؔ صفحہ ۴۸)

[3] رشید احمد صدیقی: جدید غزل، صلا، یہ وہ مقالہ ہے جو انھوں نے پروفیسری کے اعزاز میں پڑھا تھا۔

سے شاعر نہ کہہ دے۔ وہ کمی یہ ہے کہ بات اس کے برعکس بھی ممکن ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی مصرعہ یا شعر ضرب المثل بن جائے تو وہ چاہے غزل کا نہ ہو غزل کا مصرعہ یا غزل کا شعر کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ مصرعہ اور شعر پر ہی منحصر نہیں، بلکہ اگر نثر کا کوئی چھوٹا سا جملہ بھی ضرب المثل بن جائے تو اُسے بھی غزل کے شعر کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اُن کے خود کے یہ دو چھوٹے چھوٹے فقرے — "بہترین شعر وہ ہے جو ضرب المثل بن جائے" اور "غزل ضربِ الامثال کی دار الضرب ہوتی ہے"، غزل کے بہترین شعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کلام انیسؔ میں ایسے اشعار کی بہتات ہے۔ دوسرے شعرا اور انیسؔ کے کلام میں ضرب الامثال کا تناسب اگر با قاعدہ ریاضی کے اصول پہ نکالا جائے تو معلوم ہوگا کہ اوروں کے یہاں اگر دو چار شعر ایسے نکلیں گے جو ضرب المثل بن گئے ہیں اور زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں تو انیسؔ کے یہاں دس بیس۔ ذیل میں کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو مختلف سلاموں، رباعیوں اور مرثیوں میں وارد ہوے ہیں اور ضرب المثل بن چکے ہیں۔ مثلاً ایک مسدس کی بیت کا آخری مصرعہ "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد" ضرب المثل بن گیا ہے۔

پورا بند یہ ہے:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
سُرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لیے
داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اس بند کا ہر مصرعہ ضرب المثل بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، مگر آخری مصرعہ زیادہ مشہور ہو گیا ہے۔

انیسؔ کی ایک اور بیت ہے:

جوہر طبیعتوں کے دکھانے کا وقت ہے
شیرو بڑھو یہ جان لڑانے کا وقت ہے

اس شعر کو پروفیسر آل احمد سرورؔ نے حال ہی میں ہند پاک جنگ کے زمانے میں اپنے ایک مقالۂ افتتاحیہ میں استعمال کیا اور اُسے اپنا سرنامۂ کلام قرار دیا۔[1] ظاہر ہے انیسؔ نے کسی اور پس منظر میں یہ شعر کہا ہے، لیکن اس میں جو آفاقیت ہے اس کی وجہ سے وہ آج تک زندہ ہے اور غالباً ہمیشہ زندہ رہے گا، یا کم از کم اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک دنیا میں جنگ کا وجود رہے گا اور اس میں جوش دلانے کی ضرورت باقی رہے گی۔[2]

ایک سلام کے یہ دو شعر بہت مشہور ہوے ہیں اور زبان زدِ خاص و عام ہو گئے ہیں:

یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں میں ضعفِ پیری نے
چُنا ہے جامۂ اصلی[3] کی آستینوں کو
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

حسب ذیل رباعی بہت مشہور ہے اور ضرب المثل بن گئی ہے:

دُنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جاکے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

کسی آفاقی حقیقت[4] کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیا جائے تو بہت آسانی سے ضرب المثل بن جاتی ہے۔ انیسؔ کا کلام ضرب الامثال کے نمونے کی بے شمار آفاقی حقیقتوں سے معمور ہے۔ حسب ذیل اشعار مختلف مرثیوں کی بیتیں ہیں۔ یہ سب آفاقی حقیقتیں ہیں اور ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہیں اور بقول رشید احمد صدیقی ضرب الامثال تصنیف کرنے کی کامیاب کوششیں ہیں:

---

[1] ہماری زبان، علیگڑھ، ۱۸ دسمبر ۱۹۷۱ء [2] مندرجۂ ذیل دو شعر بھی اسی قبیل کے ہیں:

آداب و قاعدے سے دلیرو بڑھے چلو
تلواریں تولتے ہوے شیرو بڑھے چلو
ہے بات کی تو نام پہ مٹتے ہیں بہادر
جو کہتے ہیں منہ سے وہی کرتے ہیں بہادر

[3] مطبوعہ نسخوں میں ہر جگہ "اصلی" چھپا ہوا ہے مگر میں نے بزرگوں سے "ہستی" بھی سُنا ہے۔ [4] یہ میں نے انگریزی لفظ (Universal Truth) (یونی ورسل ٹرتھ) کا ترجمہ کیا ہے۔

کس باغ پہ آسیب خزاں آ نہیں جاتا || گل کونسا کھلتا ہے جو مرجھا نہیں جاتا[1]
یہ اصل تکبر کے سخن کہتے ہیں اکثر || جو صاحب جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر
گھٹتا نہیں ہے کم رتبہ عالی نہیں ہوتا || عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا
صحبت اہل دل اہل دل کی جلا کرتی ہے || مس کو اک آن میں اکسیر طلا کرتی ہے
سرسبز ہو جو نخل اکھاڑا نہیں جاتا || باتقوں سے چمن اپنا اجاڑا نہیں جاتا
گر کر کسی خودسر کو سنبھلنے نہیں دیتا || موذی کو کبھی پھولنے پھلنے نہیں دیتا

حسب ذیل مصرعے بھی آفاقی حقیقتیں ہیں اور ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ع "سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہان میں"

ع "جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے" ع "کیا تمہیں ہوا کسی جو روتی کی گئی تب"

ع "سچ کہتے ہیں ہر شادی کو غم علق ہیں توام" ع "دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری"

ع "دولت سے کمینہ کو شرافت نہیں آتی" ع "عزت پہ بات آئے تو مرنا ہی خوب ہے"

ع "جو دم گزر گیا وہ پھر آتا نہیں کبھی" ع "آنکھیں وہی کھلتا ہے جو انجام کو دیکھے"

اگرچہ میر تقی میر اور میر انیس کا کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا کیونکہ دونوں کی راہیں الگ منزلیں مختلف اور مقاصد جداگانہ ہیں۔ میر کا کوچہ دوسرا ہے اور انیس کا کوچہ اور لیکن مولانا عبدالحق نے اپنے انتخاب کلام میر کے مقدمہ میں میر اور انیس کا موازنہ کرنا پسند کیا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دے دیا ہے جن کا ازالہ ضروری ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: "اہل لکھنؤ کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس، آداب و اطوار، غرض تمام طرز معاشرت میں سراسر تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے[3] اور اسی وجہ سے شعرائے لکھنؤ کا کلام جن میں انیس بھی شامل ہیں اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔"

مولانا کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اہل لکھنؤ کا تکلف اور تصنع دوسروں کی نظر میں تصنع اور تکلف ہو سکتا ہے لیکن اہل لکھنؤ کے نزدیک وہ تکلف نہیں "نیچرل" ہے۔ ستاھیا مہلک ہے مگر جب انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے تو وہ مہلک نہیں رہتی بلکہ مفید ہو جاتی ہے۔ مغربی تہذیب میں "تھینک یو"، "ساری" اور "پلیز" روزمرہ میں داخل ہیں۔ ہم مشرق میں رہنے والے اسے تصنع اور تکلف سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح بوس و کنار مغرب میں سماجی معمولات میں شامل ہے۔ ہم مشرق والے اسے معیوب سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ فیصلہ کہ یہ آداب و اطوار غیر فطری ہیں یا ان میں تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے غیر منصفانہ ہے۔ مغربی ماحول میں یہ باتیں قطعاً فطری اور نیچرل ہیں۔ جس طرح مورخ عہد، ماحول اور معاشرہ کو پیش نظر رکھ کر تاریخی واقعات کو جانچتا اور پرکھتا ہے اسی طرح نقاد کو بھی چاہیے کہ وہ عہد، ماحول اور معاشرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے تنقید کرے۔ کلام انیس میں جسے ہم تصنع اور تکلف کا نام دیتے ہیں وہ لکھنوی ماحول میں عین فطری اور نیچرل ہے۔

ایک دوسرے مقام پر مولانا فرماتے ہیں: "میر انیس بھی جن کا فصاحت میں بہت بلند درجہ ہے اور جو سوز و غم کے بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، میر صاحب کو نہیں پہنچتے"[4] یہ بات بھی محل نظر ہے۔ میر اور انیس کے سوز و غم کی قدروں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میر کا سوز و غم ان کی فطری یاس پسندی کا نتیجہ ہے۔ انیس کے یہاں سوز و غم فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ بے شک میر غزل کے "بادشاہ" ہیں۔ لیکن میر کے بعد دنیا میں ایک ایسا شہنشاہ سخن بھی پیدا ہوا جس کی قلمرو شاعری میں جتنی گہرائی گیرائی، وسعت، رنگینی و تنوع، فصاحت و بلاغت، درد و غم اور وہ سب خوبیاں بیک وقت موجود ہیں جو بہت کم شعرا کو نصیب ہو سکیں۔ یہ انیس کی شاعرانہ تعلّی نہیں، ٹھوس حقیقت کہیے ؎

کسی نے مری طرح سے اے انیس || عروس سخن کو سنوارا نہیں

اسی طرح مولانا عبدالحق کی یہ تنقید کہ "میر انیس رلاتے ہیں میر خود

---

[1] اسی مضمون کو اس رباعی میں باندھا ہے۔

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے || اس باغ سے کیا کیا گل رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل جس نے دیکھی نہ خزاں || وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

[2] یہ بہت تلوار کی تعریف میں کہی گئی ہے، مگر اس کے ذریعے انیس نے ایک اہم اخلاقی سبق دے دیا ہے، اور اس کے لیے کتنا خوبصورت انداز اختیار کیا ہے کہ یہ مطلق محسوس نہیں ہوتا کہ یہ اخلاقی سبق ہے۔ یہ انیس ہی کا حصہ ہے۔ [3] مولانا عبدالحق: انتخاب کلام میر (مقدمہ) ص ـــ [4] مولانا عبدالحق: انتخاب کلام میر (مقدمہ) ص ۲۵

روتا ہے' یہ آپ بیتی ہے وہ جگ بیتی۔[1] کلام انیس کا صحیح تجزیہ یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ بیتی کے مقابلے میں جگ بیتی بیان کرنا مشکل ہے۔ دوسرے خود رونا آسان ہے، رُلانا مشکل ہے' بلکہ رُلانا بجائے خود ایک فن ہے۔ جو رُلا سکتا ہے وہ اوّل خود روتا ہے۔ جو خود نہیں روتا وہ دوسرے کو کیا رُلا سکتا ہے۔ انیس اول خود روتے تھے تب وہ دوسروں کو رُلانے میں کامیاب ہوتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

رونا مری آنکھوں سے کرے حاصل ابر　　دریا مری آنکھوں سے روانی سیکھے

اسی سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں: "میر انیس کے ہاں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہے۔ میر کے ہاں سکون اور خاموشی۔"[2] کلام میر کے بارے میں مولانا کی رائے سو فیصدی درست ہے' لیکن کلام انیس کے بارے میں نامعتدل۔ انیس کے ہاں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہی نہیں' اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ انیس کے کلام میں رزم بزم' اخلاق و حکمت' آفاقی حقیقت ضرب المثل' کردار نگاری' منظر کشی' بَین' سب ہی کچھ ہے' اور انیس ہر موقع کے لیے علیحدہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ وہ بقول خود اس کے قائل ہیں کہ "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد" اور "یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی"۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جو شعرائے اردو کے حصہ میں بہت کم آیا ہے۔ جہاں انیس رزم لکھتے ہیں وہاں بیشک ان کے کلام میں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہے' لیکن جہاں بزم نظم کرتے ہیں' خصوصاً جہاں تغزل سے کام لیتے ہیں وہاں مکمل سکون اور خاموشی پیدا کر دیتے ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار ایک سلام سے انتخاب کیے گئے ہیں۔ یہ سب غزل کے شعر ہیں اور ان میں مکمل سکون اور خاموشی پائی جاتی ہے۔

جب شکستہ ہو گیا تار نفس　　کون سا اُلفت کا رشتہ رہ گیا
کاتب اعمال بھی رخصت ہوئے　　ہائے میں غربت میں تنہا رہ گیا
قبر میں ہوا حساب زندگی　　بعد مرنے کے بھی جھگڑا رہ گیا
تیری محنت پر فلک پتھر پڑیں　　چور ہو کر دل کا شیشہ رہ گیا
قبر میں رکھ کر نہ ٹھہرا کوئی دوست　　میں نئے گھر میں اکیلا رہ گیا
سوؤ گے کب تک بس اب اُٹھو انیس　　دن بہت غفلت میں تھوڑا رہ گیا

ایک دوسرے سلام کے یہ شعر بھی اسی قسم کے ہیں:

گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اُٹھا کے چلے　　خدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
ملا جنھیں انھیں اُفتادگی سے اوج ملا　　انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے
تمام عمر جو کی سب نے بے رُخی ہم سے　　کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی　　چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

اوپر نمونے کے دو سلاموں کے چند شعر پیش کیے گئے' لیکن ان کے ہر سلام میں ایک دو اور کبھی کبھی زیادہ اشعار ایسے نکل آتے ہیں جو غزل میں مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ متفرق سلاموں میں سے اسی نمونے کے چند شعر اور ملاحظہ فرمایئے:

بات کی جب پھول منہ سے جھڑ پڑے　　مسکرائے جب تو غنچہ کھل گیا
ہمارے شیشۂ دل کو نہ توڑئے زاہد　　یہ ظرف وہ ہے کہ جس میں گلاب رہتا ہے
جو دل جلے ہیں انھیں کا کفن ہے گرما گرم　　مزا ہے سیخ پہ جب تک کباب رہتا ہے
آخر ہے عمر زیست سے اب دل بھی سیر ہے　　پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے
نہ گل میں محبت نہ بلبل میں انس　　الٰہی یہ کیسی ہوا ہو گئی
نہ کی آہ کچھ عمر رفتہ کی قدر　　عجب جنس کو رائیگاں کر دیا
نواسنجیوں نے تری اے انیس　　ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

مسدس نظم کرتے کرتے انیس کے قلم سے بعض ایسی بیتیں نکل جاتی ہیں جنھیں کسی بھی اچھی سے اچھی غزل کا مطلع قرار دیا جا سکتا ہے۔ پختہ کار شاعروں کا تجربہ ہے کہ غزل میں شعر سے زیادہ مطلع کہنے میں نسبتاً زیادہ دقت پیش آتی ہے' ورنہ مطلع کے دونوں مصرعوں کے دولخت ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ مسدس کے تینوں شعر اپنے مقام پر مطلع ہوتے ہیں۔ انیس نے اس طرح ہزاروں مطلع کہے ہیں۔ ان میں سے چند ایسے مطلع انتخاب کر کے پیش کیے جاتے ہیں جو غزل کی زینت بن سکتے ہیں:

گیسو ہلے ہوا سے تو جنگل مہک گئے　　جب ہنس کے بات کی تو ستارے چمک گئے
شادی سدا نہیں چمن روزگار میں　　روئے خزاں میں وہ جو ہنسا ہے بہار میں
خاروں سے پوچھیے نہ کسی گل سے پوچھیے　　صدمہ چمن کے لٹنے کا بلبل سے پوچھیے

(بقیہ صفحہ ۴۵ پر)

[1] مولانا عبدالحق: انتخاب کلام میر (مقدمہ)، ص ۲۶ [2] ایضاً

غزل

رباب رشیدی

ملا بھی آج وہ مجھ کو تو اس طرح یارو
سفر میں کوئی مسافر ہو جس طرح یارو

شعور میں بھی وہی لاشعور میں بھی وہی
بتاؤ اس کو بھلاؤں میں کس طرح یارو

مرے مزاج میں رس بس گیا ہے وہ ایسا
صبا میں کیف، مہک گل میں جس طرح یارو

تمھیں بھی یاد تو ہوں گے وہ رہروانِ حیات
خزاں میں پھول کھلاتے تھے کس طرح یارو

سفر کٹے گا نہ ہرگز اداس جذبوں سے
پہنچ نہ پاؤ گے منزل تک اس طرح یارو

بنامِ عظمتِ اسلاف مقتل گاہ چلو
کہ پیاسے، میکدے جاتے ہیں جس طرح یارو

زمیں کو گرم لہو کی بڑی ضرورت ہے
اُگے گی ایک نئی فصل اس طرح یارو

ابھی تو ذرے ہیں آؤ کہ آفتاب بنیں
حمید، اصغر و عثمان جس طرح یارو

غزل

آذر بارہ بنکوی

شبِ غم کی بات ہوئی نہ تھی کوئی بس کسی کا چلا نہیں
مری سرد آہ سے بجھ گیا جو چراغ پھر وہ جلا نہیں

نئی راہ جس نے دکھائی تھی وہی اس روش پہ چلا نہیں
نئی روشنی کا پیامبر نئی روشنی میں ڈھلا نہیں

کہیں جام جم نے کی تجلیاں کہیں چھوٹ روئے نگار کی
مری کائناتِ شباب میں کبھی آفتاب ڈھلا نہیں

مرے نقشِ پا سرِ رہ گذر کسی کام کے نہ سہی مگر
وہ بھٹک گیا جو خرد زدہ مرے راستے پہ چلا نہیں

مجھے دل وہ درد بھرا دیا جو غموں کی تاب نہ لا سکا
وہ چراغ مجھ کو عطا ہوا جو ہوا کے رُخ پہ جلا نہیں

یہی عہدِ نو میں ترقیاں ہوئیں انقلاب کے نام پر
جو بُرا تھا اب وہ بُرا نہیں جو بھلا تھا اب وہ بھلا نہیں

مری عمر آذرِ غم زدہ بڑی آن بان سے کٹ گئی
وہ نگاہِ ناز تھی ملتفت تو کوئی ملال کھلا نہیں

غزل

حبیب ہاشمی

روئے زمیں سے اُڑ کے سرِ آسماں گئے
دیکھئے! تو کوئی خاک کے ذرّے کہاں گئے

اب تک نہ بھر سکے ہیں غمِ بے رُخی کے زخم
اک عمر ہو گئی مجھے شہرِ بُتاں سے گئے

آیا نہ لوٹ کر کوئی منزل سے آج تک
اس کارواں سے پہلے کئی کارواں گئے

گردن تک اپنی اُٹھ نہ سکی اس سے تیغِ ناز
مقتل میں بار بار پئے امتحاں گئے

اب مہوشوں کے لب کا تبسم محال ہے
شہرِ وفا کے چاند ستارے کہاں گئے

اللہ رے یہ حُسنِ تکلّم کی شوخیاں
مجھ کو سُنا کے خود وہ مری داستاں گئے

تم کو سکونِ دل : میسّر ہوا حبیب
تم درد ہی سمیٹ کے لا ے جہاں گئے

رباعیات

سطوت رسول

آئی ہے گھٹا جھومتی بندرا بن سے
شعلے سے بھڑک اُٹھتے ہیں میرے تن سے
پیتم کی برہ میں جوگ بیراگ لیا
اے کاش اُتر جاتے وہ میرے من سے

جذبات پہ قابو ہے نہ دل پر قابو
اُمڈے ہی چلے جاتے ہیں میرے آنسو
صحرا میں ٹھکانا ہے نہ گھر میں میرا
مانوس نہیں مجھ سے ابھی تک آہو

رہنے دو یہ دلداری و اندازِ کرم،
اے دوست نہ کھُل جائے رفاقت کا بھرم
بیٹھا ہوں گھنی چھاؤں میں سستانے کو
حالات کے جس موڑ پہ ہارے ہیں قدم

آنکھوں کے حسیں جام ہیں چھلکے چھلکے
لہرائے ہوئے شانوں پہ گیسو ڈھلکے
اے میری سکھی تو نے بھی اُن کو دیکھا
نرموہی ہیں پریتم وہ بڑے کس بل کے

کتب خانہ ندوۃ العلما کے اردو مخطوطات

[illegible]

اب سے ۸۰ سال پہلے ۱۸۹۴ء میں جب بعض روشن خیال علما نے ندوۃ العلما کے تحت لکھنؤ میں اس عظیم درسگاہ کا سنگ بنیاد رکھا تاکہ تعلیم و تربیت اور علوم و فنون کی اشاعت کے لیے ایک نئے کتب فکر کی بنیاد ڈالی تھی تو اس وقت ان کے ذہن میں ایک ایسے کتب خانہ کا قیام بھی تھا جو نایاب قلمی کتابوں کے ساتھ عربی فارسی مطبوعات کا اہم ذخیرہ ہو اور بہ خاص و عامہ کے لیے اس کے دروازے کھلے رہیں۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب بانکی پور، رام پور اور آصفیہ (حیدرآباد) کے کتب خانے پبلک نہیں تھے اور محققین کو



ندوۃ العلما کی عمارت

آسانی سے استفادہ کے مواقع حاصل نہیں تھے۔

اس وقت کے اخبارات و رسائل میں علامہ شبلی اور مولانا آزاد کی تحریروں اور اپیلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس

اسلام ۱۸۹۴ء تک

کتب خانہ کا قیام ضمنی نہیں تھا بلکہ درسگاہ کے مقاصد اور اس تحریک کا اہم جز تھا۔

اس مقصد سے متعلق علمی کام شاہجہاں پور کے اجلاس سے شروع ہوا۔ سب سے پہلے مولوی عبدالرافع صاحب ڈپٹی کلکٹر نے تقریباً ۴ ہزار کتابوں کے بیش بہا عطیہ سے اس کا بنیادی پتھر رکھا۔ پھر پٹنہ کے اجلاس میں مولوی عبدالعظیم صاحب نے دو سو کتابوں کا اس پر اضافہ کیا اور مولوی سید عبدالغنی نے تاریخ و ادب کی ایک سو ایک کتابیں عطا فرمائیں۔ ان کے علاوہ وقتاً فوقتاً بعض اور عطیے بھی اس سرمایے کو وسیع کرتے رہے جن میں نواب عالمگیر محمد خاں بہادر جاگیردار بھوپال، سید حمیدالدین صاحب رئیس پٹنہ، مولوی محمد یحییٰ صاحب مرحوم اور سید احسن شاہ کے عطیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان معطیین کی تعداد کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وقت اس کتاب خانہ میں کتابوں کی کل تعداد لگ بھگ ۶۲ ہزار ہے جن میں بہت بڑی تعداد عطیات ہی کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔ بعض اہل علم نے تو پورے پورے کتب خانے اس کے لیے وقف کر دیے چنانچہ اس وقت متعدد مستقل ذخیرے (......) جو یہاں ہیں ان میں نواب صدیق خاں، نواب نورالحسن خاں، نواب نجم الحسن خاں، واجد علی خاں، عبدالجلیل اور علامہ سید عبدالحی حسنی کے قیمتی کتب خانے شامل ہیں جو قلمی اور مطبوعہ نادر و نایاب کتابوں سے مالا مال ہیں۔

کتب خانہ میں زیادہ تر کتابیں عربی کی ہیں۔ ان کے بعد فارسی اردو اور انگریزی کی ہیں۔ عربی فارسی اور اردو مخطوطات تقریباً ڈھائی ہزار ہیں جن میں سے بہت کم شائع نہیں ہوئے تھے اور اب حال میں شائع ہوئے ہیں۔

اردو زبان میں مخطوطات کی تعداد گو کم ہے مگر ان میں بیشتر قدیم الخط ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو شائع نہیں ہوئے یا انھیں حوالہ اور اصل کی حیثیت حاصل ہے۔ ذیل میں ادبیات اردو سے متعلق چند اہم مخطوطات کا تعارف قلمبند کیا جا رہا ہے:

۱۔ دیوانِ منتظر: سطور فی صفحہ ۱۵۔ سائز ۹ × ۵۔ سنہ کتابت ۱۲۲۸۔ اوراق ۲۳۴۔

خواجہ نورالاسلام منتظر مصحفی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ انھوں نے مصحفی کی طرف سے ان کے حریفوں کو جوابات دیئے ہیں۔ مصحفی نے منتظر کا ذکر اپنے تذکرہ ہندی گویان میں کیا ہے اور اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال بتائی ہے۔ یہ تذکرہ چونکہ ۱۲۰۹ھ میں مرتب ہوا ہے اس لحاظ سے منتظر کا سال پیدائش تخمیناً ۱۱۸۴ ہوتا ہے۔

دیوان شاعر کی حیات میں لکھا گیا۔ مخطوطہ تقریباً ۱۴۸۰ شعروں پر مشتمل ہے۔ کاغذ عمدہ ہے۔ کہیں کہیں کرم خوردگی کی وجہ سے الفاظ محو ہو گئے ہیں۔ مجموعی طور پر کتابت خوشخط اور حسین ہے۔ اس پر علامہ شبلی کے دستخط ہیں اور انھوں نے اپنے قلم سے بعض مقامات پر تصحیح بھی کی ہے۔ اس دیوان کا دوسرا نسخہ ہندستان کے کسی کتب خانہ میں موجود نہیں ہے۔ دیوان حمد کے بعض اشعار سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد غزلوں کا سلسلہ ہے جو زیادہ طویل ہے۔ اخیر کا ¼ حصہ مخمسات اور ہجویات پر مشتمل ہے۔

آغاز:

اسی کی حمد کی خاطر ہوئی منہ میں زباں پیدا
کیا اک حرف کن میں جس نے یہ کون و مکاں پیدا

نمونہ کلام:

میں منتظر اس شوخ کی فرقت میں جو دیکھا
اللہ نہ دکھلاوے وہ غم اور کسی کو

ترقیمہ: تمام شد دیوان تصنیف میاں منتظر شاگرد میاں مصحفی صاحب بتاریخ ہفتم شوال ۱۲۳۰ھ ....

۲۔ کلیات میر: منشی محمد تقی میر بن عبداللہ متوفی ۱۲۲۵ھ سنہ کتابت ۱۲۳۸ھ، سائز: ۱۱ × ۶۔ سطور ۲۰۔ اوراق ۴۵۰۔

میر کے ۱۳ سال بعد کی کتابت ہے۔ مجموعی طور پر دیوان

گئی ہے۔ ابتدا اور آخر کے دو ایک صفحات غائب ہیں۔

۳۔ تذکرۃ الشعراء (تذکرہ ہندی گویاں): شیخ غلام ہمدانی مصحفی متوفی ۱۲۴۰ھ تاریخ کتابت ۱۲۰۹ھ سائز ۵ × ۹
سطور ۱۳ ۔ اوراق ۴۶

سرورق پر مسودہ درج ہی لکھا ہوا ہے لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے کہ کتابت میں مختلف خط ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اشخاص کا لکھا ہوا ہے۔ البتہ اکثر مقامات پر کاٹ کر اصلاح کی گئی ہے۔ گو اس پر مصحفی کے دستخط نہیں ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ مصحفی نے اپنی زندگی میں دوسروں سے نقل کرایا ہے اور اس پر اپنے قلم سے اصلاح کی ہے۔

ایک محقق کی رائے ہے کہ اصلاح مصحفی کے قلم سے ہے اور نیز یہ اصل مسودہ کی دوسری نقل ہے۔ کتاب کے سرورق پر ایک دستخط ہے جس میں غلام واضح ہے اور دوسرا لفظ مشتبہ ہے جسے محمد بھی پڑھا جاتا ہے نیز سنہ کی جگہ صرف ۱۸ درج ہے۔ اس لیے شبہ ہوتا ہے کہ یہ کاتب کے دستخط ہوں گے۔

ترقیمہ: تمت این کتاب دل پسند بسعی در معنی طبع خود نگاشت گفتہ تاریخ جبد یہ طبع سنہ ۱۲۰۹ ہجری

۴۔ رسالہ در ذکر شہادت علی اکبر (منظوم) مصنف نامعلوم۔ سنہ کتابت ۱۱۸۰ھ سائز $\frac{1}{2}$۶ × ۶ سطور ۱۶

آغاز: راوی پر ملال بزبان حال نقل کرتا ہے کہ ایک روز حضرت شہر بانو فرزند دلبند علی اکبر کو دیکھ کر زلفہائے مشکفام کو شانہ کرتی تھیں اور دمبدم بوسہ لیتی تھیں۔

ترقیمہ: ... تحریر یافت ۱۶ محرم ۱۲۰۸، فدا محمد حسین

۵۔ دیوان مصحفی: غلام ہمدانی مصحفی ابن ولی محمد متوفی ۱۲۴۰ھ۔ سنہ کتابت ۱۲۰۹ھ سائز ۱۰ × $\frac{1}{2}$۶
اوراق ۶۳۔ سطور ۱۵۔ نسخہ قدیم، از اول و آخر ناقص۔

یہ غالباً مصحفی کا چوتھا دیوان ہے کیونکہ ۱۲۰۹ سے پہلے مصحفی کے ۳ دیوان مکمل ہو چکے تھے۔ اس کا اقرار ان کے تذکرہ ہندی میں موجود ہے۔ اس میں سلیمان شکوہ کی مدح میں قصائد اور ہجو مودی خانہ موجود ہے۔ مزید "تابوت میں انگلی" والی غزل کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ چوتھا دیوان ہے۔ خود معاصرین کے لیے ایک ہجو یہ قطعہ "رنوانے کی شاعری چھپانے کی شاعری" اس میں موجود ہے۔ اس لیے بھی اسے چوتھا دیوان ہونا چاہیے۔ لیکن یہ دیوان مکمل نہیں ہے۔ اس میں صرف ردیف "ی" کی غزلیں ہیں اور کچھ قصیدے بھی۔ صفحہ ۲ کے حاشیہ پر لکھی ہوئی غزل جس کا مقطع ہے ؎

اے مصحفی دو دن نہ گیا میں تو وہ بولا
آیا نہیں در پر مرا سائل کئی دن سے

خود مصحفی کے ہاتھ کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی اور ثبوت اس نامکمل دیوان میں نہیں ہے تاہم اندازہ یہی ہے کہ کم از کم یہ مصحفی کی زندگی میں نقل ہوا۔

مصحفی کے تذکرہ ہندی کا قلمی نسخہ جو اس کتب خانہ میں موجود ہے اور اس میں مصحفی نے اپنے قلم سے چند اصلاحیں کی ہیں۔ اس نسخہ کا طرز کتابت بڑی حد تک اس دیوان کی تحریر سے مشابہ ہے۔ دیوان میں وہ قصیدہ بھی ہے جو میر کی زندگی میں لکھا گیا تھا۔

آغاز: ہے رنگ سیاہی لیے جو اس کی حنا کا
ہاتھوں پہ ہر اک کی او دا ہٹ نہیں آتی

۶۔ دیوان ہوس: مرزا محمد تقی خاں ہوس۔ سائز $\frac{1}{2}$۶ × ۸، سطر ۱۳۔ نسخہ قدیم و خوشخط۔ سنہ کتابت موجود نہیں۔ اوراق ۳۹۷

آغاز:
نقوش کلک قسمت سے ہے اندیشہ کو حیرانی
پڑھا جاتا نہیں ہرگز کسی سے خط پیشانی

اختتام:
نیم وا چشم نہیں اس کی ادا سے خالی
شرم اک فتنۂ خوابیدہ تہ مژگاں ہے
"تمام شد دیوان"

دیوان کا دوسرا نسخہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے جو
دہ مکمل اور صحیح ہے۔ لیکن یہ فیصلہ مشکل ہے کہ مذکورہ دونوں
نوں میں تاریخ کتابت کے لحاظ سے کون سا نسخہ زیادہ قدیم
۔ دوسرے نسخہ میں غزلیات کے سوا مثنویات کا حصہ بھی
ل ہے۔

۷۔ مثنوی سراپا سوز: محمد صادق خاں اختر۔ سنہ کتابت
۱۲ھ۔ سائز $9\frac{1}{2}$" × $6\frac{1}{2}$"۔ سطور ۱۳۔ اوراق ۴۰
نسخہ قدیم اور خوشخط ہے۔

آغاز: درصفت عشق حقیقی کہ واسطہ ایجاد عالم
ست وسبب خلقت بنی نوع آدم۔
لق عالم سے مدعا ہے عشق مظہر ذات کبریا ہے عشق

اختتام:
سمجھے ہر اک کو ہوشیار ہم آئے تھے یہاں اختر
بچشم غور جو دیکھا تو متوالوں کی بستی ہے

۸۔ مظہر معجزات ائمہ معصومین: ناصر: شاعر ماہر
تخلص ناصر۔ سنہ کتابت ۱۲۵۷ھ۔ کاتب: علی نقی بن
مہرجان۔ سطور ۱۶۔ سائز $9\frac{1}{2}$" × ۶۔ اوراق ۱۰۷۔ نسخہ
خوشخط و قدیم۔

آغاز:
سزاوار حمد و ثنا ہے خدا خدا ہی سزاوار حمد و ثنا

اختتام و ترقیمہ:
یہ تاریخ پہلی ہوئی تھی بہم
کیا تھا تجلی خاطر رقم
۱۲۵۲

کتاب تمام شد بر مکان نواب ممتاز اللہ خاں بہادر
دام اقبالہٗ روبرو داروغہ دلدار خاں و ظاہر صاحب و
امیر خاں بخط علی نقی ساکن نگینہ در لکھنؤ مولف شد
شہر ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ۔

۹۔ دیوان برہمن: سنہ کتابت نامعلوم۔ سائز
۱۰ × ۶۔ سطور ۱۵۔ اوراق ۶۵

آغاز: "بسم اللہ الرحمن الرحیم"
زبان اس جمال کے صدقے ہوں نام کا ... جو سوا ہے سبب ... کا

اختتام:
کاش ناشد کہ یاد آویں ہم ... تیرا آویں ہم
برہمن میں نہیں ہے معنی ہوش ... ہے ... تیری خوش

۱۰۔ غنچۂ آرزو: دیوان صبا، میر وزیر علی ابن
میر بندہ علی متوطن لکھنؤ متوفی ۱۲۰۱ سائز ۱۱ × ۷
سطور ۱۵۔ نسخہ قدیم۔ سال کتابت نامعلوم۔ اوراق ۱۱۹۔

آغاز:
آرزو کی جو صفات نقرا سے پیدا صورت وصل ہوئی ذات خدا سے پیدا

اختتام:
شبنم کی ... ہیں تماشائے جہاں میں
رونے کے سوا اور ہمیں کام نہیں ہے

۱۱۔ معراج نامہ: سید بولاقی دکھنی۔ سنہ تالیف
۱۱۵۵ھ۔ سنہ کتابت نامعلوم۔ سائز ۹" × ۵ سطور
۱۵۔ اوراق ۳۰۔

آغاز: معراج نامہ دکھنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ
وسلم است۔

اول نام اللہ جو ہو ... تنا اور صفت اسکی کرے عدد

اختتام: یا علی مدد تمام شد کار من۔۔۔۔

صفحہ آخر پر کاتب نے کچھ متفرق چیزیں لکھی ہیں جو واضح نہ ہونے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آئیں۔ سنین میں ۱۲۴۱ھ اور ۱۲۳۱ھ تحریر ہے لیکن اس کے ساتھ تاریخ وفات لکھا ہے۔

۱۲۔ منتخب الامثال: مقبول احمد ابن قدرت احمد منشی۔
سائز: ۹ × ۶۔ سطور ۱۱۔ اوراق ۴۰۔ سنہ کتابت قبل از
۱۲۵۲ھ۔

اردو کے ضرب الامثال کا مجموعہ ہے۔ حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ کتابت خوشخط اور عمدہ ہے کئی جگہ میر حسن

کی مہریں ثبت ہیں۔

۱۲۔ شاہنامہ اُردو، نسخہ قدیم ہے۔ سائز : "۱۰ × "۶ ۔ اوراق ۳۱۰۔

آغاز :

سرنامہ حمد خُدائے کریم کہ ہے کردگارے غفور و رحیم

آخیر سے کچھ صفحات غائب ہیں۔

ان مخطوطات کے سوا درج ذیل نسخے قابل ذکر ہے جن کا تفصیلی تعارف کسی مناسب موقعہ سے کیا جاسکے گا:

۱۔ **نوادر اللغات** : مرتبہ سراج الدین علی خاں آرزو

۲۔ **نان و حلوہ** (منظوم مجموعہ) : مرزا فتیح

۳۔ **تذکرہ ریختہ گویاں** : مرتبہ علی حسینی گردیزی سنہ تالیف ۱۱۶۶ھ سال کتابت ۱۱۷۴ھ

۴۔ **تذکرۃ الشعراء** : مرتبہ میر غلام حسین متخلص حسن متوفی ۱۲۰۱ھ

۵۔ **لغات بے نقط** : مرتبہ عزیز بلگرامی

۶۔ **رسالہ مصائب اہل بیت** : از علمار شیعہ

۔ **دیوان محمدی** (مولوی محمد نظام) : سال ترتیب ۱۲۶۱ھ۔

۸۔ **دیوان ولی دکنی**

۹۔ **غنچہ آرزو** : دیوان میر وزیر علی صبا تلمیذ آتش متوفی ۱۲۷۰ھ۔ سال ترتیب ۱۲۷۲ھ

۱۰۔ **دیوان شیدا**

۱۱۔ **کلیات ناسخ** : (امام بخش ناسخ ۱۲۵۴ھ) سال کتابت ۱۲۴۹ھ

۲۸۔ **کلیات میر** : (منشی میر تقی میر متوفی ۱۲۲۵ھ) سال کتابت ۱۲۴۹ھ

۲۹۔ **مثنوی شمشاد و صنوبر** : سال کتابت ۱۲۴۹ھ

۳۰۔ **کلیات سودا** : ۱۱۲۵۔۱۱۹۵ھ

۳۱۔ **مثنوی سحر البیان** (میر غلام حسن دہلوی متوفی ۱۱۹۹ھ) اور

۳۲۔ **دیوان ظاہر**

یہ صرف ادبیات اُردو سے متعلق چند مخطوطات کا تعارف تھا۔ اس کے سوا مذہبی، تاریخی اور متفرق موضوعات سے متعلق اُردو مخطوطات کا بڑا ذخیرہ بھی یہاں موجود ہے۔

★

اتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

یو پی آراضی بنک میں فکسڈ ڈپازٹ اسکیم کا اجراء • • • مشرقی یو۔ پی میں اون کی پیداوار بڑھانے کے لیے ایک بڑا پروگرام • • • امدادی تقاوی کی بروقت ادائیگی کے امکانات • • • لائبریریوں کے لیے رضاکار تنظیموں کو مالی امداد • • • پہاڑی ضلعوں کے ۱۹۳ مواضعات کو بجلی فراہمی • • • پہاڑی علاقوں کے صارفین کے لیے سستی روغن • • • جوٹ مزدوروں کی اُجرت میں ۲۵ روپے کا خصوصی اضافہ • • • پردیش میں مزید دس فلاحی مراکز کے قیام کی تجویز • • • گنگریل کے جنگل کو پرکشش تفریح گاہ بنانے کا منصوبہ • • • سرکاری انتظام میں آنے کے بعد ایس۔ پی۔ شوگر مل سے دس لاکھ کا منافع • • • اتر پردیش میں پلوں کی تعمیر کی رفتار تیز • • • شمالی کھیری میں گینڈوں کے تحفظ کا بندوبست • • • وزیر اعلیٰ ذاتی فنڈ میں تقریباً ۶ کروڑ روپے • • • غیر میٹرک اوزان اور پیمانوں کا استعمال غیر قانونی • • • متفرقات

اتر پردیش ریاستی امداد باہمی بنک نے زراعتی مقاصد کے لیے قرضے تقسیم کرنے کے سلسلے میں ملک میں اول مقام حاصل کرنے کے بعد یکم مئی سے ایک نئی اسکیم جاری کرکے امداد باہمی تحریک میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔

بنک نے نئی اسکیم فکسڈ ڈپازٹ اسکیم کے نام سے شروع کیا ہے جس کا افتتاح وزیر امداد باہمی شری لکشمی شنکر یادو نے ایک خصوصی تقریب میں بینک کے احاطے میں کیا۔

اس اسکیم کے آغاز کے چند ہی منٹ کے اندر تقریباً ...۱۵ روپے کی رقم جمع ہو گئی۔

وزیر امداد باہمی نے اس اسکیم کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ اسکیم بنک کے اپنے وسائل کی تعمیر کے سلسلے میں معاون ہوگی۔

بنک کے صدر نے عوام کو بنک کی رفتار ترقی سے باخبر کرتے ہوئے کہا کہ بنک نے گذشتہ چھ سال کی مدت میں مجموعی طور پر ۱۰۵ کروڑ روپے کے قرضے ریاست کے ۱۱ لاکھ سے زیادہ کسانوں میں ان کی زراعتی ضروریات کی تکمیل کے لیے تقسیم کیے ہیں۔ مزید یہ کہ بنک نے گذشتہ جون میں ختم ہونے والے مالیاتی سال کے دوران ۲۴ کروڑ روپے کے قرضے تقسیم کرکے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے اور مالیاتی سال رواں کے دوران اس کارگذاری میں مزید اضافہ ہوگا اس لیے کہ ۳۰ کروڑ روپے کے قرضے تقسیم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

حکومت اتر پردیش نے مشرقی اتر پردیش میں الہ آباد، وارانسی اور مرزاپور اضلاع میں جہاں بکثرت بھیڑیں پائی جاتی ہیں۔ بھیڑوں کی افزائش نسل اور سدھار کے لیے ۲۹،۴۶ لاکھ روپے لاگت کی ایک حوصلہ مندانہ اسکیم شروع کی ہے۔ ریاست میں پائی جانے والی ۲۷ لاکھ بھیڑوں کی تقریباً ۴۰ فیصد بھیڑیں اس خطہ میں پائی جاتی ہیں۔

اس پراجکٹ کے تحت جس کی تکمیل موجودہ منصوبے کی مدت میں متوقع ہے، ایک لاکھ کیلوگرام سے زیادہ اون تیار کیا جائے گا جس کے نتیجے میں بھدوہی (وارانسی) اور مرزاپور کی ڈالر کمانے والی قالین سازی کی صنعت کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس پراجکٹ کے تحت ۵۰۰ سے زیادہ افراد کو براہ راست روزگار ملے گا۔

آغاز کار کے طور پر ان اضلاع میں بھیڑوں اور اون کے ترقیاتی توسیعی مراکز قائم کیے جا رہے ہیں جن کی کل تعداد ۷۵ ہوگی۔ ہر مرکز میں ۵۰ مینڈھے ہوں گے۔

نظامت نگہداشت مویشیاں بھیڑوں کے امراض کی بروقت تشخیص کے لیے ایک تجربگاہ قائم کرنے کی تجویز بھی رکھتی ہے۔

ان کے نقصان کو کم کرنے کے لیے اس علاقہ میں اون اُتارنے والی مشینوں کا استعمال شروع کیا جا رہا ہے اور نظامت نے ایسی نو ۹ مشینیں حاصل کرلی ہیں۔

یاد ہوگا کہ حکومت نے مرزاپور میں اون کی درجہ بندی اور

خرید و فروخت کا ایک پراجیکٹ شروع کیا ہے تاکہ بھیڑیں پالنے والوں کو بہتر قیمت مل سکے۔ اب اس سہولت کی توسیع بھیڑ پالنے والوں کی امداد باہمی انجمنوں کے ذریعے اس علاقے میں بھی کی جارہی ہے۔

ریاستی حکومت نے ضلع افسروں کو ہدایت کی ہے کہ ایسے مصیبت زدوں کو امدادی تقاوی اور قرضوں کی بروقت ادائیگی کا بندوبست کریں جو قدرتی آفات مثلاً آتش زدگی، سیلاب، شدید بارش اور خشک سالی سے متاثر ہوئے ہوں۔

حکومت نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ قدرتی آفات کا شکار ہونے والوں کو سرکاری مالی امداد بروقت اور منظم طور پر نہیں ملتی۔ بعض اوقات آتش زدگی سے متاثر ہونے والے افراد کو حکام کی اس غلط فہمی کی بنا پر کوئی مالی امداد نہیں مل پاتی کہ آتش زدگی ایک قدرتی آفت نہیں ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حکومت کے کثیر مصارف کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

ہدایات میں کہا گیا ہے کہ ضلع افسروں کو اس بات کا پورا خیال رکھنا چاہئے کہ مستقبل میں ایسی شکایتیں پیدا نہ ہوں۔

اترپردیش کے محکمہ مال نے وقتاً فوقتاً جو گشتی مراسلے جاری کئے ہیں اُن کے بموجب ایسے خاندانوں کو ۱۰۰ روپئے تک کی مفت مالی امداد منظور کی جا سکتی ہے جو بالکل بے سہارا ہوں۔ ضلع افسر یہ رقم ایسے کاشتکاروں کو منظور کرنے کے سلسلے میں بھی اپنے اختیارات استعمال کر سکتے ہیں جن کے پاس ایک ایکڑ تک زمین ہو۔

غریب خاندانوں کو ایسے مکانات کی تعمیر اور مرمت کے لیے رقم منظور کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے جنھیں نقصان پہنچا ہو۔ دیہی علاقوں میں فی خاندان ۲۰۰ روپے تک اور شہری علاقوں میں فی خاندان ۳۰۰ روپے تک منظور کیا جا سکتا ہے۔

دیہی علاقوں میں مکان کی تعمیر کے لیے ایک غیر زراعت پیشہ خاندان کو امدادی تقاوی کی شکل میں ۲۵۰ روپے تک اور شہری علاقوں میں ۲۰۰۰ روپے تک کی رقم منظور کی جا سکتی ہے۔ خصوصی معاملات میں شہری علاقوں کے لیے یہ رقم ۳۰۰۰ روپے تک بڑھائی جا سکتی ہے۔ امدادی تقاوی کی منظوری کے لیے ۱۲ء۵ ایکڑ تک کی جوتوں کے کاشتکار کو غیر زراعت پیشہ تصور کیا جائے گا۔

اس اسکیم کے تحت ۱۲ء۵ ایکڑ یا اس سے زیادہ رقبے کے کاشتکاروں کو مکانات کی تعمیر کے لیے امدادی تقاوی کے طور پر ۵۰۰ روپے تک دیا جا سکتا ہے۔ خصوصی حالات میں یہ رقم کاشتکاروں کو مکانات کی تعمیر کے علاوہ ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے بھی دی جا سکتی ہے۔

حکومت نے لائبریریوں کی ترقی کے لیے مالی امداد دینے کے واسطے رضاکار تعلیمی تنظیموں سے درخواستیں طلب کی ہیں۔ مالی امداد کا استعمال عمارتوں کی تعمیر، نیز کتابوں، فرنیچر اور ساز و سامان کی خریداری کے لیے کیا جائے گا۔

اس اسکیم کے تحت صرف ایسی رضاکار تنظیمیں مالی امداد حاصل کر سکتی ہیں جو پبلک لائبریریوں کو چلا رہی ہوں اور کم سے کم ۵۰۰۰ افراد کو پڑھنے کے لیے کتابیں مہیا کر رہی ہوں۔ ریاستی حکومت یا لوکل باڈیز کے زیر انتظام چلنے والی تنظیموں کو یا ایسی تنظیموں کو جو ریاستی مجالس قانون ساز کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی ہوں مالی امداد نہیں مل سکتی۔

خواہش مند تنظیموں کو چاہیے کہ وہ اپنی درخواستیں مقررہ فارم پر متعلقہ ریاست کے محکمہ تعلیمات کے توسط سے محکمہ ثقافتی امور حکومت ہند کو بھیج دیں۔ درخواستوں کے مقررہ فارم اور دیگر تفصیلات ضلع انسپکٹر آف اسکولز سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مقررہ فارم پر درخواستوں کی پانچ نقلیں متعلقہ ضلع انسپکٹر آف اسکولز کے پاس بھیجنا چاہیے۔ جن میں سے تین نقلیں ڈائرکٹر تعلیمات کے توسط سے ریاستی حکومت کو آئندہ ۱۵ اگست تک قطعی پہنچ جانا چاہیے۔

وزیر بجلی شری نارائن دت تیواری نے حال ہی میں ودھان سبھا کے سوالات کے وقفہ میں بتایا کہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران پہاڑی منطقہ کے آٹھ اضلاع میں مجموعی طور پر ۱۹۲ مواضعات کو بجلی

فراہم کی گئی۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ان میں سے ۸۲ مواضعات کو سنہ ۱۹۶۹ء اور ۱۰۹ مواضعات کو سنہ ۱۹۷۰-۷۱ء میں بجلی فراہم کی گئی۔

وزیر موصوف نے کہا کہ ان دو برسوں میں نینی تال ضلع میں ۸۳ مواضعات کو ٹہری گڑھوال میں ۱۲، پوڑی گڑھوال میں ۱۹، الموڑہ میں ۷، اترکاشی میں ۶، چمولی میں ۲۷، پتھوراگڑھ میں ایک اور دہرہ دون میں ۳۶ مواضعات کو بجلی فراہم کی گئی۔

اترپردیش میں وناسپتی لائسنسنگ آرڈر میں ایک ترمیم کے بموجب دیہی علاقوں میں چھوٹے دوکاندار اب ۵۰ کیلوگرام تک وناسپتی روغن کی خرید، اس کا ذخیرہ اور اس کی فروخت بغیر لائسنس کے کر سکتے ہیں۔

یہ اقدام دیہی علاقوں کے صارفین کو وناسپتی فراہم کرنے اور ایسے وقت جب اس کی آمد بازار میں اچانک کم ہو جائے، چور بازاری کو روکنے کے مقصد سے کیا گیا ہے:

دیہی علاقوں کے وناسپتی روغن فروخت کرنے والے دوکانداروں کو ضلع سپلائی افسر کا بلا قیمت جاری کردہ، ایک کارڈ اپنے پاس رکھنا ہوگا۔ اس کارڈ پر نمبر پڑے ہوں گے اور اس پر دوکاندار کا نام، دوکان کی جگہ اور اس کا پتہ درج ہوگا۔

تھوک دوکانداروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ہر ماہ اپنے کوٹہ کا ۲۵ فیصد دیہی علاقوں کے غیر لائسنس شدہ دوکانداروں کو کارڈ پیش کرنے پر فراہم کردیں۔ انھیں یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ وہ اپنی فرم کا نام، پتہ اور وناسپتی روغن کی مقدار غیر لائسنس یافتہ دوکاندار کے کارڈ پر درج کر دیا کریں۔

ریاستی حکومت نے پردیش میں تین جوٹ ملوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے مزدوروں کو یکم جنوری سنہ ۱۹۷۲ء سے ماہانہ اُجرتوں میں ۲۵ روپے کا خصوصی کا اضافہ کریں۔ اضافہ کا حکم جن کو دیا گیا ہے یہ ہیں۔ جے۔کے جوٹ مل کانپور، کانپور جوٹ ادیوگ کانپور اور مہابیر جوٹ مل سہجنوا گورکھپور۔

یہ حکم گذشتہ ۲۸ اپریل کو اُس کمیٹی کی عارضی رپورٹ موصول ہونے کے بعد دیا گیا ہے جو ریاست میں جوٹ مل مزدوروں کی اجرتوں اور دیگر معاملات کی جانچ کے لیے مقرر کی گئی تھی۔

کمیٹی نے ان ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے متفقہ طور پر اس وقت تک کے لیے خصوصی اضافے کی سفارش کی ہے جب تک وہ اپنی قطعی رپورٹ نہ پیش کردے۔

خصوصی اضافے سے متعلق حکم چھ ماہ کی مدت تک یا کمیٹی کی قطعی سفارشات پر عملدرآمد ہونے تک (جو بھی پہلے واقع ہو) نافذ رہے گا۔

حکومت اترپردیش نے ریاست میں سنہ ۱۹۷۲-۷۳ء کے دوران مزدوروں کی فلاح کے مزید ۱۰ مرکز کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ مرکز دہرہ دون، پنکی (کانپور)، گونڈہ، مغل سرائے (وارانسی)، مئو (اعظم گڑھ)، ٹانڈہ (فیض آباد)، بستی، سیتاپور، غازی آباد (میرٹھ) اور خورجہ (بلند شہر) میں کھولے جائیں گے۔

اس مقصد کے لیے ریاست کے سنہ ۱۹۷۲-۷۳ء کے بجٹ میں ۱۰۰، ۸۱، ۷۱ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

یہ مرکز ریاست کے مزدوروں کی سماجی ضروریات پوری کریں گے۔ جن کی تعداد چوتھے پنج سالہ منصوبے کے دوران ریاست کی تیز رفتار صنعت کاری کے نتیجے میں کافی بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مقصد صنعتی امن برقرار رکھنا اور صنعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں مزدوروں کا موثر تعاون حاصل کرنا اور ان میں سماجی تحفظ کا احساس پیدا کرنا ہے۔

ریاستی راجدھانی لکھنؤ سے بارہ کیلومیٹر دور لکھنؤ۔ بارہ بنکی روڈ پر تقریباً ۱۳ مربع کیلومیٹر رقبہ میں پھیلے ہوئے ککریل کے محفوظ جنگل کو مالیاتی سال رواں کے دوران ۸۰، ۴ لاکھ روپے کی تخمینی لاگت سے ایک دلکش تفریح گاہ میں تبدیل کر دینے کا منصوبہ تیار کر لیا گیا ہے۔

اس منصوبے کے تحت یہاں سیاحوں کے لیے جلد ہی ایک ٹورسٹ ہٹ۔

آرام گاہ، کیفیٹیریا، بچوں کے پارک، ہرنوں کے پارک، باغ اور ایک مصنوعی جھیل کی تعمیر کی جائے گی۔ اس کے علاوہ سیاحوں کی جدید سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

حکومت اتر پردیش نے ۱۹۷۱ء میں ضلع بجنور میں ایس۔ بی شکر مل کو اپنے انتظام میں لے لیا تھا۔ اُمید کی جاتی ہے کہ اس سال اس مل کو ۱۰ لاکھ روپے کا منافع ہو گا۔

یہ مل نجی منتظمین کے زیر [illegible] گذشتہ [illegible] سال سے نقصان پر چل رہی تھی۔ حکومت نے اس مل کو اپنے انتظام میں لینے کے بعد ضلع مجسٹریٹ بجنور کو ایڈمنسٹریٹر [illegible] ان کی نگرانی میں دے دیا۔

حکومت نے جب اس مل کو اپنے انتظام میں لیا تو [illegible] متعدد مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ بجلی اور پانی کے کنکشن کٹ چکے تھے اور مزدوروں کو مہینوں سے اُجرت ادا نہیں کی گئی [illegible] اوزاروں اور مشینوں کا بھی کوئی پُرسان حال نہ تھا۔

پنجاب نیشنل بینک سے ۱۰ لاکھ روپیہ کا [illegible] کی مرمت دو ماہ کے اندر کی گئی جس پر [illegible] روپیے [illegible] اخراجات ہوئے۔

مل کی پیداواری صلاحیت میں بھی اضافہ ہوا ہے اور اس سال گنے سے شکر کی پیداوار کا فیصد گذشتہ سال [illegible] سے بڑھ کر ۹٫۴ ہو گیا۔

مل کے مزدوروں اور ملازموں کی اُجرتوں [illegible] پابندیٔ خدمت بھتہ اور دیگر بھتوں کی فوری ادائیگی کی گئی۔ مزدوروں کو ہر ماہ پہلی تاریخ کو باقاعدگی کے ساتھ ان کی اجرت ادا کی گئی اور اس طرح تمام ملازمین کا پورا پورا تعاون حاصل کیا گیا۔

حکومت نے پنجاب نیشنل بینک سے لیا ہوا قرضہ ادا کر دیا اور گارنٹی کمیشن اور دیگر تمام واجبات کی ادائیگی بھی کر دی۔

ریاستی محکمۂ تعمیرات عامہ نے ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران پلوں کی تعمیر کے [illegible] مقررہ نشانہ سے ۱۱۱ فیصد سے زیادہ کیا ہے۔ زیر نظر سال میں ۲۰ پلوں کی تعمیر مکمل کی گئی جبکہ ۱۸ نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ریاست کے مختلف حصّہ میں ۱۴۱ بڑے پلوں پر کام ہو رہا تھا۔ ان پلوں کی کُل مجموعی لاگت ۱۶٫[illegible] کروڑ روپے سے زیادہ ہے۔

زیر نظر سال کے دوران جن پلوں کی تعمیر مکمل ہوئی ان کے علاوہ دیگر پلوں کے چند اہم پل یہ ہیں:—

ضلع فرخ آباد میں ۱٫۹۱ کروڑ روپے کی لاگت کا گنگا کا پل، [illegible] میں [illegible] کروڑ روپے کی لاگت کا کالی کا پل، ضلع بریلی میں ۲۴٫۰۰ لاکھ روپے کی لاگت کا [illegible] کا پل اور ضلع [illegible] میں [illegible] ۱۹٫۰۰ لاکھ روپے کی لاگت کا پل۔

زیر نظر سال کے دوران وارانسی۔ گورکھپور قومی شاہراہ پر دوہری گھاٹ میں ۱۸۳٫۳۲ لاکھ روپے کی لاگت کا پل تعمیر کیا گیا اور اسے جزوی طور پر چالو کیا گیا۔ اس کا افتتاح وزیر [illegible] کیا تھا۔

لکھیم پور کھیری میں ترائی کے گھنے جنگلی علاقوں میں گوندھرا کی کمیاب نسل کا تحفظ جانوروں کی پناہ گاہ ددھوا میں کیا جا رہا ہے۔ یہاں ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔

یہ پناہ گاہ ضلع کے صدر مقام سے تقریباً ۱۰۰ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور ۲۱۲ مربع کلو میٹر کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس پناہ گاہ کو جو پہلے سونار پور پناہ گاہ کے نام سے موسوم تھی، اب ایک دلکش تفریح گاہ کی حیثیت سے ترقی دی جا رہی ہے۔ وہاں جلد ہی جیپ گاڑیوں، ریسٹ ہاؤس، ہاتھیوں اور دیگر جدید قسم کی ہوٹلوں کا بندوبست کیا جائے گا۔

شمالی کھیری، ہلدوانی اور ترائی بھابر میں پائے جانے والے گوندھرا کی نسل تیزی سے نابید ہوتی جا رہی ہے جس کا سبب

جنگلات کی کٹائی، بھرپور کاشت اور اندھا دھند شکار ہے۔ اتر پردیش کے محکمہ جنگلات کے افسران اس نسل کو فنا ہونے سے بچانے کے لئے سرگرم اقدامات کر رہے ہیں۔

اعلیٰ دفاع فنڈ میں گزشتہ ۴ مئی تک تقریباً ۳۔۷۔۵ کروڑ روپے کی رقم جمع ہو گئی تھی جو ۱۹۶۲ء میں دفاع فنڈ کے عطیات کی مجموعی رقم تقریباً ۷ء۲۵ کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہے۔

میرٹھ ڈویژن نے ۵۳۰۱۰۹۷ روپے جمع کرکے پہلا مقام حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد ترتیب وار روہیلکھنڈ ڈویژن نے ۵۲۷۴۴۷ روپے، گورکھپور ڈویژن نے ۵۱۲۴۳۱۳ روپے، آگرہ ڈویژن نے ۳۹۸۶۱۹۵ روپے، لکھنؤ ڈویژن نے ۳۲۳۲۷۴۲ روپے، فیض آباد ڈویژن نے ۳۵۷۴۸۵ روپے، کماؤں ڈویژن نے ۲۷۳۸۳۳۲ روپے، وارانسی ڈویژن نے ۲۶۷۸۶۱۵ روپے، جھانسی ڈویژن نے ۲۳۱۱۵۷ روپے، الٰہ آباد ڈویژن نے ۱۷۷۱۶۴۳ روپے اور گڑھوال ڈویژن نے ۱۷۶۰۸ روپے جمع کیے۔

کماؤں ڈویژن نے فی کس ۴۹ روپے عطیہ دے کر پہلا مقام حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرا مقام میرٹھ ڈویژن نے تیسرا روہیلکھنڈ ڈویژن نے اور چوتھا مقام جھانسی ڈویژن نے حاصل کیا جہاں فی کس عطیہ کی رقم بالترتیب ۷۶ روپے، ۷۲ روپے اور ۵۴ روپے ہوئی۔

ریاست کے امداد باہمی ڈویژن نے فنڈ کے لیے ایک کروڑ روپے کی رقم جمع کی۔ اس کے علاوہ اتر پردیش شہری کونسل نے وزیر اعلیٰ دفاع فنڈ کے لیے ۱۵ لاکھ روپے جمع کیا ہے۔

وزیر اعلیٰ دفاع فنڈ میں دس اضلاع نے سب سے زیادہ رقم جمع کی ہے جن کے نام مع رقم درج ذیل ہیں:۔

میرٹھ ۲۳۳۸۱۵۷ روپے، بستی ۱۹۰۷۵۵۱ روپے، بدایوں ۱۷۹۳۵۰۰ روپے، گورکھپور ۱۷۰۹۰۰۰ روپے، بریلی ۱۶۵۹۱۲۸ روپے، نینی تال ۱۵۷۵۲۳۲ روپے، مظفر نگر ۱۵۵۰۰۰۰ روپے، علی گڑھ ۱۴۸۰۹۳۹۰ روپے، سہارنپور ۹۲۲۲۳۷۵ روپے اور دیوریا ۱۲۱۸۹۹۲ روپے۔

ریاستی حکومت نے عوام کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ایسے پیمائشی فیتوں کو تیار کرنے، فروخت کرنے یا استعمال کرنے سے احتراز کریں جن پر انچوں کے یا انچ اور میٹرک پیمائش دونوں کے نشانات لگے ہوں کیوں کہ یہ غیر قانونی ہے۔ ایسے پیمائشی فیتوں کی تیاری یا استعمال "معیاری اوزان اور پیمائش ایکٹ ۱۹۵۶ء" اور "اتر پردیش وزن اور پیمائش ایکٹ ۱۹۵۹ء" کی دفعات کی خلاف ورزی ہے اور خلاف ورزی کرنے والے پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔

ریاستی حکومت کے وزن اور پیمائش افسروں سے جائز لیسنس حاصل کیے بغیر پیمائشی فیتوں کا کاروبار بھی مذکورہ بالا ایکٹ ۱۹۵۹ء کی دفعات کے خلاف ہے جو ایک قابل سزا جرم ہے۔ چنانچہ بیوپاریوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے متعلقہ حلقے کے وزن اور پیمائش کے اسسٹنٹ کنٹرولر سے لیسنس حاصل کریں۔

متفرقات

صنعتی انجینئرنگ میں پوسٹ ڈپلوما کورس۔ ریاستی حکومت نے سرکاری پالی ٹیکنیک، مرزاپور میں آئندہ تعلیمی سال سے صنعتی انجینئرنگ کا ایک سالہ پوسٹ ڈپلوما کورس شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ کورس صنعتی پیداوار میں اضافہ کرنے اور توسیع پذیر صنعتوں کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کرنے کے پیش نظر اہل انجینئروں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کورس میں ابتداً دس امیدواروں کا داخلہ کیا جائیگا۔ اس کے لیے سال رواں کے واسطے ۱۰۸۶۰۰ روپے کا بندوبست

کیا گیا ہے۔

ہوائیہ کے تین جوانوں کو نقد انعامات۔ حالیہ ہند پاک جنگ کے دوران غیر معمولی بہادری کا مظاہرہ کرنے والے ہندستانی ہوائیہ کے تین فوجیوں کو تین ہزار روپے فی کس کی شرح سے نقد انعامات دیے جائیں گے۔ ان فوجیوں کو ویرچکر کے اعزاز سے بھی نوازا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کو ویرچکر کا اعزاز بعد از مرگ دیا گیا ہے۔

انعامات پانے والوں کے نام یہ ہیں۔ فلائٹ لفٹیننٹ آر۔ اے۔ میسی (الہ آباد)، فلائٹ لفٹیننٹ جے۔ پی گلانی (دہرہ دون) اور فلائٹ لفٹیننٹ ایں تگر یجا۔ فلائٹ لفٹیننٹ تگریجا کا انعام شری متی ایم۔ ایم۔ سنگھ (سہارنپور) کو دیا جائے گا۔

اخبارات کے خلاف کارروائی۔ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ اے کے تحت سن ۱۹۷۱ء میں جن ۷ اخبارات کے خلاف فرقہ واریت پھیلانے کے سلسلے میں کارروائی کی گئی تھی، ان میں سے ۴ اخبارات اردو کے ہیں۔

یہ اطلاع وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی نے ودھان سبھا کے سوالات کے وقفہ میں ایک سوال کے جواب میں دی۔

★

کلام انیس میں تغزل —— (صفحہ ۴۱ کا بقیہ)

نہ بچا تارِ نفس خلق میں جینے کے لیے — چاک زخموں کے فقط رہ گئے سینے کے لیے

بیتاب ہے دل صبر کا یارا نہیں مجکو — اب فصل بجز وصل گوارا نہیں مجکو

معشوق کے سوا کوئی پیشِ نظر نہیں — یہ شوق وصل ہے کہ کسی کی خبر نہیں

شادی نہیں رہتی ہے سدا غم نہیں رہتا — دُنیا کا کبھی ایک سا عالم نہیں رہتا

جو آیا ہے اک دن اُسے درپیش ہے چلنا — آگے کوئی پیچھے کوئی ہوتا ہے روانا

وقفہ کبھی دن کا ہے تو عرصہ کبھی شب کا — جب طے ہوئی منزل تو مکاں ایک ہے سب کا

مندرجہ بالا اشعار میں جتنی سادگی، سکون اور خاموشی ہے وہ ناقابل تردید ہے اور اس قسم کے بے شمار اشعار انیس کے کلام میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے: "دنیا میں جتنے شاعر استاد مانے گئے ہیں اُن میں ایک بھی ایسا نکلے گا: .... جس کا تمام کلام اوّل سے آخر تک حسن و لطافت کے اعلیٰ درجے پر واقع ہوا ہو۔ یہ خاصیت صرف خدا کے کلام میں ہو سکتی ہے"[1] اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ایک دوسرے مقام پر مولانا فرماتے ہیں کہ میر، درد، آتش، مصحفی، وغیرہ استادوں کے دیوان زیادہ تر بھرتی اور پُرکُن اشعار سے بھرے ہوئے ہیں۔[2] میر تقی میر کے ضخیم کلیات میں بقول مولانا عبدالحق "رطب و یابس"[3] بھرا ہوا ہے اور بقول مولانا آزردہ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند"[4] شعرا کی طویل فہرست میں ایک انیس ایسے شاعر دکھائی دیتے ہیں جن کے کلام پر نہ کہیں رطب و یابس کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ کہیں پستی، ابتذال یا عامیانہ پن کا پرتو اُس پر پڑا ہے۔ انیس کا یہ دعویٰ کہ "بھرتی سے کلام ہے معرّا میرا" من و عن درست ہے۔

کلام انیس ایک سمندر ہے جس کا طوفان اُمڈتا چلا جاتا ہے اور تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ ان کے کلام میں مد ہے جزر نہیں۔ معلوم ہوتا ہے خیالات، جذبات اور الفاظ و تراکیب کی ایک فوج ہے جو پرے باندھے اُن کے چشم و ابرو کے اشارے کی منتظر دست بستہ کھڑی ہے کہ کب آقا حکم دے اور کب تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔ مختصر یہ کہ ہم میر انیس کو کچھ نہیں تو کم از کم "سرتاج شعرائے اُردو" ضرور کہہ سکتے ہیں اور دنیا کے عظیم شاعروں میں اُنھیں شمار کر سکتے ہیں۔

---

[1] مولانا حالی: مقدمہ شعر و شاعری، ص۱۲۳ تا ص۱۲۴۔ [2] ایضاً ص۱۲۵۔ [3] مولانا عبدالحق: انتخاب کلام میر (مقدمہ) ص۱۹ [4] مقدمہ شعر و شاعری، ص۸۲

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

مصنف: پنڈت کیلاش نرائن کول بیدل دہلوی

تصورات بیدل

ناشر: دانش محل امین آباد لکھنؤ۔ قیمت۔ پانچ روپے

شاہ راہِ فن پر سمجھ بوجھ کر چلنا بجائے خود ایک مرحلہ ہے۔ اس بار میں خرد و جنوں کی بیک وقت ضرورت پڑتی ہے۔ فن کے مطالبات سمجھنے کے لیے خرد کی رہنمائی اور اظہار جذبات کے لیے جنوں کی کارفرمائی قریب قریب لازمی ہے۔ شدت احساس اگر مناسب و متوازن انداز بیان نہ پا سکے تو خارجی چمک دمک و مستعار خیالات، دل نشینی سے ہم آہنگ نہیں ہوتے اس راز کو پنڈت کیلاش نرائن کول بیدل دہلوی نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ اس قیاس کی وجہ ان کی وہ شاعری ہے جو تصورات میں جا بجا بکھری ہوئی ہے۔ اس کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف نام کے بیدل نہیں بلکہ ہجوم جذبات میں کبھی کبھی ایسا گم ہو گئے ہیں کہ جیسے وہ حقیقت منتظر یا صداقت جمال سے دوچار ہیں اور باوجود اس ربودگی و گم شدگی کے اظہار خیال کے لیے ساز و سامان کی درستی سے بے خبر نہیں ہوئے۔ جذبات کو اسی انداز میں پیش کیا ہے جو ان کا فطری تقاضہ تھا۔ ایسے مقامات پر آپ کو کبھی محسوس نہ ہوگا کہ الفاظ کی قبا خیال کی قامت سے سک گئی ہو۔ مثال کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جنوں لے چلا ہم کو یا ہم جنوں کو ۔ نہ وہ جانتا ہے نہ ہم جانتے ہیں
سنا کرتا ہوں میں خود اپنے افسانے ۔ قطرہ میں ہر شے میں شامل ہوں یہ کون جانے
ارے توبہ کیا کہہ گیا بیخودی میں ۔ الٰہی مرا راز دنیا نہ جانے

شدت جذبات نے جنوں میں کہہ تو دیا کہ "میں ہر شے میں شامل ہوں یہ کون جانے" پھر ہوش آیا دنیا کی کم مائیگی کا احساس ہوا اور فوراً خود کی زبان سے اظہار توبہ ہوا۔ یہ تو معرفت کی بات ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ذاتی شاعری نے اس طرح کہنے پر مائل کر دیا مگر اس کا کیا جواب ہے کہ جب ان کی انفرادیت ایک وسیع حقیقت دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتی ہے۔

کوئی پھول ہے جو نہ مرجھائے کھل کر ۔ خزاں سے نہ پوچھو بہاروں سے پوچھو

بہاروں سے اس انجام کا ثبوت طلب کرنا ذاتی مشاہدہ و انفرادی تفکر کا نتیجہ ہے۔ جس لب و لہجے میں ایسی باتیں بیدل صاحب ادا کرتے ہیں اس سے بہتر انداز بیان سوچنا مشکل ہے۔ یہ انداز فکر و بیان جہاں کہیں بھی راہ پا گیا ہے شعر نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔ مثلاً

مزا ہے ختم نہ ہو سلسلہ تصور کا ۔ وہ آ بھی جائیں ہمیں پھر بھی انتظار رہے
خود کو کھو دینا وحشت میں بس یہ تو سمجھ میں آیا ہے ۔ دنیا عصیاں اور روز جزا یہ سب افسانہ کیا سمجھا
معراج جنوں پر بالآخر تسکین جنوں ہو جاتی ہے
وحشت سے بھی وحشت ہوتی ہے اک ایسا زمانہ ہوتا ہے

خبر ہی نہیں آئی کب اور گئی کب ۔ پکارا کیے ہم جوانی جوانی

بیدل کی شعر گوئی کا انداز بیان کسی مفروضہ یا قیاس آرائی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی عملی تنقید کی تشریح ہے چنانچہ ایک جگہ خود رقم طراز ہیں کہ

کچھ نہ ہو شعر میں کہنے کی کوئی بات تو ہو ۔ شانِ الفاظ نہ ہو نظم خیالات تو ہو

شاعری میں ابلاغ و ترسیل جتنے اہم عناصر ہیں اتنی ہی ان کا بہتر برتاؤ بھی ہے۔ مفہوم کو واضح و دل نشین کرنے کے لیے تشبیہ و استعارہ کا سہارا لینا بظاہر آسان ہے مگر موقع و محل کے لحاظ سے ان کا استعمال اور صنائع و بدائع کی نزاکت و لطافت سے مفہوم کی وضاحت خوبصورتی سے دلوں تک پہنچانا اوگھٹ گھاٹ سے شہسوار کو نکال لے جانے سے کم نہیں۔ یہ وہی فن کاری ہے جس کو شاعرانہ مطالبات و حسن خیال کا صحیح مذاق حاصل ہو۔ تصورات بیدل میں ہمیں اس پہلو کی حسین تصویریں جا بجا نظر آتی ہیں جن کے دیکھنے سے یقین ہوتا ہے کہ فن کاری فکری کاوش نہیں فطرت کی ودیعت ہیں جن کو شاعر نے سمجھ کر فن شعر میں صرف کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

ابر سیاہ جھوم رہا ہے کہ اے فلک ۔ لہرا رہی ہے آہ کسی بیقرار کی
برق یقیں جو چمکی تو لے ذوق بے خودی ۔ ہم نے نقاب ہوش و خرد تار تار کی

رفتہ رفتہ میری کشتی تجھ کو ساحل ہو گئی ۔ ہوتے ہوتے آرزوئے بیدل دل ہو گئی

بیدل کا انداز فکر غالباً نتیجہ ہے اُن کی فکری صلاحیتوں کا۔ ان کے مجموعۂ کلام پر سرسری نظر ڈالنے والے کو بھی آسانی سے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو خیال کی ندرت و بیان کی رنگینی کی وجہ سے دل و دماغ کے لیے دلچسپی کا مرکز بن جاتے ہیں جن میں فکری عنصر بھی ہے اور فن کی تازگی بھی۔ یہ دونوں خوبیاں بیک وقت جہاں کہیں بھی حسن امتزاج سے پیش کی گئی ہیں وہ فنکار کے ریاض و حسن بیان کا ثبوت بن جاتی ہیں۔ ہماری مراد ایسے اشعار سے ہے مثلاً

آتے آتے رحمت حق پر یقین آ ہی گیا ۔ ہوتے ہوتے محتسب رندوں میں شامل ہو گیا
کیا خبر کس سے کہتا پھرتا یہ اسرار عشق
آپ نے اچھا کیا بیدل کو دیوانہ کیا
نقطۂ معنی کی بہاروں کی ہے بیدل کیوں تلاش
مدتیں گزریں کہ وہ غالب کا دیواں ہو گئیں
جدائی کی راتیں گزاری ہیں کیسے ۔ قسم دے کے تم چاند تاروں سے پوچھو

ان تمام خوبیوں کے دیکھنے کے بعد ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ تصورات بیدل نہ تو خیالی باتوں کا مجموعہ ہے، نہ روایات کا مرقع ہے بلکہ ایک ذہین فن کار و باخبر شاعر کا قابل قدر مجموعہ ہے جو اپنی خوبیوں کے بل بوتے پر اہل نظر سے داد طلب ہے اور باوجود قحط الرجال کے اردو کی دنیا میں ابھی ایسے قدرشناس بفضلہ باقی ہیں جو ایسے پاکیزہ کلام کو فرض منصبی سمجھ کر دل سے داد دیں گے۔

——— مبصر: ڈاکٹر اعجاز حسین

آب و سراب (مثنوی)

مصنف : جمیل مظہری ۔ ناشر : مکتبۂ ارتقا ١٥ اسی صندل اسٹریٹ کلکتہ نمبر ١٦
قیمت : ١٠ روپے ۔

جمیل مظہری صاحب اختر شیرانی، جوش اور فراق کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ مگر ابھی ان کی شاعری کے سوتے خشک نہیں ہوئے ہیں۔ آج بھی ان کا فن ارتقا پذیر ہے ۔ مثنوی آب و سراب ١٩٦٠ء میں لکھی گئی اور پہلے "اردو ادب" میں (شمارہ ٤، ١٩٦٣ء) شائع ہوئی ۔ اب کتابی شکل میں منظر عام پر آئی ہے (جولائی ١٩٧٠ء)۔

یہ مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں ہے اور بقول شاعر اس کے مندرجہ ذیل اشعار سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے ؂

کیا شکوہ عجز پری نہ سمجھے — افسوس کہ آدمی نہ سمجھے
یہ قطرۂ بحر کبریائی — دریا ہے جو ہوئے آشنائی
دم دھاگے میں رشتۂ نفس کے — پھندے میں پڑا ہے پیش و پس کے

یہ اشعار اس مثنوی کے فکری پس منظر کو ظاہر کرتے ہیں ۔ شاعر نے اس میں عرفان حقیقت کو اپنا موضوع بنایا ہے ۔ اس نے ان تمام فلسفوں، نظریات اور عقائد کا جائزہ لیا ہے جن کے ذریعے انسان اب تک حقیقت کی تلاش کرتا رہا ہے اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ خود شناسی کے ذریعے ہی حقیقت کا عرفان ممکن ہے ۔

آب و سراب نہ صرف جمیل مظہری کا اہم ترین کارنامہ ہے، بلکہ ڈاکٹر محمد حسن کے الفاظ میں اس دہائی کی بھی اہم ترین تخلیق ہے ۔ امید ہے کہ اس کتاب کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی ۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؂

جب تک نہ کرے گی آدمیت — فطرت کے خلاف اک بغاوت
اس وقت تلک یہ پیکر خاک — مجبور رہے گا زیر افلاک
سب مل کے بعزم جنگ یکسر — برپا کرو اک جہاد اکبر
ہر سانس میں عزم فاتحانہ — ہر سانس میں جنگ کا ترانہ
میلان سے اپنے اک لڑائی — رجحان سے اپنے اک لڑائی
ہر جذبۂ خام کو کچل دو — فطرت کا مزاج ہی بدل دو

——— فضل امام نقوی

خواجہ میر درد: تصوف اور شاعری

مصنف : ڈاکٹر وحید اختر ۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ ۔ (مارچ ١٩٧١ء) قیمت : پندرہ روپے ۔ سائز : ٢٢×١٨ ضخامت : ٥٠٣ صفحات ۔

یہ کتاب دراصل ڈاکٹر وحید اختر شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا فلسفہ میں پی ۔ ایچ ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے منظور شدہ تحقیقی مقالہ ہے جو کافی اضافے کے ساتھ موجودہ شکل میں شائع ہوا ہے ۔

مصنف نے مقدمہ میں جو تقریباً ٥٠ صفحات پر مشتمل ہے خواجہ میر درد کے حالات زندگی، شخصیت اور تصانیف وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے ۔ چار ابواب پر مشتمل کتاب کے حصہ اول میں تصوف کے مختلف مکاتیب اور درد کے نظریات تصوف کو کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ۔ حصہ دوم میں درد کی شاعری سے بحث کی گئی ہے ۔ یہ حصہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے ۔ نواں باب میر درد کے تلامذہ کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں فہرست کتابیات شامل ہے ۔

خواجہ میر درد کے نظریات تصوف اور کلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضخیم کتاب بیحد مفید ہے ۔ البتہ چند امور کی جانب توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

١۔ اگر کتاب میں اشاریہ بھی شامل کر دیا گیا ہوتا تو اس ضخیم کتاب کی افادیت اور بڑھ جاتی ۔
٢۔ فہرست کتب کو حروف تہجی کے اعتبار سے دینا مناسب ہوتا ۔
٣۔ خواجہ میر درد کے حالات زندگی بیان کرنے میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے ۔
٤۔ مقدمے میں بہت سے مفید امور کو محققانہ طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر وحید اختر کے حسب ذیل دو بیان قابل غور ہیں ۔

(الف) "مختلف تذکروں میں درد کا سن وفات مختلف دیا گیا ہے" (ص ٣٣)
(ب) "تمام تذکرے اس بات پر صاد کرتے ہیں کہ درد نے اپنے وصال کا جو سال متعین کیا تھا اسی سال وہ ٦٦ برس کی عمر میں راہی بقا ہوئے" (ص ٤٢)

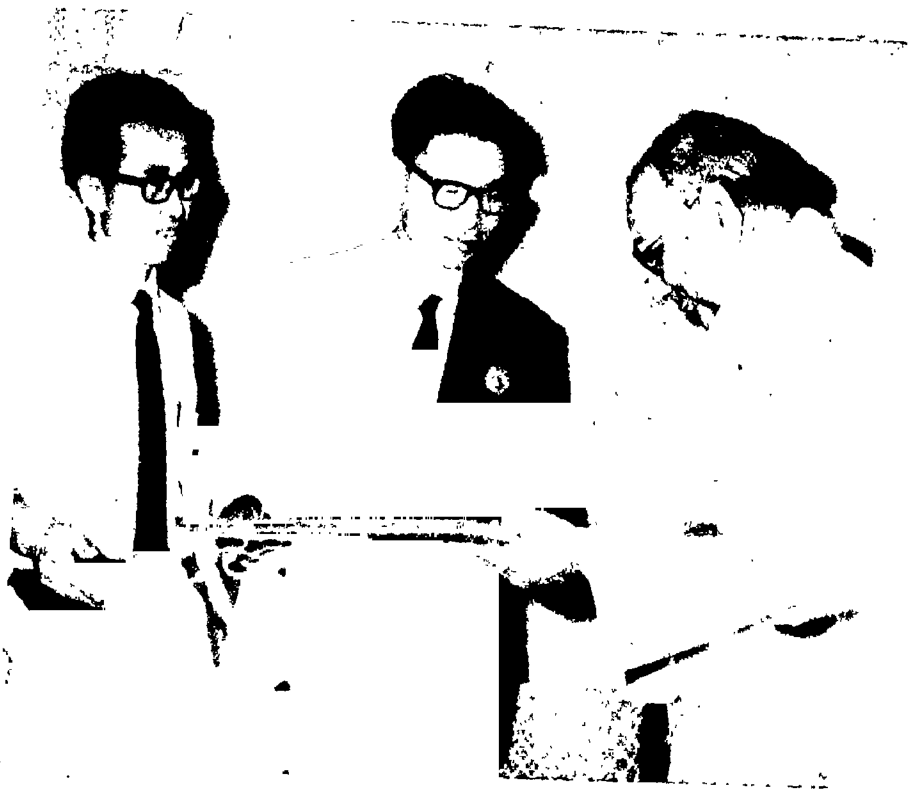
یہ دونوں بیان واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں اس کے علاوہ ڈاکٹر وحید اختر نے اپنی اس کتاب میں آب حیات کی بنا پر محمد حسین آزاد کے اس قول کی نشاندہی فرمائی ہے کہ خواجہ میر درد کا انتقال ٦٨ برس کی عمر میں ہوا ۔ مزید برآں موصوف نے دیوان درد مرتبہ بیدار مطبوعہ لکھنؤ ١٢٧١ھ سے ایک قطعہ تاریخ بھی نقل کیا ہے جس کی رو سے درد کی وفات ٦٨ سال کی عمر میں ہونا قرار پاتا ہے ۔ ایسی صورت میں یہ متعین نہیں کیا جا سکتا کہ درد کا سن وفات کیا تھا ۔

بہرحال ان کمیوں کے باوجود وحید اختر صاحب کی یہ کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ انہیں اس موضوع کو مبارکباد دی جائے اور شعر و ادب کے شائقین کے لیے یہ کتاب دلچسپ و مفید ثابت ہوگی اور درد کے کلام کو سمجھنے اور پرکھنے میں اس سے بڑی مدد ملے گی ۔

——— کاظم علی خاں

★

REGD. No. L. 319



[illegible] شمالی کوریا کے قونصل جنرل مسٹر [illegible] [illegible] کو [illegible]
کو [illegible] کی تصویر پیش کر رہے ہیں

آزادی کی پچیسویں (۲۵) سال گرہ

(اسپیشل نمبر اگست ۱۹۷۲ء)

28 (S)





شہید وطن کی یادگار (لکھنؤ)

ایڈیٹر : خورشید احمد

پبلشر : ... ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات، اترپردیش

... ... ورکنگ و ... یو۔ پی

مطبوعہ : ... پریس ... باغ۔ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات، اترپردیش

اس شمارے کے مضامین میں ... کا اظہار کیا گیا ہے ... حکومت ... سے ... متفق ...

میرے خوابوں کا ہندستان

میں ایک ایسے ہندستان کے لیے جدوجہد کروں گا جس میں غریب سے غریب آدمی بھی یہ محسوس کرے گا کہ یہ اس کا اپنا ملک ہے اور جس کی تعمیر و ترقی میں اس کی آواز کی بھی اہمیت ہے۔ اُس ہندستان میں عوام کے چھوٹے بڑے طبقے نہیں ہوں گے اور تمام طبقوں میں مکمل ہم آہنگی ہوگی۔ ایسے ہندستان میں چھوت چھات اور منشیات کی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ ہم چونکہ تمام دنیا کے ساتھ دوستی اور امن و امان کے ساتھ رہیں گے اس لیے نہ ہمارا استحصال ہوگا اور نہ ہم کسی کا استحصال کریں گے۔ ہماری فوج ممکن حد تک کم سے کم ہوگی۔ ایسے تمام ملکی و غیرملکی مفادات کا احترام کیا جائے گا جو کروڑوں بے آواز انسانوں کے مفادات کے منافی نہ ہوں گے۔ ذاتی طور پر ملکی اور غیر ملکی کے امتیاز سے مجھے نفرت ہے ——— یہ ہے میرے خوابوں کا ہندستان! ——— اس سے کم پر میں مطمئن نہیں ہوں گا۔

——— مہاتما گاندھی

ہم ایک آزاد ملک ہیں

جواہر لال نہرو

[حصولِ آزادی کے بعد سے اپنی زندگی تک ہر سال ۱۵ اگست کو شری جواہر لال نہرو لال قلعے سے قوم کو خطاب کیا کرتے تھے۔ ان کی یہ تقریریں آل انڈیا ریڈیو میں محفوظ کر لی گئی تھیں۔ پہلی تقریر جو انھوں نے ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو کی تھی اس کا اقتباس یہاں انھیں کے الفاظ میں پیش کیا جا رہا ہے۔]

آج ایک شبھ اور مبارک دن ہے جو سپنے ہم نے برسوں سے دیکھے ہیں، وہ کچھ ہماری آنکھوں کے سامنے آ گئے ہیں۔ چیز ہمارے قبضے میں آئی ہیں۔ دل ہمارا خوش ہوتا ہے کہ ایک منزل پر ہم پہنچے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ سفر ہمارا ختم نہیں ہوا۔ آئندہ بہت منزلیں باقی ہیں لیکن پھر بھی ہم نے ایک بڑی منزل پار کی اور یہ بات طے ہو گئی کہ ہندوستان کے اوپر کوئی غیر حکومت اب نہیں رہے گی۔

آج ہم ایک آزاد لوگ ہیں ——— آزاد ملک ہیں ...... ہمارا ملک آزاد ہوا۔ سیاسی طور پر ایک بوجھ جو غیر ملکی حکومت کا تھا وہ ہٹ گیا۔ لیکن آزادی بھی عجیب عجیب ذمہ داریاں لاتی ہے اور بوجھ لاتی ہے۔ اب ان ذمہ داریوں کا سامنا ہمیں کرنا ہے۔ اور ایک آزاد حیثیت سے ہمیں بڑھنا ہے اور اپنے بڑے بڑے سوالوں کو حل کرنا ہے۔

.... سوال ہمارے سارے عوام کی بہبود کے ہیں۔ ہمیں غریبی دور کرنا ہے، بیکاری دور کرنی ہے، معاملات کو دور کرنا ہے ..... آزادی محض ایک سیاسی چیز نہیں ہے۔ آزادی صحیح معنوں میں آزادی ہو سکتی ہے جب اس سے جنتا کو کوئی فائدہ ہو۔ آج کل ہمارے سامنے بہت سے معاشی اور اقتصادی سوال پیدا ہو رہے ہیں.... ہمارا فرض ہے کہ پورے طور سے ان سوالوں کو حل کرنے کی بھی کوشش کریں۔ لیکن ان سے پہلے ایک اور سوال ہے اور وہ یہ کہ ہمارے سامنے ملک میں امن ہو، شانتی ہو، آپس کے جھگڑے بالکل بند ہوں کیونکہ جب تک لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں تب تک کوئی کام معقول طریقے سے نہیں ہو سکتا۔ تو آپ سے میری پہلی درخواست یہ ہے کہ آج جو ہماری نئی گورنمنٹ بنی ہے اس نے بھی آج یہ پہلی درخواست ہندوستان سے کی ہے ..... وہ یہ کہ آپس کی یہ جو نا اتفاقی اور جھگڑے ہوتے ہیں یہ فوراً بند کیے جائیں کیونکہ آخر اگر نا اتفاقی ہے تو وہ بھی ان جھگڑوں اور مار پیٹ سے کس طرح حل ہوگی..... یہ باتیں آزاد لوگوں کو کچھ زیب نہیں دیتیں۔ یہ غلامی کی باتیں ہیں۔

ہم نے کہا کہ ہم اس ملک میں جمہوری حکومت چاہتے ہیں۔ جمہوری حکومت میں ڈیموکریسی میں اس طرح کی باتیں نہیں ہوتیں۔ جو سوال ہیں ہمیں آپس میں صلاح و مشورہ کر کے ایک دوسرے کا خیال کر کے حل کرنے ہیں، اپنے فیصلے پر عمل کرنا ہے۔

اس لیے پہلی بات تو یہی ہے کہ ہمیں فوراً اپنے اس قسم کے سارے جھگڑے بند کرنے ہیں اور فوراً ہی ہمیں وہ بڑے اقتصادی سوال اٹھانے ہیں جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ..... ہمیں سارے ملک میں بہت کچھ اقتصادی ترقی کرنا ہے، کارخانے کھولنے ہیں، گھریلو صنعتیں بڑھانی ہیں جس سے ملک کی دولت بڑھے اور وہ اس طرح نہ بڑھے کہ تھوڑی سی جیبوں میں چلی جائے بلکہ عوام کو اس سے فائدہ ہو.....

پھر سے میں آپ کو اس شبھ دن کی مبارکباد دیتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ ہماری ذمہ داریاں جو ہیں اس کے معنی ہیں کہ ہمیں آئندہ آرام نہیں کرنا بلکہ محنت کرنی ہے اور ایک دوسرے سے مل کر کام کرنا ہے۔ تبھی ہم اپنے بڑے سوالوں کو حل کر سکیں گے۔

جے ہند

پیغام

اس ماہ ہم ہندستان کی آزادی کی پچیسویں سال گرہ منا رہے ہیں۔ پچیس سال کا یہ زمانہ آزمائش اور کشمکش کا زمانہ رہا ہے۔ لیکن ہم نے کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں ہمارا ملک زیادہ طاقت ور اور زیادہ متحد ہی نہیں ہو گیا ہے بلکہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے اس کے ارادے اور بھی مستحکم ہو گئے ہیں۔

جمہوریت کا قیام عمل میں آچکا ہے اور اس نے اپنے وجود کو ثابت بھی کر دیا ہے۔ لیکن معاشی آزادی یعنی قوم میں معاشی خود اعتمادی پیدا کرنے اور عوام کی روزمرہ کی زندگی کو بہتر بنانے کا کام انجام دینا ابھی باقی ہے۔

افلاس اور نابرابری کو ختم کرنے کی جو مہم ہم نے شروع کی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ملک کے تمام لوگ اجتماعی حیثیت سے اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔ یہ عوام کا مصمم عزم اور بھرپور اشتراک و تعاون ہی تھا جس کی بدولت ہم کو سیاسی آزادی ملی۔ ہمارا نصب العین بالکل واضح اور غیر مبہم ہے۔ لیکن چونکہ کسی اور ملک نے اس طرح کے پیچیدہ حالات میں اتنا عظیم کام انجام نہیں دیا ہے اس لیے جیسے جیسے ہم آگے بڑھیں ہمیں اپنا راستہ خود متعین کرنا ہے اور ان تمام رکاوٹوں کے مقابلے کے لیے تیار رہنا ہے جو درپیش ہیں یا آئندہ پیش آئیں۔

آیئے ہم اس نئے سماج کی تعمیر میں خود اعتمادی اور ہمت و استقلال کو رفیق سفر بنائیں جس میں ہر شخص کو انصاف اور مساوی مواقع کی ضمانت دی گئی ہو، جہاں ہر شہری کو ترقی کرنے کا پورا پورا موقع ملے، جس میں تمام مرد اور عورتیں جمہوری نظام کو بروئے کار لانے میں برابر کے شریک ہوں اور اپنے ہم وطنوں کے تئیں اپنی ذمے داری کا پورا پورا احساس رکھتے ہوں۔

دستخط
اندرا گاندھی
وزیر اعظم

نئی دہلی
یکم اگست ۱۹۷۲ء

(انگریزی سے ترجمہ)

ادارۂ نیا دور

آزادی کی پچیسویں سال گرہ

کی تہنیت پیش کرتا ہے

اپنی بات

پندرہ اگست ۱۹۷۲ء کو ہماری آزادی کے ۲۵ سال پورے ہو رہے ہیں اور ملک بھر میں ۲۵ ویں سالگرہ کا جشن منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی طے پایا ہے کہ جشن سالگرہ کا سلسلہ سال بھر جاری رہے گا۔ ہم جس آزادی کی پچیسویں سالگرہ منا رہے ہیں وہ بڑی مشکلات، پریشانیاں اور تکلیفیں جھیلنے اور قربانیاں دینے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ آزادی کی راہ میں جو قربانیاں دی گئیں وہ جان و مال، گھر بار اور عزت و وقار سبھی طرح کی تھیں اس لیے مشکلوں سے حاصل کی ہوئی اپنی آزادی کا جشن بھی ہم نے شایان شان طریقے سے منایا اور آج جب کہ اس آزادی کو ربع صدی کا عرصہ گزر چکا ہے ہم پچیسویں سالگرہ کا جشن منا رہے ہیں۔ یہ جشن صرف رسمی نہیں ہے بلکہ ان ۲۵ برسوں میں ملک جن حالات و مشکلات سے گزرا، جن مصائب اور پریشانیوں کا اسے سامنا کرنا پڑا، جو مسائل درپیش ہوئے جس طرح کے چیلنج کا سامنا رہا، درحقیقت ان پر قابو پا کر ایک مستحکم تر قوم کی حیثیت سے ابھرنے اور عالمی برادری میں اپنا ایک ممتاز و باوقار مقام بنانے، ترقی کے سفر میں حیرت انگیز رفتار سے بڑھنے، اپنی دفاعی اور بہت سی دوسری ضروریات کے معاملے میں خود کفیل ہو جانے کی خوشی میں ہم یہ جشن منا رہے ہیں جو بالکل قدرتی ہے۔ اس لیے کہ ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ملک نے اس قلیل مدت میں اتنی ترقی کی ہو۔ اگر کوئی مثال ملے گی بھی تو نہ وہ ملک اتنا بڑا اور اتنا وسیع ہوگا، نہ اس کے مسائل اتنے پیچیدہ رہے ہوں گے اور نہ ان حالات میں اسے آزادی ملی ہوگی جن حالات میں ہندستان کو آزادی ملی۔ اس کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی کہ آزاد ہونے کے بعد ۲۵ سال کے عرصے میں کسی ملک پر چار بار مسلح حملہ ہوا ہو اور فوج کشی کی گئی ہو۔ یہ بھی ہمارا ہی کارنامہ ہے ہم نے ۱۹۴۷ء میں آزاد ہونے کے بعد سے ۱۹۷۱ء تک کے قلیل عرصے میں چار دفاعی جنگیں لڑیں اور چاروں مرتبہ ہمیں کامیابی حاصل ہوئی جس سے ہماری ساکھ اور بھی بڑھ گئی۔ اس لیے اپنی ۲۵ سالہ کامیابیوں اور ترقیوں پر خوش ہونا اور جشن منانا بالکل فطری ہے

اس موقع پر ان ہزاروں افراد کی یاد آتی ہے جنھوں نے جدوجہد آزادی کے جرم میں قید و بند کی سختیاں جھیلیں، اپنے گھر بار، اثاثے اور جائداد سے ہاتھ دھویا، مرتے مر گئے مگر آزادی کی جدوجہد کے پرچم کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ یہ انھیں کے ایثار و قربانی، عزم مصمم اور اٹل ارادے کا نتیجہ ہے کہ ملک آزاد ہوا۔

اب ہمارے کام کرنے کی باری ہے۔ ہم نے اپنے لیے سوشلزم کا راستہ اختیار کیا ہے اور اسی راستے پر گامزن ہو کر ملک کو خوشحالی اور خود کفالتی کی منزل تک لے جانا ہے، ملک سے غریبی اور نابرابری کو دور کرنا ہے۔ مرکز اور ریاست دونوں کی حکومتیں اس مقصد کے سلسلے میں کئی پروگرام مرتب کر رہی ہیں لیکن یہ تنہا حکومت کے کرنے کا کام نہیں ہے اس کے لیے ہم سب کو مل کر [illegible]

[illegible]

کرنا ہے۔ اسی کے ساتھ ملک میں [illegible] یہ قرار دیا ہے کہ ہم سکون کے ساتھ اپنے مقصد کو حاصل کر سکیں گے۔ اس لیے آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر ہم نے پھر عہد کر لیا کہ ملک سے افلاس و جہالت اور نابرابری کو دور کرنے کا جو خواب ہم نے بنایا ہے اسے پورا کرنے کے لیے اسی جوش، اسی لگن، اسی عزم و [illegible] اور اسی [illegible] سے کام کریں گے جس جوش و خروش اور انہماک سے ہمارے بزرگوں نے حصول آزادی کے لیے کام کیا تھا۔

ہندوستان کی آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے مبارک موقع پر نیا دور کا خصوصی نمبر شائع ہونے والا تھا، [illegible] ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس نمبر کو [illegible] نہیں [illegible] ہو سکا۔ اس کی وجہ صرف وقت کی کوتاہی ہے۔ ہمارے پیش نظر اس نمبر کو بہر قیمت وقت پر شائع کرنا تھا [illegible] مضامین وغیرہ جو ہمیں موصول ہوئے تھے اس میں شامل کرنا ممکن نہیں [illegible]۔ جب وقت پر [illegible] مضامین اور نظمیں وغیرہ جو ہمیں موصول ہوئی تھیں روک لینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ [illegible] آزادی کی [illegible] سال [illegible] کا سلسلہ سال بھر جاری رہے گا۔

اس نمبر کے [illegible] کی ترتیب کے سلسلے میں [illegible] مضامین وغیرہ بہت تاخیر سے موصول ہوئے اور جب اس کو [illegible] گیا کہ [illegible] کو بہر قیمت وقت پر شائع [illegible] کیا گیا۔ جیسے جیسے مضامین وغیرہ آتے جاتے ان کی کتابت اور ساتھ ہی ساتھ طباعت بھی ہوتی [illegible]۔ [illegible] ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات [illegible] ترتیب [illegible] نکالا کسی حیثیت سے [illegible] نہ ہو گا۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ ملک کے بعض [illegible] تعاون حاصل نہ ہو سکا۔ ان میں کچھ حضرات نے ہماری استدعا پر وقت کی تنگی کا گلہ فرماتے ہوئے معذرت کی [illegible]۔ [illegible] اعتراف ہے کہ ان حضرات کی مصروفیات کے لحاظ سے یقیناً وقت بہت کم تھا۔ بہر حال ان کی خدمت میں ہمیں [illegible] کا سلسلہ جو [illegible] جاری رہے گا اس کے لیے اب وہ اپنی نگارشات اور شعری تخلیقات عنایت فرمائیں۔

آخر میں ہم ان ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ [illegible] سمجھتے ہیں جنہوں نے باوجود اپنی مصروفیت کے نیا دور کے اس نمبر کے لیے خصوصی مضامین اور نظمیں عنایت کیں۔ جن کرم فرماؤں نے وعدے کیے اور ایفائے وعدہ نہ کر سکے ان سے شکایت نہیں البتہ گزارش ہے کہ اب سے ہمیں شکر گزار ہونے کا موقع دیں۔

— احمد [illegible]

دولتِ سیمیں

شمیم کرہانی

نظر نظر کو مبارک ہو یہ عظیم سحر
جو ظلمتوں کے قفس سے گزر کے آئی ہے
کرن کرن پہ ہے مہرِ تبسمِ ابدی
کہ مقتلِ شہدا سے نکھر کے آئی ہے
سیاہ خانۂ جمہورِ وقت کی قندیل
فرازِ دار و رسن سے اُتر کے آئی ہے

سحر کے نام سے دل جس کو یاد کرتا ہے
وہ جامِ سرخ ہے رندانِ تشنہ لب کے لیے
برائے چہرۂ عالم ہے بوسۂ اخلاص
تو حرفِ نرم ہے بیمارِ نیم شب کے لیے
جو قید خانۂ ماضی سے پھوٹ نکلا ہے
وہ زندگی کا اُجالا ہے اور سب کے لیے

خدا کرے کہ اُفق کی یہ دولتِ سیمیں
جہاں میں صورتِ کیفِ شراب اور بڑھے
زمین پیار کی شبنم سے بھیگتی جائے
سکوں کی نیند، محبت کا خواب اور بڑھے
نگاہِ بد سے رہے دور صبحِ آزادی
جمال اور فزوں ہو شباب اور بڑھے

اندھیرے سے اُجالے تک

ہندوستان کی صد سالہ جنگِ آزادی سے متعلق تمثیلی منظومیہ

نازش پرتاب گڑھی

پہلی آواز ———————— خوف و ہراس و اضمحلال
دوسری آواز ———————— جرأت و عزم و استقلال

پہلی آواز:

سرمئی شام بکھرتی ہی چلی جاتی ہے
روشنی ہانپتی مرتی ہی چلی جاتی ہے
آرزو حبس کے عالم میں گھٹی جاتی ہے
دل میں اندیشے سماتے ہی چلے جاتے ہیں
اجنبی خوف ڈراتے ہی چلے جاتے ہیں
ٹہنیاں پیروں میں زنجیر سی پہنانے لگیں
جھاڑیاں بھوت سے کچھ بڑھ کے نظر آنے لگیں
پتیاں تالی بجاتی ہیں کہ دیوانہ ہے
جب تو یہ بھی نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے
لو کہ رات آ گئی ظلمت میں نظر ڈوب گئی
سینۂ شب میں ہر اک راہ گزر ڈوب گئی
رات آئی تو سبھی نیند میں مدہوش ہوئے
ولولے سرد ہوئے حوصلے خاموش ہوئے
سخت ہے رات، مناسب ہے کہ جھک جائیں ہم
تن بہ تقدیر اسی موڑ پہ رک جائیں ہم

دوسری آواز:

سخت ہے رات یہ مانا، مگر اتنی بھی نہیں
کہ چمکنے ہی نہ پائے کسی تارے کی جبیں
ہم جو ٹھہریں گے تو سامانِ سفر کھو دیں گے
ہم جو دم لیں گے تو ارمانِ سحر کھو دیں گے
عقل سے دور ہے ظلمت کے تھپیڑے سہنا
بہتر یہ نہیں تقدیر کو روتے رہنا
حوصلے راہ کی ظلمت سے کہاں ڈرتے ہیں
ولولے سختیِ ماحول سے کب مرتے ہیں
روشنی رات کے پردوں میں نہیں رک سکتی
زندگی موت کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی

لو کہ نومیدی کے عالم میں سہارا جاگا
رات کی گود میں وہ ایک ستارا جاگا

پہلی آواز

لیکن اس ایک ستارے کی حقیقت کیا ہے
آنکھیں رکھتے ہو تو دیکھو کہ یہ ظلمت کیا ہے

دوسری آواز:

یہ بھی کیا کم ہے کوئی لے کے اجالا تو اٹھا
کوئی اس رات کو للکارنے والا تو اٹھا
صرف مبہم سا اشارہ بھی بہت ہوتا ہے
ایک تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے
زندگی کرتی ہے جانبازیِ شمع کو سلام
روشنی کرتی ہے اس پہلے ستارے کو سلام

ہماری پہلی جنگِ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء

شمارہ ۱۹۵۷ء

پہلی آواز:

وہ ستارا تو اندھیرے میں کہیں ٹوٹ گیا
ہاتھ سے دامنِ امید و یقیں چھوٹ گیا
ہر نفس ماہ نئی ہوتی چلی جاتی ہے
رات کچھ اور گھنی ہوتی چلی جاتی ہے

دوسری آواز:

کھو گیا سینۂ شب میں وہ ستارا لیکن . . .

پہلی آواز:

اب اُجالے کا تصور بھی نہیں ہے ممکن
صرف سہمے ہوئے سنّاٹے، بھیانک سائے
کوئی جگنو بھی پرافشاں ہو تو وہ مرجائے
ظلمتیں اتنی گھنیری ہیں کہ دل ہلتے ہیں
رات کے پاس اُجالے بھی کہیں ملتے ہیں؟

دوسری آواز:

زندگی نور کو جس لمحہ صدا دیتی ہے
رات خود چاند ستاروں کو جگا دیتی ہے

. . . .

آخرِ کار ستاروں کی نگاہیں جاگیں
مشعلیں چونک اٹھیں سوئی ہوئی راہیں جاگیں
ساتھیو! چلتے رہو، ہم سفرو! آگے بڑھو
رہروو! جاگ اٹھو، راہ گرو! آگے بڑھو
دوستو! مژدۂ ہنگامِ سحر آیا ہے

پہلی آواز:

کہاں آیا ہے؟ کب آیا ہے؟ کدھر آیا ہے؟
ہاتھ میں جتنے بھی ہاتھ آئے وہ سب چھوٹ گئے
تارے کچھ دیر چمکتے رہے ــــ پھر ٹوٹ گئے
ان ستاروں سے مداوائے الم ہو نہ سکا
رات کا ظلم تو کسی طرح بھی کم ہو نہ سکا

دوسری آواز:

تیرگی نور کے دھاروں پہ کبھی چھا نہ سکی
موت سے کھیلنے والوں کو اجل پا نہ سکی
بیج مٹتا ہے کہ ہو کوئی شجر تر پیدا
تارے بجھتے ہیں کہ ہو مہرِ منور پیدا
یہ بھی تسلیم، بہت سخت اندھیرا ہے ابھی
یہ بھی تسلیم کہ دکھ درد کا گھیرا ہے ابھی
لیکن ــ اب رات کے سینے میں کھٹک کیسی ہے
دیکھو، وہ دیکھو افق پر ــ وہ چمک کیسی ہے
چاند ہے ــ مملکتِ نور و تجلی کا سفیر
آخرش جاگ اٹھی ذوقِ عمل کی تقدیر
مشعلیں تیز کرو راہیں چمکتی جائیں
ظلمتوں سے یہ کہو دور سرکتی جائیں
چاند کو اٹھ کے سحر بار بنا دو یارو
رات کو موت کا پیغام سنا دو یارو

پہلی آواز:

چاند پر بھی تو وہی ابرِ سیہ دوڑ آیا
پھر وہی رات، وہی گہرا گھنیرا سایا
پھر وہی فکر کہ انجامِ سفر کیا ہوگا
کوئی رہبر نہ کوئی راہگزر ــ کیا ہوگا
اور گہری ہوئی، کچھ اور بھی گہری ہوئی رات
اور اک بار اُجالے کا مقدر ہوئی مات

دوسری آواز:

خیر ہم ہار گئے، خیر کوئی جیت گیا
پھر بھی اس دور کا کیا ذکر کہ جو بیت گیا
دل سے ناکامی کا احساس مٹا دیتا ہے
وقت ہر تلخیِ ماضی کو بھلا دیتا ہے

[illegible] ۔ آزادی کی پہلی جدوجہد ۔ [illegible] ۔ "ہندوستان چھوڑ دو" کی عوامی تحریک

شرار نو [illegible]

۱

موج دیتی ہے جو کوئی تو اُچھلنے کے لیے
ٹھوکریں کھاتا ہے انسان سنبھلنے کے لیے

پہلی آواز:

لیکن اب آس تو مرتی ہی چلی جاتی ہے
رات کی زلف بکھرتی ہی چلی جاتی ہے

دوسری آواز:

رات کی زلف بکھرتی ہے بکھر جانے دو
درد اگر حد سے گزرتا ہے، گزر جانے دو
یہی دستور ہے فطرت کا، کہا جاتا ہے
موت سے قبل سنبھالا بھی لیا جاتا ہے
رات کچھ اور بھی بہکے گی، سنک جائے گی
آتشِ درد ابھی اور بھڑک جائے گی
اشکِ شب رنگ و سیہ تاب چھلک جائے گا
قافلہ اجنبی راہوں پہ بھٹک جائے گا
تیرگی اور بھی ماحول پہ چھا جائے گی
رات ہم سب کی رگ و پے میں سما جائے گی
اور پھر رات کے چہرے پہ چمک آئے گی
ظلمتِ شب کی قبا کھل کے ڈھلک جائے گی
تیرہ ماحول کے ماتھے سے کرن پھوٹے گی
قیدِ ظلمات سے ایک ایک نظر چھوٹے گی
یہ جو پیروں میں ہے زنجیرِ سیہ ٹوٹے گی
رات کی زلفیں سمٹتی ہی چلی جائیں گی
ظلمتیں راہوں سے ہٹتی ہی چلی جائیں گی
اک کرن آئے گی، ناچے گی، کھنک جائے گی
صبح ہو جائے گی، پازیب چھنک جائے گی

پہلی آواز:

کون جیتا ہے مگر زلف کے سر ہونے تک

دوسری آواز:

فاصلہ کچھ بھی نہیں رات سے سحر ہونے تک
حوصلے زندہ رکھو، شوق کو ہمسفر کرو
جوشِ دل تیز کرو، تیز کرو، تیز کرو
رات کے پاس ستم ہے، ظلم سہی، جور سہی
پینے والا ہو تو پھر زہر کا بھی دور سہی
ایک دو لمحہ یہ اشکوں کی جھڑی اور سہی
صبح کے واسطے غم کی یہ گھڑی اور سہی
رات خود اپنے اندھیروں ہی میں کھو جائے گی
صبح تو ہوتی ہے اور صبح تو ہو جائے گی

پہلی آواز:

صبح ہو جائے گی! آتا ہی نہیں دل کو یقیں
نور بھی سینۂ شب ہی میں نہ کھو جائے کہیں
تیرگی اور بھی اک بار نظر چھین نہ لے
ڈر رہا ہوں، کوئی یہ خوابِ سحر چھین نہ لے
پا بہ زنجیر اُجالوں کی سواری نہ رہے
رات کی لاش کہیں صبح پہ بھاری نہ رہے

دوسری آواز:

تیرگی اپنی جگہ صبح کو دے جائے گی
رات کی لاش تو خود رات اٹھا لے جائے گی

. . . .

سر[1] اٹھا کر فضا زیست سے معمور ہوئی
پو پھٹی، صبح ہوئی، ظلمتِ شب دور ہوئی
روشنی رات کے پردوں سے ابھر ہی آئی
زندگی موت کو ٹھکرا کے گزر ہی آئی
تارے جو ڈوبے تھے، انوارِ سحر بن کے اٹھے
خون کے قطرے گرے اور گلِ تر بن کے اٹھے
موجۂ زیست کی رفتار پہ قابو نہ ملا
رات کو صبح کی للکار پہ قابو نہ ملا
قید بھی جرأتِ پروانہ کو جھٹلا نہ سکی
تیرگی نور کے اعجاز کو جھٹلا نہ سکی
قسمتِ زیست فقط حبس و غلامی تو نہیں
رات تاریک ہو [illegible] دوامی تو نہیں

---

[1] ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء یوم آزادی

بہارِ آزادی

سور واحدی

بہار نام نہیں عیش و کامرانی کا — بہار نام ہے تعمیرِ زندگانی کا
بہار زندہ ہے گاندھی کی آبیاری سے — بہار فیض ہے نہرو کی باغبانی کا
بہار رمز ہے قدوائی کی دیانت کا — بہار ذکر ہے جوہر کی جانفشانی کا
بہار نام ہے اوراقِ زندگانی پہ — شکستہ خامۂ آزاد کی روانی کا
بہار تازہ ہے راجندر کی ریاضت سے — بہار جلوہ ہے مظہر کی نکتہ دانی کا
بہار یہ ہے کہ ہر رنگ کے چمن میں یوں پھول — چمن نمونہ ہو اندازِ گل فشانی کا

پچیس سال کا عرصہ بہت ہے جینے کو
فضا بتاتی ہے اقوام کے قرینے کو

یہ جشن سیمیں ہے اس دور کے عوام کا جشن — زمیں سے تا بہ فلک اس نئے نظام کا جشن
یہ جشن ملک کی اک خوش سلیقگی کا ظہور — یہ جشن اپنی حقیقت کے انتظام کا جشن
یہ جامِ جم کی حسیں محفلوں کا رقص نہیں — یہ جشن نغمہ گرانِ شکستہ جام کا جشن
یہ جشن کہنہ امارت کی سازشوں سے الگ — ہے زندگی میں غریبوں کی ایک شام کا جشن
یہ جشن وحدتِ ہستی کے اعتراف کے ساتھ — ہے امن و صلح کے پرچم کے اہتمام کا جشن
ابھی ہے دورِ محبت میں پختگی کا مقام — ابھی ہے جشن بھی دنیا کے ذوقِ خام کا جشن

ابھی تو چلتے ہیں لیکن بہکتے چلتے ہیں
ابھی تو قافلے والے بھٹکتے چلتے ہیں

یہ جشن وہ ہے کہ جس کا نہیں جواب کوئی — جلے ہے شب کے چراغوں میں انقلاب کوئی
یہ شہر باغ ہے حضرت محل کی یادوں کا — ہر ایک کوچہ ہے کھلتا ہوا گلاب کوئی
نظر نواز ہے دلی کی چاندنی بھی مگر — اودھ کی شام کا ملتا نہیں جواب کوئی
حسیں تصور ماضی نقوشِ مستقبل — یہ لکھنؤ ہے کہ ہے گومتی کا خواب کوئی
پیوں حرم کی کرنوں دیر کی مے رنگیں — دروں میکدہ مشکل ہے انتخاب کوئی
مجھے یقین ہے ہر آدمی کی نیکی کا — ہجوم شر سے نہیں مجھ میں اضطراب کوئی
پگھلتی جاتی ہے دیوار برف سرمایہ — نکلنے والا ہے شاید کہ آفتاب کوئی
تضاد قول و عمل کا ہے میکدہ کی شکست — الٹ کے جام کو پیتا ہے کب شراب کوئی

زمانہ اہلِ ادب کا مقام پوچھے ہے
یہ آپ کون ہیں ہر شخص نام پوچھے ہے

شجرِ نور

فضا ابن فیضی

نشانِ فتح ہے پندرہ اگست کا یہ دن
نئے نظام، نئے بند و بست کا یہ دن

یہ دن تو اک شجرِ نور ہے سحر زادہ
اسے لہو کی حرارت سے تم نے سینچا تھا
یہ ہنستی صبحوں کا منشور ہے قمر زادہ
جسے نڈھال شبوں کی تھکی جبینوں پر
خطِ شعاع کی صورت میں تم نے لکھا تھا

ہوئے پچیس برس، جب تمہاری دھرتی پر
یہ کاروانِ مہ و آفتاب اترا تھا
ہوئے پچیس برس جب تمہاری آنکھوں میں
یہ مست و سرخوش و دلدار خواب مہکا تھا

اُفق سنورتے رہے اور سحر دمکتی رہی
چراغ جلتے رہے، تیرگی جھجکتی رہی
زمین شب سے اجالوں کی فصل اُگتی رہی
کلی چٹکتی رہی زندگی مہکتی رہی
یہ میکدہ عہد کے جمہور کی نئی دنیا
نئے شعور کے قدموں کی چاپ سنتی رہی
جراحتوں کے خیاباں سے پھول چنتی رہی
دریدہ جسم رہی اور گیت بنتی رہی

بڑے شعور، بڑی آگہی سے لوگوں نے
مہکتے جاگتے خوابوں کی پاسبانی کی
خمار حد سے بڑھا تو نشہ کو چھلکایا
سوچی لے کے شراروں کی پاسبانی کی
صبا کو نذر کیا خوشبوؤں کا سرمایہ
بہار بن کے گلابوں کی پاسبانی کی
مگر یہ ایں ہمہ گل ریزی و حنا بندی
بہ وصفِ شوخیِ رنگیں و آرزومندی

کبھی کبھی بڑی شدت سے سوچتا ہوں میں
کہیں کہیں مرے ماحول کی جبینوں پر
خراشِ سوزِ جراحت کا یہ غبار ہے کیوں
نفس نفس میں وہی شعلہ کیوں تھکن سی ہے
قدم قدم پہ وہی حشر روزگار ہے کیوں

پچیس سالہ یہ "تقریبِ جشنِ آزادی"
کچھ اور دل کش و رعنا و کامراں ہوتی
کچھ اور لالہ چکان و رطب فشاں ہوتی
کچھ اور قند گلو، شہد جسم و جاں ہوتی
جو درمیاں میں نہ ہوتی فصیلِ کہنۂ شب
جو راستوں میں نہ ہوتی خلیج جور و ہوس
جو زندگی میں نہ ہوتی یہ قدر بغض و عناد

مرے قلم کے امینو! رفیقو! ہم نفسو!
کچھ ایسا راستہ سوچو، کچھ ایسا کام کرو
جو قلب و روح کے زخموں کو مندمل کر دے
وہ شعر لکھو جو اس دور کے تقاضوں کو
حسین و خوبرو لفظوں میں منتقل کر دے
وہ جذبہ ڈھونڈ کے لاؤ شگفتہ سینوں سے
جو رتِ وقت کو شعلوں سے مشتعل کر دے
دیارِ حق میں رنا نذکرو وہ اصلاحات
فسادِ ذہن و نظر کو جو مضمحل کر دے
جو زندگی کو سنوارے، نظر کو دل کر دے

شباب کروٹیں لے، نیند سے بدن جاگے
خمار ٹوٹے، نشہ چھلکے، انجمن جاگے
بہ قدرِ شوق چلے کاروبارِ ہم نفساں
غزل کی آنکھ کھلے، غمزۂ سخن جاگے
حدیثِ لطف کی خوشبو سے محفلیں مہکیں
نوائے گرم سے محرابِ فکر و فن جاگے

★

نیا لہو ملے تہذیب کی رگوں کو
بجھے بجھے ہوئے خوابوں کا بانکپن جاگے
نظر بھڑک سکے حالات کے تقاضوں کو
حسین وقت کی سوئی ہوئی شکن جاگے
کھلائے پھول ضمیر و زباں کی آزادی
شعور خوشی نفسی کا چمن چمن جاگے
صلیب و دار کی آواز گیت میں ڈھل جائے
بجھا بجھا سا ہے جو سوزِ جان و تن جاگے
یہی ہے زندہ دلانِ جنوں کا منشا بھی
غمِ عزاں کے آہنگ سے ختن جاگے

★ تم گزر گئے ان منزلوں سے آسودہ
تو جب بھی کوئی مورخ قلم اٹھائے گا
تمہاری فہم و فراست کے گیت گائے گا
لکھے گا تم کو کہ یہ فاتحِ زمانہ تھے
نقیبِ صلح تھے، انصاف کا خزانہ تھے
صداقتوں کا مرقع، وفا کا پیکر تھے
اخوت اور مساوات کے پیمبر تھے
مگر نہ سوچ لو یہ بھی کہ وقت اور تاریخ
کبھی کسی غلطی کو معاف کرتے نہیں
یہ ڈھونڈ لیتے ہیں سچائیوں کے قاتل کو
جنونِ کم نظری کو معاف کرتے نہیں
لحاظ کرتے نہیں نام و تاج [illegible] کا
وہ کوئی ہو یہ کسی کو معاف کرتے نہیں

یہ دن تو اک شجرِ نور ہے سحر زادہ
اسے لہو کی حرارت سے تم نے سینچا تھا
یہ ہنستی صبحوں کا منشور ہے قمر زادہ
جسے نڈھال شبوں کی تھکی جبینوں پر
خطِ شعاع کی صورت میں تم نے لکھا تھا

جشنِ سیمیں

نذیر بنارسی

الفراق اے مری آزادی کے پچیسویں سال — تو نے سلجھائی ہے الجھی ہوئی زلفِ بنگال
تو نے دی وقت کے چنگیز و ہلاکو کو شکست — تو نے ہی فتح کی دولت سے کیا مالا مال

جس کو اپنائے زمانہ وہ قرینہ تو ہے
ہے مرا دیش انگوٹھی تو نگینہ تو ہے

خون سے دھو کے غبارِ رخِ تاباں تو نے — حسنِ بنگال کیا سب پہ نمایاں تو نے
پیارے بھارت کے جوانوں کا لہو دے دے کر — ارضِ مقتل کو بنایا ہے گلستاں تو نے

آج بھی نقش ترا سبز جواں باقی ہے
موت کے منہ پہ طمانچے کا نشاں باقی ہے

زندگی آ کے رہی بن کے رہا بنگلہ دیش — کال کے گاؤں میں کرنے لگا جیون پردیش
لوگ لہرانے لگے دھان کے پودے کی طرح — ندیاں دینے لگیں سب کو خوشی کے سندیش

جس کا عنوان ہے شملہ وہ فسانہ تو ہے
جس کو گاتی ہے محبت وہ ترانہ تو ہے

بڑھ کے چھبیسویں صفحے پہ کہانی آئی — سیکھ آزاد وطن تیری جوانی آئی
ڈوبا صہبائے شفق رنگ میں دن کا راجہ — لے کے گیسو کی گمک رات کی رانی آئی

آرزو سوئی تھی کاندھے سے ملا کر کاندھا
بکھیر دیں چھوڑ گئی جب رات نے جوڑا باندھا

جائزہ پھولوں کا لیتی ہوئی مالن آئی — سیر کرتی ہوئی دوشیزۂ گلشن آئی
میری آزادی کے دن تیرا جنم دن آیا — زندگی لے کے بہارِ رخِ روشن آئی

رند سمٹے ہوئے بیٹھے ہیں گھٹا چھائی ہے
ہاتھ میں جام لیے پندرہ اگست آئی ہے

[illegible] ہر ویرانے کو ہنس کر مہ تاباں کر دو [illegible]
[illegible] گھر ہی ہے کھنڈر کو بھی سجا ڈالو   آج ویرانے بھی ہم رنگِ گلستاں کر دو

رنگ [illegible] نہ کبھی شکل سے بربادی کا
جشن سیمیں ہے مرے دیش کی آزادی کا

پھول کی طرح سے زخموں کو ہنسانا ہوگا   آج رنگین کفن غم کو پہنانا ہوگا
لب تک آئے نہ کوئی درد میں ڈوبی آواز   آہ کو واہ کے پردے میں چھپانا ہوگا

آج غربت سے کہو دوسری منزل میں رہے
پیٹ جلتا ہے جلے روشنی محفل میں رہے

آگے اوروں کے نہ جھکنے کی قسم کھائی ہے   ہم نے ملتی ہوئی امداد بھی ٹھکرائی ہے
امن کے واسطے جیتی ہوئی دھرتی دے کر   اپنے آدرش نے دنیا پہ وجے پائی ہے

خط پہ خط آج مرے دیش کے نام آئے ہیں
ساری دنیا سے محبت کے پیام آئے ہیں

میرے سامان کا شہرہ ہے خریداروں میں   دیکھیے ساکھ مری دوسرے بازاروں میں
تھے جو دشمن کبھی وہ دوست نظر آنے لگے   پھونک دی روحِ وفا میں نے جفاکاروں میں

اب مرا ملک کسی ملک کا محتاج نہیں
کل تھا جو حال مرے دیش کا وہ آج نہیں

شکتی [illegible] بھی ہے گرمیِ پیکار بھی ہے   زندگی ڈھال بھی چلتی ہوئی تلوار بھی ہے
زہر کے گھونٹ مذیر اب نہ پیے جائیں گے   کیوں کہ آزاد ہیں اب جرأتِ انکار بھی ہے

السلام اے مری آزادی کے چھبیسویں سال
دل سے ہر بھارتی کرتا ہے ترا استقبال

★

۱۰ اگست سنہ ۶۲ء
اسپیشل نمبر



معمار آزادی
مہاتما گاندھی

۱۵ اگست ۱۹۴۸ء
اسپیشل نمبر



یوم آزادی

پنڈت جواہر لال نہرو ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو قانون ساز اسمبلی کے نصف شب کے اجلاس کو خطاب کر رہے ہیں

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی حلف برداری کی تقریب میں آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو حلف دے رہے ہیں



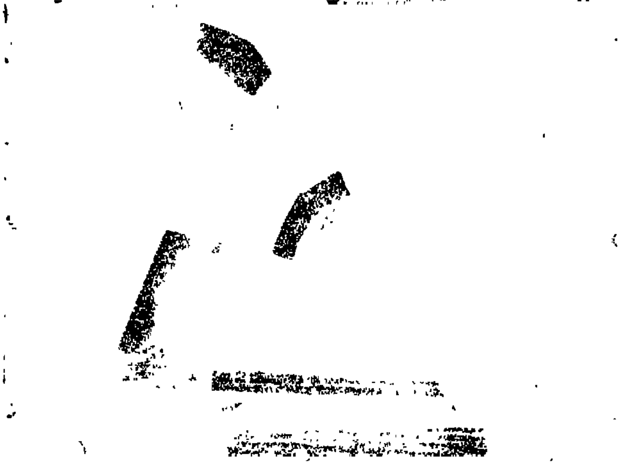
لال قلعہ کی فصیل سے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر (یوم آزادی اگست ۱۹۴۸ء)



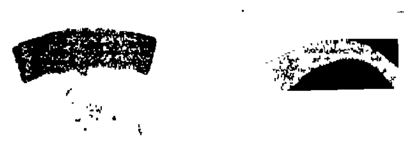
کی جھلکیاں

۱۵ر اگست ۷۲ء
اسپیشل نمبر

تکمیل دستور کی جھلکیاں



وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو ہندستان کے نئے دستور پر
۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ء کی تقریب میں اپنے دستخط کرتے ہوئے



وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جمہوریہ ہند کے دستور کے منظور ہو جانے پر
دستور ساز اسمبلی کے صدر آنجہانی ڈاکٹر راجیندر پرشاد کو مبارک باد دیتے ہوئے

شری سی. راج گوپال اچاریہ ہندستان کے پہلے گورنر جنرل کی
حیثیت سے حلف اُٹھاتے ہوئے



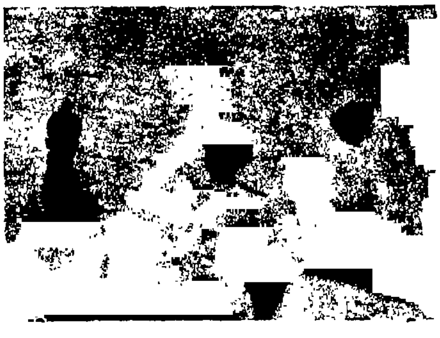
یوم آزادی



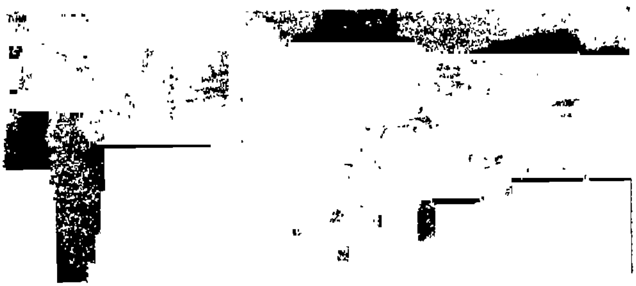
یوم آزادی کے موقع پر مرکزی سکریٹریٹ کی عمارت پر چراغاں

لکھنؤ میں ریزیڈنسی کے باقیات۔ یہاں انگریزوں اور ہندستانیوں کے درمیان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران گھمسان کی جنگ ہوئی تھی





لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جواہرلال نہرو یوم آزادی کی تقریبات کے دوران انڈیا گیٹ، نئی دہلی پر



پہلی جنگ آزادی کے دوران سکندر باغ بھی متعدد خونریز جنگوں کا میدان رہا ہے۔ یہاں شہید ہونے والوں کی ایک یادگار قائم کی گئی ہے۔ تصویر میں (بائیں) شری اجیت پرتاپ سنگھ وزیر جنگلات، یو۔پی یادگار کا افتتاح کرتے ہوئے اور (داہنے) جلوس کا ایک حصہ جو ۱۸۵۷ء کی یاد منانے کے سلسلے میں ۳۰ جون کو لکھنؤ میں نکالا گیا

آزادی کے بعد اردو شاعری

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

ادب کے ادوار دوسرے تمدنی واقعات و حالات کے ادوار سے سو فیصدی مطابقت نہیں رکھتے۔ اردو شاعری میں تبدیلیاں کئی پہلوؤں پر منحصر ہوتی ہیں اور بسا اوقات بعض ماضی و حال سے پہلے ہی [illegible] کا آغاز ہو جایا کرتا ہے۔ مثلاً غالب، حالی، داغ، امیر کا زمانہ قریب قریب ایک ہی زمانہ ہے جس میں ذوق، داغ، غالب، مومن، حالی اور شاد عظیم آبادی نغمہ سرائیاں کر رہے ہیں۔ لیکن کسی مختلف انداز سے اور کتنے دلکش رنگ انداز سے۔ حالی کے بعد بھی ریاض خیرآبادی، جلیل مانک پوری، آسی [illegible]، محمود [illegible]، اسمٰعیل میرٹھی، درگا سہائے سرور جہان آبادی، برج نرائن چکبست، [illegible] شبلی نعمانی، ظفر علی خاں، تلوک چند محروم، نادر کاکوروی، اکبر الٰہ آبادی اور ڈاکٹر اقبال ایک دوسرے سے بالکل الگ انداز میں اپنی سے اچھی شاعری کرتے رہے۔ اس سلسلے میں میں صرف ایک نام لوں گا [illegible] نظم طباطبائی کا، جن کی عمر لیں انتہائی درجہ تک [illegible] انگریزی نہ جانتے ہوئے بھی مشہور انگریزی نظم (GRAY'S ELEGY) کا ترجمہ "گور غریباں" کے نام سے نظم طباطبائی نے کیا ہے وہ ایک مستقل نظم کی حیثیت رکھتا ہے اور اردو کا کامیاب ترین اور مشہور ترین [illegible] سمجھا جاتا ہے۔ اب ہم پہلی جنگ عظیم یا [illegible] اور تیسری دہائی میں اپنے آپ کو پاتے ہیں اور [illegible] آزادی سے نظر آتے ہیں جن میں ایک [illegible] ہندوستان کی آزادی [illegible]

میں بھی حسن کی آواز گونج رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے اکثر ادوار ایک دوسرے میں ہیں بلکہ ہر دور میں ماضی، حال، مستقبل کے ادوار کا سنگم نظر آتا ہے۔ ایسا ہر دور ایک مخلوط دور ہوتا ہے۔ اجازت ہو تو اسی موضوع کا میں ایسا ایک شعر پیش کر دوں ؎

آج دو رنگ مل رہے ہیں [illegible]

[illegible] کی پرچھائیوں کو دور کی پرچھائیاں

آزادی سے پچیس تیس سال پہلے یا اس سے کچھ پہلے حسرت موہانی، [illegible] پانی پتی، ثاقب لکھنوی، عزیز لکھنوی، [illegible] صفی لکھنوی، فانی بدایونی، یاس یگانہ چنگیزی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی وغیرہ [illegible] اپنا [illegible] رکھے ہوئے تھے یا شروع کر دیئے تھے۔ فیض کا نام بھی [illegible] میں آتا ہے اور بعض ہی [illegible] جاں نثار اختر، کیفی اعظمی [illegible] ایسا سارا شاعری دوسری جنگ اور آزادی ہند سے پہلے الگ الگ انداز سے [illegible] تھا اور ان میں سے کئی ایسے ہیں جن کی [illegible] شاعری آزادی ہند کے بعد بھی جاری تھی اور جاری ہے [illegible] میں یعنی آزادی ہند سے دس گیارہ سال پہلے ہی ترقی پسند ادب و شاعری کا دور شروع ہو چکا تھا اور انقلاب روس نے نئے خواب [illegible] اور نئے تصورات شاعری کو جنم دے دیا تھا۔

آزادی ہند کے بعد کا اردو دور شاعری ایک ایسا [illegible] ہے جو [illegible] آزادی ہند سے پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا جس دور پر آنے والی [illegible] آزادی سے پہلے ہی پڑ چکی تھیں۔ [illegible]

خواب اور ساحل [illegible] صورت میں آزاد ہوتی ہیں اس کے بعد زندگی میں
آزاد ہو رہی ہیں۔ اگر ہم آزادی ہند سے نصف صدی پہلے کے ہندوستانی
ادب پر نظر ڈالیں تو شاید یہ کہنے میں ہم حق بجانب ہوں گے کہ ہندوستان
بھر میں آزادی کی پہلی نظم وہ بنگالی نظم ہے جس کا عنوان "بندے
ماترم" ہے۔ جس کے مصنف بنکم چندر چٹرجی ہیں۔ یہ نظم نصف صدی سے
آج تک ہمارا قومی ترانہ رہی ہے۔

دوسری اہم چیز جو اس دور کی شاعری میں نظر آتی ہے وہ
پچھلے ادوار کی شاعری کے مقابلے میں کہیں زیادہ بوقلمونی اور رنگارنگی یا
انفرادیت اور تنوع کے نمایاں صفات ہیں۔ کہاں داغ و امیر کا زمانہ جب
تمام انیسویں صدی کی اردو شاعری بالکل ایک رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی
تھی اور کہاں موجودہ صدی کی چوتھی یا پانچویں اور چھٹی دہائی کی شاعری
جو قوس قزح کے رنگوں کی طرح مختلف رنگوں میں لہلہاتی [illegible]
آنکھوں میں گنگناتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ یہ دور ایک حیثیت
سے اس لیے بھی یادگار رہے گا اور وہ بات ہے اردو شاعری میں غیر مقفیٰ
اور غیر مرتب نظم BLANK VERSE کی شاعری کا آغاز اور
اس کا ارتقا۔ یوں دکھایا جاتا ہے کہ BLANK VERSE کا آغاز
اسمٰعیل میرٹھی کی اس نظم سے ہوا جس کا عنوان ہے "تاروں بھری
رات"۔ لیکن BLANK VERSE کو اس زمانے تک واردات
شاعری میں شمار کیا جا سکتا تھا محض ایک تجربہ تھا۔ آزادی سے
کچھ ہی پہلے BLANK VERSE کا ریلا اردو شاعری میں آگیا۔ ن۔
م۔ راشد، فیض، سردار جعفری، مخدوم، [illegible]، سکندر علی وجد
اور ساحر لدھیانوی کے علاوہ اور کئی دوسرے شاعر کامیاب نمونے
اردو BLANK VERSE کے پیش کرنے لگے تھے۔ اسی زمانے میں
میں نے BLANK VERSE میں دو نظمیں لکھیں جن کو میں اپنا
حاصل شاعری سمجھتا ہوں یعنی "آدھی رات" اور "پرچھائیاں"۔ آزادی
کے بعد میں نے یہ سلسلہ اب تک جاری رکھا ہے۔ "جگنو"، "ہنڈولہ"،
"کاریگل پورنیما" اور کچھ دوسری نظمیں۔ اردو BLANK VERSE
کا ہر شاعر ایک دوسرے کے مزاج کا تتبع نہیں کرتا یا کسی خاص شاعر
کی تقلید نہیں کرتا یا کسی مخصوص نمونے کی شاعری نہیں کرتا۔

بہرحال غیر مقفیٰ اور غیر مرتب [illegible]
[illegible] کہا جاتا ہے جس کا ظہور ہماری [illegible]
کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ BLANK VERSE کے علاوہ [illegible]
کے بعد اردو میں آزاد نظم کا دور بھی شروع ہو گیا ہے جس میں مصرعوں
کی لمبائی یکساں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کئی بحریں بھی ایک ہی نظم میں [illegible]
ابھی تو جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قسم کی نظمیں مشہور ترین اور مقبول ترین
ہو چکی ہیں لیکن ایسا ہونے کا امکان اس نئی صنف شاعری میں مزید
ہے۔ وقت اس کا فیصلہ کرے گا۔ میری ایک آزاد نظم [illegible]
والے شاعر سے خطاب" اسی تکنیک کی ہے۔ یہ صورت مختلف شاعری
ابھی بہت [illegible] ہے۔ دیکھا جائے۔ کچھ عرصہ چند برسوں سے
اردو شاعری میں ایک نئی تحریک بھی شروع ہو گئی ہے جسے جدید
شاعری کہتے ہیں۔ ابھی اس شاعری کا بچپن ہے [illegible]
ہوئے بالکل ہیں [illegible] جدید شاعری [illegible]
ہیں۔ کہا کرتے ہیں کہ ہم ہمارے ادب میں باغی [illegible]
اور ادیب کے۔ لوگ ایسے [illegible] ایسے جدید پاروں کی نظمیں [illegible]
کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ ان نظموں میں [illegible]
بے ربطی، بد قواعدگی اور [illegible] شکستہ تعبیرات جن کا کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آتا
اس شاعری کے علاوہ اتنا قائم ہے۔ اس شاعری کے خود ساختہ علمبردار یہ
کہتے ہیں کہ جب زندگی بے ڈھنگ ہے تو ڈھنگ کی شاعری ہی کیوں
کی جائے۔ زندگی نیم مجنونانہ دور سے گزر رہی ہے تو شاعری بھی نیم مجنونانہ
کیوں نہ ہو۔ آج کی زندگی بالکل بے مقصد ہو چکی ہے۔ جدید انسان اپنا سہارا
کھو چکا ہے اور بھری دنیا میں اکیلا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے اسے وہ خود
نہیں جانتا کوئی اگر اس سے پوچھے کہ کہاں جا رہا ہے تو [illegible]
کہاں جائے گا اور کہاں جا کے رکے گا اس کی اسے خود بھی خبر [illegible]
نہیں ہے۔ ہم میں ہر ایک ایک ٹوٹا ہوا [illegible] ہے اور ہماری شاعری
بھی ایک ٹوٹا ہوا آئینہ ہے لیکن [illegible]
[illegible] نہیں کیا جائے گا اس وقت تک [illegible] شاعری [illegible]
[illegible] نہ ہو سکے گی۔ [illegible]
[illegible] کی اس [illegible]

[illegible] اشک

[illegible] ہے۔ سوال شاعر کا ہے مگر
کی شناخت کا ہوتا ہے۔ شاعری کا مقصد ہے کہ انتشار تصورات کا ہونا
ہر قاری کا ہوتا ہے جب غیر منظم حالات کو بھی منظم کر کے دکھانا ہوتا ہے۔
میں اس سے جدید شاعری کا مخالف ہرگز نہیں ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ
کچھ نمونے جدید شاعری کے کامیاب ہیں۔ جدید شاعری کی ایسی ہر
کامیاب مثال اس امر کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ شاعر انتشار کو منظم کر چکا
ہے اور اسے ایک پوری اکائی کی شکل دے چکا ہے۔ لیکن اس قسم کی
شاعری کی زیادہ تر مثالیں ناکامیاب ہیں۔

آج کی دنیا میں اور ہندوستان میں بھی غیر مطمئن اور غیر یقینی
رہ چکی ہے۔ اس کی جڑیں اکھڑ چکی ہیں، امید فنا ہو چکی ہے مجھے خود
اپنا شعر یاد آ گیا ہے

اے کھوئی کھوئی زندگی اے اکھڑی اکھڑی زندگی
ہے کیا وطن میں سکون ہو کہ وطن ہی آج ہے بے وطن

ہم لوگ ایک صبر آزما اور بہت تنگ دور سے گزر رہے ہیں۔ گھٹن زندگی
ٹوٹ رہی ہے۔ بے روزگاری ہماری سڑکوں پر آنکھیں ڈال کر ہمیں
گھور رہی ہے۔ تعمیر تاریک ساہ میں آمدنی جو معمولی ضروریات زندگی
پوری نہ کر سکے ایسا مستقبل جس پر حال اعتبار کر کے خاص کر اس
نسل کے دو اور نسل زندگی کا المیہ ایسی حقیقتیں ہیں جنہوں نے زندگی کو
بے لطف بھی بنا رکھا ہے اور بے معنی بھی۔ جدید شاعری کرنے والے نوجوان
ریلے کہ اسے کا ہمیں حق نہیں پہنچتا۔ ہمیں ان کے ساتھ انسانی ہمدردی
ہر ناسب اور ادبی ہمدردی بھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا
منتشر ہو چکی ہے۔ دھیرے دھیرے اور نئی نسل والوں کی زندگی میں
ایک ناقابل عبور خلیج پیدا ہو چکی ہے۔ آج کوئی کسی کا نہیں ہے۔
اجنبیت، غیریت، بے تعلقی، بیزاری اور بے ٹھکانہ پن نے زندگی
کو ایک ایسا لق و دق صحرا بنا دیا ہے جو قدروں سے بالکل محروم ہے۔
پھر بھی جب میں جدید شاعری کے دلدادگان سے پوری ہمدردی
کے ساتھ اور ان کے دکھ درد کو پوری طرح سمجھتے ہوئے میں یہ گزارش
کرنے کی جرأت کروں گا کہ محض جمالیاتی ادب کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا
جا سکتا۔ جدید شاعری، افسانہ نگاری، ناول نگاری، ڈرامہ نگاری [illegible]

[illegible] کہ آیا نئی تخلیقات [illegible]
جائیں، کیا جدید ادب صرف جدید شاعری ہے؟ کیا ضروری [illegible]
شاعری اپنی چمن نشو نما سے ادب کی سیکڑوں نسلوں سے [illegible]
ہو جائے کہ بہت سے کار رفتہ کو بالکل ہی چھوڑا جائے۔

جدید شاعری کے دلدادگان کو یہ حقیقت کبھی نہیں بھولنا چاہیے
کہ شروع سے لے کر آج تک کی شاعری کو ہضم کیے بغیر حقیقی جدید
شاعری جنم نہیں لے سکتی۔ مشہور انگریزی مصنف اسٹیونسن لکھتا
ہے کہ میں نے جان [illegible] کے ساتھ سیکڑوں حسینوں سے قدیم مصنفوں
کی بندروں کی طرح نقالی کر رکھی ہے تب کہیں جا کر اپنا انفرادی
رنگ پیدا کر سکا۔ ہر تعلیم اور ہر تربیت خلاقانہ تخلیق کی صلاحیت پیدا
کرتی ہے۔ زبان و بیان کے قاعدے یا لفظوں کی لغت اور ان کا مفہوم
نظر انداز کر کے یا انہیں بالکل توڑ مروڑ کے جدید شاعری پیدا نہیں کی
جا سکتی۔ جدت قدامت ہی کا ایک نیا استعمال ہے۔ پرانا پن اسی سے
نئی جہت لیتا ہے۔ کل تک کے ادب سے جدید شاعری کی ناآسودگی
بجا اور برحق ہے لیکن کل تک کی شاعری سے بالکل بے تعلق ہو کر جدید
شاعری نہیں کی جا سکتی۔ جو جدید شاعری کے نمونے کامیاب ہیں وہ
ادب کے دائمی [illegible] سے شعوری استعمال سے ہی کامیاب
ہوئے ہیں۔ کور تقلید کی راہ میں ہرگز نہ دوں گا لیکن خلاقانہ اور جدت
استفادے کی راہ دوں گا۔ جو دارو کی پرانی شاعری کا بہت بڑا
حصہ باسی ہو چکا ہے۔ لیکن قطب شاہ کے وقت سے بلکہ ایک
ہومر اور فردوسی کے وقت سے شاعری کے ایسے ہزار ہا نمونے ملتے
ہیں جو آج بھی اپنی قدامت کے باوجود تازگی اور زندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔
شاعری جدید ہو یا قدیم اگر اس میں تاثیر نہیں تو ایسی شاعری کس کام
کی؟ نئی نسل کے لوگوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کی محرومیوں اور ان
کی رنجیدگیوں کا آغاز صرف اس وقت نہیں ہوا جب وہ پیدا ہوئے
ہم میں ہر ایک کے اندر ان بہائم وحشیوں اور ان وحشیوں کا خون جاری
ساری ہے جو لاکھوں برس پہلے اس دھرتی پر چل پھر چکے ہیں [illegible]
میں مل چکے ہیں۔ سائنس اور مشاہدہ اس حقیقت کو ثابت کر چکے ہیں
کہ آدمی میں وہ [illegible]

آواز سے خوشگوار ... کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہاں خوشگوار کا مطلب
[illegible] نہ ہوا۔ باتوں کی حامل آواز ہو ضرور ہو مگر موثر انداز
سے انسان کو دماغ اس لیے عطا ہوا ہے کہ بکھری ہوئی اور منتشر چیزوں
کو منظم طور پر سمجھ سکے۔ اس طرح منتشر غیر مربوط اور بظاہر بکھرے ہوئے
[illegible] کا احساس انبساط عطا کرتا ہے۔ دوسرا فائدہ
ہوتا ہے کہ خارجی وجود کو سمجھ کر یعنی اس میں ایک نظام کو کارفرما
دیکھ کر انسان اپنے ماحول پر قادر ہو جاتا ہے، اسے بدلتا ہے اور اس کی
طرح اس پر حاوی ہوتا ہے۔ اگر ہم دیواریں اس طرح اٹھائیں کہ نہ کوئی
احاطہ بن سکے، نہ مینار بن سکے نہ گھر بن سکے اور نہ سمجھ میں آسکے کہ دیوار
کس غرض کے لیے اٹھائی گئی ہے [illegible] ایک مجموعہ [illegible] حرکت
ہوگی اسی طرح نظریات [illegible] ایک سمجھ میں آنے والی [illegible]
کام میں آنے والی چیز ہونا چاہیے [illegible] بحث [illegible]
عمل ہم انسانوں [illegible] سمجھ سکتے ہیں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کو [illegible] لیا ہے۔

[illegible] کے بعد [illegible] ہیں [illegible]
ہیں۔ [illegible] سے متعلق آزادی کے ساتھ [illegible]
[illegible] شائع ہوتی آرہی ہیں جس کا
موضوع [illegible] گزشتہ پچیس برسوں میں ان نظموں
کی تعداد [illegible] ڈھائی [illegible] ہے۔ [illegible] زندگی کی تہذیب
[illegible] اور [illegible] کے [illegible]
[illegible] موضوعات پر بہت بڑی تعداد میں نظمیں لکھی
گئی ہیں [illegible] بات سے کہ [illegible]
[illegible] پر نظمیں لکھی [illegible] نظموں کی [illegible]
بھی [illegible] ہیں [illegible] الاقوامی واقعات اور موضوعات پر بھی [illegible]
ہند کے بعد [illegible] بہت نظمیں لکھی گئی ہیں [illegible] اور [illegible]
انقلاب جیسی [illegible] طویل نظمیں آزادی کے بعد ہی لکھی گئی ہیں۔

سب سے دل پذیر جس نظم کا سب سے زیادہ گہرا اثر ہوا وہ [illegible] کی دور
نظم ہے جس کا عنوان "[illegible] نام" ہے۔ میری نظم "دھرتی کی کروٹ" اور
"داستان آدم" میں بھی مارکسی تصورات کو کئی زاویوں سے پیش کیا گیا ہے
لیکن میں اب یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ حب وطن، قومیت اور بین الاقوامی
موضوعات پر نظمیں گزشتہ پچیس برسوں میں لکھی گئی ہیں خاص کر
ترقی پسند تحریک سے [illegible] متاثر ہو کر جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان
[illegible] مقصدی نظمیں ظاہری طمطراق کے باوجود
[illegible] اور [illegible] کر بھلا دی گئیں۔ ان نظموں میں طویل عرصے
اور تحقیق [illegible] کے [illegible] نہیں تھے۔

[illegible] کے بعد سے اردو شاعری میں ہندوستان کے متعلق بھی
چیتنا یا شعور [illegible] ہوا ہے۔ اس [illegible] برس سے کوشاں
رہا ہوں [illegible] دیکھ کے ہزاروں پہلو اور اس کی ہزاروں جھلکیاں گزشتہ
پچیس برسوں میں اردو شاعری میں قریب قریب پہلی بار سنجیدگی
سے [illegible] ابھر گئی ہیں۔ اردو نثر میں یہ کام
[illegible] برس پہلے پریم چند نے شروع کر دیا تھا۔ ہندو
[illegible] آزادی ہند کے بعد ہی اردو شاعری
میں ظاہر ہونے لگا ہے۔ ہندوستان کا عام آدمی اور ہندوستان کی عوامی
زندگی اب اردو شاعری کے مستقل موضوعات بن چکے ہیں۔ اس سلسلے
میں [illegible] کی [illegible] اور انتہائی طور پر مشہور نظموں "اجنتا" اور
"ایلورا" کا ذکر ضروری ہے۔ یوں تو اسی زمانے میں چودھری جگت موہن
لال رواں کی مثنوی [illegible] اور [illegible] جگر بریلوی کی مثنوی
"[illegible]" اور [illegible] لکھنوی کا منظوم ترجمہ کالیداس کی نظم [illegible]
عام پر آئے ہیں۔ لیکن جہاں تک اسلوب بیان اور اسلوب فکر کا
تعلق ہے ان میں ہندویت پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ کیا اس سلسلے میں
میں [illegible] تین سو رباعیوں کا ذکر کر سکتا ہوں جو [illegible] کے
نام سے شائع ہوئی ہیں یا ان [illegible] رباعیوں کا ذکر بھی کیا میں کر سکتا ہوں
جو "[illegible] ہند سے خطاب" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں؟ جیسے آزادی
پا کر ہم نے اپنا وطن پا لیا اسی طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہند [illegible] کی
ترجمانی کے لحاظ سے اب اردو نے بھی اپنا وطن پا لیا۔

آزادیٔ ہند کے بعد ایک اور صنفت اردو شاعری میں رونما ہوئی۔ BLANK VERSE آزاد نظم، رباعی کی نشاۃ ثانیہ اور مغربی انداز کی نظم نگاری کا ذکر چند نا یا مفصل طور پر ہم کر چکے ہیں۔ ہاں سلیمانی تپی۔ شکنتلا بند ہو چتر بخن داس کی مشہور نظم "ساگر سنگیت" کا جو منظوم ترجمہ اردو میں کیا ہے اور جو رسالہ زمانہ کانپور میں پہلے پہل شائع ہوا تھا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں ان کے مجموعۂ کلام میں نہیں ہے۔ یہ نظم آزادیٔ ہند کے پہلے شائع ہو چکی ہے لیکن جدوجہد آزادی کے زمانے کی چیز ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ادبی ادوار سیاسی ادوار سے پہلے ہی پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ سیاسی ادوار سے پیچھے ان کی پڑتی ہوئی پرچھائیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ہاں تو جو نئی چیز آزادیٔ ہند کے بعد کی اردو شاعری میں پیدا ہوئی ہے وہ واقعیت اور صداقت احساس ہے یعنی جو چیز اور جو کیفیت فی الحقیقت جیسی ہے اس کو ویسی ہی پیش کرنا۔ اسی کے ساتھ خلوص تخیل کے علاوہ رسمی یا روایتی اسلوب بیان کی جگہ پر انفرادی اسلوب فکر اور اسلوب بیان نے اردو شاعری میں جگہ پائی۔ غلامی قوموں کو جھوٹ کا شکار بنا دیتی ہے۔ میرا ایک مصرعہ ہے ؎

غلام قوم کے اشعار بھی غلامانہ

سیاسی غلامی کے ساتھ غلامی کے خلاف بغاوت بھی آزادی سے کچھ پہلے اردو شاعری میں رونما ہو چکی تھی۔ آزادی کے بعد یہ بغاوت ایک اثباتی قدر کی حیثیت سے اردو شاعری میں اسلوب، موضوعات، انداز فکر اور انداز بیان کی شکل میں اپنا کام کر رہی ہے۔ انگریزی حکومت ہی کے خلاف یہ بغاوت نہیں رہی ہے بلکہ رسوم و روایات کے خلاف بھی یہ بغاوت آزادی کے بعد ظاہر ہوئی ہے۔ سوشلزم، سماج واد، عوام کی خود شناسی اور اپنے حقوق کا تدریجی شعور یہ تمام قوتیں اسی دور شاعری میں کارفرما ہیں۔ خود آزادی کا تصور رہ رہ کر نئے جنم لیتا رہا ہے اور اس کی جھلک گزشتہ پچیس برسوں کی اردو شاعری میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ دور آزادی میں ایک اور نئی بات اردو شاعری میں پیدا ہوئی ہے۔ وہ ہے نئے استعاروں، نئی تشبیہوں اور نئی تعبیروں کا استعمال۔ آج کا اردو شاعر ان معاملات میں ماضی کی کورانہ تقلید نہیں کرتا۔ ایک نیا علم البیان اور فن بیان نئی اردو شاعری میں پیدا ہو گئے ہیں۔

اس مضمون میں آزادیٔ ہند کے بعد اردو شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ میں نے دوران مضمون میں کچھ شاعروں کے نام گنوائے ہیں اور کچھ نظموں کے بھی۔ یقیناً بہت سے نام چھوٹ گئے ہوں گے جنھیں میں نے قصداً نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ ایک مختصر مضمون میں ہر شاعر اور ہر شعری تخلیق کی مکمل فہرست پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے میں عذر خواہ ہوں۔

★

> "یہ میری خواہش ہے کہ بھارت یہ محسوس کرے کہ اس کے پاس اس کی اپنی روح ہے جو نہ کبھی مر سکتی ہے اور نہ تباہ ہو سکتی ہے اور اس میں ہر جسمانی کمزوری پر فتح پانے کی طاقت موجود ہے اور وہ تمام دنیا کا مقابلہ کر سکتی ہے۔"
>
> مہاتما گاندھی

اگست ۱۹۴۷ — کچھ یادیں

دی آر ملکیہ ر

[illegible]

کے نام سے موسوم ہے، کے قریب تک نہ پہنچ سکی۔ یہ قافلہ پرچم کے ستونوں سے چند گز دور ہی رک گیا۔ ماؤنٹ بیٹن اس مقام سے آگے نہ جا سکے۔ تھکے ہارے جوانوں نے، جو ٹریفک کا انتظام کر رہے تھے، وائسرائے کی گاڑی کے لیے راستہ بنانے کی لاحاصل کوشش کی۔ ماؤنٹ بیٹن نے مجمع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسکراتے ہوئے نہرو سے کہا: "یہ ان کا دن ہے اگر ہم اس صورت میں رک نہ جائیں تو منع کرنے والا میں کون ہوتا ہوں!" وہ دور ہی سے پرچم کے ستونوں کی حفاظت کرنے والے جوانوں کو پرچم لہرا دینے کا اشارہ کر کے مطمئن ہو گئے اس طرح ملک میں آزادی لانے والا اس سرزمین کا کوئی بڑا آدمی نہیں بلکہ ایک

تاریخ سے بھرپور ان دنوں میں سے اس دن کا ایک اور نظارہ جو میری یادداشت پر گہرے نقوش چھوڑ گیا ہے۔

اس دن کا سب سے سنجیدہ نظارہ پارلیمنٹ ہاؤس کے مرکزی ہال میں ۱۴ اور ۱۵ اگست کی نصف شب کی تقریب کا تھا۔ اس گھڑی، جب کہ ساری دنیا محوِ خواب تھی، بھارت کو آزادی حاصل ہوئی اور اس کا مقدر جاگا۔

اس رات پریس گیلری سے نیچے کے جگمگاتے ہوئے منظر پر نظریں جمائے، میں نے گاندھی ٹوپیوں کے بیچ چند مختلف کالی پوشاکیں دیکھیں۔ کالی ٹوپیاں اور جنوبی ہند کے زریں سفید صافوں سے مل گئی تھیں۔ خواتین ارکان اپنی بہترین پوشاکوں میں



لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن پنڈت نہرو کے ساتھ انڈیا گیٹ نئی دہلی کی تقریب آزادی میں عام سپاہی تھا۔

ترنگا جب لہرا دیا گیا تو مجمع نے ایک خوبصورت اور مکمل ہمہ رنگی قوس قزح کو پرانے قلعہ اور میشنل اسٹیڈیم کے درمیان آسمان پر کمان بناتے ہوئے دیکھا اور اس کے فوری بعد ہلکی پھوار ہونے لگی جس سے پسینے میں تر اور عوام کو ٹھنڈک کا احساس ہوا، گویا آسمان بھی شام کے ان پروگراموں کو آشیرواد دے رہا تھا۔

تقریب کے ختم ہوتے ہی ایک بھگدڑ مچ گئی اور اس میں پھنسے ہوئے افراد کو کسی محفوظ جگہ پہنچنے میں کئی گھنٹے لگے۔ مگر اس تمام کسی بے ہودگی، شرارت یا گندگی کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ وہ ایک خوش، محترم اور منظم مجمع تھا۔



یوم آزادی ۱۹۵۰ء کے موقع پر مرکزی سکریٹریٹ کی عمارت پر چراغاں

ملبوس تھیں۔ ان کی تباسی کا مدانی ساڑیوں سے پُرمنظر رنگین ہو گیا تھا۔ فرینک انتھونی کی قیادت میں اینگلو انڈینس کا ایک چھوٹا گروہ اپنے نفیس یورپی طرز کے سوٹ اور نکٹائیوں میں ملبوس دکھائی دے رہا تھا۔ دھوتی، چوڑی دار، لنگی اور مغربی تیلون ایک جگہ موجود تھے۔ درحقیقت وہ مختلف ہندوستانی پوشاکوں کا عجائب گھر تھا جن سے ہندوستان کے رشتۂ اتحاد کا پتہ چلتا تھا۔

رات کے بارہ بجتے ہی "بھارت ماتا کی جے" اور "مہاتما گاندھی کی جے" کے نعروں اور ناقوس کی تیز آواز دل سے مرکزی ہال کا گنبد گونج اٹھا۔ پنڈت گووند مالویہ نظریں بچا کر ناقوس ہال میں لے آئے تھے۔ ناقوس بجاتے ہوئے ان کے بچوں جیسے گال تقریباً پھٹ رہے تھے۔

افسوس کہ مہاتما گاندھی اپنے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے دیکھنے کے لیے وہاں موجود نہ تھے۔ وہ دور نواکھالی میں بٹوارے کے بعد کی بربریت کے شکار لوگوں کو دلاسا دینے اور ان کی دلجوئی کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

اس رات جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی دو یادگار تقریروں کے علاوہ دستور ساز اسمبلی کے ارکان کی جانب سے حلف اٹھانے کی سنجیدہ تقریب میرے ذہن پر نقش ہے۔ ہندستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے والوں میں انڈین مسلم لیگ کے دو ستون چودھری خلیق الزماں اور سید حسین امام تھے۔ یہ دونوں دو ہفتوں کے اندر اندر کراچی میں دیکھے گئے جن میں سے ایک تو پاکستان مسلم لیگ کے برائے نام صدر بنے اور دوسرے گمنامی میں کھو گئے۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ اپنے اخبار کے لیے میں نے اس تاریخی واقعے سے متعلق رپورٹ ان سنجیدہ سطور پر ختم کی:

"اور اس گھڑی جبکہ دارالسلطنت میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں پنجاب میں جو زیادہ دور نہیں ہے، ہونے والی خونی وارداتوں کی گھن گرج پر کوئی بھی کان دھرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر یہ ایک الگ کہانی ہے..."

بٹوارے کے بعد دو ہفتوں کے اندر دونوں وزرائے اعظم، جواہر لال نہرو اور لیاقت علی خاں فساد زدہ ہندستانی اور پاکستانی پنجابوں کا دورہ کر کے ان بے سہارا اور بے گھر انسانوں کو دلاسا دے رہے تھے جو بربریت کے باعث، جس کی مثال نہیں ملتی، عارضی پناہ گزیں کیمپوں میں مقیم تھے۔

وہ رکشا بندھن کا دن تھا۔ وزیر اعظم نہرو کی جماعت ملتان، مغربی پنجاب پہنچی۔ پناہ گزیں کیمپ میں مقیم لوگوں نے نہرو کا خیر مقدم غصہ اور درد بھری چیخ و پکار سے کیا۔ جب یہ ہنگامہ فرو ہوا تو میں نے دل کے تاروں کو چھو لینے والا ایک منظر دیکھا۔

دکھ بھری آنکھوں اور اشکوں سے تر چہروں کے ساتھ چیتھڑے زیب تن کیے ہوئے عورتوں کی ایک قطار خاموشی سے جواہر لال کے قریب پہنچی۔ ان کے ہاتھوں میں معمولی دھاگوں کے ٹکڑے تھے۔ ہر ایک نے آگے بڑھ کر نہرو کی کلائی پر اس دھاگے کو باندھا اور "بہن کے لیے بھائی کی حفاظت" کا عہد یاد دلایا۔

جب نہرو نے راکھی بندھوانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو بے اختیار آنسو ان کے گالوں پر بہنے لگے اور اس وقت جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں کوئی بھی آنکھ ایسی نہ تھی جو پُرنم نہ ہو۔

امرتسر (ہندستان) میں واقع ایک دوسرے کیمپ میں جو مسلمانوں کا تھا، پاکستانی وزیر اعظم کی جماعت اور حفاظتی دستہ کو اچانک مسلمانوں کے ایک غضب ناک مجمع نے گھیرے میں لے لیا۔ معائنہ کرنے والوں میں لیاقت علی خاں کے علاوہ حکومت مغربی پنجاب کے وزیر اور لاہور کے میاں ممتاز دولتانہ بھی شامل تھے۔

کیمپ میں مقیم ایک مسلم جج نے پاکستانی قائدین سے رقت آمیز لہجے میں کہا "تم کو تمھارا پاکستان مل گیا ہے اور تم نے اپنی اقتدار کی ہوس پوری کر لی ہے۔ اپنی ہوس کے شکار لوگوں کی قسمیں کیسا پڑا۔ تم نے آبادیوں کے تبادلہ کا انتظام کیوں نہیں کیا؟ تم نے معصوم لوگوں کی حفاظت کے لیے کوئی انتظام کیوں نہیں کیا؟"

وہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ پولیس کی کمک فوراً کیمپ روانہ کی گئی تاکہ پاکستانی لیڈروں کو وہاں سے بہ حفاظت واپس لایا جا سکے۔

★

اُردو میں تحقیق آزادی کے بعد

پروفیسر احتشام حسین

یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ ادبی تحقیق کی جانب باقاعدہ توجہ کی شروعات بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ہوتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو میں تحقیق کو کوئی ایسا مقام اس سے پہلے حاصل نہ تھا جس پر فخر کیا جاسکے۔ تذکرے جن سے اس کی امید ہو سکتی تھی، تحقیق کا کوئی قابل ذکر نمونہ پیش نہ کرسکے۔ اگر سرسید کی آثار الصنادید کو نظر انداز کر دیا جائے جو ایک خاص نوعیت کا علمی اور تحقیقی کارنامہ تھا، تو اردو کا دامن بہت دنوں تک فراہمی مواد اور ترتیب و تدوین متن کے نقطۂ نظر سے خالی خالی نظر آتا ہے۔ مولانا حالی جنھیں غالب سے قرب حاصل تھا اور ذرائع کی بھی کمی نہ تھی، یادگار غالب میں تحقیق کا حق ادا نہ کرسکے۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں تحقیقی انداز نظر اختیار کیا لیکن اس میں ایسی خامیاں رہ گئیں جو اسے متنازعہ تصنیف بناتی ہیں۔ مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں نہ تو اردو مرثیہ کی تاریخ کے ساتھ انصاف کیا اور نہ انیس کے حالات کی طرف توجہ کی۔ مولانا نذیر احمد کا ذہن منطقی ضرور تھا لیکن ادبی تحقیق کی جانب اُن کا میلان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ عبدالحلیم شرر کی چند تاریخی، سوانحی اور علمی تحریریں یقیناً ان کے ذوق تحقیق کا ثبوت ہیں لیکن انھیں معیاری نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اس طرح ہمارے اہم ترین عالموں اور مصنفوں نے بھی تحقیق کا کوئی معیار قائم نہیں کیا۔ ہاں ان کے بعد خاص طور سے مستشرقین کے خیالات عام ہونے کی وجہ سے اُردو میں بھی تحقیق کی راہیں کھلنے لگیں چنانچہ مولانا سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ محمد شفیع، پروفیسر محمود شیرانی، مولانا عبدالحق، حبیب الرحمٰن خاں شروانی اور ان کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر عبدالقادر سروری وغیرہ نے مختلف حیثیتوں سے تحقیق کے میدان کو وسیع کیا۔

یونیورسٹیوں میں اُردو کی تعلیم عام ہونے لگی تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے موضوعات کی طرح تعلیم کے معیار میں بھی تبدیلی ہوئی۔ نئی کتابیں تیار ہونے لگیں۔ متن کی صحت اور ترتیب کی جانب توجہ ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ قدیم سرمائے کی تلاش نے ایک رومانی کیفیت اختیار کر لی۔ اُردو کے لسانیاتی مطالعہ کی داغ بیل تو بہت پہلے پڑ چکی تھی اور یوروپی مصنفوں کی تحقیقات کا سہارا لے کر یونیورسٹیوں میں بھی غور و فکر کے دروازے کھل گئے تھے لیکن علم اللسان کے اصولوں سے عام عدم واقفیت کی وجہ سے قابل اعتماد نتائج نہیں نکالے جاسکے تھے۔ جیسے جیسے اردو کے قدیم نمونے سامنے آنے لگے، لسانیات کی معلومات بڑھنے لگیں اور ہندوستان[1] کی دوسری جدید بھاشاؤں کی تاریخ مرتب کی جانے لگی، اردو کے آغاز اور ماخذ کے متعلق چھان بین بڑے پیمانے پر شروع ہوگئی۔ اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی

[1] صرف ہندوستان کا ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا عبدالحق، ڈاکٹر زور، مولانا سلیمان ندوی، نجیب اشرف ندوی وغیرہ نے آزادی سے پہلے تحقیق کی راہیں کھول دی تھیں جس کا بہت سا حصہ آج بھی غور و فکر کا سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر تحقیقی کام یونیورسٹیوں کے دائرہ میں ہو رہا تھا لیکن اس کے باہر بھی مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، مرحوم نصیر الدین ہاشمی، مالک رام، سخاوت علی وغیرہ بھی تحقیق کی سطح بلند کر رہے تھے۔

سنہ ۱۹۴۷ء کے بعد تحقیق کی جانب اور توجہ ہوئی۔ یہاں تک تنقید نگاری کا تعلق تھا، نقاد مختلف دبستانوں میں منقسم تھے۔ ایک دوسرے سے اختلافات ادبی یا فکری نقطۂ نظر کا نتیجہ ہوتا تھا لیکن تحقیق میں اس طرح کی جدید گروہ بندی اگر بحث ہو سکتی تھی تو مواد کی دریافت، شواہد کی صحت یا اخذ نتائج کی بنیاد پر ہو سکتی تھی۔ اس لحاظ سے تحقیق میں نقطۂ نظر کا انداز الگ الگ ہونے کے باوجود کسی دوسری صورت سے متعلق زیادہ سے زیادہ معتبر مواد اور اخذ نتائج سے متعلق ہوتا ہے، ہاں اس میں زیادہ موشگافی کرنے کی وجہ سے کبھی کبھی بات غیر ضروری اور غیر اہم بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں۔ لیکن تحقیق کا تقاضا یہی ہے کہ جذباتیت، جانبداری، ذاتی پسند، پہلے سے قائم کیے ہوئے نقطۂ نظر سے بلند ہو کر محض حقائق اور ٹھوس مواد کی بنیاد پر نتائج نکالے جائیں۔ یہ کام مشکل بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ تحقیق جس قسم کی ریاضت، دیدہ ریزی اور دقتِ نظر کا مطالبہ کرتی ہے اس کے لیے بہت تھوڑے سے لوگ موزوں ہو سکتے ہیں۔ اگر تحقیق معیار اور شرائطِ صحت کو پیشِ نگاہ رکھ کر کی جائے تو نہ صرف اپنے نتائج کے اعتبار سے غیر معمولی ادبی کارنامے کی حیثیت سے زندۂ جاوید ہو سکتی ہے بلکہ اپنے طریق کار کی درستی اور دشوار پسندی سے سائنٹفک اصولوں سے کام لینے کا عملی نمونہ بھی بن سکتی ہے۔ بہت تھوڑے سے محققین حقائق کی تلاش، حقائق کی اہمیت، تجزیہ، شواہد کی نوعیت، مختلف علوم اور متعلقہ مسائل کی مدد سے اخذ نتائج اور اس کے ساتھ ہی نتائج کی ادبی اہمیت کا صحیح شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے گزشتہ پچیس سال میں اگرچہ تحقیق کے نام پر ہزارہا صفحات کا مواد سامنے آیا ہے لیکن اس کا تھوڑا حصہ ایسا ہے جو تاریخ ادب میں اپنا مقام بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اکثر تحقیق کا خیال کسی متنازعہ مسئلے سے پیدا ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے مسئلہ اپنی جگہ پر رہ جاتا ہے اور چھوٹے بڑے محققین اپنی بات کی لاج رکھنے کے لیے غیر ضروری باتوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سی خامیوں کے باوجود تحقیق کا ایک معیار بن رہا ہے اور تحقیقی ادب کے ذخیرے میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ یہ بات البتہ قابلِ ذکر ہے کہ اصولِ تحقیق پر چند مضامین کے علاوہ صرف دو تین مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں۔ وہ بھی موضوع کے چند ہی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے متنی تنقید کے لوازم سے بحث کی ہے اور عبدالرزاق قریشی نے کچھ سرسری اصولوں سے۔ اس سلسلہ کا سب سے ضروری کام کتابیات اور حوالہ جات کی تیاری ہے جس کے بغیر تحقیق کا کام مشکل ہی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ بعض رسائل میں بالالتزام جیسے نوائے ادب بمبئی میں اور بعض میں کبھی کبھی جیسے اردو ادب اور ہماری زبان علی گڑھ میں کچھ ایسا مواد یکجا کر دیا جاتا ہے جو تحقیق میں مدد دے سکتا ہے لیکن یہ ناکافی ہے۔ مختلف موضوعات، مختلف مصنفین، مختلف رسائل اور اخبارات سے متعلق یہ کام سائنٹفک طور پر بہت کم ہوا ہے اور جیسی کہ ہماری عادت ہے، جہاں ایک نے کسی موضوع کی طرف توجہ کی، کئی محقق اور نقاد اسی میں الجھ جاتے ہیں اور اکثر تکرار کے سوا بہت کم نیا مواد ہاتھ آتا ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے اندر غالب کی قسمت جاگ اٹھی ہے اور حوالہ جات کی اچھی بری کئی کتابیں مرتب ہو گئی ہیں۔ میر، سودا، آتش، انیس، حالی، آزاد، شبلی اور بہت سے غیر معمولی طور پر اہم شاعروں اور ادیبوں کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ درست ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے اداروں کا [illegible]

مجلس نہیں ہیں جو ان کاموں کو سنجیدگی اور ذمہ داری سے اپنے ہاتھوں میں لے سکیں، لیکن کام اتنا اہم ہے کہ اسے یونیورسٹیوں، سرکاری امداد سے چلنے والی انجمنوں اور تحقیق کا صحیح ذوق رکھنے والے افراد کو اسے اپنے ذمے لینا ہی چاہیے۔ اگر اصول تحقیق پر چند کتابیں اور رسائل مرتب ہو جائیں اور حوالہ جات کی مختلف جلدیں شائع ہو جائیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ تحقیق کی رفتار میں اضافہ ہوگا۔

جہاں تک موجودہ تحقیقی ادب کا تعلق ہے اس کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لینا بھی ایک بڑا کام ہے کیونکہ جیسا کہ کہا گیا اس کا بڑا حصہ نکتہ چینی، لفظی گرفت، ذاتی اختلافات اور خردہ گیری پر مبنی ہے۔ اس میں کہیں کہیں کارآمد باتیں بھی نظر آتی ہیں لیکن وہ بھی اپنے غیر ادبی انداز بیان کی وجہ سے متوجہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں اور تحقیقی نوعیت کی نظمیں، مراسلوں اور مختصر معلوماتی بیانوں کی شکل میں ہونے کی وجہ سے رسائل کے اوراق میں کھو جاتی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ بچ رہتا ہے وہ یقیناً ہمارے علم میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اس ضرورت کا بار بار اظہار کیا گیا ہے کہ شعرا کے کلیات اور دیوانوں کی تخلیقات کے صحیح متن شائع کیے جائیں ورنہ تاریخ و تنقید کی ساری عمارت غلط بنیادوں پر قائم ہوگی۔ یہ کام جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں، خاص کر قدیم قلمی نسخوں کی بنیاد پر صحیح قرأت اور صحیح متن کا تعین محض ادبی ذوق کی مدد سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے لسانیات، عروض، معنی و بیان، علم لغت، تاریخ، تصوف، طب، حکمت اور نجوم، مذہبی علوم اور اساطیری تلمیحات کا علم رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کچھ بڑا اچھا کام کیا جا رہا ہے لیکن ان متنوں کی طرف توجہ کم ہے جن سے اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ مثلاً اس وقت تک میر، سودا، مومن، ظفر، شیفتہ، میر انیس، آتش، ناسخ کے دواوین اس حیثیت سے مرتب نہیں کیے گئے ہیں کہ ان پر کامل اعتماد کیا جا سکے۔ نثر میں تو اور برا حال ہے۔ پھر بھی گزشتہ ربع صدی میں چند ایسے متن مرتب کیے گئے ہیں جن پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر محقق اور ادیب نے ترتیب و تدوین میں اپنے طرز فکر سے کام لیا ہے یعنی کسی نے متن کی تولوں سے مرتب کرنے اور اختلاف نسخ کے واضح کرنے پر زور دیا ہے تو کسی نے مقدمہ اور حواشی میں مفید اور کارآمد معلومات یکجا کی ہیں۔ لیکن علمی اور تحقیقی اعتبار سے ان میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان میں ہر ممکن احتیاط مد نظر رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرے خیال میں جن کو مختلف حیثیتوں سے اہمیت دی جا سکتی ہے وہ ہیں کتاب نورس، دیوان غالب (نسخۂ عرشی)، کدم راؤ پدم راؤ، ارشاد نامہ، قصۂ مہر افروز و دلبر، من سمجھاون، ابراہیم نامہ، لیلیٰ مجنوں، مینا ستونتی، پرت نامہ، بکٹ کہانی، دیوان مرلت، گل رعنا، گنج خوبی، کلمۃ الحقائق وغیرہ۔ ان میں سے بعض کی تحقیقی اہمیت یہ ہے کہ ہمیں ان کے وجود کا علم پہلی بار ہوا اور بعض اپنے مقدمہ، حواشی، ترتیب اور معلوماتی نکات کی وجہ سے توجہ طلب ہیں۔ ان میں سے چند کی بعض خصوصیات کی جانب اشارہ شاید مفید مطلب ہو۔

کتاب نورس کا ذکر ڈاکٹر زور، مولانا عبدالحق، نصیر الدین ہاشمی اور دوسرے محققین کی تحریروں میں اکثر آتا تھا اور بعض غیر تشفی بخش مضامین بھی لکھے گئے تھے۔ لیکن اس کی اصل صورت اس وقت واضح ہوئی جب ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کے متعدد نسخے ڈھونڈ نکالے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا موضوع تحقیق ظہوری تھا۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے موضوع سے تعلق رکھنے والے سارے مواد کا زیادہ سے زیادہ حصہ دیکھ لیتے ہیں۔ پھر جب انھوں نے عادل شاہی دور کا مطالعہ شروع کیا اور ظہوری کی نثروں کا تجزیہ کیا تو انھیں ابراہیم عادل شاہ کے کارناموں سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور اس طرح ان کی رسائی نورس کے متنوں تک ہوئی۔ ان کی دلچسپی کا دائرہ پوری عادل شاہی تہذیب تھا۔ انھوں نے اس عہد کی مصوری، خطاطی، شاعری، زبان اور زندگی کے کئی پہلوؤں کا مطالعہ گہری نظر سے کیا۔ چونکہ نورس کی صحیح ترتیب و تدوین ان تمام متعلقات کے بغیر ممکن نہیں تھی اس لیے کوئی ایسا ہی محقق اس کو ہاتھ لگا سکتا تھا جس کی نگاہ صرف ایک اچھے نسخے کے نقل کر دینے پر نہ ہو بلکہ جو ان دوسرے لوازم پر بھی نگاہ رکھتا ہو جو صحیح متن کی تیاری میں معاون ہوتے ہیں۔ اتنی معلومات کے ساتھ ایڈٹ کرنے کی وجہ سے کتاب نورس کے کئی

پہلو روشن ہو گئے۔ چونکہ اس کے انگریزی اڈیشن کو اس لیے اہمیت حاصل ہوئی کہ اس سے ہندوستانی موسیقی کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد لی جا سکتی ہے جو سولھویں اور سترھویں صدی کے دکن میں رائج تھی اور جس کے فروغ میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا ہاتھ تھا۔

مولانا امتیاز علی عرشی کے مرتب کیے ہوئے دیوانِ غالب کے متعلق کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے سلسلے میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ عرشی صاحب اس سے قبل دستور الفصاحت، مکاتیبِ غالب اور نادراتِ شاہی شایع کر کے اپنے طرزِ تحقیق سے لوگوں کو روشناس کرا چکے تھے۔ دیوانِ غالب کو نئے انداز سے ترتیب دے کر انھوں نے تحقیق کی کچھ نئی راہیں روشن کی ہیں کیونکہ اس کا طریقِ کار مرکب اور پیچیدہ ہے۔ بہت سے قلمی اور مطبوعہ دواوین غالب کی مدد سے متن کی تیاری خود ایک مشکل کام ہے لیکن عرشی صاحب نے اس کے گرد ایک مخصوص ترتیب سے وہ غیر متداول کلام، جو عام اڈیشنوں میں شامل نہیں ہے، اور وہ کلام بھی جو غالب کے نام سے مشہور ہے، جمع کر دیا ہے۔ مقدمہ اور حواشی، مختصر اشاریے ایسی معلومات سے بھرپور ہیں جن سے غالب کے سمجھنے میں غیر معمولی مدد لی جا سکتی ہے۔

کربل کتھا کی اشاعت محض اس لحاظ سے بھی ایک تاریخ ساز واقعہ تھی کہ جس کتاب کے وجود سے کم و بیش مایوسی ہو چکی تھی، اس کا مکمل نسخہ سامنے آ گیا لیکن مالک رام اور ڈاکٹر مختار الدین نے اسے جس طرح ایڈٹ کیا ہے وہ بھی ایک بے مثال تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کتاب کی تلاش کی کہانی بھی دلچسپ ہے اور یہ بات بھی کہ تقریباً ایک ہی زمانے میں اس کے دو اڈیشن الگ الگ تیار کیے گئے۔ ایک کے مرتب ہیں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور دوسرے کے ڈاکٹر مختار الدین اور مالک رام۔ بعض وجوہ سے ڈاکٹر فاروقی کا اڈیشن طباعت کی منزلوں سے گزر جانے کے باوجود شائع نہیں ہو سکا، دوسرا اڈیشن عام ہو چکا ہے۔ اس کی ترتیب اور تدوین میں ان تمام باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے جو کسی کتاب کا محض ایک نسخہ دستیاب ہونے کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی، لسانی، ادبی خصوصیات کے علاوہ مذہبی تلمیحات، روایات اور اشارات، اعلام اور اماکن کو حل کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے اور وہ ساری باتیں واضح کی گئی ہیں جو کسی ایسی تصنیف کے مطالعہ کے وقت ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس میں فضلی کے حالات نہیں ملتے یا نواب اشرف علی خاں کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوتا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ موجودہ مواد میں کچھ نہیں مل سکا، ہو سکتا ہے کہ آئندہ کسی ذریعے سے حالات کی تحقیق ممکن ہو سکے۔ اور اگر اتفاق سے کربل کتھا کا کوئی دوسرا نسخہ ہاتھ آ جائے تو املا اور تلفظ کے علاوہ بعض الفاظ کی لسانیاتی ساخت کے متعلق بھی یقین کے ساتھ کچھ کہا جا سکے۔

خیر، کربل کتھا کے متعلق کم سے کم یہ تو معلوم تھا کہ اس نام کی کوئی کتاب محمد شاہی عہد میں لکھی گئی تھی لیکن قصۂ مہر افروز و دلبر کی صورت تو یہ ہے کہ کسی کو اس کے وجود ہی کا علم نہ تھا۔ غالباً اس داستان کا واحد نسخہ گوالیار میں حضرت جی کے کتاب خانے کی زینت تھا اور ۱۹۲۹ء میں ایک بزرگ نے اسے پروفیسر آغا حیدر حسن کو تحفتہً پیش کر دیا۔ موصوف نے اسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے حوالہ کیا کہ وہ اس کو مرتب کر کے شائع کریں۔ اس واحد نسخہ میں نہ کوئی ابتدائیہ ہے نہ ایسا خاتمہ جس سے کتاب کے مصنف، زمانہ، وطن، مقامِ کتابت، زمانۂ کتابت کے متعلق کچھ معلوم ہو سکے۔ کتاب کے سرورق پر ایک جگہ عیسوی خاں بہادر، ایک دوسرے خط میں لکھا ہوا ہے اور ایسی جگہ پر جہاں عام طور سے مصنف کا نام نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر مسعود حسین نے عیسوی خاں کو عارضی طور پر اس داستان کا مصنف قرار دے کر قصہ کی اندرونی شہادتوں اور لسانی خصوصیات کی بنیاد پر اس کے زمانہ کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ علم اللسان کے ماہر ہونے کی حیثیت سے یہ کام وہی خوبی کے ساتھ کر سکتے تھے۔ تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس کا زمانۂ تصنیف ۱۷۳۲ء اور ۱۷۵۹ء کے درمیان قرار دیا ہے۔ میری ذاتی رائے میں ایسے سارے نتائج عارضی ہی ہو سکتے ہیں کیونکہ جس کاتب نے اسے لکھا ہے اس نے الفاظ کے لکھنے میں کس طرح کا املا استعمال کیا ہے، یہ اس کا انفرادی عمل ہے۔ ممکن ہے کوئی دوسرا

مینا ستونتی (مرتبہ ڈاکٹر غلام عمر خاں)، اور کئی دوسری دکنی مطبوعات
کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صحیح متنوں کے مرتب کرنے
کی طرف جو رجحان ہے وہ خوش آیند بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی۔ ضرورت
اس بات کی ہے کہ اسی طرح اردو ادب کی تخلیقات کی طرف اور توجہ
کی جائے۔ مکتبہ جامعہ نے کلاسیکی ادب کی اشاعت کا جو سلسلہ
شروع کیا ہے اس میں شک نہیں کہ وہ بہت مفید ہے لیکن
متنوں کی صحت کی جانب جتنی توجہ کی جانی ضرورت ہے وہ کم
ہے۔ ہر کتاب میں ایک مختصر لیکن جامع مقدمہ، اختلاف نسخ اور
فرہنگ کا ہونا ضروری ہے تاکہ طلبہ استفادہ کر سکیں اور مطالعے
ذرا مکدر نہ ہو۔

تذکروں کی جستجو اور ترتیب و اشاعت نے اردو ادب کی تاریخ کے
مرتب کرنے میں جو مدد بہم پہنچائی ہے اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں
لگایا جا سکتا۔ گارساں دتاسی نے بہت سے تذکروں کا ذکر
کیا تھا۔ آبِ حیات میں کچھ کے نام آ گئے تھے۔ جو بعض تذکرہ نویس
نے دوسرے تذکروں کا ذکر ضمناً کر دیا تھا۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان
کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ آزادی سے پہلے انجمن ترقی اردو،
بعض دوسرے اداروں نے چند اہم تذکرے شائع کر دیے تھے لیکن
کئی ایسے تذکرے جو گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے یا جنھیں غیر اہم
سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا تھا، محققوں کو متوجہ کرنے میں کامیاب ہوئے
اور گزشتہ پندرہ بیس سال کے اندر تلاش کی رفتار بھی تیز ہوئی ہے
اور رفتارِ اشاعت بھی۔ چونکہ زیادہ تر تذکرے فارسی میں لکھے جاتے
تھے اس لیے کبھی کبھی ان کے خلاصے اور ترجمے بھی شائع کیے گئے ہیں
اور گو تحقیقی نقطۂ نگاہ سے انھیں زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی لیکن
ان کی اضافی افادیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بعض تذکروں
کی دوبارہ اشاعتیں بھی اس لیے مفید ہیں کہ دوسرے خطی نسخوں کے
دستیاب ہونے سے بعض کے متن اختلافی نظر آنے لگے ہیں۔ جن جن
تذکروں کی اشاعت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے وہ ہیں سفینۂ منتخب
(مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی)، تذکرۂ ابن طوفان (مرتبہ قاضی عبدالودود)
گلشنِ سخن (مرتبہ مسعود حسن رضوی)، تذکرۂ مسرت افزا (مرتبہ
قاضی عبدالودود)، خوش معرکۂ زیبا (مرتبہ ڈاکٹر شمیم انہونوی)،
مجمع الانتخاب، صحف الشعرا اور گلِ رعنا (مرتبہ نثار احمد
فاروقی)، گلشنِ ہند (مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد)، دو تذکرے
(مرتبہ کلیم الدین احمد)۔ اس کے علاوہ بعض تذکروں کے خلاصے رسائل
میں اور کچھ رسائل کی شکل میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں سب
سے زیادہ اہمیت عطاء الرحمٰن کاکوی کے شائع کردہ تذکروں
کو حاصل ہے۔ [illegible] نے کئی تذکرے اپنے اشاعتی پروگرام
میں شامل کر رکھے ہیں۔ یہ کام [illegible] ترتیبات کی ضرورت
ہے [illegible] مطبوعہ و غیر
مطبوعہ [illegible] ایک مجموعی فہرست ببلیوگرافی کے طور
پر [illegible] نمایاں فراہم ہو سکیں۔

[illegible] مقالے
[illegible] سال پندرہ بیس
مقالات [illegible] شائع ہوتے ہیں
جن میں سے بعض [illegible] کی تحقیق
[illegible] تحقیق
[illegible] ہوتی ہے۔ بعض [illegible] میں متن کی تصحیح و ترتیب
پر بھی [illegible] کی تعداد کم ہے۔ بعض موضوع
ایسے ہوتے ہیں جن پر تحقیق کی زیادہ گنجائش بھی نہیں ہوتی کیونکہ
نئے حقائق تو اکثر قدیم ادب کے متعلق ہی مل سکتے ہیں۔ اس لیے زیادہ
تر مقالے [illegible] تنقید کی بھرتی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ صرف مثال کے
طور پر ایک مقالہ کا ذکر کر کے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی
بیس سال ہوئے ایک طالب علم نے پنڈت برج نرائن چکبست
کی زندگی اور شاعری پر کام شروع کیا۔ تقریباً دو برس تک وہ ایسے
اشخاص سے ملتا رہا جن کے متعلق ذرا سا بھی خیال ہوا کہ وہ چکبست
کے بارے میں کچھ معلومات رکھتے ہوں گے۔ اس سے فائدہ ہوا لیکن
تحقیقی نقطۂ نظر سے کوئی ایسا مواد نہ ملا جو ان کی زندگی یا ان کے کلام
کے متعلق کوئی غیر معمولی بات بتاتا۔ بہت سے لوگ ان کی وضع قطع،
رفتار گفتار، وکالت کی کامیابی، بحث کے انداز ہی کے متعلق بتاتے

رہے، کسی نے ان کے شعر پڑھنے کے طریقے کا ذکر کیا، کسی نے عزیزوں کا اور عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ برتاؤ کا، کسی نے ان کے سیاسی خیالات کا۔ ان میں سے اکثر باتیں مفید تھیں لیکن مقالہ کے لیے بہت ضروری نہ تھیں۔ بڑی تلاش کے بعد ان کی کچھ ڈائریاں اور رجسٹر ملے۔ ڈائریاں معمولی تھیں ان میں زیادہ تر معمولات کے متعلق یادداشتیں تھیں، کہیں کہیں کسی ادبی جلسہ، مشاعرہ یا مجلس عزا (خاص کر خورشید حسن عزت دولہا صاحب عروج کی) میں شرکت ہونے کا ذکر تھا۔ رجسٹروں میں البتہ کئی کام کی چیزیں ملیں۔ یہ انجمن اصلاح کشمیریان کی کارروائی کے رجسٹر تھے۔ چکبست کا ذکر ان میں بحیثیت نقاد کی حیثیت سے تھا۔ وہ مباحثے کے آخر میں خصوصاً اصلاحی مباحث پر تبصرہ کرتے تھے جن سے ان کے مذہبی، تعلیمی، تہذیبی اور سیاسی خیالات کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہ کارروائیاں نقل طلب تھیں لیکن سب سے زیادہ مفید و کارآمد ایک مضمون وہ ثابت ہوا جس پر چکبست نے اپنی ایک نظم لکھ کر آسر لکھنوی کے بیٹے ... کے پاس بھیجی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ چونکہ انھیں یہ نظم تمام ایک جلسہ میں پڑھنی ہے، اس لیے وہ اس پر ایک نگاہ ڈال لیں۔ عام خیال ہے کہ چکبست نے کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ اس کاغذ سے کم سے کم اتنی بات تو معلوم ہوتی ہے کہ ابتدائی دور شاعری میں باقاعدہ نہیں دوستانہ طور پر کسی کو اپنا کلام دکھا لیتے تھے۔ اسے چاہے تحقیق کہہ لیجیے لیکن کسی اور ذریعہ سے اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہ پڑ سکی۔ نظم بھی غیر مطبوعہ نہ تھی بلکہ جہاں تک یاد آتا ہے، وہی تھی جو "آب امید" کے نام سے صبح وطن میں شامل ہے اور ۱۸۹۹ء میں لکھی گئی تھی۔ اس مثال کے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بعض قسم کے "تحقیقی" مقالات میں تحقیق کی گنجائش بہت کم نکلتی ہے۔

بہرحال یونیورسٹیوں میں جو مقالات منظور ہوتے ہیں ان کے تحقیقی معیار میں یکسانیت نہیں ہو سکتی اور نہ ہوتی ہے کیونکہ ہر موضوع کے مطالبات مختلف ہوتے ہیں۔ تاہم چند مقالات جنھیں دوسروں کے مقابلہ میں معیاری کہا جا سکتا ہے طالب علمانہ کاوش ہی کا نتیجہ ہیں۔ اس وقت جن کا خیال آ رہا ہے ان میں مرزا رفیع سودا (ڈاکٹر خلیق انجم) اردو مثنوی شمالی ہند میں (ڈاکٹر گیان چند) رجب علی بیگ سرور (ڈاکٹر نیر مسعود) خواجہ میر درد (ڈاکٹر وحید اختر) ذوق (ڈاکٹر تنویر علوی) قابل ذکر ہیں کیونکہ ان میں تحقیقی مواد بھی محنت علمی ذوق اور تجسس بصیرت کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ چند اور مطبوعہ مقالات بھی پیش نگاہ ہیں لیکن ان کی تنقیدی اہمیت زیادہ ہے۔

شروع کی سطروں میں اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بہت سا تحقیقی سرمایہ صرف ان مباحث اور تنازعات میں بکھرا پڑا ہے جو رسائل میں اکثر اعتراض، جواب، جواب الجواب اور جواب جواب الجواب کی شکل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا کچھ حصہ ترتیب پا کر کتابی شکل میں شائع ہو جاتا ہے اور کچھ یونہی ادھوری معلومات کی صورت میں کچھ دن زندہ رہ کر ختم ہو جاتا ہے۔ حال میں جو ادبی مہابھارت اس دیوان غالب کے سلسلہ میں چھڑی جو دیوان غالب بخط غالب کہا جاتا ہے، وہ تحقیقی دنیا میں یادگار رہے گی۔ امروہہ کے ایک تاجر کو بھوپال میں ایک دیوان غالب دستیاب ہوا، جو کچھ دن بعد ہند و پاک میں شائع ہوا۔ تین چار سال سے اس بحث کا موضوع بنا ہوا ہے کہ وہ غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس عمر میں لکھا گیا کیونکہ ترقیمہ میں سن کی جگہ خالی ہے۔ کچھ لوگوں نے تو ایک آدھ صفحوں کا عکس دیکھا اور اعلان کر دیا کہ غالب کا دیوان ہے اور انھیں کے قلم سے، کچھ نے شک ظاہر کیا، کچھ نے اپنی تصدیق واپس لی اور کچھ نے انکار کیا کہ یہ دیوان بخط غالب ہے اور وہ بھی انیس سال کی عمر کا۔ اس بحث میں درجنوں ارباب قلم نے حصہ لیا، ہزارہا صفحات لکھے گئے، کتابیں شائع ہوئیں اور کئی ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں جو تحقیقی موشگافیاں کی گئی ہیں، ان سے غالب شناسی میں اضافہ ہوتا ہے نہ اردو شاعری کی تاریخ پر اس کا اثر پڑتا ہے لیکن ذوق تجسس کے وسیع دائروں میں پھیلنے کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ ابھی یہ بحث ختم نہیں ہوئی ہے اس لیے بہت سے لوگ نتیجہ کا انتظار کر رہے ہیں کیونکہ تحقیق کے وہ ذرائع اور حربے ہر محقق اور قاری کی دسترس میں نہیں ہیں جن کی مدد سے یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔

غالب [illegible] تحقیق [illegible] کے میدان میں
[illegible] غالب کا استاد تھا یا شخص ایک
[illegible] کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ۱۹۵۹ء کو
[illegible] مفتی صدر الدین آزردہ
[illegible] خطوط نواب [illegible] کو لکھا
[illegible] شخصیت [illegible] پیش کرتا
[illegible]
[illegible] کے
[illegible] سوالات
[illegible] پہلے بھی اس
[illegible]
[illegible] حنیف نقوی [illegible] نے [illegible]
[illegible] ترتیب دے کر شائع کر دیا ہے۔
[illegible] لیکن تاریخ
[illegible] حیات
[illegible] مواد بھی
[illegible] ہو چکا ہے اور ابھی بہت وقت تک
[illegible] نے بعض خیالات پر نظر ثانی
کرنے پر مجبور کیا ہے [illegible] تحقیق سے دلچسپی لینے والوں کے لیے
[illegible] ضرورت اس کی ہے کہ جو لوگ
[illegible] میں حصہ لیں [illegible] ذمہ داری کا
خیال رکھیں [illegible] تحقیق [illegible] سے ہے لیکن ہمارے
سامنے [illegible] کی شکل میں آتے ہیں کبھی ایک
[illegible] حقیقت [illegible] تاریخ، ماحول، شخصیت
[illegible] نکالنے کی ضرورت
[illegible] کا خون ہوتا ہے۔
[illegible] کے تحقیقی ادب کا ایک [illegible]
ہے کیونکہ [illegible] تحقیق کا تفصیلی ذکر نہیں کیا گیا ہے لیکن
اس کا مقصد [illegible] پیش نظر یہ تھا کہ ان واضح خطوط

کی نشاندہی کروں جن پر اس وقت کاروان تحقیق چل رہا ہے اور
ان [illegible] کا ذکر کروں جو اس راستہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اسی
[illegible] کا [illegible] کا ذکر بھی آ گیا کیونکہ ان کے بغیر مسائل کو
سمجھانا [illegible] تھا۔ [illegible] کا تذکرہ بھی ضمناً آ گیا ہے حالانکہ
[illegible] پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اردو
[illegible] پر جو کام کیا [illegible] نگاہ ڈالتے ہوئے یہ کہوں کہ
[illegible] صحیح نقلیں دستیاب نہ ہو جائیں
[illegible] مسعود حسن ادیب [illegible] کا
[illegible] لیکن پارسی تھیٹر کے ڈراموں کا
[illegible] جب وہ شائع ہو جائیں۔ خوش
قسمتی سے [illegible] پاکستان [illegible] انھیں شائع کر دیا
[illegible] محققوں نے ان کا مطالعہ نہیں کیا ہے) بجز
[illegible] تحقیقی کاموں کو [illegible] راہ بنا کر نئے
[illegible] ناولوں کے آغاز پر ابھی کوئی تحقیقی کام
نہیں [illegible] صحیح ہے کہ اردو میں ناول [illegible] کے اثر سے
[illegible] یہ خیال بھی غور طلب ہے کہ اٹھارویں اور
[illegible] انیسویں صدی [illegible] فارسی میں جو قصے ہندوستان
میں لکھے گئے [illegible] حقیقت نگاری کے نقطۂ نظر سے ناول کی بعض شرطوں
کو پورا کرتے ہیں [illegible] اثرات کو بھی کیوں نہ پیش نگاہ رکھا جائے۔
یہی حال دوسرے اصناف کا بھی ہے، خاص کر ان کی ابتدائی تاریخ
کا۔ یہ کام منظم ریاضت چاہتا ہے جسے ادبی اور تحقیقاتی اداروں
کی نگرانی ہی [illegible] انجام دیا جا سکتا ہے۔ لکھنؤ میں اردو کی ابتدا، فورٹ
ولیم کالج، اردو نثر کا آغاز، اردو اور علاقائی بولیوں کا تعلق چند ایسے
موضوعات ہیں جن پر ابھی بہت کام کرنے کی گنجائش ہے۔

جن محققوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے ان کے علاوہ بھی چند ایسے نام
ہیں جو اپنی جگہ بنا چکے ہیں یا تیز رفتاری سے شہرت کی جانب بڑھ
رہے ہیں کیونکہ ان کی تحریروں میں حقائق کی تلاش اور ان سے نتائج
نکالنے کی مخلصانہ کوشش پائی جاتی ہے۔ بعض کی کئی کئی کتابیں چھپ
چکی ہیں، بعض کے مقالات متوجہ کرتے ہیں اور بعض کی تحریریں میانہ

ہیں جیسے ڈاکٹر محمود الٰہی (نکات الشعراء اور خط تقدیر) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ (اردو نثر کا ارتقا ۱۸۵۷ء تک) علی جواد زیدی (دو ادبی اسکول) عتیق صدیقی (گل کرسٹ اور اس کا عہد، ہندستانی اخبار نویسی) رشید حسن خاں (باغ و بہار، گلزار نسیم، انتخاب ناسخ) مسیح الزماں (اردو مرثیہ کا ارتقا) ڈاکٹر عبدالستار دلوی (من سمجھاون) ڈاکٹر اکبر حیدری (دیوان میر منظومات دلگیر) ڈاکٹر انصار اللہ نظر، ڈاکٹر محمد عقیل، عبدالغفار شکیل، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (ہندستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں) ڈاکٹر نورالسعید اختر (تاج الحقائق) ڈاکٹر ابو محمد سحر (امیر مینائی) عبدالقوی دسنوی، ڈاکٹر نعیم الدین، ڈاکٹر نعیم احمد (شہر آشوب) اور کئی دوسرے ادیب۔ کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے خاص طور پر تحقیق کو اپنا موضوع نہیں بنایا ہے لیکن ان کے اصولوں اور طریق کار پر ان کی نظر ہے۔

اس مختصر جائزے کی بنیاد پر چند اہم نتائج نکالے جا سکتے ہیں اور مستقبل میں تحقیقی ادب کے ارتقا کے لیے انھیں پیش نظر رکھا جا سکتا ہے:

۱۔ اگرچہ متنی تنقید کی طرف توجہ کی جا رہی ہے لیکن بہت سے اہم شعرا اور ادیبوں کے کارنامے یوں ہی پڑے ہیں — کاموں میں تکرار کی طرف رجحان ہے۔

۲۔ متنی تنقید کے علاوہ تحقیق کے دوسرے پہلوؤں مثلاً حوالہ جات اور کتابیات کی تیاری بھی ضروری ہے۔

۳۔ تحقیقی کاموں میں ادبی حسن بھی ملحوظ رکھنا مفید ہوگا۔

۴۔ تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کو لسانیات، تاریخ، لغت، ساجی علوم، معنی و بیان، ادبی اور شعری روایات کے ارتقا کا علم بھی ہونا چاہیے

۵۔ اس وقت تک جو کام ہوا ہے وہ قابل قدر سہی لیکن اس کا بہت سا حصہ نہ تو معیاری ہے اور نہ تاریخ ادب میں اضافہ کرتا ہے۔ ضروری اور غیر ضروری، اہم اور غیر اہم میں تمیز کرنا بھی ضروری ہے۔

۶۔ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں، اس لیے اس وقت تک زبان و ادب کے سلسلے میں جو علمی کام ہوئے ہیں انھیں نئے کام کے لیے مواد ہی سمجھنا چاہیے۔

۷۔ ہمارے اچھے محققوں کو تحقیق کے طریق کار پر بھی اظہار خیال کرنا چاہیے اور اپنے تجربوں سے نئے محققوں کو واقف کر کے ان کی راہ آسان بنانا چاہیے۔

۸۔ یونیورسٹیوں میں جو مقالے لکھے جاتے ہیں، ان کے معیار کی طرف اور زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

★

جشنِ حیات

خنداں لکھنوی

کتنی حسیں زینت صحن چمن ہے آج
کتنا جمیل جلوۂ صبح وطن ہے آج
گونجا ہوا فضا میں پیام حیات ہے
ہنگامۂ بہار چمن در چمن ہے آج
جاگے ہوئے ہیں جو ہر خفتہ کچھ اس طرح
بدلے ہوئے مزاج میں اک حسن ظن ہے آج

سیلاب نور ہر دل مضطر میں ہے رواں
موج صبا میں جلوۂ گنگ و جمن ہے آج
نکھرا نہیں ہنوز یہ معیار زندگی
لیکن ترقیوں کی دلوں میں لگن ہے آج
ہر دل چراغ طور ہے جشن حیات پر
اب منزل کمال پہ ہر علم و فن ہے آج

★

ترانۂ قفس

ظہور رضوی

مولوی حفیظ الرحمان خاں صاحب مجلبی فرخ آبادی اُن مجاہدینِ جنگِ آزادی میں سے ہیں جنھوں نے اوائلِ شباب اور زمانۂ تعلیم ہی سے قائدینِ وطن کی آواز پر لبیک کہہ کر اپنے کو قید و بند کی صعوبتوں کے لیے پیش کر دیا تھا۔ آزادیِ وطن کی تحریک جس وقت ۲۲-۱۹۲۱ء میں خلافت تحریک کے سرفروشانہ دور سے گزر رہی تھی، حفیظ صاحب گوالیار میں میٹرک میں زیرِ تعلیم تھے اپنے خاندانی وقار کے تحت نائب تحصیلداری کے لیے نامزد ہو چکے تھے۔ لیکن مرہٹی زبان کے اخبار کیسری سے جو جنگِ آزادی کا نقیب تھا، متاثر ہو کر اور سب سے زیادہ لوک مانیہ تلک کی بے پناہ جاذبیت سے مسحور ہو کر وہ مجاہدین کی صف میں پہنچ گئے۔ پہلی بار ۱۹۲۱ء میں ان کو ایک سال کی قید کا حکم ہوا۔ اور یہ فتح گڈھ سنٹرل جیل میں محبوس کر دیے گئے۔

تاریخِ وطن کا یہ دور قومی یک جہتی، جذباتی ہم آہنگی اور وطنی ارتباط و محبت کا بہترین نمونہ تھا۔ چنانچہ اس اتحاد و اخوت کے مناظر جیلوں میں بھی دیکھنے میں آتے۔ اسی کے ساتھ مشاہیر مجاہدینِ آزادی کے ذوقِ ادب نے جیل خانوں میں مشقِ سخن بھی جاری رکھی۔ چنانچہ آگرہ ڈسٹرکٹ جیل میں، جو سیاسی قیدیوں کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی، باقاعدہ طرحی مشاعروں کا انعقاد ہوا۔ جیل کی زندگی، روزانہ کے معمولات، ذوقِ سخن اور مشاعروں کے نقوش جو حفیظ صاحب کے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں اور جن کو وہ اکثر دورانِ گفتگو بیان فرماتے ہیں، اس دور کی تاریخِ اسیری کی مقدس یادگار ہیں۔

حفیظ صاحب فتح گڈھ سنٹرل جیل میں مولانا ظفر الملک، پنڈت رام پرشاد مصر تلک وادی، نرائن پرشاد اروڑا، پنڈت برہم دت شاستری، مولوی محمد مصطفیٰ خاں مدّاح پھپھوندوی (جو سیاسی دنیا میں احمق پھپھوندوی کے نام سے معروف تھے) میر عوض رضا فرخ آبادی جو پھپھوند میں گرفتار ہوئے تھے، بابا رگھرانند گورکھپوری وغیرہ تقریباً سو سیاسی قیدیوں کے ساتھ رہے۔ احمق پھپھوندوی اپنے طرز کے منفرد شاعر تھے۔ میر عوض رضا کی گرفتاری پر فرمایا تھا:

رُکے نہ اظہارِ امرِ حق میں　　گئے دھڑلّے سے جیل خانے
پھپھوند والوں کی لاج رکھ لی　　جناب میر عوض رضا نے

فتح گڈھ جیل میں ڈیڑھ ماہ کے قیام کے بعد یہ سیاسی قیدی آگرہ ڈسٹرکٹ جیل منتقل کر دیے گئے۔ یہ جیل ۲۲ء میں سارے ہندستان کی مرکزی جیل تھی۔ یہاں مہاراشٹر، مدراس وغیرہ وغیرہ کے صوبوں کے سیاسی کارکن نظر بند تھے جن میں خصوصیت سے پروفیسر رنگا آئر مدراس سے، مہادیو ڈیسائی مہاراشٹر سے، پنڈت کپل دیو مالوی، پنڈت کرشن کانت مالوی، اڈیٹر ابودھیہ الہ آباد، پنڈت گوبند کانت مالوی، مولوی نذیر احمد خجندی میرٹھی اڈیٹر غالب بمبئی، مولوی حیدر علی، مولوی سید محمد ٹونکی، عبدالمجید خواجہ، پنڈت رام نریش ترپاٹھی، مولانا عارف لکھنوی، بابو رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، بابو رتن لال زمرد سکندر آبادی، اور حافظ محمد عثمان قابلِ ذکر ہیں۔

ان اسیرانِ آزادی میں وکیل بھی تھے، اڈیٹر بھی، عالم بھی تھے حافظ بھی، شاعر بھی تھے ادیب بھی۔ سیاسی اور اخلاقی تربیت کے لیے روزانہ کے معمولات میں مختلف چیزیں شامل تھیں۔ ایک

تقریر گیتا کی تعلیمات پر ہوتی تھی جو اکثر پنڈت رام نرلیش ترپاٹھی کے سپرد تھی جنھوں نے رام چرتر مانس پر ٹیکا لکھا ہے۔ یہ رامائن پر بھی لکچر دیتے تھے۔ ایک نشست درس قرآن کی ہوتی تھی جس کے مہتمم مولانا نذیر احمد خجندی اور مولوی حیدر علی سیتاپوری ہوتے تھے۔

مولوی سید محمد ٹونکی ایک روزانہ دستی اخبار جو نیم شب میں خود تحریر کیا کرتے تھے اور تمام سیاسی قیدیوں کو ہر صبح سناتے تھے اس میں کچھ روزانہ کے جیل کے حالات ہوتے تھے اور کچھ بیرونی خبریں جو کسی نہ کسی طرح جیل کی حدود میں آجاتی تھیں۔ اس دستی روزنامہ کے لیے احمق پھپھوندوی نے کہا تھا:

چو پچ نکالیں ملّا ٹونکی شامت آئے نہ کیوں مرغوں کی

مولوی حیدر علی ایک سادہ کتاب پر مختلف لوگوں کی رائے [illegible] مرتب کر رہے تھے۔ جب ان بزرگ نے احمق صاحب سے اس موضوع پر ان کی رائے کتاب پر لکھ دینے کی خواہش کی تو انھوں نے برجستہ فرمایا:

کیا غضب کی ہیں ادائیں کس بلا کے ٹھاٹھ ہیں
مولوی حیدر علی صاحب بھی پورے آکھاڑ ہیں

حفیظ صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر میں ان بے چارے طویل ریش، سادہ لوح بزرگ کا پورا سراپا تھا:

ایک "بزم بہائم" بھی قائم ہوئی تھی، جس میں مختلف جانوروں کی بولیاں بولنے والے منتخب ہوتے تھے۔ اس کی تصدیق احمق پھپھوندوی کے ایک بحر طویل کے شعر سے ہوتی ہے جو اتفاق سے حفیظ صاحب کے ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے۔ یہ شعر اس تفریحی بزم کے علاوہ اس دور کے حالات کا بھی آئینہ دار ہے۔ شعر یہ ہے جس کا پہلا مصرعہ مندرجہ ذیل ہے:

"ہمیں یاد آتی ہے اب آگرہ کے جیل کی وہ صحبت پر لطف کہ تھا عارف و خواجہ و خجندی و جنیدی و جگت و میاں ٹونکی و ترپاٹھی و رنگا و کرشنا و کیل و یو و عزیز احمد و رگھپت کے سبب سے وہ مصیبت کدہ
دوسرا مصرعہ: ظلم بھی تخت زار مسرت"
کہ رہا کرتی تھی ہر وقت عجب رونق و تفریح

کبھی انجمن شعر و سخن اور احباب کے دل چسپ ترانے کبھی دعوت۔ کبھی گانا، کبھی شطرنج کے میچ اور کبھی بزم بہائم کہ ہوا کرتا تھا جن سے عجب اظہار مسرت"

ہر ہفتہ جمعہ کے دن ایک طرحی مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی جس کی نظامت حفیظ صاحب کے سپرد ہوئی۔ حفیظ صاحب خود خوش کلام اور بے انتہا زود گو شاعر ہیں۔ مکتبۂ فکر و شعر میں حضرت افتخار حسین مضطر خیرآبادی اور حضرت مولانا حسرت موہانی سے استفادہ کیا ہے۔ یہ مشاعرے اس قدر کامیاب ہوئے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ فکر سخن کرنے لگا۔ یہاں تک کہ آٹھواں اور آخری مشاعرہ شب میں اتنی دیر جاری رہا کہ جیل کا لاک اپ (LOCK - UP) وقت پر نہ ہو سکا۔ چنانچہ تادیبی طور پر نمایاں شعراء اور مشاعروں کے سرگرم افراد کو مختلف جیلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان سب مشاعروں میں پڑھے گئے کلام کی ترتیب و تدوین جیل میں ہو گئی تھی۔ مگر اردو میں شائع کیا جانا ممکن نہ ہو سکا۔ البتہ یہ مجموعۂ کلام پنڈت کرشن کانت مالوی نے اپنے ذوق سلیم کے ماتحت 'ابھیودیہ' ہندی میں ترانۂ قفس کے نام سے اپنے پریس سے شائع کیا تھا۔ مگر اس کی اشاعت کے فوراً بعد ہی ان کا "ابھیودیہ" پریس اور ترانۂ قفس دونوں سرکار وقت نے ضبط کر لیے۔ افسوس کہ باوجود مسلسل تلاش اور کوشش کے کوئی جلد اس مجموعۂ کلام کی دستیاب نہ ہو سکی۔ حفیظ صاحب کا حافظہ صرف چند ہی اشعار کی بازیابی کر سکا، جن میں زیادہ تر خود ان کے ہیں۔ مگر یہ اشعار اس دور کے عزم و تاثرات کے آئینہ دار ضرور ہیں۔ اس لیے انھیں یہاں درج کیا جا رہا ہے کہ کم از کم یہی محفوظ ہو جائیں۔

آگرہ جیل کے پہلے طرحی مشاعرے کی ایک غزل کے کچھ اشعار یہ ہیں:

مشکلوں میں نہ کبھی یاد گریباں ہونا	شان عشاق نہیں تنگ بداماں ہونا
کوئی آفت ہو مصیبت ہو سہے خوش ہو کر	آدمی کو نہیں لازم ہے ہراساں ہونا
عشق کی شان ہے عشاق کا شیوہ یہی	چاک دل چاک جگر چاک گریباں ہونا

دوسرا طرحی مشاعرہ اس زمین میں تھا:

اگر ہندی ہے تو ہندوستاں پر جاں فدا کر دے
مٹا دے اپنی ہستی کو وطن کا حق ادا کر دے
مرے دل میں وطن کی آگ کے شعلے بھڑک اٹھیں
بس اب اے حُبِ قومی مجکو وہ طاقت عطا کر دے
اُسی کا جینا جینا ہے اُسی کی زندگانی ہے
مرے جو قوم کی خاطر وطن پر جاں فدا کر دے
وہی کچھ زندگی کا لطف بعدِ مرگ پاتا ہے
جو انساں آپ کو اغراضِ قومی میں فنا کر دے

تیسرے مشاعرہ کا مصرع طرح تھا ع

باطن میں ہیں آزاد بظاہر ہیں نظر بند

اس طرح میں کچھ اشعار ملاحظہ ہوں :

مرنے پہ بھی ہوگا نہ یہ ناسور جگر بند | ہو جائیں گے یہ زندہ و زیادہ اگر بند
جو ملک پہ قرباں ہو کیے جائیں نظر بند | برٹش کی حکومت میں ہے انصاف کا در بند
آزادہ ہوں گے تو یہی شان رہے گی | چھوٹیں گے کبھی اور کبھی ہوں گے نظر بند

چوتھے مشاعرہ میں مصرع طرح تھا۔ ع
تمنیں ہیں شکستہ پائی کی

حفیظ صاحب کی یاد کے مطابق مولانا شاہد فاخری نے فرمایا تھا :

پھانسی پانے کا دل میں ارماں ہے | اس لیے فکر ہے رہائی کی

حفیظ صاحب نے فرمایا تھا :

اہلِ مغرب نے کج ادائی کی | ہندوالوں سے بے وفائی کی
جیل خانے میں وہ مزے پائے | فکر جاتی رہی رہائی کی
اب تو سے ۔۔۔ مانیں گے | ہندیوں نے بہت گدائی کی
لطف مٹ جائیں گے اسیری کے | آ نہ جائے گھڑی رہائی کی

جیل کے باقی مشاعروں کے اشعار باوجود کوشش کے معلوم نہیں ہو سکے۔ تاہم اس قید و بند میں کہے گئے کچھ اور اشعار اور جیل کی زندگی کے کچھ یادگار واقعات قابلِ ذکر ضرور ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند جب سفر جرمنی پر جاتے ہوئے ملاقات کے لیے آگرہ جیل آئے تھے تو حفیظ صاحب نے برجستہ ایک نظم کہی تھی جس کے دو شعر یہ ہیں :

جاتا ہے جرمنی کی طرف اک محبِ قوم | تعلیم بھی ہے سلسلہ جنبانِ حریت
جس کی لگن ہے گاندھی و نہرو کے قلب کو | ہوگا اسی طرح سے وہ سامانِ حریت

آگرہ جیل سے فیض آباد جیل جاتے ہوئے حفیظ صاحب نے فرمایا تھا :

یہ غزل لکھی ہے پرزن وان[1] میں ہم نے حفیظ
آگرہ سے آج فیض آباد کو جاتے ہوئے

اور اس کے بعد فیض آباد جیل سے لکھنؤ جیل جاتے ہوئے فرمایا تھا :

بیڑیاں پہنے ہوئے روزہ کی حالت میں حفیظ
جا رہے ہیں لکھنؤ زندان فیض آباد سے

روزانہ کے معمولات میں ہر صبح نماز، پوجا، ہون، استوتی کے بعد جیل کے میدان میں جمع ہو کر قومی ترانہ گایا جاتا تھا۔ اس پُر کیف منظر سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ سیاسی قیدیوں کے جسم علیحدہ ہیں مگر روح ایک ہے۔ محبتِ وطن، اتحادِ قومی اور اخوتِ باہمی کا جو درس جیل کی زندگی میں ملا وہ کسی کالج اور یونیورسٹی میں نہیں مل سکا۔ آج سے پچاس سال قبل کے چھوت چھات کے نظریات کی موجودگی میں بھی یہ سیاسی قیدی رنگ و نسل اور قوم و مذہب کی تفریق سے کوسوں دور تھے۔ غذا کے لیے خام سامان لینے کو ترجیح دی جاتی تھی۔ کھانا پکانے اور ساتھ کھانے میں کسی امتیاز کو دخل نہیں تھا۔

فیض آباد جیل میں الہ آباد اور اودھ کے علاقہ کے سیکڑوں اسیرانِ سیاسی اور مجاہدینِ آزادی جمع تھے۔ ان میں نمایاں حضرات للتی جی، دیا کرشن گجوز، سید صغیر حسن، سید مظفر حسن اور حافظ محمود سے انا ضل بھی تھے۔ اکثریت مسلمان سیاسی قیدیوں کی تھی۔ ماہِ صیام آتے ہی جیل کے حکام سے درخواست کی گئی کہ سیاسی قیدی تراویح باہر کھلی فضا میں پڑھیں گے۔ لہٰذا لاک اپ[2] بعد نماز ہو۔ مگر جیل کے سپرنٹنڈنٹ رائے بہادر مٹھن لال، جن کو سب سیاسی

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

---

[1] PRISON VAN   [2] LOCK UP

ہندستان میں تعلیم کے حالیہ رجحانات

ڈاکٹر سلامت اللہ

ہندستان کی موجودہ صورتِ حال میں تعلیمی رجحانات کا ذکر کیجیے تو حالیہ زمانے کے بعض حیرت انگیز واقعات کی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ یہ واقعات نہ صرف تعلیمی کام کرنے والوں کے ذہن و دماغ پر حاوی ہیں بلکہ عوام کے لیے بھی فکرمندی اور تشویش کا باعث ہیں۔ طلبا مسلسل بغاوت کے موڈ میں دکھائی دیتے ہیں۔ آئے دن اخبارات غصہ زدہ نوجوانوں کی سرگرمیوں کی سرخیاں ہوتی ہیں۔ ان دنوں تشدد میں بھی عام طور سے دلچسپی پائی جاتی ہے۔ ہڑتالیں اور گھیراؤ بھی اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ ان واقعات کی اہمیت سے بھلا کون انکار کر سکتا ہے۔ تعلیمی میدان کے یہ ایسے حقائق ہیں جن سے چشم پوشی کرنا ملک کے لیے خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن ان رجحانات پر روشنی ڈالنے کا یہ مناسب موقع نہیں ہے۔ یہاں صرف ان تعلیمی رجحانات کا ذکر کیا جائے گا جو تعلیمی میدان میں ہمارے ملک کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں، نیز ان رکاوٹوں کی طرف بھی اشارہ کیا جائے گا جو ملک کی تعلیمی ترقی میں مانع آسکتی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں برطانوی دور میں تعلیمی نظام کا ایک محدود مقصد تھا۔ ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے ضروری تھا کہ ادنیٰ درجے کی ملازمتوں کی حد تک ہندستانیوں کی خدمات حاصل کی جائیں تاکہ وہ حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان رابطہ قائم کر سکیں۔ یہی وہ مقصد تھا جس کو سامنے رکھتے ہوئے پورا تعلیمی نظام مرتب کیا گیا تھا۔ خوبصورت الفاظ میں اسے "لبرل تعلیم" کہا جاتا تھا یعنی ایسی تعلیم جو انسانی فکر و نظر کو آزادی عطا کرتی ہے۔ لیکن دراصل اس تعلیم کا مقصد بالکل برعکس تھا۔ یہ حقیقتاً پیشہ ورانہ تعلیم تھی اور وہ بھی بہت تنگ معنوں میں۔ جو کچھ سکھایا جاتا تھا اور جس طرح سکھایا جاتا تھا، دونوں کا اثر ذہن کو وسعت دینے کے بجائے ایک حد اور دائرے میں بند کر دینا تھا کہ آدمی اپنی صلاحیتوں کو چند مخصوص حدود میں محدود رکھے۔ جو غیر ملکی حکومت نے ہندستانیوں کے لیے جائز قرار دی تھیں۔ مزید برآں اس تعلیم کی سماجی زندگی کے ساتھ کوئی مطابقت بھی نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ عوام سے دور ہوتا گیا۔ اس طبقے کے لوگ خود اپنے ملک میں اجنبیوں کی طرح زندگی گزارنے لگے۔ لیکن وہ حکمرانوں کی توقعات پر پورے اترتے تھے کیونکہ یہ وفادار ملازمین حکومت برطانیہ کی ہر صورت حمایت کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے۔ اس طرح جو تعلیمی نظام قائم کیا گیا، اس کے ذریعے لیسے افراد تیار ہوئے جن کے نزدیک ذاتی مفاد مقدم تھا اور انھیں اس کی بالکل پرواہ نہیں تھی کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس تعلیم کی اساس بہت محدود تھی۔ صرف خوشحال طبقے کے لیے تعلیم کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔ جہاں تک عوام کی تعلیم کا تعلق ہے یہ کہا جاتا تھا کہ اعلیٰ طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ عوام تک علم کی روشنی پہنچائیں گے۔ لیکن تجربے نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ نہیں ہونے والا تھا۔

ناقص نظامِ تعلیم کے باوجود ہندستانیوں کی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی بدحالی نے قومی بیداری پیدا کی اور کافی طویل جد و جہد کے بعد ہندستانیوں نے آزادی حاصل کر لی۔ قومی تحریک کے باشعور رہنماؤں نے جس نظامِ تعلیم کو ہمیشہ ناقص اور نقصان دہ سمجھا تھا اس

آزادی کے بعد تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر گزشتہ
پچیس سال کے دوران تعلیمی نظریات میں اور انھیں عملی جامہ پہنانے
کے طریقہ کار میں کافی حد تک بہتری کی صورت پیدا ہوئی ہے۔

آزادی کے بعد کے دور میں اس پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ تعلیم
کا اصل رول کیا ہے۔ تعلیم کو اب قومی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔
یہ اس محدود نظریے سے بالکل مختلف ہے جس کے مطابق تعلیم کو محض فرد
کے ذاتی مفاد کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس سے پہلے یہی نظریہ
عملاً رائج تھا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تعلیمی میدان میں قومی ترقی کے
کیا تقاضے ہیں۔ تعلیم اس وقت بامعنی ثابت ہو سکتی ہے جب ہم اس
سماجی نظام کے پس منظر کو مدنظر رکھیں جو ہم اپنے ملک میں قائم کرنا چاہتے
ہیں۔ ہمارا نصب العین سوشلسٹ قسم کا سماج قائم کرنا ہے۔ اس معاشرے
میں سب سے پہلے قومی وسائل کو ترقی دی جاتی ہے جن میں تمام
مادی، انسانی، اقتصادی اور ثقافتی وسائل شامل ہیں۔ اس کے
بعد ہر شخص کے لیے اطمینان بخش اور خوش حال زندگی کے مواقع
فراہم کرنے کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے سماجی نظام کی
دوسری شرط قومی دولت پر سماجی کنٹرول ہے تاکہ سماجی انصاف
قائم کیا جا سکے اور ہر شخص کو بھرپور زندگی سے فیض یاب ہونے کے
مساوی بنیاد پر کافی مواقع فراہم کیے جا سکیں۔ مساوی مواقع فراہم
کرنے کا اصول نہ صرف دولت کی تقسیم کے میدان میں کارفرما ہونا چاہیے
بلکہ یہ بھی مد نظر رکھا جائے کہ جو کچھ پیدا کیا جائے اس میں ہر شخص حصہ دار
ہو اور اسے استعمال کرنے کے مساوی مواقع حاصل ہوں۔

اس طرح تعلیم آج قومی ترقی کے ان دونوں پہلوؤں پر روشنی
ڈالتی ہے۔ ایک طرف تو تعلیم ایسی عادتیں اور مہارتیں پیدا کرتی
ہے جو ملک کی مادی دولت میں اضافے کے لیے ضروری ہیں اور دوسری
طرف تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی محنت سے حاصل کردہ وسائل
سے جائز طور پر فائدہ اٹھانے کا رجحان افراد میں پیدا کیا جائے۔ یہ
بات واضح ہے کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم میں سماجی لحاظ سے نفع بخش
کام کو اولین حیثیت حاصل ہے اور اسی طرح ہمہ مقصدی ثانوی تعلیم
کی تجویز میں پیداوار پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ دونوں
اسکیمیں اتنی ترقی نہیں کر سکیں جتنی کہ کرنا چاہیے تھی، تاہم اس سے
انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پیداواری سرگرمیوں نے ہمارے اسکولوں
میں بحیثیت مجموعی کسی نہ کسی طرح ایک خاص مقام حاصل کر لیا ہے۔

آج پیداوار کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو تعلیم دی جاتی ہے
اس کے خلاف لوگوں میں بہت زیادہ مزاحمت کا جذبہ موجود نہیں ہے
دراصل ملک کے نفاست پسند اور اعلیٰ طبقوں میں بھی تکنیکی تعلیم کا
رجحان زور پکڑتا جا رہا ہے اور بہت مہنگے اور مخصوص اسکول جنھیں غلط
طور پر پبلک اسکول کہا جاتا ہے، اس بات کے حق میں ہیں کہ طلبا عملی
کاموں میں حصہ لیں مثلاً مٹی کا کام، کاغذ اور گتے کا کام، نجاری کا کام وغیرہ۔

لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں سب
سے زیادہ اہم سماجی ضرورت یعنی پیداوار بڑھانے کو ملحوظ رکھا جانے
لگا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے صحیح
طریقہ کار اپنایا جا رہا ہے۔ اب تک اسکولوں میں پیداواری کام سکھانے
کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا ہے۔ اس کی بڑی
وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے کام میں دلچسپی محض سطحی ہے اور سکھانے کا جو طریقہ
اختیار کیا گیا ہے وہ ناقص ہے۔ اس لیے اس بات پر حیرت نہیں ہونا
چاہیے کہ پیداواری کام سے اکثر متوقع فائدے حاصل نہیں ہوئے اور
کام کی طرف طلبا میں جو صحیح رویہ پیدا ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو سکا
اسی طرح تکنیکی اور زرعی تعلیم کے میدان میں بھی خاطر خواہ پیش رفت
نہیں ہوئی ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں میں جن کا مقصد تکنیکی
کام سکھانا ہے کم و بیش یہی صورت حال ہے یعنی یہاں بھی پیداواری
کام کی طرف صحیح رویہ کا اسی طرح فقدان ہے جس طرح عام تعلیم کے
اداروں میں۔ اس کمزوری پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ
سب لوگ مل کر کوشش کریں جو تعلیمی میدان میں کام کر رہے ہیں
اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمے داری خود اساتذہ پر عائد
ہوتی ہے۔ اس طرح تعلیم کو سماجی ضروریات پوری کرنے کے لیے
مثبت رجحانات کا حامل بنایا جا سکتا ہے۔ کام نہ کرنے کے لیے
یہ بہانہ تلاش کرنا کہ جسمانی محنت کے خلاف عام طور پر جو رجحان پایا جاتا
ہے، اسکول اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ

ان مفاد پرستوں کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں جو موجودہ صورت حال کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ انتہائی شرمناک شکست ہے۔

اوپر کی سطور میں جس تعلیمی رجحان کا ذکر کیا گیا ہے اس سے متعلق ایک اور رجحان یہ ہے کہ سماج کے تمام طبقوں کے لیے تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کیے جائیں۔ یہ سماجی انصاف کا بنیادی اصول ہے۔ ایک طرف تو اس سے فرد کی صلاحیت کو خود اس کے ذاتی مفاد میں فروغ دینے کا امکان پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ سماج کے اجتماعی وسائل میں اضافے کے لیے بھی نہایت اہم ہے۔ گزشتہ پچیس سال کے دوران تعلیم کی بنیاد مسلسل وسیع تر ہوتی گئی ہے۔ اگرچہ دستور ہند کی دفعہ ۴۵ میں کی گئی ہدایت کے بموجب ملک ابھی تک چودہ سال تک کی عمر کے تمام بچوں کو مفت، لازمی ابتدائی تعلیم مہیا نہیں کر سکا ہے، تاہم کثیر تعداد میں اس عمر کے بچوں کو اسکول جانے کی سہولتیں فراہم کی جا چکی ہیں اور موجودہ اندازے کے مطابق ۱۹۸۰ء تک دستوری ہدایت کی تکمیل ہو جائے گی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اب جو بچے اسکولوں میں جاتے ہیں ان میں کافی تعداد ایسی ہے جن کی سابقہ نسلوں نے یعنی باپ، دادا یا والدین نے کبھی اسکول کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اتنی بڑھ رہی ہے کہ تعلیمی اداروں کی تعداد اور ان میں طلبا کے لیے نشستیں بڑھانے کے باوجود ابتدائی اور ثانوی دونوں منزلوں پر طلبا کی تعداد کے لحاظ سے تعلیمی سہولتیں ناکافی ثابت ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کی سطح پر بھی تعداد میں بہت اضافہ ہو رہا ہے۔ تعلیم کی توسیع اتنی تیزی سے ہو رہی ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ تعلیم کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ ڈسپلن کا مسئلہ بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ڈسپلن کی خرابی کا ایک سبب یہ ہے کہ طلبا کی تعداد میں بہت غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور ان کا تعلق سماج کے مختلف طبقوں سے ہے جن کی روایات جدا جدا ہیں اور جن کی اقدار ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مساوی تعلیمی مواقع فراہم کرنے کی سمت میں یہ ایک صحیح قدم ہے۔

بعض لوگ نفسیاتی اصولوں اور بظاہر معقول دلیلوں کا سہارا لے کر تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ذہانت، صلاحیت، رجحان اور قابلیت کے اعتبار سے افراد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان مختلف صلاحیتوں کے طلبا کے لیے تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنا، قومی وسائل کو ضائع کرنا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کم ذہین اور کم صلاحیت والے بچے اعلیٰ قسم کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے اتنے مستحق نہیں ہیں جتنے کہ زیادہ ذہین بچے۔ لیکن بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس دلیل میں کچھ زیادہ وزن نہیں ہے۔ اوّل تو ذہانت اور دوسرے رجحانات جنھیں ہم پیدائشی اور موروثی سمجھتے ہیں دراصل سماجی اور مادی حالات کی دین ہوتے ہیں اور بڑی حد تک ان کا تعلق اس ماحول سے ہوتا ہے جس میں فرد کی نشو و نما ہوتی ہے۔ دوم، پہلے سے قطعی طور پر یہ طے کرنا مشکل ہے کہ تعلیمی مواقع کے سلسلے میں کس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ تمام بچوں کو مساوی مواقع فراہم کرنے کے بعد ہی اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی مخصوص چیز کے سیکھنے میں بچوں کی صلاحیت ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہے۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایسے بچوں کو جو یکساں استعداد اور صلاحیت نہ رکھتے ہوں برابر سمجھنا اتنی ہی بے انصافی ہوگی جتنی کہ مساوی استعداد رکھنے والوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ حق بجانب نہیں ہیں جو انصاف اور مساوات اور بعض اوقات جمہوریت کا نام لے کر سماج کے کمزور طبقوں کو دی جانے والی ان مراعات اور خصوصی سلوک کی مخالفت کرتے ہیں جو خاص طور پر درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبیلوں کو دستور ہند کی دفعہ ۴۶ کے تحت حاصل ہیں۔ ہمارے سماج کے ان طبقوں کی پسماندگی کی تاریخی وجوہات ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ فطری یا پیدائشی طور پر کمتر ہیں۔ یہی بات عورتوں اور کچھ دوسرے پسماندہ طبقوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں طاقت ور حکمراں طبقے نے صدیوں سے دبا کر کمتر حیثیت میں رکھا ہے۔ اگر ہمارے سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ہے تو اس تاریخی غلطی کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کمزور طبقے کے مفادات ہماری خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ تعلیم اور روزگار دونوں میدانوں میں اس کی جھلک دکھائی

دیتی ہے۔ لیکن یہاں بھی اس سمت کی راہ عمل میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لئے مفاد پرست عناصر چپکے چپکے کام کرتے رہتے ہیں۔ پیشہ ورانہ کالجوں اور اعلیٰ تعلیم کے دوسرے اداروں میں سماج کے کمزور طبقوں کے لئے گرانٹ اور وظیفے وغیرہ مخصوص کیے گئے ہیں اور ان کے لیے نشستیں بھی متعین کی گئی ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس تناسب سے ان کی تعلیم کا معیار بلند کرنے کے سلسلے میں ابھی تک کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ آئین کی دفعہ ۴۶ کو جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے عملی جامہ پہنانے کے لیے بہت چوکس رہنے کی ضرورت ہے تاکہ ایک طرف تو ہر قسم کے مکر و فریب سے باخبر رہا جائے اور دوسری طرف پسماندہ طبقوں کی ترقیاتی سرگرمیوں کو تقویت پہنچانے کے پختہ ارادے کو بروئے کار لایا جاسکے۔

اس کے ساتھ وابستہ تعلیم کا ایک اور رجحان قابل غور ہے۔ اس سے میری مراد تعلیمی منصوبہ بندی سے ہے جو کہ قومی ترقی کی مجموعی منصوبہ بندی کا جزو لاینفک ہے۔ موجودہ دور میں پلاننگ کی ایک عالمگیر حیثیت ہوگئی ہے۔ کوئی بھی ملک خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب اسے نظر انداز نہیں کرسکتا، یہاں تک کہ صنعتی طور پر اعلیٰ ترقی یافتہ ممالک نے بھی جن کی معیشت کاروبار کی آزادی کے اصول پر مبنی ہے اپنی قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں عدم توازن کو دور کرنے کے لیے کسی نہ کسی شکل میں پلاننگ کی طرف رجوع کیا ہے۔ ترقی پذیر اور پسماندہ ملکوں میں جہاں مادی اور انسانی وسائل بہت ناکافی ہیں، پلاننگ کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ ہندستان اس وقت ترقی کے جس مرحلے میں ہے اس کے پیش نظر اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اپنے محدود وسائل کو بے تکے پن سے استعمال کرے۔ ہمیں اپنی قومی ترقی کے نصب العین کے پیش نظر اپنے طویل مدتی اور حالیہ مقاصد کے حصول کے لیے ترجیحات طے کرنی ہوں گی اس لیے پلاننگ کا ایک منظر ہمارے سامنے ہونا چاہیے۔ قومی ترقی کی منصوبہ بندی میں تعلیم کے رول کو دونوں طرح سے دیکھنا ہوگا۔ ایک تو اس طرح کہ تعلیم ملک کے انسانی وسائل میں اضافے کے لیے ضروری ہے اور دوسرے اس طرح کہ تعلیم سماجی خدمت کی ایک قسم ہے جس

کے ذریعے انسان کی انفرادی اور سماجی دونوں لحاظ سے نشو ونما ہوتی ہے۔ تعلیم کو ایک طرف تو ترقی پذیر معیشت اور خدمات کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تربیت یافتہ افراد مہیا کرنا ہوں گے اور دوسری طرف تعلیم کا کام یہ ہوگا کہ ایسے مہذب مرد اور عورتیں ابھر کر سامنے آئیں جو اپنی شخصی زندگی کی تشکیل و تربیت نیز سماج کی فلاح و بہبود کے لیے عقلِ سلیم کو بروئے کار لاسکیں۔ تعلیم کی منصوبہ بندی اس طرح کی جانا چاہیے کہ یہ مقصد حاصل ہوسکے۔

گزشتہ چھبیس سال کے دوران ہندستان میں تعلیم کے شعبہ میں بھی اسی طرح منصوبہ بندی کی گئی ہے جس طرح قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں۔ گزشتہ پانچ سالہ منصوبوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں ہر سطح پر تعداد کے اعتبار سے کافی توسیع ہوئی ہے۔ لیکن ہر ایک پلان میں جو نشانے مقرر کیے گئے تھے وہ اکثر پورے نہیں ہوسکے۔ تقریباً مجوزہ کام نامکمل رہ گیا۔ منصوبہ بندی کے سلسلے میں کچھ بنیادی غلطیاں ہوئی ہیں۔ مثلاً نشانوں کو ضرورت سے زیادہ اونچا مقرر کرنے میں حقیقت پسندی کے احساس کی کمی کا ثبوت ملتا ہے۔ ان منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ پہنانے کے لیے جو مادی اور انسانی وسائل درکار تھے ان پر حقیقت پسندی کے ساتھ پہلے سے غور نہیں کیا گیا۔ حقیقت پسندی کی کمی کا اظہار اس طریقہ کار سے بھی ہوتا ہے جو پلاننگ میں اختیار کیا گیا۔ پلاننگ بالکل اوپر سے شروع کی گئی۔ تمام اعداد و شمار مرکز کی طرف سے اکٹھے کیے گئے، اور انھیں اعداد و شمار کی بنیاد پر منصوبوں کی تشکیل کی گئی۔ ان مخصوص حالات پر توجہ نہیں دی گئی جن کے تحت منصوبے پر عمل درآمد ہونا تھا۔ اس غلطی کو درست کرنا ضروری ہے۔ اگر متعینہ قومی مقاصد کی روشنی میں پلاننگ کا کام انفرادی اداروں یا مقامی حالات کی بنیاد پر شروع کیا جاتا تو شاید زیادہ حقیقت پسندانہ اور مربوط قومی پلان تشکیل دیا جاسکتا تھا۔

اس تنقید میں کافی وزن معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی تعلیم یعنی ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کو ان منصوبوں میں خاطر خواہ ترجیح نہیں دی گئی ہے۔ ایک ماہر تعلیم کا یہ قول ہندستان کی

موجودہ تعلیم پر صادق آتا ہے کہ ہماری تعلیمی عمارت کی نہ بنیاد مضبوط ہے اور نہ اس کی چھت محفوظ اور پائیدار ہے۔ عوام کی کثیر تعداد جیسے ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کی ضرورت ہے، دراصل قومی دولت پیدا کرتی ہے۔ اس لیے عوام کی تعلیم کو ہماری تعلیمی منصوبہ بندی میں سب سے زیادہ اہمیت دی جانا چاہیے تھی۔

مزید برآں تعلیم کی تیزی کے ساتھ توسیع کرنے کے جوش میں تعلیمی معیار کے پہلو کو نظرانداز کر دیا گیا۔ طلبا اور تعلیمی اداروں کی تعداد میں تو برابر توسیع ہوتی رہی مگر تعلیمی معیار پر سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا گیا۔ اناطول فرانس نے کتنا صحیح کہا تھا کہ لوگ مرجانا پسند کریں گے لیکن غور و فکر کرنا نہ چاہیں گے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ اب پلاننگ کرتے ہوئے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے پر بھی زور دیا جائے۔

اب نصاب تعلیم اور پڑھانے کے ان چند اہم رجحانات پر غور کرنا ہے جو اس تعلیم کے پس منظر پر پورے اترتے ہوں جس کا خاکہ بالائی سطور میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ اہم رجحان نصاب تعلیم اور تعلیمی مواد کو بہتر بنانے کی باشعور کوشش کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ رجحان خاص طور پر سائنس اور سماجی علوم کے میدان میں بہت نمایاں ہے۔ اگر تعلیم قومی ترقی میں اپنا رول ادا کرتا چاہتی ہے تو ان مضامین کا مناسب مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

آج کی دنیا میں ہر ایک صنعت اور ٹیکنالوجی کی بنیاد سائنس پر ہے۔ جدید دنیا میں تمام تر ترقی کا سرچشمہ سائنس کا علم ہی نہیں بلکہ وہ جذبہ یا نقطۂ نظر ہے جو سائنسی طریقوں کو اپنانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسکولوں کے نصاب اور عام تعلیم کے ایک حصے کے طور پر انڈر گریجویٹ تعلیمی پروگرام میں سائنس کی تعلیم پر جو زور دیا جا رہا ہے وہ نہایت خوشگوار رجحان ہے۔ علم کی حالیہ حیرت انگیز ترقی بالخصوص سائنس کے میدان میں علم کی ترقی کے پیش نظر اسکولوں کے نصاب میں سائنس کے مواد تعلیم کا معیار بلند کیا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ جو اساتذہ اسکولوں میں کام کر رہے ہیں ان کے لیے ایسے پروگرام شروع کیے جائیں جن کی مدد سے وہ ان چیزوں سے واقف ہو سکیں جو انھیں نئے نصاب کی رو سے پڑھانا ہوں گی۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن سب سے زیادہ نتیجہ خیز چیز جو سائنس کے مطالعے سے حاصل ہونی چاہیے اس پر اتنی توجہ نہیں دی جا رہی ہے جتنی کہ ضروری ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے جدید دور میں تمام ترقی کی بنیاد سائنسی نقطۂ نظر ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لیے سائنس ہی کے معلمین میں نہیں بلکہ دوسرے مضامین پڑھانے والے تمام استادوں میں سائنسی رجحان کارفرما ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود معقول طریقے پر چیزوں کا مشاہدہ کر کے نتیجے اخذ کریں۔ انھیں کسی روایت یا طاقت کے دباؤ میں آ کر خواہ وہ کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو بغیر جانچے پرکھے کسی بھی نظریے کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے سماج میں توہمات اور تاریک اندیشی اتنی زیادہ ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ اسکول کی فضا پر بھی یہ چیزیں چھائی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی نادانستہ اور کبھی دانستہ طور پر اسکول پروگراموں کے ذریعے انھیں اور تقویت پہنچائی جاتی ہے۔ اس لیے محض سائنسی معلومات فراہم کرنا کافی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبا میں مشاہدے، تجربے اور تجزیے کی اور نتائج اخذ کرنے اور انھیں صحیح مقام دینے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اسے ایک لفظ میں یوں کہہ لیجیے کہ سائنسی نقطۂ نظر پیدا کیا جائے، تب کہیں جا کر تعلیم موجودہ توہمات اور تعصبات کو دور کرنے میں کامیاب ہو سکے گی۔

جہاں تک اسکول کے نصاب اور انڈر گریجویٹ تعلیمی نصاب میں سماجی علوم شامل کرنے کا سوال ہے تو جس طرح سائنس کے سلسلے میں اسی طرح اس معاملے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مضمون کو اس طرح پڑھایا جائے کہ طلبا میں سماج کے مختلف اداروں اور طریقہ کار کے بارے میں صحیح رویہ اپنانے اور ان کو ٹھیک طور سے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جا سکے۔ ہمارے جیسے ملک میں جہاں زبان، ذات پات، مذہب، علاقے اور کلچر کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس مضمون کے مطالعے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس بات میں شبہ ہے کہ کیا سماجی علوم کے مطالعے سے ہمارے طلبا میں کثرت میں وحدت کا نظریہ پیدا ہو بھی رہا ہے جیسی کہ توقع ہے۔ قومی ترقی کے

لیے ملک میں موجود مختلف النوع معاشروں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ سائنسی نقطۂ نظر اپنانا۔ یہاں پہ طالبات کا رول توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔

مضمون طویل ہوگیا ہے لیکن دو رجحانات اور قابل ذکر ہیں، کیونکہ میرا خیال ہے کہ تعلیمی ترقی میں ان کی کافی اہمیت ہے۔ اس میں ایک رجحان کا تعلق طلبا کی ترقی کا جائزہ لینے سے ہے، جسے جائزہ (EVALUATION) کہا جاتا ہے اور دوسرا توسیعی پروگراموں کے ذریعے ان اساتذہ کی کارکردگی کو بہتر بنانا ہے جو اسکولوں میں کام کر رہے ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں جائزہ کا مطلب طلبا کی مجموعی ترقی کے مختلف پہلوؤں یعنی علمی استعداد، کردار، شخصیت وغیرہ کا جائزہ لینا ہے۔ اس کا مقصد ایک خاص وقت میں محض طلبا کی علمی نشو و نما کو ریکارڈ کرنا اور اس کی تصدیق کرنا ہی نہیں ہے بلکہ جائزہ کا اصل مقصد، ترقی کے پورے عمل میں مدد کرنا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد ہی کہ جوتا کس جگہ کاٹتا ہے، اس کی مرمت کرائی جاتی ہے۔ جائزہ یا جانچ، تعلیمی طریقۂ کار کا جزو لاینفک ہے۔ گزشتہ دس سال کے دوران جائزہ کا نظریہ اساتذہ، تعلیمی منتظمین اور سرکاری امتحانات سے متعلق حکام میں کافی مقبول ہوا ہے۔ اس مقصد کے لیے مختلف سیمیناروں، کانفرنسوں اور جلسوں کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ جائزہ اب اساتذہ کی تعلیم سے متعلق تمام پروگراموں کا ایک ضروری حصہ ہوگیا ہے۔

اس نظریے کی روشنی میں امتحانات لینے والے بعض اداروں نے امتحانات کی تکنیک میں تبدیلیاں بھی کر دی ہیں۔ اس کا اظہار اس لائحہ عمل سے ہوتا ہے جو اسکولوں میں اختیار کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود تعلیم کی مجموعی ترقی پر جائزے کے نئے تصور کا کوئی قابل ذکر اثر نہیں پڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملے پر تعلیم کے دوسرے لوازمات سے الگ ہو کر غور کیا گیا ہے۔ جائزے کو جب تک نصاب اور پڑھانے کے پورے معاملے کے ساتھ منسلک کر کے اس پر غور نہ کیا جائے گا، اس وقت تک محض نئی تکنیک استعمال کرنے سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

اب اس بات میں صداقت نہیں رہی ہے کہ جو ایک مرتبہ استاد ہوگیا وہ ہمیشہ کے لیے استاد ہے۔ استاد کو بھی دوسرے پیشے کے لوگوں کی طرح ان تمام ترقیوں کے بارے میں جدید ترین معلومات ہونا چاہیے جو تعلیم کے میدان میں ہوتی رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آج کی یہ مخصوص ضرورت پوری کرنے کے سب سے زیادہ اہل استاد ہی کے مدرسے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بہت سے کالجوں کو توسیعی پروگرام ترتیب دینے کا کام سونپا گیا ہے تاکہ اساتذہ اپنے اپنے اسکولوں میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنا سکیں۔ اس سلسلے میں جو کام کیا گیا ہے اس کی بہت سی رپورٹیں موجود ہیں جو اساتذہ ملازمت کرتے ہوئے اپنی علمی اور پیشہ ورانہ استعداد بڑھانا چاہتے ہیں ان کے پروگراموں کو کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے زیادہ پائیدار اور بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

★

ترانۂ قفس — (صفحہ ۴۳ کا بقیہ)

(صفحہ ۴۳ کا بقیہ)

قیدی "نانا" کہہ کر مخاطب کرتے تھے جیل کے قواعد کی بنا پر کسی صورت سے اس رعایت کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس باب میں تمام ہندو اور مسلم سیاسی قیدیوں کی مجلس شوریٰ بیٹھی اور یہ طے ہوا کہ افطار صوم کے بعد تراویح باہر ہی پڑھی جائے گی۔ مسلمان قیدی نماز پڑھیں گے اور ہندو قیدی ان کی حفاظت کریں گے تاکہ نمازیوں کو کوئی خلل نہ پیدا ہو سکے۔ قیدیوں میں بہت سے حفاظ قرآن تھے۔ تراویح کو اتنا طول دیا جانے لگا کہ وقت سحر سے مل جاتے۔ یہاں پر مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر قابل ذکر ہے:

درس حق جاری ہے یاں بھی حسرت آزاد کا
جیل خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا

اللہ اللہ کیا زمانہ تھا! ہندو مسلم اتحاد کا یہ روح پرور نقشہ بیان کرتے ہوئے حفیظ صاحب کا تاثر قابل دید ہوتا ہے۔

جوانی آ گئی مشرق پہ سارا ایشیا جاگا

میکش اکبرآبادی

وہی ہندوستاں جو قبلۂ اقوامِ عالم تھا
سبق جس نے زمانے کو دیا تھا علم و دانش کا
بدل دیں خوئے محکومی نے ساری خصلتیں اس کی
تہی دامن ہوا خود جو کبھی دنیا کا داتا تھا

پھر اک مردِ خدا اٹھا پھر اک مردِ فقیر آیا
خمِ گردن سے جس نے خنجرِ فولاد کو کاٹا
لڑایا جس نے کنجشکِ شکستہ پر کو شاہیں سے
بہایا اپنا خوں اور موت کا سر کر گیا اونچا

شریکِ کار اس کا اک جوانِ کامیاب آیا
چھپائے دل میں غم، سینے پہ مہکائے گلاب آیا
جوانی آ گئی مشرق پہ سارا ایشیا جاگا
ہوئی کافور اندھیری رات جب یہ آفتاب آیا
ہوائیں امن کی سنکیں، چمن لہکا فضا مہکی
وہ کیا آیا کہ ساری قوم پر جیسے شباب آیا

کلی کو اپنی نکہت دے کے ہم سے ہو گیا رخصت
کلی بھی ہے وہ گل بھی تیغ بھی آہن بھی دیبا بھی
حرم اندر حرم دل اس کا، رخ اس کا صنم خانہ
وہ قاتل بھی مسیحا بھی، وہ مومن بھی وہ ترسا بھی
سیاست اس کی عزم اس کا شجاعت اس کی حسن اس کا
متاعِ عقل و دانش بھی سرودِ جام و مینا بھی

شجرِ آزادی

عمر انصاری

صحن گلشن میں جو یہ پیڑ کھڑا ہے لوگو
اس کا افسانہ کچھ اس سے بھی بڑا ہے لوگو

پیار کا ہے یہ نشاں، عظمت انساں کا بھرم
پیڑ ہے یا ہے کوئی امن و سکوں کا پرچم

سرزمیں اس کی تمناؤں کی ہے اک وادی
نام ہے اس کا جہاں میں شجرِ آزادی

قد و قامت میں جو شرمندہ ہمالہ سے نہیں
حُسن بھی کم کسی سلما و غزالہ سے نہیں

سب وہ انداز ہوں عاشق کی وفائیں جیسے
اور یہ سائے ہیں کہ ساون کی گھٹائیں جیسے

بات بات اس کی ہے بیتاب نگاہوں کی طرح
ڈال ڈال اس کی ہے محبوب کی بانہوں کی طرح

ٹہنیاں خلق و مروت کے سکھاتی ہیں سبق
پتیاں ہیں کہ ہیں تاریخ محبت کے ورق

اس کے پہلو میں مرادوں کے کنول کھلتے ہیں
دوست تو دوست ہیں دشمن بھی گلے ملتے ہیں

راہ تکتا ہے شب و روز یہ کس کی کس کی
آشیانوں کے لیے وقف ہیں شاخیں اس کی

کارواں درد کے ماروں کے اترتے ہیں یہیں
کیسے ہی کیوں نہ مسافر ہوں ٹھہرتے ہیں یہیں

چرخ کا جب بھی ستایا کوئی آجاتا ہے
زندگی اس کی گھنی چھاؤں میں پا جاتا ہے

دیکھ سکتا ہو تو دیکھے کوئی جوبن اس کا
ہاں مگر یہ کہ نظر میں رہے بچپن اس کا

ہائے وہ دور، تصور نہیں ممکن جس کا
جرم تھا جب کہ یہاں نام بھی لینا اس کا

ہر نظر ایک دہکتی ہوئی چنگاری تھی
دھوپ ہی دھوپ کی ہر سمت عمل داری تھی

عالم ہو تھا ہر اک سمت بس اک آہ کے بعد
کوئی والی ہی نہ تھا اس کا ظفر شاہ کے بعد

اس کے یا وصف کہ ڈھونا پڑے پتھر لاکھوں
ہم نے سینچا ہے اسے اپنے لہو سے برسوں

اب یہ کہنے کو بری رد ہے بری زادہ ہے
ہے ہمارا ہی جگر جس پہ یہ استادہ ہے

یہ زمیں آگ تھی مشکل تھا جمانا اس کا
ہم تھے کمزور تو دشمن تھا زمانہ اس کا

اس سے پہلے کہ یہاں لا کے لگایا تھا اسے
من چلے خوابوں کے آنگن میں اگایا تھا اسے

تیر کیا کیا نہ زمانے نے کلیجے پہ چلائے
کیسے کیسے ستم اس کے لیے ہم نے اٹھائے

آرزو میں کہ اسے پھولتا پھلتا دیکھیں — کتنی کٹوا دیں خود اپنے ہی سروں کی فصلیں
اپنے وہ شام سویرے ہمیں یاد آتے ہیں — رسن و دار کے پھیرے ہمیں یاد آتے ہیں
جان یوں اس پہ فدا کر گئے کرنے والے — زندگی اپنی اسے دے گئے مرنے والے
بات ابھی کل کی ہے نازک سا یہ اک پودا تھا — ہم بچا لیں اسے، ہر سر میں یہی سودا تھا
اس سے پہلے کہ کرم اس پہ کوئی فرمائے — بس یہی دھن تھی کہ یہ پیڑ جواں ہو جائے
نقد جاں ہار کے بھی، بازیٔ دل جیت گئے — دیکھتے دیکھتے پچیس برس بیت گئے

آج اسے دیکھ کے آتا نہیں یاد ایک بھی غم — کم ہے کیا کچھ، کہیں بیٹھے تو گھنی چھاؤں میں ہم
سربلندی میں اگر اس کی ہے ٹیپو کی اٹھان — سرفروشی میں بھی ہے جھانسی کی رانی کے سمان
کی عطا اس کو تلک نے صفتِ غم خواری — عظمتیں اس کو یہ باپو سے ملی ہیں ساری
جب کہیں جا کے ہوا دہر میں یہ لاثانی — آب موتی سے، تو جوہر سے ملی تابانی
بانکپن میں ہے جو سوبھاش کی ساری خو بو — اس کی رگ رگ میں بھگت سنگھ کا دوڑا ہے لہو
ہو اثر اس پہ تو کیونکر ہو نگاہِ بد کا — کہ ہے محبوب یہ آزاد و حسین احمد کا
آ کے شبنم جو پڑی جاتی ہے موتی اس میں — بات یہ ہے کہ جواہر کی ہے جوتی اس میں
دوسرا ہو تو بڑا فخر، بڑا ناز کرے — مرنے والے جو ملیں لال بہادر ایسے
کیا عجب ہو جو سرِ فخر ابھی اور اونچا — اس کا دامن بھی تو اندرا کے ہے پلو سے بندھا

آخری قافلۂ شوق کی یہ منزل ہے — اس کے سینے میں ہمارا ہی دھڑکتا دل ہے
ہم نہ یوں چاہیں اسے، یہ تو نہیں ہو سکتا — سوکھ جانے دیں اسے، یہ تو نہیں ہو سکتا

جان دے دیں گے ذرا بھی اسے پہنچے جو گزند
اس کے پھولوں کی قسم، اس کے پھلوں کی سوگند

نیا دور

مسعود اختر جمال

اٹھو! عہدِ ماضی کے ماتم گسارو — غمِ رفتگاں آج دل سے بھلا دو
روانہ ہوا کارواں سوئے منزل — زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو
زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو

نیا عزم جاگا، نیا دور آیا — نئے حوصلے ہیں، ارادے نئے ہیں
نئی بزم آراستہ ہو رہی ہے — امنگیں نئی ہیں، تقاضے نئے ہیں

اٹھو عصرِ حاضر کے پروردگارو — یہ تفریقِ شاہ و گدا اب مٹا دو
روانہ ہوا کارواں سوئے منزل — زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو
زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو

اٹھو! میری دنیا کے محنت کشوں کو — خودی کیا ہے رازِ خدائی بتا دو
دلوں کو محبت سے معمور کر دو — نگاہوں کو تاثیرِ جذبِ وفا دو
کنشت و کلیسا و دیر و حرم کے — نگہباں بھی تم، رازداں بھی تمہیں ہو
اگر زد میں آئے جو زہدِ ریائی — یہ فتنہ ہے اٹھنے سے پہلے دبا دو
خدا بننے پائے نہ شداد کوئی — غریبوں پہ اب ہو نہ بیداد کوئی
قیامت نئی ہو نہ ایجاد کوئی — نظامِ کہن خاک میں اب ملا دو
نہنگ اور شاہیں کا اک لقمۂ تر — فدا یہ کنجشک و ماہی نہیں اب
یہ تخریبِ پیہم، یہ جورِ مسلسل — یہ قنطائیت اب جہاں سے مٹا دو
وہ مشرق کی پہنائیوں سے ابھر کر — ہوا جلوہ گر صبحِ نو کا پیمبر
جنہیں ظلمتِ شب نے روشن کیا ہے — وہ بے نور و افسردہ شمعیں بجھا دو

زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو — کہ تشکیلِ بزمِ حسیں ہو رہی ہے
سیہ رات دم توڑتی ہے فضا میں — افق سے ہویدا سحر ہو رہی ہے

"گیا دورِ سرمایہ داری گیا اب — تماشا دکھا کر مداری گیا اب"

اٹھو عصرِ حاضر کے پروردگارو — اب اس بزم کو رشکِ جنت بنا دو
روانہ ہوا کارواں سوئے منزل — زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو
زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو

آزادی کا روپ

رام کرشن مضطر گکوڑوی

کتنا دل کش ہے ترے رخ کا یہ شاداب چمن
کتنے پُر نور ہیں ان مد بھری آنکھوں کے کنول
کتنے تازہ ہیں مہکتے ہوئے ہونٹوں کے گلاب
کتنا سندر ہے یہ مکھڑا یہ سنہری آنچل

یہ چٹکتی ہوئی کلیاں یہ مہکتے ہوئے پھول
اک کرشمہ ہے تری شوخی و رعنائی کا
یہ لچکتی ہوئی شاخیں یہ حسیں قوسِ قزح
آئینہ ہیں تری مستی بھری انگڑائی کا

اے نسیمِ سحری! اے روحِ نموجانِ حیات
تو نے بخشا ہے جمالِ گل و نسریں کو نکھار
تیرے جلووں سے ہی زینت ہے سمن زاروں کی
تیرے نغموں سے ہی رقصاں ہے ہر اک سمت بہار

اپنی دھرتی ہے، چمن اپنا ہے، گل اپنے ہیں
اپنے جیون کے ہر انداز میں اپنا پن ہے
لہلہاتے ہوئے کھیت اور یہ گاتے دریا
جنتیں جس میں ہیں آباد یہ وہ دامن ہے

اپنے ہاتھوں سے ہی بنتی ہے یہ مٹی سونا
اپنی محنت کا ہے اعجاز نمایاں ہر سو
اپنے ہاتھوں نے ہی فولاد کو پگھلایا ہے
کارفرما ہے ہر اک شے میں عمل کا جادو

مقصدِ اہلِ وفا آرزوئے جاں بازاں
ہند کے روئے جہاں تاب کی تنویر ہے تو
تیری خاطر تری راہوں میں بہا جن کا لہو
ان شہیدوں کے حسیں خواب کی تعبیر ہے تو

عظمتِ قوم ہے جمہور کی آزادی ہے
تیرے انداز پہ سو جان سے قرباں ہم ہیں
تیری ہستی سے ہی قائم ہے ہماری ہستی
تیری ہستی کے نگہدار و نگہباں ہم ہیں

شفق

جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی

پھونکتی روح بہاروں میں گھٹا آئی ہے
آج تخصیص تماشا نہ تماشائی ہے

جادوئے چشمِ حسیناں ہے کہ برسات کی رات
سایۂ رحمتِ یزداں ہے کہ برسات کی رات

حلقۂ زلفِ بہاراں ہے کہ برسات کی رات
جلوۂ صبح بہ شام اُدھر رات کی رات

پردۂ غیب سے سبزہ پہ نکھار آیا ہے
پھر نیا دور بہ عنوانِ بہار آیا ہے

جگمگاتے ہیں ختن ساز فضاؤں میں کنول
بزمِ امکاں ہے زبس جلوہ گہِ حسنِ عمل

ظلمتِ دودِ چراغاں ہوئی یکسر کافور
گیسوئے نور پریشاں ہیں سرِ تشنۂ نور

اب وہ ادبارِ مسلسل ہے نہ دورِ آلام
صبحِ بیمارِ اجل چارہ نہ مدقوق سی شام

صورتِ بابِ قفس باز نئی راہیں ہیں
اب عناں گیرِ بہر گام کئی راہیں ہیں

پیشِ پا منزلِ مقصود فتادہ نہ سہی
رائگاں سعیِ طلب جائے تو کچھ شرط رہی

حسنِ تدبیر سے پتھر کا جگر پانی ہے
ظرفِ تنویرِ سیہ خانۂ ویرانی ہے

جام ہونٹوں سے لگائے ہوئے جمنا[1] جل کا
رو کشِ گلشنِ فردوس ہے صحرا کل کا

اک چراغِ تہِ داماں ہے چراغِ خورشید
پرتوِ سروِ خراماں ہے صفوں سے ناپید

ذرّہ خاکِ وطن ہے مہ و انجم کا جواب
مسکراتی ہوئی کلیاں ہیں بطِ بادۂ ناب

شاملِ حال مقدر بھی ہے مقدور بھی ہے
خدشۂ دار تو ہے جرأتِ منصور بھی ہے؟

---

[1] جمنا ہائیڈل پروجیکٹ

اُردو کے ضبط شدہ مطبوعات

علی جواد زیدی

پہلی جنگ آزادی کی صد سالہ یادگار ۱۹۵۷ء میں منائی گئی تھی۔ آج ۱۹۷۲ء میں ہم حصول آزادی کی پچیسویں سالگرہ منانے جا رہے ہیں۔ پہلے موقع پر میں نے ایک حقیر سا ہدیہ "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" کی شکل میں پیش کیا تھا۔ اب جشن سیمیں کے موقع پر "نیا دور" کی فرمایش پر اسی سے ملتے جلتے کسی موضوع پر کچھ لکھنے کی فکر ہوئی۔ متذکرہ بالا کتاب کے شائع ہو جانے کے بعد موضوع سے متعلق جو مواد ملتا رہا اسے میں جمع کرتا گیا۔ لیکن اب وہ ذخیرہ کاغذات کے انبار میں کہیں دب گیا ہے اور سامنے نہیں آ رہا ہے، اس لیے تلاش موضوع میں ذہن دوسری سمتوں میں بھٹکنے لگا۔ یکایک ۱۹۴۲ء کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے پٹنہ گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے سیاست حاضرہ پر اظہار خیال کیا جو مقامی اخبارات میں شائع ہوا۔ معمر سیاستداں، سچیدانند سنہا زندہ تھے اور وہاں کی ثقافتی زندگی کے ہر نشیب و فراز پر ان کی نظر رہتی تھی۔ اخباری اطلاع پاتے ہی انھوں نے اپنے ایک عزیز طالب علم کی وساطت سے مجھے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ ایسی شناسا نظریں اب کہاں ہیں؟ کھانے کے بعد انھوں نے مجھے اپنے کتب خانے کی زیارت کرائی۔ پھر کچھ مقفل الماریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس میں ضبط شدہ کتابیں محفوظ ہیں۔ "جب کوئی گورنر یہاں آتا ہے تو میں یہ الماریاں اسے ضرور دکھاتا ہوں۔" ان کے اس عالمانہ ظن نے مجھے مسحور کر دیا۔ آزادی کے بعد میں سرکاری کاروں اور مصروفیتوں میں پھنس گیا اور ان محبوس و مجبور کتابوں کو بھول سا گیا۔ ۱۹۴۷ء، ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۷ء میں ان کی یاد ضرور آئی لیکن ہوا کی طرح ایک دریچے سے آئی اور دوسرے دریچے سے نکل گئی۔

آج پھر یاد آئی تو خیال آیا کہ کم از کم ضبط شدہ کتابوں کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ مشکل یہ تھی کہ یہ کتابیں مختلف دیا ستوں اور کتب خانوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کی فہرست کی ترتیب بھی تقریباً ناممکن تھی۔ اتفاق سے میری نظر حکومت بنگال کے ہوم ڈپارٹمنٹ (پریس) کی مندرجہ ذیل شائع کردہ کتاب پر پڑی:

LIST OF PUBLICATIONS PROSCRIBED IN BENGAL DURING THE PERIOD FROM MARCH. 1-1910 TO DECEMBER 9. 1919.

(بنگال میں ضبط شدہ مطبوعات کی فہرست یکم مارچ ۱۹۱۰ء اور دسمبر ۱۹۱۹ء کے مابین)

یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں گورنمنٹ پریس علی پور سے شائع ہوئی تھی۔ تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے چار برس پہلے گورنمنٹ پریس علی پور بنگال سے ایک اور فہرست حکومت بنگال کے پولیٹکل ڈپارٹمنٹ نے شائع کی تھی اس کا نام ہے

LIST OF PUBLICATIONS PROSCRIBED FROM 1920 TO 1934 (JUNE)

(۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۴ء (جون) کے مابین ضبط شدہ مطبوعات کی فہرست)

پھر ابھی حکومت کے ہوم (پولیس) ڈپارٹمنٹ کی جانب سے شائع شدہ ایک اور فہرست کا پتہ چلا۔ یہ جنوری ۱۹۳۶ء اور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۰ء کے درمیانی وقفے میں ضبط شدہ مطبوعات کی فہرست ہے۔ اول الذکر دونوں کتابیں عام مطبوعات ہیں جو شائع ہونے کے بعد عام فروخت کے لیے کتب فروشوں کو دے دی گئی تھیں۔ لیکن آخری فہرست صرف سرکاری استعمال کے لیے ہے اور عام طور پر خریدی نہیں جا سکتی۔

مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ ایسی فہرستیں دوسری حکومتوں کے پاس بھی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ اگر ارباب تحقیق کوشش کریں تو ان تک رسائی ہو سکتی ہے۔ ان فہرستوں میں تحریک آزادی کی تاریخ اور ادب سے متعلق بیش بہا مواد موجود ہے اور اس کی فوری ضرورت ہے کہ اس سب کو ایک رشتے میں پرو دیا جائے اور ۱۹۱۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کی ان ضبط شدہ کتابوں اور دوسری مطبوعات کا مکمل جائزہ لے کر ایک تفصیلی فہرست مرتب کی جائے تاکہ تحقیق کے راستے کی ایک اہم رکاوٹ دور ہو۔

انھیں فہرستوں سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ پہلے انڈین پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء کی دفعہ ۱۲(۱) کے تحت اور اس قانون کی منسوخی کے بعد قانون ضابطۂ فوجداری (کریمنل پروسیجر کوڈ) کی دفعہ ۹۹ (الف) کے تحت کتابیں اور مطبوعات ضبط ہونے لگیں۔ ۱۹۱۰ء سے کون سے مطبوعات ضبط ہوئے ان کا سراغ لگانا باقی ہے۔ پہلے کوئی ایک حکومت ضبطی کے احکام صادر کر دیتی تھی۔ اس کے بعد دوسری حکومتیں بھی اپنے گزٹ میں ان احکام ضبطی کا اعادہ کرتی تھیں۔ لیکن سب حکومتیں ایسا نہیں کرتی تھیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں مطبوعات کی رسائی تھی یا جہاں تحریک آزادی مضبوط تھی وہاں ضبطیوں کی زیادہ فکر ہوتی تھی۔ چونکہ بنگال میں تحریک زیادہ زور شور سے چل رہی تھی اس لیے وہاں ضبط شدہ اور قابل ضبطی مطبوعات پر زیادہ کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ یہ صورت اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ مطبوعات طبع یا شائع کہیں اور ہوئے اور ضبط کہیں اور۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مطبوعات پر پولیس کی نظر پہلے اس ریاست میں پڑی جہاں ضبط ہوئی۔

ضبط شدہ مطبوعات میں سبھی طرح کی چیزیں ہیں۔ کتاب، کتابچہ، پمفلٹ، لیف لٹ (چھوٹا اشتہار عموماً دو ورقہ یا چو ورقی) پوسٹر، تصاویر، اخبارات، رسائل غرض کچھ بھی بچنے نہیں پاتا تھا۔ کلکتہ کے دلیر اور طباع قوم پروروں نے ایک نیا طریقہ نکالا۔ دھوتیوں کے کناروں پر ایک بنگالی نظم چھاپ دی۔ نظم کا عنوان تھا "الوداع ماں"۔ یہ دھوتیاں کلکتہ، ہوڑہ اور مدنا پور میں فروخت ہوتی پائی گئیں اور بنگال کی حکومت نے حکم ۔ 1350 P مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۱۰ء کے ذریعے ضبط کر لیں۔

ضبط شدہ کتابوں میں بہت سی ہندستان کے باہر، برطانوی ہند کے باہر طبع ہوئی ہیں۔ ان مقامات کے نام یہ ہیں۔
(۱) پیرس (۲) لندن (۳) برلن (۴) سین فرانسسکو (۵) نیویارک (۶) جینوا (۷) قسطنطنیہ — بیرونی ممالک میں چھپنے والے مطبوعات کی اکثریت سین فرانسسکو سے شائع ہوئی ہے۔ کچھ کتابیں پانڈیچری سے شائع ہوئی ہیں۔ پانڈیچری اس وقت فرانسیسی مقبوضہ تھا۔ بعض مطبوعات کی جائے طباعت میں شہروں کی بجائے ملک یا براعظم کا نام درج ہے۔ مثلاً یورپ یا انگلینڈ۔ سین فرانسسکو کئی ہندستانی تحریکوں کا مرکز بن گیا تھا۔ مثلاً جگانتر، غدر پارٹی وغیرہ۔

ان فہرستوں میں کئی نام بے حد غلط درج ہیں۔ بعض معلومات جو بہت ضروری تھیں مثلاً مصنف وغیرہ کا نام، وہ بھی درج نہیں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر 'الہلال' کے بارے میں یہ نہیں لکھا ہے کہ اس کے مدیر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ اعلانات اور اشتہارچوں یا فتاویٰ وغیرہ کے سلسلے میں بھی نام درج نہیں ہیں۔ پوسٹروں اور لیف لٹوں کے بارے میں تو یہ سوچا بھی جا سکتا ہے کہ نام شاید اصل میں بھی درج نہ ہوں۔ لیکن فتاویٰ کے سلسلے میں یہ صورت نہیں ہو سکتی۔

۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۹ء کے دوران شائع ہونے والے مطبوعات میں زبان کی تشریح الگ سے نہیں کی گئی ہے صرف دو ایک جگہ 'اردو' کا ذکر ہے باقی کا اندازہ نام اور دوسرے قرائن سے لگایا گیا ہے لیکن یہ فہرست مزید تحقیق کی محتاج ہے اور جب تک اصل تالیفیں یا گزٹ وغیرہ نہ دیکھا جائے یہ قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مطبوعات

اردو کے ہیں۔ بصورت سنہ ۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۳ء کی فہرست مطبوعات میں ہے۔ اس میں ہر زبان کی فہرست الگ الگ درج ہے۔ اردو کے بعض مطبوعات کے نام اور عنوانوں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور اصل نام معلوم نہیں ہو پاتا۔ جہاں نام انگریزی میں درج ہیں وہاں املا کی بے حد غلطیاں ہیں بعض اوقات الفاظ کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔ پروف ریڈنگ میں بڑی بے پروائی برتی گئی ہے۔ بعض اوقات ایک ہی کتاب کا نام ایک جگہ اردو میں اور دوسری جگہ انگریزی میں درج ہوا ہے۔ مثلاً "مغربی بندر" از محمد فہیم خان ایک اور جگہ WESTERN MONKEY کے عنوان سے درج ہے۔ بعض مطبوعات مختلف جگہوں سے شائع ہوئے یا ایک جگہ ضبط ہو جانے کے بعد دوسری جگہ سے شائع کیے گئے۔ مولانا مسعود علی ندوی نے اعظم گڑھ خلافت کمیٹی کی جانب سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ کا ایک ضروری خط چھپوایا جو پہلے یو پی پھر سی پی و برار میں ضبط ہوا۔ غالباً اسی کو دوبارہ علی گڑھ سے شائع کرایا گیا۔ یہاں عنوان مختصر کر دیا گیا ہے۔ "حضرت ..... ایک ضروری خط" یہ صرف یو۔ پی میں ضبط ہوا غالباً یہ دونوں ایک ہیں۔ لیکن مزید تحقیق کے بغیر قطعی حکم لگانا ناممکن ہے۔

کچھ مطبوعات ایسے بھی ہیں جو اردو اور پنجابی میں شائع ہوئے ہیں۔ فہرست میں پنجابی کو ہر جگہ "گورمکھی" لکھا گیا ہے۔ لیکن ایک عنوان "ذکر شاہی دا نمونہ۔ یانواں ڈار جھیا" از گیانی مان سنگھ صاف طور سے پنجابی ہے۔ غلطی سے اسے بھی اردو درج کر دیا گیا ہے لیکن ایسی مثال یہی ایک ہی ہے شاید ایک آدھ اور بھی ہو۔

مطبوعات کے نام کے ساتھ جو تفصیلات دی گئی ہیں ان کی شکل یہ ہے:

1.... (NAME OF BOOK) PUBLISHED FROM.... BY

اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ BY کا اشارہ ناشر یا طابع کے نام کی طرف ہے یا مصنف و مدیر کے نام کی طرف۔ جہاں یہ بات بالکل ہی صاف نہیں ہے وہاں ہم نے اسے ناشر فرض کر لیا ہے اور جہاں معلومات کی بنا پر یا قرائن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مصنف ہے وہاں ہم نے کئی قرائن و معلومات پر اعتبار کیا ہے لیکن ان میں بھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کی پراونشل حکومت کی جانب سے جو چند مطبوعات شائع ہوئے ان میں بعض پر عبید اللہ یا اسم عبید اللہ درج ہے یہ مولانا عبید اللہ سندھی ہیں۔ دوسرے اہم ناموں میں — مولانا حسین احمد مدنی، مرزا نعیم بیگ چغتائی، شیخ مشیر حسین قدوائی، عبد الحی گوپال نرائن سکسینہ (جو بعد میں پالن جی کے نام سے مشہور ہوئے) مولانا شبیر احمد عثمانی، بھائی پرمانند، کشن چند زیبا وغیرہ کے نام آتے ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد اور مولوی مسعود علی ندوی کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے۔

اس دور کے اکثر مطبوعات کا تعلق آزادی کی تحریکوں سے ہے جن میں خلافت کی تحریک کے علاوہ جگانتر، غدر پارٹی وغیرہ شامل ہیں لیکن بعض مطبوعات کی ضبطی کا سبب فرقہ داریت بھی ہے۔ چونکہ اس کی تشریح کہیں نہیں کی گئی ہے اس لیے اس کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ ان میں وہ مطبوعات بھی شامل ہو سکتے ہیں جو اس بنا پر ضبط ہوئے ہوں کہ ان سے فرقہ داریت پھیلنے کا اندیشہ تھا۔ مزید تحقیقات کے بغیر ان سب کو تحریک آزادی سے وابستہ سمجھ لینا غلط ہوگا لیکن ان کی بہت بڑی اکثریت (جیسا کہ نام سے اور دوسری تشریحات سے صاف ظاہر ہے) تحریک آزادی سے متعلق ہیں۔ ان میں نظموں کے بھی کئی مجموعے ہیں۔

یہ فہرستیں دو حصوں میں تقسیم ہیں (الف) کا تعلق سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۹ء سے اور (ب) کا تعلق سنہ ۱۹۲۰ء تا سنہ ۱۹۲۳ء سے ہے۔

فہرست الف

(۱) ایک اخبار کا نام "تلوار یا شمشیر" تھا یہ بنگال میں مسلم مورخہ ۱۷۹۶ مورخہ ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء کے ماتحت کسی دوسری حکومت میں ضبط قرار دی جانے کی بنا پر ضبط کر لیا گیا تھا۔ نام سے تو اخبار اردو زبان کا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تفصیل نہیں معلوم ہوئی۔

(۲) اسی طرح حکم نمبر P 110 (A) مورخہ ۱۸ر اپریل ۱۹۱۰ء کے ذریعے مصطفےٰ کامل (کمال ؟) پاشا کی تقریر ضبط قرار دی گئی — زبان لامعلوم۔

(۳) پنجاب سے ایک پرچہ بعنوان "مرنا بھلا ہے" شائع ہوا تھا۔ حکم نمبر P 329 (A) کے ذریعے ضبط ہوا — زبان کی تشریح تو نہیں ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ اردو ہی ہوگی۔

(۴) الہ آباد سے ندا رام سنیاسی کی مصنفہ "حالات شہید اور سنیاسی کی آواز" اور "ہندستان کی حالت ماضیہ" نامی مطبوعات حکم نمبر P 1127 (B) مورخہ ۲۰ر مئی ۱۹۱۰ء ضبط ہوئیں۔

(۵) برلن کے "تلوار" نامی اخبار کی اشاعت مورخہ ۲۰ر فروری ۱۹۱۰ء بحکم PD 1178 (A) مورخہ ۲ر مئی ۱۹۱۰ء ضبط ہوئی۔

(۶) ناڈیڈ ضلع کیرا سے ایف ڈی شاہ اور سی، ان، دیسائی نے INDIAN NATIONAL SONGS شائع کیے تھے۔ یہ بھی بحکم PD 1230 مورخہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۰ء ضبط ہوئیں۔ زبان کے بارے میں تفصیل نہیں ہے لیکن اگر یہ نظمیں کہیں مل جائیں تو فلسفے کی چیزیں ہوں گی۔

(۷) "ماردِ فرنگی کو" نامی مطبوعہ حکم مورخہ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۱۰ء ضبط ہوا۔ زبان، مصنف، جائے اشاعت وغیرہ کا حال معلوم نہیں۔ بظاہر اردو ہے۔

(۸) بابو بستن پرادکر کی مصنفہ "دیش کی بات" بحکم P 4124 مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۹۱۰ء ضبط ہوئی۔ (اردو ؟)

(۹) "الہلال" کلکتہ اشاعت مورخہ ۶ر اگست ۱۹۱۳ء بحکم PD 3241 مورخہ ۱۰ر ستمبر ۱۹۱۳ء ضبط ہوا نام مدیر درج نہیں۔

(۱۰) "دردِ جگر" از رحمت اللہ بدائی بحکم PD 3255 مورخہ ۱۷ر ستمبر ۱۹۱۳ء ضبط ہوئی۔

(۱۱) "الہلال کلکتہ" اشاعت مورخہ ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء بحکم PD 3414 مورخہ ۲۱ر ستمبر ۱۹۱۳ء ضبط ہوئی نام مدیر درج نہیں۔

(۱۲) "حبل المتین" کلکتہ مورخہ ۱۱ر اگست ۱۹۱۳ء اردو ایڈیشن نامہ پیغام ایضاً بنگالی ایڈیشن مورخہ ۱۲ر ۱۹۱۳ء ضبط ہوئے۔

(۱۳) سین فرانسسکو سے شائع "اخبار ہندستان" مورخہ ۲۱ر جولائی ۱۹۱۳ء بحکم P 9902 A مورخہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۱۳ء ضبط ہوا۔ معلوم نہیں کہ اردو، گورمکھی، گجراتی یا اردو میں۔ پتہ نہیں کہ یہ سب زبانوں میں نکلتا تھا یا ایک ہی شمارے میں سب زبان کے مضامین ہوتے تھے۔ یا مرتب فہرست کو پتہ نہیں کہ مندرجہ بالا زبانوں میں سے کس زبان میں تھا۔

(۱۴) "انڈیلی" رنا منڈ پراونسر مطبوعہ۔ ابتدائی الفاظ "پالیسی پسند رائج الوقت حکومت کے سامنے" اور آخری الفاظ "سدیش بھگتی" مطبوعہ رام پریس آکاش پور۔ ضبط بحکم P 3514 مورخہ ۱۵ر مارچ ۱۹۱۵ء مصنف لامعلوم۔

(۱۵) "الانتقام" کلکتہ سے مطبوعہ۔ آغاز "رہنے دیا ہے (نہ پایا ہے) ضبط بحکم P 3315 (A) مورخہ ۱۲ر مارچ ۱۹۱۵ء مصنف لامعلوم۔

(۱۶) "مسلمانوں کو کس کا ساتھ دینا چاہیے" پنجاب سے شائع شدہ ضبط بحکم P 4139 مورخہ ۲۹ر مارچ ۱۹۱۵ء مصنف لامعلوم۔

(۱۷) "بغاوت ہند" نمبر ۲ یوپی سے شائع شدہ ضبط بحکم P 4920 (A) مورخہ ۱ر اپریل ۱۹۱۵ء مصنف لامعلوم۔

(۱۸) "تاریخ ہند" از بھائی پرمانند۔ بزبان اردو مطبوعہ یونین اسٹیم پریس لاہور ضبط بحکم P 5004 (A) مورخہ ۱۱ر اپریل ۱۹۱۵ء

(۱۹) جَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ مصنف لامعلوم یوپی سے طبع۔ ضبط بحکم P 5336 مورخہ ۱۶ر اپریل ۱۹۱۵ء

(۲۰) "نیا زمانہ" سین فرانسسکو۔ ضبط بحکم PD 43 (A) زبان و مصنف لامعلوم۔

(۲۱) وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ آغاز "برجستہ زندگانی کردن" اختتام "یا ارحم الرّاحمین" پتہ نہیں فارسی میں تھا یا اردو میں۔

(۲۲) خروجِ دجّال۔ مطبوعہ پنجاب ضبط بحکم P 1073۔ مورخہ ۵ر ستمبر ۱۹۱۶ء مصنف لامعلوم

(۲۳) "جہاد" آغاز "اگر فردوس بر روئے زمین است" اختتام لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ضبط بحکم P 13739 مورخہ ۸ر دسمبر ۱۹۱۶ء مصنف لامعلوم

(۲۴) آریہ سماج کے بانی دیانند اور اس کے خلیفہ پنڈت ... کا

مختصر حالات ۔ از دامر سنگھ (لاہور)۔ ضبط بحکم (A) 14941 مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۱۸ء

(۲۵) "فرمان" ضبط بحکم P 6607 مورخہ ۱۳ مئی ۱۹۱۹ء مصنف ظہیر الاسلام۔

(۲۶) "خونی کفن" ضبط بحکم P 9937 مورخہ ۸ جولائی ۱۹۱۹ء

فہرست ب

۱۹۲۰ء

(۱) "ایڈریس" ناشر شیخ مشیر حسین قدوائی، فیض آباد۔ پہلے دلی سے ضبطی ہوئی بعد میں مدراس، بمبئی، یوپی اور سی پی کی حکومتوں نے احکام ضبطی جاری کیے۔

(۲) ADMINISTRATIVE DEPARTMENT PROVISIONAL GOVT. OF INDIA بزبان اردو۔ از عبید اللہ وزیر حکومت ہند AND MOUKATA پہلے یوپی میں پھر مدراس، برما اور بمبئی میں ضبطی ہوئی

(۳) "اورنگ خلافت" ناشر منشی احسان الحق سہارنپور۔ پہلے یوپی پھر پنجاب، سی پی، دلی اور مدراس میں ضبط ہوئی۔

(۴) "DAY OF THE MARTYR" بزبان اردو۔ سین فرانسسکو میں طبع ہوا۔ پہلے سرحد میں پھر دلی اور بمبئی میں ضبط ہوا۔

(۵) اعلان عام افواج ہند کے نام: پراویژنل گورنمنٹ آف انڈیا ملٹری ڈپارٹمنٹ کی جانب سے مطبوعہ۔ پہلے پنجاب پھر مدراس یوپی، برما، سی پی اور دلی میں ضبطی ہوئی۔

(۶) "فتوی امام ہند" پمفلٹ ناشر محمد سعید خاں ہوشیار پور۔ پہلے پنجاب میں پھر مدراس، یوپی، برما، سی پی اور دلی میں ضبط ہوا۔

(۷) "فتوی علمائے ہند" ناشر اقبال علی علوی لکھنؤ۔ پہلے سی پی میں ضبط ہوا پھر دلی اور پنجاب میں۔

(۸) "حضرات خواجگان دکن کی خدمت میں کھلی چٹھی" ناشر نیر مسلم دہلوی۔ بمبئی۔ پہلے یوپی میں پھر بمبئی، پنجاب، سی پی اور دلی میں ضبطی ہوئی۔

(۹) "خلافت" پمفلٹ ناشر محمد عبد الغنی کانپور۔ پہلے یوپی میں ضبط ہوا پھر مدراس، پنجاب، برما، سی پی اور دلی میں۔

(۱۰) "اشتہار" از عبد الرزاق جلال آباد۔ پہلے سرحد میں ضبطی ہوئی بعد میں پنجاب، مدراس، آسام، یوپی اور دلی میں۔

(۱۱) "MUSLIMS! SAVE INDIA" ناشر شفاعت علی علوی لکھنؤ۔ پہلے دلی پھر پنجاب اور سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲) "اشتہار" ناشر ام عبید اللہ وزیر حکومت MOAKATA ہند۔ پہلے آسام میں پھر دلی میں ضبط ہوا۔

(۱۳) "ندائے غیب" ناشر سلیمان طاہر۔ پہلے دلی پھر مدراس، پنجاب اور برما میں ضبطی ہوئی

(۱۴) "نظمیں" EWFALLY (عوض علی) اور عبد الغنی نے کراچی سے شائع کیا۔ پہلے دلی میں اور پھر مدراس، بمبئی، یوپی، دلی اور سی پی میں ضبط۔

(۱۵) "PRAYERS ON KHILAFAT QUESTION" پہلے دلی میں ضبطی ہوئی پھر پنجاب اور مدراس میں۔

(۱۶) THE FRIST AND FORE MOST WAY CHARITY FOR CURSE OF GOD" عبد الستار اسمٰعیل نے رنگون سے شائع کیا پہلے برما میں اور پھر سی پی اور دلی میں ضبطی کے احکام صادر ہوئے۔

(۱۷) WHAT IS THE KHILAFAT? MUSLIMS, SAVE INDIA شفاعت علی علوی نے لکھنؤ سے شائع کیا۔ پہلے یوپی پھر پنجاب، سی پی اور دلی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۸) "یا قومنا JIJBOO IDAI اللہ" ایک گنہگار مسلمان نے شائع کیا۔ پہلے پنجاب پھر مدراس، برما اور دلی میں ضبط ہوئی۔

(۱۹) "پردیسی ہندوستانیوں کی بھارت نواسیوں کے نام کھلی چٹھی" ہینڈ بل۔ مطبوعہ سین فرانسسکو از ہندوستان غدر پارٹی۔

(۲۰) "پیام امت" از میرزا ابراہیم بیگ چغتائی بمبئی۔ بمبئی میں ضبطی ہوئی۔

(۲۱) "پولیٹکل بولیوں کا گلدستہ" پمفلٹ ناشر لال بہادر در بلہ بریلی پہلے یوپی، پھر سی پی اور مدراس میں ضبط ہوا۔

(۲۲) "نظمیں آغاز "ہندو والے ہیں فقط گردن کٹانے کے لئے" اختتام "قوم اگر تیار ہے چرخہ چلانے کے لئے"۔

(IN THE NAME OF GOD THE MOST MERCIFUL AND GRACIOUS.)

برما میں ضبطی ہوئی پھر سی، پی میں۔

(۲۳) "قومی ترانہ۔ آزادی کا نسخہ" پہلی بیعت سے محمد حمید عرف پیارے خاں نے شائع کیا۔ پہلے یو، پی پھر مدراس اور بہار و اڑیسہ میں ضبطی ہوئی۔

(۲۴) "راشٹریہ گیت" بہار و اڑیسہ میں ضبطی ہوئی۔

RELIGOUS UKASE OF ALL THE ULEMAS (۲۵) OF INDIA (FATWA) مطبوعہ لاہور، بعد میں مدراس نے ضبط کیا

(۲۶) "کچی رہنمائی" از مولانا محمد ریاست علی خاں۔ مطبوعہ ہاشمی پریس دہلی۔ پہلے برما میں پھر مدراس اور سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۲۷) "شکریہ انگلینڈ" (FEELING OF SABR) و سین کا نام غالباً "جذبات صبر" کا ترجمہ ہے مطبوعہ شبنمی پریس میرٹھ۔ از مولانا سید ایوب احمد قیصر بخاری شاہجہانپوری۔ پہلے یو، پی پھر سی، پی اور مدراس نے ضبط کیا۔

(۲۸) "صلائے عام" یا SARWIYA-I-DAND از مولانا حافظ محمد برکت اللہ رضا۔ مطبوعہ لکھنؤ۔ سی میں ضبط ہوئی۔

(۲۹) "سپاہیہ" (سپاہی) لیف لٹ۔ مطبوعہ حبیب پرنٹنگ ورکس بانکی پور۔ پہلے بہار و اڑیسہ میں ضبطی ہوئی پھر برما میں۔

(۳۰) "تحریر بارۂ تحریک ترک موالات کفار" خلافت سے متعلق پمفلٹ۔ مولوی نور الحق ساکن موضع جھنڈے والا نے لاہور سے شائع کیا۔ پہلے مدراس نے ضبط کیا پھر سی پی نے۔

(۳۱) "ترانۂ قوم" بھوانی پرشاد نے لاہور سے شائع کیا۔ پہلے یو، پی پھر مدراس بہار و اڑیسہ اور سی پی نے ضبط کیا۔

(۳۲) "ترانۂ قوم" لالہ نند لال نے بریلی سے شائع کیا۔ پہلے یو پی پھر مدراس بہار و اڑیسہ اور سی پی نے ضبط کیا۔

(۳۳) "ترانۂ خلافت" مولوی مصباح الاسلام صدیقی عزیزی نے دیوبند سے شائع کیا۔ پہلے یو، پی پھر مدراس و سی پی نے ضبط کیا۔

THE RELIGIOUS FATWA OF THE ULEMAS (۳۴) OF INDIA دلی سے طبع ہوا۔ پہلے یو، پی پھر بنگال، سی پی اور مدراس میں ضبط ہوا۔

(۳۵) "تمام ہندوستان کے عالموں کا شرعی فتویٰ" لاہور کے نامہ عمرانی مالا و اشاعت پتر نے شائع کیا۔ پہلے یو پی پھر بنگال، آسام بہار و اڑیسہ اور مدراس نے ضبط کیا۔

THE ORDER OF THE KHILAFAT COMMITTEE (۳۶) AND CONGRESS لیف لٹ۔ مطبوعہ وفاقی پریس بانکی پور بجانب ممبران کانگرس و خلافت کمیٹی ندوہ۔ پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔

(۳۷) "بدیشی کپڑوں کو چھوڑ دو" علی گڑھ سے سکریٹری کانگرس کمیٹی نے شائع کیا۔ پہلے یو پی پھر سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۳۸) "بلبلان حریت کا ترانہ" (نظمیں مختلف شعرا) خلافت کمیٹی جونپور نے شائع کیا۔ پہلے یو پی، پھر سی پی اور مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۳۹) "کانگرس بھجن" مطبوعہ العدل پریس، بانکی پور۔ پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی اور مدراس میں ضبط کیا گیا۔

(۴۰) COMPLAINT OF INDIA (غالباً شکوۂ ہند کا ترجمہ) مولانا عقیل الرحمٰن ندوی کی نظم اردو۔ سہارن پور سے طبع کی گئی۔ برما میں ضبط کی گئی پھر سی، پی، مدراس میں۔

(۴۱) "درد خلافت" (نظم) از حاجی احمد۔ مطبوعہ علی گڑھ۔ پہلے یو پی میں ضبط ہوئی پھر سی پی و مدراس میں۔

(۴۲) "فغان ہند" پمفلٹ از قاضی محمد جمیل۔ مطبوعہ بجنور۔ پہلے برما میں ضبط ہوا پھر مدراس، سی، پی و یو، پی میں۔

(۴۳) "فریاد جگر" ڈاکٹر مہال چند سکسینہ از بلند شہر۔ پہلے یو پی، پھر مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۴۴) "فصل الخطاب" کتابچہ مشتمل بر تقریر عبد الماجد (عبد المجید) بدایونی پہلے بمبئی میں پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۴۵) "فتویٰ" کتابچہ مشتمل بر تقریر عبد الماجد جمعیۃ العلماء دہلی۔ پہلے بمبئی میں پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۴۶) "فتویٰ کی ضبطی" کتابچہ مشتمل بر تقریر عبد الماجد۔ پہلے بمبئی میں، پھر بہار و اڑیسہ ضبط کیا گیا۔

(۴۷) "گلدستہ خلافت" از جنرل سکریٹری بہار پراونشل کمیٹی بانکی پور۔ پہلے بہار و اڑیسہ میں پھر مدراس میں ضبط کیا گیا۔

(۴۸) حضرت خطاب بنگال کی خدمت میں کھلی چٹھی۔ از نظیر مسلم دہلوی بستی۔ پہلے بہار و اڑیسہ میں پھر مدراس و یوپی میں ضبطی ہوئی۔

(۴۹) حادثۂ نہضت اشرف۔ منشی مشتاق احمد میرٹھ شہر۔ پہلے یوپی میں پھر مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۵۰) حقائق پنجاب۔ از حاجی احمد دلی۔ پہلے بنگال میں پھر مدراس میں ضبط کیا گیا۔

(۵۱) ہندستان وبیع غدر۔ سین فرانسسکو میں یگانتر آشرم سے شائع ہوا۔ بزبان اردو و گورمکھی۔ پہلے پنجاب میں پھر مدراس، برما، سی پی و کورگ میں ضبط ہوا۔

(۵۲) انقلاب ہند۔ نظم از ہیرداس پرکاش مطبوعہ میرٹھ۔ پہلے یوپی میں ضبطی ہوئی پھر سی پی میں۔

(۵۳) اسلام کی فریاد۔ از دلی محمد مطبوعہ مرادآباد۔ سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۵۴) اتحاد اسلامی۔ منشی مشتاق احمد مطبوعہ میرٹھ۔ پہلے سی پی میں ضبط پھر مدراس، برار اور برما میں۔

(۵۵) جذبۂ مسلم۔ اردو نظم مطبوعہ اخلاق پریس پٹنہ جنکشن۔ پہلے بہار و اڑیسہ میں ضبط کی گئی پھر سی پی و مدراس میں۔

(۵۶) کاشی گنج کا خواب۔ از لال بہادر ورما۔ مطبوعہ بریلی پہلے یوپی میں ضبطی ہوئی پھر سی پی اور بہار و اڑیسہ میں۔

(۵۷) کاشی گنج کا خواب۔ از لال بہادر ورما۔ مطبوعہ بریلی۔ یوپی میں ضبط کیا گیا۔

(۵۸) قومی نظام (نظم) از بابو گوپال نرائن سکسینہ مطبوعہ لکھنؤ پہلے یوپی میں ضبط ہوئی پھر سی پی و مدراس میں۔

(۵۹) خطبۂ صدارت و فتویٰ۔ ناشر ممبر خلافت کمیٹی دیوبند۔

(۶۰) خون حرمین۔ از حافظ عبدالرحمٰن خاں۔ مطبوعہ جادہ پریس جون پور۔ پہلے بہار و اڑیسہ میں ضبط پھر یوپی میں۔

(۶۱) کسان بھیّا۔ از رہا نند۔ مطبوعہ بنارس۔ پہلے یوپی میں ضبطی ہوئی پھر بہار و اڑیسہ اور سی پی میں۔

(۶۲) خون حرمین۔ از سید غفار شاہ وارثی۔ مطبوعہ دلی۔ بمبئی میں ضبطی ہوئی۔

(۶۳) خون حرمین۔ اردو پمفلٹ (دوسری تفصیلات درج نہیں)

(۶۴) خون اسلام حرمین میں۔ از منشی مشتاق احمد مطبوعہ میرٹھ۔ یوپی میں ضبط کیا گیا۔

(۶۵) لیف لٹ۔ دو طرفہ لکھا ہوا۔ مطبوعہ سہارن پور از محمد محی الدین انصاری۔ بہار و اڑیسہ میں ضبط ہوا۔

(۶۶) لیف لٹ۔ دو طرفہ لکھا ہوا۔ مطبوعہ دیوبند۔ از محمد حسین یوپی میں ضبط کیا گیا۔

(۶۷) مغربی بندر (نظمیں) از محمد فہیم خاں۔ از لکھنؤ۔ پہلے یوپی میں ضبط ہوئیں۔ پھر سی پی و مدراس میں۔

(۶۸) متفقہ فتویٰ۔ مطبوعہ حنفی پریس دلی۔ پہلے برما میں ضبط ہوا پھر سی پی و مدراس میں۔

(۶۹) نوحہ رام۔ پمفلٹ۔ از دیا نند سرسوتی۔ مطبوعہ علی گڑھ۔ پہلے یوپی میں ضبط ہوا پھر سی پی میں۔

(۷۰) دو طرفہ لیف لٹ۔ ایک طرف علمائے ہند کے متفقہ فتوے اور پشت پر اسلامی فتویٰ۔ امن سبھا اور لبرل لیگ میں شریک ہونا حرام ہے۔ مدراس میں ضبط ہوا۔

(۷۱) پہلی لوبر غدر پارٹی وادن۔ اردو گورمکھی کے پرچے مطبوعہ سین فرانسسکو منجانب یگانتر آشرم۔ پنجاب میں ضبطی ہوئی۔

(۷۲) ترک موالات (کتابچہ) از مولانا حسین احمد مطبوعہ دیوبند۔ پہلے بنگال میں ضبط ہوا پھر سی پی، یوپی، آسام اور مدراس میں۔

(۷۳) ترک موالات۔ از شبیر احمد عثمانی مطبوعہ دیوبند۔ سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۷۴) ترک موالات پر تقریر زبردست۔ پمفلٹ از محمد مبارک حسین محمودی مطبوعہ میرٹھ۔ یوپی میں اور بعد مدراس میں اور بہار و اڑیسہ میں ضبط ہوا۔

"Religious Fatwa of the Holy Leaders" یا متفقہ فتویٰ علماء کے دستخطوں کے ساتھ۔ پہلے مدراس میں پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۷۶) علمائے ہند کا متفقہ فتویٰ۔ لبرل لیگ اور امن سبھاؤں میں شریک ہونا شرعاً حرام ہے۔ از محمد محی الدین انصاری۔ مطبوعہ

سہارن پور۔ پہلے یوپی پھر مدراس میں ضبط ہوا۔

(۷۷) "علمائے ہند کا متفقہ فتویٰ" ناشر فخرالدین دہرہ دون - مدراس میں ضبط ہوا۔

(۷۸) "علمائے ہند کے متفقہ فتوے" ناشر آنریری سکریٹری سنٹرل خلافت کمیٹی بمبئی۔ پہلے بمبئی میں پھر مدراس، سی پی اور برما میں ضبط ہوا۔

(۷۹) "علمائے ہند کے متفقہ فتوے" ناشر محمد حسین دیوبند۔ مدراس میں ضبط ہوا۔

(۸۰) "Western monkey" (مغربی بندر) از محمد نعیم خان مطبوعہ لکھنؤ۔ پہلے یوپی پھر سی پی اور مدراس میں ضبطی ہوئی

(۸۱) "واقعہ پنجاب" پمفلٹ از حاجی احمد علی گڑھی۔ مطبوعہ دلی۔ پہلے یوپی پھر برار، سی پی اور مدراس میں ضبط ہوا۔

(۸۲) "واقعہ پنجاب" حصہ دوم پمفلٹ از حاجی احمد علی گڑھی مطبوعہ دلی پہلے یوپی، پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۸۳) "زخمی پنجاب" از عان چند زیبا مطبوعہ لاہور۔ پہلے پنجاب پھر یوپی، سی پی اور مدراس میں ضبط ہوئی۔

(۸۴) "زمیندار لاہور" اشاعت مورخہ ۵ راگست ۱۹۲۱ء از ابوالحسن (غالبا مدیر یا ناشر؟) پہلے پنجاب پھر بہار و اڑیسہ اور سی پی میں ضبط کیا گیا ۱۹۲۲ء

(۸۵) "انگریزاں دے ٹوٹ" (پنجابی توہین) از عبدالحق مطبوعہ سیالکوٹ۔ پہلے پنجاب پھر بہار و اڑیسہ میں ضبطی ہوئی۔

(۸۶) "انگریزوں کی گڑ بڑ" پمفلٹ ناشر نیشنل سنٹرل بک ڈپو۔ دلی۔ پہلے بہار و اڑیسہ پھر یوپی، بمبئی، مدراس اور سی پی میں ضبط ہوا۔

(۸۷) "انگریزوں کی میاؤں" مطبوعہ لکھنؤ۔ پہلے یوپی میں ضبط کیا گیا پھر سی پی و مدراس میں۔

(۸۸) "pledge of civil disobedience" مطبوعہ الہ آباد۔ یوپی میں ضبطی ہوئی۔

(۸۹) "آہ مظلوماں" پمفلٹ از ایس۔ اے احمد مطبوعہ سہارنپور پہلے یوپی پھر سی پی اور مدراس میں ضبط ہوا۔

(۹۰) "مسلمانان بمبئی سے اپیل ۱۹۲۱ء Appeal to The Mussalmans of Bombay" از ناشر ... پہلے بمبئی پھر سی پی و مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۹۱) "Appeal to Mussalmans to enrol as Volunteers in national volunteer corps" از۔ ایم، بی قاضی و دیگر حضرات۔ مطبوعہ کلیان پہلے بمبئی پھر سی پی، مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۹۲) "آزادی ہند" مطبوعہ مراد آباد۔ یوپی میں ضبطی ہوئی۔

(۹۳) آزادی ہند۔ سوراج کی دیوی" مطبوعہ مراد آباد۔ پہلے یوپی پھر سی پی، برما اور بمبئی میں ضبط کیا گیا۔

(۹۴) انگریزوں کی اکڑفوں" بزبان اردو و ہندی۔ ناشر نیشنل بک ڈپو دلی۔ پہلے یوپی پھر سی پی و مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۹۵) انگریزوں کی میاؤں میاؤں" مطبوعہ لکھنؤ پہلے یوپی پھر بہار، مدراس سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۹۶) انگریزوں کا خون" مطبوعہ سوراج پرنٹنگ ورکس دلی پہلے سی پی پھر مدراس، بنگال اور بہار و اڑیسہ میں ضبط کیا گیا۔

(۹۷) بندے ماترم" ست سری اکال "اللہ اکبر" سپاہیوں بھری نوجوانوں اور دوسروں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ حکومت سے تعلقات منقطع کریں۔ ناشر لال سنگھ۔ پہلے بمبئی پھر سی پی و یوپی میں ضبطی ہوئی۔

(۹۸) "برباد مسافر" دو حصوں میں۔ کتاب۔ مطبوعہ گلزار ہند پریس بمبئی۔ پہلے بمبئی پھر برما میں ضبط کی گئی۔

(۹۹) "بیداری ہند" حصہ اول از جگدیش پرکاش ودیا رتھی چندوسی۔ مطبوعہ بدایوں۔ پہلے یوپی پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوئی

(۱۰۰) "بیداری ہند حصہ دوم" از جگدیش پرکاش ودیا رتھی چندوسی مطبوعہ بدایوں۔ پہلے یوپی پھر مدراس میں ضبط ہوئی۔

(۱۰۱) "برباد مسافر" یعنی گورو نانک جہاز کے مسافروں کی درد بھری کہانی۔ از ارجن سنگھ پرگوہری مطبوعہ بمبئی۔ پہلے بمبئی پھر پنجاب و سی پی میں ضبط ہوئی۔

اسپیشل نمبر، اگست ۱۹۸۰ء

شمارہ ۹۴-۹۳، اگست ۱۹۸۰ء





ڈاکٹر راجیندر پرشاد
(پہلے صدر)

ڈاکٹر رادھا کرشنن
(دوسرے صدر)

جمہوریہ ہند کے صدر
(۱۵ر اگست ۷۲ء۔ اسپشل نمبر)



ڈاکٹر ذاکر حسین
(تیسرے صدر)



شری۔ وی۔ وی۔ گری
(موجودہ صدر)

آزاد ہندستان کے وزراے اعظم



پنڈت جواہر لال نہرو۔ پہلے وزیر اعظم

شری لال بہادر شاستری



۱۵ر اگست سنہ ۴۷ء

( )

اسپشل نمبر

شریمتی اندرا گاندھی



(۱۰۲) "بغاوت ہند" از بال مکند آزاد دہلی — پہلے یو پی پھر مدراس و سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۰۳) "بی اماں کا پیام اپنے فرزندوں کے نام" اردو نظم ناشر محمد قادر حسین صاحب مطبوعہ ترچناپلی پہلے سی پی پھر برما میں ضبط ہوئی۔

(۱۰۴) "بی اماں کا پیام اپنے فرزندوں کے نام" ناشر محمد قادر حسین — مطبوعہ مدراس — پہلے مدراس پھر بمبئی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۰۵) "بسم اللہ الرحمن" پمفلٹ: پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔

(۱۰۶) "بائیکاٹ" پمفلٹ — از مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ میرٹھ پہلے یو پی پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔

(۱۰۷) "بائیکاٹ" پمفلٹ — ناشر مشتاق احمد میرٹھ — پہلے یو پی پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔

(۱۰۸) "چرخے کی چہاں چہاں" از شیخ دلدار حسین دلدار مطبوعہ مراد آباد۔ پہلے یو پی پھر سی پی و بہار میں ضبطی ہوئی۔

(۱۰۹) "چو ماسہ برسات" از فقیر چند مطبوعہ دہلی — برما میں ضبطی ہوئی۔

(۱۱۰) "ویدار ہند" مجریہ بدایوں — یو پی میں ضبط کیا گیا۔

(۱۱۱) "فریاد ہند" حصہ اول پمفلٹ — از محمد عنایت علی خان مطبوعہ سہارنپور پہلے یو پی پھر سی پی و برما میں ضبط ہوا۔

(۱۱۲) "فریاد ہند" از قاضی محمد جمیل الدین مطبوعہ بجنور — پہلے یو پی پھر مدراس و بہار و اڑیسہ برما اور سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۱۳) "فریاد دیکس" از محمد اسمٰعیل مطبوعہ سہارنپور — پہلے یو پی پھر بہار و اڑیسہ اور مدراس میں ضبط کیا گیا۔

(۱۱۴) "فغان ہند" مجریہ بجنور — برما و سی پی میں ضبط ہوا۔

(۱۱۵) "قول فیصل" از ابوالکلام آزاد مطبوعہ میرٹھ — پہلے یو پی پھر بہار و اڑیسہ و مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۱۱۶) "خلافت نامہ" از منشی احمد علی مطبوعہ بجنور — پہلے یو پی پھر بہار و اڑیسہ اور مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۱۱۷) [illegible] کتابچہ — از مولوی محمد [illegible] مطبوعہ مراد آباد — یو پی میں [illegible]

(۱۱۸) "فریاد [illegible]" مجریہ سہارنپور — یو پی میں ضبط ہوا۔

(۱۱۹) "[illegible]" از محمد ابراہیم سیکرٹری خلافت کمیٹی [illegible] مطبوعہ [illegible] پہلے بمبئی پھر سی پی و برما اور مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۰) "گلشن خلافت" از ناشر عبدالستار مطبوعہ دھام پور (ضلع بجنور) یو پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۱) "غلامی" مجریہ سیالکوٹ — پنجاب میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۲) "جنرل ڈائر اور جلیانوالہ باغ" مطبوعہ [illegible] دلی — پہلے سی پی اور پھر برما میں ضبط ہوا۔

(۱۲۳) "گریہ ہند" از قاضی محمد جمیل الدین مطبوعہ بجنور — پہلے یو پی پھر سی پی و مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۴) "گلدستہ رضاکار" ناشر سید میاں محی الدین مدراس — پہلے مدراس پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۱۲۵) "گلدستہ تحفۂ خلافت" از محمد فدا حسین مطبوعہ دھام پور (بجنور) پہلے یو پی پھر سی پی و پنجاب میں ضبط ہوا۔

(۱۲۶) "گلزار جنت" از ماسٹر عبدالستار مطبوعہ دھام پور (بجنور)۔ پہلے یو پی پھر سی پی و مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۷) "گلشن خلافت" (ملاحظہ تفصیلات درج نہیں)

(۱۲۸) "گلزار جنت" از جگناتھ تیواری مطبوعہ [illegible] — پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۹) "غلامی" کتابچہ ناشر مولوی مظفر الدین اینڈ سنس سیالکوٹ — پہلے پنجاب پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔

(۱۳۰) "برٹش تل" لیف لٹ — پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۱۳۱) "حکومت کی پول" ناشر منیجر آریہ گزٹ [illegible] — یو پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۳۲) "حضرت... ایک مزدوری خط" مجریہ علی گڑھ یو پی میں ضبط ہوا۔

(۱۳۳) "حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ کا ایک ضروری خط" از سیکرٹری خلافت کمیٹی مطبوعہ اعظم گڑھ — پہلے یو پی پھر برما میں ضبط ہوا۔

(۱۳۴) "[illegible] اخبرت" مجریہ میرٹھ — یو پی میں ضبط ہوا۔

(۱۳۵) "ہندی راشٹریہ" ہند کا شاہد ناشر محمد [illegible]

مطبوعہ لاہور - پہلے پنجاب پھر بمبئی، سی پی اور برما میں ضبط ہوا۔

(۱۹۳) "ظالموں کی بیداد مظلوموں کی فریاد" پمفلٹ پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی، مدراس اور یوپی میں ضبط ہوا۔

(۱۹۴) "ظالم و مظلوم کی گفتگو" از عبدالحلیم مطبوعہ بدایوں - پہلے یوپی پھر سی پی، مدراس نے ضبط کیا۔

(۱۹۵) "زمیندار" ناشر سید احمد لاہور - پنجاب میں ضبط ہوا۔

۱۹۲۳ء

(۱۹۶) "المجاہد" شمارہ ۱۸ مورخہ ۲ مئی ۱۹۲۳ء پہلے سی پی پھر برما میں ضبط ہوا۔

(۱۹۷) اخبار المجاہد شمارہ ۵ تا ۱۰ - بشہر سمرقند مجاہدین - پہلے سی پی پھر برما میں ضبط ہوئے۔

(۱۹۸) "انوری شمشیر یا شمشیر اسلام" مطبوعہ صداقت پریس بمبئی - پہلے برما پھر سی پی نے ضبط کیا۔

(۱۹۹) "دو بیگی آبروریزی کے قتل میں" پمفلٹ مطبوعہ شانتی پرنٹنگ پریس بہار نپور - پہلے برما پھر سی پی، مدراس میں ضبط ہوا۔

(۲۰۰) "فریاد مسلم" مرتبہ انعام الحق مطبوعہ مظفرپور - پہلے بہار و اڑیسہ نے پھر سی پی و برما نے ضبط کیا۔

(۲۰۱) "فرمان کابل" پمفلٹ از شیخ انوار الحق مطبوعہ سہارنپور — پہلے یوپی میں پھر سی پی، برما میں ضبط ہوا۔

(۲۰۲) "حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ کے ضروری خط" پوسٹر اردو - ناشر مسعود علی ندوی، خلافت کمیٹی اعظم گڑھ - پہلے یوپی پھر سی پی، برار اور برما میں ضبط ہوا۔

(۲۰۳) "ہندستانی اخبار" سین فرانسسکو - یوپی میں ضبط ہوا۔

(۲۰۴) "ہندستانی اخبار" سین فرانسسکو - پہلے مدراس میں پھر برما میں ضبط ہوا۔

(۲۰۵) "ہندستانی اخبار" سین فرانسسکو - پہلے مدراس میں پھر برما میں ضبط ہوا۔

(۲۰۶) "ہندستانی کے نام کھلی چٹھی" پمفلٹ مجریہ سین فرانسسکو منجانب ہندستانی امیگریشن - پہلے یوپی میں پھر سی پی، مدراس اور برما میں ضبط ہوا۔

(۲۰۷) "ہندستانی اپیل" مجریہ سین فرانسسکو منجانب ہندستان غدر پارٹی - پنجاب میں ضبط ہوا۔

(۲۰۸) "مہاجرت خالصہ" حصہ اول از سورج سنگھ مطبوعہ جالندھر پہلے پنجاب پھر سی پی، برار اور کورگ نے ضبط کیا۔

(۲۰۹) "کامل سوراج المعروف ہند میں انگریزوں سے راج لینے کی کتاب" ناشر محبوب بخشی لاہور - پہلے برما پھر سی پی میں ضبط ہوئی۔

(۲۱۰) "مخاطب نجیب" پمفلٹ مطبوعہ لکھنؤ پہلے بہار و اڑیسہ میں پھر سی پی، برما میں ضبط ہوا۔

(۲۱۱) "کرکری ز شکروں کم" مجریہ لکھنؤ پہلے بہار و اڑیسہ میں پھر سی پی، برما میں ضبط ہوا۔

(۲۱۲) "مسائل حاضرہ یا ہندستان کی سیاسی جدوجہد" پمفلٹ مرتبہ غلام نبی خاں - لاہور پہلے پنجاب پھر سی پی، برما میں ضبط ہوا۔

(۲۱۳) "Message of Shah Badiul Alam to Mahatma Gandhi" ناشر محمد بدیع العالم - مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۲۱۴) (1) A Message of Shah Mohd Badial... To Mahatma Gandhi

(2) A Message of Shah Mohd Badial Alam ... Dolier sizjine of Sudan

(3) Message ...

مذکورہ بالا مطبوعات کے ناشر محمد بدیع العالم - پہلے سی پی میں ضبط ہوئیں پھر دوسری حکومتیں مطلع کر دی گئیں۔

(۲۱۵) "نادرشاہی زمانہ" پمفلٹ مطبوعہ ریاض پریس ... — سی پی میں ضبط ہوا۔

(۲۱۶) "نادرشاہی زمانہ" پمفلٹ ناشر ... جبل پور، برما میں ضبطی ہوئی اور دوسری حکومتیں مطلع کر دی گئیں

(۲۱۷) "نعرہ ہائے اسلام" پمفلٹ از شیخ محمد یامین و شیخ حبیب احمد مطبوعہ سہارنپور پہلے برما پھر سی پی، بہار اور یوپی میں ضبط ہوا۔

(۲۱۸) "پولیٹیکل گیت" پمفلٹ ناشر ۔۔۔ ڈیرہ ۔۔۔ پہلے پنجاب پھر بہاولپور سی پی نے ضبط کیا۔

(۲۱۹) مقبول فیصلہ۔ پمفلٹ۔ مطبوعہ بمبئی۔ پہلے بنگال پھر سی پی، بہار، برما اور پنجاب میں ضبط ہوا۔

(۲۲۰) "صدائے بازگشت" از مرزا فہیم بیگ۔ آگرہ (پمفلٹ) پہلے یوپی میں پھر بمبئی و سی پی میں ضبط ہوا۔

(۲۲۱) "شہنشاہ کابل کا فرمان" ناشر شیخ حبیب الرحمن سہارنپور۔ پہلے یوپی میں پھر بہار و سی پی اور برما میں ضبط کیا گیا۔

(۲۲۲) شہنشاہ کابل حصہ دوم (پمفلٹ) از حافظ ظہور احمد سہارنپور۔ پہلے یوپی میں پھر پنجاب میں ضبط ہوا۔

(۲۲۳) "سنگیت او ڈائرشاہی جنی مظلوم پنجاب" کتابچہ از سورج بھائی مطبوعہ امرتسر۔ پہلے پنجاب میں پھر برما، مدراس اور سی پی میں ضبط ہوا

(۲۲۴) "سودیشی توپ" پمفلٹ ناشر یونین پریس لکھنؤ پہلے بہار و اڑیسہ میں پھر سی پی و برما میں ضبط ہوا۔

(۲۲۵) "تازہ زخم یعنی گورو کے باغ کا نظارہ" پہلے پنجاب پھر بہاولپور والے نے ضبط کیا

(۲۲۶) Heroic Scenes of non Violent Satyagrahi Akalis at Guru Ka Bagh
باتصویر لیف لٹ۔ ناشر ستر دمنی چتر شالا لاہور۔ پہلے برما میں پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۲۲۷) A Scene of Akali Sacrifice
باتصویر لیف لٹ۔ ناشر رام برادرس اینڈ کمپنی امرتسر۔ پہلے برما میں پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔

★

آزادی کی کسوٹی

اس دیش میں ہزاروں کام ہیں۔ ہزار کام ہم کریں گے پھر بھی ہزاروں کام باقی رہیں گے۔ کام کا ہم اس طرح اندازہ کریں کہ ہم نے کوئی نئی عمارت بنا لی، کوئی نیا اسکول بنایا اور کوئی نیا بڑا کام کیا، تو ٹھیک ہے لیکن آخر میں کام کا اندازہ یہ ہے کہ اس ملک میں ایسے کتنے لوگ ہیں جن کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ ان میں سے کتنے آنسو ہم نے پونچھے، کتنے آنسو ہم نے کم کیے۔ وہ اندازہ ہے اس ملک کی ترقی کا، نہ کہ عمارتیں جو کہ ہم بنائیں یا کوئی شاندار بات جو ہم کریں۔ آخر یہ ملک کیا ہے؟ یہ ہمالیہ پہاڑ نہیں ہے، نہ کنیا کماری ہے۔ یہ ملک اس کے رہنے والے ۳۶ کروڑ آدمی ہیں۔ مرد، عورت اور بچے اور اخیر میں اس ملک کی بھلائی برائی ان ۳۶ کروڑ آدمیوں کی بھلائی اور برائی ہے۔

—— جواہر لال نہرو —— (۱۹۵۲ء)

ہندستان سے ایک ملاقات

آوارہ

عمر عزیز کا ایک بڑا اور بہت بیش بہا حصّہ سیر و شکار کی نذر ہو گیا۔ جنگل جنگل گھومے ان گنت ندّی نالے گھاٹیاں چھان ڈالیں، بے گنتی کارتوس پھونک ڈالے ـــ قازوں اور مرغابیوں کی ڈاروں کے تعاقب میں گھٹنوں گھٹنوں دلدل اور گردن گردن پانی کو اس طرح جھیل لیا جیسے آج کل لوگ سینما کا ٹکٹ لینے کے جتنوں میں جیب کتروں کو انگیز کر جاتے ہیں ـــ سانبھر اور ہرن سے لے کر بگ گیم تک کے تمام مراحل طے کیے۔ کبھی تو یہ مقصود ہاتھ آیا اور کبھی کچھ بھی نہیں پھر بھی کھیل کا لطف ـــ دن بھر کی دوڑ دھوپ یا راتوں کی صحرا نوردی کے بعد پاس کے کسی ویران اور شکستہ ڈاک بنگلے میں شکاری ساتھیوں کے ساتھ چائے یا کافی کے مہکتے ہوئے گرم گرم پیالوں پر دن بھر یا پھر شب بھر کی تکان اور کوفت کو ـــ غرق مئے ناب اولیٰ ـــ کہہ کر اڑا دیا ـــ اور جو کبھی اس تگ و دو کا صلہ کسی سیخ پر مرغابی، قاز یا ہرن کی شکل میں مل گیا تو پھر کامیاب شکار کی مسرت اور بھرپور سرخوشی؛ لذّت کام و دہن مستزاد۔ لیکن ؏

یہ باتیں ہیں تب کی جب آتش جواں تھا

خدانخواستہ اس سے یہ نتیجہ نہ نکال لیجیے گا کہ اب آتش بوڑھا ہو چلا ہے۔ صاحبو، بات یہ ہے کہ بڑھاپا قوت ارادی اور جذبۂ عمل کے اضمحلال کا نام ہے۔ سو الحمدللہ کہ چار اوپر اسّی کے اس سن میں بھی، جب بقول اپنے اپنے، مجھ ایسی عمر کے اور لوگ کھونٹیوں پر لٹکا دیے جاتے ہیں اور ڈالڈا گھی، ملاوٹ اور فضائی آلودگی کے اس دور میں میوزیم (یا اکثر نذر) میں رکھ دینے اور یاد کرنے کی چیزیں رہ جاتے ہیں، یہ خاکسار ابھی تک خود کو جوان بلکہ نوجوان محسوس کرتا ہے۔ خیر یہ عادت تو بقول شخصے، بندہ بادہ پرست ستم کاری کی ایک کمزوری، حالانکہ میں ذاتی طور پر اسے اس کی سب سے بڑی ستم روری تصور کرتا ہوں، یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گزشتہ کارناموں کی لذیذ حکایت کو دراز سے دراز تر کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ بلکہ بعض معتبر بزرگوں سے تو یہ بھی سنا ہے کہ کارنامے اور روداد میں جتنی زیادہ قیاسی اور فرضی ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ لذیذ اور دلچسپ ـــ خیر، اس کا تو کوئی ذاتی تجربہ نہیں، ہوتی ہوں گی، واللہ اعلم بالصواب۔ یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ جاڑوں کی راتوں میں لحافوں میں دبکے ہوئے، اور کونوں کے زرہ بکتر میں پناہ لیے ہوئے اور شالوں کے قلعوں میں محصور، ماشاءاللہ درجنوں نواسے نواسیاں، پوتے پوتیاں، بھانجے، بھتیجے دلان اور گرد، کافی کا دور چل رہا ہے اور "نقل محفل" کے طور پر ایک طرف سے ارشاد ہوتا ہے "ننھو بھائی (جی ہاں یہی خاکسار) کوئی شکار کا دلچسپ واقعہ" کسی طرف سے فرمائش ہوتی ہے "بابا دریا حیدرآباد میں قیام کے زمانے کی کوئی داستان" اور کوئی صاحب یا صاحبہ فرماتے ہیں "حضرت، اپنی یادداشت کا کوئی ناقابل فراموش ورق"۔ غرض یہ کہ آل انڈیا ریڈیو میں اس خاکسار کے داخلے اور پطرس بخاری مرحوم سے ملاقات سے لے کر، نقل کلب کے تعاقب کے واقعات اور پھر قزی سینوں کی حیرت انگیز داستانوں تک، خدا

جانے کس کس داستان اور کس کس واقعہ کو دُہرانے کی فرمائشیں ہوتی
ہیں — اب آپ یاد فرمایئے کچھ دیر کے لیے ذہن اچھا خاصا
ریس کورس بن کر رہ جاتا ہے — زندگی کے میدان کے ان نو واردوں
کو کیا پتہ کہ اُن کی یہ ننھی منی فرمائشیں ذہن اور تصور کے کتنے مرقعوں
کے ورق ایک ساتھ اُلٹ جاتی ہیں جن پر ماہ و سال کی گرد جم چکی ہے۔
ایک فرمائش کے ساتھ ذہن کے نگار خانے کا ایک باب کھلتا ہے،
اور ایک تصویر متحرک ہوتی ہی ہے کہ دوسری فرمائش نئی اور بھولی ہوئی
یاد کو جگا جاتی ہے — اور شکار کی داستان "اللہ اللہ" جس مشغلہ
میں نصف صدی سے بھی زیادہ مدت گزر گئی ہو، بلکہ اب بھی روز ازل
شب ماہتاب میں جو شوق سر اُٹھا لیتا ہو، اُس کی داستان کا ایک ورق
بھی کیا چند لمحوں میں بیان ہو سکنے کی چیز ہے۔

غالب، خدا ان کی مغفرت فرمائے، خدا جانے کس سے
فرماتے تھے۔ ع

ہوس سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

اب ملاحظہ فرمایئے کہ رامپور اور لکھنؤ سے لے کر کلکتہ کے سبزہ زاروں
مسطحوں تک خدا جانے کہاں کہاں گھوم لیے، کیا کیا دیدنی اور
نادیدنی دیکھ لی، لیکن انکسار ہو تو ایسا کہ "سو وہ کم ہے ہم کو"۔
اب کوئی پوچھے، کہ حضرت اگر یہ ہوس سیر و تماشا نہ تھی تو اور کیا
تھا — مگر اب وہ ملیں کہاں — بہت سے بہت یہی کر سکتے ہیں
آپ کہ کسی غالب نمبر میں ایک طویل تحقیقی مضمون لکھ کر ان کی
روح اور ناظرین کے ذوق کو تکلیف پہنچانے کی سعی فرمائیں —

بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ عرض کرنے کا مقصد صرف اس
قدر ہے کہ اس مضمون کے راقم کو اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں —
جیسا کہ ہر شریف اور معقول انسان جانتا ہے، سیر و شکار لازم
ملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی محال ہے۔ اور پھر
حقیقت تو یہ ہے کہ سیر کے بغیر شکار اسپورٹ نہیں رہتا، ایک
ظالمانہ فعل بن کر رہ جاتا ہے — تو صاحب، اول تو ایک
ایماندارانہ با اصول شکاری ہونے کے سبب سے سیر و تماشا سے
طبعی مناسبت اور تعلق اور پھر اس قلمی نام (دیا ہوا کرم کوئی صاحب
اسے قلمی نام کی قبیل کی کوئی شے نہ تصور کریں) کی برکت پانچ اور چھ
تیرہ جیسی برسوں سے شخصیت کا جزو بن کر رہ گیا ہے، سیر و سیاحت
اور قدرت کی کاریگری کے نمونوں سے بالمشافہ ملاقات زندگی کا اہم
مشغلہ رہی ہے — شکار کی داستانوں نے تو اب آبروئے اہل
نظر ہی کھو دی ہے کیونکہ ہر وہ بوالہوس جو قلم چلانا سیکھ چکا ہے
کسی ڈائجسٹ کے لیے کوئی نہ کوئی داستان شکار لے کر موجود ہے۔
روئے سخن کی طرف نہیں، لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ ان میں
سے اکثر داستانیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان کے مصنفوں سے
صرف اس قدر دریافت کرنے کی جرأت کی جائے کہ حضرت، اگر
آپ شکار کی یہ داستان نہ سناتے تو دنیا کے معمولات میں کیا فرق
پڑ جاتا، تو شاید اُن کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا — مگر اس کو
کیا کیجیے کہ جم کاربٹ کی داستانوں کے اُردو ترجمے اس قدر
آسانی سے دستیاب ہیں کہ جنگل کی شکل عمر میں ایک بار بھی نہ
دیکھی ہو تو بھی ڈائجسٹ کے لیے کچھ نہ کچھ دال دلیا تو فراہم کیا
ہی جا سکتا ہے۔

خیر — یہ سب تو بقول شخصے چلتا ہی رہتا ہے۔ اس
تمام گزارش کا لب لباب یہ ہے کہ پہلے ارادہ یہ کیا کہ آج کی صحبت
میں شکاری زندگی کا کوئی پرانا ورق ہی ناظرین کے سامنے
پیش کیا جائے۔ پھر ذرا یہی خیال آیا کہ قبلہ کہیں اس کو بھی "ڈائجسٹی
شکاریات" میں ایک اور کہانی کا اضافہ ہی تصور نہ کر لیا جائے
لہذا آج کی اس صحبت میں گفتگو کو محض سیر تک محدود رکھیے اور شکار
کو کسی اور موقع کے لیے اُٹھا رکھیے —

جم نے امریکہ سے لکھا کہ وہ ہندوستان سے براہ راست
ملاقات کے لیے بے حد مشتاق ہیں اور اس سلسلہ میں سفر کی تمام
تیاریاں مکمل کر چکے ہیں اور عنقریب وارد ہندوستان ہوا چاہتے
ہیں — لیکن ٹھہریے، پہلے میں آپ سے جم صاحب کا تھوڑا سا
تعارف تو کرا ہی دوں۔ یہ حضرت ایک باذوق اور دلچسپ
امریکی ہیں اور ہندوستان اور اس کے علوم کے شیدائی۔ میری
اُن سے ملاقات اب تک نصف ہی تھی اور ایروگرام اور ہوائی ڈاک

سروس کی مرہونِ منت ـــــ لیکن ہندوستانی اور فارسی زبان و ادب اور سیر و سیاحت میں ان کی شدید دلچسپی نے ہمارے مکتوبی تعلقات کو ایک بے حد مضبوط مشترک بنیاد فراہم کر دی تھی ـــــ بہر حال۔
اب ان کی آمد کی اطلاع آ چکی تھی اور اس سے اگلا قدم تھا خود اُن کی اپنی آمد ـ انھوں نے ہندوستان سے ملاقات کے لیے اپنی کار کے ذریعے (جس پر وہ اپنے سفر کا بیشتر حصہ طے کرنے والے تھے) آگرہ، دہلی، بمبئی، بنگلور، مدراس، اور خدا جانے کہاں کہاں کے سفر کا پروگرام طے کیا تھا اور بہر ہی کے لیے ۔ ۴

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

اتنا کچھ پڑھ لینے کے بعد آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ شاید اس سفر میں کسی بڑے پُراسرار واقعہ کا بیان ہوگا لیکن ـــــ لیکن چھوڑیئے، شکاریات کی داستانوں میں تو تجسس یعنی سسپنس خواہ مخواہ پیدا کیا جاتا ہے تاکہ لوگ اُسے کسی طرح آخر تک پڑھ لیں۔ یہاں میں اگر سچ سچ کہہ دوں تو میری یہ سیر و سیاحت کی داستان سسپنس کے حسن سے محروم رہ جائے ـــــ اس لیے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

ایک خوب صورت صبح (ایک انگریزی فقرہ کا یہ ترجمہ بھی بہت خوب صورت لگتا ہے) حضرت جم مع اپنی واکس ویگن کے سرزمینِ ہندوستان پر تھے اور یہ خاکسار اُن کی موٹر میں ان کی برابر کی نشست پر۔

اب سنیے کہ ہندوستان سے ملاقات کے سلسلے میں جن جن کی فہرست میں تاج محل، ایلورا، اجنتا، کھجوراہو، سانچی، مدرائی اور اسی طرح کے بہت سے مقامات شامل تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ حضرت اپنی گاڑی کو حرکت میں لائیں عرض کیا گیا کہ قبلہ چونکہ یہ خاکسار ہندوستان کو اتنا ہی جانتا اور پہچانتا ہے جتنا آپ امریکہ کو، اس لیے اس سلسلے میں بجائے اس کے کہ آپ اپنی فہرست اور سفر کے شیڈول پر بھروسہ کریں، مجھ پر بھروسہ کیجیے اور جہاں اور جیسے میں عرض کروں بے چون و چرا چلتے رہیے۔
جیسا کہ زیادہ تر پردیسیوں کا حال ہے، حضرت جم بھی ہندوستان سے اپنے اب تک کے غائبانہ تعارف کے سلسلے میں ہاتھیوں، سانپوں، شیروں کی یہاں بے روک ٹوک چہل قدمی اور جگہ جگہ ناگوں کے رقص کی کہانیوں کو اپنا جزو ایمان بنا چکے تھے ـــــ لیکن دہلی سے قریندرم تک کے طویل سفر میں ہمیں نظر آیا تو کیا ـــــ فقط چند دُبلے پتلے اونٹ، جو آگرہ کے مضافات میں اتفاقاً سرِ راہ مل گئے اور ہماری طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی کیے بغیر اپنے رستے پر چلتے رہے یا پھر گھنے پیڑوں کے درمیان بل کھاتی ایک سڑک کے کنارے بیٹھی ہوئی چند فاختائیں، کہیں کہیں اٹکھیلیاں کرتے، بلکہ خوش فعلیاں کرتے کچھ بندر، موروں کا ایک جوڑا جس نے ہماری شدید خواہش اور بے حد اصرار کے باوجود ہمیں اپنے رقص سے محظوظ نہیں کیا ـــــ ہاں یاد آیا ـــــ ایک ہاتھی سے بھی ملاقات ہوئی ضرور لیکن اتفاق سے اس پر ایک مہاوت بیٹھا ہوا تھا۔

آگرہ سے گزرتے ہوئے ایک عجیب اتفاق ہوا۔ ایک پل پار کرتے ہوئے جیسے ہی حضرت جم کو ایک بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا 'چمبل ندی' تو اچانک جیسے وہ کچھ سہم سے گئے ـــــ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اور اب تک آپ پر بخوبی ظاہر بھی ہو چکا ہوگا آدمی بہت پڑھے لکھے تھے، بلکہ ہیں اور امریکی اور دوسرے مغربی مصنفوں اور صحافیوں کی نگارشات کے ذریعے سے ہندوستان سے خاصا تعارف پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں۔ چمبل گھاٹی سے گزرتے ہوئے یقیناً اُن کے گوشِ تخیل میں خوفناک ڈاکوؤں کی بندوقوں کی دھائیں دھائیں گونجنے لگی ہوں گی اور چشمِ تصور کے آگے خوفناک چہروں پر اُگی ہوئی خوفناک مونچھیں، خوفناک ہتھیار اور خوفناک مڈبھیڑیں رقص کرنے لگی ہوں گی ـــــ سہمے ہوئے انداز میں فرمایا "یہاں ڈاکو ....؟" عرض کیا "جی ـــ بس چلتے رہیے ـــ چپ چاپ"۔
ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں میرے مشورے کے بغیر بھی وہ ایسا ہی کرتے۔ بہرحال اس خطرناک علاقے کا سفر بخیریت گزر گیا سوائے ایک عجیب اتفاق کے، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ـــــ یعنی ایک جگہ اچانک ایک ناعاقبت اندیش خرگوش [illegible] سڑک پر آ گیا اور ہماری کار کی روشنیوں کی چکاچوند سے [illegible]

ہو کر بے وقوفوں کی طرح وہیں بیٹھ کر رہ گیا۔

جم کے دورے کی مدت بہت مختصر تھی اسی لیے وہ زیادہ سے زیادہ جگہیں دیکھ لینے اور بقول اُن کے حقیقی ہندوستان سے ملاقات کر لینا چاہتے تھے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ہمارا بیشتر وقت اُن کی وارفتگی میں ملک کی سڑکوں کی پیمائش کرتے گزرا ــــ ہندوستان کی دو طرفہ سایہ دار پیڑوں سے گھری ہوئی سڑکوں پر موٹر کے ذریعے سفر ایک بہت دل چسپ اور خوش گوار تجربہ ہے ــــ سفر کی تکان حد سے بڑھ جائے اور اعصاب کھنچنے لگیں تو کسی موڑ، کسی چوراہے، کسی مضافاتی علاقے میں چند منٹ کے لیے رُکیے، اور کنارے کے کچے یا نیم پختہ 'رستوران' میں گرم اور گاڑھی چائے کے ساتھ، یا موسم اگر گرم ہو تو دہی کی لذیذ لسّی کے ساتھ طرح طرح کے پکوڑے، نمکین، مٹھائیاں، کچوریاں نوش جان فرمائیے ــــ اس سفر میں جم کے لیے یہ تجربہ بے حد لذیذ ثابت ہوا۔ اُن کا کہنا تھا کہ امریکہ میں بھی اسی قسم کے 'روڈ سائڈ اسٹال' پائے تو جاتے ہیں لیکن ہر جگہ وہی ہیم برگر اور ہاٹ ڈاگ کھاتے کھاتے منہ اُبٹ جاتا ہے۔

رستے میں ایک ایسے ہی 'رستوران' پر خاصی دعوت شیراز رہی۔ دوکان کی ظاہری دھج تو کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھی لیکن صاحب سچ یہ ہے کہ وہاں کی مُرغ بریانی بے حد لذیذ تھی۔ دوکان کے مالک بڑے میاں باورچی یعنی 'چیف'، بیرے اور ہیڈ ہیڈ ماسٹر تینوں کے فرائض تن تنہا انجام دے رہے تھے۔ اس دعوت سر راہے میں اگر کوئی چیز قدرے ناخوش گوار تھی تو وہ تھا ایک نیم فاقہ کش سا کتّا، جو بار بار بظاہر بڑی بے پروائی اور استغناء کے ساتھ ہماری نیم شکستہ ڈائننگ ٹیبل کے نیچے چکر لگاتا پھر رہا تھا اور کبھی کبھی ایسی دزدیدہ نگاہوں سے ہماری طرف بھی دیکھ لیتا تھا جن میں جم کو شرکت دعوت کی درخواست اور کچھ خودداری اور سیر شکمی کی جھلکیاں نظر آتی تھیں ــــ اتفاقاً اسی جگہ جم کی پہلی ملاقات ہندوستان کی سرزمین پر ہندوستان کی موسیقی سے بھی ہو گئی ــــ اور اس ملاقات کا کریڈٹ اس بریانی رستوران کو ہی جانا چاہیے جس میں رکھے ہوئے سال خوردہ والو سیٹ ٹرانزسٹر پر جم نے محمد رفیع صاحب کو اپنے پورے 'پچ' پر گاتے ہوئے سُن لیا۔ اب بے چارے زبانی تکلف میں مجھ سے یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ یہ چیز کلاسیکل تھی یا نیم کلاسیکل یا لائٹ یا فوک۔ ہندوستان کے ان سڑک کنارے کے رستورانوں پر مرغ بریانی اور پنیر پکوڑوں کے بعد اگر جم صاحب کو کوئی چیز بے حد لذیذ معلوم ہوئی تو وہ تھی جنوبی ہند کی سانبر ڈوسہ اور پاپڑ۔

رستے میں کئی جگہ ہماری ننھی منی واکس ویگن اور دیو پیکر ٹرکوں میں معانقہ ہوتے ہوتے بچا۔ آخر جم نے ترکیب یہ نکالی کہ جیسے ہی دور سے کسی ٹرک کو آندھی طوفان کی طرح آتا دیکھتے تھے، جھٹ سے کار کو سڑک سے نیچے اُتار، رک جاتے تھے اور جب ٹرک خیریت سے برابر سے گزر جاتا تھا، سفر پھر سے شروع کر دیتے تھے ــــ ایک بار فرمانے لگے "سڑکوں کی چوڑائی میں تو اضافہ شاید مشکل ہو لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کے یہاں کے ٹرکوں کی چوڑائی کچھ کم ہو جائے۔" ظاہر ہے کہ اس قدر ٹیکنیکل سوال کا جواب دینا مجھ ایسے غیر ٹیکنیکل آدمی کے لیے مشکل تھا لہٰذا چپکے رہا۔

ہندوستان کے طول و عرض میں ہمارے اس سفر نے ہمیں یادوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ اور نظاروں کا ایک بے مثال مرقع فراہم کیا۔ نیل گری اور اوٹی اور مسوری کی پہاڑیوں سے نیچے، دامن کوہ میں پھیلے ہوئے ہرے بھرے میدان اور وادیاں، رستے میں دم لینے کے لیے ہماری کار رُکنے پر اُس کے ارد گرد اکٹھا، شوخ و سادہ آنکھوں والے ننھے منے بچوں کی متحیر و حیرت بھری نگاہوں سے کبھی ہمیں کبھی واکس ویگن کو دیکھتے تھے، کسی کا تنہا دور دراز پہاڑی چوٹی کے پاس کوئی سنسان مندر، ہرے بھرے لہلہاتے گیہوں کے کھیت، پیلی سرسوں کی پھولی ہوئی شفق، چائے کے حسین باغات اور دھان کے گیلے گیلے کھیت، گاؤں کے کسی کنویں پر جمع ہنستی، چہکتی، لڑتی، ملتی عورتیں، سادہ دیہاتی سفید کرتوں، لال ٹوپیوں، نیلی جھنڈیوں اور پرانی سائیکلوں پر شور مچاتے مختلف پارٹیوں کے الیکشن ورکر ــــ یہ تھا ہندستان کا وہ روپ جس سے جم نے سب سے پہلے اس سفر میں براہ راست ملاقات کی۔ ہندستان کا ایک روپ وہ ہے جو اس کے عظیم الشان کارخانوں، ملوں، سائنسی تجربہ گاہوں میں

ملتا ہے ۔۔ ایک روپ وہ ہے جو اس کی عظیم تاریخی عمارتوں میں نظر آتا ہے ۔۔ لیکن ہندوستان کے جس روپ سے جم کی اس سفر میں ملاقات ہوئی شاید وہ روپ ہندوستان کا وہ حسین روپ ہے جو مہمان کا سب سے پہلے استقبال کرتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ ذرا تصور کیجیے، ہندوستان سے حقیقی ملاقات کے لیے اور اسے صحیح طور پر پہچاننے کے لیے اس سچی، پر خلوص اور سادہ مسکراہٹ سے بہتر بھی کوئی وسیلہ ہو سکتا ہے جو آپ کو صحیح سمت اور رستہ بتاتے ہوئے اُس ہندوستانی کے لبوں پر نمودار ہوتی ہے جس سے آپ رستہ بھول جانے پر مدد اور رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں ۔۔ یہی بے لوث اور پُر خلوص مسکراہٹ ہمارے تمدن کا ورثہ ہے اور ہمارا عزیز ترین سرمایہ۔

سیر و سیاحت کی یہ داستان تو خیر یہیں پر ختم ہو جانی چاہیے کیونکہ جم نے حقیقی ہندوستان کی ایک جھلک دیکھ لی لیکن اس سیر کی داستان کے تتمہ کے طور پر، جس طرح اصل سے مثنیٰ وابستہ ہوتا ہے شکار کی ایک مختصر لیکن دلچسپ داستان بھی وابستہ ہے۔ وہ بھی پیش کرتا ہوں۔

جم میرے غریب خانہ پر سفر کی تکان اُتارنے کے سلسلے میں مقیم تھے اور وطن واپسی کی تیاریوں میں مصروف۔ انھیں اس سفر میں ہر چیز اور ہر بات پسند آئی تھی اور بے حد خوش تھے لیکن افسوس تھا تو صرف اتنا کہ اس سارے قیام ہندوستان میں وہ نہ تو ہمارے یہاں کے شیروں سے ملاقات کر سکے نہ سانپوں سے۔ ویسے ان کے اشتیاق اور بے چینی کے پیش نظر بمبئی کے سفر کے دوران میں ایک بار محمد علی روڈ سے گزرتے ہوئے میں نے انھیں ایک سات منزلہ عمارت کے پیچھے چھپتے ہوئے ایک شیر کا نظارہ کرانا چاہا تھا لیکن جب تک وہ میرے "وہ دیکھو" اُدھر اس عمارت کے پیچھے ایک شیر!" کے جواب میں اپنی گردن گھماتے، شیر غالباً کسی عمارت کے پیچھے کے پیچھے غائب ہو چکا تھا۔ اس کا انھیں رستے بھر افسوس رہا تھا اور اپنی اس محرومی کا ذکر وہ بڑی حسرت سے کرتے تھے اُن کی روانگی امریکہ میں غالباً دو دن باقی تھے۔ ہم لوگ باہر کے احاطے میں بیٹھے سہ پہر کی چائے پی رہے تھے۔ اچانک میر صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور اطلاع دی کہ حویلی کے آنگن میں اینٹوں کے ایک ڈھیر کے نیچے ایک سانپ تھا جسے بحمد اللہ قتل کیا جا چکا ہے۔

یہ اطلاع جب میں نے جم صاحب کو دی تو وہ جوش مسرت میں اُچھل پڑے ۔۔ مکمل ناامیدی کے بعد یک بیک کامیابی کا کیسا حسین اور درخشاں سورج طلوع ہوا تھا ۔۔ نہ سہی شیر، مگر سانپ سے یہ ملاقات تو ہندوستان کے سفر کی بیش بہا یادوں میں سے ایک اہم یاد رہے گی ۔۔ ہم لوگ فوراً جائے واردات پر پہنچے ۔۔ جم صاحب فرط جذبات سے کانپ رہے تھے۔ واقعی وہاں ایک سچ مچ کا سانپ مرا پڑا تھا ۔۔ تقاضا چار پانچ انچ لمبا اور پنسل سے کچھ ہی کم موٹا سانپ کا ایک بچہ جو اپنی ناعاقبت اندیشانہ سرگشتگی کی پاداش میں اب بے جان پڑا تھا ۔۔ سانپ کے برابر کھڑے ہو کر جم صاحب نے مختلف زاویوں سے چار پانچ تصویریں اُتروائیں ۔۔ ایک سانپ پکڑنے والے کو بطور خاص بلوایا گیا کہ وہ اس سانپ کی کھال اُتار کر جم کو دے، کیونکہ وہ اُسے اپنے ساتھ ایک سوونیر کے طور پر امریکہ لے جانا چاہتے تھے ۔۔ لیکن پھر انھیں سانپ کے ساتھ اتروائی ہوئی تصویروں ہی کی یادگار لے جانے پر اکتفا کرنا پڑا کیونکہ سپیرے نے ایک پیشہ ورانہ بے پروائی کے ساتھ مطلع کیا کہ اس سانپ کی کھال اُترنا ممکن نہیں کیونکہ اگر ایسی کوئی کوشش کی گئی تو کھال کے ساتھ پورا سانپ بھی اُتر آئے گا۔

★

۱۹۴۷ء کے بعد اردو ناول

ڈاکٹر محمد حسن

فہرست سازی میرا دستور نہیں گو مجھے فہرست سازی کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ اعداد و شمار کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور ان کی روشنی میں چھان بین آسان ہو جاتی ہے اور ادبی ذخیرے کی کیفیت اور کمیت کا اندازہ لگانا بھی آسان ہو جاتا ہے اردو میں ناولوں کی تعداد کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ پچھلے پچیس ۲۵ سال میں ہزاروں ناول چھپے اور بکے۔ اور کیسے کیسے ناول۔ رومانی، جاسوسی، ترجمے، طبعزاد۔ ایسے جن کی حیثیت اچھے ادبی ذوق کے لیے چھوت کی بیماری کی سی تھی، ایسے جو چند دنوں میں رائج ہوئے اور ختم ہو گئے۔ ان سب کا شمار نہ ممکن ہے نہ لازمی البتہ یہ بات حیرت ناک ہے کہ پچھلے پچیس سال میں صرف چند نام ہی باقی رہ گئے ہیں اور انھیں یاد کرتے وقت بھی ادبی مورخ اطمینان یا فخر محسوس نہیں کر سکتا۔

ظاہر ہے کہ کوئی تنقیدی جائزہ بھی ہر قسم کے ناولوں کا احاطہ نہیں کر سکتا یہاں محض ادبی مرتبے کے ناولوں کا ذکر ہوگا لیکن خود ادبی مرتبے کا تعین آسان نہیں۔ مختصراً یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ادبی مرتبے کے ناولوں سے مراد وہ ناول ہیں جن میں موضوع کے اعتبار سے فکری صلابت اور طرز تحریر میں ادبی چاشنی موجود ہو۔ گھٹیا ناول واقعات پر توجہ مرکوز کرتا ہے، ادبی ناول ان میں مضمر اقدار کی عکاسی کے لیے واقعات کو استعمال کرتا ہے۔ گھٹیا ناول کے لیے خارج کی تصویر کشی بڑا کام ہے، ادبی ناول کے لیے خارج بصیرت کا وسیلۂ اظہار بنتا ہے۔ ارسطو نے اعلیٰ سنجیدگی اور اعلیٰ صداقت کی انہی اقدار کی بنا پر ادب کو تاریخ پر ترجیح دی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ خوبیاں پچھلے پچیس ۲۵ سال کے کتنے اردو ناولوں میں پائی جاتی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں جن ناولوں کی دھوم دھام تھی ان میں اب صرف کرشن چندر کے ناول شکست اور عصمت چغتائی کے ناول ضدی اور ٹیڑھی لکیر کے نقوش ذہن پر ثبت ہیں۔ ان تینوں ناولوں کا موضوع تھا عنفوان شباب کی کشمکش۔ دور وہ تھا جب نئی رومانیت کے سب و لہجے کا چلن تھا۔ فلم دیوداس کے اثر سے ابھی پرانی نسل پوری طرح آزاد نہیں ہوئی تھی اور آزادی، آزادخیالی کے ارمان نے عنفوان شباب کو انارکزم اور رومانیت سے قریب کر دیا تھا۔ ذکر سماجی استحصال اور تمدنی الجھنوں کا بھی ہوا مگر بنیادی طور پر شکست، ضدی اور ٹیڑھی لکیر تینوں بوہیمین ازم اور انارکزم کی سرحدوں کی داستانیں ہی تھیں۔ رومانی سرمستی، انفرادی خواہش اور تلاش نشاط ہی حاصل کائنات تھی اور سماجی ضوابط اور تو اور مذہب اور اخلاق کے سبھی بندھن جو اس فطری خواہش سے ٹکرائے ہیں پاش پاش ہونے چاہییں۔ یہ اظہار ذات کی باغیانہ خواہش ناول پر حاوی رہی۔ اسی خواہش کی زد میں سماجی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز آ گئے کہ یہ دور ہی عنفوان شباب کی رومانیت کو سماجی سیاق و سباق بخشنے کا دور تھا جس کا ایک سما قاضی عبدالغفار کے ناول لیلیٰ کے خطوط سے بندھا تھا

جنھوں نے رومانیت کی سرمستی، گھن گرج اور اسلوب کے رنگ آہنگ کو سماجی معنویت کے لیے برتنے کی کوشش کی تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ یہ ناول نئی موڑ کے نمایندہ تھے۔ اس دور کا نوجوان جذباتی، آزاد خیال اور لذت کا جویا، سنگین حقائق کے سامنے چور چور ہوا جاتا تھا مگر تلخ حقیقتیں اُسے خواب دیکھنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھیں اور ان خوابوں میں وہ اپنی نجی آرزومندی کے رشتے اجتماعی فلاح سے بلکہ ایک مثالی سماج کی تشکیل سے جا ملاتا۔ اس کے ہاں ایک اضطراب تھا غیر مرئی، انوکھا اور بے نام۔ ابھی اس کی کوئی سمت متعین نہ تھی گو وہ اسے کبھی ایک نام دیتا تھا کبھی دوسرا۔

تقسیم نے اس خواب دیکھنے والے نوجوان کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔ وہ تو صرف خواب دیکھتا رہا اور حقیقتوں نے اسے چور چور کر ڈالا۔ اس نے سماج کے جن توہمات اور تعصبات کو اپنے خیال و خواب کی دنیا میں کچل ڈالا تھا وہ اس شدت سے ابھرے کہ ان کی بنیاد پر ملک، تہذیب، خاندان، گھربار حتیٰ کہ انسان کا وجود تقسیم ہو گیا۔ فرد کے اعتقادات اور اقدار خارجی زندگی کی حقیقتوں سے اس طرح ٹکرائے کہ شیشوں کے ٹکڑوں کی طرح بکھر گئے۔ تقسیم کا یہ کرب ایسا تھا جو ایک مدت تک اردو ناول پر کابوس کی طرح مسلط رہا۔

نجی اور اجتماعی سطح پر احتجاج کی یہ آواز بنیادی طور پر جذبے کی آواز تھی۔ اس جذبے میں فکر کا عنصر کم تھا بے اطمینانی کا زیادہ اور اس بے اطمینانی کی صحیح سمت ہنوز متعین نہیں ہوئی تھی۔ یہ احتجاج دراصل عنفوان شباب کی ذاتی آزادی کی خواہش کا دوسرا نام تھا۔ اسی لیے اس دور کا انقلابی رنگ و آہنگ یا جنسی آزادی کی آواز ہو یا مذہب اور اخلاق کے مسلمات کے خلاف سرکشی ہو سب اسی قسم کے مزاج کا مختلف روپ تھے۔ اسی لیے اس دور کی آگہی میں تینوں تصورات گڈمڈ سے ہو گئے تھے۔ مارکس ازم فرائڈ ازم اور انارکزم تینوں تصورات عنفوان شباب کی آزادی کی سرحد پر بکھرے ہوئے تھے اور ایک مدت تک ان کی درمیانی سرحدیں واضح نہیں ہوئی تھیں۔

فکر کی اس عقبی زمین کا تذکرہ کرتے ہوئے شاید ان اقدار کی نشاندہی ضروری ہے جنھیں ناول میں تلاش کیا جانا چاہیے۔ ناول اگر واقعات یا کرداروں کا آئینہ خانہ ہے تو فنی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا بلکہ فن دراصل اس معنویت میں پنہاں ہوتا ہے جو ناول نے واقعات اور کرداروں کو نادل بخشتا ہے یعنی اچھا ناول پڑھنے والے کو نئی بصیرت ضرور بخشتا ہے فکر اور جذبے کی ترتیب نو کرتا ہے اور زندگی کو ایک نئے روپ میں دیکھنے اور برتنے کی صلاحیت بخشتا ہے۔ گویا ناول کی عظمت کی بحث کا مدار اس کی جمالیاتی اقدار کے ساتھ ساتھ اس کے فکری اقدار پر بھی ہے۔ جمالیات ناول کے لیے بصیرت کے اظہار و ترسیل کا ذریعہ ہے کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ قاری کے تصورات کو نئی سمت میں لے جاتا ہے اور زندگی کی بصیرت کا نیا موڑ بخشتا ہے۔ انسانی زندگی کی بصیرت کے اعتبار سے ناول کے فکری ذخیرے یا فکری عظمت دونوں کو پرکھنا ہوگا۔

دوسری جہت خارج اور ناول کی اندرونی تانے بانے کے درمیان رشتے سے پیدا ہوتی ہے۔ ناول صرف اس بنا پر اچھا یا بُرا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے اردگرد بکھرے ہوئے سماج کے واقعات اور کرداروں کی کتنی اچھی یا کتنی بُری عکاسی کرتا ہے کیونکہ یہ تو اس کے موضوع نہیں اس کا خام مواد ہیں جن کے وسیلے سے اسے زندگی کے اعلیٰ تر شعور کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح اچھا ناول ہمیشہ ہی زندگی کے خارجی مظاہر سے انسانی وجود کی نئی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اندرونی اور بیرونی مطابقت کے درمیان یہ مطابقت جتنی گہری اور جتنی بامعنی ہوگی ناول اتنا ہی عظیم ہوگا۔

ناولوں کی قدر و قیمت کا تعین بنیادی طور پر انھیں اقدار پر ممکن ہے۔ شکست اور ٹیڑھی لکیر کے کچھ ہی دن بعد رامانند ساگر کے ناول اور انسان مر گیا کا چرچا ہوا لیکن یہ اس کے دیباچے کی وجہ سے زیادہ ہوا جس میں خواجہ احمد عباس نے فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری محض برطانوی سامراج کے بجائے خود ہندستانی مزاج کی کسی کمزوری پر ڈالنے کی کوشش کی تھی اس بحث سے قطع نظر رامانند ساگر کا ناول خلوص، دردمندی اور رشتہ

کی قوت کے ساتھ لکھا گیا تھا قتل و خون کی یہ فضا کچھ دنوں تک ہمارے ناولوں پر چھائی رہی کچھ ادیبوں نے اس کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا مگر اس حد تک اس غالب حقیقت کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا مثلاً منٹو جیسا فن کار بھی جو اس زمانے میں سماجی ذمہ داری سے کم و بیش انکار کر رہا تھا اور ترقی پسندوں کی سخت تنقید کر رہا تھا سیاہ حاشیے اور موذیل کی کہانیاں لکھ رہا تھا جن میں فرقہ وارانہ فسادات کے بوجھ کے نیچے آکر انسان کی شخصیت کی چھپی ہوئی نفسیاتی گرہوں کا پتہ لگا رہا تھا۔ ساگر کا ناول ان چند مثالوں میں ہے جب دیباچہ اصل تصنیف کو کھا جاتا ہے ساگر کا اچھا ناول دیباچے کی بحث کی نذر ہو گیا۔ ساگر کے ناول یا فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلے پر لکھے ہوئے کسی ناول کی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر نہیں ہے کہ اس میں ہنگامی صورت حال کی دردمندانہ عکاسی کی گئی ہے یا فرقہ وارانہ فسادات کے المیے کی تصویر کشی ہوئی ہے بلکہ اس کی کامیابی اس میں ہے کہ انسانی شخصیت کا سارا زہر ان ناولوں میں سامنے آیا انھوں نے ایک غیر معمولی صورت حال سے انسان کی اندرونی شخصیت کے نئی سطح پر مطابقت یا مخالفت کرنے کی صلاحیت کو ظاہر کیا۔ ان ناولوں کی کشمکش انسان کے تہذیبی مزعومات اقدار و اعتقادات اور زندگی کی سنگین حقیقتوں کے درمیان ٹکراؤ کی کشمکش سے پیدا ہوا تھا گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ پوری صورت حال جو اس قسم کے ناولوں کے لیے عقبی زمین کا کام دے رہی تھی دراصل ہندستان کے ذہن اور دل، ضمیر اور اندرونی شخصیت، مزعومات اور عمل کی کشمکش تھی ایک طرف تو یہ کشمکش ظاہر کرتی تھی کہ ہمارا دانش ور طبقہ، اس کے تصورات اور مزعومات ہندستانی سماج سے کتنے دور اور الگ تھلگ تھے دوسری طرف اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ خود ہمارے دانش وروں میں بھی اقدار و اعتقادات اور عمل میں حقیقی کشمکش موجود تھی اور سائنسی روشنی اور بصیرت سے ان کی ساری وابستگی محض جذباتی تھی جس سے وہ اپنے اردگرد کے سماج کی تو در کنار خود اپنی شخصیت کے دوسرے گوشوں کو منور نہیں کر پائے تھے گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ عنفوان شباب کے راستے سے انارکزم یا ہیومن ازم سے جو

جذباتی لگاؤ پیدا ہوا تھا وہ محض بے بنیاد تھا اور حقیقت کی آندھی نے اسے شکست کر ڈالا وہ بھی اس طرح کہ خود ان کی اپنی شخصیتیں بھی فرقہ وارانہ فسادات کی آگ سے دو نیم ہو گئیں۔

لیکن ناول کی عقبی زمین پر اس صورت حال کے اثرات خاصے دور رس ثابت ہوئے۔ ایک طرف تو اس آگ نے پرانے سبھی جذباتی مزعومات کے آگے سوالیہ نشان لگائے اور نئے سرے سے تصورات کی نفی (یا اگر ممکن ہو تو ان کی تعمیر نو) کی ضرورت واضح کر دی۔ دوسری طرف تقسیم نے جو ناسٹلجیا پیدا کیا اس کی تلخی اور چاشنی مدتوں تک غالب رہی۔ ماضی کی طرف ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ کیا ابھی تک زندگی کی ساری سمجھ بوجھ، مشترک تمدن کی ساری جھلکیاں مستقبل کے سبھی خواب محض فریب تھے؟ اور اب اس نئی زندگی اس نامہربان لمحۂ موجود کی طرف کون سا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ آئندہ چند سال تک ماضی کو لازمی طور پر ہمارے افسانوی ادب کا ہیرو ہونا تھا اور وہی ہوا۔

میرے بھی صنم خانے یقین اور گمان کی اسی دھوپ چھاؤں میں لکھا گیا قرۃ العین حیدر گو اس زمانے میں پاکستانی شہری تھیں لیکن موضوع اور ان کی موجودہ شہریت دونوں کے پیش نظر اس کا ذکر ہندستانی ناولوں ہی کے ضمن میں آتا ہے۔ قرۃ العین نے اس صنم خانے کے سبھی صنم بڑی محبت اور پیار سے تراشے ہیں اور ان کی پرستش بھی کی ہے البتہ ان کو شکست کرنے کا فریضہ وقت کے ناگزیر اور بے رحم عمل کے ہاتھوں پورا ہوا ہے زندگی جاگیردارانہ نظام کی ہے اور اس جاگیردارانہ طبقے کی جو آہستہ آہستہ نئے صنعتی نظام میں ڈھل رہا ہے، انگریزی تعلیم اور تمدن اپنا رہا ہے اور ہندستان میں گویا بین الاقوامی کلچر کی نعمتوں کو اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس عمل میں ہندستانی سماج کی ساری قدیم تقسیموں کو مٹاتا جا رہا ہے چھوت چھات، توہمات، ذات برادری، مذہب — مگر اس ساری فضا پر جذباتیت اور عنفوان شباب کی تصور پرستی غالب ہے قرۃ العین نے جاگیردارانہ طبقے کے روشن خیال نوجوانوں کو مشترک ہندستانی

تہذیب ہی کا نہیں عالمی تمدن کی اعلیٰ ترین اقدار کا بھی اپنے کھو دیا ہے۔ اسی لیے جب زمینداری ختم ہوتی ہے تو گویا تہذیب انسانی کا خاتمہ ہوتا نظر آتا ہے یا جب تقسیم ہندوستان ہوتی ہے تو بھی قرۃ العین اسے محض بلائے ناگہانی کے طور پر پیش کرتی ہیں ان طبقوں کی ذمہ داری اس میں نہیں دیکھتیں جو انھیں اتنے عزیز ہیں۔

سیاسی اور تہذیبی بصیرت سے قطع نظر "میرے بھی صنم خانے" میں بھی عنفوانِ شباب کا وہی رویہ ابھرتا ہے جس کا عکس کرشن چندر اور عصمت کے ناول پیش کر رہے تھے۔ میرے بھی صنم خانے کی مقبولیت کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ جس چمکتی جگمگاتی اوپری طبقے کی زندگی کی عکاسی قرۃ العین کر رہی تھیں وہ اردو داں طبقے کے لیے نئی تھی۔ کلبوں کی زندگی، تعلیم یافتہ آزاد خیال مردوں اور عورتوں کی زندگی جہاں جنسی زندگی پر گھر کی دیواروں کی قدغن بھی نہ پردہ دار خواتین کی گھٹی گھٹی سی آرزوئیں تھیں۔ یہ چمکتی زندگی نہ عصمت کے ناولوں کی گھریلو فضا میں تھی نہ کرشن چندر کے متوسط طبقے کے نگار خانے میں۔ اس لیے اس چمکتی دمکتی فضا نے جی موہ لیا اس پر طرہ یہ ہوا کہ سماجی زندگی کی پرچھائیوں اور تہذیبی اکائی کے بکھراؤ کا عکس بھی اس کے پس منظر میں ابھرا۔ اتنا بہت کافی تھا جس طرح ہندستانی سماج اٹھارہویں صدی کے تمدن پر بیسویں صدی کا پیوند لگا رہا تھا اسی طرح قرۃ العین نے بھی ماڈرن زندگی کی چمک دمک میں جاگیردارانہ نظام کی نفاستوں کا جوڑ لگایا اور اس میں نئی تعلیم یافتہ نسل کی رومانی دردمندی کا اضافہ کر کے پیچ کی داستان مکمل کر لی۔ بنیادی طور پر یہ فضا کا ناول ہے جس میں سماجی آہنگ کی آمیزش سے نئی سمت پیدا کی گئی ہے۔ فکری صلابت کی تلاش یہاں بے سود ہے۔

"میرے بھی صنم خانے" کا شاید سب سے خوب صورت حصہ وہ ہے جہاں تقسیم ہندستان کو مہابھارت کی تلمیح کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف کوروں ہیں دوسری طرف پانڈوں کا لشکر اور بیچ میں ارجن کا رتھ ہے جسے گیتا والے سری کرشن چلا رہے ہیں اور ارجن کے دل میں یہ دکھ ہے کہ دونوں طرف اس کے اپنے عزیز اور رشتے دار ہیں وہ آخر کس پر وار کرے۔ مگر جس طرح یہ سب کچھ ہوا ہے ایسا لگتا ہے کہ اس میں کسی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ تاریخی عمل قرۃ العین نے فراموش کر دیا جو تقسیم ہندستان کی شکل میں انجام پایا۔ یہ نہیں ہوا تھا کہ اچانک انگریزوں کے جی میں آئی اور وہ ملک کو تقسیم کر کے چلے گئے۔ وہ نفرت کی آگ جو دھیرے دھیرے بھڑکی تھی جس کی ذمہ داری ہمارے اپنے سر تھی ہمارے اپنے تاریخی عوامل کے سر تھی جس میں سجو جیسے نہ جانے کتنے نوجوان عملی طور پر سرگرم تھے ان کے تذکرے کے بغیر ناول ایک رومانی معصومیت کے ساتھ تاریخی عوامل کے جرم و سزا پر محض جذباتیت کا ہلکا سا لبادہ ہی ڈال سکتا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ اس ناول یا کسی اور ناول سے تاریخ کے مطالبات روا ہیں لیکن یہاں مرکزی تاریخی شعور کی ہے اور اس تاریخی شعور سے پیدا ہونے والی فکری توانائی کی۔ "آنگن" پاکستان میں لکھا گیا لہٰذا ہماری بحث سے خارج ہے لیکن تاریخی شعور، فنی بالیدگی اور فکری صلابت کے اعتبار سے کم سے کم میرے نزدیک وہ اس موضوع پر سب سے اچھا ناول ہے اور "میرے بھی صنم خانے" سے کہیں آگے۔

قرۃ العین کے فن میں جو چیز خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے وہ جان بوجھ کر الجھاؤ اور بکھراؤ کا استعمال ہے بعض اسے شعور کی رو سے تعبیر کر لیتے ہیں حالانکہ دونوں میں فرق ہے شعور کی رو تو گویا کسی کردار کے ذہن میں جس ترتیب یا بے ترتیبی سے مختلف خیالات گزرتے ہیں ان کا جوں کا توں بیان ہے جس کے نمونے محمد حسن عسکری کی چائے کی پیالی یا حرام جادی۔ یا اس سے بھی بہتر طریقے پر کالج سے گھر تک میں پیش کیے ہیں یا سجاد ظہیر کے افسانے نیند نہیں آتی میں ملتے ہیں۔ الجھاؤ اور بکھراؤ سے میری مراد یہ ہے کہ کسی واقعے یا کردار کو بیان کرتے کرتے دوسرے غیر متعلق واقعات یا خیالات در آئیں اور ان میں جملۂ دیا صفحوں) معترضہ کی صورت پیدا ہو جائے یعنی ناول کا وحدت تاثر ایک تسلسل اور ترتیب کے بننے کے بجائے غیر مرتب اور غیر مسلسل ٹکڑوں سے مل کر بنے۔ یہ بکھراؤ بھی ایک فن ہے بشرطیکہ آگے چل کر بیان کا سلسلہ ان تمام غیر مرتب اور غیر مسلسل ٹکڑوں میں ایک گہرا ربط پیدا کر دے جیسے دستاوسکی

کے ناول BROTHERS KARAMAZOR کے پہلے سو صفحات کا بکھراؤ بعد کے بیان سے مربوط ہو جاتا ہے۔ قرۃ العین کے ہاں بکھراؤ تکنیک نہیں عادت ہے بلکہ مجھے معاف کیا جائے تو کمزوری ہے جسے آرٹ سمجھ لیا گیا ہے۔ قرۃ العین ترشے ہوئے پلاٹ پر قادر نہیں (ہاؤسنگ سوسائٹی اور کسی حد تک سیتا ہرن استثنا ہیں) یہ بکھراؤ اول تو بے جا طوالت پیدا کرتا ہے دوسرے تاثر کی شدت کو مجروح کر دیتا ہے۔

جس ناول نویس کی شہرت کا غلغلہ اتنا بلند ہو اس کے بارے میں یہ بات شاید عجیب سی لگے مگر ان کے ناول پڑھتے وقت بارہا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا ذہن گیلری کی طرف بھٹک جاتا ہو اور وہ اپنی بات کو بے کم و کاست اور بے محابا کہنے کے بجائے بے جا آرائش بیان اور آراستگی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہوں۔ ان کے چھوٹے ناولوں میں بھی یہ عیب موجود ہے۔

اس کے بعد کچھ اور آگے بڑھے تو زمینداری کے خاتمے کا اعلان ہوا جس نے دیہی معاشرت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ جاگیردار طبقہ آخری سانسیں لے رہا تھا مگر اس دھچکے نے اس کی ساری آب و تاب بھی ختم کر دی لیکن زمینداری کا خاتمہ ایک ادھورا قدم تھا جس نے پرانے آقاؤں کا دم تو نکال لیا مگر نچلے طبقے کے دبے کچلے کسانوں کے لیے پیغام راحت نہ لا سکا۔ پرانے آقاؤں کی جگہ نئے آقا ابھر سے اور دیہاتوں میں نو دولتی کسان نے زمیندار کی گدی سنبھال لی مگر اس کی تہذیبی میراث جداگانہ تھی دیہات کی تصویر کشی اردو ناول میں قاضی عبدالستار ہی کے ذریعے ہوئی بنے ہوئے انداز بیان اور شاعرانہ اسلوب کے باوجود قاضی عبدالستار کا مشاہدہ بہت گہرا اور تخیل کی اڑان نہایت بلند ہے قاضی کو فضا کا جادو جگانے کا فن آتا ہے مگر ان کی ہمدردیاں واضح طور پر مرتے ہوئے جاگیردارانہ طبقے کے ساتھ ہیں جس کی وضع داری اور تہذیبی آب و تاب کو وہ فراموش نہیں کر پاتے۔ قاضی سے پہلے ہمارے نئے دیہاتوں کی ایسی بھرپور عکاسی کبھی نہیں ہوئی تھی 'شکست کی آواز' اور اس کے بعد 'غبار شب' دونوں میں یہ عکاسی ایسی تابناک ہے کہ دیہات کی پوری تصویر

آنکھوں کے سامنے لاکھڑی کرتی ہے۔

قاضی ہی نے اس دور کے دو تاریخی ناول لکھے 'غازی صلاح الدین' اور 'دارا شکوہ' اور دونوں میں تخیل کے زور سے ماضی کو پوری رنگا رنگی کے ساتھ زندہ کر دکھایا! اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تاریخ کا مطالعہ جزئیات تک پر حاوی ہے اور انہی جزئیات سے ان کے تخیل کو غذا ملتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے ناول ایک چادر میلی سی کا حسن تہذیبی تصویر کشی ہی میں مضمر ہے مرکزی خیال تو صرف اتنا ہے کہ انسانی زندگی مفاہموں سے لبریز ہے ہر قدم پر ناگوار حقیقتوں اور کبھی دشمن چہروں سے سابقہ پڑے تو کبھی ماضی کے ٹوٹے اور بے جوڑ رشتوں سے اور انسانی زندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ حالات جن ناگوار حقیقتوں کی گود میں پھینک دیں انھیں سے سمجھوتہ کر لو۔ ماننے کے لیے یہ تجربہ نہایت دل دوز تھا لیکن کہانی کا پس منظر اس کے پیش منظر سے کہیں آگے ہے اور اسی وجہ سے وہ پنجاب کی قصباتی زندگی کو پورے تہذیبی سیاق و سباق کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہ اس زندگی کا ایک ٹکڑا معلوم ہونے لگتی ہے۔ بیدی کا ناول زبان کی ناہمواری اور انداز بیان کے کچے پن کے باوجود اردو کے اعلیٰ ناولوں میں گنا جائے گا کیونکہ اس میں خیال کا حجم اور تجربے کی روشنی میں ڈھل کر فن کا روپ رنگ اختیار کر گیا ہے۔

عصمت کے ناول معصومہ اور دل کی دنیا اسی عرصے میں شائع ہوئے مگر معصومہ کمزور ہے اور دل کی دنیا کینوس کے اعتبار سے افسانے سے زیادہ نہیں۔ البتہ کرشن چندر کے متعدد ناولوں کی ناکامی کے باوجود دادر پل کے بچے اور گدھے کی سرگزشت قابل لحاظ ہیں۔ کرشن چندر اپنے اسلوب کو دلچسپ اور شاعرانہ بنانے اور کہانی اور کرداروں کو عام فہم سطح تک قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر اس کوشش میں فکری صلابت اور فلسفیانہ گہرائی کو صحافتی دلچسپی کی خاطر قربان کر دیتے ہیں لیکن پھر بھی فن پر ان کی دسترس اور عصری زندگی کی اتنی سوجھ بوجھ اسی پکی اور سچی ہے کہ ان کی زود نویسی کے باوجود کہیں کہیں جوہر دکھا جاتی

ہے۔ داور پل کے نیچے اسی قسم کے ناولوں میں ہے۔

گد ھے کی سرگزشت کو بہت سے لوگ طنز و مزاح کی صف میں رکھیں گے اور اسے باضابطہ ناولوں کی فہرست میں جگہ نہ دیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ طنز کے سارے آداب و لوازم کو ملحوظ رکھنے کے بعد بھی عصری زندگی کی پیچیدگی اور رنگارنگی کو کرشن چندر نے اس ناول میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔

اس دور کے اہم ناولوں میں حیات اللہ انصاری کا ناول لہو کے پھول بھی شمار کیا جائے گا جو پانچ جلدوں میں شائع ہو کر اردو کا ضخیم ترین ناول قرار پایا۔ اس ناول میں حیات اللہ انصاری نے ۱۹۱۱ء سے ۱۹۴۸ء تک یا اس کے قریب قریب ہندستانی سماج کی تہذیبی اور خصوصاً سیاسی کروٹوں کی تاریخ بیان کی ہے۔ اسی لیے صحافت کا بیانیہ انداز زیادہ غالب ہو گیا ہے۔ البتہ جہاں کہیں حیات اللہ کا قلم تہذیبی زندگی کی مختلف پرتوں کا بیان کرتا ہے وہاں ناول نئی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ ہندستانی ریاستوں کے محلوں کی اندرونی زندگی، قدیم مسلم جاگیردارانہ گھرانوں کی ریت رسمیں اور تہذیبی فضا، متحدہ اور منقسم ہندستان میں قوم پرست مسلمانوں کا المیہ ــــ یہ سب کچھ بڑی دردمندی اور ہنرمندی سے بیان ہوا ہے۔ لہو کے پھول یقیناً عظیم ناول نہیں لیکن اہم ناول ضرور ہے۔

اس کے بعد جن ناولوں کا ذکر آئے گا ان میں عظمت نہیں۔ شاید ان سب کو اہم بھی نہ کہا جا سکے لیکن ان میں کئی قابل لحاظ ہیں۔ بعض کی حیثیت ایسے خاکوں کی ہے جن میں مشق اور ریاضت سے رنگ بھرا گیا تو شاید آگے بہتر تخلیقات کا وجود ممکن ہو سکے۔ کچھ ایسے ہیں جو پڑھتے وقت اچھے لگتے ہیں لیکن ہاتھ سے چھوٹنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ذہن سے فراموش ہونے لگتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس ہمارے پرانے پختہ مشق ناول نگار ہیں لیکن اس عرصے میں بھی ان کا کوئی ایسا ناول اردو ادب کے حصے میں نہیں آیا جو ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہو یا اپنے مصنف کی صلاحیتوں کا پوری طرح اظہار کر سکتا ہو۔ نام گنانے سے کوئی فائدہ نہیں لیکن خواجہ احمد عباس کے صحافتی رنگ نے اور آسانی سے اور جلد اثر دکھانے کی کوشش نے ان کے ناولوں کو اس سنجیدگی کی سطح تک پہنچنے نہیں دیا۔

انور عظیم کا ناول پرچھائیوں کی وادیاں چھپا جس میں ایک چھوٹے سے تعلیمی حلقے کی مختلف ہستیوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور سماجی تہ داریوں کی تصویرکشی کی گئی تھی۔ انور عظیم ہمارے ان لکھنے والوں میں ہیں جن کی کہانیاں تہذیبی مرقعے ہوا کرتی تھیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس ناول میں تہذیبی تصویرکشی اور نفسیاتی تحلیل کے تقاضوں کے درمیان وہ اس طرح الجھ کر رہ گئے ہیں کہ ناول میں معنویت پیدا نہیں ہو سکی۔

آمنہ ابوالحسن کا نیا ناول سیاہ سرخ سفید، رضیہ سجاد ظہیر کا سمن اور سر شام، صالحہ عابد حسین کے ناول ساہ عمل، اپنی اپنی صلیب اور حامدی کاشمیری کا ناول بلندیوں کے خواب اس دور کے اچھے ناولوں میں شمار کیے جائیں گے۔ ان میں دلچسپی رنگینی اور کشش ہے۔

پچھلے چند مہینوں میں البتہ ایک اہم ناول عظیم مسرور کا بہت دیر کر دی نظر سے گزرا جو چونکا دینے کی حد تک کامیاب اور اعلیٰ تھا۔ علیم مسرور نئے لکھنے والے ہیں لیکن کردار نگاری کا سلیقہ، واقعہ نگاری کا سنبھلا ہوا انداز، مکالموں کی شگفتگی اور سلجھی ہوئی نثر ان کی فن کارانہ پختگی کی گواہی دیتی ہے۔ پلاٹ اور کردار نگاری دونوں کے لحاظ سے تقاضا کرتی ہے لیکن ناول نگار نے انسانی کردار میں تبدیلیاں پیدا کرنے والے نفسیاتی عوامل اور سماجی محرکات کو جس طرح ایک فنی تجربے کے روپ میں ڈھال دیا ہے وہ اسے خاصے کی چیز بنا دیتا ہے۔

۲۵ سال اور صرف چند گنے چنے ناول ــــ! فہرست بنانا مقصود بھی نہیں اور دوسرے اور تیسرے درجے کے ناولوں کی فہرست بنانا ممکن ہے نہ مفید لیکن چند گنے چنے نام اردو ناول نگاری کی نئی جہات کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں۔ بلاشبہ اردو ناول پچھلی ربع صدی کے مقابلے میں (یا داستانوں سے پریم چند) اس ربع صدی میں کہیں آگے نکل آیا ہے مگر ابھی وہ عالمی شاہکاروں کے مقابلے میں ابتدائی حالت ہی میں ہے۔ ابھی اس میں فکر کی تابناکی، مشاہدے کی قوت، تجربے کی وسعت اپنے عروج تک نہیں پہنچ سکی ہے۔

ہمارے دستور کے بنیادی حقوق

عرش ملسیانی

آزادی کو ملے پچیس سال ہو گئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت اپنے اختیارات سونپ کر الگ ہو گئی۔ صرف ایک بات تسلی بخش نہ ہوئی اور وہ یہ کہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر چند یہ تقسیم مذہب کی بنا پر ہوئی لیکن مابعد کے ہندستان میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہ ہوئی۔

ہندستان سیاسی اعتبار سے ترقی پذیر ہوا۔ اس کی خارجہ پالیسی بھی دنیا میں بڑی مقبول ہوئی۔ اقتصادی، زرعی اور صنعتی ترقی میں ہندستان اتنا آگے بڑھا کہ دنیا کے ملک دیکھتے رہ گئے۔ اس کی سرحدوں کے محافظ بھی ہر وقت چوکس رہے۔ فوجی اور دفاعی انتظام بہت ترقی پذیر ہے۔ ملکی ضروریات زیادہ تر ملک میں بننے لگیں۔ سینہ زور دریاؤں کو قابو میں لا کر ان پر بڑے بڑے بند بنائے گئے اور یہ سلسلہ آب پاشی اور بجلی کی پیداوار میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ آج ہندستان سے کروڑوں روپے کا صنعتی سامان دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں سے افضل جو بات اس زمانے میں ہوئی وہ یہاں کے دستور کا بننا تھا۔ ایک آئین ساز اسمبلی نے سیکولر دستور تیار کیا۔ ہمارے ہمسایہ ایک دو ملکوں میں ابھی تک کوئی دستور ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو عوام کے لیے ناقابلِ اعتبار۔

اس مضمون میں ہم اس دستور میں بنیادی حقوق کی چند دفعات کا جائزہ لیں گے جن پر سیکولرزم اور عام آزادی کا دارومدار ہے۔ یہ تو عام طور پر سب کو معلوم ہی ہے کہ تقسیم ملک کے بعد آبادی کی از خود تبدیلی اور فسادات کی وجہ سے ملک میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا تھا لیکن ان تمام فتنہ انگیزیوں پر قابو پانے کے بعد ملک میں دستور سازی کی طرف فوراً توجہ کی گئی اور آئین ساز مجلس کا قیام عمل میں آیا۔

مجلس آئین ساز کا پہلا جلسہ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہی شروع ہو گیا تھا لیکن آزادی اور اس کے بعد کے حوادث کی وجہ سے کام میں تاخیر ہوتی گئی۔ اس میں سب قوموں اور اداروں کے نمائندے تھے۔ بہرحال آئین منظوری کے لیے مجلس کی آخری نشست ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوئی۔ اس کی کچھ تفصیلات ذیل میں درج ہیں

(۱) آئین سازی میں ۲ برس، ۱۱ ماہ ۱۸ دن کا وقت صرف ہوا۔ مجلس آئین ساز کے کل گیارہ سیشن ہوئے۔ (۲) سیشن دیکھنے کے لیے آنے والوں کی تعداد ۵۳ ہزار تھی۔ (۳) آئین سازی پر کل ۶۳۹۶۷۲۹ روپے کے اخراجات ہوئے۔ (۴) آئینی مشیر کے مرتبہ آئین کی دفعات و جدول بالترتیب ۲۴۳ اور ۱۳ تھی۔ (۵) ترتیبِ مسودہ پیش کردہ مسودہ کی ۳۱۵ دفعات اور ۸ جدول۔ (۶) مسودہ میں جس قدر ترمیموں کا نوٹس دیا گیا ان کی کل تعداد ۷۶۳۵ تھی۔ (۷) ان میں سے حقیقتاً ۲۴۷۳ ترمیمیں پیش ہوئیں۔ (۸) آئین کے آخری مسودے کی ترتیب ۳۹۵ دفعات اور ۸ جدول۔

اس آئین کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے ممبران مندرجہ ذیل تھے:

ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیدکر (چیئرمین)، آئینی مشیر شری بی۔ این۔ راؤ۔ رکن ـــــ شری گوپالا سوامی آئینگر، شری کے۔ ایم۔ منشی، شری ٹی۔ ٹی۔ کرشنا چاری، شری الادی کرشنا سوامی آئر اور شری محمد سعد اللہ۔

آئین ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد تھے جو

بعد میں جمہوریۂ ہند کے پہلے صدر بنے۔ یہ دستور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ کیا گیا۔

ہندوستان کا دستور انگریزی تعلیم یعنی مغربی اداروں سے ہمارے تعلق اور وابستگی اور ہندوستانی ماحول کی آمیزش سے بنا ہے۔ اس میں پیچیدہ دستور کی سب خوبیاں موجود ہیں یعنی جامعیت بھی ہے اور توضیح بھی لوچ بھی ہے اور لچک بھی ہے۔ البتہ اختصار نہیں۔ اتنے بڑے ملک میں جس میں اتنی زبانیں، فرقے اور ... اختلاف ممکن بھی نہیں تھا۔ اگر اختصار ... بہت تشنہ رہ جاتی۔ ... بنیادی حقوق کا ... جو ... ہر دستور میں یہی حقوق ... ضروری ہوتے ہیں۔

بنیادی حقوق سات اقسام کے ہیں۔

(۱) حق مساوات (۲) حق آزادی (۳) استحصال سے حفاظت کا حق (۴) مذہبی آزادی کا حق (۵) تعلیمی اور ثقافتی حقوق (۶) جائداد کے حقوق اور (۷) دستوری معاملات میں محافظت کے حقوق۔

آخری دو حقوق بہت بحث طلب ہیں اور اس مضمون میں اس بحث کی گنجائش نہیں۔ اس لیے پہلے پانچ حقوق کا ذکر احسن ... ہے۔

۱۔ اس کا تو مطلب صاف ہے کہ کسی شخص کو مذہب، فرقہ، ذات، صنف یا جائے پیدائش کی بنا پر کسی دستوری حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں سماجی برابری قائم کرنے کے لیے حکومت ہند نے خطابات کی تنسیخ کر دی ہے۔ اب جو بھارت رتن، پدم وبھوشن، پدم بھوشن، پدم شری وغیرہ اعزاز دیے جاتے ہیں وہ ہرگز خطابات نہیں ہیں۔

چھوت چھات کی تنسیخ۔ چھوت چھات قانونی طور پر قطعی منسوخ کر دی گئی ہے اور کسی شخص کا داخلہ نسل، رنگ یا ذات پات کی وجہ سے کسی دوکان، ہوٹل یا عام تفریح گاہ میں بند نہیں کیا جا سکے گا۔ کسی شخص کو حکومت کے کلی یا جزوی طور پر بنوائے ہوئے کنوئیں، تالاب یا گھاٹ یا سڑک کے استعمال سے نہیں روکا جا سکے گا۔

۲۔ اسی طرح ہر شخص کی شخصی آزادی بھی محفوظ ہے اور اسے زبردستی بلا جرم یا بلا وجہ حراست میں رکھا نہیں جا سکتا یا گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ ہندوستان کے دستور کے مطابق بیگار بھی لینا منع ہے۔ انسانوں کا فروخت ہونا اور چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کا فیکٹریوں، کانوں اور خطرناک کاموں میں تقرر بھی قانونی طور پر جرم ہے۔

۴۔ پہلے ہم تعلیمی اور ثقافتی آزادی کا ذکر کریں گے اور بعد میں مذہبی آزادی کا۔ حکومت ہر اقلیت کو اپنی ثقافتی زندگی اور مذہب کو قائم رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کہیں کوئی طبقہ اپنی تہذیبی زندگی اور زبان کو قائم رکھنا چاہے تو حکومت اس پر جبر نہ کرے اور ... یہ ہے کہ وہ الٹی ... کی راہ ... لے۔ اسی طرح حکومت کے ... کی مدد سے چلنے والے اسکولوں یا کالجوں میں کسی شہری کو محض مذہب، فرقے وغیرہ کی بنا پر داخل ہونے سے روکا نہیں جا سکتا۔ ... زبان ... تعلیم کا حق دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ ترمیمات بھی دستور میں کی گئی ہیں ... پارلیمنٹ کو ایسے اختیارات دیے گئے ہیں جن سے کسی کی حق تلفی اس ... نہ ہو۔ ... اعلیٰ مدارج تک ہونے لگی ہے اور ... میں بھی وہ رائج ہو چکی ہے۔

۵۔ مذہبی آزادی۔ یہ ایک ضروری بنیادی حق ہے اور یہی بعض اوقات ... فساد بھی ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر معمولی باتوں کو مذہب میں دخل اندازی قرار دے دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے دستور کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ کسی کو بھی مذہبی طور پر امتیاز یا گھٹیا پن حاصل نہیں۔ یہاں کا ہر شہری ہر عہدے پر پہنچ سکتا ہے خواہ وہ صدر کا عہدہ ہی کیوں نہ ہو۔ بعض ملکوں میں صدر کے لیے کسی خاص مذہب کا ہونا ضروری ہے۔ سکھوں کو کرپان پہننے کی اجازت بھی دی گئی ہے کیونکہ یہ ان کے مذہبی لباس کا ایک حصہ ہے۔

ہماری جمہوریت کو بعض اوقات بڑی نازک باتوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ جب کسی مقام پر مذہبی رواداری ختم ہوتی ہے تو وہاں آتش غیظ و غضب بھڑک اٹھتی ہے لیکن ...

ہمارے دستور کے بنیادی حقوق

عرش ملسیانی

آزادی کو ملے پچیس سال ہوگئے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں غیر ملکی حکومت اپنے اختیارات سونپ کر الگ ہوگئی۔ صرف ایک بات تسلی بخش نہ ہوئی اور وہ یہ کہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر چند یہ تقسیم مذہب کی بنا پر ہوئی لیکن مابعد کے ہندستان میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تو بنیاد پرست نہیں ہندستان سیاسی اعتبار سے ترقی پذیر ہوا۔ اس کی خارجہ پالیسی بھی دنیا میں بڑی مقبول ہوئی۔ اقتصادی، زرعی اور صنعتی ترقی میں ہندستان اتنا آگے بڑھا کہ دنیا کے ملک دیکھتے رہ گئے۔ اس کی سرحدوں کے محافظ بھی ہر وقت چوکس رہے۔ فوجی اور دفاعی انتظام بہت ترقی پذیر ہے۔ ملکی ضروریات زیادہ تر ملک میں بنے لگیں سینہ زور دریاؤں کو قابو میں لا کر ان پر بڑے بڑے بند بنائے گئے اور یہ سلسلہ آب پاشی اور بجلی کی پیداوار میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ آج ہندستان سے کروڑوں روپے کا صنعتی سامان دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں سے افضل جو بات اس زمانے میں ہوئی وہ یہاں کے دستور کا بننا تھا۔ ایک آئین ساز اسمبلی نے سیکولر دستور تیار کیا۔ ہمارے ہمسایہ ایک دو ملکوں میں ابھی تک کوئی دستور ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو عوام کے لیے ناقابلِ اعتبار۔

اس مضمون میں ہم اس دستور میں بنیادی حقوق کی چند دفعات کا جائزہ لیں گے جن پر سیکولرزم اور عام آزادی کا دار و مدار ہے۔ یہ تو عام طور پر سب کو معلوم ہی ہے کہ تقسیم ملک کے بعد آبادی کی ادلا بدلی اور فسادات کی وجہ سے ملک میں بڑا انتشار پیدا ہوگیا تھا لیکن ان تمام فتنہ انگیزیوں پر قابو پانے کے بعد ملک میں دستور سازی کی طرف فوراً توجہ کی گئی اور آئین ساز مجلس کا قیام عمل میں آیا۔

مجلس آئین ساز کا پہلا جلسہ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہی شروع ہوگیا تھا لیکن آزادی اور اُس کے بعد کے حوادث کی وجہ سے کام میں تاخیر ہوتی گئی۔ اس میں سب قوموں اور اداروں کے نمائندے تھے۔ بہرحال آئین منظوری کے لیے مجلس کی آخری نشست ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوئی۔ اس کی کچھ تفصیلات ذیل میں درج ہیں:

(۱) آئین سازی میں ۲ برس ۱۱ ماہ ۱۸ دن کا وقت صرف ہوا۔ مجلس آئین ساز کے کل گیارہ سیشن ہوئے۔ (۲) سیشن دیکھنے کے لیے آنے والوں کی تعداد ۵۳ ہزار تھی۔ (۳) آئین سازی پر کل ۶۳،۹۶،۷۲۹ روپے کے اخراجات ہوئے۔ (۴) آئینی مشیر کے مرتبہ آئین کی دفعات و جدول بالترتیب ۲۴۳ اور ۱۳ تھی۔ (۵) ترتیبِ مسودہ پیش کردہ مسودہ میں ۳۱۵ دفعات اور ۸ جدول۔ (۶) مسودہ میں جس قدر ترمیموں کا نوٹس دیا گیا ان کی کل تعداد ۷۶۳۵ تھی۔ (۷) ان میں سے حقیقتاً ۲۴۷۳ ترمیمیں پیش ہوئیں۔ (۸) آئین کے آخری مسودے کی ترتیب ۳۹۵ دفعات اور ۸ جدول۔

اس آئین کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے ممبران مندرجہ ذیل تھے:

ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیدکار (چیرمین)، آئینی مشیر شری بی این راؤ، رکن — شری گوپالا سوامی آئینگر، شری کے۔ ایم منشی، شری ٹی۔ ٹی۔ کرشنا چاری، شری الادی کرشنا سوامی آئر اور شری محمد سعد اللہ۔

آئین ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد تھے جو

بعد میں جمہوریۂ ہند کے پہلے صدر بنے ۔ یہ دستور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ کیا گیا ۔

ہندستان کا دستور انگریزی تعلیم یعنی مغربی اداروں سے ہمارے تعلق اور وابستگی اور ہندستانی دماغ کی آمیزش سے بنا ہے ۔ اس میں اچھے دستور کی سب خوبیاں موجود ہیں یعنی جامعیت بھی ہے اور توضیح بھی ، توت بھی ہے اور لچک بھی ہے ۔ البتہ اختصار نہیں ۔ اتنے بڑے ملک میں جس میں اتنی ریاستیں ، فرقے اور بولیاں ہوں اختصار ممکن بھی نہیں تھا ۔ اگر اختصار ہوتا تو بات بہت تشنہ رہ جاتی ۔ آیئے اب بنیادی حقوق کا سرسری جائزہ لیں کیونکہ ہر دستور میں یہی حقوق بہت ضروری ہوتے ہیں ۔

بنیادی حقوق سات اقسام کے ہیں :

(۱) حق مساوات (۲) حق آزادی (۳) استحصال سے حفاظت کا حق (۴) مذہبی آزادی کا حق (۵) تعلیمی اور ثقافتی حقوق (۶) جائداد کے حقوق اور (۷) دستوری معاملات میں محافظت کے حقوق ۔

آخری دو حقوق بہت بحث طلب ہیں اور اس مضمون میں اس بحث کی گنجائش نہیں ۔ اس لیے پہلے پانچ حقوق کا ذکر اختصار سے کیا جاتا ہے ۔

۱ ۔ اس کا تو مطلب صاف ہے کہ کسی شخص کو مذہب ، فرقہ ، ذات ، صنف یا جائے پیدائش کی بنا پر کسی دستوری حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا ۔ اس سلسلے میں سماجی برابری قائم کرنے کے لیے حکومت ہند نے خطابات کی تنسیخ کر دی ہے ۔ اب جو بھارت رتن ، پدم وبھوشن ، پدم بھوشن ، پدم شری وغیرہ اعزاز دیے جاتے ہیں وہ ہرگز خطابات نہیں ہیں ۔

چھوت چھات کی تنسیخ ۔ چھوت چھات قانونی طور پر قطعی منسوخ کر دی گئی ہے اور کسی شخص کا داخلہ نسل و رنگ ، یا ذات پات کی وجہ سے کسی دوکان ، ہوٹل یا عام تفریح گاہ میں بند نہیں کیا جائے گا ۔ کسی شخص کو حکومت کے کلی یا جزوی طور پر بنوائے ہوئے کنوئیں ، تالاب یا گھاٹ یا سڑک کے استعمال سے نہیں روکا جا سکے گا ۔

۲ ۔ اسی طرح ہر شخص کی شخصی آزادی بھی محفوظ ہے اور کسی شخص کو بلا جرم یا بلا وجہ حراست میں رکھا نہیں جا سکتا یا گرفتار نہیں کیا جا سکتا ۔

۳ ۔ ہندستان کے دستور کے مطابق بیگار بھی لینا منع ہے ۔ انسانوں کا فروخت ہونا اور چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کا فیکٹریوں ، کانوں اور خطرناک کاموں میں تقرر بھی قانونی طور پر جرم ہے ۔

۴ ۔ پہلے ہم تعلیمی اور ثقافتی آزادی کا ذکر کریں گے اور بعد میں مذہبی آزادی کا ۔ حکومت ہر اقلیت کو اپنی ثقافتی زندگی اور مذہب کو قائم رکھنے کی اجازت دیتی ہے ۔ مطلب یہ کہ اگر کہیں کوئی اقلیت اپنی تہذیبی زندگی اور زبان کو قائم رکھنا چاہے تو حکومت اس پر جبر نہ کرے اور اسے یہ نہ کہے کہ وہ اکثریت کی راہ پر چلے ۔ اسی طرح حکومت کے اپنے یا اس کی مدد سے چلنے والے اسکولوں یا کالجوں میں کسی شہری کو محض مذہب ، فرقے وغیرہ کی بنا پر داخل ہونے سے روکا نہیں جا سکتا ۔ مادری زبان میں ابتدائی حد تک تعلیم کا حق دیا گیا ہے ۔ اس سلسلے میں کچھ ترمیمات بھی دستور میں کی گئی ہیں جن کی رو سے پریذیڈنٹ کو ایسے اختیارات دیے گئے ہیں جن سے کسی کی حق تلفی اس ضمن میں نہ ہو ۔ اب مادری زبان میں تعلیم اعلیٰ مدارج تک ہونے لگی ہے اور انتظامیہ میں بھی وہ رائج ہو رہی ہے ۔

۵ ۔ مذہبی آزادی ۔ یہ ایک ضروری بنیادی حق ہے اور یہی بعض اوقات بنائے فساد بھی ہو جاتا ہے ۔ بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر معمولی باتوں کو مذہب میں دخل اندازی قرار دے دیتے ہیں ۔ لیکن ہمارے دستور کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ کسی کو بھی مذہبی طور پر امتیاز یا گھٹیا پن حاصل نہیں ۔ یہاں کا ہر شہری ہر عہدے پر پہنچ سکتا ہے خواہ وہ صدر کا عہدہ ہی کیوں نہ ہو ۔ بعض ملکوں میں صدر کے لیے کسی خاص مذہب کا ہونا ضروری ہے ۔ سکھوں کو کرپان پہننے کی اجازت بھی دی گئی ہے کیونکہ یہ ان کے مذہبی لباس کا ایک حصہ ہے ۔

ہماری بارجیت کو بعض اوقات بڑی نازک باتوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے ۔ کیوں کہ جب کسی مقام پر مذہبی رواداری ختم ہو جاتی ہے تو وہاں آتش غیظ و غضب بھڑک اٹھتی ہے لیکن [illegible]

ملک میں یہ باتیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ جہالت ختم ہوتی ہے اور لوگوں میں روشن خیالی آجاتی ہے۔ جب ہمارا دستور بنا تھا تو ہندوستان کے اکابر نے اس پر راست صفائی کی تھی۔ ان رایوں میں ایک نہایت ہی معتبر رائے سید سلطان احمد کی ہے جو وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر رہے تھے اور معتدل مزاج کے سیاستداں تھے۔ اچھے درجے کے قانون داں بھی تھے۔ انھوں نے دستور کو بہت غور سے دیکھا ہوگا۔ اگر ایسا شخص جو اس وقت کی حکومت کا رکن بھی نہیں تھا بے لاگ رائے دے تو ہمیں قبول کرنا چاہیے کہ واقعی وہ بڑی حد تک حق بات کہہ گئے:

"اقلیت کا مسئلہ سیاست کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ یہ دنیا کی دو جنگوں کے لیے چنگاری کا کام دے چکا ہے جب مغرب اپنے تمام لطیف سیاسی احساسات کے باوجود اقلیت کے مسئلے کو حل نہ کر سکا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ غیر ملکوں کے اختلافات پیدا کرنے کی پالیسی کی وجہ سے ہندوستان آپس میں لڑنے والے فرقوں کا ایک افسوس ناک اکھاڑہ بن گیا اور یہ ایک عظیم ملک جس کے باشندے انسانی تاریخ کی پاکیزہ ترین روایات کے وارث ہونے پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں، دو خود مختار ریاستوں میں بٹ گیا۔

بہرحال یورپ کے سیاست دانوں کو اس امر کا احساس ضرور ہوا کہ اقلیت کا مسئلہ ایک اہم اور بڑا مسئلہ ہے۔ معاہدہ ورسائی کی رو سے یورپ کے علاقائی ملکوں میں پابند کرا اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ طریقہ اگرچہ غلط تھا لیکن اس کوشش سے یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ مسئلے کو حل کرنے کی خواہش ضرور موجود تھی۔ اس کے علاوہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) کے زیر اہتمام اقلیتوں کو بین الاقوامی طور پر تحفظ دینے کا چارٹر تیار کیا گیا جسے لیگ میں شامل ہونے والی تمام ریاستوں نے منظور کیا۔

گول میز کانفرنس کے وقت ہندوستان کی اقلیتوں کے سوال نے دنیا کی توجہ کو نمایاں طور پر اپنی طرف کھینچا۔ مہاتما گاندھی کی سرگرم کوششوں کے باوجود دوسری گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کے سوال پر مناسب سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس معاملے میں کانگرس کو جو ناکامی ہوئی اس کا ازالہ کرنے کے لیے اس نے چند سال بعد ایک رابطۂ عوام کی تحریک جاری کی لیکن مسلم لیگ نے اسے اپنے لیے ایک چیلنج سمجھا۔ اور یہ ایک طویل خواب کے بعد یکایک جاگ اٹھی۔ اور اس نے سرگرم تنظیمی کام شروع کر دیا۔ انتخابات میں مسلم لیگ کو وسیع پیمانے پر کامیابیاں ہوئیں۔

کچھ دیر بعد رقابت نے اقلیت اور اکثریت کے سوال کی شکل بدل کر دی اور ہندوستان کی سیاست کے میدان میں دو قوموں کا نظریہ نمودار ہوا۔ اس نظریے کو لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں سرکاری طور پر ایک ریزولیوشن کی شکل میں پیش کیا۔ کئی سال کی باہمی نفرت اور بے دردانہ کشت و خون کے بعد اس نے قطعی شکل یہ اختیار کی کہ ملک ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہو گیا۔ اب یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے اور تاریخ گزشتہ کا ایک واقعہ ہے۔ مستقبل کی تشکیل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں دانش مندی سے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں تاکہ دونوں ملکوں اور ان کے عوام کے درمیان ہمسایوں جیسے خوشگوار تعلقات پیدا ہوں۔ ہمیں اس بات سے اجتناب کرنا چاہیے کہ پرانی رقابتیں اور گزشتہ افسوس ناک تلخیاں از سر نو زندہ ہوں۔

اس حوصلہ افزا حقیقت کے پیش نظر کہ ہمارے نئے دستور میں بنیادی حقوق کی شکل میں گارنٹیاں دے کر اقلیتوں کی خودداری اور محفوظ حیثیت کا انتظام کر دیا گیا ہے ہم ہند میں بڑی آسانی سے ایک نئے باب کا افتتاح کر سکتے ہیں۔ بنیادی حقوق میں ایسے کوئی ایک تحفظ کو بھی نظر نہیں آیا جس کا بین الاقوامی کنونشنوں میں مشابہ تک موجود ہو۔ ان بنیادی حقوق میں امریکہ اور کنیڈا کے جدید ترین دستوروں اور چارٹروں کی گارنٹیاں موجود ہیں۔

ہندوستان کا نیا دستور کئی اعتبار سے ایک اہم اور قابل ستائش دستاویز ہے۔ یہ دستاویز اقلیتوں کے نقطۂ نگاہ سے بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس میں موجودہ دور کے بڑے بڑے دستوروں کی تمام خوبیاں موجود ہیں ...... ہندوستان کی تقسیم دو قوموں کے نظریے پر ہوئی تھی اور تقسیم کے ساتھ ہی دو قوموں کے نظریے کو ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر دو قوموں کو اب بھی برقرار رہنا ہے تو ہند کو اس بھدے اور ناقابل کار انداز میں کیوں تقسیم کیا گیا تھا۔ اب ہندوستان میں صرف ایک ہی قوم رہے گی اور اس کا ایک ہی جھنڈا ہوگا ......

نئے دستور میں تمام شہریوں کے لیے جو بنیادی حقوق تسلیم کیے گئے

ہیں۔ ان میں یہ بات شامل ہے۔ یہ اتنے ہمہ گیر ہیں کہ ان کی موجودگی میں مجالس آئین ساز میں مسلمانوں کے لیے نشستوں کی تخصیص بالکل بے ضرورت اور غیر ضروری ہے۔ مشترکہ انتخاب کے رواج سے یہ ٹھوس فائدہ ہوگا کہ اس دستی [illegible] کا خاتمہ ہو جائے گا جو سالہا سال تک فرقہ وارانہ طور پر ووٹ ڈالنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ برطانیہ کے اخراج کے بعد یہ بالکل قدرتی اور مناسب ہے کہ فرقہ وارانہ سیاست کو بھی یہاں سے نکال دیا جائے۔

مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کے تحفظ اور دوسری مراعات کے لیے جان دے دی۔ اگر ہندوستان کا مسلمان آج بھی اپنے دل میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان تحفظات کے علاوہ جو آئین میں موجود ہیں مہاتما گاندھی کی لافانی سپرٹ بھی اس کی حفاظت کر رہی ہے تو وہ افلاسِ ایمانی کا [illegible] حد تک شکار ہے۔ [illegible] لحاظ پیغام پہ کاربند رہنا چاہیے جو ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو [illegible] کے خون سے رقم ہوا تھا [illegible] کے تعلق [illegible] آج سے بائیس سال پرانی ہے اور کتنی اہم ہے۔

۱۹۴۷ء میں پنڈت جواہر لال نے یہ فیصلہ تحریر کرتے ہوئے کہا تھا ہم کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم سب مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ ہم عملاً اور فعلاً تنگ دلی اور مذہبی جنون کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ایک مسلمان ہندوستان کا راشٹرپتی بھی ہوا۔ مسلمان، عیسائی، سکھ، اینگلو انڈین اور پارسی بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے جن میں کابینہ کے وزیر بھی رہے۔ گورنر بھی اور دوسرے ممتاز عہدوں پر بھی۔

حال ہی میں بنگلہ دیش نے دو قومی نظریے کو ٹھکرا دیا اور وہ ایک سیکولر نظام قائم کرنے کی طرف گامزن ہے۔ یہ ہندوستان کے [illegible] بنیادی حقوق کی بہت بڑی فتح ہے۔ مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں ملک سماجی نظام کی طرف بڑی بڑی اصلاحات میں مصروف ہے اور "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ ایک حقیقت بنتا نظر آ رہا ہے۔

★

فدایانِ وطن کے عزائم

روشن [illegible]

[illegible] کا پرچم [illegible] گے
حقیقی [illegible] سبق سب کو پڑھائیں گے

ترانے حیات افزا پیام نو سنائیں گے
ہر اک کے [illegible] بنائیں گے

پہنچ منزلِ مقصود پر ہم گھر بنائیں گے
ہم اپنے عزم راسخ کا کرشمہ بھی دکھائیں گے

نئی بیداریِ احساس سے جادہ جگائیں گے
حسین آدرش کا دنیا کو شیدائی بنائیں گے

دماغ و دل کا ہر گوشہ مہک اٹھے گا خوشبو سے
گلستانِ وطن میں ہم بہاریں ایسی لائیں گے

جو [illegible] حقائق کی
خیالاتِ بطالت کی سیاہی کو مٹائیں گے

[illegible] میں محبت کا لہو بھر کر
تنگ دلی و داخلی زمانے سے مٹائیں گے

ہر اک دل میں ابھریں گے جذبہ اخلاص کا جوہر
نظر انسان سب کو ایک ہی مرکز پہ لائیں گے

حکومت ہوگی جنت کی ہمارے عالمِ نو پر
زباں سے کہتے ہیں جو اسے کر کے دکھائیں گے

ہر اک دل میں نئے جوشِ عمل کا ولولہ بھر کر
سبھی کو عظمتِ قومی کا شیدائی بنائیں گے

دکھا کر امن کا روشن حسیں چہرہ زمانے کو
نشاں کل سامراجی جنگ بازوں کا مٹائیں گے

ملکوں میں یہ باتیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ جہالت مٹتی رہتی ہے اور لوگوں میں روشن خیالی آجاتی ہے۔ جب ہمارا دستور بنا تھا تو ہندوستان کے اکابر نے اس پر راستہ سنجیدگی کی تھی۔ ان ارکان میں ایک نہایت ہی معتبر رائے سید سلطان احمد کی ہے جو وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر رہ چکے تھے اور معتدل مزاج کے سیاستداں تھے۔ اسی درجے کے قانون داں بھی تھے۔ انھوں نے دستور کو بہ غور دیکھا ہوگا۔ اگر ایسا شخص جو اس وقت کی حکومت کا رکن بھی نہیں تھا بے لاگ رائے دے تو ہمیں قبول کرنا چاہیے کہ واقعی وہ بڑی حد تک حق بات کہہ گئے:

'اقلیت کا مسئلہ سیاست کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ یہ دنیا کی جنگ کے لیے جنگاری [illegible] جب مغرب نے تمام لطیف سیاسی اصول سامنے کے باوجود نسب [illegible] مسئلے کو حل نہ کرسکا تو بڑی حد تک [illegible] کہ غیر ملکوں کے حملہ [illegible] کی اصلی وجہ [illegible] آپس میں بٹے والے [illegible] افسوسناک [illegible] عظیم جنگ [illegible] تاریخ لی [illegible] مت ہوئے [illegible] رہ سکے ہیں [illegible] حقوق [illegible]

بہرحال یورپ نے سیاست دانوں کو اس کا احساس ضرور رہا اقلیت کا مسئلہ [illegible] ہے۔ [illegible] یورپ کے بعض ملکوں [illegible] مسئلے [illegible] کی کوشش [illegible] طریقہ اگرچہ [illegible] سب کہ مسئلے کو حل کرنے کی خواہش ضرور موجود تھی۔ اس کے علاوہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) کے ذریعہ تمام اقلیتوں کو بین الاقوامی طور پر تحفظ دینے کا چارٹر تیار کیا گیا جسے لیگ میں شامل ہونے والی تمام ریاستوں نے منظور کیا۔

گول میز کانفرنس کے وقت ہندوستان کی اقلیتوں کے سوال نے دنیا کی توجہ کو نمایاں طور پر اپنی طرف کھینچا۔ مہاتما گاندھی کی سرگرم کوششوں کے باوجود دوسری گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کے سوال پر مناسب سمجھوتہ نہ ہوسکا۔ اس معاملے میں کانگریس کو جو مایوسی ہوئی اس کا ازالہ کرنے کے لیے اس نے چند سال بعد ایک رابطہ عوام کی تحریک جاری کی۔ لیکن مسلم لیگ نے اسے اپنے لیے ایک چیلنج مانا۔

ایک طویل خواب کے بعد یہ لیگ جاگ اٹھی۔ اور اس نے سرگرم تنظیم کا کام شروع کردیا۔ انتخابات میں مسلم لیگ کو وسیع پیمانے پر کامیابیاں ہوئیں جس کے کچھ دیر بعد رقابت نے اقلیت اور اکثریت کے سوال کی شکل ترک کردی اور ہندوستان کی سیاست کے میدان میں دو قوموں کا نظریہ نمودار ہوا۔ اس نظریے کو لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں باقاعدہ طور پر ایک ریزولیوشن کی شکل میں پیش کیا۔ کئی سال کی باہمی نفرت اور بے دردانہ کشت و خون کے بعد اس نے قطعی شکل یہ اختیار کی کہ ملک ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہوگیا۔ اب یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے اور زمانہ گزشتہ کا ایک واقعہ ہے۔ مستقبل کی تشکیل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں دانشمندی سے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں کہ دونوں ملکوں اور ان کے عوام کے درمیان ہمسایوں جیسے خوشگوار تعلقات پیدا ہوں۔ ہمیں اس بات سے اجتناب کرنا چاہیے کہ پرانی [illegible] افسوسناک تلخیاں از سر نو زندہ ہوں۔

اس مسئلہ پر حقیقت سے پیش نظر ہمارے نئے دستور میں بنیادی حقوق کی شکل میں [illegible] اقلیتوں کی خود داری اور محفوظ حیثیت کا انتظام کردیا گیا ہے۔ ہم اس میں بڑی آسانی سے ایک [illegible] اضافات کرسکتے ہیں۔ بنیادی حقوق میں ایسے کئی ایک تحفظ کو جن کی نظیر نہیں [illegible] بین الاقوامی کنونشنوں میں تشابہت موجود ہو۔ ان بنیادی حقوق میں امریکہ اور کینیڈا کے جدید ترین دستوروں اور [illegible] کی ضمانتیں موجود ہیں۔

ہندوستان کا نیا دستور کئی اعتبار سے ایک اہم اور قابل ستائش دستاویز ہے۔ یہ دستاویز اقلیتوں کے نقطۂ نگاہ سے بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس میں موجودہ دور کے بڑے بڑے دستوروں کی تمام خوبیاں موجود ہیں ..... ہندوستان کی تقسیم دو قوموں کے نظریے پر ہوئی تھی اور تقسیم کے ساتھ ہی دو قوموں کے نظریے کو ختم ہوجانا چاہیے۔ اگر دو قوموں کو اب بھی برقرار رہنا ہے تو ہند کو اس بھدے اور ناپاک انداز میں کیوں تقسیم کیا گیا تھا۔ اب ہندوستان میں صرف ایک ہی قوم بسے گی اور اس کا ایک ہی جھنڈا ہوگا۔

نئے دستور میں تمام شہریوں کے لیے جو بنیادی حقوق تسلیم کیے گئے

ہیں۔ ان میں ہر بات قابلِ عمل ہے۔ یہ اتنے ہمہ گیر ہیں کہ ان کی موجودگی میں مجالس آئین ساز میں مسلمانوں کے لیے نشستوں کی تخصیص بالکل بے جا اور غیر ضروری ہے۔ مشترکہ انتخاب کے رواج سے یہ ٹھوس فائدہ ہوگا کہ اس ذہنی تلخی کا خاتمہ ہو جائے گا جو سالہا سال تک فرقہ وارانہ طور پر ووٹ ڈالنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ برطانیہ کے اخراج کے بعد یہ بالکل قدرتی اور مناسب ہے کہ فرقہ وارانہ سیاست کو بھی یہاں سے نکال دیا جائے۔

مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کے تحفظ اور [illegible] کے [illegible] کے لیے جان دے دی۔ اگر ہندوستان کا مسلمان آج بھی اپنے دل میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان تحفظات کے علاوہ جو آئین میں موجود ہیں مہاتما گاندھی کی لافانی اسپرٹ بھی اس کی حفاظت کر رہی ہے تو وہ اخلاصِ ایمانی کا [illegible] ایک حد تک [illegible] رہے۔ ہندو کو اس لافانی پیام پر کاربند رہنا چاہیے جو ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ایک شہید کے خون سے رقم ہوا تھا۔" دستور کے متعلق سردار پٹیل کی یہ رائے آج سے بائیس سال پرانی ہے اور کتنی اہم ہے۔

۱۹۴۸ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

"ہم کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم سب مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ ہم عملاً اور فعلاً تنگ دلی اور مذہبی جنون کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔" چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ایک مسلمان ہندوستان کا راشٹرپتی بھی ہوا۔ مسلمان، عیسائی، سکھ، اینگلو انڈین اور پارسی بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے جن میں کابینہ کے وزیر بھی رہے۔ گورنر بھی اور دوسرے ممتاز عہدوں پر بھی۔

حال ہی میں جبکہ بنگلہ دیش نے دو قومی نظریے کو ٹھکرا دیا اور وہ ایک سیکولر نظام قائم کرنے کی طرف گامزن ہے۔ یہ ہندوستان کے دستور میں بنیادی حقوق کی بہت بڑی فتح ہے۔ مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں ملک سماجی نظام کی طرف تیزی سے اصلاحات میں مصروف ہے اور ان کا "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ ایک حقیقت بنتا نظر آ رہا ہے۔

★

فدایانِ وطن کے عزائم

روشن پٹیالوی

رواداری کا پرچم تھام کر لہرائیں گے

حقیقی دوستی کے سبق سب کو پڑھائیں گے

زمانے کو حیات افزا پیامِ نو سنائیں گے

ہر اک کے [illegible] زندگی مثلِ نو بنائیں گے

پہنچ کر منزلِ مقصود پہ مسکن بنائیں گے

ہم اپنے عزم و ہمت کا کرشمہ بھی دکھائیں گے

نئی بیداریِ احساس سے جادو جگائیں گے

حسیں اقدار کا دنیا کو شیدائی بنائیں گے

دماغ و دل کا ہر گوشہ مہک اٹھے گا خوشبو سے

گلستانِ وطن میں ہم بہاریں ایسی لائیں گے

جو میں کے ذہن عرفان میں حقائق کی

خیالاتِ جہالت کی سیاہی کو مٹائیں گے

ضمیرِ آدمیت میں محبت کا لہو بھر کر

تمیزِ ادنیٰ و اعلیٰ زمانے سے مٹائیں گے

ہر اک دل میں بھریں گے جذبۂ اخلاص کا جوہر

بطورِ انساں سب کو ایک ہی مرکز پہ لائیں گے

حکومت ہوگی جنتا کی ہمارے عالمِ نو پر

زباں سے کہتے ہیں جو اسے کر کے دکھائیں گے

ہر اک دل میں نئے جوشِ عمل کا نور بھر کر

سبھی کو عظمتِ قومی کا شیدائی بنائیں گے

دکھا کر امن کا روشن حسیں چہرہ زمانے کو

نشاں ہر کل سامراجی جنگ بازوں کا مٹائیں گے

غلام نہیں انسان چاہیئے

صالحہ عابد حسین

وہ اسی کے سنٹر کی سب سے شریف، سب سے حسین، سب سے مہذب لڑکی تھی۔ بہت دنوں سے وہ اسی جد و جہد میں تھی کہ کوئی نیک پڑھا لکھا اور معقول لڑکا ملے۔ "معقول" یعنی جو جہیز نہ مانگے۔ [illegible] چاہیے، جس کو ساس سسر کے کندھوں پر چڑھ [illegible]۔ نامطلوب نہ ہو تو وہ اس بیچاری سی لڑکی کا بیاہ [illegible] لے گا۔ ایسے لڑکے ملنا تو اب ناممکنات میں سے [illegible] جو وہ ماں کے پاس چار جوڑے دینے [illegible] سمجھا!

اور آج وہ اسی کی بہو بن کر آئی ہے۔ سرخ بنارسی جوڑے، خوبصورت زیوروں سے آراستہ، حیا کی سرخی، مسرت کی جھلک نے اس کے حسن کو اور نکھار دیا ہے:

وہ دونوں اس کے سامنے آکر جھک گئے۔ "ماں ہمیں دعا دو ـــــ ہمیشہ تمھاری محبت اور خدمت کی مسرت ہمیں نصیب رہے ـــــ" بیٹے نے پیار سے کہا تو ماں نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ سال بھر بعد پہلی دفعہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا ہوئی۔

انجنیئر صاحب نے حیرت سے اُسے دیکھا ـــــ یہ وہی پتھر دل عورت ہے جو ان کی ببلی کے لیے نہ روئی تھی ـــــ آج ـــــ آج یہ کیوں رو رہی ہے ـــــ کس کے لیے؟

"لیجیے ـــــ اسے گلے سے لگا لیجیے ـــــ یہ آپ کی ببلی واپس آگئی ہے" بیوی نے سسکیوں کے درمیان میاں کے شانے پر سر رکھ کر کہا۔ انھوں نے بیٹے کو دیکھا، بیوی کو دیکھا، بہو کو دیکھا ـــــ سچ مچ کتنی خوبصورت ہے ـــــ اور اسی کی صورت ـــــ تو ـــــ تو ـــــ ہاں ہاں۔ میری ببلی سے ملتی ہے ... آنکھیں دھندلا گئیں ... انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلا ـــــ اور بیٹا بہو دونوں ان کے سینے سے لگ گئے اور سال بھر بعد ان کو لگا کہ اندر جو شعلے بھڑک رہے تھے وہ مدھم پڑ گئے!

رات گئے جب دولہا دلہن کو ان کے کمرے میں بھیج دیا گیا، مہمان بہت سے چلے گئے، کچھ سو گئے تو انجنیئر صاحب تھکے ہارے اپنے کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گئے۔ سامنے مینٹل پیس پر ببلی کی بڑی سی تصویر رکھی تھی ـــــ بالکل انھیں لگا کہ وہ سچ مچ کی ببلی ہے، ابھی وہاں سے اتر کر آئے گی اور ان کے گلے میں باہیں ڈال دے گی اور ٹھنک ٹھنک کر ان سے اپنی بات منوائے گی! وہ ایک ٹک اس تصویر کو دیکھ رہے تھے!

"پاپا ـــــ پاپا ڈیر ـــــ میں ایم۔ اے یہاں نہیں کروں گی میں تو بمبئی میں پڑھوں گی پاپا"

"مگر ڈارلنگ۔ تمھاری ماں ـــــ وہ اتنی دور بھیجنے کے لیے تیار نہیں ـــــ" انھوں نے پیار سے سمجھانا چاہا۔

"پاپا آپ ممی سے بہت ڈرتے ہیں ـــــ وہ تو جانے کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ایک طرف اتنی پڑھی لکھی ـــــ اتنے بڑے ادارے کی چیرمین ہیں، سنٹر چلاتی ہیں ـــــ اور بیچ بیچ ذات

بات، چھوٹے بڑے، امیر غریب کسی چیز کی قائل نہیں ۔۔۔ آزادی کی علمبردار ہیں ۔۔۔ خود نوکری کرتی ہیں ۔۔۔ میرے پاپا بیچارے کی کوئی خدمت نہیں کرتیں ۔۔۔" اس نے آنکھیں نچائیں ۔ وہ سیاہ ، گہری حسین کنول کی سی آنکھیں ۔۔۔ اور باپ کی پیشانی چوم لی: "ہاں! اور میرے لیے تدامت پسند بن جاتی ہیں ۔۔۔

"نہیں بیٹے ۔ یہ بات نہیں ۔۔۔ اصل میں وہ تجھے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتیں ۔۔۔ اور پھر ۔ میں ۔ ۔ ۔ بھی کیسے رہوں گا تیرے بغیر" وہ تو ہمیشہ سے اس پر فدا تھے ۔ جب تین چھوٹے چھوٹے مر کر وہ زندہ بچی تھی تو ماں سے زیادہ تو باپ ہی اس پر قربان رہتے تھے ۔ دنیا کی کون سی نعمت تھی جو انھوں نے اس کے لیے فراہم نہ کی ہو ۔ کون سی ضد جو پوری نہ کی ہو ۔ بڑا بیٹا اس سے سال بھر چھوٹا تھا مگر وہ ماں کا لاڈلا تھا ۔ ۔ ۔ یہ بی جان دبیلی تھی:

"پاپا ۔ نہ ۔ نہ ۔ ہم تو ممی سے ۔ ۔ ۔ جیسے ہمارے کی دوست بھی وہیں جا ۔ ۔ ۔ ۔۔۔ ۔ ۔ ۔ پڑھنا ہی چھوڑ دوں گی ۔۔۔ اور انھیں اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے ۔۔۔ بیوی کو کسی نہ کسی طرح راضی کیا تھا ۔ وہ بمبئی پڑھنے چلی گئی تھی ۔ وہاں سے چھٹیوں میں آتی تو پھول کی طرح کھلی ہوئی ۔ سال بھر سے اس کا ایک دوست بھی آکر ٹھہرا کرتا ۔۔۔ ماں باپ دونوں نے بھانپ لیا کہ دوستی سے اگلی منزل شروع ہو چکی ہے ۔ لڑکا اچھی صورت شکل کا ، قابل اور شریف لگتا تھا ۔ ذات ان سے نیچی ضرور تھی مگر وہ ذات پات کے قائل ہی کب تھے ۔ اور پھر ببلی کی خوشی میں ان کی خوشی تھی ۔

اگلے سال ببلی نے ایم ۔ ایس سی ۔ فرسٹ کلاس میں پاس کر لیا ۔۔۔ بہت خوش تھے دونوں! آنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن جب اس کے بجائے اس کا خط آیا کہ میں نے بمبئی ہی میں نوکری کر لی ہے تو پہلی بار انھیں اپنی لاڈلی بیٹی پر غصہ آیا تھا ۔ کیا ان کی محبت کا اتنا حق بھی نہ تھا کہ وہ ان سے پوچھ لیتی ۔۔۔ اور اس وقت بیوی نے الٹی ببلی کی طرف داری کی تھی ۔۔۔ آج کل کے نوجوان کہاں یہ سب دیکھتے اور مانتے ہیں ۔۔۔ اچھا ہے جہاں وہ خوش رہے ۔ ۔ ۔

۔۔۔ کئی مہینے بعد ببلی ملنے آئی ۔۔۔ ساتھ میں اس کا دوست بھی تھا ۔ اور ببلی نے ماں باپ کو یہ خبر سنائی کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور خود درخواست کرنے آیا ہے تو باپ غصہ وصہ بھول گئے ۔ ان کی اکلوتی بیٹی کا بیاہ ہوگا ۔ یہ سوچ کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے ۔ لڑکے نے ان سے کہا پاپا ۔۔۔ میرے والد صاحب خود آپ سے ملنے آئیں گے ۔ مگر میں نے سوچا پہلے میں آپ سے خود ہی بات کر لوں!"

انھوں نے بہت خوشی سے انھیں شادی کی اجازت دی مگر اس شرط پر کہ منگنی بیاہ سب یہاں مذہبی طریقے پر ہوگا ۔۔۔ بعد میں بیوی نے انھیں بتایا تھا کہ انھوں نے لڑکے سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ جہیز وغیرہ نہ دیں گے ۔ نہ نقد ۔ کچھ ۔۔۔ ہاں بول ان کا جو کچھ بھی ہے ۔۔۔ اور جو کچھ ہے عمر بھر دونوں نے کمایا ہے ۔ وہ سب ان تینوں بچوں ہی کا تو ہے ۔۔۔ اور اس پر لڑکے نے کہا تھا ہاں تو ۔ ۔ مجھے بیوی چاہیے ۔ ببلی چاہیے ۔ نہ اس کا یا آپ کا ۔ روپے کی خاطر بیاہ نہیں ۔ ونیا گا کتنی خوش ہوئی تھی وہ ۔ وہ ٹھہری جہیز کے خلاف بنائی کمیٹی کی سکریٹری اور سرگرم کارکن ۔۔۔ وہ بھلا یہ بات کیسے گوارا کرتی!

مگر آہ! پھر سب کچھ خاک میں مل گئی!

اس رات دونوں میں سارات بھر لڑائی ہوتی رہی تھی ۔

ببلی نے باپ کو خط لکھا تھا کہ جی ۔۔۔ شادی کے فوراً بعد مزید تعلیم کے لیے امریکہ جانا چاہتا ہے ۔۔۔ اور اسی کے لیے اسے پچپن ہزار روپے کی ضرورت ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ پاپا اگر اسے دے دیں تو اس کی یہ تمنا بر آجائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ساتھ ہی بہت کچھ اس کی طرف سے صفائی بھی دی تھی!

وہ سوچ میں پڑ گیا ۔ یہ لڑکا بنتا تو بڑا وہ تھا ۔ مگر اندر سے وہی لالچی، خود غرض، روپے کا لوبھی نکلا نا! وہ جانتا ہے کہ میری جائداد ہے، گھر ہے، نقد ہے ۔۔۔ تینوں بچوں کے

غلام نہیں انسان چاہیئے

صالحہ عابد حسین

وہ اسی کے سنٹر کی سب سے شریف، سب سے حسین، سب سے مہذب لڑکی تھی۔ بہت دن سے وہ اسی جدوجہد میں تھی کہ کوئی نیک پڑھا لکھا اور معقول لڑکا ملے۔ "معقول" یعنی جو جہیز مانگے، جو قدر و قیمت نہ چاہے، جس کو ساس سسر کے کندھوں پر چڑھ کر [illegible] ترقی [illegible] مطلوب نہ ہو تو وہ اس بیاری کی لڑکی کا بیاہ اس [illegible] ایسے لڑکے کا ملنا تو اب ناممکنات میں سے [illegible] اور [illegible] بیوہ ماں کے پاس چار جوڑے دینے [illegible] بھار ابھی [illegible] تھا!

[illegible] آج وہ اس کی بہو بن کر آئی ہے۔ سرخ بنارسی جوڑے، خوبصورت زیوروں سے آراستہ، حیا کی سرخی، مسرت کی جھلک نے اس کے حسن کو اور نکھار دیا ہے:

وہ دونوں اس کے سامنے آکر جھک گئے۔ "ماں — ہمیں دعا دو — ہمیشہ تمھاری محبت اور خدمت کی مسرت ہمیں نصیب رہے —" بیٹے نے پیار سے کہا تو ماں نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ سال بھر بعد پہلی دفعہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا ہوئی۔

انجینیر صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا — یہ وہی پتھر دل عورت ہے جو ان کی بیلی کے لیے نہ روئی تھی — آج — آج یہ کیوں رو رہی ہے — کس کے لیے؟

"بیچے — اسے گلے سے لگا لیجیے — یہ آپ کی بیلی واپس آگئی ہے" بیوی نے سسکیوں کے درمیان میاں کے شانے پر سر رکھ کر کہا۔ انھوں نے بیٹے کو دیکھا، بیوی کو دیکھا، بہو کو دیکھا — سچ مچ کتنی خوبصورت ہے — اور اسی کی صورت — تو — تو — ہاں ہاں۔ میری بیلی سے ملتی ہے.. آنکھیں دھندلا گئیں ... انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بیٹا بہو دونوں ان کے سینے سے لگ گئے اور سال بھر بعد ان کو لگا کہ اندر جو شعلے بھڑک رہے تھے وہ مدھم پڑ گئے!

رات گئے جب دولہا دلہن کو ان کے کمرے میں بھیج دیا گیا، مہمان بہت سے چلے گئے، کچھ سو گئے تو انجینیر صاحب تھکے ہارے اپنے کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گئے۔ سامنے شیلف پر بیلی کی بڑی سی تصویر رکھی تھی — بالکل انھیں لگا کہ وہ سچ مچ کی بیلی ہے، ابھی وہاں سے اتر کر آئے گی اور ان کے گلے میں باہیں ڈال دے گی اور ٹھنک ٹھنک کر ان سے اپنی بات منوائے گی! وہ ایک ٹک اس تصویر کو دیکھ رہے تھے!

"پاپا — پاپا ڈیر — میں ایم۔ اے یہاں نہیں کروں گی میں تو بمبئی میں پڑھوں گی پاپا"

"مگر ڈارلنگ۔ تمھاری ماں۔ وہ اتنی دور بھیجنے کے لیے تیار نہیں —" انھوں نے پیار سے سمجھانا چاہا۔

"پاپا آپ ممی سے بہت ڈرتے ہیں — وہ تو جانے کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ایک طرف اتنی پڑھی لکھی — اتنے بڑے ادارے کی چیرمین ہیں، سنٹر چلاتی ہیں — اونچ نیچ، ذات

بات، چھوٹے بڑے، امیر غریب کسی چیز کی قائل نہیں ـــــ آزادی کی علمبردار ہیں ـــــ خود نوکری کرتی ہیں ـــــ بیچارے پاپا بیچارے کی کوئی خدمت نہیں کرتیں ـــــ اس نے آنکھیں نچائیں۔ وہ سیاہ گھنی حسین کنول کی سی آنکھیں ـــــ اور باپ کی پیشانی چوم لی "ہاں! اور میرے لئے تو سب پسند بن جاتی ہیں ـــــ

"نہیں بیٹے [illegible] بات ہیں ـــــ اصل میں وہ تھے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتے ـــــ اور پھر [illegible] کیسے رہوں گا تیرے بغیر" وہ لوجسے اس کے رہا تھے [illegible] چھوٹے چھوٹے مرکر وہ زندہ بچی تھی تو ماں [illegible] وہ لو باپ [illegible] تھے [illegible] کی کوئی [illegible] تو [illegible] کی ہو۔ کون سی [illegible] چھوٹا تھا مگر وہ ماں کا لاڈلا تھا [illegible]

[illegible] کی دوست بھی [illegible] چھوڑ دو تی [illegible] اور [illegible] اس کے ساتھ ہتھیار ڈالنے پڑے تھے ـــــ [illegible] کو کسی نہ کسی طرح [illegible] وہ [illegible] چلی گئی تھی وہاں سے [illegible] کی طرح کھلی ہوں سال بھر سے اس کا ایک دوست بھی آکر ٹھہرا کرتا ـــــ ماں باپ دونوں نے بھانپ لیا کہ دوستی سے اگلی منزل شروع ہو چکی ہے لڑکا اچھی صورت شکل کا، قابل اور شریف لگتا تھا ذات ان سے بھی منزوری تھی مگر وہ ذات پات کے قائل ہی کب تھے۔ اور پھر ببلی کی خوشی میں ان کی خوشی تھی۔

اگلے سال ببلی نے ایم۔ایس سی۔فرسٹ کلاس میں پاس کرلیا ـــــ بہت خوش تھے دونوں! آنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن جب اس کے بجائے اس کا خط آیا کہ میں نے بمبئی ہی میں نوکری کرلی ہے تو پہلی بار انھیں اپنی لاڈلی بیٹی پر غصہ آیا تھا۔ کیا ان کی محبت کا اتنا حق بھی نہ تھا کہ وہ ان سے پوچھ لیتی ـــــ اور اس وقت بیوی نے الٹی ببلی کی طرف داری کی تھی ـــــ آج کل کے نوجوان کہاں یہ سب دیکھتے اور مانتے ہیں ـــــ اچھا ہے جہاں وہ خوش رہے۔

ـــــ کئی مہینے بعد ببلی ملنے آئی ـــــ ساتھ میں اس کا دوست بھی تھا۔ اور ببلی نے ماں باپ کو یہ خبر سنائی کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور خود درخواست کرنے آیا ہے تو باپ غصہ وغصہ بھول گئے۔ ان کی اکلوتی بیٹی کا بیاہ ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ لڑکے نے ان سے کہا "پاپا ـــــ میرے والد صاحب خود آپ سے ملنے آئیں گے۔ مگر میں نے سوچا پہلے میں آپ سے خود ہی بات کر لوں۔"

انھوں نے جب خوشی سے انھیں شادی کی اجازت دی مگر اس شرط پر کہ منگنی [illegible] اسی طریقے پر ہوگا ـــــ [illegible] انھیں بتایا تھا کہ انھوں نے لڑکے سے یہ بھی کہہ [illegible] کہ وہ جہیز وغیرہ [illegible] کچھ [illegible] کا جو کچھ بھی ہے ـــــ [illegible] دونوں نے کہا ہے۔ وہ سب ان تینوں بچوں [illegible] کا ہے ـــــ [illegible] کے [illegible] تھا "ہاں تی ـــــ مجھے [illegible] ببلی چاہیے [illegible] یا آپ کے روپے کی خاطر [illegible] کبھی خوش ہوئی تھی وہ۔ وہ ٹھہری [illegible] کے خلاف [illegible] کی سکریٹری اور سرگرم کارکن ـــــ وہ بھلا [illegible] کیسے گوارا کرتی۔

مگر آہ! پھر سب کچھ خاک میں مل گئی!

اس رات دونوں میں رات بھر لڑائی ہوتی رہی تھی [illegible] نے باپ کو خط لکھا تھا کہ بجی ـــــ شادی کے فوراً بعد مزید تعلیم کے لیے امریکہ جانا چاہتا ہے ـــــ اور اسی کے لیے اُسے پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پاپا اگر اسے دے دیں تو اس کی یہ تمنا بر آجائے گی ...... اور ساتھ ہی بہت کچھ اس کی طرف سے صفائی بھی دی تھی!

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ لڑکا بنتا تو بڑا وہ تھا۔ مگر اندر سے وہی لالچی، خود غرض، روپے کا لوبھی نکلا نا! وہ جانتا ہے کہ میری جائداد ہے، گھر ہے، نقد ہے ـــــ مجبوراً بچوں کے

سے میں کمائی آنے لگا۔ پھر ببلی تو سات آٹھ سو کی نوکر ہو گئی
ہے۔ پھر بھی۔ پھر بھی ـــــ وہ! اور میں مان بھی لوں تو اس
کی ماں ـــــ وہ تو کبھی نہ سنے گی یہ بات! اور وہی ہوا ـــ
وہ سنتے ہی بھڑک اٹھی ـــ "مجھے ایسے لڑکے سے اپنی لڑکی
نہیں بیاہنی ہے۔"
"مگر ببلی کا کیا ہوگا ببلی ـــــ وہ تو اسے دل و جان
سے چاہتی ہے۔"
"اگر یہ چاہت یک طرفہ ہے تو ببلی کی زندگی عذاب ہو جائے
گی ـــ اس لڑکے کو اگر ببلی سے سچی محبت ہوتی تو وہ کبھی
روپے نہ مانگتا ـــ"

اور رات بھر دونوں میں لڑائی ہوتی رہی۔ وہ ہر طرح سے
سمجھاتا رہا۔ ہماری لڑکی ضدی ہے ـــ جذباتی ہے ـــ
ہمیں اس کا مستقبل دیکھنا ہے۔ روپیہ بعد میں نہ دیا پہلے دے
دیا فرق کیا پڑتا ہے ـــ مگر اس کی سمجھ میں بات نہ آئی!
"مجھے صرف اپنی لڑکی کی فکر ہے۔ مجھے ہندوستان بھر کی لڑکیوں
کی چنتا ہے۔ میں اس لعنت کو دور کرنے کے لیے بیس برس سے
جدوجہد کر رہی ہوں۔ تقریریں کرتی ہوں، مضمون لکھتی ہوں!
میں نے کتنی ہی ایسی شادیاں رکوائی ہیں ـــ کتنے ہی ایسے نوجوانوں
کی ہمت افزائی کی ہے جو غریب لڑکیوں سے بیاہ کرتے ہیں یا کم
سے کم جہیز اور روپیہ مانگتے نہیں! اور اب میں یہ سب کچھ اپنی لڑکی
کے لیے کروں ـــ نہیں ـــ یہ نہ ہوگا ـــ میں مر جاؤں گی ـــ مگر یہ
شکست قبول نہ کروں گی!" وہ بے بس ہو گیا ـــ بیٹی کو تار دیا
"میں مجبور ہوں ـــ تو خود آکر اپنی ماں سے بات کر!"
اس سے آگے سوچنے کی جیسے ہمت نہ رہی ـــ ببلی کی
تصویر کو سینے سے لگا کر وہ بلک بلک کر رونے لگے۔

وہ بستر پر لیٹی تھی، آنکھیں چھت پر گھومتے پنکھے کو گھور
رہی تھیں اور سال بھر پہلے کے واقعات اس پنکھے سے زیادہ
تیزی سے دماغ میں چکر کھا رہے تھے!

"ممی ـــ ڈارلنگ ممی!"
"ہاں میری بچی ـــ!"
"ماں۔ پاپا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے ـــ میں آپ
کی مشکل سمجھتی ہوں ـــ مگر ماں ـــ" وہ بہت کم اسے ماں کہتی
تھی ـــ مگر جب کہتی تو کتنا پیارا لگتا تھا اس کے منہ سے یہ انمول لفظ۔
"ماں ـــ جی ـــ نہیں مانتا ـــ وہ روپیہ چاہتا ہے ـــ
نقد روپیہ ـــ"
"اور تو نے یہ نہیں کہا کہ تو مجھے چاہتا ہے یا روپے کو ـــ؟"
"ماں ـــ تم نہیں جانتیں ـــ آج کل زندگی کا انداز
کتنا بدل گیا ہے۔ ماں یہ تو عام بات ہے۔ دلی میں، بمبئی میں،
حیدرآباد میں، کشمیر میں، بنگال میں ـــ ہر جگہ۔ ہر مذہب، ہر
قوم کے نوجوان اپنی قیمت لگاتے ہیں۔"
"جانتی ہوں ـــ مگر میں انسان خریدنے کے خلاف ہوں!
مجھے غلام نہیں بیٹا چاہیے۔ جو انسان ہو۔ یہ نوجوان ـــ
وہ خود اپنی عزت خاک میں ملاتے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے قاتل
ہیں۔ وہ جن لڑکیوں سے بیاہ کرتے ہیں ان کو سچی محبت نہیں
دے سکتے ـــ عزت نہیں کر سکتے۔ وہ صرف پیسے کے لوبھی ہوتے
ہیں۔ تجھے ایک سے ایک اچھا لڑکا مل جائے گا میری بچی ـــ
اس کم ظرف، لالچی خود غرض کے لیے تو اپنی شخصیت مسخ کر دے گی!
اپنی ماں کو ذلیل کرے گی۔ اس کے عمر بھر کے اصولوں کو خاک
میں ملا دے گی۔ کیا اسی لیے ہم نے تجھے اتنا بڑا کیا تھا؟"
ماں رونے پر آمادہ ہو رہی تھی!
ببلی کے ہونٹ کانپنے لگے ـــ "ماں۔ نہیں ـــ تم ـــ ماں
ـــ میں بہت دور نکل آئی ہوں ـــ اب واپس نہیں جا سکتی ـــ"
ماں کا چہرہ سفید پڑ گیا ـــ "ببلی یہ تو کیا کہہ رہی ہے ـــ کیا
تو نے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگائی ـــ کیا ـــ تو ـــ
کیا تو ..." وہ جملہ پورا نہ کر سکی!
"نہیں ماں ـــ میں نے تمہاری عزت اب تک بچائی ہے۔
مگر میں بھی تم کو اتنا بتانا چاہتی ہوں کہ اب ـــ کہ اب کسی اور کو وہ مقام

نہیں دے سکوں گی ـــــ ناممکن ـــــ"

ماں چپ رہی۔

"تمھیں دنیا کی لڑکیوں کا درد ہے ماں۔ اپنی بیٹی کا نہیں؟"

"ہاں بیلی ـــــ تو میری کوکھ سے ضرور پیدا ہوئی ـــــ مگر مجھے ان لڑکیوں کا بھی اتنا ہی درد ہے جو ہر سال جانے کتنی اس دہیز کی لعنت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔"

"اور اگر تمھاری بیٹی بھی اسی کی بھینٹ چڑھ گئی تو؟"

"بیلی! یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ تو اتنی بزدل نہیں ہو سکتی تو پڑھی لکھی۔ سمجھدار۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی خود اعتمادی سے بھرپور ـــــ نہیں یہ تو مجھے ڈرانے کو کہہ رہی ہے ـــــ"

"ہاں ماں یہی بات ہے" خیر تم سو جاؤ اب!

میں ذرا پاپا سے مل لوں!"

وہ بیٹی کے پیچھے پیچھے گئی اور دراز میں سے جھانکنے لگی کہ باپ بیٹی میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

"پاپا"

"ہاں ڈیر ـــــ مل آئیں ماں سے؟"

"ہاں پاپا"

"بات ہو گئی ـــــ"

"ہو گئی پاپا ـــــ"

"مان گئی وہ؟"

"پاپا ـــــ ممی تو پتھر کی چٹان ہیں۔ وہ کیا مانیں گی ـــــ"

"تو اب کیا ہو گا بیٹی" بے بسی سے انھوں نے کہا۔

"آپ انھیں مجبور نہیں کر سکتے پاپا"

"نہیں بیٹی۔ اسے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ مگر میں چپکے سے اپنی پنشن بیچ کر ـــــ تجھے روپے دے دوں گا۔ اُسے خبر بھی نہ ہوگی ـــــ"

"نہیں پاپا۔ نہیں پاپا ـــــ یہ نہ ہوگا۔ آپ زندگی بھر اصول پرست رہے ہیں۔ آپ میں اور ممی میں مثالی محبت ہے ـــــ میں ـــــ میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ دونوں کے بیچ دیوار کھڑی ہو ـــــ ممی کے دل میں آپ کی عزت کم ہو جائے!"

"تو پھر؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ سب ٹھیک ہو جائے گا پاپا۔ انکل ـــــ"

اس نے باپ کے گال کو بوسہ دیا۔ ماں جلدی سے اپنے پلنگ پر آ کر لیٹ گئی۔ بیلی نے دروازے سے جھانکا۔

"گڈ نائٹ ماں۔ گڈ نائٹ"

"گڈ نائٹ پیاری" اس نے بہت پیار سے کہا۔ جی چاہا جا کر اسے سینے سے لپٹا لے۔ مگر چپ لیٹی رہی ـــــ

اگلے دن بیلی گہری نیند سو رہی تھی۔ بڑی نیند!

سارا شہر اس کے جنازے کے ساتھ تھا ـــــ باپ پاگل سے ہو گئے تھے۔ بھائی دیواروں سے سر پھوڑ رہے تھے ـــــ سارا خاندان، سارا شہر رو رہا تھا ـــــ موت اور ایسی موت! ـــــ مگر وہ چپ تھی۔ سب اسے دیکھ رہے تھے ـــــ مگر اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا تھا ـــــ اس کی سہیلیاں، بہنیں، اس کے سنٹر کی لڑکیاں، اس کی کولیگ اس کے چاروں طرف جمع تھیں لیکن نہ تھا رکیا کریں مگر ـــــ وہ کیا کرے ـــــ ہر طرف ایک خلا تھا ـــــ ایک ویرانی ـــــ ایک بے حسی ـــــ شدید بے حسی اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

لوگ سمجھتے ہیں وہ پاگل ہو جائے گی ـــــ مر جائے گی ـــــ مگر انسان کیا کچھ سہہ لیتا ہے۔ کیا کچھ!!

. . . .

اس نے سر اٹھایا . . . . چاروں طرف دیکھا۔ کارنس پر بیلی کے بچپن کی تصویر مسکرا رہی تھی ـــــ اس کے برابر کچھ دونوں لڑکوں کی تصویریں تھیں ـــــ ممی کی ڈگری گاؤن میں اور چھوٹے بیٹے کی سوٹ میں!

سے میں کافی آئے گا۔ پھر ببلی خود سات آٹھ سو کی نوکر ہو گئی ہے۔ پھر بھی۔ پھر بھی ــــ وہ! اور میں مان بھی لوں تو اس کی ماں ــــ وہ تو کبھی نہ سنے گی یہ بات! اور وہی ہوا ــ وہ سنتے ہی بھڑک اٹھی ــــ "مجھے ایسے لڑکے سے اپنی لڑکی نہیں بیاہنی ہے۔"

مگر ببلی کا کیا ہوگا ببلی ــــ وہ تو اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔"

"اگر یہ چاہت یک طرفہ ہے تو ببلی کی زندگی عذاب ہو جائے گی ــــ اس لڑکے کو اگر ببلی سے سچی محبت ہوتی تو وہ کبھی روپے نہ مانگتا ــــ"

اور رات بھر دونوں میں لڑائی ہوتی رہی۔ وہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔ ہماری لڑکی ضدی ہے ــــ جذباتی ہے ــ ہمیں اس کا مستقبل دیکھنا ہے۔ روپیہ بعد میں نہ دیا پہلے دے دیا فرق کیا پڑتا ہے ــــ مگر اس کی موٹی سمجھ میں بات نہ آئی! تمھیں صرف اپنی لڑکی کی فکر ہے۔ مجھے ہندستان بھر کی لڑکیوں کی چنتا ہے۔ میں اس لعنت کو دور کرنے کے لیے بیس برس سے جدوجہد کر رہی ہوں۔ تقریریں کرتی ہوں، مضمون لکھتی ہوں! میں نے کتنی ہی ایسی شادیاں کروائی ہیں ــ کتنے ہی ایسے نوجوانوں کی ہمت افزائی کی ہے جو غریب لڑکیوں سے بیاہ کرتے ہیں یا کم سے کم جہیز اور روپیہ مانگتے نہیں! اور اب میں وہی کچھ اپنی لڑکی کے لیے کروں ــــ نہیں ــــ یہ نہ ہوگا ــــ میں مر جاؤں گی ــ مگر یہ شکست قبول نہ کروں گی!" وہ بے بس ہو گیا ــــ بیٹی کو تار دیا میں مجبور ہوں ــــ تو خود آکر اپنی ماں سے بات کر!

اس سے آگے سوچنے کی جیسے ہمت نہ رہی ــــ ببلی کی تصویر کو سینے سے لگا کر وہ بلک بلک کر رونے لگے۔

وہ بستر پر لیٹی تھی، آنکھیں چھت پر گھومتے پنکھے کو گھور رہی تھیں اور سال بھر پہلے کے واقعات اس پنکھے سے زیادہ تیزی سے دماغ میں چکر کھا رہے تھے!

"ممی ــــ ڈارلنگ ممی!"

"ہاں میری بچی ــــ"

"ماں ـ پاپا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے ــــ میں آپ کی مشکل سمجھتی ہوں ــــ مگر ماں ــــ وہ بہت کم اسے ماں کہتی تھی ــــ مگر جب کہتی تو کتنا پیارا لگتا تھا کہ اس کے منہ سے یہ انمول لفظ۔

"ماں ــ ممی ــ نہیں مانتا ــ وہ روپیہ چاہتا ہے ــــ نقد روپیہ ــــ"

"اور تو نے یہ نہیں کہا کہ تو مجھے چاہتا ہے یا روپے کو؟"

ماں ــــ تم نہیں جانتیں ــــ آجکل زندگی کا انداز کتنا بدل گیا ہے ـ ماں یہ تو عام بات ہے۔ دلّی میں، بمبئی میں، حیدرآباد میں، کشمیر میں، بنگال میں ــــ ہر جگہ۔ ہر مذہب، ہر قوم کے نوجوان اپنی قیمت لگاتے ہیں۔"

"جانتی ہوں ــــ مگر میں انسان خریدنے کے خلاف ہوں! مجھے غلام نہیں بیٹا چاہیے۔ جو انسان ہو۔ یہ نوجوان ــــ وہ خود اپنی عزت خاک میں ملاتے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے قاتل ہیں۔ وہ جن لڑکیوں سے بیاہ کرتے ہیں ان کو سچی محبت نہیں دے سکتے ــــ عزت نہیں کر سکتے۔ وہ صرف پیسے کے لوبھی ہوتے ہیں۔ تجھے ایک سے ایک اچھا لڑکا مل جائے گا میری بچی ــــ ایسا کم ظرف، لالچی خود غرض کے لیے تو اپنی شخصیت مسخ کر دے گی! اپنی ماں کو ذلیل کرے گی۔ اس کے عمر بھر کے اصولوں کو خاک میں ملا دے گی۔ کیا اسی لیے ہم نے تجھے اتنا بڑا کیا تھا؟"

ماں رونے پر آمادہ ہو رہی تھی!

ببلی کے ہونٹ کانپنے لگے ــــ "ماں ـ تمھیں ــ تم ــ ماں ــ میں بہت دور نکل آئی ہوں ــــ اب واپس نہیں جا سکتی ــ"

ماں کا چہرہ سفید پڑ گیا ــ "ببلی یہ تو کیا کہہ رہی ہے ــ کیا تو نے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگائی ــ کیا ــ تو ــــ کیا تو . . . " وہ جملہ پورا نہ کر سکی!

"نہیں ماں ــــ میں نے تمھاری عزت اب تک بچائی ہے۔ مگر میں ممی کو اتنا چاہتی ہوں کہ اب ــــ کہ اب کسی اور کو وہ مقام

نہیں دے سکوں گی ـــــ ناممکن ـــــ"

ماں چپ رہی۔

"تمہیں دنیا کی لڑکیوں کا درد ہے ماں ـ اپنی بیٹی کا نہیں؟"

"ہاں ببلی ـــــ تو میری کوکھ سے ضرور پیدا ہوئی ـــــ مگر مجھے ان لڑکیوں کا بھی اتنا ہی درد ہے جو ہر سال جانے کتنی اس دہیز کی لعنت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔"

"اور اگر تمہاری بیٹی بھی اس کی بھینٹ چڑھ گئی تو؟"

"ببلی! یہ تو کیا کہہ رہی ہے تو اتنی بزدل نہیں ہو سکتی تو پڑھی لکھی۔ سمجھدار۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی خود اعتمادی سے بھرپور ـــــ نہیں رے تو مجھے ڈرانے کو کہہ رہی ہے ـــــ"

"ہاں ماں یہی بات ہے" خیر تم سو جاؤ اب! میں ذرا پاپا سے مل لوں!"

وہ بیٹی کے پیچھے پیچھے گئی اور دراز میں سے جھانکنے لگی کہ باپ بیٹی میں کیا باتیں ہوتی ہیں۔

"پاپا"

"ہاں ڈیر ـــــ تم ماں سے ؟"

"ہاں پاپا"

"بات ہو گئی ـــــ"

"ہو گئی پاپا ـــــ"

"مان گئی وہ؟"

"پاپا ـــــ ممی تو پتھر کی بنی ہیں۔ وہ کیا مانیں گی ـــــ"

"تو اب کیا ہوگا بیٹی" بے بسی سے انھوں نے کہا۔

"آپ انھیں مجبور نہیں کر سکتے پاپا!"

"نہیں بیٹی۔ اسے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ مگر میں چپکے سے اپنی پنشن بیچ کر ـــــ تجھے روپے دے دوں گا۔ اُسے خبر بھی نہ ہوگی ـــــ"

"نہیں پاپا۔ نہیں پاپا ـــــ یہ نہ ہوگا۔ آپ زندگی بھر اصول پرست رہے ہیں۔ آپ میں اور ممی میں مثالی محبت ہے ـــــ میں ـــــ میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ دونوں کے بیچ دیوار کھڑی ہو ـــــ ممی کے دل میں آپ کی عزت کم ہو جائے!"

"تو پھر؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ سب ٹھیک ہو جائے گا پاپا ڈارلنگ ـــــ"

اس نے باپ کے گال کو بوسہ دیا۔ ماں جلدی سے اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ ببلی نے دروازے سے جھانکا۔

"گڈ نائٹ ماں۔ گڈ نائٹ!"

"گڈ نائٹ بابی" ماں نے بہت پیار سے کہا۔ تم جلا جا رہے ہو۔ ... سے سمجھتے نہیں ... چپ لیٹی رہی ـــــ

اگلے دن ببلی آرام کی نیند سو رہی تھی۔ بڑی نیند!

سارا شہر اس کے جنازے کے ساتھ تھا ـــــ باپ پاگل سے ہو گئے تھے۔ بھائی دیواروں سے سر پھوڑ رہے تھے ـــــ سارا خاندان، سارا شہر رو رہا تھا ـــــ موت اور ایسی موت! ـــــ

مگر وہ چپ تھی۔ سب اسے دیکھ رہے تھے۔ مگر اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا تھا ـــــ اس کی سہیلیاں، بہنیں، اس کے سٹر کی لڑکیاں، اس کی کولیگ اس کے چاروں طرف جمع تھیں۔ سمجھ رہی تھیں کیا کریں مگر ـــــ وہ کیا کرے ـــــ ہر طرف ایک خلا تھا ـــــ ایک ویرانی ـــــ ایک بے حسی ـــــ شدید بے حسی اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

لوگ سمجھتے ہیں وہ پاگل ہو جائے گی ـــــ مر جائے گی ـــــ مگر انسان کیا کچھ سہار لیتا ہے ـــــ کیا کچھ!

. . . .

اس نے سر اٹھایا ..... چاروں طرف دیکھا۔ کارنس پر ببلی کے بچپن کی تصویر مسکرا رہی تھی ـــــ اس کے برابر دونوں لڑکوں کی تصویریں تھیں۔ ممی کی ڈگری لگا گاؤن میں اور چھوٹے بیٹے کی سوٹ میں!

"ٹمی —— میرا پیارا بچہ !۔ آہ ! کس قدر اسے خیال ہے میرا" اس نے سوچا۔ اور اس ان کی ساری باتیں اس کے ذہن میں تازہ ہو گئیں ! چار مہینے بھی تو نہ ہوئے تھے ببلی کو سدھارے ہوئے !

وہ دونوں بازو پر سر رکھے —— میز پر جھکی ہوئی تھی۔ جو دن بیت رہے تھے۔ غم کا ساگر اور گہرا —— اور گہرا ہوتا جا رہا تھا —— ہر پل پہاڑ۔ اب تو ان کاموں میں بھی جی نہ لگتا تھا جن پر ساری زندگی بتائی تھی ! آہ وہ معمولی عورت ہوتی —— یہ سب کچھ نہ کرتی ہوتی تو شاید اس کا دل اتنا سخت نہ ہوتا —— وہ اپنی بیٹی کو اصول پر قربان نہ کر دیتی ؟ مگر ... مگر ..... اس نے جو کیا صحیح کیا ہے۔ ۔ طمانیت —— یہ روحانی خوشی اس کے دل کو ڈھارس دے رہی تھی۔

"ماں" اس نے سر اٹھایا۔ ٹمی سامنے کھڑا تھا۔

"ماں"

"ہاں میرے بچے"

"ماں میرا بیاہ کر دو ——" وہ اس کا منھ دیکھنے لگی —— ابھی تو ببلی کو گزرے چار دن ہوئے ہیں اور اسے بیاہ کی پڑ گئی !

"جو جی چاہے کرو میرے لال ——" اس نے افسردگی سے کہا

"نہیں —— ماں۔ یہ کام تو تمھیں کو کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں گھر میں تمھاری بہو —— آ جائے۔ بچے ہوں تو تمھارا اور بابا کا جی بہل جائے گا !"

"مگر بیٹے۔ تم۔ تم تو انگلینڈ جا رہے تھے نا"

"نہیں ماں۔ میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ تمھارے ہی پاس رہوں گا"

"کون لڑکی ہے وہ ؟" ماں جانتی تھی وہ ایک لڑکی سے بہت پینگ بڑھا رہا ہے

"کوئی نہیں ماں"

"مگر وہ تمھاری دوست"

"ماں میں اس سے بیاہ نہیں کروں گا —— وہ نئے زمانے کی لڑکی ہے۔ خود غرض، دولت پرست، اتھلی لڑکی —— وہ خاندان و اندان کا جھگڑا پسند نہیں کرتی —— وہ کسی ایسے لڑکے سے شادی کرے گی جو اسے یورپ اور امریکہ لے جائے —— وہیں رہ جائے —— مگر میں —— میں اپنے ماں باپ کو کیسے چھوڑوں گا ؟"

ماں کا دل چاہا اسے کلیجے میں چھپا لے —— مگر کچھ بولی نہیں،

"ماں۔ تم جو لڑکی پسند کرو —— جیسی بھی ہو —— جو تمھارے دل کا خلا بھر سکے —— میں اسی سے بیاہ کروں گا ماں"

"مگر تیری پسند ؟"

"ماں تمھاری پسند اتنی اونچی ہے کہ اس سے بہتر لڑکی میں خود تلاش نہیں کر سکوں گا"

وہ چپ ہو گئی —— پھر کہاں کہاں لڑکی دیکھتی رہی —— اور پھر ایک دن اچانک جب نازو نے آ کر اس کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا "ماں۔ تمھارا اداس چہرہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا ماں ——" تو اس کی آنکھیں برس اٹھیں اور لگا اسے لڑکی مل گئی ! مگر یہ غریب، انا تھ —— لڑکی ! انجینیر صاحب —— اس کا ڈاکٹر بیٹا —— اس کو کیوں پسند کریں گے ؟

ٹمی نے ماں کی پسند پر صاد کیا —— باپ چپ رہے —— اور آج وہ بہو بیاہ لائی —— پیاری سی بہو —— ببلی کا بدل !

برابر کے کمرے سے دولھا دلھن کی دبی دبی ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ ماں کی آنکھیں چھلک اٹھیں —— یہ مسرت اور غم کے ملے جلے آنسو اس کے زخم پر مرہم رکھ رہے تھے۔

★

افسانہ

کلیانی

سہیل عظیم آبادی

کلیانی ماں باپ کی چھاتی پر بھاری پتھر بن کر رہ گئی تھی۔ جب پیدا ہوئی تو کوئلے جیسی کالی، چپٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں، ماں باپ کی طبیعت رنجیدہ ہو گئی۔ مگر جیسے جیسے بڑھتی گئی ان دونوں کو اندازہ ہوا کہ تیز ہے۔ اور اسے محلے کی ایک عورت کے پاس پڑھنے کو بٹھا دیا گیا۔ پڑھنے میں سب لڑکیوں میں تیز تھی۔ ماں باپ نے اسے بھی غنیمت جانا اور پڑھانے لگے لیکن آٹھ برس کی تھی کہ چیچک نکل آئی۔ اچھی تو ہو گئی مگر چیچک کے داغ سے چہرہ اور بھدا ہو گیا۔ وہ پڑھتی رہی۔ ماں باپ کبھی سوچتے تھے کہ پڑھ لکھ لے گی تو شاید کوئی اچھا بر مل جائے گا۔ مگر ان کا خیال غلط نکلا کلیانی نے بائیس سال کی عمر میں ایم اے کر لیا۔ مگر کوئی بیاہ کی بات کرنے کو پھٹکا تک نہیں۔ رشتہ داروں میں اس کی نیکی، سگھڑپن اور عقل مندی کی تعریف ہوتی تھی۔ مگر بیاہ کی بات نہیں ہوتی تھی۔ جب کسی نے بات چلائی اور لڑکے کی رشتہ دار عورتیں اسے دیکھنے کو آئیں تو پھر جا کر کوئی بات ہی نہیں کی۔ آنکھ رہتے کوئی مکھی کیسے کھاتا۔ بدصورتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا، اس کے ماں باپ کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ کلیانی سب کچھ سمجھتی تھی مگر بے بس تھی۔ صورت کو بدل لینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ماں باپ کی پریشانی دیکھ کر وہ خود بھی پریشان رہتی تھی۔ کئی بار اس نے اپنی زندگی کو کسی طرح ختم کر ڈالنے کی بات سوچی لیکن ہر بار ایک دوسرے خیال نے آکر اسے سمجھا دیا۔ اپنے ہاتھوں زندگی کو ختم کر ڈالنا تو بزدلی ہے۔ بیاہ نہیں ہوگا تو کیا؟ بیاہ کیے بغیر بھی وہ زندہ رہ سکتی ہے، اپنے ماں باپ، رشتہ داروں اور دوسروں کو آرام پہنچا سکتی ہے، فائدہ پہنچا سکتی ہے اور زندگی کا سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ دن رات کی الجھنوں نے اسے زیادہ پڑھنے اور زیادہ سوچنے کا عادی بنا دیا تھا لیکن اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آ رہا تھا۔

ماں باپ کی بڑی کوششوں سے کلیانی کے بیاہ کی بات ایک جگہ چلی۔ شیام لال ایک مڈل اسکول میں ماسٹر تھا۔ اس کی دو پتنیاں مر چکی تھیں، اور تین بچے تھے۔ عمر چالیس سال سے زیادہ تھی۔ ماں باپ خوش تھے۔ ان کو یقین تھا کہ بات پکی ہو جائے گی اور کلیانی کو سر چھپانے کے لیے چھپر کا سایہ مل جائے گا۔ اور شیام لال کی بہن دیکھنے آئی، کلیانی کو دیکھتے ہی اٹھ کر چلی گئی۔

بات ختم ہو گئی لیکن کلیانی پر اس کا اثر کچھ اور ہوا۔ وہ اچانک بالکل بدل گئی۔ ماں سے اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ بیاہ کرے گی ہی نہیں۔ وہ ایسے لوگوں سے کوئی لگاؤ رکھنا نہیں چاہتی جو چہرے کو دیکھتے ہیں، گنوں کو نہیں دیکھتے۔ ماں نے اس کی بات سن کر سر پیٹ لیا۔ اور باپ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ یہ جلے پر نمک کا چھڑکاؤ تھا۔ پہلے تو لوگ اس کی صورت کی برائی کرتے تھے۔ اب اس کی بات سنیں گے تو نہ جانے کیا کیا کہیں گے۔ ماں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر کلیانی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے کہہ دیا کہ اگر پھر بیاہ کی بات چلی اور کوئی عورت اسے دیکھنے آئی تو اسے گھر سے نکال دے گی۔ یا خود کہیں چلی جائے گی۔ ماں باپ سوچتے رہ گئے۔ اگر بیاہ نہیں کرے گی تو دنیا کیا کہے گی۔ مگر کر بھی

کیا سکتے تھے۔ اتنے روپے بھی نہیں تھے کہ اس کے لیے ایک پتی خرید لیتی

کلیانی نے اپنی زندگی بدل ڈالی۔ وہ کنواری لڑکی کی طرح گھر کے اندر سمٹی سمٹائی نہیں رہی۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے اور محلے میں گھوم کر کئی غریب بچیوں کو اُن کے ماں باپ سے کہہ کر لے آئی۔ ان کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ماں باپ کو اس کا یہ کام اچھا نہیں لگا۔ ماں باپ نے اسے سمجھانا چاہا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اسے بچیوں کو پڑھانے سے منع کیا گیا تو گھر چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے گی۔ ماں باپ اس کی باتیں سُن کر چپ ہو گئے۔

غریب بچیوں کو پڑھانے میں اس کا جی لگ گیا اور وہ خود کو بھولنے لگی۔ مگر پھر قدم قدم پر نئی پریشانیاں۔ بچیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ جگہ کم تھی۔ بچے غریب تھے۔ نہ کتاب نہ کاغذ اور نہ دوسرا کوئی پڑھانے والا۔ کلیانی زیادہ بچیوں کے پڑھانے کا انتظام نہیں کر سکتی تھی اور کڑھتی رہتی تھی۔ ماں باپ میں مدد کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اور کوئی دوسرا مددگار نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے ایک دن ہمت کر کے ایک قدم اور بڑھایا اور شہر کے مشہور وکیل کیدار بابو کے یہاں پہنچ گئی۔ کیدار بابو ایسے کاموں میں مدد کرتے تھے۔ اُن کی پتنی دس سال پہلے مر چکی تھی۔ ایک بیٹا تھا وہ انگلینڈ میں بیرسٹری پڑھ رہا تھا۔ اپنی پتنی سے انھیں اتنی محبت تھی کہ اس کے مرنے کے بعد انھوں نے دوسری شادی کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ حالانکہ جب وہ مری تھی تو کیدار بابو کی عمر پینتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ کیدار بابو نے کلیانی کو دیکھتے ہی کہا:

"جلدی بتاؤ کیا کام ہے؟"

کلیانی نے انھیں بتایا کہ وہ کیوں آئی ہے۔ کیدار بابو نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ دراز میں سے سو روپے نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیے۔

کام کرنے سے کلیانی میں نئی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے روپیوں کو چھوا تک نہیں۔ اور بولی:

"مجھے اپنے کام کے لیے روپیوں کی ضرورت قدم قدم پر ہے۔ لیکن میں آپ سے روپے صرف اس شرط پر لوں گی کہ آپ میرا اسکول آ کر دیکھیں۔ اور......"

کیدار بابو بولے:

"اسکول تو دیکھنا کیا ضروری ہے۔"

کلیانی بولی:

"آپ کو کیا معلوم کہ میں سچ بول رہی ہوں یا جھوٹ۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں آپ سے زیادہ مدد چاہتی ہوں۔ اسکول کو بڑا بنانا چاہتی ہوں۔"

کیدار بابو نے کلیانی کو غور سے دیکھا۔ اس کالی کلوٹی لڑکی میں کتنی خود اعتمادی تھی۔ کیدار بابو نے کہا:

"یہ روپے لے لو۔ پھر کبھی آنا —"

کلیانی نے روپے نہیں اٹھائے اور بولی:

"میں چاہتی ہوں کہ اسکول بڑا بن جائے جہاں زیادہ لڑکیاں پڑھ سکیں —"

کیدار بابو کچھ سوچنے لگے۔ کلیانی بولی:

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔ تو اسکول کا نام آپ کی پتنی کے نام پر آشا دیوی اسکول رکھ دوں —"

کیدار بابو کی رگوں میں جیسے برف جمنے لگی۔ وہ کلیانی کو دیکھتے رہ گئے۔ اس نے ان کی دُکھتی نس پر انگلی رکھ دی تھی۔ بہت دنوں سے ان کے دماغ میں ایک بات چلی آ رہی تھی۔ آشا دیوی کی کوئی یادگار قائم کریں۔ کلیانی یہ کام کرنے کو تیار تھی — کیدار بابو نے اس سے بہت سی باتیں پوچھیں اور جب انھیں معلوم ہو گیا کہ کلیانی نے ایم۔ اے کیا ہے اور اندازہ ہو گیا کہ اسے کام کرنے کا شوق ہے تو بولے:

"میں تمھاری آخری حد تک مدد کروں گا —"

کلیانی نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی اور آواز رندھ گئی تھی کلیانی پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ بولی:

"آپ میری مدد کریں گے تو مجھے امید ہے میں اسے اچھا اسکول بنا لوں گی۔"

کیدار بابو نے چار سو روپے اور نکال کر دیے اور بولے۔
"تم کام کرو۔ میں تمھارا اسکول دیکھوں گا۔ تمھاری مدد ہر طرح کروں گا۔"

کلیانی نے روپے لے کر بٹوے میں رکھ لیے اور کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور بولی
"آپ کو اسکول دکھانے کے لیے کس دن انتظار کروں ـــ"
کیدار بابو کو جیسے جلدی تھی جیسے وہ خود یہی چاہتے تھے۔ بولے:
"آج شام کو ـــ"
کلیانی نے پاؤں چھو کر اُن کو سلام کیا اور چلی آئی۔

کیدار بابو نے اسکول دیکھا۔ جگہ کی بڑی کمی تھی۔ بچیاں زیادہ تھیں۔ لڑکے کم ـــ دوسرا کوئی پڑھانے والا بھی نہ تھا۔ انھوں نے کلیانی کے باپ سے کلیانی کی بڑی تعریف کی اور اس کی ہمت بڑھائی۔ اسکول کے لیے اپنا ایک مکان بھی دے دیا۔

آشا دیوی اسکول ہر روز ترقی کرنے لگا۔ کئی پڑھانے والی استانیاں آ گئیں اور بچیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ کیدار بابو اور کلیانی نے طے کیا کہ اسکول لڑکیوں کا ہوگا۔ صرف چھوٹے بچے داخل کر لیے جائیں گے۔

جب اسکول ترقی کرنے لگا تو بہت سے لوگ کلیانی کے مخالف بھی پیدا ہو گئے اور طرح طرح کی باتیں اس کے بارے میں کہی جانے لگیں۔ کچھ لوگوں نے کیدار بابو کے بارے میں بھی جو جی میں آیا کہہ دیا۔ ایسے لوگوں کی زبان پر کون تالا لگا سکتا ہے۔ لیکن کیدار بابو کو اس کا رنج ہوا۔ ایک شریف لڑکی جو حالات کا مقابلہ کر کے اپنے لیے زندگی کی نئی راہ تلاش کر سکتی ہے اس کے بارے میں ایسی باتیں کہنا ـــ اور خود ان کے بارے میں ـــ حالانکہ وہ اپنی مری بیٹی کا نام زندہ رکھنے کے لیے سب کچھ کر رہے تھے۔

آخر کیدار بابو نے سوچ کر ایک راہ نکالی۔ اسکول کے سلسلے میں بڑا جلسہ کیا۔ شہر کے سارے بڑے آدمیوں کو بلایا۔ اسکول کے بارے میں اپنے ارادے بتائے اور انھوں نے کہا کہ اس کام میں ان کی مدد اُن کی بیٹی کلیانی کر رہی ہے۔ وہ سچ مچ کلیانی کو بیٹی کی طرح ماننے لگے تھے۔ وہ وہی کام کر رہی تھی جو کیدار بابو بہت دنوں سے کرنا چاہتے تھے۔

کلیانی بہت خوش تھی۔ وہ جو کچھ چاہتی تھی اس کی خواہش کے مطابق ہو رہا تھا۔ کیدار بابو نے دل کھول کر کلیانی کی مدد کی اور کلیانی نے دوڑ دھوپ کر کے اسکول کو دو سال میں اتنا بڑھا لیا کہ مڈل بنانے کی بات ہونے لگی اور کلیانی کی تعریف ہونے لگی۔ لیکن جلنے والے اپنی جگہ پر تھے۔ وہ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے جو منہ میں آتا تھا کہتے تھے۔ بعضوں نے اس کی دیکھا دیکھی نئے اسکول بھی بنا ڈالے لیکن ان باتوں کا اثر کلیانی پر کچھ نہیں ہوا۔ اس کی مخالفت جتنی بڑھتی جاتی تھی۔ اتنی ہی اس کی خود اعتمادی بڑھتی جاتی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھی۔ اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ ساری زندگی آشا دیوی اسکول کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور لڑکیوں کی زندگی سدھارنے میں ختم کر دے گی۔ اب اُسے کوئی فکر نہیں تھی۔ کبھی کوئی دوسرا خیال اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن کیدار بابو نے اُسے خبر دی کہ اُن کا لڑکا سنیل لندن سے بیرسٹر ہو کر واپس آ رہا ہے۔ وہ اُس دن بہت خوش تھے۔ انھوں نے سو روپے دیے کہ مٹھائی اسکول میں تقسیم کی جائے اور ہنستے ہوئے بولے:

"سنیل آ جائے گا تو تم کو اور مدد ملے گی۔ تم کام کرتی جاؤ۔ ہائی اسکول تک میں اسے اپنی زندگی میں پہنچا ہی دوں گا۔ اس کے بعد سنیل کی ذمہ داری ہوگی کہ ماں کے نام پر کالج بنائے اور کیدار بابو نے ایسے جذباتی انداز میں یہ بات کہی کہ کلیانی جیسے خوابوں کی دنیا میں کھو گئی۔ آشا دیوی اسکول جو ابھی مڈل اسکول بھی نہیں تھا بڑھ کر ہائی اسکول بن جائے گا ـــ اور آشا دیوی لڑکیوں کا کالج بھی بن جائے گا ـــ اس نے جو پودا لگایا ہے وہ ایک دن تناور درخت بن جائے گا۔ اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ زندگی کا مقصد آخر کیا ہے۔ سدھار۔ زندگی تو سبھی گزار لیتے ہیں کوئی کام انسان کر جائے اور اس کا نام رہ جائے یہی زندگی ہے۔ آشا دیوی کے نام کیا تھا اس کا نام بھی زندہ ہو جائے گا۔

اور وہ سوچنے لگی ـــ سنیل کیسا ہوگا۔ خوبصورت تو ضرور ہوگا ـــ کیدار بابو اس عمر میں بھی خوبصورت آدمی ہیں، ماتا شاردا دیوی خوبصورت تھیں۔ سنیل ضرور خوبصورت ہوگا۔ یکایک اسے اپنی بدصورتی کا خیال آیا اور وہ مرجھا گئی۔ لیکن پھر وہ سنبھل گئی۔ اسے خوبصورتی سے کیا لینا دینا ہے۔ اسے بیاہ نہیں کرنا ہے۔ اسے اس کی پروا نہیں کہ کوئی مرد اسے قبول نہیں کرے گا۔ اب وہ شادی کرنے کے لیے خود بھی تیار نہیں تھی۔ اگر کوئی کرنا چاہتا تو انکار کر دیتی۔ اب وہ اپنی زندگی کے دوسرے سہانے خواب دیکھا کرتی تھی اور محسوس کرتی تھی کہ وہ عام عورتوں سے بہت بلند ہے جو اپنے لیے زندہ رہتی ہیں اور اپنے لیے مرتی ہیں۔ اب اس کا اپنا کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اپنا غم بھی نہیں۔ اپنی خوشی بھی نہیں۔

کبھی کبھی اسی قسم کے خیالوں میں وہ کھو جاتی تھی اور جب خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا تو خود اپنے اوپر اسے غصہ آتا تھا۔ وہ اپنے کو غلط نہ سمجھ لے۔ اسے تجربوں نے بتا دیا تھا کہ جو لوگ غلط اندازہ کرتے ہیں وہ راستہ بھول جاتے ہیں اور بھٹکتے رہتے ہیں۔ اور وہ جو راستہ ڈھونڈھ چکی تھی اسے بھلانا نہیں چاہتی تھی۔

سنیل بیرسٹر ہو کر آگیا۔ کیدار بابو نے خوشی میں بڑی دعوت کی۔ دوستوں نے انھیں دل کھول کر مبارک باد دی۔ دوسرے دن وہ اسکول دیکھنے آیا اور کلیانی اسے دیکھ کر اچانک پریشان ہو گئی۔ سنیل بہت خوبصورت جوان تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور کتاب دیکھنے لگی ـــ سنیل کتنا خوبصورت اور وہ کتنی بدصورت ـــ اس نے سوچا۔ بہت سی لڑکیاں دل سے چاہیں گی کہ اس سے اُن کا بیاہ ہو جائے۔ اور ایک وہ تھی، کوئی بھی اس سے بیاہ کرنا نہیں چاہتا۔

اچانک اُس میں ایک نیا اعتماد جاگ اُٹھا۔ تم سے وہ کام ہو سکتا ہے جو سنیل نہیں کر سکتا۔ کیدار بابو نے اسے بیٹی کہا ہے اور وہ ماتا شاردا دیوی کا نام زندہ کر دینے کا وعدہ کر چکی ہے۔ سنیل دیر تک اسکول میں رہا۔ سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ اس سے بھی ـــ اور اسکول سے چلا گیا۔

اب کیدار بابو کو ایک فکر تھی اور وہ یہ کہ سنیل کا بیاہ ہو جائے۔ اور وہ وکالت شروع کر دے۔ لیکن سنیل کو کوئی جلدی نہ تھی۔ وہ کچھ دن یوں ہی وقت گزارنا چاہتا تھا۔ شادی اور وکالت ـــ ساری زندگی کا ساتھ رہے گا۔

کیدار بابو کے یہاں بہت سی جگہوں سے سنیل کے لیے باتیں آرہی تھیں۔ ایک سے ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکیوں کی تصویریں خاندان کے حالات۔ اور کیدار بابو کو فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن آخر انھوں نے فیصلہ کر ہی لیا۔ امرناتھ وکیل کی لڑکی سمترا ان کو بھی پسند آئی اور سنیل کو بھی۔ اور بات پکی ہو گئی۔

لیکن ایک دن اچانک جیسے دنیا بدل گئی۔ سنیل موٹر چلاتا آرہا تھا سخت حادثہ پیش آیا۔ اسے شدید چوٹ لگی۔ بہت سے گہرے زخم آئے۔ مہینوں اسپتال میں پڑا رہا۔ اور جب اسپتال سے اچھا ہو کر آیا تو اس کی آنکھوں کی روشنی جا چکی تھی۔ وہ اندھا تھا۔

کیدار بابو کی دنیا ہی بدل گئی۔ بیوی مر چکی تھی۔ بیٹا اندھا ہو گیا تھا۔ وہ غم سے نڈھال ہو گئے، اور تھوڑے ہی دنوں میں بوڑھے نظر آنے لگے۔ کلیانی کے لیے یہ بڑا غم تھا ـــ کیدار بابو کا غم ـــ اس کا غم بن گیا تھا۔ اسکول کے بعد وہ گھنٹوں کیدار بابو کے پاس بیٹھتی اور ان کا غم کم کرنے کی کوشش کرتی۔ گھنٹوں سنیل کے پاس بیٹھتی اور اس کا جی بہلاتی۔ اندھا ہو جانے کے بعد اُسے زیادہ سے زیادہ ہمدردی کی ضرورت تھی، ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جس کی آنکھیں اس کی مدد کر سکیں۔ یعنی اس کا بیاہ ہو جائے کسی اچھی سی لڑکی سے جو سنیل کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچا سکے۔ لیکن سنیل اندھا ہو چکا تھا۔ چودھری امرناتھ کی لڑکی سمترا سے بات پکی ہو کر ختم ہو چکی تھی۔ اور کیدار بابو کو فکر تھی کہ جلد سے جلد سنیل کا بیاہ کر دیں۔ اس کا اکیلا پن ختم ہو جائے۔ وہ دوسروں کی ہمدردی کا محتاج نہ رہے۔ اس کی پتنی اس کی دیکھ بھال کرے۔ لیکن بات بن نہیں رہی تھی۔ جو لڑکیاں اُن کو پسند آتی تھیں ان کے ماں باپ اندھے سے بیاہ کرنے پر رضامند نہیں ہوتے تھے اور جن لڑکیوں کے ماں

(باقی صفحہ ۸۸ پر)

افسانہ

رشتے

مسیح الحسن رضوی

بڑے سنگار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی وہ مسکرا کر رہ گئی مخمور چشم، ستواں ناک، اور ناک کے نتھنوں کے نیچے دو گلاب کی پتیاں۔ "یہ لب" اس نے خود سے کہا "گلاب کی پتیوں جیسے ملائم اور رنگین"۔ اور پھر اس کی نظریں گلاب کی پتیوں سے ہٹ کر اپنے پنڈے پر گئیں جس پر شباب کی رعنائیاں بکھری ہوئی تھیں۔ لیکن آج یہ سب ایک موہوم اُمید، ایک مبہم اور لایعنی سے سہارے پر برباد کیے جا رہے ہیں۔ ایک دولہا اوھیڑ عمر کا، وہ اعلیٰ سرکاری افسر کے لیے، والدین نے کتنی حفاظت سے پرورش کی تھی۔ معاذاللہ!

دور فضا میں اُلو کی چیخ گونج گئی۔ کیسا بُرا شگون۔ لیکن شگون تو اسی دن بُرا ہو چکا تھا جس دن بلال کو اس کے گھر سے ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا گیا تھا۔ کیوں۔ نہ جانے کیوں۔ اس نے سوچا، بلال اس کا خلیرا بھائی اس وسیع و عریض دنیا میں بے سہارا چھوڑ دیا گیا ہے۔ چچا نے صرف محبت کی سُن گُن پا کر کھڑے کھڑے اسے گھر سے نکلوا دیا۔ آہ بے چارہ بلال۔ لیکن خطا کس کی تھی۔ اس کی؟ نہیں بلال کی؟ نہ نہ بے چارہ بلال تو اتنا سیدھا تھا، اتنا سیدھا

پھر یہ خطا کس کی تھی؟ والدین کی جنھوں نے بلال کو صرف اس اُمید پر گھر میں رکھا تھا کہ پڑھ لکھ کر کم از کم چار سو کا نوکر ہو جائے گا اور پھر اس کو بیاہ کر لے جائے گا۔ کہاں بیاہ کر لے جائے گا؟ یہ کہو کہ زبیدہ خود اس کو بیاہ کر اپنے گھر رکھ لے گی۔ لیکن اب تو وہ جا چکا تھا۔ ہمیشہ کے لیے۔

اور یہ اس کا نیا دولہا جو منگیتر، جس نے اپنی جوانی میں، آنکھیں پھوڑ پھوڑ کر مقابلے کے امتحان کی تیاری کی تھی۔ جو تے و تے نشستوں کی عینک چڑھائے دن رات کتابوں پر جھکا رہتا۔ دل و دماغ لیا۔ بلکہ جس نس کا خون مطالعہ کی نذر ہو چکا تھا ایک زندہ لاش جو ہوا سے حرکت کر رہی ہو لیکن جس معاشرے میں وہ رہتی تھی، اس میں تندرستی ہی تو سب کچھ نہیں دولت بھی تو ہے۔ عزت بھی تو ہے اور اس معیار پر نوشاہ پورا اُترتا تھا۔

کچھ بھی ہو زبیدہ کی خوش قسمتی میں کیا شبہ ہے جوانی جب بیش بہا ساڑیوں میں ملبوس ہو کر انجمن نشین ہوا کرے گی کلبوں میں جا کر ہلکے قہقہے، جیسے سیر کی قُلقُل ادا کرے گی تو ظلمت پسند سماج کے بگس ایوانوں میں زلزلہ آ جایا کرے گا۔

"کون ہے ــــــ" کوئی سیٹھ سا ہو، اپنے سکریٹری سے سرگوشی کرے گا۔

"زبیدہ اصغر علی"

"او بہت خوب، فسٹ کلاس، سیٹھ اپنے سکریٹری سے کہے گا۔

ٹمگ ٹمگ جگ مگ کرتے ہوئے ہال کی دوسری طرف کچھ نوجوان اور سیٹھوں کے اوباش چھوکرے آپس میں چہ می گوئیاں کرتے ہوں گے

"اوگاڈ۔ او رام۔ یہ آصف کی چھلاوا۔ اے بھگوان، اے رب میرے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے فن کار ہاتھوں نے عورت کے حسین پیکر کو ارغوانی شراب میں حل کر دیا ہے۔"

"دیکھو وہ ادھر ہی آ رہی ہے، خاموش۔"

اور پھر زبیدہ ان من چلے اوباشوں کے درمیان سے گذرتی اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر شامپین کا ایک گلاس نوش جان کرے گی۔

اور اس کے بعد کسی کے مضبوط ہاتھوں کو اپنی نازک کمر پیش کر کے رقص کرنے لگے گی۔

ادھر ایک۔ مرگھ ایسی ہوا چلی کہ درمیانی افسر اوپر پہونچے، اور اوپر والے اور اوپر اور معلوم نہیں کہ کیا ہوا کہ میاں آصف ڈپٹی کمشنری کے مستحق قرار پا گئے۔ زبیدہ نے جب اس خبر کو اخبار میں دیکھا تو وہ تقریباً چیخ پڑی "امی ——" پھر وہ غالباً بیہوش ہو گئی۔ بلال نے اسے بھوت بن کر ڈرا دیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے کو ایک مسہری پر پڑا پایا۔ آصف سرہانے کھڑا تھا۔ جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔ وہی، داس چہرہ بے رونق آنکھیں، اور خشک سیاہی دو ڑے ہونٹ۔ لیکن امی آج واقعی سولہ سنگار کیے تھیں۔ سفید جارجٹ کی ساری جس پر بڑے بڑے پھول کڑھے ہوئے تھے، زیب جسم تھی۔ لپ اسٹک کی دھڑی ہونٹوں پر، اور منھ کی جھریوں میں پاؤڈر کا پلستر۔ شادی کس کی ہو رہی تھی؟ زبیدہ کے دماغ میں یہ سوال پھیلتا چلا گیا۔ اور وہ ہلکے سے مسکرا دی آصف کا بے ہنگم قہقہہ فضا کو چیرتا ہوا گم ہو گیا۔ اور زبیدہ نے سوچا کہ کیا دن میں بھی اُلّو بول سکتا ہے۔

شام کو آصف کے اعزاز میں ڈنر دیا جانا طے پایا۔ شہر بھر کے بے فکرے آناً فاناً جمع ہو گئے۔ کالے کالے ڈنر سوٹ اور روپہلی اور سنہری کرنوں کے تانے بانے سے تنا ہوئی ساریاں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابر کے سیاہ و سفید ٹکڑے زمین پر چاند اور تاروں کے جلو میں محو خرام ہیں۔

زبیدہ اوپر سے نیچے آ رہی تھی اور آصف اوپر جا رہا تھا۔ اس نے اپنے گنجے سر پر وگ لگا رکھی تھی۔ اور اس کی عمر دس سال کم ہو گئی تھی۔ دونوں کی سیڑھیوں پر مڈبھیڑ ہو گئی۔ زبیدہ کے پیکر کی کنواری خوشبو شبنم آلود گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ اور سینے کی رقصاں سانسیں۔ آصف دانستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ "ڈارلنگ ——"

"ڈیئر" زبیدہ کے منھ سے عالم بے اختیاری میں نکلا۔ اسے معلوم ہوا جیسے آسمان سے شہاب ثاقب ٹوٹ کر اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جا رہا ہے۔

شادی ——؟

"اور بہت جلد غالباً اگلے ماہ" زبیدہ نے ہنستے ہنستے ہوئے کہا اپنے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ اسے احساس ہوا جیسے اس کی کوفت اور اذیت پر بہت جھلملا چاندی کا ملمع...

چڑھ رہا ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا ہے جیسے پہلی تاریخ کا چاند۔

اس کے دوسرے دن اسے بلال کا خط ملا۔

زبیدہ احمد آباد آ کر مجھے ایک نوکری مل گئی ہے۔ اگر محنت سے کام کیا تو ترقی کا بھی وعدہ ہے۔ فی الحال دو سو روپے مل رہے ہیں۔ تمہارا "مرغ باد نما" ایک دم گگروں کوں ڈپٹی کمشنر ہو گیا۔ کہو کب تک شادی کا ارادہ ہے؟ مبارک!!

"مرغ باد نما۔ گگروں کوں"۔ زبیدہ نے خط کے پرزے پرزے کرتے ہوئے کہا۔ ایک ڈپٹی کمشنر کی اتنی بڑی بے عزتی۔ اس نے خط کے پرزے کھڑکی کی راہ باہر پھینک دیے جو ہوا میں لہراتے ایک دوسرے سے جدا ہو کر کولتار کی سڑک پر بکھر گئے۔ زبیدہ نے اطمینان کی سانس لی گہری اور لمبی۔ وہ بلال کے خیال کو یکلخت اپنے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ کم آدمی جب تک یہاں رہا پریشان کرتا رہا۔ اور اب وہاں سے تیر اندازی کر رہا ہے۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کے گوشوں میں پانی جمع ہو گیا۔ کیا وہ رو رہی ہے۔ نہیں اس کے دشمن روئیں۔ اس نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے سوچا۔

برابر کی کوٹھی سے ایک ساں آواز چلی آ رہی تھی ؎

ہوئے تم دوست جس کے، ہوئے تم

زبیدہ اس خوش نصیب جوڑے کو اچھی طرح جانتی تھی۔ چھ ماہ ہوئے یہ میاں بیوی دلی سے تبدیل ہو کر برابر والی کوٹھی میں آ کر رہے تھے۔ کیا یہ دونوں ہی زندگی سے خوش نہیں ہیں؟ اگر یہ بدنصیب ہیں تو اس قدر خوش کیوں ہیں؟ لیکن آواز تھی کہ برابر چلی آ رہی تھی۔ زبیدہ اٹھی کھڑکی سے جھانکا۔ عورت ریڈیوگرام کے کان نوچ رہی تھی۔ اور اس کا شوہر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ کھٹ کھٹاک، ایک دھڑاکے سے اس نے کھڑکی بند کی اور آ کر صوفہ میں دھنس گئی۔ تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ سنائی دی۔ شاید میاں بیوی کلب جا رہے تھے۔

اچانک شادی سے دو روز پہلے بلال آ دھمکا۔ زبیدہ کے چچا نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جسم کی پوری قوت جمع کرتے ہوئے اسے گھورا۔ اس کے باپ نے اپنی چھوٹی مونچھوں پر تھوک اڑاتے ہوئے اس کی غیر متوقع آمد پر نوکری کی آڑ لے کر خوب لتاڑا۔ لیکن اس نے خاموشی

سے سب کچھ برداشت کرلیا۔ وہ زبیدہ سے آخری بار ملنا چاہتا تھا۔ اور اس کی خاطر اتنا لمبا سفر کرکے آیا تھا۔ آخر شام کو بلال کو زبیدہ سے بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ وہ سرو کے درختوں سے پرے سورج غروب ہوتا تھا۔ زبیدہ اپنی کوٹھی کے وسیع چمن میں انگوروں کی بیل کے پاس ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ شفق کی سُرخی کو دیکھ کر اسے نہ جانے کیوں بلال کے قلب کی سُرخی یاد آرہی تھی۔

"بہن زبیدہ ۔" اس کے کانوں میں ایک لرزتی ہوئی صدا گونج گئی۔

" بلال تم جاؤ۔ خدا کے واسطے میری آنکھوں کے سامنے سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جاؤ۔"

بلال نے ایک مہیب قہقہہ لگایا۔

" تم رو رہے ہو ــــــ"

" زبیدہ یاد ہے" اس نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا "یاد ہے میں نے کہا تھا کہ تمہارا جسم ریشم کا کپڑا ہے جس سے صرف ریشم ہی تیار کیا جا سکتا ہے۔"

" آہ یاد ہے۔ سب کچھ یاد ہے لیکن خدا کے واسطے تم چلے جاؤ۔ جاؤ نہیں جاتے ؟"

" ہاں جا رہا ہوں، لیکن یہ میرا تحفہ" بلال نے ایک سنہرا لاکٹ جیب سے نکالتے ہوئے کہا "قبول کر لو۔ اپنے بھائی کی نشانی۔" زبیدہ کو چکر آگیا۔ اس نے بلال کا سہارا لیا اور پھر اپنے کو سنبھالتی ہوئی بغیر کچھ کہے سُنے اندر چلی گئی۔ اور بلال اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بہت ہی خاموشی سے اسی دن احمد آباد لوٹ گیا۔ وہ زبیدہ سے یہ بھی تو نہ کہہ سکا کہ وہ اپنے شوہر کی سرکار میں سفارش کر کے اسے کوئی چھوٹی موٹی سی آسامی دلانے کی کوشش کر دے۔ ★

کلیانی

(صفحہ ۸۵ کا بقیہ)

باپ رضامند ہوتے تھے وہ لڑکیاں انھیں پسند نہیں آتی تھیں۔ کیدار بابو کے سامنے صرف ایک بات تھی۔ ایسی لڑکی سے سنیل کا بیاہ کریں جو اسے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچا سکے۔ جو خود کو بھول کر سنیل کے آرام کا خیال کرے۔ اور ایسی لڑکی انھیں نہیں مل رہی تھی۔

کیدار بابو بہت پریشان تھے۔ سنیل اندھا ہو گیا تھا۔ ان کی دنیا اندھیری ہو گئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ کلیانی کی ہمدردیاں زیادہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ اسکول کے بعد اس کا زیادہ وقت کیدار بابو یا سنیل کے پاس گزرتا تھا۔ کیدار بابو ہر بات میں اس سے مشورہ لینے لگے تھے۔ کلیانی سے بڑا ہمدرد انھیں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ کلیانی خود بھی سنیل کے لیے کوئی اچھی لڑکی تلاش کر رہی تھی۔ ایسی لڑکی جسے اپنے سے زیادہ سنیل کی فکر ہو۔ لیکن کوئی مل نہیں رہی تھی۔ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ سنیل کا جلد سے جلد بیاہ ہو جائے تو کیدار بابو کی فکر دور ہو اور سنیل کے بچوں سے اپنا دل بہلائیں۔

ایک دن کیدار بابو نے کلیانی سے ایک لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ کلیانی اسے جانتی تھی۔ اچھی لڑکی تھی۔ اچھی بھلی صورت نیک اور سمجھدار۔ اس نے کیدار بابو سے کہا کہ اس سے اچھی لڑکی اسے نظر نہیں آتی۔ غریب ماں باپ کی بیٹی تھی۔ سنیل کو خوش اور آرام سے رکھ سکے گی۔ اور کیدار بابو نے طے کر لیا کہ ہاں کہہ دیں گے اور جلد ہی بیاہ کا انتظام کر لیں گے۔

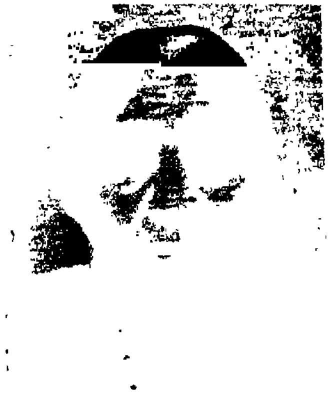
شام کے وقت کلیانی اسکول ختم کر کے سنیل کے پاس چلی گئی۔ اب وہ اس گھر کی ایک فرد تھی۔ کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ کوئی تکلف نہیں تھا۔ نوکر نے چائے کی ٹرے لا کر رکھ دیا۔ کلیانی نے چائے بنا کر سنیل کو دی اور خوش ہو کر بولی:

"سنیل بابو! مبارکباد ــــ آپ کا بیاہ ہونے والا ہے۔ رکھا بہت خوبصورت اور اچھی لڑکی ہے ــــ"

سنیل کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر گر گئی۔ کلیانی نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ تو سنیل نے کلیانی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بولا:

"کلیانی ــــ مجھے مت چھوڑو۔ مجھے دوسرے کے حوالے مت کرو۔ میں کسی دوسری لڑکی سے بیاہ نہیں کروں گا۔ تم سے اچھی کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی۔ تم سے خوبصورت کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی ــــ تم کلیانی ہو۔ تم ہی میرا کلیان کر سکتی ہو ــــ"

کلیانی کا سر چکرانے لگا اور وہ خود کو سنبھال نہیں سکی۔ کرسی سے نیچے گر پڑی۔ ★



شریمتی سروجنی نائیڈو
(۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تا مارچ ۱۹۴۹ء)



شری ایچ۔ پی۔ مودی
(۲ مئی ۱۹۴۹ء تا یکم جون ۱۹۵۲ء)

آزادی کے بعد اتر پردیش کے گورنران

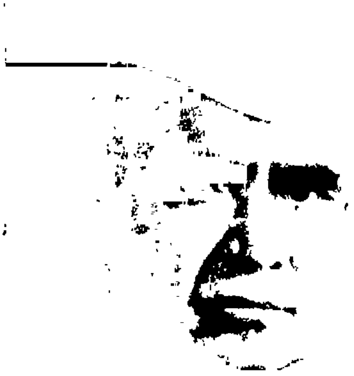
۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۲ء

شری کے۔ ایم۔ منشی
(۲ جون ۱۹۴۹ء تا ۹ جون ۱۹۵۷ء)



شری وی۔ وی۔ گری
(۱۰ جون ۱۹۵۷ء تا ۳۰ جون ۱۹۶۰ء)





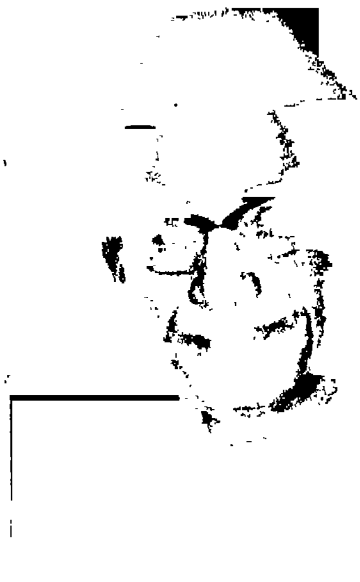
شری پی۔ رام کرشن راؤ

(یکم جولائی ۱۹۶۰ء تا ۱۵ اپریل ۱۹۶۲ء)



ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی

(یکم مئی ۱۹۶۷ء تا ۳۰ جون ۱۹۷۲ء)



شری بشوا ناتھ داس

(۱۶ اپریل ۱۹۶۲ء تا ۳۰ اپریل ۱۹۶۷ء)



شری گووند بلبھ پنت



ڈاکٹر سمپورنانند

اتر پردیش کی عوامی حکومتوں کے وزراء اعلیٰ

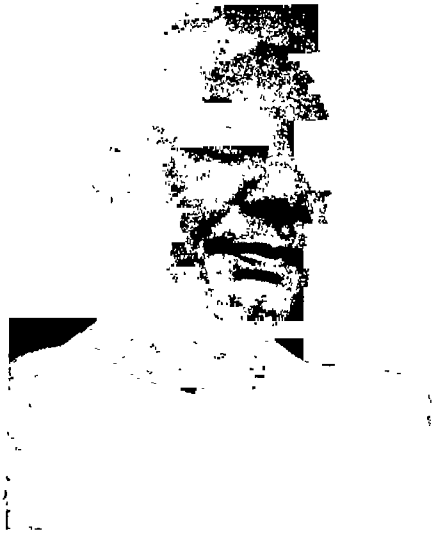
۱۹۴۶ء تا ۱۹۶۲ء



شری چندر بھان گپتا



شریمتی سوچیتا کرپلانی



شری چرن سنگھ



شری کملاپتی ترپاٹھی
(موجودہ وزیر اعلیٰ)



شری تربھون نرائن سنگھ

(افسانہ)

باپو

رتن سنگھ

ڈیم بڑی تیزی سے اُبھر رہا تھا۔

ہزاروں ہاتھ مصروف تھے کوئی نقشے بنا رہا تھا۔ کوئی مٹی کاٹ رہا تھا۔ کوئی مٹی ڈھو رہا تھا۔ کوئی پتھر توڑ رہا تھا۔ کوئی لوہے کی سلاخوں سے لے کر گرانڈیل گرڈروں کو مناسب جگہوں پہ رکھ رہا تھا۔ کوئی بڑی بڑی مشینوں اور کرینوں کی مدد سے ٹنوں وزن چیزیں ادھر سے اُدھر پھینک رہا تھا۔ اور اس سارے کام میں اتنا شور تھا کہ ساری وادی ہر وقت گونجتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ رات کے وقت جب بجلیوں اور گیسوں کی چمکتی روشنیوں میں کام کرنے والوں کے سائے لمبے لمبے ہو جاتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں آدمی نہیں بلکہ بڑے بڑے دیو کام کر رہے ہوں۔

ہاں! دیو ہی تو کام کر رہے تھے۔ تبھی تو مٹی کا باندھ ہوا اونچے پہاڑوں کے قدموں سے اُبھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے سر اُٹھا کر پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں سے آنکھ ملا کر بات کرنے لگا۔

مٹی کے اُس باندھ کے ایک طرف پانی کی پتلی سی ندی سمٹ کر رہ گئی تھی اور باندھ کے دوسری طرف اُسی ندی کا پانی جمع ہو کر ایک چھوٹے سے سمندر کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

اور اُس ساری وادی میں سڑکوں کا ایک جال سا بچھ گیا تھا جن پر موٹر گاڑیاں، ٹرک کرینیں، بل ڈوزر بھاگتے رہتے، چنگھاڑتے رہتے۔

پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر وادیوں کی گود میں اور ڈیم کے ارد گرد بڑی بڑی عمارتیں بھی بن گئی تھیں۔ جہاں بڑی بڑی مشینیں لگائی جا رہی تھیں۔ تاروں کے تانے بانے اور مشینوں کی پیچیدگیوں کو دیکھ کر عقل حیران ہوتی تھی۔

وہ دماغ وہ ہاتھ اور پاؤں جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو تھوڑی دیر سستانے کے لیے اپنے عارضی گھروں میں چلے جاتے۔ وہاں تھوڑی دیر سوتے۔ چائے پیتے۔ کھانا کھاتے اور کپڑے بدل کر تازہ دم ہو کر پھر وہ ہوتے اور اُس ڈیم کا کام۔

اُن مصروف لوگوں کے بیچ کچھ روز سے ایک بوڑھا آنے لگا ہے۔ اُس کے لاغر جسم پر صرف ایک دھوتی ہوتی ہے۔ ہاتھ میں سوٹی اور پاؤں سے ننگا۔ اِس لیے اُس کی شخصیت میں کوئی بھی چیز بظاہر جاذب نظر نہیں ہے۔ اور ممکن ہے اُن مصروف لوگوں کو اُس شخص کی آمد کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن چشمے کے پیچھے سے جھکتی ہوئی اُس کی ذہین آنکھوں سے کچھ ایسی روشنی پھوٹتی رہتی ہے جو مقناطیسی کشش کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔

بوڑھا اُن لوگوں کے بیچ سے گزرتا ہوا اچانک کسی شخص کے پاس رک جاتا ہے اور پوچھتا ہے:

"یہ ڈیم کب بن جائے گا؟"

"دو سال میں۔"

"پھر اِس ڈیم سے پیدا ہونے والی بجلی کلو کو ملے گی؟"

"کون کلو؟" کام کرنے والا آدمی پوچھتا ہے۔

"وہ دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہے۔"

"ہاں۔ یہ بجلی ارد گرد کے سو میل کے رقبے والے سبھی لوگوں

کو ملے گی۔"

"کلو کو بھی؟" بوڑھا پھر وہی نام دہراتا ہے۔

"ہاں سبھی کو۔" کارندہ جلدی سے گول سا جواب دیتا ہے کچھ دور آگے جا کر بوڑھا پھر رک جاتا ہے اور کسی سے پوچھتا ہے۔ "اس نہر سے جو پانی کی نہر نکل رہی ہے وہ کلو کے کھیتوں کو پانی دے گی؟"

"ہاں! اس نہر سے چار ہزار مربع میل کھیتوں کو پانی ملے گا۔"

"کلو کے کھیتوں کو بھی؟" بوڑھا پھر اپنا شک ظاہر کرتا ہے۔

اس کارندے کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ اس سے پوچھ سکے کہ کلو کے کھیت کہاں ہیں۔ اس لیے وہ سر ہلا دیتا ہے

"ہاں کلو کے کھیتوں کو بھی پانی ملے گا۔"

بوڑھا یہ جواب سن کر مطمئن ہو جاتا ہے۔

اسی طرح وہ بوڑھا کچھ دن متواتر آتا رہا اور لوگوں سے یہی مخصوص سوال دہراتا رہا:

"کیا کلو کے گھر تک اس ڈیم کی بجلی پہنچے گی؟"

"کیا کلو کے سوکھے کھیتوں کو اس ڈیم سے نکلنے والی نہر سیراب کرے گی؟"

پھر اچانک وہ بوڑھا کہیں غائب ہو گیا اور ڈیم پر کام کرنے والے اس قدر مصروف ہوئے کہ اس بوڑھے کو یکسر بھول گئے۔

وہاں ڈیم اونچا اور اونچا ہوتا رہا اور وادی میں ٹرک، موٹریں اور ٹریکٹر دوڑتی رہیں اور کرینیں اور مشینیں دیو ہیکل جانوروں کی طرح دھاڑتے رہے۔ یہاں تک کہ ... سال کا وقفہ اپنی رفتار سے بیت گیا اور وہ ڈیم بن کر تیار ہو گیا۔ اس چھوٹے سے مصنوعی سمندر کا پانی بڑی بڑی سرنگوں سے ہوتا ہوا نیچے گرا تو کتنے ہی ٹربائن حرکت میں آ گئے اور ان سے رکھوں کلو واٹ بجلی پیدا ہو کر بے جان تاروں میں زندگی کی رو بن کر دوڑ پڑی اور ڈیم کا پانی نہروں میں چاندی اچھالتا ہوا ان دور دراز علاقوں میں چل پڑا جہاں ہزاروں لوگ صدیوں سے اپنے اپنے کھیتوں میں کھڑے اس چاندی کا انتظار کر رہے تھے۔

ڈیم کے افتتاح کے وقت سبھی لوگ خوش تھے۔ بہت خوش۔ مگر ان میں سے کسی کو بھی اس بوڑھے کا سوال یاد نہ آیا جو یہ پوچھا کرتا تھا کہ کیا اس ڈیم کی بجلی کلو کے گھر پہنچے گی؟ کیا اس نہر کا پانی کلو کے کھیتوں کو ملے گا؟

ڈیم کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی وہاں ڈیم پر کام کرنے والوں کے لیے ہزاروں مکانوں کی ایک بستی بھی بسائی گئی تھی جہاں انھوں نے ڈیم کے بننے کی خوشی میں ملک کے راشٹرپتا مہاتما گاندھی کا ایک قد آدم مجسمہ بھی بستی کے وسطی چوک میں نصب کیا تھا۔ اس دن اس کا بھی افتتاح تھا۔

وہ سب لوگ اس موقع پر مجسمے کے چاروں طرف جمع تھے۔ جب اس مجسمے سے پردہ ہٹایا گیا تو ملک کا راشٹرپتا اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ کھڑا تھا۔

دبلا سا جسم، کمر میں لنگوٹی، باقی بدن ننگا۔ ایک ہاتھ میں موٹی لاٹھی، آنکھوں پر پتلا سا چشمہ۔ اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے سے معلوم ہو رہے تھے جیسے وہ ان سب سے پوچھ رہا ہو:

"جس ڈیم کو تم نے بنایا ہے اس کی بجلی کلو کے گھر گئی ہے یا نہیں اور اس نہر کا پانی کلو کے کھیتوں کو سیراب کر رہا ہے یا نہیں؟"

★

(مزاحیہ)

آج کریں مجھے نہ تنگ

عبدالمجید شمالوی

ہمارے ایک دوست مے آزادی سے مست یہ گنگناتے ہوئے نکلے ؎

آج کریں مجھے نہ تنگ مذہب و عقل نام و ننگ

میں نے کہا یہ نعرہ کس خوشی میں لگایا جا رہا ہے۔ انھوں نے جھوم کر فرمایا آپ کو نہیں معلوم آج ہم آزاد ہی نہیں بلکہ اپنی آزادی کی ۲۵ویں سالگرہ کا جشن منا رہے ہیں یعنی ہم ۵ اگست کو آزادی کا پچیسواں جام نوش فرمانے جا رہے ہیں۔

میں نے کہا معاف کیجیے گا شاید آپ آزادی کا مطلب عقل و ہوش سے آزادی سمجھتے ہیں اسی لیے آپ مذہب و عقل اور ننگ کی بیڑیاں توڑ کر جشن آزادی منانے کے لیے نکل پڑے ہیں۔

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور آپ ابھی تک عقل و ہوش کے چکر میں پڑے ہیں حالانکہ غالب صاحب فرما چکے ہیں ؎

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

چنانچہ میں نے آج اسے تنہا چھوڑ دیا ہے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ کی طرح سبھی لوگ اسے تنہا چھوڑ دیں تو جشن آزادی منانا تو بڑی بات ہے سڑک پر چلنا دشوار ہو جائے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اجتماعی آزادی کے لیے انفرادی آزادی پر پابندی ضروری ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ پورا ملک کے سب لوگ آزادی اور سلامتی کے ساتھ گزر سکیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد سڑک پر دائیں بائیں ہر طرف سے گزرنے کی اپنی انفرادی آزادی پر تھوڑی سی پابندی عائد کرے اور صرف بائیں طرف سے گزرے تاکہ حادثات سے بچا جا سکے اور لوگوں کی آمد و رفت میں رخنہ نہ پڑے۔

آزادی کے معنی کبھی یہ نہیں ہو سکتے کہ آپ دوسروں کی آزادی کا لحاظ کیے بغیر اور بے ٹھکانہ جو جی میں آئے کر گزریں۔ ہاں جہاں تک ایسی باتوں کا تعلق ہے جن کے کرنے یا نہ کرنے سے سماج پر کوئی اثر نہیں پڑتا آپ ان باتوں کے کرنے میں بے شک آزاد ہیں مثلاً آپ کا دل چاہے تو چلچلاتی دھوپ میں چھتری لگا کر جشن آزادی کی سیر کے لیے نکل سکتے ہیں اور جشن آزادی منانے والوں کے لیے تفریح کا سامان فراہم کر سکتے ہیں۔ اس کا تعلق خود آپ کے ذوق و فہم سے ہے۔

لیکن اگر آپ آزادی کی موج میں آکر دامن دگر بیاں ہی نہیں بلکہ پاجامے کرتے سے بھی آزاد ہو کر سیر کے لیے نکل پڑیں تو آپ کی یہ حرکت دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث ہوگی۔ اس لیے آپ ننگے رہنے کے اپنے پیدائشی حق کو اس وقت تک استعمال نہیں کر سکتے جب تک سوسائٹی آپ کی اس حرکت کو بغیر تکلیف کے برداشت کرنے کے لائق نہ ہو جائے۔

انھوں نے یہ سن کر جوش کے ساتھ کہا ؎

چند ہی روز مرے دوست فقط چند ہی روز

گھبرائیے نہیں وہ دن دور نہیں جب نیم برہنگی کا موجودہ ذوق بڑھ کر مکمل برہنگی کی منزل پر نہ پہنچ جائے جس نے لباس کو تن ڈھکنے

کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کی نمائش کا وسیلہ بنا دیا ہے۔

میں نے کہا کہ جس طرح آپ نے سیاسی آزادی کا مطلب تمام پابندیوں سے آزادی خیال کر لیا ہے اسی طرح فیشن پرستوں نے لباس کی آزادی کا مفہوم عریانی سمجھ لیا ہے حالانکہ دونوں غلطی پر ہیں۔ سیاسی آزادی اپنے ساتھ صرف آزادی ہی نہیں بلکہ بہت سی ذمہ داریاں بھی لاتی ہے۔ وہ شخص جو ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے تیار نہیں اسے آزادی منانے کا بھی حق نہیں۔ آزادی کے حصول کی طرح اس کی حفاظت اور اسے بیرونی دباؤ اور بد نظمی سے محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ آزادی کی حفاظت کے لیے اتحاد اور بیرونی دباؤ سے بچنے کے لیے معاشی استحکام ضروری ہے۔ اس لیے جشن آزادی منانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان تمام باتوں سے پرہیز کیا جائے جن سے ہمارے قومی اتحاد میں رخنہ پڑتا ہے۔ مذہبی فرقہ وارانہ نفرت، صوبائی اور لسانی تعصب، نیچ اونچ کا فرق اور چھوت چھات سب سے نفرت ہی نہ کی جائے بلکہ دوسروں کو بھی دور رکھنے کی کوشش کی جائے۔

اسی طرح دولت کے اس فرق کو بھی دور کرنے کی ضرورت ہے جس نے ملک کے کروڑوں عوام کو بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم کر رکھا ہے۔ ملک کی پیداوار بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس کی منصفانہ تقسیم کے لیے بھی جدوجہد ضروری ہے تاکہ آزادی کے بعد ملک میں آئی ہوئی خوش حالی سے صرف انے گنے آدمیوں کے بجائے عام لوگ فائدہ اٹھا سکیں اور آزادی کی نعمتوں سے محظوظ ہو سکیں۔ ملک میں سماجی انصاف بھی صحیح معنوں میں اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک معاشی فرق نہ دور کیا جائے۔ دولت کا اتنا بڑا فرق عوام کو نہ صرف یہ کہ ضروریات زندگی سے محروم رکھتا ہے بلکہ انھیں سماج میں باعزت جگہ بھی حاصل کرنے نہیں دیتا۔

اجتماعی خوش حالی کے لیے انفرادی راحتوں میں کمی اسی طرح ضروری ہے جس طرح اجتماعی آزادی کے لیے انفرادی آزادی پر پابندی جس طرح سڑک پر سکون سے گزرنے کے لیے دائیں بائیں ہر سمت سے گزرنے پر پابندی لگائی جاتی ہے اسی طرح ملک کی معاشی زندگی کو پُر سکون بنانے کے لیے ضروری ہے کہ کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کی بے لگام معاشی سرگرمیوں پر مفاد عامہ کو سامنے رکھتے ہوئے پابندیاں عائد کی جائیں اور معاشی سرگرمیوں کا مقصد محض ذاتی منافع کے بجائے اجتماعی منافع اور قومی مفاد بنایا جائے۔

ہمارے دوست نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو ہمیں عقل و ہوش سے آزاد رہنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے آپ جانتے ہیں کہ کمزور کا زور دوسرے پر نہیں چلتا ہی پر چلتا ہے اس لیے زندگی کی محرومیوں سے عاجز آ کر ہم اپنا ہی دامن گریبان نوچ ڈالتے ہیں اور کپڑے پھاڑ کر باہر نکل پڑتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اگر آپ کپڑے پھاڑنے کی زحمت گوارا کرنے کے بجائے ذرا عقل پر زور دینے کی تکلیف گوارا کرتے تو آپ کی سمجھ میں آ جاتا کہ یہ دکھ تنہا آپ کے نہیں عام جنتا کے ہیں آپ کو عقل و ہوش سے بیزار ہونے کے بجائے عوام کو بیدار کرنا چاہیے! اگر وہ واقعی بیدار ہو گئے تو دنیا کی کوئی طاقت انھیں اپنے جائز حقوق سے محروم نہیں رکھ سکتی۔ آج آزادی کا پچیسواں سال پورا ہو رہا ہے اٹھیے اور ملک کے نوجوانوں کو جھنجھوڑ کر کہیے کہ

گریباں کو دو چاک اہل جنوں پرچم میں بچانے کے دن آ گئے

★

آزادی کے پچیس سال

(ایک طویل تمثیلیہ)

جگن ناتھ آزاد

راوی نمبر ۱ (تحت اللفظ)

دوستو! ابھی کل ہی کی بات ہے
وطن کی سرزمین پر جب غلامی کی حکومت تھی
یہ دیس ایک قفس کا، زمانے سے نالاں تھا لیکن
یہ وہ دور تھا جس پر ستمگاری کی حکومت تھی

راوی نمبر ۲ (تحت اللفظ)

غلامی کی یہ دل دوز داستاں سے کوئی
بھی محروم نہ تھا اس وطن میں ناواقف تھا
جس ناواقف لیکن اس نے احساس نہ تھا کوئی
[illegible]

راوی نمبر ۳ (ترنم سے)

اس وطن کی تباہی سے آخر کب تک آپ آیا
آزادی لے رنگ حیا ، غلامی بہت بھوک
[illegible]

کورس (موسیقی، سازوں کے ساتھ)

دیس ہوا آزاد ہمارا دیس ہوا آزاد
دل کا سہرا آنکھ کا تارا دیس ہوا آزاد
سندر سندر پیارا پیارا دیس ہوا آزاد
گونج اٹھا ہر سمت یہ نعرہ دیس ہوا آزاد
دیس ہوا آزاد

سب بولو، آؤ، دیکھو گاندھی جی کا نام
جس کے دم سے آج ہوا ہے سارے دیس کا نام
اپنے بل سے جس نے توڑا سامراج کا دام
آج سن گاندھی جی کا پیارا دیس ہوا آزاد
دیس ہوا آزاد

اپنے دیس کی کشتی ادھر طوفانوں کے پار
بیچ میں کیسے کیسے ہیں اس کے کھیون ہار
راجن بابو، نہرو جی، مولانا اور سردار
ڈھونڈ لیا کشتی نے سہارا، دیس ہوا آزاد

دیس ہوا آزاد
آج کے دن سے ٹوٹ گئی ہے غلامی کی زنجیر
آج کے دن سے ایسی ہے اس دیس کی ہر تصویر
ایسی ہے جنت کی دنیا ایسا ہے کشمیر
گونج اٹھا ہر سمت یہ نعرہ دیس ہوا آزاد
دیس ہوا آزاد

راوی (تحت اللفظ)

ہم تو آزادی کے لئے کام رہے تھے ادھر ادھر
جنگ کی تیاریوں میں [illegible] یہ کہتا ہوں کہ
حملہ دشمن نے کیا ، اس نے حملہ کر دیا
کون جانے کہ اس کے دل میں کیا ارماں تھا
کہ جس کس نے پڑھایا اس کو یہ سبق
مدد سے [illegible] انسان انسان تھا

رجز کے انداز میں موسیقی کے ساتھ

ہمارا [illegible] بڑھے چلو بڑھے چلو
دلاوران [illegible] بڑھے چلو، بڑھے چلو
جس جگہ دشمن دکھے بڑھے چلو، بڑھے چلو
سروں سے باندھ کر کفن بڑھے چلو، بڑھے چلو
تمہاری آن سے وطن، وطن کی آن تم سے ہے
ہر ایک فرد قوم ہے ہر ایک انسان تم سے ہے
وطن کی لاج تم سے ہے وطن کی شان تم سے ہے
مثال [illegible] بڑھے چلو، بڑھے چلو

رجز کے انداز میں موسیقی کے ساتھ

ہمارے کارناموں سے وطن کا نام روشن ہے
اس کی صبح [illegible] جہاں کی شام روشن ہے
[illegible] دشمن ناکام [illegible] ہے
کہ دنیا پر ہماری عزت [illegible] روشن ہے
ہم اس کے زور سے جھنڈا رکھیں گے سربلند اپنا
خدا چاہے تو ہوگا ہر ارادہ [illegible] بلند اپنا

راوی: (تحت اللفظ)

بالآخر اپنا جو تھا مقصد وہ ارجمند ہوا
وطن ہمارا زمانے میں سب سے بلند ہوا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

راوی: (تحت اللفظ)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

راوی: (مختلف آوازیں تحت اللفظ)

[illegible]
[illegible]
[illegible]

راوی: (تحت اللفظ)

[illegible]
[illegible]

راوی: (کئی آوازیں ساتھ)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

راوی: (تحت اللفظ)

اس رحمتِ الٰہی کو سمجھ سکے ... [illegible]
[illegible]
گاندھی تو ہمیں چھوڑ کے ... [illegible]
اور ان کی تعلیم کے سبب ہم سب کو ایک تسلی تھی

کورس کی آواز:

سہرو بھی تھے مولانا بھی قدردانی بھی سردار بھی تھے
گفتار بھی تھی کردار بھی تھے اور کار بھی تھے افکار بھی تھے
اور قافلہ اپنا منزل کو چلتا ہی گیا بڑھتا ہی گیا
ہر اک بلندی کی جانب چڑھتا ہی گیا چڑھتا ہی گیا
کچھ ایسے جذبِ دل اپنا فروزاں کر دیا ہم نے
اندھیری رات میں عشق چراغاں کر دیا ہم نے
شریکِ رنگ فردا یوں کیا خونِ جگر اپنا
کہ ہر ذرے میں پیدا اک گلستاں کر دیا ہم نے
[illegible]
[illegible] کو ساحل کا داماں کر دیا ہم نے
[illegible]
[illegible] سامان بہاراں کر دیا ہم نے
[illegible]
[illegible] کر دیا ہم نے
کوئی مشکل [illegible] رستے میں [illegible]
[illegible] آساں کر دیا ہم نے
[illegible] کوئی دیکھے
[illegible] کر دیا ہم نے
[illegible]
[illegible] کر دیا ہم نے
[illegible]
[illegible] کر دیا ہم نے
[illegible]
[illegible] کر دیا ہم نے
[illegible] آج بھی چلیں
[illegible] کر دیا ہم نے
[illegible] فولاد پانی بن کے بہتا ہے
کہیں وحشت ہوا [illegible] کر دیا ہم نے
وطن کے ہر بیاباں کو گلستاں میں بدل دینا
بڑا مشکل تھا لیکن اس کو آساں کر دیا ہم نے
بدل دیں ہم نے تدبیروں سے تقدیریں نظاروں کی
ہر اک خاموش منظر کو غزل خواں کر دیا ہم نے

دوسری آواز: اگلے ہیں کہیں خاک نے سربستہ خزانے
گاتی ہیں مشینیں کہیں فردا کے ترانے
وہ دن بھی نہیں دور کہ ہو جائیں گے جس دن
بیکاری و افلاس وطن محض فسانے
اے گردش افلاک ہم آ گئے ہیں اب ان سے
گرنے کے نشانے تیر کہ سینے کے نشانے
بجلی کی رہی نعمت نایاب ہمیشہ
تھی اپنے کروڑوں کے لیے خواب ہمیشہ
اس دیس میں کہ پانی کی طرح عام ہو بجلی
کوشاں ہی ... باہمت نہ ... اہمیت
ہمت نے اسے کر ہی لیا قبضے میں ...
اپنا ہے یہ اب نور جہاں تاب ہمیشہ

تیسری آواز: خود کاوش مردوں سے کہ جذب دل کی امنگ
طلسم عصر رواں ہے کہ ... نیرنگ
جو راہ میں کبھی حائل تھا کوہسار مہیب
اسی نے آج دلوں کو کیا دلوں سے قریب
جو راہ میں سد سکندری تھا کو
وہی پہاڑ ہے اب ولولوں کی راہ گزر
نظر نظر متحیر ہے کیا تماشا ہے
اگر یہ ایک کرشمہ نہیں تو پھر کیا ہے
بشر کی پختہ خیالی کا اک کرشمہ ہے
ہماری ہمت عالی کا اک کرشمہ ہے
ہمارا عزم مصمم جب آشکارا ہوا
تو جو بھی سنگ گراں تھا وہ پارہ پارہ ہوا
جب اپنے شوق نے یلغار کا ارادہ کیا
تو بانہال نے دامان دل کشادہ کیا
بسرا جو اپنے تعلق کا گر تھا میں ہی گیا
جو ایک چاک تھا دامن میں آج سل ہی گیا
یہ کام دور ... کے اہتمام کا ہے
تمام جلوہ یہ اک سوز ناتمام کا ہے

راوی: فن اور ہنر کے میدان میں ہر ایک ترقی جاری تھی
صنعت کی زمینوں پر ہر سو ہر روز نئی گلکاری تھی
تعلیم و زراعت کی دنیا خود بین پہلے سے اعلیٰ تھی
صحت کی کلی گلزاروں میں اک جذبۂ دل سے کھلی تھی

راوی: طرب کا دور تھا گویا ہر اک سمت آباد
(مختلف آواز): اچانک اس میں اٹھا شور نالہ و فریاد
وطن تمام ہجوم الم میں ڈوب گیا
وطن سے ہو گئے رخصت ابوالکلام آزاد

راوی: جس سے دشت وطن سینے تھے منور سب دماغ
(مختلف آواز): بجھ گیا وہ علم کا دانش کا حکمت کا چراغ

راوی: اے وطن تیرا امیر کارواں جاتا رہا
(مختلف آواز): ناز تھا جس پر وہ گنج شائگاں جاتا رہا
داستاں کیسی کہ زیب داستاں جاتا رہا
اس کلام اقدس ترا ترجمان جاتا رہا
جس کی تحریروں سے روشن تھی شب اسرار حق
آج خاموش ہے وہ سر سینۂ اسرار شرق
تیرے دم سے تھا سیاست کو بھی حاصل اک وقار
تیری سطوت ملک و ملت کے لیے مثل حصار
عصر نو میں اے دبیر عقل و دیں کے تاجدار
تیرے دل کا صدق تھا تیری نظر سے آشکار
جلوہ آرا نور قرآں تیرے سینے میں تھا
جوہر آزادی تیرے دل کے آئینے میں تھا

راوی: نہ پوچھیے کہ وطن میں تھا کیا سماں اس وقت
(مختلف آواز): دلوں میں ایک قیامت کا تھا سماں اس وقت
دیار ہند میں مینار نور تھا آزاد
ہمارا ... ہمارا غرور تھا آزاد

راوی
(مختلف آواز): آزاد اگرچہ بھارت سے ظاہر کا رشتہ توڑ گیا
تعلیمیں تھیں جو ظلمت میں وہ نقش کف پا چھوڑ گیا
اور پھر یہ وہ نہیں جو گھبراتا کس واسطے آخر گھبراتا
کیوں شکوہ مقدر کا کرتا کیوں اپنی جبیں پر بل لاتا
ہمت کیوں ہارتا قافلہ جب اس کا سردار جواہر تھا
طوفاں سے سفینہ کیا ڈرتا جب کھیون ہار جواہر تھا

ایک آواز: اے جواہر لال نہرو، رہبر روشن ضمیر
(ترنم کے ساتھ) کاروان جہد قومی کے امیر

آج ہے تری ضیا سے ذہنِ انساں مستنیر
آسمانِ ہند کے تم ہو مہرِ منیر

دوسری آواز: (تحت اللفظ) دونوں کی ایک دنیا ہے تری آواز میں
جس کا زیر و بم نہیں ہے راز میں
ہے کتنا درد پوشیدہ ہے تیرے ساز میں
تیرے شوقِ فکر کی پرواز میں
کاروانِ شوق کو تیری قیادت کی قسم
کارواں آگے ہی بڑھتا جائے گا
کارواں کو تجھ سے ہے جو اس محبت کی قسم
کارواں اب نہ رکنے پائے گا

راوی: (مختلف آواز) لیکن اک دن ایسا آیا یہ ندہ بھی ٹوٹ گیا
اپنے رہبر کے ہاتھوں سے ہر رہبر کا دامن چھوٹ گیا

راوی: (مختلف آواز) ذوقِ گلاب سحر کا منظر چلا گیا
جس سے شام جان تھا معطر چلا گیا
موجِ تبسم عمل میں سے جھیل گئی
لعلِ لبِ شبنم کی آب یہیں سے جھیل گئی

راوی: (مختلف آواز) جب دکھ ہوکے تیرا بدن خاک میں ملا
محسوس یوں ہوا کہ چمن خاک میں ملا
رفعت سے گر کے تاجِ وطن خاک میں ملا
سارا جہاں گنگ و جمن خاک میں ملا
اے خاکِ ہند آج بس اتنا خیال کر
محسن کی راکھ ہے اسے رکھنا سنبھال کر

راوی: (مختلف آواز) تو اپنے وطن کا ناز بھی تھا اور نیاز بھی
تو ایک راز دار ہوا تھا راز بھی
سیاستِ قوم بھی تھا، چارہ ساز بھی
فولاد بھی تھا موم کی صورت گداز بھی
کشتِ وطن بھی حاصلِ کشتِ وطن بھی تھا
تو تھا چمن بھی اور نسیمِ چمن بھی تھا

راوی: (مختلف آواز) انساں تھا اک محاسنِ یزداں لیے ہوئے
قطرہ تھا اپنے ظرف میں طوفاں لیے ہوئے
دل میں بشر کا دردِ فراواں لیے ہوئے
لامذہبی میں دولتِ ایماں لیے ہوئے

ایماں کی روح یوں وہ زمانے میں بھر گیا
دردِ بشر سے دہر کو معمور کر گیا

راوی: (مختلف آواز) اپنا الم نہ کوئی ایماں کے دل سے پوچھ
ہندو کے دل سے اور نہ مسلماں کے دل سے پوچھ
لنکا کے دل سے پوچھ نہ ایراں کے دل سے پوچھ
حالِ دلِ تباہ بس انساں کے دل سے پوچھ
ہندو کی موت ہے نہ مسلماں کی موت ہے
نہرو کی موت ہے وہ اک انساں کی موت ہے

راوی: (مختلف آواز) واشنگٹن میں وہ تری تقریر دل پذیر
تقریر تھی کوئی کہ پہاڑوں میں جوئے شیر
لندن تھی یا کہ تھی ترے علم کے اسیر
عالم ترے سخن کی تجلی سے مستنیر
آیا کہاں سے زمانے میں سرور نئے
حاصل کی نے نواز کا دل ہے کہ جوب نئے"

راوی: (مختلف آواز) ترا ہی یہ کمال تھا تیرا ہی انتظام
گنگا کی موج ہے جو مسیبی سے ہم کلام
جمنا کو دانگا کی طرف سے ملا پیام
اے سرزمینِ ہند کے رودِ سبک خرام
ساز اپنے مختلف ہیں ترانہ تو ایک ہے
عنوان الگ ہیں فسانہ تو ایک ہے

راوی: (مختلف آواز) حق نے دیا تھا تجھ کو ادب میں بھی اک مقام
دنیا کے اہلِ فن ترا کرتے تھے احترام
اس بات میں نہیں ہے کسی کو ذرا کلام
بیٹی کے نام خط ہوں کہ عالم کے صبح و شام
تیرا ہے بات کرنے کا انداز ہی کچھ اور
شور جہاں میں ہے تری آواز ہی کچھ اور

راوی: (مختلف آواز) جو کچھ بھی لکھ گیا ہے ترا کلکِ خوش کلام
پیغامِ اتحاد ہے نوعِ بشر کے نام
ترا اک ایک لفظ سیاست کے اسے امام
ہے شاخِ گل کہیں تو کہیں تیغِ بے نیام
جو دردِ آج ہے دلِ دنیا لیے ہوئے
تیرا قلم ہے اس کا مداوا لیے ہوئے

راوی: اس کے جانے سے وطن کا تمام پورے حال تھا
(ترنم آواز سے) وہ ہمارا تھا جواہر وہ ہمارا لعل تھا
حادثے کتنے پڑے ہوں کام رکتے ہیں کہیں
تیز رفتاری کے عادی گام رکتے ہیں کہیں
اپنے منصوبے پہ عامل تھا وطن پوری طرح
مست تھا اپنی ہی خوشبو میں چمن پوری طرح
کارخانے، تجربہ گاہیں، ادارے، مدرسے
اپنے اپنے کام میں مشغول تھے مصروف تھے
دھان گندم مہک رہے تھے کھیت میں گلشن میں پھول
رہنما اپنا بقائے باہمی کا تھا اصول

راوی: اپنے عالم میں جب اپنی دھن میں گم تھا ہندوستان
(مختلف آواز تحت اللفظ) خوشحالی کا نادل بڑے دل میں ہی تھا اک ارمان
جنگی طبل بجی کہ پاکستان نے کی ہم پہ ملغار
توپیں اس کی ہم پہ برسیں جیسے ہم ہوں رام سار
ٹینک اس کے میدان میں سرکے گرد دت آئے بار
کون ستائے تیکھے سے بے بوتے طاقت تھا نہ

نئی آواز: اس طوفان کے روکنے کو جب بھارت کا جمہور اٹھا
(تحت اللفظ) محنت کا دو رنگ جو آدم کا سب دستور اٹھا
دشمن کے حملے سے بچ نے اپنے دیس کی مٹی کو
سرحدوں میں جوش تھا یا دل میں ایک سرور اٹھا
دانشوروں نے قلم سنبھالا اور فن کار نے اپنا فن
خون گرم دہقاں چمکا چہرے پہ اک نور اٹھا
میدانوں میں فوجیں اتریں ٹھیکری میں مزدور اٹھا

راوی: بہار ہند کے جو گھٹا بن کے چھا گئے
(مختلف آواز) چیتا عدو کہ دیو فضاؤں میں آگئے
پیغام امن شہروں پہ جا کر ستم کئے
تھے کے مرکزوں میں قیامت اٹھا گئے
جو شہروں کے سر میں تھی وہ شیخی بھری
دو روز میں غرور گیا خود سری گئی

دوسری آواز: اے مجاہد اے بہادر اے سپاہی اے شہید
(تحت اللفظ) جان نثاران وطن کے فخر اے عبدالحمید
جان دے کر تو نے پائی ہے حیات جاوداں
نام بھی تیرا مبارک کام بھی تیرا سعید

راوی: آخر چھٹ گئے جنگ کے بادل امن والوں کا دور آیا
دھوپ کی بری ختم ہوئی اور ابر باراں کا دور آیا
ایسے میں بھارت والوں نے پاک کو یہ پیغام دیا
چھوڑ اب فتنہ دوسری باتیں قلب تپاں کا دور آیا

ایک آواز: ہاں حال سے تاریخ کہتی ہے یہی
بات جنگ ہم ابتدا نہیں کرتے
مدافعت کی لڑائی ہمارا شیوہ ہے
اور اس میں رکھ کے قدم ہم رکا نہیں کرتے

دوسری آواز: ہم آج پھر یہی کہتے ہیں اے پڑوسی دیا
ترے عوام سے ہم کو کوئی عناد نہیں
ہمارا طرز عمل امن سے عبارت ہے
ہمارے میثاق نظر صلح ہے فساد نہیں

تیسری آواز: اپنے منصوبے میں تھا ہندوستان جنگ کے بعد
آئی تھی پھر سے گلستاں پہ چمن جنگ کے بعد
گرچہ نقصان ہوئی یہ جنگ تھی ہم پر لیکن
پھر ہوئی مشکلات برطرح وطن جنگ کے بعد

مختلف آواز: جنگ کے بعد جو معمول پہ حالات آئے
سامنے اس دور ترقی کے خیالات آئے

مختلف آواز: سائنس کی صدی بھی آئی گاندھی صدی بھی آئی
زندگی بھی آئی وہ زندگی بھی آئی
علم سیاحوں نے پھر دیس کو سنوارا
پھر مرکز بن تھا ہندوستاں ہمارا
ہندوستاں کی شہرت یورپ میں جا کے پہنچی
اپنی صنعت جاپان میں بھی دکھی
ہندوستان ہے اک مکمل سماج داری
جب انتخاب آیا جمہور نے صدا دی

★

عظمتِ قومی

شمس نقوی

موجِ تسنیم سے اُلفت کی کرن پھوٹی ہے چٹکی کلیوں سے نزاکت کی کرن پھوٹی ہے
نکھرے سونے سے حقیقت کی کرن پھوٹی ہے کھلتے پھولوں سے محبت کی کرن پھوٹی ہے
شاد باشو! عظمتِ قومی کا مقام آیا ہے
چاندنی کی تھالی میں [illegible] پیام آیا ہے

ہے پیام یہ محبت کے طلب گاروں کو نغمے سمجھا کیے زنجیر کی جھنکاروں کو
ہم نے توڑا ہے چمکتی ہوئی تلواروں کو کر دیا سرد دہکتے ہوئے انگاروں کو
لَو حقیقت کی نکلنے لگی ارمانوں سے
جذبۂ غم کا سبق سیکھا ہے پروانوں سے

[illegible] پگھلی کہ ہمارا کوئی [illegible] شاد کرے تاج اُبھرا کہ محبت کو سدا یاد کرے
دل میں ہے جس کے عداوت اُسے برباد کرے اُجڑی بستی ہو جو بستی اُسے آباد کرے
[illegible] تربت کی طرح وادی سے
[illegible] کر دیا انجام کو آزادی سے

حُسن کہتا ہے کہ [illegible] کی شکن یاد کرو عشق کہتا ہے کہ [illegible] کا چمن یاد کرو
پھول کہتے ہیں جو آہ کا چمن یاد کرو پھر سے قربانیٔ حبِ وطن یاد کرو
باتیں ہوتی ہیں تصور ہی میں پروانوں سے
اب بھی آتی ہے [illegible] کی آواز نئے زندانوں سے

لکشمی بائی کی ہمت کا سبق یاد کرو اپنی تاریخِ شہادت کا ورق یاد کرو
[illegible] حق یاد کرو خون میں ڈوبا ہوا رنگِ شفق یاد کرو
تاتیا ٹوپی کا پیغامِ وفا یاد کرو
[illegible] دشمن کی جفا یاد کرو

شکل آنکھوں میں سموئی [illegible] کی کیفیت یاد ہے چھلکے ہوئے پیمانوں کی
گنگا [illegible] کی [illegible] پروانوں کی
عظمت [illegible] عشق کی [illegible] ہیں
کتنی قربانیاں [illegible] حاصل ہوئیں آزادی میں

بادِ نو بہار چلے

وقار خلیل

(شملہ چوٹی کانفرنس کے پس منظر میں)

کہا تھا یہ مرے مخدوم نے مسرت سے
جہاں میں جنگ نہیں امن سربلند چلے
سپیدۂ صبح چلے، بادِ تاشقند چلے

بڑھاؤ ہاتھ کہ انسانیت کا نام کریں
گلے ملیں کہ زمانے میں شاد کام رہیں
گلاب بن کے کھلیں، روشنی کے رخ پہ جییں
کہ ہند و پاک ہیں دو بستیاں اجالوں کی

تمام ارضِ پاک کی تہذیب اور ثقافت کو
وقار دینا ہو، احساس کی شرافت کو
عظیم جو ان کے رشتے سے استوار کرو
شعور و فکر و نظر پر تو اعتبار کرو

ہم اہلِ ہند ہیں، محبت آرزوؤں کا
کرن کرن سے نچوڑے ہیں آفتاب کئی
جہاں بھی ظلم ہوا، حریت پہ آنچ آئی
سکونِ تخت کے فریضہ ادا کیے ہے وہیں

لکھی تھیں میں نے کسی نظم میں یہ سطریں بھی
کرن سحر کی، اسیرِ ہوس کہیں ہو گی
سحر ستارہ شناسوں کی مسکراہٹ ہے

اور آج پھر یہی کہنا ہے، گوشِ دل سے سنو
کہ ہند و پاک ہیں دو بستیاں اجالوں کی
کہ ان میں جنگ نہیں، امن سربلند رہے
ہوائے ظلم نہیں، بادِ نو بہار چلے
بقولِ فیض، محبت کا "کاروبار چلے"

ذوقِ آزادی

سعادت نظیر

جہادِ زیست میں ٹوٹا طلسمِ صیادی
صدائے نغمہ سے بدلی نوائے فریادی
جو قید ہو تو ہو کس طرح ذوقِ آزادی
تعینات کہاں؟ عزم جو ہو فولادی
قدم اٹھے تو گئے بیٹھ مرحلوں کے جگر
ستارے ہو گئے گردِ غبارِ راہِ سفر
ہر ایک ذرے میں لرزاں ہے آفتابِ سحر
جنونِ شوق کی کروٹ کا نام ہے محشر
کمالِ عزم سے نصرت بنی، کامرانی ہے
شعورِ پختہ سے تہذیبِ زندگانی ہے
نگاہِ گرم سے ہے سردِ زلزلوں کا جلال
نشاطِ کار سے ہے حوصلوں کا حسن و جمال
وہ عقدے ہو گئے حل، جو کبھی تھے امرِ محال
بقا کی جہد میں گزرے، جو گزرے وہ ماہ و سال
وہ کل، جو بیت گیا ہم سے خوب تر ہے آج
رسومِ نو سے بدل کر رہے قدیم رواج
دیارِ بیم و رجا پہ ہے شاہِ دل کا راج
مزاجِ شعلہ و شبنم ہے زندگی کا مزاج
عجیب شان سے نکھرا شبابِ فکر و نظر
قدم قدم پہ ضیا پاش ہیں نجوم و قمر
شبِ سیاہ کے دامن میں ایک تابندہ سحر
رگوں میں غنچہ و گل کی ہے رقصِ برق و شرر
ہوا فروغ کچھ ایسا مذاقِ حکمت کو
کہ مل گئی وہ معراج آدمیت کو

رامائن اور اردو

ویریندر پرشاد سکسینہ

سنسکرت میں برتی والمیک نے ایک تاریخی کہانی نظم کی تھی جو رامائن کہلاتی ہے۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جو نہ صرف ہندستان کی مختلف زبانوں میں بلکہ دنیا کے ادب میں کسی نہ کسی صورت میں آج تک برابر دہرائی جاتی رہی ہے۔

سنسکرت اور ہندی سے قطع نظر خود اردو میں بھی رامائن کا قصہ مختلف صورتوں میں لکھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ رامائن سے متعلق اردو نظم و نثر کے تراجم کا ایک طویل سلسلہ موجود ہے جس میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اردو میں رامائن کی ابتدا غالباً اتی مرحوم کے رامائن یاترا سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد جدید دور میں بھی شعلہ، سرور، چکبست، جگر بریلوی، فراقی دریا آبادی، جناب بریلوی وغیرہ نے اس کے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ اردو رامائن کے مصنفین کی طویل فہرست میں ہندو اور مسلمان دونوں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ اردو میں منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی، منشی جگل ناتھ خوشتر لکھنوی، ملک الشعرا دوارکا پرشاد افق لکھنوی، منشی سورج نرائن مہر اور دوسرے شاعروں کی رامائنوں کا چراغ تلسی داس کی رام چرت مانس سے روشن ہوا ہے اور اردو نظم میں رام بھگتی کے ذریعے ان شعرا نے اردو زبان کو اپنی مذہبی تخلیقات سے مالا مال کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اردو کے بعض نقادوں اور ادیبوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ اردو میں رامائن اور مہابھارت کی داستانیں تبرک کے طور پر ملتی ہیں۔ حق بات تو یہ ہے کہ ہمارے ان ادیبوں اور نقادوں کا رام بھگتی اور کرشن بھگتی پر اردو میں کوئی مطالعہ نہیں تھا ورنہ یہ حضرات ایسا غلط اعتراض اردو زبان پر نہ کرتے۔ اس مقالہ میں چند رام بھگت شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے جنھوں نے رام بھگتی میں ڈوبی ہوئی شاعری کی ہے اور اس کی وجہ سے ان کا نام اردو ادب میں زندۂ جاوید ہو گیا ہے۔

منشی شنکر دیال فرحت نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو خیر مذہبی رنگ کی ہیں۔ لشن پران اور رامائن کا اردو نظم میں ترجمہ کیا۔ یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اردو اپنے ابتدائی زمانے میں ترقی و توسیع کے لیے سلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی سعی کی مرہون منت ہے۔ اس سعی نے ہندو دھرم کے ضخیم صحیفوں کے منظوم و منثور ترجموں کی شکل اختیار کی تھی جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ زبان اردو کی تاریخ کو ہندوؤں کے بارے میں دیگر امور کے ساتھ ساتھ ان ترجموں سے متعلق ایک فرض انجام دینا ہے یعنی یہ تحقیق کرنا ہے کہ ان کی تعداد کیا ہے؟ اردو کی ترقی میں ان کا کتنا اور کس نوعیت کا حصہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو کے ذریعے سے معاشرت میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان پر ان کا کتنا اثر ہے۔

فرحت کی منظوم رامائن بہت مقبول ہوئی اور حق یہ ہے کہ اس کی بدولت ان کا نام اردو دنیا میں پائندہ ہو گیا ہے۔ یہ مثنوی بلاغت و فصاحت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ روانی اور جوش سے بھی معمور ہے۔ صنائع و بدائع بھی کافی ہیں۔ بندش چست، الفاظ و ترکیبیں مرصع، تشبیہیں اور استعارے پُر لطف اور برمحل۔ غرض شاعری کی تمام خوبیوں سے یہ مالا مال ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

قریب قوس جب پہنچے سری رام — قدم سے دامنِ مہر الیا تھام

دھنک کو توڑ کر پھینکا زمیں پر   اندھیرا چھا گیا عرش بریں پر
بدن میں ہولتا پھولے جز و کل   ہوئی اوجِ ہوا سے بارشِ گل
پھولک اٹھے جنک سیتا ہوئیں شاد   خوشی سے خانۂ خاطر تھا آباد
بہمراہِ جلیسان حسبِ آئین   جناب جو بھی محفل میں آئیں
جناب رام کے قریب آ کے فی الحال   پہنا دی پھول کر پھولوں کی جے مال،

منشی جگن ناتھ خوشتر کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ہندو گھر میں، جن کی مادری زبان اردو ہے، راماین خوشتر ضرور رہے گی۔ راماین خوشتر پہلی مرتبہ ۱۸۶۴ء میں مطبع منشی نولکشور میں چھپی اور اس کے بعد اس کے تیرہ ایڈیشن اسی مطبع سے شائع ہوئے۔ سولہواں ایڈیشن ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں یہ راماین شائع ہوئی تو نسیم دہلوی نے یہ تاریخ کہی ؎

عیسوی تاریخ اے فکرِ رسا
لکھو "چھپے خوشتر کے افکارِ بجا"

اردو کے مثنوی نگاروں میں میرحسن، پنڈت دیا شنکر نسیم، شوق قدوائی، جگر بریلوی، برق سیتاپوری وغیرہ کافی مشہور رہے۔ لیکن اس صنفِ سخن میں خوشتر کی شہرت مثنوی راماین خوشتر کے باعث کسی سے بھی کم نہیں ہے۔ یہ مثنوی ان کا کارنامہ سمجھنا چاہیے اور اس کا شمار اردو کی بہترین مثنویوں میں ہوسکتا ہے۔ سلاست زبان، پختگی بندش کی چستی اور شگفتہ طرزِ بیان میں یہ مثنوی لاجواب ہے۔ منظر نگاری کے دلکش اور اثر آفریں نمونے اس میں ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

ہوا جب مطلعِ خورشید روشن   گلستانِ جہاں میں جلوہ افگن
ہوا مشرق سے ظاہر عارضِ حور   رُخِ عالم پہ چمکا پرتوِ نور
اُڑا زاغِ سیاہِ شب جہاں سے   ہمائے روز نکلا آسماں سے
ہوئی قوسِ ہلالِ شب شکستہ   عروسِ صبح نکلی دست بستہ
فلک پہ شاہدِ خورشید آیا   درِ شبنم کا زیبا ہار لایا
ہوا بیدار شاہِ بخت بیدار   شہنشاہِ جنک پور نیک کردار
شہ روشن جبیں و ماہ سیما   ہوا تختِ شہی پر جلوہ فرما

ملک الشعرا منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے رام ناٹک کے نام سے ایک ڈرامہ ۱۹۱۰ء میں بدیجو کلب لاہور کے لیے تصنیف کیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں آپ کی منظوم راماین بک ڈپو نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے جو ایک ادبی شاہکار ہے۔ حضرت جگر بریلوی یادِ رفتگان میں فرماتے ہیں:

"راماینیں کئی لکھیں جن میں ایک ایک قافیہ ہے۔ اکیلی یہی تصنیف آپ کی نادرالکلامی کی زبردست دلیل ہے اور دوامی عدیم المثال چیز ہے۔"

منشی سورج نرائن مہر نے اپنی کتاب بہا تصنیف میں بید و شاستر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ آپ کی سب سے زیادہ مشہور کتاب چہل حدیث ہے جس میں کہانیوں کے ذریعے ویدانت کے اصول سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کی راماین مہر ۱۹۱۴ء میں مادھو پریس دہلی سے شائع ہوئی تھی اس میں تلسی داس جی مہاراج کی شاعرانہ خصوصیتوں اور رام کی بھگتی کا فوٹو مہر صاحب نے اردو نظم میں ۵۴ صفحات میں پیش کیا ہے۔ آپ نے راماین منظوم میں زبان بہت سیدھی سادی استعمال کی ہے تاکہ یہ راماین عوام میں مقبول ہوسکے۔ راماین مہر کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

رامؐ روپ اپنے گورو کی دمبدم   میں لگاؤں آنکھ میں خاکِ قدم
درحقیقت خاک ہے یہ کیمیا   دردِ دنیا کے لیے کامل شفا
خاک کیسی یہ تو وہ اکسیر ہے   جس کی کشفِ ذاتِ حق تاثیر ہے
ظاہر و پنہاں چشم سب رام کے   دیدۂ دل کو نظر آئیں کھلے
کوہ و دریا دشت و صحرا بحر و بر   دیوتا بندہ آدمی اور جانور
کیا خلا میں کیا ملا میں بر ملا   کیا زمیں کیا چرخ پر ہر ایک جا
جلوہ فرما ایک میرے رام ہیں   وہ ہی میرے وہ تیرے رام ہیں

لکھنؤ کے منشی سورج پرشاد نقد نے راماین کے کئی کانڈوں کا منظوم لفظی ترجمہ کیا تھا جو مدت ہوئی شائع ہوچکا ہے۔ اس منظوم ترجمے میں بڑی پختگی شگفتگی اور روانی ہے اس کی ایک جلد میری لائبریری میں محفوظ ہے۔

ئلہ رام کی شکل کہ گھیل

چکبست کی [illegible] رام [illegible] "[illegible]" [illegible] ایک

مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے شری رام چندر جی کا اپنی

ماں سے رخصت ہونا دکھایا ہے۔ چکبست نے اصل میں رامائن

کے کئی سین نظم کیے تھے لیکن ان کی وفات کے بعد اُن کے قلم کے ہوئے

کسی سین کا پتہ نہیں چلا۔ پنڈت منوہر لال زتشی کا ایک مقالہ زمانہ

نومبر ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا ہے اس میں زتشی صاحب فرماتے ہیں:

"چکبست کی رامائن کا ایک ٹکڑا چھپ گیا ہے کئی اور

ٹکڑے چکبست نے لکھے تھے اور راون کے دوستوں سے ان کی

زبانی سُنے تھے۔ اُن میں آخری جنگ سے پہلے راون کی تقریر

خاص طور سے قابل ذکر ہے مگر وہ سب اُن کے ساتھ چلا

گئے۔ میں نے اُن کے مرنے کے بعد اُن کے کاغذات کو

چھانا مگر افسوس کہ مجھے کچھ نہیں ملا۔"

رام چندر جی کے [illegible] کے اضطراب کو چکبست ان [illegible]

اپنے بھی نامرادی بہت آئیں گے نظر گھر جن کے بے چراغ ہیں آہ عمر بھر

رہنا مرا بھی خلل تمنا جو ہے تر یہ جانے صبر بھی کہ دعا میں نہیں اثر

لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا

پھل پھول لا کے باغ سارا اجڑ گیا

رام چندر جی کا جواب چکبست کی زبان میں سنیے

اپنی نگاہ بھی ہے کسی کا رسا پر صحرا میں بے گا وہ ہے مہرباں اگر

جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر

اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں

داماں دشت دامن مادر سے کم نہیں

منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی اُن اُردو شعرا میں سے ہیں

جن کی شاعری میں سارے ہندوستان کا دل دھڑکتا ہوا نظر

آتا ہے انھوں نے رامائن کے کئی سین نظم کیے ہیں یہ مہاراجہ

دسرتھ کی بے قراری اور سیتا جی کی گریہ وزاری ملاحظہ فرمائیے۔

"مہاراجہ دسرتھ کی بیقراری"

بالک تھے رام دشت نوردی کے دن نہ تھے

بچے ابھی تھے بادیہ گردی کے دن نہ تھے

[illegible] کو [illegible] سہے [illegible]

[illegible] بھی [illegible] کے [illegible]

"سیتا جی کی گریہ وزاری"

مجھ سے شب فراق میں تڑپا نہ جائے گا

روز سیاہ ہجر کا دیکھا نہ جائے گا

گھر میں جو چھوڑ جاؤ گے سیتا غریب کو

پاؤ گے بن سے آ کے نہ جیتا غریب کو

صورت تمہاری دیکھ کے غم بھول جاؤں گی

صحرا کے سارے رنج و الم بھول جاؤں گی

منشی نرائن پرشاد بدایونی مرحوم نے "پرتاپ بانکا" کو

مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں نظم کیا تھا جو مرحوم کی یہ مثنوی

امیر الاقبال پریس بدایوں سے ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی تھی جو بحر

کی اس مثنوی میں بڑی روانی ہے لیکن ادبی حیثیت سے اس کا

مقابلہ "گلزار نسیم" "سحر البیان" اور پیام ساوتری سے نہیں کیا جا سکتا

لیکن پھر بھی یہ مثنوی ادبی حلقوں میں مقبول ہے جنوماں جی

سیتا جی کی تلاش میں اشوک واٹکا میں گھوم رہے ہیں چند

اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہر گُو سے جا کے پوچھا	ہر ذرہ کی دھوپ میں ڈھونڈا
نرگس سے لطف اٹھا کے پوچھا	سوسن کو تسمہ ملا کے پوچھا
بلبل نے ہزار کی رسائی	نکہت دھن کی بات آئی
غنچہ نہیں کوئی کھلاتا	پتا بھی نہیں پتہ بتاتا
ہر پھول ہے خاک جو ہیاں پر	تب بھی چمن کا پاسبان ہر
آساں نہیں ہے جو ساقی	مشکل ہے خیال کی ملاقی

منشی جواری لال شعلہ نے مریادا پرشوتم بھگوان رام

چندر کے حالات کو اپنے ایک مسدس "[illegible]" میں نہایت

ہی خوب صورتی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ ان کا یہ مسدس ادبی

ادب میں ایک شعری شاہکار ہے۔ سیتا جی رام چندر جی کے

ساتھ بن جانے کے لیے اصرار کرتی ہیں [illegible]

ہو رام رہ [illegible] کر نہ پائی ہوں [illegible]

[illegible] سیتا جی [illegible] ہے
[illegible] ہے ہیں تو آنکھ کی آنکھوں کے دل پر کیا گزرتی ہو

[illegible] بدن دشمن سے گر کے رہ گئیں
نکلی نہ جان پتلیاں پھر کے رہ گئیں

شعر [illegible] کی کیفیات کی آئینہ داری دیکھیے:

چہروں کو دیکھ آنا آتش ہو گئی
آخر باد کے زباں بند ہو گئی

بن باس کے زمانے کے رام چندر جی سیتا جی اور لکشمن جی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اسے ملاحظہ کیجیے۔

رام اور لکشمن کے ساتھ میں سیتا جی یوں رواں
جس طرح برہم و جیو کے مایا ہو درمیاں
یوں یہ بہ جانکی تھیں مہ خور کے بیچ میں
جیسے ہو پریم بھگت اور ایشور کے بیچ میں

شری رام چندر جی لکشمن جی اور سیتا جی کو سرجو ندی کو پار کرنا ہے اور کشتی کا انتظار ہے شفق صاحب نے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

بے تاب کر رہے ہیں جو بر بہانہ ہجر کو پار
اپنے لیے ہے آج انھیں کشتی کا انتظار
چل مارتے ہی ناؤ کنارے پہ آ لگی
ابرو کی طرح کشتی اشارے پہ آ لگی

بن باس میں سیتا جی سے بن کی باسی عورتیں ان کا حال دریافت کرتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ یہ دو جواں مرد جوان کے ہمراہ ہیں کون ہیں سیتا جی فرماتی ہیں ؎

دیور لکشمن کو [illegible] میں بتلا کے رہ گئیں
[illegible] کا تا تا پوچھا تو مسکا کے رہ گئیں

[illegible] شری رام چندر جی سیتا جی اور لکشمن [illegible] کے ساتھ کیا تھا ؎

[illegible]
[illegible]

جناب [illegible] کی جدید اردو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے راماین کے کئی حصوں کو نظم کیا ہے پریم کا تحفہ یا بھیلنی کے بیر ان کی شاہکار نظم ہے جس کا ترجمہ ہندوستان کی کئی علاقائی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ شری رام چندر جی بھیلنی کے جھونپڑے پر پہنچتے ہیں اور بھیلنی عقیدت کے ساتھ ان کو بیر پیش کرتی ہے اس واقعہ کو شاعر نے یوں نظم فرمایا ہے۔

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا
وارفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا
دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا

ڈوبے ہوئے تھے بیر محبت کے جوس میں
خود پریم کے ساگر بھی ہوئے پریم کے بس میں

ہے رسم محبت کی زمانے سے نرالی بھگتی کبھی تاثیر سے رہتی نہیں خالی
منظور کیا رام نے یہ تحفۂ عالی بنیاد جہاں میں یہ محبت کی ڈالی

اے کاش جھوٹوں کو کھٹے ہم بھی بتائیں
اس پریم کے افسانے کو آدرش بنائیں

روش امادی کا شمار صف اول کے شعرا میں کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی فضا اور ہندی ماحول سے ان کی نظمیں بھرپور ہیں۔ ان میں "رخصت بال" "چترکوٹ" اور "شکتی پوجا" ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ شری رام چندر جی، لچھمن جی اور جانکی جی کے ساتھ جنگل کو روانہ ہوتے ہیں اور چترکوٹ پہنچ کر ایک جگہ مقیم ہیں دور سے کچھ غبار اٹھتا ہوا نظر آتا ہے لچھمن جی رام چندر جی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

گرد غبار دیکھ رہے ہیں حضور کچھ تھوڑی نہیں اب نور کچھ
شک ہے کہ آج قطرہ ہے ضرور کچھ نیت میں آ گیا ہے جبر کا فتور کچھ
اس کا سوا جنگ کے انجام کچھ نہیں
اک قافلہ کا دشت بیاباں میں کام کچھ نہیں

شری رام چندر جی لچھمن جی کو جواب دیتے ہیں کہ آپ کا خیال غلط ہے۔

[illegible]

جگنو سے جیسے آگ کا جلنا محال ہو
اہلِ وفا کے قول کا ٹلنا محال ہو
مغرب سے آفتاب نکلنا محال ہو
لچھمن! یونہی بھرت کا بدلنا محال ہو

بھائی کہاں جہاں میں ایسے وفا شعار
یوں ہو کے بدگماں نہ ہو تم گناہ گار

بھرت جی کا سمہ جب ختم ہوتا ہے اور وہ چترکوٹ میں اپنے بھائی کے قریب آتے ہیں اور انھیں بن باسیوں کے روپ میں دیکھتے ہیں تو جب غمگین ہو جاتے ہیں۔ بھائی کو بھائی سے کیسی محبت و الفت ہوتی ہے اسے کہنے والے [illegible] اس موقع کے چند بند ملاحظہ ہوں:

یہ دیکھ کر بھرت کو ہوا اس قدر ملال
[illegible] کہ جان برادر کیا ہے حال
دیکھے وہ آپ جو [illegible]
اور موہ لی [illegible] تحفہ و القعان

[illegible]
[illegible] واسطے

[illegible] ہوئے جو محبت [illegible]
[illegible] سے برادر کو دوڑ کر
[illegible]
[illegible] تصویر [illegible]

[illegible]
[illegible] بند ہو گئی

حضرت منور لکھنوی نے والمیکی رامائن کا اردو ترجمہ سنت سنگھ اینڈ سنز لاہور کے لیے کیا تھا جو ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ترجمہ میں منور صاحب نے اسلوب اور زبان کا خاص خیال رکھا ہے اب ان کا ترجمہ نایاب سا ہو گیا ہے۔ منور صاحب نے رام کتھا کے نام سے منظوم رامائن لکھنا شروع کیا تھا لیکن یہ ان کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکی۔

جناب بریلوی کی ایک سیف امر کہانی کے نام سے ۱۹۵۲ء میں آکاش بانی آفس بہاری پور بریلی سے شائع ہوئی ہے۔ امر کہانی میں واقعات تو رامائن ہی کے ہیں لیکن ان کی ترتیب اور تکنیک مصنف کی اپنی چیز ہے۔ یہ منظوم افسانہ تکنیک کے اعتبار سے جدید افسانوی ادب میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ امر کہانی کی سب سے بڑی خوبی اس کا غیر معمولی اختصار ہے۔

رامائن جیسے طویل قصہ کو بے کم و کاست چند صفحات میں بیان کر دینا بجائے خود ایک ادبی معجزہ ہے۔ دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور اس خوبی کے ساتھ کہ تمام لہریں اپنی جگہ پر ثابت ہیں۔ قوتِ منظر نگاری تو جیسے جناب کا حصہ ہی ہے مگر اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی منظر مقامی رنگ سے عاری نہیں ہے۔ "پاتال وجے" کے دو بند ملاحظہ ہوں:

[illegible] آئینہ در نقاب
ہوتی تھی جو نبا بلیہ سے آب آب
[illegible] پردہ سحاب
جو ناپتا تھا آب کو شرمندہ حجاب

[illegible] مہر جہاں تیر کی طرح
چمکی [illegible] کے آنکھ میں [illegible] کی طرح

[illegible] موت کے [illegible]
[illegible] دریا سے پاس [illegible]
سلطان [illegible]
[illegible] تو کیسر ہوا تسلیم

[illegible]
[illegible] آسماں کی سمت تھا سیلاب نور کا

علامہ [illegible] کی نظمیں "سوامی رام تیرتھ" "گرونانک" اور "رام" اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔

منشی دیبی پرشاد [illegible] کے شاگرد [illegible] نے رامائن منظوم اردو کو دو حصوں میں ۱۹۱۲ء میں مطبع جگدیش پرس میناپوری سے شائع کرایا تھا۔ ان کی یہ رامائن بہت مقبول ہوئی۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کوئی [illegible] کر کہتا تھا وہ جان اجودھیا تھے
کوئی سر پھوڑ کر کہتا تھا وہ مالک اجودھیا تھے
کوئی گھبرا کے کہتا تھا وہ جاتے ہیں چلو دیکھو
کوئی بھپتا کے کہتا تھا نہ جانے دو ذرا دیکھو
کوئی کہتا تھا اب دنیا میں جینے کا مزہ کیا ہے
جو یہ جان حزیں تن سے نکل جائے تو اچھا ہے
کوئی کہتا تھا وہ شاہ اودھ کو دل سے پیارے تھے
کوئی کہتا تھا کوشلیا کے بھی آنکھوں کے تارے تھے
شہنشاہ اودھ کے دل کو اب چین آئے گا کیونکر
جگر آرام کو شلیا کا کیسے پائے گا کیونکر

دکھائی خوب ہے ، اجاگر کے پردوانوں نے کیفیت
سمجھ میں کیکئی رانی کے بھی اب آ گئی حکمت

ہمارے صوبہ ناتھ بلی فراقیؔ دریابادی مرحوم نے ۱۹۳۲ء میں "مریادا پرشوتم بھگوان رام چندر کی خدمت میں "نذرِ فراقیؔ" کے نام سے ایک کتاب اعلیٰ پریس دہلی سے شائع کرائی تھی۔ اس مجموعہ میں رام جی پر غزلیں، رباعیات اور مخمس ہیں۔ تلسی داس کی رامائن کا منظوم ترجمہ بھی آپ نے مسدس میں نظیرؔ کے رنگ میں کیا تھا۔ رام جی پر ایک غزل ملاحظہ فرمائیے:

لے تو، حضرت کے ہمارے بادشاہ کا تخت	یا کبھی او کہتے ہیں پشت و پناہ کا ساتھ
لاؤ دشرت کے نیر معلوم قد کو بھی	سیرت جلووں سے کر دی جلوہ گاہ کا ساتھ
کوئی پوچھے بسی آنکھوں سے ...	نام و سیتا ... کا ساتھ

اے فراقیؔ ربط کی صورت نظر آتی نہیں
راہ میری اور ہے ... اور راہ کا ساتھ

حضرت جگر بریلوی کا شمار ہندوستان کے صفِ اوّل کے اساتذہ سخن میں ہوتا ہے اور اردو کی کلاسیکل شاعری کی آبرو آپ سے قائم ہے۔ آپ کی شاہکار مثنوی پیامِ ساوتری شائع ہو چکی ہے جس کو ہمارے نقادوں اور ادیبوں نے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ تسلیم کیا ہے۔

"رنگ و بو" کے نام سے آپ کی تین مثنویات کا مجموعہ ۱۹۵۳ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔ اس میں "پریم کہانی" کے نام سے آپ نے شری بھیلنی کے حالات کو مثنوی میں نظم کیا ہے۔ بڑی سلاست اور روانی ہے۔ شبری کو بھگوان رام چندر نے خود جا کر درشن دیے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہوا محبوبِ جاں کا جب دیدار	تھی سے انبساط سے سرشار
نہ رہا ہوش تن بدن کا اسے	نہ رہا ہوش پیرہن کا اسے
دھوم اٹھیں دیکھ کر جانے لگی	ناچنے گانے کھلکھلانے لگی
متبسم تھے دیکھ کر یہ رام	امرتوں کا چھلک رہا تھا جام
کہا لچھمن نے اس سے اے شبری	ناچتی ہی رہے گی کیا یوں ہی

جلوہ فرما ہیں سامنے بھگوان	دیکھ تو تو کہاں ہے تیرا دھیان

منشی منی لال جوان سندیلوی شاگردِ رشید آرزو لکھنوی نے "رام بن باس" کے نام سے اپنا اردو مسدس دو سال پہلے ہندی زبان میں شائع کرایا تھا۔ جوان صاحب کا مسدس "رام بن باس" اردو شاعری میں ایک یادگار کارنامہ ہے۔ ابھی کتاب ابھی تک اردو میں شائع نہیں ہوئی ہے۔

تلسی داس جی کے رام چرت مانس کو اردو کے قابلِ ذکر مصنف منشی شیو برت لال ورمن نے لاہور سے اردو نثر میں شائع کیا تھا۔ حضرت منور لکھنوی نے اس ترجمہ کے بارے میں رسالہ صبح دہلی میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اسے ایک عدیم المثال اور جاودانی شہرت رکھنے والا کارنامہ بتایا ہے۔

منشی بانکے لال بہار نے ۱۸۸۹ء میں مطبع نول کشور پریس لکھنؤ سے رامائن کا اردو نظم میں خلاصہ پیش کیا ہے۔ شاعری کی خوبیاں اس نظم میں قابلِ داد ہیں۔

بلبل تلوک چند محروم نے رامائن کے کئی سین نظم کیے تھے جن سے استادانہ شان ٹپکتی ہے۔

ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے رام کی عظمت پر کئی نظمیں لکھی ہیں جو ہمارے ادب میں ایک عمدہ اضافہ ہیں۔ نظم "رام کی عظمت" کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مدار اے رام تیرے راج پر ہے تیری عظمت کا
وہ کس سے ہو سکا جو ہو گیا تیرے زمانے میں
کہیں تاریخِ عالم میں نظیر اس کی نہیں ملتی
زمانے کا بھلا جتنا ہوا تیرے زمانے میں
بڑی راحت بڑے آرام سے سب لوگ رہتے تھے
کوئی فتنہ بپا ہوتا نہ تھا تیرے زمانے میں
زبردستوں کے ہاتھ اٹھتے نہیں تھے زیردستوں پر
نہیں ہوتا تھا ظلم ناروا تیرے زمانے میں
یہ الفت اور یگانگت وقت میں شیر اور بکری نے
ہم اک گھاٹ پر پانی پیا تیرے زمانے میں

★

ہندوستان کی آزادی کے پچیس سال

محمد ہاشم قدوائی

پونے دو سو سال کی طویل، جاں گسل اور روح فرسا غلامی کے بعد ہندوستان کو دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت یعنی برطانوی استعمار کے پنجۂ غضب سے مہاتما گاندھی کی قیادت میں گلوخلاصی حاصل ہوئی۔ آزادی کی اس منزل تک پہنچنے میں ملک کو بے شمار قربانیاں دینا پڑیں اور نہ معلوم کتنے سرفروشان وطن نے آزادی کے لیے اپنی جانیں تک نچھاور کر دیں۔

جس وقت ملک آزاد ہوا تو بہت سارے مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف لاکھوں پناہ گزیں تھے جو پاکستان کی نوزائیدہ مملکت سے بھاگ کر ہندوستان آ گئے تھے۔ دوسری طرف ضبط و نظم کا زبردست مسئلہ تھا۔ تیسری طرف احیاء پرست (REVIVALIST) فرقہ پرست جماعتوں نے سر اٹھایا اور مذہبی حکومت کے قیام کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ چوتھی طرف ہندوستانی ریاستوں کا مسئلہ تھا۔ ان میں سے بعض مکمل آزادی کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ انتظامی مشنری کا حال بھی بہت ابتر تھا۔ یہ فرقہ وارانہ ذہنیت سے پوری طرح سے مسموم ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستانی معیشت (ECONOMY) کو بھی بحال کرنا تھا کیونکہ بغیر معاشی استحکام کے سیاسی آزادی بے معنی تھی۔ سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ تھا کہ ملک میں ایک مستحکم حکومت قائم کی جائے جو ملک کی وحدت کو برقرار رکھ سکے، قوم پروری کو مضبوط کیا جا سکے اور ملک کا ایسا دستور مرتب کیا جائے جو سارے ملک کو ایک رشتے میں پرو سکے اور ہندوستان کی اس امتیازی خصوصیت کے باوجود مذہبی، نسلی، لسانی اور تمدنی اختلافات کے ملک کے سارے باشندے ہندوستانی قومیت کا جزو لاینفک ہیں اور ہندوستان میں پوری طرح قائم اور برقرار رکھا جائے۔

ملک کی بدقسمتی تھی کہ آزادی کے چند ہی مہینوں کے بعد یعنی ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو اسے اپنے سب سے بڑے رہبر گاندھی جی سے محروم ہونا پڑا۔

ملک کی خوش قسمتی تھی کہ آزادی کے بعد ۱۷ برس تک اس کی قیادت جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں رہی جن کی سی عظیم، متنوع صفات اور جلیل القدر ہستی کہیں جا کر صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کی قیادت میں ملک نے ہمہ جہتی ترقی کی اور آج تک اس ترقی کا سلسلہ جاری ہے۔

دستور ساز اسمبلی نے نومبر ۱۹۴۹ء میں غیر مذہبی جمہوری دستور کو منظور کیا جس کا نفاذ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے ہوا جس کی رو سے دنیا کی سب سے بڑی پارلیمنٹری جمہوریت کا قیام عمل میں آیا اور جمہوریہ ہند 'انڈین یونین' کے نام سے معرض وجود میں آئی۔ دستور نے سارے ہندوستانیوں کو بلا تمیز یا تخصیص یا تفریق مذہب و ملت و جنس و زبان ہندوستانی قومیت اور شہریت کے یکساں حقوق عطا کیے۔ اور ان کو انتظامیہ یا مقننہ کی چیرہ دستیوں اور زیادتیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے بنیادی حقوق دیے اور ان کو اس کا بھی حق عطا کیا کہ ان کے ان حقوق پر کسی قسم کی کوئی آنچ آئے تو وہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں اس کے خلاف چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔ اس طرح جملہ ہندوستانی شہریوں کی شہری اور سیاسی آزادی کا مکمل تحفظ کیا گیا۔

دورِ غلامی میں ہندوستان دو حصوں میں منقسم تھا۔ آبادی کے لحاظ سے ملک کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ مطلق العنان اور مستبد راجاؤں اور مہاراجاؤں کے زیرِ نگیں تھا اور ہندوستان کے اس حصے کے بدنصیب باشندوں کو شہری آزادی مطلق حاصل نہ تھی۔ آزادی کے حصول کے چند مہینوں کے بعد ان تمام ریاستوں کو بڑے تدبر کے ساتھ یا تو سابق برطانوی ہند کے صوبوں کے ساتھ ضم کر دیا گیا یا متعدد ریاستوں کو ملا کر یونین بنا دی گئی مثلاً راجپوتانہ کی سب ریاستوں کی یونین راجستھان اور دیگر اور کاٹھیاواڑ کی ریاستوں کی یونین سوراشٹر کے نام سے موسوم کی گئی اور چند بڑی ریاستوں کو علاحدہ انتظامی وحدت کی شکل دی گئی۔ مثلاً حیدرآباد اور کشمیر۔ اسی طرح سے [illegible]

غلامی کی اس دوئی کو دور کیا گیا اور سارا ملک انتظامی طور سے ایک کر دیا گیا۔ راجاؤں مہاراجاؤں کی مطلق العنانی کا خاتمہ کر دیا گیا، اور ان ریاستوں میں بھی جمہوری نظامِ حکومت قائم کر دیا گیا۔ چونکہ برطانوی عہدِ حکومت میں صوبے تمام تر انتظامی مصلحتوں کی بنا پر قائم کیے گئے تھے، اس لیے ان کی حد بندی سائنٹفک نہ تھی اور ان میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس خرابی کو ۱۹۵۶ء کو ریاستی تنظیمی ایکٹ کی رو سے بڑی حد تک ریاستی تنظیمی کمیشن کی سفارشوں پر مبنی تھا دور کیا گیا اور زبان کی بنیاد پر ریاستیں قائم کی گئیں۔ اس قسم کی تنظیم کا سلسلہ بعد تک جاری رہا۔ چنانچہ اب ملک میں ۲۱ ریاستیں ہیں۔ انتظامی وحدتیں قومی اتحاد کو استوار کرنے میں بہت زیادہ معین ہوئیں۔

دستور کے ماتحت ۱۹۵۲ء میں دنیا کا سب سے بڑا جمہوری انتخاب ہوا اور ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں یعنی لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے ہزاروں ممبر منتخب ہوئے۔ آزادی کے ان ۲۵ برسوں میں اب تک ۵ عام انتخابات ہو چکے ہیں اور بہ حیثیتِ مجموعی یہ سارے انتخابات بڑے پر امن ہوئے۔

ہندوستانی معیشت (ECONOMY) کو بحال کرنے کے لیے ملک کو معاشی اعتبار سے مضبوط کرنے اور اسے سرمایہ داری کے نظام کے مفاسد سے محفوظ رکھنے کے لیے پنج سالہ منصوبے بنائے گئے۔ پلاننگ کمیشن کا تقرر عمل میں آیا اور اب پانچواں منصوبہ زیرِ غور ہے۔ ان منصوبوں کی وجہ سے ملک کی پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہوا اور قومی دولت و خوش حالی میں بھی اضافہ ہوا۔ صنعتی اعتبار سے ملک میں اتنی زیادہ ترقی ہوئی ہے کہ اس کا دورِ غلامی سے مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ دورِ غلامی میں مشین کے معمولی یا چھوٹے پرزے تک باہر کے ملکوں سے منگوائے جاتے تھے اور اب ۲۵ سال کی اس قلیل مدت میں بھاری بھاری دیو پیکر مشینیں، ہوائی جہاز، بحری جہاز، ریلوں کے ڈبے، مال گاڑیوں کے انجن، موٹر کاریں، سارا جنگی سامان، بجلی کا سامان سب ملک میں تیار ہونے لگا ہے۔

جواہر لال نہرو کی قیادت میں جمہوریۂ ہند نے امن و آشتی اور غیر جانبداری کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر امتیازی پوزیشن حاصل کر لی۔ اس نے اپنے کو روسی اور امریکن بلاکوں سے الگ رکھا اور اس طرح سے دنیا کو تیسری عالمی جنگ سے محفوظ رکھا۔ اس کی قیادت میں ایشیا اور افریقہ کی نئی آزاد قوموں کے بلاک کا قیام اور اقوامِ متحدہ میں عمل میں آیا جو عمل کے ساتھ ساتھ غیر جانبداری کا قائل ہے۔ نہرو کے بعد موجودہ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں جمہوریۂ ہند اسی بنیادی پالیسی پر گامزن ہے کہ دوسرے ملکوں کی آزادی اور علاقائی سالمیت کا احترام کیا جائے، ان کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیا جائے، بقائے باہم کے اصولوں پر عمل کیا جائے اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ چنانچہ جب پچھلے سال بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجوں نے مظالم ڈھائے اور وہاں ایک کروڑ سے زیادہ مظلوم افراد پناہ لینے ہندوستان آئے تو ہندوستانی حکومت نے ان مظلوموں کے ساتھ پوری پوری ہمدردی کی اور جب پاکستانی مظالم کی حد نہ رہی تو ہندوستان نے بنگلہ دیش کی عملاً مدد کی اور بالآخر بنگلہ دیش آزاد ہو گیا اور اس طرح سے ہندوستان کے ہاتھوں استعماریت کو زبردست شکست اٹھانا پڑی۔

ان پچیس برسوں میں ہندستان نے جو ہمہ جہتی ترقی کی اس کا
بہت ہی سرسری جائزہ ان اعداد و شمار سے لیا جا سکتا ہے۔

دورِ غلامی میں ہندستانیوں کی اوسط عمر ۳۲ سال تھی۔
۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں یہ ۴۳ سال ہو گئی اور اب یہ تقریباً
۴۸ سال ہے۔

انگریزی عہدِ حکومت میں شرحِ اموات ۲۷.۴ فی ہزار
تھی لیکن ۱۹۶۹ء میں یہ شرح گھٹ کر ۱۴ فی ہزار رہ گئی
یعنی بقدر نصف کے رہ گئی۔

دورِ غلامی میں ملک میں خواندگی کا اوسط ۱۰ فی صد سے زیادہ
نہ تھا یعنی پورے دو سو سال کی حکومت میں برطانوی حکومت
۱۰ فی صد سے زیادہ ہندستانیوں کو خواندہ نہ بنا سکی لیکن آزادی
کے صرف ۲۵ برسوں میں خواندگی کا اوسط بڑھ کر ۲۹.۴۶ فی صد
ہو گیا۔ آزادی کے ۴ سال بعد یعنی ۱۹۵۰-۵۱ء میں سارے ملک
میں تعلیمی اداروں کی کل تعداد ۲۸۶۸۰۰ تھی۔ ۱۹۶۵-۶۶ء میں
یعنی ۱۵، ۱۶ سال میں یہ تعداد دگنی سے زیادہ یعنی سات لاکھ
پچپن ہزار چورانوے ہو گئی۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں طلباء کی کل تعداد
دو کروڑ پچپن لاکھ سینتالیس ہزار تھی۔ ۱۹۶۶-۶۷ء میں یہ تعداد بڑھ کر
۷ کروڑ چھبیس لاکھ انہتر ہزار ہو گئی یعنی ان میں تگنی سے
زیادہ کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۵۰-۵۱ء میں اساتذہ کی کل تعداد
۸ لاکھ چار ہزار تھی لیکن ۱۹۶۶-۶۷ء میں یہ تعداد تقریباً تگنی یعنی
بائیس لاکھ بائیس ہزار ہو گئی۔ اسی طرح ۱۹۵۰-۵۱ء میں ہائر
سکنڈری اسکولوں کی تعداد بیس ہزار آٹھ سو چوراسی تھی جو ۱۹۶۶ء
میں بڑھ کر ایک لاکھ آٹھ ہزار سات سو چھیالیس ہو گئی۔ ۱۹۵۰-۵۱ء
میں سارے ملک میں کل ستائیس یونیورسٹیاں تھیں۔ ۱۹۷۰ء
میں یہ تعداد تگنی ہو گئی یعنی اکیاسی ہو گئی۔

آزادی کے ۴ سال بعد یعنی ۱۹۵۱-۵۲ء میں اعلیٰ صنعتی تعلیم
کے اداروں کی کل تعداد ترپن تھی اور ڈپلوما دینے والے اداروں کی
تعداد نواسی تھی لیکن ۱۹۷۰ء میں ڈگری دینے والے اداروں کی
تعداد بڑھ کر ۱۳۶ اور ڈپلوما دینے والے اداروں کی تعداد ۲۷۰ ہو گئی۔

۱۹۵۱ء میں ڈگری لے کر نکلنے والے طلباء کی تعداد دو ہزار چھ سو
ترانوے اور ڈپلوما پانے والوں کی تعداد دو ہزار چھ سو چھتیس تھی
یہ تعداد ۱۹۷۱ء میں بڑھ کر بالترتیب پندرہ ہزار سات سو
اور اکیس ہزار ساڑھے سات سو ہو گئی۔

آزادی پر صحت عامہ کے سلسلے میں بہت بڑی کمی ڈاکٹروں
اور نرسوں کی محسوس کی گئی چنانچہ اس کمی کو فوراً دور کرنے کے لیے
جو اقدامات کیے گئے ان کے نتیجے میں ۱۹۶۹ء میں سارے
ملک میں ڈاکٹروں کی تعداد بڑھ کر ایک لاکھ نو ہزار اور نرسوں کی
تعداد تقریباً ستّر ہزار ہو گئی۔ اسی طرح میڈیکل کالجوں کی تعداد
میں اضافہ ہوا اور ۱۹۷۱ء میں ملک بھر میں پچانوے میڈیکل کالج
اور پندرہ دانتوں کے کالج تھے

تقسیم کے بعد ہندستان کو زبردست غذائی بحران کا سامنا
کرنا پڑا کیونکہ بعض زرخیز علاقے مثلاً گیہوں کی پیداوار کے علاقے پاکستان
میں چلے گئے اور چاول کے علاقے سابق مشرقی پاکستان میں چلے گئے
ادھر آبادی میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کا سلسلہ اب تک
جاری ہے اس لیے مجبوراً کروڑوں بلکہ اربوں روپیے باہری ملکوں
سے غلہ منگوانے پر صرف کرنا پڑتا تھا چنانچہ امریکہ سے لاکھوں ٹن
غلہ منگوایا جاتا تھا۔ اس دشواری پر فوری طور سے قابو پانے کے لیے
باہری ملکوں سے کافی مقدار میں غلہ منگوانا پڑا۔ لیکن اسی کے
ساتھ ملک کو غذائی اعتبار سے خود کفیل بنانے کی بھرپور کوشش
جاری رہی۔ پنج سالہ منصوبوں میں زراعت اور غذائی پیداوار
بڑھانے پر زور دیا جاتا رہا۔ اسی کے ساتھ کاشتکاری کے جدید ترین
اور سائنٹفک طریقے اختیار کرنے اور عمدہ بیج، ٹریکٹر اور اچھی کھاد
فراہم کرنے کی جانب خصوصی توجہ کی گئی۔ اسی ضمن میں کھاد تیار
کرنے کے کئی بڑے کارخانے حکومت نے قائم کیے ہیں۔ چنانچہ
ٹریکٹر ہزاروں کی تعداد میں استعمال کیے جا رہے ہیں ان سب
تدبیروں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے
اور بعض اشیاء کی پیداوار میں خود کفیل ہو گیا ہے یا خود مکتفی
ہونے کے قریب آ گیا ہے اس لیے اب دوسرے ملکوں سے غلہ

کم مقدار میں منگوایا جاتا ہے سنہ ۱۹۶۳ء میں چونسٹھ لاکھ پچاس ہزار ٹن چاول باہر سے منگوایا گیا تھا سنہ ۱۹۷۰ء میں یہ مقدار ۲ لاکھ ۹۰ ہزار ٹن رہ گئی۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں ۵ کروڑ باسٹھ لاکھ دس ہزار ٹن گیہوں اور آٹا منگوایا گیا تھا لیکن سنہ ۱۹۷۰ء میں ۳ کروڑ ساڑھے بیالیس ہزار ٹن منگوایا گیا۔ سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں چاول کی کل پیداوار ۲ کروڑ چہتر ہزار ٹن تھی سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں یہ بڑھ کر ۴ کروڑ ۴ لاکھ تیس ہزار ٹن ہو گئی۔ گیہوں کی پیداوار بڑھ کر ۲ کروڑ ترانوے ہزار ٹن ہو گئی۔ اسی طرح سے اس مدت میں جوار، باجرہ اور چنے کی پیداوار علی الترتیب ۵۴ لاکھ پچانوے ہزار ٹن سے بڑھ کر ۹۷ لاکھ ۲۱ ہزار ٹن، ۲۵ لاکھ ۹۵ ہزار ٹن سے بڑھ کر ۵۳ لاکھ ۲۷ ہزار ٹن ہو گئی اور ۳۶ لاکھ ۱۵ ہزار سے بڑھ کر ۵۵ لاکھ ۶۴ ہزار ٹن ہو گئی۔ چائے اور کافی کی پیداوار علی الترتیب سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء کی ۲ لاکھ چھہتر ہزار اور پچیس ہزار ٹن سے بڑھ کر ۳ لاکھ چھیانوے ہزار ٹن اور ۶۳ ہزار ٹن ہو گئی۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں دس ہزار سے کم آبادی والے جن قصبوں میں بجلی پہنچی ان کی تعداد تین ہزار سات سو پچیس تھی مارچ سنہ ۱۹۷۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر نوے ہزار تین سو تراسی ہو گئی۔ دس ہزار سے زیادہ اور ۵۰ ہزار سے کم آبادی والے جن شہروں میں بجلی پہنچی ان کی تعداد سنہ ۱۹۵۱ء میں چھ سو اٹھانوے تھی۔ مارچ سنہ ۱۹۷۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۲ ہزار چھتیس ہو گئی۔

سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں کوئلہ کی پیداوار ۳ سو اٹھائیس لاکھ ٹن تھی۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں یہ دوگنے سے زیادہ ہو گئی۔ اس سال لوہے کی پیداوار تیس لاکھ ٹن تھی سنہ ۱۹۶۹ء میں یہ بڑھ کر ۲ کروڑ سات لاکھ ٹن ہو گئی۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں فولاد کی پیداوار ۱۴ لاکھ ۴ ہزار ٹن تھی سنہ ۱۹۶۹ء میں اس میں تعداد ساڑھے چار گنا اضافہ ہوا یعنی اب ۶۳ لاکھ تین ہزار ٹن ہو گئی۔ المونیم کی پیداوار سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۴۰ ہزار ٹن تھی سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں یہ بڑھ کر ۱ لاکھ ۳۵ ہزار ٹن ہو گئی۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں ملوں میں تین سو نو ملین میٹر سوتی کپڑا تیار ہوا۔ سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں اس کی مقدار بڑھ کر ۳ ہزار ۷۰۰ ہو گئی۔ سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں شکر ملوں کی تعداد ایک سو اڑتیس تھی۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں یہ بڑھ کر دو سو سات ہو گئی۔ سنہ ۴۶-۱۹۴۵ء میں شکر کی پیداوار ۹ لاکھ اڑتیس ہزار ٹن تھی۔ سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں اس میں چوگنے سے زیادہ کا اضافہ ہوا یعنی یہ بڑھ کر ۴۲ لاکھ ۱۶ ہزار ٹن ہو گئی۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں ملک میں سیمنٹ کی پیداوار ۱۴ لاکھ ۷۰ ہزار ٹن تھی۔ سنہ ۷۱-۱۹۷۰ء میں یہ بڑھ کر ایک سو ۴۳ لاکھ ٹن ہو گئی یعنی ۲۵ برسوں میں اس کی پیداوار میں دس گنا اضافہ ہوا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں کاغذ کے کارخانوں کی تعداد ۱۵ تھی اور یہ کارخانے ایک لاکھ تین ہزار آٹھ سو چار اسی ٹن کاغذ سالانہ تیار کرتے تھے اب ان کارخانوں کی تعداد ۷۵ ہے اور اب کاغذ کی پیداوار بڑھ کر ۷ لاکھ ۶۸ ہزار ٹن سالانہ ہو گئی یعنی اس میں تقریباً ۷ گنے کا اضافہ ہوا۔

سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ہندستانی ریلیں ۵۴ ہزار پانچ سو چھیانوے کیلومیٹر لمبی تھی۔ تقسیم کی وجہ سے مشرقی اور شمالی مغربی حصوں کی ریلوے لائن پاکستان کے حصہ میں جا چکی تھی اور اس طرح کئی ہزار کیلومیٹر کی کمی واقع ہوئی تھی لیکن سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں ہندستانی ریلیں ۵۹ ہزار ۷۹۸ کیلومیٹر لمبی یعنی ان میں تقریباً ۶ ہزار کیلومیٹر کا اضافہ ہوا۔

دور غلامی میں ریلوے انجن سواری یا مال گاڑی کے ڈبے ریلوے انجنوں اور ڈبوں کو اٹھانے والے کرین اور دوسری ساری مشینیں دوسرے ملکوں سے منگوائے جاتے تھے اور ان پر زر کثیر صرف ہوتا تھا لیکن اب ریلوے کا سارا سامان ملک میں تیار ہونے لگا ہے۔ بنگلور اور چترنجن میں اس سامان کی تیاری کے لیے عظیم الشان کارخانے تیار ہیں۔

سنہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں بھاپ سے چلنے والے ریلوے انجنوں کی تعداد آٹھ ہزار ایک سو بیس تھی۔ سنہ ۷۰-۱۹۶۹ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۹ ہزار سات سو ہو گئی اس سال ڈیزل سے چلنے والے انجنوں کی کل تعداد ۱۸ تھی

لیکن ۱۹۶۹ء میں یہ تعداد بڑھ کر ایک ہزار اکیانوے ہو گئی یعنی تقریباً ۲۰ برسوں میں ساڑھے کا اضافہ ہوا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں بجلی سے چلنے والے انجنوں کی تعداد ۷۲ تھی یعنی تقریباً ۲ قرنوں کی قلیل مدت یعنی ۷۰-۱۹۶۹ء میں ۵ سو ۵۲ ہو گئی یعنی آٹھ گنے کا اضافہ ہوا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ریل کے ڈبوں کی تعداد ۲ لاکھ ۵ ہزار ۹۶ تھی۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۳ لاکھ ۸۳ ہزار آٹھ سو اکیانوے ہو گئی بلکہ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۱ کھرب ۸۴ کروڑ افراد نے ریلوے ٹرینوں سے سفر کیا لیکن ۲۰ برس کی مدت یعنی ۱۹۶۹ء میں مسافروں کی تعداد ۲ کھرب ۳۸ کروڑ ہو گئی۔

۱۹۴۷ء میں ہوائی جہاز سے سفر کرنے والوں کی تعداد ۲½ لاکھ تھی۔ ۱۹۷۰ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۲۷½ لاکھ تک پہنچ گئی یعنی ۲۳ برس میں ہوائی جہاز کے مسافروں میں ۱۱ گنا اضافہ ہوا۔

اسی طرح سے ڈاک اور تار کے محکموں میں بے پناہ توسیع ہو گئی۔ ۴۹-۱۹۴۸ء میں ڈاک سے لائی ہوئی کل چیزوں کی تعداد ۲۲۶.۰۰۴ کروڑ تھی۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں اس کی میزان ۶۲۰.۶۱۷ کروڑ ہو گئی۔ ۴۹-۱۹۴۸ء میں سارے ملک میں ٹیلیفون کی کل تعداد ایک لاکھ ۲۰ ہزار تھی۔ ۱۹۶۹ء میں اس میں تقریباً بارہ گنا اضافہ ہوا اور ان کی تعداد ۱۲ لاکھ ۷۰ ہزار ہو گئی۔ ۴۹-۱۹۴۸ء میں ڈاکخانوں سے دو کروڑ ۱۷ لاکھ تار بھیجے گئے۔ ۷۱-۱۹۷۰ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۴ کروڑ ۹۳ لاکھ ہو گئی۔ ۱۹۵۰ء میں ملک بھر میں ۳۶ ہزار ۹۴ ڈاک خانے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں اس تعداد میں بقدر ۳ گنے کا اضافہ ہوا یعنی ان کی تعداد بڑھ کر ۱ لاکھ ۴ ہزار ۹ سو چھپن ہو گئی۔

جمہوریہ ہند اس پر سختی سے عامل ہے کہ دنیا میں امن و امان رکھنے کی کوششوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے اور کسی ملک کے اندرونی معاملہ میں مداخلت نہ کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندستان کی علاقائی سالمیت پر آنچ نہیں آنے دیتی اور ملک کی سرزمین کی ایک ایک انچ کی حفاظت کے لیے کمربستہ رہتی ہے اسی لیے ملک کے دفاع پر خاصی توجہ کی گئی ہے اور دوسرے ملکوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے اصول پر عمل درآمد ہے اسی لیے جنگی سامان ملک میں تیار کیا جانے لگا ہے۔ دفاعی مسئلوں پر ماہرین فن کی تحقیقات سے پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور جنگ کے جدید ترین طریقوں کو اپنایا جاتا ہے اور ہندستانی فوجوں کو جدید ترین اسلحوں سے مسلح کیا جاتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ بنگلہ دیش کی جنگ کے موقع پر پاکستان کے مقابلے میں اتنی نمایاں کامیابی حاصل کی۔

پنڈت نہرو اور ان کے بعد ان کی لائق جانشین مسز اندرا گاندھی کو اس کا پورا احساس ہے کہ ملک کی ساری معاشی و صنعتی ترقی بے معنی و بیکار ہے اگر اس سے ہندستانی عوام کو فائدہ نہ پہنچے اسی لیے پنڈت جی کی زندگی میں ہی کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۱ جنوری ۱۹۵۵ء میں یہ فیصلہ کیا کہ اس کا نصب العین ہندستان میں اشتراکیت کا قیام ہے اور اس کے بعد حکومت کی ساری پالیسیوں کا بھی محور یہی شعور قرار پایا کہ ہندستانی عوام کو معاشی خوشحالی کے فائدے حاصل ہوں اور وہ سرمایہ داروں کے استحصال سے محفوظ رہیں۔

مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں کانگریس جمہوری اشتراکیت لانے کے لیے کوشاں ہے اسی لیے وزیر اعظم نے غریبی ہٹاؤ کا پروگرام ملک کے سامنے رکھا اور سرمایہ دارانہ نظام کے مفاسد کو دور کرنے کے لیے اس قسم کے اقدامات کیے تاکہ ملک میں اشتراکیت آئے لیکن یہ اشتراکیت جمہوری ہو۔ چنانچہ بینکوں کو قومیا یا گیا اور اب شہری، دیہی جائدادوں پر حدبندی کی جا رہی ہے۔ پنڈت نہرو کے زمانہ میں یہ فیصلہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا کہ کلیدی صنعتیں نجی ملکیت میں نہیں بلکہ حکومت کے ہاتھ میں رہیں گی۔ اندرا حکومت کے ترقی پسند اشتراکی اقدامات سے جمہوری اشتراکیت کے لیے میدان اور زیادہ صاف ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ ان اقدامات سے ملک سے غریبی دور ہو گی اور ملک سے وہ دوسری مشکلیں بھی جلد دور ہوں گی جو ترقی کے راستے میں زبردست رکاوٹ اور غیر مذہبی جمہوریت کے لیے زبردست خطرہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ★

آج پھر ہر رنگ کے انساں کو یک رنگ کرو

ہزار لکھنوی

اک نئے دور کا پھر آج سوال آیا ہے
ذہنِ انساں میں پھر اک نیک خیال آیا ہے
پھر نئے ڈھنگ سے تبلیغِ وفا کرنا ہے
حق نئے تازہ تقاضوں کا ادا کرنا ہے
پھر تڑپ لانا ہے یک جہتی و یک رنگی کی
چھاپ باقی ہے ابھی ذہنوں میں افرنگی کی
دل کے آئینوں میں مٹی ہو کدورت اب بھی
عظمتِ صدق و صفا کی ہو ضرورت اب بھی
رنگ اور نسل ہو کیا چھوٹا بڑا کیا شے ہے
دولت و غربت و ثروت کی بلا کیا شے ہے
دیش میں پیدا کچھ اس طرح کا آہنگ کرو
آج ہر رنگ کے انسان کو یک رنگ کرو
صاف دل ہو کے گلے مل کے رہو اچھا ہے
کام اچھا ہو تو کھل ڈُل کے کہو اچھا ہے
آج بھی قلت و کثرت کا سوال آتا ہے
شیشۂ دل میں انھیں بار تو نے بال آتا ہے
وقت کے ساتھ تو ہر ایک کو چلنا ہوگا
صرف ہم ہی نہیں ہم سب کو بدلنا ہوگا

اسپیشل نمبر اگست

گیت نئے دور کا

حیات وارثی

ساتھیو، دوستو! اپنے خیالوں کے رخ کو اب موڑ دو
آزادی کے پھول کھلے ہیں جشن بہاراں کی رت ہے
ارمانوں کے دیپ سجے ہیں جشن بہاراں کی رت ہے
سماج واد کا سورج چمکا اندھکار کو چھوڑ دو
ساتھیو، دوستو!
امن و محبت کے چہرے پر جس سے داغ نظر آئیں
جس میں عداوت کی چھایا ہو اور نفرت کی لکیریں
جو انساں کا روپ بگاڑے اس درپن کو توڑ دو
ساتھیو، دوستو!
دکھ کا اندھیارا چھٹ جائے، سکھ کا اُجیالا چھا جائے
تاج اٹھیں شہروں کی سڑکیں گاؤں کا گلیارا جاگے
اپنی ہمت اور محنت سے جیون کا رخ موڑ دو
ساتھیو، دوستو!
آشاؤں کی کلیاں مہکیں ارمانوں کے پھول کھلیں
الگ الگ راہوں کے راہی آگے اک منزل پہ ملیں
دل کے رشتے ٹوٹ گئے ہیں ان کو پھر سے جوڑ دو
ساتھیو، دوستو!
سورگ سے پیاری دھرتی، سکھ کے پرچم لہرائیں
جو پیاسے ہیں اک مدت سے جام خوشی کے چھلکائیں
عزم و عمل کی تنویروں سے رخ ظلمت کا موڑ دو
ساتھیو، دوستو!
سماج واد کا سورج چمکا اندھکار کو چھوڑ دو!

نیا دور اگست

پچیسواں دور

وشوامبھر پرشاد ماتھر لکھنوی

روشنی پھیل گئی آ گئی گلشن میں بہار — دیکھو پورب سے نکلتے ہوئے سورج کا نکھار
سارے عالم پہ فضا چھا گئی آزادی کی — کلیاں چٹکیں تو مہک آ گئی آزادی کی
جب ہوا سنکی تو گل ریز ترانہ آیا — پھول کے لب پہ محبت کا فسانہ آیا
زندگی ایک نئے روپ میں لہرا کے اٹھی — قوم بھی عظمتِ قومی کی قسم کھا کے اٹھی
نکھرے نکھرے ہوئے بادل جو فضا پر چھائے — گنگا اور جمنا نے الفت کے ترانے گائے
خوں میں ڈوبے ہوئے برباد چمن یاد آئے — آج کی بزم تو احبابِ وطن یاد آئے
باپو کی یاد میں آتی ہوئی آوازِ وفا — وہ بھگت سنگھ کا انجام وہ آغازِ وفا
وہ ہمالہ کی بلندی میں حقیقت کا چلن — وہ نگاہوں کی تجلی میں جواہر کی کرن
نا خدا طوفانوں کی آغوش میں کھینے والے — یاد آتے رہے قربانیاں دینے والے

رنگ مے خانے پہ نکھرا ہوا اور آیا ہے
مے کشو دیکھو تو پچیسواں دور آیا ہے

عشق اور رنگ میں ڈوبی ہوئی راہیں ٹھہریں — آج چھلکے ہوئے ساغر پہ نگاہیں ٹھہریں
جب ترقی کا قدم اٹھا تو آہٹ بدلی — ملک نے اک نئے انداز میں کروٹ بدلی
زندگی رشک بنی سارے زمانے کے لیے — چپے چپے سے غریبی کو ہٹانے کے لیے
قوم بڑھنے لگی قسمت کا ستارہ چمکا — چاندنی پھیل گئی چاند کا چہرہ چمکا
زندگی مدحِ محبت کی خریدار ہوئی — قافلہ بڑھنے لگا تیز جو رفتار ہوئی

متحد قوم رہے قلب ہر اک شاد رہے
یہ تمنا ہے کہ تا حشر وطن آباد رہے

ترادنرد ۱۹۹۰ اشک

یومِ آزادی

شوکت رشوف

ہر ایک سمت چمن میں بہار آئی ہے
کلی چٹک کے پیامِ نشاط لائی ہے

تکن سی پڑ گئی جیسے [illegible] کے ماتھے پر
[illegible] میں ڈولی ہوئی خدائی ہے

[illegible] ایک پھول بہاروں کا [illegible]
[illegible] سینے میں اک [illegible] ہے

نہ جانے کیا تھا [illegible] حیات اب تک
[illegible] مسرت کی [illegible]

[illegible] طرح سے چلی ہے [illegible]
[illegible] کلی میں گلستن کی مسکرائی ہے

ہر ایک قید سے آزاد ہو گئیں سانسیں
بہارِ اہلِ گلستاں کو راس آئی ہے

زمانے بھر کی نگاہیں ہیں کس لیے مشکوک
ہزاروں اشک پیے تو ہنسی بھی آئی ہے

نہ پوچھو کالی سیہ آنکھوں میں کتنی راتیں شوق
سکوں کی نیند زمانے کے بعد آئی ہے

اجمل [illegible]

سوادِ منزل

[illegible] مقصود کیا آسانی ہے
قدم قدم پہ [illegible] سے [illegible]
اس ایک صبح [illegible] کے لیے
تڑپ تڑپ کے [illegible] شام [illegible]
[illegible]
اگرچہ [illegible] پریشانی
قدم قدم [illegible]
قدم قدم [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] محبت [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] تو بھول گئے
[illegible]
[illegible] ہوتا
[illegible] نگہبانی
[illegible] کرتا ہے
[illegible]
[illegible] ایک [illegible]
فضا میں [illegible]
قدم بڑھا کہ [illegible]
نہ سمجھو راہ کو [illegible] نادانی
ابھی وطن کے لیے کام ہم کو کرنا ہے
[illegible] امن و مسرت [illegible] حیاتِ انسانی
نثار ہو گئے کتنے ہی اہلِ دل [illegible]
بھلا سکے گی یہ دنیا نہ جن کی قربانی

درشن سنگھ

[illegible] ۱۹۴۸

ہمارے عزائم

اختر [illegible] سلوی

ملی تھی ہم کو [illegible] جو قربانی صدیوں پیہم
اُسے ہم نے سعیِ لاحاصل سمجھا [illegible]
[illegible] ہو کر [illegible] آگے
[illegible] عزت سے [illegible]
[illegible] کو
[illegible] کے سہرے [illegible] سوتے جاگتے دیکھے
حیران خوابوں کی تعبیر [illegible] جس میں وہ قسمت میں
[illegible] دیکھیے
ہمارا قافلہ [illegible]
ہماری [illegible] شخص [illegible]
نہیں اب ظلمتیں [illegible]
ہمارے قلب میں [illegible]
[illegible] قسمت [illegible]
یہ آزادی کے سیمیں [illegible] ساعت
ہمارے ہم اگر اس وقت سرمست مسرت ہوں
کہ اب معلوم ہے [illegible] از فرحت [illegible]
مگر یہ عہد بھی [illegible] کی اس ساعت میں کرنا ہے
کہ اپنی منزلوں کی سمت بڑھتے ہی جائیں گے
[illegible] سارے [illegible] ترقی کے
انھیں تکمیل کی حد تک ہر اک قیمت پہ لائیں گے
خود اپنے زورِ بازو سے [illegible]
وطن کے واسطے حاصل کریں گے عزت و عظمت
عطا کر دیں گے سارے ملک کو ہم ایسی زیبائش
کہ دنیا کہہ اٹھے "ہندوستاں ہے دائمی جنت"

آزادی کے دن

[illegible]

[illegible] کی بات کرتے ہیں
[illegible] کی بات کرتے ہیں
[illegible] کرتے ہیں

[illegible] آزادی
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible] کا رنگ بیکھا ہے

[illegible] آئینہ
[illegible] آئینہ
[illegible] آئینہ

[illegible] میں دیکھ
[illegible] قوم کی تعمیر میں دیکھا
محبت کا مرقع جنت کشمیر میں دیکھا

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

آزادی سے آزادی تک

احمد جمال پاشا

آزادی کی ۵۰ ویں سالگرہ کے مبارک موقع پر مجھے آزادی [illegible] سے پہلے کا زمانہ اور آج کا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ یہ بات ایک نسیم کبھی [illegible] تھی اور [illegible] میں [illegible] اس وقت تک یہی سبق پڑھایا گیا تھا کہ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کسی انگریز [illegible] ایک [illegible] آتی رہتی تھی

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب پہلے پہل [illegible] سائیکل تیار ہوئی تو [illegible] کو یقین نہ آتا تھا [illegible] اس کا مذاق اڑاتے تھے کسی نے کہا

[illegible] یہ نہیں [illegible] سائیکل رکھ لی

کوئی بولا:

[illegible] پیٹ سے [illegible] ہو گئے

[illegible] ایک [illegible]

اس کے بعد لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دیسی سائیکل خریدی پھر عام جنتا دیسی سائیکل استعمال کرنے لگی۔ اس کے بعد تو یہ سائیکل ایسی چلی کہ ولائتی سائیکلیں اس کے آگے بول گئے۔

آزادی کے ساتھ ہماری قومی حکومت نے نئی صنعت و حرفت [illegible] ولائتی چیزوں کا طوفان [illegible] اشیاء کا اچھا خاصا سیلاب سا آ گیا۔

جیسے کہ [illegible] استعمال کی تمام چیزیں [illegible] آیا ترقی نہیں [illegible] یہی صرف ملک میں لوگوں کو دستیاب نہیں ہوئیں بلکہ دوسرے ملکوں کو بھی اس طرح جانے لگیں جیسے پہلے کبھی یہاں [illegible] کارخانے [illegible] ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز [illegible]

اب تقریباً یہ صورت ہے کہ [illegible] ترقی کی گاڑی طوفانی رفتار سے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

آزادی کے بارے میں جب [illegible] سوچتا ہوں [illegible] آزادی کی [illegible] کے موقع پر سب سے زیادہ خوشی مجھے اس بات پر ہوتی ہے کہ ہم [illegible] اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے [illegible] اس قدر مضبوطی سے کہ اب قدم جمائے ہوئے [illegible] بجائے کسی کا سہارا لینے کے اب دوسروں کے لیے سہارا بن گئے ہیں۔

آزادی کے ان پچاس برسوں میں ملک ہر میدان میں ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے اس کا اندازہ [illegible] آنکھوں والوں کو ہو سکتا ہے [illegible]

[illegible] وغیرہ [illegible] نام ہیں۔ جیسے [illegible] وغیرہ [illegible] اور کسی [illegible] سے چھوٹے گاؤں میں چلے جائیے۔ [illegible] آزادی سے پہلے زمیندار [illegible] سب [illegible] کا کام [illegible] کا کرنا [illegible]

ہو کا مزہ ہوا کرتا تھا اب ایسی مواصلات ہیں جانیے تو پہلے جہاں
دھول اڑتی تھی وہاں اب کھیتیاں لہلاتی ہیں۔ بہرحال رہٹ
ٹیوب ویل اور نہر سے سینچائی ہوتی ہے گی۔ بلاک کی جانب سے
بیج اور کیمیاوی کھاد وغیرہ کی سپلائی کا انتظام ہے گا ان کے
علاوہ گرام سبھا میں کھیتی کو نئے سائنسی طریقے سے بہتر بنانے
کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے لیے جو جلسے ہوتے ہیں کھیت
کھیت بہار زراعت کے ترقی یافتہ طریقوں کے جو عملی مظاہرے
کیے جاتے ہیں [illegible] لیے اب طریقوں کی جو نشر و اشاعت
ہوتی رہی ہے ریڈیو پر ان کے بارے پروگرام ملتے ہیں کہ اب
کسان اپنے کھیت [illegible] فصل کے بارے میں سب
کچھ جانتا ہے وہ کھیت کے [illegible] کیڑوں سے کیمیاوی ادویات
کی مدد سے اسی طرح لڑتا ہے جیسے [illegible] میدان جنگ میں

گاؤں میں اب [illegible] صنعتی بجلی [illegible]
اور کچے مکانوں کے علاوہ پکے مکانات کی [illegible] گھروں
پر ٹرانسسٹر [illegible] اور کسی سائیکل [illegible] گے
[illegible] ملک [illegible] باقاعدہ اخبار
[illegible] اور [illegible] سیاسی اقتصادی اور
سماجی مسائل پر بحث کرتے دکھائی دیں گے

گاؤں میں آپ کو کھیتوں کی طرف [illegible] صرف بیل
نہیں اب ٹریکٹر بھی نظر آئیں گے [illegible] کو منڈی تک
ترکاریاں لے جانے کے لیے کسان اب بیل گاڑی کے علاوہ ٹرک
پر بھی منڈی مال لے جاتے دکھائی دیں گے یہ وہ بے حساب
ترقی ہے جس کا تصور آزادی سے پہلے تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔
گاؤں میں ترقی کی ایک بہت ہی بڑی جھلک ہے [illegible]
ہمارے دیہات نے صنعتی [illegible] میں بھی بڑی ترقی کی ہے ہر گاؤں
میں پہلے بہت کم [illegible] سے بھی آپ کو [illegible] جائیں گے کہیں چٹائیاں
بنی جا رہی ہیں، کہیں [illegible] جا رہی ہے کہیں [illegible] بنائے جا رہے
ہیں، کہیں شہد کی مکھی، بکری اور مرغی پالی جا رہی ہے غرض کھیتی کے

[illegible] ہوتا [illegible] کہ [illegible]
[illegible] جائیں گے ہر [illegible] میں گاؤں یا قصبے [illegible]
آدھ جھلک بھی آپ کو مل جائے گا۔ اور اب تو ہم نے ایک قدم اور بڑھایا
ہے اور دیہی عوام کے لیے ٹیلی ویژن مہیا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ تجربے
کے طور پر کئی گاؤں میں ٹیلی ویژن نصب کیے جا چکے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ
آزادی کی برکت ہے جو آپ کسی بھی گاؤں میں دیکھ سکتے ہیں۔
آزادی میں جو صنعتی اور ترقی کی جھلک شہروں خصوصاً صنعتی
شہروں میں [illegible] دیکھنے والی ہے ان ترقیوں کو دیکھ کر بھی
خیال آتا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں ہم کتنے علیحدہ ہیں اب ہمارے یہاں کیا نہیں ہوتا؟
[illegible] کے سامنے سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ ترقی برابر جاری ہے
[illegible] کی رفتار [illegible] رہی ہے۔ میں اس رفتار کو دیکھتا ہوں اور تنہا ایک
[illegible] پر نظر ڈالتا ہوں تو خیالات جگمگا اٹھتے ہیں

غلامی سے آزادی تک اور آزادی سے آزادی کی پچیس
سال [illegible] کے [illegible] تک کے اس چوتھائی صدی کے سفر کو آپ بھی
دیکھیے [illegible] آپ [illegible] تازہ دم محسوس کریں گے۔
[illegible] دہلی ایک منزل ابھی باقی ہے جس کی جانب
ہماری [illegible] بڑھتی ہے وہ ہے غریبی سے آزادی۔
جب میں [illegible] آزادی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یقین آ جاتا
ہے کہ ہم غریبی سے بھی اسی طرح آزادی حاصل کریں گے جس طرح
ہم نے غلامی سے آزادی حاصل کر لی تھی غلامی سے آزادی ناممکن
معلوم ہوتی تھی جیسے کہ ہم غلامی کا پتہ لگا کر [illegible] ہیں اسی طرح
غریبی سے آزادی بھی بظاہر ناممکن معلوم ہوتی ہے لیکن ہماری
تاریخ خود اس کی گواہ ہے کہ ہم ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں۔
اب یہ یقین ہے کہ ہمیں غریبی کی غلامی سے بھی آزادی مل کر
رہے گی۔ ضرورت ہے کہ ہم عوام [illegible] استقلال سے کام [illegible]
پیداگراموں کو بروئے کار لانے میں اشتراک و تعاون کریں [illegible]
[illegible]
[illegible]

امتحاں اور بھی ہیں

غلام احمد فرقت کاکوروی

پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی آزادی کو پورے
پچیس سال ہو جاتے ہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا
جا سکتا کہ اس ربع صدی میں ہندوستان نے زندگی کے مختلف شعبوں
مثلاً معاشیات، صنعت و حرفت، تجارت، تعلیم، رسل و رسائل
اور تعمیرات میں جو ترقی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے لیکن ہے
بعض لوگ اس رفتار ترقی سے مطمئن نہ ہوں اور ان کو ترقی کے
فوائد بھی عام ہونے کی بجائے محدود نظر آتے ہوں۔ یہ وہ لوگ
ہیں جو فوری اور ہمہ گیر نتائج کے متمنی ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نقطۂ نظر
حقیقت پسندانہ نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جن حالات میں
ملک نے آزادی حاصل کی ان کے باوجود گذشتہ پچیس سال
میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کی مثال کوئی دوسرا ملک پیش نہیں
کر سکتا ہے۔

آزادی کی اس باسٹھ سالہ تحریک میں، جس کا باقاعدہ آغاز
۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے شروع ہو کر
۱۹۴۷ء میں حصول آزادی پر ختم ہوا، ہمارے ملک کے سیاسی
رہنماؤں نے جو جانی و مالی قربانیاں دی ہیں اس کی جتنی بھی تعریف
کی جائے کم ہے کیونکہ اس دور میں محبان وطن کو قدم قدم پر ایسے
مصائب کا سامنا کرنا پڑا جن کی تاب بڑے بڑے پہاڑوں کو
[illegible] لیکن آزادی وطن کے متوالوں نے راہ
[illegible] کی پروا [illegible]
[illegible]

کہہ کر جنگ آزادی میں کود پڑے اور اس عزم و استقلال کے ساتھ
کہ ان کا جو قدم آگے بڑھ چکا تھا اسے انھوں نے پیچھے نہیں ہٹنے
دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی سامراج کو "بیک بینی و دو گوش"
ہندوستان کو چھوڑتے ہی بن پڑا۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی حاصل
کرنے کے بعد آزادی کو برقرار رکھنا بہت زیادہ مشکل کام ہے
کیونکہ آزادی کے بعد جو ملک کی حالت ہوتی ہے وہ ٹائیفائیڈ
بخار اترے ہوئے ایک مریض کی سی ہوتی ہے اور یہی وہ موقع
ہے جس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ
جب انگریزی سامراج کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تو اس نے
زچ ہو کر ایسے حالات پیدا کر دیے جن سے ملک کی آزادی کا برقرار
رہنا ہی خطرہ میں پڑ گیا۔ وہ ہندو مسلم منافرت کا جو بیج اپنے پونے
دو سو سال کے قیام میں بوتا رہا تھا، اس نے [illegible] اس سے
پورا فائدہ اٹھا کر ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم پر رضامند
کر دیا اور ایسے مسائل کھڑے کر دیے کہ دونوں ملکوں کے لیے اب تک
درد سر بنے ہوئے ہیں۔

تقسیم کے بعد فریقین کے درمیان انتقال آبادی کے سلسلے میں
جو واقعات پیش آئے ان کے باعث دونوں ملکوں کے درمیان تنفر
اس منزل پر پہنچ گیا کہ دونوں کے درمیان تین مرتبہ مسلح تصادم کی
نوبت آ گئی۔ ان تصادموں کی ابتدا ہمیشہ پاکستان کی جانب سے
ہوئی۔ پہلی بار آزادی کے فوراً بعد کشمیر میں مسلح حملہ ہوا، پھر ۱۹۶۵ء

میں باقاعدہ دوسرا حملہ ہوا۔ اور اب تیسری بار ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کا حملہ ہوا۔ ان لڑائیوں میں سب سے بڑا نقصان تعمیری منصوبوں کا تھا جو دونوں ملکوں کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی اور جو دونوں ملکوں میں میل ملاپ دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

کشمیر پر پہلے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کے درمیان چین کا حملہ بھی ملک کے لیے کچھ کم نقصان رساں نہ تھا۔ یہ ساری کی ساری آزمائشیں انہی پچیس سال کے عرصے میں ملک پر اس وقت ٹوٹیں جب کہنا چاہیے کہ ملک آزادی حاصل کرنے کے بعد اطمینان کی سانس بھی نہ لے سکا تھا لیکن ملک کے ذمہ داروں نے بڑی تدبر اور جرات سے حالات کا مقابلہ کیا اور اس موقع پر سب سے زیادہ قابل ستائش کام یہ کیا گیا کہ ملک کے نظم و نسق میں کوئی فرق نہ آنے دیا اور فرقہ وارانہ فسادات سے ملک کے دامن کو بچائے رکھا۔ ملک کی تعمیر کے لیے پنج سالہ منصوبوں پر عمل ہوتا رہا۔ چنانچہ اب سے پچاس برس پہلے کا مقابلہ اگر آپ موجودہ ہندوستان سے کریں تو ہر شعبۂ زندگی میں آپ کو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ آج ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں کی شکلیں بدل گئی ہیں اور جہاں تاریک جنگلات اور دلدلیں تھیں وہاں آج بڑے بڑے پررونق شہر نظر آ رہے ہیں اور اب سے پچاس برس پہلے خود وہاں کے رہنے والوں کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان کے جھونپڑے محلوں میں بدل جائیں گے اور ان کی تیرہ و تار رہائش گاہیں برقی روشنی سے جگمگ جگمگ کرنے لگیں گی۔ وہ کسان جس کی پشتہا پشت زمینداروں کے رحم و کرم پر زندگی گزارتی تھی اور جس کے بچے افلاس میں زندگی بسر کرتے تھے۔ آج ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دیہاتوں میں تعلیمی ادارے قائم ہیں اور اب ہر دیہات کے رہنے والے کے چہرے پر بشاشت برستی ہے۔ جدید قسم کے وہ آلات جن سے کل ہندوستانی کسان بالکل ناآشنا تھے آج جگہ جگہ دیہاتوں میں نظر آتے ہیں اور انہی پچیس سال کے عرصے میں ہمارے ملک میں سائنس نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ بہت سی ادھوری منصوبے ناقابل کاشت زمینیں انہوں نے غلہ اگانا شروع کر دیا ہے۔

ان پچیس سال کے عرصے میں پنڈت نہرو، لال بہادر شاستری اور اندرا گاندھی نے ملک کی [illegible] شدہ ہیں۔

مگر ان تمام ترقیوں کے باوجود بعض لوگ مطمئن نہیں ہیں اور انھیں شکوہ ہے کہ ملک سے بیروزگاری اور غریبی دور نہیں ہوئی ہے سوچیے تو کہ اتنے وسیع ملک میں جس کی حیثیت حصول آزادی کے وقت ایک کھنڈر کے مانند ہو اس کو از سر نو خوش حال بنانا اور اس کی پرانی عظمت واپس لوٹانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تعمیر کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ جس کی تکمیل چند برسوں نہیں ہو پاتی ہے سکتی۔ چنانچہ ان معترضین کو سوچنا چاہیے کہ جس ملک کو پہلے دو سو برس تک غلامی اور بھکمری کی زندگی بسر کرنا پڑی ہو جس کی دولت کو بری طرح لوٹا گیا ہو جس کی ہر رعنائی اور دلکشی کو خاک میں ملایا گیا ہو، اس کو دوبارہ بنانے اور سنوارنے اور اس میں پہلی سی دلکشی پیدا کرنے کے لیے طویل عرصہ بھی کم ہے نہ کہ پچیس سال کی مختصر مدت

ان پچیس سال کے مختصر عرصے میں ہندوستان نے جو ترقی کی ہے اس کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ملک کا بدترین دشمن بھی اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا، ملک کے رہنے والوں کو خود کفیل بنانا، غریبی اور بے روزگاری کو دور کرنے کے لیے جگہ جگہ کارخانوں کی تعمیر، شہروں اور دیہاتوں میں بسنے والوں کی صحت کی نگہداشت کو قائم کر کے قوم کی فلاح و بہبود کے لیے نئے نئے [illegible] نکالنا، دیہاتوں میں کو آپریٹیو بینک اور کو آپریٹیو سوسائٹیاں قائم کرنا، غرض کہ ایسا تعمیری کام ہے جو حکومت نے انجام نہیں دیا۔

اندرا گاندھی نے برسر اقتدار آ کر تو بھی ملک میں ایک سوشلسٹ نظام قائم کرنے کے جو منصوبے بنائے ہیں جب وہ سارے کے سارے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے تو ایک بار پھر ہندوستان سونے کی چڑیا کہا جانے لگے گا لیکن ان منصوبوں کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے کے لیے یہاں کے ہر شخص کا سچا اور دلی تعاون ملک کے ہر فرد کا فرض ہے [illegible] کہ ہم سب یک جہتی اور ایثار اور ضبط و نظم کی بےحد ضرورت ہے۔

★

راولپنڈی ۴ ۹ ۱۹ [illegible]

جشن آزادی

ودود قیصر

ذرہ ذرہ ہے چمن کا مہ و اختر جیسے
ہر طرف پھیلی ہو اک نور کی چادر جیسے

آج ہر خارِ مغیلاں ہے گُلِ تر جیسے
جاگ اُٹھا ہے گلستاں کا مقدر جیسے

سب کے ہاتھوں میں ہے صہبائے طرب کا ساغر
سب کی نظروں میں ہو میخانے کا منظر جیسے

ایک اک لمحہ کچھ اس طرح کھنک جاتا ہے
رقص فرما ہوں یہاں شیشہ و ساغر جیسے

ہر گھڑی عزم ہے نوئی تو ہر اک گام عمل
موج زن سینوں میں ہو کوئی سمندر جیسے

یوں ہر اک سمت مسرت ہے ہر اک فرد ہے خوش
فرش پہ لائے ہوں جنت کو اُڑا کر جیسے

وہ بھی دن تھا کہ اندھیرا ہی اندھیرا تھا یہاں
یہ بھی دن ہے کہ ہر اک ذرہ ہے خاور جیسے

ایک اک ہاتھ میں پہنچی ہے ارجن کی کماں
ایک اک فرد بنا ٹیپو و حیدر جیسے

پھر چٹانوں سے نکل آئے ہزاروں اصنام
پھر سے بیدار ہوئی صنعت آذر جیسے

نکہت و نور کا سیلاب اُمڈ آیا ہے
ٹوٹ کر برسی گھٹا سی کہ وطن پر جیسے

دم بدم تیز قدم لوگ بڑھے جاتے ہیں
رہنما بن گئے ہیں راہ کے پتھر جیسے

دیکھیے ارض ہمالہ پہ ہمالہ کا سماں
فخر سے دھرتی اٹھائے ہوئے ہو سر جیسے

کچھ اس انداز سے جشن مناتے ہیں عوام
ہیں محمود و ایاز آج برابر جیسے

لب ہر غنچہ پہ ہیں امن و اماں کے نغمے
پتی پتی ہو گلستاں کی سخن ور جیسے

ارضِ بھارت پہ کچھ اس طرح جھکا ہے امبر
ہار مانے ہوئے ہو چرخ ستمگر جیسے

ہم میں وہ جذبۂ تعمیر و ترقی جاگا
اپنے ہاتھوں ہی میں ہو اپنا مقدر جیسے

آج کے دور میں ہے یوں میرا محبوب وطن
کرۂ ارض پہ الفت کا پیمبر جیسے

جشن آزادی بھارت کے قصیدے کیا کہیے
عیش و عشرت لٹے جاتے ہیں نچھاور جیسے

جنت نظارہ

ساحل سلطان پوری

(ہندوستان غیر ملکی سیاح کی نظر میں)

میں نے احباب سے تعریف سنی تھی جس کی
آج وہ ارضِ مقدس ہے مرے پیشِ نظر
واقعی جنت نظارہ ہے بھارت کی زمیں
ذرہ ذرہ ہے یہاں دلکش صد شمس و قمر

شہر دلی ہے روایاتِ گزشتہ کا امیں
جس کی آغوش میں ہیں ہند کی عظمت کے ستون
بام افلاک کو چھوتا ہوا مینارِ قطب
اس کی رفعت کی کن لفظوں میں تعریف کروں

سرخ پھولوں سے یہ گلدستہ بنا ہو جیسے
جامع مسجد کی یہ پُرنور مقدس تعمیر
مسکراتی ہوئی اک حور لقا ہو جیسے

یہ اجنتا و ایلورا کی گپھاؤں کا جمال
حسنِ فطرت کا ہر اک نقش جگاتے ہیں یہاں
عہد ماضی کے صنم خانوں میں پتھر کے صنم
فنِ صنعت کی کہانی کو جگاتے ہیں نشاں

سنگ مرمر کا یہ شہکار حسیں تاج محل
جس کی تخلیق نے بخشا ہے محبت کو دوام
میری آنکھوں میں بسا جاتا ہے خوابوں کی طرح
بعد از مرگ ہوا ہے [illegible]

گنگا جمنا کی یہ لہریں یہ ہمالہ کا شکوہ
اور یہ وادیٔ کشمیر کی شاداب فضا
واقعی جنت نظارہ ہے بھارت کی زمیں
پھر بھی دیکھنے آؤں گا اگر زندہ رہا

قطعات

ذہین صدیقی

(۲۵ ویں جشن آزادی کے موقعہ پر)

(۱)

آج ہونٹوں پہ ہے خوشی کی کرن
آج ہر دل پہ تازگی کی پھبن
دین آزادی کی ہے یہ تابش
ہے ہر اک دل میں زندگی کی لگن

(۲)

دن مسرت میں کٹ کے ڈھل گئے
ہم وطنی کا ایک ایک منظر
دلکش آتا ہے آج اس تابش
ہم کو خود اپنے ہی مقدر پہ

(۳)

اب نئے عہد آج کرنا ہے
نئی راہوں میں رنگ بھرنا ہے
ذوق تعمیر دے کے ہر دل کو
جادۂ زیست سے گزرنا ہے

(۴)

ملک کی شان کو بڑھائیں گے
سب کی نظروں میں اس کو لائیں گے
ہم سمجھ دار اس چمن کے ہیں
جان بھی اس کے لیے گنوائیں گے

(۵)

ایک ایک فرد کی دعا ہے یہی
اپنی آزادی پہ نہ آنچ آئے
اور جو بھی نیا قدم اٹھے
پہنچ کے منزل قریب ہو جائے



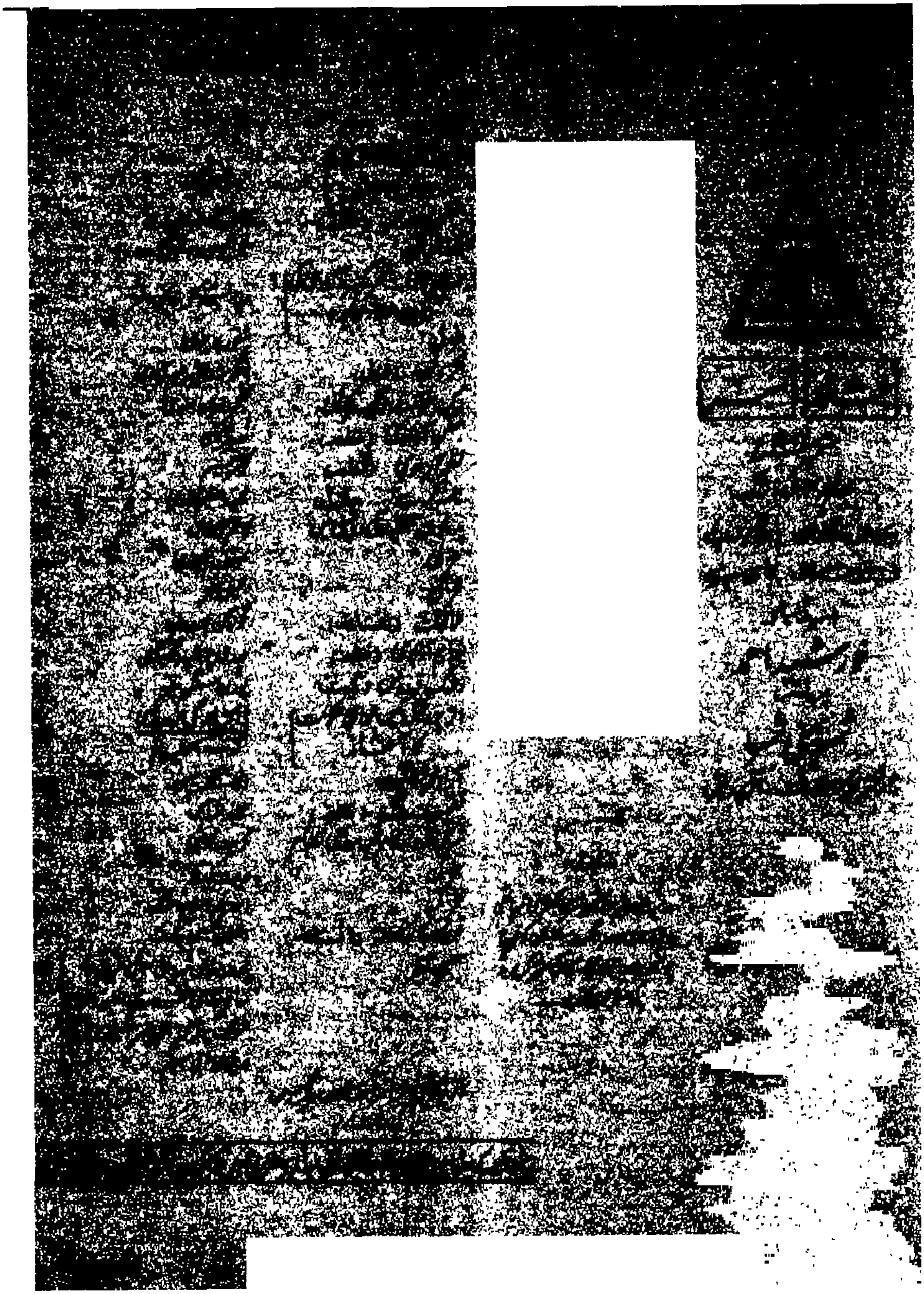
بھابھا ایٹمی تحقیق مرکز ٹرامبے (بمبئی) کا —
ری ایکٹر ہال

دول

28 (

۴۰ پیسے

ستمبر ۱۹۶۲ء
اور نومبر ۱۹۶۲ء تک



اپنی بات

آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر نیا دور کا جو خصوصی شمارہ پیش کیا گیا تھا اسے اہل ادب نے جس قدر پسند کیا اور [illegible] اظہارات بے شمار خطوں سے ہوتا ہے جو اس سلسلے میں ہمیں موصول ہوئے ہیں اور جن کا سلسلہ جاری ہے۔ خصوصی نمبر کے [illegible] مسرت و طمانیت کا باعث ہیں کہ ہماری کوشش رائیگاں نہیں گئی اور آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے مبارک موقع پر ہم نے جن [illegible] کے مجاہدوں کے تئیں نیا دور کا نذرانۂ عقیدت قبول ہو گیا۔ اگر اسے خود ستائی سے تعبیر نہ کیا جائے تو یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ نیا دور کے خصوصی نمبر اردو صحافت میں [illegible] ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں نیا دور کے بعض خصوصی نمبر مثلاً اقبال نمبر، نہرو نمبر، غالب نمبر، جعفر علی خاں اثر لکھنوی نمبر، گاندھی جینتی نمبر [illegible] خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اب تازہ ترین آزادی نمبر (شمارہ اگست ۱۹۷۲ء) کا استقبال قدردانوں اور ادب دوستوں نے جس خوش دلی کے ساتھ کیا ہے وہ اس سابقہ نمبروں پر سبقت لے جانے کا ثبوت آپ ہے۔ زیر نظر شمارہ میں کسی صفحہ پر "حسن نظر" کے عنوان سے چند ادب دوستوں اور کرم فرماؤں کے تاثرات درج کیے جا رہے ہیں۔ بہرحال اس حقیقت پسندانہ اور انصاف پسندانہ حوصلہ افزائی کے باوجود ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ موجودہ خصوصی نمبر ہو یا سابقہ نمبر ہوں ان کی کامیابی اور دل پذیری کا سہرا در حقیقت ان قلمی معاونین کے سر ہوتا ہے جو ہماری استدعا پر بلا تامل قلمی اعانت کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اس لیے اگست ۱۹۷۲ء کے آزادی نمبر کی کامیابی پر جو تہنیتیں ہمیں موصول ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں ان میں ہم اپنے قلمی معاونین کو بھی شریک کرنے کی مسرت حاصل کر رہے ہیں۔

● ہندستان کی آزادی ان بے شمار جانبازوں اور سرفروشوں کی مرہون منت ہے جنھوں نے شمع آزادی پر جان دے دینا اور اپنا گھر بار لٹا دینا گوارا کیا لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ ملک پر غیروں کا تسلط رہے اور ہندستان غلام ملک کہلائے۔ ان فدایانِ ملک و قوم اور آزادی کی خاطر مصائب جھیلنے، بربادیوں کو دعوت دینے اور ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کیے بغیر آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے والوں کی خاصی تعداد ابھی بقید حیات ہے۔ شہرت اور خود ستائی سے بے نیاز ان بے لوث خدمت کرنے والوں کا ہمارے اوپر قرض ہے۔ اس قرض کو کسی حد تک چکانے کے خیال سے نیا دور میں ایک سلسلہ "مجاہدین آزادی" کے عنوان سے شروع کیا جا رہا ہے جس میں ہم ایک سال تک نیا دور کے ہر شمارہ میں جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کی خواہ وہ اس جنگ میں کام آ گئے ہوں یا بقید حیات ہوں، حیات اور کارناموں پر مضامین شائع کریں گے۔ امید ہے کہ اہل قلم حضرات ہماری اس آواز پر آواز دیں گے اور اس سلسلے کو کامیاب بنانے میں ہماری مدد کریں گے۔

● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۲ء سے متعلق جولائی کے شمارے میں ان سطور میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ ایکٹ برابر موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اور اس کے بارے میں مخالف و موافق رائیں اخبارات و رسائل میں ظاہر کی جا رہی ہیں۔ مراسلے شائع ہو رہے ہیں جن میں اکثریت ایسے مراسلوں کی ہوتی ہے جن میں ایکٹ کی مخالفت کی جاتی ہے۔ ان تحریروں میں مدلل انداز فکر اختیار کرنے اور ایکٹ کے ان مضمرات و نتائج سے بحث کرنے یا ان پر روشنی ڈالنے کے بجائے جذبات سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ اس ایکٹ کا تعلق ملک کی ایک عظیم درس گاہ سے ہے جس کا اپنا ایک تاریخی کردار ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایکٹ مذکور کے سلسلے میں موافق یا مخالف جو بھی رائے دی جائے یا اظہار خیال کیا جائے وہ جذبات سے بلند ہو کر کیا جائے تاکہ اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی ہو اور کوئی ناگوار صورت بھی پیدا نہ ہو سکے جیسی کہ بدقسمتی سے کچھ عرصہ پہلے پیدا ہو چکی ہے۔ اس مقصد سے ہم نیا دور میں ایک سلسلہ شروع کرنا چاہتے ہیں اور اہل علم و اہل الرائے حضرات کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۲ء کے بارے میں اپنی رائے خواہ مخالف ہو یا موافق ہمیں بھیجیں جسے ہم کوشش کریں گے کہ نیا دور میں شائع کریں۔ اس ضمن میں ہمیں صرف یہ کہنا ہے کہ یہ سلسلہ خالص "علمی بحث" (ACADEMIC DISCUSSION) کی حیثیت رکھے گا اور ہم ایسا کوئی مضمون اس سلسلے میں شائع نہ کریں گے جس میں واقعات سے ہٹ کر جذبات سے کام لیا گیا ہو، شخصیت زیر بحث لائی گئی ہو، ذاتیات سے بحث کی گئی ہو، جماعتی یا فرقہ وارانہ سوال اٹھانے کی کوشش کی گئی ہو یا اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ اٹھا کر کسی فرقہ کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ہو۔ جب ہمیں یہ محسوس ہوگا کہ بحث اپنے مقصد سے ہٹ رہی ہے اور اس میں ذاتیات اور شخصیات کی تلخی پیدا ہونے لگی ہے اسی آن اس بحث کو نیا دور میں بند کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے کا آغاز ہم اکتوبر ۱۹۷۲ء کے شمارے سے کر رہے ہیں اور اس میں ایکٹ کی موافقت میں ایک مضمون شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس سلسلے کو "صحت مند بحث" تک محدود رکھنے میں ہمارے معاونین ہماری اعانت کریں گے۔

—— ایڈیٹر

ہندستان کی آزادی میں اُردو ادب کا حصّہ

عبدالصمد نعیمی

کسی ملک میں جب انقلاب جنم لیتا ہے تو اس انقلاب لانے میں اس ملک کے ادب کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ روس اور چین کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان ملکوں کے انقلابات کی پشت پر ملکی ادب تھا جس نے قوم کے سوتے ہوئے ذہنوں کو جھنجھوڑا اور انقلاب کے لیے زمین ہموار کی۔ صرف ان دو ملکوں میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے تقریباً ہر ملک کے انقلاب میں وہاں کے ادب کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔

ہندستان کی جنگ آزادی میں بھی منجملہ دیگر ہندستانی ادب کے اُردو ادب کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے۔ اس وقت جبکہ قوم کے دل سے زیاں کا احساس ختم ہو گیا تھا، غلامی کے بوجھ نے سر اٹھانے کی قوت ختم کر دی تھی، قوم نہ صرف غلام تھی بلکہ غلاموں کی زنجیر کو بدیسی حاکم کے جادو کی تاثیر سے سازِ دلبری سمجھ رہی تھی اور ہندستانی عوام روایتی شترمرغ کی طرح اپنی گردنوں کو غلامی کے ریت میں چھپائے خاموش تھے، اس وقت اُردو ادب نے قوم کے سوئے ہوئے ذہنوں کو جھنجھوڑنا شروع کیا۔ پھر بغاوت کی ایک لہر اٹھی۔ بغاوت کی یہ لہر جو غلام ہندستان کی پہلی جنگ آزادی تھی اور جس کو غیر ملکی حاکموں نے غدر کا نام دیا تھا ایک غیر منظم کوشش تھی جو ایک طاقت ور حاکم کے مقابلے میں ناکام ہو گئی لیکن راکھ کے ڈھیر میں ایسی چنگاری دبی رہی جس نے بعد میں انگریزی حکومت کے لیے برق و شرر کا کام کیا۔

تاریخ صحافت اردو کے مصنف کی نظر میں "ہندستان کے اخبارات میں اردو کے اخبارات بھی مجموعی اعتبار سے آزاد خیال تھے اور بہت بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ بدیسی حکومت کے خلاف جس قدر جذبہ پیدا کر سکتے تھے وہ انھوں نے پیدا کیا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندستانیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جو بغاوت کی تھی اس کی زیادہ تر ذمے داری گارساں دتاسی نے ان اخبارات پر عاید کی ہے" (تاریخ صحافت اردو صفحہ ۲۹۶)۔

اس دور کے اردو اخباروں میں خصوصیت کے ساتھ صادق الاخبار اور اردو اخبار وطن پرستی کی دعوت دینے میں سب سے آگے تھے۔ جب جنگ آزادی ختم ہوئی اور بدیسی حاکموں نے تمام ملک کو انتقامی شعلوں کی نذر کر دیا، اس وقت "صادق الاخبار کے مہتمم کو اس جرم میں کہ وہ سرکار کی بدخواہی کی خبریں جھوٹی گڑھ کر لکھا کرتا تھا، تین برس کی قید ہوئی"

(بغاوت ہند صفحہ ۳۰۰)

دہلی اردو اخبار کے مالک و مدیر محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر تھے۔ محمد باقر کو ہندستانیوں کو ورغلانے اور "حاکم" سے جنگ کے لیے آمادہ کرنے کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ آزاد کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوا مگر وہ کسی طرح بچ نکلے اور جا چھپے۔ اس طرح ہندستان کی پہلی جنگ آزادی میں اُردو کے ادیب و شاعر دار و رسن کی آزمائش سے ہمکنار کر دیے گئے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہر سمت ایک سکوت سا طاری ہو گیا مگر یہ سکوت دراصل طوفان سے پہلے کا سکوت ہی تو تھا

باہر سے پر سکون نظر آنے والی قوم کے دل اندر ہی اندر
تڑپ رہے تھے۔ اس تڑپ کا اظہار اردو ادب نے محسوس
کیا۔

"...... اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازے سے
باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے
رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر
بے چراغ پڑے ہیں۔" (غالب کا خط تفتہ کے نام)

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس ‌ ‌ یوں کہا آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے ‌ ‌ یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب
(غالب)

کیونکر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو ‌ ‌ قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو
(آزردہ)

بجائے زمزمہ ہر جائے شیون و ماتم ہے ‌ ‌ محل عیش تھا اب سرائے ماتم ہے
(سالک)

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی ‌ ‌ خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی
(داغ)

مات دل گریہ سے اور تنگ ہے اور سینہ ہے ‌ ‌ اور ظہیر جگر افگار ہے بیان دہلی
(ظہیر دہلوی)

مجھ کو کہیں کہ یہ دہلی ہے تو ہرگز نہ پٹے ‌ ‌ دہلی والوں کو بھی دہلی پہ گمانِ دہلی
(شیفتہ)

موجزن دل میں ہیں یاں کے دریائے خوں ‌ ‌ دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
(حالی)

اے وطن! اے میرے بہشت بریں! ‌ ‌ کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں؟
(حالی)

پہلی جنگ آزادی کے بعد جب ہندوستان اپنی تمام
قوتیں کھو چکا تھا اور ہر طرف مایوسی اور قنوطیت چھائی ہوئی تھی
اس وقت اردو ادب نے ایک نیا موڑ لیا۔ سر سید احمد خاں نے
تعلیمی اور اصلاحی تحریک کی آواز بلند کی۔ اس میں شک نہیں
کہ ۱۸۵۷ء کی تباہی و بربادی پر سب سے زیادہ جس انسان کا دل
تڑپا وہ سر سید کے ساتھی حالی تھے۔ [illegible]
[illegible] سے تعبیر کیا۔ حالی سب سے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے [illegible]
کی غلامی پر رو دیا۔ "شعر الہند" کے مصنف کے الفاظ میں "حریت
اور آزادی کا لفظ آج بچے بچے کی زبان پر ہے، لیکن ایک زمانے
میں جبکہ یہ لفظ جرم خیال کیا جاتا تھا، سب سے پہلے حالی ہی
نے ہندوستان کی غلامی کا ماتم کیا۔" (شعر الہند جلد اول صفحہ [illegible])
حالی ہی ہندوستان کا وہ پہلا شاعر تھا جس نے باقاعدہ اپنی
قوم کو دعوت دی۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو! ‌ ‌ اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
چھوڑ دو افسردگی کو جوش میں آؤ ‌ ‌ بس بہت سوئے اٹھو ہوش میں آؤ

اس دور میں بھی عوام میں بیداری پیدا کرنے میں اردو
اخباروں نے نمایاں حصہ لیا۔ اودھ پنچ (لکھنؤ) نے اس وقت میں
جبکہ اخباروں کو آج کی طرح آزادی حاصل نہ تھی، انگریزی حاکموں
پر زبردست تنقید کی۔ "حکام کہتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت مثل گدھے کے
ہے۔ ہندوستان کے گدھے کی پیٹھ کا گوشت نوچو جہاں تک ناخنوں
میں طاقت ہو۔ یہ گوشت اصلی گوشت نہیں بلکہ بد گوشت ہے۔ اس
کا نوچنا مضر نہیں بلکہ انجام کار راحت رساں ہوگا۔ گدھا فربہ ہے
لک پر بار بھی لادو اور جب منزل پر پہنچو تو اس کا گوشت نوچو۔
اس کی لید جلا کر اس کی کھال کی ہانڈی بنا کر پکاؤ اور کھاؤ۔۔۔ یہ
دودھ بھی دیتا ہے کباب کھا کر دودھ پیو اور پھر اس کو بار بھی لادو
اور آپ بھی سوار ہو جاؤ۔ تیز نہ چلے تو منہ سے خبر لطف یہ ہے کہ
کاٹو کاٹ کھائے، نہ کھانے کی حاجت نہ پینے کی ضرورت۔ اس
پر منہ مشاہدہ [illegible] (اودھ پنچ۔ لکھنؤ)

دوسرا اخبار "پنچ پٹنہ" تھا جو اودھ پنچ کی طرح مزاحیہ [illegible]
سے لکھے [illegible] عوام سے تعلق [illegible] سوال [illegible]
دل میں کتنی دفعہ کھلتے ہیں؟ اور انگریز [illegible]
جواب: امیر ہندوستانی دل میں ایک دفعہ کھلتے ہیں [illegible]
سے زیادہ سے چار دل کو [illegible]

[illegible] ہندوستانی کو پیغام دیتا ہے [illegible]

[illegible] ہندوستانی ہو [illegible] سب کا [illegible]

[illegible] کے بعض [illegible] ادیب اور شاعروں کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں منشی سجاد حسین کے علاوہ سید محمد حسین آزاد، چکبست اور اکبر الٰہ آبادی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں حب الوطنی کی تڑپ کے ساتھ ساتھ غیر ملکی حکومت پر تنقید بھی ہوتی تھی۔

اے [illegible] | تو [illegible]
[illegible] | [illegible] زیر و زبر ہو رہا
[illegible] | [illegible]

(محمد حسین آزاد)

[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

(چکبست)

[illegible] | [illegible]
[illegible] | [illegible]

جب [illegible]
[illegible]

(اکبر الٰہ آبادی)

بیسویں صدی کی ابتدا میں اردو ادب نے ایک زبردست کروٹ لی اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں چند نئے ادیب و شاعر شامل ہو گئے۔ حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، پریم چند، [illegible] وغیرہ نے نظم و نثر کے ذریعے انقلابی خیالات کو عام کیا اور ملک کی آزادی کی [illegible] کے ساتھ [illegible] منزل کی طرف بڑھنے [illegible]

[illegible] کے مضامین پر مشتمل کہانیاں لکھے [illegible] کی ابتدائی سال کی کہانیوں کی منزل آزادی اور صرف آزادی ہی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"...... اگر تو مسافر ہے تو آ اور میرے ٹوٹے ہوئے جھونپڑے میں بیٹھ جا کیونکہ یہی وہ ٹکڑا زمین ہے جو میرے پاس باقی رہ گئی ہے اور جو سوائے موت کے کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔ افسوس کہ تو یہاں ایسے وقت آیا جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور اور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لیے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو تو لاشیں دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں (مسکرا کر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں لیکن غنیمت ہے کہ حریف کے حلقے میں نہیں مر رہا ہوں (سینہ کے زخم سے خنجر نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا؟ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لیے زندہ رہوں؟ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں...... یہ کہہ کر اس نے ایک مرتبان [illegible] کھولا اور اس میں سے ایک لوح نکالی جس پر آب زر سے لکھا ہوا تھا "وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے"۔ پریم چند "دنیا کا سب سے انمول رتن" حب الوطنی کے مرکزی خیال کو لے کر پریم چند کی پانچ کہانیوں کا ایک مجموعہ سوز وطن شائع ہوا جسے انگریزی حکومت نے بغاوت سمجھا گیا اور اس کی تمام کاپیاں بحکم سرکار ضبط کر لی گئیں۔

دوسری طرف شعراء اپنے فرض کو نبھا رہے تھے۔ شاعری کا نیا انداز جو حالی اور آزاد نے شروع کیا تھا، ملک میں مقبول ہو رہا تھا۔ شعراء اپنے کلام کے ذریعے حب الوطنی، اخوت و محبت اور بھائی چارے کا درس دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ آزادی [illegible] جوش ابھار رہے تھے۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے
(اقبال۔ نیا شوالہ)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا　　ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری　　صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا
(اقبال)

رنگیا اور سحر تاریکی شب سے جھاگتی　　تیرا اقبال بلند یا شام ماتم چھا گئی
پھر بھی اے خاک وطن الفت ہے وفاداری تری
چار سو ہے دیر میں شب کرم جاری تری
(سرور جہاں آبادی)

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے
(چکبست)

ترا حسن ایک تماشہ ہے　　تری چھیلی گرد بہار ہے
تو غلاموں کی دلیل ہو　　تری پاد شرم کا اشارہ ہے
(عظمت اللہ خاں دہلوی)

کہاں ہیں ترے سور ما صف شکن　　ترے اہل دانش ترے اہل فن
کہاں ہے ترا لاتستہ ار جن　　ترے رام، لچھمن، بھرت، شتروگھن
زمین وطن! اے زمین وطن!
(آنند نرائن ملا)

اقبال کی "ہمالیہ" "نیا شوالہ" "تصویر درد" "ترانۂ ہندی" "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اسی دور کی یادگار ہیں۔ چکبست کی "خاک وطن" سرور جہان آبادی کی نظم "پھولوں کا کنج" کافی مقبول ہوئیں۔ آگے چل کر اقبال کی "شاعر کا امید" آنند نرائن ملا کی "زمین وطن" اور جاں نثار اختر اور ساحر کی نظموں نے جادو جگانا شروع کر دیا۔

اس دور میں کئی اخبار جیسے الہلال، ہمدرد، مسلم اور مدینہ وغیرہ منظر عام پر آئے۔ الہلال مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار تھا۔ ایک اعتبار سے یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس نے ہندوستانیوں

[illegible] کی کشش نے الہلال کے ذریعہ [illegible] نظر رہے کی وجہ سے اندادب میں بھاری انقلاب [illegible] پیدا ہوا۔ [illegible] کا اخبار تھا جس میں [illegible] اور ولایت حسین وغیرہ کے انقلابی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان اخباروں کے علاوہ وحید الدین سلیم کی ادارت میں "مسلم گزٹ" بھی شائع ہونے لگا۔ ان اخبار کی پشت پر شبلی کا دماغ تھا۔ یہ تمام اخبارات انگریز دشمن اور سخت قسم کے وطن پرست تھے۔ انگریزی حکومت شروع میں خاموشی کے ساتھ ان کی جولانیاں دیکھتی رہی لیکن جب ان اخباروں کی آواز لمحہ بہ لمحہ بلند تر ہونے لگی اور ہندوستانی اس آواز سے بیدار ہونے لگے تو برٹش حکومت اسے برداشت نہ کر سکی اور الہلال و ہمدرد پر پابندی عائد کر دی۔ شبلی کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوا۔ اس سے پہلے کہ ان کی آواز کو اسیر کر لیا جاتا وہ قید حیات سے آزاد ہو گئے۔ اس وقت تک قوم خواب گراں سے جاگ چکی تھی اور برٹش حکومت کے ساتھ آمادۂ پیکار تھی بقول ڈاکٹر اشرف "عام لوگوں کے جوش اور انگریز دشمنی کا یہ عالم تھا کہ مولانا محمد علی کا اعتدال آمیز رویہ بھی نا پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور خواجہ حسن نظامی جیسے نامور شخصیتوں نے "کوتکبیر" جیسے مضامین لکھے جو جھنجوڑ کر رکھ دینے گئے۔"
(نوجوہر جامعہ ملیہ جوبلی نمبر)

تحریک ترک موالات کی ابتدا ہو چکی تھی۔ سارے ملک میں ایک طوفان سا آگیا۔ نئے نئے اخبار وجود میں آئے۔ ڈاکٹر اشرف کے خیالات میں "غلام بھیک نیرنگ، ترلوک چند محروم، آزاد، جگر، [illegible] فریب آبادی جیسے محب وطن انقلابی [illegible] حسرت [illegible] اقبال سے بڑھ کر خوش نوائی کی [illegible] انقلابی شاعری میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔"

[illegible]

اس دور میں محمد علی [illegible] ہماری [illegible] ڈاکٹر اقبال [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] لکھا ہر لفظ [illegible]

[illegible] حقیقت سے [illegible]

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا

ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

(اقبال)

نئے اخبارات جیسے حقیقت۔ لکھنؤ۔ زمیندار۔ لاہور۔ پرتاپ۔ لاہور۔ بندے ماترم۔ لاہور۔ ملاپ لاہور۔ خلافت۔ بمبئی۔ انقلاب۔ لاہور۔ الجمعیت۔ دہلی۔ مسلم۔ دہلی وغیرہ نے تحریک آزادی کو اور ہوا دی۔ انگریزی حکومت کے خلاف تند و تیز مضامین لکھے، پُرجوش نظمیں شائع کیں۔ حکومت نے ان کے مدیران کو تنبیہ کی، ضمانتیں طلب کی گئیں، ضمانتیں ضبط ہوئیں اور مالکان و مدیران اخبار کو سیاہ قید خانوں میں ڈال دیا گیا۔ لیکن انقلاب کی آواز بلند ہو چکی تھی، نہ یہ آواز بند ہوئی اور نہ تحریک آزادی روکی جا سکی۔

وقت گزرتا رہا، تحریک آزادی بڑھتی رہی اور اردو ادب کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ اردو کے ادیب و شاعر دار و رسن سے بے پرواہ قوم کے لہو کو گرم کرتے ہی رہے۔ شمع آزادی کی لگن میں ان متوالوں نے قوم سے کہا:

وقت آ پہنچا کہ برپا ہو نیا اک انقلاب
اور یہ نظم زندگی یا رو مگر منظوم ہو

(ظفر علی خاں)

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

(جوش ملیح آبادی)

[illegible]

(حسرت موہانی)

نقد جاں نذر کو [illegible] کام [illegible]

(محمد علی جوہر)

[illegible] سرفروشی [illegible]

(ریاض خیرآبادی)

حکومت ہم پہ ہو سکتی ہے دل پر ہو نہیں سکتی
کوئی روکے تو دیکھو کہ چشم دل کی گریہ و زاری

(مہدی [illegible])

جو راہ میں پہاڑ ہوں تو بے دریغ اکھاڑ دو
اٹھاؤ اس طرح نشان فلک کے دل پہ گاڑ دو

ہے کھیل دار اور رسن، بڑھے چلو بڑھے چلو
مجاہدین صف شکن، بڑھے چلو بڑھے چلو

(احسان دانش)

اٹھو ہند کے باغبانوں اٹھو اٹھو انقلابی جوانوں اٹھو
اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے اٹھو خاک بنگال و کشمیر سے
اٹھو وادیوں کی طرح ہنستے ہوئے [illegible] گرجتے ہوئے
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

(سردار جعفری)

ذہن انساں پہ جو چھایا ہے اندھیرا یارب اس اندھیرے کی کبھی کوئی سحر بھی ہوگی
اک امید پہ بیٹھا ہوں سر راہ گزر ہجر کی رات ڈھلی ہے تو سحر بھی ہوگی

(آل احمد سرور)

دریا میں تلاطم برپا ہے، کشتی کا ٹھکانہ کیا معنی
گرداب سے جب لڑنا ہے تمہیں، تنکے کا سہارا کیا معنی
تم خود کشتی بند کرو، خود موج طوفاں بن جاؤ
پیروں کے تلے ساحل ہوگا، ساحل کی تمنا کیا معنی

([illegible])

تڑپ ہے گرنے ہی والی ہے برق زنداں پر
کھڑے ہیں در پہ اسیر آسرا لگائے ہوئے
(کیفی اعظمی)

شاد دل سے کرو شادی ستاں غلامی کا زمیں چھوڑ چکا کارواں غلامی کا
(کیفی اعظمی)

ملبس تازگیاں ہیں پائے عالم زار اور گریباں چاک ہیں گل ہائے [illegible]
ایک نیا دور چلا ہے اپنی نبض دیکھ کر اپنی حالت کی مگر تم کو نہیں کچھ بھی خبر
(رشید [illegible])

جہاں کو بسر کرنا ہے یہیں جینا ہے یہیں مرنا ہے یہیں
اٹھو یہ چمن شاد ہو کرو اب غاصب خود مر جاتا ہے
(اقبال سہیل)

پھر امنگیں، آرزوئیں ہیں دلوں میں بے قرار
قوم کو یاد آگیا ہے اپنا گم گشتہ وقار
(جگن ناتھ آزاد)

ایک سمت اردو نظم قوم کی رگوں میں نئی روح بھر رہی تھی اور دوسری طرف اردو نثر تحریک آزادی کو تیز کر رہی تھی۔ چنانچہ حسرت موہانی لکھتے ہیں: "یہ سمجھتے ہیں کہ بعض اخبار اگر اعلیٰ درجے کے نہیں ہیں لیکن بمقابلہ سابق آج وہ ملک کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ آپ کانگریس میں تجویزیں منظور کرتے ہیں وہ ہمارے تعلیم یافتہ گروہ تک پہنچتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح اخبار کے کالموں میں حکام اور رعایا تک ہر وقت پہنچائی جاتی ہیں۔"

عوام کو متحد کرنا، انھیں حالات و مسائل حاضرہ سے باخبر رکھنا اور آزادی کی لڑائی کے لیے ان کو تیار کرنا اردو اخباروں کا خاص کام تھا۔ یہاں اس زمانے کے اخبارات کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"ہم کو پہلے سے یقین تھا کہ جس وقت ہندستانیوں نے اپنے حقوق طلب کرنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو قومی رشتہ میں منسلک کرنے کا ارادہ کیا تو فوراً حکام وقت کی طرف سے ان کی مخالفت ہوگی اور اگر فرصت ہوئی تو جبر و تشدد سے بھی کام

[illegible]
[illegible]
([illegible] کی غزل)

"مانا کہ ہندوستان کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ (مسلمانوں) کے لیے ایک فرض دینی اور جہاد فی سبیل اللہ۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے ..... آج جو لوگ ملک کی آزادی کے لیے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں یقین کیجئے وہ بھی مجاہدین ہیں ..... پس اٹھو کھڑے ہو کہ خدا ایسا کرنا چاہتا ہے اور اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہیں بیدار ہوں اور اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں۔" (ابو الکلام آزاد: ہندوستان کی آزادی اور مسلمان)

"اب ہم اس متحدہ طاقت کے ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائیں اور مستقبل کے چہرے سے جو ہمارے ذہنی گرا علی تخیل کے ساتھ وابستہ ہے نقاب اٹھانے کی خلوص دل سے کوشش کریں۔" (حکیم اجمل خاں۔ ہندوستان کا مستقبل)

"ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو چونکہ خدا تعالیٰ نے کسی پراسرار معجزہ سے اس طرح متحد کر دیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھے۔ لازم ہے کہ اس ہیبت ناک حقیقت کو سمجھیں اور متحد ہوکر ان ناپاک شیطانی طاقتوں کا مقابلہ کریں جو ان دونوں کی تہذیب و تمدن اور ان کے شاندار زمانۂ ماضی کے آثار کو تباہی و بربادی میں دھکیل دینا چاہتی ہیں۔"
(ظفر علی خاں: متحدہ [illegible])

"پیاری بہنو! تمہارے درمیان میں سیتا اور حضرت زینب کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جو [illegible] یا شہید کر دیے گئے ہیں اور یا تو قید خانوں میں ڈال دیے گئے ہیں ..... تمہیں قرآن پاک اور شاستروں کے احکامات کا پابند رہنا چاہیے۔ یاد رکھو کہ جب ہمارے کل مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو اس وقت آزادی کے چہرے سے گھونگھٹ کو تمہیں کو ہٹانا ہوگا"

[اردو ادب پر تحریک آزادی کا اثر ، مطبوعہ صدائے عام]

اس مختصر سرسری جائزے سے اندازہ ہوگا کہ تحریک آزادی میں اردو ادب کا کتنا حصہ رہا ہے۔ بقول علی سردار جعفری "اردو والوں نے آزادی کی جدوجہد کو قومی دائرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے دائرے میں قومیت سے ملا کر اس طرح ایک زیادہ جاندار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا ہے"

(صبا حیدرآباد)

اور پھر وہ صبح نمودار ہوئی جس کے لیے کتنے ہی شاعر و ادیب دار و رسن کی کڑی آزمائش سے گزرے، برسوں جیلوں میں بند رہے اور جب وہ صبح نمودار ہوئی تو شاعر بے اختیار کہہ اٹھا،

بصد غرور، بصد فخر و ناز آزادی
مچل کے کھل گئی زلف دراز آزادی
سرود بزم ہیں نغمہ طراز آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح ساز آزادی

زمانہ رقص میں ہے زندگی غزل خواں ہے

(مجاز)

اردو ادب جس کے بیکر صدیوں سال عشق و محبت اور گل و بلبل کی حکایات دہرانے میں گزرے ہیں، وقت پڑنے پر اس نے شیشے کی بجائے تلوار اٹھانے اور بزم آرائیوں کی بجائے میدان جنگ میں کود پڑنے کی تلقین کی ہے۔ شمیم کرہانی کہتے ہیں :

ناگنوں نے کالے کالے بال لہرائے بہت
مہ وشوں نے گورے گورے گال دکھلائے بہت
بجلیوں نے کوند کوند جام چھلکائے بہت
جا بجا تقدیر ؛ دل خود بھی للچائے بہت

سب کو ٹھکرا کر جگر میں آ گیا میدان میں

پھر جب آزادی حاصل ہوئی تو شاعروں نے دل کھول کر آزادی اور ملک کی کامرانی کے گیت گائے۔ اقبال سہیل فرماتے ہیں :

گلزار وطن کی کلی دیکھئے تو چمن کا ہے ۔ سرشار ہے خوشبو سے ہر گوشہ گلشن کا ہے

چمن والا صبا آ تو ذرا کی تھی رہ کی ۔ ہر سنگ غلاماں کی زنجیر پہ بس آ تو
صد شکر کہ اٹھا ہے زندان محن آج

رخصت ہوئی شب تار غلامی کا اندھیرا ۔ وہ سامنے ہے صبح سعادت کا سویرا
جاتا ہے بدیسی کا کھٹنے لگا ڈیرا ۔ لہرانے لگا عظمت قومی کا پھریرا

آزاد ہوا قید غلامی سے وطن آج

آزادی کے گن گانے اور خوشیاں منانے کے ساتھ ساتھ ہمارے شاعر اور ادیب یہ کبھی نہیں بھولے کہ وطن کی آزادی اور سالمیت کو خطرہ پیدا ہونے کی صورت میں بھی ان پر ہم وطنوں کا حوصلہ بڑھانے متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا کرنے اور رجز خوانی کے فرائض انجام دینے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی یہ موقع آیا اور آزادی کو خطرہ لاحق ہوا ہمارے شاعر اور ادیب کبھی پیچھے نہیں رہے اور پکار اٹھے :

اس طرف رقصاں نگاہوں میں تری جام کے
اس طرف اک دشمن ایمان طلب گار لہو
وہ نشیمن ! رام کی جو آنکھ کا تارا رہا
وہ نشیمن ! کرشن کو جو جان سے پیارا رہا
وہ نشیمن ! جس کو گوتم نے سجایا تھا کبھی
خیبر کے پنجے سے گاندھی نے چھڑایا تھا کبھی
وہ نشیمن ! جس میں نانک نے ترانے گائے ہیں
اور چشتی کے جہاں نغمات حق لہرائے ہیں
وہ نشیمن ! سرمد و ٹیپو نے جس میں جان دی
شاہ عبدالحق نے جس کو تابش ایمان دی
اس نشیمن ہی سے ہے رنگینی و کیف حیات
یہ نشیمن جل اٹھا تو جل اٹھے گی کائنات

(حفیظ میرٹھی پیلی بھیتی)

غرض ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا کوئی موڑ ایسا نہیں جس میں اردو ادب نے اس کا ساتھ نہ دیا ہو اور ہر تحریک میں بھرپور حصہ نہ لیا ہو۔

★

جشنِ بہاراں

طلعت مسعود انصاری

منزلِ نو کا پیامی، عالمِ ایجاد ہے — عصرِ حاضر زندگی کی اک حسیں روداد ہے
آج کا یہ جشنِ زریں ہند کی تاریخ میں — فتح مندی کی علامت امن کی بنیاد ہے

دیکھنا اہلِ چمن، اب رنگ ہی نکھرا ہوا ہے
آج اپنے دیس میں محنت کشوں کا دور ہے

آفتابِ کامرانی داغِ دل دھونے کو ہے — رشکِ جنت یہ جہاں ہے ہر کلی کھلنے کو ہے
آج یہ محسوس ہوتا ہے، یہ اپنی چارہ گری — زخمِ تقسیمِ وطن کا اندمال ہونے کو ہے

دل سے اب اندیشۂ سود و زیاں مٹ جائیگا
ملک سے افلاس کا نام و نشاں مٹ جائیگا

اپنا صوبہ وادیِ گنگ و جمن کی سرزمیں — ڈس رہے تھے جس کی تقدیروں کو کالی راتیں
جو ہمیشہ ایک پسماندہ علاقہ ہی رہا — ہو گیا ہے آج پھر وہ رشکِ [illegible]

آ گئی فصلِ بہاراں غنچۂ دل کھل گیا
اب نشانِ منزلِ مقصود ہم کو مل گیا

ننگ ہے بغض و ریاکاری پہ کہنہ رسم و رت — سامراجی ذہنیت ہو دشمنِ انسانیت
ملک کی دنیا میں قائل ہے انسانی اخوت — ظلم کرنا بیکسوں پر ہے درندوں کی خاصیت

تنگ نظری کچھ نہیں، فرقہ پرستی کچھ نہیں
ایک ہیں ہم ایک ہیں، صوبہ پرستی کچھ نہیں

دیکھ لے سارا جہاں یہ عظمتِ ہندوستاں — یہ محبت کا ہے زریں دور ملتِ ہندوستاں
ہم سدا انسان کی خاطر رہے سینہ سپر — ساری دنیا پر عیاں ہے عظمتِ ہندوستاں

آج گاندھی اور نہرو کے مقدس خواب کی
مل گئی تعبیر جیسے چاندنی مہتاب کی

رباعیات

تارا چرن رستوگی

معلوم نہیں اور نہ جانے کیا ہو
تازہ ستم و جور نہ جانے کیا ہو
ہر ایک کو اب خوف یہی رہتا ہے
آئندہ نیا دور نہ جانے کیا ہو

کس خواب کی تعبیر نہیں ہو سکتی
کس درد کی تدبیر نہیں ہو سکتی
ہمت سے ذرا کام تو لے اے طاہر
کس ہاتھ میں شمشیر نہیں ہو سکتی

تحقیر و ملامت کے سبب ہوتے ہیں
آ ناج کہ یہ قہر و غضب ہوتے ہیں
ہر بات پہ کھائیں جو قسم اللہ کی
وہ لوگ بھی دنیا میں عجب ہوتے ہیں

بے آب کہیں سلکِ گہر ہوتی ہے
ہر شامِ اودھ رشکِ سحر ہوتی ہے
بھر آتے ہیں جب اشکِ ندامت آنکھیں
اس وقت نظر رشکِ نظر ہوتی ہے

سرلا دیوی — تحریک آزادی کی ایک ممتاز مجاہدہ

مرزا سجاد علی خاں اختر

صنف نازک کی ملکی خدمات اور ان کے ولولہ انگیز قومی جذبات سے ہندستان کی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ کون ایسا غدار ملک و قوم ہے جس کے دل پر رانی لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) اور بیگم حضرت محل کے کام اور نام دلفریب نقش نہ چھوڑ جائیں۔ مورخ برسہا برس سے ان کی زندگیوں کو اجاگر کرتا چلا آرہا ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ ان کے سوانح فنا ہو جائیں گے۔ وہ تو امر ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں ہر دور میں ان کی انمول زندگیوں کو دہراتی رہیں اور ان سے ملک کی محبت کا سبق حاصل کرتی رہیں۔ انھوں نے ہندستان کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ وقت پڑا تو میدان جنگ میں تلوار بھی چلائی، وطن پر مال و دولت بھی نچھاور کیا اور جانیں بھی دے دیں۔ ان خواتین کے یہ جرأت مندانہ اقدام تو انیسویں صدی عیسوی کی تاریک فضا میں روشن ستارے بن کر چمکے لیکن بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں بھی جب پورا ہندستان بدیسی حکمرانوں کی مضبوط گرفت میں جکڑا جا چکا تھا، چند دلیر، شیر دل اور قوم پرست خواتین ایسی پیدا ہوئیں جنھوں نے ملک کو آزاد کرانے میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ تاریخ ان کے کارنامے بھی دہراتی رہے گی تاکہ آنے والی ملک کی خواتین ملکی خدمت کے سلسلے میں ان کی سوانح سے سبق حاصل کرتی رہیں۔

مشاہدات بتاتے ہیں کہ تحریک آزادی کی ابتدا ہوتے ہی متعدد خواتین میدان عمل میں نظر آنے لگیں جو تحریک کو آگے بڑھانے اور اس کو کامیاب بنانے میں پیش پیش تھیں۔ بلبل ہند سروجنی نائیڈو، شریمتی اوشا مہتا، شریمتی کرتار دیوی، مس حاجرہ بیگم، ثوبانی، مسز جے پلیٹ، شریمتی رنجیت کور وغیرہ کے نام جنگ آزادی کے سپاہیوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ذکر تاریخ آزادی کا ایک مستقل باب ہے۔ فی الحال شریمتی سرلا دیوی چودھری بی۔ اے کی زندگی اور ان کے کارناموں کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

یہ محترم خاتون ۱۸۷۲ء میں مسٹر جانکی ناتھ گوسال کے گھر بمقام کلکتہ پیدا ہوئیں۔ ان کے ننہال میں ادب کا دور دورہ تھا۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور ان کے ماموں تھے جن کی وطن پرستی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ موصوف نے مظالم پنجاب پر اظہار ناراضگی کرتے ہوئے "سر" کا گراں قدر خطاب انگریز سرکار کو واپس کر دیا۔ ان کی شہرت ان کی بلند پایہ شاعری کی وجہ سے یورپ اور امریکہ پر اپنا سکہ بٹھا چکی تھی اور ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا نوبل پرائز حاصل کرکے انھوں نے زبان خلق سے ملک الشعراء کا خطاب بھی حاصل کیا تھا۔ سرلا دیوی کی والدہ بنگلہ زبان کی ایک مشہور مصنفہ تھیں۔ مختلف رسالوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ وہ عرصے تک رسالہ بھارتی کی ایڈیٹر بھی رہ چکی تھیں۔ ایسی قابل، تعلیم یافتہ ماں کی زیر تربیت سرلا دیوی اپنی ذہنی اور دماغی قابلیتوں کو جلا دیتی رہیں۔ ہوتے ہوتے ۱۸۹۰ء میں جبکہ وہ صرف سترہ سال کی تھیں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی

ڈگری حاصل کرلی۔

طالب علمی کے زمانے میں سرلا کے مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ آخر رسالہ بھارتی کی ایڈیٹری کا قرعۂ فال بھی ان ہی کے نام نکلا۔ اس طرح آپ اپنے ماموں ٹیگور اور ماں کی جانشین قرار پائیں۔ بنگلہ، انگریزی، سنسکرت اور ہندی زبانوں پر ان کو کافی عبور تھا۔ اردو میں بھی صفائی کے ساتھ گفتگو کرسکتی تھیں۔ اردو شاعری سے کافی دلچسپی تھی۔ دیہی علاقوں میں آپ کی تقریریں اکثر اردو ہی میں ہوا کرتی تھیں۔ مشہور ہے کہ دوران تعلیم اور تعلیم کے بعد بھی رابندر ناتھ ٹیگور کی قومی نظمیں اور بنگال کے مشہور ناولسٹ بنکم چندر چٹرجی کے ناول ان کے قلب پر آہستہ آہستہ اور نامعلوم طریقے پر انقلاب انگیز اور تغیر خیز اثر کرتے رہے۔

آپکے ایک رشتہ دار ستیندر ناتھ ٹیگور بمبئی پریسیڈنسی میں بحیثیت آئی۔ سی۔ ایس افسر کے ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ سرلا جب اُن سے ملنے گئیں تو ان کو شولاپور، پونا اور ستارہ بھی جانے اور اکثر مرہٹوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان ملاقاتوں کے تاثرات موصوفہ نے اس طرح بیان کیے: "میں نے مرہٹوں میں حیرت انگیز قومی جذبہ دیکھا۔ ان میں کا ہر ایک ملکی ہیرو بننے کے نشہ میں سرشار نظر آیا۔ میں نے ان کی قومی روح میں تازگی پائی۔ مجھ پر مہاراشٹر کے اس سفر کا ایسا اثر پڑا کہ میں اپنے وطن بنگال سے جو سیاسی جذبہ لے کر چلی تھی اس پر خاص جلا ہوئی۔ ملک کا حال و مستقبل دونوں مجھ پر چڑھتے ہوئے دن کی طرح روشن ہو گئے اور میری زندگی ایسے سیاسی موڑ پر آگئی کہ میری منزلیں قریب تر نظر آنے لگیں۔" موصوفہ جب وطن واپس آئیں تو ان کو مسٹر رڈیارڈ کپلنگ، جو کبھی لاہور کے سول ملٹری گزٹ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے، ان کی نظموں کے مطالعے کا موقع ملا۔ بنگالی چونکہ فطرتاً ذہین اور زیرک ہوتے ہیں، انگریز ان سے ہمیشہ خائف رہے اور من گھڑت قصوں اور بے بنیاد نظموں کے ذریعے بنگالیوں کو رسوا اور ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ کپلنگ اس پروپیگنڈے کے روح رواں تھے۔ ان کی نظموں نے محب وطن سرلا دیوی کے زخم خوردہ دل کے ساتھ وہ کیا جو جلتی آگ کے ساتھ تیل کرتا ہے۔ جو جذبات و احساسات وہ مہاراشٹر سے لائی تھیں وہ یکبارگی بھڑک اٹھے۔ قومی غیرت و حمیت نے تقاضا کیا کہ اس قسم کی مطعون زندگی کب تک بسر ہوتی رہے گی۔ ہمارے ملک اور ہماری قوم پر اس طرح کے جو وار اگلے کیے جا رہے ہیں کیا ان کا دندان شکن جواب نہ دیا جائے گا؟ یہ سوچ کر مسٹر رڈیارڈ کپلنگ کو بالواسطہ کوئی جواب دینے کی بجائے انھوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں سے برادران وطن کو آگاہ کرنا شروع کیا۔ جگہ جگہ سبھائیں قائم کیں۔ لیکچر دیے اور لوگوں میں کام کرنے، ملک کا نام روشن کرنے اور عملی زندگی اختیار کرنے کی روح پھونک دی۔ اخبارات اور رسائل میں ایسے مضامین لکھنے شروع کیے جن سے ملک کی موجودہ نسلوں کے دلوں میں حرارت و حرکت پیدا ہو جائے۔ "بھارتی" نامی رسالہ میں جس کی وہ ایڈیٹر تھیں، مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جن کا عنوان تھا "انگریزی گھونسا بنام دیسی مکا"۔ آخر ان کی اس محنت شاقہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ شادی بیاہ میں جہاں ناچ مجرے ہوتے تھے، اب قومی اکھاڑے ہونے لگے اور اس طرح اس دیش بھگت معزز خاتون نے وطن کے ایک بڑے گروہ کو قومی رنگ میں ایسا رنگ دیا کہ دو سال کی مختصر مدت میں بنگال میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ ایک بار دسہرہ کے موقع پر آپ نے ویر اشٹمی کی تشریح کرتے ہوئے حاضرین جلسہ کو بتایا کہ دسہرہ در اصل ہمارے بہادروں کی یادگار ہے اور ہم سب ان ہی بہادروں کے خون اور نسل سے ہیں۔ اس لیے بہادری اور شجاعت کا دامن ہمیں کسی عالم میں بھی چھوڑنا نہ چاہیے۔ اگر یہ دامن چھوٹا تو ہماری صدا کی عزت پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائیگا اور اپنے ملک کو جو انقلاب کی موڑ پر آچکا ہے منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔"

اکتوبر ۱۹۰۵ء میں بنگال کی ادبی اور قومی ہیروئن سرلا کی شادی پنجاب کے قانونی اور سیاسی ہیرو پنڈت رام بھج دت چودھری بی۔ اے۔ ایل ایل بی کے ساتھ ہوئی۔ تو آپ نے اپنے

[illegible]

[illegible] کے کردار کا تجزیہ کیا جائے تو پتا
چلتا [illegible] پنجاب میں جس بات نے آپ پر سب سے زیادہ اثر کیا وہ
[illegible] انسانی طاقت موجود ہے ان کی قوتیں
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اپنے معزز صاحب زادے [illegible] کو [illegible]
لیڈروں کی گرفتاریاں، مارشل لا کے نفاذ اور ان ایام کی تخریب
اور مظالم کے ساتھ ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے
واپس کر دیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ نے وائسرائے ہند کو ایک خط لکھا جس میں کہا:
"جناب والا! مجھ کو آپ کی گورنمنٹ سے بنگالی ریجنٹ میں زخمیوں کو
طبی امداد کرانے کے صلہ میں ایک تمغہ عطا کیا گیا تھا جو کبھی میرے
لیے باعث فخر رہتا۔ مگر اب اس پر ناز کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔
میں تحریک خلافت کے حشر کو دیکھ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں
ہندوستان کے مسلمان زن و مرد اس بے انصافی سے کس درجہ
بے چین و مضطرب ہیں۔ اگرچہ میں ایک ہندو عورت ہوں مگر
میں نے اپنی قسمت کو اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کی قسمت
کے ساتھ جو اپنے مذہب کے تقدس کو خطرے میں دیکھ رہے ہیں
وابستہ کر دیا ہے۔ لہذا میں تحریک عدم تعاون پر عمل پیرا
ہو کر جو خلافت کمیٹی کی جانب سے نافذ ہوئی ہے نہایت
افسوس کے ساتھ آپ کی حکومت کے عطیہ (تمغہ) کو واپس
کرتی ہوں۔ علاوہ بریں اس اتحاد و محبت سے دستکش ہونے کی
ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں ایک پنجابی لیڈر کی بیوی ہوں جس کی
معصومیت پر مجھ کو کامل یقین ہے۔ مگر میرے شوہر کو
بغیر کسی جرم کے مجھ سے چھین لیا گیا۔ مارشل لا کے ایام میں میں
لاہور میں مقیم تھی۔ میں مضطرب اور غم خوردہ دلوں کے حلقہ
میں ان بہنوں سے ملا کرتی تھی جن کے خاوند، بھائی یا باپ ان
سے [illegible] کر دیے گئے تھے۔ میں ان فریادیوں کو تسلی دیا
کرتی تھی۔ میں نے اس [illegible] کارروائی کو بھی دیکھا جو لاہور
کی عدالتوں [illegible] قانون کے تحت قائم کی گئی تھیں۔
[illegible] ان ایام میں [illegible]
[illegible] میری آنکھوں میں پھرتے تھے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے خلاف [illegible] تحریک [illegible]
ختم ہو جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ مجھے معلوم ہے [illegible]
اور حکومت برطانیہ انصاف اور صداقت دونوں [illegible]
ہیں۔ جب تک بے انصافی کے یہ دو نمونے میری آنکھوں کے
سامنے موجود ہیں اور ان کی یاد تازہ ہے، میں گورنمنٹ کے
ساتھ ہر اتحاد سے انکار کرتی ہوں۔" (سرلا دیوی چودھرانی)

سودیشی کی تحریک۔

جنوری ۱۹۲۱ء میں جب مہاتما گاندھی کانگریس کے اجلاس
میں شرکت کے لیے لاہور میں موجود تھے، چودھرانی صاحبہ نے اپنا
بڑا لڑکا ان کی نذر کر دیا۔ کبھی یہ لڑکا راجہ مہاراجہ کے لڑکوں کی طرح
اونچے اونچے مدرسوں میں تعلیم پاتا، انگریزی کھانے کھاتا اور انگریزی
پوشاک استعمال کرتا تھا۔ مہاتما کی سرپرستی میں آتے ہی بالکل بدل گیا۔
اب وہ کھدر پوش ہے اور بجائے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے
تھرڈ کلاس میں سفر کرتا اور ملک کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتا
ہے۔ لڑکے کو تو باپو کے حوالے کر ہی دیا تھا، فروری ۱۹۲۱ء سے
پانچ یا چھ ماہ تک خود بھی مہاتما کے ہمراہ رہیں۔ پنجاب، یوپی وغیرہ
کا دورہ کرتی رہیں اور اس طرح ان کی ہمراہی میں سیاسی ٹریننگ
حاصل کرتی رہیں جس کے بعد ان کے قومی معتقدات اتنے پختہ
ہو گئے کہ سندھ، کراچی، حیدرآباد وغیرہ میں جہاں کہیں
خلافت کے سلسلے میں کی جانے والی ناانصافی پر تحریک نے وہاں
ایک ہلچل مچا دی۔

سرلا دیوی چونکہ [illegible] کی ایک بالکل فرد [illegible]
نے اپنے امیرانہ ٹھاٹ کو یک لخت بلند [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] ہو چکی ہے [illegible]

[illegible] تقریر کر چکی تھیں۔ [illegible]

[illegible] میں

[illegible] نے

[illegible] اس وقت [illegible]

[illegible] کی توہین۔ ان کا جنگ میں اپنا [illegible]

[illegible] وہ [illegible]

[illegible]

صاحب کے [illegible]

[illegible] صاحب نے [illegible]

حاضرین جلسہ پر بہت کچھ [illegible] تقریر [illegible]

زمین [illegible] تھا۔ اختتام جلسہ [illegible]

[illegible] کی ایک [illegible]

[illegible] نے جواب دیا [illegible]

ذات پات، چھوت چھات [illegible]

[illegible]

[illegible] کی حفاظت کے لیے [illegible]
سے دریغ نہ کریں گے۔

[illegible]

جنوری ۱۹۲۰ء اور [illegible] تعلیم [illegible]
کے لیے۔ ان حالات میں قومی مدارس اور اسکول کی بنیاد رکھی جا رہی
تھی یہ ایک زبردست [illegible] منظم ہو جاتا ہے [illegible]
صاحب نے فرمایا، "قومی تعلیم کے فرائض ادا کرنے میں [illegible]
کی ذمہ داریاں ہیں۔ عام تعلیم کے علاوہ قومی اسکولوں کی [illegible]
تعلیم میں صنعت و حرفت کا خاص خیال رہنا چاہیے تاکہ طلبا
کم سے کم اپنی تعلیم کے معاملے میں خود کفیل ہو سکیں۔ طلبا کو اس
قسم کی تعلیم دینا چاہیے کہ ان میں مذہبی برداشت پیدا ہو سکے
ہر ایک مذہب [illegible] جب [illegible]
ان میں ملک کی خدمت کے ساتھ [illegible] مساوات پیدا
کی جانی چاہیے تاکہ ہندوستان ایک متحد قوم [illegible] کے چلانے کے
قابل ہو سکے۔ ہماری تعلیم کا مقصد صرف [illegible] پیدا کرنا نہ ہو بلکہ
[illegible] ترقی
کے [illegible] سکیں اور
[illegible] کردار کی تعمیر میں مدد [illegible]
[illegible] ان کے سامنے نمایاں [illegible] تعلیم
نہایت ضروری ہے کیونکہ تعلیم یافتہ ماؤں کی گود میں پرورش پا کر
زندگی میں داخل ہونے والے افراد ہی سے [illegible] مستقبل کی [illegible]
پر [illegible] کی بنیادیں ڈالی جا سکتی ہیں۔"

[illegible] اس خاتون کی [illegible] وقت کے
[illegible]

[illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible] کے اپنے [illegible]
[illegible] کر [illegible] چلایا گیا [illegible]
[illegible] حقارت کی [illegible]
[illegible] سے [illegible]
[illegible] تمام ملک [illegible]
اگر [illegible] سے [illegible] کی خدمات کا لحاظ کیا جائے
تو [illegible] کا لحاظ ہے۔ [illegible] کے خیال سے
[illegible] کی عزت کا بچانے والا ہے [illegible]
[illegible] کام کرتی ہیں۔ [illegible] پڑھنے والی عورتوں کے
لیے ایک ایسا [illegible] کے خلاف کر [illegible] نہیں ہونے
دیا۔ بلکہ ہر وقت [illegible] کا ایک [illegible] ہے۔

اب ہمارا ملک آزاد ہو چکا ہے۔ ملک میں اتحاد و اتفاق
کے [illegible] کی آج بھی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح [illegible]
[illegible] کے زمانے میں تھی۔ اس وقت تو ہندوستان [illegible]
تھا۔ اب [illegible] کی [illegible] آزادی کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ اس
وقت سامراجیت کے خلاف جنگ کرتا تھا۔ آج ملک [illegible]
سے جنگ کرنا ہونا [illegible] کا ایک اہم تقاضا ہے۔ آج [illegible]
[illegible] کی [illegible] ضرورت ہے جن کی [illegible]
[illegible] سے [illegible] آزادی کی حفاظت کے
استحکام و ترقی کے لیے نہ صرف [illegible] رہے بلکہ
وقت [illegible] کی بڑی [illegible] سے بھی دریغ نہ کریں۔

غزل

شعور بریلوی

فطرتِ دل غم شناس، دیکھیے کب تک رہے
ذوقِ جنوں بدحواس، دیکھیے کب تک رہے

موسمِ جواں مضمحل، تاب و تواں منفعل
زیست کا چہرہ اداس، دیکھیے کب تک رہے

دیر و حرم کا یقیں، کشمکشِ کفر و دیں
زندگی دور از قیاس، دیکھیے کب تک رہے

دورِ خزاں کا خطر، خدشۂ برق و شرر
قلبِ چمن میں ہراس، دیکھیے کب تک رہے

پرسشِ زخمِ دروں، کاوشِ دستِ جنوں
خستہ دریدہ لباس، دیکھیے کب تک رہے

فطرتِ طبعِ سلیم، مرکزِ امید و بیم
تشنۂ وعدہ دل کی آس، دیکھیے کب تک رہے

[illegible] سحر آفریں، اور شعورِ حزیں
[illegible] یاس، دیکھیے کب تک رہے

فکر و فن

اشک مشتاق رحیم آبادی

سرکار ہی جہاں میں مرا آسرا نہ تھے
بت ہی تو آپ تھے کوئی میرے خدا نہ تھے

اب اُن کو اختلاف ہے مجھ سے تو کیا علاج
پہلے تو میرے اُن کے مسائل جدا نہ تھے

اک اور ہی جہان سے کھاتے رہے فریب
دعدے تو اُن کے ایسے کوئی خوشنما نہ تھے

اظہارِ مدعا سے جو بیتی وہ کیا کہیں
اپنا یہی قصور ہے بے مدعا نہ تھے

امیدِ التفات بھی اپنا ہی جرم تھا
ظاہر ہے ورنہ آپ ہماری رضا نہ تھے

یہ شکوہ ہائے تلخ کلامی بجا مگر
سچ کہیے آپ بھی کبھی شیریں نوا نہ تھے

دنیا کی ہر خوشی کا جہاں ساتھ چھٹ گیا
شاید وہاں حضور سے رہ نما نہ تھے

سرکار نے مزاج ہی ایسا بنا دیا
ہم ورنہ تلخ گوئی پہ مائل ذرا نہ تھے

اشکؔ جو واقعاتِ محبت تھے چشم دید
کچھ دن گزر گئے تو وہی اب فسانہ تھے

ایک حقیقت ایک کہانی

نجم الدین نقوی

بزرگوں نے بیان کیا کہ اورنگ زیب جب دکن کی مہم میں مصروف تھا تو اودھ کی ایک بہت قدیم بستی کے ایک سپاہی پیشہ جن کا مورث اعلیٰ نہ صرف ان کے زمانہ میں بلکہ اُن کے بعد بھی پشت در پشت اس خاندان کے لیے باعث فخر رہا، دہلی میں علوم مشرقیہ کی تحصیل کے لیے مقیم تھے۔ وہ ایک دن کسی گذرگاہ پر جا رہے تھے کہ ان کی شکل و شمائل دیکھ کر کسی بڈھے کو مدتوں بعد ایک نشاط دل مل گیا۔ ایک محذرۂ عصمت بے تحاشہ دل دے بیٹھیں۔ نامہ و پیام شروع ہوئے اور حریم ناز میں شرف باریابی ملا۔ صاحب زادے ناتجربہ کار، نوعمر اور انیلے تھے، پھر وطن سے سیکڑوں میل دور مسافرانہ زندگی گذار رہے تھے، کچھ ڈرے، کچھ سہمے، کچھ ہمت باندھی — کرم خصوصی گستاخانہ بے باکی دیتا رہا مگر بجز خجلت تقصیر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ قصہ مختصر وطن واپس آئے مگر چلتے وقت حسین کا پچھلا دامن یہ کہہ کر چھڑایا کہ اگر تم میرے وطن آ جاؤ تو بچھڑے ہوئے مل جائیں اور ایسے ملیں کہ تا قیامت جدا نہ ہوں۔ رخصت ہوئے اور دل حسرت پرورد کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔ سفر میں سوچتے جاتے تھے کہ کہاں دہلی اور کہاں اُن کا کوردیہہ۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی یہ بانوئے خجستہ صفات اپنے کو کیسے منزلوں کی صعوبات کی نذر کر سکے گی۔

وطن پہنچے، والدین سے ملے مگر کھوئے کھوئے سے بجھے بجھے بھولے سے محسوس ہوتے ع

وہ تھیں زمیں کی تو کبھی آسماں کی

قصبہ سے چار میل کے فاصلے پر آبائی زمینداری کا ایک گاؤں بہادر گنج تھا جو گنگا کے کنارے ہے۔ یعقوب نے جب اپنے یوسف کی یہ حالت دیکھی تو دل بہلانے اور مصروف رکھنے کے لیے گاؤں کے انتظامی امور سپرد کر دیئے مگر شرط یہ رکھی کہ ہر روز نماز صبح باپ کے ساتھ ادا کریں۔ لائق فرزند تعمیل حکم کرتے رہے۔ روزانہ علی الصباح تیز گھوڑے پر سوار ہو کر آنا، باپ کو سلام کرنا، نماز صبح کے بعد کچھ کھا کر پھر گاؤں کو واپس چلے جانا مدتوں جاری رہا۔

"گرہ کشا یانِ سلسلۂ سخن و تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن" سے معلوم ہوا کہ جب سید زادے دہلی چھوڑ کر وطن آ رہے تھے تو اُن کے حبیب نے وہ راستہ دریافت کیا جو اُن تک پہنچنے کی سبیل بن سکے۔ راستہ بتایا گیا مگر اس یقین کے ساتھ کہ وہ ناخوشۂ نازدانہ ایسی سخت منزلیں طے کر کے کیسے پہنچے گی۔ بتایا گیا کہ دہلی سے براہ جمنا الٰہ آباد تشریف لائیں اور [illegible] الٰہ آباد سے [illegible] بہتی ہوئی گنگا میں بیٹھ کر گنگا کی لہر پر بہتی ہوئی بہادر گنج تشریف لائیں جو عین گنگا کے کنارے واقع ہے۔

صاحب زادے راستہ بتا کر چلے آئے مگر اُس جانب دل کی لگن نے بے چین و مضطرب رکھا۔ کہتے ہیں کہ محبوب کو منزل تک پہنچانے میں وقت بہت مددگار ثابت ہوتا ہے مگر [illegible] بہادر گنج کا سارا کام منزل تک پہنچا دیا اور [illegible]

آتش شوق تیز تر ہوتی جاتی تھی۔

بہر کیف جب داستان [illegible] ... عمر یہ شرح [illegible] ...

[illegible]

... [illegible] ... تھا۔

... [illegible] ... کی منزلیں سے گذر

... مگر ... والی باتوں سے منزلوں سے دور رہے۔

البتہ یہ بات کیسی ہے کہ ایک شام کی جب آفتاب عالم تاب جلال کھاتا کا ڈوب رہا ہوا اُفق پر شفق بکھیرا ہوا تھا، ساون کی تیز ہوا میں گل کی لوکیں بیٹھی تھیں، کہاں میر کا شعر یاد آ رہے تھے۔

چلتے ہیں تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
ڈالی ڈالی پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

مگر ان کیفیات کا اثر مرحوم سید زادے پر کیا ہوتا۔ اس لیے وہ تو اُس کیفیت میں کھوئے ہوئے تھے جسے خواجہ میر درد نے اپنے اس شعر میں کیا خوب بیان کیا ہے

خلوتِ دل سے کچھ پا لینے حواس میں خلل
جشن بلائے چشم ہے، نغمہ وبالِ گوش ہے

دفعتاً اسی شام کو وہی جانی پہچانی بھولی صورت نظر آئی۔ وہی وردی، وہی چاندی کا عصا اور وہی چمکدار دستار بکھری ہوئی ... سامنے تھا۔ نظریں ملیں مگر یقین نہ آیا۔ کئی بار آنکھوں کو ملا اور ... سے صاف کیا اور پھر دیکھا تو وہی بھولی، وہی پیکر سامنے تھا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا "تم کیسے" جواب ملا۔ ع

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

بیگم صاحب تشریف لائی ہیں۔ وہ ... سنہرا ... شفق پر طنز کر رہا ... سید زادے ... سر برہنہ بھاگ کر گھاٹ پر پہنچے ... [illegible] ... اس پذیرائی کے جواب میں اُس طرف سے ... [illegible] ... مسکراہٹ ... ساتھ تھے۔

یوں وقت اس منزل پر پہنچا تو ہم لوگ کہتے، بابا کمال ہے ... کشش ... فارسی کا یہ شعر [illegible]

[illegible] ... عشق ... [illegible]

اور بابا یہ شعر ... پڑھتے ... اُن ... کے متعلق ... کسی نے کہا تھا۔

وضع داری کے یہ معنی ہیں کہ پیری میں بھی
نہیں مرکتے درِ دلدار سے جانے والے

اسد بابا کی یہ وضع داری آخر وقت تک قائم رہی۔ اُن کے بعد "صحبتِ شب کی چلی ہو گئی" شمع نہ گئی تھی سو کافی دن ہوئے وہ بھی خاموش ہو گئی۔

ہاں تو بات آگے بھی ہے۔ سید زادے نے اپنے عالی شان مکان میں اس انجمن کو اُتارا اور عقد کر لیا۔ مگر یہ معمول رہا کہ صبح کی نماز اپنے باپ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ یہ پابندی بھی تا بہ کے چلتی۔ سو کر اٹھنا ... تھا۔ باپ کے ساتھ صبح کی نماز کی پابندی میں خلل ... میں شامل ہوتے اور کبھی تاخیر حاضری ... باپ کو مطمئن کر دیتے تھے۔ مگر مشک کی خوشبو کو کون روک سکتا تھا۔ وطن والوں تک پہنچی۔ جن کے شانے لطیف تھے انھوں نے مزہ لیا اور جو تنگ ظرف اس خبر کو برداشت نہ کر سکے انھوں نے باپ کے کان بھرے۔ باپ نے حقیقت حال دریافت کی۔ بیٹے کو سچ بولنے کی تعلیم ملی تھی، سر جھکا کر شرمندگی کے انداز میں جرم محبت کا اقرار کیا۔ باپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا ... اور سکتے ہیں کہ مدتوں بات نہ کی۔ آخر وقت بیٹے ... خواہ ... پر سر رکھ کر رفع ملال کر دیا۔ باپ نے سینے سے لگایا اور بہو کو بھی سامنے بلا کر دعا دی۔

ہمارے میر صاحب کا جب انتقال ہوا تو ان کی آبائی ملکیت میں صرف وہی ایک گاؤں تھا جس کا اوپر ذکر آیا۔ بہو صاحبہ ... وطن آئیں تو انھوں نے ایک ... حویلی تعمیر کرائی ... جو اب بھی موجود ہیں۔ بہادر گنج میں جہاں وہ پہلے پہل آ کر رہی تھیں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی جو آج بھی باقی ہے۔ ... مرکز ... چاروں طرف اپنی دولت سے ... [illegible]

[illegible] سالِ بھی باقی نہیں [illegible] خاندان [illegible] جیسا کہ گزشتہ [illegible] ہے
[illegible] کا ذکر [illegible] ہے۔

بزرگوں نے ان بانئ سلطنت صفات کا اسمِ گرامی ماہ پیدا یا ماہ پیدی بتایا ہے۔ بعض لوگ مرحومہ کو مغل شاہزادی بتاتے تھے اور حاسد مجہول النسب ٹھہراتے تھے۔

ماہ پیدا کے شوہر کا انتقال پہلے ہوا۔ بیوہ ہونے کے بعد اس نیک بخت نے محل چھوڑ کر ایک گوشہ میں گنج خانہ آباد کیا جو آج بھی موجود ہے اور عرفِ عام میں گنج خانہ کہا جاتا ہے۔ بزرگوں نے بتایا کہ مرحومہ نے بیوگی کی زندگی آسیِ گوہاتی اور قرآن سرائی میں گزاری اور مرنے کے بعد یہ زلیخا قصبے سے باہر اپنے یوسف سے ہمیشہ کے لیے مل گئی۔ اُن کا مقبرہ اگرچہ آج منہدم ہو گیا ہے لیکن مقبرہ کی ہر خشت عشق کی عظمت اور اس کی پائندگی کی شاہدِ عادل بن کر زبانِ حال سے باربار یہ شعر سناتی ہے۔ ؎

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

بظاہر بات یہیں پر ختم ہو گئی مگر نہ یہ دنیا کبھی ختم ہوگی اور نہ اس کے قصّے۔ اس کہانی کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ہو یا جاگیردارانہ، زمانے کا ظالم ہاتھ کسی کو نہیں بخشتا۔ پھر ان دونوں نظاموں کی تعمیر میں تو خرابی کی صورت بھی مضمر تھی۔ جب دولت آتی ہے تو اپنا مزاج بھی ساتھ لاتی ہے، اس کے اپنے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ خاندان جس کا قصّہ میں نے سنایا ہے، زمانے کو اپنی تاریخ کے دامن میں بہت کم جگہ دیتا ہے، البتہ مشرقی تہذیب و تمدن اور اس کی صالح روایات کا اب تک حامل ہے۔ اس خاندان میں علماء، فضلاء، شعراء، ادیب، اچھے کنٹش [illegible] اور ذی ملکت پیدا ہوتے رہے ہیں اور ملک کی قومی زندگی میں اچھی حد تک یہ خاندان پورا تعاون دیتا آیا ہے۔

یہ داستان جس قصبے سے متعلق ہے وہ شہر لکھنؤ سے [illegible]

[illegible]
شاعری [illegible]
یہاں [illegible] تک [illegible] صاحب [illegible]
شمس العلماء مولانا سید [illegible] صاحب قبلہ [illegible]
متعلقہ لکھنؤ، حضرت لکھنؤ کا دفتر [illegible] اس بستی کو اپنے قدم سے شرف بخشا۔ یہاں بیٹھ کر اڑائے گئے، مرغ پالے گئے، پتنگ اڑائے گئے [illegible] کبوتر اڑائے گئے اور لکھنؤ سے یاری ہوئی۔ غرض [illegible] عیداَرات شب برات منائی رہی۔

یہاں تک کہ زمانے نے کروٹ بدلی اور وہ وقت آ گیا جب اس خاندان کی ملکیت میں صرف ایک آبائی گاؤں رہ گیا۔ ماہ پیدا کے تشریف فرما ہونے سے پہلے تھا۔ انہیں اسی وقت اس گھر میں ایک فرزند کی ولادت ہوئی۔ باپ نے شگون لے کر اپنے بزرگ کے نام پر اس کا نام رکھا۔ اس امید کے ساتھ کہ تاریخ اپنے کو دہرائے گی۔ صاحبزادے جب جوان ہوئے تو قبل اس کے کہ ایک مرتبہ پھر لکھے "جس طرف سے گزرتے ہو آنکھوں کے جھپکنے کی آوازیں آتی ہیں" کے مصداق ہو سکیں اور اگر یہ بات عملاً ظہور پذیر نہ ہوئی ہو تو اتنا تو یقینی ہے کہ ان صاحبزادے کی جوانی کو دیکھ کر کچھ لوگ آہیں ضرور بھرتے تھے اور کچھ لوگ ع

کر شمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا است

پڑھنے لگے تھے۔

باپ نے بزرگ کے نام پر اس فرزند کا نام رکھا کہ امید کی تھی کہ اس خاندان سے جو ٹوٹا ہوا ناطہ ہے وہ [illegible] حال کی [illegible] [illegible]

جہاں تک ان کے حسن و جمال کی بات ہے [illegible]
کہ جب وہ آئینہ کے سامنے جاتے ہیں تو [illegible]
شعر یاد [illegible] ہو جاتا ہے۔ ؎

[illegible]
[illegible]

جشن آزادی

فضہ قریشی

آؤ سے چلو یاں سے طائرانِ آزادی
بلا رہا ہے تمھیں آسمانِ آزادی
قدم قدم پہ سجا دیا حسن و عقیں
سراب زیست میں اے رہروانِ آزادی
[illegible] کے نغمے، کھلاؤ جشن کے پھول
[illegible] پہ اڑاؤ نشانِ آزادی
چمن چمن ہے بہاروں کا دل نشیں مرکز
ہر ایک سمت ہے خنداں دیارِ آزادی
مہک رہی ہیں فضائیں شمیم جسم لیے
نکل پڑے ہیں گھروں سے بتانِ آزادی
فضائے تاج و اجنتا [illegible]
سہانے گیت سنائے زبانِ آزادی

تمہارا عہد ہے تاریخ کا حسیں پہلو
تمہارے دم سے ہے قائم جہانِ آزادی
سبق اخوت و الفت، پیامِ امن و امان
یہ ارضِ پاک ہے اک نشانِ آزادی
وقار [illegible] وفا، [illegible]
تمہارے نام کی عظمت ہے جانِ آزادی
[illegible]
تمہارے واسطے یہ امتحانِ آزادی
[illegible]
[illegible] آزادی
[illegible]
[illegible] آزادی
[illegible]
[illegible]
[illegible] آزادی

نظم آزادی

کلیمہ تسنیم

رات ڈھلی اور صبح ہوئی
کیسی روشن روشن صبح
اُجلی اُجلی، صاف، معطر
منزل منزل حسن گلی تر
دفتر، مکتب اور [illegible]
جگمگ جگمگ کرتے منظر
آزادی کی ایسی کہانی
ایسی حقیقت ایسا فسانہ
کس نے سنا اور کس نے دیکھا
[illegible]
چار دشا سے آواز آئی
ہم نے سنا تھا ہم نے دیکھا
[illegible]
[illegible]
[illegible]

نامہ بر سے

حمید عظیم آبادی

[illegible]

پدماوت تنقید کی روشنی میں

کاظم علی خاں

ملک محمد جائسی ہندی شاعری کی بھگتی تحریک کے پریم مارگی سلسلے کے اہم ترین شاعر ہیں۔ پدماوت ان کا منظوم شاہکار ہے جو شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں وجود میں آیا۔ ہندی شاعری کے پریم مارگی سلسلے میں پدماوت سے قبل کرم از کم چار، 'مرگاوتی'، 'مدھو مالتی'، 'مگدھاوتی' اور 'پریماوتی' نامی چار مشہور نظموں کا وجود ثابت ہے۔ پدماوت کو بخوبی سمجھنے میں ان تمام نظموں کے اہم خصوصیات کا اجمالی جائزہ مفید معلوم ہوتا ہے۔ ان نظموں کے بنیادی خصوصیات کی مدد سے ہم اس ادبی مذاق و مزاج کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس میں پدماوت لکھی گئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان عصری رجحانات و فکری میلانات کی نوعیت کا بھی پتہ لگ سکے گا جن سے پدماوت معنوی طور پر متاثر ہوئی ہے۔

پدماوت کی طرح یہ تمام نظمیں بھی دراصل منظوم کہانیاں ہیں۔ پریم مارگی ہندی شاعری کی یہ منظوم داستانیں مسلمان صوفیا پر ہندو تہذیب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ مسلمان صوفیا جب ہندو تہذیب و فلسفہ سے متاثر ہوئے تو انھوں نے صوفیانہ تصورات کو تمثیلی پیرائے میں ان کہانیوں کے کردار و واقعات کے پردے میں پیش کیا۔ ان منظوم تمثیلوں کے واقعات و کردار بلکہ ساری فضا ہندو تہذیب اور ہندو سماج کی عکاسی کرتی ہے۔

یہ منظوم کہانیاں عام طور پر [illegible] ... اور صاحب جمال [illegible] ... لیکن اصل محبوب یا مقصود تک سالک ... مشکلات و مصائب کی تمثیل میں طریقت و معرفت کے منازل کی ... کوشش کیا ہے۔

پریم مارگی سلسلے کی یہ منظوم داستانیں اپنی پیش رو یا شری سلسلے کی نظموں کے مقابلے میں فنی اور لسانی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ان کی زبان عام طور پر اودھی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن رقمطراز ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ ادبی حیثیت سے پریم مارگی صوفیانہ شاعری ایک ارتقا کا پتہ دیتی ہے۔ مسلمان شعرا نے ہندو تمدن کو اپنایا اور ہندو دھرم کی تلمیحات اور اصطلاحات سے کر محبوب ازل کی عظمت اور اس کی تمثیل میں پیش کیا۔ برج ... شاعری ... [کی] روایت ... [کے] بموجب یہیں عورت نہ کہ مرد (یعنی محبوب ازل) کے عشق کی کہیں برہ کے روپ میں جدائی کا راگ الاپا ہے۔"[1]

یہ منظوم کہانیاں طبع زاد ہونے سے زیادہ قدیم روایتی قصوں پر مبنی ہیں۔ ان میں بعض تاریخی واقعات یا تاریخی شخصیتوں کے نام ضرور ملتے ہیں۔ لیکن یہ نظمیں دراصل تاریخ سے زیادہ تخیل پر مبنی ہیں۔ تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان کہانیوں کی اہمیت زیادہ نہیں۔ البتہ ادبی اور تہذیبی اعتبار سے ان پریم مارگی منظوم قصوں کی کافی اہمیت ہے۔ پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

"... مرگاوتی ... اور پدماوت کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ محض زبان ہی کے لحاظ سے نہیں خیالات اور جذبات کے لحاظ سے بھی ان میں ہندوستانی کلچر کے بہترین عناصر موجود ہیں۔"[2]

ہندی ادب میں پریم مارگی سلسلے کی یہ تمام کہانیاں اہم ہیں لیکن ملک محمد جائسی کی پدماوت شہرت و مقبولیت میں ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ پدماوت ملک محمد جائسی کا عظیم ادبی شاہکار ہے۔

---

[1] ہندی ادب کی تاریخ: ڈاکٹر محمد حسن۔ طبع اول ۱۹۵۸ء ص ۸۲ [2] ذوق ادب اور شعور: سید احتشام حسین۔ ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ۔ ۱۹۵۵ء۔ ص ۹۹

[illegible]
[illegible]
[illegible] ہے۔ پدماوت
کا بغور مطالعہ ان کے مصنف کی حیات و شخصیت کی روشنی میں اس
کو جانچنے پرکھنے کے ساتھ ہی ساتھ ان تہذیبی، فکری، سماجی اور
تاریخی عوامل و محرکات کا بھی جائزہ لینا چاہیے جن کے نتیجے میں پدماوت
وجود میں آئی۔ سائنٹفک تنقید ادب کے "کیا" اور "کیسا" کے ساتھ
ساتھ ادب کے "کیوں" کے جوابات بھی فراہم کرتی ہے۔

ملک محمد جائسی شیر شاہ سوری کے ہمعصر تھے۔ وہ موجودہ
اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی کے مشہور مقام جائس کے باشندے
تھے۔ اسی نسبت سے انھیں جائسی کہا جاتا ہے۔ بکرمی سن کے مطابق
ان کا دورِ حیات سنہ ۱۵۴۹ سے سنہ ۱۵۹۹ کی درمیانی مدت پر محیط ہے۔[1]
قاعدہ کے مطابق بکرمی سن میں سے ۵۶ یا ۵۷ برس گھٹا دینے سے
عیسوی سن کے لحاظ سے ان کی مدتِ حیات تقریباً ۱۴۹۲ء تا ۱۵۴۲ء
متعین ہو سکتی ہے۔ ہجری سن کے مطابق ملک محمد جائسی کا سال وفات
قاضی نصیر الدین جائسی نے سنہ ۹۴۹ھ بتایا ہے۔

(ہندی ادب کی تاریخ ص: ۸۵)

ملک محمد جائسی نے پدماوت میں رانی ناگ متی اور پدمنی کے
جسمانی اور ظاہری حسن کو ایک بے وقعت شے قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ
اس سے دل نہ لگانا چاہیے۔ رانی ناگ متی اپنے حسنِ ظاہری پر غرور کرتی
ہے ملک محمد اسے "دنیا دھندا" قرار دیتے ہیں۔ علاء الدین خلجی کا
پدمنی کے ظاہری حسن پر فریفتہ ہونا ان کے نزدیک مایا موہ کے مترادف
ہے جو قابلِ تعریف نہیں۔ ظاہری حسن اور جسمانی خوبصورتی کی جانب
ملک محمد جائسی کا یہ مخالفانہ رویہ عجب نہیں کہ ان کی بدصورتی کے
پیچیدہ نفسیاتی ردِ عمل کا نتیجہ ہو۔ اس لیے کہ بچپن ہی میں چیچک نے
ان کے چہرے کو داغدار بنا دیا تھا اور انھیں ایک آنکھ سے محروم کر دیا تھا۔

ملک محمد جائسی شیخ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] زندگی بسر کی ہے۔ وہ انھیں سے [illegible]
مرید ہو گئے تھے۔ شہر کے بجائے جنگل میں قیام کرنا ان کے صوفیانہ
طبیعت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کی وفات بھی ایک جنگل میں ہوئی تھی۔
امیٹھی[3] کے راجہ ان کے کشف و کرامات کے قائل تھے۔ راجہ کا خیال تھا
کہ ملک محمد جی کی دعاؤں کے اثر سے وہ صاحبِ اولاد ہوا اسی لیے وہ
ان کی کافی قدر و منزلت کرتا تھا۔ جائسی کی حیات و شخصیت کے یہی
اثرات ان کی ادبی تخلیقات میں تصوف کے اظہار و بیان کے اہم محرکات
قرار دیے جا سکتے ہیں۔

ملک محمد جائسی سے تین کتابیں منسوب ہیں (۱) پدماوت
(۲) اکھراوٹ اور (۳) آخری کلام۔ پدماوت تمثیل کے پردے میں
صوفیانہ تصورات پیش کرتی ہے۔ اکھراوٹ میں بھی تصوف کے مسائل
بیان کیے گئے ہیں۔ آخری کلام اسلامی تعلیمات سے متعلق ہے۔ ملک محمد
جائسی کی کتابوں میں تصوف کا یہ غلبہ جن اسباب کا نتیجہ ہے ان کے پیچھے
ملک محمد جائسی کے عہد کی فکری، تہذیبی اور سماجی تاریخ میں تلاش کیے
جا سکتے ہیں۔

عرب کی سامی تہذیب کا زائیدہ اور عجم کی آریائی تہذیب کا پروردہ
یہی تصوف جب ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد و قیام کے نتیجے میں
ہندوستانی ویدانت فلسفہ سے دوچار ہوا تو اسلامی تصوف اور ہندو
ویدانت فلسفہ نے ایک دوسرے کو کافی متاثر کیا۔ ہندو ویدانت فلسفہ
بھی آریائی تہذیب میں رنگا ہوا تھا۔ اسلامی تصوف اور ہندو ویدانت
فلسفہ کے مشترک آریائی عناصر تصوف اور ویدانت کی قربت کا سبب
بنے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان صوفیا ہندو تہذیب و فلسفہ کے اثرات قبول
کرتے رہے اور ہندو فلسفیوں نے تصوف کے اثرات کو قبول کیا۔

---

[1] ہندی ادب کی تاریخ، ڈاکٹر محمد حسن۔ طبع اول ۱۹۶۶ء ص ۸۵
[2] " " " ، ڈاکٹر محمد حسن۔ " ص ۸۵۔ [3] امیٹھی ایک چھوٹا قصبہ ہے لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے (ڈاکٹر [illegible])

[illegible] ہندو فلسفہ پر اسلامی اثرات کی نشاندہی اس طرح
[illegible] سے کی گئی ہے۔[1]

اسلامی تصوف اور ہندوستانی ویدانت فلسفہ کے باہمی اختلاط
اور تبادلہ فکری اور تہذیبی سرچشمے ہیں جس سے ہندی شاعری نے بھی
کمال میں کبیر، ملک محمد جائسی اور قطبن وغیرہ کی شعری تخلیقات نے فروغ
اور مواد حاصل کرتی رہیں۔ ہندی شاعری کے پریم مارگی مسلمان صوفی
شعرا کی نظموں میں ہندو تہذیب و فلسفہ کا غلبہ انہیں عوامل و اثرات
کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ہندی ادب میں کبیر، ملک محمد جائسی اور دوسرے
پریم مارگی مسلمان صوفیا کی شاعری میں ہندو ویدانت اور اسلامی
تصوف دونوں کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر
ظہیر الدین احمد علوی کے حسب ذیل نظریے کو تسلیم کرنے میں بڑا تامل ہوتا ہے:[2]

صوفیا کی شاعری زیادہ تر فارس کے خیالات سے متاثر تھی۔ اس کا
پودا ہندوستان کی سرزمین اور آب و ہوا میں بار آور نہ ہو سکا۔
اسی وجہ سے ہندی ادب میں صوفیانہ شاعری نمایاں نہ ہو سکی۔[3]

پدماوت کے داخلی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شیر شاہ سوری کے
عہد حکومت میں لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے پدماوت
کا سن تصنیف [illegible] تحریر کیا ہے جو کسی طرح صحیح نہیں۔[4] کافی بحث
تمحیص کے بعد پنڈت رام چندر شکل نے پدماوت کا سن تصنیف
۹۴۷ھ بتایا ہے جو درست معلوم ہوتا ہے۔[5] ڈاکٹر گیان چند جین
نے بھی یہی سن صحیح تسلیم کیا ہے۔[6]

پدماوت میں راجہ رتن سین اور سنگل دیپ کی راجکماری پدمنی
کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سنگل دیپ

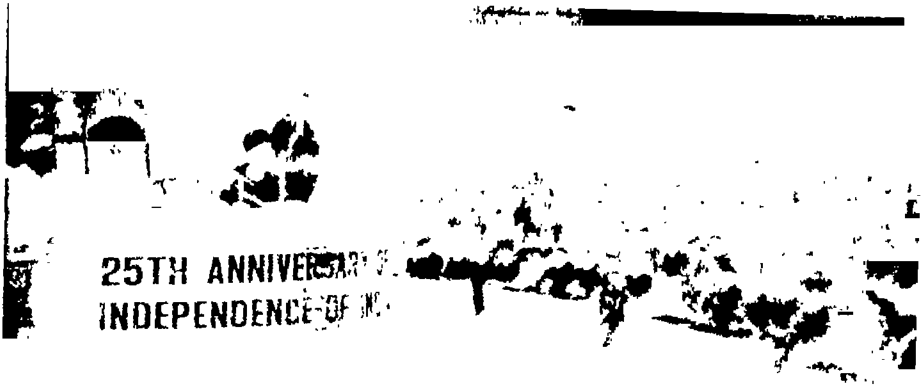
[illegible]
[illegible]
برہمن کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اس برہمن نے [illegible] طوطا چتوڑ [illegible]
سین کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ایک دن رتن سین کی رانی ناگ متی
نے خوب بناؤ سنگار کیا اور طوطے سے اپنے حسن کی داد چاہی۔ طوطے نے
اپنی اصل مالک راجکماری پدمنی کے حسن کی تعریف کی۔ رتن سین پدمنی
کے حسن سے آگاہ ہوا تو اس پر نادیدہ عاشق ہو گیا۔ طوطے کی رہنمائی
میں رتن سین بھیس بدل کر سنگل دیپ پہنچا اور پدمنی کو بیاہ لایا۔

ادھر دہلی کے سلطان علاء الدین خلجی کو رگھو چیتن پنڈت نے
پدمنی کے حسن کا حال سنا کر پدمنی کا گرویدہ کر دیا۔ سلطان ایک مرتبہ آئینہ
میں پدمنی کی جھلک بھی دیکھ چکا تھا۔ سلطان نے حیلے سے راجہ رتن سین
کو قید کر لیا اور پدمنی کو کٹنیوں کے ذریعے پھسلانا چاہا مگر پدمنی رضامند
نہ ہوئی۔ رتن سین کے زمانۂ اسیری کے دوران دیوپال نے بھی پدمنی
کو اپنے پھندے میں پھنسانا چاہا۔ پدمنی نے ہوشیاری سے رتن سین کو قید سے
آزاد کرا دیا۔ رتن سین نے چتوڑ گڑھ آ کر دیوپال سے جنگ کی۔ اس
جنگ میں دیوپال مارا گیا لیکن رتن سین بھی زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔
رتن سین کی چتا میں جب آگ دی گئی تو پدمنی بھی اپنے شوہر اور محبوب کے
ساتھ ستی ہو گئی۔ سلطان علاء الدین جب چتوڑ گڑھ پہنچا تو وہاں اسے
حسین و جمیل پدمنی نہ مل سکی البتہ پدمنی کی بجائے راکھ کا ڈھیر ملا۔

پدماوت کی یہ کہانی تمام تر تمثیلی ہے۔ اس کے کردار دراصل
کے پردے میں تصوف کے مسائل (عشق و ہجر، لذت وصل، منزل
عرفان کی راہ کی دشواریاں وغیرہ) بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی تمثیلی

---

۱ اے شارٹ ہسٹری آف دی انڈین پیپل: ڈاکٹر تارا چند۔ میک ملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ (۱۹۶۵ء) ص ص ۲۲۱-۲۲۲۔
۲ اردو شاعری کا سماجی پس منظر: ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ کاروان پبلشرز الٰہ آباد (۱۹۶۶ء) ص ص ۱۲۸ [illegible]
۳ تاریخ ادب ہندی: ظہیر الدین احمد علوی۔ شائع کردہ رام نرائن لال الٰہ آباد (۱۹۴۲ء) ص ۵۶
۴ ہندوستانی لسانیات: ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ (مارچ ۱۹۶۰ء) ص ۳۰
۵ ہندی ادب کی تاریخ: ڈاکٹر محمد حسن (۱۹۵۵ء)
۶ تجزیے: ڈاکٹر گیان چند جین۔ ادارۂ فروغ اردو لکھنؤ (۱۹۷۳ء) ص ۲۲۳



آزادی کے ۲۵ سال مکمل ہونے پر ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو نئی دہلی میں پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں جو تقریب منعقد ہوئی اسے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی خطاب کر رہی ہیں۔ ڈائس پر صدر شری وی۔ وی گری، نائب صدر شری جی۔ ایس پاٹھک اور لوک سبھا کے اسپیکر شری جی۔ ایس ڈھلوں بیٹھے ہیں



جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کے اعزاز میں ایک تقریب دہلی کے لال قلعہ میں ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو منعقد ہوئی جس کا افتتاح صدر جمہوریہ شری وی۔ وی گری نے کیا اور ایک ہزار سے زیادہ مجاہدین آزادی کو جو اس موقع پر مدعو کیے گئے تھے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے تامر پتر (اعزاز نامہ) دیے۔ (بائیں) تصویر میں وزیر اعظم ہریانہ کے شری گلاب سنگھ کو تامر پتر پیش کرتے ہوئے



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو لال قلعہ دہلی۔

گورنر اتر پردیش شری ششی کانت ورما ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کی
خصر





گورنر اتر پردیش شری ششی کانت
ورما آزادی کی ۲۵ ویں سال گرہ
کے موقع پر ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو
راج بھون لکھنؤ میں پرچم کشائی کرتے
ہوئے



ب کر رہی ہیں

دھان بھون لکھنؤ کے ودھان سبھا ہال میں مجلس قانون ساز کے اراکین کے
کو خطاب کرتے ہوئے





دہلی میں آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کی تقریبات میں شرکت کرنے والے اتر پردیش کے مجاہدین آزادی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ

وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی مجاہدین آزادی کو اس خصوصی تقریب میں تامر پتر دے رہے ہیں جو ودھان بھون لکھنؤ میں ۱۵ اگست ۱۹۷۲ کو منعقد ہوئی تھی۔ تامر پتر حاصل کرنے والوں میں بلیا کے ۱۱۶ سالہ مجاہد آزادی شری رامیشور مصر (دائیں) اور نینی تال کے شری اپورنانند تیواری شامل تھے



[illegible]

[illegible]	[illegible]
گہہ سو ہیں جیو دو نگ ناہ	جو ہو جیک کو ز کرن لیا
مگر پاتی سید ہی وہندا	با پاس ... بہت بد
ملکہ دوت سون سیلا ...	ای علاء الدین سلطان ...

جائسی کے مطابق پدمنی عرفان الٰہی کی علامت ہے، ناگ متی دنیا دھندا ہے، راگھو چیتن شیطان کا بہروپ ہے اور سلطان علاء الدین مایا کا پرتو۔ ڈاکٹر محمد حسن نے پدماوت کے مرکزی خیال کے بارے میں لکھا ہے:

"پدماوت گویا اس خیال کو ظاہر کرنے کے لیے نظم کی گئی ہے کہ جب تک جسم اور مادی دنیا کی ہوس اور وسائل ہے اس وقت تک نور الٰہی یعنی پدمنی تک رسائی ممکن نہیں۔ جب انسان کا عشق صادق ہوتا ہے اور وہ دنیاوی مسائل سے اور مادی زندگی کے پھندے سے نکل جاتا ہے تبھی وہ نور الٰہی تک پہنچ سکتا ہے۔"[1]

جائسی نے ان متصوفانہ تصورات کو پدماوت میں تمثیلی طور پر بڑی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ چتوڑ انسانی جسم کی علامت قرار دی گئی ہے۔ رتن سین اس کی روح ہے۔ پدمنی عرفان الٰہی ہے۔ طوطا گرو کا اور ناگ متی مایا موہ ہے۔ رتن سین جب مایا موہ (ناگ متی) سے منہ موڑتا ہے تو عرفان حقیقی (یعنی پدمنی کو) حاصل کرتا ہے۔ اس کے برخلاف سلطان علاء الدین مایا موہ میں الجھا رہتا ہے یعنی وہ پدمنی کے ظاہری حسن اور جسمانی خوبصورتی کی لالچ میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ کامیاب نہیں ہوتا۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت جس کی زبان ہندی اور رسم خط فارسی (اردو) ہے ہندو تہذیب کے عناصر کو بڑے دلکش انداز سے پیش کرتی ہے اور ہندوستان کی مشترک ہندو مسلم تہذیب کی شاندار یادگار ہے۔ ملک محمد جائسی جیسے مسلمان صوفی کا ہندی زبان میں ہندو

[illegible] ہند مسلم تہذیب [illegible] کی تفصیل طور پر مقدمہ میں بیان کی گئی۔

ہندو مسلم میل ملاپ کی یہ فضا صرف ہندی شاعری تک محدود نہیں بلکہ مسلمانوں پر ہندو تہذیب و روایات کے اثرات دکنی زبان (جسے کسی حد تک اردو کی ابتدائی شکل کہا جا سکتا ہے) میں لکھی جانے والی مشہور کتاب نورس میں بھی نظر آتے ہیں۔ نورس بیجاپور کے حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی فن موسیقی سے متعلق کتاب ہے۔ اس کے گیتوں میں ہندو دیوتاؤں مثلاً اندر، سرسوتی، گنیش، لچھمی، ترلوچن (شیو) وغیرہ کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو گیت نمبر ۲۵، ۲۶، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۴، ۴۹، ۵۰ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں مسلمان بزرگوں کا بھی ذکر عقیدت کے ساتھ کیا گیا ہے۔[2]

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ کتاب نورس بقول ڈاکٹر نذیر احمد ۱۰۰۸ ہجری اور ۱۰۲۰ ہجری کے درمیان لکھی گئی تھی جبکہ پدماوت کا سن تصنیف ۹۴۷ ہجری ہے گویا نورس اور پدماوت کے سن تصنیف میں نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصہ کا فرق ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنے عہد کے ہندو مسلم میل ملاپ کی شاندار روایات کی امین نظر آتی ہیں۔ ان دونوں کا مطالعہ دور حاضر میں قومی یکجہتی کی فضا کو قائم و برقرار رکھنے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ظہیر الدین احمد تاریخی اعتبار سے پدماوت کے متعدد اجزا کو درست نہیں مانتے۔[3] بہرحال ادبی لحاظ سے پدماوت اپنی پیشرو ہندی نظموں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ فکری اعتبار سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ فنی نقطہ نظر سے بھی پدماوت ملک محمد جائسی کے ادبی شعور کی پختگی کی روشن دلیل ہے اس میں نہ صرف صنائع بدائع کا فنکارانہ استعمال کیا گیا ہے بلکہ انداز بیان کے بھی حسین نمونے ملتے ہیں۔ پدمنی کے وطن سنگلدیپ (لنکا)

---

۱ عہد وسطیٰ کی ہندوستانی شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر، ڈاکٹر محمد حسن (۱۹۷۶ء)، ص ۱۳۲
۲ کتاب نورس، مصنفہ ابراہیم عادل شاہ ثانی۔ مرتبہ ڈاکٹر نذیر احمد۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ (اپریل ۱۹۵۵ء)، ص ۲۰
۳ تنقید پدماوت، ظہیر الدین احمد، رام نرائن لال الہ آباد (۱۹۶۱ء)، ص ۱۲۷

غزل

سیف بجنوری

ڈال دی ہے غم الفت نے پناہوں کی طرح
مطلق تیغ کرم ہو گئے شاہوں کی طرح

ہر نفس محفل امید سجائے رکھیے
کس لیے زیست ہو ویران سی راہوں کی طرح

مری خوبیِ تقدیر نہیں تو کیا ہے
تجھے ناز ہے بے گناہوں کی طرح

شوق دیدار کی حد ہے کہ سر راہ گزر
منتظر بیٹھا ہوں میں چشم براہوں کی طرح

عشق خوددار کی یہ شان ہے اللہ اللہ
حسن مغرور ملا خود ہی خواہوں کی طرح

گردش وقت بھی یک رنگ نہیں ہے اے دوست
رخ بدل لیتی ہے یہ تیری نگاہوں کی طرح

ایک بہرے پہ بھی فریاد اثر کیا کرتی
بے اثر ہو گئی فریاد بھی آہوں کی طرح

دیکھ کر سیفؔ بدلتا ہوا رنگ ماحول
منہ سے اشعار نکلتے ہیں کراہوں کی طرح

بہادرپور ملک

غزل

جمیل حسن

خرد کا پاس جنوں نے کیا کیا نہ کیا
مگر کام جذب وفا نے لیا لیا نہ لیا

تمہارے ظلم و ستم ہی کی پردہ داری میں
مریض عشق کا کہنا ہے جیا جیا نہ جیا

لکھا تو ہے دل مضطر کا حال رو رو کے
جواب نامہ کا اس نے دیا دیا نہ دیا

جنونِ عشق بڑھا ہے تری زلفِ مشکیں سے
تری بلا سے گریباں سیا سیا نہ سیا

دل شکستہ لیے جا رہا ہوں محفل میں
قبول اس نے یہ تحفہ کیا کیا نہ کیا

پلانے جب ترے میکدے میں اے ساقی
کسی نے جام اجل کا پیا پیا نہ پیا

تم سلام محبت میں احتیاط ہے شرط
سلام اس نے تمہارا لیا لیا نہ لیا

ملاقات

گربچن چندن

جب ساون کی ایک ایسی شام تھی جب طبیعت آپ ہی آپ مسکرانے لگتی ہے۔

میری آنکھ کھلتے ہی آسمان پر پھیلتے ہوئے بادل نظر آئے جیسے برفانی بچے روئی کی وردیاں پہنے گشت لگا رہے ہوں۔ ان کے ڈر سے سورج کو سامنے آنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اوپر سے قبل موسلا دھار بارش ہوئی جیسے شریر بچوں نے ہنستے ہوا آبشاروں کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا ہو۔ دیر تک بدن آبشار فضا کے ہم دوش رہے اور دو ڈھائی گھنٹے رم جھم کا سماں بندھا رہا۔ اب مطلع صاف ہو گیا تھا برفانی بچے کہیں اور چلے گئے تھے اور سورج کی تپش اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

اگر میں بچہ ہوتا تو باہر لان کے برساتی تالاب میں نہانے نکل جاتا۔ لڑکا ہوتا تو دوستوں سے جا ملتا یا کالج کا طالب علم ہوتا تو اپنے دوست ملا کے یہاں جا کر اس کی کزن سرلا سے گپ بازی اور ملک کی سیاست پر باتیں کرتا اور اگر میں نوجوان شوہر ہوتا تو اپنی بیوی کو ساتھ لے کر پارک میں جاتا۔ لیکن میں تو ایک تھکا ہوا [illegible] تھا جس کی بے بسی کو [illegible] نے پن کے کچھ اور [illegible] تھا۔ [illegible] جلد [illegible] میں [illegible] کرنا تھا چنانچہ [illegible] چائے بنانے کو [illegible] اور عمر خیام سے راز و نیاز کی باتیں کرنے کا [illegible] ہو کے رہ گئی۔

[illegible] کے بہانے

چار دن ہیں گزرے ہنس کر عاقبت کی خبر خدا جانے
ہیں ایسی [illegible] کے بہانے۔ [illegible] بیٹھنے والے خیام نے کتنی پتے کی بات کہی ہے۔ سرلا اور میں نے زندگی بھر کا تعلق قائم کرنے کی ٹھانی تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا حالانکہ اس کی دادی مجھے بے حد پسند کرتی تھی۔ ہم دونوں کو اکٹھے باتیں کرتے، چائے پیتے اور ہنسی مذاق کرتے دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ مدتوں سے وہ نزاکت میری تعریف کیا کرتی تھی۔ اتفاق دیکھیے کہ شروع شروع میں جب وہ گاؤں سے سرلا کو لے کر آئی تو میرا ملا کے ہاں جانا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ اسے تو اپنی پوتی کی پاسبانی کرنا تھی لیکن جب میں نے سرلا کو اپنے کالج میں داخلہ دلوا دیا اور کتابیں وغیرہ حاصل کرنے میں اس کی بھرپور مدد کی تو وہ میری مداح ہو گئی۔ صبح و شام مجھے دعائیں دیتی اور بات بات پر سرلا کو مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے کہتی۔ یہ بزرگ لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ ان جانوں کے بھی خود اور جان پہچان والوں پر مہربان ہو جاتے ہیں۔

لیکن ملا کی والدہ کو سرلا سے میرا بڑھتا ہوا میل جول ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ سرلا کا رشتہ اپنی برادری کے ایک لڑکے سے کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ ہماری راہ میں کوئی نہ کوئی روڑا اٹکاتی تھی۔ جب تک دادی وہاں رہی اس کی کوئی دال نہ گلی لیکن جب دادی واپس گاؤں چلی گئی تو ملا کی والدہ تو دن ہی سرلا کی نگرانی کرنے لگیں۔ وہ ملا کے کان بھی میرے خلاف بھرنے لگیں سرلا مجھ سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی کہ ہم ملاقات کے لیے کوئی

ہکائی تدبیر کر ہی لیتے تھے۔ ہمارا اعتقاد تھا کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور خواہ کیسی بھی مخالفت ہو ہم ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کا پیمان پورا کریں گے۔ دادی اماؤں سے سرلا کو جو بھی خط لکھواتی اس میں میرا ضرور حال پوچھتی۔ اور ہم سمجھتے تھے کہ دادی کی دعائیں ہماری ہر مشکل کو دور کر دیں گی۔ وہ گاہے بگاہے آ بھی جاتی اور ہر بار مجھے جتا دیتی "تمہیں دیکھے بہت دن ہو گئے تھے اس لیے چلی آئی۔"

بی۔ اے۔ کرنے کے بعد میں نے ایم۔ اے کا امتحان دیا لیکن فیل ہو گیا۔ سرلا بی۔ اے میں فرسٹ ڈویژن لے کر کامیاب ہوئی۔ دادی اماؤں سے شہر آئی اور ایک بڑا پرلطف جشن منایا گیا۔ کئی دوست بار بار مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ مجھے اپنی ناکامی کا دکھ بھول گیا تھا اور میں ان مبارک بادوں سے مسرور ہو رہا تھا۔ مجھے ایک اور خوشی ہو رہی تھی کہ سرلا میرے ہی کالج میں ایم۔ اے میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ لیکن ——— یہ میرا اٹل قسمتوں کے پہلے ——— سرلا کا ایک غیر ملکی وظیفے کے لیے انتخاب ہو گیا اور ان کی والدہ کے مجبور کرنے پر وہ امریکہ چلی گئی۔ اس کا نصاب دو سال کا تھا لیکن اس میں نہایت اچھی کامیابی پانے کے سبب اسے وہاں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا وظیفہ مل گیا اور وہ تین سال کے لیے اور رک گئی۔ اس دوران میں والد پر میرے رشتے کے لیے تقاضے ہونے لگے جو ہم کسی نہ کسی طرح جھیلتے رہے لیکن والد کو ایک ہارٹ اٹیک ہو گیا جس کے بعد وہ ہر معاملے میں عجلت پسند ہو گئے۔ سب احباب و اقارب کے سمجھانے پر میری ایک اور گھر میں شادی ہو گئی۔

شادی کے ایک سال بعد میرے والد چل بسے۔ عین اسی دن سرلا امریکہ سے واپس لوٹی۔ آتے ہی اسے سب باتیں معلوم ہو گئیں۔ وہ فوراً میرے ہاں آئی تعزیت کی۔ جنازے میں شریک ہوئی۔ کئی ہفتوں تک میرے سوگ میں شریک رہی۔ پھر ایک دن میرے ہاں آئی اور بولی "میں نے عہد کیا ہے کہ ساری عمر شادی نہیں کروں گی۔ کنواری رہ کر ہی پروفیسری کے اپنے منصب کو نبھاؤں گی۔

اس کے بعد میں کل ہی بمبئی جا رہا ہوں امید ہے تم مجھے رخصت کرنے آؤ گے۔"

میں انھیں یادوں میں غرق تھا کہ میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مدن وہاں کھڑا تھا۔

"ارے کس طرح گم سم بیٹھے ہو۔ کسی آنے جانے کی خبر ہی نہیں۔" اس نے ڈانٹ سی پلائی اور میں بدستور چپ بیٹھا رہا۔ "ابھی بھابی نے بتایا کہ اچھے بھلے چائے پی رہے تھے کہ یکایک اداس ہو گئے اور وہ یہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ اٹھو ہوش میں آؤ۔ دیکھو موسم کس قدر سہانا ہے۔ چلو ذرا گھومنے چلیں۔" مدن نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"یار یہیں بیٹھو۔" میں نے عاجزی سے کہا۔ "تمہاری بھابی کو بھی بلاتے ہیں اور چائے کا ایک اور دور چلاتے ہیں۔"

"مجھے منظور نہیں۔ آج مجھے ضرور جانا ہے۔" مدن نے کہا۔

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"چھوٹے چوک میں ایک یوگی راج آئے ہیں جن سے مجھے ضرور ملنا ہے۔"

"کون یوگی راج؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہاں چل کر دیکھو۔ سنا ہے بڑے غیب داں ہیں۔ ہر مشکل کا حل بتا سکتے ہیں۔" مدن نے اعتماد سے کہا۔

"تم پر کیا مشکل آ پڑی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ارے ایک مقدمہ آیا ہے جس کے لیے بڑی بھاری رقم پیش کی گئی ہے لیکن مقدمے میں زیادہ جان نہیں۔ پوچھنا ہے کہ لوں یا نہ لوں۔ بھئی اپنی شہرت کا بھی تو خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"یار تم وکیل ہو کر اتنے وہمی ہو۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہمی نہیں ہوں لیکن ہر معاملے کے سب پہلو دیکھ کر چلنے میں یقین رکھتا ہوں۔ اپنے مستقبل کو جاننے کی کوشش دور اندیشی ہی تو ہے۔"

"یہ علم کسی کام نہیں آتا۔"

[illegible]

"کیا پوچھو گے"

"یہی کہ تمھاری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ کوئی نیا باب شروع ہونے والا ہے یا نہیں۔"

"قسمت کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔"

"یار چلو تو۔" اس نے مجھے ساتھ لے لیا۔

چھوٹے چوک میں ایک زینہ چڑھ کر ہم اوپر چلے گئے۔ یوگی راج گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ ماتھے پر تلک کی تین دھاریاں تھیں۔ بدن اور سر سے ننگے تھے لیکن کندھوں پر دھوتی کا کنارہ پڑا ہوا تھا۔ آگے ایک چوکی رکھی تھی جس پر ایک پیلے رومال میں بہت سارے اوراق کی ایک کھلی پوتھی رکھی تھی۔ ساتھ ہی ایک جنتری تھی۔

"مدن نے آگے بڑھ کر اپنا معاملہ پیش کیا اور دیر تک اُس سے باتیں کرتا رہا۔ یوگی راج بھی اس قدر بھروسے سے باتیں کر رہے تھے جیسے سب کچھ جانتے ہوں۔ پھر مدن نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ میرے دوست ہیں۔"

یوگی راج بڑی دل چسپی اور شفقت سے میری طرف دیکھتے رہے۔

"ان کے بارے میں کچھ بتایئے۔" مدن نے درخواست کی۔

یوگی راج مسکرائے: "کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

میں چپ رہا۔

"آپ ہی بتایئے۔" مدن نے کہا۔

یوگی راج نے میرا نام اور تاریخ پیدائش پوچھی۔ پھر پوتھی کی ورق گردانی کی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ماتھے پر [illegible] "[illegible] پڑھ چکا ہے۔"

ہم دونوں ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

[illegible] ستمبری [illegible] سے

پھر کہا: "آپ پیدا ہوئی گرفت سے نکل رہے ہیں۔ یہ بہت شروع ہوا چاہتا ہے۔ مسلسل کام۔ آپ کی تحریری کاموں میں کامیابی ہوگی۔ نئی خوش خبری ملے گی۔ طبیعت رنگین ہوگی۔ دیر سے بچھڑے کسی سے ملاپ ہوگا۔ ملاقات دوست کے گھر ہوگی جس کا نام م سے شروع ہوتا ہے۔ آپ کی ذات سے کسی کا بھلا ہوگا۔ کسی بلا وجہ اخراجات بڑھیں گے۔ لیکن راہو کا اثر پوری طرح ختم نہیں ہوا۔ جلدی رکاوٹ بھی آ رہی ہے۔ ملاپ ہو کر پھر جدائی ہونے کا ڈر ہے۔"

"دیر سے بچھڑے کسی سے ملاپ ہوگا" یہ اشارہ دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ یہ کسی کون ہو سکتا ہے۔ مجھے جیوتش شاستر پر کوئی یقین نہیں تھا لیکن یہ سوال سر پر سوار ہو گیا۔ مدن کی باتیں پہلو بدل بدل کر ذہن میں اترنے لگیں۔ پھر ایک اور سوال پیدا ہوا۔ اس کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ مجھ کو اس سے جدا ہوئے سترہ سال ہو گئے ہیں اور وہ اگر مجھے بھول نہیں گئی ہوگی تو ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کے بعد بدل ضرور گئی ہوگی۔ اپنی زندگی کے لیے کوئی پختہ راہ چن چکی ہوگی۔ لیکن دھن کی تو پکی تھی۔ جوانی میں ایسی راہ سے انکار کیا تو اب کیسے اسے اختیار کرے گی؟" میں سوچتا رہا: "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے ذہن میں میری یاد پھر بیدار ہو گئی ہو۔ زندگی میں کوئی جذبات کو کب تک دبا سکتا ہے اور اگر اس کی یادیں اور جذبات عود کر آئے ہیں تو میں ہی کس طرح پتھر دل ہو سکتا ہوں۔ لیکن وہ ملے گی کہاں۔ یوگی راج کے ارشاد کے مطابق تو اس کا مقام مدن ہی کا گھر ہو سکتا ہے اور وہ آ بھی کہاں سکتی ہے۔ میں بھی عجب بدھو ہوں ایک واضح اور صاف اشارہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔" میں نے خود کو بہت کوسا۔ "اور میرا وہاں جلد از جلد جانا بھی ضروری ہے۔ یوگی راج نے کہا ہے کہ اگلے ہفتے اڑچن پیدا ہو رہی ہے۔ اور پھر فراق میں جلنا ہوگا۔ میں تو پہلے ہی آگ جل کر راکھ ہو چکا ہوں۔ کیوں نہ اب اس سے بچنے کی تدبیر کروں۔"

میں فرمان تھا ان دنوں کے گھر ...
پہلے تو دل ہوئے ...
پڑھ گیا۔ دل میں کئی سارے خیالات اٹھے۔ ان سے ...
کا میری وجہ سے اسے تنہائی اختیار کرنا پڑی۔ ایک لمحوں
کہ یہ جدائی بڑی جان لیوا ہے۔ ٹھیک ہے ہم ایک گھر میں
نہیں رہ سکے لیکن ایک شہر میں تو رہ سکتے ہیں۔ وہ بمبئی چھوڑ
کر یہاں چلی آئے۔ ان جیسی ماہرِ تعلیم کے لیے یہاں بیسیوں کام
مل سکتے ہیں۔ یہاں آجائے گی تو ایک دوسرے کو دیکھ لیا کریں گے
کبھی کبھی مل لیا کریں گے۔ تقدیر نے شادی تو نہ ہونے دی لیکن تدبیر
سے ایک دوستی کا، غم گساری کا، چارہ سازی کا تعلق تو رہ سکتا ہے۔

مدن گھر میں نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

میں ان کے بیڈروم میں چلا گیا۔ سرلا سے اکثر یہیں ملاقات

[illegible] تھا [illegible]

میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

[illegible]
کہتا تھا۔ بڑا غیب دان ہے۔ میں [illegible]
دے رہا تھا۔ ہم بھی صحن میں پہنچ گئے۔

سامنے چارپائی پر دادی بیٹھی تھیں۔ پشت [illegible]
مدن بھی پاس بیٹھا تھا۔ اس کی والدہ نے پاس جا کر کہا "[illegible]
کے لیے کہہ رہی تھیں نا۔ یہ لو آ گیا تمہارا بیٹا۔"

میں نے بڑھ کر دادی کے پاؤں چھوئے اور سر جھکا کے
اس کے پاس بیٹھ گیا۔

★

پدماوت تنقید کی روشنی میں — (صفحہ ۱۵ کا بقیہ)

(صفحہ ۱۵ کا بقیہ)

کی تصویر کشی جائسی کی منظر نگاری کی اعلیٰ صلاحیتوں کی غمازی کرتی ہے۔
بلحاظ ہیئت پدماوت سات چوپائیوں کے بعد ایک دوہے کی
شکل رکھتی ہے۔ تلسی داس کی رامائن بھی اسی شکل میں لکھی گئی ہے۔
پدماوت کی منظوم داستان مرگاوتی اور مدھومالتی سے زیادہ طویل
اور پیچیدہ ہے۔

اپنے انھیں محاسن کی بدولت پدماوت جہاں پریم مارگی
ہندی شاعری کی سب سے اہم اور مقبول نظم ثابت ہوتی ہے وہاں ملک محمد
جائسی کو ہندی ادب میں ایک بلند مقام عطا کرتی ہے۔

★

پیام آزادی

[illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | بنا دی ہے بشر نے [illegible]

[illegible] | ہر ایک گام پہ جاری ہے چشمۂ زمزم

[illegible] | حیات آج نہیں ہے شکار [illegible] غم

فنا ہوئی ہے [illegible] کی ترقی نے | بکھر گئی ہے ہر اک شاہراہ پہ ہمدم

[illegible] | کبھی کیا تھا زمانے نے ہم پہ مشق ستم

[illegible] | کہ آج ایک [illegible]

گرا دیا ہے [illegible] کی دیوار | کیا ہے [illegible] نے ہر اک [illegible]

چمن [illegible] بہار | [illegible] موسم

[illegible] اس کا زمانے میں [illegible] سکتا | جو آپ [illegible] ہیں آج رقم

[illegible] | بلند ہو [illegible] حیات کا پرچم

ہمیں عزیز [illegible] آزادی | جہان امن و مسرت کے [illegible] ہیں ہم

اب اس مقام پہ پہنچا ہے کاروان اپنا

[illegible] قدم

[illegible] | ابھی قریب نہیں آیا عیش کا ہنگام

[illegible] | [illegible] تمام

[illegible] | [illegible] بلند مقام

[illegible] | [illegible] پیغام

[illegible] | [illegible] دوام

[illegible] | [illegible] تمام

[illegible]

[illegible] کا پیام

رشک فردوس

[illegible]

خندہ زن [illegible]

ہے حسین وطن

[illegible] ہر اک سمت [illegible]

[illegible] اور مسرت کی انگڑائیاں

ماہ و خورشید ہے

ہر حسین وطن

رشک فردوس ہے سرزمین وطن

یہ وطن وہ ہے جس کی بڑی شان ہے

اس وطن کا ہمارا [illegible] ہے

ہے مکان امان

ہر مکان وطن

رشک فردوس ہے سرزمین وطن

اک نیا باب گلشن میں [illegible]

کانٹا پھولوں کے [illegible] میں [illegible]

[illegible] ہے

[illegible] وطن

رشک فردوس ہے سرزمین وطن

[illegible] کا [illegible]

[illegible] کا نقش [illegible]

[illegible]

حسین وطن

رشک فردوس ہے سرزمین وطن

[illegible] گئے

[illegible] گئے

[illegible]

ہر حسین وطن

رشک فردوس ہے سرزمین وطن

[illegible]

[illegible]

[illegible] وطن

رشک فردوس ہے سرزمین وطن

[illegible]

[illegible]

[illegible] وطن

[illegible]

اتر پردیش میں عوامی حکومت کا آغاز

ڈاکٹر بی گوپال ریڈی
ترجمہ : عطیہ بانو

اتر پردیش کی سیاسی اور انتظامی مشنری کی ہیئت اور کردار میں پچھلے کچھ عرصے کے اندر بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ وہ علاقہ جو آج اتر پردیش کہلاتا ہے اس کا بیشتر حصہ ۱۸۳۳ء میں بنگال پریسی ڈنسی سے الگ کر دیا گیا۔ ۱۸۳۶ء میں شمال مغربی صوبے کے نام سے اس علاقے پر مشتمل ایک نیا صوبہ بنایا گیا اور اسے ایک لفٹیننٹ گورنر کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ ۱۸۷۷ء میں اودھ کے بارہ اضلاع اس شمالی مغربی صوبے میں شامل کیے گئے۔ کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۹۰۲ء صوبے کا نام بدل کر صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ رکھا گیا اور ۱۹۵۰ء میں دستور ہند کی رو سے اس کا نام اتر پردیش ہوا۔

اتر پردیش میں پہلی بار ۳ رجنوری ۱۹۲۱ء کو دو اگزیکیٹو کونسلروں اور دو وزرا کا تقرر عمل میں آیا اور ساتھ ہی لفٹیننٹ گورنر کو ترقی دے کر گورنر بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء تک لفٹیننٹ گورنر صوبے کا نظم و نسق بغیر اگزیکیٹو کونسلروں اور وزیروں کے مختلف محکمے کے سکریٹری کی مدد سے چلاتا تھا۔

یہ تبدیلیاں ریاست کی آئینی ترقی کا ایک اہم وسیلہ ثابت ہوئیں جس میں حکومت کے عوامی کردار کی شگفتگی اور بالیدگی کے بھرپور امکانات تھے پہلے گورنر اور ان کے اگزیکیٹو کونسلروں اور وزیروں کی حلف برداری ۳ رجنوری ۱۹۲۱ء کو انجام پائی وہ ایک یادگار موقع تھا اور آج ہم اسی یادگار موقع کی یاد تازہ کرنے اور اس درمیان میں ہم نے جو ترقیاں کی ہیں ان کا جائزہ لینے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ غالباً ریاست میں یہ پہلا موقع تھا جب عوام کے منتخب نمائندوں کو حکومت میں شامل کیا گیا اور انھیں الگ الگ محکمے دیے گئے لیکن پورا کنٹرول بہرحال گورنر کا رہا۔

انسان کی زندگی میں تو پچاس سال کی مدت طولانی کہی جا سکتی ہے لیکن کسی ملک کی تاریخ میں نہیں۔ پھر بھی ان پچاس برسوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ذمے دار حکومت کا آغاز چیمس فورڈ اصلاحات سے ہوا۔ ریاستی نظم و نسق کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اہم شعبے مثلاً قانون اور ضبط و نظم، مال، مالیات، آبپاشی اور بجلی "ریزرو" قرار دے کر اگزیکیٹو کونسلروں کو سونپے گئے جو عوام کے منتخب نمائندے نہیں ہوتے تھے۔ لوکل سلف گورنمنٹ، صحت، تعلیم، زراعت وغیرہ کے محکمے "ٹرانسفرڈ" محکمے کہلاتے تھے اور ان سیاسی لیڈروں کے حوالے کیے گئے جو ایوان قانون ساز کے جو اس وقت لیجسلیٹو کونسل کہلاتی تھی منتخب اراکین ہوا کرتے تھے۔ [illegible] لفٹیننٹ گورنر ہارکورٹ بٹلر نے ۳ رجنوری ۱۹۲۱ء کو صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کے پہلے گورنر کی حیثیت سے [illegible] لیا۔ راجہ صاحب محمود آباد اور مسٹر [illegible] کو لیجسلیٹو کونسل کی حیثیت سے حلف دلایا [illegible]

---

[1] یو پی میں گورنری نظام کے پچاس سال "تقریبات کے افتتاح کے موقع پر ۳ جنوری ۱۹۷۱ء کو گورنر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کا خطبہ صدارت [illegible]

[illegible]

[illegible] ... صوبہ جات متوسط

بہار ... میں بہار کی

[illegible] کے آزاد ... [illegible]

[illegible] ... لیکن ... [illegible]

[illegible] سے انکار کر دیا کہ قانون حکومت ہند نے

گورنروں کو ... اختیارات اور خصوصی ذمہ داریاں دے

رکھی ہیں ... جب ... حکومت سے ... [illegible]

عام طور سے استعمال نہیں کیے جائیں گے اور گورنر وزیروں کے

مشورے کے مطابق کام کریں گے تب ... جولائی میں انہوں نے

... اور اس طرح صوبائی نظم و نسق مکمل طور سے عوام

کے نمائندوں کے ہاتھ میں آ گیا لیکن مرکز میں عوامی نمائندگی [illegible]

تک نہیں ہو پائی چنانچہ ... مرکزی نظم و نسق ... تک جب

پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور بابو جگ جیون رام

... انتظام ... انگریزوں کے ہاتھ میں تھا

... [illegible]

[illegible] ... ہندوستان ... [illegible]

[illegible] ... کے سامنے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ... راست ... [illegible]

... [illegible] حکومت [illegible]

[illegible]

[illegible]

حال بالکل مختلف ہے اور ... راست ... [illegible]

ہے جس کی رو سے ہر شہری جو ۲۱ سال کا ہو چکا ہے ... [illegible]

مجالس قانون کے انتخابات میں حصہ لینے کا حق ہوتا ہے۔

اب یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی کے پاس جائداد ہے یا نہیں تعلیم

یافتہ ہے یا نہیں ... حکومت کو ٹیکس دیتا ہے یا نہیں ...

کی تفریق کے بغیر مردوں اور عورتوں دونوں کو ...

... [illegible]

اب ... کے واقعات کا ذکر ... [illegible]

... سیاسی حالات کا ... [illegible] یونیورسٹی کا ...

... یونیورسٹی کورٹ کا پہلا جلسہ ... [illegible]

میں باقاعدہ طور سے کام ... ۱۹۲۱ء میں شروع ہوا ...

ریاست کی دوسری یونیورسٹی تھی اور اس وقت ... [illegible]

یونیورسٹیاں ... بنارس اور علی گڑھ کی ... یونیورسٹیاں ...

تعلیم میں ہر ... ترقی ہوئی ہے چنانچہ ...

... اسکول، انٹرمیڈیٹ کالج، ڈگری کالج ... [illegible]

کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے ... [illegible]

[illegible] ... کے ... [illegible]

[illegible]

[illegible] ... کوشش کی جائے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے تحت سے پہلے [illegible]

میں کہیں زیادہ تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ [illegible]

پاکستان میں چلا گیا ہے۔ سندھ ۱۹۴۷ء [illegible] سے الگ کیا گیا [illegible]

کے بعد سرے حصے [illegible] مہاراشٹر اور گجرات میں ملا دیے گئے۔ [illegible]

علاقے [illegible] آندھرا پردیش، تامل ناڈو [illegible] میں بٹ گئے ہیں۔ [illegible]

کو بہار سے الگ کر دیا گیا [illegible] مشرقی پاکستان میں چلا گیا

[illegible] (سی۔ پی) اور صوبہ بہار کے بھی ٹکڑے ہو گئے۔ چنانچہ ناگپور

اور امراوتی ڈویژن مہاراشٹر کے حصے میں پڑے اور بھوپال [illegible]

مدھیہ پردیش کے حصے میں آیا۔ پنجاب کو بھی تقسیم کی وجہ سے بہت

نقصان پہنچا۔ بعد میں اس کی مزید تقسیم ہوئی اور ہریانہ اور پنجاب

کے صوبے بنے۔ بہرحال [illegible] اضلاع پٹیالہ اور کپور تھلہ

پنجاب کے حصے میں آئے۔ اتر پردیش البتہ تقریباً جوں کا توں رہا۔

اس سے کوئی علاقہ نکالا نہیں گیا بلکہ اس کے برعکس آزادی کے

بعد سابقہ دیسی ریاستوں کے ہندوستان میں ضم ہونے کے نتیجے

میں کچھ علاقہ یو۔ پی میں شامل ہی ہوا جیسے پوری ریاست رامپور

اتر پردیش میں شامل کی گئی۔ اسی طرح ٹہری۔ گڑھوال کی ریاست بھی

ضم ہوئی اور ریاست بنارس کا علاقہ بھی یو۔ پی کے ضلع بنارس

(اب وارانسی کے نام سے موسوم ہے) میں شامل کیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں اتر پردیش میں کل ۴۸ ضلعے تھے اور اب ۵۴ ضلعے

ہیں۔ ان میں دیوریا، رامپور، ٹہری گڑھوال، اتر کاشی، چمولی

اور اتر کاشی نئے اضلاع ہیں۔ دیوریا پہلے گورکھپور ضلعے میں شامل

تھا لیکن ۱۹۴۶ء میں اسے گورکھپور سے نکال کر علیحدہ ضلع بنا دیا

گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقہ ضلع گورکھپور اپنی وسعت کے

باعث انتظامی نقطۂ نظر سے پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا حقیقۃً

گورکھپور اور دیوریا کی علاحدگی سے قبل گورکھپور ہندوستان کا سب سے

[illegible] آباد ضلع مشہور تھا۔ ملک کی شمالی سرحدوں کو [illegible]

مستحکم بنانے کے مقصد سے المورہ، پیتھورا گڑھ، گڑھوال اور ٹہری گڑھوال

[illegible] کے تحت [illegible] اتر کاشی کے نئے ضلعے

[illegible]

[illegible] اور آئی۔ اے۔ ایس۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] نے ہندوستانی [illegible]

عیب [illegible] سرکاری ملازمتوں [illegible]

بیشتر انگریز افسران رکھے جاتے تھے [illegible]

اور انڈین پولیس میں ہندوستانی خال خال تھے۔ [illegible]

اور محکمہ آب پاشی میں بھی انگریز افسروں کی تعداد بہت [illegible]

بعض کالجوں میں پرنسپل بھی انگریز ہوتے تھے [illegible]

آئی سی ایس افسروں کی بھاری اکثریت تھی۔ [illegible]

نہیں ہے بلکہ تمام بڑے بڑے عہدوں پر ہندوستانی فائز [illegible]

ہمارے سامنے بڑے بڑے منصوبے [illegible]

متعلق ہوں یا بجلی سے، خود ہمارے انجینئر تیار کرتے اور پایۂ تکمیل

تک پہنچا رہے ہیں۔ ہندوستانی افسروں نے بالعموم اپنے آپ کو

ہر طرح کی ذمہ داریوں کا اہل ثابت کیا ہے اور انگریز افسروں کے

چلے جانے سے کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ اس عرصہ میں بھی

جس تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے باعث ہندوستانی

افسروں کو ذمہ داریاں اٹھانے اور تجربہ حاصل کرنے کے بہتر

مواقع حاصل ہوئے ہیں۔

سرکاری کورٹ [illegible] کی [illegible] سے [illegible]

[illegible] نے انہیں [illegible] اتنا [illegible]

[illegible]

[illegible] اور ایوان قانون ساز [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ۱۹۴۷ء [illegible]

لہ مشرقی پاکستان سے مراد ہے جو اب آزاد بنگلہ دیش بن چکا ہے۔ تہ اب [illegible]

[illegible] ٹھیک ہے۔

اوّل الذکر سے تحریک ۱۹۲۱ء میں وہ تاریخ [illegible]
زندگی کا رخ موڑ دیا۔ یعنی ۲۰ جنوری ۱۹۲۱ء کو [illegible]
بینک کے عہدے سے [illegible] استعفیٰ دے دیا [illegible]
[illegible] کی طرف [illegible]
[illegible]

اتحاد پسندی کے ایک [illegible] سے [illegible]
[illegible]
[illegible] پیش کرتا ہوں۔

[illegible]

[illegible] ہندوستان [illegible] سے [illegible]
[illegible] ہندوستان [illegible]
[illegible]

[illegible]

آزادی کا گیت

وی۔ کے۔ جین

اے مرے پیارے وطن ہم بے ضرر بندے ترے
سرنگوں ہیں تیرے آگے بے خطر بندے ترے
بندگی تیری ہمارا دین بھی ایمان بھی
تیرے آگے سر بہ سجدہ جسم بھی ہے جان بھی
ہم پجاری ہیں ترے کہتے ہیں تجھ سے عاجزی
خاک میں تیری نمو، روئیدگی، بالیدگی
ہے چمن اندر چمن تیری حسیں آغوش میں
اصل میں ہے ہی محبت۔ تیری وادی خاموش میں
جان کتنی قیمتی ہے، کتنی پیاری زندگی
روپ کتنے ہی بدلتی ہے ہماری زندگی
جان تیری شان ہے، ہم شان لے سکتے نہیں
جان دے سکتے ہیں لیکن جان لے سکتے نہیں
ارتقا کا راز پنہاں ہے ترے ذرات میں
معرفت ہے نور افشاں صرف تیری ذات میں
آج ہے جشن بہاراں اے مرے پیارے وطن
جاگ اٹھے ہیں دل کے ارماں اے مرے پیارے وطن
سربلندی سے تری، ہم شادماں ہیں کس قدر
تیری آزادی سے خوش پیر و جواں ہیں کس قدر
اے مرے پیارے وطن مٹی تری اکسیر ہے
یہ ہماری زندگی کے خواب کی تعبیر ہے
محبت کی خوش اختری سے ہم کو سب کچھ مل گیا
ذوقِ دل کی رہبری سے ہم کو سب کچھ مل گیا

نغمۂ گل

[illegible]

اپنے لہو سے سینچ کے گلشن سجائیں گے
گلہائے رنگ رنگ کی دنیا بسائیں گے
کہتے ہیں یوں تو خار بھی ہیں پاسبانِ گل
اچھا ہے خار زار سے دامن بچائیں ہم
تقسیم ہے گل بو سدا دستِ باغباں
دیوار گلستاں کی نہ ہرگز اٹھائیں ہم
ہندوستاں کی روح میں شامل ہو صبر [illegible]
دل کا جنوں کی آگ میں کیسے جلائیں ہم
محفل میں جذب و کیف کا اک سلسلہ رہے
دل چمن سے شاد ہو وہی نغمے سنائیں ہم
ساتھ ہی سایۂ فکر و عمل ساتھ ساتھ ہوں
اب منزلِ حیات کا رستہ دکھائیں ہم
دیکھیں ہر ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
آؤ شب دراز کا پردہ اٹھائیں ہم
ٹوٹے کبھی نہ سلسلہ [illegible]
الماس [illegible]

شری اروند کا مرتبہ سماجی نظام

کرایت جوشی

(شری اروند کی صد سالہ پیدائش کی تقریب ۱۵ اگست ۱۹۷۲ کو تھی۔ تاخیر کے ساتھ موصول ہونے کے باعث یہ مضمون اگست کے شمارے میں شامل نہ ہو سکا۔ اب اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

ایڈیٹر)

دور جدید کو غیر معمولی تغیرات اور انقلابات کا دور کہا جاتا ہے۔ شری اروند اس دور جدید کے صف اول کے رہنما ہیں۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی جس ذریعہ انسان کی اپنی تغیرات سے نکال کر اس کو اس بلند مقام تک پہنچانے میں لگا دی جو تسخیر کی قوت کا سرچشمہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ شری اروند نے اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تمام تر کوششیں کیں، اعتکاف کیا، قربانیاں دیں اور اکتشافات حاصل کر لیا۔

شری اروند نے انسانی تاریخ کی موجودہ حالت کو منطقی نظر سے دیکھا ہے۔ منطق اپنے اصولوں اور نظریات کے ذریعے طرح طرح کے تجربات کرتی ہے اور پھر انتہائی نتیجے اخذ کرنے کے بعد بھی خود کو مجبور اور محدود تسلیم کر لیتی ہے، یعنی وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ منطق انسان کی بہتری کے لیے کوشاں ہونے کے باوجود ابھی تک حیات انسانی کو صرف مشینی بنانے اور اس کو بے حقیقت اور کھوکھلا بنا دینے میں کامیاب ہوئی ہے اور اس کے سامنے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ انسان بالآخر مختار ہے یا مجبور؟

موجودہ بحران

چند مہینوں میں اپنی تصانیف "دی آئیڈیل آف ہیومن یونٹی" اور "دی ہیومن سائیکل" میں شری اروند نے موجودہ بحران کی نہایت غیر معمولی انداز میں بصیرت افروز تشریح کی ہے۔ آج جو کہ ہم ایک پیچیدہ مرحلے سے گزر رہے ہیں ایسے اس موضوع پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں اس حقیقت سے واقف ہونے کی ضرورت ہے کہ موجودہ بحران انتہائی

بربادی کے خطرے سے نکلنے کے لیے شری اروند کے بتائے ہوئے روحانی انقلاب کا سہارا لینے کے علاوہ اور کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہے۔

شری اروند کے خیال کے مطابق اس منطقی دور کی اصل شکل معاشی جمہوریت، سوشلزم یا سرکاری کیپٹلزم اور نراج کے بڑھتے ہوئے رجحانات

کے درمیان پائی جاتی ہے۔ دنیا طاقت کے دو بڑے بلاکوں میں تقسیم ہو جاتا اسی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس کشمکش کو ختم کیسے کیا جائے؟ سمجھوتے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تمام بڑی طاقتوں کے درمیان پُرامن بقائے باہم کا معاہدہ قائم کیا جائے۔ شری اروند کا قول ہے کہ ان دونوں نظریات کے ساتھ ساتھ رہنے سے کچھ اقتصادی رجحان وجود میں آ سکتا ہے اور یہ ایک دوسرے کے نزدیک آ سکتے ہیں۔ ویسے دنیا اس وقت سماج پر حکومت کے کنٹرول کے اصول کی جانب بڑھ رہی ہے۔ ایک جانب جمہوری ممالک اور دوسری طرف مزعومہ سرمایہ دار ملکوں کے بلاک ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں اور ان میں آپس میں دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو سکتے ہیں۔

"شری اروندا سکشن" نامی تنظیم کے ذریعے اس ضمن میں جو کام کیا گیا ہے وہ قابلِ تحسین تصور کیا جاتا ہے۔ شری اروند نے مستقبل کے کچھ امکانات ہی کا اندازہ نہیں لگایا بلکہ انھوں نے یہ بھی بتا دیا کہ انسان کو کس سمت میں جانا چاہیے۔ انھوں نے ایک لازمی قوت کی تخلیق کے لیے بھی کام کیا ہے جس کی مدد سے مناسب اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ شری اروندا سکشن کا مقصد لوگوں کو صحیح حل کی جانب صحیح سمت میں پیش قدمی کے لیے تیار کرنا ہے۔

صحیح حل

لیکن شری اروند کا پیش کردہ صحیح حل ہے کیا؟ ہمیں اس سلسلے میں قطعی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے کہ یہ حل آسان ہے یا اتنے بڑے عالمی مسئلے کا حل کسی محدود نظریے یا "ازم" کی شکل میں ہوگا۔ اصل شری اروند کسی معمولی نظریہ یا مذہب کے نمائندے نہیں ہیں۔ انھوں نے روحانی طور پر کلی قلبِ ماہیت کی صورت میں ایک حل پیش کیا ہے جو تمام مذاہب، تمام بیاستوں اور موجودہ اور انسان پسند انسانی خود پسندی کے مطالبات کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے کہیں بلند ہے۔

شری اروند کی نظر میں موجودہ بحران ارتقائی کشمکش ہے جو ایک نوع کے دوسرے نوع میں تبدیل ہونے کے ہر مرحلے پر پیدا ہوتا ہے۔ انسان منطقی دور سے گزر کر اپنی تمام انسانی صلاحیتوں کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا ہے اور اب اسے اپنی اس حد سے آگے بڑھنے کے لیے خود کو تیار کرنا چاہیے۔ شری اروند کے قول کے مطابق انسان ایک تغیر پذیر مخلوق ہے

ساب ... ایک ... اب ... ہے

انسان کے مسائل کے حل کے لیے ... کو ... ہو ... دور کرنا ہوگا۔ شری اروند نے لکھا ہے ... ہے کہ انھیں ... تشکیل ... روحانی ... انسان جس ... کر ... کہ اصل حقیقت سے ... کیا گیا ہے۔

ان کا قول ہے کہ انسان یکدم روحانیت پرست بننے ہی سے صورتِ حال ایکدم بدل جائے گی۔ لیکن کیا ایسا نہیں لگتا کہ اس کا اصل عمل ... میں کافی لمبا عرصہ لگ جائے گا۔ کیا یہ حل ہماری موجودہ ضرورتوں سے بعید نہیں معلوم ہوتا؟

شری اروند نے خود اپنی کتابوں "دی لائف ڈیوائن" اور "ہیومن سائیکل" میں یہ سوال اٹھایا ہے۔ آخر الذکر کتاب میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ حل ایسا ہے جس کے بارے میں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح چند انسانی سماج کو بہتر بنانے کا معاملہ مستقبل میں ہونے والے نسلِ انسانی کے ارتقا پر منحصر ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ منطق کے ذریعے تشکیل دیا گیا کوئی بھی نظام فرد یا سماج کو مکمل نہیں بنا سکتا، صرف انسانی فطرت میں ایک داخلی تبدیلی ہی سے ایسا ممکن ہے۔ لیکن تبدیلی کا یہ حل بھی اتنا دشوار ہے کہ اس سے بہت کم لوگ متاثر ہو سکتے ہیں۔ اور یہ یقینی بھی نہیں ہے۔ بہر طور اگر یہ حل نہیں ہے تو انسان کے لیے کوئی اور راہِ نجات ہو ہی نہیں سکتی۔ ...... یہ کوئی منطقی دلیل نہیں کہ فوری طور پر اگر تکمیل ممکن نہیں ہے تو تبدیلی کا عمل بھی شروع ہی نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں چند عظیم افراد ہی بلندیوں تک پہنچ سکیں اور دیگر افراد منزل سے دور رہیں۔ لیکن انسان کا روحانی آدرش کی جانب مائل ہونا مطلقاً ناممکن نہیں کہا جا سکتا۔ اس آغاز سے انسانی ذہن پر چھائے ہوئے ناامیدی کے بادل چھٹ جائیں گے، انسان کی پوری زندگی بدل جائے گی اور اس میں اپنے اندر رفعت پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوگا۔

روحانیت کی شرطیں

شری اروند کے قول کے مطابق اگر یہ کام شروع کرنا ہے تو چند شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے۔ ایسے افراد کا ہونا لازمی ہے جو ... روحانیت سے متعارف ہو چکے ہوں اور جو ... روحانی ... ہوں ...

[illegible] ہے وہ آزمائش میں ... کہ ... ایک زمانہ پہلے نہیں ہوا تھا۔ یہی صورت حال ہمارے ملک کی موجودہ ... کا اصل سبب ہے۔

لیکن کیا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ذکر کردہ مقصد حاصل نہیں ہو سکا تو مستقبل میں بھی نہیں ہو سکے گا؟ اب ہونا ممکن نہیں ہے وہ حاصل؟ اگر ہم اس مقصد کا جائزہ لیں جس کو لے کر شری اروند پانڈیچری گئے اور انھوں نے یوگ سادھنا کی تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ ان دو حالتوں میں تال میل پیدا کرنے کی ہی کوشش تھی۔ انھوں نے جو طاقت حاصل کی جس مافوق الفطرت قوت کو وہ زمین پر اتار لائے، وہ درحقیقت پہلی بار ان شری ماں کو پا سکتی ہے۔ ابھی کچھ سال ہی قبل شری اروند انٹرنیشنل سنٹر کے تعلیمی مرکز سے شائع ہونے والے بلیٹن میں ہمیں 'ماں' کا یہ اعلان پڑھنے کو ملا کہ 'کام مکمل ہو گیا، کام مکمل ہو گیا، کام مکمل ہو گیا!' لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت اس اثر کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے؟ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ تمام عالم انسانیت یا کم سے کم بھارت خود بخود روحانی بحران کی حالت میں ہے اور ہر جگہ صحیح حل کو جاننے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ لوگ 'ازم' کے چکر میں الجھ گئے ہیں اور وہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا ان 'ازموں' کے علاوہ بھی کوئی مشرب اور جادہ ہے۔

شری اروند کا طریقۂ کار

اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسانیت پوری طرح تیار ہے۔ یہ اب بھی بالکل بے پروا ہے، اب بھی جھوٹ اور مفروضات کی پستیوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اندھیری رات کے پردے میں صبح نو کا جلوہ نمودار ہونے کے لیے تیاریاں کر رہا ہو۔ ممکن ہے ایک نئی کوشش سے انسانی صبح کے سورج کے رخ پر چڑھا ہوا غلاف اتر جائے اور اس کی تابانیاں پھوٹ پڑیں۔ یہاں تک میں سمجھتا ہوں اس قسم کی کوشش ہی شری اروند کے طریقۂ کار کا مقصد رہا ہے۔ جس ممکن ہے کہ بھارت پھر اس روحانی حل کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ عظیم روحانی بھارت کی روایت رہی ہے اور بھارت نے امتحان کے فرقہ وارانہ ماحول میں بھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا ہے۔ ہم پُرامید ہیں کہ اس ہنگامی صورت حال میں بھی بھارت ناکام نہیں ہوگا۔

ایک نئی روحانی تیاری، نئے ادراکات، نئے مظاہر کی اس وقت کا مطالبہ ہیں۔ مستقبل کو ان کی ضرورت ہے۔ ان نئے ادراکات کی نشاندہی کرنا ہے اور انھیں نئے ادراکات کو فروغ دینا ہے۔ مستقبل کے قائدوں کا ذکر کرتے ہوئے شری اروند نے یہی بات اپنی کتاب 'دی ہیومن سائیکل' میں لکھی ہے۔ میرے خیال میں یہ تشریح ہمارے لیے اس سلسلے میں معاون ہوگی کہ موجودہ یہ ترکیب کن خطوط پر منظم کیے جائیں۔ شری اروند لکھتے ہیں: '... مستقبل کی تعمیر میں معاون ہونے والے افراد وہ ہوں گے جو روحانی ارتقا کو اپنی تقدیر سمجھیں گے اور اس لیے اس کو انسانیت کی اخیر ضرورت مانیں گے۔ وہ اس طرح کا طرز حیات اپنانے کو بے حد ضروری تصور کریں گے۔ وہ خاص طور سے یہ سوچنے کی غلطی نہیں کریں گے کہ یہ روحانی تغیر مشینوں یا خارجی اداروں کے اثرات میں ملوث ہو سکتا ہے۔ وہ مشرق کے اس داخلی طرز فکر کو اپنائیں گے جو فرد کو اس کی تقدیر اور اس میں پوشیدہ نجات کے راز کو جاننے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کو بھی مختلف شکل میں قبول کریں گے کہ مغربی طرز زندگی میں سب ہی کے لیے زندگی اور علم کی اہمیت ہے۔ وہ اس اصول میں یقین نہیں کریں گے کہ زیادہ تر لوگ یقیناً زندگی کی نچلی سطح پر ہی رہیں اور صرف تھوڑے سے لوگ زندگی کی آزاد ہوا اور روشنی سے لطف اندوز ہوں، بلکہ وہ ان عظیم روحانی شخصیتوں کے نقطۂ نظر سے آغاز کریں گے جنھوں نے روئے زمین پر زندگی کو حیات نو سے ہمکنار کیا ہے۔

"اے قادر مطلق، اے ابدی حقیقت!
ہمیں اپنی اطاعت کرنے کی صلاحیت عطا فرما اور سچائیوں پر چلنے کی قوت دے!"

—— جے ہند

★

غزل

دیدور ماداز

میں تنہائی میں خود سے پوچھتا ہوں
خدا ہوں نا خدا ہوں بول کیا ہوں

چمن سے یوں نہ خالی ہاتھ جاؤ
اِدھر آؤ میں خوشبو بانٹتا ہوں

مسلسل زندگی ہے نام میرا
لہو بن کر رگوں میں دوڑتا ہوں

مذاقِ عشق ہے میرا مقدر
ہمیشہ دار پہ چڑھتا رہا ہوں

یہ سب دیکھے ہوئے چہرے ہیں میرے
میں ان سب کی حقیقت جانتا ہوں

لیے پتھر نظر آتے ہیں اپنے
میں کیسے موڑ پر اب آگیا ہوں

جہاں تک ہے مقید فکر تیری
میں اُس دُنیا سے آگے بڑھ گیا ہوں

مجھے بدنام کرنا ہے تو کر لے
مگر یہ سوچ تیرا آئینہ ہوں

نظر آتے ہو اکثر سامنے تم ہی
جب اپنے دل کے اندر جھانکتا ہوں

غزل

احترام اسلام اٹک

فسردہ غنچہ و گل ہیں صبا پریشاں ہے
یہ کس کے سوگ میں ڈوبا ہوا گلستاں ہے

سبھی پہ اس کی نظر ہے مگر نہ جانے کیوں
زمانہ میرے مقدر پہ اتنا حیراں ہے

مجھے زمانہ کی تاریکیوں کا غم کیا ہو؟
چراغِ عشق مرے قلب میں فروزاں ہے

ترا جمال مبارک رہے تجھے ہمدم
مجھے خلوص کی چاہت وفا کا ارماں ہے

غمِ حیات کو ہنس ہنس کے ٹال دیتا ہوں
مرا نصیب مرے حوصلوں پہ حیراں ہے

خود اپنے واسطے جینے کو سب ہی جیتے ہیں
جیے جو اوروں کی خاطر عظیم انساں ہے

تمام رنج و غم دل کا رازدار ہے اشک
وہ ایک قطرہ جو نوکِ مژہ پہ لرزاں ہے

فن کار کا نذرانہ

اخلاق حسین عارف

روز جب وہ فرضیات سے فارغ ہوکر وہ اپنے گھر سے نے کے قدموں سے چل کر یہاں اس راہ پر چلتے چلتے اس قدر رُک گئے کہ بھولے کا گمان بھی نہ تھا، شہر آجاتا اور شاہراہ کے قریب کسی گوشے میں بیٹھ کر وہ اپنا پورے شغل کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

یہی اس کا روز کا معمول تھا۔ اور یہی تھا اس کا ذریعہ معاش ——!

کبھی کبھی تو آتے ہی وہ بیٹھتا اور ٹھیک طرح سے دم بھی نہ لینے پاتا کہ ان لوگوں میں سے جو ماضی قریب میں اس کی موسیقی سے لطف اندوز ہو چکے تھے، کوئی سوال کر بیٹھتا،

"مغنی —— آج کچھ سناؤ گے نہیں ——؟"

"ضرور سناؤں گا —— آیا ہی اسی لیے ہوں۔"

"تو پھر سناؤ ——؟"

"اور مغنی سوال کر بیٹھتا کیا سناؤں ——؟"

"وہی جو تیرے کی پہلی والا گیت۔"

اور مغنی کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ رقص کرنے لگتی۔ جس مقام پر وہ بیٹھا ہوتا، کاندھے سے اتار کر وہیں سامنے اپنی میلی سی چادر پھیلا دیتا اور اس کے ایک گوشے پر جم کر بیٹھ جاتا۔ دوسرے کاندھے سے ساز اتار کر تا بعد کو ٹھیک کرتا اور [illegible] کی [illegible] نکالتا پھر اس کی انگلیاں ساز پر متحرک ہو جاتیں۔ ادھر ساز کی مدھم اور سریلی [illegible] فضا میں گونجتا ادھر مجمع میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا۔ لوگ اس کا نغمہ سننے کے لیے اور قریب سمٹ [illegible] [illegible]

[illegible] کے ساتھ [illegible] ہو جاتے [illegible] [illegible] سے ساز [illegible] آنکھیں [illegible] [illegible] [illegible] ساتھ [illegible] چادر پر [illegible] [illegible]

تھوڑی دیر بعد وہ چادر کے چاروں پلو پکڑ کر احتیاط سے سمیٹتا، اس میں سے سکے اس طرح سے ٹٹول کر نکالتا جیسے ماہی گیر جال سے مچھلیاں پکڑ پکڑ کر باہر نکالتا اور اپنی تھیلی میں رکھتا جاتا ہے۔ جب وہ اس کام سے فراغت پاتا تو چادر کو جھاڑ کر دوبارہ اسے کاندھے پر اسی جگہ پہنچا دیتا جہاں سے وہ اتاری گئی تھی۔ سکوں کو شانے سے لٹکے ہوئے چھوٹے جھولے میں ڈال کر وہ ساز اٹھاتا اور پھر تنگ قدموں سے [illegible] کر اپنی نشست بدل لیا کرتا۔

دن بھر میں وہ مختلف جگہیں بدلتا اور جب سہ پہر ڈھلتی تو وہ گھر کی راہ لیتا —— یہی اس کا روز کا معمول تھا۔!

شروع شروع میں جب وہ گاؤں سے شہر آتی روزی کمانے جانے لگا تھا تو اسے دوسروں کے سہارے کی محتاجی ہوتی کیوں کہ ان کے بغیر وہ ان نامانوس راہوں پر ایک قدم بھی نہ چل سکتا —— اس وقت لاشعور میں خوابیدہ اس کی خواہشیں بیدار ہو جاتی کہ کاش اس کی آنکھوں میں روشنی کی کوئی ایسی کرن سما جائے کہ وہ دوسروں کے رحم و کرم سے بے نیاز ہو کر اپنی راہ خود طے کر لیا کرے —— اس کی آنکھوں کے سامنے بھی [illegible] ظلمت [illegible] یہ لامحدود [illegible] اندھیرا ——

مگر اس کے لاشعور میں جس تمنا نے کروٹ لی تھی، اس کی تکمیل میں قدرت نے اسے روشنی کی کوئی کرن تو نہ عطا کی البتہ اس کی قوت حس میں ضرور اضافہ کر دیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جس طرح وہ اپنے گاؤں کی گلیوں اور راستوں سے واقف تھا اور بلا کسی سہارے کے چلا جاتا، حتیٰ کہ گاؤں کا ہر گھر اس کے ذہن میں محفوظ تھا اور جب جس کے یہاں چاہتا بے تکلف چلا جاتا، ٹھیک اسی طرح اب وہ شہر میں بھی بغیر کسی کے سہارے کے آنے جانے لگا تھا۔ [illegible] حصے کو شہر کا نقشہ [illegible] اس کے قدموں تلے اس طرح محفوظ ہو گیا تھا جیسے اس کا ایک ایک ذرہ اس سے مانوس ہو [illegible]

دیکھا دل جب بھی وہ ... [illegible] ... سے پہچان لی
سے وہ اس پر چلتا رہا ہے ـــــ وہ [illegible] ہے ـــــ
لیکن وہ سکا ... [illegible]
کیسے سکتا تھا جبکہ وہ اس ... سانس لیتا ... [illegible]
اس تصور میں کیا کرتا تھا وہ اس کے چاروں طرف بکھری تھی ـــــ!

اور اس کی یہ آرزو اس کے لاشعور کی نوزائیدہ نہیں، بلکہ برسوں پرانی تھی ـــــ اس نے اپنی ماں سے ہی تو سنا تھا کہ پیدا ہونے کے بعد اس کی آنکھوں میں روشنی تھی، نور تھا اور وہ کافی دنوں تک باقی رہا بھی، جبکہ وہ ہر چیز کا مشاہدہ کرتا تھا۔ اپنا کمرہ، اپنا گھر، اس کا کشادہ صحن، گھر کی تمام چیزوں کو وہ دیکھے گھما گھما کر دیکھتا مگر چونکہ اس سن میں قدرت قوت نطق ودیعت نہیں کرتی) وہ مشاہدہ کی جانے والی چیزوں پر اظہار رائے سے قاصر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب اس کی شفیق ماں تھپکے سلانے کے لیے راتوں کو اس کے گہوارے کے پاس بیٹھ کر اسے حرکت دیا کرتی زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کبھی اس کی پیشانی تو کبھی لب چومتی، جیسے کلی کو مسکرانا سکھلا رہی ہو۔ ایک ایک لفظ کہہ کر بولنا سکھاتی۔ آہستہ چلنے کے لیے اس کی ننھی سی انگلی پکڑ کر اسے پاؤں پاؤں چلنا سکھاتی۔ پیار سے چپٹا کر کہتی، ننھے ـــــ تیرا وجود دراصل میرے وجود ہی کا تو ایک حصہ ہے ـــــ اور اس کے یہ الفاظ حقیقت میں ڈوبے ہوئے ہوتے۔

اور اس کی ماں نے سچ ہی تو کہا تھا کہ پیدا ہونے کے بعد اس کی آنکھوں میں نور تھا، بینائی تھی ـــــ اگرچہ وہ اس نعمت بے بہا سے اب محروم ہو گیا تھا مگر ماں کے تیکھے نقوش، اس کا شیریں تبسم، رنگ روپ، اس کا پیکر اس کے ذہن کے پردوں میں اب تک محفوظ تھے۔ یہاں تک کہ اس کے حافظے میں وہ علامت بھی ہنوز تازہ تھی، ان کے چمپئی رخسار پر دائیں طرف وسط میں ایک سیاہ تل ہے ـــــ!

ایک بھیانک رات جب گھنگھور گھٹا ہر طرف چھائی ہوئی تھی، مسلادھار بارش بڑے زور و شور سے کئی دنوں سے ہو رہی تھی، بادلوں کی گرج کے بعد بجلی کی کڑک جو تیز شعاعیں پھینکتی، پھر گھپ اندھیرا چھا جاتا، اس رات جانے کس طرح روشنی کی

[illegible]
[illegible]
دیتا تھا ..... مگر بچپن ہی ... [illegible]
... شدید ... [illegible]
سے نجات ملی مگر قدرت کا وہ عطیہ جسے بینائی کہتے ہیں وہ اس سے چھن گیا اور باوجود مسلسل ... کوشش، علاج معالجہ اس کے والدین اسے قدرت کا وہ عطیہ واپس نہ دلا سکے۔ اور یہ دل فریب دنیا اس کے لیے ایک گھٹا ٹوپ تاریک مکان تھی

جب وہ ذرا سن تمیز کو پہنچا تو اس کے والدین نے ایک ... استاد کی سپردگی میں اسے دے دیا جو اسے اپنی اولاد کی طرح پیار کرنے لگا اور اپنے فن کا سبق اسے دینا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ ... کی طرف اپنی تمام تر توجہ مبذول کرتے رہے اور برسوں ریاض کرتے رہنے کے بعد بالآخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ ایک اچھا فنکار بن گیا اور خود اس کے استاد نے اس کی تعریف و توصیف میں موتی رولنے شروع کر دیے ـــــ اب فن پر تجھ کو اتنی دسترس ہو گئی ہے کہ تیرے سامعین تیرا نغمہ و ساز سن کر سرشار ہو جائیں گے۔ اب ... ساز مانا نہیں رہا اور نہ اپنے بعد تاریخ میں رہتی کی اور ... کی طرح اپنا نام چھوڑ جاتا لیکن اس کے باوجود میری دعا ہے کہ تو کبھی بھی نشانہ رہے ... بلکہ چار کو کھلا کر خود کھائے گا ـــــ یہ تھے اس کے استاد کے الفاظ جو اس نے اس کے بارے میں کہے تھے ـــــ اور اب میں حسن حقیقت ... [illegible]

فن پر اعلیٰ درجہ دسترس حاصل کر لینے کے باوجود کبھی کبھی وہ دکان کی تنہائیوں میں ساز اٹھا کر کبھی ... کی کوشش کرنے لگتا اور اس طرح کی تخلیق نغمے کہ اس نے ... [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ایک روز ... [illegible]

[illegible] ... سے ... [illegible]

"اسے ... بجا رہے ہو نا ۔۔۔؟"

"جی ہاں، مگر ... چاندنی رات ہو جائے گی!"

"... تمہیں ... — ... تو ... ساتھ ... چلو ... اس ... [illegible] ... دیکھ لیں گے ۔۔۔"

"کون ہے کون ہے وہاں؟"

"ہاں ہاں، ... بڑی بیٹیا، جو میوزک کالج میں پڑھاتی ہیں، ... چھٹیوں میں آئی ہوئی ہیں۔"

... [illegible] ... وہ بولا

"مزہ ... گا ۔ ۔ ۔ ۔ کتنی دور چلنا ہوگا ۔۔۔!"

"ارے یہ کیا ... پہلی کوٹھی ہے۔ یہاں سے کوئی چار پانچ سو قدم ہوگی!"

"واپسی پر آپ مجھے اسی جگہ لاکر چھوڑ دیں گے نا، تاکہ میں گاؤں کے راستے سے نہ بھٹک جاؤں؟"

"ہم تمہیں بٹیا کی موٹر میں گاؤں پہنچا دیں گے ۔۔۔ ہمارے یہاں ... موٹریں ہیں، ایک صاحب کی، دوسری بڑی بٹیا کی۔"

"... [illegible] ... وہ بولا

"اچھا تو چلیے!"

... ساتھ ساتھ چلتے باتیں کرتے پہلی کوٹھی پہنچ گئے۔ ... جا کر اسے ... نرم قالین پر ... میں بٹھا دیا گیا جو بڑے کمرے میں بچھا ہوا تھا ... کے چاروں طرف قیمتی صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے ... دوسری چیزیں قرینے سے ... [illegible] ... خیالات ... [illegible]

[illegible] ۔ ۔ ۔ ... [illegible]

[illegible] ... ۔ ۔ ۔ ۔؟

"پھر ... کچھ سنائیں گے ۔۔۔؟"

"ضرور ۔۔۔"

"تو پھر سناؤ ۔۔۔!"

"جو فرمایئے وہ سناؤں ۔۔۔!"

"بس اپنی من پسند کوئی چیز ۔۔۔"

بہت اچھا کہہ کر اس نے ساز کے تاروں کو جنبش دی اور ابھی بیٹھے نہ کر پایا تھا کہ کون سی دھن نکالے کہ یکایک اس کی انگلیاں غیر ارادی طور پر اس کی پسندیدہ دھنوں میں سے ایک پر بے اختیار پھیلنے لگیں ۔ ۔ ۔ یہ وہ دھن تھی جسے وہ ... کو دل میں بسا کر بجایا کرتا تھا۔ عجیب انداز میں اس کی انگلیاں تاروں پر مچلتی رہیں، تھرکتی رہیں، بہاروں کے شگوفے چٹکتے رہے، مسکراتے رہے، ... کے پھول کھلتے اور ... آتے رہے۔ لطیف و خنک ہوا کے ہلکے ہلکے تھپیڑوں سے گلشن ... ہوتا چلا گیا۔ ظلمتیں دور ہوتی گئیں اور اجالا پھیلتا گیا۔ دنیا رنگین سے رنگین تر ہوتی چلی گئی جس میں پریوں کی شہزادی مقام بلند و بالا پر جلوہ ... اس کا نغمہ سنتی رہی ۔۔۔!

بڑی دیر تک ساز نغمہ بار رہا ۔۔۔ کائنات ساکت رہی، دنیا کا وجود نغمہ و ساز میں سمٹ کر مرکوز ہو گیا ۔۔۔ آج ... جیسے فنکار کی انگلیاں جادو جگا رہی تھیں، ساز کا سینہ ... [illegible] ... اس کی ہر ... بکھر رہی تھی ۔۔۔!

نغمے کے ختم ہونے پر ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا جس میں سرسراتے ہوئے چند نوٹ تھے جو اس کی ہتھیلی میں منتقل ہو رہے تھے ... [illegible]

"... بہت پسند کیا ۔۔۔ کبھی ادھر ... اچھا!"

"جب یاد فرمایئے گا، حاضر ہو جاؤں گا۔"

گھر پہنچ کر ساز کو اس کی جگہ احتیاط سے لٹکا دیا ... ہتھیلی ... ایک دوست کے گھر پہنچا۔ ایک کاغذ پر کچھ لکھوایا ... نوٹوں سمیت ایک منقش ڈبیہ میں ... [illegible]

(باقی صفحہ ... پر)

حسنِ نظر

[نیا دور بابت اگست ۱۹۷۲ء (آزادی نمبر) کے بارے میں قارئین نیا دور نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں چند درج ذیل ہیں ——— (ایڈیٹر)]

پروفیسر ہارون خاں شیروانی ——— حیدرآباد

نیا دور کا آزادی نمبر ملا۔ خوب صورتی اور خوب سیرتی دونوں میں یکتا ہے۔ مضامین کے تنوع، مضمون نگاروں کی شہرت اور حیثیت، رسالے کی ضخامت اور ادارت کی یکجائی سب دل کی کشش کا باعث ہیں۔ یقین ہے یہ چیز ایسی ہے جو مجھ جیسے پیرانہ سال ناظرین کے لیے وقت کا باعث ہوگی اور وہ رنگین طباعت ہے۔

عرش ملسیانی ——— دہلی

آپ کا اگست کا شمارہ ہمیشہ قابلِ رشک ہوتا ہے اور اس بار تو بڑے اچھے اچھے مضامین اور منظومات آپ نے جمع کر ڈالے۔ ہر لحاظ سے آزادی کی پچیسویں سالگرہ کی شان کے شایاں ہے۔ اتر پردیش میں اس اچھے شمارے کو دیکھ کر اور وہ بھی حکومت کی طرف سے بڑی خوشی ہوئی۔

ساغر نظامی ——— نئی دہلی

خاص نمبر ملا، شکریہ۔ نہایت شان دار ہے۔ مطالعہ کے بعد رائے بھی دوں گا۔

نشور واحدی ——— کانپور

آزادی نمبر آپ کی محنت، خلوص اور کمال سلیقہ مندی کا آئینہ ہے۔

ظہور رضوی ——— فرخ آباد

اس عظیم اشاعت کی افادیت، ترتیب و تحسین کی بے پناہ صلاحیتوں اور مضامین و منظومات میں فکری صلاحیتیں اور ادبی رعنائیاں قابلِ تحسین ہیں۔ بلاشبہ یہ سب آپ کے ذوقِ سلیم اور کاوشِ فکر و نظر کا نتیجہ ہے۔ یقین واثق ہے کہ یہ ادبی شاہکار نہ صرف آزادی کے پچیس سال پر مفید ترین معلومات کی باقی رہنے والی یادگار ثابت ہوگا بلکہ اس دور کے ادبی جائزوں کے سلسلے میں گراں قدر پیش شمار کیا جائے گا اور نیا دور آپ کی ادارت اور نگرانی میں یوں ہی ترقی کی بلند ترین حدوں تک پہنچ کر علم و ادب کے لیے سرمایۂ افتخار رہے گا۔

شوکت پردیسی ——— [illegible]

نیا دور کو دیکھ کر دلی مسرت ہوتی ہے۔ آپ اپنی جد و جہد سے اردو ادب کی جو خاموش خدمت کر رہے ہیں وہ نہ صرف لائق ستائش ہے بلکہ اردو ادب کے لیے باعثِ فخر ہے۔ بلاشبہ اردو ادب میں نیا دور کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے اور یہ نیا دور کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اظہر افسر ——— حیدرآباد

آزادی کی پچیسویں سالگرہ کا اسپیشل نمبر نیا دور ملا۔ آزادی پر نظمیں اور قصائد دلکش ہیں۔ مضامین میں "آزادی اور اردو شاعری"، "آزادی میں تحقیق"، "عہد شد مطبوعات"، "اردو ناول اور آزادی کے پچیس سال" لاجواب ہیں۔ اس قدر کم مدت میں ایسے شاندار نمبر کے اجرا پر میری طرف سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

جگیشور ناتھ بیتاب ——— بریلی

آپ کا خاص نمبر یقیناً بعض دیگر اشاعتوں پر فوقیت رکھتا ہے اور خاصا کامیاب ہے۔ مبارک!

بی بیگم ——— جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو [illegible]

آزادی نمبر جس حسن و خوبی سے شائع ہوا، وہ آپ کی اعلیٰ ادبی صلاحیت اور اعلیٰ حس کا بین ثبوت ہے۔ آپ کی کامرانی اضافۂ دعائے حیات دوام کی نیک خواہشات عرض ہیں۔ اپنی جانب سے انجمن کے ممبران اور قارئین کی جانب سے شکریہ اور مبارک باد پیش ہے۔

حسن مقصود صاحب ——— [illegible]

نیا دور کا اسپیشل نمبر ٹھیک ۱۵ اگست کو ملا جس سے دو گنی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ [illegible] طبیعت خوش ہو گئی۔ [illegible] نیا دور [illegible] شائع نہیں ہوا۔ میری طرف سے [illegible] کی طرف سے ہدیۂ مبارک باد [illegible] کیجیے۔

★

اتر پردیش میں

ترقیوں اور سرگرمیوں کی رفتار

ایک [illegible] ہم آج آزادی کی ۲۵ ویں سال گرہ منا رہے ہیں ... ہندوستان کے عوام نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ... کی قلت ... سے اس کا استحصال اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں ہوا تھا ... عظیم ترین ... وقت سے ... ایک ... نظام ... اور ... ساجی ... کے ... ہندوستان ... بالقصد اور تعمیری سرگرمیوں کا گہوارہ ہے اور ... ایک خوش حال اور مستحکم ... سماج کی تشکیل ... کا ... عزم کر چکا ہے۔

اتر پردیش میں آزادی کی بنیاد مستحکم ہو چکی ہے ... ایک نظام ... بہ صرف ... یافتہ طبقوں ... اور ... محروم طبقوں کی ضروریات ... اس حقیقت ... میں ... عام آدمی کی زندگی میں انقلاب لانے ... کرنے کے سلسلے میں ...

آزادی کا پچیسواں سال

- عام آدمی کی زندگی میں انقلاب
- اصلاحات آراضی کے اقدامات
- ریاست کے آبپاشی کے وسائل کی صلاحیت کے دوگنی ہو جانے
- غلہ کے معاملے میں خود کفالتی
- بجلی میں دس گنا اضافے
- صنعتوں کی تیز رفتار ترقی
- بچوں کے لیے امید کے [illegible]
- ابتدائی تعلیم کے قومیانے کا سال رہا

... کی ... رفتار تیز ہوئی گئی اور اب ہم ... ایک ... ہے۔ ایک ... صرف ۲۵ سال قبل ... قسمت کا ... تھا' آج ... تدریجی ... ہے کہ ... پسماندہ طبقوں ... سماج میں کوئی قدر و منزلت نہ تھی اب اس قابل بنا یا جا رہا ہے ... وہ ... سکیں ... معاشرہ میں مل سکیں۔

اصلاحات آراضی کے سلسلے میں ریاستی حکومت نے جو پہلا قدم اٹھایا وہ زمینداری نظام کو ختم کرنا اور زمین پر کسانوں کو ملکیت عطا کرنا تھا جس کے نتیجے میں کاشتکار اور حکومت کے درمیان براہ راست رابطہ قائم ہو گیا۔ زمین جوتنے والے شخص کو زمین پر حق ملکیت دینے خواہ وہ اصل کاشتکار ہو یا شکمی کاشتکار، حکومت نے زراعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے تحریک پیدا کی۔ اس ایکٹ کے تحت تقریباً ۱٫۵۱ لاکھ ایکڑ فاضل آراضی حاصل ہوئی جو مختلف اداروں اور بے زمین افراد میں تقسیم کر دی گئی۔ چونکہ اس کے بعد بھی بڑی بڑی جاگیریں سابق درمیانی اشخاص اور کمپنیوں کے قبضے میں رہیں لہذا ۳۰ ایکڑ کی انتہائی حد مقرر کر دی گئی اور فاضل زمین مختلف زمروں کے بے زمین افراد میں تقسیم کر دی گئی اور اس سلسلے میں ہریجنوں کو اولیت دی گئی۔ بدلے ہوئے سماجی اور سیاسی حالات میں ۳۰ ایکڑ کی انتہائی حد کو بھی زیادہ تصور کیا گیا چنانچہ اب زمین کی انتہائی حد گھٹا کر ۱۸ ایکڑ کرنے کے لیے ایک ترمیمی بل پیش کیا گیا ہے۔ مجوزہ تبدیلی کے نتیجے میں تقسیم کے لیے مجموعی طور پر مزید تین لاکھ ایکڑ آراضی کی دستیابی متوقع ہے۔ اصلاحات آراضی کے سلسلے میں دوسرا اہم قدم جوتوں کی چک بندی ہے۔ منتشر جوتوں کو ایک مقام پر یکجا کر دینے سے کسان اپنے وسائل اور محنت کا بہتر استعمال کر سکتے ہیں اور زیادہ منفعت حاصل کر سکتے ہیں۔

کاشتکاروں کو ناسازگار قدرتی حالات سے محفوظ رکھنے اور پہاڑی علاقوں، بندیلکھنڈ اور مشرقی اضلاع جیسے پسماندہ اور نیم ترقی یافتہ علاقوں کو آب پاشی کے لیے پانی مہیا کرنے کے سلسلے میں جہاں اس کی بے حد کمی ہے، بڑی درمیانی اور چھوٹی آب پاشی کی اسکیموں پر ۲۳۲۱٫۶۸ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں نہروں کی لمبائی ۲۰۰۸۷ کلو میٹر سے بڑھ کر ۴۸۲۳۰ کلو میٹر اور ریاستی ٹیوب ویلوں کی تعداد ۵۰۰ سے بڑھ کر ۱۱۴۳۰ ہو گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں آب پاشی کے سرکاری وسائل کی صلاحیت ۲۷٫۵ لاکھ ہیکٹیر سے بڑھ کر ۵۹٫۵ لاکھ ہیکٹیر ہو گئی اور واقعی آب پاشی شدہ رقبہ ۱۴٫۴ لاکھ ہیکٹیر سے بڑھ کر ۱۰۲۴ لاکھ ہیکٹیر ہو گیا۔ ایک آب پاشی کمیشن بھی قائم کیا گیا ہے جو علاوہ دیگر امور کے کسانوں کو آب پاشی کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں [illegible] کا مشورہ دے گا۔

مختلف اقدامات کے نتیجے میں گذشتہ ۳۰ سال کے دوران زراعتی پیداوار دوگنی ہو گئی۔ ان اقدامات میں اصلاحات آراضی، آب پاشی کی سہولتوں کی توسیع، زراعتی مصنوعات کی بروقت اور یقینی فراہمی، زیادہ پیداوار والی اقسام کی کاشت، زراعتی آلات کی کرایہ پر فراہمی، ان کی مرمت کے لیے مقدمتی مراکز کا قیام اور زمین تحفظ سے متعلق اسکیمیں شامل ہیں۔ گیہوں کی پیداوار ۱۵٫۳۲ لاکھ ٹن سے بڑھ کر تین گنی اور چاول کی پیداوار ۱۱٫۲۰ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۳۶٫۰۵ لاکھ ٹن ہو گئی۔ گنے کی پیداوار گڑ کی شکل میں ۳۴٫۹۵ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۵۴٫۶۷ لاکھ ٹن ہو گئی جبکہ مکئی اور باجرے کی پیداوار بالترتیب ۷٫۶۵ لاکھ ٹن سے ۱۷٫۹۶ لاکھ ٹن اور ۳٫۷۶ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۸٫۸۲ لاکھ ٹن ہو گئی۔

بجلی کو جو زراعتی اور صنعتی پیداوار کے لیے اشد ضروری ہے، سب سے زیادہ اولیت دی گئی ہے۔ متعدد بجلی گھر قائم کیے گئے ہیں جس کے نتیجے میں بجلی کی پیداواری صلاحیت ۷۰ میگاواٹ سے بڑھ کر ۴۱۰۷ میگاواٹ ہو گئی ہے۔ بجلی کی ترسیلی لائنوں کی لمبائی ۲۳۶۰۰ سرکٹ کلو میٹر سے بڑھ کر ایک لاکھ سرکٹ کلو میٹر سے زیادہ ہو گئی جبکہ بستیوں، ٹیوب ویلوں اور پمپ سیٹوں کو بجلی کی فراہمی میں ۱۶ گنا اضافہ ہوا ہے۔ متعدد پراجیکٹوں کی تکمیل کے نتیجے میں، جن کے لیے یا تو مرکزی حکومت نے منظوری دے دی ہے یا جو منظوری کے مرحلے میں ہیں، امید کی جاتی ہے کہ ریاست کی بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ۷۵۲۰ میگاواٹ ہو جائے گی۔

صنعتی ترقی کی رفتار تیز رہی ہے۔ آزادی کے بعد سے ۶۰۱۵۰ کروڑ روپے سے زیادہ کی سرمایہ کاری سے بڑے اور درمیانہ پیمانے کے ۸۳۴ صنعتی اداروں کا قیام عمل میں آیا اور ۱۹۹۳ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کے ۲۰ پراجیکٹوں پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ ان میں رجسٹرڈ صنعتی اداروں کی تعداد کم میں بڑے اور درمیانہ اور چھوٹے پیمانے کے ادارے شامل ہیں جو ۱۹۸۳ء میں [illegible]

[illegible] ریاستی [illegible] اور
[illegible] کے [illegible] کروڑ روپے کی رقم
خرچ کی گئی [illegible] منصوبوں میں ۱۲ء۲۱۲ کروڑ روپے اور
[illegible] ۱۰ء۲۹۱ کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا۔ مرکزی [illegible] میں
ریاستی [illegible] تک کل ۲۰ء۱۹ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی گئی
ریاست کی [illegible] سنہ ۱۹۶۰ء میں ۲۸ء۲۸ کروڑ روپے کی مالیت
کی تھی سنہ ۱۹۷۰ء میں بڑھ کر ۰۰ء۴۰ کروڑ روپے ہو گئی۔

حصول آزادی کے بعد ہریجنوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کے
لیے ایک باقاعدہ [illegible] شروع ہوا۔ ریاستی حکومت نے مہاتما
گاندھی کی مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے ان کی ترقی اور سماج میں ان کو
جائز مقام دلانے کے لیے ایک پروگرام شروع کیا۔ چھوت چھات
برتنے والے اشخاص کے خلاف پولیس کو قانونی کارروائی کرنے کا
اختیار دینے کے لیے قانون وضع کیا گیا۔ تب سے تعلیم اور دیگر فلاحی
پروگراموں پر کئی کروڑ روپے کی رقم خرچ کی جا چکی ہے اور اس
سلسلے میں مالیاتی سال رواں کے دوران ۴۲ء۴ کروڑ روپے خرچ
کرنے کی تجویز ہے۔ ہریجن بستیوں کو پینے کے پانی اور بجلی کی سہولتیں
فراہم کرنے پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ آزادی کے ۲۵ویں سال
کے دوران ہر ضلع میں روزانہ ایک بستی کو بجلی فراہم کرنے کی تجویز ہے۔
ہریجنوں کو ان کی بستیوں کے قریب تعمیر شدہ ٹیوب ویلوں سے مفت
پانی فراہم کیا جا سکےگا۔ اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے افراد کو ان کی
بستیوں اور مکانات کی تعمیر کے لیے زمین محفوظ کرنے کے واسطے قانون
زمینداری ایکٹ میں ترمیم کی گئی ہے۔ معاشی ضروریات کا جائزہ
لینے بستیوں کے لیے گاؤں سبھا کی زمین اور سرکاری زمین کی دستیابی
اور زمین حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک سروے شروع کیا گیا ہے۔
آج سے ایک مہم شروع کی جائے گی جس کے تحت ہر ترقیاتی بلاک
میں کم سے کم دس ہزار قطعات میں ہریجنوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کو مکانات
کی تعمیر کے لیے مفت زمینیں الاٹ کی جائیں گی۔

منصوبہ بندی

ریاست میں منظم معاشی ترقی کا دور اپریل سنہ ۱۹۵۱ء میں شروع
ہوا جب پہلا پنج سالہ منصوبہ شروع کیا گیا۔ اس کے بعد دوسرے
تیسرے اور چوتھے پنج سالہ منصوبے اور تین سالانہ منصوبے شروع
کیے گئے۔ پہلے پنج سالہ منصوبہ کے لیے ۱۴۷ء۱۵۲ کروڑ روپے
کے مصارف کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ریاست میں سنہ ۱۹۶۶-۶۷ء،
سنہ ۱۹۶۷-۶۸ء اور سنہ ۱۹۶۸-۶۹ء کے سالانہ منصوبوں پر بالترتیب
۹۵ء۵۰ کروڑ روپیہ، ۲۳ء۵۱ کروڑ روپیہ اور ۳۹ء۴۹ کروڑ روپے
کی سرمایہ کاری کی گئی۔ چوتھے پنج سالہ منصوبہ کے تخمینی مصارف
۹۶۵ کروڑ روپے کے ہیں۔

منصوبہ بندی کے فوائد کا اندازہ فی کس آمدنی۔ ریاستی آمدنی۔
فی کس پیداوار میں اضافہ اور تعلیم، تکنیکی ٹریننگ، صحت اور دیگر شعبوں
میں بچت۔ سرمایہ کاری اور اصلاح سے لگایا جا سکتا ہے۔

ریاست کی آبادی سنہ ۱۹۵۱ء میں جب اس کی منصوبہ بندی
کے دور کا آغاز ہوا، ۶ء۳۲ کروڑ تھی جو سنہ ۱۹۷۱ء میں بڑھ کر ۸ء۸ کروڑ
ہو گئی۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ چھٹے منصوبہ کے اختتام تک ریاست کی
آبادی ۱۳ء۹ کروڑ تخمینہ تک پہنچ جائے گی۔ آبادی میں اس اضافہ
کی روک تھام کے لیے اتر پردیش میں سنہ ۱۹۶۳ء میں خاندانی
منصوبہ بندی پروگرام شروع کیا گیا اور اس کے اثرات چوتھے
منصوبے تک محسوس کیے جانے لگے جب منصوبہ کے پہلے دو برسوں
کے دوران معاشی ترقی کی شرح ۴ء۹ فی صد ہو گئی جبکہ آبادی کی
شرح ۸ء۱ فی صد تھی۔ ریاستی آمدنی بھی جو سنہ ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۱۴۹۹
کروڑ روپیہ تھی سنہ ۱۹۶۹-۷۰ء میں ۴۰۲۳ کروڑ روپیہ ہو گئی۔ اسی مدت
کے دوران ریاست میں فی کس آمدنی ۲۴۶ روپیہ سے بڑھ کر
۵۱۵ روپیہ ہو گئی۔

منصوبہ بندی کو اور زیادہ موثر اور مفید بنانے کے لیے مسلسل
کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر وزیر اعلیٰ کی صدارت
میں ایک اعلیٰ اختیاری ریاستی منصوبہ بندی کمیشن قائم کیا جا رہا ہے۔
بہتر منصوبہ سازی اور جائزہ کے لیے ادارۂ منصوبہ بندی تحقیق و عمل
نظامت جائزہ اور معاشیات و شماریات نظامت کو ریاستی
منصوبہ بندی ادارہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب تک ۵۲ ایکیوں

[illegible]
[illegible] ریاست کے پانچویں منصوبہ کی تشکیل کے [illegible]
[illegible] منصوبہ بندی کی لامرکزیت سے ریاست میں معاشی ترقی
کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ ضلعی سطح پر وقتاً فوقتاً اسکیموں کی رفتار
ترقی کا جائزہ لیں گے۔ ہر ضلع کو ایک فنڈ کی نگرانی میں دے دیا
گیا ہے جو اس کی مجموعی ترقی کے لیے ذمہ دار ہوگا۔

× × ×

ریاستی حکومت نے مستقبل میں پھر خشک سالی کے حالات
پیدا ہونے کی صورت میں لوگوں کے مستقل تحفظ کے پیش نظر ۱۰۰
کروڑ روپے کی لاگت کی اسکیمیں اور دیہی علاقوں میں بڑے
پیمانے پر روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے ۱۵ کروڑ روپے
کی لاگت کی اسکیمیں ایک مرکزی ٹیم کے سامنے پیش کی ہیں جس نے
حال ہی میں لکھنؤ کا دورہ کیا تھا۔

مرکزی وزیر زراعت شری فخر الدین علی احمد کے زیر قیادت
مرکزی ٹیم کو بات چیت کے دوران جو اتوار کو ہوئی خشک سالی کے
نتیجہ میں پیدا ہونے والی سنگین صورت حال سے باخبر کیا گیا
اور خشک سالی کے اندیشہ کا مستقل طور سے سدباب کرنے کے لیے
اسکیمیں شروع کرنے کی فوری ضرورت پر زور دیا گیا۔ ٹیم کے ممبران سے
کچھ اضلاع میں پینے کے پانی کی قلت اور ریاست کے بڑے علاقوں
میں ہیضہ اور گلٹی کے پھیلنے کا بھی ذکر کیا گیا۔

ان اسکیموں میں جن پر ۱۵۴ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی
فرخ آباد کے قریب گنگا ندی کے کنارے ایک باندھ اور لوور
گنگا نہر کا نہر شاخ کو ملانے کے لیے ایک ۲۲ میل لمبی معاون نہر کی
تعمیر شامل ہے جس سے خریف کی فصلوں کی آب پاشی کے لیے پانی فراہم
ہونے کے علاوہ مزید ۵۰۰۰ کیوسکس پانی کے اخراج کے لیے خاص

[illegible]
[illegible]
[illegible]
رفتار تیز کی شامل ہیں۔

ان اسکیموں کے تحت [illegible]
کی لاگت سے ۲۰۰۰ ریاستی ٹیوب ویلوں کی تنصیب بھی شامل ہے۔
یہ اسکیمیں ۱۲ لاکھ ایکڑ کے لیے آب پاشی کی سہولتیں فراہم کرنے کے علاوہ
آئندہ ربیع کے لیے مفید ہوں گی بلکہ مستقبل میں خشک سالی کے حالات
کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں بھی معاون ہوں گی۔

اس سلسلہ میں باقی سال ڈیڑھ سال کے دوران کام شروع کرنے کے
لیے ۱۱۰ کروڑ روپے کی رقم درکار ہوگی۔

پینے کے پانی کی فراہمی سے متعلق ۱۶ کروڑ روپے کی لاگت کی اسکیموں
کا مقصد ان اہم اسکیموں کو جلد سے جلد مکمل کرنا ہے جو مرزاپور۔ الہ آباد۔
جھانسی۔ جالون اور ہمیر پور اضلاع کے ۱۵۶۰ مواضعات کا احاطہ
کرتی ہیں۔ قحط زدہ علاقوں میں کنوؤں کی تعمیر کے لیے بھی دو کروڑ روپے
کی رقم درکار ہے۔

دیہی علاقوں میں روزگار فراہم کرنے کے لیے امدادی کام شروع
کرنے کے واسطے دس کروڑ روپے اور محکمہ تعمیرات عامہ کے ذریعہ کاموں
کو پورا کرنے کے لیے پانچ کروڑ روپے کی رقم کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ اس کے
علاوہ اس پروگرام میں مزید اضلاع کو شامل کرنے کی بھی درخواست
کی گئی جو مرکزی حکومت نے اکثر خشک سالی سے متاثر ہونے والے
علاقوں کے لیے شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان اضلاع کے لیے
۲۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کرنے کی درخواست بھی کی گئی۔

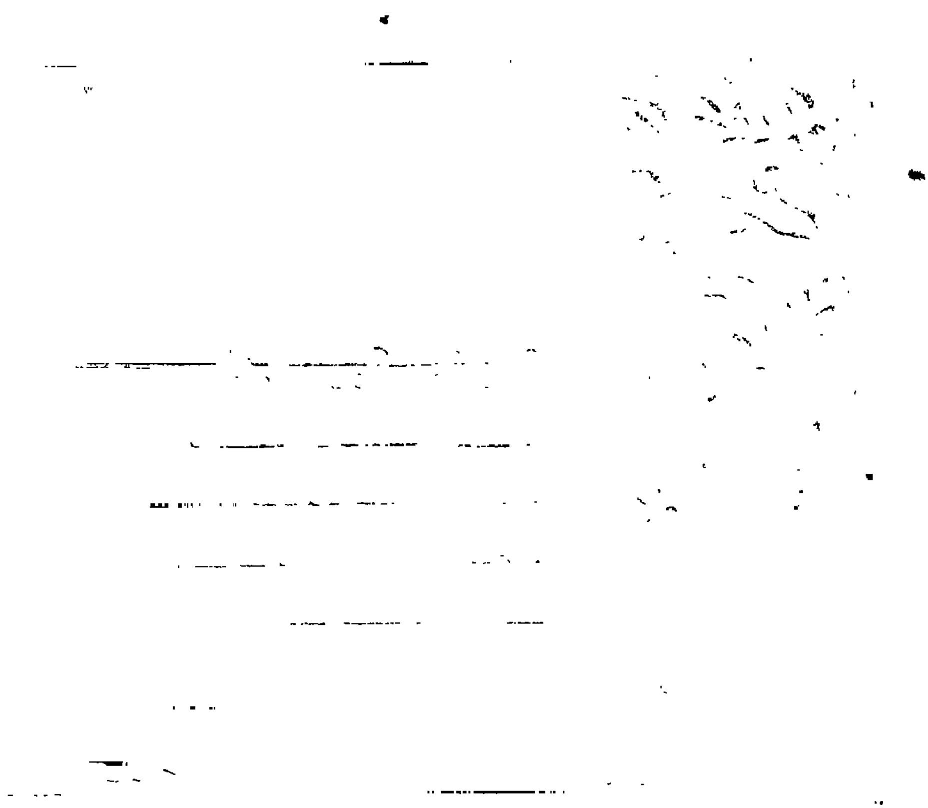
ہیضہ اور گلٹی کی روک تھام کے لیے بڑے پیمانے پر ٹیکے لگانے
کی مہم شروع کرنے کے لیے [illegible] کروڑ روپے کی رقم کی ضرورت ہوگی۔

فن عمارت کا سنگ میل ۔۔۔ (صفحہ ۲۲ کا بقیہ)

چھینٹے سے باندھا اور اکا کے ہاتھ میں [illegible] دیا جو اس دن [illegible]
اسکول کی دیواریں ڈالے جانے کی افتتاحی رسم ادا کیے جانے
کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

معزز حاضرین کے سامنے [illegible] اسکول کی [illegible]
[illegible]
[illegible]

Regd. No. L. 319



اس تامر پتر کی فوٹو کاپی جو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو نئی دہلی میں مجاہدین آزادی کو دیے



عنوانات

فیا دور کے مضامین میں ظاہر کیے گئے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے متفق ہو

جلد ۲۸ نمبر

اکتوبر ۱۹۷۲ء

آشون ۱۸۹۴ شک

چندہ سالانہ: پانچ روپے

فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر

خورشید احمد

پبلشر

شرومنی شرما

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر

اشوک ٹنڈن

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یوپی

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

اپنی بات

قوموں کی زندگی میں کوئی نہ کوئی تاریخ اپنی غیر معمولی اہمیت اور خصوصیت کے باعث (آئی تہوار کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان میں یوم آزادی ۱۵ اگست، یوم استقلال جمہوریہ ۲۶ جنوری کے ساتھ ساتھ ۲ اکتوبر کو بھی قومی دن جیسا مرتبہ حاصل ہے۔ اس دن وہ عظیم المرتبت ہستی پیدا ہوئی ہے جو بصورت غلام ہندوستانیوں کی نجات دہندہ تھی بلکہ اپنے صفات کی مالک ایسے افکار و خیالات کی حامل اور ایسے طریقۂ کار رہنمائی جن کے باعث وہ سیاسی رہنماؤں اور سماجی مصلحوں میں منفرد نظر آتی ہے۔ مہاتما گاندھی کے بارے میں اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا؛ اس لیے کہ بقول مرحوم صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین "گاندھی جی کی تعلیمات اس وقت کے لیے نہایت مناسب اور قابل قبول تھیں لیکن ان میں ایک ایسا فلسفۂ زندگی بھی ہے جو ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لیے با موقع اور برمحل ہے۔" (مہاتما گاندھی کا پیغام، مولفہ یو۔ ایس۔ موہن راؤ)

انسانیت کے لیے مہاتما گاندھی کی سب سے بڑی دین اہنسا اور عدم تشدد کا فلسفہ ہے جو آفاقی ہے۔ اس میں نہ زمان کی قید ہے نہ مکان کی، نہ رنگ و نسل کی قید ہے نہ مذہب و فرقے کی۔ یہ ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر مذہب و ملت کے لیے یکساں طور پر درست اور زندگی اور اس کے مسائل کے حل کا کامیاب اور موثر ذریعہ ہے۔ یہی وہ ہتھیار تھا جس کی مدد سے انھوں نے برطانیہ جیسی طاقت ور سلطنت کو جھکنے اور ہندوستان کو آزادی دینے پر مجبور کر دیا۔ اہنسا کے بارے میں گاندھی جی کا قول تھا کہ وہ "ایک کامل نصب العین ہے۔ تمام بنی نوع انسان اسی واحد مقصد کی جانب فطرتاً لیکن غیر شعوری طور پر رواں دواں ہے"۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اور اس کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے ایک جگہ کہا کہ "اگر ہم قدیم زمانے سے موجودہ زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انسان نے بتدریج اہنسا کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے آبا و اجداد آدم خور تھے۔ اس کے بعد وہ آدم خوری سے تنگ آگئے اور انھوں نے شکار پر گزر بسر شروع کی۔ پھر ایک منزل وہ آئی کہ انسان کو ایک خانہ بدوش شکاری کی سی زندگی بسر کرنے میں ندامت محسوس ہونے لگی اور اس نے کھیتی باڑی شروع کر دی اور اپنی خوراک کے لیے وہ زیادہ تر زمین کی پیداوار پر انحصار کرنے لگا۔ اس طرح خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے اس نے ایک جگہ آباد ہو کر مہذب زندگی شروع کی، گاؤں اور قصبے آباد کیے اور محض ایک کنبے کا رکن ہونے کی بجائے وہ ایک فرقے اور پھر ایک قوم کا فرد بھی بن گیا۔ یہ تمام باتیں اہنسا کی ترقی اور ہنسا (تشدد) کی کمی کی علامتیں تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک نسل انسانی بھی پیچھے رہ جانے والی کئی نسلوں کی طرح ختم ہو گئی ہوتی۔" دوسری جگہ انھوں نے کہا کہ "انسان بطور ایک حیوان کے تشدد کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ روح عدم تشدد کی قائل ہے، اس لیے انسان کے لیے تشدد کی راہ پر چلتے رہنا ممکن نہیں۔ اسے یا تو اہنسا کی طرف قدم بڑھانا ہوگا یا اپنی تباہی کی طرف۔ اسی لیے پیغمبروں اور اوتاروں نے سچائی، یگانگت، بھائی چارے، انصاف وغیرہ کا درس دیا ہے اور یہ تمام اوصاف اہنسا کے لوازم ہیں۔" ایک اور جگہ کہتے ہیں "میرا پختہ عقیدہ ہے کہ تشدد کے ذریعے کوئی پائیدار عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ وحشیانہ پن کا جواب وحشیانہ پن سے دینا اپنے اخلاقی اور ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت دینے کے مترادف ہے اور اس سے بدی کا چکر شروع ہو جاتا ہے۔"

یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ سچائی کے اس پرستار اور امن اور محبت و اتحاد کی اس روح کو ہم سے جدا ہوئے ابھی کچھ کم ۲۵ برس ہی ہوئے ہیں لیکن ہم نے ان کی تعلیمات کو جن میں اہنسا اور عدم تشدد پر کاربند ہونے کو سب سے اولیت حاصل ہے، بھولنا شروع کر دیا ہے۔ گاندھی جی نے اہنسا اور تشدد کے نقصانات، خطرات اور دور رس اثرات کو بار بار اور مختلف طریقوں سے سمجھایا اور بتایا ہے لیکن آج دیکھتے ہیں یہ آ رہے کہ قوم کے باپ کے نظریے اور تعلیم کو پس پشت ڈال کر تشدد کا راستہ اپنایا جا رہا ہے اور اپنے مقاصد کے حصول اور اپنی مانگوں کی تکمیل کے لیے تشدد آمیز تحریکیں چلائی جاتی ہیں، ذریعہ بازوں کا گھیراؤ کیا جاتا ہے، سرکاری اور نجی املاک کو توڑ پھوڑ اور آتش زنی کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس طرح ایک عام بدنظمی پیدا کی جاتی ہے۔ جمہوریت میں اپنی شکایتوں اور مانگوں کے لیے احتجاج کرنا جائز اور درست ہے۔ لیکن یہ طریقہ پرامن اور ایسا ہونا چاہیے کہ مسائل کے حل ہونے کی بجائے مشکلات بڑھ نہ جائیں، ملک کے ترقیاتی پروگرام ٹھپ نہ ہونے پائیں اور قوم اختلافات اور بدنظمی کا شکار ہو کر کمزور نہ ہو جائے۔ افسوس یہ ہے کہ اس تشدد آمیز طریقۂ کار میں ملک کے نوجوان اور طلبا پیش پیش نظر آتے ہیں جب کہ گاندھی جی نے انھیں خاص طور سے مخاطب کر کے کہا کہ "میں نے اپنی تمام امیدیں ملک کے نوجوانوں سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ انھیں اپنے اندر یہ احساس پیدا کرنا چاہیے کہ مکمل طور پر ڈسپلن کی زندگی ہی انھیں اور ملک کو تباہی سے بچا سکتی ہے۔" طالب علموں سے مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "گڑبڑ پیدا کرنا، ہڑتالیں کرنا اور اس قسم کی دیگر کارروائیاں سراسر تشدد کے مترادف ہیں۔ طلبا کو اپنے افکار اور قول و عمل میں اہنسا پر چلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ میں سیاسی ہڑتالوں کی حمایت نہیں کرتا۔ طلبا کو جب وہ زیر تعلیم ہوں عملی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہونا چاہیے۔ ایک طالب علم سرگرم سیاست داں ہو کر اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا۔ ان کی زندگی کا مقصد تعلیم حاصل کرنے کے بعد قوم کی خدمت کا رشتہ کا ہونا چاہیے۔"

اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ نسل انسانی پیچھے رہ جانے والی کئی نسلوں کی طرح ختم نہ ہو جائے، ہم اپنی تباہی کی طرف قدم نہ بڑھائیں اپنے اخلاقی اور ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت نہ دیں اور "بدی کا چکر" جو تشدد آمیز طریقۂ کار کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، شروع نہ ہونے دیں تو ہمیں ضبط و نظم سے کام لینا ہوگا اور تشدد کا راستہ ترک کر کے اہنسا کے طریقے کو اپنانا ہوگا ورنہ اس سے ملک کو جو نقصان پہنچے گا اس کے لیے آئندہ نسلیں ہمیں کبھی معاف نہ کریں گی۔

آزادی کی ۲۵ویں سال گرہ کے سال میں گاندھی جینتی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ آیئے اس موقع پر ہم قوم کے باپو کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے قول و فعل اور عمل کردار کا جائزہ لیں اور ان تعلیمات کو نہ صرف اپنے لیے مشعل راہ بنائیں بلکہ ان کی نشر و اشاعت میں سرگرمی دکھائیں تاکہ نئی نسل جو ابھر رہی ہے وہ اپنی زندگیوں کو ان تعلیمات کے سانچے میں ڈھال سکے۔

● نیا دور کے شائقین اور خریدار حضرات سے پرچہ نہ ملنے کی شکایتیں موصول ہوتی رہتی ہیں۔ ان شکایتوں کا لب و لہجہ بعض وقت انتہائی درشت اور کبھی کبھی جنگ آمیز ہوتا ہے۔ بسا اوقات ان تحریروں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ خریداروں کو پرچے "انڈر سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ" بھیجے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ احتیاط برتنے کا اور کوئی طریقہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ پھر بھی اگر کاپی موجود ہوتی تو دوبارہ بھیج دی جاتی ہے۔ نیا دور کا زر بدل صرف پانچ روپے ہے۔ اس قیمت میں ہر پرچہ بذریعہ رجسٹری بھیجا ممکن نہیں ہے۔ خریدار حضرات اگر سارا الزام دفعتہ ایڈیٹر یا منتظمین پر اتارنے کی بجائے اپنے اپنے ڈاک خانہ کو نیا دور کی گم شدگی یا عدم وصولی کی جانب متوجہ کریں تو شاید زیادہ بہتر ہو۔

ایڈیٹر

مہاتما گاندھی علی گڑھ میں

۱۹۱۷ء کا ایک واقعہ

ہارون خان شروانی

دسمبر ۱۹۱۶ء میں شہر لکھنؤ میں ہندوستان کے سیاسی رہنما جمع ہیں؛ کانگریس اور مسلم لیگ کے پس پردہ ہندو مسلمانوں کے باہمی سمجھوتے کی بات چیت ہو رہی ہے تاکہ انگریزوں کے پاس اس چیلنج کا جواب بھیجا جا سکے کہ ہندوستانی کسی متفقہ دستور کو پیش نہیں کر سکتے۔ آخر کار سمجھوتا ہو جاتا ہے اور ہندو مسلمان شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ ان روح پرور جلسوں میں جن لوگوں کو شرکت کا موقع ملا تھا انھیں یاد ہوگا کہ کس طرح مہاراجہ صاحب محمود آباد سر محمد علی محمد خاں نے ہندو مسلمان نیتاؤں کو، جو لکھنؤ میں جمع تھے ایک بڑے پیمانے کی ضیافت پر مدعو کیا اور ان میں سب ہی نے شرکت کی۔ انھیں شاید یہ بھی یاد ہوگا کہ مہاراجہ محمود آباد کے محل کے بالکل متصل شاہی زمانے کی جو نفیس بارہ دری ہے، اس میں کل ہند مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، اور اس کی صدارتی کرسی کے لیے کانگریس کے ممتاز ترین رہنماؤں میں سے ایک کو چنا گیا جن کا نام محمد علی جناح تھا۔ اس جلسے کے مدعوین میں کانگریس کے تقریباً تمام چوٹی کے رہنما تھے جو مسند کے دائیں بائیں لیگ کے ممتاز ممبروں میں گھلے ملے نظر آ رہے تھے۔ اس زمانے کے رواج کے بموجب صف اول کے کانگریسی اور صف اول کے لیگی بہترین انگریزی کپڑوں میں ملبوس ہوتے تھے اور ان کے چمکدار کالر اور کف سیاہ یا دوسرے کسی گہرے رنگ کے سوٹوں میں دور سے نظر آ سکتے تھے۔ لیکن لیگ کے اس جلسے میں شہ نشین کے ایک گوشے میں ایک شخص خاموش بیٹھا ہوا اس میل جول کی تمنا کا گویا جائزہ لے سکتا تھا۔ اس کے کپڑے، اس کی رکھ رکھاؤ، اس کا طور طریق باقی سب سے جداگانہ تھا۔ سر پر گجراتی وضع کی ذرا بانکی پگڑی، بدن پر دیہاتی قسم کی انگرکھی جو کمر سے صرف تین چار انچ نیچے تک جاتی تھی اور موٹے کپڑے کی دھوتی، یہ اس کی پوشش تھی۔ یہ کپڑے بہترین سوٹوں اور شیروانیوں کے جمگھٹ میں کچھ عجیب سے معلوم ہوتے تھے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ وہی موہن داس کرم چند گاندھی ہیں جنھوں نے جنوبی افریقہ میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ اور جن کے کاری ہتھیاروں یعنی حق پسندی، دیانت داری، انکساری اور عدم تشدد نے جنوبی افریقہ کے سفید فام وزیر اعظم جنرل اسمٹس کو جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ دیکھنے والوں کو تعجب ہوا کہ ایک بیرسٹر اور ایک دیسی شخص کو بھیس بدلنے کی کیا ضرورت تھی جس نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ یورپی طرز کی بود و باش میں بسر کیا تھا۔ لیکن انسان عالم الغیب نہیں، انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ کم زور و نحیف شخص ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی جڑیں ہلا دے گا اور اس کا اقتدار ملک سے ختم کر کے دم لے گا۔

ہندی مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی اور ثقافتی مرکز علی گڑھ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے شدید مصائب کے بعد یہیں سے ان کی زندگی میں ایک نئی لہر دوڑی تھی، یہیں سے سید احمد خاں نے اپنے عمل سے یہ دکھا دیا تھا کہ مسلمانوں اور ان کے ہندو بھائیوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں ہونی چاہیے، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تمھیں ابھی سیاست کی منجدھار میں پڑنے کی نا قابلیت ہے بیشک، اور سیاست میں عملی حصہ لینے سے تمھارا اور ملک بھر کا نقصان ہی ہوگا۔ تمھیں ضرورت اس بات کی ہے کہ تم سب سے پہلے تعلیم کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور تم اپنے

پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکو گے اور کیا حقہ؟ ملک کی خدمت نہ کر سکو گے۔ الغرض ملک میں علی گڑھ کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد گاندھی جی نے وہاں جانے کا ارادہ کر لیا، لیکن ان کے اس ارادے کی کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔

اگست ۱۹۱۶ء کی کوئی تاریخ تھی۔ ملک کیا، پوری سلطنت برطانیہ میں (جس میں سورج کبھی ڈوبتا ہی نہ تھا) لکھنؤ سمجھوتے کا چرچا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے کانگریسی اور لیگی قوم پروروں کا جلسہ دہلی میں طلب کیا تھا۔ علی گڑھ کے مندوب جن میں عبدالمجید خواجہ اور میرے والد حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب شامل تھے، ایک روز پہلے ہی دہلی پہنچ گئے تھے۔ علی گڑھ کی کیفیت یہ تھی کہ ایم اے او کالج کے طلباء (ابھی مسلم یونیورسٹی نہیں بنی تھی) قوم پرورانہ جذبے میں ڈوبے ہوئے تھے، لیکن یوروپی اسٹاف میں استبدادیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یوروپی پروفیسروں اور ٹرسٹیوں کے سابق سکریٹری نواب وقارالملک کے درمیان چند سال پہلے سخت کشمکش ہوئی تھی، لیکن وقارالملک کے استعفے کے بعد حالات نے پلٹا کھایا تھا اور یوروپی پروفیسر از سر نو حاوی ہو گئے تھے۔

میں علی گڑھ ضلع کانگریس کمیٹی اور ہوم رول لیگ شاخ علی گڑھ کا معتمد تھا۔ دس بجے کے قریب ڈاکٹر انصاری کا میرے پاس تار آیا کہ مہاتما جی چھ بجے کی ریل سے علی گڑھ آ رہے ہیں۔ میں نے فوراً مقامی کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ طلب کی، ساتھ ہی عوامی ربط کے تمام طریقوں کو متحرک کیا اور گاندھی جی کے استقبال کی جیسی بھی تیاری ہو سکی وہ پوری کی۔ اس وقت تک گاندھی جی کے طرز کار کا پھیلاؤ کافی ہو چکا تھا۔ کالج تو ہماری تحریک سے گویا بارہ پتھر باہر تھا، اور ہم نے شہر ہی میں ایک عظیم الشان جلسے کا انتظام کیا تھا۔ شہر کے شمالی کنارے پر اسٹیشن کے قریب ایک عوامی کتب خانہ تھا اور اس کے ایک رُخ پر ایک بڑا احاطہ تھا، اسے صاف کرا دیا گیا۔ اس کے ایک کونے میں ایک بڑا تخت رکھا گیا، اس پر ایک میز اور ایک کرسی مہاتما جی کے لیے رکھی گئی، اور تخت پر چڑھنے کے لیے دو سیڑھیوں کا انتظام کیا گیا۔ میز کے سامنے چالیس پچاس کرسیاں رکھ دی گئیں اور ان کے پیچھے دریوں اور شطرنجیوں کا فرش کر دیا گیا۔ یہ سب انتظام آناً فاناً مکمل ہو گیا۔ ریل آنے سے پہلے ہی اسٹیشن پر سیکڑوں کی تعداد میں عوام گاندھی جی کے منتظر کھڑے ہوئے تھے۔ گاندھی جی حسب معمول تیسرے درجے کی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ وہ ڈبے سے اترے تو حاضرین نے "مہاتما گاندھی کی جے" "ہندو مسلمان کی جے" کے فلک شگاف نعروں سے ان کا استقبال کیا، اور سیکڑوں نے پرنام کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے مہاتما جی کو کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اب سے چھپن برس پہلے علی گڑھ میں موٹریں اِکا دُکا ہی نظر آتی تھیں اور جن راجاؤں، نوابوں کے پاس موٹریں تھیں، ان کے ایوانوں کے سوتے ہم لوگوں کے لیے گویا بند تھے۔ ہم نے کسی نہ کسی طرح ایک رئیس سے ایک عمدہ فٹن اور مشکی گھوڑوں کی جوڑی مانگ لی تھی۔ ہم بڑی مشکل سے ہجوم کو چیرتے ہوئے گاندھی جی کو گاڑی تک لائے اور انھیں جلسہ گاہ تک پہنچایا۔ یہ معلوم کرکے کہ انھیں شہر لے جایا جا رہا ہے گاندھی جی نے برہم احتجاج کرتے ہوئے کہا "میں کالج دیکھنے اور بانی کالج کی قبر کا درشن کرنے کے لیے آیا ہوں، آپ مجھے شہر کیوں لے جا رہے ہیں۔" بہرحال ہم جلسہ گاہ پہنچ گئے۔ میدان ہزاروں سے بھرا ہوا تھا۔ مہاتما جی کو سہارا دے کر تخت پر پہنچایا گیا، ان کے کرسی پر بیٹھتے ہی لوگوں نے تالیاں بجائیں اور جیکارے لگانے شروع کیے۔ بڑی مشکل سے انھیں خاموش کیا گیا۔ گاندھی جی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا کہ "بھائیو اور بہنو، میں اس وقت کوئی بھاشن نہیں دوں گا، میں بھاشن دینے نہیں بلکہ کالج دیکھنے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ لوگوں نے تقریر کرنے پر اصرار کیا، مگر گاندھی جی کہاں ماننے والے تھے! وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم لوگوں نے سہارا دے کر انھیں مصنوعی تخت نشین سے اتار لیا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ کالج چلیے۔

اب رات ہو گئی تھی۔ فٹن تیار تھی۔ مہاتما جی بیٹھے، مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے کی نشست پر مہادیو ڈیسائی اور ان کی دھرم پتنی دونوں بیٹھ گئے۔ سنہ ۱۹۱۶ء کی فضا ایسی تھی کہ یہ ناممکن تھا کہ کوئی بڑا سیاسی رہنما علی گڑھ آئے، اس کی باتیں سننے کے لیے جلسہ ہو اور اس میں کالج کے طالب علم موجود نہ ہوں، گو ایسے جلسوں میں کالج کے طالب علموں کا جانا ممنوع تھا۔ اس جلسہ میں بھی بیسیوں طلبہ تھے۔ جلسہ گاہ سے کالج بمشکل ڈیڑھ میل ہوگا، لیکن گاڑی کے کالج پہنچتے پہنچتے

سے [illegible] گیا گاندھی کے [illegible] میں [illegible] گاندھی جی نے
یہ [illegible] کے ساتھ پہلا صاحب [illegible] ہدایت کی کہ
گاندھی [illegible] کام چلنے پر
مجبور [illegible] کرکٹ [illegible] کا تھا، صدر
دروازے [illegible] پہنچے تو وہاں چند طلبہ استقبال کے لیے کھڑے
ہوئے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ صدر [illegible] کی صدارت میں انجمن اتحاد
کا ہفتہ وار جلسہ ہو رہا ہے، اور جو طلبہ وہاں جمع ہیں ان کو گاندھی جی
کے کالج میں آنے کا مطلق علم نہیں۔

گاندھی جی نے خواہش ظاہر کی کہ طلبہ کے جو کمرے کھلے ہوئے ہوں
وہ انھیں دکھلائے جائیں۔ یکی بارک کے کمرے نہایت شاندار ہیں۔
اور سر سید کے زمانے میں بلکہ ان کی نگرانی میں تعمیر ہوئے ہیں۔ ان کے
اکثر مکین انجمن اتحاد کے جلسے میں گئے ہوئے تھے، جو طلبہ ساتھ
تھے ان میں چند ہی اس اقامت خانے میں رہتے تھے۔ انھوں نے
فخریہ انداز میں اپنے اپنے کمرے کھول کر دکھا دیے۔ اس اقامت خانے
میں سب سے زیادہ [illegible] سجا سجایا کمرہ روایتی اعتبار سے وہ ہوتا ہے جس
میں کرکٹ ٹیم کا کپتان رہتا ہے۔ اتفاقاً یہ کمرہ کھلا ہوا ملا۔ مہاتما جی
اسے دیکھ کر حیران ہو گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا اس کمرے میں بھی
طالب علم رہتے ہیں۔ میں نے اس کا اثبات میں جواب دیا اور ساتھ ہی
اس کی توجیہ کر دی کہ کالج کی تاریخ میں کرکٹ کو ایک خاص تفوق
حاصل رہا ہے، اور کالج کی [illegible] میں کرکٹ کے کھیل نے [illegible]
[illegible] اسی لیے کرکٹ کپتان کے کمرے کو ایک خاص اہمیت
دی جاتی ہے۔ [illegible] کمرہ دیکھنے کے بعد مہاتما جی کا حکم ہوا کہ اب
انجمن اتحاد کے جلسے میں چلیے۔ اول تو بغیر پرنسپل کی اجازت
کے میں مہاتما جی کو کالج لاتا، پھر [illegible] ان کا معائنہ
کرایا، اور [illegible] انجمن اتحاد کے جلسے میں لے جاتا [illegible]
[illegible] لیکن اول تو [illegible]
[illegible] گاندھی جی کی
[illegible] ہر حال مہاتما جی [illegible]
[illegible] بارک کے پچھلے دروازے سے

جلسے [illegible] کی طرف روانہ ہوئے۔ اُدھر پرنسپل [illegible] کو
[illegible] صدارت کر رہے تھے، کسی ذریعے سے ہم لوگوں کی کالج میں
آمد کی خبر [illegible] معلوم ہو گیا کہ مہاتما جی یونین کی طرف آ رہے ہیں۔
[illegible] ہوتے ہیں اور بہت [illegible] بدل دیتے ہیں [illegible]
[illegible] کرسی چھوڑ کر انجمن اتحاد کے مستقل صدر کو صدارت کی کرسی پر بٹھایا
اور خود تیز قدموں سے ہم لوگوں کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ [illegible] راستہ
طے ہوا تھا کہ وہ ہماری چھوٹی سی جماعت سے آ کر مل گئے۔ میں نے
[illegible] صاحب کا گاندھی جی سے اور ان کے ساتھیوں سے تعارف کرایا
اور ہم سب نہایت خندہ پیشانی سے ایک ساتھ [illegible] ہال پہنچے۔
گاندھی جی کے ہال میں داخل ہوتے ہی طلبہ میں جو جوش و خروش پیدا
ہوا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہال میں پہنچتے ہی پرنسپل نے اعلان کیا
کہ ہندوستان کے عظیم رہنما مسٹر گاندھی کو خوش آمدید کہنے میں وہ بڑا فخر
محسوس کرتے ہیں۔ ہال میں شرکت [illegible] بڑا
[illegible] میں بلا مبالغہ سیروں گلاب کے
پھول لائے گئے تھے۔ اور جونہی پرنسپل نے گاندھی جی سے تقریر کرنے کی
درخواست کی اور وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے، ادھر سے گلاب کی
پنکھڑیوں کی گویا موسلا دھار بارش ہونے لگی اور گاندھی جی ان
پنکھڑیوں میں آدھے ڈھک گئے۔

لڑکوں کی [illegible] کی کوئی حد نہ تھی۔ جب [illegible] آواز [illegible]
تو گاندھی جی نے اپنی تقریر شروع کی۔ انھوں نے [illegible]
ذرا رک [illegible] طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے اس کالج میں
[illegible] آپ [illegible] ملنے سے بڑی خوشی ہوئی ہے، اور [illegible] کا نام
لے کر کہا کہ ان کی [illegible] مجھے یہاں آنے میں بہت سہولت ہوئی ہے۔
میں نے [illegible] کمرے دیکھے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں
کہ [illegible] کیا اس [illegible]
[illegible] مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کیا جا سکتا ہے؟ [illegible]
[illegible] ہندوستان کے بڑے بڑے دولت مندوں کے
بچوں کو بھی میسر آتا [illegible] ہے۔ میں نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا ہے،
حضرت محمد کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کیا ہے، [illegible]

سے سمجھ لیا ہے، جو مجھوتی ثروت اللہ کر رہا ہے، دیکھیں وہ نہ قرآن سے
ثابت ہے نہ خلفائے راشدین کے طریقے سے۔ میں پوچھتا ہوں کہ
اس کر و فر کے ساتھ آپ ایک سال میں نہیں، دس سال میں نہیں، پچاس
میں، پانچ سو سال میں کتنے عمر و سعد پیدا کر سکتے ہیں؟ میں
آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنی زندگی کو رسول اور ان کے تابعین کی
طرح سادہ بنائیے ورنہ اس کر و فر کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔"

یہ گاندھی جی کی آدھے گھنٹے کی تقریر کا ملخص ہے جو راقم الحروف کو
یاد رہا ہے۔ وہ خاموش ہوئے تو ہال سیکڑوں تالیوں کی آواز سے دوبارہ
گونج اٹھا۔ صدر جلسہ نے گاندھی جی کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے
ہوئے وعدہ کیا کہ معزز مہمان نے جن اصولوں کو سراہا ہے ان پر ہم سب
عمل کرنے کی کوششیں کریں گے۔

جلسہ ختم ہوا تو بے شمار لڑکوں نے گاندھی جی کے ساتھ چلنا چاہا،
مگر انھوں نے یہ پسند نہیں کیا بلکہ انھیں اپنے اپنے کمروں کو واپس جانے
کی ہدایت کی۔ اب ہماری مختصر سی جماعت سیدھی کالج کی مسجد کی طرف
چلی جس کے ایک طرف سرسید اور ان کے رفقائے کار آسودہ ہیں۔ میں وہ
سماں کبھی نہیں بھولوں گا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے مسجد
میں عشا کی نماز بھی ختم ہو چکی، [illegible] کا اختتام ہو چکا ہے
ہیں، تمام غیر مسلم سید احمد خاں کے حضور سکوت سے [illegible] صامت
آنکھیں جھکائے کھڑے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ دو منٹ گزرے ہوں گے، ایک منٹ
تک مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھی اسی طرح خاموش کھڑے رہے۔
مسجد سے لگا ہوا سرسید کورٹ کا دروازہ باب الرحمت ہے، وہاں گاڑی
تیار کی ہوئی منگائی گئی تھی۔ ہم سب خاموشی کے ساتھ اسی تم سکوت کے عالم
میں اس میں بیٹھ گئے اور وہاں سے سیدھے عبدالمجید خواجہ کی کوٹھی
پہنچے جہاں مہاتما گاندھی کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ پیاز، ہرا میوہ
اور بکری کا دودھ حاضر تھا۔ چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد مہاتما جی
صبح چار بجے کی ریل سے واپس دہلی چلے گئے۔

اس واقعے کو نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے، لیکن
اس کے بعض گوشے اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس کی اہمیت
میری زندگی میں اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ اس کے بعد جب تک
انگریزی اسٹاف کا کالج پر غلبہ رہا، اس وقت تک میری مادرِ علمی میرے
لیے شجرِ ممنوعہ بنی رہی، اور اس کا تھوڑا بہت اثر ان کے نکلنے کے بعد بھی
مدت تک جاری رہا۔

★

"میں پھر اپنے اس یقین کا اعادہ کرتا ہوں کہ جب تک بڑی طاقتیں
جنگ کے موثر ہونے اور جنگ کے ساتھ لازم و ملزوم
عیب دھوکے بازی میں اپنا یقین نہ چھوڑ دیں اور تمام قوموں اور
تمام نسلوں کی مساوات اور آزادی پر مبنی حقیقی امن کے قیام کی سرگرم
کوشش نہ کریں، اس وقت تک دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔"

——— مہاتما گاندھی

آزادی کے پچیس سال

نذیر بنارسی

آ کے سر سے اگر کی ٹوٹ گیا — کتنی مشکل سے سامان چھانٹا گیا
کس بلا کی تھی وقت فرنگی ادا — جسم تک دھرتی ماتا کا بانٹا گیا

ہم نے ہونٹوں اپنے گلشن سے بجلیاں — مر گئیں اپنی موت آپ تاریکیاں
بے زبانوں کو ہم سے زبانیں ملیں — توڑ دیں ہم نے جنگل کی خاموشیاں

سامنے آئی مشکل بڑی سے بڑی — اٹھ کے طوفاں اڑا آ کے آندھی لڑی
شانتی کا سفینہ بھنور میں پڑا — اس بھنور میں بھی بنیاد ساحل پڑی

اپنے پربت کو جب ہم سجانے لگے — ہنس کے آئینہ جھرنے دکھانے لگے
چاند انگڑائی لینے لگا جھیل میں — جل ترنگوں پہ جل گنگ گانے لگے

نغمے ہر ہر قدم پر سناتے چلیں — ساتھ قدموں کے دل بھی ملاتے چلیں
اپنا جیون بناتا ہے سندر اگر — سب کی جیون کی بھائیں سجاتے چلیں

شہر بن کے بن جگمگانے لگے — دوسرے دیس کے دل کو لبھانے لگے
مادرِ ہند کو یوں سنوارا گیا — غیر ملکی بھی درشن کو آنے لگے

کوئی مختار اور کوئی مجبور ہے — اصل منزل ابھی منزلوں دور ہے
کارناموں پہ کرتے چلیں اک نظر — آگے بڑھنے کا اک یہ بھی دستور ہے

ٹینک اپنا ہے گن اپنی اپنے جہاز — کیوں نہ ہو اپنے کل کارخانوں پہ ناز
دشمنوں کے چھکے ہیں وہ اک اپنا نہیں لگ — سب پہ کالیں گے ہم ہند ہے چارہ ساز

کتنی تعمیر ابھی زیرِ تعمیر ہے — اوجِ تقدیر محتاجِ تدبیر ہے
گر امنگیں نہ ہوں دل میں تعمیر کی — آدمی ایک کاغذ کی تصویر ہے

انکساری بھی فطرت میں ہے ناز بھی — پر شکن ہے پرندے کی پرواز بھی
شانتی دوت بھی ہے شکاری بھی ہے — اپنا ہر شیش کبوتر بھی ہے باز بھی

ٹوٹتے ہیں ہزاروں بپتاؤں کے سر — جب کہیں جا کے بنتی ہے اک رہگزر
لاکھوں فرہاد دل کر لٹا دیتے ہیں جاں — تب یہ شیریں کہیں ہوتی ہے جلوہ گر

دولتِ زندگی دی ہے بنگال کو — کیوں دعا دوں نہ پچیس سال کو
لہلہانے لگیں دھان کی کھیتیاں — یوں سنوارا گیا [illegible] بنگال کو

حسن کے ساتھ سڑکیں نکالی گئیں — دھرتی ماتا کی مانگیں نکالی گئیں
زندگی ہر قدم پر لہر لینے لگی — اتنی خوبی سے نہریں نکالی گئیں

بانگلا دیش انگڑائی لینے لگا — زندگانی کے سندیش دینے لگا
جو تڑپتا تھا کل مچھلیوں کی طرح — آج وہ دیس کی ناؤ کھینے لگا

کتنے کھیتوں کے سینے ابھارے گئے — کتنے پودوں کے گیسو سنوارے گئے
تھا نہ پانی جہاں ایک چلو تلک — ہم وہاں لے کے دریا کے دھارے گئے

جتنے پرسے ملے ان پلانوں کی دین — سب مشینوں کی کل کارخانوں کی دین
جن سے پانی دیئے اپنے آدرش نے — ان مشینوں کی کل کارخانوں کی دین

ہم سے گونجے ہیں [illegible] — ہنس پڑی ہیں پربتوں کی سونی چوٹیاں
[illegible] — صبح ہوتی ہے آ کے گانے لگیں تتلیاں

ساتھ جیون نے لی کال کی چھاؤں میں — زندگی ابر کی ہے [illegible] کے گاؤں میں
[illegible] — آئی [illegible] پاؤں میں

اردو شاعری میں

ہندو دیومالائی عناصر

[illegible]

اس سے پہلے کہ ہم اردو شاعری میں ہندو متھالوجی (MYTHOLOGY) کے استعمال اور اس کی بازیافت کے سلسلے میں پیش رفت کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متھالوجی (MYTHOLOGY) کے مستند اور مسلمہ معنی و مفہوم ذہن نشین کر لیں۔ متھالوجی جس بنیادی لفظ سے بنا ہے وہ جیسا کہ سب جانتے ہیں MYTH ہے۔ "THE RANDOM HOUSE DICTIONARY OF THE ENGLISH LANGUAGE" جیسی مستند لغت میں MYTH کا مطلب حسب ذیل درج ہے

A TRADATIONAL OR LEGNDARY STORY, USUALLY CONCERNING SOME SUPER HUMAN BEING OR SOME ALLEGED PERSON OR EVENT WITH OR WITHOUT A DETERMINABLE BASIS OF FACT OR A NATURAL EXPLANATION ESPACIALLY A TRIDITIONAL OR LEGENDARY STORY THAT IS CONCERNED WITH DEITIES OR DEMIGODS AND THE CREATION OF THE WORLD AND ITS INHABITANTS.

[illegible]

قدرت کے عجیب و غریب اور ہوش ربا جلووں اور مناظر نے آہستہ آہستہ اس جہان رنگ و بو [illegible] اور عظیم کائنات میں جب انسان نے [illegible] اپنے وجود [illegible] دیگر موجودات اور مخلوقات [illegible] سے اپنے تعلق اور اپنی نسبت کو سمجھنے کی کوشش کی ہوگی تو اس وقت کے احساسات اور تجربات کے اور تعاقبات کا کیا عالم رہا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ [illegible] ایک عالم تحیر، اور خوف کے احساس [illegible] کی فضا اور جہات کائنات کے [illegible] سمجھنے اور سمجھانے کی [illegible] اور [illegible] کوششوں کے درمیان انسان نے اپنی ذہانت کے مطابق جو کچھ سیکھا اسے دوسروں تک منتقل کرنے [illegible] اپنے وقت [illegible] کو [illegible] کرنے چاہی چنانچہ انسانی احساسات و جذبات کے وسیلہ اظہار کے طور پر زبان اور [illegible] کی تخلیق ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف علائم [illegible] تجربات [illegible] کے [illegible] درمیان کا [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible] ہندوستانی تہذیب [illegible] کے [illegible]
[illegible] ادب [illegible] میں [illegible]
علم الاصنام کا تعلق کسی حد تک واضح ہوتے ہیں۔ پہلا درجہ شکل [illegible] کا ہوتا
ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل وہ ہے جبکہ وہ انسانی اپنے تصرفات سے
کام لیتا ہے اور تیسرا درجہ اس ارتقا کا ہے جبکہ اس میں گہرائی اور معنویت
پیدا ہو جاتی ہے۔

فن و ادب کے اکثر ماہرین مثلاً [illegible] کا خیال ہے کہ یونانی اور رومی اصنامی روایات کی طرح ہندو اساطیر میں تفریح یا آمیزش کے پہلو نہیں ملتے۔ مگر اس خیال سے پوری طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو دیومالا میں ایک گہری معنویت اور فلسفیانہ ربط و تسلسل ملتا ہے۔ غالباً اسی لیے امرسن کو ہندو علم الاصنام میں "SUBLIMITY OF ETHICAL THOUGHT" نظر آئی تھی۔ ڈاکٹر [illegible] نے بھی اپنی تصنیف اردو [illegible] کے تعلق میں اس خیال کی ہمنوائی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہندوستانی دیومالا (غالباً یہاں ہندو دیومالا کی طرف ہی اشارہ ہے) دنیا کی سب سے زیادہ دلکش اور عظیم دیومالا ہے۔"

یوں تو یہاں ہندو دیومالا کا شمار نہ تو ممکن ہی ہے اور نہ ہی مقصود ہے مگر ان کی ماہیت اور نوعیت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر ہندو اصنامی روایات کہانی یا تمثیلی نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے "بعض تو مناظر قدرت اور کرشمات فطرت" مثلاً شمس و قمر کی تاثیر کے مطالعے اور مشاہدے کا نتیجہ ہیں اور بعض انسانی احساسات و جذبات اور [illegible] کی تفہیم اور تبلیغ کے سلسلے میں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ بعض ایسی روایات بھی ہیں جو ملکی اور جغرافیائی ماحول، معاشی اور تمدنی زندگی [illegible] کے سلسلے میں [illegible] ہیں [illegible] فلسفۂ حیات [illegible] کے سلسلے کی کڑی ہیں۔

اردو شاعری میں ہندو دیومالا کا دو طرح سے استعمال ہوا ہے، ایک تو [illegible] ہندو دیوی دیوتاؤں کے متعلق کہانیاں وغیرہ [illegible] دوسرے [illegible]

[illegible] اردو شاعری [illegible] کے چند شعر کے [illegible] ہندو دیومالا کے عناصر [illegible] کی ایک [illegible] [illegible] کے [illegible] تو [illegible] شعرائے ہی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر [illegible] صاحب اپنی ایک اہم تصنیف [illegible] میں اردو شاعری میں ہندو اساطیری عناصر کے تعلق سے فرماتے ہیں: "ہندوؤں کے مذہبی اور تہذیبی عناصر کے نشانات غزل میں پائے جاتے ہیں عام طور پر حسب ذیل ہیں۔ بت پرستی، خدا پرستی، گنگا اشنان، ہولی، دیوالی، بسنت، سبزہ قشقہ، رام لچھمن، سیتا، برہمن، جوگی، زنار وغیرہ۔ اگرچہ اس مختصر سی فہرست سے ہندو عناصر کا کامل احاطہ نہیں ہوتا مگر پھر بھی اس کی روشنی میں پیش رفت کرتے ہوئے جب ہم اردو شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام بھی ہندوستانی، مذہبی، ثقافتی، وطنی اور فطری عناصر سے مزین و مرصع ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

سبھی ناگاں کے گل پھل ہار بایا ہے سو [illegible]
جو گھلے رام لچھمن کر دوانی دیکھاتی ہے
شاہ کے مند سعادت کا خبر لیایا بسنت
نین پتلیاں کے چمن میں پھول لیایا بسنت
شکر ایزد کو معانی رات دن آنند سوں
ترے مندر میں خوشیاں آنند سوں آیا بسنت

ولی تمارے توارے

اچھائی ورن موہن پیارا [illegible] سو کھینچا آنچل کنارا

محمد قلی کے بعد اس عصر میں سب سے اہم کتاب کا ذکر کیا جا سکتا ہے وہ [illegible] کی مشہور نثری تصنیف [illegible] ہے۔ ہندو دیومالائی عناصر کے تعلق سے اسے اردو کے دکنی عہد کی نمائندہ شاعری قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بیشتر گیت ہندو دیومالا سے [illegible] جیسے اندر، شیو، پاربتی، سرسوتی، گنیش اور اندر وغیرہ جیسے دیوی دیوتاؤں [illegible] اس میں [illegible] کے ساتھ [illegible] آیا ہے۔

ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

نورس، سوز جگ جوتی آنند سرو مگی
پوست سرستی ماتا ابراہیم پر ساد بھگتی مدنی
گیستی سورت ہست ستکھ مد برکھت پانی
ونت واس گھنٹ گھو گھو گھورنڈلن بجاں ستھوپانی

اور شیو جی کا سراپا دیکھیے کس طرح کھینچا گیا ہے:

بھبھوت کر پور گورا بجال تلکت چندرا
تری نیترا جٹا مکٹ گنگا دھرا
ایک ہست انڈ بیرا ترسول جگل کرا
باہن، بلیورد دیت مات گسائیں ایسورا
گینتی تم روپ کی تنک جوت سو بجلا سنت
بجو کنچن تھال موتیا جر اندر چھپا یو بھا درد وار

اس طرح سارے دکنی عہد میں ہندو اساطیر کے تعلق سے بے شمار مثالیں ملتی ہیں جیسے:

سورج گیران چھوٹے لگ
(کنزالمومنین - عابد شاہ)

موہان تے پانی سیت کا ڈھل جاؤں بدا بیری
(علی نامہ - نصرتی)

کھیا شہ کوں راکس اس ٹھار پو
(قطب مشتری - ملا وجہی)

دوا چند ہنم کا ستارے جتنگ
بھی اماوس لگ داں تھے اندھار ہاک
(موہن بل - قریشی بیدری)

بھاگیرتی سو مانگ ہے مس پھول بر ہمن
(کلیاتِ ضیافی - شاہی)

جنت کے تر جگ جیں سو یک جمن تج بلغ کا
کر گوپن سے کے نمی دو تن لگی ہے کان کی جاسگے
(کلیاتِ بحری - محمود بحری)

دلی دکنی کو جس کے اثر سے شمالی ہند میں بھی اردو شاعری کی ابتدا ہوئی، دراصل دکنی عہد ... اور ... کا ... کہا جا سکتا ہے۔ ان کے کلام میں بھی ... کی جھلکیاں ... ملتا ...

زلف ہے تیری موج جمنا کی
تل نزدیک اس کے اک سناسی ہے
کشن سوں جب کہ رام راسی ہے
گنگا رواں کیا ہے نین سے آپس ستی
آ اے صنم شتاب ہے روز نہان آج
کفر کوں توڑ دل سوں دل میں رکھ کر نیت خالص
ہوا ہے رام بن حسرت سوں بجا لچھمن سوں رام اس کا

دکنی لوک گیتوں میں بھی کہیں کہیں ہندو اصنامی روایات کے اشارے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

آئیم آئیم بول کو سچ بولو پنڈت
راجت کے پاؤں کو لگاؤں گی ٹھگت
بجایاں مرے بھینیں، شولا پور کی گھوڑی
اللہ صاحب جیو رام لچھمن کی جوڑی
میں بن جاؤں گی دیول کی دیوی، ہاں رے سیاں
پوجاری بن بن کر پوجا کروں گا، دیوی کو جانے نہ دوں گا

اردو کو شروع سے ہی مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کا خلوص و پیار اور باہمی اتحاد و یگانگت کی روح ملی ہے صدیوں سے۔ یہ ایک رشتۂ اتحاد بھی بنی ہوئی ہے۔ عام زندگی کی طرح شاعری میں بھی ایک دوسرے کی تہذیب، مذہب اور اعتقادات کا احترام ملتا ہے۔ چنانچہ امرت لال جو مرہٹی کے شاعر تھے، انھوں نے دکنی میں بھی شاعری کی تھی مثنوی سدام چرتر میں کرشن جی کے بچپن کے ایک ساتھی سدام کی زندگی کی ایک جھلک پیش کی ہے۔ خوبی یہ ہے کہ مثنوی کی ابتدا انھوں نے حمد سے کی ہے — ابتدائی چند شعر پیش ہیں:

عجب ہر گھڑی جی تو ہی کارساج
خلق بیچ میانے دسی کارساج
وہی ہے کرم بخش صاحب دھنی
اسی کو ہے کل عالم غنی

اس سے بنتا آتش اور آسمان
یہ سب کب آتش بنایا مکان
مرگ مرتیو پاتال جیو بی تیو
ہر کا ہر یہ جو کلاں تیو

شمال میں اردو شاعری کے آغاز کے بعد شمالی ہند کے ان اہم شعرا میں جنھوں نے ہندو دیو مالا کو بطور خاص برتا ہے نظیر اکبرآبادی اپنی نظیر آپ ہیں۔ اردو میں عوامی شاعری کے داعی و نقیب نظیر اکبرآبادی کے ہاں جسے ترقی پسند بھی اپنا باوا آدم تسلیم کرتے ہیں، ہندو دیومالائی عناصر اور ہندو مذہبی تہواروں کا ذکر بیان صرف تشبیہ و استعارے کی صورت میں ہی نہیں بلکہ ایک طرح کے عقیدے اور طرز زندگی کے طور پر ملتا ہے۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے دکنی شعرا کی طرح حمد و نعت میں بھی ہندو اساطیر کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ حمد کا ایک بند ملاحظہ ہو:

کوئی خالق باری رب مولا رحمان رحیم اللہ تنگری
کوئی ایک روپ کرتار کہے نرکال کہے نرگن دھاری
کوئی رام رام کہہ کو سمرے کوئی بولے شیو شیو ہری ہری
کوئی دانا دینت دیال کوئی رامیس دیا بت جن پری
کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

نظیر کا ہندو عقائد، تہواروں اور مذہبی اوتاروں وغیرہ سے گہرا لگاؤ ان کے مزاج میں پوری طرح سے رچ بس گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے کے ہر ممکن موقع پر نظمیں کہی ہیں۔ جیسے "جنم کنھیا جی کا"، "کنھیا جی کی شادی"، "بالپن بانسری بجیا"، "رس کتھا"، "ہر کی تعریف میں"، "درگا جی کا درشن"، "مہادیو کا بیاہ" وغیرہ وغیرہ۔ ہر کی تعریف کا ایک بند پیش ہے:

تم کیا کیا صفت کہوں یارو اس شام برن اوتاری کے
شری کشن کنھیا مرلی دھر من موہن کنج بہاری کے
گوپال منوہر سانولیا گھنشیام اٹل بنواری کے
نندلال دلارے سندر چھب برج چند مکٹ جھلکاری کے

بانسری اور ہولی کے تعلق سے ایک ایک بند ملاحظہ ہو:

جب مرلی دھر نے مرلی کو اپنی ادھر دھری
کیا کیا پریم پریت بھری اس میں دھن بھری
لے اس میں جو نند لال کی ہر دم بھری لہری
لہرا گئی دھن جو اس کی ادھر اور ادھر ذری
سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنھیا نے بانسری

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ رنگ اور راگ سے بھیگے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودے ہیں کچھ اچھلے ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ ہولی کا ہر آن بنایا ہولی نے

اس سے قبل کہ شمالی ہند کی معیاری اردو شاعری کا ذکر کیا جائے، جان صاحب کی ریختی سے بھی جو اردو کا ایک خاص اسلوب اظہار رہا ہے ہندو اساطیر سے متعلق چند مثالیں پیش کر دینا یقیناً بے محل نہ ہوگا:

سوم کے گھر میں میاں کی دال بھی گلتی نہیں
برہم راکس جان لے گا آنکھ لے گی کالکا

گو عقل میری الجھی ہے پر کیا کروں کچھی
تقدیر تو بدتر ہے مری بھاگ بھری ہے

نام کیا لنکا میں کرتی شاعری سے میں سوا
مجھ سی جادوگرنیاں ہوتیں اگر راون کے ساتھ

ایک ایک نقطے پہ موئے لڑتے ہیں مردوے
محفل شاعروں کی اکھاڑا ہے بھیم کا

تل نہیں مانگ میں زنانی کی
یہ کنھیا کھڑا ہے گوکل میں

"اُردو شاعری کا مزاج" میں ایک مقام پر ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے اور بہت صحیح لکھا ہے کہ انیسویں صدی میں اردو گیت کی ابتدا امانت کی اندر سبھا سے ہوئی اور اندر سبھا کی فضا اس ہندوستانی فضا کا عکس ہے جس میں بت پرستی کا عمل اور بوقلمونی اور تنوع کی صفات ہمیشہ سے عام رہی ہیں۔ اندر سبھا پر سحر البیان اور گلزار نسیم کے پرتو کے آثار بھی ملتے ہیں۔ ذیل میں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

ان کے [illegible] ہاری [illegible] ہماری
[illegible] کے [illegible]
تم جا کر [illegible] ہماری
[illegible] یہ ان [illegible] بیماری
[illegible] ہے جان سے ماری

کچھ اس لئے بھی کہ شاعری کا کسی قسم کا جائزہ اس وقت کے علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی اور معاشرتی حالات کے پس منظر کے مطالعے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ [illegible] یہ توقع نہیں کہ ان تمام حالات سے بحث کی جائے۔ مگر مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری [illegible] تہذیبی تمدنی [illegible] رنگ [illegible] اختلاف و تقاریب [illegible] رسم و رواج میں [illegible] کے ظاہر [illegible] بالکل برعکس اس وقت کی شاعری میں [illegible] آیا ہے۔ [illegible] اخلاقی [illegible] نظریں [illegible] رنگ پھیکا پڑتا گیا ہے۔ مختلف تحریکوں اور مختلف انقلابوں کے زیر اثر اردو شاعری کے [illegible] قسم کی [illegible] ہے۔ اب [illegible] کے [illegible] بعض [illegible] ہیں۔ [illegible] شاعری [illegible] حقیقت [illegible] اردو شاعری کسی زمانے میں بھی اپنے ماحول کے اثر [illegible] کی فضا اور اس کی تہذیب [illegible] روایات و حکایات کے دل [illegible] نہیں رہی۔

[illegible]
[illegible]
[illegible] (شاہ حاتم)
[illegible] کی [illegible] خیال کی
[illegible] کی
[illegible] صورت
[illegible] (فائز)
[illegible] (مضمون)

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کی
[illegible] کی

[illegible] ہو قریب [illegible]
[illegible] کس کو [illegible] (میر تقی میر)

اردو شعر و ادب میں [illegible] میر [illegible] یوسف زلیخا کے عشق کے افسانے ہی نہیں [illegible] مثنوی [illegible] مثلاً [illegible] مرزا [illegible] کی تصنیف مثنوی [illegible] مال [illegible] ایک [illegible] داستان عشق کے تعلق سے ایک مثنوی [illegible] ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] اس [illegible] کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

سنا [illegible] سے ہوا
[illegible] مشہور ہے [illegible] مذکور ہے
[illegible] ہوتی ہے [illegible] رنگ اور [illegible] ہے

ہماری [illegible] شاعری کی روایات نہ صرف اردو شاعری [illegible] تک محدود ہیں بلکہ [illegible] مذہبی اور [illegible] زندگی [illegible] تہذیبی [illegible] کی بنیاد [illegible] بعض [illegible] رسوم [illegible] اپنی [illegible] ہے۔ [illegible] ان کے [illegible]

[illegible] مذہب [illegible] ہندو [illegible] [illegible]
[illegible] مذہب [illegible] [illegible]
[illegible] سے [illegible] یہ تھا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

ہم نہ کہتے تھے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

[illegible] چاہیے اسلام کی رونق کے لیے
حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

اور اس روایت کا سلسلہ غالب تک پہنچتا ہے

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

اس تصوف [illegible] کی دلکش [illegible] کے عشق [illegible]
بیل کے نیچے ہندوستان کی سرزمین رنگ رنگ کی برسوں [illegible]
اور [illegible] بھی لہلہاتے رہے۔ مگر [illegible] مختلف محرکات و
عوامل، روایت و بغاوت، شکست و ریخت کے [illegible] چل رہے تھے
اس انحطاط اور انتشار کے اثرات [illegible] سے اردو شاعری کیسے
خالی رہ سکتی تھی [illegible] اکبر الہ آبادی اپنے مخصوص رنگ میں فرماتے ہیں

کہاں کے [illegible] ہند و مسلمان [illegible] سب [illegible]
[illegible] تیرہ [illegible] اشتی ہے

اب [illegible] زنار [illegible] اٹھا جاتا ہے [illegible] ہندو [illegible] مسلمان [illegible]
ہندو [illegible] ہم [illegible] [illegible]
اس [illegible] مذہب [illegible] [illegible]

عشق سے پاک ہوا اگر دل نہیں ہے پاک
زمزم میں غسل [illegible] نہا لیجیے

[illegible] نانک کے [illegible] مذہب [illegible] میں
[illegible] نانک [illegible] اور [illegible] کی
وحدت دی تھی اور گوتم [illegible] نانک اور [illegible] رام [illegible] عقیدت پیش
کی تھی

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

گوتم کا جو وطن ہے جاپان کا حرم ہے
عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے

ان کے ہاں بھی رام چندر جی پر ایک مستقل نظم ملتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند

اعجاز اس چراغ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شام ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں جوش محبت میں فرد تھا

یہی نہیں انیس کے مرثیوں کی طرح [illegible] میں ہندوستانی تہذیب و
ثقافت کا رنگ نمایاں ہے۔ مشہور نعت گو محسن کاکوروی کے ایک مشہور
نعتیہ قصیدے کی تشبیب بھی سراسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل	برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل	جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن	سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے	نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں	تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

پیغمبرِ امن

رعنائیِ افکار

مہاتما گاندھی

مرتضیٰ امروہوی

آج سے کچھ سال پہلے اس زمیں کی خاک پر
اک مجاہد، اک عظیم انسان ہوا تھا جلوہ گر
یعنی گاندھی، اس زمیں کی عظمتوں کے ترجماں
سچ کے رکھوالے، اہنسا کے محافظ بے گماں
وادیِ امن و اماں میں آپ کی تنویر ہے
زندگی کے ہر ورق پر آپ کی تصویر ہے
آپ کا پیغام، پیغامِ محبت کا امیں
آپ کا پیغام، امن و آشتی، عزم و یقیں
آپ کی دانش وری ہندوستاں کی آرزو
آپ کی ہستی جہادِ زندگی کی آبرو
سرزمینِ ہند کو روحِ تجلی پاش دی
آپ نے رجعت پسندوں کو شکستِ فاش دی
آپ نے انسانیت کی قدر کو بالا کیا
خون کا اپنے جلا کر دیپ اجالا کیا
آپ کی یہ روشنی ظلمت مٹا سکتی نہیں
آپ کی اس شمع کو دنیا بجھا سکتی نہیں

مفتون کوٹوی

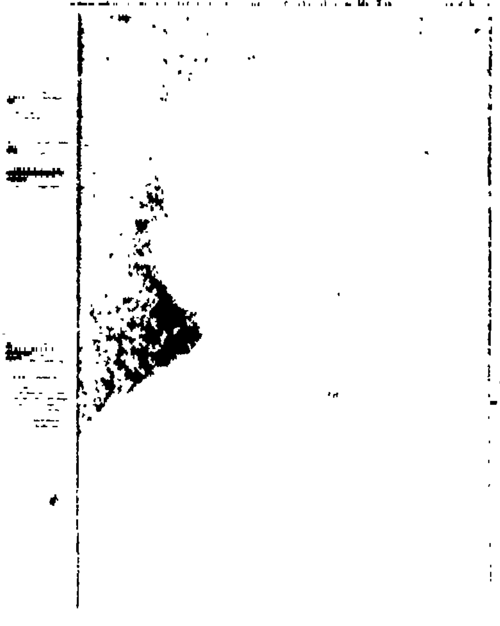
جمہوریت ملک پہ ہے فخر ہمیں آج — ہر اہلِ وطن کے لیے زینت کا سر تاج
صد شکر کہ اپنا ہی ہوا ملک میں اب راج — ہاں کس کی بدولت ہوا انگریز کا اخراج
وہ مخلص و خود دار و وفادار تھے گاندھی

وہ راہ دکھائی کہ وطن ہو گیا آزاد — سرشار ہر اک شخص ہوا قلب ہوا شاد
ڈالی گئی جمہوریت ملک کی بنیاد — ہر گوشہ وطن کا ہے اب اس جشن سے آباد
[illegible] کے خواہانِ [illegible] تھے گاندھی

عیسائی ہو، سکھ ہو کہ مسلمان کہ برہمن — مزدور ہو، دہقاں ہو کہ ہیں ہندو کہ ہریجن
کشمیر میں گھر ہو کہ ہو پنجاب میں مسکن — بنگال ہو، مدراس ہو، گجرات ہو مامن
ہر اہلِ وطن کے بڑے [illegible] تھے گاندھی

آزادیِ ملک اور خیالاتِ ترقی — ہیں منتظرِ [illegible]، روایاتِ ترقی
خواہش سے ابھر آتے ہیں جذباتِ ترقی — کوشش سے ہیں مشروط حالاتِ ترقی
یہ نشہ وہ ہے جس کے طرفدار تھے گاندھی

آزادیِ ملک اہلِ وطن سب کو مبارک — جمہوریت [illegible] یہ سب کو مبارک
یہ غنچہ و گل، سرو و چمن سب کو مبارک — اب اوجِ ترقی کا چلن سب کو مبارک
کیا پیکرِ رعنائیِ افکار تھے گاندھی



حافظ صاحب

• ——— سید حامد

جون ۱۹۴۵ء کا ذکر ہے میں ملازمت کے سلسلے میں الٰہ آباد سے بجنور کے لیے روانہ ہوا۔ جہاں میرا پہلا تقرر ہوا تھا۔ بجنور پہنچتے ہی حافظ صاحب کا ذکر کانوں میں پڑنے لگا۔ معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں گرفتار ہوئے تھے ابھی چھوٹ کر آئے ہیں۔ زبانِ خلق پر ان کی تعریف تھی۔ ایک روز ان سے ملاقات بھی ہو گئی۔ از رہِ غریب نوازی ایک دن وہ مجھ سے ملنے چلے آئے۔ میں انسپکشن بنگلے کے ایک کمرے میں مقیم تھا۔

یہ پہلی ملاقات تھی، اور آخری ملاقات جون ۱۹۶۶ء میں ہوئی اس وقت وہ پنجاب کے گورنر تھے۔ گورگ سے واپسی میں ہم لوگ دو روز کے لیے ان کے ساتھ ٹھہرے۔ اس وقت ان کے مزاج ناساز تھے، سانس پھولا ہوا تھا، آکسیجن لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ پہلی اور آخری ملاقات کے درمیان کئی بار حافظ صاحب کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ اس اثنا میں وہ کبھی حکومت کے باہر تھے اور کبھی اس کے رکن رہے، لیکن اس ۲۲ سال کے عرصے میں ان کے رویے میں سرِ مو تبدیلی نہیں ہوئی۔ [illegible] احساس ہوتا تھا گویا انھوں نے وقت کے چیلنج کو قبول کر لیا [illegible] وہی انداز نشست و برخاست، وہی آداب و اطوار، احباب کے ساتھ وہی خصوصیت، عوام کے لیے وہی صلائے عام جس کا جی چاہے دسترخوان پر بیٹھ جائے جس کے دل میں آئے ان کا مہمان بن جائے جو چاہتا خود کو دعوت دے دیتا۔ وضعداری حافظ صاحب کی خو تھی۔ جس طرح شہتوت (؟) سے کونپلیں پھوٹتی ہیں، ان کی بے تکلف اور دل پذیر شخصیت سے وضعداری پھوٹتی تھی۔ زمانے نے لاکھ زور لگایا اس بندۂ خدا کی وضع میں فرق نہ آیا۔ تخت و تختہ کے مراحل سے وہ کئی بار گزرے آج زنداں میں تو کل ایوانِ وزارت میں۔ آج عدالت میں بحث کر رہے ہیں تو کل مجلسِ قانون ساز میں۔ خواہ مجرم کو عدالت سے بچانا ہو یا خود زنداں میں جانا ہو، قانون توڑنا ہو یا قانون بنانا ہو، حافظ صاحب کے رویے، ان کے انداز، ان کے سکون و طمانیت، ان کی [illegible] اور ان کی دلربا گفتگو میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کے چہرے پر ہم چشم (؟) اعدا نے کبھی گھبراہٹ کی لکیر نہیں دیکھی۔

بجٹ پیش ہونے والا یا ابھی سندھ کا ہو تو وہ اسمبلی کا، تقاضا [illegible]
ہوتا ہے۔ چونکہ بیشتر وزیر بھی کام کرتے ہیں انھیں ان دنوں کے لیے
بڑی تیاریاں کرنا پڑتی ہیں جب ان کے محکمے کی گرانٹ ایوان میں پیش کی
جاتی ہے۔ ایک سال کا ذکر ہے حافظ صاحب یو پی میں [illegible] اور
محکموں کے صنعت و حرفت کے وزیر بھی تھے۔ میں اسی محکمے سے متعلق
تھا۔ ہم سب رفقا نے بجٹ گرانٹ کی بحث کے لیے جی بھر
کر تیاریاں کیں۔ ان طالب علموں کی طرح جو متوقع سوالات کے
جواب تیار کرتے ہیں ہم نے بھی جستجو کے گھوڑے دوڑائے اور ان
سوالات کا تصور کیا جن کا پوچھا جا سکتا ہے وزیر با تدبیر کو سامنا کرنا
پڑے گا۔ ان سوالات کے جواب تیار کیے، جواب الجواب کو قیاس کی
گرفت میں لا کر اس کا جواب بھی قلم بند کیا گیا۔ ایوان کی نشاندہی میں
جو سوالات اٹھائے جاتے ہیں، جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ
سب آفیشل گیلری میں بیٹھے ہوئے عہدہ دار قلم بند کرتے ہیں۔ ان
کے جوابات کا مسودہ افسران کے متعلق [illegible] جلد جلد تیار کر کے وزیر
کے پاس پرزے بھیج دیے جاتے ہیں۔ صنعت و حرفت کا محکمہ یوں
بھی اہم ہے پھر اس کے پھیلاؤ اور [illegible] مکانات کے پیش نظر ارکین
نے محکمے کے طرز عمل پر خوب لے دے کی۔ طرح طرح کے پریشان کن اعتراضات
کیے۔ ٹیڑھے سوالات کیے۔ آفیشل گیلری میں بیٹھی ہوئی فائلیں [illegible]
لگیں۔ جوابات و تشریحات کے پرزوں پر پرزے بھیجے گئے۔ حافظ صاحب
ان پرزوں کو بیس بیس پڑھتے جاتے تھے۔ منہ چہرے پر تشویش کے آثار [illegible]
[illegible] کی کوشش۔ پھر جواب دینے کا وقت آ گیا۔
فرماتے ہیں:

"کاریگری میں ایک مشکل ہے کہ ان عیب نہ کر دیں کہ عیب"
یعنی کیجے [illegible] نہ کیجے تو ایک برائی۔ اس کے بعد ایوان کے سامنے
ارکان نے کتنی طویل تقریریں ہمارے محکمہ صنعت و حرفت کی کارکردگی
سے متعلق کیں، کتنے عیب نکالے، کتنے نقص بیان کیے، کتنی بدانتظامیاں
اور [illegible]۔ اس کے [illegible] ہوتا ہے، [illegible] ہم سب ہمارے
ہمارے محکمے کے کار ہائے نمایاں کو دکھاتے بھی آ رہا سکتے ہیں لوگوں کو
اعتراض کرنے کا موقع [illegible] آیا۔ ہم کچھ [illegible] کرتے، [illegible]

ہے صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لیے [illegible]
[illegible] انقلاب لانا انھیں ورثہ گیری اور [illegible]
"حرف گیری اور نکتہ چینی حزب مخالف کا حق ہے [illegible]
سمجھا گیا ہے۔ لیکن جب میری باری آئی تو [illegible] جب کوئی نکتہ
یہ دیکھا کہ فاضل حزب مخالف نے حرف گیری کا [illegible] اچھا ہی کیا ہے
اس کی تقریر میں مذاق کی کمی [illegible] کوئی تعمیری بات۔ میں نے امید کی تھی
تھا کہ [illegible] بہتر ہو سکے اور صنعتی ارتقا کے [illegible]
میرے فاضل نکتہ چیں کوئی ایسا ٹھوس مشورہ ایوان کے سامنے رکھیں گے
لیکن میری مایوسی کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے اپنی تقریر [illegible]
تک محدود رکھا اور کوئی بات ایسی نہ کہی جس سے ہمارے صنعتی پروگرام کو
ترقی و فروغ ہو سکے۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

اتنا کہا اور حافظ صاحب بیٹھ گئے۔ مخالفین کی ساری کارروائی
بد یہہ گوئی سے صاف کر گئے۔ ایک کہاوت سے تقریر کا آغاز ہوا اور ایک
شعر پر اختتام۔ حافظ صاحب ایوان کی نس نس کو پہچانتے تھے، جب
چاہتے شگفتۂ بیان سے اسے گرما دیتے، جب چاہتے ایسے لاجواب کر دیتے۔
اعتراضات کو چٹکیوں میں اڑا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔
شعر کا ذکر بھی آ گیا تو اس سلسلے میں ایک بات کا ذکر کرتا چلوں جو
موصوف کو شعر و شاعری سے تھا۔ دن بھر کے ہنگاموں اور جھمیلوں سے فارغ
ہو کر رات کا کھانا کھانے کے بعد حافظ صاحب [illegible] اور گرد چند
احباب ہوتے جو بیشتر [illegible] ہوتے اور جہاں [illegible] تازہ ہو کر آتا اور شب
تک شعر و شاعری اور لطائف و ظرائف [illegible] وحکایات کا دور چلتا۔ حافظ
صاحب حقہ پیتے جاتے [illegible]
سرور و انبساط ہوتے۔ ان صحبتوں کی [illegible]
شاعروں کی [illegible]
[illegible]

میں بلا کی لطافت آگئی۔

آزادی ملنے کے بعد یو۔ پی۔ اور مرکز، ہر جگہ کانگریس کا ڈنکا بجنے لگا تو ان میں سوائے مولانا آزاد کے چھوڑ کر مرکز میں بھی حافظ ابراہیم کا کوئی حریف نہ تھا۔ مولانا آزاد کو بلند پایہ سیاسی احساس برتری نے خلوت نشین بنا دیا تھا اور وہ رفعت تخیل اور بلندی ذوق کے دام میں اسیر ہو گئے تھے۔ ان کے اور عوام کے درمیان خواہ وہ سیاست کی دنیا ہو خواہ شعر و ادب کی، فاصلہ دن بدن بڑھتا گیا۔

حافظ صاحب عوام کے اپنے فرد تھے۔ ان کے ساتھ گھل مل کر شیر و شکر ہو کر رہتے۔ وضع قطع، نشست برخاست، اطوار و آداب میں وہ سو لانے عوام کے آدمی تھے۔ سول لائن میں زندگی گزارنے والے اعلیٰ طبقہ سے جو کر ہوا میں معلق رہتا ہے، انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ انھوں نے محلّے کی زندگی سے اپنا ناتا کبھی نہ توڑا۔ مغرب کے تمدن نے ان کی نگاہیں کبھی خیرہ نہ کیں۔ علم و خرد کی تمام بنیاد و موشگافیوں نے ان کے ذہن کو ادراک اور حقیقت آشنا فہم کو کبھی گمراہ نہ کیا۔ یہی راز تھا کہ ان کے اس عزیز زندگی مقبولیت سادگی، اعتماد اور سکون کا۔

سیاست میں حافظ صاحب نے اپنی سادگی کی وجہ سے بارہا دھوکے کھائے لیکن انھیں کوئی گزند نہ پہنچا۔ ان پر چھینٹے ڈالے گئے، کیچڑ اچھالی گئی تاہم ان آزمائشوں سے وہ بے داغ نکلے۔ وہ ہمارے رہنماؤں کی صف اوّل میں نہ تھے۔ سیاست عالیہ میں شاید انھیں دخل کا موقع بھی نہ ملا ہو۔ شعر و ادب میں انھوں نے کوئی یادگار نہ چھوڑی پھر بھی ایوانِ سیاست میں یو۔ پی کے تمدن کے وہ آخری ترجمان تھے۔ ان کی شخصیت دلنواز اور دلپذیر تھی، ان کی سیرت بے تصنع، ان کی گفتگو بے تکلف، ان کا دسترخوان وسیع، ان کا توکّل اَلَم نشرح، ان کی انسان دوستی ضرب المثل تھی۔ ان کی طاقت کا راز یہی تھا کہ وہ ایک عام انسان تھے۔ ان کی ذات میں عام انسانیت کے بے شمار دلکش پہلو جمع ہو گئے تھے، اور اس کی بعض کمزوریاں بھی۔ ترقی نے ان کی فروتنی میں اضافہ کیا، زمانے کے نشیب و فراز نے لاکھ سر مارا ان کی وضعداری میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔ یہی ان کی عظمت کا بڑا پہلو ہے۔ اختیار اور اقتدار کو انھوں نے کبھی نہ سمجھا جو انسان کی عالی ظرفی ہے۔ غریب اور امیر کے درمیان کبھی امتیاز نہ رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ انسان کی بڑائی کا صحیح اس کا کردار ہے اور کردار کی بنیاد ہے سادگی اور انسان دوستی پر۔

یا شاید ان کبھی اس پودے کو جس کی جڑیں زمین میں دور دور تک پھیل گئی ہوں، اکھاڑ کر دوسری جگہ نہیں لگاتا، وہ جانتا ہے کہ وہ پودا اس نئی زمین میں جڑ نہیں پکڑ سکے گا، کمھلا جائے گا۔ حافظ صاحب کو اودھ یو۔ پی سے اکھاڑ کر مرکز میں بٹھا یا گیا، دلی میں آکر وہ پنپ نہ پائے، کمھلا گئے، وہ پھل نہ سکے۔ ان کی جڑیں مرکزی زمین کو پکڑ نہ پائیں، انھیں یو۔ پی کی معاشرت، وہاں کا گھر یلو پن، وہاں کی صحبتوں کی یاد ستانے لگی۔ پارلیمنٹ میں انھیں انگریزی میں تقریریں کرنا پڑیں جو وہ روانی سے کر سکتے تھے لیکن ان میں وہ بات کہاں جو ان کی لطافت و ظرافت سے بھری ہوئی خطابت اور بذلہ سنجی سے سنواری ہوئی اردو میں تھی۔ دلّی میں وہ کمھلانے لگے۔ دلّی نے ان کی شخصیت کی آب و تاب کو دیکھا ہی نہیں۔ دہلی سے ہٹے تو چند ہی گھڑیوں کو، آج بھون میں اسیر کیے گئے۔ وہاں کی فضا انھیں کیا راس آتی؟

برعکس ہند نامِ زنگی کافور۔ آخر میں حافظ صاحب کا یہی عالم ہو گیا تھا۔ جس کے حافظے نے کبھی قرآن مجید کا احاطہ کیا تھا زندگی کی آخری دہائی میں اُسے نسیان کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ اور بات بے جا نہ تھی۔ کلام اللہ کو بھول جانے کے بعد پھر یاد رکھنے کے لائق کون سی چیز تھی۔ حافظ صاحب کے حافظے سے جو سہو سرزد ہوتے ان پر چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں لیکن وہ دوسروں کے اعتراضات سے اسی حد تک بے نیاز تھے جیسے اپنی کوتاہی سے۔ چھوٹے دماغوں کی چھوٹی باتیں ان کے لیے کبھی درخورِ اعتنا نہ ہوئیں۔ حافظ صاحب کا عارضۂ نسیان ڈاکٹر ضیاالدین مرحوم کی قبلِ نسیان سے مختلف تھا۔ موخر الذکر بزرگ نے جان کر بھولنے اور بھول کر یاد کرنے کو فنِ لطیفہ کا مرتبہ عطا کیا تھا۔ حافظ صاحب کی بھول میں آورد کا شائبہ نہ تھا۔ وہ سراسر آمد تھی۔

حافظ صاحب کے اندازِ گفتگو میں خوش خوابی کی ادائیں تھیں۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ ذہن سرعت کے ساتھ کسی بات کی طرف منتقل ہونے کے لیے تیار ہی نہیں۔ وہ بات آہستہ آہستہ کرتے تھے اور اطمینان سے جیسے کھانا کھاتے وقت کوئی ہر لقمے کا لطف اٹھائے۔ دوسروں کی باتوں کو ان کا ذہن بظاہر اسی رفتار سے گرفت میں لاتا تھا۔ بات کہنے یا بات سننے میں بوکھلائی ہوئی تیز روی کو وہ شاید معیارِ تہذیب سے ساقط

سکتے تھے۔ شرفا کو کسی نے سیاہ وہ تے دیکھا ہو۔ ایک سوال کو وہ ایک سے زیادہ بار پوچھتے گویا خود سے کہہ رہے ہوں کہ ارشاد۔ آپ کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کسی دوسرے سے مخاطب ہو جاتے۔ لیکن پھر آپ کی طرف واپس آتے بلکہ سچ یہ تھا کہ حاضرین محفل میں سے ہر شخص مورد التفات رہے۔ چنانچہ جب حافظ صاحب گفتگو میں خوش خوش فرماتے تو حاشیہ نشین حاضرین چوکنا رہتے کہ کب کوئی بات حافظ صاحب کی زبان سے ایسی ادا ہو جائے جس میں روئے سخن ان کی طرف ہو اور جو اس سلسلۂ تخاطب کی ایک کڑی ہو جس کا آغاز ان کی آمد سے ہوا تھا۔ افراد محفل سے بسا اوقات ان کا تخاطب جگنو کی روشنی کی طرح ہوتا جو جلتی بجھتی رہتی ہے۔ ان کی گفتگو کا لہجہ روہیل کھنڈی تھا۔ اس زبان کی کھڑکھڑاہٹ پر اہل لکھنؤ چیں بہ چیں ہوں تو زیادہ نہیں لیکن اس میں لکھنؤ کی ہموار چکنی اور لطیف زبان سے توانائی کہیں زیادہ ہے۔ اس زبان کی سرحدیں ایک طرف سہارنپور کی مخصوص زبان سے ملتی ہیں تو دوسری طرف دلی کی عوامی زبان سے۔ حافظ صاحب کے سوالات میں بسا اوقات شوخی کے عناصر چھپے ہوتے۔ انھیں لطف آتا تھا چھیڑنے میں اور زیر لب اور بالائے ریش مسکرانے میں۔ ان کی آنکھوں میں شوخی کی وہ چمک میں نے اکثر دیکھی ہے جسے انگریزی میں MERRY TWINKLE کہا جائے گا۔

حافظ محمد ابراہیم کی رحلت کو ابھی صرف چھ سال کے قریب ہوئے ہیں، لیکن ہماری محفلیں ان کے ذکر جمیل سے محروم ہو چکی ہیں۔ یہ ہماری محرومی، بے حسی اور قدر ناشناسی ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادہ عتیق الرحمٰن (افسوس کہ وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں) مرحوم سے، جو اس وقت یوپی کابینہ کے رکن تھے، میں نے برسبیل تذکرہ کہا تھا کہ کسی اہل قلم کو حافظ صاحب کے سوانح حیات لکھنے پر مامور کیا جائے جس میں بالخصوص اس تمدن کی عکاسی ہو جس کے وہ ترجمان تھے، اور شعر و ادب کی ان محفلوں کا تذکرہ ہو جن کی وہ جان تھے۔ عتیق الرحمٰن مرحوم نے ایک حد تک میری تجویز سے اتفاق کیا لیکن انفرادی زندگی اور شعر و ادب کے بجائے تجویز کا رخ انھوں نے اجتماعی زندگی اور سیاست کی طرف موڑ دیا۔ اور زمانہ نے انھیں اس کی

مہلت بھی نہ دی کہ یہ منصوبہ اگر ان کی سوانح عمری کا ترتیب دے سکتے یا دلا سکیں۔ مرحوم کی بات ہے کہ اب ہم ان کی ... گفتگو کی بات ہی کتاب تھی۔ میں حیرت میں رہ گیا۔ وہی نسب وہی لہجہ وہی عادات وہی اسلوب فکر، وہی طرز ادا، وہی آداب، وہی اطوار۔ نسلوں کے فاصلہ کو میں دو نسلوں کے قرب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن حافظ صاحب کی طرف گیا اور رشید صاحب اور اصحاب رشید کے اسالیب گفتگو پر رہے۔

گردش ایام نے بہت سے سرفرازوں کے سر کو جھکا دیا۔ وقت نے کتنی ہمتوں کو پست اور کتنے حوصلوں کو کھوکھلا کر دیا۔ ماہ و سال کے اس ظالم سلسلے نے کتنے قویٰ کو مضمحل، کتنے ارادوں کو متزلزل کر دیا اور کتنے حریت پرست آتش آشام انقلاب پسندوں کو عافیت طلب اور آسائش پسند بنا دیا۔ حافظ صاحب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وزارت سے دو ایک بار انھوں نے اصول اور آن کی خاطر استعفیٰ دیا اور عافیت کی خاطر اسے واپس لے لیا۔ لیکن حافظ صاحب کچھ بھی ہوں ابن الوقت نہ تھے۔ جو وضع انھوں نے شروع میں اختیار کی اس پر آخر دم تک قائم رہے۔ شرافت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ کوئی چھوٹی بات ان سے سرزد نہ ہو سکتی تھی۔ ہوا لوکی ان سے کوسوں دور تھی۔ نخوت، تکبر، تلون اور تصنع سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ حافظ صاحب نے سیاست کے سمندر میں ایک عمر گزاری تاہم ان کی پشت بھیشہ پانی کے اوپر رہی۔ سیاست کے داؤں پیچ اور فریب سے وہ معصوم تھے۔ حلقۂ انتخاب کے ہندو مسلمانوں میں وہ ہر دلعزیز تھے۔ چنانچہ اس حلقہ میں ان سے مقابلہ کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ مختلف وقتوں میں ضلع بجنور کے دو سیاستدانوں نے جو حافظ صاحب کے حلیف و مخالف رہ چکے تھے اپنی زر پرست ذہنیت کی وجہ سے انھیں دھوکا دیا اور ان سے سرتابی کی لیکن وہ نہ تو حافظ صاحب کو اپنی جگہ سے ہلا سکے، نہ ان کا سکون برہم کر سکے اور نہ ان کے لب و لہجہ میں تلخی لا سکے۔ حافظ صاحب فرقہ پرستی سے نفور رہتے خواہ وہ اکثریت کی ہو خواہ اقلیت کی۔ سیاست کے میدان میں وہ اس قابل تہذیب کا آخری نمائندہ رہتے جو تیزی

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

لہ پروفیسر رشید احمد صدیقی

غزل

قضا ابن فیضی

خزاں زدوں کو متاعِ بہار بھی دے دو
دیا ہے غم تو ہمیں اپنا پیار بھی دے دو

صلیبِ عصر سجا دو مگر ذرا اس کو
بہارِ قامتِ رعنائے یار بھی دے دو

یہ چاندنی بھی ذرا دھوپ کا مزا چکھ لے
قمر وشوں کو غمِ روزگار بھی دے دو

میں آئینہ ہوں، کدورت کو جذب کر لوں گا
مجھے تو اپنے دلوں کا غبار بھی دے دو

یہ اور بات ہے میں راستے کا پتھر ہوں
غریبِ شہر کو کچھ اختیار بھی دے دو

یہ بانکپن ہے اب اہلِ خرد پہ اک الزام
جنوں کو تاجِ سرِ شہریار بھی دے دو

کچھ آنچ تیز تو ہو، وقت کی شراروں کو
مرے جوان لہو کا خمار بھی دے دو

سلگتی دھوپ کا صحرا ہوں میں کہاں جاؤں
مجھے کوئی شجرِ سایہ دار بھی دے دو

یہی ہے سہل کہ یارانِ رشک پیشہ کو
مرا قلم بھی قلم کا نکھار بھی دے دو

بھٹک رہا ہے خرد خانہ ساز اندھیروں میں
اسے مری نگہِ ہوشیار بھی دے دو

جو بے دبے سے یہ تیور نہ تجھ سے شعور
سخن وروں کو ہنر کا وقار بھی دے دو

گلہ ہے تم سے قضاؔ بے کلاہی فن کو
غزل کے عہد کو اک تاجدار بھی دے دو

میں بھی افسانہ تم بھی کہانی

(افسانہ)

اقبال متین

تمہاری آنکھیں تو وہ آئینہ تھیں جن میں جھانک کر میں اپنے خدوخال ہی نہیں اپنی روح کا عکس بھی دیکھ سکتا تھا لیکن اب یہ آئینہ خانہ ایک ایسا حیرت کدہ بن گیا ہے جس میں جھانکتا ہوں تو اپنی صورت تک پہچانی نہیں جاتی۔ ہم کبھی اتنے اجنبی تو نہ تھے۔ اس وقت بھی نہیں جب ہم نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا — جنم جنم کا ساتھ دینے کی قسمیں کھانے والے ہم لوگ اپنی محبتوں کو زندگی کے دکھ درد سے بچا کر کتنی دور لے جا سکتے تھے؟ اب تو ہمیں اس کی بھی خبر نہیں — اور پھر سچ پوچھو تو ہمارے پاس اس کے سوا تھا بھی کیا — لیکن کیا تم آج بھی مجھے چاہتی ہو؟ — کیا میرے لیے آج بھی تم میں وہی دل کشی ہے؟ — اگر ہے تو پھر یہ دوری کیا ہے — ایسا کیوں ہے کہ وہ جو تم ہو تم نہیں ہو — وہ جو میں ہوں، میں نہیں ہوں۔

ہم سر جھکائے ایک ہی ڈگر پر اس طرح چل رہے ہیں جیسے منہ اٹھائے مخالف راستوں پر چل رہے ہوں — میں جو باتیں تم سے کرنا چاہتا ہوں ان کا تعلق نہ گھر کے کرائے سے ہے جس کا تقاضہ ہم پر ہو رہا ہے، نہ گوالن کی تنگ مزاجی سے کہ اس نے کل سے بچے کا دودھ بند کر دینے کی دھمکی دی ہے۔

میں تو تم سے جسم و جان کی باتیں کر رہا ہوں — منہ بند سیپ میں چھپے ہوئے انمول سچے موتی کی باتیں کر رہا ہوں جو تم نے اپنے سینے سے میرے سینے میں منتقل کیا تھا۔ روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی التجاؤں اور دعاؤں کی باتیں کر رہا ہوں — ایسی باتیں کر رہا ہوں جنھیں ہم بھولتے جا رہے ہیں — تمھیں یاد ہے — کبھی تم نے مجھے لکھا تھا — کیا لکھا تھا تم نے مجھے بھی تو پوری طرح یاد نہیں — شاید۔ تم نے معصومیت سے یہ بھی لکھا تھا کہ جب میں دفتر سے تھکا ہارا گھر لوٹوں گا تو تم مجھے آرام کرسی پر گرا دو گی۔ — بڑے چاؤ سے میرے جوتے کی ڈوریاں کھولو گی — میرے کوٹ کے بٹن کھولو گی — ان مخروطی حنائی انگلیوں سے جن سے میری زندگی کی گتھیاں سلجھ سکتی تھیں، تم نے جوتے کی ڈوریاں اور کوٹ کے بٹن کھولنے کا پیمان کیا تھا — تم نے تو پھر اسی زمین پر رہ کر بات کی تھی، شاید اسی لیے عورت ستاروں کی طرف ہاتھ بڑھاتی بھی ہے تو اپنے پیروں کو زمین سے اٹھنے نہیں دیتی — لیکن میں تو زمین کی پستیوں سے اتنا بلند ہو گیا تھا کہ ستارے میری نظر میں سنگریزوں کی طرح ماند پڑ گئے تھے — شفق کی سرخیاں دل پر خون کا عکس بن گئی تھیں جو آنکھوں میں اتر اتر کر آنسو بن جاتی تھیں۔ لیکن ہاتھ نہ سنگریزے ہی آتے تھے نہ آنسو — اور نہ میں چلتے پھرتے افسانوں کے جنگل میں تمھارے نرم و نازک وجود سے شیفتگی کا گراں بار بوجھ اٹھائے تنہا تنہا دیا جا رہا تھا، لیکن اس واماندگی کے باوجود مجھ میں دنیا بھر پر چھا جانے کا حوصلہ تھا۔

اسی حوصلہ کے سہارے جب میں نے ہاتھ پکڑ کر تمھیں زمین سے اوپر اٹھا لیا تو ہماری محبت زندگی کا بوجھ سہار نہ سکی اور ہم اپنی زمین پر لوٹ آئے — یہ الگ بات ہے کہ ہم مبارک اور مسعود تھے۔ ہم چاہتے بھی تو یہی تھے تاکہ چمن کا پھول بن کر مہکیں۔ صبا کی رفتار

بن کر جائیں۔ اور ان کے موتی بن کر سورج کی کرنوں میں زندگی کو گم
کر دیں۔ لیکن میرے کرتے کے بٹن سرے سے ٹوٹے ہوئے تھے۔
تمھیں فرصت یک نگاہ بھی کہاں ملی۔ ہم نے یہ کب سوچا تھا کہ یہ
دھرتی جس پر ہم ساتھ ساتھ قدم اٹھانے کے لیے لوٹ آئے ہیں، یوں
بھی ہو گا کہ ہمارے پیروں تلے سے سرک جائے گی۔

اب یہ سب کچھ کیا ہو گیا ہے۔ جب میں دفتر سے گھر لوٹتا ہوں تو ہم
ایک دوسرے کو کیسے اجنبی اجنبی سے لگتے ہیں۔ جیسے جانتے تو ہوں
لیکن پہچان نہیں پا رہے ہوں — ابھی کل ہی کی تو بات ہے — میں نے
تم سے کہا تھا کہ تم سارے گھر کی صفائی کے بعد چہرے اور بالوں پر اَٹے
ہوئے گرد و غبار کو [illegible] سمجھ کر اس طرح مطمئن ہو جاتی ہو کہ مجھے
تمھارے چہرے کی یہ بیوگی اچھی نہیں لگتی — اس بات کی تلخی شاید
تمھیں کھل گئی تھی۔ تم نے دوسرے دن بناؤ سنگھار کیا — اور جب
میں گھر لوٹا تو مجھے اپنے گھر میں اجالے اجالے سے نظر آئے — لیکن
تم بہت جلد بھول بھال گئیں کہ میرے لیے تمھیں یہ اہتمام زندگی بھر
کرنا ہے۔ خواہ گھر کا سارا بوجھ سمیٹتے سمیٹتے تمھارے ہاتھ شل کیوں
نہ ہو گئے ہوں۔

پھر میں یہ سوچ کر رہ گیا ہوں کہ چلو، تم نے ٹھیک ہی کیا ورنہ کہیں
اس اجالے کا تصور بھی مٹ جاتا تو — کیونکہ تمھارے کنوارے
الھڑپن کو سہاگ کی سپردگی عطا کرنا تو میرے بس میں تھا لیکن تم سے اس
سہاگن پن کو چھین لینا خود میرے بس میں کہاں ہے۔ جی چاہتا ہے،
اس سے پہلے کہ تم اس معاشرے کے ہاتھوں ایک چلتی پھرتی کہانی
بن جاؤ، میں ایک جیتا جاگتا افسانہ تم سے جی بھر کے محبت کی
باتیں کر لوں — ایسی باتیں جن کا اسکول کی فیس نہ دے سکنے کے
باعث ننھے کے امتحان میں عدم شرکت سے کوئی تعلق نہیں ہے —
نہ ہی ان باتوں کا تعلق تمھارے ننگے ہاتھوں سے ہے جن میں چوڑیاں
نہیں کھنکتیں، نہ سونے گلے سے جس میں کالی پوت کا لچھا تم کبھی ضروری
سمجھتی تھیں — ہم شاید زندگی کی ان معاملات سے بہت آگے نکل
آئے ہیں، کیوں کہ ہم لوگ پڑھے لکھے لوگ ہیں، سمجھدار لوگ ہیں۔ میں
تم سے ان چھوٹی چھوٹی آسودگیوں کی بات بھی نہیں کرنا چاہتا ہوں جو کہ
کبھی تم نے اور کبھی میں نے قتل کر دیا ہے — مجھے تو تم سے محبت
کی باتیں کرنی ہیں — تم سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ کیا ہمیں اپنے
سن و سال کی ساری پونجی کھو کر ایک دوسرے کو سمجھے بغیر ہی اس
دنیا سے گزر جانا ہے؟

مجھے تو تم سے اتنا پوچھنا ہے کہ اس دن، جس دن تم اپنے دور
افتادہ بھائی کو کوسنے دے رہی تھیں کہ اس نے تمھاری زندگی تباہ
کر دی، اس لیے کہ وہ تمھاری اور میری محبت کے پروان چڑھانے
میں ایک وسیلہ رہا تھا، مجھے بتاؤ کیا تم یہ سچ کہہ رہی تھیں؟ اگر یہ
سچ ہے تو اتنا بھیانک سچ تمھیں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اس لیے
کہ سچائی اگر موت کی طرح سفاک ہو تو زندگی کے خوب صورت
جھوٹ میں اسے چھپا لینا چاہیے۔

ہم انسان ہیں، لے کر تو کچھ آئے نہیں تھے نہ کچھ لے کر جائیں گے
ہی لیکن ایک دوسرے کو کچھ دینے لینے میں کیوں بخل سے کام لیں۔

اسی لیے تو میں تم سے آج صرف محبت کی باتیں کرنا چاہتا
ہوں۔ فی الوقت تم بھی اس حقیقت کو بھول جاؤ، میں بھی اس
حقیقت سے آنکھیں چرا لوں کہ ہم اپنی محبت کی باتیں ختم کر لیں تو
مجھے دانے دانے کی تلاش میں سرگرداں ہو جانا ہے۔ اور تمھیں ننھے کے
جھرمٹ میں بیٹھ کر روٹیاں بیلنی ہیں اور انھیں جھوٹی سچی کہانیاں
سنانی ہیں کہ پرستان کا شہزادہ ٹھنڈے میٹھے پانی کو دودھ سمجھ کر
پی جاتا تھا۔

مجھے تو تم سے صرف اتنا کہنا تھا کہ نہ تم کو مجھ سے نفرت ہے
نہ مجھے تم سے۔ بات اتنی سی ہے کہ تم میری چپ کو پہچان لو میں تمھارے
آنسوؤں کا راز جان لوں۔ ہم ایسی کٹھ پتلیاں ہیں کہ جن کی ریشمی
ڈوریاں ہمارے معاشرے نے اپنی انگلیوں پر لپیٹ رکھی ہیں۔
لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ ان کٹھ پتلیوں کا ذہن ہے، جذبہ ہے، احساس
ہے اور جب تک یہ سب کچھ رہے گا نہ ہم مل جل کر خوش رہ سکیں گے
نہ کچھ کر سکیں گے، اس وقت تک جب تک کہ یہ ریشمی ڈوریاں کٹ
نہیں جاتیں۔

میری چپ سے تمھارے آنسوؤں تک جو راستہ جاتا ہے

وہ ایک ایسا پل صراط ہے کہ ہم پار اتر لیں تو پھر کوئی پرسش نہیں ہو گی۔ اس لیے کہ تلوار کی دھار پہ چلنا، نوکیلے کانٹوں کے تیز سرے کی انی کو دل میں پیوست کر لینے سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔

جی چاہتا ہے کہ تمہارا ہاتھ تھامے ماضی کے ایک ایک چمن زار میں گھوم پھروں، کچی کلیاں پھر سے تمہارے راستہ میں بچھاؤں اور جب تم انھیں روند کر گزر جاؤ تو میں چن کر اپنے دامن میں محفوظ کر لوں کہ ان پر تمہارے نقش کف پا ہیں۔ اور اگر ایسے میں اپنی موٹر سائیکل پھٹ پھٹاتا غلط والا سیٹھیا اس چمن زار میں در آئے اور میرا راستہ روک لے تو نہ تم کچھ پروا کرو نہ میں کچھ برا مانوں کہ اس عزت و توقیر کی میت کے اٹھ جانے سے ہماری محبت کو کیا لینا دینا ہے۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں ہم لوگ کیسے پاگل سے لوگ ہیں، زندگی سے کچھ بھی تو نہیں مانگتے صرف اتنا حسن سلوک مانگتے ہیں کہ ہمارے بعد زندگی پر یہ حرف نہ آئے کہ اس نے ہم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔

تمھیں یاد ہے کہ ایک سہانی شام کو ہم اپنی ساری اداسیاں سمیٹے چل پڑے تھے کہ شاید کہیں بہل جائیں۔ تم اس کوشش میں تھیں کہ مجھے خوش نظر آؤ میں تمھیں یہ جتلانا چاہتا تھا کہ واقعی شام کتنی خوب صورت ہے کیونکہ مجھے ایک کہانی کا بہتر مواد مل گیا تھا۔ جب ہم ٹہلتے ٹہلتے اتفاقاً اس باغ کے قریب آ گئے جہاں ہماری محبت کی ابتدا ہوئی تھی تو میں نے گفتگو کا موضوع بدل دینے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس وقت تم مجھ سے اس قرض کی بات چھیڑنے کا آغاز کر چکی تھیں جو مجھ سے میری انا چھین رہا تھا اور تم سے تمہارا حسن۔ میں نے تم سے کہا تھا — شازیہ — دیکھو شفق کیسی پھول رہی ہے اور وہ حد نظر پر کون کس سے مل رہا ہے۔ کیا وہ بھی ہم ہی تو نہیں؟ لیکن کوئی چور تھا جو اس وقت بھی میرے دل میں گھسا میری محبت کی گٹھڑی لوٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم اپنی سوچوں میں گم سم اس باغ میں داخل ہو گئے تھے جس کے پھول مرجھا چکے تھے جس کے گملے ٹوٹ گئے تھے جس کی کیاریاں اجڑ گئی تھیں جس کی روشیں خار دار جھاڑیوں میں الجھ چکی تھیں اور وہ مکان جس کے محراب میں

دیا جلا کر تم مجھے اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کیا کرتی تھیں بالکل ایسا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مجھے اپنا وجود بھی تو بالکل اسی مکان کی طرح لگا جیسے ایک کھنڈر دوسرے کھنڈر کے مقابل کھڑا ہو اور تم حیران حیران نظروں سے دونوں کو تک رہی تھی۔

یہ کیسا دکھ درد ہے کہ ہم عمر کی لمبی راتوں کا کرب آج وصال کے لمحے میں محسوس کرتے ہیں۔ تم نے تو یہ سوچ کر میری جانب ہاتھ بڑھایا تھا کہ میرا ہاتھ تھام لو گی تو میں خود کو فاتح مکان و زماں سمجھنے لگوں گا اور میں نے یہی کچھ سمجھا بھی۔

لیکن اگر تمہارے ہاتھ جن میں پھولوں کی کوملتا تھی اب اتنے کھردرے ہو گئے ہیں کہ میرے اپنے ہاتھوں کی بے حسی اس لمس کے فرق کو بھی محسوس نہیں کر سکتی ہے تو بتاؤ میں کہاں قصوروار ہوں؟ تمہارا کہاں دوش ہے۔ محبت تو انسانی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمہاری عرق عرق پیشانی سے اگر محبت مرجھا جاتی ہے میرے ذہن کی تابانی سے اگر سینے میں اندھیرے جنم لیتے ہیں تو تم محبت کو بدد عا دو نہ میں اپنے شعور کے اجالوں کو قتل کر دوں۔ بعض اوقات کیسی چھوٹی چھوٹی مصلحتیں زندگی کے سمندر کی اتھاہ گہرائی کی چغلی کھاتی ہیں۔ ہم اپنے مجروح احساسات کو چھپا لینا چاہتے ہیں تو مسکراہٹ میں بھی یہ جراحتیں بکھر جاتی ہیں اور یہ تبسم کیسا زخمی دکھائی دیتا ہے۔

میں نے تمہاری خوشی کو اپنی خوشی اور تمہارے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے کی جو باتیں کی تھیں کیا میں وہ سب بھول گیا ہوں؟ — پنجرے سمیت اڑ جانے کی سوچنے والا میں پھڑکتے پرندے کی طرح زمین ناپ رہا ہوں۔

میں ایک جیتے کی ڈگر سی پڑ گئی ہے جس کو میں عادت کا نام دے کر اپنی شکست خوردگی کے احساس کو نرم کر لیتا ہوں۔ اور تم مصلحتاً اسی کو میری محبت سمجھ لیتی ہو۔

میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ جس روز چھپ کر اپنے گھر آیا تھا میں نے پہلی کاپی تمہیں نذر کی تھی۔ میں کتنا مطمئن مطمئن سا تھا جیسے کوئی باپ اپنی بیٹی کا گھر بستا ہوا دیکھ رہا ہو۔ لیکن تمہارے

دل میں دور دور تک ملتا کی کوئی کرن نہیں تھی۔ تم نے مسکرا کر یہ کتاب قبول کر لی۔ میں نے اس مکان میں نہ خوشوں کا ایک سپنا دیکھا اور تعمیر کیا لیکن بہم نے اپنا آبائی گھر بیچ دیا تھا۔ ناقابلِ برداشت قرض کی ادائیگی کے بعد جو کچھ بچ رہا تھا وہ اس کتاب میں لگ گیا تھا۔ تم وہاں ہو تم نے یہی سوچا ہوگا کہ کہانیوں نے تو گھر بنا لیا پر حقیقتوں کا گھر نیلام ہو چکا ہے۔ تم نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ میں نے تمھیں چھیڑنے کے لیے کہا تھا ـــــ اپنی کہانیاں مجھے بڑی پیاری ہیں کیوں کہ میں نے انھیں جنم دیا ہے۔ وہ میری معنوی اولاد ہیں لیکن ان سے تمھارا سلوک سوتیلی ماؤں کا سا کیوں ہے؟ تم مسکراتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہو گئی تھیں۔ پھر آبدیدہ ہو گئیں اور تمھارے آنسو میرے پہلے مجموعے کی پہلی کاپی پر گر پڑے جو تمھارے ہاتھوں میں تمھاری نظروں کے سامنے کھلا ہوا تھا اور میں نے تمھارے ہاتھ سے اپنی یہ کتاب واپس لے کر بڑے جتن سے بک شیلف میں سجا دی کہ اس میں میرا خونِ جگر بھی شامل ہے تمھارے آنسو بھی۔

تم ہی بتاؤ کہ اپنی محبت میں اس بات سے تو کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ میں ایک ایسی عظیم زبان کا ادیب ہوں جس کی موت کے بعد مستقبل کو اس کی تحریر کا ایک حرف بھی ملتا ہے اور نہ اس کی قبر کا نشان لیکن اپنی نسل کے بہت سے دیوانوں میں اگر میں بھی شامل ہوں اور ہم اپنے خون سے دیے جلا کے ایک دوسرے ہی کو راستہ سمجھانے چلے ہیں تو کیا تمھیں اس دیوانگی پر پیار نہیں آتا جو مستقبل سے آس لگائے بغیر ہی اپنے حال میں مست ہے۔

★

حافظ صاحب (صفحہ ۱۸ کا بقیہ)

کے ساتھ مٹ رہی ہے، جو کہ عبارت تھی شرافت، بھلمنساہت، خلق، نرم روی، سادگی، وضعداری اور غمخواری سے۔ ایک دفعہ اندوہناک حیرت کے ساتھ ذکر کر رہے تھے زمانہ کی بے حسی کا۔ ایک صاحب کی رحلت کی خبر پا کر جو نئی دہلی کی ایک سرکاری کالونی موتی باغ میں رہتے تھے، حافظ صاحب تعزیت کے لیے گئے۔ انتقال کو چند گھنٹے ہو چکے تھے لیکن ہمسائے یہ بھی نہ بتا سکے کہ مرنے والے کا گھر کون سا ہے۔

حافظ صاحب کی پرواز بلند نہ تھی، میانہ روی و پیادہ روی کا دامن انھوں نے کبھی نہ چھوڑا لیکن ان کی پیادہ روی ان کے رسوخ و طاقت کی ضامن تھی اور ان کے حسنِ کردار کی غماز۔ مشہور یونانی ہیرو کی طرح زمین پر ان کا جو قدم پڑتا ان کی طاقت میں اضافہ کرتا تھا۔ ان کا حلقۂ انتخاب ان کی تحویل میں تھا، چنانچہ ان کے صاحبزادہ کو اسی نے مجلسِ آئین ساز میں بھیجا۔ حافظ صاحب اپنے حلقۂ انتخاب کو چھوڑ کر دلی کیا آئے گوشت ناخن سے جدا ہو گیا۔ چند سال کے بعد انھیں الیکشن کے اکھاڑہ میں پچھاڑا گیا ایک اجنبی حلقۂ انتخاب سے۔ جاتے جاتے انھوں نے چناؤ میں ہار کا مزہ بھی چکھ لیا۔ لیکن یہ ان کا دورِ اضمحلال تھا اور کسی دوسرے کا حلقۂ انتخاب۔

وزارت سے پہلے نگینہ اور بجنور میں حافظ صاحب نے کامیاب وکالت کی۔ ان کی گفتگو کی دل آویز جرح گواہی دور کی یادگار ہے۔ وکالت سے انھوں نے جو کمایا اور وراثت میں جو کچھ پایا اس کا ایک بڑا حصہ سیاست میں گنوایا۔ سیاست نے ان کے تجربہ میں اضافہ کیا اور ان کے سلیقے میں تخفیف لیکن ان کی وضع میں ترمیم نہ کر سکی۔ وہی شیروانی، وہی علی گڑھ قطع کا پائجامہ، میانہ قد، گداز جسم کی طرف مائل، دمِ تحریر شکستہ حال کا وہی ارتباط، وہی جمہوری دربار، وہی ایک تاریخ میں جاگنا اور دوسری تاریخ میں سونا، وہی انسانیت، وہی ظرافت، وہی ہمدردی، وہی غمخواری، وہی حسنِ اطوار، وہی شگفتگیِ گفتار۔

★

آفتاب کی پہلی کرن

عشرت دھولپوری

(باپو کے تئیں نذرِ عقیدت)

اے ہم نشیں نہ دورِ غلامی کا حال پوچھ
لب بند تھے کہ درد کا اظہار بھی نہ ہو
زنداں کے پاسبانوں کا فرمان تھا یہی
زنجیر پاؤں میں رہے جھنکار بھی نہ ہو

تھے باغباں کے بھیس میں گلچیں و گل فروش
پھولوں کا گلستاں میں کوئی پاسباں نہ تھا
بگڑا ہوا نظامِ چمن تھا کچھ اس قدر
محفوظ بجلیوں سے کوئی آشیاں نہ تھا

جس وقت ماں کی گود میں تو نے جنم لیا
باپو! وہ ایک لمحہ بڑا دل نواز تھا
جس طرح ایک لفظ میں پنہاں ہو داستاں
پوشیدہ ایک لمحے میں صدیوں کا راز تھا

آزادیِ وطن کی لڑی جنگ اس طرح
تو نے مخالفوں کو اصولوں سے دی شکست
تیر و سنان و خنجر و تلوار کی جگہ
سچائی اور صبر کے پھولوں سے دی شکست

تو ہے وہ روشنی جو اندھیروں کو چیر کر
منزل کا رہ نوردوں کو پیغام دے گئی
تو ہے وہ آفتاب کی پہلی کرن کہ جو
نکلی تو ظلمتوں کا سحر نام دے گئی



شملہ سمجھوتہ

بات چیت کے ذریعہ
مسائل کے
یکسوئی سے
متاثر ہو کر

افسانۂ ماضی کو فراموش کرو اب
بگڑے ہوئے حالات کو حکمت سے سنوارو
نظروں میں لیے پیار کا مستقبل رنگیں
آواز دو خوشیوں کو بہاروں کو پکارو
فانوس جو روشن ہوا ایوانِ طرب کا
اس دیپ سے اب سیکڑوں تم دیپ جلاؤ
دل جس سے ہو مسرور نظر جس سے منور
وہ پیار کا دنیا کو نیا گیت سناؤ
لہرانے لگے پرچم تو امن و وفا کے
اب پھر سے در و بام ہوئے جاتے ہیں روشن
جس پیار کی خوشبو کی ضرورت ہے جہاں کو
اس پیار کی خوشبو سے مہکنے لگا گلشن
اب جذبۂ الفت سے جہاں ہو گیا مسرور
ہم پیار کا دنیا میں چلن عام کریں گے
آپس میں ہم اک دوسرے پہ ہو کے مہرباں
انساں کی بھلائی کے لیے کام کریں گے
اب دونوں ممالک ہیں رواں راہِ وفا پہ
دونوں ہی کا ہے منزلِ الفت کا ارادہ
اک جان دو قالب نہ ہوں کیوں سب کی نظر میں
منزل وہی دونوں کی وہی دونوں کا جادہ
سمجھوتہ ہے شملہ کے لیے قلب و نظر صاف
اخلاص ہر اک فصل میں باب ہو گیا شامل
ہم منزلِ ہستی کے طلبگار رہے ہیں
مل جائے گی اک روز بالآخر ہمیں منزل
دو دیپوں میں جلنے لگا محبت کا اجالا
سمجھوتہ ہے شملہ کا بلندی میں ہمالہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ

حقائق کی روشنی میں

پروفیسر بشیر الدین

تقریباً ۵۰ سال کی ملازمت کے اپنے تجربے کے بعد جو کئی لحاظ سے اہم ہے اور جس میں ۱۸۷۷ میں سرسید احمد خاں کے قائم کردہ کالج کے جسے ۱۹۲۰ میں یونی ورسٹی کا درجہ دے کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نام سے موسوم کیا گیا دو سال بھی شامل ہیں اور اسی مدت تک یونی ورسٹی سے قریبی رابطے کی زندگی گزارنے کے بعد مجھے اس بات کا یقین ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ترمیمی ایکٹ کے مضمرات و ماثرات کا اندازہ اس ادارے کے ماضی پر نظر ڈالے بغیر نہیں لگایا جا سکتا۔ چنانچہ زیر نظر مضمون میں میری یہی کوشش ہے کہ اس پس منظر کو موٹے طور پر واضح کر دوں کیوں کہ درجے کے اعتبار سے یونی ورسٹی، کالج ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

مجھے اکثر اس بات پر حیرانی ہوئی ہے کہ سرسید کی سوانح حیات لکھنے والوں میں سے، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے شمالی ہندوستان میں سرسید احمد خاں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاحات کی تحریک کو مسلمانوں کے احیاء کی تمہید بتایا ہو۔ یہ تحریک ۱۸۵۷ء کے المیہ کے بعد بے حسی کے عالم میں سرد بازاری کی نذر ہو گئی۔ ایک طرح سے یہ تحریک راجہ رام موہن رائے (۱۷۹۲ - ۱۸۳۳) کی طرف سے چلائی گئی تحریک ہی کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ راجہ رام موہن رائے نے انیسویں صدی کے آغاز میں ہندو سماج کو بیدار کرنے اور اس میں نئی روح پھونکنے کے لیے بنگال میں ایک تحریک چلائی تھی۔

مشترکہ باتیں

راجہ رام موہن رائے نے ویدوں اور اپنشدوں کی نئی تشریح کی۔ سرسید احمد خاں نے بھی جدید علوم کی روشنی میں قرآن کریم کی تفسیر لکھی تاکہ تعلیم یافتہ طبقے کو اسلامی تعلیمات سے متاثر کیا جا سکے اور زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ گمراہی اور ظلمت پسندی کی جو تہہ چڑھی ہوئی ہے اسے دور کیا جا سکے۔ راجہ رام موہن رائے نے اس بات کی پرزور حمایت کی کہ مغربی تعلیم کے حصول کے ذریعے سے ہی سماجی اصلاح ممکن ہے۔ انھوں نے اندرون بنگال ایسے اسکول قائم کیے جن میں انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دی جا سکے۔ ان کے پرستاروں میں سے ایک شخص مسٹر ڈیوڈ ہیئر نے راجہ رام موہن رائے کی پر جوش قیادت کے زیر سایہ کلکتہ میں ۱۸۱۷ء میں گویا کہ سرسید احمد خاں کے سال ولادت میں ہندو کالج قائم کیا جو اب پریزیڈنسی کالج کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح سرسید نے بھی مرادآباد، بریلی اور وارانسی میں اسکول قائم کیے اور ان کے بعد علی گڑھ ایم اے او کالج کی بنیاد ڈالی۔ راجہ رام موہن رائے نے بنگالی نثر کو ایک نیا طرز عطا کیا۔ سرسید احمد خاں نے بھی اردو میں سہل نگاری کی بنیاد ڈالی اور اردو نثر کو ایک نیا انداز عطا کیا جس سے اردو میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ راجہ رام موہن رائے کی طرح سرسید نے بھی انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دیے جانے والے اسکولوں اور کالجوں کی جگہ محض مشرقی علوم کے مدارس کھولے جانے کے لیے برطانوی دباؤ کی مخالفت کی۔ سرسید احمد خاں اور راجہ رام موہن رائے دونوں ہی پرزور خطیب ہونے کے علاوہ مصنف بھی تھے اور سماجی برائیوں کے خلاف صف آرا تھے۔ اپنے اپنے خیالات کے باعث دونوں ہی کو برا کہا گیا اور بدنام کیا گیا۔ جس طرح راجہ رام موہن رائے کو ہندو سماج میں کٹر قسم کے ہندوؤں کی طرف سے خارج کر دیا گیا اسی طرح مسلمانوں میں سخت اور کٹر قسم کے مذہب کے ٹھیکیداروں کی طرف سے سرسید پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ سرسید اور راجہ رام موہن رائے دونوں ہی انگلینڈ گئے تھے اور دونوں ہی واپسی پر برطانوی ثقافت سے بے حد متاثر تھے۔ ایک سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں ہی فارسی کے ماہر تھے۔

میں جس بات کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ یہ کہ اگرچہ دونوں کے مقاصد اور ان کے حصول کے تئیں انداز نظر میں قریبی یکسانیت تھی، تاہم ان میں سے ایک کامیاب ہوا اور دوسرا ناکام رہا۔ صاف صاف

لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ راجہ رام موہن رائے بنگال میں ہندو مذہب میں نئی بیداری اور اس میں نئی روح پھونکنے کے مقصد میں کامیاب ہو گئے لیکن سرسید احمد خاں کا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں اس طرح کی بیداری لانے کا خیال محض ایک خواب ثابت ہوا۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ سرسید کے تخیل کی نویں اور دسویں صدی کے بغداد، قاہرہ اور قرطبہ (اسپین) کے اسلامی تمدن جیسے کو زندہ کرنے کی نشاۃ ثانیہ کی کوششیں بے کار ثابت ہوئی تھیں۔

معاملے کی حقیقت یہ ہے اور یہی اس مضمون کی کلیدی بات ہے کہ راجہ رام موہن رائے کے کاز کی حمایت کرنے والے تو بنگال کے روشن خیال طبقوں میں کئی گنے چنے تھے مثلاً [illegible] وغیرہ جنھوں نے ہندو ذہن بدلنے کے لیے راجہ رام موہن رائے کا پورا پورا ساتھ دیا تاہم سرسید احمد خاں کے ساتھ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا حتیٰ کہ ان کے اندرونی حلقہ احباب میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو مغربی تعلیم اور سماجی اصلاح کے ذریعے مسلمانوں کی بہبود و بہتری کے سلسلے میں ان کے ترقی پسند خیالات و نظریات سے متفق ہوتا۔ ان کے ساتھیوں میں زیادہ تر اس وجہ سے ان کے ساتھ تھے کہ وہ برطانوی حکمرانوں کی نظر میں ایک پسندیدہ شخصیت تھے۔ ان کے رفقائے کار میں سب کے سب ان کی اس کوشش میں کھلے دل سے ان کے ساتھ نہ تھے جو وہ اسلام کو بہت سی ایسی فرسودات سے پاک و صاف بنانے کے لیے کر رہے تھے جو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔

سرسید کو ایک اور عظیم قربانی یہ دینی پڑی کہ انھیں اس رسالے کی اشاعت بند کر دینا پڑی جس کے ذریعے وہ اپنے ترقی پسند خیالات عوام تک پہنچاتے اور ان کی نیک خواہشات اور مالی امداد حاصل کیا کرتے۔ ان کے حامیوں میں زیادہ تر ایسے تھے جن کا تعلق امراء کے طبقے سے تھا اور جو علی گڑھ کے آس پاس بستے تھے اور جو ۱۸۵۷ء کے غدر سے [illegible] اثرات کی پیداوار تھے۔

اس حلقے کی طرف سے اپنے کاز کو شدید خطرہ محسوس ہوتے دیکھ کر سرسید نے اپنے ذہین صاحبزادے کو جو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے مشہور و معروف جج تھے، اپنا جانشین اور آنریری سکریٹری نامزد کرنا چاہا کیونکہ وہی ایک ایسی شخصیت تھے، جو سرسید کے خیالات کے ہمنوا تھے اور سرسید کو ان پر اعتماد بھی تھا۔ کالج کے ٹرسٹیوں (متولیوں) کی کمیٹی نے جس میں کہ جاگیردار بھی ہوتے تھے، شک اور کفر کے لگائے گئے اس غیر منصفانہ الزام کی بنا پر سرسید کی بات نامنظور کر دی کہ ان کے بیٹے سید محمود شراب کے عادی ہیں۔ سرسید نے عالم بے بسی میں ۱۸۹۸ء میں وفات پائی جبکہ ان کی وہ تجویز بھی نامنظور کی جا چکی تھی کہ ان کے بعد ان کے بیٹے سید محمود کو کالج کا سکریٹری بنایا جائے۔

بعد ازاں علی گڑھ کالج کے منتظمین پر ایسے لوگوں کا غلبہ ہو گیا جو حکومت پسندی کے باعث اعلیٰ تعلیم کے خلاف تھے۔ بعد میں یہی لوگ یونیورسٹی کے منتظم ہوئے جبکہ ۱۹۲۰ء میں اس کی بنیاد پڑی۔ یہ سب کے سب سلطنت انگلیشیہ کے منظور نظر تھے اور انھوں نے اپنے معمولی ذاتی فائدوں اور اغراض کے تحت ادارے کو سلطنت انگلیشیہ کے آلہ کاروں کے سپرد کر دیا تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی کے اسٹاف میں انگریز کلیدی مقامات پر فائز تھے اور انھوں نے مسلمان نوجوانوں کو بڑی ہوشیاری سے اس مشہور درس گاہ کی چار دیواری کے باہر چلتی ہوئی فضا سے [illegible] باز رکھا۔ اس کے لیے انھوں نے مختلف طریقے اپنائے چنانچہ ان میں سے ایک یہ تھا کہ روشن خیال طلباء کی حوصلہ شکنی کی جائے اور پسماندہ طلباء کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس کام میں انھیں کالج کے غیر تعلیم یافتہ جاگیردار سکریٹری کی پوری حمایت حاصل تھی۔

۱۹۱۹ء میں برطانوی حلقے کے چلے جانے کے بعد کالج کا انتظام جس شخص کے ہاتھ میں آیا اس نے انگریز کی بنائی ہوئی پالیسی کو پوری طرح نبھایا اور اسے برسراقتدار جاگیرداروں کی حمایت حاصل رہی

تعلیم کے شعبوں میں گوناگوں تجربے کے ایک اور انتہائی ذہین شخص کی قیادت میں یونیورسٹی نے ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جنم لیا۔ نتیجے کے طور پر اس وقت کی یو پی سرکار نے علی گڑھ کے گریجویٹوں کو اپنے تعلیمی محکمے میں ملازمتوں کے لیے درخواست دینے کے لیے "نااہل" قرار دیا۔

۱۹۲۹ء میں ان سے اختیارات لے لیے گئے۔ ۱۹۲۸ء میں [illegible] اپنے عہدے پر [illegible] کی نظر عنایت سے جنھیں [illegible] کا خطاب ملا اور [illegible] حاصل [illegible] ترقی پسند [illegible] کر دیا [illegible] جو [illegible] تھے [illegible] پہلے تھے جنھوں نے یونیورسٹی کیمپس میں [illegible] کی ابتدا کی۔

اس طرح یونیورسٹی میں اب [illegible] اس طرح کے حالات پیدا ہو گئے کہ وہاں مسلم لیگ کا [illegible]

جو صوبائی اسمبلی میں ناظم الدین حکومت سے دیگر مسلمانوں کو خوش آمدید کہا جا چکا علیگڑھ مسلم لیگ کا گڑھ ہو گیا اور صوبہ بنگال سے ندوہ سے علیگڑھ طالب علموں کو جمع کر کے مسلم لیگ کا قبضہ ہو گیا۔ اس موقع پر جاگیرداری نظام نے جو کہ یونیورسٹی کی قسمت کا مالک بن بیٹھا تھا اور جس کا اثر بیں خطابات تھے مسلم لیگ کے رہنماؤں کا خوش آمدید کیا۔ لیاقت علی نے گریجویٹ یونیورسٹی میں طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ یہ کتابیں جلا دیں اور ملک کا دورہ کر کے مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالبہ کی آواز گھر گھر پہنچائیں۔ محلی جواہر لال نہرو نے مخالفت کی انہیں سخت نتیجہ بھگتنے کی دھمکی دی گئی۔ اس تحریک میں مقامی زمیندار پیش پیش تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد بھی یونیورسٹی کی صورت حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ مسلمانوں کی انفرادی بحالی کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کے لیے حکام نے کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی۔ جس شخص نے بھی اساتذہ اور طالب علموں میں علٰحدگی پسندی اور رجعت پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات سے نپٹنے کی کوشش کی اسے دور ہٹا کر دیا گیا۔ آج یہ تصور اساتذہ اور طالب علموں کے ذہنوں میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے کہ یونیورسٹی تحقیق اور مطالعے کا مرکز ہونے کی بجائے ایسا ادارہ بن گئی جہاں ایک نظریہ کو مقبولیت حاصل ہو سکی

مخالفت کی کوئی وجہ نہیں

لہٰذا یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کوئی ایسا اقدام نہیں ہے جو بہت عجلت میں کیا گیا ہو اور یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ بھارت میں بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں مسلمانوں کی بہبود کے لیے فکرمند کوئی بھی شخص کس طرح اس اقدام پر نکتہ چینی یا اس کی مذمت کر سکتا ہے۔ یونیورسٹی کا نام تبدیل نہیں کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے اقامتی کردار کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ سنی اور شیعہ دینیات کے شعبوں اور شعبۂ علوم اسلامی کو نہیں چھیڑا گیا ہے۔ میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں نشستوں کی نصف تعداد کو علی گڑھ کے طلباء کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ مختلف اکیڈیمک تنظیموں میں اساتذہ کو پہلے سے زیادہ مؤثر مقام دیا گیا ہے۔ ملک میں کسی بھی یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ طلباء کی تنظیم کو کورٹ میں نمائندگی دی گئی ہے اور اس طرح ان کے مفادات پر اثرانداز ہونے والے معاملات میں ان کو مؤثر رول ادا کرنے کو کہا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نئے ایکٹ کی رو سے وائس چانسلر کے اختیارات کو بڑھا دیا گیا ہے لیکن یونیورسٹی کے خصوصی حالات کے پیش نظر ضروری

تھا۔ من علی گڑھ کا انتظامی اعتماد بحال ہو گا اس کے علاوہ ضروری اقدامات ممکن نہ ہوتے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں جس قدر بھی اعتراضات ہوئے ہیں ان کا کوئی اصولی جواز نہیں ہے۔ یونیورسٹی میں ہمارا واسطہ خالصۃً علمی ترقی سے ہوتا ہے چنانچہ اس مقصد کے حصول کے ضمن میں نورالحسن صاحب مرکزی وزیر نے صحیح ہی کہا ہے کہ "جب تک مسلمان عوام کی صف میں ان کے دوش بدوش نہیں کھڑے ہو جاتے تب تک وہ ترقی کی راہ پر گامزن عوام سے قدم ملانے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

ہلکا اشارہ

"اگر پہ وزیر صاحب کے مندرجہ بالا قول کی وضاحت کی جائے تو یہ علیحدگی پسندی کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ہے اور اس ایکٹ کے نافذ کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کمی کو دور کیا جائے۔ ہم نے اس عادت سے ماضی میں بھی بھاری نقصان اٹھایا ہے۔ اگرچہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بہت زیادہ سنگین نتائج ظاہر نہ ہوئے ہوں تاہم تعلیم کے معاملے میں تو یہ مہلک ہے۔ کیونکہ مقابلے کی فضا میں پہنچنے کے لیے خود کو مقابلے کے لیے تیار کرنا ضروری ہے۔ تاہم اس عادت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم میں مقابلے کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یونیورسٹی میں اسی قسم کی پالیسی کو دیکھ کر بے حد دکھ ہوتا ہے۔ اگر ہم اس طرح کی پالیسی کے خطرناک نتائج سے سبق لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو یہ اقدام خودکشی کے مترادف ہوگا۔ کوئی شخص خواہ کچھ بھی کیوں نہ کہے مجھے اس کے کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ پروفیسر نورالحسن وزیر نے یونیورسٹی کو ایک تعلیمی ادارہ بنانے کی امنگ پر کان نہ دھر کر مسلمانوں کی زبردست خدمت کی ہے۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس انداز فکر کو زیادہ وسیع پیمانہ پر توسیع نہیں دی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ بھارت کے وزیر تعلیم یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کے سامنے جو مقصد ہے وہ ہے جدید تعلیم کو فروغ دینا۔ اس طرح سے وہ سرسید کے اس مقصد کو یاد دلا رہے ہیں جو انھوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے اپنایا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس ایکٹ کا مقصد یہ ہے کہ اس ادارے سے رجعت پسندانہ اور علٰحدگی پسندانہ سرگرمیوں کو خارج کر کے اسے جدید تعلیم کے فروغ کا ذریعہ بنانا!

حاشیہ: (انگریزی مضمون سے تلخیص و ترجمہ)

غزل

سعید عارفی

کربِ احساس جو اس دل پہ ترے ہے یارو
یہ صحیفہ انھیں نظروں کا کرم ہے یارو

پسند اپنی ہے یہ ذوقِ نظر ہے اپنا
وصل کا مجھ کو تمہیں ہجر کا غم ہے یارو

درد کی دھوپ بھی ہے سایۂ محرومی بھی
شوق ہر حال میں شایانِ ستم ہے یارو

کتنا دشوار ہے انسان کی خاطر جینا
کیوں عبث کشمکشِ دیر و حرم ہے یارو

اُف وہ غم لب پہ جو آتا ہے تبسم بن کر
ہائے وہ درد جو عنوانِ کرم ہے یارو

سر وہی سر ہے جو سودائے جنوں رکھتا ہے
دل وہی دل ہے جو شائستۂ غم ہے یارو

رنج و اندوہ سے باقی ہے مسرت کا وجود
ظلمتِ شب سے اُجالے کا بھرم ہے یارو

روشنی روز نگل جاتی ہے اپنے پیکر
ہم پہ ہر روز اندھیروں کا ستم ہے یارو

۲ جون ۱۹۶۲ء تک

غزل

(پریم پرکاش [illegible])

بہارِ شام نہ رنگینیٔ سحر سے مجھے
نشاطِ دل ہے میسر تری نظر سے مجھے

قدم قدم پہ جبینِ نیاز جھکتی ہے
ہے ایک ربطِ نہاں تیری رہگذر سے مجھے

شعورِ عشق، شعورِ وفا، شعورِ حیات
ملی ہیں نعمتیں کیا تری نظر سے مجھے

ابھی جہاں کو پیامِ حیات دینا ہے
ابھی ہیں کام بہت عمرِ مختصر سے مجھے

گزر گئے ہیں وہ جس راہ سے کبھی اک بار
ہزار بار گزرنا پڑا اِدھر سے مجھے

جنوں سے بڑھ کے نہیں کوئی رہنما جوہر
ملا ہے درس یہ اک صاحبِ نظر سے مجھے

اکتوبر ۱۹۶۰ء

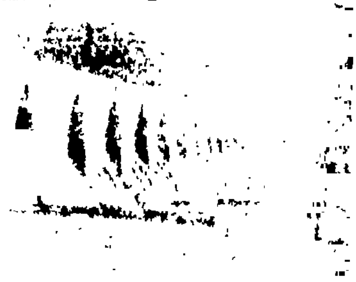
آزادی کے بعد کی ترقیاں



پنڈت جواہرلال نہرو کے ہاتھوں، ریہاند باندھ کا افتتاح

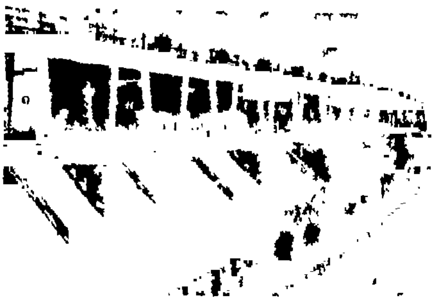


چندر پربھا باندھ (ضلع وارانسی)

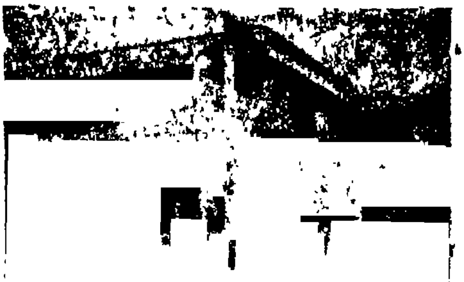


ماتاٹیلا باندھ (جھانسی)

تصویروں کے آئینے میں



بان گنگا نہر



ٹل مٹو پمپ نہر

پنڈت جواہر لال نہرو بازپور شگر مل
کا افتتاح کرنے کے بعد
شکر کی تیاری کا عمل دیکھ رہے ہیں

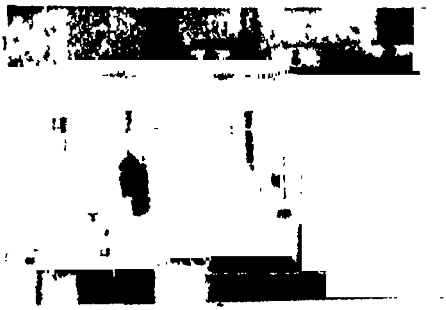


نائلون فیکٹری مودی نگر

یوپی کی ترقی



بے بی فوڈ فیکٹری، مراد آباد



امداد باہمی دودھ ڈیری، کان پور

کے آئینے

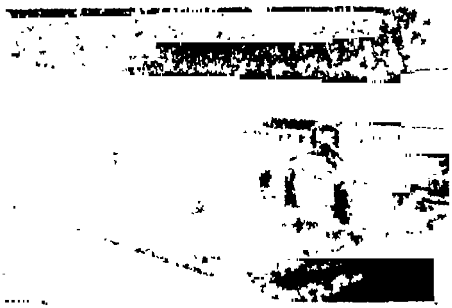


(داہنے) پری سیزن انسٹرومنٹ فیکٹری
(بائیں) [illegible]

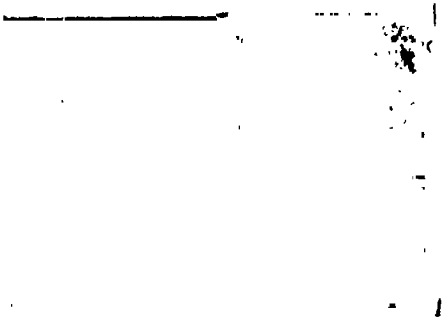
یوپی کی ترقی



وزیراعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی امداد باہمی شکر مل پلیا (ضلع کھیم پور) کا افتتاح کرتے ہو۔

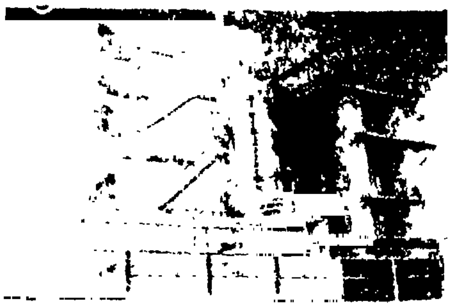


سرکاری ڈالا سیمنٹ فیکٹری، مرزاپور



سرکاری سیمنٹ فیکٹری چُرک ضلع مرزاپور

کے آئینے



ہندستان المونیم کارخانہ، مرزاپور

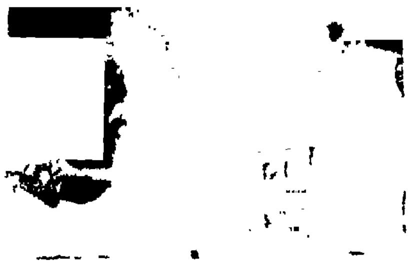


ڈیزل لوکوموٹیو کارخانہ، وارانسی

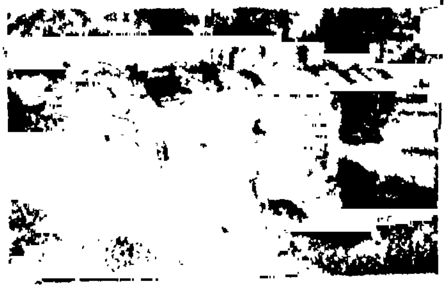
یوپی کی ترقی



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کیمیاوی کھاد کے کارخانہ (گورکھپور) کا افتتاح کرنے کے بعد معائنہ کرتے ہوئے (اپریل ۱۹۶۸ء)



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی پنکی بجلی گھر کا افتتاح کرتے ہوئے

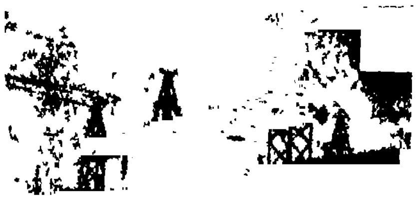


ایگرو انڈسٹریل کارپوریشن، تال کٹورہ لکھنؤ سے متعلق ٹریکٹر کارخانہ



ہردواگنج تھرمل پاور اسٹیشن

ماتا ٹیلا پاور اسٹیشن کا سوئچ یارڈ



کے آئینے

[illegible]

لال پدم دھر سنگھ

ہندستان چھوڑو تحریک کا ایک شہید

آر۔ سی۔ دوبے

ہندستان کی جنگ آزادی میں ۹ اگست ۱۹۴۲ء کا دن ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دن کانگریس کمیٹی نے اپنے بمبئی اجلاس میں ایک اہم تجویز پاس کی جس کے مطابق انگریزوں سے ہندستان چھوڑ کا پرزور الفاظ میں مطالبہ کیا گیا۔ تجویز کے پاس ہوتے ہی مہاتما گاندھی نیز دوسرے تمام لیڈروں کو گرفتار کرکے قید کر دیا گیا۔ لیڈروں کی گرفتاری کی خبر ملک کے گوشے گوشے میں آندھی کی طرح پھیل گئی اور ہر جگہ موضوع گفتگو بن گئی۔ اس خبر نے ملک میں غم و غصہ کی ایک عام لہر دوڑا دی اور عوام میں برطانی حکومت سے ٹکر لینے اور اس کے خلاف سب کچھ کر ڈالنے کا جذبہ اور جوش اور بھی بڑھ گیا۔

ایک ہفتہ قبل یعنی ۲ اگست کو الہ آباد میں مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود پرشوتم داس ٹنڈن پارک لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پنڈت جواہر لال اس موسلا دھار بارش میں بھی تقریر کر رہے تھے۔ ان کے قریب کھڑے ہوئے جب ایک شخص نے ان کو بارش سے بچانے کے لیے چھتری لگانے کی کوشش کی تو انھوں نے اپنے ہاتھ سے اس کو ہٹا دیا اور چھتری کی پیش کش کو کسی طرح قبول نہیں کیا۔ پنڈت نہرو کی اس معرکۃ الآرا تقریر کے دوران جب لوگوں نے ان سے یہ تاریخ ساز الفاظ سنے کہ "کل میں بمبئی جا رہا ہوں۔ کانگریس کمیٹی کے فیصلے کے بعد میں واپس آسکوں گا یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ اگر ہم لوگ گرفتار کر لیے گئے تو کانگریس کمیٹی اور اس کا بوجھ آپ ہی لوگوں پر دیش کے نوجوانوں پر ہوگا" تو ان کے دلوں میں دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ پنڈت نہرو کی اس موثر اور جوشیلی تقریر کو سننے والوں میں زیادہ تر الہ آباد یونیورسٹی

اور مقامی کالجوں کے طالب علم تھے۔ ان میں جوانی کا خون جوش مارنے لگا۔ جگہ جگہ جلسے ہونے لگے، اسکیمیں بننے لگیں، جلوس نکالے جانے لگے اور ہر طرف انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔

علم اور سیاست کا مرکز اور گنگا جمنا کے سنگم کا شہر الہ آباد بغاوت کی تیاریاں کر رہا تھا۔ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے طالب علم اپنی جانوں کو ہتھیلی پر لیے نکل پڑے! دھرتی ماتا نے پکارا، آزادی کے متوالو! کچھ کر دینے کا جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔ ہندستانی عوام کو ڈرانے اور ان کو دہشت زدہ بنانے کے لیے لیڈروں کو اندھا دھند گرفتار کر کے نامعلوم مقامات پر بھیجا جا رہا تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے لیڈروں کا امتیاز نہیں تھا۔ لیکن لوگوں میں آزادی کی لگن اتنی بڑھ چکی تھی کہ ان استبدادی کارروائیوں کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا اور انھوں نے برطانوی سامراج کے اس چیلنج کو خوشی خوشی قبول کر لیا۔

یونیورسٹی کے طلبا نے ۱۱ اگست کو یونین ہال میں ایک زبردست جلسہ کر کے اپنے لیڈروں کی فہرست تیار کی۔ اس کے بعد جلوس کی شکل میں روانہ ہوئے جب جلوس چھا ہوسٹل اور سنٹرل ہوسٹل کی درمیانی سڑک سے ہو کر گزرا تو پولیس کے سپاہیوں کو جو لاٹھیوں سے لیس سڑک کے دونوں طرف قطار باندھے کھڑے تھے جلوس کو منتشر کرنے کا حکم ہوا۔ لیکن طالب علموں کے اس بڑے مجمع نے پولیس کی آگاہی کے باوجود منتشر ہونے سے صاف انکار کر دیا اور انتہائی جوش کے عالم میں بلند آواز سے "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس وقت ایک بڑا ہی عجیب نظر

دیکھتے ہیں پر آیا کہ لاٹھیاں تانے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے ضرور گئے لیکن وہ ہاتھ اٹھے کے اٹھے ہی رہ گئے اور طالب علموں پر ایک بھی لاٹھی کا وار نہ ہوا۔ ہزاروں طلبا کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا یہ جلوس پولیس کے سپاہیوں کی قطاروں کو جو راستہ روکے اور لاٹھیاں تانے کھڑی تھیں کائی کی طرح چیرتا اور گاتا ہوا آگے نکل گیا:

"سر باندھے کفن والے شہیدوں کی ٹولی نکلی"

اس وقت میں ہندو بورڈنگ ہاؤس کے کمرہ نمبر ۱۰ میں رہتا تھا۔ لال پدم دھر سنگھ جو بی۔ ایس سی کے طالب علم تھے، انھیں جب کسی ہوسٹل میں جگہ نہ ملی تو میری استدعا پر وہ بھی میرے ہی کمرے میں رہنے لگے تھے۔ ان سے میرا تعارف آگرہ میں دو سال پہلے ہوا تھا۔ وہ میرے بہنوئی کے دوست تھے اور جب دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء میں آگرہ کی مشہور تاریخی عمارتیں دیکھنے آئے تو انھیں کے مہمان ہوئے۔ میں بھی ان دنوں وہیں مقیم تھا۔ میری ان کی یہ رسمی ملاقات رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بندیل کھنڈ کے ایک معزز اور بااثر راجپوت گھرانے میں ۱۴/ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے تھے اور ۱۲/ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کو مادر وطن پر قربان ہو جانے کی سعادت حاصل کی۔ ان کی بے لوث اور سچی دوستی کے سب ہی معترف تھے۔ جو بھی ان کے قریب آتا بہت جلد ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ہم سب لوگ ان کو 'لال صاحب' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

لال صاحب ہندو بورڈنگ، جس میں میرے ساتھ چند ہی دن ہی رہ پائے تھے کہ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کی تحریک شروع ہو گئی۔ وہ شروع سے ہی مخلص خیالات کے تھے۔ آزادی کی لڑائی میں شامل ہونے کا یہ سنہری موقع ملا تو آیا تو ان کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت سی اسکیمیں تیار کیں اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں تن من دھن سے لگ گئے۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔

ہندوستان چھوڑو تحریک نے ملک بھر میں ہلچل مچا دی تھی۔ ۱۲/ اگست کا دن تھا اور صبح کا وقت۔ ہم لوگ نیشنل ہیرالڈ اخبار پڑھ رہے تھے۔ مختلف مقامات پر آزادی کے جانباز سپاہیوں کی برطانوی سامراج سے مڈبھیڑوں، نہتوں پر گولیوں کی بارش، اور اندولن میں شریک ہونے والوں کے گھروں کو تاراج کرنے، مال و اسباب کو لوٹنے اور کھڑی فصلوں کو تباہ و برباد کیے جانے کی خون کھولا دینے والی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ اگرچہ برطانوی حکومت کا ظلم و جور اور بربریت اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا لیکن ملک کے جاں نثاروں کے قدم آزادی کی منزل کی جانب بے خوف و خطر بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔

ملک کے مختلف مقامات پر برطانوی حکومت کی جانب سے بربریت کا جو ننگا ناچ ہو رہا تھا اس کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ الٰہ آباد یونیورسٹی کے ہم طالب علموں اور شہریوں کے دل اپنے خون سے آزادی کی کہانی کی سرخی لکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ لیکن یونیورسٹی کے علاقے میں جب پولیس کی لاٹھیاں فضا میں بلند ہو کر ہمارے سروں تک نہ آئیں، مسلح پولیس کی سنگینیں اور گولیاں ہمارے سینوں کو چھیدنے اور چھلنی کرنے کے لیے آگے نہ بڑھیں تو ہمیں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مادر وطن ہمارے خلوص اور جذبۂ قربانی سے مطمئن نہیں۔ حالانکہ اس دن ہم سنگینوں اور گولیوں کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہی نہیں بلکہ بے چین تھے — مگر یہ ہمارا وہم ہی تھا۔ اس لیے کہ شہر کا چکر کاٹتے کاٹتے جب ہماری نہتی فوج کچہری کے سامنے پہنچی تو ہم نے دیکھا کہ ہماری آرزو پوری ہونے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ لاٹھیوں، ریوالوروں اور بندوقوں سے لیس برطانوی حکومت کے محافظ یہاں ہمارا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار کھڑے تھے۔

جلوس جس میں شہر کے کونے کونے سے طلبا کی ٹولیاں "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتی ہوئی شامل ہوتی گئی تھیں اب ہزاروں کی تعداد پر مشتمل ہو چکا تھا۔ اس پرجوش ہجوم کے کچہری کے قریب پہنچتے ہی اس پر لاٹھی چارج شروع کر دیا گیا۔ ساتھ ہی دھمکی بھی دی گئی "بھاگ جاؤ، ورنہ بھون دیے جاؤ گے"۔ لیکن آزادی کے پروانے بھلا جلنے سے کب ڈرتے؟ لاٹھیوں کی بارش اور بھون دینے کی دھمکی بھی جب مجمع کو آگے بڑھنے سے روک نہ سکی تب بندوقوں کے دہانے کھلنے لگے۔ شروع میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ تو ایسی معلوم ہوئی گویا پٹاخے چھوڑے جا رہے ہیں لیکن جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے گولیوں کی بوچھار صاف دکھائی دینے لگی۔ کچھ لوگ یکایک گولیوں کی زد سے بچنے اور دُم دبا کر بھاگنے بھی لگے۔ یکایک مجمع سے لعنت و ملامت کی

اور اپنے بلند ہو گئیں جن میں لال صاحب کی آواز سب پر غالب تھی۔ "بزدلو! تھوڑی سی زندگی پر ... لڑکیاں آگے بڑھ رہی ہیں اور تم پیٹھ دکھلا رہے ہو!"

بھاگنے والوں نے جب دیکھا کہ لڑکیاں بال کھولے اور ترنگا جھنڈا لیے بپھری ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں تو ان میں سے بہت سے لوگ واپس لوٹ آئے اور آگ اگلتی ہوئی بندوقوں کی جانب بڑھنے لگے۔ لال پدم دھر کبھی جوش میں آگے بڑھتے کبھی مڑ کر ساتھیوں کو للکارتے اور مادر وطن کی آزادی کی خاطر جان قربان کر دینے کی تلقین کرتے۔ پھر تھوڑی دیر میں ہم لوگ کچہری کے احاطے میں پہنچ گئے اور نیم کے پیڑ سے ملحق ایک مثلث نما بڑے کٹہرے میں ہو گئے جس کے تین طرف لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

آزادی کے یہ نڈر سپاہی 'انقلاب زندہ باد' 'بھارت ماتا کی جے ہو' 'انگریزو! بھارت چھوڑو' 'سامراج شاہی مردہ باد' وغیرہ نعرے لگا رہے تھے۔ دفعتاً لال صاحب کی گرجدار آواز سنائی دی۔ "لیٹ جاؤ، لیٹ جاؤ!" ہم سب پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ جب تک گولیوں کی بوچھار ہوتی رہی ہم لوگ لیٹے رہے۔ گولیوں کی بارش ختم ہوتے ہی ہم سب اٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور نعرے لگانے لگتے۔ اس طرح کئی بار گولیاں چلیں کئی بار ہم لوگ لیٹے اور اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ مگر ہر حال میں زبان پر وہی نعرہ تھا۔ "انقلاب زندہ باد" "انگریزو بھارت چھوڑو" بعض جوشیلے جوانوں نے عدم تشدد کا طریقہ ترک کر کے نزدیک پڑے ہوئے پتھروں، اینٹوں اور ڈھیلوں کو پولیس والوں پر پھینکنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر لال صاحب نے چیخ کر کہا: "پتھر مت پھینکو، ڈھیلے مت پھینکو" گولیوں کی بوچھار پھر ہونے لگی اور قریب قریب سبھی لوگ زمین پر لیٹ گئے۔ اسی لمحہ لال صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کا ایک ساتھی جھنڈا لیے ہوئے ہے وہ چاروں طرف سے گولیوں سے گھرا ہے اور سخت خطرے میں ہے وہ تیزی سے اٹھے، تیر کی طرح چھلانگ لگا کر اس کے پاس پہنچ گئے اور جھنڈا لے کر ہاتھ میں لے لیا۔ اچانک ایک گولی لال صاحب کے سینہ کو پار کرتی ہوئی نکل گئی اور وہ زمین پر آ رہے۔ ان کے کچھ ساتھیوں نے اپنے محبوب شہید ساتھی کا خون اپنے ماتھوں پر لگایا اور لاش کو "یونین ہال" میں لے جا کر رکھ دیا گیا۔

۱۳ اگست کی صبح کو جب ترنگے میں لپٹے ہوئے ان کے جسد خاکی کو نذر آتش کرنے سے پہلے یونیورسٹی کے احاطے کے مشہور برگد کے درخت کے سامنے والے برآمدے میں لٹایا گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوج کا کمانڈر میدان جنگ سے تھکا ہوا واپس آ کر آرام کر رہا ہے۔ البتہ آنکھیں ادھ کھلی تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے اور دل میں مادر وطن کے ایک سچے سپوت کے ساتھی ہونے کا فخر محسوس کرتے ہوئے ہم نے ان کے قدموں پر عقیدت کے پھول چڑھائے۔

آج اپنے ایک پیارے دوست اور جنگ آزادی کے ایک عظیم سورما سے بچھڑے ہوئے تیس برس بیت گئے لیکن ان کی جب بھی یاد آتی ہے تو سارے واقعات آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ قومی جھنڈے کی سلامی کے لیے میں جب بھی کھڑا ہوتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مسکراتا ہوا چہرہ آکاش سے جھانک رہا ہے۔

مجھے جب بھی الہ آباد جانے کا موقع ملتا ہے میں یونیورسٹی یونین ہال کے نزدیک نصب ان کے مجسمہ کو سلام کرتا ہوں۔ کاش ان کی اس شاندار موت میں مادر وطن کے لیے ان کی اس عظیم قربانی میں میں بھی ان کا ساتھ دے سکا ہوتا۔

★

(خاکہ)

بڑے میاں

رشید الدین

اصل نام تو اُن کا ابا نے کیا تھا مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا وہ گھر میں اسی نام سے مشہور تھے۔ لمبا پتلا جسم، منہ پر گھنی سفید داڑھی، کالا سانولا رنگ۔ ہاتھ میں ایک ڈنڈا جسے وہ منٹ بھر اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے، تنگ موری کا پاجامہ اور ایک ڈھیلی ڈھالی اچکن۔ — بس یہی اُن کا حلیہ تھا۔ جب میں نیا نیا اسکول جانے لگا تھا اس وقت بھی بڑے میاں بڑے میاں ہی تھے اور اب جب میں کالج جاتا ہوں تب بھی بڑے میاں بڑے میاں ہی ہیں۔ جب سے لے کر اب تک کئی انقلابات آئے، زمانے بدلے، حکومتیں بدلیں مگر کیا مجال جو بڑے میاں کی روش، بات چیت یا عادات و اطوار میں ذرہ برابر بھی فرق آیا ہو۔ جب بھی بڑے میاں صبح اٹھ کر سودا سلف لانے جاتے تھے اور اب بھی جاتے ہیں۔ جب بھی بڑے میاں بہوبند جاتے تو پان والے سے تُو تُو مَیں مَیں کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ جب بھی بڑے میاں بات بے بات قسمیں کھاتے تھے اور آج بھی کھاتے ہیں۔ جب بھی بڑے میاں کا سارے گھر میں سکہ تھا اور آج بھی ہے۔ فرق پڑا تو صرف اتنا کہ پہلے وہ ہر روز دوپہر میں باورچی خانہ میں جا کر ہر چیز کا مزہ چکھتے تھے اور ہر روز ماما صاحبہ سے مٹھار مٹھار کر باتیں بناتے تھے مگر اب ماما سے ان کی کچھ اَن بن ہو گئی ہے۔

گھر میں چاہے کتنی ہی گڑبڑ کیوں نہ ہو، کتنے ہی مہمان کیوں نہ جمع ہوں، بڑے میاں کے نظام شغل میں ذرا بھی فرق نہ آئے گا۔ وہی اپنے وقت پر آٹھ بجے نکلیں گے، منہ ہاتھ دھو کر باورچی خانہ میں جا کر دو تین بلکہ چار چھ پیالیاں چائے پی جائیں گے اور پھر کہیں آہستہ سے بازار کا راستہ لیں گے۔ بازار بھی جائیں گے تو سیدھی طرح سے نہیں بلکہ جاتے جاتے خواہ مخواہ ہی کلو پان والے کی دوکان سے ہو لیں گے اور ایک زردے کا پان کھانے کے بعد باتیں کرتے کرتے اتنی بے تکلفی پر اتر آئیں گے کہ توبہ ہی بھلی! بعض دفعہ تو نوبت گالی گلوچ تک بھی پہنچ جاتی ہے۔

وہاں سے بازار جائیں گے۔ گھوم پھر کر زیادہ اور سودا سلف لے کر کم دو گھنٹے کے بعد ایسے کمرے میں داخل ہوں گے جیسے بازار سے سودا نہیں لائے کوہ قاف سے پری اٹھا لائے ہوں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ برآمدے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور انھیں دیکھتے ہی ہم سب بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

"ہاں بڑے میاں! آج کی کیا خاص خبر ہے" شریر خالہ زاد بھیا کرکٹ کا بیٹ ہوا میں گھماتے ہوئے پوچھتا ہے۔

اور بڑے میاں حسب معمول اپنے خاص انداز میں بڑی سنجیدگی سے خبریں سنانے لگتے ہیں (جن میں سے ایک آدھ صحیح ہوتی ہے اور باقی کا اللہ ہی علیم!) اس اثناء میں امّی کو آتے دیکھ کر ہم سب تو دو گیارہ ہو جاتے ہیں اور بڑے میاں پورے خشوع و خضوع کے ساتھ انھیں حساب دینے لگتے ہیں:

"چار آنے کے آلو — دو آنے کے بینگن — ایک آنے کی بھاجی — آدھ آنے کی کوتمیر —"

غرض ایک گھنٹہ اس حساب میں صرف ہو جاتا ہے۔ پھر وہ معمول

کے مطابق اطمینان سے کھانا کھاتے ہیں اور پھر گھر کی تفتیش کو نکل جاتے ہیں:

"یہ چیز یہاں کیوں رکھی ہے — وہ چیز وہاں کیوں رکھی ہے — نیا نوکر آج پھر کہاں غائب ہے، منی آج اسکول کیوں نہیں گئی — خالد محلے کے آوارہ لڑکوں میں کیوں کھیلتا ہے" وغیرہ وغیرہ۔

بس پھر دوپہر سے لے کر شام تک بڑے میاں کو یہی کام ہے اور رات میں وہ اپنا مخصوص تاریخی اونی کوٹ پہنے نوکروں کے کمرے میں جا کر اپنے بچپن اور جوانی کے قصے سنایا کرتے ہیں جہاں کبھی کبھی ہم لوگ بھی پہنچ جاتے ہیں۔ اپنے کوٹ کے بارے میں بڑے میاں یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ پہلے وہ ایک بلانکٹ (کمبل) ہوا کرتا تھا جسے ان کی والدہ محترمہ کو اُن کی والدہ محترمہ نے جہیز میں دیا تھا تاکہ وہ سرما کے زمانے میں اس گرم اونی کپڑے کو استعمال کر کے سردی سے بچا کریں۔ اُن کے والد مرحوم کی اس اونی بلانکٹ پر بڑی نظر تھی مگر وہ مرتے مر گئے یہ بلانکٹ ان کے ہتھے نہ چڑھ سکا۔ آخر ان کے مرنے کے بعد ان کی والدہ نے اس کا کوٹ بڑے میاں کو سی دیا تھا۔

دراصل انھیں اپنے بچپن کے قصے سنانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ جہاں بھی وہ کوئی واقعہ سُن لیتے ہیں فوراً اسے اپنے نام سے منسوب کر کے سُنا دیتے ہیں۔ ہرکولیس کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ بالکل چھوٹا تھا تو دو سانپ اس کے قریب آ گئے جنھیں اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس زور سے دبایا کہ اُن کی جان نکل گئی۔ بڑے میاں نے یہ قصہ کہیں سن لیا اور فوراً اپنے نام سے منسوب کر کے ایک رات نوکروں کے کمرے میں سُنا دیا۔ اتفاق سے منی اور خالد بھی وہاں موجود تھے۔ منی نے جب بڑے میاں کی بہادری کا یہ قصہ سنا تو ششدر رہ گئی اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہنے لگی:

"سچ مچ بڑے میاں آپ اتنے بہادر تھے؟"

بس اتنا سننا تھا کہ خالد کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں:

"ارے یہ تو معمولی واقعہ ہے منی۔ بڑے میاں کے اپنے بچپن میں تو چوہے جیسے چالاک جانور بھی اُن کی زد سے بچ کر نہ جا سکتے تھے۔ کیوں بڑے میاں؟"

خالد نے سوالیہ نگاہوں سے بڑے میاں کی طرف دیکھا اور بڑے میاں نے اپنے مخصوص انداز میں کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے سینہ پھلا کر وہ قصہ چھیڑ دیا کہ جب وہ چھوٹے تھے تو اُن کے ایک پڑوسی رحمن کے گھر میں چوہے بہت تھے) روزانہ رات کو محلے کے میونسپلٹی کے چپراسی سے ایک آنے کرائے کا چوہا پکڑنے کا پنجرہ لاتے تھے۔ پھر صبح ہی اٹھ کر دیکھتے تو پنجرے میں چوہوں کی بھرمار ہوتی جنھیں وہ دور میدان میں لے جا کر چھوڑ دیتے تھے تو یہی بڑے میاں ایک چوہے کو بھی زندہ بچ کر نہیں جانے دیتے تھے۔ ابھی یہ قصہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ خالد نے انھیں دوسرا واقعہ یاد دلایا:

"کیوں بڑے میاں! اور آپ نے اپنی جوانی میں ایک مست ہاتھی کو کس طرح مار بھگایا تھا"

"ارے وہ تو معمولی واقعہ ہے ورنہ میں نے تو اپنی جوانی میں ایک بار پوری اُلٹی ہوئی بس کو سیدھا کر دیا تھا۔"

"وہ کیا قصہ ہے بڑے میاں بتائیے نا۔" ہمارے نئے نوکر کریمو نے لجاجت سے کہا۔

"چل ہٹ بے۔ گدھے کو زعفران کی کیا قدر۔" بڑے میاں نے اُسے ڈانٹ پلائی۔

آخر میں منی کے کہنے پر اور کریمو کی سفارش کرنے پر پورا واقعہ سنایا۔

جھوٹ بولنا تو ان کے نزدیک کوئی خاص بات ہے ہی نہیں اور پھر طرفہ یہ کہ جھوٹ بولنے کے بعد قسمیں کھا کھا کر اسے سچ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ باتیں کرتے کرتے وہ قسمیں یوں کھاتے ہیں جیسے کوئی پان کھاتے کھاتے زردہ کھاتا ہے۔ جھوٹ بات کرنے اور قسمیں کھانے کی ان کی یہ عادت اب معمول کی چیز بن گئی ہے۔ ایک دن ابا جان اپنے چند مخصوص دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ بڑے میاں چائے لے کر پہنچ گئے اور بات ہی بات میں ایک عدد قسم کھائی۔ ابا جان نے انھیں سمجھایا کہ قسمیں کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ اس عادت کو ترک کرنا چاہیے۔ بڑے میاں نے فوراً وہیں کھڑے کھڑے پختہ وعدہ کیا کہ وہ اب

بالکل قسم نہیں کھائیں گے چاہے ان کے گلے پر چھری کیوں نہ چل جائے۔ بڑے میاں سے کچھ ہی واقف ابا جان کے ایک دوست نے جو ذرا خوش طبع واقع ہوئے تھے، بڑے میاں سے پوچھا:

"کیا بڑے میاں اب آپ نے قسمیں کھانا چھوڑ دی ہیں؟"

"ہاں، ہاں! بالکل چھوڑ دی ہیں۔" بڑے میاں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"بالکل؟" ان صاحب نے لفظ بالکل پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بالکل، خدا کی قسم بالکل۔" بڑے میاں نے انھیں یقین دلاتے ہوئے بے ساختہ کہا اور دوسرے ہی لمحہ سارا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

اس کے بعد جب میں نے اس واقعہ کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے:

"ارے میاں قسمیں نہ کھائیں تو کیا کریں۔ یہاں تو کسی کو ہماری بات پر اعتبار ہی نہیں آتا۔ جیسے ہم انسان نہیں کچھ اور شے کے بنے ہیں۔"

"صحیح بڑے میاں! آپ کی بات پر کوئی اعتبار نہیں کرتا" میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

"صحیح میاں! خدا کی قسم کوئی اعتبار نہیں کرتا۔" بڑے میاں نے حسب معمول قسم کھا کر کہا۔

کوئی بات انھیں معلوم ہو جائے اور پھر وہ صیغہ راز میں رہے یہ ناممکن ہے۔ کوئی بھی بات انھیں معلوم ہوئی (خواہ وہ کتنے ہی راز کی کیوں نہ ہو) وہ اس کی فوراً تشہیر شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے انھیں اپنے دل کی بات دوسرے کو بتائے بغیر کھانا ہی ہضم نہ ہوتا ہو۔ ایک دفعہ باجی وغیرہ پکچر جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ باتوں باتوں میں گفتگو مرد عورت تک پہنچ گئی۔ باجی مجھ سے تنگ کر کہنے لگیں ہم لوگ تو تمھارے مردانہ کمپارٹمنٹ میں بیٹھ سکتے ہیں لیکن تم لوگ باوجود ہزار کوشش کے زنانہ کمپارٹمنٹ میں قدم نہیں رکھ سکتے۔"

مجھے بھی تاؤ آگیا اور میں نے کہا "نہیں یہ غلط ہے۔ ہم لوگ خود ہی وہاں بیٹھنا پسند نہیں کرتے ورنہ ہم برابر بیٹھ سکتے ہیں!"

باجی بھلا اتنی بھولی کہاں تھیں کہ ہمارے اس تیز سے سامنے استدلال پر خاموش ہو جاتیں۔ خوب خوب بحث ہوئی فیصلہ شرط پر چھوڑ دیا گیا۔ باجی نے فوراً دس روپے کی شرط باندھ لی اور ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب پکچر ختم ہونے کے بعد میں نے ماما کے میلے کچیلے برقع کی نقاب اٹھائی اور انھیں سلام کیا۔ باجی اپنی شکست پر بہت نادم تھیں۔ انعام حاصل کرنے کی تقریب کو صبح کے لیے اٹھا رکھنے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد میں فتح کی خوشی میں سرشار سو گیا۔ لیکن اتفاق سے صبح ہی صبح بڑے میاں کے کان میں اس واقعہ کی بھنک پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا ناشتہ کر کے ہم باجی سے دس روپے وصول بھی نہ کر پائے تھے کہ رات کی ساری روداد بڑے میاں نے امی جان کو سنا ڈالی۔ اس طرح ہمارے دس روپے کے دس روپے گئے اور ڈانٹ الگ سننا پڑی۔

جب بھی بڑے میاں باہر سے سودا سلف لے کر آتے ایک نہ ایک نئی اور سنسنی خیز خبر ضرور ساتھ لاتے۔ ایک دن جب وہ دروازے میں سے نمودار ہوئے تو چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ دراصل وہ ہماری ماما کو پکار رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی فوراً کہنے لگے:

"ارے نگوڑی تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ تیرا بیٹا موٹر سے ٹکرا گیا ہے۔"

ماما نے جب اپنے اکلوتے بیٹے کے حادثے کی خبر سنی تو پچھاڑیں کھاتی ہوئی گھر پہنچی۔ وہاں جا کر جو دیکھا تو اس کا بیٹا ہشاش بشاش بیٹھا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسی محلہ کا کوئی لڑکا حادثے کا شکار ہوا تھا۔ اب ماما نے واپس آ کر بڑے میاں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ حسب معمول وہ نوکروں کے کمرے میں مصروف کلام تھے۔ ماما نے ان کے قریب جا کر بڑی ہی سنجیدگی سے پوچھا:

"بڑے میاں! ایک بات کہوں؟"

"ہاں، ہاں! کیوں نہیں۔" بڑے میاں نے اپنا ڈنڈا سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتایئے آپ بڑے ہیں یا آپ کی بیڈ داڑھی؟" ماما نے پوچھا۔

"اے بس اتنی سی بات" بڑے میاں نے جھینگی بجاتے ہوئے

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

ہم اور آزادی

ایس ایم، عبّاس رضوی

انسانی زندگی جذبات کا مجموعہ ہے۔ یہ جذبات کچھ خوشی کے ہیں کچھ غم کے۔ کچھ محبت و رواداری کے۔ کچھ غیرت و خودداری اور آن کے۔ جب کبھی انسانی عظمت و وقار کو ٹھیس لگی ہے، زندگی کی آن تک کوئی بات پہنچی ہے تو اس کے اندر ایک ہیجان برپا ہوا ہے۔ اس کے خیالات نے انگڑائیاں لی ہیں اور ایک جذبے نے کروٹ بدلی ہے۔ اسی جذبہ کا نام آزادی ہے۔

یقیناً وہ نہایت ہی مبارک ساعت رہی ہوگی جب انسان کی سرشت میں آزادی کے اس عظیم، پاکیزہ اور مقدس جذبے نے جنم لیا ہوگا۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک ہر دور میں یہی جذبہ بنی انسان کی پشت پناہی کرتا رہا ہے۔ ظلمت سے نور کی سمت، شر سے خیر کی جانب اور بغض و حسد، تعصب و نفرت کی گہری کھائیوں سے حق و انصاف، صداقت کے مہکتے لالہ زاروں تک یہ جذبہ کشاں کشاں آدمی کو آگے ہی بڑھاتا رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کبھی انسان ظلم کے گرداب میں گھرا ہے، انسانوں سے انسانی طور و طریقہ کے ساتھ زندہ رہنے کے حقوق چھیننے کی بات چلی ہے، زندگی کے بنیادی اصول، انسانیت کی اعلیٰ قدریں جبر و استبداد کی بھاری چکیوں تلے پسی ہیں، انسان کی شرافت و افتخار بٹانے کی کوشش ہوئی ہے، زندگی کی عظمت و شان پر دھبّہ لگا ہے، جیتے جاگتے زندگی کی آہنی زنجیروں میں معصوم انسانوں کو جکڑ کر خوں ریزی اور غارت گری کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں زندگی کا اساس لوٹ لینے کی سازش ہوئی ہے تو انسان اپنے ہاتھوں میں حریت اور آزادی کا پرچم لے کر ابھرا ہے اور ظلم کی بڑی سے بڑی طاقتوں کو اس نے یہ کھلا چیلنج دیا ہے کہ ؎

لاکھ تخریب ہو تعمیر نہیں رک سکتی
زندگی موت کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی

تاریخ شاہد ہے۔ ہم پر بھی ایسا ہی ایک وقت گزرا ہے۔ ہم طوق و سلاسل میں مسلسل قید کر دیے گئے تھے۔ ہماری زبان بند کی جا رہی تھی۔ فکر و نظر پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ ہمیں مجبور اور مجبور محض بنا کر ہماری کس مپرسی کا کھلے عام مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ نگاہوں پہ بھاری پردے ڈال کر ہماری تہذیب و تمدن، ہمارے علوم و فنون کی صدہا سال پرانی عظیم الشان تاریخ یکسر نیست و نابود کی جا رہی تھی۔

یہی نہیں، انسانی اور اخلاقی قدریں کھلے عام پامال ہو رہی تھیں۔ عزت کے ساتھ زندہ رہنا محال تھا۔ محض طاقت کے زعم باطل کی وجہ سے مصلحتِ وقت ہم سے "ہر گام" پر "سجدہ" کی طلب گار تھی۔ اس انتہا پر پہنچ کر جب حیات موت کے قدموں پر جھکنے کے لیے مجبور ہوئی تو کچھ سرفروشانِ وفا کو ملک و قوم کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر جلال آ گیا۔ حریت کا جذبہ بے قرار ہو اٹھا اور اپنے سر سے کفن باندھ کر انھوں نے وطن کو آزاد کرانے کا بیڑا اٹھا لیا۔

اُف آزادی! تیرے جاں نثاروں نے بھی دنیا میں کتنے بھیانک ظلم برداشت کیے۔ کتنوں کے سینے دہکتی ہوئی گولیوں سے چھلنی کر دیے گئے۔ کتنوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا کر ان کے

تھوکے چھینٹوں سے "منظرِ دار" کو رنگین بنایا گیا۔ کتنوں کے گلے کاٹے گئے۔ کتنی بستیاں ویران کردی گئیں۔ کتنے گھر ہمیشہ کے لیے اُجڑ گئے۔ کتنی ماؤں نے اپنی ساری زندگی کی کمائی لٹا دی۔ کتنی سہاگنوں نے اپنی نازک کلائیاں سونی کرلیں، مانگ کے سیندور پونچھ ڈالے۔ کتنے بھائی سے بھائی اور باپ سے بیٹے بچھڑ گئے۔ یہ طویل، سادہ اور غمگین داستان آج تک یہ کہہ رہی ہے کہ ؎

کرن کرن کو بھگویا گیا ہے اشکوں میں
کہ جاوداں تو بنے عہدِ نو بہار کا پھول

آخر جب "ہزاروں غنچے" پامال ہوگئے، "لاکھوں کلیاں" موت کی بھیانک آگ میں جھلس گئیں تو "شبِ ظلمات" نے گھبرا کر اپنا دم توڑ دیا۔ روشنی نے تاریکی پر فتح حاصل کی اور ہمیں ایک "پیغام بقا" ملا۔ ہم دنیا کے سامنے سرخرو ہوئے اور ہم نے دنیا کو صلح و آشتی، امن و سلامتی، انصاف و صداقت کی دعوت دی۔

پھر صبحِ جمہور آئی اور اپنے ساتھ مسرت و شادمانی کا پیغام لائی۔ ہم نے "جشنِ بہاراں" کیے اور ہمیشہ ہمیشہ اس جشن کی خوشبو قائم رہنے کی دعائیں مانگیں بقول کسی کے ؎

میں نے اس کہنہ تمدن کے سیہ خانے میں — اک نئی جوت جلانے کی قسم کھائی تھی
میرے احساس و تخیل کے افق پر طاری — حسن ہی حسن تھا رعنائی ہی رعنائی تھی
میرے خوابوں کے حسیں روپ میں ڈھلنے کیلئے — زندگی خود میرے قدموں میں چلی آئی تھی

آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم نے خود اپنے دستور مرتب کیے اور اس دستور کو ہم نے کچھ اس ڈھنگ سے لکھا جس میں ہمیں زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم ہوں۔ ہم قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ ہمارے حقوق یکساں ہیں۔ اگر کچھ فرق ہے گا تو وہ خاص حلقے مخصوص حالات اور ماحول و حیثیت کے باعث ہے۔ یہ ہمارے دستور کی ایک غیر معمولی بات ہے یعنی عوام کو جو حقوق دیے گئے ہیں وہ کناڈا، نیوزیلینڈ اور برطانیہ کے باشندوں کو بھی نہیں ملے ہیں۔ ان حقوق کا اولین مقصد عوام کی خوشحالی اور پورے ملک میں امن و مساوات و آزادی کی بحالی ہے۔

آج ہم دوسرے کے ناجائز دباؤ اور استحصال سے محفوظ ہیں۔ علمی و ادبی معاشرتی و تمدنی اور اخلاقی و مذہبی تعمیر و ترقی کا ہمیں پورا حق ہے۔ ہم جگہ جائیداد خرید سکتے ہیں، رکھ سکتے ہیں اور فروخت کرسکتے ہیں۔ بلا کسی مشروع قانون کے عمل میں آئے ہوئے ہم اپنی ملکیت سے محروم نہیں کیے جاسکتے ہیں۔ قانونی طور پر بلا تفریق مذہب و ملت، قوم و جماعت، رنگ و نسل، جنس و جائے پیدائش ہم سبھی یکساں ہیں۔ سبھی کو سرکاری نوکریاں حاصل کرنے کے لیے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ فوجی یا علمی اعزازات کے علاوہ کسی کو کوئی خطاب نہیں دیا جائے گا۔ سبھی کو تحریر و تقریر اور اظہار رائے کی آزادی ہے —— جیسے جلوس، یونین تنظیم سازی، جماعت پر کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ نقضِ امن کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ ہر آدمی اپنی خواہش کے مطابق کوئی بھی روزگار، پیشہ، کاروبار چن یا کرسکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر شخص کو اپنی حیثیت کے دائرہ میں وہ سارے حقوق دیے گئے ہیں جن سے وہ زیادہ سے زیادہ ترقی کرسکے اور پُرامن بامسرت اور خوشگوار زندگی گزار سکے۔

لیکن آزادی اور جمہوریت، جہاں ہمیں کچھ حقوق دیتی ہے وہاں ہمارے اوپر کچھ فرائض بھی عائد کرتی ہے۔ جمہوریت "جیو اور جینے دو" کے اصول کی زبردست حامی ہے۔ اس کی اساس ہی آزادی اور مساوات پر رکھی گئی ہے۔ جہاں ہمارے دوسروں سے کچھ مطالبات ہیں، سماج سے ہمیں کچھ ملنا ہے وہاں ہماری بہت کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں، سماج کو ہمیں کچھ دینا بھی ہے۔ بلا اس لین دین کے سماج سے ہمارا رشتہ قائم نہیں رہ سکتا ہے۔ کسی نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ:

"یہ حقوق و فرائض بالکل ایک سکے کے دو پہلو ہیں۔ جو ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔"

اسی طرح ہمیں قانونی برابری کا حق دیا گیا ہے۔ لیکن یہ برابری کس بات کی ہوگی؟ کس نوعیت کی ہوگی؟ یہ بات بڑی قابلِ غور ہے۔ ہم برابر ضرور ہیں لیکن ہماری برابری، برابری کی حیثیت میں ہی ممکن ہے۔ بالکل یہی صورت آزادی کی ہے۔ ہم بہت سے معاملات میں آزاد ہیں۔ لیکن کیا ہماری آزادی لامحدود ہے۔ اس پر کوئی پابندی

نہیں ہے۔ اس لیے کہ انجیر قل کی کوئی صداقت نہیں ہے وہ ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل آزادی پابندیوں میں رہ کر اپنی حقیقی منزلوں کو تلاش کر سکتی ہے۔ آزادی پر پابندی نہ عائد کی گئی تو سماج میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس (MIGHT IS RIGHT) کی فضا پھیل جائے گی۔ پھر یہ منزل اتنی خطرناک ہوگی کہ ہر کمزور شخص اپنے سے زیادہ طاقت ور سے یہ خطرہ محسوس کرے گا کہ کہیں وہ اسے پیس نہ دے اور اس حالت میں بعض تھوڑے سے لوگ پورے سماج کے غم اور ہر شخص کی خوشی کے مالک بن جائیں گے۔

جمہوری معاشرہ کو اس نازک صورت حال سے بچانے کے لیے کسی نے آزادی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ہم اپنے ہاتھ وہیں تک پھیلائیں جہاں وہ دوسرے کی ناک کو چوٹ نہ پہنچا سکیں۔ یعنی سماج میں امن و سلامتی، ہم آہنگی و یکسانیت قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جہاں ہم اپنے حقوق کا استعمال کریں وہیں فرائض کا بھی لحاظ رکھیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے حقوق کا استعمال اسی حد تک کریں جہاں وہ دوسرے کی آزادی میں کوئی خلل یا فتور نہ پیدا کریں۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ آزادی کا استعمال حدود کو مدِ نظر رکھ کر کرنا بہتر ہے۔ تبھی سماج کا توازن برقرار رہ سکے گا۔ جیسے ہی ہم پابندیوں سے الگ ہو کر محض حقوق کے لیے دوڑیں گے، حقوق سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی لیے ولوبی نے کہا ہے: "آزادی کا وجود اسی وقت ممکن ہے جب کہ پابندیاں بھی ساتھ ہوں۔" اسی خیال کی ترجمانی ہربرٹ اسپنسر نے یوں کی ہے:

"ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے لیے آزاد ہے بشرطیکہ اس کا کام کسی دوسرے شخص کی آزادی میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرے۔"

اب یہاں پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ آخر ہمارے حقوق کے استعمال کی حدیں کون متعین کرے گا۔ یہ بات کیسے طے ہوگی کہ ہم اپنے کسی حق کا استعمال کس دائرہ میں کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب بہت آسان ہے یعنی جہاں سے ہمیں آزادی ملی ہے وہیں سے پابندی عائد ہونا چاہیے۔ قانون نے ہمیں آزادی بخشی ہے، حقوق سے روشناس کرایا ہے، اس لیے قانون پر ہی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ سماجی رشتوں کو مستحکم بنانے کے لیے غریب کو امیر اور کمزور کو طاقت ور کی کھلی ہوئی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک روشن حال ہی نہیں ایک خوش آئند مستقبل کے لیے آزادی کے حقوق کے استعمال کی حدیں مقرر کر دے۔ یہ قانونی سرحدیں بھی قانون ہوں گی۔ اسی لیے جان لاک نے بہت پہلے کہا تھا۔ جہاں قانون نہیں وہاں آزادی کا وجود بھی ناممکن ہے۔

یہیں سے آزادی اور قانون کا رشتہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی رشتہ ہماری سمجھ میں کم آتا ہے۔ ہم اکثر یہیں پہنچ کر بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آزادی اور قانون کے باہمی تعلق کو لے کر مفکرین میں بھی طویل بحثیں رہی ہیں۔ چند مفکرین نے قانون کو آزادی کے لیے مضر بتایا ہے۔ لیکن یہ خیال زیادہ درست نہیں۔ دراصل قانون، آزادی کا معاون ہے۔ وہ آزادی کے راستے میں جتنی بھی پابندیاں عائد کرتا ہے وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے، مفاد عامہ کی بقا و تحفظ کے لیے اور ایک پرسکون معاشرہ کی تعمیر کے لیے۔

یہ بات واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ جمہوریت میں آزادی کا مطلب 'کھلی ہوئی چھوٹ' یا من مانی کرنا' ہرگز نہیں بلکہ حق و انصاف، امن و سکون کے ساتھ زندگی کی تعمیر و ترقی ہے۔ اسی طرح 'مساوات' کا یہ مفہوم کہ 'ہر شخص برابر ہے' بالکل غلط ہے بلکہ ہر وہ شخص برابر ہے جو برابر کی حیثیت اور برابر کی صلاحیت رکھتا ہے۔ برابر کی حیثیت والوں کو ہی برابر کے حقوق و سہولتیں دی گئی ہیں۔

آج ہمارے سامنے جو گوناگوں پیچیدگیاں ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم آزادی و مساوات کا محض ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ اس کی گہرائی تک نہ جا کر محض لفظوں کی پوجا کرتے ہیں۔ بس ہمیں اپنی فکر ہے۔ دوسرے کی پرواہ نہیں۔ ہر جگہ ہم حقوق ہی کی بات کرتے ہیں فرائض کی جستجو نہیں۔ ہم مساوی ہونے کی تو بات کرتے ہیں لیکن انسانی و اخلاقی

قدریں ہمیں حاصل نہیں کرتیں۔ پنڈت نہرو نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔
"آزادی صرف سیاسی آزادی نہیں بلکہ روح و ضمیر کی آزادی ہے
نفس و شعور کی آزادی ہے۔" اصل آزادی دماغ اور دل کی
آزادی ہے۔ اگر دل وسیع نہ ہوا، نظر بلند نہ ہو سکی، دماغ میں
شگفتگی، سلیقگی اور پاکیزگی پیدا نہ ہو سکی تو آزادی تلخ ہو جاتی ہے۔"

آج جب کہ ذرا ذرا سی بات پر زبردست ہنگامہ آرائیاں
شروع ہو جاتی ہیں، چھوٹی سی بات کو لے کر زبردست طوفان برپا
ہو جاتے ہیں، ایک ذرا سی غلطی پر فرقہ واریت کی فضا پھیل جاتی ہے،
ایک مانگ کے لیے بڑی بڑی ہڑتالیں ہو جاتی ہیں اور غم و غصہ کے
اظہار میں چشم زدن میں اچھی خاصی عمارتیں نذر آتش کر دی جاتی
ہیں، بسیں برباد کر دی جاتی ہیں، اسکول اور کالج ہنگاموں کے
محاذ بن جاتے ہیں، اُستادوں اور شاگردوں کے درمیان کھلی ہوئی
آویزشیں شروع ہو جاتی ہیں تو شاید اس وقت ہمارے شہیدانِ حریت کی
آزادی کی پاکیزہ روحوں کو عظیم صدمہ پہنچتا ہوگا اور آزادی اشکبار
آنکھوں سے یہ سرگوشی کرتی ہوگی ؎

وقت کا بحر پھر اضطراب ہو کے رکھ دیکھو
قافلے امن و ترقی کے کہاں تک پہنچے
فرض اب بھی جو تمہارا ہے وہ تم پہچانو
"میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"

بلاشبہ ہم آزاد ہیں۔ یہ آزادی ہمارے بزرگوں کی بیش بہا قربانیوں
کی مرہون ہے۔ انھوں نے جان و دل کی بازی لگا کر اسے حاصل کیا ہے۔
اس لیے آزادی ہماری عظیم ترین امانت ہے اور ہمیں اس امانت کو
اگلی نسلوں تک پہنچانا ہے۔ ہم نے اس کی کتنی قدر کی، ہم نے
شہیدوں کے خون و پسینہ کی کیا قیمت ادا کی اور اپنے آپ کو کس
حد تک اس امانت کا اہل بنایا، ہمیں اس کا حساب دینا ہوگا۔
اس لیے ہمارا اہم فریضہ ہے کہ ہم اس امانت کی زیادہ سے زیادہ
قدر کریں، آزادی کی راہوں کو استوار کریں، سماجات کی فضا
کو خوشگوار بنائیں، خود بھی سکون، اطمینان اور عزت کے ساتھ زندگی
بسر کریں اور دوسروں کو بھی امن و سلامتی کے ساتھ زندگی گزارنے کا موقع دیں۔ اسی میں ہمارا
بھلا ہے اور سارے عالم کا بھلا ہے اور یہی حقیقی آزادی کا تقاضا ہے۔

★

بڑے میاں

(صفحہ ۴۴ کا بقیہ)

کہا "پہلے میں پیدا ہوا اور میرے پیدا ہونے کے کوئی بیس برس
بعد یہ ڈاڑھی نمودار ہوئی ہے۔" انھوں نے مزے سے ڈاڑھی پر ہاتھ
پھیرتے ہوئے کہا "اس طرح میں اپنی ڈاڑھی سے بہت بڑا
ہوں نہ، سمجھیں بوا؟"

اب تو ماما کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور وہ چیخ اٹھی:
"تمہاری ڈاڑھی نے تو اپنا رنگ بدل دیا ہے۔ تم کب اپنا
رنگ بدلو گے؟ قبر میں پانو لٹک رہے ہیں میاں! اللہ قسم حشر کے دن
تمہارا منہ کالا ہوگا۔ یہ بڑھاپا، یہ ڈاڑھی اور یہ جھوٹ!"

یہ کہہ کر ماما کمرے سے نکل گئی۔ وہ دن اور آج کا دن، بڑے
میاں اور ماما میں اَن بن چلی آ رہی ہے اور آج تک دونوں میں صلح
نہیں ہو سکی۔

اُس دن خدا جانے بڑے میاں کس کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔ سارا
گھر ان کے خلاف ہو گیا تھا۔ ماما نے تو ان کا منہ بھی دیکھنے سے انکار کر دیا
تھا۔ اچھا ہوا جان بڑے میاں پر اس لیے خفا تھیں کہ ماما کے چلے جانے کی
وجہ سے دوپہر کا کھانا انھیں پکانا پڑا اور ساتھ ہی جان تو بہو پر بھی بگڑ گئیں
سلیمان بھی خفا تھیں اور سب سے زیادہ بیچارے سلیمان کو گھر سے نکال دیا گیا۔
گیلی ہوئی تھیں کیونکہ بڑے میاں کبھی آ سے تمام گھر والوں میں نمایاں [illegible]
رات میں دس بجے میں پڑھتے پڑھتے اکتا گیا تو سوچا چلو دیکھوں
بڑے میاں کس حال میں ہیں۔ کھڑکیوں کے کمرے کے سامنے سے گزرا
تو دیکھا کہ سب معمول گُم سُم ہے اور بڑے میاں سب کچھ بھول کر
بیٹھے لہک لہک کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں ؎

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
سن رکھو فسانہ ہیں ہم لوگ

★

غزل

احساس گونڈوی

لے کے دیوانگی کی کرن آگئے
کہہ دو ظلمت سے ظلمت شکن آگئے

ڈوب کر غم کے دریا سے اُبھرے تو کیا؟
ہم لہو میں ڈبو کر بدن آگئے

ہم کو یادوں نے تنہا نہ چھوڑا کبھی
راہبر جب گئے راہزن آگئے

وہ ہمیں تھے کہ جو ملکِ حیات تک
زندگی کا لیے بانکپن آگئے

اصل میں حاصلِ جستجو تھے وہی
مرحلے پیش جو دل شکن آگئے

عقل کو دیکھ کر آج ننگِ وجود
ہم جنوں کا لیے پیرہن آگئے

تبصرہ دوستوں کی نوازش پہ تھا
یاد کیوں دشمنوں کے چلن آگئے

ان سے بہتر ہیں احساس تنہائیاں
دیکھ کر ایک اک انجمن آگئے

غزل

پریتم وارنجی

پہلے تو بہت گردشِ دوراں سے لڑا ہوں
اب کس کی تمنا ہے جو مقتل میں کھڑا ہوں

گو قدر مری بزمِ سخن میں نہیں لیکن
ہیرے کی طرح فن کی انگوٹھی میں جڑا ہوں

خیرات میں بانٹے تھے جہاں میں نے ستارے
خود آج وہیں کاسۂ شب لے کے کھڑا ہوں

ہوتا کوئی پتھر بھی تو کام آتا جنوں کے
ٹوٹا ہوا شیشہ ہوں، سرِ راہ پڑا ہوں

آفاق کی تسخیر تو آسان تھی لیکن
اے جانِ جہاں تیرے لیے خود سے لڑا ہوں

طوفاں سے کہو میرے قریب اور نہ آئے
بہہ جاؤں گا دریا میں کہ ساحل کا گھڑا ہوں

سمٹوں تو کسی سیپ کے سینے میں سما جاؤں
اے پریتم جو پھیلوں تو سمندر سے بڑا ہوں

آزادی کے بعد

آر۔ ایس۔ پرمار

عہد آزادی کی اقتصادی ترقی کے ساتھ تعلیم کے فروغ اور صحت عامہ کی سرکاری سرپرستی اور نگہبانی کے طفیل کئی موذی امراض مثلاً ملیریا، پلیگ، ہیضہ اور چیچک کی بیخ کنی پر زور دیا شروع ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی سے پہلے اوسط میعاد عمر جو ۳۲ سال تھی، ۱۹۶۹ء میں عمر کا یہ اوسط ۵۲،۶ تک پہنچ گیا۔ شرح اموات ۲۷،۴ فی ہزار سے گر کر ۱۴ فی ہزار تک آگئی۔

۱۹۵۱ء میں ملیریا کے مریضوں کا شمار ہندستان میں دس کروڑ تک پہنچ گیا تھا۔ اس ملیریا کی وجہ سے لاکھوں افراد ہر سال ہمارے ملک میں موت کے منہ کا نوالا بن جایا کرتے تھے۔ لیکن اب ملیریا کا موذی مرض قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ پلیگ اور ہیضہ تو ہماری شہری زندگی میں اب گاہے ماہے کی بات بن چکے ہیں۔ ہمارے دیہات میں اشاعت تعلیم کے فیض سے اب وہ اگلی سی بے علمی اور جہالت نہیں رہی۔ اب ہمارے دیہات میں گندگی کے انبار کم نظر آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ بہتر صحت اور بلند تر معیار زندگی کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔

ملیریا کے خلاف جو مہم ۱۹۵۱ء میں شروع کی گئی تھی ۱۹۷۳ء کے قریب پایۂ اختتام تک پہنچ جائے گی۔ چیچک کا تو بہت حد تک انسداد ہو چکا ہے۔ تپ دق جو ہمارا سب سے پرانا اور خونی دشمن تصور کیا جاتا تھا۔ اب بی۔ سی۔ جی (B. C. G.) کے ٹیکوں کے طفیل بڑی حد تک قابو میں لایا جا چکا ہے۔

اتنے بڑے ملک میں ڈاکٹروں اور اسپتالوں کی سخت قلت تھی چنانچہ ۱۹۴۷ء میں ہمارے یہاں ۴۷،۵۰۰ ڈاکٹر تھے، ۷،۰۰۰ نرسیں اور ۵،۰۰۰ دائیاں تھیں لیکن اب امید کی جاتی ہے کہ چوتھے پنچسالہ منصوبے کے خاتمہ تک ہمارے یہاں ۱،۳۲،۹۳۰ ڈاکٹر ہوں گے، ۸۸،۰۰۰ نرسیں اور ۷۰،۰۰۰ دائیاں ہوں گی۔ یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر اور مریضوں کا تناسب ۱:۴۲۴۳ ہو جائے گا جو کبھی ۱:۵۲۰۰ تھا۔ میڈیکل کالج اب چار گنا زیادہ ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارے یہاں ۲۵ میڈیکل کالج تھے اور اب ۹۵ ہیں جن میں ۲۰۰۰ طلبا کی بجائے ۱۱۸۰۰ طلبا طبی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میڈیکل کالجوں کے علاوہ ۱۵ ڈنٹیل کالج اور ۱۱ دوسری نوعیت کے طبی ادارے بھی ہیں جن میں ڈاکٹری کی تربیت دی جاتی ہے۔

پچھلے بیس سال میں نئے اسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد ۱۵۰۰۰ تک پہنچ چکی ہے۔ اب ملک کے اسپتالوں میں بیماروں کے بستروں کی تعداد ۱۱۳۰۰۰ سے ۲۶۱۰۰۰ ہو گئی ہے۔ سارے ملک میں ایسے مرکزوں کی تعداد اس وقت ۵۰۰۰ ہے جو ہمارے کروڑوں دیہی باشندوں کی خدمت کا کام سر انجام دے رہے ہیں۔ کوشش یہ ہے کہ بوقت ضرورت ہر شہری کو اپنے گھر سے معمولی فاصلے پر طبی امداد فراہم ہو سکے اور کوئی بیمار بے علاج پڑا نہ رہنے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک طرف تو شرح اموات میں کمی اور صحت عامہ میں ترقی ہوئی ہے لیکن دوسری طرف آزادی سے پہلے تقسیم شدہ ہندستان کی آبادی جو ۳۴ کروڑ کے لگ بھگ تھی بڑھ کر اندازاً ۵۴ کروڑ ہو چکی ہے۔ آبادی اگر اسی رفتار سے بڑھتی گئی تو اس کا انجام بڑا بھیانک ہوگا۔ لہذا افزائش آبادی کی رفتار کو روکنے کے لیے

[illegible] ۱۹۴۷ [illegible]
[illegible] منصوبوں اور [illegible] کے نتیجوں کی بدولت اب [illegible] ۳۲۰ فی ہزار ہو گئی ہے۔ لیکن [illegible] ہزار [illegible] ہے۔

ہمارے ہاں خاندانی منصوبہ بندی مراکز کی تعداد اس وقت ۲۸۰۰۰ ہو چکی ہے اور امید ہے کہ پانچ سال اور گزر جانے سے پہلے ان کی تعداد ۱۰۰۰۰ تک پہنچ جائے گی۔

بہت سے امراض ایسے ہیں کہ اگر پینے کو صاف پانی دستیاب ہو اور حفظانِ صحت کے قوانین سے واقفیت ہو جائے تو ان سے لوگ بڑی حد تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہماری سرکار نے شہری واٹر سپلائی اور حفظانِ صحت کے پروگرام ۱۹۵۴ء میں شروع کیے۔ چوتھے پنج سالہ منصوبے کے شروع ہونے تک دس لاکھ پینے کے کنویں اور تین لاکھ سے زائد ہینڈ پمپ لگائے جا چکے ہیں۔

تعلیم

قومی ترقی کے لیے تعلیمی ترقی بہت ضروری ہے۔ آزادی سے پہلے ہمارے دیہات ناخواندہ لوگوں کی بستیاں کہلاتے تھے جب کہ ہماری کل آبادی کا ۸۰ فیصد دیہات ہی میں رہتا ہے۔

انگریزوں نے جب ہندوستانیوں کو تعلیم دینا شروع کی تو انھوں نے دیہات اور نچلے طبقے کے لوگوں کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔ تعلیم شہروں کے اونچے درجے اور امیر لوگوں کے بچوں کا حق اور مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ [illegible] تعلیم دینے سے تو پوری طرح احتراز کیا گیا تھا۔ یہ حالت تقریباً آزادی [illegible] تک قائم رہی۔ لیکن ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو جب ہمارا ملک [illegible] آئین نافذ ہوا تو [illegible] ہر بالغ شہری کو ووٹ [illegible] اس میں [illegible] کیا گیا کہ [illegible] سال تک کی عمر کے بچوں کو مفت اور لازمی [illegible] ۱۹۷۶ء تک [illegible] سال [illegible] تعلیم [illegible] ہمارے اسکولوں میں [illegible] تعلیم حاصل [illegible] لاکھ

[illegible] ۱۹۶۶ء میں ان کی تعداد پانچ کروڑ [illegible] لاکھ ہو گئی۔ [illegible] ہائی اسکولوں میں طلبا کی تعداد اب [illegible] لاکھ کے لگ بھگ [illegible] لاکھ ہے۔ اور ہائر سیکنڈری میں طلبا کی تعداد ۱۹۵۰ء میں دس لاکھ سے کم تھی مگر اب چھیاسٹھ لاکھ ہو گئی ہے۔ ۱۹۵۰ء تک ہمارے کالجوں میں طلبا کی تعداد صرف تین لاکھ تھی مگر اب اس سے پانچ گنا زیادہ ہے یعنی ایک کروڑ [illegible]۔

ان سب سے زیادہ شاندار نتائج تکنیکی تعلیم میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اقتصادی ترقی کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ اس ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمارا ملک آج تک ڈھائی لاکھ [illegible] انجینئر اور ڈپلوما ہولڈر پیدا کر چکا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارے یہاں صرف ۳۸ انجینئرنگ کالج تھے جن میں ۳۰۰۰ طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن ۱۹۶۸ء تک انجینئرنگ کالجوں کی تعداد ۱۳۸ ہو گئی اور ان میں ۲۲۰۰۰ طلبا زیرِ تعلیم تھے۔ اسی طرح پالی ٹیکنک اسکولوں کی تعداد ۲۸۴ ہو گئی جن میں ۷۲۰۰۰ طلبا تربیت حاصل کرتے ہیں۔ انجینئرنگ اداروں کی اس شاندار ترقی کے فیض سے ہماری صنعت و حرفت میں زبردست ترقی ہوئی ہے۔ اس وقت ہمارے کارخانوں کی بنی ہوئی چیزوں کی بیرونی ممالک کی منڈیوں میں کافی مانگ پیدا ہو رہی ہے۔

اچھے تعلیمی اداروں کے دروازے ہمارے نام نہاد اچھوت قبیلے کے لیے صدیوں سے مسدود چلے آتے تھے۔ لیکن ہمارے دستور نے چھوت چھات کو ملک بدر کر دیا ہے اور پس ماندہ طبقے کے دوسرے لوگ بھی شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو چکے ہیں۔ قومی زندگی کا ایک نیا [illegible] حصہ [illegible] سرفراز ہو چکا ہے۔

چوتھے اور پانچویں منصوبوں کی تکمیل کے لیے ہمیں [illegible] کے تربیت یافتہ کارکنوں کی بڑی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مناسب سہولتیں اور ضروری وسائل پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہریجنوں اور دیگر پس ماندہ قوموں کے بچوں کے لیے خصوصیت سے [illegible] تعلیم مفت دی جا رہی ہے۔ نیز انھیں بہت سی [illegible] وظائف دیے جا رہے ہیں [illegible] طلبا کے لیے وظیفے ان کی [illegible] ہیں اور [illegible]

اچھی خوراک کا بندوبست بھی کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں دیہات میں پرائمری سکولوں کی تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے نیشنل کونسل برائے ایجوکیشن قائم کر دی گئی ہے جس کا فرض منصبی حکومت کو تعلیم کے ضمن میں ضروری اور کارآمد مشورے دینا ہے۔

اقتصادی ترقی صنعتی اور زرعی ترقی کے بغیر ناممکن ہے۔ اس وقت ہماری فیکٹریوں میں ...... ۵ مزدور کام کر رہے ہیں۔ مزدوروں کی اتنی بڑی فوج کو اپنے حالات سے مطمئن رکھنا اشد ضروری ہے۔ سب سے پہلا اور اہم سوال شرح مزدوری ہے۔ اس کے لیے گورنمنٹ نے مختلف صنعتوں کے واسطے الگ الگ اجرت (ویج) بورڈ قائم کیے ہوئے ہیں جن کے مشوروں پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

امپلائیز اسٹیٹ انشورنس اسکیم ۱۹۴۸ء میں شروع کی گئی اور فروری ۱۹۷۰ء تک ۳۷،۰۸ لاکھ مزدوروں کا بیمہ اس اسکیم کے ذریعے ۳۱۴ سینٹروں میں کیا گیا۔ مزدور عورتوں کو ایام زچگی میں زرِ امداد دیا جاتا ہے۔ مزدوروں کے اہل و عیال اور بچوں کی فلاح و بہبود کا ہر طرح خیال رکھا جاتا ہے۔

مزدوروں کو ٹریڈ یونین بنانے کی مکمل آزادی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ہمارے یہاں ۱۴۲۵۱ ٹریڈ یونینیں تھیں اور ان یونینوں کے ممبروں کی تعداد ۲۲۳۱۵۴۸ ہو چکی تھی۔

اسی طرح زرعی مزدوروں کے مفاد کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ۱۹۵۱ء، ۵۴-۱۹۵۲ اور ۶۵-۱۹۶۴ء میں نیشنل سیمپل سروے کی وساطت سے زرعی مزدوروں کے حالات کی تحقیقات کی گئی اور اس کی روشنی میں ان کی آمدنی، خرچ اور قرضوں وغیرہ سے متعلق معلومات حاصل کی گئیں۔ ایک نئے قانون کے تحت جو ۱۹۴۸ء میں نافذ کیا گیا تھا، کئی صوبوں میں زرعی مزدوروں کی کم سے کم شرح اجرت مقرر کر دی گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ معافیوں، جاگیروں اور زمینداریوں کی تنسیخ بھی کئی صوبوں میں کر دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ...... ۲ زرعی مزدور اس زمین کے مالک بن گئے جس پر وہ کاشت کاری کیا کرتے تھے۔

ہریجنوں اور دیگر پسماندہ اقوام کی حالت نامناسب، اس بات کی متقاضی تھی کہ ان کی ترقی کے لیے خاص وسائل پیدا کیے جائیں۔ اس لیے ہمارے دستور اور پنج سالہ منصوبوں میں اس کام کو [illegible] اہمیت دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۵۰ء تک [illegible] ہیں۔ صوبائی حکومتیں بھی اس پر کافی زر پیدا [illegible]۔ چوتھے پنج سالہ منصوبے میں اس مقصد کے لیے ۳۵ کروڑ کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مزید ۱۴۰ کروڑ روپیہ چوتھے پنج سالہ منصوبے کے خرچ کے طور پر مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ رقم ان پسماندہ اقوام کے بچوں کے تعلیمی وظیفوں اور دیگر فلاحی کاموں پر خرچ ہوگی۔

مرکزی حکومت نے ان لوگوں کے لیے سرکاری ملازمتوں میں [illegible] فی صد کر دی ہے اور ہریجنوں کے ضمن میں یہ شرح ۵ فی صد سے ½ [illegible] فی صد کر دی گئی ہے۔

انسان کی خوشحالی اور بہبودی کے لیے خوراک اور صحت کے علاوہ ایک تیسری اور چیز کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اور وہ ہے رہنے کے لیے مکان۔ دیہات میں ۹۴ فی صد لوگوں کے رہنے کے لیے کچے مکان ہیں اور شہروں میں ۴۶ فی صد۔ لیکن گاؤں میں مکانوں کا کثیر حصہ کچے مکانوں پر مشتمل ہے اور یہ کچے مکان نہایت گھٹیا درجے کے ہوتے ہیں اور یہی حالت اکثر قصبوں اور شہروں میں پائی جاتی ہے۔ چوتھے پنج سالہ منصوبے میں ...... ۸۳۷ رہائشی مکانوں کی کمی کا اندازہ تھا۔ اس لیے صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے اپنے ملازموں کو رہائشی مکان مہیا کرنے پر توجہ کی۔ پاکستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے لوگوں کے لیے مکان بنانے کی مہم کے ساتھ پہلی دفعہ سرکاری ملازموں کے علاوہ دوسروں کے لیے تعمیرات کا پروگرام اپنایا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں ہاؤسنگ کے ایک الگ محکمے کی تشکیل کی گئی جس کے ذریعے [illegible] لوگوں کو مکان بنانے کے لیے آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ [illegible] قصبے اور شہر [illegible] اسکیموں کے ذریعے بسائے گئے ہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سال ۱۹۷۲ [illegible]
[illegible]
تفصیل تنخواہ پانے والے کارخانوں کے مزدوروں
کے لیے رہائشی مکان تعمیر کرنے کے سلسلے میں ۱۹۵۲ء میں ایک
اسکیم تیار کی گئی اس کے مطابق ستمبر ۱۹۶۹ تک ۱۶۷۰۳۲ گھروں
کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ اسی طرح کی ایک اور اسکیم اقتصادی لحاظ سے
مالی طور پر کمزور افراد کے واسطے مکانوں کی تعمیر کے لیے بنائی گئی۔
اس اسکیم کے ذریعے ستمبر ۱۹۶۹ تک ۱۹۴۲۷ مکان تعمیر ہو چکے
ہیں۔ دسمبر ۱۹۶۹ تک مرکزی حکومت نے مکانوں کی تعمیر کے
لیے اپنے ملازموں کو ۹۴ کروڑ روپے کے قرضے دیے ہیں۔

دیہات میں مکان بنانے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ۱۹۵۷
میں ویلیج ہاؤسنگ پروجیکٹ اسکیم کا اجرا ہوا۔ یہ اسکیم
امداد اور خود اعتمادی پر مبنی تھی۔ اس کے مطابق مکان کی تعمیر
کے لیے ۳۰۰۰ روپے یا کل قیمت کا ۸۰ فیصد امدادی قرضہ دیا
جاتا ہے (دونوں میں جو بھی کم ہو)۔ ۱۹۶۹ تک ۹۲۱
روپیہ قرض دیا جا چکا ہے اور ۴۳۴۹۲ گھروں کی تعمیر مکمل
ہو چکی ہے۔

صنعتی بستیوں اور کارخانوں کی تعداد بڑھنے کی وجہ سے جھگی جھونپڑیوں
کا سوال زیادہ اہم شکل اختیار کر رہا ہے اس کے حل کے لیے مئی ۱۹۵۶ء
میں ایک اسکیم بنائی گئی ـــــ اس اسکیم کے مطابق صوبائی
حکومتوں کو مالی امداد دی جاتی ہے تاکہ جھگی جھونپڑیوں کو
منہدم کرنے کے بعد جو لوگ ان میں رہتے تھے ان کے لیے
رہائش کا بندوبست کیا جا سکے۔ اس اسکیم کے تحت صوبائی
حکومتوں کو ..... [illegible] تک ادا کر دیا گیا ہے
اس عرصہ میں اس اسکیم کے مطابق ۷۶۵۸۴ مکان تعمیر کیے
جا چکے ہیں۔ ایسی ہی ایک اسکیم دہلی میں ۱۹۶۰ سے چل رہی ہے۔

[illegible] ہاؤسنگ اور شہری ترقی کو مالی امداد دینے کے مقصد سے
[illegible] کی بنا اپریل ۱۹۷۰ میں رکھی گئی۔ اس غرض سے دو سو
کروڑ [illegible] مخصوص کیا گیا ہے اس سے توقع ہے کہ رہائشی مکانوں
کی تعمیر کے سلسلے میں خاصی مدد ملے گی اور یہ نیا قدم اس مسئلے کو حل کرنے
میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

اب رہا سوال بے روزگاری کا تو آزادی سے پہلے کبھی
کسی نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ ملک بھر میں بے روز
گاری کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے۔ آزادی کے بعد اس
بے روزگاری کے مسئلے کی وسعت پر پوری طرح غور و خوض
کیا گیا۔ مزدوروں کی مردم شماری کی گئی اور وہ صنعتی امور
آب پاشی نیز زراعت وغیرہ میں کس قدر استعداد رکھتے تھے
اس کے جاننے کی کوشش بھی کی گئی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انھیں قومی
تعمیر کے معاملے میں کس کس کام پر لگایا جا سکتا ہے۔

روزگار دفتر (امپلائمنٹ ایکسچینج) اور دوسرے ادارے
جو اس مطلب کے لیے کھولے گئے ہیں، ہر وقت اس بات
کی کوشش میں رہتے ہیں کہ ہر شخص کو اس کی قابلیت کے مطابق
کام مہیا کیا جائے۔ لیکن سب کے لیے بیک وقت کام مہیا
کرنا فوراً آسان نہیں ہے۔ ابھی ہمارے صنعتی زرعی اور
دوسرے اداروں میں کئی طرح کی توسیع عمل میں لانا ہے گاؤں
گاؤں میں بجلی پہنچا دینے کے کام کی ابھی تکمیل کرنا ہے۔ ابھی
بہت سی نئی سڑکیں پل اور نہریں بنانا ہیں۔ ان کاموں کی تکمیل
کے بعد یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بیشتر آبادی کے لیے روزگار
اور کام مہیا ہو سکے گا۔

با ایں ہمہ اس بات کا ہمیں فخر ہے کہ آزادی کے ۲۵ سال
کے اس قلیل عرصے میں ہم نے صنعتی، زراعتی، سائنسی، تعلیمی، میڈیکل
وغیرہ میدانوں میں کافی ترقی کر لی ہے۔ اور امید ہے کہ ملک
اس راہ پر تیزی سے گامزن رہ کر خوشحال اور خود کفیل سوشلسٹ
سماج کے قیام کا نصب العین پورا کرے گا جو اس نے آزادی
کے بعد اپنے لیے متعین کیا تھا اور جس کی تکمیل کے لیے وہ مسلسل کوشاں ہے۔

★

آزادی کے لیے ہستیاں

جھیلنے والوں کے لیے اعزازات

وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری کملاپتی ترپاٹھی نے ۱۵ اگست کو یہاں منعقدہ ایک خصوصی تقریب میں ۲۲۹ مجاہدین آزادی میں سے ۲۱۸ کو تامر پتر پیش کیے گئے۔ اس تقریب میں ۱۰۳ مجاہدین آزادی کو مرکزی حکومت کی جانب سے اور ۱۰۵ کو ریاستی حکومت کی جانب سے تامر پتر پیش کیے گئے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے حسب ذیل ۱۰۳ مجاہدین آزادی کو تامر پتر پیش کیے گئے۔

علی گڑھ: سروشری ستیہ [illegible] کشور اور تلسی رام۔ الموڑہ: سروشری دیا دھر پانڈے اور [illegible] پانڈے۔ آگرہ: سروشری [illegible] چند [illegible] اور شیو سنگھ۔ اعظم گڑھ: سروشری کیلاش ناتھ لال، سنتوش آنند عرف گھونا سنگھ اور [illegible] رام [illegible]۔ اناؤ: سروشری شیو داس پانڈے عرف کیشو دیو پرشاد اور سوکھے لال [illegible]۔ الہ آباد: سروشری ہر چرن لال مصرا اور دیوی پرشاد بھٹناگر۔ اتر کاشی: شری [illegible] سنگھ کشیپ۔ اناؤ: سروشری رام دت اوستھی، رگھو نندن اور رام آدھار مسرا۔ ایٹہ: شری گوند [illegible] سنگھ۔ کانپور: سروشری حمید خاں، اقبال، کرشن [illegible] اور چھیل بہاری۔ غازی پور: سروشری بینی مادھو رائے، [illegible] روپ [illegible] اندر دیو سنگھ، رام سروپ اپادھیائے، شنکر میاں رائے اور [illegible] عرف [illegible] پانڈے۔ گونڈہ: سروشری [illegible] پرشاد، [illegible] اور [illegible] لال [illegible]۔ گورکھپور: سروشری گنیش [illegible]۔ چمولی: سروشری باگھ سنگھ راوت [illegible]۔ جالون: سروشری [illegible] دیال۔ جھانسی: [illegible] سنگھ [illegible] پرشاد [illegible] لال اور رام گوپال شاستری۔ [illegible] سروشری [illegible] سنگھ۔ دہرادون: سروشری [illegible]۔ نینی تال: شری [illegible] سنگھ [illegible] دیوی [illegible]۔

[illegible]

پرتاپ گڑھ: سروشری [illegible]۔ فتح پور: سروشری دیا شنکر مصرا اور [illegible] ناتھ [illegible]۔ فرخ آباد: سروشری دیوی سہائے اور [illegible]۔ سروشری [illegible] ناتھ اور [illegible]۔ سروشری تارا چند اور موہن لال۔ بریلی: سروشری [illegible] گپتا اور [illegible] ناتھ گپتا۔ بلیا: سروشری رامیشور [illegible]۔ بستی: سروشری [illegible] پرشاد اور [illegible]۔ بہرائچ: سروشری [illegible] ترپاٹھی اور [illegible] ناتھ۔ باندہ: شری گوبردھن [illegible]۔ بارہ بنکی: سروشری [illegible] شکلا اور [illegible] لال۔ بجنور: سروشری [illegible] سنگھ اور [illegible] پرشاد پاٹھک۔ بلند شہر: شری [illegible]۔ متھرا: سروشری راج پال سنگھ اور [illegible]۔ شری [illegible] سنگھ [illegible] شریمتی شیو دیوی اور شری [illegible] چند۔ مراد آباد: سروشری [illegible] شیام اور [illegible] داس [illegible] چودھری [illegible]۔ رام پور: شری [illegible] سنگھ۔ رائے بریلی: سروشری شیو [illegible] سنگھ اور [illegible] شنکر۔ لکھنؤ: شری گنیش [illegible] اوستھی۔ وارانسی: شری [illegible] سنگھ۔ شاہجہاں پور: [illegible]۔ سہارنپور: سروشری [illegible]۔ سیتاپور: سروشری [illegible]۔ سلطان پور: [illegible]۔ ہمیر پور: سروشری [illegible]۔

اس کے علاوہ ریاستی حکومت کی طرف سے [illegible] تامر پتر پیش کیے جانے والے [illegible] مجاہدین آزادی کے نام حسب ذیل ہیں:

[illegible]

دگرہ کھیرو (بجنور): شری ادیا پرشاد سنگھ اور ادھیا پرشاد (مونیو)۔ شری مکند دت (گڑھوال)۔ شری جگدیش سنگھ (بلیا)۔ شری بشیشر سنگھ (بستی)۔ شری چندر بھوشن سنگھ (باندہ)۔ شری بہاری پرشاد (بلند شہر)۔ شری بسنت لال (مرزا پور)۔ سوشری پھول سنگھ اور بچیال سنگھ تیاگی (میرٹھ)۔ شریمتی پریم کلا دیوی (گونڈہ)۔ شری گورھاری سنگھ (رامپور)۔ شری رادھا کرشن (لکھنؤ)۔ مسٹر شری ستیا پن سنگھ۔ پنڈت شری پاٹھک اور گوری شنکر مسرا (وارانسی)۔ شری رام لال (شاہ جہاں پور)۔ شری رگھونندن شرما (بہرائچ)۔

ریاستی حکومت کی طرف سے جن ۹۵ مجاہدین آزادی کو تامرتر دیے گئے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:

علی گڑھ: سوشری دیکی نندن پال سنگھ اور پرشادی سنگھ۔ المورڑہ: شریمتی بھگوتی اور گرش چند۔ درپانی۔ آگرہ: سوشری رام سرن اور جے پرشاد اور رام سنگھ۔ اعظم گڑھ: سوشری ترلوک سنگھ شرما۔ رام چندر اور جگناتھ رائے۔ پاٹھی شری رام اور سیتا رام سنگھ۔ اناوہ: سوشری دین دیال راجپوت۔ رستم اور مرلی دھر دیکھیے۔ الہ آباد: سوشری رام کشور۔ رام لال گپتا۔ لکھپت رائے اور شری کلاوتی مصرا۔ اناؤ: سوشری نکھو سنگھ۔ شیو پال۔ وشو ناتھ سنگھ۔ برج ناتھ اور چھیدا لال۔ اٹاوہ: سوشری متی رام۔ بدن سنگھ۔ لال جی اور رام چندر۔ فاضی پور: سوشری ہری شنکر سنگھ۔ جیسیکر رائے۔ ساما بلشی۔ رام شنکر اور جیا سدا سنگھ۔ گونڈہ: شری جگدمبکا پرشاد۔ گورکھپور: شری رام سیوک گوار۔ جونپور: سوشری سالک رام گپتا۔ گنگا دین۔ شیو جسی اور شیتلا پرشاد۔ جالون: سوشری گنگا دین اور سکھ رام تیواری۔ جھانسی: سوشری بھاؤ سنگھ۔ ہری پرشاد اور گلاب چند۔ دیوریا: شری مت موہن موف پورن ماسی مہو۔ دہلی: سوشری بھیم سین بھاٹیا اور دیش پال بھاٹیا۔ نینی تال: شری ملیا دھر شرما۔ جہانگیر گڑھ: شری گنگا دت شرما۔ پیلی بھیت: شری نند رام۔ بریلی: گڑھوال دسشری نکی رام۔ پرتاپ گڑھ: سوشری جگن ناتھ سیٹھ اور شیو بہادر سنگھ۔ فتح پور: شری گنگا ناتھ پانڈے۔ فرخ آباد: شری رام شیو دیال

فیض آباد: سوشری رام بگیا اور رام پانڈے۔ بریلی: سوشری امراؤ سنگھ اور وشو ناتھ شرما۔ بیلی۔ بلیا: شری پادری بلیا۔ شری بھگوت پانڈے۔ بہرائچ: سوشری سیتا رام۔ بستی: جے پرشاد اور بھگوتی پرشاد۔ باندہ: شریمتی کملا دیوی۔ بجنور: سوشری لال سنگھ اور رام سرن داس۔ بلند شہر: سوشری گنیش رام بھتوا۔ شری ہیت رام۔ مرزا پور: سوشری بیج سنگھ۔ کرشنا پرشاد۔ رام سنگھا۔ جے نارائن مظہر۔ دیاس جی آباد: مہابیر رام ابھاگ شرما اور شریمتی نیہ کور۔ مظفر نگر: شری تین سنگھ۔ مراد آباد: شری بھرت سنگھ اور شریمتی بھگوتی۔ میرٹھ: سوشری جیا سنگھ۔ ججن کشور شرما۔ سلامند تیاگی اور منشی لال شرما۔ مین پوری: شری کرتار سنگھ۔ رامپور: شری کاشی رام۔ لکھنؤ: شریمتی چندرا پادھیائے۔ شری آتما رام پانڈے۔ سہارنپور: شریمتی آنارکلی اور شری کشوری لال اگروال۔ شاہجہاں پور: شری فخر الدین۔ سیتا پور: سوشری سری پال سنگھ اور جنگ بہادر پرشاد۔ سلطان پور: شری ایشور دت پاٹھک۔ ہردوئی: سوشری کرن سنگھ اور متھو لال۔

ریاستی حکومت کی طرف سے تامرتر پانے والے ان ۲۹ مجاہدین آزادی کے نام حسب ذیل ہیں جو اس موقع پر نہ پہنچ سکے۔

شریمتی سرسوتی دیوی (اناؤ)۔ شری کنہیا لال۔ شری ستیہ نارائن۔ شری کالی چرن۔ شری موہن لال اور سکھی کانکا۔ شری رام دھار تیاگی (کانپور)۔ شری پرم ہنس رائے (غازی پور)۔ شری سوامی ناتھ (گونڈہ)۔ شری سروپ سنگھ (جالون)۔ شری شنکر دت دھیانی۔ شری اندر سنگھ۔ شری بھیو دت اونیال۔ شری گڑھوال۔ شری رنجیت سنگھ (پوڑی گڑھوال)۔ شری بچو لال۔ شری گیا (فرخ آباد)۔ شری بہاری پرشاد اپادھیائے (فیض آباد)۔ شری حسین پانڈے (بلیا)۔ شری عبدالرحمٰن (بستی)۔ شری سیوک رام۔ شری ٹھکو لال (باندہ)۔ شری چھیپی مالویہ۔ شری پالس راج۔ شری بھگوت سنگھ۔ شری بیجناتھ سنگھ۔ شری ادیا پرشاد (مرزا پور)۔ شری بابو رام (میرٹھ)۔ شری ستیا دت او جھا (وارانسی)۔ شری مہیش لال (سہارنپور)۔ شکنتلا دیوی تکھیا (ہمیر پور)۔

★

ہندستان کی آزادی کی پچیسویں سالگرہ

قاسم صہبا جمیلی

آج پندرہ اگست کو ہم ملک کی آزادی کی پچیسویں سال گرہ منا رہے ہیں۔ عمر کا پچیسواں سال بہت ہی اہم ہوتا ہے جس میں طفلی بہت دور پیچھے رہ جاتی ہے مگر دور سے جوانی کی امنگوں، حوصلوں اور بہاروں کو دیکھتی ہے۔ ایک بچہ جوان ہو کر زندگی کی تلخیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا ہے اور زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح آج ہمارا دیش ترقی کی اس منزل میں ہے جس میں داخل ہونے کے بعد ایک ملک خود کفیل کہلاتا ہے۔ ہندستان آج خود کفیل ہے۔ ترقی کی شاہراہیں اس قول کی نشان دہی کر رہی ہیں ——— صدیوں پرانا فن زراعت آج بالکل بدل چکا ہے۔ ہندستان کا کاشتکار نئی نئی تکنیک استعمال کر رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ "سبز انقلاب" (GREEN REVOLUTION) اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہم اپنی آنکھیں ان فرٹیلائزر کارخانوں کی غیر معمولی ترقیوں کی طرف سے نہیں بند کر سکتے "جو سبز انقلاب" کی عناصر اور ذمے دار ہیں جیسے بہار میں سندری، پنجاب میں ننگل، تامل میں نے ولی، اڑیسہ میں رورکیلا، مغربی بنگال میں درگاپور، مدھیہ پردیش میں کوربا، آسام میں نامروپ، یوپی میں گورکھپور، کیرالا میں کوچین اور گجرات میں کنڈلا۔ چار دیوناد اسٹیل کارخانے راورکیلا، بھلائی، درگاپور، اور بوکارو میں قائم کیے گئے ہیں۔ بمبئی میں تاراپور، راجستھان میں رام پرتاپ ساگر، تامل میں کال پکم مشہور و معروف ایٹمی توانائی گھر ہیں جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے عالمگیر شہرت کے حامل ہیں ——— بمبئی کے نزدیک ٹرامبے میں نیوکلیائی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تشکیل عمل میں آئی جو ایٹمی اور نیوکلیائی سائنس میں ایک نمایاں ترقی کا علمبردار ہے۔ جدھر پور میں ایر فورس فلائنگ کالج، رڑکی میں سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ میں سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بنگلور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اور کانپور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ہمارا آج کا ہندستان کس قدر سائنسی اور ایٹمی ترقی اور ایجادات کے راستے پر آگے جا چکا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمسایہ ملک چین اور پاکستان برابر در پے آزار رہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آزادی ملتے ہی پاکستان نے ۱۹۴۷ء میں حملہ کیا اور کشمیر تک گھستا چلا آیا۔ پھر ۱۹۶۲ء میں چین ہندستان پر حملہ آور ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان نے ہندستان کے خلاف اعلان جنگ کیا ——— ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان نے پھر ہندستان پر جارحانہ حملہ کیا ——— "اہنسا" کی راہ پر چلنے والا ہندستان کبھی بھی اپنے اصولوں سے ہٹا نہیں اور سیکولرازم کی امانت کو سینے سے لگائے اپنے روایتی اصولوں اور آدرشوں کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرتا رہا ——— یہ بات بلا کسی مبالغے کے کہی جا سکتی ہے کہ اگر اس طرح آزاد ہندستان پر دشمنوں کے متواتر حملے نہ ہوتے تو آج ہندستان ترقی کی منزل میں کہیں زیادہ بلندی پر ہوتا۔ دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء میں لڑی گئی اور تاریخ عالم شاہد ہے کہ تباہ شدہ ممالک کو پنپنے میں کافی عرصہ لگا ——— ہندستان پر متواتر جارحانہ حملے ہوتے رہے ان کے بعد بھی آج وہ تر و تازہ ہے، شاداب ہے، جوان ہے اور اس کے حوصلے بلند ہیں ——— پاکستان کے جارحانہ حملے کے جواب میں حال ہی میں جو جنگ لڑی گئی وہ ایک فیصلہ کن جنگ

ـــہ یہ مضمون اگست کے شمارہ کے لیے لکھا گیا تھا۔

بن جا سکتی ہے جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش وجود میں آیا۔ تاریخ عالم میں ہندوستان کی یہ شاندار کامیابی سنہرے حروف میں لکھی جائے گی۔

ہندوستان میں قدرتی اور معاشی وسائل کی کمی کبھی نہیں رہی۔ قدرت نے ہندوستان کو ہر قسم کی نعمتوں سے بہرہ مند کیا ہے۔ یہاں خام اشیا بڑی افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ہم پر ایک غیر ملکی حکومت مسلط تھی جس کے باعث ہم ان نعمتوں سے اپنے دامن کو خالی پا رہے تھے اور یہ نعمتیں قومی دولت نہیں بن رہی تھیں۔ لیکن آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم نے تجارت کی منڈی میں فروغ پایا اور ہم ملک کی ترقی و خوشحالی کی طرف چل پڑے۔ زمینداری جو ایک لعنت تھی آزادی کے فوراً ہی بعد خاتمۂ زمینداری بل پاس کرکے ختم کر دی گئی اور اس طرح ایک "سامنت شاہی نظام حیات" نے دم توڑ دیا۔ آزاد ہندوستان نے "سماج واد" نظام حیات کی بنیاد ڈالی اور اس "نظریۂ حیات" کے ترویج و بقا کے سلسلے میں وہ تمام پرانی روایتیں اور اصول جو اس "تصور حیات" کے منافی تھے ایک ایک کر کے ختم کر دیے گئے۔ تاریخ آپ کو آگے بڑھ کر آواز دے گی کہ "ہندو سماج" میں عورتوں کے سلسلے میں وراثت کا مسئلہ نہ تھا — ایک سے دو بیوی بیک وقت رکھنے پر قانونی پابندی نہ تھی۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے کے افراد سے ازدواجی تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا۔ افلاس، جہالت، بیماری، معاشی نابرابری، قدامت پرستی، ذات پات، اونچ نیچ اور چھوت چھات کا جذبہ ہندوستان کی ملی و قومی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا تھا — ان حالات کے پیش نظر ہندوستانی سماج میں سدھار کی کوششیں کی گئیں۔ عورتوں کو برابری کا حق ملا، ہندوستان کے آئین میں ہندو عورتوں کو طلاق کا حق دیا گیا۔ "ضبط تولید" کے سلسلے میں خاندانی منصوبہ بندی اسکیم چلی تاکہ ملک کی حد سے بڑھتی ہوئی آبادی کو اوسط منزل میں لایا جا سکے — والیان کی کفالت کے لئے "پریوی پرس" (وظیفۂ خاص) مقرر کیا گیا تھا اس کا خاتمہ ہوا۔ بینک کو عوام الناس کی بہتری اور خوشحالی کے واسطے "قومیایا" گیا — اونچ نیچ، چھوت چھات کی لعنت ختم کیا گیا اور ہر ایک کو برابری کا حق ملا —

آج کا ہندوستان ایک ترقی یافتہ ملک ہے جس کی گود میں بڑی بڑی نہریں بجلی پیدا کرنے کے کام آ رہی ہیں۔ دریا آبپاشی کر کے کھیتوں کو لہلہا رہے ہیں، باغات اور جنگلات قومی سرمایہ بن رہے ہیں، چمکتا ہوا سورج، بہت صاف ستھری ہوا، برف، پہاڑ اور ہمیشہ بہنے والے طوفانی پہاڑی چشمے ہندوستان کی عظمت گزشتہ کو واپس لا رہے ہیں جو غیر ملکی دور حکومت میں ماند پڑ گئی تھی اور ہندوستان کھوکھلا ہو گیا تھا۔ مختصر یہ کہ آج سے پچیس سال پہلے آزادی حاصل کرنے کی مہم سر کر لی گئی تھی، مگر سخت ترین مہم اس آزادی کو برقرار رکھنے، ملک کو مستحکم بنانے، سوشلزم کے راستے سے اسے ترقی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچانے کی باقی ہے۔ اس لیے آیئے آج اس مقدس موقع پر ہم عہد کریں کہ اس کے لیے ہم ہر قربانی پیش کرنے کو تیار رہیں گے اور ہم سب مل کر پورے اتحاد کے ساتھ اس کام کو انجام دیں گے — ہم رہیں یا نہ رہیں ہمارا ملک قائم رہے گا، ہماری داستان باقی رہے گی۔

★

> "تشدد کا جواب تشدد سے نہ دینا بلکہ اپنے ہاتھ کو روک کر اور اس کے ساتھ ہی ساتھ (جارح کے) مطالبے (جس کی پشت پر طاقت ہے) کے آگے جھکنے سے انکار کر کے تشدد کو بے اثر بنا دینا ہی دنیا میں آگے بڑھنے کا واحد راستہ ہے۔"
>
> — مہاتما گاندھی

حسنِ نظر

[نیا دور بابت اگست ۱۹۷۲ء (آزادی نمبر) کے بارے میں قارئین نیا دور نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں ——— ایڈیٹر]

ماہ شیر برتاب پگلا ——— پرتاپ گڑھ

گزشتہ کئی برسوں سے رسالوں کے صفحات پر خطوط بازی کی وبا خصوصیت کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے جن میں یا تو اپنے گروہ کے شعراء کی تعریف و توصیف ہوا کرتی ہے یا پھر رسالہ اور مدیر رسالہ کی شان میں قصیدہ خوانی۔ مگر کسی بھی رسالے میں آپ کو میرا کوئی خط نظر نہ آئے گا۔ میں شروع ہی سے تعریف و توصیف کے معاملے میں بے حد احتیاط برتتا رہا ہوں اور "جھوٹ" تو خیر مجھ سے کبھی بولا ہی نہیں گیا۔ اس کے باوجود آپ کا آزادی نمبر دیکھنے کے بعد بے اختیار منہ سے کلمۂ تحسین نکل ہی گیا۔ میرے پاس بہت سے ماہناموں اور ہفت روزہ اخباروں کے آزادی نمبر آئے ہیں لیکن مضامین کی فراہمی پھر ان کی ترتیب و تدوین میں آپ نے جس محنت، لگن، شعور اور سلیقے کا ثبوت دیا ہے وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ اس حسین، خوبصورت اور کارآمد نمبر کی اشاعت پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

[illegible] ——— آرہ بہار

کئی روز [illegible] حصولِ عام ؟ پٹنہ میں نیا دور کے خاص نمبر آزادی نمبر کی شہیر نظر سے گزری۔ نیا دور کے متوقع اور روایتی شان کے حامل اگست نمبر کے لیے منتظر ہی تھا کہ کل ٹھیک یوم آزادی کے روز ہی ڈاکیہ یہ شان دار نمبر دے گیا اور مسرتوں میں اضافہ ہوا۔

پیش نظر شمارہ اپنے تمام محاسن صوری و معنوی کے ساتھ آپ کے حسن [illegible] کا مظہر ہے۔ یوں تو "آج کل" کو مرکز کی سرپرستی حاصل ہے مگر اہل نظر خوب جانتے ہیں کہ نیا دور کا مقام کتنا بلند ہے۔

یہ شمارہ میں بغور دیکھ رہا ہوں اس میں کیا نہیں ہے؟ جیسا کہ آپ کے شگفتہ اداریے سے ظاہر ہے اکثر چیزیں باوجود شامل اشاعت نہ ہو سکیں تاہم معیاری ادب پاروں کی کہکشاں بکھری ہے۔ اسے پڑھ رہا ہوں اور رشک ہو رہا ہے کہ کاش میں بھی اس میں شریک ہوتا

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ——— ناگالینڈ، آسام

آپ نے اگست کا شمارہ فراخی انداز سے نکالا ہے۔ خوب بہت خوب

یوسف اعظمی ——— حیدرآباد

نیا دور نے آزادی کی ۲۵ ویں سال گرہ کے موقع پر قوم کے لیے جو ادبی صفحات نذر کیے ہیں وہ انمٹ نقش چھوڑ جائے گی۔ مضامین، شعری انتخاب اور ترتیب ہر لحاظ سے ایک نمایاں مثال ہے۔ اس طرح ایک سرکاری ماہنامے نے ادبی دنیا میں جو مقام پیدا کیا ہے اور دلوں میں اس کے لیے جو جگہ بن گئی ہے وہ مبارک اور لائق تحسین ہے۔

سیف بجنوری ——— بجنور

آزادی کی پچیسویں سالگرہ پر نیا دور کا اسپیشل نمبر باصرہ نواز ہوا۔ مضامین اور دوسرے تمام معاملات کے لحاظ و اعتبار اور آپ کی خصوصی ترتیب نے تو اور بھی اسے ادب کے معیار پر پہنچا کر قابل مبارک باد بنا دیا ہے۔ اس خاص موقع پر اور اتنے معیاری شمارے میں اپنی عدم شرکت کا افسوس ہے۔

حفیظ فضا ——— حیدرآباد

محترم خورشید بھائی۔ سلام و نیاز

آپ کی ادارت میں ماہ بماہ رسالہ کا معیار نکھرتا جا رہا ہے۔ یہ سب آپ کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے۔

آفاق حسین صدیقی ——— آبھین

گزشتہ چند ماہ سے نیا دور کے صوری و معنوی معیار میں قابلِ قدر اضافہ ہو رہا ہے اور ہر نیا شمارہ گزشتہ سے بہتر ہو کر آ رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کاوش اور محنت قابل مبارک باد ہیں۔

★

اترپردیش

کا ہراول ترقی پر



غلہ کی پیداوار کے لیے جنگی پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ●●● خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لیے اترپردیش کو مرکزی سے مالی امداد ●● قیمتوں کے اضافے کی روک تھام کے سلسلے میں ایڈہاک دستوں کا قیام ●●● مجاہدین آزادی کے لیے تعمیر مکانات کی سہولتیں ●● جوانوں اور ان کے والدین کو نقد انعامات ●●● سینئر بیسک اسکولوں کی امداد کے قواعد میں ترمیم ●●● بیسک تعلیمی بورڈ کا قیام ●●● بڑی صنعت، سینما گھروں اور انجینئرنگ دا صدوں کے مزدوروں کی اجرتوں میں اضافہ ●●● کسانوں کو دیے جانے والے قرضوں کے قواعد میں ترمیم ●●● زراعتی صنعت کارپوریشن اسٹامپ فیس کی ادائیگی سے مستثنیٰ ●●● اعظم گڑھ میں ہریجنوں کی زراعتی صنعتی بستی کا قیام ●●● اترپردیش ترقی سیاحت کونسل کی تشکیل ●●● چھوٹی (منی) بسوں کے لیے پرمٹوں کا فیاضانہ اجراء ●●● بے گھر افراد کو مکانات کے پلاٹوں پر واقعی قبضہ دلانے کی ہدایت ●●● لکھنؤ میں بچوں کی پرورش گاہ کا قیام ●●● زمین اور پانی کے وسائل کے بہتر استعمال کے لیے دو ضلعوں میں رہبر منصوبے ●●● پسماندہ علاقوں میں آبپاشی کی سہولتیں ●●● یوم آزادی کے موقع پر ۱۱۲ قیدیوں کی سزا معاف ●●● متفرقات

اترپردیش کے وزیر زراعت شری رام لکھن نے محکمہ زراعت کے فیلڈ افسروں کو ہدایت کی ہے کہ بارش میں تاخیر اور اس کی غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے ملک کو زیادہ غلہ پیدا کرنے کا جو چیلنج درپیش ہے وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھرپور کوشش کریں اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی تساہلی نہ برتیں۔ خریف کی پیداوار میں کمی کے امکان کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کمی کی تلافی کرنے کے لیے بڑے پیمانے پر ربیع کی مہم شروع کی جائے اور ۵۰ لاکھ ایکڑ کے کل آبپاشی شدہ رقبہ کو گیہوں کی زیادہ پیداوار دینے والی اقسام کے زیر کاشت لایا جائے۔ اس پروگرام میں سالوں بعد موسم گرما کے دھان کی فاضل پیداوار شامل ہو گی۔

شری رام لکھن کل لکھنؤ میں کرشی بھون میں تمام اضلاع کے زراعت افسران، ڈپٹی ڈائرکٹروں اور پراجکٹ افسروں کے ایک جلسہ میں تقریر کر رہے تھے۔

وزیر موصوف نے بعض سرکاری فارموں کو سخت ناپسند کیا جو نقصان کے ... اگر مستقبل میں یہ فارم نقصان پر چلیں تو انھیں ختم کر دیا جائے۔ وزیر زراعت نے کہا کہ زراعت افسران اور بیسک کارکنوں کو چاہیئے کہ وہ وقت کی ضرورتوں کے مطابق کام کریں اور کسانوں سے قریبی رابطہ رکھیں جن کے فائدے کے لیے محکمہ زراعت کثیر مصارف برداشت کرتا ہے۔

شری رام لکھن نے کہا کہ اگر چھوٹے کسان کو نظر انداز کیا گیا اور صرف مٹھی بھر کاشتکاروں کو "سبز انقلاب" کے میدان میں اتارا گیا تو زراعتی ترقی کی کوئی اسکیم کامیاب نہیں ہو گی۔

وزیر موصوف نے کہا کہ زراعت افسروں کو اپنے علاقوں کی آبپاشی کی ذمہ داری بھی قبول کرنا چاہیئے کیوں کہ پانی کے بغیر زرعی پیداوار میں رکاوٹ پیدا کرنا ناگزیر ہے۔

وزیر ریاست برائے زراعت شری شیام صورت اپادھیائے نے مقامی حالات کے مطابق گاؤں اور بلاک کی سطح پر زراعتی منصوبہ بندی کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ اسکیم غلہ پیدا کرنے کے لیے ہر جگہ اسکیم اور زمین کی صلاحیت پر مبنی ایک حقیقت پسندانہ اسکیم ہونی چاہیئے

نے کہا کہ زراعتی ساز و سامان خصوصاً اور کیمیاوی کھاد کی فراہمی بروقت کی جائے اور انھیں مہیا کرنے کی ذمہ داری محکمہ زراعت کی ہونا چاہیے۔

زراعتی کمشنر شری بی ڈی ساتیال محکمہ زراعت کے اسپیشل سکریٹری شری راجیندر ناتھ آنا اور ڈائرکٹر زراعت شری رام کرشن نے بھی فیصلہ افسروں سے خطاب کیا۔

* * *

مرکزی حکومت نے ریاست میں بڑے پیمانہ پر حالیہ خشک سالی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات پر قابو پانے کے لیے اتر پردیش کو ۳۰ کروڑ روپیہ کی خصوصی امداد منظور کی ہے۔

مرکزی وزیر زراعت شری فخرالدین علی احمد نے اتر پردیش کے وزیر مالیات شری نارائن دت تیواری کو جنھوں نے ان سے کل دہلی میں ملاقات کی تھی یقین دلایا کہ اس مرکزی ٹیم کی سفارشات موصول ہونے پر جس نے اس ہفتہ نقصانات کا اندازہ لگانے کے لیے ریاست کا دورہ کیا تھا اتر پردیش کو مزید امداد دی جائے گی۔

اس خصوصی امداد کو خشک سالی کے خلاف اقدامات خصوصاً چھوٹے پیمانہ پر آبپاشی کی اسکیموں پر عملدرآمد (جن میں ڈیزل پمپنگ سیٹوں کی تنصیب اور ٹیوب ویلوں کی نالیوں کی تعمیر شامل ہے) اور غلہ کی پیداوار میں اضافہ سے متعلق پروگراموں کی رفتار تیز کرنے پر خرچ کرنے کی تجویز ہے۔

دریں اثنا ریاستی حکومت کے سینئر افسروں نے مرکزی حکومت کی ایک ٹیم سے جو لکھنؤ آئی ہوئی تھی ریاست میں خشک سالی اور خریف کی فصل کو پہنچنے والے زبردست نقصان کے پیش نظر مرکزی حکومت کی امداد کے سلسلہ میں تبادلہ خیالات کیا۔ مرکزی ٹیم کی قیادت شری بی۔ پی اگروال مشیر منصوبہ بندی کمیشن اور ریاستی ٹیم کی قیادت چیف سکریٹری شری ایم لال کر رہے تھے۔

مرکزی ٹیم نے اس سے قبل خشک سالی سے متاثر وارانسی۔ مرزا پور۔ الہ آباد۔ پرتاپ گڑھ اور رائے بریلی اضلاع کا دورہ کیا تاکہ وہاں نقصان کا اندازہ لگایا جاسکے۔

ریاستی حکومت نے ۱۱۹۰۲۷ کروڑ روپیہ کی مرکزی امداد کی درخواست کی ہے جس میں ۱۷۰۵ ۶۲۸ کروڑ روپیہ زراعت ۲۰۱۱۵ کروڑ روپیہ

آبپاشی ۱۱ کروڑ روپیہ خشک سالی کے لیے [illegible] روپیہ ٹیوب ویل اور پمپنگ سیٹ نصب کرنے اور تعمیر کیلئے فراہم کرنے کے لیے ہے۔ باقی ۸۰۰ کروڑ روپیہ کی رقم پینے کے پانی کے کنوؤں کی تعمیر چھوٹے پیمانہ پر آبپاشی، سڑکوں اور صحت سے متعلق اقدامات کے لیے مانگی گئی ہے۔

* * *

حکومت اتر پردیش نے قیمتوں میں اضافہ پر نظر رکھنے اور منافع خوروں اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف فوری طور پر سخت کارروائی کرنے کے مقصد کے پیش نظر ہدایات جاری کی ہیں کہ ہر ضلع میں قیمتوں سے متعلق شعبہ اور الرٹ دستے قائم کیے جائیں۔

یہ بندوبست ان اقدامات کا ایک جزو ہے جو حکومت نے بارش میں تاخیر کے نتیجہ میں غذائی اجناس اور ضروری اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کی روک تھام کے لیے کیے ہیں۔

قیمتوں سے متعلق شعبہ غلہ۔ دالوں۔ شکر۔ نمک۔ بناسپتی، مونگ پھلی کے تیل اور دیگر ضروری اشیاء کی یومیہ تھوک قیمتوں کے بارے میں معلومات جمع کرے گا اور ان کی قلت یا قیمتوں میں اضافہ پر نظر رکھے گا۔ ضلع کی سطح کی قیمتوں کا شعبہ حکومت کو روزانہ رپورٹ پیش کرے گا تاکہ حکومت صارفین کے مفاد میں ضروری اقدامات کر سکے۔

الرٹ دستہ سے امید کی جاتی ہے کہ ناجائز منافع حاصل کرنے والوں اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف موثر کارروائی کرے گا۔

صارفین کو مقررہ قیمتوں پر غلہ۔ شکر۔ مٹی کا تیل اور دیگر ضروری اشیاء فراہم کرنے کے لیے نظام تقسیم میں بھی اصلاحات کی گئی ہیں۔

* * *

زمین کے حصول اور ترقی سے متعلق اسکیم کے تحت ترقی دیتے ہوئے پانچ فیصد قطعات آراضی اور ایسے مکانات جو کم اور متوسط آمدنی والے طبقوں کے لیے "نہ نفع اور نہ نقصان" کی بنیاد پر براہ راست یا قسطوں پر فروخت کے لیے تعمیر کیے گئے ہیں اب اتر پردیش کے ایسے مجاہدین آزادی یا ان کے زیر کفالت افراد کو الاٹ کرنے کے لیے مختص کر دیئے جائیں گے جن کے پاس ریاست میں کہیں بھی اپنا ذاتی مکان نہیں ہے۔

ریاستی حکومت نے ایک گشتی مراسلہ میں ہدایت کی ہے [illegible]

[illegible] اپنے اختیارات میں حکومت کے اس فیصلے سے [illegible] سے فائدہ اٹھانے کی تعلیم کر دیں۔

* * *

ریاستی حکومت نے ایسے والدین کو بھی پانچ سال تک فی ۱۰۰ روپیہ سالانہ کی رقم دینے کا فیصلہ کیا ہے جن کی اولاد میں ایک ہی اکلوتا بیٹا ہو اور اس اکلوتے بیٹے نے فوج کی ملازمت اختیار کر لی ہو۔

یہ نقد انعام ایسے والدین کو جن کے تین یا تین سے زیادہ بچوں نے ایسی عورتوں کو جن کے شوہر اور دو بچوں نے نیز ایسے والدین کو جن کے دو بچے نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ہنگامی حالات کا اعلان ہونے کے بعد سے فوج کی ملازمت اختیار کر لی ہو پہلے سے ہی دستیاب ہے۔ گزشتہ ہند پاک جنگ سے لے کر اب تک تقریباً ... افراد اس سہولت سے مستفید ہو چکے ہیں۔

* * *

ریاستی حکومت نے ویر چکر کا اعزاز پانے والے سیکنڈ لیفٹیننٹ منو ہر جگموہن ہرن نئی دہلی، سیکنڈ لیفٹیننٹ چندر پال۔ علی گڑھ اور لانس نائیک ہربنس سنگھ رام گھوش۔ الہ آباد کو تین تین ہزار روپیہ کا نقد انعام دیا ہے۔ ان سورماؤں نے ہند پاک جنگ کے دوران غیر معمولی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا۔

* * *

ریاستی حکومت نے غیر امداد یافتہ منظور شدہ تسلیم شدہ سینئر بیسک اسکول کو امداد حاصل کرنے والے تعلیمی اداروں کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے ضوابط اور قواعد میں جزوی طور پر ترمیم کی ہے۔

ان قواعد کے تحت اسکولوں کو جو نیر ہائی اسکول کے امتحان کے نتیجہ کی تقابلی بنیاد پر امدادی فہرست میں شامل کرنے میں اولیت دی جائے گی۔ ان اسکولوں کو امدادی فہرست میں پہلے شامل کیا جائے گا جن کا جونیر ہائی اسکول امتحان کا نتیجہ کم سے کم ۵۰ فیصد ہو گا۔ جونیر ہائی اسکول کی سطح پر پہلی بار امتحان لینے والے اسکولوں کو بعد میں امدادی فہرست میں شامل کیا جائے گا۔

پہاڑی علاقوں کے جو نیر ہائی اسکولوں کا کم سے کم نتیجہ ۴۰ فیصد [illegible] ہونا چاہیے اور اسی صورت میں وہ مالی امداد کے مستحق

[illegible] جائیں گے۔

* * *

ریاستی حکومت نے ۱۰ رکنی بیسک تعلیمی بورڈ کی تشکیل کی ہے۔ بہ اعتبار عہدہ ممبروں کے علاوہ بورڈ کے دیگر ممبروں کی مدت تین سال ہو گی۔ بیسک تعلیم کے ڈائرکٹر بورڈ کے چیرمین ہیں۔

بورڈ کے دیگر ممبران یہ ہیں۔ شری جاگیشور پرشاد منسپل کارپوریشن کانپور، شری لکشمن پرشاد سنگھل۔ صدر ضلع پریشد بورڈ۔ بریلی، شریمتی ایس پی سکھیا پرنسپل ڈی ایس ٹریننگ کالج دیال باغ آگرہ اور شری بلونت سنگھ سابق ڈائرکٹر تعلیم اترپردیش۔

حکومت اترپردیش کے مالیات سکریٹری، پرنسپل اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن الہ آباد اور ابتدائی تعلیم کے ڈپٹی ڈائرکٹر بورڈ کے بہ اعتبار عہدہ ممبران ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے ڈپٹی ڈائرکٹر بورڈ کے ممبر سکریٹری ہیں۔

بیسک تعلیم کے ڈائرکٹر کا کیمپ آفس ہیڈ کوارٹر ۱۰ دوسس تلک مارگ رسٹل روڈ) لکھنؤ میں کھول دیا گیا ہے۔

* * *

حکومت اترپردیش نے بیڑی کی صنعت کے ۲۰۵ لاکھ سے زیادہ مزدوروں کی اجرتوں میں فوری طور پر اضافہ کر دیا ہے۔ ایسے سینما گھروں اور انجینیرنگ وا حدوں کے ملازمین کی اجرتوں میں بھی پہلی بار اضافہ کیا گیا ہے جہاں پچاس سے کم افراد کام کر رہے ہوں۔ اگر کسی واحدہ میں اجرت کی مروجہ شرح میں حکومت کی اعلان شدہ شرحوں سے زیادہ ہیں تو وہاں مزدوروں کو بدستور زیادہ اجرتیں ملتی رہیں گی۔

بیڑی صنعت سینما گھروں اور انجینیرنگ وا حدوں کے ملازمین کو اپنی کم سے کم اجرت میں ۲۵ فیصد کا اضافہ ملے گا۔ اس سلسلہ میں سرکاری احکام جاری کر دیے گئے ہیں۔

اعلانیہ کے مطابق بیڑی صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کی کم سے کم اجرت کی موجودہ شرح ۲۱۶۰ روپیہ فی ہزار بیڑی سے

بڑھا کر ۲۰۵ / ۲۰ روپیہ فی مزدور بیڑی کو ملا کر اسی طرح صنعت
کے دیگر زمروں کے ملازمین کی کم سے کم اجرتوں میں بھی اضافہ
کیا گیا ہے۔

کماؤں ڈویژن پہاڑی علاقوں اور بریلی، گورکھپور اور
میرٹھ میں سنیما گھروں کے ملازمین کو اب کم سے کم ۱۰۰ روپیہ ماہانہ
کی اجرت ملے گی اور دیگر مقامات کے سنیما گھروں کے ملازمین
کو ۹۰ روپیہ ماہانہ ملے گا۔

حکومت نے ایسے انجینئرنگ واحدوں اور اداروں کے
معاملہ میں جن میں پچاس سے کم ملازمین کام کر رہے ہیں ایک غیر
ہنرمند مزدور کے لیے کم سے کم ماہانہ اجرت ۱۱۰ روپیہ، ایک نیم
ہنرمند مزدور کے لیے ۱۲۰ روپیہ اور ایک ہنرمند مزدور کے لیے
۱۴۰ روپیہ ماہانہ مقرر کی ہے۔

ریاستی حکومت نے چھوٹے اور بڑے پیمانے کے ایسے صنعتی
واحدوں دوکانوں کاروباری اداروں اور ٹرانسپورٹ کمپنیوں
کے لیے جو فیکٹریز ایکٹ کے تحت ہوں اور جن میں دس سے
زیادہ افراد کام کر رہے ہوں مستقل احکام نافذ کر دیے ہیں۔

ریاستی حکومت سوتی اور اونی ملوں اور جوٹ اور ریان کی ملوں میں
عوضی پر کام کرنے والے مزدوروں کی مستقلی اور بیکاری بھتّہ
کے لیے بھی احکام جاری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جس سے عوضی
پر کام کرنے والے تقریباً ..... مزدور مستفید ہوں گے۔

* * * *

وزیر ریاست برائے امداد باہمی شری گوپی ناتھ دیکشت
نے بتایا کہ امداد باہمی ترقی آراضی بینک کی طرف سے اس
سال بڑے پیمانے پر آبپاشی کے آلات کے لیے کسانوں کو ۲۴ کروڑ
روپیہ کے قرضے تقسیم کیے جا رہے ہیں جو اب تک تقسیم شدہ
رقموں میں سب سے بڑی رقم ہے۔ اس رقم میں سے ۲۰ کروڑ روپیہ
صرف پمپنگ سیٹ لگانے کے لیے دیے جائیں گے۔

شری دیکشت نے کہا کہ اس مقصد کے پیش نظر کہ کسان قرض
کے ایک ایک پیسہ کا پورا فائدہ اٹھا سکیں اور اپنی پسند کے آبپاشی
[illegible] کی ہے۔ حکومت نے [illegible]
بینک آبپاشی کے آلات فروخت کرنے والوں کے نام چیک
جاری کرنے کے موجودہ طریقہ کار کو ختم کر کے کسانوں کو براہ راست
قرضہ کی رقم ادا کرے۔

وزیر امداد باہمی نے کہا کہ اس طرح کا فیصلہ کرنے کی وجہ
یہ ہے کہ یہ شکایتیں موصول ہو چکی ہیں کہ آبپاشی کے آلات فروخت
کرنے والے کسانوں سے بازار کی مروجہ قیمتوں سے بہت زیادہ
قیمت وصول کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو زیادہ قیمت کی یہ رقم ایک
ہزار روپیہ سے لے کر ڈیڑھ ہزار روپیہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس
کے علاوہ یہ شکایتیں بھی موصول ہوئی ہیں کہ ان کے فراہم
کردہ آلات اعلیٰ درجہ کے نہیں ہوتے ہیں۔

وزیر امداد باہمی نے کہا کہ کسانوں کو اپنی جوتوں کے لیے
مشینیں، پمپنگ سیٹ صحیح قیمت پر فراہم کرنے کے لیے ان کی تقسیم
کا انتظام ریاستی امداد باہمی فیڈریشن کے ذریعہ کیا جا رہا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ریاستی امداد باہمی فیڈریشن آبپاشی کے
آلات کی فروخت کے بعد بھی ان کی دیکھ بھال کے لیے خصوصی سروس
کا بندوبست کر رہا ہے۔

شری دیکشت نے کہا کہ کسانوں کو بینک سے جلد قرضے دلانے
کے لیے بھی اقدامات کیے گئے ہیں۔ ترقی آراضی بینک کی شاخوں کو حکم
دیا گیا ہے کہ وہ قرضوں کی منظوری کے لیے ہر ماہ جلسے منعقد کرنے
کے بجائے ہر ہفتہ کے منعقد کریں اور قرضوں کے چلانے کے معاملات
کو بھی مکمل کر کے جلد سے جلد نپٹائیں۔

* * * *

ریاستی حکومت نے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ریاستی حکومت نے چھوٹی صنعتوں یا خود روزگار فراہم کرنے کی اسکیم کے تحت چھوٹی صنعت کاروں کو ریاستی زرعی صنعت کارپوریشن کے توسط سے قرضے دیتی ہے۔

ریاستی حکومت ساڑھے پانچ فیصد کی شرح سے سود وصول کرتی ہے جبکہ زرعی صنعت کارپوریشن ان صنعت کاروں سے ۶ فیصد کی شرح سے سود لیتا ہے۔ اس طرح کارپوریشن کو سود میں اپنے حصے کے طور پر صرف نصف فیصد ملتا ہے جو وہ قرضوں کی تقسیم، ریکارڈ رکھنے اور قرضوں کی وصولیابی وغیرہ پر خرچ کرتا ہے۔ چنانچہ کارپوریشن نے اسٹامپ فیس کی ادائیگی سے استثنا کی درخواست کی تھی۔

* * *

ضلع اعظم گڑھ میں ہریجنوں اور بے زمین مزدوروں کو رہائشی سہولتیں اور روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے مستقبل قریب میں ایک زرعی صنعتی بستی کے قیام کی تجویز ہے۔

آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے سلسلے میں سماج کے کمزور طبقوں کے لیے یہ بستی بطور تحفہ پیش کی جائے گی جو ۱۷ لاکھ روپیہ کے ابتدائی اخراجات سے قائم کی جائے گی۔ اس بستی میں صنعتی اور زرعی زمرہ میں ۱۰۰ خاندانوں کو روزگار فراہم کرنے اور رہائش کی سہولتیں مہیا کرنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ یہ اسکیم مرکزی حکومت کی طرف سے چلائی جا رہی ہے۔

اس بستی میں آباد ہونے والوں میں سے جو شخص زراعت کا پیشہ اختیار کرے گا اسے بستی کے اندر زمین سے چار ایکڑ تک زمین اور کاشت شروع کرنے کے لیے ضروری مالی اور مادی امداد بھی دی جائے گی۔ گھریلو صنعتیں قائم کرنے کے خواہشمند افراد کو مشینیں، کاروباری سرمایہ اور خام مال فراہم کیا جائے گا۔

ضلع کی لال گنج تحصیل میں موضع [illegible] کا انتخاب بستی کی جائے وقوع کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ضلع کی ہریجن بستیوں میں [illegible] لاکھ روپیہ کی ایک اسکیم کے تحت۔ اکتوبر میں تعمیر [illegible] پیسا اور ۵۵ کنووں کی تعمیر جلد ہی مکمل ہونے والی ہے۔

* * *

حکومت اتر پردیش نے ریاست میں سیاحت کی ترقی کے لیے ۲۵ ممبران پر مشتمل ایک کونسل کی تشکیل کی ہے۔ وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی کونسل کے سربراہ، وزیر سیاحت نائب صدر اور محکمہ سیاحت کے ڈپٹی سکریٹری ممبر سکریٹری ہوں گے۔

کونسل کے دیگر ممبران یہ ہیں۔ وزیر مالیات، سیاحت، اطلاعات اور پہاڑی علاقوں کی ترقی کے وزرائے ریاست۔ حکومت اتر پردیش کے چیف سکریٹری اور مالیات، منصوبہ بندی، سیاحت، صنعت اور لوکل سیلف گورنمنٹ محکموں کے سکریٹری، صدر ریاستی بجلی بورڈ، ٹرانسپورٹ سیاحت کے ڈائرکٹر، جنگلات کے چیف کنزرویٹر، تعمیرات عامہ، پینے کے پانی سے متعلق اسکیم اور آبپاشی کے محکموں کے چیف انجینئر، حکومت ہند کے محکمہ سیاحت کے ڈائرکٹر جنرل، حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر جنرل، حکومت ہند کے شہری ہوا بازی کے ڈائرکٹر جنرل اور پہاڑی ترقیاتی کارپوریشن اتر پردیش کے مینجنگ ڈائرکٹر اور روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن اتر پردیش کے جنرل منیجر۔

* * *

اتر پردیش میں مستقبل میں ریاستی ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے جاری کردہ کنٹریکٹ کیرج پرمٹوں پر کسی بھی ساخت کی ایسی چھوٹی بسیں چلانے کی اجازت دی جائے گی جن میں سات سے کم اور بیس سے زیادہ نشستیں نہ ہوں۔

اس سلسلہ میں ریاستی ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے جاری کردہ ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ ان راستوں کو چھوڑ کر جن پر اتر پردیش ریاستی روڈ ٹرانسپورٹ کی نقل و حمل سے متعلق خدمات کا اعلان کیا جا چکا ہے پوری ریاست کے لیے منی بس کنٹریکٹ کیرج پرمٹ فیاضی کے ساتھ جاری کیے جاتے رہیں گے۔

پریس نوٹ میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ چھوٹی بسوں میں لازمی طور سے آرام دہ گدے دار نشستیں ہونا چاہییں اور

ان مسودوں کے ٹھیک حالت میں ہونے کا ایک جائزہ سرٹیفکیٹ پیش کیا جانا چاہیئے۔

٭ ٭ ٭

مواضعات میں بے گھر افراد کو جنھیں مکانات کی تعمیر کے لیے زمین الاٹ کی گئی ہے زمین پر واقعی قبضہ دلایا جانا چاہیئے اور اس قبضہ کو قانونی بنانے کے لیے مال کے کاغذات میں فوراً اندراج کیا جانا چاہیئے۔ اس خیال کا اظہار وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ شری بینی سنگھ نے کل یہاں کیا۔

وزیر موصوف آزادی کے ۲۵ ویں سال کے پروگراموں پر عملدرآمد سے متعلق کمیٹی کے جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ اس جلسہ میں وزیر ریاست شری راج بہاری سنگھ چیف سکریٹری زرعی پیداوار کمشنر داخلہ آبپاشی اطلاعات مال لوکل سیلف گورنمنٹ محنت اور منصوبہ بندی کے محکموں کے سکریٹری اور متعدد محکموں کے سربراہوں نے شرکت کی۔

شری بینی سنگھ نے کہا ہے کہ بے گھر افراد کو زمین تقسیم کرنے کی اسکیم کے تحت پہلے زمین کو ترقی دینے اور تب اسے پلاٹوں میں تقسیم کرنے اور متعلقہ احکام کے تحت انھیں بے زمین افراد کو الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ الاٹمنٹ کی توثیق کرنے کے لیے مال کے کاغذات میں اندراج کیا جانا چاہیئے۔

انھوں نے ایک رابطہ کمیٹی کی فوری تشکیل کا مشورہ دیا جس میں مال اجتماعی ترقی اور لوکل سیلف گورنمنٹ محکموں کے سکریٹری شامل ہوں جو دیہی علاقوں میں مکانات کی تعمیر کے لیے زمین کی تقسیم کے سلسلہ میں واضح احکام جاری کریں۔

مذاکرات میں حصہ لیتے ہوئے وزیر ریاست برائے آبپاشی شری راج بہاری سنگھ نے مشورہ دیا کہ اس بات کا پورا خیال رکھا جانا چاہیئے کہ مواضعات میں ہریجنوں اور سماج کے کمزور طبقوں کے افراد کو با اثر افراد کے مکانات سے متصل پلاٹ الاٹ نہ کیے جائیں۔ اگر یہ احتیاطی تدبیر اختیار نہ کی گئی تو ہریجنوں اور دیگر افراد کے لیے الاٹ شدہ زمین پر واقعی قبضہ حاصل کرنا مشکل ہو جائیگا۔

چیف سکریٹری شری ایم اللہ سنے الاٹ کی ہوئی زمین تیز مستقبل میں الاٹ کی جانے والی زمین کا نقشہ بنانے پر زور دیا انھوں نے کہا کہ اس اسکیم کو واقعی کارآمد اور موثر بنانے کے لیے ہر قدم اٹھایا جانا چاہیئے۔

شری بینی سنگھ نے ہریجن فلاح اور صنعت کے محکموں سے خاص طور پر کہا کہ وہ زیادہ حوصلہ مندانہ پروگرام وضع کریں جنھیں آزادی کے ۲۵ ویں سال کے دوران بروئے کار لایا جا سکے۔

٭ ٭ ٭

لکھنؤ میں بچوں کی ایک پرورش گاہ قائم کی گئی ہے جو ریاست میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے۔

یہ ادارہ ۲۱۰۰۰ روپیہ کی لاگت سے قائم کیا گیا ہے اور اس میں ۱۴ سال تک کے ایسے پچاس بچے داخل کیے جائیں گے جو اپنے والدین کے تغافل یا کسی اور وجہ سے اپنے خاندان سے بچھڑ گئے ہوں۔ اس ادارہ میں سات بچے داخل کیے جا چکے ہیں۔ بچوں کو مفت قیام و طعام اور تعلیم کے ساتھ دیگر سہولتیں بھی فراہم کی جاتی ہیں۔

ادارہ میں قیام کے دوران ان بچوں کے والدین کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی اور انھیں اپنے بچوں کو واپس لینے کی ترغیب دی جائے گی۔ ایسے معاملات میں جب والدین اپنے بچوں کو واپس لینے سے انکار کریں تو ان کی پرورش کی ذمہداری قبول کرنے والے والدین کو انھیں سپرد کرنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ یہ ادارہ اس وقت توحید آباد میں واقع ہے۔

٭ ٭ ٭

زراعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے دستیاب زمین اور پانی کے وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے اور اس طرح زمین کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے ریاست کے دس اضلاع میں متعدد فصلوں کے دو بہرہ اسکیم منظور کیے گئے ہیں۔ یہ اسکیم ضلع دیوریا کے دو ترقیاتی بلاکوں یعنی سعد پور اور نگر بازار اور

ضلع الٰہ آباد کے دو بلاکوں پھول پور اور پرتاپ پور میں بروئے کار لائے جائیں گے۔

امید کی جاتی ہے کہ آئندہ چند برسوں میں جب ریاست میں کسان بڑے پیمانے پر غلہ کی زیادہ پیداوار دینے والی اقسام کی کاشت کو اپنا لیں گے زراعتی پیداوار کے سلسلہ میں متعدد فصلوں یعنی زیادہ سے زیادہ اور منفعت بخش فصلوں کی حکمت عملی کو اختیار کیا جائے گا۔

رہبر منصوبے زمین۔ پانی کے مسائل اور کسانوں کے ذرائع کا استعمال کر کے مختلف قسم کی آب و ہوا کے حالات میں متعدد فصلوں کے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے بنیاد فراہم کریں گے جن کے لیے تمام ضروری ساز و سامان قرضے اور خرید و فروخت کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ پراجیکٹ کے علاقوں میں کسانوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کے علاوہ زراعت ڈیری باغبانی مرغبانی۔ سور پالنے کو ترقی دینے اور بجلی فراہم کرنے کا کام شروع کیا جائے گا۔

اس پروگرام کے تحت چاروں ترقیاتی بلاکوں میں سے ہر بلاک پر مالیاتی سال رواں کے دوران ۴۸۴،۲۱ لاکھ روپے کی رقم خرچ کی جائے گی۔ ہر پراجیکٹ کی تکمیل پر ۸۳،۱۸ لاکھ روپے کی لاگت آئے گی جو مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔

گونڈہ۔ علی گڑھ۔ بدایوں اور رائے بریلی اضلاع میں متعدد فصلوں کے پراجیکٹ پہلے ہی جاری ہیں۔

اگرچہ یہ پراجیکٹ ابتدائی مرحلہ میں ضلع میں ایک ہی منتخب بلاک میں شروع کیا جائے گا لیکن بعد میں مرحلہ وار طریقہ سے اس کی توسیع پورے ضلع میں کر دی جائے گی۔ پہلے سال میں ہر بلاک میں دس مواضعات کا انتخاب کیا جائے گا اور ان کو زراعت کی ترقی کے واسطے ضروری وسائل مہیا کیے جائیں گے۔ ہر بلاک میں اوسط درجے کے کاشتکار طبقے کی نمائندگی کرنے کے لیے کم سے کم ایک گاؤں میں مظاہرے سے متعلق مراکز قائم کیے جائیں گے۔ مظاہرے سے متعلق کھیتوں میں کسانوں کو معلومات فراہم کرنے کے لیے اور یکے بعد دیگرے فصلوں کے نظام میں مناسب تبدیلیاں۔ آب پاشی گندے پانی کی نکاسی کیمیاوی کھاد پودوں کے تحفظ اور زمین کو مناسب شکل دینے سے متعلق طریقوں کا مظاہرہ کیا جائے گا۔ ان کھیتوں کے ارد گرد ترقی یافتہ زراعتی طریقوں اور ترتیب کے تحت یکے بعد فصلیں پیدا کرنے کے طریقوں کی کسانوں کو ٹریننگ بھی دی جائے گی۔

ریاستی حکومت نے ریاست کے پسماندہ علاقوں میں آبپاشی کی سہولتوں کی توسیع کے لیے ایک جامع پروگرام وضع کیا ہے۔

یہ پروگرام نو اسکیموں پر مشتمل ہے اور تقریباً ۱۷ کروڑ روپے کی تخمینی لاگت سے ۵۴۵،۳۰ ایکڑ آراضی کو آب پاشی کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ یہ اسکیمیں مالیاتی سال رواں کے دوران اولیت کی بنیاد پر بروئے کار لائی جائیں گی۔

ان نو اسکیموں میں رائے بریلی اور پرتاپ گڑھ اضلاع میں ۲،۰۲ لاکھ ایکڑ سے زیادہ آراضی کی آب پاشی کرنے کے لیے ڈلمؤ پمپڈ نہر مرحلہ دوم۔ ضلع باندہ میں ۱۹ ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین کی آب پاشی کے لیے چلیا پمپڈ نہر پراجیکٹ۔ ضلع بہرائچ میں ۲۰ ہزار سے زیادہ ایکڑ آراضی کے لیے آب پاشی کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے سرجو پمپڈ نہر پراجیکٹ ضلع غازی پور میں ۲۵ ہزار ایکڑ آراضی کی سینچائی کے لیے دیم کی پمپڈ نہر پراجیکٹ اعظم گڑھ اور بلیا اضلاع میں ۱،۱۳ لاکھ ایکڑ آراضی کی آب پاشی کے لیے دوہری گھاٹ سائفن پراجیکٹ۔ ضلع الموڑہ میں ۱۴۸۳ ایکڑ آراضی کی آب پاشی کے لیے رام گنگا وادی آب پاشی اسکیم ضلع نینی تال میں ۱۴۴۹ ایکڑ آراضی کی آب پاشی کے لیے کسی ندی آب پاشی اسکیم۔ ضلع الٰہ آباد میں دوآبہ علاقہ میں ۵۱۲۰۰ ایکڑ آراضی کی آب پاشی کے لیے کشن پور پمپڈ نہر پراجیکٹ اور خشک سالی سے متاثرہ ضلع مرزا پور میں ۲۱۵۰۰ ایکڑ آراضی کی آبپاشی کے لیے ادوا باندہ پراجیکٹ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ریاست کے مختلف حصوں میں پانی اٹھا کر آبپاشی کے لیے متعدد چھوٹی نہروں کی تعمیر کی تجویز ہے۔

زیر نظر سال کے دوران ۸۴۰ ٹیوب ویلوں کی تعمیر کی بھی

تجویز ہے۔ سنہ ۱۹۷۱ء میں خاص طور پر باندہ، ہمیرپور، جالون اور للت پور میں ٹیوب ویلوں کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا ہے۔

متفرقات

۱۱۲ قیدیوں کی سزا معاف۔ حکومت اتر پردیش نے آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ۱۱۲ قیدیوں کی سزا معاف کر دی ہے۔ یہ قیدی جو اس وقت ریاست کی آٹھ مختلف جیلوں میں مختلف مدت کی سزا کاٹ رہے ہیں ۱۵ اگست کو دوپہر سے قبل آزاد کر دیے گئے۔

مرکزی جیلوں سے رہا کیے جانے والے قیدیوں کی تعداد حسب ذیل ہے:

نینی ۱۷۔ بریلی ۳۲ وارانسی ۱۴۔ فتح گڑھ ۳۳۔ اس کے علاوہ ماڈل جیل لکھنؤ سے آٹھ، ضلع جیل سلطان پور سے تین، سمپورنانند کیمپ ستار گنج (نینی تال) سے تین اور مرزاپور سے تین قیدی آزاد کیے گئے۔

ریاستی بجلی بورڈ اسٹامپ ڈیوٹی کی ادائیگی سے مستثنیٰ۔ اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کو مالیاتی سال رواں کے دوران زندگی بیمہ کارپوریشن سے ملنے والے تین کروڑ روپے کے قرضے کے رہن نامہ پر وصول کی جانے والی اسٹامپ ڈیوٹی اور رجسٹریشن فیس کی ادائیگی سے جو ۱۱۔۵۰، ۹ روپے ہوتی ہے مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ کل یہاں کابینہ کے ایک جلسہ میں کیا گیا۔

جنگ کے سورماؤں کو مختلف انعامات۔ ریاستی حکومت نے گزشتہ ہند پاک جنگ میں غیر معمولی دلیری کا مظاہرہ کرنے والے اتر پردیش کے ۲۰ سورماؤں کو ۲۹۲۰۰ روپے کے نقد انعامات دیے ہیں۔ ان میں سے ۱۱ کو مہاویر چکر اور ۹ کو ویر چکر ملا تھا۔

کوئلہ اور سیمنٹ بھٹوں کے لیے کارپوریشن۔ ریاست میں آئندہ ۱۵ ستمبر تک کوئلہ اور سیمنٹ بھٹوں سے متعلق ایک کارپوریشن قائم کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ کل یہاں وزیر مالیات شری نارائن دت تیواری کی صدارت میں منعقدہ افسروں کے ایک جلسہ میں کیا گیا۔

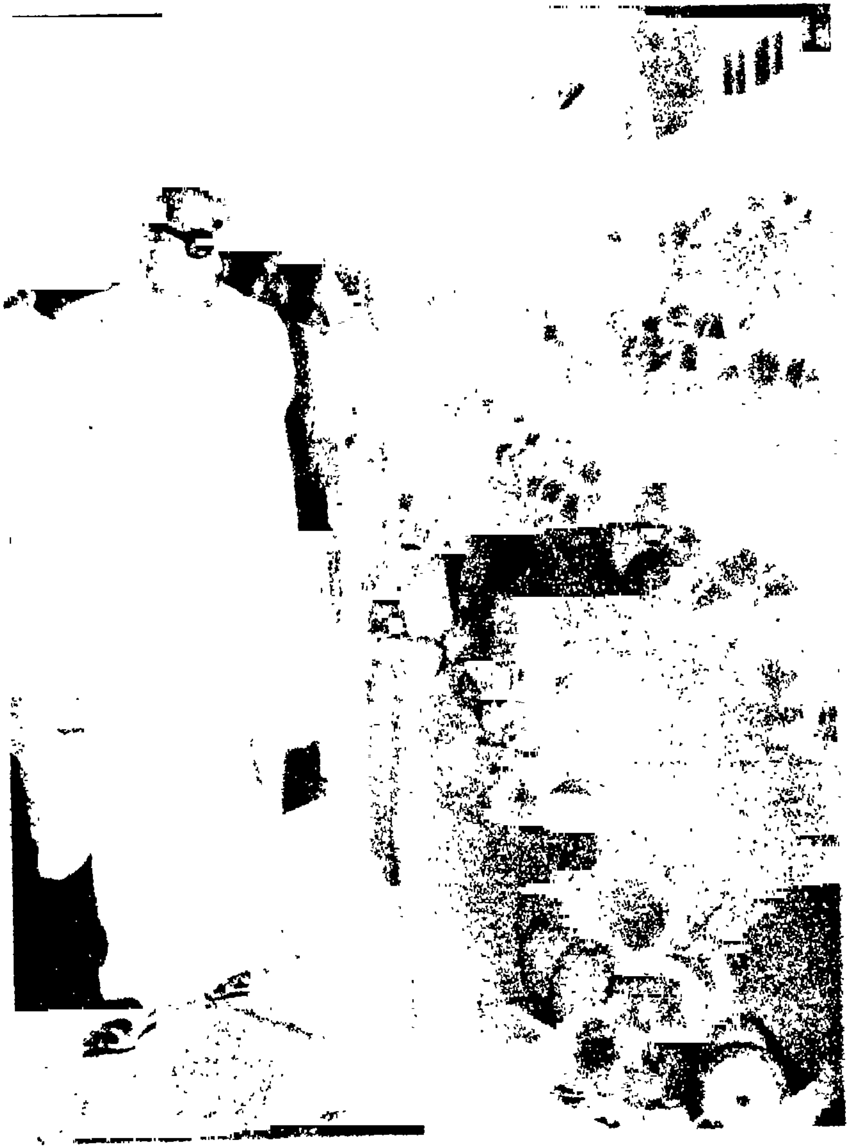
جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے وزیر موصوف نے بتایا کہ اینٹوں اور سیمنٹ کی قلت کی وجہ سے محکمۂ تعمیرات عامہ، محکمۂ آب پاشی اور بجلی کے پراجکٹوں سے متعلق تعمیرات کا کام رک گیا ہے۔ مختلف محکمہ جاتی پیداگراموں کو چلانے کے لیے اینٹوں کی تیاری بہت ضروری ہے۔ چنانچہ اس معاملہ کو سب سے زیادہ اولیت دینا ضروری ہے۔

مجاہدین آزادی کے زیر کفالت افراد کے لیے عمر کی حد میں رعایت۔ محکمۂ تقرری کے جاری کردہ ایک اعلانیہ کے مطابق ریاستی حکومت کے تحت سامیوں پر بھرتی کے لیے درخواست دینے والے مجاہدین آزادی کے زیر کفالت افراد کو عمر کی بالائی حد میں مزید ایک سال کی چھوٹ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

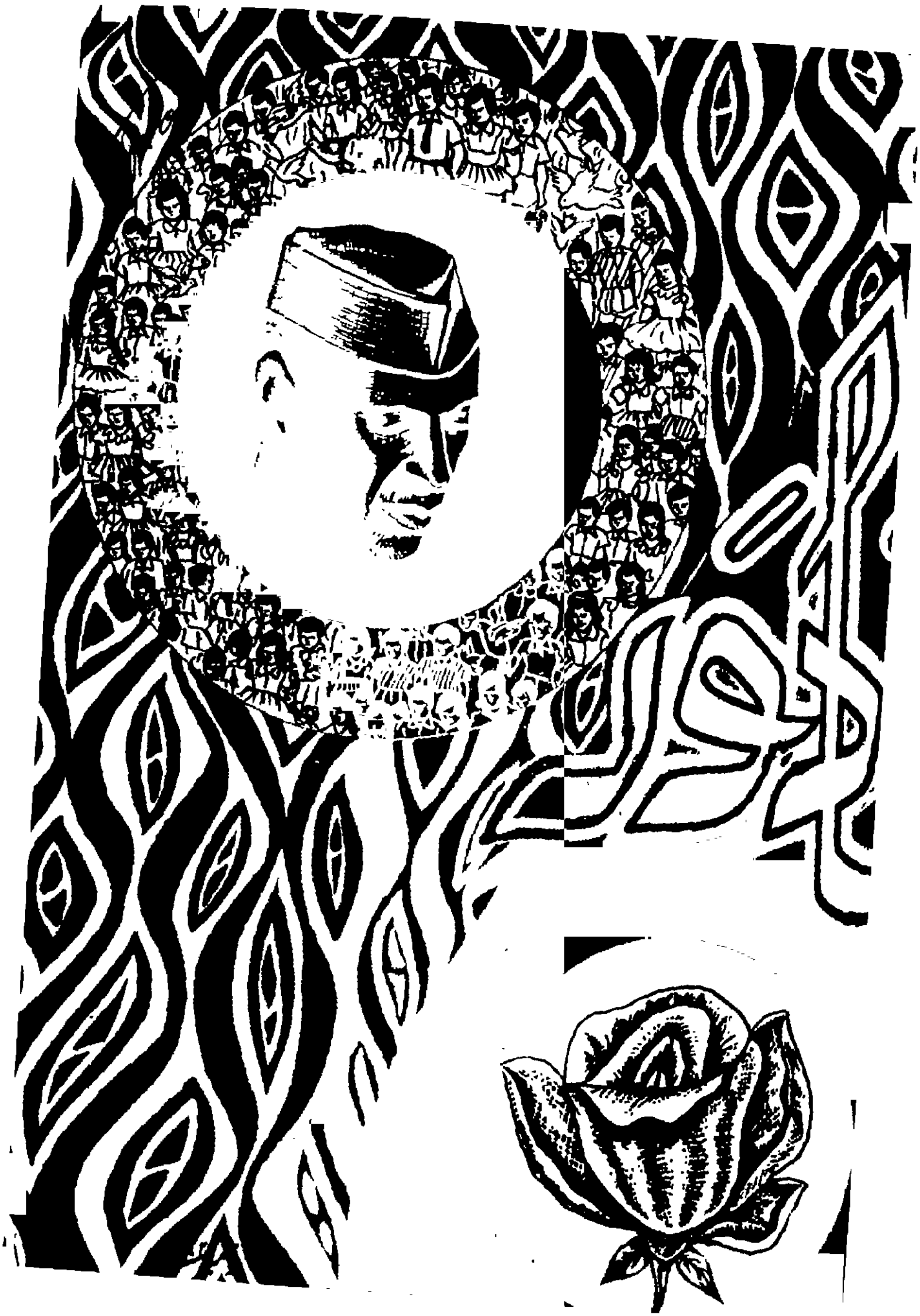
اس زمرہ کے درخواست دہندگان کے لیے اب تک عمر کی بالائی حد چار سال زیادہ تھی۔

★

> بڑی طاقتوں کے لیے یہ موقع کھلا ہوا ہے کہ وہ کسی بھی دن اس چیز (عدم تشدد) کو اختیار کر لیں اور آئندہ نسلوں کی ابدی ممنونیت حاصل کریں۔ لیکن اس صورت میں ان بڑی طاقتوں کو سامراجی عزائم اور دنیا کی نام نہاد غیر متمدن یا نیم متمدن قوموں کے استحصال کو ترک کرنا ہوگا اور اپنے طرز زندگی پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ اس کا مطلب ہے ایک مکمل انقلاب۔ ——— مہاتما گاندھی



وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری کملا پتی ترپاٹھی ریاستی سیب نمائش جو قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ میں ۷ اگست ۱۹۷۲ء
کو منعقد ہوئی تھی دیکھ رہے ہیں



عنوانات

سرورق: عظمت اشرف آرٹسٹ

جلد ۲۸ نمبر ۸

نومبر ۱۹۷۲ء
کارتک ۱۸۹۴ شک

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو۔ پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمہ اطلاعات۔ اتر پردیش

[illegible]

اپنی بات

نومبر کے مہینے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ہم دو قومی رہنماؤں کا یوم پیدائش یکے بعد دیگرے مناتے ہیں۔ ان میں سے ایک عظیم قومی رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کا یوم پیدائش ہے جو ۱۴ / نومبر کو ہر سال "یوم اطفال" کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ جواہر لال نہرو کی عظمت کے مختلف اور متعدد پہلو تھے۔ لیکن ان کی عظمت کا غالباً سب سے نمایاں پہلو تھا ان کی انسان دوستی، انسانیت کے لیے ان کی انتہائی محبت، دل گدازی اور بے پناہ صبر و تحمل۔ اسی لیے وہ دوسروں کی ذرا سی تکلیف پر دل گرفتہ ہو جاتے۔ ناانصافی انھیں بے چین کر دیتی، ظلم و تشدد جہاں کہیں بھی ہوتا انھیں تڑپا دیتا۔ ان کو صرف اپنے ملک کے لوگوں کی آزادی سے محبت نہ تھی بلکہ وہ بلا تفریق طبقہ، فرقہ یا ملک سب کی آزادی میں یقین رکھتے تھے اور ساری دنیا کی تحریکوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کی رنگا رنگ شخصیت کا جادو عامۃ الناس پر ان کی زندگی میں بھی چلتا تھا اور آج بھی جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں ان کا سکہ لوگوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ بچوں سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ لیکن اس محبت کو انھوں نے کبھی خوردی و بزرگی کا شکار نہیں ہونے دیا بلکہ بچوں کے ساتھ ان کا سلوک دوستوں کا سا تھا۔ ان کی خواہش پر ان کی سالگرہ کا دن یوم اطفال کی حیثیت سے منایا جاتا ہے تاکہ بچوں کے لیے سال میں ایک ایسا موقع فراہم کیا جائے جب اجتماعی حیثیت سے انھیں اپنے وجود کا اور ہماری آئندہ قومی زندگی میں ان کی کیا اہمیت اور کیا درجہ ہے اس کا احساس نیز مستقبل کے لیے ان میں ایک مقصد اور ایک جذبہ پیدا ہو۔

ایسے عظیم اور محبوب رہنما کا یوم پیدائش منائے جانے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اس روز ہم اس کا جائزہ لیں کہ جو نصب العین انھوں نے ملک و قوم کے سامنے رکھا تھا اسے ہم نے کہاں تک پورا کیا اور پھر عہد کریں کہ ہمارے لیے انھوں نے جو راہ روشن کی تھی اس پر بے جھجک چلتے رہیں گے اور ان کے آدرشوں کی تکمیل میں جو کسر رہ گئی ہے اسے پورا کریں گے ـــــ یہ آدرش ہیں پارلیمانی جمہوریت، نامذہبی اور غیر فرقہ وارانہ ریاست، منصوبہ بند ترقی، بین اقوامی معاملات میں بیدار مغزی اور مفاہمت کا جذبہ، قوموں میں دوستی، عالمی امن اور بقائے باہم۔

دوسری نامور شخصیت ہماری موجودہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی ہے جن کا یوم پیدائش ۱۹/ نومبر کو شہریوں کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اندرا جی نے ملکی قیادت کے سلسلے میں جس حوصلہ مندی، دلیری اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا ہے اور بین اقوامی معاملات میں جس بیدار مغزی اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے اس نے نہ صرف انھیں عظیم رہنما بنا دیا ہے بلکہ دنیا میں ہندوستان کی ساکھ بڑھا دی ہے اور قوموں کی برادری میں اس کا درجہ بلند کر دیا ہے۔ اندرا جی بھی نامذہبی جمہوریت اور سوشلزم کو نصب العین اپنے سامنے رکھتی ہیں۔ البتہ ان کا پختہ یقین ہے کہ سوشلزم کا مقصد ملک سے غریبی اور نابرابری ختم کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ متعدد دلیرانہ قدم اٹھا چکی ہیں اور سوشلزم کو وقت کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کے لیے ان کی قیادت میں نئی معاشی پالیسی مرتب کی گئی ہے۔ ان کی سالگرہ کے موقع پر سب سے بہتر تحفہ اور ہماری شکر گزاری کا سب سے اچھا ثبوت یہ ہوگا کہ ہم ہنگامہ آرائیوں، بدنظمیوں اور تشدد آمیز مظاہروں سے الگ رہ کر فرقہ وارانہ اتحاد برقرار رکھ کر اور ضبط و نظم سے کام لے کر معاشی پالیسی کو بروئے کار لانے اور غریبی ہٹاؤ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں اندرا جی اور ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ اپنے پردیش کی حکومت کا ہاتھ بٹائیں اور مفاد پرست عناصر کو بحیثیت مجموعی ملک کے مفاد سے کھیلنے کا موقع نہ دیں۔

● وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۳/ اکتوبر کو بوکارو (بہار) میں فولاد کے کارخانے کی پہلی بھٹی کا افتتاح کیا۔ بوکارو فولاد کارخانہ روس کے تعاون سے قائم کیا جا رہا ہے۔ اس کارخانے کی تکمیل پر [illegible] ارب روپے خرچ ہوں گے۔ اس کارخانے کی اندرونی صلاحیت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اتنی ہے کہ آگے چل کر یہ ایشیا کا فولاد تیار کرنے کا سب سے بڑا نظام بن سکتا ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد بھلائی، درگاپور اور رورکیلا میں بالترتیب روس، برطانیہ اور جرمنی کی مدد سے تین فولاد کارخانے قائم ہو چکے ہیں۔ اب یہ چوتھا اور سرکاری زمرے میں اب تک کا سب سے بڑا صنعتی پروجیکٹ ہے جو قائم کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ کارخانہ ہندوستان کی اپنی کوششوں سے قائم ہوا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں استعمال ہونے والے ۹۰ فی صد عمارتی ڈھانچے، ۹۵ فی صد مشینی ساز و سامان، ۸۴ فی صد بجلی کا ساز و سامان، ۸۰ فی صدی آلات اور ۶۰ فی صد دوسرے ساز و سامان دیسی ہیں۔ اس سے جہاں ایک طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا ملک غیر ملکی محتاجی سے بہت بڑی حد تک آزاد ہو چکا ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کارخانہ ہندوستان کی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی پرعزم کوشش اور جدید ہندوستان کی تعمیر کی جانب ایک زبردست قدم ہے۔

● ہم نے ستمبر کے شمارے میں اہل علم و اہل الرائے حضرات کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کے سلسلے میں خالص علمی بحث (ACADEMIC DISCUSSION) کی حیثیت سے موافق یا مخالف رائے زنی کی دعوت دی تھی اور یہ عرض کیا تھا کہ اظہار رائے جذبات سے بلند ہو کر کیا جانا چاہیے۔ مطلب یہ تھا کہ اظہار رائے کرنے میں اس قانون کے واضعان، مؤیدین اس کے منظور کرنے والوں اور ارباب حکومت کی نیتوں پر حملے کیے بغیر اور دفعات قانون کو مخصوص نقطۂ نظر سے معنی پہنائے بغیر رائے زنی کی جائے خواہ وہ ترمیمی ایکٹ کی مخالفت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اسی کے ساتھ ہم نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ اس "خالص علمی بحث" کو "صحت مند بحث" بنانے میں ہمارے لکھنے والے ہماری اعانت کریں گے۔ افسوس ہے کہ ہماری اس دعوت کے جواب میں جو تین چار مضامین موصول ہوئے ان میں ہماری گزارشات ملحوظ نہیں رکھی گئیں اور یا تو ترمیمی قانون سے متعلق شخصیتوں کی نیتوں کو صاف نہیں بتایا گیا یا پھر قانون کی متعدد دفعات کو کسی نہ کسی مقصد خاص کے حصول کا ایک وسیلہ قرار دینے کی کوشش کی گئی اور خاتمہ پر ایک فریق بن کر قانون کو واپس لینے کی تلقین بھی کی گئی تھی۔ مجبوراً ہمیں اس مجوزہ بحث کو یہیں ختم کر دینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کی مخالفت یا موافقت میں کوئی مضمون [illegible] کو بھیجنے کی زحمت نہ کی جائے کیونکہ یہ سلسلہ اب ختم کیا جا چکا ہے۔

ـــــ ایڈیٹر

بچوں کے چاچا — نہرو



عظیم رہنما جواہر لال نہرو کی ۸۳ ویں سالگرہ حسب سابق اس سال بھی ۱۴ نومبر کو یوم اطفال کی شکل میں منائی جائے گی۔



شریمتی اندرا گاندھی کی ۵۵ ویں سالگرہ ملک بھر میں ۱۹ نومبر کو منائی جا رہی ہے

نہرو

ایک اصول پرست انسان

★ ڈاکٹر رادھا کرشنن



دوستو! ڈاکٹر ذاکر حسین نے ابھی آپ سے بتایا ہے کہ کس طرح ان جلدوں کو مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا اور کیسے یہ اب شائع ہوئیں۔ انھوں نے مجھے یہ موقع دیا ہے کہ میں ان جلدوں کا اجرا کر لیا۔ ان میں سے ایک تصویروں کا البم ہے جس میں جواہر لال نہرو کو بچپن سے لے کر ان کے آخری لمحہ تک کے مختلف منازل حیات میں پیش کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں ابھرتے ہوئے عالمی سماج کا ذکر کیا گیا ہے۔

عام طور پر تاریخ انسان کو بناتی ہے اور پھر انسان تاریخ بناتا ہے۔ جواہر لال نہرو پر ان کی زندگی کے ابتدائی برسوں میں جو اثرات پڑے انھوں نے ان کی زندگی کے نظریے اور سانچے کو ڈھالنے میں بہت کچھ کیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جب وہ ہیرو میں تھے تو انھیں خوش اطواری کے لیے ایک کتاب بطور انعام ملی تھی۔ یہ کتاب تھی گیری بالڈی کے متعلق جو ٹریولین نے لکھی تھی تب نہرو نے محسوس کیا کہ گیری بالڈی کیسا انقلابی ہیرو تھا اور اس کی شخصیت کتنی عظیم اور پرکشش تھی کس طرح اس نے اٹلی کے لیے جدوجہد کی اور کیسے اٹلی کو آزاد و متحد کیا۔ انھوں نے سوچا کہ میں بھی کچھ ایسا ہی کیوں نہ کروں۔ گیری بالڈی کے سوانح حیات نے ان کے تخیل کے لیے مہمیز کا کام کیا اور ان میں یہ احساس شوق پیدا کیا کہ ہندستان کے غریبوں، بھوکوں اور کنگالوں کو ان کی معیت سے نجات دلائی جائے۔

جب وہ اس نظریہ کے ساتھ ہندستان واپس آئے تو انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ایسی سیاسی تحریکیں کون سی ہیں جنھیں اس ملک کے آزاد کرانے میں دلچسپی ہے۔ ایسی تحریکیں تو کئی تھیں لیکن اُن کے لیے گاندھی جی کی ہستی بہت پرکشش تھی۔ انھوں نے سوچا کہ یہ ہے وہ انسان جس کے پیش نظر ملک کو آزاد کرانے کا عظیم کام ہے اور جس نے وہ شریفانہ طریقے بھی وضع کر لیے ہیں جن کے ذریعہ یہ آزادی مل سکتی ہے۔ نہرو کے خیال میں یہ وہ انسان تھا جو زمانہ دراز سے دکھ سہتے ہوئے اور ستائے ہوئے قدیم ملک کی نمائندگی کرتا

---

۱۴ نومبر ۱۹۶۴ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں نہرو کی دو یادگاری جلدوں کے اجرا کے موقع پر تقریر۔

تھا جو اس ملک کی عظمت و رفعت اور اس کی صلاحیتوں کا بھی شناخت کرتا ہے۔ یہ دونوں باتیں گاندھی جی میں سموئی ہوئی تھیں۔ نہرو فوراً ان کے وفادار پیرو اور پرجوش شاگرد بن گئے۔ جب وہ پہلے پہل میدان میں آئے تو ایک جلد باز اور غصیلے نوجوان تھے لیکن گاندھی جی نے انھیں سادھ لیا۔ انھیں اپنے طریقوں پہ لے آئے۔ پھر تو نہرو نے بڑی طویل مدتیں جیل میں کاٹیں۔ کوئی بات انھیں گاندھی جی سے الگ نہ کر سکی۔ خود گاندھی جی نے کہا: "ہم میں ذہنی اختلافات ہیں مگر ہمارے دل ایک ہیں۔"

زمانہ قبل تاریخ سے تیاگ اس ملک کا دھرم رہا ہے۔ جن بڑے آدمیوں کا ہم احترام کرتے ہیں عزت کرتے ہیں وہ بادشاہ نہیں، بڑے بڑے کارخانوں کے مالک نہیں اور نہ وہ فوجی سورما ہیں۔ وہ لوگ تو ہمارے سادھو سنت ہیں جنھوں نے تیاگ دیا اور اپنے لیے زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی روا نہ رکھیں۔ اگر آج کی دنیا میں کچھ سلیقہ مندی ہے، اگر کچھ آن باقی رہ گئی ہے۔ اگر سچائی کے لیے کچھ عزت ہے اور اگر ہم ایسے لوگوں سے آج بھی عقیدت رکھتے ہیں تو وہ اس لیے ہے کہ انھوں نے اس ملک میں کچھ کارنامے دکھائے اور دنیا کو تیاگ دینے والے ان مہان لوگوں نے کچھ حاصل کر کے دکھایا۔ پس نہرو نے گاندھی جی کی رہنمائی میں سخت جدوجہد کا کام کیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ گاندھی جی کے تیاگ کا طریقہ سلجھا ہوا کہلا سکتا ہے، ظالموں کو زیر بر انجام کر سکتا ہے اور آزادی دلا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ حاصل کر لینا ہی آخری منزل نہیں ہے۔ نہرو نے ملک پر نظر ڈالی۔ ملک تو قدرت کی فیاضیوں سے مالا مال ہے مگر یہاں بسنے والے انسان غریب ہیں۔ آخر یہ کروڑوں آدمی بھوکے ننگے کیوں ہیں؟ یہ اتنے کنگال کیوں ہیں؟ انھوں نے محسوس کیا کہ مجھے لازماً ان لوگوں کی حالت بہتر بنانا ہے۔ اگر آزادی کو واقعی آزادی ہونا ہے تو وہ ایسی آزادی ہونی چاہیے جو افراد کو حقیقی آزادی دے یعنی سیاسی برابری کے ساتھ ساتھ معاشی اور سماجی آزادی۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ سائنس کا طریقہ ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے ہم اپنے ملک کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔ اسی لیے

انھوں نے یہاں وسیلوں سے کہا کہ سائنس پر زیادہ توجہ دی جائے اور ان کے سامنے جو بھی مسئلے آئے انھوں نے ان کے حل کے لیے سائنس کے طریقے استعمال کیے۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ سائنس محض زیبائش کے لیے نہیں ہے۔ وہ کوئی [illegible] ہے بلکہ وہ ہر پہلو میں اور انداز فکر میں سائنس کو داخل کرتا ہے ملک اتنی طویل مصیبت کیوں برداشت کرے۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے یعنی لوگوں کے ذہنوں کی نفسیاتی رکاوٹیں، عجیب [illegible] بندھنوں، مذہبی تعصب اور بہت سے دیگر سماجی عدم مساوات کا شکار ہیں۔ ہم نے اپنے آدمیوں کو طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر رکھا ہے اور ان سب باتوں کی ہم کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگر ہمیں ان سے چھٹکارا پانا ہے تو ہمیں اپنے سماجی تعلقات میں سائنس کی اسپرٹ کو داخل کرنا ہوگا۔ اپنے ذہنی عادات میں سائنس کی اسپرٹ کو لانا ہوگا۔ اسی لیے نہرو یہ کہتے تھے کہ میں سائنس کا معتقد ہوں۔ سائنس صرف حقیقت کی تلاش ہی نہیں وہ انسانوں کو بہتر بھی بناتی ہے۔ اسی لیے نہرو سائنس اور ٹکنالوجی پر اتنا زور دیتے تھے۔

کیا آج ہماری حالت بالکل درست ہے؟ کیا ہم نے اپنا مقصد پا لیا ہے؟ کیا ہم اپنی موجودہ حالت سے مطمئن ہو سکتے ہیں؟ غذا ہی کی کو دیکھیے، مختلف میدانوں میں جو سنکٹ آئے ہوئے ہیں انھیں دیکھیے، ان سیاسی اختلافات کو دیکھیے جو ہماری عوامی زندگی کو تباہ کر رہے ہیں۔ ان طریقوں کو دیکھیے جن کی وجہ سے ہمیں اپنے ملک کے مقابلے میں اپنے فائدے کی زیادہ فکر ہے اگر تنگ پن، بداخلاقی اور بے ایمانی کی جڑ اکھاڑ پھینکنا ہے تو پھر نہ صرف اپنے ماحول کے سدھار بلکہ اپنے سدھار کے لیے بھی ذہن کو سائنسی سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ اسی لیے نہرو سائنس اور روحانیت کو بڑھاوے کا رواج دینے پر زور دیتے تھے۔ روحانیت سے مراد ہے ہماری زندگی کی ایک دوسری حد جو محض مادی حد سے آگے ہے۔ انھوں نے ہمیں یہ سب کرنے کو کہا۔ اگر ہم باقی دنیا پر نظر ڈالیں تو آج بھی ہم پیچھے ہیں۔ [illegible] کی وجہ ہے جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں۔ دنیا کے [illegible]

کہ ذات پات یا فرقہ اور طبقہ کی بات نہیں کیا کرتے تھے۔ وہ ایک ہی دھارے میں بہتے ہیں۔ جاپانی ہوں یا چینی یا کوئی اور ہوں۔ وہ یہ نہیں پوچھتے پھرتے کہ آپ کا مذہب کیا ہے۔ گاندھی جی کا گیت — ایشور اللہ تیرے نام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ہم پرماتما کو کیا نام دیتے ہیں۔ جب تک ہم سچے دھرم پر قائم ہیں حق تعالیٰ کو کوئی بھی نام دے سکتے ہیں جہاں تک عوام کی خدمت کا تعلق ہے مذہب سے اس میں کیا فرق پڑتا ہے جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی اور ہم سے یہ کہا کہ ہمارے اپنے دماغوں کے اندر جو رکاوٹیں ہیں ان سے ہوشیار رہیں کیونکہ یہ ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔

اس کے بعد وہ اپنے آپ کو دنیا کا ایک شہری محسوس کرتے تھے۔ آج ہم نے جس کتاب کا اجرا کیا ہے اس کا نام ہے "ابھرتی دنیا" ایک نئی دنیا ابھر رہی ہے۔ وہ دنیا جس سے ہمارے بزرگ اب سے سو پچاس برس پہلے آشنا نہ تھے آج ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مقامات پر سب قومیں مل رہی ہیں اور ساتھ کام کر رہی ہیں اور نہرو نے ناطرفدار رہنے کی پالیسی اختیار کی۔ یہ ناطرفداری اتنا تی ہے، یہ تعصب کو ختم کرتی ہے۔ لوگوں کو اپنے ساتھ لاتی ہے اور انھیں اس قابل بناتی ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھیں۔ ناطرفداری کے صحیح معنی یہی ہیں نہرو نے پنچ شیل کو رواج دیا اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ عوامی معاملوں میں بھی ضبط نفس کی ضرورت ہے۔ وہ بانڈونگ کانفرنس میں شامل ہوئے۔ بلگریڈ کی کانفرنس میں شمولیت کی اور جہاں تک انڈو چائنا کے معاہدوں کا تعلق ہے انھوں نے ان میں نمایاں حصہ لیا۔ تمام معاملوں میں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ انسانیت تمام قوموں سے بالاتر ہے۔ ہماری نسل کے لیے جو کام ہے وہ محض اپنی قوم کے بنانے کا نہیں ہے تمام دنیا کے بنانے کا سوال ہے کیسی ایک سماج نہیں ادھل کر نہیں رہ سکتی۔ کوئی قوم یقین نہیں کر سکتی کہ اسے اپنے تصور کے مطابق تمام دنیا کو ڈھالنے کا حق ہے ہر قوم کا اپنا جوہر ہے' اپنی روایات ہیں انھیں مٹانا نہیں ہے ان تمھیں محفوظ رکھنا ہے اور دنیا کی رنگا رنگی اور اسے مالا مال بنانے کے لیے بروئے کار لانا ہے۔ ہمیں ابھی اپنے آپ کو اس منزل تک پہنچنے والا راہ رو اور کام میں حصہ دار سمجھنا چاہیے ہمیں ہر فرد کو مدد دینی چاہیے کہ وہ 'پرم' تک پہنچے۔ نہرو نے اپنی کتاب "تلاش ہند" میں دو سنسکرت شلوکوں کے حوالے دیے ہیں اور انھیں دنیا کے نئے نظام کا بنیادی اصول قرار دیا ہے۔

ایک یہ تھا — کہ اپنے کنبہ کو فرقہ کے لیے چھوڑ دو' فرقہ کو قوم کے لیے چھوڑ دو، قوم کو دنیا کے لیے چھوڑ دو اور دنیا کو بھی اپنی پوتر آتما کے لیے چھوڑ دو۔ شخصی آزادی انفرادی حقے کی پاکیزگی ہے۔ اگر آپ نے اپنی روح کو کھو دیا تو پھر اگر ساری دنیا کو پا بھی لیا تو کیا ہے —— اپنی آتما کی پراپتی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے جس کے لیے سب کچھ کھلا چھوڑ دینا چاہیئے۔

دوسرا سنسکرت کا شلوک جس کا انھوں نے ترجمہ بھی کیا ہے اور جو گاندھی جی اکثر پڑھا کرتے تھے مطلب یہ ہے —— میں دنیوی راج نہیں چاہتا۔ میں مکتی (نجات) یا سورگ (بہشت) بھی نہیں چاہتا۔ میں ان لوگوں کا دکھ کم کرنا چاہتا ہوں جو مصیبت میں پڑے ہیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔ سماجی برابری اور انفرادی آزادی ہی کسی پاکیزہ عالمگیر نظام کے بنیادی اصول ہو سکتے ہیں — سچائی اور محبت یہ اصول ہیں اہنسا اور امنیا، نہرو ایک باصفا انسان تھے۔ انھوں نے ہمیں یہ باتیں سکھائیں اور اپنی زندگی میں بھی ان پر عمل کیا۔ ہمارے لیے یہ بڑی بات تھی کہ ہم میں ایک ایسی آتما موجود تھی جو ہمیں نسلاً بعد نسلاً حوصلہ دلاتی رہے گی۔

★

اندرا گاندھی

مسعود انور جھالی

(جشنِ سیمیں (سلور جبلی) کی تقریب میں ایک شاعر کا نذرانۂ عقیدت)

اندرا، ایک نئے دور کی تمہیدِ حسیں
صفِ اعدا میں غریبوں کے لیے سینہ سپر
کارواں کے لیے، اک شمعِ سرِ راہگذر
ایک تابندہ کرن، تیرگیٔ شب کے لیے
ارضِ مشرق پہ بہاروں کی شفق رنگِ سحر
مطلعِ شوق پہ، تابانیٔ خورشیدِ حسیں
اندرا، ایک نئے دور کی تمہیدِ حسیں

آج کے دن یہ تب و تاب اُسی کے دم سے
فکر کو قوتِ پرواز دیا ہے جس نے
ساز سے شعلۂ آواز لیا ہے جس نے
حال و مستقبل و ماضی کا بنا کر سنگم
اک نئے عہد کا آغاز کیا ہے جس نے
آج کا لمحۂ نایاب اُسی کے دم سے
آج کے دن یہ تب و تاب اُسی کے دم سے

اندرا فہم و فراست میں یگانہ سب سے
دولتِ عزم و یقیں، سوزِ تکلم اُس کا
بیش از لعل و گہر، ایک تبسم اُس کا
کہکشاں زیرِ قدم، قوسِ قزح آنچل میں
خوشہ چیں، جلوۂ مہر و مہ و انجم اس کا
اندرا حسنِ قیادت میں یگانہ سب سے
اندرا فہم و فراست میں یگانہ سب سے

اے کہ، اک زندہ حقیقت ہے حکایت تیری
حرفِ زریں میں لکھی جائے گی روداد تری
مژدۂ فتح و ظفر، منزلِ افتاد تری
جادواں تو ہے، دنیا ہے آباد تری
ہے دعا میری کہ ہر دل میں رہے یاد تری
فاتحِ گردشِ دوراں ہے محبت تیری
اے کہ، اک زندہ حقیقت ہے حکایت تیری

[illegible]

[illegible]

رومانیت کیا ہے!

ڈاکٹر طلحہ رضوی برق

رومانی تحریک (ROMANTIC MOVEMENT) یورپ کی ادبی تاریخ کا ایک دلکش باب ہے۔ یہ تحریک کچھ وقفے سے انگلینڈ، فرانس اور جرمنی میں شدت اختیار کیے ہوئے تھی۔ ہر سہ ممالک میں اس تحریک کے تحت رومانیت ROMANTICISM کا تصور کسی حد تک مماثل اور بعض جہتوں سے مخالف و متبادل رہا۔ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادبیات میں لفظ رومانی (Romantic) ایک مخصوص صفت اور اصطلاح بن گیا ہے۔ مزاج و ماحول کے اختلاف نے ان میں سے ہر جگہ اس لفظ کی معنوی سمتیں بدل دیں اور متضاد مفاہیم بھی پیدا ہوتے گئے۔

اس میں قطعی مبالغہ نہیں کہ ادب کی کوئی اصطلاح 'رومانی' کی طرح بےبایانہ وسعت معنی نہیں رکھتی۔ جے۔ برزون (J. Barzun) نے 'رومانی' کے مستعملہ جدید مرادفات کے لیے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں:-

"دلکش، بےغرض، وافر، آرائشی، معصوم، حقیقت پسند، مادی، غیر جذباتی، سبک، شاندار، مترنم، روایتی، پراسرار، روحانی، ادق، انقلابی، طولانی، منظری، بےہیئت، ظاہر بیں، جذباتی، تصوراتی، بےعقل۔"

اور لطف یہ کہ ابھی یہ فہرست بہ آسانی ایسی مثالوں سے طویل ہو سکتی ہے جن سے ذہن دوچار رہتا ہے۔ اس تنوع معنوی کو ہم اس پر محمول نہیں کر سکتے کہ ابھی تک اس کی صحیح تعریف بیان کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ مفاہیم آپس میں کچھ اس حد تک متضاد ہوتے گئے ہیں کہ ابہام کا پیدا ہونا ناگزیر ہو گیا۔ مشہور ادیب اے۔ او۔ لوجوائے (A.O. Lovejoy) رومانیت سے متعلق لکھتا ہوا اس نتیجہ پر پہنچا کہ:

"... ... the word "romantic" has come to mean so many things that, by itself, it means nothing. It has ceased to perform the function of a verbal sign so that the whole sale use of the word has led to a good deal of unconscious falsification of the history of ideas."

حقیقت یہ ہے کہ ادبی تنقید میں جب سے اس لفظ کا استعمال شروع ہوا ہے، غلط فہمیوں اور نارسائیوں کا ایک مستقل باب کھل گیا ہے۔ ۱۷۹۶ء میں فریڈرک شلیگل (Friedric Schlegel) نے تقریباً سوا سو صفحات میں اس لفظ کی تشریح کی تھی۔ مگر وہ بھی اس لفظ کے کسی ایک قطعی معنی کا تعین نہ کر سکا۔ اس پوری تشریح میں لفظ رومانی کا مفہوم نہ صرف یہ کہ جدا جدا ادبی تخلیقات میں بدلتا رہا بلکہ اکثر ایک ہی نظم کے مختلف حصوں میں متضاد پایا گیا۔ جرمن ادیب و شاعر اسٹنڈال (Stendhal) نے شیکسپیر کا مطالعہ کر کے لکھا تھا کہ رومانیت عوام کے سامنے ایسے ادبی شہپارے پیش کرنے کا فن ہے جو انھیں عصری میلانات، عقائد اور رسوم کا احترام کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ مسرت بہم پہنچائے۔ اس کے برعکس کلاسکیت وہ ادب پیش کرتی ہے جس نے اسلاف کو خاطر خواہ مسرت بخشی تھی۔

اسی درمیان فرانس میں پیرس کے ذہین طبقے نے شاعری

میں خاکہ نویسی، منظر نگاری، عہد وسطیٰ کے احیا اور تاریخ کے استعمال
کو رومانیت سے تعبیر کیا۔ MUSSET لکھتا ہے کہ حسن، رنج، مضحکہ،
سنجیدہ، سادہ و رنگین ہیئت و طمانیت بلکہ آسان لفظوں میں الہامیہ
طربیہ کے امتزاج کے علاوہ رومانیت کوئی دوسری چیز ہو نہیں سکتی۔
اور مختصراً یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اس وقت کلاسیکی ادب صرف رومن
شاعری کی نقل اور رومانی سراسر جرمن، انگریزی اور اسپینی شاعری
کا چربہ تھا۔ موسیٹ کا یہ شدید طنز اس ابہام پر بہت صاف روشنی
ڈالتا ہے جو اس اصطلاح کو اپنے اندر ریشم کے کیڑے کی طرح بند
کر لیتا ہے۔ انگریز شعرا اس معاملے میں کافی دور اندیش تھے کہ انھوں
نے اس کی تشریحی الجھنوں کو سمجھتے ہوئے خود کو محتاط رکھا۔ اواخر اٹھارہویں
صدی اور اوائل انیسویں صدی عیسوی کی انگریزی شاعری رومانی
اصطلاح کے پھیروں سے الگ رہ کر بہ آسانی سمجھی اور پرکھی جا سکتی ہے۔
یہ لفظ بلیک، ورڈس ورتھ، کالرج، شیلی اور کیٹس کی شاعری میں
بہت کم استعمال ہوا ہے بہ نسبت جرمن اور فرانسیسی شعرا کے جن کے
یہاں اس کا استعمال کثرت سے نظر آتا ہے۔ اس عہد کے انگریز نقاد جرمنوں
کی طرح اس تحریک کی فلسفیانہ بنیادوں سے کما حقہ متعارف نہ تھے
نہ فرانس کی طرح انگلینڈ میں رومانی اور کلاسیکی کی تفریق اتنی اہم تھی مگر پھر
توانا، تجرباتی اور غیر جانبدار انگریزی تنقید نے اس کی چند اصولی توضیحیں
کیں۔ حتیٰ کہ کالرج نے جو انتہائی فلسفیانہ طور پر اس تحریک سے ملوث
و متعلق تھا، اپنی دریافتوں کی بنیاد عام سطح پر رکھی اور کوئی قطعی
اصول وضع نہ کیا لہذا رومانی ''(ROMANTIC) کی مختلف تعبیریں
جرمنی، فرانس اور انگلینڈ کی ادبی رومانی تحریکوں کی گیرائی اور ان
کے درمیان مخصوص اختلافات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔ ہر زبان
میں یہ لفظ چند خاص معنوں کا حامل رہا جو غیر مقامی شعرا کے لیے
قابل قبول نہ تھا۔ ان متضاد معنوں اور مختلف مفاہیم کے پیش نظر
ہر سہ ممالک کی رومانی تحریکوں کا اکثر و بیشتر تقابلی مطالعہ کیا گیا
ہے اور تجسس و تلاش کے بعد ایک ایسی تعریف (DEFINITION)
اور اس کے اجزا مشترک پیش کیے گئے ہیں جس پر سب کا اتفاق ہے۔
ان باتوں کے باوجود یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ہر ملک کا اپنا جداگانہ
اور شفقتہ رومانٹک اسکول جس سے واضح قومی خصوصیات وابستہ تھیں ان
اسکولوں کے تقابلی مطالعے میں ایک بڑی دقت اور ہے۔ یہ جبکہ بلیک اور
بائرن عام طور پر رومانی گروہ میں رکھے جاتے ہیں مگر ان دونوں کی
منظوم شاعری پڑھ کر یہ کہنے کا خطرہ کون مول لے گا کہ انگلستان میں
بھی کوئی رومانی اسکول ہے۔ اس طرح کی مثالیں فرانس میں بھی ملیں گی
جن کے پیش نظر فرانس کے رومانی اسکول کی تعیین دشوار معلوم ہوگی۔ فرانس
میں ESSAI SUR LES REVOLUTIONS اور ATALA کے
بعض حصے رومانی کہے جا سکتے ہیں بعض نہیں۔ تو کلاسیکی ڈرامہ کے خلاف
مخالف ہیوگو HUGO جس کی تصنیفیں CROM WELL اور
HARNANI ہیں اور ODESET BALLADES کا مصنف
نابالغوں کی سماجی اور اخلاقی ذمے داریوں کا قائل ہے۔ ان تبدیلیوں
اور تغیرات کے پیش نظر بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملک میں
بھی معمولی اوسط، مخصوص، نا شدہ بلکہ علامتی 'رومانی انداز' شاید
کبھی نہیں رہا۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ ساری دشواریاں رومانیوں کی دقت پسندی،
اختلاف ہیئت اور نادرہ کاری کی عجلت سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس
کے باوصف نظریات کی تبدیلی کے سنجیدہ اسباب موجود تھے۔ مثلاً
شلیگل کا ATHENAUM کے مطالعہ کے بعد یہ مطالبہ کہ رومانی
شاعری کو ہمیشہ ترقی پذیر (PROGRESSIVE) ہونا چاہیے۔ شاید
اس پر واضح نہ تھا کہ جرمنی میں یہ ترقی پسندی دو قطعی مختلف گروہوں
FRUHROMANTIC اور HOCHROMANTIC سے ابھرے
گی۔ پہلا گروہ عموماً موسوم بہ جینا رومانٹک (JENA ROMANTIC)
لازمی طور پر فلسفیانہ، مابعد الطبیعاتی، مفکرانہ اور داخلی دلچسپیوں
کا حامل ہے جبکہ دوسرا گروہ موسوم بہ HADELBERG RO-
MANTIC) زیادہ تخلیقی، خارجی اور جرمن کے قومی ورثہ (مثلاً
لوک گیت، لوک کہانیاں وغیرہ) کو نئی توانائی بخشنے والا ہے۔ جرمن
رومانٹکس اپنے اس تاریخی، ادبی اور رومانی انحطاط کے ساتھ تیزی سے
قومی و سیاسی اتحاد کی طرف گامزن تھے۔ دوسری طرف فرانسیسی
رومانٹکس انقلابی دور کی علیحدگی پسندی اور جوشش قلبیہ سے

الگ ہو کر زیادہ سے زیادہ عالمی اثرات قبول کرتے گئے۔ یہ رومانی سکول لگ بھگ پچاس سال پر حاوی رہا۔ اس کے بعد بتدریج ترقی کے بے شمار مدارج تک رہا جس نے صورت حال کو اور بھی گنجلک کر دیا۔

یورپ میں رومانی تحریک کے پیچ و خم اور اس اصطلاح کے متعدد معنوی زاویے بحث کے دوران مختلف ادبیات کے باہمی تعلقات کی تصویر اور نارومانیوں کی ایک طویل فہرست پیش کرتے ہیں، کیونکہ جرمنوں نے رومانیت کو جیسا اور جو کچھ سمجھا اس سے فرانسیسی اور انگریز متاثر ہو سکے۔ رومانیت فرانسیسیوں کی نگاہ میں جیسی تھی وہ انگریزوں اور جرمنوں کی نظر میں نہ تھی۔ علیٰ ہٰذا القیاس فرق ہر جگہ کے ادیبوں نے غیر ملکی ادب پاروں میں دیکھے۔ رومانیت کبھی جو ان کے اپنے خیالات سے قریب تھی یہاں تک کہ ایسی نادرست توضیحیں پیدا ہوئیں جنھیں بغیر دوسرے معتقدات کی عینک لگائے سمجھا ہی نہ جا سکے مثلاً گوئٹے کی WERTHER اور GOTZVON BERLICHINGEN جو جرمنوں کے لئے خیالات کے قطعی داخلی اور خارجی پہلو ہیں مگر فرانسیسیوں کے لیے خاص جرمن رومانیت کی مظہر ہیں۔ البتہ انیسویں صدی کے مورخ نقاد جب جرمن رومانیت کے متعلق لکھتے ہیں تو گوئٹے، شلر اور بورجر کا نام لیتے ہیں کہیں بھی شلیگل، نووالس، واکن راڈر کا تذکرہ نہیں آتا جیسے یہ لوگ اس وقت بالکل گمنام رہے ہوں۔ اسی طرح بائرن اس وقت بھی جرمنی اور فرانس میں ایک رومانی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ انگلینڈ میں اس کی حیثیت اس نہج سے محض حاشیائی ہے۔ وہ رومانیوں سے بہلے نام مالوت رکھتا ہے۔ اس کا رشتہ اٹھارہویں صدی کے پوپ کی روایتی شاعری سے زیادہ مضبوط و مربوط ہے۔

ورڈس ورتھ کی کتاب لیریکل بیلڈس اور اس کا اہم پیش لفظ انگلینڈ کے رومانٹک اسکول میں کسے نے کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسکے معاصرین اور ہم وطن رومانیت کی اس تشریح کی ندرت پر چونک اٹھے تھے لیکن جرمنوں نے ورڈس ورتھ کے بیلڈ میں اپنے تئیں شعری صداقت کی بہترین مثال پائی ہو مگر فرانسیسیوں کے نزدیک یہ سب اتنا کھوکھلا ہے سست، تبلیغی اور خلوص سے معرا ہے کہ اسے رومانی کہا ہی نہیں جا سکتا۔ ورڈس ورتھ وضاحت، تجزیہ، تحلیل، تشریح کا تعمیر کرتا ہے مگر اس کے فرانسیسی مخالفین تعصب، جوش، شور و ہنگامہ، بیجا ستائش اور مبالغہ آرائی کرتے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ انگلش، فرنچ اور جرمن رومانی تحریکوں کے درمیانی رشتے جس حد تک محسوس کیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ مبہم اور پیچیدہ ہیں۔ یہ دشواریاں و مسائل رومانیت کے مزاج سے پیدا ہوئیں اور سارے یورپ میں عام ہو گئیں۔ اس تصور کی وسعت و پہنائی معنوی تغیر و تبدل کی ایک قابل لحاظ گنجائش کی متقاضی ہے۔ ہم انھیں بجا طور پر مختلف رومانی اسکول کے درمیان اختلافات کی کڑیاں کہہ سکتے ہیں جو باہم مل جل کر یورپ کی رومانی تحریک سے عبارت ہیں

ان تمام دقتوں کے باوجود مختلف زبانوں کی رومانی تخلیقات کچھ ایسے مشترک عناصر اور مشابہتیں ضرور رکھتی ہیں جن سے ہم تقابلی مطالعہ پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بغور مطالعہ کرتے ہوئے رومانی تحریک کے تین مشترک کلیدی اوصاف سامنے آتے ہیں۔ غلبۂ انفرادیت، عظمتِ تخیل اور احساسات پر زور۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو رومانیت کی تقریباً ہر تعبیر میں بنیادی اور جبلی حیثیت رکھتی ہیں گویا یہ انفرادی تجربات و محسوسات کا آزادانہ تصوراتی اظہار پیش کرتی ہیں۔

رومانیوں کی بنیادی انفرادیت فن کو ہیئتی اور خارجی طور پر دونوں طرح سے الگ کرتی ہے۔ ابتداً ادب کو فنی طور پر چند بندھے ٹکے اصولوں کا پابند اور اختراعی عنصر سے پاک سمجھا جاتا تھا۔ اب کسی رومانی اختراع (CREATION) کی حیثیت ایک ایسے تجربے کی ہو گئی ہے جس میں فنکار کی حسیت براہ راست کارفرما ہو اور اس کے ذاتی تاثر کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہ تبدیلی فنکار کی نئی بصیرت پر محمول ہے۔ وہ اپنے علم و دانش کی نمائش نہیں کرتا۔ وہ سچے واردات قلبی اور احساسات ذاتی کو پیش کرتا ہے جس میں اس کی انفرادیت دخیل ہوتی ہے۔ ایسے فن پارے پابندیٔ روایت و ہیئت کے جھول سے پاک اور فنکار کے ذاتی تاثرات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یہ شخصی انفرادیت ہی ہے جس میں رومانی بے ساختگی و برجستگی پوشیدہ ہے۔ یہ انفرادیت کم و بیش ہر جگہ رومانیت کی تحریک سے نمایاں طور پر وابستہ رہی۔ خارجی ماحول کے

بھی رومانی شاعر اپنی داخلی دنیا [illegible]
ہو گیا۔ فطری اور عطری شاعری [illegible]
کی داخلی بصیرت کو بڑا دخل ہے اور یہی وجہ ہے کہ رومانی شاعری نے
اس کے سہارے بہت جلد شہرت حاصل کی۔

رومانی دنیا میں جس طرح ایک فرد کی اہمیت ہے بالکل اسی
طرح تصور کو مرکزی نقطہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ تصور ہی کسی فرد کی قوت
مشاہدہ ہے جس سے وہ اپنی داخلی بصیرت کے سہارے تجربات و تاثرات
کو نئے انداز کی شکل دیتا ہے۔ تصور کی یہ بالادستی براہ راست فرد
کی عظمت و انفرادیت کا حاصل ہے۔ یہ تصور یقینی طور پر انسانی احساسات
کے ترکیبی عمل سے متعلق ہے ہر فرد میں ایک انا (ایگو) ہوتی ہے اور یہ انا
اپنی قبولیت، حسیت اور رد عمل کے لحاظ سے کیفیت کی کام کرتی
ہے۔ اس انا کے ادراک و عمل کا واحد ذریعہ تصور ہی ہے۔ لہذا
رومانی نقطۂ نظر سے تصور بے حد اہمیت کا حامل ہے رومانیوں کے
نزدیک انا کی اہمیت موضوع سے چند زیادہ ہے کیونکہ اس
سے وہ خارج کو اپنی ذہنی گرفت میں لاتا اور اپنے تصور کی مدد سے
نئی شکلیں عطا کرتا ہے

کالرج اپنی مشہور کتاب "بایوگریفیا لٹریریا" میں رقمطراز ہے

"THE PRIMARY Imagination I
HOLD TO BE THE LIVING POWER AND
PRIME AGENT OF ALL HUMAN
PERCEPTION IN THE FINITE MIND
OF THE ETERNAL ACT OF CREA-
TION IN THE INFINITE"

ورڈسورتھ نے PREFACE میں اپنے کلام کو
"WORKS OF IMAGINATION AND SENTIMENT" کہا ہے۔
کیٹس کا دعویٰ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اپنے رومانی جذبے کا اظہار وہ یوں
میں لکھتا ہے:

"I DESCRIBE WHAT I IMAGINE"

شیلی نے شاعری کی مدافعت "میں شاعری کو THE EX- PRESSION OF THE IMAGINATION" کہا ہے۔
[illegible] تصور [illegible]
[illegible]

تیسرا عنصر جو رومانیت سے بہت گہرے طور پر وابستہ ہے
"احساس" (FEELING) ہے عام طور پر ہم رومانی نظم یا رومانی
انداز اسے کہتے ہیں جو بہت زیادہ احساساتی و جذباتی (SENTIMENTAL)
یا رقت آمیز ہو۔ احساس کا تعلق بیشتر قلب انسانی سے ہے تصور، تخیل،
شعور، ادراک، فکر، یہ سب ذہن و دماغ سے متعلق ہیں۔ اس کے برعکس
احساس، جذبہ، رقت، جوش اور کیفیت کے رشتے دل سے استوار ہیں
انسان کا دل احساساتی کیفیات و جذبات کا منبع ہی نہیں رومانیت
کی کلید ہے یہ درد و گداز قلب رومانیت کے تصور کو جلا بخشتا ہے
اور حسیت کی یہ نعمت بغیر دل زندہ کے ممکن نہیں

روسو کنفیشن (CONFESSIONS) میں لکھتا ہے:

" I FELT BEFORE I THOUGHT.
THAT IS MANS LOT

رومانیت کے لیے قلب کی اہمیت اس نقطۂ نظر سے ہیوگو کے الفاظ میں
ملاحظہ ہو:

"THE HUMAN HEART IS LIKE THE
EARTH, YOU CAN SOW, PLANT,
CULTIVATE WHATEVER YOU PLEASE
ON ITS SURFACE, IT WILL BRING-
-FORTH ITS NATURAL VEGETATION,
ITS WILD FLOWERS AND FRUITS.
... .. IT IS THE FOUNDATION OF
ART JUST AS THE EARTH IS OF
NATURE."

فرانسیسی ادیب STAEL بھی قدیم معمولہ ادب ہی اس کا اعتراف
[illegible] کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ [illegible] کی شاعری [illegible] ادب
([illegible])

یہ اجیالی رات

مسعود علی ذوقی

جوت کی مالا گلے میں ڈالے رات کھڑی ہے روپ نکالے
گہری جھیل، روپہلا پانی اُجلی اُجلی رات سُہانی
ندی جل میں چاند کی نیّا تیر رہی ہے بنا کھویا
میٹھی میٹھی، مدھم لے میں گیت سناتی چنچل لہریں

ایک سہانا خواب ہے پیارے
یہ اُجیالی رات !!

بہتے ہیں ندیا دھیرے دھیرے لہریں ناچ رہی ہیں جیسے
کومل بھونکے، پَوَن پہیلی مہکی مہکی، گیلی گیلی
اوس کے موتی بکھرے بکھرے دُوب کے تختے نکھرے نکھرے
دوب کے اوپر ہرن چکارے اونگھ رہے ہیں نیند کے مارے

ایک سُہانا خواب ہے پیارے
یہ اجیالی رات !!

چاند کی کرنیں برسیں چَھم چَھم لہریں مل کر ناچیں باہم
پیڑ کی ڈالیں جھوم کے جھکیں شیتل جل کو چوم کے چمکیں
اڑتے جگنو جم جم چمکیں ہوا میں ناچیں تھم تھم چمکیں
جھوم رہے ہیں خوشی کے مارے نیچے جگنو، اوپر تارے

ایک سُہانا خواب ہے پیارے
یہ اجیالی رات !!

[illegible] قلم

ساغر [illegible]

(آزادیٔ ہند کی [illegible] کے موقع پر)

زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

ذہن پہ اب کوئی پہرہ نہ نگاہیں مجبور
پاؤں میں اب کوئی زنجیر نہ راہیں مجبور
نہ تو نغمے ہی مقید ہیں نہ آہیں مجبور
جبر و بیداد کے سب ٹوٹ چکے دست ستم

زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

ذرہ ذرہ ہے شہیدوں کے لہو سے گلنار
جن کا ہر قطرۂ خوں قول و قسم کا معیار
بات اپنوں کی نہیں جب سکتا غیروں کی دھار
یاد کرتے ہیں تو ہو جاتی ہیں آنکھیں پُرنم

زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

پھر اجنتا و ایلورا کا ہنر رقص میں ہے
فن ٹیگور کا انداز نظر رقص میں ہے
قلعۂ سرخ میں پھر روحِ ظفر رقص میں ہے
اپنے ہاتھوں میں لیے عظمتِ آزادی کا علم

زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

جس کی آہٹ سے اندھیروں کا بھرم ٹوٹ گیا
ظلم کی طاقتِ مغرور کا دم ٹوٹ گیا
جس کی خوشبو سے ہر اک حلقۂ غم ٹوٹ گیا
اُسی احساس کی مشعل کے پرستار ہیں ہم

زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

ذہن گاندھی کی درخشاں تعبیر ہے یہ
مادرِ ہند کی جاگی ہوئی تقدیر ہے یہ
آرزوؤں کے حسیں خواب کی تعبیر ہے یہ
جس نے آنچل سے بنا ڈالے [illegible] پرچم

زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

بجلیاں گرتی رہیں قافلے چلتے ہی رہے
[illegible] کے [illegible] چلتے ہی رہے
منزلیں [illegible] بھی ہم [illegible] چلتے ہی رہے
کیا [illegible] قدم

زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

[illegible]

آنند بھون

اقبال ماہر

یہ قصرِ علم بردارِ وطن
راحت کدۂ سالارِ وطن
فردوسیتِ گلزارِ وطن
صنعت گریِ معمارِ وطن
یہ فنکدۂ فنکارِ وطن
نہرو کا مکاں آنند بھون

یہ قلب و جگر ہے بھارت کا
کاشانہ ہے صاحبِ عظمت کا
ایوان ہے اہلِ سیاست کا
گہوارہ ہے حریت کا
یہ رزم گہہ سالارِ وطن
نہرو کا مکاں آنند بھون

یہ صدر مقام آبادی کا
دل گنگ و جمن کی وادی کا
ملبوس بدن پر کھادی کا
اک سمبل[1] ہے آزادی کا
عزت سے ہے یہ جینے کا چلن
نہرو کا مکاں آنند بھون

یہ گنبد و بام و در و روزن
ہر چیز یہاں فردوس نظر

یہ عزم کی پہلی منزل ہے
یہ امن و اماں کا ساحل ہے
یہ حال رخِ مستقبل ہے
ہر ذرّہ ادب کے قابل ہے
یہ درس گہِ تہذیبِ زمن
نہرو کا مکاں آنند بھون

شاداب کنول نوخیز جواں
دوشیزۂ گل ہے حورِ جناں
پھولوں کی روش ہے بزم بتاں
فوّارہ مثالِ کاہکشاں
یہ باغ ہے یا چوتھی کی دلہن
نہرو کا مکاں آنند بھون

یہ تہذیبوں کا سنگم ہے
الفت کا نظامِ محکم ہے
اک شیر و شکر کا عالم ہے
آمیزش شعلہ و شبنم ہے
جیسے ہو وصال روح و تن
نہرو کا مکاں آنند بھون

خاموشی بہت کچھ کہتی ہے
ہر دل میں محبت رہتی ہے
اک پریم کی گنگا بہتی ہے
یہ انجمنِ یک جہتی ہے
قوموں کا یہاں ہوتا ہے ملن
نہرو کا مکاں آنند بھون

ہر ذرہ نجوم و شمس و قمر
ہر سنگ یہاں ہے لعل و گہر
ہر قطرۂ شبنم دُرِّ عدن
نہرو کا مکاں آنند بھون

---

[1] SYMBOL (علامت)

(افسانہ)



قسمت کی لکیر

صغرا مہدی

ایک عرصے تک تپتے ہوئے صحرا میں سفر کرتے رہنے کے بعد کوئی گھنا سایہ دار درخت مل جائے یا ریگستان میں چلتے چلتے اچانک کوئی چشمہ نظر آجائے تو ایسا ہی تو لگتا ہوگا مگر ریگستان چشمہ...... سراب...... کہیں یہ بھی تو کوئی سراب نہیں؟ کہیں یہ بھی تو پرچھائیں نہیں جو ہاتھ لگاتے ہی غائب ہو جائے گی اُف! یہ بدگمان دل! اسے یہ زندگی کے تلخ تجربے جو اس سے اس خوشی کو بھی چھیننے پر مصر ہیں۔

بچپن میں آسمان پر اڑتے ہوئے جگنو اسے کتنے اچھے لگتے تھے۔ وہ پہروں ان کا پیچھا کرتی مگر کبھی وہ ہاتھ نہ آتے اور زندگی بھر وہ اسی طرح خوشیوں کا پیچھا کرتی رہی تھی...... خوشی اطمینان اور سکون اس کی زندگی سے ہمیشہ ہی عنقا رہے تھے۔ مگر ایسا کیوں ہوا؟ قسمت؟ مگر اس کی قسمت تو بہت اچھی ہے۔ جس نے بھی اس کا ہاتھ دیکھا تھا یہی کہا تھا تمھاری قسمت بہت اچھی ہے۔ اس کے کانوں میں ان لوگوں کے جملے زندگی بھر گونجتے رہے جنھوں نے اس کو خوش قسمت کہا تھا۔

زندگی میں جو ہوا اس کی ذمے دار وہ خود بھی ہے — اس کی زود حسی، خود اعتمادی کی کمی۔ مگر یہ اس کے حالات ہی تو تھے جنھوں نے اسے کم گو، ریزرو اور ایک حد تک قنوطی بنا دیا تھا۔

اب وہ سوچتی ہے کہ آخر اس نے پاپا سے کبھی یہ کیوں نہیں پوچھا کہ روز روز ان کی اور ممی کی لڑائی کیوں ہوتی ہے؟

وہ دن بھر کہاں رہتے ہیں؟ رات بھر کہاں رہتے ہیں۔ اس نے ممی سے بھی کبھی نہ پوچھا ہو تا کہ آخر وہ کس کو ہر وقت برا بھلا کہتی ہیں۔ ان کو ہر وقت غصہ کیوں چڑھا رہتا ہے وہ اس کو جھڑکتی کیوں ہیں۔ جیسے ممی سے تو اسے ڈر لگتا تھا تو آیا سے ہی پوچھا جاتا کہ یہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مگر اس نے کسی سے کبھی نہ پوچھا نہ کسی نے بتایا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔

اور جب ممی کہیں چلی گئیں اور پاپا نے گھر سے اتنی دور بورڈنگ بھیج دیا تو وہ باوجود شدید خواہش کے ان سے یہ نہ کہہ سکی کہ وہ اسے اپنے سے دور نہ کریں۔ وہ انھیں بہت چاہتی ہے۔ جب وہ کبھی پیار کرتے ہیں یا گلے سے لگاتے ہیں تو وہی لمحات اس کے لیے خوشی اور سکون کے ہوتے ہیں۔

بورڈنگ میں آکر کچھ عرصے وہ بہت اداس پریشان اور گھبرائی ہوئی رہی مگر پھر یہ سمجھ کر کہ اب یہیں رہنا ہے خود کو اس نے اس زندگی کا عادی بنا لیا۔ ہوسٹل میں لڑکیوں نے اس سے بہت دوستی کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو اپنی روم میٹ اور ہمسائیوں سے بھی کم ہی بولتی۔ ہاں مسز ایلیون جو اسے ہسٹری پڑھایا کرتیں اسے بہت پسند تھیں اس لیے کہ وہ کبھی اس سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہ پوچھتیں۔ وہ اکثر ان کے کمرے میں [illegible] سے پیش آتیں ادھر ادھر کی باتیں کرتیں، کتابیں اسے پڑھنے کو دیتیں۔ وہ اس کو پڑھنے میں بھی مدد کیا کرتیں۔ [illegible] آپ مسز ایلیون کی طرف کھنچنے لگی اور کچھ

عرصے بعد اسے محسوس ہوا، وہ انھیں چاہنے لگی ہے۔ جی جان سے۔

دن گزرتے گئے۔ وہ ہر کلاس میں امتیاز سے پاس ہوتی رہی ایک کلاس سے دوسرے میں پڑھتی رہی۔ کبھی کبھی پاپا کا خط آجاتا۔ ایک دو دفعہ وہ اس سے ملنے بھی آئے۔ مگر اسے گھر نہیں بلایا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ مسز ایڈون کے ساتھ کسی ہل اسٹیشن پر چلی جاتی

ایک دن اسے پاپا کا خط ملا "میں نے امریکہ جاکر رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے تم چاہو میرے ساتھ چلو چاہو یہیں مسز ایڈون کے ساتھ رہو" وہ ہفتوں سوچتی رہی۔ پاپا نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ "تم میرے ساتھ امریکہ چلو"! اور پھر اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ یہیں رہے گی۔ مسز ایڈون اس کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئیں۔ اس کے پاپا چلے گئے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ۔ ان کے جانے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے شادی کرلی تھی۔

وہ اسکول سے کالج میں آئی تو زندگی کا ایک نیا باب کھلا اسکول کے مقابلے میں کالج کی زندگی اسے زیادہ اچھی لگی یہاں اس کی زندگی میں دو شخصیتیں آئیں۔ ایک اس کا کلاس فیلو اِروِن دوسرے انگلش کے پروفیسر بنرجی، جو ہفتہ میں صرف ایک دفعہ اس کے کلاس میں پڑھانے آتے تھے اور وہ اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتی رہتی۔

چند دنوں بعد اسے محسوس ہوا کہ اِروِن اسے پسند کرتا ہے۔ مسز ایڈون کو بھی پسند تھا۔ اب وہ اکثر گھر بھی آجاتا۔ کبھی کبھی وہ اس کے ساتھ باہر بھی چلی جاتی۔ مگر اسے اروِن کی باتوں سے گھٹن کا احساس ہوتا اور بنرجی کی طرف وہ خود کو آپ ہی آپ کھنچتا ہوا محسوس کرتی۔ وہ ان کی قابلیت اور ذہانت سے بے حد متاثر تھی۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے جھانکتی ذہین اور سیاہ آنکھیں اسے بہت پیاری لگتیں جنھیں وہ گھنٹوں تکا کرتی۔ وہ بھی اس کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتے۔ اس کی ذہانت اور وسیع مطالعہ کی تعریف کرتے۔ انھوں نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جب چاہے ان کے کمرے میں آئے اور جس موضوع پر چاہے گفتگو کرسکتی ہے۔ اگرچہ وہ باتیں زیادہ تر اپنے مضمون یا دنیا کے علم مسائل کے بارے میں ہوتیں۔ مگر وہ حیران رہ جاتی کہ ان کے سامنے اس کی جھجک کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ کس طرح بنرجی کے سامنے بے تکان بولتی ہے ان سے بحث کرتی ہے اور کبھی کبھی لڑ پڑتی ہے۔ اور وہ کس نرمی اور پیار سے اس کو سمجھاتے تھے۔

اس نے ایم اے میں یونیورسٹی بھر میں ٹاپ کیا تھا۔ یہ سن کر مسز ایڈون بے حد خوش ہوئی تھیں اور بنرجی بھی ___ مگر اِروِن! وہ کچھ زیادہ خوش نہ ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ تھرڈ ڈویژن پاس ہوا تھا۔ بنرجی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اس کو باہر جاکر تعلیم حاصل کرنا چاہیے اور اس کو داخلہ اور اسکالر شپ دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ تین سال کے لیے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے باہر جا رہے تھے۔ مگر مسز ایڈون کی خواہش تھی کہ وہ شادی کرلے اور اس کے لیے اِروِن سے زیادہ موزوں لڑکا ان کے خیال میں اور کوئی نہیں تھا۔ خوبصورت، کھاتا پیتا، اچھے خاندان کا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کو جی جان سے چاہنے والا۔ کیا کرے وہ اسی کشمکش میں تھی کہ مسز ایڈون چند دن بیمار رہ کر چل بسیں اور وہ اکیلی رہ گئی۔ مسز ایڈون جو اس کی دوست تھیں، محبوب تھیں، محافظ تھیں اور کیا نہیں تھیں؟ ان کے جانے سے اسے لگتا تھا کہ دنیا خالی ہوگئی۔ مگر اِروِن کی دل جوئی اور محبت نے اس کو زندہ رکھا اور جب اس نے اسے آفر کیا تو وہ انکار نہ کرسکی۔

شادی کے بعد چند دن تک اسے محسوس ہوا کہ زندگی میں سوائے محبت، پیار، آرام، سکون کے کچھ اور ہے ہی نہیں اور اِروِن کو اپنا کر اس نے سب کچھ پالیا۔ مگر۔۔۔ ایک دن اسے بنرجی کے خط سے یہ اطلاع ملی کہ اس کا داخلہ ہوگیا ہے اور اسکالرشپ بھی مل گیا تو اسے اپنے ہاتھ کی لکیریں پر

جھنجھلا سا جانے لگا۔ شام کو یہ خبر اس نے جب اروِن کو سنائی
"اروِن میرا داخلہ ہو گیا ...."
"داخلہ کس کا کہاں؟" اس نے وہسکی کا بڑا سا گھونٹ
لیتے ہوئے کہا تھا۔
"میرا اروِن، میرا۔ میں باہر جا کر پڑھنا چاہتی ہوں نا!"
"گولی مارو پڑھائی کو ...... داخلے کو ...... آؤ
میری جان آؤ میری باہوں میں آ جاؤ" اور یہ کہہ کر اس نے
اس پر لاتعداد بوسوں کی بارش کر دی تھی "شکریہ ڈارلنگ
تم میری ہو صرف میری اور ......" وہ بہت پی گیا تھا۔
صبح جب اس نے پھر اروِن سے اس کا ذکر کیا تو اس
نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور اس خیال کو چھوڑ دینے کا حکم
دیا تھا۔ اس دن وہ دن بھر روتی رہی اور شام کو اس نے
بنرجی کا خط پھاڑ دیا۔

اس کے بعد سے اس پر عجب بے دلی اور بے حسی کی کیفیت
طاری رہتی اور جب بھی بنرجی کا کوئی خط آتا وہ اسے بغیر پڑھے
پھاڑ ڈالتی۔

اروِن اس کا بہت خیال رکھتا۔ اکثر شام وہ باہر گزارتے
کبھی کوئی پارٹی، کبھی فلم، کبھی ڈنر، وہ بہت چاؤ سے اس
کا تعارف کرتا "مائی وائف"۔ دفتر سے ایک دو دفعہ فون کر کے
اس کی خیریت پوچھتا ہر ہفتہ اسے بازار لے جا کر شاپنگ
کراتا جہاں سے وہ بغیر سوچے الم غلم چیزیں اٹھا لاتی۔
کبھی کبھی اروِن دکھی ہو کر اس سے پوچھتا "کیا بات
ہے ڈارلنگ؟ کیا تم خوش نہیں ہو؟"
"نہیں تو اروِن!" وہ مختصر سا جواب دیتی۔
"تمہارا یہ کھویا کھویا انداز، یہ اداس آنکھیں، یہ بے
دلی، یہ بے زاری، آخر یہ سب کیا ہے تمہیں کیا تکلیف ہے؟"
اس کا دل چاہتا کہ اروِن سے کہے "اروِن تم جن چیزوں
سے مجھے خوش کرنا چاہتے ہو کسی انسان کو خوش کرنے کے لیے
وہ کافی نہیں ہیں۔ تم مجھے ایک گڑیا سمجھتے ہو اپنے دل کا بہلاوا۔
تم کبھی یہ کیوں نہیں سوچتے کہ آخر میں بھی انسان ہوں میرے
پاس بھی دل ہے، دماغ ہے، میری پسند و ناپسند ہے۔ تم کو
کتابوں سے نفرت ہے تمہیں میرا کام کرنا برا لگتا ہے تم پڑھنے
سے چڑھتے ہو، کسی سنجیدہ موضوع پر نہ بات کرتے ہو نہ سنتے ہو۔
اروِن مجھے تمہاری باتیں، تمہارا ماحول، تمہارا پیار سب سطحی، مصنوعی
اور کھوکھلا لگتا ہے۔ مگر وہ یہ سب کچھ صرف سوچتی رہ جاتی اور
اروِن جھنجھلا کر چلا جاتا۔

اور پھر ان کے درمیان دوری پیدا ہونے لگی جو وقت کے
ساتھ بڑھتی رہی۔ اب اروِن بھی جھنجھلایا، خفا اور بیزار نظر آتا۔
وہ خود کو مجرم سمجھتی جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں نہ خوشی ہے
نہ اطمینان۔ وہ اب اکیلے ہی باہر چلا جاتا رات گئے واپس آتا۔
اس وقت وہ مطالعہ میں غرق ہوتی۔ وہ چپکے سے لیمپ بجھاتا،
اس کی طرف سے کروٹ لیتا اور سو جاتا۔ اور وہ خود؟ اس
کے پاس تو چین کی نیند سونے کا تصور بھی نہ رہا تھا۔
ایک دن شام کو وہ ریکارڈ پلیئر پر کوئی ریکارڈ سن رہی
تھی کہ اروِن بپھرا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے
آتے ہی چیخنا شروع کر دیا "تو اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی
اب اس بدمعاش سے چھپ چھپ کر خط و کتابت بھی ہونے لگی؟" وہ
کچھ نہ سمجھ سکی کہ اروِن کیا کہہ رہا ہے "یہ کیا ہے؟" اس نے
چند پرزے اس کی طرف پھینکے جو کمرے میں چاروں طرف
بکھر گئے۔

"اروِن میں نے تو ان خطوں کو پڑھا بھی نہیں۔"
"تم نے کہا اور میں نے یقین کیا۔ اب بے وقوف بنانے
کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہاری چال سمجھ گیا ہوں۔ مگر اب اس
کی ضرورت نہیں۔ تم جہاں اور جس کے پاس جانا چاہتی
ہو چلی جاؤ۔ اب میں اپنے گھر میں تم کو ایک منٹ برداشت نہیں
کر سکتا۔"

شاید اروِن آخری جملہ نہ کہتا تو وہ اسے مناتی، اس
کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتی مگر آخری جملے نے اس

کی زبان بالکل بند کردی اور وہ بستر اپنے دل سے لگ کر بیٹھ گئی اور دیر تک اپنی قسمت کی لکیر کو دیکھتی رہی۔

اس نے مقامی کالج میں پڑھانے کی ملازمت کرلی تھی۔ ایک دن کالج سے باہر نکلی تو دیکھا بنرجی کار میں بیٹھے ہیں۔ وہ نظر بچاکر نکلنا چاہتی تھی کہ انھوں نے اسے روک لیا اور وہ ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔

بنرجی نے ایک دفعہ اسے پھر زندگی سے پیار کرنے کا حوصلہ دیا، کچھ کرنے پر اکسایا۔ ان سے مل کر اسے محسوس ہوا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ وہ روز شام کو آجاتے اور دونوں گھنٹوں دنیا بھر کی باتیں کرتے رہتے یہاں تک کہ نوکر ان کو یاد دلاتا کہ کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ وہ چلے جاتے۔ اور وہ ان کا تصور لیے سو جاتی اور صبح اس امید کے ساتھ اٹھتی کہ شام کو بنرجی سے ملے گی۔

چند دن سے اس نے یہ محسوس کیا تھا جیسے بنرجی اسے اپنے سے قریب کرلینا چاہتے ہیں، اتنا قریب کہ وہ گھبرا جاتی۔ وہ اب اس سے باہر جانے کی فرمائش بھی کرتے مگر وہ ٹال جاتی۔ انھوں نے اس سے شملہ ساتھ چلنے کو بھی کہا تھا جہاں وہ اپنی کتاب کے لیے جانے والے تھے۔ اس کا ساتھ جانا اس لیے ضروری تھا کہ اس سے ان کو انسپریشن ملتا تھا۔ مگر اس نے سختی سے انکار کردیا۔ آخر وہ کس حیثیت سے ان کے ساتھ جا۔

روز رات کو وہ اسے وہاں سے فون کرتے اس کی خوبصورت اور پیاری آواز سننے کے لیے۔ اور وہ خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ شام سے ہی فون کا انتظار کرنے بیٹھ جاتی۔ انھوں نے اپنی کتاب اس کے نام ان الفاظ میں معنون کی تھی۔ "اس خوشی کے نام جو مجھ سے گریزاں ہے" اور پھر اس سے ملاقات کرکے ان کو سب کچھ بتا دیا سب کہہ دیا۔ وہ اب ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ ان کی ہونا چاہتی ہے۔ انھیں اپنا کہنا چاہتی ہے۔

کال بیل کی آواز نے اسے خیالات کی دنیا سے باہر پھینکا۔ شاید ان کا خط ہو۔ ان کن الفاظ میں انھوں نے اس کے خط کا جواب دیا ہوگا۔ وہ کتنے خوش ہوئے ہوں گے۔ فون پر تو صرف اتنا ہی کہا تھا۔ "میں آج ابھی ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تمھارے خط کا جواب دے دیا ہے۔ تمھیں آج ہی مل جائے گا۔"

"میم صاحب چٹھی۔"

اس نے خط نوکر سے جھپٹ لیا۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے اس نے خط کھولا...... "شوبھی! مائی لو ابھی تھوڑی دیر پہلے تمھارا خط ملا۔ تم اتنے دقیانوسی انداز سے سوچو گی مجھے امید نہیں تھی۔ اور یہ بتاؤ کیا اب ہم ایک نہیں ہیں۔ کیا میں تمھیں جی جان سے نہیں چاہتا ہوں۔ شوبھی ڈارلنگ! تم ہی تو میری تنہا ویران زندگی میں ایک روشن ستارہ ہو۔ میری زندگی میں وہی لمحے پُرمسرت اور پُرسکون ہوتے ہیں جو میں تمھارے ساتھ گزارتا ہوں۔ ہمارے درمیان جو آرٹسٹک رشتہ ہے اس کو دقیانوسی، ٹپیکل، بے رنگ بندھنوں میں باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم چند گھنٹے ایک ساتھ مل کر گزاریں۔ زندگی کی ساری تلخیاں، سارے ٹینشنز (TENSIONS) کو بھلا کر بہت کافی ہے اور یہی سب کچھ ہے..."

اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اسے لگا وہ جگنو جو بہت مشکل سے اس کی گرفت میں آیا تھا، وہ بھی اڑ گیا اور اب اس میں اس کے پیچھے دوڑنے کی سکت بھی نہیں ہے۔ وہ گھور اندھیرے میں کھڑی ہے تھکی ہوئی تشنہ لب بے سہارا.....

اس نے اپنے ہاتھ کی لکیر دیکھی۔ وہ بہت خوش قسمت ہے۔ یہ لکیر دیکھتی رہی، دیکھتی رہی نہ جانے کب تک ا.... پھر اسے لگا جیسے وہ دھندلی ہوتی جا رہی ہے اور پھر ——— وہ دھندلی ہوتے ہوتے غائب ہوگئی۔

غزلیں

حرمت الاکرام

دھڑکنوں میں بسی ہے تنہائی   سازِ دل چھیڑتی ہے تنہائی
اترا جاتا ہے دل میں سناٹا   درد کی بانسری ہے تنہائی
دن ڈھلے آئے شام کی ڈولی   راستہ دیکھتی ہے تنہائی
نقشوں کے اتر گئے سپنے   بام و در میں سجی ہے تنہائی
کیسے پوچھوں بتائے گی بھی کیا   کیوں سرہانے کھڑی ہے تنہائی
کاٹ لو رات کیوں زباں کھولو   وقت کی منھ لگی ہے تنہائی
بات کرتی ہے صورتِ محبوب   ہمہ شب جاگتی ہے تنہائی
جاگ اٹھتی ہے روح خوابیدہ   رات کی زندگی ہے تنہائی
جسم سے ہے لگا ہوا سایہ   ساتھ دل کے لگی ہے تنہائی
گھر سے نکلوں تو کس طرف جاؤں   راہ روکے کھڑی ہے تنہائی
قربتیں ہیں کہ آستیں کی چھری   یہ بھی اک قسم کی ہے تنہائی
راہزن بن گیا اک اک لمحہ   مجھ سے بڑھ کر لٹی ہے تنہائی
خوابِ امروز کا ہوں آئینہ   میرا منھ دیکھتی ہے تنہائی
رابطوں نے بنائی ہے زنجیر   جاں بجاں پل رہی ہے تنہائی

میری ہی طرح دیر سے حرمت
جانے کیا سوچتی ہے تنہائی

شوکت پردیسی

چاروں طرف فضا میں اداسی بکھر گئی
تم کیا گئے کہ رونقِ شام و سحر گئی

میرا سلامِ شوق انھیں ہو گیا قبول!
نظروں کی احتیاط بڑا کام کر گئی

جب کچھ نہ بن پڑا تو یہ عذرِ شکستِ شوق
کوتاہیٔ عمل بھی مقدر کے سر گئی

ناکام آرزو بھی بہت کامیاب تھی
کچھ دیر تو حیات کو آسودہ کر گئی

تھا جسم سے بلند مرا مرتبہ مگر
جب بھی کوئی نگاہ اٹھی جسم پر گئی

اٹھی تھی ایک موج ترے التفات کی
وہ بھی سرشکِ درد سے دامن کو بھر گئی

اوروں کا عیب سب کو گناتے پھرے مگر
خود اپنی خامیوں پہ نہ شوکت نظر گئی

غلام مرتضیٰ راہی

نظر آتا ہوں، لیکن بے نشاں ہوں
اگر دیکھو تو میں بھی آسماں ہوں

اٹھایا ہے سوال اک ایسا میں نے
کہ خود میں بھی شریکِ امتحاں ہوں

مری شہرت کا اندازہ بھی کیا ہو
وہ پہونچا ہوں کہ اپنے درمیاں ہوں

حقیقت کو مری محسوس کر لے
زباں پر آ گیا تو داستاں ہوں

ابھی کچھ دیر پہلے میں یہیں تھا
مگر اس وقت میں جانے کہاں ہوں

مری تصویر کا اک اور رُخ ہے
کہ میں قطرہ ہوں لیکن بیکراں ہوں

بکھرتا جا رہا ہوں ہر قدم پر
میں اپنی کوششوں سے رائیگاں ہوں

بندھا لیتا ہوں ڈھارس تیرے جی کو
مگر اپنی طبیعت پر گراں ہوں

نصیر پرواز

ڈھکیل یاس کی غاروں میں کو ہسار ہے مجھے
میں آسماں ہوں زمیں پر ذرا اتار مجھے
یہاں حیات کے لمحے گنے نہیں جاتے
یہ خواہشوں کا نگر ہے یہاں نہ مار مجھے
یہ آئینہ مرے چہرے کو اور دھندلا دے
کسی طرح تو کرے کوئی شرمسار مجھے
بہت وسیع ہے مجبوریوں کی انگنائی
اگر میں دور رہوں چیخ کر پکار مجھے
وہ جس کے واسطے معصومیت کا زہر پیا
اسی نظر نے کیا بار ہا شکار مجھے
میں تیرا نام جو لوں گا حیات مہکے گی
رکھے گی ساتھ ہر اک گام پر بہار مجھے
ہر ایک شخص مجھے پائمال کر نکلے گیا
ہر ایک شخص سمجھتا تھا ہوشیار مجھے
جو ساتھ لاے ترے دستِ ناز کی خوشبو
کوئی کرے اسی پتھر سے سنگسار مجھے
مرے یقیں مرے احساس کو جواں رکھنا
نہیں ہے عمر گریزاں پہ اختیار مجھے
تری شکست میں اک تمکنت کا زور سہی
مگر خدا کے لیے اس طرح نہ ہار مجھے
اداس آنکھوں میں ٹھنڈی سی روشنی بن کر
کبھی تو اشک کی مانند ہی ابھار مجھے
میں اپنے چہرے کی زردی پہ ہو اٹھا ہوں اداس
ہوا بکھیر چلی جیسے اک غبار مجھے

★

بشیر فاروقی

تذکرہ میں ترے اک نام یونہی جوڑ دیا
دوستوں نے مجھے شیشے کی طرح توڑ دیا

اب تو آ جائیں مجھے چھوڑ کے جانے والے
میں نے خوابوں کے دریچوں کو کھلا چھوڑ دیا

زندگی نکلی تھی ہر غم کا مداوا کرنے
چند چہروں نے خیالات کا رخ موڑ دیا

عمر بھر اب تو وہ دھڑکے گا زمانے والو
تم نے سینے میں جو غم دل کی طرح چھوڑ دیا

قدرداں قیمتِ بازار سے آگے نہ بڑھے
فن کی دہلیز پہ فنکار نے دم توڑ دیا!

یوں تو رسوائے زمانہ سہی لیکن اس نے
میرے ساتھ آ کے روایات کا رخ موڑ دیا

اس چمن میں بھی ہمیں چین میسر نہ ہوا
جس چمن کے لیے تم نے یہ چمن چھوڑ دیا

میں مسافر نہیں آوارۂ منزل ہوں بشیر
گردشِ وقت نے یہ دیکھ کے دم توڑ دیا

عالموں اور دانشوروں کو اعزازی اسناد

ادارہ

یوم آزادی ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند نے سنسکرت، عربی اور فارسی کے جن عالموں کو اعزازی سند دی ہے ان میں مولانا امتیاز علی عرشی اور ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی کو بالترتیب عربی اور فارسی کے لیے یہ اعزازی اسناد دیے گئے ہیں۔ مولانا عرشی عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے ممتاز عالم ہیں اور اپنے وطن رامپور میں علمی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر اور ماہر ایرانیات تسلیم کیے جاتے ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اعزازی لیکچرر (اردو) مقرر کیا ہے۔ شبلی کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہو گئے اور وہیں علمی اور تحقیقی کاموں میں مشغول ہیں ——

ایڈیٹر

امتیاز علی عرشی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی اردو، عربی اور فارسی کے ایک متبحر عالم، اور جید ادیب ہیں۔ ان کو علوم مشرقیات کی چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آپ کی بیش بہا ادبی خدمات اور علمی کارناموں کو پورے برصغیر میں شرف قبولیت کا درجہ مل چکا ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۹۰۴ء میں رامپور (یوپی) میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم مدرسہ مطلع العلوم، رامپور اور اس کے بعد اورینٹل کالج، لاہور اور اورینٹل کالج، رامپور میں حاصل کی۔ آپ برسوں سے رضا لائبریری، رامپور کے لائبریرین ہیں۔ یہ لائبریری ہندستان میں اپنی نوعیت کی واحد لائبریری ہے جس میں مشرقی علوم اور اسلامیات سے متعلق ہاتھ کے لکھے ہوئے پندرہ ہزار سے زائد نادر مسودات موجود ہیں۔ مولانا عرشی اب تک ۴۰ کتابیں اور تقریباً سو تحقیقی مضامین لکھ چکے ہیں۔

آپ کو ۱۹۶۱ء میں دیوان غالب (نقوش عرشی) مرتب کرنے پر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق نائب صدر جمہوریہ ہند نے آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں "نذر عرشی" پیش کیا۔ سال رواں میں آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر ملک کے جن ۲۵ مشہور و معروف ادیبوں کو صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے اعزازی سند دی گئی ہے ان میں مولانا عرشی بھی ہیں۔ آپ نے غیر ممالک میں بھی مستشرقین کی کانفرنسوں میں ہندستان کی متعدد بار نمائندگی کی ہے۔

مولانا نیاز فتحپوری نے نگار بابتہ مارچ ۱۹۴۳ء میں مولانا عرشی کے بارے میں اپنے مخصوص انداز میں یہ لکھا تھا: "مولویوں کے طبقے میں مولانا عرشی کی واحد ذات ایسی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی محبت سے مجھے کافر بنا سکتے ہیں چاہے اس کفر کا نام ان کے یہاں اسلام ہی کیوں نہ ہو"۔ جرمنیا اور عربی کے بین الاقوامی شہرت یافتہ عالم مسٹر مالکم جاٹ جو اس وقت کیمبرج یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں، مولانا عرشی کی علمیت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں

"یہ ایڈیٹر اپنی تخلیقات میں اتنی جانفشانی اور دیدہ ریزی سے کام لیتا ہے کہ یورپین ادیب اس سے متاثر بلکہ حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم فرماتے ہیں" مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے متعدد تصنیفی کارنامے علمی اور ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ پچھلے ۲۵۔۳۰ برس میں انھوں نے جو تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے اس سے جہاں ہماری زبان کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہوا، وہیں ہمارے نئے لکھنے والوں کو رہنمائی بھی ملی ہے۔ کئی قیمتی اور قابل قدر کتابیں محض انھیں کی کوشش اور ذوقِ جستجو کی بدولت پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی ہیں۔ کئی پرانی کتابوں کو انھوں نے اپنے حسن ترتیب سے نئی زندگی بخش دی ہے۔ خاص طور پر متنوں کے تحشیہ و تدوین کا جو بلند معیار انھوں نے قائم کیا ہے وہ کسی زبان کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے۔"

سیّد امیر حسن عابدی

پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی فارسی کے ایک مستند عالم اور بلند پایہ ادیب ہیں جو اپنے ادبی کارناموں کے لیے ہندستان کے علاوہ ایران میں بھی داد تحسین پا چکے ہیں۔ آپ یکم جولائی [illegible] کو غازی پور (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم [illegible] میں پائی۔ اس کے بعد سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخلہ لیا اور آگرہ یونیورسٹی سے فارسی میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن میں ایم۔ اے کیا۔ اسی یونیورسٹی نے آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی (فارسی) ڈگری دی۔ [illegible] میں آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایران تشریف لے گئے اور تہران یونیورسٹی سے بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ [illegible] اور [illegible] کے درمیان ایک فارسی ادبی رسالہ بھی آپ کے زیر نگرانی شائع ہوا۔ [illegible] میں ہند فارسی ادب کی تاریخ کا مواد جمع کرنے کے لیے کابل یونیورسٹی کے مہمان کی حیثیت سے آپ افغانستان بھی گئے۔ آپ ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے فارسی اور عربی سے متعلق مشاورتی بورڈ کے رکن رہے ہیں۔ [illegible] میں ماہر ایرانیات کی ورلڈ کانگرس میں شرکت کرنے کے لیے آپ پھر ایران گئے۔ آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر آپ کو ادبی خدمات کے صلے میں ہندستان کے صدر کی جانب سے اعزازی سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے۔ عابدی صاحب کی اب تک سات کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور بہت سے تحقیقی مقالے ہندستان اور غیر ممالک کے مستند رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ نیا دور کی قلمی اعانت بھی عابدی صاحب فرماتے رہتے ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی اسکیم کے تحت دہلی یونیورسٹی نے آپ کی مزید تین کتابوں کو شائع کرنے کے لیے سفارش کی ہے۔

اس وقت عابدی صاحب دہلی یونیورسٹی میں فارسی اور عربی شعبے کے صدر ہیں۔

سیّد صباح الدین عبدالرحمان

سید صباح الدین عبدالرحمان ایم۔ اے بلند پایہ کے محقق اور مصنف ہیں۔ سید صاحب کے تحقیقی اور علمی کارنامے نمایاں کر کے اردو ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ آپ دیسنہ ضلع پٹنہ (بہار) میں [illegible] میں پیدا ہوئے۔ تعلیم پٹنہ اور علی گڑھ میں پائی۔ ۱۹۳۶ء میں ہی دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں آ گئے۔ درس و تدریس اور پڑھنے پڑھانے اور لکھنے میں موصوف کو ایسی لذتیں ملیں کہ اسی کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنا لیا۔ چنانچہ [illegible] سے [illegible] تک شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ میں علمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اور کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی کہیں اور جانا پسند نہ کیا بلکہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں ہی علمی و ادبی اور تحقیقی پیاس

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

مثنوی کے چند اہم کردار

★ قاضی عبید الرحمان ہاشمی

کردار کے بغیر کسی کہانی کا تصور کرنا محال ہے۔ کہانی میں کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے جس طرح کوئی کہانی خلا میں جنم نہیں لے سکتی اسی طرح کردار کی شمولیت کے بغیر بھی کہانی کا وجود تقریباً ناممکن ہے۔ کہانی اپنی تکمیل کے لیے بھی کردار کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کی نوعیت جو بھی ہو اور جس مقصد کے لیے بھی لکھی گئی ہو اس میں کردار جزو لازم کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کہانی بیشتر کرداروں ہی کو پیش کرنے کے لیے لکھی جاتی ہے اس کے مختلف عناصر ترکیبی مثلاً جذبات، مکالمہ وغیرہ کردار کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں، اس کے ذہن اور اس کی زندگی کے نقوش کو اجاگر کرتے ہیں جس کے سبب کہانی زیادہ جاندار اور دلچسپ ہو جاتی ہے۔ کردار کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ کہانی میں جس مقام و منصب کی نمائندگی کرتا ہو اس میں وہ اپنی بے پناہ صلاحیتیں صرف کر سکتا ہے اور یہ ثابت کر سکتا ہو کہ وہ مذکورہ منصب کا حقدار تھا۔ کردار جامد بھی ہو سکتے ہیں اور ٹھوس بھی، فعال بھی ہو سکتے ہیں اور غیر فعال بھی البتہ ظاہر ہے کہ چونکہ وہ حقیقی زندگی ہی کے نمائندہ ہو کر ایک تمثیلی سطح حیات پر ابھرتے ہیں اس لیے ان کے اعمال کے مطابق ہی ہم ان پر کوئی حکم صادر کرتے ہیں اور ان کے اعمال سے ہم پر وہی رد عمل و کیفیات ظاہر ہوتی ہیں جن کا ہم واقعی اور اصلی زندگی میں ہر آن تجربہ کرتے ہیں۔ اب اگر یہ کردار کہانی میں فعالیت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ہم ان سے زیادہ محظوظ ہوتے ہیں لیکن اگر وہ بودے پن اور انفعالیت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ہمیں کبھی کبھی ان سے نفرت اور بعض اوقات ان کی ذات سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تناظر میں ہم ذیل کے تین کرداروں کا مطالعہ پیش کریں گے۔

(۱) سحرالبیان میں وزیرزادی نجم النساء (۲) گلزارِ نسیم میں تاج الملوک اور (۳) زہرِ عشق میں مہ جبیں۔ سحرالبیان میں نجم النساء کی صحیح حیثیت کا یقین و اعتراف دونوں اس وقت تک محال ہوگا جب تک ہمارے سامنے تقابل و تضاد کے واسطے دوسرے کردار موجود نہ ہوں اس لیے کہ نجم النساء مجموعی طور پر انھیں کرداروں کے درمیان رہ کر ہم سے اپنی ہستی کا اعتراف کراتی ہے۔

ابتدا میں اس مثنوی میں بادشاہ کا کردار سامنے آتا ہے جس کے تصور سے ہم فطری طور پر اپنے ذہن میں بہت ساری امیدیں قائم کر لیتے ہیں لیکن وہ ہماری کسی بھی توقع کا زیادہ عرصے تک ساتھ دینے کی اپنے اندر سکت نہیں رکھتا۔ اس کی ذات ہر لمحہ تضادات کو جنم دیتی رہتی ہے اور بالآخر وہ زندگی کے کھوکھلے پن سے مجبور ہو کر اور بار حزن کی تاب نہ لاکر داستان کے افق سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جاتا ہے۔

دوسرے ہی لمحے ہم مثنوی کے مرکزی کردار شاہزادہ بے نظیر سے متعارف ہوتے ہیں۔ اس کردار کی تخلیق میں مصنف کا عیش و آسودگی مزاج اس حد تک آزادی کا مظاہرہ کرتا ہے کہ یہ کردار حقیقت و واقعیت سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس پر حقیقت کا التباس تک نہیں ہوتا۔ اس کی نسوانیت اور نسائی حسن اس کے لیے ایک ایسا دامِ فریب بن جاتا ہے کہ وہ اسی میں گھٹ گھٹ کر فنا ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ بے نظیر کے کردار میں اس درجہ انحطاط اور انفعالیت اس معاشرتی اور تہذیبی زبوں حالی کا پیدا کردہ ہو جس کے تحت آصف الدولہ کے سماج میں منفی صفات ایک نقطۂ محوری بن کر ابھری تھیں۔ کم و بیش انھیں صفات سے اس کی محبوبہ بدر منیر کا بھی

کردار عبارت ہے جو زندگی میں روحانی خلا کو جنسی اتصال کی لذت ہی سے پُر کرنے میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر ناسجے بڑا فن تصور کرتی ہے۔

ان کرداروں کے روحانی جمود کے سبب جب قاری خود کو ایک کابوس میں گھر جانے کا تجربہ کر رہا ہوتا ہے اس وقت اچانک نجم النسار کا "قیامت شریر چہرہ" اسے ایک غیر معمولی فرحت بخش تجربہ سے دوچار کر دیتا ہے ؎

تھی ہمراہ اک اس کے دخت وزیر | نہایت حسین اور قیامت شریر
زبس تھی ستارا سی وہ دلربا | سے لوگ کہتے تھے نجم النسار

نجم النسار کی ذات وہ ذات ہے جو پہلی بار اپنی جولانیٔ طبیعت کا مظاہرہ کر کے داستانوی بحر ظلمات کے پیدا کردہ سکوت کو توڑنے کی سزاوار ہوتی ہے اور ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک مانوس، زندہ اور زندگی کی رعنائیوں سے معمور جہان میں سانس لے رہے ہیں۔ نجم النسار اپنے اعمال سے اس روحانی خلار کو بھی پر کرنا چاہتی ہے جو جاگیردارانہ تہذیب کے پروردہ کرداروں کی زندگیوں کو رنگ آلود کرنے پر آمادہ ہے لیکن شاید ان کی بے حسی اور بے دلی اس درجہ بڑھ چکی ہے جو خود اس کے بھی ختم کرنے سے ختم نہیں ہو سکتی، اس کی ایک تصویر ملاحظہ ہو ؎

انھوں کے کے بیٹھنے سے خفا | ہوئی دل میں اپنے وہ نجم النسا
گلابی کو لا اس کے آگے دھرا | پیالے کو پھر جلد اس سے بھرا
کہا شاہزادی کو بیٹھی ہے کیا | یہ پیالہ تو اس بت کے منھ سے لگا

نجم النسار کی ذات اس وقت اور بھی زیادہ دلربا اور دلکش ہو جاتی ہے جب وہ اپنی سہیلی بدر منیر کے آلام کو کم کرنے کے لیے اپنی وفا شعاری اور جرأت کا مظاہرہ کر کے جوگن کا روپ دھار لیتی ہے اور بے نظیر کی جستجو میں صحرا نوردی اس کا مقدر ہو جاتی ہے ؎

سنا جبکہ نجم النسار نے یہ حال | ہوئی بیقراری تب اس کو کمال
لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا | ترے واسطے میں نے اب دکھ سہا
بس اب سر پہ پھر کر نکلتی ہوں میں | اسے ڈھونڈ لانے کو چلتی ہوں میں
جو باقی رہا کچھ مرے دم میں دم | تو پھر آ کے یہ دیکھتی ہوں قدم
دگر مر گئی تو بلا سے موئی | تو یوں جانیو تجھ پہ صدقے ہوئی

اس کردار میں ہمیں صرف تحریک ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ اس روح کا بھی سراغ ملتا ہے جو سارا عشق پر محو رقص ہے اور جس کے ذکر کشش سے تمام فضائیں مہک جاتی ہیں۔ نیز دہ شخصیت ایک مرئی مخلوق ہونے کے باوجود اس سا حوب پیدا ہونے والے نغموں سے سرشار نظر آتا ہے ؎

کبھی خوش کیا اور کیا گہہ اداس | کبھی دور بیٹھی کبھی آ کے پاس
کبھی منہ چھپایا دکھایا کبھی | کبھی مار ڈالا جلایا کبھی

ہمارے دل پر نجم النسار کے کردار کا نقش بہت گہرا ہوتا ہے خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کی ذات اس ماحول میں بھی اپنے فرائض سے تغافل نہیں برتتی جس میں زندگی کی ساری اقدار ایک ایک کر کے ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں اور جہاں ہر اصول اور نظم و ضبط کو جذبے کی صلیب پر آویزاں کر دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف خود نجم النسار کی زبانی اگرچہ زیب نہیں دیتا لیکن چونکہ اس کے اعمال بھی اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اس لیے اس کے اعتراف کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ؎

میں نجم النسا ہوں اس کی دخت وزیر | ہمیشہ سے ہمراز تھی اور مشیر
جدا ایک دم اس سے ہوتی نہ تھی | سلانے بغیر اس کو سوتی نہ تھی
خوشی سے بہر کار غم سے فراغ | برنگ چمن رہتی تھی باغ باغ

آخر میں اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ نجم النسار کے کردار کی گہرائی اور اس کا ذہنی اور روحانی اضطراب اس کی ذاتی اور انفرادی خصوصیات ہیں جو کسی بھی زمانے، ماحول اور معاشرے میں کسی بھی انسان کی ذات میں یکجا ہو سکتی ہیں البتہ ان کے داخل اشت کے لیے توفیق کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رہا یہ مسئلہ کہ نجم النسار بھی بعض حالات میں جنسی بحر مہا لذری برہنگی اور عیش و طرب کے مواقع ڈھونڈ لیتی ہے تو یہ چیزیں اسے اپنے معاشرے سے حاصل ہوئی ہیں اور وہ خود کو ان چیزوں سے محفوظ بھی نہیں رکھ سکتی تھی اس لیے کہ کوئی بھی فرد جو ذرا بھی حساس مزاج اور ذہن رکھتا ہوگا وہ نہ تو معاشرتی سطح پر پیدا ہونے والی حقیقتوں سے آنکھیں چرا سکے گا اور نہ ہی ان کی عطا کردہ لغزشوں یا نعمتوں سے ہی وہ سبکدوش ہو سکے گا۔ میرے پیش نظر یہاں وہ غیر معمولی ہستیاں نہیں ہیں جو اپنی صلاحیت اور استقامت کو بروئے کار لا کر زمانے کے سیل کو موڑ دیتی ہیں اور خود زمانے کے نقش کو قبول کرنے کے بجائے اپنی شخصیت کے دائمی نقوش کو زمانے پر ثبت کر دیتی ہیں۔ نجم النسار کے کردار کی تمام تر خوبیاں یا خامیاں ایک مخصوص معاشرے میں

دبھرتی ہیں جن سے ہمیں ان کے مطالعہ میں اس نقطۂ نظر کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے
ہمارے سامنے دوسرا کردار گلزارِ نسیم میں تاج الملوک کا ہے۔

گلزارِ نسیم میں بہت سے کردار ہیں لیکن ہماری توجہ شدّت کے ساتھ اپنی طرف منعطف کرانے میں صرف دو کردار کامیاب ہوتے ہیں۔ تاج الملوک اور بکاولی۔ بکاولی مصنف کی ایک عظیم اختراع ہے لیکن چونکہ وہ ماورائی دنیا سے تعلق رکھتی ہے اس لیے وہ مرئی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کے باوجود کبھی کبھی ہماری عقل کی حدوں سے پرے چلی جاتی ہے اس لیے اس کی ہیت کا اعتراف کرنے کے لیے ہمیں ماورائی معیار کا سہارا لینا پڑے گا جو ظاہر ہے کہ ہمارے لیے کچھ بہت زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتا۔ یہ مسئلہ بالکل ہی دوسری نوعیت کا حامل ہے کہ مصنف مرئی اور غیر مرئی میں اتصال کی ضرورت کیونکر محسوس کرتا ہے اور اس کا منطقی جواز بھی اس کے پاس ہے یا نہیں۔ اس کا ایک سیدھا سادا جواب ہے کہ چونکہ ہمارے داستان گویوں پر ہمیشہ خود سپردگی کا جذبہ طاری رہتا ہے اور وہ زندگی کو کلی طور پر تخیل ہی کے آئینے میں دیکھتے تھے اس لیے انھوں نے طلسم کو حقیقت بنا کر پیش کرنے کی جسارت کی لیکن اس پیش کش میں سائنسی اور تکنیکی منطق کا گزر نہیں تھا اس لیے آج وہ حقیقت مشتبہ ہو کر رہ گئی ہے اور اس میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے ہیں۔

گلزارِ نسیم کی کہانی ابتدا تا انتہا ایک علامتی رنگ لیے ہوئے ہے چنانچہ اس کی اصل معنویت کا انحصار ان علامتوں کی عقدہ کشائی اور تفہیم پر ہے۔ یہاں کہانی بھی علامتی نوعیت رکھتی ہے اور کردار بھی۔

تاج الملوک کہانی میں زندگی کی افتاد سے نپٹنے، آلام زمانہ سے نبرد آزما ہونے کی علامت ہے جو زندگی کے ہر مرحلے میں اپنی خداداد صلاحیتوں اور مقاومت کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے لیے حالات کو سازگار بنا تا ہے اور یہ بات آخر میں واضح ہو جاتی ہے کہ عزم مسلسل اور تدبر سے انسانی دنیا کی تقدیریں بدل سکتا ہے۔ تاج الملوک اپنے بڑھے بادشاہ باپ کی پانچویں اولاد ہے۔ اس کے چار بھائی جن کے نام علامتی نوعیت کے حامل ہیں (دانا، عاقل، ذکی، خرد مند) اپنی صفات کی ضد ہیں جن کا ارتقا اگرچہ کہانی میں فطری انداز میں ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ اپنی بدباطنی سرشت کا بوجھ اٹھانے کے متحمل نہیں ہو پاتے۔ اس لیے بہت جلد جلد وہ فراموش گاری کی نذر ہو جاتے ہیں اور صرف تاج الملوک کی ذات وہ سہہ کر جائے

شوقِ جستجو اور شوقِ نظارہ کے سامان فراہم کرتی ہے، اس کا نام جو علامتی حیثیت رکھتا ہے بالآخر وہ خود کو صحیح معنوں میں وارث تخت و تاج ثابت کرتا ہے۔

تاج الملوک اور اس کے چار بھائیوں کے درمیان کوئی موازنہ ممکن نہیں اس لیے کہ یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے دو زمانوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ چار بھائی اپنے باپ کے مطیع اور ایک طور پر محفوظ حالات میں ہیں اس کے برعکس تاج الملوک نئی نسل کی نمایندگی کرتا ہے جو نئے اقدارِ حیات کا پجاری ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی معاشرہ کے عتاب و سرزنش کا سلسلہ اس پر شروع ہو جاتا ہے۔ اس کو دیکھ کر باپ کا اندھا ہو جانا خود اس بات کی علامت ہے کہ لاشعوری طور پر اس کے اندر بیٹے کے تئیں ایڈیپس کامپلکس پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نئی روشنی کو زیادہ عرصے تک دیکھ نہیں سکتا ؎

پیارا ہے یہ وہی کہ دیکھ اسی کو
پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو

باپ کے اندر اس (COMPLEX) کا خاتمہ اس وقت ہوتا ہے جب بالآخر تاج الملوک ہی اس کے لیے گل بکاولی کو فراہم کرنے کا سبب بنتا ہے جس سے اس کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

تاج الملوک ماحول و معاشرہ کے جبر سے صحیح ردِ عمل قبول کرتا ہے اور مصائب اس کے لیے ایک حقیقی ہیچ بن جاتے ہیں۔ وہ اپنے مقصدِ حیات کے حصول کی تمنا کو سینے سے لگائے زندگی کی مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا اصل منزل تک پہنچتا ہے۔

تاج الملوک کو اصل مقصد سے سروکار ہے چنانچہ وہ خود اپنی ذات میں مستور تاریکیِ نفس تک کی مزاحمت کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ارم کے ڈانڈے پر پہنچ کر دیو کو زیر کرنے کی علامتی حیثیت یہی ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہوتا ہے چنانچہ یہی دیو (تاریکیِ نفس) اپنی بے بسی کا اعتراف کر کے اس کی رہبری کرنے لگتا ہے ؎

پیارا ہے مرا یہ آدمی زاد دیکھو اسے جس طرح مری یاد
مہماں ہے چاہیے جو کچھ سازش مہماں ہے کیجیو نوازش

تاج الملوک باغِ ارم میں پہنچ کر بالآخر گل بکاولی کو توڑ لیتا ہے یہ

گل بکاولی خود بکاولی کی نرگسیت کی علامت بن جاتا ہے جس کی حفاظت بکاولی بڑے خلوص سے کرتی ہے۔ اس کا حسن و شباب اور رعنائی ایک ایسے پھول کی علامت ہے جو ابھی ناکتخدا ہے۔ اس پھول کی چوری سے مراد بکاولی کا وہ جنسی شعور ہے جو اب ایک غیر شخص کی موجودگی میں اچانک بیدار ہو گیا ہے' پھول کے غائب ہو جانے کے بعد بکاولی جو آہ و بکا کرتی ہے وہ اس کے احساسِ گناہ کے ساتھ اس کی لذتیت کی نفی غمازی کرتا ہے جو نرگسیت کے خاتمے کے وقت ایک فطری چیز ہے۔ البتہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ نرگسیت کے خاتمے کا عمل بیک وقت دونوں میں ہو رہا ہے۔ خود تاج الملوک کی نرگسیت سے اس وقت ابھرتا ہے جب وہ پہلی بار ایک مخالف جنس سے اتصال کی لذت حاصل کرتا ہے اور اس جنسی فعل کی علامت خود بکاولی کی انگشتری ہے جسے وہ چلتے وقت بدل لیتا ہے۔

تاج الملوک کی زندگی سے کشمکش زمانہ اس طرح چمٹا ہوا ہے جو کسی طرح اس سے الگ ہونے کے لیے تیار نہیں، ہزار مصیبت اٹھا کر وہ اس قابل ہوا تھا کہ اسے پھول کی مدد سے اپنے باپ کی آنکھیں روشن کر دے لیکن اس کے صبر و ضبط کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اس کے بھائی بڑی جسارت اور بیدردی کے ساتھ اس سے پھول چھین لیتے ہیں جو گو یہ ایک سانحہ ہے لیکن یہی چیز اس کے استقلال اور جدوجہد کو مستحکم کرنے میں معاون ہوتی ہے' وہ اس وقت کا انتظار کرتا ہے جب حقیقت خود بخود اس کے باپ پر روشن ہو جاتی ہے اور وہ اپنے باپ کا محبوب نظر بن جاتا ہے یعنی جو EDIPUS COMPLEX اس کے تحت الشعور میں تاج الملوک کے لیے ابتدا میں بیدار ہوا تھا۔ وہ اختتام پذیر ہوتا ہے ؎

مسند سے شہ اٹھ کے بے محابا
بولا بوٹے سے جان دا ایاں
روشن کیا دیدۂ پدر کو
مادر کے بھی چل کے آنسو پونچھو

تاج الملوک زندگی کی جراحتوں کے درمیان بلبلا اٹھنے کے بجائے مسکراتا ہے وہ ہر نئی مصیبت کو اس انداز سے گلے لگاتا ہے گویا یہ چیزیں اس کا سرمایۂ ناز ہیں۔ تاج الملوک کی زندگی میں ہمیں ایک وفادار جری اور بہادر عاشق کا بھی سراغ ملتا ہے یہاں پہنچ کر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ عشق بکاولی پر شباب کی تکمیل کا انحصار ہے اور خود شخصیت کی بھی ارتقا کے لیے تاج عشق ہے' ہمیں اس کے عشق میں ایک طرح کی طہارت کا احساس ہوتا ہے۔ بکاولی جس کا سراپا وہ پہلے دیکھ چکا ہوتا ہے اس کے جلوۂ صد رنگ کا نقشہ اس طرح پیش کرتا ہے ؟

تجھ سے مری خاطر آب کہاں ہے۔ تو نشتر شعلہ میں رگِ شمع
تو جوششِ یم میں نور بے پر میں نقشِ قدم تو بادِ صرصر

تاج الملوک کی شخصیت میں ہم جوئی کا بھی عنصر خاصا توانا ہے البتہ مصنف اس کے کردار میں جگہ جگہ فوق الفطرت کے بھی رنگ بھرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ وہ اسی تخت کو جس پر بکاولی بیٹھی ہوئی ہے پیچھے سے پکڑ کر ماورائی دنیا کا اس انداز میں سفر کرتا ہے کہ خود بکاولی تک کو خبر نہیں ہوتی اسے ہم مصنف کے حسنِ بیان پر محمول کر سکتے ہیں ورنہ تاج الملوک بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کرتا۔

تاج الملوک ایک وفاشعار شوہر کی بھی صفات اپنے کردار میں رکھتا ہے جس کا ثبوت وہ جابجا اپنے اعمال سے فراہم کرتا رہتا ہے چنانچہ جب وہ ہزار آفات سے گزر کر اس طلسمی بت خانے تک پہنچتا ہے جہاں بکاولی مقید ہے تو وہ اپنے ہمسفر کے حالِ زار کو دیکھ کر بے قرار ہو جاتا ہے ؎

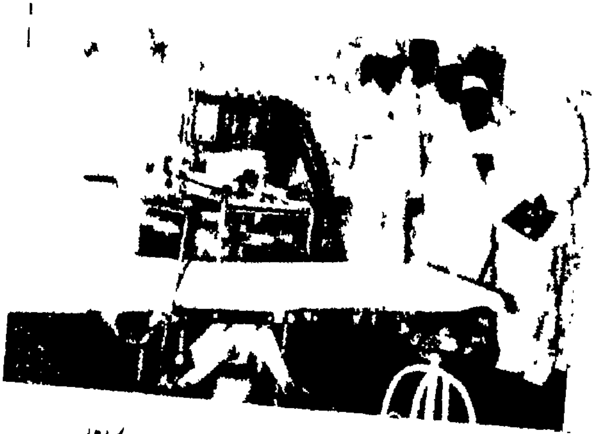
صدقے وہ بشر ہوا پری کے قدموں پہ گرا بکاولی کے
پاؤں اس کے چھوٹے تو چھٹ سا آنسو چھوڑ کے گھر اٹھا ہے

تاج الملوک کی بکاولی کے ساتھ وفاشعاری کا عہد صرف حیات تک محدود نہیں ہے اس کا سلسلہ حیات و موت دونوں پر محیط ہے یہاں تک کہ جب وہ فنا کے گھاٹ اتر چکی ہوتی ہے اور دوبارہ دہقان کے گھر میں جنم لیتی ہے (یہ آواگون RE-INCARNATION) ہندو عقیدہ کا جزو ہے اور یہاں اس کی بھی علامتی حیثیت ایک خاص معنویت رکھتی ہے چونکہ دونوں کرداروں کو روح کا سفر در پیش ہے لہذا اس کی تعبیر ناگزیر تھی اور یہ اسی طرح ممکن تھا کہ جب زمین کا باشندہ تمام اذیتوں کو برداشت کرنے کے بعد ماورائی دنیا تک پہنچا اور خود بکاولی کے لیے بھی ضروری تھا کہ وہ فنا ہو کر دوبارہ حیات میں آتی اور اب ان کا دم ہی برابر کی تخلیق کی حیثیت سے ہوتا اسی وقت دونوں کا جسمانی اور روحانی اتصال ممکن تھا) اس وقت تک تاج الملوک اس کا انتظار گوارا کرتا ہے ؎

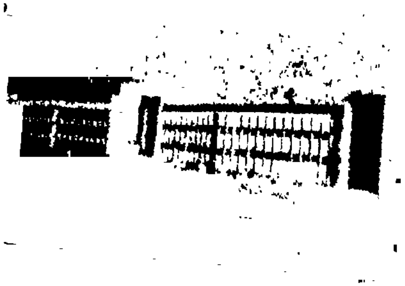


پنڈت نہرو کھیل کود اور ورزش پر ہمیشہ بڑا زور دیتے تھے اور نہ صرف بچوں کو ہمیشہ اس کی نصیحت کرتے تھے بلکہ بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود خود بھی اس کے لیے تھوڑا بہت وقت نکال لیا کرتے تھے اوپر کی تصویر اسی کی بین مثال ہے

یوپی کی ترقی



کینسر انسٹی ٹیوٹ۔ کانپور جس کا افتتاح وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا



گنیش شنکر ودیارتھی میڈیکل کالج۔ کانپور



میڈیکل کالج۔ میرٹھ

کے آئینے



سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
چھتر منزل لکھنؤ

یوپی کی ترقی کے آئینے



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ۸ دسمبر ۱۹۶۸ء کو ضلع بہرائچ میں گھاگرا کے پل کا افتتاح کر رہی ہیں)

گنگا کا پل گڑھ مکتیشور۔ میرٹھ



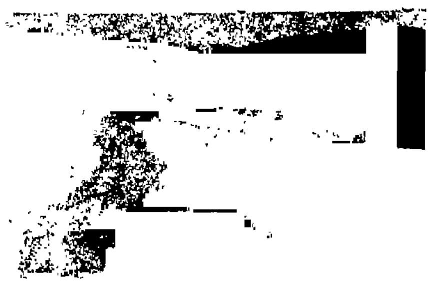


شاردا برج۔ لکھیم پور کھیری

رشی کیش۔ بدری ناتھ سڑک پر نقل و حمل کا بندوبست



اتراکھنڈ میں موٹر سڑک۔ ضلع پوڑی گڑھ



یوپی کی ترقی کے آئینے



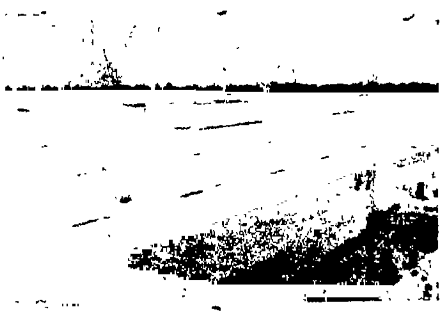


وزیراعلیٰ شری چندر بھان گپتا ۲۲ دسمبر ۱۹۶۹ء کو لکھنؤ میں ریاستی آرکائیوز کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں (بائیں) اس عمارت کے ماڈل پلان کی تصویر



اینٹی بایوٹک کارخانہ ۔ ضلع دہرہ دون

وزیراعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی ہند۔پاک جنگ میں کام آنے والے جوانوں کے خاندانوں کے لیے شہید گھر کا افتتاح کر رہے ہیں



مزدور بستی ۔ کانپور

دیہاتوں کے لیے پینے کے پانی کی اسکیم ۔ مرزاپور



شاردا بجلی گھر، کھٹیما (نینی تال)



چمک پیدا ہوگئی ہو کہ یہ نظارہ   بے نقاب ذات و صبح رخسار

ظاہر ہے کہ یہاں مصنف اپنے عقیدے کے مطابق تاج الملوک جیسا کہ مسلم کردار سے ایک ایسے رنگ میں پیش کرتا ہے جو صریحاً ناممکنات میں سے ہے، اس سے الگ بھی اس کی کیا ضمانت کہ یہ عقیدہ عقل کی کسی بھی گرفت میں آسکتا ہے۔ اس سے اگر یہاں محض تاج الملوک کی بہادری کی زبردست ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کا اظہار مقصود ہے تب تو اس کے گرد پھیلا ہوا طلسماتی حصار یقیناً بامعنی ہو جاتا ہے ورنہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔

"زہر عشق" میں مہ جبیں کا کردار اپنی فعالیت کے لیے یادگار ہو کر رہ گیا ہے۔ "زہر عشق" نام بجائے خود اس مثنوی کے موضوع اور مواد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ عشق کافی بدنام زمانہ لفظ ہے البتہ اس پر ہوا نہ یہ ایک خصوصی نقاب ڈال دیا جاتا ہے جس کے تحت اس کا اصلی روپ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ شاید پہلی بار اس مثنوی میں مرزا شوق نے اس گھونگھٹ کو چہرہ عشق سے سرکانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ فعل بذات خود مبتذل سہی لیکن عشق و عاشقی کا تصور جس پیمانے پر زہر عشق میں پیش کیا گیا ہے وہ تھوڑا سا غیر سنجیدہ سہی لیکن یہی داستان عشق اور کار نقاب کشائی ایک طور پر مصنف کی عظمت کا بھی ثبوت فراہم کرتا ہے، مصنف کے پیش نظر یہاں ہمیں ایک حقیقت کی واقعیت کا احساس دلانا ہے اور یہ دکھانا مقصود ہو کہ عشق بجائے خود اپنی اصلی شکل میں کن کن گوشوں سے ابھرتا ہے اور اس کا اظہار کیوں کر ہوتا ہے۔ یہاں نہ علمیت کی گرم بازاری ہے نہ طلسماتی گورکھ دھندے ہیں اور نہ ہی یہاں قاری کی شکلیں کسی جاتی ہیں۔ جو کچھ ہے واضح ہے، بین السطور کچھ بھی نہیں ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہی اس مثنوی کی خوبی بھی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خامی بھی ہے کہ وہ بالواسطہ کم سے کم ہے اور بلاواسطہ بہت زیادہ۔

یہاں ابتدا میں (SENSUOUSNESS) ہے اور تدریجاً (SENSUALITY) فروغ پانے لگتی ہے۔ مرد کا کردار خود مرزا شوق کی ذات بھی ہو سکتی ہے جو لکھنوی سماج کے پیدا کردہ سارے جراثیم سے معمور ہے۔ یہ ذات حسی مسرت کی متلاشی اور صرف صحبت ہی کو زندگی کا سب سے بڑا انعام تصور کرتی ہے جس میں حقیقی فعالیت کا سراغ نہیں ملتا۔ اس طور پر اس کا کردار اپنے اندر بجا ذہنیت کے بھی آثار کم رکھتا ہے۔

طلوع (مہ جبیں) اس مثنوی کا دراصل وہ مرکزی نکتہ ہے جہاں ساری داستانیاں سمٹ آئی ہیں۔ مہ جبیں بھی لکھنوی سماج ہی کا عطیہ ہے لیکن اس کی شخصیت پر جو نقوش اس تہذیب نے ابھارے ہیں وہ ان نقوش سے مختلف ہیں جو مرد کے کردار پر ثبت ہوئے ہیں۔ مرد کے کردار میں مہ جبیں کے کردار میں جذبے اور وفور شوق کی ایک عجیب و غریب مماثلت پائی جاتی ہے لیکن مرزا شوق جو مرد کا کردار پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی حیوانی جبلت کے بار تلے دب کر بالکل کچل چکے ہیں اور ان کے اندر فعالیت اور توانائی اس قدر بھی باقی نہیں ہے کہ وہ کار عاشقی کا بھی فریضہ صحیح معنوں میں انجام دے سکیں لیکن مہ جبیں کا دل امنگوں اور آرزوؤں کا ایک ایسا سر چشمہ ہے جو ہمہ وقت ابلتا رہتا ہے۔ وہ پہلی ہی نظر میں دلبری اور دلداری کی بلندیوں سے گزر جاتی ہے، یہ بات غیر فطری بھی نہیں ہے ایسے واقعات عورت کو بھی پیش آسکتے ہیں اور مرد کو بھی البتہ اس میں چند اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً برٹرینڈ رسل کو کالج کی زندگی میں داخل ہونے کے ساتھ ہی بیک نظر ایک لڑکی سے عشق ہو گیا جو ظاہر ہے کہ برٹرینڈ رسل کی ہمسری اور برابری کی مدعی نہیں ہو سکتی تھی۔ محض ایک معمولی لڑکی تھی، وہ کسی بھی عظیم ترین لڑکی سے عشق کر سکتے تھے لیکن ایسا محسوس کیا جاتا ہے کہ چونکہ وہ ایک عرصہ تک کیتھولک مذہب کے رسوم و رواج اور گرجا کی چہار دیواری میں اس طرح جکڑے رہے کہ انھیں اپنی جنسی خود شعوری کا بھی احساس بھی نہ ہو سکا اسلیے اس حصار سے نکلنے کے بعد انھیں پہلی بار میں جو لڑکی نظر آئی اسے انھوں نے منتخب کر لیا، ممکن ہے کہ اس قسم کے کچھ معاملات مہ جبیں کے ساتھ بھی ہوئے ہوں۔ اس سماج میں عموماً رسم عاشقی کے بعض ایسے مطالبات رہے ہیں جو اتنی آزادروی کے متحمل نہیں ہو سکے۔ عورت مرد کی اس معاشرتی اصول کے تابع ہیں چنانچہ جب تھوڑی سی باگ ڈھیلی ہوتی ہے تو عام انسانوں کا ذہنی ردعمل سامنے آجاتا ہے اس کی سب سے دلچسپ مثال خود مہ جبیں کی ذات ہے ؎

سوزش الفت اسے ڈبونے لگی   ایک الجھن سی اس کو ہونے لگی

محبوب کے نام خط کی تحریر ملاحظہ ہو ؎

اس محبت پہ ہو خدا کی مار   جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار
اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے   جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

اس پیش روی کا نتیجہ ان کر کے مہ جبیں پر حجاب بھی ہوتی ہے اور عشق کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ جواز بھی تراشنے پڑتے ہیں ؎

تم پہ میں مر مٹی کیا قیامت تھی　　کیا رسے دشمنوں کی شامت تھی
مجھ کو ایسی بھی تیری کیا پرواہ　　بام پر تو بلا سے آ کہ نہ آ

لیکن یہ باتیں محض زبانی ہیں ورنہ کسی احساس گناہ کی قطعاً جھلک نہیں ملتی اس لیے کہ ؎

ہوئے اس گل سے وصل کے اقرار　　اٹھ گئی درمیاں سے سب تکرار
جو کہا تھا ادا کیا اس نے　　وعدہ اک دن وفا کیا اس نے

مہ جبیں کی ذات درد عشق سے عبارت ہے جو عشق ہی کی پروردہ ہے اور بالآخر عشق ہی کی صلیب پر چڑھ جاتی ہے یہاں طہارت اور پارسائی عشق کے تابع ہے جو زندگی کی ہر قدر سے افضل ہے مہ جبیں کا یہ خیال کہ ؎

گو کہ عقبیٰ میں روسیاہ چلی
لیکن اپنی سی میں نباہ چلی

نصف حقیقت ہے اور نصف فسانہ ہے اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ عشق انسانی فطرت کا حقیقی اور جائز مظہر ہے لیکن چونکہ اس کے اظہار پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ بندشیں رہی ہیں جن سے مہ جبیں کی بھی ذات آزاد ہے اس لیے وہ اپنی پیش قدمی کو گناہ کے مترادف سمجھتی ہے لیکن عشق چونکہ اس کی ہستی کا تقاضا ہے اور اس کا سب سے بڑا سہارا ہے اس لیے وہ خلوص دل سے اسی میں یقین رکھتی ہے اور بقیہ باتیں اس کے نزدیک ضمنی اہمیت کی حامل ہیں اس کی ذات نشۂ عشق سے سرشار ہے جس کے واگذاشت کی مہلت اسے نہیں مل پا رہی ہے ؎

حسرت دل تھوڑی باقی ہے
اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے

مہ جبیں سوز عشق میں جل مرنے ہی میں یقین رکھتی ہے، چنانچہ اسے اس بات کا شدید غم ہے کہ زمانے نے اسے لذت عشق سے صحیح معنوں میں سرشار ہونے ہی نہ دیا اور موت کا کھٹکا اس کے لیے اس راہ میں سب سے بڑا ذہنی آزار اور سد راہ بن گیا ؎

جائے عبرت سرائے فانی ہے　　مورد مرگ نوجوانی ہے

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے　　یہی دنیا کا کارخانہ ہے
پھل اٹھایا نہ زندگانی کا　　نہ لیا کچھ مزا جوانی کا
دل میں ہے کہ تمہاری یاد چلے　　باغ عالم سے نامراد چلے

اس پر نامرادی کے سائے کالی بدلی کی مانند چھا جاتے ہیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ابھی چند لمحات میں وہ عشق کے اس جہاں گسل اور خود سوز شعلوں میں جل کر اپنے وجود کا شیرازہ منتشر کر دے گی۔ اس خیال سے وہ محبوب کو دعوت دیتی ہے ؎

پھر کہاں ہم کہاں یہ صحبت یار　　کر لو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار

اور کبھی کہتی ہے ؎

لہر پھر چڑھ رہی ہے کانوں کی
بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

زندگی کے آخری لمحے میں اس کے کردار میں زندگی کی وہ اعلیٰ صفات یکجا ہو جاتی ہیں جو اسے حیات دوام بخشتی ہیں۔ یہاں اس کی ذات ان خصوصیات سے معمور نظر آتی ہے جو اپنے اندر ایک آفاقی شان لیے ہوئے نظر آتی ہے۔ مہ جبیں اپنے جن قلبی واردات کا اظہار کرتی ہے وہ صرف اس کی انفرادی شخصیت پر محیط نہیں بلکہ آفاقی مزاج کا ایک جزو ہے ؎

ضبط کرنا اگر ملال رہے　　میری رسوائی کا خیال رہے
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم　　ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
میری میت کا دھیان رکھیے گا　　بند اپنی زبان رکھیے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا　　نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے　　سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
ذکر سن کر مرا نہ رو دینا　　میری عزت نہ یوں ڈبو دینا

ان اشعار کے ذریعے مہ جبیں کے کردار کی جو تصویر بنتی ہے وہ اپنے اندر ایک عجیب بانکپن لیے ہوئے ہے۔ مشرقی تہذیب کے خمیر سے تعمیر کی گئی مہ جبیں کی ذات میں دلکش معصومیت اور خلوص کی ملی جلی شان سے آراستہ ہے اس کی عکاسی صفحۂ قرطاس پر ممکن نہیں۔ مہ جبیں کا کردار ایسے عشق سے عبارت ہے جو پہلے تو زندگی کو حرارت بخشتا ہے پھر اسے خاک و خون میں لت پت کر دیتا ہے۔

★

مظہر امام

زندگی بن کے دلہن کس کے سنگار آئی ہے — چھیڑتی عشرتِ فردا کا ستار آئی ہے
دل کی خوابیدہ امنگوں پہ بہار آئی ہے — اپنے کیا شان ہے کیا رنگ خود آرائی ہے
جیسے دوشیزۂ تخیل کا آنچل ڈھلکے
جس طرح ساقیِ جذبات کا ساغر چھلکے

موسمِ حسن پراگندہ نقاب آیا ہے — اپنی ساغوش میں لیتے ہوئے گلاب آیا ہے
اپنے ہونٹوں میں لیے رنگِ شباب آیا ہے — دل کے خاموش سوالوں کا جواب آیا ہے
آج ہر گام پہ جنت کا گماں ہوتا ہے
غم بھی دنیا میں ہوا ساز کہاں ہوتا ہے

زندگی حسنِ فراواں کا پتہ دیتی ہو — سرخیِ رنگِ بہاراں کا پتہ دیتی ہے
مستیِ رقصِ غزالاں کا پتہ دیتی ہو — سرفرازیِ گلستاں کا پتہ دیتی ہے
جشنِ آزادیِ بھارت کے کنول کھلتے ہیں
وقت وہ ہے کہ مہ و مہر گلے ملتے ہیں

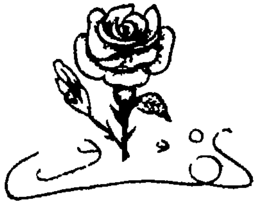
مطرب دل ہے بانداز طرب نغمہ فشاں — نشۂ کیف میں ہے جور نگارِ امکاں
جلوہ نما ہے مرے اشعار کی سرخی سے عیاں — خون بن کر رگِ ہر لفظ میں صہبائے رواں
نغمہ گر وقت کی رفتار ہوئی جاتی ہے
رقص بازیب کی جھنکار ہوئی جاتی ہے

عارضِ وقت پہ ہے غازۂ رنگینیِ حال — حسنِ امروز میں پوشیدہ ہے فردا کا جلال
میری نظموں کی جوانی، مری غزلوں کا جمال — تم پہ قربان ہے پیارے وطن کے مہ و سال
مہرِ آزادیِ بھارت کی ضیا اور بڑھے
عزمِ جمہور کی بیباک ادا اور بڑھے

زندگی خواب بھی ہے عالمِ بیدار بھی ہے — قدِ گیسو بھی ہے یہ اور رسن دار بھی ہے
نغمۂ ناز بھی ہے، روح کی للکار بھی ہے — بزم میں ساز بھی ہے رزم میں تلوار بھی ہے
روپ بھی ہے یہی دنیا، یہی بہروپ بھی ہے
یہ گھنا سایہ بھی ہے اور کڑی دھوپ بھی ہے

اپنے کردار کی قندیل جلانا ہے ہمیں — نقش ٹھہری ہوئی ظلمت کا مٹانا ہی ہمیں
اپنے اس ملک کو فردوس بنانا ہے ہمیں — دور منزل سہی لیکن وہیں جانا ہے ہمیں
ہم منزل بھی، شعور رہِ منزل بھی ہے
عقل تنہا نہیں، ساتھ یہاں دل بھی ہے

ہو مبارک تمہیں پینتیس برس کا یہ سفر — اپنی راہوں میں بکھیرا کیے خورشید و قمر
شوق کچھ اور بڑھائے عمل بن کے ثمر — اے زمیں! اور اٹھ، اور فلک! اور نکھر
اے وطن! ہے تری عظمت کا نشاں آزادی
جشن کا دن ہے کہ ہے آج جواں آزادی



[illegible]

رونقِ گنگ و جمن تھا نہرو
جلوۂ صبحِ وطن تھا نہرو

جانِ ہر سرو و سمن تھا نہرو
زینتِ صحنِ چمن تھا نہرو

تو کہے لعلِ یمن تھا نہرو
میں کہوں دُرِ عدن تھا نہرو

عزتِ آدمِ عہدِ حاضر
عظمتِ اہلِ وطن تھا نہرو

ایک پیغامبرِ امن و سلام
مہرِ الفت کی کرن تھا نہرو

متفق سب ہیں وہ دشمن ہو کہ دوست
پاک دل، پاک چلن تھا نہرو

اے قمرؔ یاد رکھے گی دنیا
اک یقیں، ایک لگن تھا نہرو



یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ہندستان جیسا امن اور عدم تشدد کا حامی ملک ایک پستول کو عزت بخشے لیکن ہندستان آج جس پستول کو عزت و احترام سے نواز رہا ہے وہ تشدد کے ارتکاب کا کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ چندر شیکھر آزاد سے وابستہ ہو کر اس محب وطن انقلابی کے ذہن میں یہ پستول مادرِ وطن کی قربان گاہ پر عبادت کا ایک وسیلہ اور برطانوی سامراج کے استحصال اور ظلم و تشدد کے خلاف ہندستان کے احتجاج کی ایک علامت بن گیا۔ لہٰذا یہ امر چنداں تعجب خیز نہیں ہے کہ ایک ممنون قوم اس محب وطن اور اس کے پستول کو اس موقع پر یاد کرے جب وہ اپنی آزادی کی ۴۷ ویں سالگرہ منا رہی ہو اور ان تمام جاں نثاروں کو ہدیۂ عقیدت و احترام پیش کر رہی ہے جنھوں نے اس مقصد کے پیش نظر اپنی جانیں قربان کر دیں کہ ان کے بچے عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہیں اور آزاد وطن کی فضا میں سانس لے سکیں۔

آزاد اپنے نام ہی کی طرح ملک کے آسمان انقلاب پر ایک آزاد فرد کی حیثیت سے عرصۂ دراز تک تابندہ رہے۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء سے جب انھیں مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تعاون میں حصہ لینے کی پاداش میں ۱۵ تازیانوں کی سزا ملی تھی ایک طویل راستہ طے کیا۔ وہ ۱۹۲۳ء تک انقلابی تحریک کی طرف مائل ہو گئے اور جلد ہی وہ اس تحریک کے روح رواں ہو گئے۔

آٹھ سال کی طویل مدت تک آزاد نے ہر قدم پر برطانوی سامراجیت کی طاقت کو للکارا اور پھر بھی پولیس ان کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔ اس عرصہ میں انھوں نے نہ صرف ۱۹۲۵ء میں کاکوری ڈکیتی کیس میں نمایاں حصہ لیا بلکہ ہندستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے پرچم تلے سردار بھگت سنگھ کے ساتھ انقلابی تحریک کو از سر نو منظم کیا اور اس کے کپتان کی حیثیت سے اس کے تمام بڑے اور دلیرانہ کارناموں سے وابستہ رہے جس میں ان کا وہ کارنامہ بھی شامل ہے جب لاہور میں ۱۹۲۸ء میں پنجاب کیسری لالہ لاجپت رائے کی موت کا بدلہ لینے کے لیے بھگت سنگھ اور راج گرو کے ہاتھوں پولیس افسر سینڈرس کے ہلاک ہونے کے بعد انھوں نے پولیس ہیڈ کانسٹبل چانن سنگھ کو اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب وہ ان کے مذکورہ بالا ساتھیوں کا تعاقب کر رہا تھا۔

آزاد نے ۱۹۲۸ء سے ماؤزر پستول کے بجائے کولٹ پستول اپنے ہاتھ میں لیا اور اسی سے ہیڈ کانسٹبل چانن سنگھ کو موت کے گھاٹ اتارا۔

اس وقت سے لے کر ۱۹۳۱ء میں ان کی شہادت کے دن تک کولٹ پستول ان کا مستقل رفیق رہا۔ چنانچہ ۲۷ فروری ۱۹۳۱ء کو بھی جب آزاد کو الٰہ آباد میں الفریڈ پارک میں جو اب آزاد پارک کہلاتا ہے چاروں طرف سے ایک پولیس پارٹی نے گھیر لیا جس کی قیادت سی۔ آئی۔ ڈی کا اسپیشل سپرنٹنڈنٹ جے۔ این۔ آر۔ ناٹ باور کر رہا تھا کولٹ پستول ان کے پاس تھا۔ پولیس کے مشکوک ڈولی کی بو پا کر آزاد نے اس سے پہلے سکھ دیو سے جس کو انھوں نے پارک میں بات چیت کے لیے بلایا تھا فرار ہو جانے کے لیے کہا تھا۔

اس کے بعد رامنٹ کی بندوق کی جنگ میں اس اعلیٰ درجہ کے نشانہ باز نے اپنے پستول کو ہاتھ میں لے کر سپرنٹنڈنٹ باور اور اس کی پارٹی بد حواسی میں بھاگتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ آزاد نے جام شہادت نوش کرنے سے قبل باور کی کلائی پر گولی ماری اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بشیشور سنگھ کا جبڑا توڑ دیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب آزاد کے پاس صرف ایک گولی رہ گئی تو انھوں نے پستول اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلا دی اور اس طرح کبھی انگریزوں کے ہاتھ میں نہ پڑنے کے اپنے عہد کو پورا کر دکھایا۔ ان کی نشانہ بازی اتنی دہشت ناک تھی کہ کسی پولیس والے کو ان کے قریب جانے کی اس وقت بھی جرأت نہیں ہوئی جب وہ زمین پر گر پڑے اور پارٹی نے اس بات کا یقین کرنے کے لیے وہ واقعی مردہ ہو چکے ہیں اپنی تمام گولیاں ان پر خالی کر دیں۔

قدرتی طور پر آزاد کا کولٹ پستول سپرنٹنڈنٹ باور کے لیے ایک انعامی ٹرافی بن گیا اور وہ اس کو اپنے ساتھ انگلینڈ لے گیا۔ برطانیہ میں مقیم ہندوستانی ہائی کمشنر کے توسط سے حکومت ہند کی وزارت امور خارجہ کی مسلسل کوششوں اور اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی کی ذاتی درخواست کے بعد سی۔ آئی۔ ڈی کا سابق سپرنٹنڈنٹ اس پستول کو حکومت اتر پردیش کو بطور تحفہ دینے پر رضامند ہو گیا۔ اس پستول کو واپس کرتے ہوئے باور نے الٰہ آباد میں آزاد پارک میں اس انقلابی کے مجسمہ کی تصویر کے لیے درخواست کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد کے مخالفین بھی ان کی حب الوطنی اور شجاعت و دلیری کے لیے ان کی انتہائی عزت کرتے تھے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے مبارک موقع پر یہ پستول ریاست کی راجدھانی میں پہنچ گیا ہے۔

علی راجپور ریاست میں (جو اس وقت وسط ہند) میں تھی اس محب وطن کی پیدائش سے پانچ سال قبل ۱۹۰۱ء میں ۳۲ بور دس راؤنڈ کا یہ آٹومیٹک پستول امریکہ میں بنایا گیا تھا جس کو اب ایک قومی نوادر کی حیثیت سے رکھا جائے گا جو برطانوی سامراج کے خلاف ہمارے ایام بغاوت کی ایک یادگار ہے اور جو ہمیں چندر شیکھر آزاد کی جاں نثاری اور بے لوث اور دلیرانہ حب الوطنی کی یاد دلاتا ہے۔

✱

(عالموں اور دانشوروں کو اعزازی اسناد صفحہ ۲۰ کا بقیہ)

جانے کے لیے اس سے وابستہ ہو گئے۔ آپ شبلی کالج اور شبلی اکیڈمی کو اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ دیوان حضرت علی خاں فغاں، بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، بزم مملوکیہ، ہندستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، ہندستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ہندستان کے سلاطین، علما و مشائخ، ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں، عہد مغلیہ، مسلمان اور ہندو مورخین کی نظر میں، ہندستان امیر خسرو کی نظر میں، آپ کی مشہور تالیفات و تصنیفات ہیں۔ آج کل آپ غالب، مدح و قدح کی روشنی میں کی تصنیف میں مصروف ہیں جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی اور دو جلدوں میں شائع ہوگی۔

آپ کو حال ہی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے اعزازی پروفیسر مقرر کیا گیا ہے۔ آپ کے اس اعزاز پر ادارہ نیا دور تہنیت پیش کرتا ہے۔

✱

شریمتی میو بائی

"نہیں میں کبھی ریٹائر نہیں ہوں گی۔ ابھی میں نے کیا ہی کیا ہے؟ ابھی تو میرا بہت کام باقی ہے۔"

جنگ آزادی میں حصہ لینے والی بہادر خاتون شریمتی میو بائی نے یہ بات بڑی سادگی سے کہی۔ ان کی عمر اس وقت ۸۰ برس ہے۔ حال ہی میں انھیں تامر پتر دے کر ان کی عزت افزائی کی گئی ہے۔ ملک کو آزاد کرانے کی لڑائی میں حصہ لینے والی دبلی پتلی چھوٹے سے قد کی ہنس مکھ شریمتی میو بائی میں کام کرنے کا وہی جوش اور لگن آج بھی ہے جو کبھی جنگ آزادی کے زمانے میں تھی۔

شریمتی میو بائی کا جنم دلی کے ایک معمولی خاندان میں ہوا۔ ان کی پرورش ان کے نانا کے یہاں ہوئی۔ ان دنوں تعلیم نسواں کا سوال نہیں کے برابر تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت زیادہ تر گھر ہی پر ہوتی تھی۔ اس قدامت پرست ماحول کے باوجود ان کے نانا نے انھیں مشنری اسکول میں داخل کر دیا جہاں وہ صرف تیسری جماعت تک ہی پڑھ سکیں۔

یہ پوچھنے پر کہ گھر گرہستی اور ملک کی خدمت دونوں کو وہ کس طرح بخوبی انجام دے سکیں، انھوں نے بتایا کہ ان کی شادی صرف نو برس کی عمر میں لاہور کے ایک متمول خاندان میں ہو گئی تھی لیکن بدقسمتی سے ان کی گھر گرہستی بہت جلد ختم ہو گئی۔ صرف ۲۴ برس کی عمر میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ بیوہ ہو جانے کے بعد وہ دلی واپس آ گئیں۔

یہاں آ کر انھوں نے اپنے بھائی شری رام پرساد کی حوصلہ افزائی کی بدولت گھر ہی میں لکھنا پڑھنا جاری رکھا اور کانگریس کی تحریک عدم تعاون میں حصہ لینے لگیں۔ ہمارے یہاں شری مادھو رام جی آیا کرتے تھے۔ بہن ستیہ وتی جی بھی آتی تھیں۔ میرا زیادہ تر وقت پوجا پاٹھ اور مذہبی موضوع کی کتابوں کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ بھائی صاحب کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک دن وہ بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ دیش میں آگ لگ رہی ہے اور تم ہو کہ گھر میں بیٹھی پوجا کر رہی ہو۔" انھوں نے گزشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے بعد انھوں نے دلی کی دیگر خواتین کے ساتھ ۱۹۲۱ء کی لاہور کانگریس میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر انھیں صرف اس لیے نہیں جانے دیا گیا کہ لاہور میں ان کی سسرال تھی، ان کی ساس موجود تھیں اور ممکن ہے وہاں ان کا خیر مقدم نہ ہوتا۔ لیکن بات ایسی نہ تھی۔ یہ آگے چل کر معلوم ہوا۔ انھیں دنوں نہرو خاندان سے ان کا تعارف ہوا اور دھیرے دھیرے خاندان کے افراد سے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔

آزادی کی تحریک اس وقت پورے زور و شور پر تھی۔ جگہ جگہ غیر ملکی کپڑوں کی ہولی جلائی جاتی۔ اور قانون کی خلاف ورزی کی جاتی۔ سرکاری عمارتوں پر کانگریسی جھنڈے لہرائے جاتے تھے۔ بیا جی (شریمتی میو بائی) اب پوری طرح سے تحریک میں شامل ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ انھیں جیل جانا پڑا۔ اس کے بعد جیل جانا تو روز کا معمول ہو گیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۳ء، ۱۹۴۱ء، ۱۹۴۲ء، ۱۹۴۳ء میں وہ کئی کئی مہینے جیل میں رہیں۔ یہ اتفاق ہی کی بات ہے کہ سن بیالیس میں لاہور میں عورتوں کی جیل کے پھاٹک پر جھنڈا لہرانے کے الزام میں انھیں اسی جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ وہ ۱۵ اگست ہی کا دن تھا۔

اپنے ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے ان میں جوش امنڈ آیا۔ ان کا چہرہ پرانی یادوں سے چمک اٹھا، ایسا لگتا تھا جیسے ان کے سامنے ماضی مجسم ہو گیا ہو۔ بے ساختہ ان کے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھے جیسے ابھی وہ جھنڈا لہرانے والی ہیں۔ ان کے بوڑھے ہاتھوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انھوں نے زندگی میں کتنی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ یہ سوال کرنے پر کہ تامر پتر دے کر موجودہ نسل نے ان کی قربانی اور خدمت قوم کا اعتراف کیا ہے۔ یہ تو عقیدت کا ایک چھوٹا سا پھول ہے۔ کیا اب وہ کام کاج کی ذمہ داریوں کے بوجھ سے

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

اردو شاعری اور قومی یکجہتی

شاغل ادیب

ہندستانی تہذیب کو دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ایک بلند و نمایاں مقام حاصل ہے اور اس کا ارتقائی تسلسل اس کی اپنی اہم خصوصیت ہے۔ ہندستانی تہذیب کی نشو و نما، اس کے ارتقا اور اس کی بقا میں قوموں کے اشتراک، نسلوں کے اتحاد، فرقوں کی مساوات اور علاقوں کی ہم آہنگی کو بڑا دخل رہا ہے۔ مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کے اس عظیم کلچر کے استحکام و ارتقا میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب نے بھی اہم رول ادا کیا ہے گو اردو زبان کے ماخذ، مقام پیدائش اور اس کے ادب کے آغاز کے بارے میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس بات سے سبھی متفق ہیں کہ اردو ہند و مسلم تہذیبوں کے ارتباط، ہندو اور مسلمانوں کے ایک دوسرے پر گہرے اثرات اور دونوں کی زبانوں کے اتحاد و اشتراک ہی کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان بلاشبہ ہندستان کے مشترکہ کلچر ہی کی پیداوار ہے اور اسی لیے اس میں اشتراک، اتحاد اور قومی عناصر کا وجود شروع ہی سے ملتا ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب لکھتے ہیں "اردو کو ہندستان کی قومی یک جہتی، وطن پرستی اور انسان دوستی کے استحکام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اردو نے اپنی ابتدا سے آج تک ہندستان کے قومی اتحاد، حب الوطنی اور علاقہ واری ہم آہنگی کی تشکیل و تعمیر میں ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے۔"

اردو کے پہلے شاعر امیر خسرو (متوفی ۱۳۲۵ء) کو لیجیے جنھیں قومی یک جہتی اور وطن پرستی کے تعلق سے ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کا کلام ہندستان کی محبت سے لبریز ہے جس میں مشترک تہذیب کے نمایاں خد و خال ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں "خسرو کے فکر کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیاسی مخالفوں کے ساتھ سخت دشمنی کا سلوک کرتے ہیں۔ خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں لیکن اپنے ہم وطنوں کے مذہب اور عقائد کا بلاتفریق مذہب احترام کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب، ہندی زبان اور ہندو رسموں اور رواجوں کا بیان محض رواداری کی بنیاد پر نہیں بلکہ طرفدار کے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔"

امیر خسرو صوفی شاعر تھے۔ اردو زبان کا صوفی لٹریچر مذہب سے زیادہ بھائی چارگی، صلح و آشتی اور انسان دوستی کا درس دیتا ہے۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان کی اردو شاعری میں قومی یکجہتی اور انسان دوستی کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ صوفیا کا کام بلاتفریق مذہب و فرقہ عوام کو انسانیت، پیار اور خلوص و محبت کا درس دینا تھا۔ ان کے عقیدت مندوں میں سبھی مذاہب کے افراد شامل رہتے تھے۔ اس سلسلے میں خواجہ بندہ نواز، شمس العشاق، شاہ میراں جی اور ان کا خاندان، خواجۂ اجمیر، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت شیخ فرید شکر گنج اور شیخ بہاء الدین باجن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اب اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کو لیجیے۔ ان کے یہاں قومی اتحاد اور حب الوطنی کی کئی عمدہ مثالیں

مل جاتی ہیں۔ دکن میں اردو کی ترویج و ترقی کا ایک اہم سبب ہندو مسلم اتحاد بھی بتایا جاتا ہے۔ یہاں کے مسلم حکمرانوں کی فوجوں اور اہم دفاتر میں بہت سے ہندو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور اپنی دکنی زبان جو اردو کی ابتدائی شکل تھی، استعمال کرتے تھے۔ دکن کے مسلم حکمرانوں نے دہلی سے ناتا توڑ کر اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کر رکھی تھیں۔ وہ حکومت، معاشرت اور زبان وغیرہ کے تعلق سے دہلی کے مقابلے میں ایک نئی طرز کو ترجیح دیتے تھے، اور اسی انفرادیت و جدت پسندی کے جذبے نے انھیں دہلی کی سرکاری زبان فارسی کے بالمقابل دکنی یا ابتدائی اردو کے ارتقا پر اکسایا۔

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ہندوستانی ماحول کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ ان کے کلام میں ہندوستانیت کا شدید غلبہ ہے۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں اور شادی بیاہ کے رسم و رواج سب پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ ان کا کلام فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

قومی یکجہتی اور وطن دوستی کے اعتبار سے اردو نظم میں نظیر اکبرآبادی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ بقول کلیم الدین احمد اردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبرآبادی کی ہستی تنہا ستارے کی طرح درخشاں ہے۔ قلی قطب شاہ کے بعد نظیر پہلے عوامی شاعر ہیں جنھوں نے ہندوستان، اس کے رسم و رواج، ہندوستانی تیوہاروں، ہندوستانی معاشرت اور اتحاد و یکجہتی کو تفصیل کے ساتھ اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں "نظیر نے خالص ہندوستانی پہلوؤں پر زیادہ توجہ مرکوز نہیں کی بلکہ انھیں ذہنی لگاؤ اور جذباتی خلوص کے ساتھ پیش بھی کیا جس سے ان کی مذہبی رواداری اور میل ملاپ کے سچے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ نظیر کو عوامیت اور جمہوریت کا آئینہ دار کہنا غلط نہیں۔ وہ اپنے زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک عظیم الشان مرقع نگار تھے":

جھگڑا نہ کرے مذہب و ملت کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے میں کہ بغل بیچ ہو قرآں

عاشق تو قلندر ہے نہ ہندو نہ مسلماں
کافر ہے نہ صاحب اسلام رہے گا
آخر وہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر اکبرآبادی بقول نیاز فتح پوری ایک بہت بڑے وطن پرست شاعر تھے۔ ان کے کلام میں ہندوستانی قومی اتحاد و اشتراک کے بہترین نمونے ملتے ہیں:

وہی دیکھا، وہی سمجھا، وہی جانا، وہی پایا
برابر ہو گئے سب ہندو مسلم گبر و نصرانی

غزل، اردو شاعری پر ہر دور، ہر زمانے میں حکمراں رہی ہے گو قدیم غزل معاملاتِ حسن و عشق اور عاشق و معشوق تک ہی محدود رہی ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں وطن دوستی، عوام سے دلچسپی اور انسانیت کے احترام اور عقیدت کے ان گنت نمونے بھی ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تسبیح تری زلف کو کہتے ہیں اے صنم
یک تار دے کہ رشتۂ زنار کر رکھوں (ولی دکنی)

مدرسہ تھا کہ دیر تھا، کعبہ تھا یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہماں تھے واں، اک تو ہی صاحبِ خانہ تھا (درد)

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمعِ حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا (سودا)

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا (میر)

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو (غالب)

گلزار نسیم کے مصنف دیا شنکر نسیم نے اپنی مثنوی کی ابتدا حمد باری سے کی ہے۔ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے شاعر، مہاراجہ کشن پرشاد نے رسول کریم کی شان میں ان گنت نعتیں قلم بند کی ہیں۔ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

پیمبروں میں کوئی ایسا آفتاب نہیں
حضور احمد مختار کا جواب نہیں

زاہد کو ہے جنت کی تمنا تو مبارک
ہم کو یہی حسرت ہے کہ مل جائے مدینہ

منشی شنکر لال ساقی بھی جو ہرگوپال تفتہ کے چچازاد بھائی تھے اعلیٰ کے نعت گو تھے۔ ان کے یہاں تصوف کے اشعار کا انبار ملتا ہے:

میں اگر خاک نشینِ درِ احمد ہوں گا
رفعتِ عرش کی ہم سری ہستی ہوگی
پی گیا بھر کے جو جام مئے عشقِ احمد
اس کی ہستی کو نہ ہرگز کبھی پستی ہوگی

مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ ابتدا ہی سے اردو شاعری اور اردو ادب انسان دوستی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اتحاد و یگانگت، امن و صلح جوئی اور وطن پرستی کی علمبردار رہی ہے۔

علامہ اختر علی تلہری مرحوم "انسانیت دوست ادب" میں لکھتے ہیں "ادب و شعر کا کام شانتی، پریم کے گیت گانا اور امن و صلح کی فضا پیدا کرنا ہے اور اس طرح دنیا کو جہاں تک ممکن ہے جنت بنا دینا ہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ نفرت، تشدد اور جنگ کے نعرے بلند کرتا ہے اور فتنہ و فساد کو ہوا دے کر دنیا کو جہنم بنانے کی کوشش کرے۔"

یہ صحیح ہے کہ اردو کے قدیم ادب میں قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندوستانی وطنیت کا وہ مفہوم نہیں ملتا جو آج لیا جاتا ہے۔ یہ مفہوم اردو شاعری میں دہلی کی بربادی اور نادر شاہی حملے کی تباہ کاری کے بعد سے واضح طور پر ملنے لگتا ہے۔ اس میں شدت ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

اردو کی جدید شاعری میں حب الوطنی اور قومی اشتراک کے سلسلے میں حالی کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ملک کے مصائب کا احساس سبھی کو تھا لیکن معاشرے کی دکھتی رگ پر حالی کے سوا کوئی انگلی نہ رکھ سکا۔ حالی کی آواز وقت کی آواز تھی، حال و مستقبل کی آواز تھی، وہ صدا بہ صحرا نہ رہی۔ ان کی مثنوی حب وطن اپنی مثال آپ ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے اتفاق و اتحاد اور قومی یکجہتی کا پیغام دیا ہے اور بتایا ہے کہ اسی کی کمی کی وجہ سے ہم لوگ غلامی کا شکار ہیں۔

ملک میں اتفاق سے آزاد شہر میں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
جاگنے والے، غافلوں کو جگاؤ تیرنے والو، ڈوبتوں کو بچاؤ
ہو مسلماں اس میں یا ہندو بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
سب کی میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد شہر ہیں اتفاق سے آزاد

حالی جدید شاعری کے امام تھے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں اور بعد کے آنے والے شعرا کو بے حد متاثر کیا۔ حالی سے اس دورِ شاعری کا آغاز ہوتا ہے جس نے اقبال، اکبر اور چکبست جیسے شاعر پیدا کیے۔

اقبال کی ابتدائی نظموں میں قومی رنگ بدرجہ اتم موجود ہے۔ اردو کی قومی نظموں میں اقبال کے "ترانۂ ہندی" اور "نیا شوالہ" کو ایک اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کی قومی نظموں کے بارے میں کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ "یہ نظمیں ان کے جذباتِ ذاتی کی صداقت ہیں جو جوش کے ساتھ محسوس بھی کی جا سکتی ہیں۔"

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اکبر طنز و مزاح کے معاملے میں واقعی اکبر و عظیم ہیں۔ انھوں نے مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم کی دلیرانہ مخالفت کی۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں: "اکبر نے جدیدیت کے خلاف احتجاج

تھی لیکن ان کے احتجاج کا انداز بجائے خود جدید تھا۔ اکبر نے مغربی تہذیب اور انگریزی حکومت کے زیر اثر پیدا ہونے والے تفرقے اور ابتری سے ہندوستانی قوم کو متنبہ کیا اور اتحاد و یکجہتی کی ضرورت پر زور دیا۔

ہندو و مسلم کیا ہیں دونوں یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن ہم زبان و ہم قسمت کیوں نہ کہدوں کہ بھائی بھائی ہیں

کہتا ہوں ہندو مسلماں سے یہی اپنی اپنی روش پہ نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

چکبست کی شاعری کا بنیادی آہنگ قوم پرستی اور سماجی اصلاح ہے۔ وہ قوم پرستی، وطن دوستی اور جدید دور کی روشنی کے شدت سے مؤید تھے:

گو تم نے آبرو دی اس معبد کہن کو سرو نے اس زمیں پہ بہتے کیا بجا کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو
سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

قومی اتحاد و فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے ذکر میں منشی درگا سہائے سرور کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظم "گلزار وطن" کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں
حب وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں
اک ایک گل میں پھونکیں روح نسیم وحدت
اک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں
مل جل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کا گائیں

سیاسی اور قومی شاعری میں ظفر علی خاں کا نام بہت نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو:

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

تہذیب ہند کا یہ نشاں ہے سدا اگر ازلی
یہ موج بادہ رنگ پھر آئی کمال ہے

جدید غزل کے احیاء میں حسرت موہانی کو اولیت حاصل ہے۔ ان کی غزل ادب و سیاست کا ایک حسین امتزاج ہے۔ ملاحظہ ہو:

چمن چمن کے لیے اور گل گل کے لیے ... ادب و رشتۂ الفت کا استوار کرتے ... یہ تفرقے ہیں فقط ... کے لیے
یہی ہے ... کی آرزو حسرت
جیوں وطن کے لیے اور مروں وطن کے لیے

قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی آج کا اہم تقاضا ہے۔ اس تقاضے کو پورا کرنے میں اردو شاعری ملک کی دوسری زبانوں کی شاعری سے پیچھے نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

تیری چھاتی پر ہیں مندر جن کی موجیں مسجد و مندر
دونوں کی ہے گنگا برابر اللہ اکبر، ایشور، ایشور
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام
(آنند لکھنوی)

وطن اور قوم کی سو جان سے خدمت کرے گا یہ
خدا کی اور خدا کے حکم کی عزت کرے گا یہ
ہر اپنے اور پرائے سے سدا الفت کرے گا یہ
مرا ننھا جواں ..... ہوگا۔
(اختر شیرانی)

مذہب کچھ ہو، ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں
ہندو ہیں یا مسلم ہیں یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے پریم کے ہم متوالے ہیں
بھارت کے نام کے عاشق ہیں ہم بھارت کے شیدائی ہیں
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
(افسر میرٹھی)

ہم وطن شیخ و برہمن اٹھے ہیں تیری گود سے
ہمسایۂ حب وطن اٹھے ہیں تیری گود سے

غازی، مجاہد، صف شکن اٹھو یہ تیری لگو سے
جن کا فیاں کا رواں سے آج خنجر کاروان
اے کشورِ ہندوستاں اے کشورِ ہندوستاں
(اسلم صدیقی)

اخوت کا بھر ہاتھ میں جام لے مساوات انساں کا پیغام لے
روایاتِ ماضی سے پھر کام لے وطن کو بنا در حقیقت وطن
زمینِ وطن، اے زمینِ وطن
(آنند نرائن ملا)

ہند میں جس کو نہیں منظور جمہوری نظام
ہند سے کیا اس کو مطلب ہند سے کیا اس کو کام

فرقہ واری سے ہے بالاتر ہماری سرزمیں
تنگ ہوگی فرقہ واری پر ہماری سرزمیں
(محتشم)

وقت ہے اب بھی سنبھل جاؤ بھٹکنے والو
توڑ دو تفرقہ پرستی کو
چھوڑ دو باعثِ تفریق لسانی جھگڑے
پھر مرا خواب
حقیقت میں بدل جائے گا (سلیمان ادیب)

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ "آج ہمارے ادب میں قومی عناصر و وطن دوستی کا اتنا بڑا اور شاندار ذخیرہ موجود ہے جس پر ہم فخر و ناز کر سکتے ہیں۔"

★

رومانیت کیا ہے — (صفحہ ۱۰ کا بقیہ)

کا نمونہ ہے جبکہ عصر ی شاعری ہمیں رقت و اشک ریزی پر مجبور کرتی ہے۔ جرمن شاعر شینیر CHENIER کا قول ہے کہ

"THE HEART ALONE CREATES POETRY

اس طرح یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ احساس کا عنصر بھی یورپ کی رومانی تحریکوں میں ایک قدر مشترک رہا ہے۔ احساس کا منبع و مصدر قلب ہے اور صرف قلب اسی لیے HUGO نے احساس کو شاعری کا نام دیا ہے۔

اس کے بعد مصنف جرمن ادیب و شاعر VIGNY نے کیا پتہ کی بات کہی ہے:

"THE HEART CERTAINLY EXISTS AS A MORAL FACTOR. ITS JOYS AND SORROWS ARE FELT; BUT IT IS A DARK ROOM, AND ITS LIGHT IS THE INTELLECT"

یہ انٹلکٹ (ذہانت و ذکاوت، سوجھ بوجھ یا آگہی) ہی زندگانی قلب سے عبارت ہے۔ فرض کر دل اگر مردہ ہے تو تجربہ و مشاہدہ کوئی احساس پیدا نہ کر سکے گا۔ احساس نہ ہوگا تو جذبہ بھی نا پیدا ہوگا، جذبہ بیدار نہ ہوگا تو تصور کو پرواز نہ ہوگی، نہ تصور کو جولانی ہوگی نہ فرد کی انا اسکو اپنا خاص رنگ دے سکے گی۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

یہیں پر شاعری کو عرفان ذات اور تخلیقی دردوں سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ وہ منزل ہے جہاں شاعری سے متعلق ایک قدر مطلق پیش کی گئی ہے۔ رومانیت شاعری کا ایک رخ ہے جس کی تشریح، تعبیر اور تنقید ہر دور میں ہوتی رہی اور حقیقت یہ ہے کہ بقول الف۔ شلیگل رومانی شاعری ابھی تک اپنے دورِ حرکت و نمو میں ہے اور یہ حرکت و نمو دراصل اس کی روح ہے، یہ ہمیشہ تغیر پذیر رہے گی، اس کی تکمیل شاید کبھی نہ ہو۔

★

مری خوشی ہے مری آبرو ہے میرا وطن

اعجاز فاطمہ

مری خوشی ہے مری آبرو ہے میرا وطن
مرا وطن ہے تمنا، مرا وطن ہے لگن

مرا وطن ہے جمالِ حیات کا درپن
مرا وطن ہے تمدن کا بے مثال چمن
مرا وطن ہے محبت کا شانِ دار گلشن
مرا وطن ہے سکون و قرار کا دامن

مری خوشی ہے مری آبرو ہے میرا وطن
مرا وطن ہے تمنا، مرا وطن ہے لگن

مرے شعور، مری آگہی کا دفتر ہے
مرے خلوص، مری آرزو کا محور ہے
دل و نظر کے تصور کا ایک پیکر ہے
خیال و فکر و تخیل سے بھی حسین تر ہے

مری خوشی ہے مری آبرو ہے میرا وطن
مرا وطن ہے تمنا، مرا وطن ہے لگن

عظیم تاج اسی خاک پر ہے جلوہ نشیں
ہے جس کے حسن سے تابندہ تر جہاں کی جبیں
اجنتا ایلورا بھلا ہیں اور کہیں
زمین تو ہے مگر آسماں سے کم بھی نہیں

مری خوشی ہے مری آبرو ہے میرا وطن
مرا وطن ہے تمنا، مرا وطن ہے لگن

غزل



کتنے نادان وقت پر دیکھے ہیں کیا کیا آشنا
کوئی آئے منزلِ الفت میں دل سا آشنا
روبروئے حسن غائب ہو گئے صبر و قرار
کوئی بھی میرے سوا ٹھہرا نہ میرا آشنا
سیکڑوں دامن توجہ میں الجھ کر رہ گئے
ایک میں نکلا تمہاری بے رخی کا آشنا
شیخ جی ہم تو اسیرِ معصیت ٹھہرا مگر
آپ کی ذات مقدس ہے خطا نا آشنا
جز مرے کوئی نہ پہنچا اس تکلف کے قریب
وہ برنگِ اجنبیت کس قدر تھا آشنا
گو رہِ الفت میں کی ہے ہر قدم پر رہبری
رہبری کا اپنے سر باندھیں گے سہرا آشنا
کثرتِ غم دل کو اس درجہ حقارت سے دیکھ
یہ سمجھ رکھنا کہ یہ قطرہ ہے دریا آشنا
سوچتا ہوں زندگی کے اس بھرے بازار میں
کتنی سستی دشمنی ہے کتنا مہنگا آشنا
شرط یہ ہے کوئی ہونا چاہیے حسنِ کمال
زندگی کیا موت بھی کرتی ہے پیدا آشنا
اس قدر ہے دوستی پر آج موسم کا اثر
جب ہوا بدلی ہوا کے ساتھ پلٹا آشنا
آج اپنی سادگی پر دیر تک ہنسنا پڑا
کتنا بیگانہ تھا وہ جس کو میں سمجھا آشنا
فرق کو دستِ طلب کے جاننا تو چاہیے
ورنہ گلچیں کو بھی کہہ دیجے گلوں کا آشنا
رنگ و بو تو اڑ لیے بادِ خزاں کو دیکھ کر
پھول سے پوچھا ہے کوئی اور تیرا آشنا!
اک زمانہ یوں تو دم بھرتا ہے الفت کا مگر
کاش تو بھی جانتا ہے کون کتنا آشنا
آج تو خوش ہوں کہ مرضی کسی کی دیکھ کر
کاش ہو تیرا میری آنکھوں کا منظر زدہ آشنا
آپ ان کے بجز سے ہو جاؤ دل کے آشنا کیا
ہو چکی ہے اب نگاہِ شوق پر وہ آشنا
جادۂ دیر و حرم بھی اتنے پیچ و خم نہ تھے
جاننے والے بھی ہادی اب ہوئے نا آشنا

ہادی مصطفیٰ آبادی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ

از: سید قمر الحسن
چیف ایڈیٹر
ندیم، بھوپال

میرا شروع ہی سے یہ خیال رہا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کو کچھ افراد یا پارٹیوں کی جانب سے ایک خاص مقصد، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ سازش کے تحت ہدف لعنت و ملامت بنایا جا رہا ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ پھر ایسے بھی لوگ ہیں جو نادانی نادانستگی یا جذباتیت کا شکار ہو کر اس ایکٹ کے خلاف موہوم اندیشوں اور مفروضہ وسوسوں میں مبتلا ہیں۔ میں ایکٹ کو بہ حیثیت مجموعی اس کی تمام دفعات کے ساتھ حرف آخر نہیں سمجھتا نہ کوئی دنیوی قانون اتنا جامع اور مکمل ہو سکتا ہے کہ وقت اور زمانے کی تبدیلی کے باوجود اس میں لفظ رکھنے کی گنجائش نہ ہو مگر جہاں تک اس ایکٹ کے مقاصد اور اس کی غرض و غایت کا تعلق ہے میں اسے روح عصر کی آواز سے تعبیر کرتا ہوں۔

میں یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ آج اگر سرسید زندہ ہوتے تو وہ بغیر کسی تذبذب اور تامل کے اس قانون کے مقصد پر صاد ہی نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے خوابوں کی سچی تعبیر بھی سمجھتے۔ یہ قانون کیا جا رہا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو علمی اور تعلیمی نقطہ نظر سے کتنا آگے لیے جا رہا ہے اس کا جواب صرف یہ ہے کہ یہ علیگڑھ یونیورسٹی کی نشاۃ ثانیہ، اس کے احیاء، بقا، اس کی ترقی اور بلندی کی طرف ایک بڑھا ہوا قدم ہے۔ وہ مسلمان جو یہ سمجھ رہے ہیں یا جنہیں یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ لیے ایک مسلم یونیورسٹی رہ گئی تھی اس پر بھی حکومت نے ہاتھ صاف کر دیا اور ایسا قانون نافذ کر دیا کہ آگے چل کر یہ نام کی مسلم یونیورسٹی غیر مسلم یونیورسٹی بن جائے گی۔ جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اس قانون کی منشا کے تحت مسلمان طلباء پر بہترین تعلیم و تعلّم کے وہ دروازے کھولے جا رہے ہیں جو اس سے پہلے ان پر کبھی نہیں کھلے تھے۔ اب صحیح معنوں میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے متعلم علم کی روشنی لے کر نکلیں گے، نفرت تعصب اور تنگ دلی کے اندھیرے لے کر باہر نہیں آئیں گے۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ اس کا انداز فکر بدل گیا ہے۔ ہم سوشلزم کی جانب بڑھ رہے ہیں جہاں انفرادی ملکیت اور حق حقوق کا قدیم تصور اجتماعیت کے ہمہ گیر احساس میں ضم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے ایک ترقی پسندی اور روشن خیالی وسیع النظری اور کشادہ قلبی کے دور میں پرانی لکیروں کو پیٹنے سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ تو حکومت کی مسلمانوں سے دشمنی ہوتی کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے قلیتی کردار کے مطالبہ کے نام پر اس ابھرنے والی یونیورسٹی کو ایسے مسلمانوں کے حوالے کر دیتی جو ہنوز بسم اللہ کے گنبد میں بند ہیں اور یونی ورسٹی پر اپنا حق جتانے کو ہی مسلمانوں کی سب سے بڑی اور اہم خدمت سمجھتے ہیں۔ علم و فن کسی فرقے اور ملت کی میراث نہیں ہے۔

اس لیے اگر مرمتہ قانون کے تحت یونیورسٹی کے نظم و نظام میں اس کی بہتری، ترقی اور بہبودی کی خاطر کچھ ایسے اصحاب بھی اس میں شامل کیے جا سکتے ہیں جو مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی ماہر تعلیم اور اسکالر ہیں تو کسی باشعور انسان کو اس سے اختلاف یا انحراف کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ ایکٹ کے خلاف تحریک چلانے والے چند گنتی کے مسلمانوں کو یہ کہلوانا عزیز ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی ہمارے بزرگوں کی متاع ہے اور اس متاع پر ہمارا حق میراث تسلیم کیا جانا چاہیے چاہے ہم اسے برباد کر کے ہی کیوں نہ رکھ دیں یا یہ بات اچھی ہو کہ

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یونیورسٹی کو تعلیمی معاملہ میں بالکل بے جا نہ رہیے ہم کو اس سے بحث نہیں ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی سے مسلمان طلبا علوم اسلامیہ اور جدید فنون میں تعلیم و تربیت پانے کے وسیع امکانات حاصل کر سکیں جس سے وہ ایک اچھے اور قابل مسلمان بننے کے علاوہ ایک عمدہ انسان بھی بن سکیں جو صرف اپنے فرقہ کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کے لیے مفید اور کار آمد ثابت ہوگا۔

اس لیے ہم کو آج یہ فیصلہ کرنا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ اقلیتی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے جن مقاصد کے پیش نظر سرسید احمد نے یونیورسٹی کی ایم۔ اے۔ او کالج کی شکل میں بنیاد ڈالی تھی اور جس سے مسلمان طلباء کا زریں مستقبل وابستہ تھا اور جسے گزشتہ کئی سالوں سے ایک معقول قانون نہ ہونے کے باعث گھن لگا جا رہا تھا۔

★

مزاحیہ

جی۔ اے۔ شاہد

اپنی نظر نہ ہند پہ مرکوز کیجیے — پیرس میں جا کے مخزنِ جہاں چوز کیجیے

دل دیکھیے نکالتا ہوں کس صفائی سے — زلفِ دوتا کی آپ گرہ لوز کیجیے

چُپ چُپ سی شمع اور پتنگے مرے مرے — کل رات کیا ہوا تھا بیاں نیوز کیجیے

مرغِ شباب اسیر ہے ٹیڈی لباس میں — للہ اس قفس کو ذرا لوز کیجیے

روشن ہے شمعِ حسن تو پروانے آئیں گے — بیوٹی کا بلب آپ ذرا فیوز کیجیے

قاشیں نہیں، یہ میرا دلِ لخت لخت ہے — غیروں کو پیش شوق سے تربوز کیجیے

شاہد پسند آپ کو بھنگڑا ہے یا ٹوئسٹ
ظاہر جناب اپنے ذرا ویوز کیجیے

مزاح

اے بسا آرزو

علی عباس امید

جب میرا ایم۔ اے کا رزلٹ آیا تو گھر میں خوب خوشیاں منائی گئیں۔ پاس پڑوس کے سبھی مردوں نے مبارک باد پیش کی اور عورتیں اسی بہانے سے اکٹھا ہو کر کئی دنوں تک ایک دوسرے کی غیبت کرتی رہیں کئی دوستوں اور رشتہ داروں نے تو چھوٹے موٹے بے مقصد قسم کے تحفے بھی پیش کیے اور خواہ مخواہ مجھے اپنی اہمیت کا احساس دلایا۔ اس روز تو مجھے اپنی کامیابی پر واقعی غرور ہوا جس دن بھوپال والی خالہ نے میرے پاس ہونے کی خوشی میں گڑ کی جلیبیاں تقسیم کر ڈالیں۔

تین مہینے اسی نشہ میں گزر گئے اور جب خمار ٹوٹا تو پتہ چلا کہ دراصل ایم اے کرنے کا مطلب ہے ایسا لائسنس حاصل کر لینا جسے دکھا کر اپنے گزر بسر کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ جب کئی ماہ بھٹک چکا تو معلوم ہوا کہ ڈگری تو سبھی حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس سے صحیح فائدہ کچھ ہی لوگ اٹھا پاتے ہیں۔ مقامی طور پر ناکام ہونے کے بعد میں نے بیرونی محاذ پر مہم شروع کی اور دور دور رشتہ داروں دوستوں، دوستوں کے رشتہ داروں اور پھر ان کے رشتہ داروں سے رجوع کیا۔

دو ماہ گزرے ہوں گے کہ بھوپال سے خالو نے لکھا کہ فوراً آ جاؤ ملازمت مل گئی ہے۔ بھوپال کی گاڑی میں چونکہ دیر تھی اس لیے میں بس ہی سے چل پڑا۔ میرے بھوپال پہنچنے پر خالو، خالہ اور ان کے تمام بچوں نے عید جیسی خوشی منائی اور مجھے احساس ہوا کہ اب بھی دنیا سے محبت ختم نہیں ہوئی ہے اور اپنائیت کی روایت برقرار ہے۔ گھر اگرچہ چھوٹا تھا لیکن رہنے والوں کے دل بڑے تھے۔ میں بالکل گھر کی طرح رہنے لگا۔ چند ہی دنوں بعد ایک سرکاری دفتر میں کام کرنا شروع کر دیا۔ زندگی ایک ڈگر پر لگ گئی اور دن گزرنے لگے۔ سردیاں ختم ہو گئیں اور گرمی کا موسم شروع ہو گیا۔

گرمی آتے ہی ایک الجھن پیدا ہو گئی۔ خالو کا مکان چھوٹا تھا اور رہنے والے زیادہ۔ سردیوں میں تو کسی طرح گزر ہو جاتا تھا لیکن اب چھوٹے سے آنگن میں سب کا سونا کسی طرح ممکن نہ تھا! دن تو اچھا بھلا آفس میں گزر جاتا لیکن رات مصیبت بن کر نازل ہوتی۔ شام کو دفتر سے واپس آنے پر میں دیکھتا کہ اس مختصر آنگن میں بڑے فنکارانہ طریقے سے خالو، خالہ، میاں جاوید، شگفتہ، ننھے خاں بھوپالی اور پہلوان آپا کے بستر لگے ہوتے۔ ان کے ساتھ ہی شبنم، حیدر، شبینہ اور رضی بھی گڈمڈ ہو کر رہتیں۔ اس کے بعد اتنی گنجائش بھی نہ رہتی کہ ان کے درمیان سے چل کر کمرے میں جایا جا سکے۔ مجھے کسی نہ کسی طرح باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری تک پہنچنا ہی پڑتا تھا کیونکہ رات تو بہر حال اسی میں گزارنا پڑتی تھی۔ مجھے خالو یا خالہ سے کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ ان کی جگہ پہ مجھے کسی قسم کا شک نہیں تھا۔ ان کے خلوص کا آئینہ اب بھی پہلے

ہی جیسا تھا۔ بس مکان کی تنگی نے اسے غبار آلود کر دیا تھا۔
کچھ راتیں میں نے باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری میں گزاریں
لیکن جب گرمی زیادہ بڑھی تو وہاں سونا ناممکن ہو گیا۔

وہ رات بہت گرم تھی۔ شاید اس پر سورج کچھ زیادہ ہی خفا
ہوا تھا۔ گیارہ بجتے بجتے کوٹھری بھٹی میں تبدیل ہو گئی اور میں
گھبرا کر باہر سڑک پر آ گیا۔ یہاں کچھ سکون تھا۔ کافی دیر تک ٹہلنے
کے بعد نیند کا غلبہ ہوا لیکن گھر میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔ میں
ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر گھومتا رہا
پھر پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم کا رخ
کیا۔ ابھی میں سونے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہا تھا
کہ چوکیدار نے رجسٹر کی خانہ پُری کے لیے ٹکٹ طلب کیا۔ میں نے
کمال لاپرواہی سے پلیٹ فارم ٹکٹ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔
ٹکٹ دیکھ کر وہ مجھے اس طرح گھورنے لگا جیسے اچانک میرے
کان سینگوں میں تبدیل ہو گئے ہوں یا پھر ناک نے بڑھتے بڑھتے
سونڈ کی شکل اختیار کر لی ہو۔ جب اس کی حیرت کچھ کم ہوئی تو اس نے
ٹکٹ میرے ہاتھ پر رکھ کر انگلی سے پلیٹ فارم کی جانب اشارہ کیا۔
میں نے یہی غنیمت جانا کہ اس نے اپنی زبان کو قصیدہ خوانی کے
لیے زحمت نہیں دی اور سر جھکا کر باہر نکل آیا۔ مسافروں کی نشتری
نگاہیں دیر تک چبھتی رہیں اور میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ اب دو بج
چکے تھے۔ گھر تین میل دور تھا۔ نیند غالب آ رہی تھی اور صبح کو آفس بھی
جانا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اسٹیشن کے سامنے والے
پارک میں ہی بقیہ رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں پہنچا تو ایسا محسوس
ہوا جیسے کسی جوتا بنانے والی کمپنی میں پہنچ گیا ہوں کیوں کہ پورے
پارک میں گھاس پر لوگ اسی طرح پڑے ہوئے تھے جس طرح ڈبوں
کے اندر جوتے اُلٹے کر کے رکھے جاتے ہیں۔ میں بھی ایک کونے میں
چپلیں سر کے نیچے دبا کر پڑ رہا۔ پاؤں کی طرف جگہ اتنی کم تھی کہ وہ
سمٹے ہی رہے۔ کئی ماہ بعد کھلے آسمان کے نیچے سویا تھا۔ پاؤں
کے سکڑے ہونے اور آس پاس جسموں کی شدید گرمی کے باوجود
مجھے نیند آ گئی۔ میں نہ جانے کب تک سوتا رہتا لیکن صفائی کرنے
والوں نے بڑی بے دردی سے پانی کے چھینٹے ڈال کر اٹھنے کے لیے
مجبور کر دیا۔ اٹھنے پر معلوم ہوا کہ اور تو سب خیریت ہے سوائے اس کے کہ
سر کے نیچے دبا ہوا چپلوں کا جوڑا کوئی صاحب اپنا سمجھ کر اٹھا لے
گئے ہیں۔ مجبوراً ننگے پاؤں گھر لوٹنا پڑا۔

اس دن آفس میں اس پریشانی کا ذکر کیا تو سنگھ صاحب نے
دوسرا مکان لینے کا مشورہ دیا۔ دفتر سے اٹھ کر وہ میرے ساتھ مکان
ڈھونڈنے نکلے تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم حاتم طائی کے سات سوالوں
میں سے ایک کا جواب تلاش کرنے کے لیے چل پڑے ہیں۔ جہاں جاتے
لوگ ہمیں اس طرح دیکھتے جیسے ہم کوئی ناقابلِ یقین بات کر رہے
ہوں: "آپ کو مکان چاہیے؟ خوب! ارے بھائی اب مکان کہاں
ملتے ہیں" "کمرہ تو کہیں ملتا نہیں اور آپ پورے مکان کی بات
کر رہے ہیں" "شاید آپ حال ہی میں کہیں دیہات سے
آئے ہیں اسی لیے یہ بے فائدہ کوشش کر رہے ہیں!"

رات کو گیارہ بجے جب ہم ناکام لوٹ رہے تھے تو ہمارا
مشترکہ شناسا لیاقت موچی مل گیا۔ اس نے بتایا کہ آج ہی شام کو
ایک مکان اس کے پڑوس میں خالی ہوا ہے۔ اس کے مالک بڑ والے
بابا جی سے اس کے اچھے تعلقات ہیں لہٰذا صبح ہونے سے پہلے ہی
وہ ہمیں دلا دے گا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اتنی آسانی سے
ہماری مشکل کو سہل بنا دیا تھا۔ ہم اس کے ساتھ مکان دیکھنے کے لیے
چل پڑے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔
گندے نالے کے دائیں جانب تین دیواریں کھڑی تھیں۔ ان کے اوپر
ٹین کی دو ایسی چادریں پڑی تھیں جن میں سے بغیر کسی خاص زحمت
کے آسمان کے بدلتے ہوئے رنگوں کا دیدار ہو جاتا تھا۔ میں نے
لیاقت موچی سے دریافت کیا کہ وہ مکان کہاں ہے تو وہ گمبھیرتا
سے بولا "یہی تو ہے۔ ابھی آپ لے لیجئے بعد میں بابا جی سے اجازت
دلا دوں گا تو اسے اپنی مرضی سے درست کرا لیجئے گا۔ بابا جی تو سیدھے
آدمی ہیں انھیں کسی چیز کا لالچ تھوڑے ہی ہے۔ اگر آپ ہر ماہ
کرایہ کے تیس روپے پیشگی دیتے رہے تو جب تک جی چاہے
رہیے گا وہ کچھ نہ کہیں گے" پھر وہ فدویت کے سے لہجے میں

پڑا سنگر اور ایسے کہ یہ شام کو خالی ہوا ورنہ اب تک تو اسے بِکا ہوتا۔" ہم نے کافی سوچنے کے بعد باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری ہی کو غنیمت جانا۔

دوسرے دن آفس جاتے ہوئے بس میں سیرل جی مل گئے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے ایک دوست ہیں منظور صاحب۔ اردو کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ انھوں نے خالی مکان کا تذکرہ کیا تھا۔ میں نے اور سنگھ صاحب نے دفتر سے چھٹی لی اور منظور صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ وہ بہت با اخلاق انسان ثابت ہوئے۔ ڈرائنگ روم میں بٹھایا، شربت پلایا، سگریٹ پیش کیا اور تین گھنٹے تک اپنی تازہ کہانیاں سناتے رہے۔ جب کافی دیر ہوگئی تو سنگھ صاحب نے پہلو بدلا اور دھیرے سے منمنائے "منظور صاحب ہم آپ کے پاس ایک ضرورت سے حاضر ہوئے تھے۔" وہ بڑی خوش اخلاقی سے بولے "فرمایئے فرمایئے۔" سنگھ صاحب نے جھجکتے جھجکتے کہا "وہ..... وہ..... خالی مکان....." اور منظور صاحب کھل اٹھے "اچھا اچھا میں سمجھا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے نا قدر زر کو ہر شاہ داند..... تو صاحب یہ حقیقت ہے۔ واقعی آپ دونوں حضرات ملک ادب کے بادشاہ ہیں۔ آپ ہی جیسے قدردانوں کی وجہ سے اس بدترین دور میں بھی ادب زندہ ہے۔ ابھی حاضر ہوا۔" وہ اندر چلے گئے۔ سنگھ صاحب بولے "استاد کام بن گیا۔ اب دعوت کرنا ہوگی۔ ہوٹل میں نہیں نے گھر میں۔" میں نے قسم کھا کر انھیں یقین دلایا کہ مکان ملنے کے بعد کرایہ نکال کر بقیہ تنخواہ ان کے حوالے کر دوں گا۔ اتنے میں منظور صاحب برآمد ہوئے ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ انھوں نے سنگھ صاحب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "آپ پہلے قدردان ہیں جو اس طرح گھر آ کر لے رہے ہیں۔" میں نے دیکھا کتاب پر لکھا تھا "خالی مکان" یہ ان کا پہلا جاسوسی ناول تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے چھوٹے بڑے دائرے گھومنے لگے۔ ان میں کسی کا رنگ سرخ تھا، کسی کا سیاہ، کوئی زرد تھا اور کوئی آسمانی۔ پھر مجھے کچھ خبر نہیں۔ آنکھ کھلی تو میں

باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری میں تھا اور خالہ سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ سنگھ صاحب نے ساڑھے چار روپے دے کر وہ ناول لے لیا تھا۔

صبح کے اخباروں میں ایک اشتہار تھا "دنیا کا سب سے ہیبت ناک ناول۔ ادب کی تاریخ میں تہلکہ۔ صرف سرورق دیکھ کر ایک شخص بیہوش ہو گیا۔ آج تک ایسا خوفناک ناول نہیں لکھا گیا۔ ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے۔ آپ بھی فوراً اپنی جلد حاصل کر لیجئے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

دو دن چھٹی پر رہنے کے بعد دفتر پہنچا تو یہ خوف تھا کہ لوگ مذاق اڑائیں گے لیکن وہاں خلاف معمول سنجیدگی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرے درد کو سب سمجھتے ہیں۔ اسی روز معلوم ہوا کہ میرے ساتھیوں میں سے تقریباً نصف دھرم شالاؤں یا مندروں میں رہتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے بال بچوں کو اس لیے ساتھ نہیں رکھ پاتے کہ وہ خود مسافر خانوں اور مسجدوں کے حجروں میں گزر کرتے ہیں۔ جن کے پاس فیملی ہے ان کے مکان بھی ہمارے مکان سے مختلف نہیں ہیں۔ ان اطلاعات نے میرے زخم پر مرہم کا کام کیا۔

ڈاکٹر اگروال میرے قریبی دوست ہیں، جب انہیں میری زبوں حالی کا پتہ چلا تو وہ مجھے اپنے ایک قریبی دوست کے پاس لے گئے۔ ان حضرت کے ماموں زاد بھائی کے سالے کے چچا دولت رام کا مکان خالی تھا۔ جب ہم لوگ دولت رام کے پاس پہنچے تو انھوں نے ایک سوالنامہ دیتے ہوئے کہا: "آپ اطمینان سے اسے بھر کر دے جایئے گا۔ ہمارے پاس اور بھی کافی سوالنامے آئے ہیں۔ اگلے ہفتہ ان سب پر غور کیا جائے گا۔ اگر آپ ہمارے معیار پر پورے اترے تو مکان آپ کو مل جائے گا۔" میں نے ہر پہلو کی نزاکت اور مسئلے کی اہمیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ ان کے اکیس سوالوں کے جواب بھر کر ان تک پہنچا دیے۔ مکان کافی اچھا تھا اور کرایہ بھی معقول تھا۔ اس لیے میں صبح و شام انھیں سلام کرنے کی غرض سے ان کے در پر حاضری دینے لگا۔ آج کل سفارشوں کا زمانہ ہے لہذا پتہ

لگانا شروع کیا کہ ایسے کون لوگ ہیں جن کی بات دولت رام مان سکتے ہیں۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک صاحب شناس کا نام معلوم ہوا جو مکان حاصل کرنے میں میری مدد کر سکتے تھے۔ پہلے صاحب سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا کہ "آپ دو گزیٹیڈ افسران کا تصدیق شدہ کیرکٹر سرٹیفکیٹ اور کسی مقامی باعزت شخص کی ضمانت لائیے پھر میں اس سلسلے میں سوچ سکوں گا۔" دوسرے حضرت سے ملا تو وہ دیر تک بڑے خوشگوار موڈ میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر بولے "آپ شام کو ہوٹل رنجیت میں آ جائیے پھر تفصیل سنوں گا۔" ہوٹل میں عالمی سیاست سے لیکر مکان کے مسئلے تک گفتگو کرکے رات کے دس بجے جب ہم اٹھے تو بیرے نے اکیاون روپے کا بل میری جانب بڑھا دیا۔ باہر نکل کر انھوں نے بڑی لاپرواہی سے ٹیکسی کو آواز دی اور مجھ سے کہا "پیدل کہاں جائیے گا آئیے مجھے چھوڑتے ہوئے اسی سے آپ بھی گھر نکل جائیے گا۔" ٹیکسی والے کو چار روپے ستر پیسے دے کر جب میں باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری میں داخل ہوا تو اس سے میرا رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔

تیسرے روز پتہ لگانے پھر ان کے پاس پہنچا۔ وہ اسی خوش اخلاقی سے پیش آئے "آئیے آئیے حضرت! کہئے مزاج تو بخیر ہیں آپ کے! بھئی معاف کیجئے گا اس قدر مصروف رہا کہ آپ کے کام کے لیے وقت ہی نہ نکال سکا۔ آج شام کو طے سمجھئے، بالکل پکی رہی۔" میں کافی دیر تک بادل نخواستہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور چٹکلوں سے انھیں خوش کرتا رہا۔ جب اٹھ کر چلنے لگا تو وہ بڑی بے تکلفی سے بولے "بھئی سید صاحب میں شام کو ضرور گفتگو کروں گا، آپ سویرے آ جائیے . . . اور ہاں آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن آپ کی بھابی کی دوا ہے اس لیے صبح آئیے تو ایک کلو سیب کا مربہ لیتے آئیے۔ کئی دنوں سے وہ کہہ رہی ہیں لیکن مجھے فرصت نہیں تھی۔ آج شام کو لانے کا ارادہ تھا لیکن آپ کے کام سے چلا جاؤں گا اور ان کے مزید ناراض ہو جائیں گے ــــ" ہر دم دکھیں ہر جا دکھیں کے مصداق سویرے ہی سویرے سیب کا مربہ لے کر ان کے گھر پہنچا تو انھوں نے بہت ہی خوش خوش

یہ مرحلہ بھی ... کہ دولت رام بہت اصولوں کے آدمی ہیں انھوں نے کسی عذر کی سماعت ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ مطمئن رہیے انصاف کی جیت ہوگی۔ میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔" اپنی خالی اور خستہ جیب کی اشک شوئی کرتے ہوئے ان کے نیک

اپنی خالی اور خستہ جیب کی اشک شوئی کرتے ہوئے ان کے نیک خواہشات

والے پھر گھر میں چلا آیا۔ چند دنوں بعد دولت رام سے ملا تو انھوں نے بتایا کہ ویسے تو میں ہر طرح ان کے مقررہ معیار پر پورا ہوں لیکن چونکہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے اس لیے مکان مجھے نہیں مل سکتا۔ میں نے مودبانہ عرض کیا کہ میں ضرور غیر شادی شدہ ہوں لیکن میرے ساتھ میرے خالو بھی ہیں جن کی بارات پندرہ سال قبل ہمارے اپنے مکان سے گئی تھی۔ اس کے ثبوت کے طور پر مختلف سائزوں کے پونے درجن بچے ان کے روبرو پیش کیے جا سکتے ہیں ــ دولت رام نے اس دلیل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو میں نے انھیں یقین دلانا چاہا کہ اگر انھوں نے مکان مجھے دے دیا تو اسی ماہ کے اندر اندر اپنی شادی کا ماحضر تناول کرا دوں گا لیکن ان کی گردن کانوں کی سمتوں میں ہل کر تھم گئی۔

دولت رام کی نفی کا بار اٹھائے ہوئے تین ہفتے گزر چکے تھے۔ ایک سہ پہر کو مسعود صاحب ملنے آئے تو بولے کہ جہانگیر آباد مرغی بازار میں یوسف پہلوان کے چائے خانہ کے سامنے ایک مکان خالی ہے۔ اپنے غمگسار بھائی احسان کو لے کر وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک بیوہ اپنا مکان کرایہ پر دینا چاہتی ہیں۔ ہم ناطے کے پردہ والے اس مکان کے دروازے پر پہنچے تو ایک نسوانی آواز آئی "بیٹے ذرا منی کو آواز تو دینا۔" ہم نے وہیں ٹہلتی ہوئی ایک بچی کو پکارا تو پتہ چلا کہ منی دراصل بڑی بی کی اس مرغی کا نام ہے جس کے سفید پروں پر سرخ رنگ کے چھینٹے ہیں۔ میں اور بھائی احسان اس کی تلاش میں نکلے۔ کوئی آدھ گھنٹہ کی محنت کے بعد وہ گھورے پر نظر آئی۔ ایک طرف سے میں نے اور دوسری جانب سے بھائی احسان نے اسے گھیرنا شروع کیا۔ جب قریب پہنچ کر ہم نے اس پر ہاتھ مارا تو وہ کڑکڑاتی ہوئی اڑ گئی اور اس

کی پرواز کے ساتھ ہی میری بچی کچی عزت نے بھی پر تول لیا کیونکہ اس محلے کے کوئی نصف درجن باعزت اور بے عزت لوگوں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور اس حصار کے باہر ان کے زندہ مستقبل تالیاں بجا بجا کر "مرغی چور، مرغی چور" کی آوازیں لگا رہے تھے۔ ہم نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم مرغیاں پکڑنے والے نہیں ہیں بلکہ اس مرغی کی مالکہ کی درخواست پر اسے پکڑ رہے تھے لیکن مونچھوں والے ایک صاحب برابر ہمیں برا بھلا کہے جا رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جس مرغی کو ہم بڑی بی کی ملکیت سمجھ کر پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے، دراصل وہ انھیں حضرت کی تھی۔ بہرحال ایسے حادثاتی مواقع پر کچھ شریف لوگ بھی پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں بھی تھے اور انھوں نے معاملہ کو سمجھ کر ہماری جان بچائی۔ ایک بزرگ نے کہا کہ "چلیے میاں آپ کا مسئلہ طے کرا دوں گا۔" ہم پھر وہاں پہنچ گئے۔ مکان دیکھا، ایک کمرہ اور برآمدہ تھا۔ بڑی بی نے کہا کہ برآمدہ میں وہ خود رہیں گی اور کمرہ کرایے پر اٹھا دیں گی۔ کرایہ دار کے لیے کوئی شرط بھی نہ تھی سوا اس کے کہ اس کے بیوی بچے نہ ہوں، ان کی مجبوریوں کا خیال کرے، اللہ کے کام آئے اور اپنی عاقبت سنوارے۔ کام بھی کوئی خاص نہیں بس یہی کہ دونوں وقت پانی بھر دے، بازار سے سودا وغیرہ لا دے اور ان کی مرغیوں کی نگرانی کرے۔ مرغیوں کا ذکر آتے ہی میری وہی کیفیت ہونے والی تھی جو منظور صاحب کا

مال دیکھ کر ہوئی تھی۔ لیکن بھائی احسان نے خلاف توقع عقل سے کام لیا اور میرا بازو پکڑ کر بے تحاشہ سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔ کافی دور پہنچ کر جب ہم دم لینے کے لیے رکے تو احساس ہوا کہ تقریباً بے دم ہو چکے ہیں۔ پھر بھی خداوند عالم کا شکر ادا کیا کہ دل نے اپنا کاروبار جاری رکھا تھا۔

مکان تلاش کرتے ہوئے مجھے دس ماہ ہو چکے ہیں۔ برسات کی آمد آمد ہے اور میں باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری میں سوتا ہوں۔ جب بارش ہوتی ہے تو پوری رات چھت پر آنکھیں لگی رہتی ہیں کیونکہ باران رحمت کا ایک قطرہ بھی باہر گر کر ضائع نہیں ہوتا۔ شاید یہ اس حبس کا بدلہ ہے جو گزشتہ تین ماہ میں میرا رفیق رہا ہے۔ سنا تھا کہ صبر اور محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مجھے اس مقولہ کی صداقت پر قطعی اعتبار نہیں ہے کیونکہ دائمی صبر اور مسلسل محنت کے باوجود میں میٹھے تو کجا کھٹے پھل سے بھی محروم ہوں۔ اب تو یہ صورت ہو گئی ہے کہ جب بھی کسی سے ملتا ہوں تو بجائے اس کی اور اس کے بال بچوں کی خیریت دریافت کرنے کے کسی خالی مکان کا پتہ پوچھتا ہوں۔ کاش کبھی یہ معجزہ ہو جائے کہ میں ایک ایسا مکان ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں جس میں رہنے والے لوگ اپنی مرضی کے مطابق الگ الگ چارپائیوں پر لیٹ کر سو سکیں۔ نا امید پر دنیا قائم ہے لہٰذا میں بھی اسی امید کے سہارے دن اور بالخصوص راتیں گزار رہا ہوں۔

★

"مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے" (صفحہ ۴۰ کا بقیہ)

سہیلہ برآمد ہونا چاہیں گی؟

اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ "نہیں۔ میں کبھی ریٹائر نہیں ہوں گی۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ میرے چاروں طرف ابھی بہت اور قدامت پرستی موجود ہے اور بُرے رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑا ہوا اسلام کے پہلے وہ سب کا وہ طبقہ ہے جس کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے اپنے مہیلا کلاس کے بارے میں بتایا جو بنیادی طور پر جاہل عورتوں کے لیے کھولا گیا ہے۔ یہاں مرچ مسالے وغیرہ اور گھریلو استعمال کی اشیاء ہاتھ سے بنا کر فروخت کی جاتی ہیں جن کی آمدنی سے پچھلے طبقے کی عورتوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

بوا جی آج بھی جلسوں اور تقریبات میں حصہ لیتی ہیں۔ مہیلا کلاس کی گھریلو مصنوعات کی فروخت کے لیے انھیں جگہ جگہ جانا پڑتا ہے۔ وہ غریبوں کی بستیوں میں پابندی سے جاتی ہیں اور وہاں کی خواتین کو صحت و صفائی، خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ کے بارے میں بتاتی ہیں۔ بے غرض قربانی، ایثار اور خدمت خلق کی چلتی پھرتی علامت ہیں۔

غزل

قدیر چشتی

اک گرہ ہوں غمِ امید کی کھولو مجھ کو
میں کہ خود ہی میں چھپا ہوں ذرا ڈھونڈو مجھ کو

اختلافات کی وادی میں اندھیرا ہے بہت
دیکھنا ہے تو ذرا بڑھ کے ہی دیکھو مجھ کو

میں اسی شہر کا گمنام سا باشندہ ہوں
ذرا انجان نگاہوں سے ٹٹولو مجھ کو

ایک موہوم بھروسے پہ یقیں ٹھیک نہیں
کوئی امید نہیں مجھ سے تو چھوڑو مجھ کو

طنز کرنا بہت آسان ہے لیکن یارو
وقت مل جائے اگر تم کو تو سوچو مجھ کو

سامنے ایک شناسا سا کوئی چہرہ ہے
اجنبیت کا ہے احساس لگا ہو! مجھ کو

عاملِ شوق پہ ناکامی کا دھبہ ہوں قدیرؔ
ہو جو ممکن تو کسی طور ہی دھولو مجھ کو

غزل

مظفر النساء ناز

نظر ملائیں تو کس طرح بے سہاروں سے
لہو ٹپکتا ہے بجھتے ہوئے چراغوں سے

یہ رہبری تو فقط منزلوں کا دھوکہ ہے
گزر رہے ہیں سبھی اپنی اپنی راہوں سے

اکیلے پن میں میں یکجا نیت سے ڈرتی ہوں
حیات نکھری حوادث کے تیز دھاروں سے

جہاں بھی دیکھا تبسم نواز لوگوں کو
بڑے خلوص سے ملتے ہیں اشکباروں سے

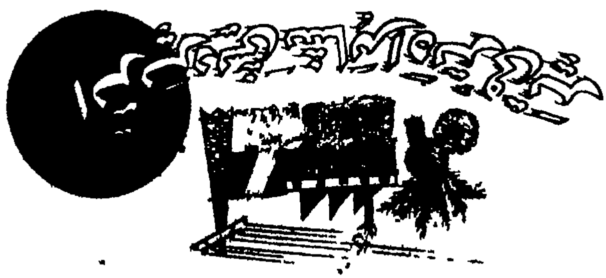
جنوں پسند مزاجوں کو کون سمجھائے
مرا بھی ربط ہے روٹھی ہوئی بہاروں سے

کروں میں شکوۂ اغیار کس زباں سے نازؔ
لگے ہیں زخم تو اپنے ہی خیرخواہوں سے

"شیشے کی فصیلیں"

محمد عادل صابر

پگھلے ہوئے لمحوں سے یہ چلتا ہے پتا بھی
اس شہر میں رہتا ہے کوئی شعلہ نوا بھی
ڈرتا ہوں کہ قسمت اسے "پتھر" نہ بنا دے
اپنے لیے میں نے جو کوئی "پھول" چنا بھی
کیا جانے! کہاں کھو گئے خوشبو کی طرح وہ
میں چار قدم ان کے تعاقب میں چلا بھی
ماحول کے زخموں کی کسک دیکھنے والو
حالات کے دھاگوں سے کوئی زخم سیا بھی
زائل نہ ہوئے جسم سے ظلمات کے دھبے
راتوں کا بدن چاند کی کرنوں سے دھلا بھی
ہر شب کی سیاہی ہے تری آنکھ کا کاجل
ہر صبح کا پرتو ہے ترے رخ کی ضیا بھی
ہاتھوں میں تو پہنا دیے زنجیر کے کنگن
ممکن ہو تو محصور کرو دل کی صدا بھی
لفظوں سے تراشا ہے ترے حسن کا پیکر
شعروں میں سموئے ہیں ترے ناز و ادا بھی
پتھر کی چٹانیں بھی تو ہیں راہ میں صابرؔ
شیشے کی فصیلوں کو اگر توڑ دیا بھی



کہ وہ جہاں کہیں بھی ضرورت ہو غریب اور حاجت مند افراد کو روزگار فراہم کرنے کے لیے امداد کا کام شروع کریں۔ انھوں نے کہا کہ منصوبہ بندی کی اسکیمیں اور تیز رفتار اور دیگر پروگرام عوام کو آئندہ ربیع کی فصل تک کی مشکل حالات کا سامنا کرنے کے لیے مواقع فراہم کریں گے۔

جلسہ میں دیگر افراد کے علاوہ وزیر اجتماعی ترقی شری پی۔ ایس آریہ، وزیر مال شری امین شرما۔ وزیر آبپاشی شری ایم۔ اے۔ خان، وزیر ریاست کنور اشرف علی اور نائب وزیر شری کے بی شرما نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ جلسہ میں چیف سکریٹری شری ایم۔ لال۔ زراعتی پیداوار کمشنر شری بی۔ ڈی سانیال مختلف ڈویژنوں کے کمشنر اور محکموں کے سربراہ بھی موجود تھے۔

❖ ❖ ❖

عالمی بینک خشک سالی سے اکثر و بیشتر متاثر ہونے والے ضلع مرزاپور میں خشک سالی سے متعلق علاقائی پروگرام کے لیے چار کروڑ روپے کی مالی امداد دینے پر رضامند ہو گیا ہے۔ یہ فیصلہ عالمی بینک کی ٹیم نے ریاست کے خشک سالی سے متاثر ہونے والے اضلاع کا دورہ کرنے کے بعد کیا ہے جو اس نے کچھ عرصہ قبل کیا تھا۔

یہ پروگرام ۱۲ کروڑ روپے کی لاگت کے اس مرکزی پروگرام کے علاوہ ہے جو ریاست کے خشک سالی سے سب سے زیادہ متاثرہ چھ اضلاع وارانسی، مرزاپور، الٰہ آباد، باندہ، ہمیرپور اور جالون میں جاری ہے۔ مرکزی پروگرام کے تحت جسے مارچ سنہ ۱۹۷۴ء تک مکمل کرنے کی تجویز ہے، ۳۵ء۷ کروڑ روپے آبپاشی کی اسکیموں پر خرچ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان اضلاع میں ۴۹۰ کلومیٹر لمبی سڑکوں کی تعمیر کے لیے ۲۲ء۴ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ شجرکاری اور زمین کے تحفظ سے متعلق اسکیموں پر ۲۲ء۲ لاکھ روپے کے مصارف آئیں گے۔

عالمی بینک نے جس پروگرام کے لیے امداد کی پیش کش کی ہے وہ ضلع مرزاپور میں اس وقت شروع کیا جائے گا جب اس کی متعدد اسکیموں کے خاکے مرکزی حکومت منظور کر دے گی۔ پروگرام کا بنیادی مقصد کم و بیش مستقل طور پر قلت کی صورت حال کو ختم کرنا، زراعت کو ترقی دینا اور سماج کے تمام طبقوں خاص طور پر چھوٹے کسانوں اور بے زمین

مزدوروں کو روزگار کے مواقع فراہم کرنا ہے۔

اس سلسلے میں ریاستی حکومت نے ایک ماسٹر پلان تیار کیا ہے جس میں متعدد مربوط اسکیمیں شامل ہیں۔ یہ پلان منظوری کے لیے مرکزی حکومت کو بھیج دیا گیا ہے۔

❖ ❖ ❖

ریاستی حکومت نے چھوٹے پیمانے کے تعمیراتی کاموں کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے گزشتہ جولائی میں قائم کی گئی دیہی انجینیرنگ سروس کے تحت ۱۰۸ اسسٹنٹ انجینیر اور ۲۲۲ اوورسیروں کی تقرری کی ہے تاکہ دیہی علاقوں کی پسماندگی کو دور کیا جا سکے۔

ضلع مجسٹریٹ کی نگرانی اور رہنمائی میں دیہی انجینیرنگ ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیراتی کام جس میں دیہی علاقوں میں معاون سڑکیں، پینے کے پانی کے کنویں۔ بلاک کی عمارتوں۔ پنچایت گھروں اور ماتحلائی صحت مرکزوں کی تعمیر سے متعلق کام شامل ہے، مکمل کرے گی۔ دیہی انجینیرنگ سروس ہر سال تقریباً ۷۰۰۰ افراد کو روزگار فراہم کرے گی جس میں ریاست کے ۶۰۰۰ غیر ہنرمند مزدور بھی شامل ہیں۔

❖ ❖ ❖

ریاستی حکومت کے صدر مقام پر موصولہ اطلاعات کے مطابق مالیاتی سال رواں کے اول چار ماہ میں ۹۵۰۷ ٹیوب ویل، ۲۰۸ پمپنگ سیٹوں اور ۱۸۰۴ رہٹوں کے لگ جانے اور ۱۵۰۷ پختہ کنوؤں کے تعمیر ہو جانے سے اتر پردیش میں مزید ۲۱۰۷ لاکھ ایکڑ آراضی کی آبپاشی کے لیے سہولتیں مہیا ہو گئی ہیں۔

ترقی آراضی بینک نے مذکورہ مدت کے دوران ۷ء۱ کروڑ روپے کے قرضے دیئے جبکہ اس کا مالیاتی سال رواں کے لیے قرضے دینے کا نشانہ ۳۲ کروڑ روپیہ ہے۔

زراعتی پیداوار کمشنر شری بی۔ ڈی۔ سانیال نے ایک گشتی مراسلہ میں ضلع مجسٹریٹوں سے کہا ہے کہ وہ چھوٹے پیمانے کے آبپاشی کے نجی پروگراموں کی رفتار تیز تر کر دیں تاکہ آئندہ مارچ تک ۲۰۰۰۰ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپ سیٹوں کی تنصیب کا نشانہ پورا کیا جا سکے۔

ریاستی حکومت نے تکنیکی تربیت اور انجینیرنگ کے مخصوص

شعبوں میں روزگار کے نئے مواقع فراہم کرنے کے لیے کچھ پالی ٹیکنیکوں میں مختلف قسم کے متعدد ڈپلوما نصاب شروع کیے ہیں۔ یہ نصاب مقامی ضروریات اور ریاست کی صنعتی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر تیار کیے گیے ہیں۔

نئے تربیتی نصابوں میں بی۔ ایم۔ بی۔ پالی ٹیکنیک متھرا۔ میں تین سال کی مدت کا آٹو موبائیل کورس (جس میں تیس طلبا کے داخلہ کا بندوبست ہے) ایس۔ جی۔ ایس۔ جے۔ پالی ٹیکنیک۔ خورجہ۔ میں سیرامکس۔ شیشہ اور پلاسٹک ٹیکنالوجی سے متعلق سہ سالہ نصاب (جس میں تیس طلبا کے داخلہ کا بندوبست ہے) سرکاری ویمنس پالی ٹیکنیک۔ لکھنؤ میں ملبوسات کی ڈیزائن اور تیاری سے متعلق دو سالہ نصاب (جس میں تیس طالبات کے داخلہ کی گنجائش ہے) اور نینی تال پالی ٹیکنیک نینی تال کا معیاری طریقوں سے متعلق دو سالہ تربیتی نصاب شامل ہیں۔ موخرالذکر نصاب کے لیے تیس نشستیں ہیں۔

نئے پوسٹ ڈپلوما نصابوں میں نینی تال پالی ٹیکنیک نینی تال میں بلند مقامات پر انجینیرنگ سے متعلق ایک سال کی مدت کا نصاب (دس نشستیں) سرکاری پالی ٹیکنک مرزا پور میں ایک سال کی مدت کا صنعتی انجینیرنگ کورس (دس نشستیں) اور گورنمنٹ پالی ٹیکنک گورکھپور میں ایک سال کی مدت کا ریفریجریشن اور ایر کنڈیشنگ کورس (دس نشستیں) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ پالی ٹیکنک جھانسی میں الکٹرانکس میں ایک سہ سالہ نصاب بھی شروع کیا گیا ہے جس میں تیس طلبا کے داخلہ کی گنجائش ہے۔

❖ ❖ ❖

اترپردیش میں ۱۹۷ ترقیاتی بلاک جو سنہ ۱۹۶۶ء میں ختم کر دیے گئے تھے اب چھ سال بعد ۲ اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ء سے دوبارہ کام کرنے لگیں گے۔ تمام ترقیاتی بلاکوں میں جن کی تعداد اب ۸۹۵ ہو گئی ہے کی نو تنظیم کرنے کے لیے ضروری کارروائی مکمل ہو گئی ہے۔ بلاک کی سطح پر نظم و نسق کی اس غرض سے اصلاح کی جا رہی ہے کہ متعدد ترقیاتی اسکیموں کو تیزی سے بروئے کار لایا جا سکے اور مکمل کیا جا سکے۔ ڈویژنل کمشنروں سے کہا گیا ہے کہ وہ اسسٹنٹ ڈیولپمنٹ افسروں اور متعدد ترقیاتی محکموں کے افسروں میں سے نئے ترقیاتی بلاک افسروں کا انتخاب کریں۔

ریاست میں نو تنظیم شدہ ہر بلاک کے دائرۂ عمل میں تقریباً ۸۰۰۰۰ دیہی آبادی آ جائے گی جبکہ بیس سال قبل ان بلاکوں کے قیام کے وقت یہ تعداد ۶۶۰۰۰ تھی۔ نو تنظیم شدہ بلاکوں کے صدر مقامات دیہی باشندوں کی سہولت کے لیے بلاک کے کسی بھی گاؤں سے ۸ سے ۱۰ کلومیٹر کے اندر واقع ہوں گے۔

❖ ❖ ❖

اترپردیش کے انتہائی حد آراضی قانون سنہ ۱۹۶۰ء میں مجوزہ ترمیم کی مجالس قانون ساز سے منظوری حاصل ہونے پر مختلف زمروں کے بے زمین افراد میں جن میں ہریجن بھی شامل ہیں تقسیم کے لیے ۳٫۶۰ لاکھ ایکڑ زمین کی دستیابی متوقع ہے۔ اس تقسیم سے ۱٫۱۵ لاکھ دیہی کنبے مستفید ہوں گے۔

مجوزہ ترمیم سے نہ صرف جوتوں کی انتہائی حد کم ہو جائے گی بلکہ مذکورہ بالا قانون کی خامیاں دور کرنے میں بھی مدد ملے گی جس کا فائدہ اٹھا کر سماج کا ایک خاص طبقہ اپنے مفاد کو پورا کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں جو متعدد اہم اقدامات کیے گئے ہیں ان میں مذکورہ قانون کے تحت فراہم کردہ متعدد مراعات کا خاتمہ شامل ہے جس کا سہارا لے کر کاشتکار جوت کی انتہائی حد سے زیادہ زمین پر قابض رہتے ہیں۔ اس امر کے پیش نظر کہ قانون کو پچھلی تاریخوں سے نافذ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو زمین سے دست بردار ہونے کا اختیار کم کیا جا رہا ہے۔ خاندان کے ارکان کی زمینیں بھی کاشتکار کی جوت میں شامل کی جائیں گی تاکہ وہ اپنی بیوی یا نابالغ بچوں کے نام پر انتہائی حد سے زیادہ زمین اپنے قبضہ میں نہ رکھ سکے۔

❖ ❖ ❖

حکومت اترپردیش نے مختلف آبپاشی نہروں سے آبپاشی پر دوگلی محصول نظام کو ختم کرنے اور ان نہروں سے آبپاشی کے لیے شیڈول اول کی شرحیں نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ آئندہ یکم اکتوبر سے نافذ ہوگا۔ اس سلسلے میں محکمہ آبپاشی کے جاری کردہ پریس نوٹ میں کیا گیا ہے۔ اس وقت ریاست

میں لفٹ آبپاشی نہروں سے آبپاشی پر دو گنی محصول نظام نافذ ہے۔ اس بنیاد پر مذکورہ شرحیں نہروں کے لیے رائج شدہ ریگولر شرحوں سے زیادہ ہیں۔ چنانچہ آبپاشی کی صلاحیت کا پورا پورا استعمال کرنے کے لیے حکومت نے اس پیچیدہ نظام کو ختم کرنے اور ایسی لفٹ نہروں سے آبپاشی پر سٹینڈرڈ ریٹوں کی شرحیں وصول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان شرحوں کا اطلاق یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء سے ہوگا۔

جولائی سے اکتوبر تک ہر ۱۲۰۰۰ گیلن پانی کے لیے ایک روپیہ وصول کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جبکہ اس وقت ریاستی ٹیوب ویلوں سے پانی کی فراہمی پر ہر ۸۰۰۰ گیلن پانی کے واسطے ایک روپیہ وصول کیا جاتا ہے۔ سال کے بقیہ حصّہ کے لیے ہر ۶۰۰۰ گیلن پانی کے واسطے ایک روپیہ کی شرح مقرر کی گئی ہے۔ ان شرحوں کا نفاذ بھی یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء سے ہوگا۔

آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے سلسلہ میں گذشتہ ۱۵ اگست کو شروع کیے گئے ایک خصوصی پروگرام کے تحت ریاست میں ۵۴ ایلوپیتھک اور ۱۲ آیورویدک ڈسپنسریاں قائم کی گئی ہیں۔

محکمہ علاج کی تیار کردہ ایک فہرست کے مطابق ریاست بھر میں ۲۵ جنوری ۱۹۷۳ء تک مجموعی طور پر ۲۰۰ ایلوپیتھک ۲۶ آرویدک اور ۲۰ ہومیوپیتھک ڈسپنسریاں قائم کی جائیں گی۔ گاندھی جینتی، پنڈت نہرو کے یوم پیدائش وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے یوم پیدائش اور یوم جمہوریہ کے موقعوں پر ڈسپنسریاں کھولنے کے نشانے مقرر کیے گئے ہیں۔

ریاست میں ہاؤسنگ کارپوریشن کی جانب سے مکانات کی تعمیر سے متعلق مختلف اسکیموں کے تحت تیار کیے گئے پانچ فیصد پلاٹ اور تعمیر شدہ مکانات مجاہدین آزادی کو الاٹ کرنے کے لیے محفوظ کر دیے جائیں گے۔

مجاہدین آزادی کو یہ پلاٹ اور مکانات نیلام کرنے کے بجائے بغیر نفع و نقصان کی بنیاد پر دیے جائیں گے۔

یہ سہولت صرف ایسے مجاہدین آزادی اور ان کے پسماندگان کو حاصل ہوگی جن کے پاس رہنے کے لیے اپنا کوئی مکان نہیں ہے۔

حکومت اترپردیش نے ریاست بھر میں مہمانوں سے متعلق کنٹرول حکم ۱۹۶۰ء نافذ کر کے عام تقریبات شادی بیاہ اور تجہیز و تکفین جیسے خصوصی موقعوں پر محض نمود و نمائش کی خاطر بے جا مصارف کے پیش نظر غذائی اجناس کے استعمال اور مہمانوں کی تعداد پر پابندی عائد کر دی ہے۔

یہ نیا حکم غذائی اجناس کے استعمال پر پابندی سے متعلق حکم ۱۹۶۶ء کی جگہ پر ۱۹ ستمبر ۱۹۷۲ء سے نافذ کیا گیا ہے۔

اس حکم کے تحت عام تقریبات کے موقع پر ایک دن میں ۲۵ سے زیادہ مہمانوں اور شادی اور تجہیز و تکفین سے متعلق خصوصی موقعوں پر ۱۰۰ سے زیادہ مہمانوں کو ناج اور دالوں سے بنی ہوئی غذائی اشیاء اور تمام قسم کی مٹھائیاں کھلانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

متفرّقات

امدادی پروگرام میں سڑکوں کی تعمیر۔ ریاست کے خشک سالی سے متاثرہ ۲۲ اضلاع میں امدادی پروگرام کے تحت دیہی علاقوں میں مجموعی طور پر ۱۵۲۹ کیلومیٹر کچی سڑکوں کی تعمیر پر غور کیا جا رہا ہے۔ اس پروگرام کے تحت جس پر تقریباً ۵ کروڑ روپیہ کی لاگت آنے کی ہر ضلع میں ۴۲ کیلومیٹر لمبی دیہی سڑکوں کی تعمیر کی تجویز ہے۔ ہر ضلع میں ان سڑکوں کی تعمیر کے نتیجے میں دیہی مزدوروں کو ۷۶۵۰۲۵۱ کام کے دنوں کا روزگار فراہم کیا جائے گا۔

واجبات کی وصولی میں رعایت۔ اترپردیش ریاستی بجلی بورڈ نے ناکافی بارش کے پیش نظر اپنے سپرنٹنڈنٹ انجینیروں اور ایگزیکیوٹو انجینیروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ نجی ٹیوب ویلوں یا پمپنگ سیٹوں کے بجلی کے کنکشن بجلی واجبات کی عدم ادائیگی کی بنا پر آئندہ ۳۰ نومبر ۱۹۷۲ء تک نہ کاٹیں۔

ان ہدایات کا اطلاق بہرحال ایسے ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں پر نہیں ہوگا جن کے کنکشن واجبات کی عدم ادائیگی کی وجہ سے پہلے ہی کاٹے جا چکے ہیں۔

★

دسمبر ۱۹۷۲ء

اگر ہائنٹر ۱۸۹۴ اشک

قیمت:

۵۰

پیسے

عنوانات

سرورق: علی عطا آرٹسٹ

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے پوری طرح متفق ہو

جلد ۲۸ نمبر ۹

اگرہاینہ ۱۸۹۴ شک
دسمبر ۱۹۷۲ء

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی

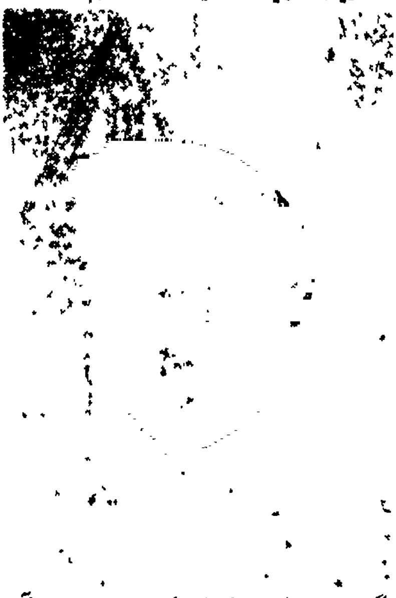
مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

اپنی بات

اتر پردیش کے سابق گورنر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کے مدت گورنری ختم ہونے پر اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد جناب اکبر علی خاں صاحب نے یو۔پی۔ کے گورنر کی حیثیت ۱۳ ر نومبر ۱۹۷۲ء کو اپنا عہدہ سنبھال لیا ہے۔

شری اکبر علی خاں ۲۰ ر نومبر ۱۸۹۹ء کو حیدرآباد کے ایک خوش حال جاگیردار خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی۔ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ علی گڑھ یونی ورسٹی میں داخل ہوئے۔ اسی یونی ورسٹی میں ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی اور علی برادران سے متاثر ہوکر تحریک عدم تعاون میں شامل ہوگئے۔



اس کے بعد آپ عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور وہاں سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرکے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے جہاں انھوں نے لندن یونی ورسٹی سے ایل ایل۔ بی (آنرس) کا امتحان پاس کیا پھر مڈل ٹمپل سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۲۶ء میں آپ حیدرآباد واپس آگئے۔ اور مولوی احمد شریف، رائے بشیشور ناتھ، سر تیج بہادر سپرو اور شری کرشنا سوامی آئینگر جیسے مشہور وکیلوں کے ساتھ کام کیا۔

شری خاں ملکی تحریک کے روح رواں رہے ہیں۔ آپ حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے میئر بھی رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ ۱۰ سال تک برابر سوسائٹی آف یونین اینڈ پروگریس کے صدر بھی رہے۔ حیدرآباد میں پہلی بار جب ۱۹۴۵ء میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تو آپ کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں آپ عثمانیہ یونی ورسٹی کی سینیٹ کے ممبر منتخب ہوئے۔ اس وقت بھی آپ علی گڑھ یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سینیٹ کے ممبر ہیں۔ آپ نے ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد میں پالی ٹیکنیک قائم کی جو گزشتہ ۱۶ سال سے کامیابی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد اس پالی ٹیکنیک کا نام جواہر لال نہرو پالی ٹیکنیک رکھ دیا گیا ہے۔

شری اکبر علی خاں اقوام متحدہ میں شرکت کرنے والے اس ہندستانی وفد کے رکن تھے جس کے سربراہ شری کرشنا مینن تھے۔ آپ شری اننت سیانم آئینگر کی قیادت میں ایک خیر سگالی مشن کے رکن کی حیثیت سے چین بھی تشریف لے گئے۔ اس کے علاوہ موصوف نے ماسکو، انگلینڈ اور ایشیا اور افریقہ کے متعدد ملکوں کا بھی دورہ کیا۔ آپ ۱۰ سال تک راجیہ سبھا کے ممبر اور ۱۲ سال تک اس کے لوہاری انگریزی پینل رہے۔ آپ کو کانگریس پارلیمانی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر بھی منتخب کیا گیا تھا۔

شری اکبر علی کا خاص کارنامہ ہندو مسلم اتحاد کو مستحکم بنانا ہے۔ آپ سیکولر نقطۂ نظر میں پختہ یقین رکھتے ہیں۔ آپ اس وقت بھی ثابت قدم رہے جب کہ مرحوم مسٹر محمد علی جناح اور نواب بہادر یار جنگ نے آپ کو اتحاد المسلمین میں شرکت کی دعوت دی۔ موصوف نے حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ کا عہدہ قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا جب کہ وہ صرف مسلم لیگ کے فارم پر دستخط کرکے ایسا کر سکتے تھے۔

گورنری کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ہی سے آپ نے یہاں کی سماجی زندگی میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کی اس دلچسپی سے نہ صرف پردیش کی سماجی اور شہری زندگی میں صالح اقدار کا اضافہ ہوگا بلکہ ہندو مسلم اتحاد جو ہندستان کا امتیاز رہا ہے اور جو سامراجی مفادات کی نذر ہوگیا اور جس کے اثرات اب تک چلے جا رہے ہیں از سر نو مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگا۔

آہ احتشام حسین صاحب

یاد رہے کہ زیر نظر شمارہ کی اشاعت میں بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر تھوڑی سی تاخیر ہوگئی تھی اور اس کی آخری پلیٹ مشین پر پہنچ گئی تھی کہ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر بجلی بن کر گر پڑی۔ پہلی دسمبر کا وہ منحوس دن تھا جب احتشام صاحب دنیائے علم و ادب، دنیائے شرافت و انسانیت، دنیائے خلوص و محبت، دنیائے انکسار و مروت کو تاریک بنا کر چلے گئے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ برگزیدہ ذات اب ہمارے درمیان نہیں رہی اور بار بار دل میں یہ سوال اٹھتا ہے کیا اب احتشام صاحب سے کبھی ملاقات نہ ہوگی؟

احتشام صاحب کی ہمہ گیر شخصیت میں ایسی کشش تھی، ایسا جذب تھا کہ جو بھی ایک بار ان سے قریب ہوتا ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ یہ گرویدگی ان کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی قابلیت، سوجھ بوجھ، دور بینی اور معاملات و مسائل کو انتہائی خوبی کے ساتھ حل کرنے کی زبردست قابلیت کے باعث تو ہوتی ہی اس سے بڑھ کر ان کے خلوص محبت، انکسار، مروت، فراخ دلی، ہمدردی اور پاس وضعداری کی بنا پر ہوتی۔ موجودہ دور میں شاید ان کی واحد ذات تھی جس سے کسی کو شاکی نہیں پایا گیا۔ وہ سب کے ہر دلعزیز تھے اور ان کو سب سے پیار تھا۔ یہ ان کی شہرت، علمیت اور مقبولیت کی روشن دلیل ہے کہ کوئی جلسہ ہو، کوئی کمیٹی ہو، کوئی سیمینار ہو، اکیڈمی ہو ان کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی۔ جب کبھی اجتماعات احتشام صاحب کے انتقال میں منعقد ہوتے تھے کر وہ آئیں تو انجام پائیں۔ ان کے ساتھ اس طرح کے اجتماعات بھی مر گئے۔ ان کی اچانک دائمی جدائی کا جو زبردست دھچکا لگا ہے اس کے باعث اظہار تاثر کے لیے الفاظ بھی نہیں مل رہے ہیں۔ یہ حال راقم الحروف ہی کا نہیں ہے بلکہ سبھی کی یہ حالت ہوگی۔ ایسی عظیم ہستی کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا صحیح احساس ابھی نہیں ختنت غم میں رفتہ رفتہ کمی کے ساتھ ہوگا اور اس وقت اندازہ ہوگا کہ بے رحم موت نے ہمارے ساتھ کیسا ظلم کیا ہے۔ بقول مشرق کے شاعر اقبال ؎ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے ٭ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا۔ لیکن احتشام صاحب کا ایسا دیدہ ور پیدا ہونا بڑی مشکل نہیں ناممکن ہے۔ ادارہ نیا دور احتشام صاحب کے پس ماندگان کے غم میں اسے اپنا بھی غم سمجھ کر شریک ہے۔

ایڈیٹر

اگرہائن ۱۸۹۴ شک

دسمبر ۱۹۷۲ء

ابراہیم یوسف

اردو یکبابی اسٹیج ڈراما وہ صنف (صنفِ ادب) ہے جس کی طرف نہ تو خاطر خواہ توجہ دی گئی اور نہ اس کو وہ اہمیت حاصل ہوئی جو فنونِ لطیفہ کی دوسری اصناف کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ ہمارے کچھ تعصبات ہیں جو اس فن کے مقابلے میں ہمیں زیادہ عزیز ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن "جس وقت اردو ڈرامے اسٹیج پہ جھلکے نکھار رہے تھے اس وقت ہمارے ادیب اور نقاد ڈرامے کو ادبی صنف تو کیا فنِ شریف تک قرار دیتے ہوئے ہچکچاتے تھے[1]" کچھ اس سے ملتی جلتی بات وقار عظیم نے لکھی ہے کہ "جن لوگوں نے ڈرامے کو ایک صنفِ ادب تسلیم کیا ہے ان کا انداز معذرت کا ہے۔ ایسے لوگوں کا کہنا ہے کہ ادبی اوصاف ڈرامے کے لیے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے[2]" منظر حسین دسنوی نے ڈرامے کے متعلق جو انکشافات فرمائے ہیں وہ بھی خالی از دلچسپی نہیں فرماتے ہیں (۱) "کلیم الدین کے اس مشہور جملے میں جو انھوں نے گل نغمہ کا تعارف لکھتے ہوئے غزل کے متعلق تحریر کیا ہے کہ غزل ایک نیم وحشیانہ صنفِ شاعری ہے ذرا تصرف کر کے ڈرامے کو ایک نیم وحشیانہ صنفِ ادب نہ بھی کہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ادنیٰ قسم کا فن ہے جو غیر ترقی یافتہ اقوام یا نیم خواندہ افراد اور کم عمر نوجوانوں کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھ کر لکھا اور پیش کیا جاتا ہے[3]" (۲) "ابتدائی انسان کی طرح بچوں کو بھی اپنے تجربات کے اظہار کے لیے اپنے مافی الضمیر کو موثر اور دل نشین انداز میں پیش کرنے کے لیے اشارات، حرکات و سکنات سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے اگر یہ سچ ہے کہ "ڈرامے کا فن ڈراما نگار کا نہیں بلکہ اداکار کا فن ہے تو وہ اصل یہ بچوں کا فن ہے یا ابتدائی انسان کا[4]" (۳) "اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور میں بھی ڈرامے اور تھیٹر کی بہت مانگ ہے اور کسی تھیٹر میں تماشائیوں کی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن ان تماشائیوں میں اکثریت انھیں لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے ذہنی ارتقا میں نامکمل تعلیم یا کسی نفسیاتی وجہ کی بنا پر پیچھے رہ گئے ہیں اور ان میں فنونِ لطیفہ کی اعلیٰ قسموں سے حظ اٹھانے کی صلاحیت موجود نہیں[5]" ان تمام بیانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسٹیج ڈراما خواہ وہ پورے وقت کا ہو خواہ یکبابی، مختلف قسم کے تعصبات کا شکار ہے۔ خاص طور پر یکبابی اسٹیج ڈراما شاید سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا ہے جس کے باعث اس کے متعلق کبھی کوئی واضح تصور پیدا نہ ہو سکا۔ پروفیسر احتشام حسین تو یکبابی اسٹیج ڈرامے کو مورد عتاب ٹھہراتے ہیں فرماتے ہیں "جس طرح بعض صورتوں میں مختصر افسانہ ناول کی راہ میں اور غزلیں نظموں کی راہ میں کھڑی ہو گئی ہیں اسی طرح یکبابی تمثیلیں اچھے مکمل ڈرامے کے راستے میں حائل ہیں۔ یہ تمثیلچے واقعی ڈراموں کا بدل نہیں بن سکتے[6]"

جب یکبابی اسٹیج ڈرامے کے سلسلے میں صورتِ حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس صنف کی ترقی کے راستے محدود ہو جاتے ہیں اور ہر

---

[1] محمد حسن: اردو ڈراما آزادی کے بعد: ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر جنوری ۱۹۵۹ء ص ۶۳ [2] بحوالہ منظر حسین دسنوی: ادب میں ڈرامے کا مقام: ماہنامہ شاعر بمبئی ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۳۶ [3]، [4]، [5] منظر حسین دسنوی: ادب میں ڈرامے کا مقام، ماہنامہ شاعر بمبئی ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۳۱، ص ۲۷، ص ۲۸ [6] احتشام حسین: جدید اردو ڈراما اور اس کے مسائل، ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر جنوری ۱۹۵۹ء ص ۸

از قلم چیز جو مکالموں میں لکھ دی جاتی ہے یکبابی اسٹیج ڈراما تسلیم کر لی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر "شمعِ منزل"[1] جو ڈرامے کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اسٹیج ڈراما تو خیر وہ کسی بھی نقطۂ نظر سے نہیں ہے اسے ادبی مکالمے کا نام دینا بھی محلِ نظر ہے مگر اس کو ڈراما کہا گیا ہے۔ اس طرح یہ صنف برابر غلط فہمیوں کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے اور اب تو یہ عالم ہے کہ ہر بوالہوس نے 'حسن پرستی' شعار کر لی ہے جس کا جو جی چاہا مکالموں میں لکھ دیا یا صرف مکالمے لکھ دیے اور مصر ہو گئے کہ اسے ڈراما تسلیم کرو۔ کبھی اس صنف کے فنی پہلو پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ جن لوگوں نے یکبابی اسٹیج ڈرامے سنجیدگی سے لکھے بھی تو صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے۔ جب منہ کا ذائقہ ہی بدلنا ہے تو پھر فن کے متعلق غور کرنے کا زیادہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اردو یکبابی اسٹیج ڈراما کا نہ تو کوئی صحیح روپ ہی واضح ہے اور نہ اس کا کوئی علاحدہ وجود۔ ادھر کچھ حضرات نے ریڈیو ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کو کچھ اس طرح گڈمڈ کر دیا کہ اسٹیج یکبابی ڈرامے کا مفہوم دھندلا اور صورت مسخ ہو کر رہ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر شخص کے ذوق پر مبنی ہے کہ جسے چاہے اسٹیج ڈراما کہہ اور جسے چاہے ریڈیو ڈراما بلکہ عافیت اسی میں ہے کہ اس جھنجھٹ ہی میں نہ پڑا جائے بلکہ صرف چھپنے چھپانے کے شوق کو پورا کرنے کے لیے صرف ڈراما کہلائے۔

یہ بات تو تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ ہمارے یہاں یکبابی اسٹیج ڈراموں کو پڑھنے والوں کی کمی ہے مگر یہ ضرور ہے کہ وہ مصلحت پسندی کا شکار ہیں اور احتساب کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے سے کتراتے ہیں کیونکہ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے اور اسے سدھارنے کی کوشش بڑے دل گردے کی بات ہے۔ یکبابی اسٹیج ڈراموں کے مجموعے مشکل ہی سے شائع ہوتے ہیں اور یہ ڈرامے زیادہ تر رسائل کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے ادبی سیاست اور اس کی مصلحت پسندی سے ہٹ کر آرام پسندی کی مصلحت ہے کہ کون ہزاروں رسائل کی ورق گردانی کرتا پھرے۔ اگر کوئی نقاد کسی مجبوری یا مدیر کی فرمائش پر کچھ لکھتا بھی ہے تو وہ پرانے ڈراموں کا جائزہ لے کر اپنی عزت بچا لیتا ہے۔ غزل، نظم، افسانہ اور ناول کی تو باقاعدہ تنقیدیں مرتب ہیں۔ سال میں متعدد مضامین ان اصناف پر لکھے جاتے ہیں اور ان تجربات اور تبدیلیوں کی جانب نشاندہی کی جاتی ہے جو ان اصناف میں ہوتی ہیں مگر یکبابی اسٹیج ڈراما کی طرف سے مجرمانہ بے اعتنائی برتی جا رہی ہے کہ اس نے ترقی کی کون سی منزلیں طے کی ہیں یا وہ تباہی کے کس راستے پر گامزن ہے۔ پورے وقت کے ڈرامے پر تو کبھی کوئی لکھ بھی دیتا ہے مگر یکبابی اسٹیج ڈراما کا ریکارڈ یہاں کے مصداق ہے جس پر نرم اور گرم نگاہ ڈالنا وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔ کم از کم اب وقت تو نہیں رہا ہے کہ لوگ اسے "فنِ شریف" قرار دیتے ہوئے ہچکچاتے ہوں مگر یہ ضرور ہے کہ اسے شاعری، افسانہ نگاری یا ناول نویسی کے مقابلے میں کمتر درجے کا ہی سمجھا جاتا ہے اور اس کی ادبی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کیونکہ اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس کا تعلق صرف اسٹیج سے ہے ادب سے نہیں۔

آج کل متعدد رسائل ڈرامے چھاپتے ہیں مگر تجربہ یہی بتلاتا ہے کہ قارئین ڈرامے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ دنیا کی ہر بڑی زبان میں درسی نصاب میں ڈرامے کو شامل کیا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے اردو ہی ایسی زبان ہے جس کے نصاب میں ڈرامے کی کوئی جگہ نہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ بمبئی یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے نصاب میں ڈرامے کا ایک پرچہ شامل ہے مگر دوسری

اردو یکبابی اسٹیج ڈراما کن کن مشق ہائے ستم کا نشانہ بنا ہے اس پر نظر ڈالنا بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر سید حامد حسن قادری فرماتے ہیں کہ "اردو میں مختصر ڈرامے کا رواج اسٹیج کی ضروریات کی بنا پر نہیں بلکہ ادبی صنف کی حیثیت سے ہوا جسے مغرب میں خاص مقبولیت حاصل ہے۔ اردو میں مختصر ڈراما خاص ادبی چیز بن گیا ہے۔"[2] ڈاکٹر صاحب موصوف کے خیال کا پہلا حصہ کہ "اردو میں مختصر ڈرامے کا رواج اسٹیج کی ضرورت کی بنا پر نہیں بلکہ ادبی حیثیت سے ہوا" حقیقت سے بعید ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس عام غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ یکبابی ڈراما اور ادبی مکالمے دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔

ادبی مکالموں کو ڈرامے کا نام دینا ایک مرض سا بن گیا ہے جس سے

---

[1] اظہر افسر: شمعِ منزل: شاعر بمبئی، تمثیل نمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر [illegible] ص ۱۹۱ تا ۱۹۶۔ [2] ڈاکٹر سید حامد حسن: اردو میں مختصر ڈراما: ماہنامہ شاعر بمبئی، ڈراما نمبر [illegible] ص ۱۶

ایسی غلط فہمیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ درحقیقت یہ ہے کہ جس طرح انگریزی میں مختصر یا یکبابی ڈرامے کی ابتدا کرٹین ریزر (CURTAIN RAI-ZERS) سے ہوئی جو ڈراما شروع ہونے سے پہلے ان تماشائیوں کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے دکھلائے جاتے تھے جو وقت سے پہلے تماشاگاہ میں آجاتے تھے اسی طرح اردو یکبابی اسٹیج ڈرامے کی ابتدا ان چھوٹے چھوٹے کامکس سے ہوئی جو پارسی تھیٹر میں ڈرامے کے شروع یا آخر میں دکھلائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی کے پھیلاؤ نے بھی لوگوں کو اس جانب مائل کیا۔ اس کے علاوہ ان کالجوں اور اسکولوں میں جو انگریز مشنریوں کے ذریعے چلائے جاتے تھے انگریزی کے یکبابی ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے ان کو دیکھ کر اردو والوں کو بھی اس صنف میں دلچسپی پیدا ہوئی اور یکبابی اسٹیج ڈرامے نے جنم لیا۔ اس لیے یہ خیال کہ یکبابی یا مختصر ڈرامے کی ابتدا اور اسٹیج کی ضرورت سے نہیں بلکہ ادبی حیثیت سے ہوئی حقیقت سے بعید ہے۔ ڈاکٹر حامد حسن کے بیان کا دوسرا حصہ کہ مختصر ڈراما خالص ادبی چیز بن گیا، محل نظر ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اسے خالص ادبی چیز گردانتے ہیں جبکہ وقار عظیم کو ڈرامے کی ادبی حیثیت پر ہی شک ہے۔ اس قسم کے متضاد بیانات نے ڈرامے اور یکبابی ڈرامے کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر حامد حسن کو اس کے خالص ادبی ہونے کا شک اس وجہ سے ہوا ہے کہ ابتدا میں کچھ لوگوں نے ڈرامے کے لوازمات سے قطع نظر کر کے مکالمے لکھے اور ان میں ادبی چاشنی ہی کو ضروری سمجھا مگر جوں جوں یکبابی ڈرامے کے متعلق علم بڑھتا گیا یہ رجحان بھی ختم ہونے لگا۔ ممکن ہے آج بھی کچھ لوگ ایسے ہوں جو صرف مکالمے ہی کو ڈراما سمجھیں۔ مگر اب یکبابی ڈرامے پر قطعی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ محض ادبی مکالمہ ہی بن کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح وقار عظیم کے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ڈرامے کا تعلق ادب سے ہے ہی نہیں۔ درحقیقت پورے وقت کا ڈراما ہو یا یکبابی۔ وہ بیک وقت اسٹیج اور ادب سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہے جیسا کہ پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ "ڈراما ادب اور اسٹیج کی یکجائی سے تخلیق کے پیکر میں ڈھلتا ہے۔ اس لیے عالمی ادب میں وہ ڈرامے کامیاب ہیں جو دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں۔"[1] اس طرح پورے وقت کا ڈراما ہو یا یکبابی وہ اسٹیج اور ادب دونوں سے اپنا رشتہ قائم کیے ہوئے ہے۔ اگر ڈراما نگار ان دونوں میں توازن برقرار رکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو اس سے ڈرامے کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اردو کا کوئی ایسا باقاعدہ اسٹیج نہیں ہے۔ اگر سال میں دس پانچ ڈرامے کالجوں اور اسکول کے اسٹیج پر کھیل لیے جاتے ہیں یا کچھ شوقین مزاج لوگ ایک دو ڈرامے اسٹیج کر لیتے ہیں یا کچھ پیشہ ور لوگ ایک دو ڈرامے دکھلا دیتے ہیں تو اس کو اسٹیج کا وجود تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور چونکہ اسٹیج نہیں ہے اس لیے صنف ڈراما کو بالکل نظر انداز کر دینا اس صنف کے ساتھ انصاف نظر نہیں آتا۔

اس طرح ڈرامے کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک اس کا ادبی ہونا اور دوسرا اس کا فنی ہونا۔ فنی سے مراد اس کی وہ تکنیکی حیثیت ہے جو اس کو دوسری اصناف سے جدا کر کے اسٹیج پر پیش کیے جانے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ ادبی سے مراد زبان و بیان کے ساتھ اس کا زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کو پیش کرنا ہے۔ ڈراما زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ زندگی کی عکاسی افسانے اور ناول میں کی جا سکتی ہے۔ اگر انسان کے جذبات و احساسات کا اظہار شاعری میں کیا جا سکتا ہے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ڈرامے کو ادب سے کیوں خارج کر دیا جاتا ہے یا اس کی ادبی حیثیت کو قبول کرنے میں کون سا امر مانع ہے جبکہ ڈراما زندگی کی پیچیدگیوں، انسان کے احساسات و جذبات، اس کے غموں اور مسرتوں کو جس انداز سے پیش کرتا ہے اس میں واقعیت اور تاثر زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے اسے قطعی ادب سے خارج کر دینا یا تو مصلحت پسندی ہے یا پھر ڈرامے کی طرف سے تعصب۔ انارکلی اسٹیج ڈراما نہیں ہے مگر اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے بلکہ اب تو وہ قطعی ادبی شاہکار ہی بن کر رہ گیا ہے۔ شیکسپیئر کے ڈرامے اگر اپنے اندر اسٹیج پر کھیلے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو وہ انگریزی ادب کے بھی شاہکار ہیں۔ پروفیسر مجیب کے زیادہ تر ڈرامے اپنی چند فنی کمزوریوں کے ہوتے ہوئے بھی ادب پارے ضرور ہیں۔ پھر ہم ڈرامے کو ادب میں شامل کرنے سے کیوں شرماتے ہیں اور اسے بطور ادب قبول کرنے میں کون سی قباحت ہے۔

---

[1] پروفیسر احتشام حسین: جدید ڈراما اور اس کے مسائل، ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر جنوری ۱۹۵۹ء ص ۵

اسے بہ حال صنفِ ادب سے خارج کر دینے کا کوئی معقول جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے ایک بڑا طبقہ میرے اس خیال سے متفق نہ ہو لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ریڈیو پر ڈرامے کو سن کر لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے، اگر مرثیہ سن کر لوگ بے حال ہو جاتے ہیں تو پڑھ کر بھی کم کم بے حال نہیں ہوتے۔ پھر ڈراما کو پڑھنے میں کون سی قباحت ہے مانا کہ ڈرامے کو اسٹیج سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا مگر جہاں تک اس کے ادبی پہلو کا تعلق ہے اس کے لیے ڈرامے کو پڑھنا کوئی غیر ادبی بات نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ڈرامے کی طرف سے جو تعصب ذہنوں میں پیدا ہو گیا ہے اس کا دور ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔

ایک اور عام اعتراض آج کے یکبابی ڈرامے کے متعلق کیا جاتا ہے وہ یہ کہ "ان ادبی نقطۂ نظر سے لکھے جانے والے مختصر ڈراموں پر مختصر افسانے کا فن غالب نظر آتا ہے"[1]۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس اعتراض میں بڑا وزن ہے اور اعتراض بھی حقیقت سے بہت قریب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ در حقیقت ڈراما تو پورے وقت کا ہو یا یکبابی بڑی حد تک فارمولائی فن ہے اور جب بھی اس فارمولے کو نظر انداز کیا جاتا ہے ڈراما اپنا چولا اتار پھینکتا ہے اور کوئی دوسری چیز بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جناب منچوقر صاحب نے میرے ایک ڈرامے "داغ اور دھبے" پر ماہنامہ شاعر بمبئی بابتہ ماہ مارچ ۱۹۶۲ء میں بحث کرتے ہوئے ڈرامے میں کشمکش کو ضمنی شے قرار دیا ہے اور چونکہ ضمنی شے کو نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے اس لیے ایسے ڈرامے جن میں کشمکش کو نظر انداز کر دیا جائے گا ڈراما نہیں رہے گا بلکہ افسانے سے قریب ہو جائے گا۔ ایسے ہی ڈراموں پر ڈاکٹر حامد حسن کو افسانے کا فن غالب نظر آیا ہے اور ان کا اعتراض حق بجانب ہے۔ دوسری وجہ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے ریڈیائی ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کو گڈمڈ کر کے کوئی نئی چیز پیدا کرنے کی کوشش ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسٹیج ڈرامے کے بارے میں ایسی سیکڑوں غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اگر ہم اسٹیج ڈراما اور ریڈیو ڈرامے کا فنی مقابلہ کریں تو ہم کو دونوں میں بنیادی اور بیّن فرق نظر آئے گا۔ ریڈیو ڈراما زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے جبکہ اسٹیج ڈراما جغرافیائی حدود اور وقت کا پابند اور زماں کی قید میں جکڑا ہوا ہے جو وحدت تاثر کے لیے لازمی ہے۔ ریڈیو ڈراما مکالمہ اور آواز کا کھیل زیادہ ہے جبکہ اسٹیج ڈراما عمل و حرکت پر زیادہ زور دیتا ہے اور مکالمے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ عمل و حرکت اسٹیج ڈراما میں بے بولے مکالمے ہیں جو زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سے کہیں زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ اس طرح اسٹیج ڈرامے میں جنت نگاہ اور فردوس گوش کا عمل ساتھ ساتھ چلتا ہے جبکہ ریڈیو ڈراما میں صرف فردوس گوش کا عمل ہے۔ ریڈیو ڈرامہ نگار ان تکنیکی بندشوں سے آزاد ہے جس میں اسٹیج ڈرامہ نگار جکڑا ہوا ہے۔ چونکہ ریڈیو ڈراما افسانے کی طرح زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اس لیے یہ غلط فہمی کہ مختصر ڈراما جس میں ریڈیو اور اسٹیج ڈراما دونوں شامل ہیں افسانویت کا شکار ہے پیدا ہونا غلط نہیں ہے اور چونکہ ریڈیو ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کو گڈمڈ کرنے کا رجحان عام ہے اس لیے ریڈیو ڈرامے کو اسٹیج ڈراما سمجھ کر یہ الزام لگایا جاتا ہے۔ اگر دونوں کو علاحدہ علاحدہ کر کے دیکھا جائے اور ڈرامہ نگار بھی واضح طور پر یہ لکھ دیں کہ یہ ریڈیو ڈراما ہے تو یہ غلط فہمی بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر کسی ضرورت کے تحت ریڈیو ڈرامے کو اسٹیج ڈراما میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مثال کے طور پر "تلچھٹ"[2] ریڈیو کے لیے لکھا گیا تھا مگر بعد میں اسے چند تبدیلیوں کے بعد اسٹیج ڈراما کا روپ دیا گیا۔ بیدی ایک بڑے فنکار ہیں اور اس میں اسٹیج ڈراما کے لوازمات پیدا کرنے میں تو کامیاب ہو گئے مگر تصادم کی وہ شدت نہ دے سکے جو اسٹیج ڈراما کے لیے ضروری ہو۔ اس طرح کی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور ایسے ڈراموں پر افسانویت کا شک پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے۔ اگر ہم اردو یکبابی اسٹیج ڈراموں کا غور سے مطالعہ کریں تو ہم کو ان میں دو طرح کے ڈرامے نظر آئیں گے۔ ایک ایسے ڈرامے جن کی بنیاد خالص خارجی تصادم پر ہوتی ہے اور دوسرے ایسے جن میں تصادم داخلی ہوتا ہے۔ جن ڈراموں میں تصادم

---

[1] ڈاکٹر سید حامد حسن: اردو میں مختصر ڈراما، ماہنامہ شاعر بمبئی ڈراما نمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۶۱ [2] راجندر سنگھ بیدی: ماہنامہ قند دوران جلد ۲ شمارہ نمبر ۳، ۴ ڈراما نمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۳۶ تا ۱۶۴ (۱۶۵)

کی بنیاد خارجی حالات یا کسی مضحک سچوایشن پر ہوتی ہے اس میں ڈرامائی عنصر بہت واضح اور حالات کی الٹ پھیر بہت تیزی سے ہوتی ہے جیسے ڈراما "کلاد توسط" جو اگرچہ صرف دس منٹ کا ڈراما ہے مگر واقعات کی تیزی ڈرامے کو برق بداماں بنا دیتی ہے یا جیسے "چھدکا سوا گت"[۱] اور "مفت خورے"[۲] ہیں جن کی بنیاد مضحک سچوایشن پر ہے۔ حالات تیزی سے بدلتے ہیں اور کبھی کبھی تو اسٹیج پر دھما چوکڑی کا گمان ہونے لگتا ہے مگر ڈرامائی کیفیت برابر قائم رہتی ہے۔ دوسری قسم کے ڈرامے وہ ہیں جن میں ایک انسان دوسرے انسان سے یا ایک تصور دوسرے تصور سے نہیں ٹکراتا بلکہ انسان خود اپنے آپ سے دست و گریباں نظر آتا ہے۔ ایسے ڈراموں پر بھی افسانویت کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ بیدی کے ڈرامے "تلچھٹ" میں ماں اپنے ہی جذبات سے متصادم نظر آتی ہے یا "شکست"[۳] جس میں ڈاکٹر خود اپنے آپ سے متصادم ہے۔ میں نے خود بھی اپنے کچھ ڈراموں میں ایسے ہی تجربے کیے ہیں جیسے "خاموشیاں"[۴]، "قدم قدم اداس موڑ"[۵]، "موسمی پرندے"[۶] اور "ڈاکٹر تکین کی الجھن"[۷] جن میں کوئی خارجی تصادم نہیں ہے۔ بلکہ کردار اپنے آپ سے متصادم نظر آتے ہیں اور انہیں بھی ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتے۔ اس سلسلے میں معذرت کے ساتھ یہ عرض ہے کہ ہم نے ڈرامے کا مقصد اسٹیج پر دھما چوکڑی سمجھ رکھا ہے۔ اپنے آپ سے ٹکراتے آہستہ رو کرداروں کی ذہنی دنیا کو دیکھنے میں لطف نہیں آتا۔ اگر آئی۔ ایس۔ جوہر کا ڈراما "بدھ کام شدہ" (جو شش) اور بیدی کا ڈراما "تلچھٹ" بیک وقت اسٹیج کیے جائیں تو بدھ کام شدہ کامیاب رہے گا اور تلچھٹ ناکام ہو جائے گا جبکہ تلچھٹ زندگی سے بہت قریب ہے۔

ایک اور ظلم جو کیا جا رہا ہے وہ ریڈیو ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کا مقابلہ ہے جبکہ نوعیت کے اعتبار سے دونوں قطعی علاحدہ علاحدہ چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر سید حامد حسن فرماتے ہیں "ریڈیو ڈراما زیادہ آسانی سے کرداروں کی ذہنی دنیا میں اتر کر اس کی کش مکش سے ایک دلچسپ و اتفاقی ترتیب عمل میں لا سکتا ہے۔ ریڈیو ڈراما بعض اوقات خارجی ماحول کو نظرانداز بھی کر سکتا ہے"[۸]۔ ریوتی سرن شرما فرماتے ہیں "ریڈیائی ڈراما تکنیکی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ، مواد کے اعتبار سے زندگی کے تئیں بے حد وفادار ہے اور خیال کے نقطۂ نظر سے اس قدر صحت مند ہے جس قدر کہ موجودہ دور کے ادیبوں کا تخلیقی شعور"[۹]۔ ڈاکٹر محمد حسن کا خیال ہے کہ "اسٹیج ڈراما فردوس گوش اور جنت نگاہ دونوں سامان بہم پہنچاتا ہے۔ آنکھیں اسے دیکھتی بھی ہیں اور کان سنتے بھی ہیں لہٰذا اس میں بہت سے ایسے عناصر کام کرتے ہیں جن کا مجموعہ زندگی کی بہت کچھ عکاسی کرتا ہے۔ ریڈیو کی آنکھیں نہیں ہوتی ہیں صرف کان ہوتے ہیں اور اس طرح اس میں روشنی اور سائے کا استعمال، اداکار کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اور اس کی حرکات و سکنات اور نظر سے تعلق رکھنے والے بہت سے عناصر سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس لیے مناسب ہے کہ ریڈیائی ڈراما وقت اور مکان دونوں کی حد بندیوں کے پیش نظر اسٹیج ڈرامے کی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا اور اسے کمتر درجے کا فن ہی کہا جائے گا"[۱۰]۔

مندرجہ بالا تینوں بیانوں میں کس قدر اختلاف ہے، یہ اہل نظر غور فرما سکتے ہیں گویا دونوں اقسام کے ڈراموں کا مقابلہ کرنے میں کوئی فنی اور تکنیکی معیار نہیں ہے بلکہ صرف وجدانی کیفیات ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریڈیو ڈراما زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے اور اپنے تکنیکی عناصر کے باعث اس جگہ بھی کامیابی سے گزر جاتا ہے جہاں اسٹیج ڈراما ناکام ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے اسٹیج ڈراما کی شان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسٹیج

---

۱ حبیب تنویر: ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر اگست ۱۹۵۶ء ص ۱۰ تا ۱۲ ۲ رام لعل: ماہنامہ شاعر بمبئی ڈراما نمبر ۱۹۷۲ء ص ۷۱ تا ۷۶، ۸۱ ۳ پکاش پنڈت: ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر اگست ۱۹۵۶ء ص ۳۰ تا ۵۲، ۸۴ ۴ ڈاکٹر محمد حسن: ماہنامہ آج کل دہلی بابتہ ماہ جون ۱۹۶۳ء ص ۳۳ ۵ ابراہیم یوسف: ماہنامہ صبح نو پٹنہ ستمبر ۱۹۶۰ء ص ۳۹ ۶ ابراہیم یوسف: ماہنامہ آج کل دہلی اپریل ۱۹۶۹ء ص ۳۳ ۷ ابراہیم یوسف: ماہنامہ شاعر بمبئی اگست ۱۹۶۹ء ص ۵۸ ۸ ابراہیم یوسف: ماہنامہ شاعر بمبئی جلد ۴۲ شمارہ ۴ ص ۵۵ ۹ آئی۔ ایس۔ جوہر: قند مکرر، ڈراما نمبر ۱۹۷۲ء ص ۱۳۳ ۱۰ ڈاکٹر سید حامد حسن: اردو میں مختصر ڈراما۔ ماہنامہ شاعر بمبئی ڈراما نمبر ۱۹۷۲ء ص ۱۶ ۱۱ ریوتی سرن شرما: ریڈیائی ڈراما اور اس کی تکنیک: ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر جنوری ۱۹۵۹ء ص ۳۲ ۱۲ محمد حسن (ڈاکٹر): اردو ڈراما آزادی کے بعد: ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر جنوری ۱۹۵۹ء ص ۲۸

ڈراما زمان و مکان کا پابند ہے اور اسٹیج کی جغرافیائی حدود سے باہر نہیں نکل سکتا مگر یہی اس کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے کیونکہ زمان و مکان کی پابندی اس کو وحدت تاثر عطا کرتی ہے۔ نیز اس کی جنت نگاہی اسی کی وہ خوبی ہے جو ریڈیو ڈرامے کو حاصل نہیں۔ اسٹیج ڈرامہ صرف آوازوں اور مکالموں کا کھیل نہیں ہے بلکہ کچھ بے بولے مکالموں کا بھی کھیل ہے جس کو عمل و حرکت کہا جاتا ہے اور یہ بے بولے مکالمے کسی کردار کی ذہنی کشمکش کو جس طرح ظاہر کرتے ہیں وہ بولے ہوئے مکالمے نہیں کر سکتے۔ نیز اسٹیج کی سیٹنگ ماحول میں جو رنگ آمیزی کرتی ہے اور آج کے ترقی یافتہ اسٹیج پر رنگوں کا جو کھیل کھیلا جاتا ہے اس سے نہ صرف ماحول کا ایک مجموعی ڈرامائی فضا میں ڈھلتی ہے بلکہ یہ رنگ کرداروں کی ذہنی کشمکش کو ظاہر کرنے میں بھی بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس لیے یہ خیال کہ ریڈیو ڈرامے کرداروں کی ذہنی دنیا میں زیادہ آسانی سے اتر جاتے ہیں یا ریڈیو ڈرامے مواد کے اعتبار سے زندگی کے تئیں زیادہ وفادار ہیں کچھ حقیقت سے اس قدر زیادہ قریب نہیں معلوم ہوتا جتنا کہ ڈاکٹر محمد حسن کا یہ خیال کہ ریڈیو ڈراما اسٹیج ڈراما کی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔

یکبابی ڈرامے کے عناصر ترکیبی یقیناً وہی ہوتے ہیں جو پورے وقت کے ڈرامے کے ہوتے ہیں لیکن پلاٹ کی اکائی، کشمکش کی شدت اور تاثر کی وحدت یکبابی ڈرامے کے لیے ضروری اجزا ہیں۔ پورے وقت کے ڈراموں میں پلاٹ کی وحدت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور ضمنی پلاٹ مرکزی پلاٹ کی مدد اور مرکزی خیال کی وضاحت کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ مگر یکبابی ڈراما ضمنی پلاٹ کا متحمل نہیں ہو سکتا کیونکہ یکبابی ڈرامے کا اختصار اور قصے کی اکائی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ دوسرے ضمنی پلاٹ کی موجودگی یا غیر ضروری واقعات کا ڈرامے میں شامل کرنا یکبابی ڈرامے کی شدت کشمکش کو کم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "غالب"[1] کو لیجیے۔ اول تو اس میں ڈرامے کا بنیادی پہلو کشمکش سرے ہی سے معدوم ہے اور عمل و حرکت کی کوئی گنجائش پیدا نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے واقعات کی ترتیب اس طرح ہے کہ ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے مصنف بارہ مسالے کی چاٹ تیار کر رہا ہے جس میں لطیفوں سے لے کر ... تک سب کچھ ہے مگر ڈراما نہیں۔ اس کے مقابلے میں "کوچ"[2] کو لیجیے جس میں لاتعداد کرداروں کے باوجود کشمکش کی واضح صورت ... اور بنیادی مقصد کہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ داخلی اور خارجی کشمکش کے توازن نے ڈرامے کو بڑا جاندار بنا دیا ہے یا پھر "جوتے ٹکڑے"[3] داخلی اور خارجی کشمکش کا اعلیٰ نمونہ ہے قصے کی اکائی کہیں مجروح نہیں ہوتی۔

پروفیسر احتشام حسین نے وحدت تاثر کو چوتھی وحدت قرار دیا ہے لیکن اگر ہم تینوں وحدتوں پر غور کریں تو اس کا ماحصل یہی ہوگا کہ یہ وحدتیں جو چوتھی وحدت پیدا کرنے کے لیے معرض وجود میں آئی ہیں۔ گویا وحدت وہ مرکز ہے جس کے حصول کے لیے باقی وحدتیں گردش کرتی ہیں خاص طور پر وحدت زمان و مکان۔ رہی تیسری وحدت یعنی وحدت عمل جس کے متعلق احتشام صاحب فرماتے ہیں کہ "دراصل اس کا ... مقصد یہ ہے کہ جو روداد بیان کی جا رہی ہے اس میں کئی قصے ملا کر ... نہ پیدا کی جائے اور نہ المیہ اور طربیہ کو گڈمڈ کیا جائے"[4] احتشام صاحب نے وحدت عمل کے دو ضروری اجزا قرار دیے ہیں۔ پہلا قصہ کی اکائی دوسرا المیہ و طربیہ کو گڈمڈ نہ کرنا لیکن وحدت عمل اور وحدت ... میں میرے نزدیک بنیادی فرق ہے۔ قصے کی اکائی کا تعلق وحدت تاثر سے ہے نہ کہ وحدت عمل سے۔ ایک پورے وقت کے ڈرامے میں قصہ کی اکائی پر عمل کیا جانا ضروری نہیں بلکہ مرکزی خیال کو ابھارنے یا اس کو تقویت دینے کے لیے ضمنی پلاٹ لائے جا سکتے ہیں جو اصل قصے سے مربوط ہوں غیر مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ قصے کی اکائی کا تعلق صرف یکبابی ڈرامے سے مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ رہا وحدت عمل کا دوسرا جز "المیہ و طربیہ کو گڈمڈ نہ کرنا" تو یہی وحدت عمل کا صحیح مفہوم ہے۔ مگر انسان کی نفسیات

---

[1] اظہر افسر: غالب؛ ماہنامہ شاعر بمبئی غالب نمبر فروری ۱۹۶۹ء ص ۲۴۲ [2] انور عظیم: کوچ؛ ماہنامہ شاہراہ دہلی سالنامہ ۱۹۵۸ء ص ...
[3] کرتار سنگھ دگل: جوتے ٹکڑے؛ فنکار دہلی شمارہ نمبر ۳، ۴ ص ۲۱۰ [4] سید احتشام حسین: ڈرامے میں وحدتوں کا مفہوم؛ ماہنامہ شاعر بمبئی خاص نمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۰۵

پیچیدہ ہیں کہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی شخص پر ایک ہی موڈ ہمیشہ طاری رہ سکتا ہے۔ یا زندگی کے واقعات اس قدر سپاٹ ہیں کہ وہ ایک وقت جس ڈگر پر چلائے ہمیشہ اسی پر چلتے رہیں گے۔ بعض وقت غم و خوشی ایک دوسرے سے اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ انھیں الگ الگ خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اس لیے میں وحدتِ عمل کو ڈرامے کے لیے لازمی وحدت تصور نہیں کرتا۔ اگر آج ڈرامے میں اُسے نظرانداز کر دیا جائے تو ڈرامے کی شکل پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہو سکتا۔ رہیں باقی دو وحدتیں تو ان کا وجود یکبابی ڈرامے کا بھی وجود ہے۔ ان دونوں کی عدم موجودگی وحدتِ تاثر کو بری طرح مجروح کر دیتی ہے۔

ویسے تو یکبابی ڈرامہ اگر ایک ہی سین پر مشتمل ہو تو بہت ہی مستحسن ہے۔ لیکن اگر بہ ضرورت اسے کئی سینوں یا مناظر میں بانٹا جائے تو مقام ایک ہی ہونا بہت ضروری ہے تاکہ ماحول کا جو تاثر شروع میں قائم ہوا ہے وہ آخر تک برقرار رہے۔ ہر سین کا ایک نئے مقام پر ہونا تاثر پر بری طرح اثرانداز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر "سنگریزے"[1] کو لیجیے جس میں سات مناظر ہیں اور یکے بعد دیگرے دو الگ الگ مقامات پر وقوع پذیر ہوتے ہیں حالانکہ ڈراما ایک پلاٹ کی وحدت کے باعث یکبابی کہا جا سکتا ہے۔ مگر واقعات کا الگ الگ جگہوں پر ہونا تاثر کو بری طرح مجروح کرتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ناظر یا قاری کو ہر دو حادثے کے بعد اپنے ذہن کو ایک نئے سین کے لیے تیار کرنا پڑتا ہے۔ بار بار پردے کا گرنا اور اٹھنا اور پھر ایک نئے سین کا سامنے آنا ناظر کو ایک اکتاہٹ میں مبتلا کر دے گا اور جو تاثر ڈرامے کا پیدا ہونا چاہیے وہ اکتاہٹ اور جھنجھلاہٹ کی نذر ہو جائے گا۔ اسی طرح "شیر افگن"[2] ہے جو چھ مناظر پر مشتمل ہے اور چھ کے چھ مناظر چھ الگ الگ جگہوں پر ہوئے ہیں جو شہنشاہ اکبر کے خلوت خانے سے لے کر بنگالے میں شیر افگن کی خوابگاہ اور دیوانِ خاص تک پھیلے ہوئے ہیں۔ شاید ڈاکٹر صاحب نے غور نہیں فرمایا کہ انھیں اسٹیج کرنے کے لیے کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور کیا اس کا اسٹیج کیا جانا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ اگرچہ شیر افگن کے کردار پر خاص محنت کر کے قرونِ وسطیٰ کے KNIGHT کی خصوصیات کو بڑے سچے ڈھنگ سے اجاگر کیا گیا ہے مگر اسی کے ساتھ اکبر کا کردار انارکلی کے مہابلی کا مثنیٰ بن کر رہ گیا ہے۔ ایکشن کی کمی اور بعض جگہ طویل و ربادی مکالموں نے ڈرامے کو بڑا بوجھل بنا دیا ہے۔ آخری سین غیر متوقع طور پر شروع ہوتا اور غیر متوقع طور پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ان کا ایک اور ڈراما "شکست"[3] ہے جو باوجود پانچ مناظر پر مشتمل ہونے کے وحدتِ تاثر پر پورا اترتا ہے۔ ڈاکٹر کی داخلی کشمکش نے ڈرامے میں بڑی جان ڈال دی ہے۔ کاش ڈاکٹر محمد حسن اس میں اسپتال کا منظر شامل نہ کرتے تو ڈرامے کے اندر جو سقم پیدا ہو گیا ہے وہ نہ ہوتا اور اس سے ڈرامے کے پلاٹ پر بھی اثر نہ پڑتا۔

قصہ کی اکائی، وحدتِ تاثر اور وحدتِ زمان و مکان کے علاوہ یکبابی ڈراما عمل و حرکت کا سب سے زیادہ متقاضی ہوتا ہے۔ فطری طور پر انسان ایک ہی چیز لمبے عرصے تک نہیں دیکھ سکتا، اور اگر وہ دیر تک اپنی آنکھیں ایک ہی چیز پر جمائے رہے تو وہ تھک جاتی ہیں اور انسان بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس لیے اسٹیج پر کرداروں کا جامد ہو جانا ناظر میں اکتاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ کرداروں کے عمل و حرکت اور چہرے کا اتار چڑھاؤ ڈرامے کے بولے بولے مکالمے ہیں جو صرف کرداروں کی ذہنی حالت کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ ناظر کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول رکھتے ہیں۔ اسی لیے اسٹیج ڈراما زیادہ سے زیادہ عمل و حرکت چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یکبابی ڈراما زیادہ کرداروں کا متحمل نہیں ہو سکتا مگر کرداروں میں کمی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم صرف دو کرداروں پر ہی ڈرامے کی بنیاد رکھ دیں۔ دو کرداری ڈراموں میں اول تو تصادم کی شدت پیدا ہونا مشکل ہے دوسرے اگر تصادم کی کوئی صورت پیدا کر بھی لی جائے تو مکالموں کی زیادتی اور پورے وقت میں صرف دو

---

[1] اظہر افسر: سنگریزے، شاہکار (ادبی ڈائجسٹ) وارانسی۔ جنوری ۱۹۶۱ء ص ۱۲۹ [2] محمد حسن (ڈاکٹر) شیر افگن: ماہنامہ آجکل دہلی اگست ۱۹۶۲ء ص ۴ [3] ڈاکٹر محمد حسن: شکست، ماہنامہ آجکل دہلی بابت ماہ جون ۱۹۶۲ء ص ۳۲ [4] اظہر افسر: تیرھویں شب کا چاند: ماہنامہ کتاب۔ لکھنؤ۔ افسانہ نمبر حصہ دوم نومبر ۱۹۶۶ء ص ۲۰۸

کرداروں کا ناظروں کے سامنے رہنا ناظر میں بددلی اور اکتاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر "تیرھویں شب کا چاند" صرف دو کرداروں پر مشتمل ہے جو ایک موٹر میں بیٹھے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ ممکن ہے ڈرامہ نگار موٹر کو اسٹیج پر کسی طرح اسٹیج کی محدود جغرافیائی حدود میں دوڑتا ہوا دکھا دے مگر کرداروں کو موٹر کے اندر بٹھلا کر عمل و حرکت کے لیے کون سی گنجائش پیدا کر سکے گا سوائے اس کے کہ مکالمے، مکالمے اور مکالمے۔ یہی حال "منیاں کی دستک"[1] اور "اعتبار نظر"[2] کا ہے۔ "اعتبار نظر" میں نہ تو عمل و حرکت ہے اور نہ تصادم کی شدت اور پھر کردار نگاری بھی اس قدر ڈھیلی ڈھالی ہے کہ دونوں کرداروں میں فرق کرنا اور دونوں کی ذہنی ساخت کا تعین کرنا ناممکن ہے۔ اگر بالفرض محال ڈراما دو ہی کرداروں پر مبنی ہو تو پلاٹ کی ترتیب پر خاص دھیان دیا جانا ضروری ہے۔ مکالموں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ہر مکالمہ تجسس اور تحیر پیدا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "کلنک کا ٹیکہ"[3] سومرالی سے ترجمہ کیا گیا ہے، ہر ہر قدم پر تحیر و تجسس پیدا کرتا ہے۔ کہیں بھی ناظر یا قاری تھکا ہوا محسوس نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر قدم پر کسی نئے واقعہ یا انکشاف سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔

اردو کے یک بابی ڈراموں میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ماحول اور کرداروں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ وہ کسی تہذیبی اکائی کی نمائندگی کرتے ہوں، کرداروں کا کوئی عمل اور مکالمہ ایسا نہ ہو جس سے کسی مخصوص تہذیب یا کرداروں کے منصب کی نفی ہوتی ہو۔ اکثر یک بابی ڈرامے اس خوبی سے خالی نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر "کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"[4] میں باپ اپنی بیٹی کے منگیتر یا عاشق کو مجبور کرتا ہے کہ وہ وہی جملہ اس کے سامنے دہرائے جو وہ اس کی عدم موجودگی میں کہہ رہا تھا یعنی:

جمیل: اچھا ہوا انجم نے انکار کر دیا۔ تم نہیں جانتیں انجم، دراصل تمہیں خبر نہیں کہ میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں، سچ کہتا ہوں ان موٹے اور بھدے ہونٹوں کو جن کی ہمارے تمہارے رشتے دار کوئی قدر و قیمت نہیں جانتے میں انہیں ایک بار چومنے کے لیے اپنی ساری زندگی قربان کر سکتا ہوں۔

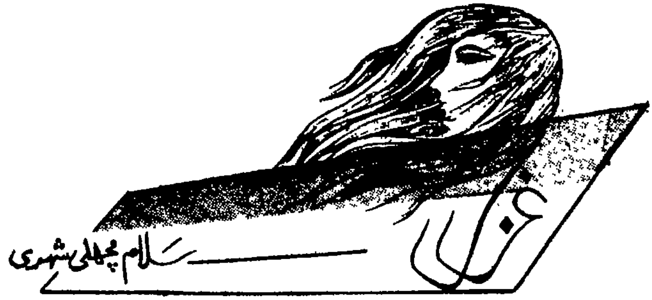
بھلا کون ایسا باپ ہوگا جو ایک مرد کو مجبور کرے کہ وہ اس کے سامنے اس کی بیٹی سے ایسے الفاظ کہے جو تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا شخص ہندستانی سماج میں ہے تو وہ باپ نہیں اور کچھ ہوگا۔ مختصر یہ کہ اس قسم کے مکالمے لکھنا یا ایسی سیچوایشن پیدا کرنا جو کسی جانی پہچانی تہذیب اور کلچر کے خلاف ہے ڈرامے میں شامل نہ کی جانا چاہیے کیونکہ اس سے ڈرامے کی تہذیبی قدریں کم ہوتی ہیں۔

غرض یہ چند خامیاں اور غلط فہمیاں ہیں جو اردو یک بابی ڈرامے کے متعلق پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر ہمارے نقاد اس جانب توجہ کریں اور اردو یک بابی ڈرامہ کا احتساب کریں تو اردو یک بابی اسٹیج ڈراما بلندیوں کو چھونے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کر سکتا ہے۔

★

---

[1] ساگر سرحدی: "منیاں کی دستک"، ماہنامہ افکار کراچی جولائی ۱۹۷۱ء ص ۴۶ [2] منیژ قمر: "اعتبار نظر"، ماہنامہ شاعر بمبئی ستمبر ۱۹۶۸ء ص ۶۶ [3] ش۔ن۔ فرے (ترجمہ یونس امالسکو) "کلنک کا ٹیکہ"، ماہنامہ شاعر بمبئی آزادی نمبر اگست ۱۹۷۱ء ص ۴۹ [4] اظہر افسر: "کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"، ماہنامہ شاعر بمبئی فروری ۱۹۶۳ء ص ۵۵



اسے بھی اپنے مسائل میں مبتلا نہ کرو
اُداس ہو تو کسی دوست سے ملا نہ کرو

بجھے تو اتنے پریشان، اتنے افسردہ
چراغ بن کے کہا تھا کبھی جلا نہ کرو

کلی کھِلے گی، ستارے ضرور چمکیں گے
یہ اور بات کہ تم شکریہ ادا نہ کرو

گنہ کی راہ میں اک روشنی کا موڑ بھی ہے
مرے لیے ابھی اے دوستو دعا نہ کرو

نئے رفیقو! مرے حال پر ترس کھا کر
ابھی سے ترکِ تعلق کی ابتدا نہ کرو

جو حسن کار ہو ساری فضا تمھاری ہے
اگر نہیں ہو تو پھر شکوۂ قضا نہ کرو

یہ کم نہیں ہے کہ اس دور میں بھی زندہ ہو
سلامؔ! صورتِ حالات کا گِلا نہ کرو

انشائیہ



[illegible]

مرزا غالب کو آم بہت پسند تھے۔ اچھے آم کی تعریف انھوں نے یوں کی تھی کہ بہت سے ہوں اور خوب میٹھے ہوں ——— آپ کی پسند اور ناپسند مجھے نہیں معلوم۔ مگر آپ جانتے ہوں گے کہ آم نہ پسند کرنے والوں کو غالب گدھا سمجھتے تھے۔ اپنی ہیرو پسندی کا اظہار کر کے مجھے اس وقت اپنی یا آپ کی شناخت منظور نہیں ——— تو کھٹے اور میٹھے آم کی طرح ہیرو بھی خالصتاً دو ہوتے ہیں، مثالی اور موسمی۔ اسے اپنے ملک کی خوش قسمتی کہیے کہ ہمارے پھلوں میں جتنی شکل اور سواد کے آم ملتے ہیں، اتنی ہی قسم کے ہیرو بھی۔ مثال کے طور پر فلمی ہیرو اور قومی ہیرو، کلاس کا ہیرو اور بازار کا ہیرو، محلّہ کا ہیرو اور سیچ کا ہیرو وغیرہ وغیرہ ——— یہ ہیرو کسی جگہ اداکاری کرتا ہے، کہیں سودا بازی۔ کہیں یہ کامریڈ کہلاتا ہے، کہیں رنگ دار۔ کہیں یہ سرداری کرتا ہے اور کہیں سواری۔ کہیں اس کا شغل پہلوانی ہوتا ہے اور کہیں عاشقی ——— جہاں زندگی کی علامت ہے، وہاں ہیروازم کی علت۔ جہاں زندگی کا سوز و ساز ہے وہاں ہیروازم کی تب و تاب۔ کوئی جگہ ہیرو سے خالی نہیں۔ ہر دل میں ہیرو شپ کا جذبہ اور جوش موجود ہے۔

الغرض، ہیرو طبعاً دو ہوتے ہیں، مثالی اور موسمی ——— مثالی ہیرو کتابی دنیا میں نشو و نما پاتا ہے اور عموماً یہ زائیدۂ خیال ہوتا ہے۔ نامی شعرا اور کہانی کار اس کے خالق ہوتے ہیں اور اسی ہیرو کے دم سے وہ مقام ابد حاصل کرتے ہیں۔ نیرنگیٔ زمانہ سے مثالی ہیرو اگر کبھی اس عالم رنگ و بو میں نمودار ہو جاتا ہے تو اس کا قیام اور قیاد معاشرہ کے لیے پُرخطر ہو جاتی ہے۔ اس کی سرفرازیاں جو اس کی ہیروازم کو نادر الوجود بنا دیتی ہیں، اس کے اقوال و اعمال کی تزئینی ہوتی ہیں۔ مرنے کے بعد اس کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور "اتباع و توقیر" کے نام پر اس کی قدریں بے قدر کی جاتی ہیں۔ پیراں نمی پرند مریداں می پرانند کے مصداق اس مردِ آہن کے کردار سے زیادہ اس کی ذات کو مرکز رکوع و سجود بنایا جاتا ہے ——— مثالی ہیرو اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے اور دیکھتے دیکھتے اس کے مقلدین و تابعین خرافات کے ظلمات میں ذرۂ نور تلاش کرتے رہتے ہیں ——— بعض مثالی ہیرو ایسے بھی ہوتے ہیں جو بے وقت یا قبل از وقت صفحۂ ارض پر نمودار ہو جاتے ہیں، اور اپنے فکر و شعور کے عرفان کی نافہمی اور بلا خیز روشنیٔ طبع کی وجہ سے وہ خود آپ شکار ہو جاتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایسے حبیبؑ اور جیالے ہیرو کو ارباب قضا و قدر جلد از جلد عالم ہستی سے عالم نیستی میں واپس کر دیتے ہیں۔ مثالی ہیرو کا انجام، خواہ یہ زائیدۂ مسلم کار ہو یا پروردۂ قدرت عموماً المیہ ہوتا ہے۔ مگر اپنی المناکی کے باوجود یہ دستِ فنا سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی مثالی ہیرو کے المیہ کا طربناک اور درخشاں پہلو ہے جس کی وجہ سے اس کی ہیروازم کلاسیکی بن جاتی ہے۔

عصر جدید کا ہیرو کلاسیکی ہیرو سے زیادہ حوصلہ مند اور فعال ہوتا ہے اس کی وجہ اس کے مزاج اور ماحول کی ہم رنگی ہے ——— لڑکپن سے پہلے اس میں عاشقی کا مادہ اور جوانی سے پہلے حسینوں پر مرنے کا حوصلہ آ جاتا ہے اور چلتے پھرتے ایجاب و قبول کی خاطر ہمہ وقت وہ آوارہ گشت بنا رہتا ہے۔ اظہارِ عشق کا مرحلہ ہو یا ترسیلِ عشق کی مہم، وہ ہمیشہ ترقی پسند انداز سے سوچتا ہے اور غیر روایتی طریقۂ کار کو اپناتا ہے۔ وہ پتنگ بازی یا غزل گوئی نہیں کرتا۔ وہ کبوتر یا ملازمہ کا سہارا نہیں لیتا۔ وہ مٹھائی یا چٹھی کا بھی قائل نہیں ہوتا۔ رہی مصوری اور افسانہ نگاری، تو ان وسیلوں کا استعمال اس کے لیے امر محال ہے کہ اب افسانہ اور تصویر دونوں تجریدی آرٹ ہو گئے ہیں۔ لازماً سرخ روئی یا زرد روئی کے نتائج سے بے پروا ہو کر آتشِ عشق میں وہ بے خطر چھلانگ لگاتا ہے کہ میر صاحب فرما گئے ہیں:

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

عصرِ جدید کے ہیرو کے منظرِ عام پر آنے کے عوض مجھے ترس آتا ہے
اور آپ بھی میرے ہم خیال ہوں گے کہ اس کی ہیروازم کی نامعقولیت
دراصل ہمارے نظامِ تعلیم اور طریقۂ تربیت کا ثمرہ ہے ـــــ غور
فرمائیں، مذہب، مکتبی اور مذہبی تعلیم ہے، درس گاہوں میں پٹائی اور
چھڑی۔ مخلوط تعلیم اور سیکولرزم کا دور دورہ ہے۔ ابتدائی تعلیم کے آغاز سے
بہت پہلے بچّے کی دنیائے مشاہدہ میں وہ چمکدار رنگین تصویریں داخل ہو
جاتی ہیں جو والدین کے ذوق اور کمروں کی زینت کا ثبوت دیتی ہیں۔
بچّے کی تجسس پسند نظریں ان ماہ پیکر کے عریاں جسم کے جغرافیہ کا جائزہ
لیتی رہتی ہیں۔ گھر اور باہر، بازار یا تقریب کی کوئی قید نہیں۔ مرنے کی
دعوت اسے ہر جگہ ملتی ہے۔ وہ سینی کہانیاں دیکھتا اور پڑھتا ہے۔
پڑھتا بہت کم ہے کہ دیکھنے سے ہی اسے فرصت نہیں ملتی ـــــ عمر
آتے ہی کالج کی کھلی فضا میں اس کی ہیروازم تازہ دم ہو جاتی ہے اور
جو دل پر گذرتی ہے، حیوانی عوامل سے اس کا مظاہرہ شروع ہو جاتا
ہے ـــــ آخرش، بداقبال والدین اور نامراد اولاد بعد از خفّت
بسیار، ایک ہی انجام پر جا پہنچتے ہیں یعنی، آپ کی ہمدردی پر ہائے
دل اور ہائے گل کا واسوخت دونوں سناتے ہیں ـــــ !

خدا بخشے، لکھنؤ کے اگلے کیسے روشن دماغ اور دور بیں تھے! ان کی
نفاست پسندی اور جدّت پرستی کا جواب نہیں۔ ادب اور تہذیب کو
اس لکھنوی زندہ دلی سے کیا کچھ نہ ملا؟ ـــــ ریختہ کو ریختی اور
قیصر باغ کو راجا اندر کا دربار بنا کر اور بلبل کو مذکر باندھ کر انہوں
نے دلدادوں کو نئے مقاماتِ آہ و فغاں سے روشناس کرایا ـــــ
اور تو اور، نہایت دور افتادہ ماضی کے ایک تہذیبی مشغلہ کو انہوں نے
یوں اپنا لیا کہ نقل اصل سے دو ہاتھ آگے بڑھ گئی ـــــ قدیم روم
اور یونان کے ان جری سورماؤں کے قصے آپ نے پڑھے ہوں گے
جو خونخوار اور گرسنہ درندوں سے کشتی لڑتے اور پینترے بدل بدل کر
اپنی فولادی شجاعت کے مظاہرے کرتے ـــــ حیات و موت
کی کشمکش کا یہ روح فرسا تماشا رومی اور یونانی فرماں رواؤں کا ایک
محبوب مشغلہ تھا۔ اس کشتی سے جانبازی کا جیسا بھی مظاہرہ ہوتا ہو،
ہے یہ مشغلہ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری، والا ایک طرفہ معاملہ تھا۔

تو جناب، لکھنوی مذاق نے اُس رومی روایت کی احیا رکھی
اور اس کشتی میں نفاست اور جدّت دونوں پیدا کی۔ ایک طرف انھوں
نے انسان اور درندوں کی بجائے بٹیر اور مرغ کی پہلوانی رائج کی۔
دوسری جانب وہ پہلوانوں کو اکھاڑے میں اتارنے کے عوض گھر
بیٹھے ہی بیٹھے چونچ لڑانے کا سلیقہ سکھایا ـــــ بھلا درندہ اور
دو پایہ کا مقابلہ ہی کیا؟ حیوان دونوں ہی ٹھہرے۔ مگر لکھنؤ کے گھروں
نے ایسے سورما تیار کیے جو پہلوان سے "بانکے" ہو گئے۔ ان کی لنگوٹ
اتر گئی اور مونچھ اٹھ گئی۔ پہلوانی جسم نہ رہا، کس بل آ گیا۔ دیکھا آپ نے!
لکھنؤ کے یہ بانکے بھی دراصل ہیرو کی ایک قسم تھے۔ یا اس عہد کی تیغ
جاہ و جمال کی مجسم تصویر تھے۔ ان کی ہیروازم سے مجمع اور محفل میں
جان آ جاتی!

کہتے ہیں، لکھنؤ اسٹیشن سے دو بانکے بغرض سفر یکے بعد دیگرے
ایک ہی ڈبے میں داخل ہوئے۔ ان کی نظریں ملیں۔ جو بیٹھ چکا تھا، جا نہ
سکا اور جو آیا وہ واپس نہ ہوا کہ ہر فریق کو اپنا بانکپن عزیز تھا۔
ٹرین روانہ ہوئی۔ مسافر خوش ہوئے کہ ان بانکوں کی آمد سے اچھی
خوش وقتی نصیب ہوئی۔ زانو پر زانو رکھے آمنے سامنے سیٹ پہ جا بیٹھے
بیٹھے دونوں بانکوں نے اپنی لن ترانی شروع کر دی۔ مسافروں سے
مخاطب ہو کر یہ اپنے مربی کے بے شمار اعزاز و افتخار پر شیخی کی لینے
لگے۔ اور مکالمہ میں نہلے پر دہلا اور دہلے پر یکہ کی بازی شروع ہو گئی۔
کچھ دیر بعد، کسی اسٹیشن پر ٹرین رکی ـــــ اتفاق یہ وقت، دونوں
بانکوں کو اسی جگہ اترنا تھا۔ اپنی مرصّع چھڑی لیے یہ پلیٹ فارم پر آ گئے۔
ادھر اُدھر قلی گھوم رہے تھے۔ ایک بانکے نے ملے دار آواز سے قلی کو پکارا۔
دوسرے بانکے نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا کہ سامان ندارد، پھر تسلّی
پہ ہنسی! وہ منہ پھیر کے انداز سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ پہلے بانکے نے نہایت
تمکنت کے ساتھ قلی کی طرف اپنی چھڑی بڑھائی اور کہا "دیکھتا کیا ہے؟ لے
یہ چھڑی اٹھا" ـــــ بانکپن کا یہ مظاہرہ دوسرے بانکے کو زک دے گیا۔
دل ہی دل میں وہ تلملا اٹھا جیسے اس کی کور دب گئی ہو۔ اچانک [illegible] نے
اسے سہارا دیا۔ اس نے بھی قلی قلی کی صدا لگائی۔ ایک قلی دوڑا آیا۔ پاس
آ کر بولا "نواب صاحب! سامان کہاں؟" ـــــ بانکے نے [illegible]

کی جیب میں نہایت نخرے دو انگلی ڈالی اور اپنا ٹکٹ نکالتے ہوئے قلی کو حکم دیا۔ "نواب کے بچے! لے یہ ٹکٹ اٹھا۔"

آج کا ہیرو بانکا سجیلا نہیں ہوتا اور نہ اس کی ہیرو ازم کو دیکھنے یا سننے کو جی چاہتا ہے۔ یہ نہ مثالی ہوتا ہے اور نہ کتابی۔ یہ فصلی ہوتا ہے اور ہر موسم میں تولد ہوتا ہے۔ میں یہ مشاہدہ کر سکتا ہوں کہ موسمی ہیرو کی بھی فصل نامناسب فضا کا نتیجہ ہوتی ہے یا نامناسب فضا سے کسی فصل لہلہاتی ہے۔ پر اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عصری بحران اور انتشار موسمی ہیرو کے لیے نہایت سازگار ہیں اور کسی محتسب کیلیے معاملہ تولید میں آمد و آورد کا امتیاز دشوار ہو گا۔

موسمی ہیرو کھڑے اسٹیم انجن کے بھبکتے دھوئیں کی طرح اچانک ابھرتا ہے۔ اس کی ہیرو ازم کے کارناموں سے شرفا گھر کے اندر اور سفلہ گھر کے باہر آجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے بلا وہ دوسرا اکثریت کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور نامراد ہونے سے پہلے وہ یوں اینٹھنے لگتا ہے جیسے نیا ملازم نمائش فر پہن کر رنگینی کے ساتھ بازار کو نکلا ہو۔

موسمی ہیرو کدو کریلے کی لتوں کی مانند تیزی سے بڑھتا ہے، اور زیادہ دن تک ہرا بھرا نہیں رہتا۔ کامرانیاں ستر ہوں یا سینکڑوں یہ جلد اپنے رنگ بدل دیتا ہے۔ توبہ استغفار کر کے اور فتنہ و فتور کی دنیا سے منہ موڑ کر وہ خیر و خدمت کی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ اس نئے روایتی رسوم کے اجرا اور چلنے پھرتے عقائد کی راستی پر اس کا یقین نہایت کامل اور پختہ ہوتا ہے۔ علمیا برادری کے ان روشن خیال طلبہ کی عقل پر وہ دست تاسف ملا کرتا ہے جو کارخانۂ قدرت کو اندھے کی لاٹھی تصور کرتے ہیں۔ ان کبیدہ دل اور جگر سوختہ روشن خیال طلبہ کے اس منفیانہ نقطۂ نظر سے شرعی ہیرو کو اختلاف رہتا ہے۔ اعتراف اسے بھی ہوتا ہے کہ ہم آفاق پُر از فتنہ و شر ہے، پر اسے یقین ہوتا ہے کہ قیامت قریب ہے۔ نماز پڑھو۔ اللہ کو یاد کرو۔ سب ٹھیک رہے گا — یہ ایمان پرور اور ایمان سوز تقابلی بحثیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ مداخلت کیے بغیر اس محاکاتی مناظرے سے لطف اندوز ہونے کا مجھے موقع ملا ہے اور ایسا محسوس ہوا جیسے متانت سے اقبال کا "شکوہ" اور محمد رفیع "جواب شکوہ" منہ ور فتہ ہو کر سنا رہے ہوں —!!

★



کے انتظار میں

(منظوم خط)

ملکت کوکب (کلکتہ)

بندہ پرور! آپ کو کچھ یاد ہے
کس طرح! کس حال میں ناشاد ہے

ہم نے مانا۔ آپ ہیں غمخوار بھی
اپنے دل کے مالک و مختار بھی

چھوڑیے طرزِ تغافل چھوڑیے!
رشتۂ الفت دوبارہ جوڑیے!

قید خانے کی طرح گھر ہو گیا
ہجر میں جینا بھی دوبھر ہو گیا

شاہزادوں کی محبت دیکھ لی!
چار دن کی رسمِ الفت دیکھ لی!

چاہیے تھی اک نگاہِ التفات
کھو گئی حسنِ تکلف میں یہ بات

مے کے بدلے خون ٹپکا جام سے
شامِ ہجراں مل گئی انجام سے

روز و شب رہتا ہے دل کو انتظار
آپ کی تحریر پر دنیا نثار

ڈھونڈتا ہے دل وہی باتیں جناب
پڑھ کے پیشانی ہو جن سے آب آب

کاش ہوں ماضی کی باتیں خوشگوار
وقت نے جن کو بنایا دلفگار

یہ طلسمِ بے وفائی — یہ ستم؟
حلقۂ دامِ محبت کی قسم؟

دوڑ کے آجائیں ہم ہر آن کو
آپ کے قدموں میں رکھ دیں جان کو

دل دھڑکتا رہتا ہے، مہلت کہاں؟
انتظارِ خط میں ہیں اب نیم جاں!

بے مروت آپ ہیں۔ ہم تو نہیں؟
کیا بدل سکتی ہے فطرت بھی کہیں؟

غالبِ خستہ کی صورت آپ کو
"خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو"

عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے فارسی کا اخراج

ڈاکٹر حکم چند نیر

عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے فارسی زبان کے اخراج اور اس کی جگہ پر ہندستانی زبانوں کی تمام نہاد ترویج کی تحریک کا آغاز کیوں، کیسے اور کب ہوا؟ اس تحریک کے آغاز کے اسباب و علل، اغراض و مقاصد اور عواقب و نتائج کیا اور کتنے دوررس تھے، اس موضوع کے متعلق پورا مواد سیکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس مضمون میں ان تمام امور اور مباحث کی گنجائش نہیں۔ یہاں اس مسئلے کے اہم پہلوؤں پر مختصراً روشنی ڈالنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

دستیاب مواد کی بنیاد پر بخوبی کہا جاسکتا ہے کہ اس تحریک کا آغاز سامراجی مفادات کے تحفظ کے لیے انگریزوں کی حکمت عملی سے ہوا تھا۔ سامراجی حکومت نے خود کو غیر جانب دار اور معصوم رکھنے کے لیے اس تحریک اور اپنے فیصلے کو پورا پورا جمہوری رنگ دے دیا تھا اور فارسی کے اخراج کا فیصلہ حکام وقت اور اہم سرکاری اداروں سے تقریباً دس برس تک گفت و شنید، صلاح و مشورہ اور خط و کتابت کے بعد کیا تھا۔ حکام مقوضہ متعدد اور مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ فارسی کو سرکاری اور عدالتی زبان کی حیثیت برقرار رکھنے کا حامی تھا۔ دوسرا گروہ فارسی کی جگہ پر ہندوستانی زبانوں کو رائج کرنے کے لیے عوام کی فلاح و بہبودی کی دہائی دیتا تھا۔ اس کا ایک ذیلی گروہ فارسی کی جگہ پر ہندستانی (اردو) بخط فارسی کو شمال مغربی صوبے میں رائج کرنے کے لیے فارسی رسم خط کی خوبیاں پیچ پیچ کر گنا تا تھا۔ بعض افسران ہندستانی بخط دیوناگری کی ترویج کے لیے اکثریت کی حق تلفی اور پسماندگی کا نام لے لے کر آنسو بہاتے تھے۔ جتنے منہ تھے اتنی بلکہ ان سے بھی زیادہ باتیں تھیں۔ ان باتوں میں فکر و خیال کی کجی اور دل و زبان کا تضاد ہر جگہ نمایاں تھا کیونکہ بباطن یہ لوگ فارسی کو دفتروں اور سرکاری عدالتوں سے بہرحال خارج کرنے پر متفق تھے۔

فارسی کے عدالتوں اور دفتروں سے اخراج سے ایک تیر بیک وقت دو نشانوں پر کارگر وار کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ مدراس، بمبئی اور بنگال وغیرہ میں انگریزی کا جادو چل چکا تھا۔ سرکاری کام زبان چلانے کے لیے ان علاقوں میں انگریزی کا چلن کافی تھا۔ مزید برآں ان علاقوں میں فارسی کی بجائے کسی ایک ہندستانی زبان کو رائج کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تامل، تلگو، مراٹھی، گجراتی، اڑیا اور بنگالی وغیرہ کتنے دعوے دار موجود تھے، اور ان زبانوں میں انگریزی کے منہ آنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں دیسی اینگلو انڈین اور دیسی عیسائی کافی تعداد میں موجود تھے جن سے بیک وقت تلوار اور ڈھال دونوں کا کام لیا جاسکتا تھا۔ یہ مجاہدین تازہ ترین جوش ایمانی کی بدولت ہر ہندستانی فکر کی تحقیر اور ہر ولایتی خیال کی توصیف و تحسین کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان علاقوں پر سامراجی حکومت کی گرفت کافی مضبوط اور مستحکم ہو چکی تھی۔

اس کے برعکس برصغیر کے ایک بہت بڑے اور سیاسی حیثیت سے اہم ترین خطے یعنی شمال مغربی ہندستان (مشتمل بر موجودہ اترپردیش، دہلی، ہریانہ، پنجاب اور پاکستان) پر اگرچہ انگریزی اقتدار

سے ان لوگوں کو معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صوبۂ بنگال میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں فارسی کا چلن زیادہ ہے۔ اس لیے انگریزی یا ہندستانی زبانوں کے مقابلے میں فارسی کو عدالتی زبان کی حیثیت سے جاری رکھنے میں کم اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے اور ایک معیاری اور عدالتی زبان کی حیثیت سے فارسی ہندستانی زبانوں کے مقابلے بدرجہا بہتر ہے۔[1]

گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر مسٹر شیکسپیئر نے اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "سرکاری اور مراسلاتی زبان کی حیثیت سے فارسی کو دیگر تمام ہندستانی زبانوں پر فوقیت حاصل ہے، کیونکہ ہندستان کے اس کونے سے اس کونے تک سبھی تعلیم یافتہ لوگ اسے بآسانی سمجھتے ہیں۔"[2]

شمال مغربی صوبے کی صدر دیوانی عدالت اور نظامت عدالت نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ "مقامی زبان سرکاری اور عدالتی زبان کے لیے ناموزوں ہے کیونکہ تمام اضلاع بلکہ ہر ضلع کے مختلف طبقات کی بولیوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔"[3] اسی عدالت کے ایک جج مسٹر ڈِک اگرچہ ہندستانی بخط دیوناگری کو رائج کرنے کے حامی تھے لیکن اس کے معترف تھے کہ "فارسی کی جگہ پر ہندستانی بخط دیوناگری کو رائج کرنے میں اصطلاحات کی تشکیل، بولیوں کے اختلافات اور ناگری رسم خط کو بآسانی صحت کے ساتھ نہ پڑھ سکنے کی مشکل وغیرہ بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"[4] شمال مغربی صوبے کی صدر دیوانی عدالت اور نظامت عدالت کے تحت کام کرنے والے ۶۲ ججوں میں سے ۲۹ جج مروجہ طریق کار میں کسی قسم کی تبدیلی کے خلاف تھے اور ۳۳ جج فارسی کی جگہ پر ہندستانی بخط فارسی کو رائج کرنے کے حق میں تھے۔[5]

پٹنہ سٹی کورٹ کے جج مسٹر موریس نے فارسی کی جگہ پر ہندستانی کو رائج کرنے کے سلسلے میں لکھا کہ "ہمیں تمام عمل درآمد کے لیے عدالتی زبان کی حیثیت سے فارسی کو برقرار رکھنا پڑے گا کیونکہ عدالتی کارروائیاں اور تجویزیں لکھنے کے لیے ترکیبیں، بندشیں اور اصطلاحیں فارسی سے مستعار لینا پڑیں گی۔ ہندستانی کو رائج کرنے سے صرف فقروں کی ترکیب اور تصرف بدل جائے گی یا پھر فقروں کا خاتمہ فارسی افعال کے بجائے ہندستانی افعال پر ہوگا۔"[6]

دوسری طرف فارسی زبان اور رسم خط کو غیر ملکی کہا گیا۔ "فارسی پڑھنے میں لوگوں کو زیادہ دقت پیش آتی ہے اور دوسری کئی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ آج کل ہندستان میں ایک فرقے کے مخصوص لوگوں کے سوا فارسی کوئی نہیں پڑھتا، فارسی تمام مقامی اصوات کو ادا نہیں کر سکتی۔"[7] وغیرہ وغیرہ۔ ساتھ ہی تمام سرکاری کارروائیوں بالخصوص محکمۂ انصاف کی کارروائیوں کو مقامی زبانوں میں سرانجام دینے کی ضرورت پر بہت زور دیا گیا۔ بقول مسٹر شور:

"عدالتوں میں فارسی کی ترویج کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام سرکاری ملازمتیں دوسرے صوبوں کے خاصے لوگوں سے بھر جاتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کی تقرری اپنے صوبے میں کسی اسامی پر ہرگز نہ ہو سکتی۔ اگر بہ فرض محال ان میں سے کچھ لوگوں کی تقرری ہوتی تو وہ صرف چھوٹی چھوٹی ملازمتوں ہی پر ہوتی ہے اور ملک کے اس حصے کے مقامی لوگوں کو اس طرح نظر انداز نہ کیا جاتا۔"[8]

مسٹر شور قائم مقام کمشنر ریاود سائر کمشنری کا درج بالا اقتباس سامراجی حکومت کی حکمت عملی کی بخوبی وضاحت کرتا ہے۔ بہرحال بہت کچھ خط و کتابت

---

[1] محکمۂ امور داخلہ (بنیادی شہادات متعلقہ عدالتی امور) [illegible] ۱۰ اکتوبر [illegible] ۔ [2] ایضاً ۔ [3] مراسلہ ۲۹ جولائی [illegible] منجانب صدر دیوانی و نظامت عدالت شمال مغربی صوبہ بنام لفٹنٹ گورنر شمال مغربی صوبہ بحوالہ عدالتی شہادات (دیوانی) ۹ نومبر [illegible] ۔ [4] مورخہ ۲۳ جولائی [illegible] منجانب مسٹر ڈِک ۔ [5] ایضاً ۔ [6] محکمۂ امور داخلہ، بنیادی شہادات (عدالتی امور) [illegible] مورخہ ۱۰ اکتوبر [illegible] ۔ [7] مراسلہ [illegible] جنوری [illegible] منجانب [illegible] بنام سکریٹری محکمۂ انصاف بنگال بحوالہ عدالتی شہادات (دیوانی) [illegible] ۔ [8] مراسلہ مورخہ ۲۹ اکتوبر [illegible] منجانب [illegible] بنام سکریٹری [illegible] شمال مغربی صوبہ [illegible] مورخہ [illegible] تا ۱۶ دسمبر [illegible] ۔

کے بعد گورنر جنرل ہند نے شمال مغربی صوبے کے لفٹننٹ گورنر مسٹر راس کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے اپنی تجویز مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۸۳۶ء میں لکھا کہ یہ افسران عدالتوں میں فارسی کی جگہ پر ہندوستانی (اردو) کو رائج کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

حکومت ہند (گورنر جنرل با اجلاس کونسل) نے ۲۰ نومبر ۱۸۳۶ء کو ایکٹ نمبر ۲۹ پاس کیا جس کے ذریعے گورنر جنرل کو مجاز کیا گیا کہ وہ بنگال کوڈ کے ایسے دفعات کو منسوخ کر دے جن کے تحت کمپنی کے مقبوضات ہند کے محکمۂ انصاف اور محکمۂ مال کی کارروائیوں کو لکھنے کے لیے فارسی زبان کا استعمال ضروری ہے۔ مزید برآں انہیں فارسی کی جگہ پر کوئی دوسری زبان اور کوئی رسم خط رائج کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔

اس ایکٹ کے پاس ہونے کے تقریباً دو مہینے بعد ۲۳ جنوری ۱۸۳۷ء کو صوبہ بنگال کے ڈپٹی گورنر جنرل نے گورنر جنرل کے محولہ بالا اختیارات کے تحت فیصلہ کیا کہ "فورٹ ولیم پریزیڈنسی کی بنگال کمشنری (مشتمل بر موجودہ صوبجات بنگال، اڑیسہ، بہار و بنگلا دیش) کے تمام اضلاع کے محکمۂ مال کے دفتروں اور عدالتوں کی کارروائیاں فارسی کے بجائے مقامی زبانوں میں قلم بند کی جائیں اور اس فیصلے پر یکم جنوری ۱۸۳۸ء سے بارہ مہینوں میں بتدریج عمل کیا جائے۔"

اس فیصلے سے بنگال پریزیڈنسی کے دفتروں اور عدالتوں میں ایک خلفشار پیدا ہو گیا کہ کس ضلع میں کونسی زبان استعمال کی جائے اور کس رسم خط میں لکھی جائے۔ یہ ایک بڑا پیچیدہ لسانی مسئلہ تھا اور رسم خط کے قضیے نے اسے پیچیدہ تر بنا دیا تھا۔ اس لیے اس فیصلے پر عمل کی رفتار سست رہی۔ فورٹ ولیم پریزیڈنسی کی صدر دیوانی عدالت نے ۹ فروری ۱۸۳۹ء کو ماتحت عدالتوں کے نام ایک سرکلر بھیجا کہ وہ اپنے اپنے ضلع میں عدالتی کارروائیاں جلد از جلد فارسی کے بجائے مقامی زبانوں میں قلم بند کرنا شروع کر دیں۔

صوبہ بنگال میں فارسی کی بجائے بنگالی کی ترویج کی کوششیں کی گئیں تو ڈھاکہ کے رئیسوں، زمینداروں اور وکیلوں نے سرکار کے اس اقدام کے خلاف زبردست اور موثر احتجاج کیا جس کے نتیجے میں حکومت بنگال نے ۱۹ اپریل ۱۸۳۹ء کو ایک سرکلر جاری کیا جس کے ذریعے سابقہ احکامات کو نرم کرتے ہوئے فارسی کو ایک متبادل زبان کی حیثیت سے عدالتوں اور دفتروں میں برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی۔

اسی سلسلے میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ۵ اگست ۱۸۳۹ء کو ایک تجویز پاس کی جس میں ۱۹ اپریل ۱۸۳۹ء کے محولہ بالا سرکلر میں یہ اضافہ کیا گیا کہ جہاں کہیں ناگری رسم خط کا چلن ہو، وہاں اردو کو ناگری رسم خط میں لکھا جائے۔ یہ فیصلہ پہلے کیا جا چکا تھا کہ صدر دیوانی اور نظامت عدالت کی زبان اردو بجائے فارسی ہوگی۔ اس طرح ۵ اگست ۱۸۳۹ء کے فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ صدر عدالتیں اردو کے لیے فارسی رسم خط استعمال کریں اور اضلاعی عدالتیں بنگالی، اڑیا اور اردو بجائے فارسی کے علاوہ اردو بخط ناگری بھی استعمال کر سکتی ہیں جہاں کہیں یہ ثابت ہو کہ یہ رسم خط مروج ہو اور بنگال میں فارسی کو ایک متبادل زبان کی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

بنگال پریزیڈنسی میں صوبہ بہار ہی ایک ایسا علاقہ تھا جہاں اردو کے لیے دیوناگری رسم خط کا چلن تھا یا بالفاظ دیگر جہاں اسے مروج کیا جا سکتا تھا۔ ترہت کے لوگوں کے احتجاج سے بھی اسی امر کی توثیق ہوتی ہے۔ باشندگان ڈھاکہ کی طرح ترہت (بہار) کے زمینداروں، رئیسوں، وکیلوں اور مختاروں نے حکام بالا کو ایک احتجاجی عرضداشت پیش کی جس کے نتیجے میں صدر دیوانی عدالت نے نومبر ۱۸۳۹ء کو ایک سرکلر جاری کر کے حکام کو ناگری رسم خط کو جبراً رائج کرنے میں احتیاط اور آہستگی سے کام لینے کا مشورہ دیا۔

شمال مغربی صوبے کے محکمۂ مال میں فارسی کی جگہ اردو بخط فارسی و دیوناگری کی ترویج کا کام صوبہ بنگال کے مقابلے میں پہلے شروع ہو گیا تھا۔ مسٹر برڈ

محکمۂ صدر اعظم، بنیادی مخطوطات (عدالتی امور) ۱۸ اکتوبر ۱۸۳۶ء۔ مشورات عدالتی امور (دیوانی) مورخہ ۲۴ مارچ ۱۸۳۹ء۔ مشورات عدالتی امور (دیوانی) مورخہ مارچ ۱۸۳۹ء۔ مشورات عدالتی امور (دیوانی) مورخہ مارچ ۱۸۳۹ء۔ مشورات عدالتی امور (دیوانی) مورخہ مئی ۱۸۳۹ء۔ مشورات عدالتی امور (دیوانی) مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۸۳۹ء۔ مشورات عدالتی امور (دیوانی) مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۳۹ء۔

نے شمالی مغربی صوبے کی آگرہ کمشنری کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ۱۰ اکتوبر ۱۸۳۲ء کی رپورٹ میں "سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں فارسی کے بجائے ہندستانی رائج کرنے کا مشورہ دیا تھا"[1] اور اسی صوبے کے نربدا اور ساگر (ملحقہ ۱۸۲۰ء بہ شمالی مغربی صوبہ) کے علاقے میں حکومت نے ۱۱ نومبر ۱۸۳۵ء کے حکم کے ذریعے "عدالتوں اور دفتروں میں فارسی کے بجائے ہندستانی کو رائج کرنے کی اجازت دے دی تھی"[2] شمالی مغربی صوبے کے صدر بورڈ مال نے ۲۹ جولائی ۱۸۳۶ء کے سرکلر کے ذریعہ حکم دیا کہ محکمہ مال کی تمام کارروائیاں فارسی کے بجائے ہندستانی میں قلم بند کی جائیں گی۔ اسی سرکلر میں حکام محکمہ مال کو ہدایت کی گئی کہ "وہ خود بخوبی سمجھ لیں اور اپنے ماتحت افسران کو بھی سمجھا دیں کہ اس تبدیلی کا مقصد نہیں کہ صرف تصریفات، سابقے، لاحقے اور افعال بدل دیں جبکہ بجا دے ترکیبیں اور بیشتر الفاظ جو فارسی کے رہیں۔ صدر بورڈ مال کی یہ خواہش ہے کہ تمام کارروائیاں ایسی زبان میں لکھی جائیں جسے فارسی سے بالکل نابلد ایک معزز اور معتبر ہندستانی بآسانی سمجھ سکے"[3]

"بورڈ کو اعتماد ہے کہ یوروپی حکام اور بالخصوص ہندستانی ڈپٹی اس پر کڑی نظر رکھیں گے کہ عملہ ایک فراموش شدہ اور ناقابل فہم زبان (فارسی) کو برقرار رکھنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو اور وہ بہرحال عملے کو روزمرہ کی بات چیت کی زبان استعمال کرنے پر مجبور کریں گے"[4]

یہاں اس بات کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ شمالی مغربی صوبے کے لفٹننٹ گورنر سر چارلس مٹکاف نے گورنر جنرل ہند کے مراسلہ مورخہ ۳۰ مارچ ۱۸۳۵ء کے متعلق صدر عدالت و نظامت اطلاعات کی رپورٹ مورخہ ۲ اگست ۱۸۳۵ء گورنر جنرل کے پاس بھیجنے سے پہلے شمالی مغربی صوبے میں فارسی کی جگہ پر اردو اور ناگری کی ترویج کے احکام جاری کر دیے تھے۔ گورنر جنرل کی یہ تجویز مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۳۵ء بھی سر چارلس مٹکاف ہی کی کوششوں اور مشورہ کا نتیجہ تھی۔ صدر بورڈ مال شمالی مغربی صوبہ نے ۲ مئی ۱۸۳۷ء کو اس ضمن میں ایک اہم سرکلر جاری کیا، جس میں کہا گیا کہ "انگریزی اور مقامی زبانوں کی واقفیت کی بجائے یہ ضروری ہے۔ یوروپی اور کچھ باشعور ہندستانی افسران اول الذکر انگریزی زبان استعمال کریں گے جبکہ عوام سے رابطے کی زبان مؤخر الذکر ہندستانی ہوگی"[5]

شمالی مغربی صوبے کے محکمہ انصاف نے آغاز کار میں اس لسانی تبدیلی میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ صدر دیوانی عدالت نے اس ضمن میں سب سے پہلا سرکلر ۹ اپریل ۱۸۳۸ء کو جاری کیا کہ "تمام دیوانی امور سے متعلق روبکاروں، بحثوں اور تحریروں میں فارسی کی جگہ پر ہندستانی استعمال کی جائے اور اگر کوئی شخص کسی دستاویز کا فارسی ترجمہ بھی ساتھ داخل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے"[6]

شمالی ہندستان میں اس وقت فارسی کی جگہ لینے کی مستحق اگر کوئی زبان تھی تو وہ صرف اردو تھی، اردو نظم و نثر کی روایت کافی استوار تھی۔ فارسی سے تعلق اور تواتر کی وجہ سے عدالتی اور دفتری اصطلاحوں، ترکیبوں اور جملوں کا ایک وافر ذخیرہ اس میں موجود تھا۔ سرکاری اور مراسلاتی زبان بننے کے لیے اردو ہر لحاظ سے موزوں ترین زبان تھی۔ لیکن ایک طرف انگریزوں نے اسے اس کے معیاری اور مسلم نام "اردو" کے بجائے ہمیشہ "ہندستانی" کے مبہم نام سے موسوم کیا اور دوسری طرف اس کے مقابلے میں "ناگری" کا نام لیا۔ "ناگری" کسی زبان کا نام نہ تھا بلکہ ایک رسم خط کا نام تھا۔ شوؔر اور ڈکٹ جیسے اس کے انگلستانی حامی بھی اسے ہندستانی بخط ناگری سے پکارتے تھے۔ ترہٹ کے ضلع جج نے اسے ناگری کے علاوہ "ہندوی" کے نام سے موسوم کیا تھا جو یقیناً اردو معروف بہ ہندستانی ہی کا ایک اور نام تھا۔ ہندی والوں نے اپنی زبان کو ہندوی کے نام سے کبھی موسوم نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک ہندستانی بخط دیوناگری کے لیے "ہندی" کا نام وجود پذیر نہیں ہوا تھا حالانکہ پچیس تیس برس قبل فورٹ ولیم کالج میں گلکرسٹ اور اس کے رفقاء کی کوششوں اور کاوشوں سے کھڑی بولی بخط ناگری میں کچھ کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی تھیں لیکن اگلے ساٹھ ستر برسوں (۱۸۵۰ء سے ۱۹۰۰ء)

(بقیہ صفحہ ۶۹ پر)

---

[1] مشورات عدالتی امور (دیوانی) عدد مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۸۳۲ء [2] بحوالہ مراسلہ ۲۹ اکتوبر ۱۸۳۶ء منجانب مسٹر شور بنام سکریٹری محکمہ مال و انصاف، شمالی مغربی صوبہ، شمولہ روداد اجلاس لفٹننٹ گورنر و صدر بورڈ مال ۱۲ صفحہ ۱۳ ستمبر تا نومبر ۱۸۳۶ء [3] ایضاً [4] روداد اجلاس لفٹننٹ گورنر و صدر بورڈ مال ۱۸۳۶ء مورخہ ۲۹ جولائی تا اگست ۱۸۳۶ء [5] ایضاً [6] ارشش میجاریٹ کا ٹائزدیوانی ص ۱۳۰



شاداب لکھنوی

کچھ نہ مانا دل نثارِ حسنِ جانانہ ہوا
ایک اپنا رہ گیا تھا وہ بھی بیگانہ ہوا

آنسوؤں پر ختم سوزِ دل کا افسانہ ہوا
خاک سے پیدا ہوا تھا خاکِ پروانہ ہوا

چھوڑ کے پھولوں کو کانٹوں کو لگائے ہیں گلے
ہوش میں آیا تو سب کہتے ہیں دیوانہ ہوا

انقلاب ایسے بھی آئے ہیں ہمارے سامنے
دم زدن میں بستیوں کا نام ویرانہ ہوا

رند پیاسا ہو تو پیمانے کی کچھ قیمت نہیں
چھو گئے ہونٹوں کو میرے پیمانہ پیمانہ ہوا

دل کے اندر بس گئیں کچھ ایسی ایسی صورتیں
اچھا خاصہ گھر خدا کا اک صنم خانہ ہوا

اُن حسین لب کے تبسم کی قسم کھاتا ہوں میں
اک اشارہ آپ کا بدنام دیوانہ ہوا

سوچتے ہی سوچتے کٹتا گیا دورِ حیات
دیکھتے ہی دیکھتے لبریز پیمانہ ہوا

چاک ہیں سب کے گریباں اک میں تنہا نہ تھے
کس کو فرصت ہے جو پوچھے کون دیوانہ ہوا

کچھ نہ واعظ کہہ سکا اُچٹی اُن آنکھوں کا خمار
مارا اٹھا جب تو بے جام و پیمانہ ہوا

شہید آزادی

ڈاکٹر [illegible]

ہندستان کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا واقعہ ہے کہ جس آدمی کو پھانسی کی سزا سنائی جانے والی ہو، وہ انتہائی سکون اور یکسوئی کے ساتھ قید خانے کی کوٹھری میں بیٹھا ہوا اپنی آپ بیتی لکھتا رہے اور صرف اسے قلم بند ہی نہ کرے بلکہ اسے تین حصوں میں تقسیم کرکے قید خانے کی چار دیواری کے باہر بھی بھیج دے۔ برطانوی سامراج کی سختی کا اندازہ کرنا آج کے دورِ آزادی میں مشکل ہے۔ لیکن پھانسی کے قیدی پر کس قدر زبردست پہرہ رہتا ہے اس کا تصور یقیناً آسان ہے۔ اس پر ہر طرف سے ہر طرح کی نگرانی اور نگہبانی کا مضبوط انتظام ہوتا ہے۔ لیکن سب کی نگاہوں سے بچ کر حکومت برطانیہ کی سخت گیریاں اور آلام و مصائب برداشت کرکے انتہائی طمانیت قلب اور خاموشی کے ساتھ اپنی سوانح حیات کو مرتب کر لینا، جو آزادی کی تحریک کا ایک اہم باب ہے اس کی جرأت مندی، بلند حوصلگی، گہری حب الوطنی اور تائید غیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے!

اس طرح کی قوم و ملک کی حقیقی اور عملی محبت کا جذبہ پیش کرنے والے کو ہندستان کی تاریخ آزادی میں پنڈت رام پرساد بسمل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے —— رام پرساد بسمل کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں ہوئی تھی اور ۱۹۲۷ء میں وہ پھانسی کے تختے پر جھول گئے۔ اس طرح ان کی حیاتِ مختصر کل تیس سال کی تھی جس میں انھوں نے گیارہ سال احیاءِ ذہنیت کے گزارے کیونکہ انیس سال کی عمر کے بعد انھوں نے مادرِ ہند کی آزادی کی تحریک میں سرگرم طور پر حصہ لیا اور اپنی زندگی کے تیس سال پورے کرتے کرتے انھیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ ملک کی غلامانہ ذہنیت سے اس قدر پست اور ذلیل ہو گیا ہے کہ اب اس میں حریت اور غیرت کا جذبہ پیدا کرنا مشکل ہے۔ لیکن انھیں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنا نہ آتا تھا اور ان کا دل مادرِ ہند کی غلامی سے ہر وقت بے قرار اور مضطرب رہتا تھا۔ اس لیے اپنی زندگی کے گیارہ سال انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے وقف کر دیے اور وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ جسے ہندستان کی تاریخ آزادی کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

بسمل جرأت و بے خوفی، پامردی و جواں مردی کی ایک عملی مثال تھے۔ جب انھیں پھانسی کا حکم سنایا جا چکا تو بھی ان کے چہرے پر اضمحلال، پژمردگی اور ہراس نہیں تھا۔ بلکہ اس حکم نے ان کے جذبۂ وطنیت کو اور بھی مہمیز کیا۔ اور جب ۱۶ دسمبر ۱۹۲۷ء کو گورکھپور جیل میں انھیں پھانسی کا حکم ہوا تو اس واقعہ کو بھی انھوں نے اپنی آپ بیتی میں بخوشی تحریر کر دیا۔ اس وقت کی ان کی اس تحریر میں کوئی بھی ہیجان نظر نہیں آتا بلکہ اس میں کافی وقار، عزم اور سنجیدگی جھلکتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا ہے۔ یہی نہیں جب انھیں پھانسی کے تختے پر لے جایا جاتا ہے تو بھی اس پیکرِ صبر و استقلال کے پاؤں میں لغزش نہیں آتی اور وہ بڑی بہادری کے ساتھ ایک عاشق کی طرح اپنے گلے میں پھانسی کے پھندے کو "وندے ماترم" اور "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ لگاتے ہوئے ڈال لیتا ہے اور زیرِ لب تبسم کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار گنگنانے لگتا ہے: —

دل فدا کرتے ہیں قربان جگر کرتے ہیں
پاس جو کچھ ہے وہ ماتا کی نذر کرتے ہیں
خانہ ویران کہاں دیکھیے گھر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

بشکریہ [illegible]   اگر ا[illegible]

ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن کی بنیاد

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حکومت برطانیہ نے ہندوستانیوں پر طرح
طرح کے ظلم و جور ڈھانے شروع کر دیے اور اس بات کی کوشش میں
رہی کہ کسی نہ کسی طرح ان کے جذبۂ حریت کو پامال کر دیا جائے۔ اس
کانگریس میں "نرم دل" اور "گرم دل" دو طرح کے نظریات ابھر کر ہو گئے
"گرم دل" طبقے کے افراد انقلاب میں یقین رکھتے تھے اور "انقلاب زندہ باد"
ہندوستان میں سب سے پہلے انھیں بغاوت پسندوں نے بلند کیا۔ اس
"گرم دل" کے افراد انگریزوں کے لیے ایک کھلا ہوا چیلنج تھے۔ اس
نے "بندے ماترم" اور "بھارت ماتا کی جے" کے دو نعرے اپنی
علامت کے طور پر اپنائے تھے اور اس تحریک کا نام "ہندوستان
ری پبلکن ایسوسی ایشن" تھا جس کے بانی رام پرساد بسمل تھے۔ اس تحریک
کے اصول و ضوابط "پیلے کاغذ" کے نام سے مرتب کیے گئے تھے، جس میں
بغاوت پسند عناصر اور جدید باغیانہ رجحانات کے امتزاج سے ایک نیا
مرتب کر کے پیش کیا گیا تھا۔ جب کاکوری کا حادثہ پیش آیا اور پرانے
کی گرفتاریاں اور انھیں پھانسی کی سزائیں ہوئیں تو اس تحریک کی قیادت
آزاد اور سردار بھگت سنگھ کے ہاتھ آئی اور ان لوگوں نے تحریک
نام بدل کر "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن" رکھا۔ اس
تک ہندوستان میں سوشلسٹ پارٹی کی داغ بیل نہیں پڑی تھی اور
سوشلسٹ پارٹی کا وجود دستاویزی کاغذ پر بھی نہیں تھا۔ اس لیے یہ تحریک
۱۹۱۰ء کے علی پور جیل میں پستول نکال کر مخبر نریندر گوسوامی کا کام تمام
کرنے والے کنہائی لال کو پھانسی دی جانے سے لے کر ۱۹۲۶ء (کاکوری
تک کافی شدت اختیار کر چکی تھی اور سردار بھگت سنگھ کے قتل یعنی
۱۹۳۱ء کے بعد سے ۱۹۴۲ء تک پہنچتے پہنچتے یہ تحریک مدھم پڑ گئی
کانگریس تک نرم دل کا اثر بڑھتا گیا، جس سے شورش پسندی کے بجائے
جیسی تحریکات نے جڑیں پکڑ لیں۔

ماحول اور خاندانی حالات

ریاست گوالیار میں ... کے علاقہ کے نام سے ایک مقام
چنبل کے کنارے واقع ہے۔ وہاں کے باشندے بڑے دلیر اور
ہیں۔ ان پر حکومت برطانیہ اور مہاراج گوالیار کے دبدبہ کا بھی تک

بڑا پُراثر تھا۔ وہ جب بھی چاہتے چند دنوں میں اکٹھا ہو کر دریائے چنبل پار کر کے
میدانی علاقہ میں آ جاتے اور اپنی بہادری کا مظاہرہ کر کے اپنے مواضعات
میں واپس چلے جاتے تھے۔
اس علاقے کے افراد نے ایک بار مہاراج گوالیار کی فوج کے سانڈنی
اونٹ چرا کر چھپا دیے۔ اونٹوں کی گمشدگی پر کافی پریشانی اور دوڑ دھوپ
کی گئی۔ تلاش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آخر میں جب اس بات کا علم
ہوا کہ فلاں گاؤں میں اونٹ ہیں تو مہاراج گوالیار کو اس کی خبر دی
گئی۔ انھوں نے حکم دیا کہ یا تو وہ لوگ اونٹ واپس کر دیں یا وہ موضع
توپ لگا کر اڑا دیا جائے۔ گاؤں کے چاروں طرف توپیں لگوا دی
گئیں اور حکم پر عمل ہونے ہی والا تھا کہ کچھ بااثر لوگوں نے گفت
و شنید کا سلسلہ جاری کیا اور مہاراج کو مشورہ دیا کہ ایسے بہادر لوگوں
کو برباد کر دینا دانشمندی نہ ہوگی۔ مہاراج نے توپ دم کر دینے کے احکام
واپس لیے اور گاؤں والوں نے اونٹ واپس کیے۔
اس واقعہ کو بیان کرنے کا صرف اتنا مقصد تھا کہ بسمل جس علاقہ
کی پیداوار تھے اس میں کتنے دلیر، جیالے اور بہادر لوگ ہوتے تھے۔
جرأت و ہمت اس علاقے کی روایت ہے۔ ایسے بہادرانہ ماحول میں
اس طرح کے انقلابی رہنما کا پیدا ہونا کوئی زیادہ تعجب خیز نہیں ہے۔
خود بسمل کے دادا شری نرائن لال جی بھی بڑے ہی جیوٹ والے تھے۔
اس علاقے میں ان کی قوت و دلیری کا ہر شخص قائل تھا۔ لیکن کچھ عرصے
بعد خانگی معاملات میں تنازعہ پیدا ہو جانے کے باعث یہ اپنے وطن
سے مرلی دھر اور کلیان مل جی کو لے کر شاہجہاں پور آ گئے۔ یہاں
کچھ دنوں تک بہت ہی عسرت کی زندگی بسر کی، لیکن کچھ عرصے بعد
نرائن لال جی نے شاہجہاں پور میں ہی ایک عطار کی دوکان پر تین
روپیہ ماہوار پر نوکری کر لی تھی۔ اس زمانے میں قحط بھی پڑا تھا۔
اس لیے چاروں طرف اور بھی معاشی بدحالی کا دور دورہ تھا۔ گرانی
اگرچہ آسمان پر پہنچ چکی تھی، لیکن وہ اس قلیل رقم میں ہی گزر بسر کرتے
رہے۔ اس کا سہرا بسمل کی دادی کے سر تھا جو بڑی ہی سلیقہ مند اور منتظم
خاتون تھیں۔ وہ اس مختصر رقم میں بھی کسی نہ کسی طرح اپنے خاندان
والوں کو روٹی کھلاتی رہیں۔ خود آدھا پیٹ کھاتیں اور کبھی کبھی فاقہ بھی

روز جیو! اچھا اور ڈھیر سارا کھا کر زندہ جائیں، لیکن بچوں کے لیے چھت، جاوداں، جوتے وغیرہ کی مدد کا ضرور انتظام کریں۔ جب ان پر تاب نہ لا کر ان کے شوہر اُن وطن ہی کہہ کر "اس شدید زندگی کو اپنانے سے اچھا ہے کہ واپس گھر ہی چلی جائیں"، تو کبھی وہ واپسی کے لیے راضی ہوتیں اور بہت ہی پر عزم لہجے میں کہتیں کہ ——— "جب ایک بار کسی سے رشتہ توڑ چکے تو پھر اس کو قائم کرنا بزدلی اور بے غیرتی ہے ———"

یہ تھے وہ خاندانی حالات جن کے پس منظر میں بسمل پروان چڑھے۔ ان کی رگ رگ میں حمیت اور غیرت کا لہو دوڑ رہا تھا۔ اسی لیے خودداری کے تحفظ کے واسطے جان کی بازی لگا دینا آسان سمجھتے تھے لیکن غلامی کی قید و بند میں رہ کر ذلت کی زندگی بسر کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے برطانوی سامراج سے اپنی غیرت، شرافت، تہذیب، ثقافت اور عزت کا سودا کرنا کبھی بھی نہیں پسند کیا۔

بسمل کی پیدائش کا شرف شاہ جہان پور کو حاصل ہے۔ جب بسمل کی عمر سات سال کی ہوئی تو ان کی باقاعدہ طور پر تعلیم کا آغاز ہوا کیونکہ ان کے والد مرلی دھر جی کو تعلیم و تربیت کا بہت خیال رہتا تھا۔ اس وقت کی رسم کے مطابق رام پرساد جی کی بھی تعلیم کی ابتدا اردو، فارسی سے ہوئی۔ پھر وہ ہندی کی طرف رجوع ہوئے اور رفتہ رفتہ اچھی استعداد حاصل کرلی۔ کچھ عرصے بعد آریہ سماج کی تحریک سے متاثر افراد نے انھیں آریہ سماج کے نظریات سے واقف کرایا اور بسمل کٹر آریہ سماجی بن گئے، اگرچہ ان کے والد سناتن دھرم میں یقین رکھتے تھے۔ جب ان کے والد کو یہ علم ہوا تو انھوں نے رام پرساد بسمل کو بلایا اور سخت انداز میں تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ "تم یا تو آریہ سماج چھوڑ دو یا میرا گھر چھوڑ دو۔" رام پرساد بسمل نے اپنے اصولوں کی خاطر گھر کو چھوڑنا پسند کیا اور باپ کے گھر سے نکل کر گھر سے رخصت ہوگئے۔ وہ ایک سال بعد ان کے والد کو پتہ چلا [illegible] بسمل کو تلاش کر کے گھر لائے۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بسمل ایک بغاوت کی فطرت [illegible] کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ جس شخص نے اپنے اصول و نظریات کے لیے [illegible] نظریات کو ٹھکرا دیا [illegible] کر سکتا تھا۔

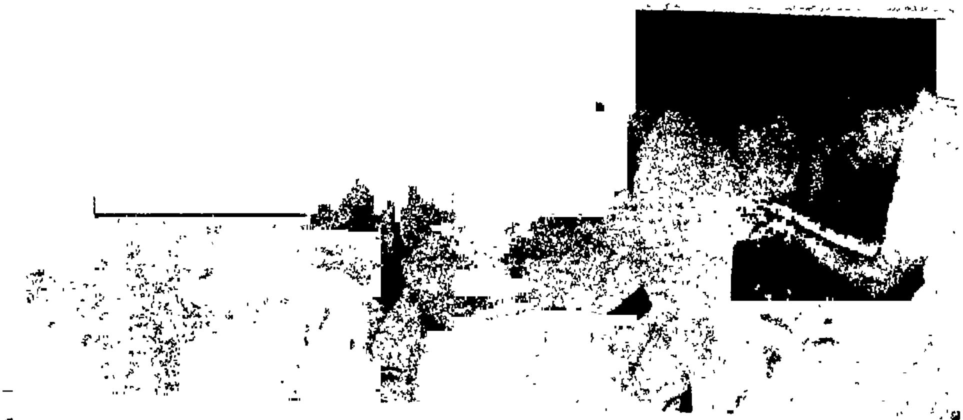
تحریک بغاوت کی ابتدا

اسی زمانے میں لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں کچھ ایسے بھی افراد شامل ہوئے تھے جو ملک میں منظم اور مسلح فوج کی تشکیل کر کے عملی طور پر بغاوت کے حامی تھے۔ انھوں نے ایک خفیہ اجلاس کا بھی اہتمام کیا تھا جس کا مقصد ایسے افراد سے رابطہ قائم کرنا تھا جو ان کے مقصد کی حمایت میں ہوں۔ جب بسمل کو اس طرح کے خفیہ اجلاس کی خبر ملی تو انھوں نے اس کو کامیاب بنانے کی جان توڑ کوشش کی، اور جب اس اجلاس کے سرگرم اراکین نے دیکھا کہ بسمل بہت ہی فرض شناس اور جذبے سے اس تحریک کی حمایت میں ہیں تو ان لوگوں نے انھیں باقاعدہ طور پر اس تحریک کا رکن بنا لیا۔ اس کمیٹی کو مالی دشواریوں کا سامنا تھا کیونکہ اس تحریک کو عملی صورت دینے کے لیے اسلحوں کی فراہمی کی ضرورت تھی۔ ان کے پاس پیسے اسلئے تو بہت ہی مختصر تھے۔ بسمل نے یہ رائے دی کہ ایک کتاب شائع کی جائے، اس سے جو منافع ہو اسے کمیٹی کے خزانے میں داخل کر دیا جائے اور اس سے اسلحوں کی خریداری کی جائے۔ کمیٹی کے اراکین نے کہا کہ لیکن کتاب کی اشاعت کے لیے روپے کہاں سے آئیں گے؟ کچھ دنوں اسی طرح فکرمند رہنے کے بعد بسمل کو ایک تدبیر سوجھی ——— انھوں نے اپنی والدہ سے کہا ——— "ماں! میں کچھ روزگار کرنا چاہتا ہوں جس میں اچھا منافع ہوگا، اگر آپ روپیہ دے سکیں تو بہت اچھا ہوگا۔" ماں کی ممتا نے جواب دیا کہ "بیٹا کل میرا ہاتھ بہت تنگ ہے، کسی طرح کا سامنا نہ کرنا پڑے اس لیے کچھ سوچ کر روزگار شروع کرنا ———" اتنا کہہ کر انھوں نے دو سو روپے دے دیے ——— اور بسمل نے "امریکہ کو آزادی کیسے ملی؟" نامی کتاب شائع کی۔ اس کی اشاعت کے وقت دو سو روپیوں کی ضرورت پڑی اور ان کی والدہ نے اس رقم کو بھی دیا۔ کتابوں کی جلدیں فروخت ہونا شروع ہوگئیں۔ اس کے منافع سے سو روپے کی پہلی قسط بسمل نے اپنی والدہ کو ادا کر دی۔ ابھی اس کتاب کا پہلا ایڈیشن فروخت ہونے کو باقی تھا کہ [illegible] تحریک کے سرگرم [illegible] قید کر لیے گئے اور صوبائی حکومت [illegible] کتاب کو بھی ضبط کر لیا [illegible] روپے کہاں سے [illegible] جائیں کہ زیادہ تعداد میں [illegible]



شری اکبر علی خاں

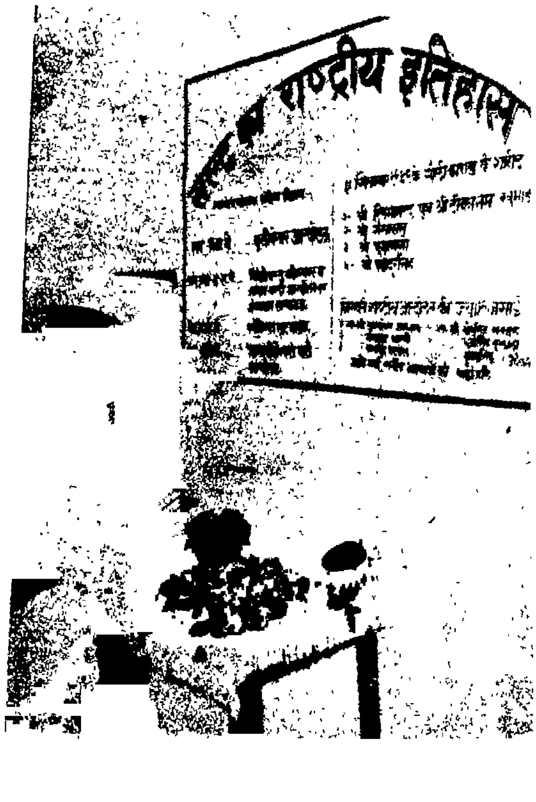
اتر پردیش کے گورنر کی حیثیت سے ۱۴ر نومبر ۱۹۷۲ء کو راج بھون میں حلف لے رہے ہیں



▲ گاندھی جینتی کے موقع پر تلک ہال کونسل ہاؤس لکھنؤ میں وزیراعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی بہترین خدمات کے لیے افسروں اور سرکاری ملازموں کو نقد انعام اور توصیفی سرٹی فیکٹ عطا کرتے ہوئے۔

(بائیں سے دائیں) شری جوگیندر سنگھ ٹرک ڈائیرکٹر پی. ڈبلو. ڈی، شری اے. این کول، ایس. ایس. پی. لکھنؤ، شری ڈی. ڈی جوشی ڈپٹی کمشنر لکھنؤ اور شری شری لال شکلا ڈپٹی سکریٹری





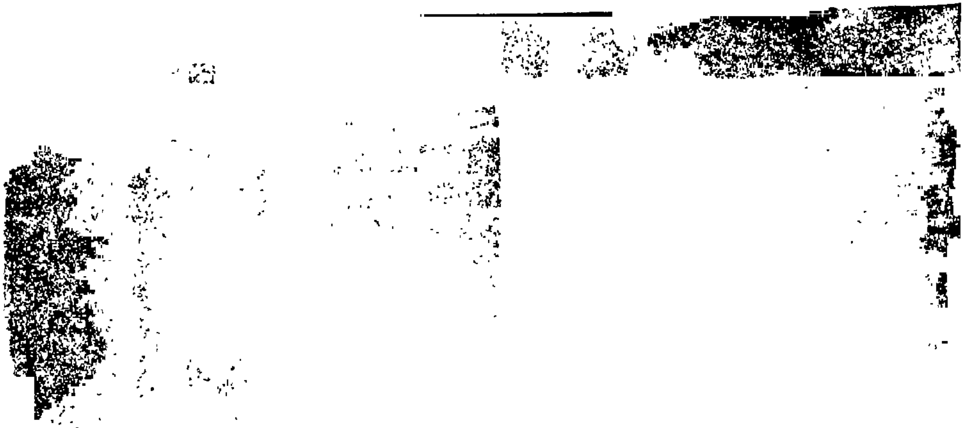
▶ وزیرمالیات
شری نرائن دت تیواری
سُلٹ (ضلع الموڑہ) میں شہیدوں کی
یادگار پر ان شہیدوں کو نذرانۂ عقیدت
پیش کررہے ہیں جو
۱۹۴۲ء کے
ہندوستان چھوڑو اندولن میں مادر وطن
پر نثار ہوئے تھے۔



علی شری کملاپتی ترپاٹھی ۱۵ رنومبر ۱۹۷۲ء کو سیتاپور میں پی۔اے۔سی کور کے مقابلے میں ۲۷ ویں بٹالین کے کپتان شری آر۔ایل۔پانڈے کو ٹیم چیمپین کی ٹرافی عطا کرتے ہوئے

۲

آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کی تقریبات کے سلسلے میں وزیر تعمیرات عامہ شری لکشمی شنکر یادو نو تعمیر جنہٹ۔ دیواسٹرک کا ۱۰ راکتوبر ۱۹۷۲ء کو افتتاح کرتے ہوئے۔





وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی نے آزادی کی ۲۵ویں سالگرہ کی تقریبات کے سال میں شروع کیے جانے والے ترقیاتی کاموں کے سلسلہ میں غازی پور کے دریائے گنگا کے مجوزہ پل کا ۲۶؍اکتوبر ۱۹۷۲ء کو سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔

جواہر جینتی کے موقع پر ۱۴؍نومبر ۱۹۷۲ء کو سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم میں یوم اطفال جوش و خروش سے منایا گیا۔ تصویر میں وزیر اعلیٰ شری ترپاٹھی یوم اطفال میں حصہ لینے والے بچوں اور بچیوں کی کامیاب زندگی کے لیے اپنی دلی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے۔



جا سکیں۔ بسمل نے بہت ہی کوششوں سے کچھ مزید بندوقیں وغیرہ اکٹھا کیں اور منصوبہ بند پروگرام کے تحت کاکوری ریلوے اسٹیشن پر سرکاری خزانہ کو لوٹنے کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ پھر ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا۔ اس جرم میں منجملہ دیگر لوگوں کے بسمل اور اشفاق اللہ خاں بھی گرفتار ہوئے اور برطانوی حکومت نے انھیں سخت ترین سزا دی اور ۱۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو انھیں پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا گیا۔ بسمل کی پھانسی کی خبر سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی اور ملک کے طول و عرض میں کھل کر رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ لاکھوں افراد نے متحد ہو کر "رام پرساد بسمل زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔ عورت مرد، بوڑھے، جوان اور بچوں نے "بھارت ماتا کی جے" اور "وندے ماترم" کے مخصوص نعرے لگائے، جس کے بسمل موجد تھے۔ سبھی نے ایک زبان ہو کر بسمل کا مندرجہ ذیل شعر دہراتے ہوئے گلے سے گنگنایا ؎

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

(۳)

بسمل بنیادی طور پر اردو کے طالب علم تھے، اس لیے اردو شاعری سے بھی انھیں فطری مناسبت تھی اور اسی خصوصی نسبت نے ان سے شعر بھی کہلوائے ہیں۔ درحقیقت ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو شعر و ادب کا اہم رول رہا ہے اور بسمل کے اشعار نے بھی اور حقیقی وطنی محبت کا ثبوت دیا ہے اس وقت کی آزادی کی ادبی فضا میں بسمل کے نغمے گونجتے رہتے تھے۔ لہٰذا بسمل کی شاعری ایک تاریخی اہمیت کی مالک ہے۔ جب ۱۹۲۷ء میں ماں بھارتی کے سپوتوں کو پھانسی کی سزا ملی تو وہ پھانسی کے تختے پر بسمل کے مندرجہ ذیل اشعار والہانہ عقیدت سے گنگنا رہے تھے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے ... دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
بے پرواہ محبت رہ نہ جانا راہ میں ... لذت صحرانوردی دوری منزل میں ہے
آج مقتل میں یہ قاتل کہہ رہا ہے بار بار ... اب بھلا شوقِ شہادت بھی کسی کے دل میں ہے
وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں ... ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اے شہیدِ ملک و ملت ہم تیرے اوپر نثار ... اب تری ہمت کا چرچا غیر کی محفل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ ... ایک مٹ جانے کی حسرت بس دلِ بسمل میں ہے

یہ وہی لوگ تھے جو ان مردوں میں سے تھے جو کاکوری کے واقعہ میں پھانسی کی سزا سنائے جانے کے بعد بھی آزادی کے گیت گاتے تھے۔ عدالت سے باہر زمین پر بیٹھ کر جھوم جھوم کر گایا تھا اور ان کے عزم و استقلال کو دیکھ کر عدالت کو تعجب ہوا تھا۔

اس وقت کے رسائل اور اخبارات میں بسمل کا کلام شائع ہوتا تھا۔ "پربھا"، "اور" "رام" نامی ماہنامہ رسالوں میں ان کی تخلیقات مسلسل شائع ہوتی تھیں لیکن افسوس ہے کہ انتہائی تلاش و تحقیق کے بعد بھی ان کی نظمیں دستیاب نہیں ہو سکی ہیں۔ اس لیے ان کا مکمل کلام اہل نظر کے سامنے نہیں آ سکا ہے۔ ایک مختصر انتخاب کلام پیش خدمت ہے۔

مٹ گیا جب مٹنے والا پھر سلام آیا تو کیا ... دل کی بربادی کے بعد ان کا پیام آیا تو کیا
کاش اپنی زندگی میں ہم یہ منظر دیکھتے ... یوں سرِ تربت کوئی محشر خرام آیا تو کیا
مٹ گئیں جب سب امیدیں مٹ گئے سارے خیال ... اس گھڑی پھر نامہ بر لے کر پیام آیا تو کیا
اے دلِ ناکام مٹ جا آج کس یاس میں ... پھر میری ناکامیوں کے بعد کام آیا تو کیا

آخر شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم گر چہ کوئی بالائے بام آیا تو کیا

ہم شہیدانِ وفا کا دین و ایماں اور ہے ... سجدے کرتے ہیں ہمیشہ پاؤں پر جلاد کے

ہے بہر فنا میں جلد یا رب لاش بسمل کی ... کہ بھوکی مچھلیاں ہیں جوہرِ شمشیر قاتل کی

وفا پر دل کو صدقے جان کو نذرِ جفا کیجیے ... محبت میں یہ لازم ہے کہ جو کچھ ہو فدا کیجیے

مجھ کو پھونک کر دل کو اسکو دے داغِ ناکامی ... بہت کچھ غربتوں میں آباد اس تیرے بے دلیں

مالک تری رضا رہے اور تو ہی تو رہے ... باقی نہ میں رہوں نہ میری آرزو رہے

جب تک کہ تن میں جان رگوں میں لہو رہے ... تیرا ہی ذکر اور تری جستجو رہے

کیا ہی لذت ہے کہ رگ رگ سے یہ آتی ہے صدا ... دم نہ لے تلوار جب تک جان بسمل میں رہے

(بقیہ صفحہ ۲ پر)

پاکستان سے خطاب

شعور بریلوی

بتائیں مصر مکرم مجھے یہ بعد سلام
کہ یہ کہاں کا ہے طرز و طریقۂ اسلام
کیا ہے درہم و برہم جو زندگی کا نظام
ہمارے خلق و محبت کا ہے یہی انعام
سمجھ میں آیا نہ بھارت سے دشمنی کا سبب
بلا وجہ تو مناسب نہیں یہ غیظ و غضب
یہی زمین تمہاری بھی جنم داتا ہے
اسی زمیں کی فضاؤں نے تم کو پالا ہے
اسی زمیں پہ کبھی بچپنا گذارا ہے
اسی زمیں پہ تمہارا شباب آیا ہے
وہی زمیں جہاں اگتے تھے آرزو کے چمن
وہی زمیں جہاں بہتے ہیں سندھ گنگ و جمن
اسی وطن پہ کبھی تم بھی فخر کرتے تھے
دم اس کی عظمت و حرمت کا تم بھی بھرتے تھے
ترانے گاتے تھے اس کے جہاں گذرتے تھے
نہ بھولو اس کے تقدس پہ تم بھی مرتے تھے
کہاں چھپاؤ گے اقبال کے ترانے کو
مذاق اڑانے کا موقع نہ دو زمانے کو

رہیں جو پیشِ نظر امن و آشتی کے اصول
ہم آپ سے ہوں کبیدہ نہ آپ ہم سے ملول
یہ عصر نو ہے حریصانہ ذہنیت ہے فضول
یہ دشمنوں کی ہیں چالیں انھیں نہ کیجیے قبول
یہ ایک مشورۂ نیک ہے اگر مانیں
مگر نہ اس کو کہیں آپ بزدلی جانیں
منافرت کا نتیجہ تمھیں نہیں معلوم
مآل ظلم و جفا کیا تمھیں نہیں معلوم
شعار حب وطن کا تمھیں نہیں معلوم
ہمارا فرض ہے کیا کیا تمھیں نہیں معلوم
ہم اس زمیں کے تقدس پہ سر کٹا دینگے
پہاڑ راہ میں آئیں تو ہم ہٹا دینگے
کریں جو آپ بھی شملہ معاہدے پہ عمل
فضائے امن ہو قائم تو مسئلے ہوں حل
بگڑ چکے ہیں جو حالات خود ہی جائیں سنبھل
تو دونوں دیشوں میں کھل جائیں آرزو کے کنول
جفا شعاروں کی سازش جو کامیاب نہ ہو
تو پھر جہاں میں ہمارا کوئی جواب نہ ہو

ستشا کی زندگی ایک خواب پریشاں کی طرح ہو گئی تھی۔ وہ دن کتنے خوشگوار تھے جب وہ صبح جاگ جانے کے باوجود سوتی بنی رہتی حتیٰ کہ اس کے ڈیڈی پہنچ آ دیں بیٹے پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے تب کہیں وہ اٹھا کرتی۔ اسے ان کی پیار بھری نازبرداریوں میں لطف ملتا تھا جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔

اُس منحوس دن بھی سویرے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی مگر وہ حسبِ عادت انتظار کرتی رہی کہ ڈیڈی آئیں تو اٹھے۔ مگر جب دیر تک ڈیڈی نہیں آئے تو ناامید ہو کر اور کچھ جھلا کر وہ خود ہی اٹھ بیٹھی اور سیدھی ان کے کمرے میں جا پہنچی۔ ڈیڈی کا چہرہ اترا اترا سا تھا پھر بھی انھوں نے ستشا کو دیکھا تو مسکرانے لگے۔

"آپ کی طبیعت خراب ہے کیا؟ آج آپ مجھے جگانے بھی نہیں آئے۔"

"ہاں بیٹی آج کچھ تکلیف ہو گئی ہے۔ تمہاری ممی سے جگانے کے لیے کہا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ تم بے خبر سو رہی ہو تو میں نے منع کر دیا۔ کوئی گہری نیند سو رہا ہو تو اسے آرام کرنے دینا چاہیے۔"

ستشا نے انکی پیشانی چھو کر دیکھی وہ بالکل ٹھنڈی ہو رہی تھی جیسے برف۔

"آپ کو بخار تو نہیں معلوم ہوتا۔ سر میں درد ہے کیا؟ لائیے دبا دوں" منع کرنے کے باوجود وہ دھیرے دھیرے ان کا سر سہلانے لگی جیسے وہ اس کو جگانے کے لیے سہلایا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر آئے۔ کچھ نئی دوائیں تجویز کیں اور یقین دلایا کہ اس کے ڈیڈی جلد اچھے ہو جائیں گے۔

وہ جب تک ان کے پاس بیٹھی رہی بہر شخص بالکل خاموش تھا۔ اس سکوت سے اسے وحشت ہونے لگی کہ اتنے میں اس کی آیا نے اسے اشارے سے بلا کر کہا کہ "چلو ناشتہ کر لیجیے۔"

کھانے کی میز تک وہ بادلِ ناخواستہ پہنچی تھی کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ آیا نے بتایا کہ سب لوگ ناشتہ کر چکے ہیں۔ اسے تعجب ہوا کہ آج اتنی جلدی ناشتہ کیسے ہو گیا۔ کسی نے اس کا انتظار بھی نہ کیا۔ اس کے ڈیڈی کبھی ایسا نہیں کرتے تھے اور شام کو آفس سے لوٹ کر تو وہ اسے دم بھر کو بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔

اُس دن ستشا کھیلنے کے لیے باہر نکلی (اس کا جی نہ لگا) وہ بار بار گھر لوٹ آتی تھی۔ کسی نہ کسی طرح دن کٹ گیا۔ رات کو وہ بستر پر لیٹی تو اسے بے اختیار رونا آ گیا اور وہ روتے روتے ہی سو گئی۔

دوسرے دن سویرے وہ اٹھی تو عجیب طرح کا شور تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ چپ چاپ ڈیڈی کے کمرے کی طرف بڑھی۔ جاتے میں اسے خیال آیا کہ وہ سوئٹر نہیں پہنے ہے ڈیڈی ناراض ہوں گے۔ وہ لوٹ کر سوئٹر تلاش کرنے لگی۔ بیماری کی حالت میں وہ انھیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ڈیڈی کے کمرے میں خلافِ معمول بہت سے رشتے دار جمع تھے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ڈیڈی اپنا چہرہ چادر سے ڈھکے ابھی تک سو رہے ہیں۔ ستشا ان کے پلنگ کے قریب جانے لگی تو اس کو منع کر دیا گیا۔ وہ اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔ ڈیڈی نے ابھی کل ہی تو اسے بتایا تھا کہ کوئی گہری نیند سو رہا ہو تو اسے جگانا نہیں چاہیے آرام کرنے دینا چاہیے۔ وہ گہری نیند سو رہے ہیں تبھی تو اسے قریب جا کر جگانے سے روک دیا گیا۔ شام کو اسے بتایا گیا کہ اس کے ڈیڈی کو ڈاکٹر صاحب نے تبدیلیِ آب و ہوا اور علاج کے لیے دور بھیج دیا ہے اور علاج کے لیے وہ انھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

ان کے چلے جانے کے بعد وہ ان کا انتظار کرتی رہی سب سے پوچھتی رہی کہ اس کے ڈیڈی کب آئیں گے۔ کوئی بھی اس کے سوال کا جواب نہ دے پاتا آخر ایک دن اسے بتایا گیا کہ اس کے ڈیڈی کا تبادلہ کہیں بہت دور ہو گیا ہے اور وہ جلدی نہیں آ سکیں گے۔

شروع شروع میں کئی دن اس کی ممی نے اسے جگایا لیکن اس نے انھیں یہ کہہ کر منع کر دیا کہ وہ خود ہی سویرے اٹھ جایا کرے گی۔

اب دن کسی طرح کاٹے نہ کٹتا۔ وہ صبح سے شام تک پورے گھر میں بھٹکتی پھرتی۔ کوئی سہیلی آ جاتی تو خیر ورنہ اسے کسی کا انتظار نہیں رہتا تھا۔ شام کو ایک ماسٹر صاحب آ جاتے تھے جن کی ٹھوڑی غائب تھی۔ وہ اس کے اسکیل سے بار بار قمیص کے اندر سے اپنی پیٹھ کھجایا کرتے تھے۔ ماسٹر صاحب کی اس حرکت سے اسے چڑ تھی۔ ان کے جانے کے بعد اسے اسکیل اٹھاتے ہوئے کراہت محسوس ہوتی۔ یہ ماسٹر اس کے ڈیڈی سے کتنے مختلف تھے ہر وقت ناک بھوں چڑھی ہوئی۔

اکثر راتوں کو وہ اپنے ڈیڈی کو خواب میں دیکھتی اور ہر بار یقین کر لیتی کہ پچھلی بار کی طرح یہ خواب نہیں ہے اس کے ڈیڈی سچ مچ واپس آ گئے ہیں اور اب اسے چھوڑ کر کہیں نہ جائیں گے۔ اس کے گزرے ہوئے پرمسرت دن ایک بار پھر لوٹ آئے ہیں۔

صبح اب پہلی سی صبح نہیں رہ گئی تھی۔ وہ بے رحمی کے ساتھ اس کا سکون درہم برہم کر دیتی تھی۔ اب اسے گھر سے بھی الجھن ہوتی تھی۔ اس کا زیادہ وقت قریب کے ایک تالاب کے کنارے گزرا کرتا تھا۔ اس تالاب میں ایک پتھر کا ستون گڑا ہوا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ کبھی کوئی بنجارا یہیں کہیں آس پاس اپنا خزانہ دفن کر کے نشاندہی کے لیے یہ پتھر نصب کر گیا ہے۔

تالاب کے کنارے کہیں سے روز ایک بگلا سویرے ہی آ جایا کرتا تھا۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ طوطے والی کہانی کی طرح کسی جادوگر نے اس بنجارے کو کہیں بگلا تو نہیں بنا دیا ہے۔

اسے اب اپنا خزانہ کبھی نہیں مل سکتا پھر بھی بے چارا یہاں آس لگائے دن دن بھر کھڑا رہتا ہے

برسات کے بعد جب تالاب کا پانی ذرا کم ہو جاتا تو اس پتھر کے قریب پہنچنے کا ایک پتلا سا راستہ ابھر آتا۔ دوپہر کو جب ہر طرف سناٹا چھا جاتا تو وہ اس پتھر کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔

تالاب کی چھوٹی چھوٹی لہریں جب ایک جانب سے دوسری جانب تیزی سے بھاگتی ہوئی سامنے سے گزرنے لگتیں تو اسے محسوس ہوتا جیسے وہ جگہ جہاں وہ بیٹھی ہوئی ہے ایک کشتی کی طرح چل پڑی ہے اس احساس سے اسے بڑی آسودگی ملا کرتی تھی۔ وہ زندگی سے فرار کی خواہاں تھی۔

جوانی میں قدم رکھنے کے بعد بھی فرار کی خواہش جوں کی توں قائم رہی۔ اس کے دل کے سونے پن میں کوئی فرق نہ آیا۔ آخر کار انیل نے اسے جینا سکھا دیا۔ وہ کیا چاہتی ہے کیا نہیں، اسے کیا پسند ہے کیا ناپسند؟ یہ سب ایک معمہ بن گیا وہ سب کچھ چاہتی تھی اور کچھ بھی نہیں، اسے سب پسند بھی تھا اور ناپسند بھی۔

غم اور عارضی سکون کی دھوپ چھاؤں میں وقت بے پاؤں گزرتا رہا۔ بے کیفی کے اس دور میں انیل نے اس کا ساتھ دیا۔ اور کچھ نہیں تو اس کے احساس تنہائی میں کچھ کمی ضرور واقع ہو گئی۔

انیل نے اس کو الجھے ہوئے خیالات کی دنیا سے باہر نکال لیا جہاں وہ ریشم کے کیڑے کی طرح پناہ گزیں تھی پھر بھی کوئی چیز اس کے اور انیل کے درمیان دیوار کی طرح استادہ تھی۔ انیل اس کی دل جوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا پھر بھی سشما کو ہر دم ایک گمنام سی خلش کا احساس ہوا کرتا۔ انیل سے مل کر اسے سکون تو ملتا مگر یہ بڑا عارضی ثابت ہوتا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ سوچنے لگتی کہ انیل چلا جائے اور اسے اسکے حال پر چھوڑ دے تو اچھا ہو۔

آخر ایک دن انیل چلا گیا اس کو کہیں دوسرے شہر میں نوکری مل گئی تھی۔ ایک عرصے تک خط و کتابت جاری رہی پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ سشما کو اس سے تکلیف پہنچی یا نہیں یہ بھی اس پر ٹھیک سے واضح تک نہ ہو سکا اس کے بعد ایک مدت تک اس نے تنہائی میں بےشمار خواب دیکھے۔ وہ ایک تصویر بناتی پھر خود ہی اس کو مٹا بھی ڈالتی اسی دوران ایک ایسی تصویر بنی جو منفرد اور دلکش تھی۔

شیش سے اس کی باقاعدہ ملاقات ایک کلب میں ہوئی جہاں اس دن نئے سال کے استقبال میں جشن منایا جا رہا تھا۔ ان

کے پیچ و خم کو اور بھی نمایاں کرنے کے لیے اس پر فراخدلی سے پاؤڈر چھڑکا گیا تھا تاکہ رقص کرتے ہوئے جوڑوں کے قدم موسیقی کی تیز سے تیز دھنوں پر بھی اپنے جوہر دکھا سکیں اور جسم بے پروا ہو کر جھک سکیں، سمٹ سکیں، لہرا سکیں۔

سنشا نے سادہ سی ہلکی نیلی ساڑی پہن رکھی تھی اور اسی رنگ کی بندی بھی لگائی تھی۔ لپ اسٹک کا رنگ بھی کھلتا ہوا نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے یہاں آنے کی تیاری بڑی بے دلی سے کی ہو۔

"تم جاؤ" اس نے ایک گوشے میں رکتے ہوئے اپنی سہیلی سے کہا۔ "قدرے آتی ہوئی آرکسٹرا کی آواز بہت پیاری معلوم ہو گی۔ میں کچھ دیر یہیں بیٹھوں گی۔" وہ کسی خیال میں غرق بیٹھی تھی کہ تشیش پھرتا پھراتا ہاں آ نکلا۔ ... میں سرسری دو ایک ملاقاتیں پہلے بھی ہو چکی تھیں اور کسی حد تک اجنبیت دور ہو چکی تھی۔

"تم سب سے الگ تھلگ کیوں بیٹھی ہو، اندر کیوں نہیں گئیں؟" تشیش نے اس سے پوچھا۔

"یہاں سکون ہے، اندر بھیڑ بھاڑ سے الجھن ہوتی ہے۔"

"میں خود بھی پرسکون جگہ کی تلاش میں تھا۔ تم کو اعتراض نہ ہو تو میں بیٹھ جاؤں۔"

"ضرور بیٹھو، مگر تم ڈانس میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔"

"اس طرح کی تفریحی فرصتیں مجھے پسند نہیں۔ آؤ بلیرڈ روم کے پاس والے کمرے میں چل کر بیٹھیں وہاں اور بھی عافیت ہو گی۔"

اس کمرے میں شور برائے نام پہنچ رہا تھا۔ آرکسٹرا کی دھیمی دھیمی لَے کے ساتھ بلیرڈ کی گیندوں کے ٹکرانے کی آواز تھوڑی تھوڑی دیر بعد شامل ہو جاتی تھی۔ خالی میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں کسی بجھے ہوئے سگریٹ کا دھواں چھت کی جانب بلند ہو رہا تھا۔ ہوا کے جھونکے سے دھوئیں کی یہ کمزور لکیر کانپ کانپ جاتی تھی۔

"تم تنہا کیوں بیٹھی تھیں؟"

"یونہی" سنشا نے تشیش کے سوال کا جواب دیا۔

"تنہائی میں تمہارا جی نہیں گھبراتا؟"

"نہیں ... مجھے تنہائی پسند ہے۔"

"میں مخل تو نہیں ہو رہا ہوں؟"

"نہیں تو۔"

"تنہائی پسند لوگوں میں تخلیقی صلاحیتیں بھی ہوا کرتی ہیں۔"

"مجھ میں کوئی صلاحیت نہیں ہے۔"

"تعجب ہے۔ خیر اس موضوع کو چھوڑو کل نیا سال شروع ہو گا۔ آؤ ہم بھی اس کا استقبال کریں۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ہر نئے سال کا استقبال کیا کریں۔ اس سے بھی کہیں کوئی فرق پڑتا ہے؟"

"نہیں ضروری تو نہیں لیکن کیوں نہ زندگی کے ہر موڑ پر ہم کسی بہانے تھوڑا سا خوش ہو لیا کریں۔ اس میں آخر حرج ہی کیا ہے۔"

"لیکن ہمارے اختیار میں کچھ ہو تب نا؟ کیا ہم سب وقت کے اس سیل رواں پر خشک پتوں کی طرح نہیں ہیں؟ لہروں کے تھپیڑے ہمیں جدھر چاہتے ہیں لے جاتے ہیں۔ ان کے زیر و بم پر ابھرتے ڈوبتے گھومتے چکراتے ایک دن کہیں گم ہو جائیں گے۔"

"تم تقدیر پرست ہو گئی ہو کیا؟"

"اور تم؟"

"میں کچھ بھی نہیں۔ ایک تھکا ہارا انسان ہوں۔ کبھی گھنٹوں مستقبل کا سراغ لگانے کے لیے تاش کے پتوں کو اپنے سامنے پھیلا کر ان کی پیش کردہ تعبیریں دیکھا کرتا ہوں۔ مستقبل کی یہ جھلک کبھی یاس انگیز ہوتی ہے کبھی امید افزا۔ جب تک جی چاہتا ہے یہ کھیل کھیلتا رہتا ہوں زندگی کے رنگا رنگ روپ دیکھتے دیکھتے جب اکتا جاتا ہوں تو بند کر دیتا ہوں۔ خدا جانے بے بس ہوں یا صاحب اختیار۔"

سنشا بالکل خاموش کسی سوچ میں ڈوبی رہی۔

"آج کی تقریب میں تم کوئی حصہ لینا نہیں چاہتیں تو دو لو کچھ دیر میرا ساتھ دے سکتی ہو پھر چلی جانا۔ یہاں ہم اس وقت تک رکیں گے جب تک گھڑی کے گھنٹے بج کر نئے سال کے آغاز کا اعلان نہ کر دیں۔ اس وقت چپ چاپ کھڑا ہو کر سوچوں گا کہ خدا سے آخر کیا مانگوں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کبھی دکھ نظر آنے لگتا تھا کبھی اطمینان سا۔ انجام کو دیکھ رہی

ہوگی۔ تم جاؤ۔ میں کل بھی میں تمہارا انتظار کروں گا۔" شتیش نے اٹھتی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

دوسرے روز شتیش کا چہرہ پچھلے دن کے مقابلے میں بشاش تھا۔

"تم آج بہت خوش ہو" سشما نے اس سے پوچھا۔

"میری شکل ہمیشہ بسورتی ہوئی نہیں رہی"

"کیا میری شکل بسورتی ہوئی ہے؟"

"اور نہیں دیکھا۔ اتنے دنوں میں میں نے تم کو صرف ساڑھے پانچ بار مسکراتے ہوئے دیکھا ہے"

"یہ ساڑھے پانچ کا کیا مطلب ہے؟"

"ایک بار تم مسکرانے کا محض ارادہ کر کے رہ گئی تھیں اس کا نصف شمار ہوگا۔"

سشما ہنس پڑی۔ شتیش نے کہا۔ "کل میرا جی چاہ رہا تھا کہ کلب میں جو لوگ مسرت کی تلاش میں جھوٹے قہقہے لگاتے ہیں ان سب کو چمگادڑوں کی طرح الٹا لٹکا دوں صرف دو کو چھوڑ کر"

"کس کو، کس کو؟"

"ایک تم کو، ایک بلیرڈ روم کے مارکر کو جو ہنسنے سے ایک منٹ پہلے پورا منہ کھول لیا کرتا ہے اور ہنس چکنے کے بعد ایک منٹ تک کھولے رکھتا ہے۔ اس دنیا میں اتنے اہتمام سے ہنسنے والے کی ہمیں قدر کرنا چاہیے۔ آج تم آگئی ہو اس وجہ سے میں بہت خوش ہوں یہ سن کر تم جھوٹ موٹ شرما جاؤ۔ تمہیں بھولی بھالی بننے کا اچھا موقع مل گیا ہے۔ ہر عورت سوچتی ہے کہ وہ شرماتے وقت بہت بھلی معلوم ہوتی ہے"

"اور تم یہ سوچتے ہو کہ گھوڑے کی طرح منہ لٹکا کر سنجیدہ بننے کی کوشش کرتے ہوئے تم بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہو"

"آج کے دن بھی وہی تو تو میں میں ہو جائے تو غنیمت گزر جانے دو نا" شتیش نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

مزاج کی یکسانیت نے دونوں کو جلد ہی ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ شتیش کے ساتھ نے سشما کو بہت کچھ دیا تھا لیکن کبھی کبھی صحبت اس کی یاسیت اس کو بچھاڑ چھوڑتی۔ وہ سوچا کرتی کہ وہ بے مطلب ہو گئی ہے۔ تنہائی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی اور کسی کا ساتھ بھی اسے غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس کی ہنسی اور آنسو گڈمڈ ہو کر ایک ناقابل برداشت بوجھ بن گئے ہیں۔ اس کا کیا علاج ہے۔ اگر کبھی وہ یہ سوچنے لگتی تو اس کے ذہن پر گہرا اکھڑا چھا جاتا جس میں کچھ تلاش کرنا بے سود ہوتا تھا لیکن خیالوں میں وہ ابھی بیٹھی تھی کہ شتیش آ گیا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" اس نے آتے ہی دریافت کیا۔

"کچھ نہیں۔ دماغ خود بخود سوچنے لگتا ہے۔ تنہائی میں تم بھی اسی طرح سوچا کرتے ہوگے"

"ہاں سوچتا تو میں بھی ہوں"

"کیا سوچتے ہو بتاؤ"

"میں سوچتا ہوں کہ تم مجھے بھلا تو نہ دوگی؟"

"عورت اپنا پیار کبھی نہیں بھلا سکتی"

"یہ تو بہت گھسی پٹی بات ہے۔ مگر عورت اپنا پہلا پیار سب سے آخر میں کیا کرتی ہے" شتیش نے ہنستے ہوئے مذاقاً کہا۔

"اور مرد کی محبت لافانی ہوتی ہے؟" سشما نے طنزاً کہا۔ "مرد صرف اپنی ذات کی پرستش کیا کرتا ہے اور اپنے ہی دل پر بھینٹ چڑھانے کے لیے سارے اہتمام کرتا ہے۔ کسی کو ٹھکرا کر مسرت حاصل کرتا ہے، کسی کو خوشی کی تلاش میں سجدے کیا کرتا ہے۔ اس کا ہر عمل خود اس کی اپنی ذات پر ایک احسان ہوتا ہے"

"آج پھر تم پر وحشت کا دورہ پڑا ہے"

"مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑا۔ کیا تم اس وقت مجھ کو میرے حال پر چھوڑ دوگے؟"

"تم کہتی ہو تو ضرور چلا جاؤں گا"

"ہاں چلے جاؤ۔ ابھی چلے جاؤ" سشما کا دل بھر آیا تھا وہ سسکیاں لے کر رونے لگی تھی۔

"ارے، ہو گئی ہو کیا؟ تمہاری کوئی حرکت میری سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے۔ تم جتنی دیر بھی چاہتا ہے خوش رہتی ہو پھر خلاف ... (باقی صفحہ ...)

عہد سیمیں

— [illegible]

نوبہار وادی گنگ و جمن چہک اٹھی
شعاع نور سے ارض وطن چمک اٹھی

فصیل شب کے جھروکوں سے صبح آزادی
چمکتی جھومتی گاتی ہوئی اتر آئی
چمن چمن سے بہاروں کے قافلے لے کر
نشاط روح کے سامان رنگ و بو لائی
نزاکتوں کا وہ عالم کہ دیکھتے رہیے
لطافتوں کی وہ شبنم کہ پھول پھول نکھار
حیات عشق کی خاطر کھلے ہیں باب جنوں
حجاب ناز نے بخشی ہے جرأت دیدار

نفس نفس طراز ہے ہر لمحہ جشن سیمیں کا
نگاہ دیکھ رہی ہے رنگ عہد زریں کا

نسیم وقت نے ہلکی سے رہ گزار حیات
نشاط و کیف کا پیغام دے رہی ہے سحر
دلوں میں مشعل آزادی وطن روشن
ہجوم شوق سے رقصندہ کائنات نظر
فراز کوہ ہمالہ ہے باعث تعظیم
کہ آج مشرق و مغرب ہیں جس کے زیر اثر
سفیر فن نے جسے بارہا سلامی دی
مرے وطن کا محافظ خدائے فتح و ظفر

چلو کہ آج زمانے کو ہم نوا کر لیں
یہ نام ہند محبت کی ابتدا کر لیں

وطن کے عزم سے ہے یہ وقت کا حسین آنچل
ہوا کے دوش پہ اڑتے ہیں امن کے بادل
دعا ہے جس سے مہکتے ہیں حیات نو کے لیے
ہر ایک منزل ہو روشن ہر ایک شام و سحر
ہمیشہ وطن کے لالہ و گل سے ہم کنار رہے
گلوں کے آب سے مہکیں ستاروں سے سجیں
نفس نفس میں رہے تازگی بہاروں کی
نشاط راہ ہیں ہند کے ستاروں کی

(شملہ معاہدے کی روشنی میں)

— شباب کیرتپوری

بتاؤ ایسا نشیمن کہ شاہکار رہے
نگاہ برق پڑے بھی تو شرمسار رہے
قدم اٹھانے سے پہلے ہے خیال اس کا
معاہدہ جو ہوا ہے وہ برقرار رہے
چراغ امن بجھا دیں گے یہ غرور و غرض
جو ان کی چالوں سے ہم تم نہ ہوشیار رہے
خلوص دل سے جو جمہوریت کے سانچے میں
تم اپنے دیش کو ڈھالو تو اقتدار رہے
چمن تو خیر چمن ہی ہیں لطف تو جب ہے
خزاں نصیب گلستاں میں بھی بہار رہے
دیکھو لو امن کی بستی ہی دلیل بخشی ہے
اسی پہ ملک کا ملت کا انحصار رہے
کہا یہ ایک حقیقت یہ بنگلہ دیش بھی ہے
مگر وہ بات کہ ماحول خوشگوار رہے
سبھی نے اس کو سراہا اور اس سے پیار کیا
مگر [illegible] کہ اعتبار رہے
بڑھاؤ ہاتھ کہ ہم ان سے بھی دوستی کر لیں
یہی ہے شان کہ وہ بھی سدا بہار رہے
رہے نہ کام اجالوں ہی سے شباب ہمیں
اندھیری راتوں سے بھی دل کو تیرے پیار رہے

ایشیا ۷۲

فن تعمیر میں

ادارہ

ہندوستان میں ۳ نومبر سے تیسرے ایشیائی عالمی تجارتی میلے کا آغاز ہو گیا ہے۔ فن تعمیر کے لحاظ سے ایشیائی میلہ بھارتی نمائشوں کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ ہے۔ یہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ بھارت کا فن تعمیر اپنی پابندگی اور پختگی کے لحاظ سے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ ملک میں پہلی مرتبہ ایک مستقل نمائش گاہ کی تعمیر بھارت کو تجارتی میلوں کی بین الاقوامی انجمن کی رکنیت کا مستحق بنا دیتی ہے۔

ایک سو ساٹھ ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی ایشیا ۷۲، نمائش کے لیے جگہ کی فراہمی کا ایک اہم مسئلہ تھا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے نمائش کی موجود جگہ کا انتخاب کر کے یہاں پہلے کی بنی ہوئی متعدد تعمیرات کو زمیں بوس کیا گیا اور موجودہ مستقل نمائش گاہ تعمیر کی گئی۔ اس جگہ اس سے قبل بھارتی صنعتوں کا میلہ، زرعی میلہ، دہلی کی صد سالہ تقریبات اور کلکتہ کے مکانوں کی نمائش اسی مقام پر لگائی گئی تھیں۔

ایشیا ۷۲، کی مرکزی تعمیرات چالیس ایکڑ رقبہ زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ نمائش کی باقی عمارتیں اس کے چاروں طرف تعمیر کی گئی ہیں۔ نمائش میں داخل ہونے کے چار دروازوں میں سے تین مرکزی عمارتوں سے براہ راست جڑے ہوئے ہیں۔ مرکزی عمارتوں کا کمپلیکس "ہال آف نیشنز"، "ہال آف انڈسٹریز" اور "تفہیم پویلین" پر مشتمل ہے۔ ہال آف نیشنز بلند ترین عمارت ہے جس کی تعمیر میں بعض نئی تعمیراتی تکنیکیں بھارت میں پہلی مرتبہ بروئے کار لائی گئی ہیں۔

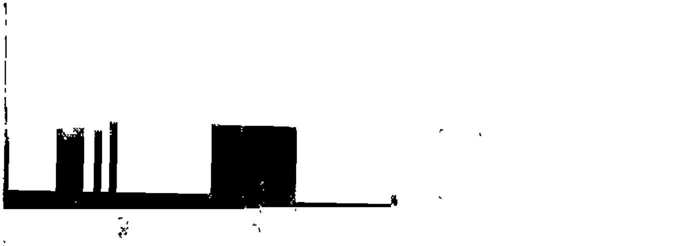
ہال آف نیشنز ۲۵۴ فٹ × ۲۵۶ فٹ رقبے میں تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک سو دو فٹ بلند عمارت ہے جو دیواروں اور ستونوں کے سہارے کے بغیر تعمیر کی گئی ہے۔ یہ اہرام کی شکل کی ایسی عمارت ہے جسے وسط ہی میں سطح کر دیا گیا ہے۔ دراصل یہ ساری عمارت آر۔سی۔سی کے سہ رخی فریم والے ڈھانچے پر کھڑی کی گئی ہے۔

ہال کے اندر دیگر اُن کی تکنیکی گیلری پویلین کی چوڑائی ۵۰ فٹ ہے۔ اس کی اونچائی دس فٹ سے نوے فٹ تک ہے تاکہ طیارے، ارتھ موونگ مشینری اور دیگر طویل الجثہ مصنوعات کی بآسانی اور خاطر خواہ نمائش کی جا سکے۔ پوری عمارت آر۔سی۔سی کے سو فٹ طویل ستونوں پر مشتمل ایک چھت ہے۔ اپنی قسم کی پہلی عمارت ہونے کے سبب ماہرین تعمیرات اور انجینئروں نے اپنے تخمینوں اور حساب کتاب کی صحت کو جانچنے کے لیے ایک کمپیوٹر کی بھی مدد لی۔

ہال آف انڈسٹریز، ہال آف نیشنز کے قریب ہی تعمیر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس عمارت کا ڈیزائن اسی جیسا ہے لیکن یہ نسبتاً چھوٹے پیمانے پر بنائی گئی ہے۔ یہ تین ستونوں پر مشتمل ہے اور اس کا فرشی رقبہ ۱۵۰ فٹ × ۱۵۰ فٹ ہے۔ یہ عمارت ۶۰ فٹ اونچی ہے۔

دیگر مستقل تعمیرات میں تفہیم پویلین، ایک سینما ہال زیر تعمیر، ایک ریستوراں اور ایک کھلا ہوا چوک ہے۔ یہ سب اسی کمپلیکس کے حصے ہیں۔ تفہیم پویلین میں دو بڑے آڈیٹوریم ہیں جن میں کمپیوٹروں پر مبنی سماعی و بصری ذرائع سے بھارت کی دور جدید میں داخل ہونے کی کہانی بیان کی جائے گی۔ سینما گھر میں چار سو افراد کے لیے جگہ فراہم کی گئی ہے۔

گیٹ نمبر دو کے نزدیک ایڈمنسٹریشن بلاک کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ یہ ساری عمارت جو کہ ملک میں اپنی قسم کی پہلی عمارت ہے،



نئی دہلی کے تیسرے ایشیائی بین الاقوامی تجارتی میلہ کا ایک منظر

پوری طرح آر سی سی کے کھمبوں کے سہارے کھڑی ہے۔

میلہ میں شرکت کرنے والے ممالک

ایشیا:- میلہ میں ۵ براعظموں کے ممالک حصہ لے رہے ہیں ان براعظموں کے نام ہیں ایشیا، افریقہ، یورپ، شمالی اور جنوبی امریکہ اور اشنیا۔ میلہ میں شرکت کرنے والے ممالک کے نام یہ ہیں:

ایشیا:- (۱) افغانستان (۲) بنگلا دیش (۳) بھوٹان (۴) برما (۵) انڈونیشیا (۶) عراق (۷) جاپان (۸) ری پبلک آف کوریا (۹) کویت (۱۰) ملائیشیا (۱۱) نیپال (۱۲) عوامی جمہوریہ منگولیا (۱۳) فلپائن (۱۴) سری لنکا (۱۵) عمان (۱۶) ترکی اور (۱۷) تھائی لینڈ

افریقہ:- (۱) الجیریا (۲) گھانا (۳) کینیا (۴) لیبیا (۵) موریشس (۶) سوڈان (۷) تنزانیہ اور (۸) زمبیا

یورپ:- (۱) آسٹریا (۲) بلجیم (۳) بلغاریہ (۴) سائپرس (۵) چیکوسلوواکیہ (۶) جرمنی کی وفاقی جمہوریہ (۷) فرانس (۸) جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک (۹) ہنگری (۱۰) اٹلی (۱۱) پولینڈ (۱۲) رومانیہ (۱۳) اسپین (۱۴) سویڈن (۱۵) روس اور (۱۶) یوگوسلاویہ

شمالی اور جنوبی امریکہ:- (۱) برازیل (۲) کناڈا اور (۳) پیرو

اوشینیا:- (۱) آسٹریلیا (۲) فجی اور (۳) نیوزی لینڈ

پویلینوں کے ڈزائن

غیر ملکی پویلینوں میں سب سے زیادہ جاذب نظر آسٹریلیا، جمہوریہ کوریا اور کناڈا کی پویلینیں ہیں۔ آسٹریلیا کی پویلین کے سامنے کے حصے پر ایلومنیم کی چادریں جڑی ہوئی ہیں جو نومبر کے روشن دنوں میں خوب چمکے گا۔ اس کے علاوہ جمہوریہ کوریا کی پویلین مخروطی شکل کی ہے اور اس کی ایلومنیم پوشش ہے۔

بغیر کھڑکیوں والی بیضوی شکل کی دو منزلہ کینیڈا کی پویلین اپنی مثال آپ ہے۔

جاپانیوں نے اپنی پویلین کو ڈھکنے کے لیے کرپ کا استعمال کر کے اپنی جدت طرازی کا اظہار کیا ہے۔ یہ مستطیل نما ہے اور سادہ چند ستونوں پر قائم ہے۔ نمائش علاقے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے ایک پتلی سی نہر ہے جس پر جاپانی طرز کے تین خوبصورت پل بنائے گئے ہیں۔

سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے ممالک نے جو بڑے پیمانے پر شرکت کر رہے ہیں، اپنی پویلینوں کی تعمیر کے لیے بکس نما ڈھانچے استعمال



کیے ہیں۔ ہنگری کی پویلین ایک استثنا ہے جو کام چلاؤ اور تجارتی انداز پر تعمیر کی گئی ہے۔

متعدد سرکاری اور پبلک پویلینوں کی ڈیزائن سازی اور تعمیر میں کافی غور و فکر، جان فشانی اور ندرت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ انڈین اسٹیل پویلین اس کی امتیازی مثال ہے۔ وہ شاندار گنبدوں کی شکل کی ایس پویلین میں داخلے کے لیے جو راستہ بنایا گیا ہے وہ بھی فن تعمیر کے لحاظ سے کافی دل کشی رکھتا ہے۔

جہاز رانی اور نقل و حمل کی پویلین تیرتے ہوئے جہاز کی یاد دلاتی ہے۔ اس کا بیرونی نارنجی رنگ کے سیل کلاتھ سے چھپا دیا گیا ہے۔ ٹریڈ ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی پویلین کو ایک نئے اہرام کی شکل دی گئی ہے۔ شہری ہوا بازی کی پویلین، ایگار ڈن، یا گلس اڑیان کی ایک جدید ترین تعمیر ہے جو فضائی سفر میں اعتماد اور تحفظ کے تصور پر مبنی ہے۔

بیوی الیکٹریکلز پویلین کا ڈیزائن اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کامیاب ہے یعنی بجلی اور انجینیری کا بھاری ساز و سامان۔ اس میں تین تعمیرات ہیں۔ دو واٹر ٹربائینیں ہیں جو ایک باندھ کے ذریعے ایک دوسرے سے علیحدہ کی گئی ہیں۔

پرائیویٹ سیکٹر نے خود کو پوری طرح "اچھا" کے پویلینوں کی تیاری کا اہل ثابت کیا ہے۔ بہت سی فرموں نے اپنے پویلینوں کے ڈیزائن کے لیے نمایاں شہرت رکھنے والے ماہرین تعمیرات کے خدمات حاصل کیے ہیں۔ ایک فرم نے بالکل نئے انداز کا ایک پویلین تیار کیا ہے جو چاند پر خلائی اسٹیشن کے مشابہ ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لیے ایک کونے میں ایک راکٹ رکھ دیا گیا ہے۔

مجرہ انسر ۱۹۶۲ء ارشک

ایک اور فرم نے ایک مخروطی پویلین تیار کیا ہے۔ یہ عام انداز کے پویلینوں سے ہٹ کر اس طرح بنایا گیا ہے کہ پویلینوں کے عام شرائط پورے نہیں کرتا۔ یہ ایک تالاب کے گرد عام سطح زمین سے تھوڑا اوپر ایک راستہ معلوم ہوتا ہے۔

ریاستی پویلین فنِ تعمیر کے مختلف نمونوں کا امتزاج پیش کرتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر ریاست کے فنِ تعمیر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پنجاب اور ہریانہ نے چنڈی گڑھ کے طرزِ تعمیر کو سامنے رکھ کر تعمیر کی جدید ترین طرز کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ جنوبی ریاستوں میں میسور نے روایتی انداز سے ہٹ کر اپنا پویلین تیار کیا ہے۔ میسور کا پویلین ہشت پہل ایک عمارت ہے اور اس کی چھت بغیر کسی سہارے کے قائم ہے۔

کارکنوں کی اہمیت

اس ایشیائی بین اقوامی تجارتی میلے کے لیے تعمیراتی کام انجام دینے والے کارکن ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں، جنھوں نے اس عظیم الشان اور زبردست پروجیکٹ کو مثالی مدت میں مکمل کرنے کے لیے اپنے دن رات ایک کردیے۔ یہی وجہ ہے کہ میلے کی تمام تعمیراتی تقریبات میں انھیں وزرا اور اعلیٰ سرکاری افسروں پر فوقیت حاصل رہی۔ ترقیاتی کام کے آغاز کا اعزاز اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے قصبے کے رہنے والے ایک سیدھے سادے مزدور شری بھگوتی پرساد کو حاصل ہے۔ انھوں نے ایک ڈلیا مٹی جو ان کی بیوی اپنے سر پر ڈھو کر لائی تھیں ایک نشیبی مقام پر ڈالی اور اس طرح ترقیاتی کام شروع ہوگیا۔

نمائش گاہ کی تعمیری تقریبات کے موقع پر جو سادگی اور مقصدیت سے بھرپور تھیں نہ تقریریں کی گئیں اور نہ ہی فیتہ کاٹنے کی رسم ادا کی گئی۔ شاید روایتی لال فیتہ شاہی کو ختم کرنے کا یہ سب سے بہترین طریقہ تھا۔

بھارت کی آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ۱۵ اگست کو دس برس کی عمر سے بھی کم کے ایک لڑکے اور ایک لڑکی نے میلہ گاہ میں قومی جھنڈا لہرایا۔ ان کے والدین اس پروجیکٹ میں کام کرنے والے غیر ہنرمند مزدور ہیں۔

طرح طرح کی آوازوں اور مشینوں کے شور و غل کے درمیان تعمیراتی کام اسی طرح جاری رہا جیسے کہ کہیں اور ہوتا ہے۔ میلے گاہ میں گزشتہ دس مہینوں کے دوران ۴۲ بچے پیدا ہوئے۔ مختلف تعمیراتی سرگرمیوں میں مصروف لگ بھگ ۲۰ ہزار عورتوں اور مردوں کی زبردست تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد شاید زیادہ نہیں ہے۔

پہلے پانچ بچوں کی ولادت پر میلے کے حکام نے ہر ایک کے والدین کو دو دو سو روپے پیش کیے جبکہ اگلے سات نومولود بچوں کو سو سو روپے حاصل ہوئے۔ نومولود بچوں کے اعزاز میں پرشکوہ ہال آف نیشنز میں ۱۹ جولائی کو ایک خصوصی تقریب منعقد کی گئی۔

میلے کا جس دن افتتاح ہوا، نومولود بچوں میں سے ایک چھ ماہ کا ہوگیا تھا۔ یہ ۲۲ سالہ مادھو سنگھ اور اس کی بیوی امرتی کا بیٹا ہے۔ یہ بچہ ۲ اپریل کو پیدا ہوا تھا اور اس کا نام ایشیا سنگھ رکھا گیا ہے۔ اس کی ہندی عرفیت ...

غیر ملکی پویلینوں کی خصوصی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کچھ کارکن غیر ممالک سے بھی آئے ہیں۔ آسٹریلیا کی پویلین میں لکڑی پر نقاشی کرنے کے لیے لگ بھگ ایک درجن چینیوں کو سنگاپور سے لایا گیا ہے۔ کچھ روسی کارکنوں نے سوویت پویلین کی تعمیر میں جو کہ دیگر غیر ملکی پویلینوں میں سب سے بڑی ہے، اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

اس پروجیکٹ کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک لاکھ پچاس ہزار مربع میٹر زمین کو مسطح کیا گیا ہے، لگ بھگ ایک لاکھ مربع میٹر رقبے پر کنکریٹ کی چھت ڈالی گئی ہے، ۱۵ ہزار ٹرکوں میں عمارتی سامان نمائش گاہ تک پہنچایا گیا ہے، اس کے علاوہ خاص طور پر تعمیر کی گئی ریلوے لائن پر ویگنوں کے ذریعے جو سامان لایا گیا اس کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔

فولاد کی سپلائی کم تھی اس لیے اس کا حاصل کرنا کبھی کبھی ایک شدید مسئلہ بھی بن گیا۔ دلی میں موجود ہندستان اسٹیل لمیٹیڈ کا سارا ذخیرہ بھی ایشیا ۷۲ کی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ اس ذخیرے میں سے فولاد کا ایک بھی ٹکڑا گزشتہ اگست اور ستمبر میں دیگر لوگوں کے ہاتھ فروخت نہیں کیا گیا۔

مرکزی کابینہ نے اگرچہ اس میلے کی منظوری جنوری ۱۹۷۰ء میں دے دی تھی لیکن انجینیرنگ سے متعلق کام جولائی ۱۹۷۱ء تک جاکر مکمل ہوا۔ اس کی وجہ سے تعمیراتی کام کو پورا کرنے کے لیے بمشکل ایک سال کا وقت ملا۔

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر ہے)

غزل

[illegible]

کچھ تو دنیائے تمنا کو سجایا جائے
ورقِ دل پہ کوئی نقش بنایا جائے

ان کی پلکوں پہ ستارے ابھر آئے تھے جہاں
پھر اسی موڑ سے افسانہ سُنایا جائے

حُسن کا کوئی مقابل نہ مماثل نہ بدل
کیسے آئینہ کو آئینہ دکھایا جائے

تیرگی وقت کی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
اب چراغوں میں لہو دل کا جلایا جائے

عشرتِ زیست کے ساحل سے تو کچھ بھی نہ ملا
غم کے طوفاں سے ہی اب ربط بڑھایا جائے

یوں تو ہم شام و سحر چلتے رہے ہیں لیکن
سوئے منزل تو قدم کوئی بڑھایا جائے

وادیِ ذہن میں کچھ دن سے اندھیرا ہے قمر
فکر کی جوت کو اب کیسے جگایا جائے

قطعات

متین فتح پوری

ماحول میں آلودہ ہے، رنجور ہے انسان
خود اپنے ہی افکار میں محصور ہے انسان
چاہے تو بدل سکتا ہے تقدیرِ زمانہ
اس قوتِ تسخیر سے معمور ہے انسان

قسمت نے ستم کئے ہیں اکثر
تنہائی میں رو لیے ہیں اکثر
غیروں کا گلہ عبث ہے اے دل
اپنوں ہی نے دکھ دیے ہیں اکثر

بے سود امید کامرانی
دو دن کی بہارِ شادمانی
بے کار جہاں سے لو لگانا
ہر چیز یہاں کی آنی جانی

کلی کلی کی زباں پر اسی کا نام رہا
اسی کی یاد میں کھلنا گلوں کا کام رہا
قرار دہر میں کہاں عشق کے مقدر میں
ازل سے گلشنِ ہستی کا یہ نظام رہا

آدمی آدمی کے کام آتا
سب کے لب پر ترا ہی نام آتا
تیرے لطف و کرم سے اے ساقی
بزمِ رنداں میں دورِ جام آتا

عشاق کا طریقۂ آہ و فغاں الگ
لطفِ زباں کے ساتھ ہے طرزِ بیاں الگ
جو بات دل سے نکلی وہ دل میں اتر گئی
ان صاحبانِ دل کے ہیں تیر و کماں الگ

[illegible] اٹک

مزاحیہ

شادی خانہ آبادی

سلیم مقصود

کسی نے شادی کو "پھانسی کا پھندا" کہا، کسی نے ایک ایسا "قلعہ" کہا کہ جس میں داخل ہو جانے والے باہر نکلنے کی اور باہر والے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری بیگم صاحبہ اگر ہمیں اجازت دیں تو ہم بھی کچھ کہیں۔ آخر ہم بھی اس تجرباتی دور سے گذر رہے ہیں۔ ہمیں بھی کچھ کہنے کا حق ہے۔ ہم شادی کے متعلق ایک ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جسے ساری دنیا سمجھ جائے لیکن ہماری بیوی نہ سمجھ سکیں، ورنہ مصیبت یہ ہوگی کہ وہ چونکہ علم ریاضی کی گریجویٹ ہیں، شروع کر دیں گی کہ ہماری شادی کو کتنے سال کتنے ماہ، کتنے ہفتے، کتنے دن، کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈ ہوئے ہیں۔ اس دوران انھوں نے ہمارے گھر آ کر کتنی خوشیاں اور کتنے غم اٹھائے ہیں۔ خوشیوں اور غموں میں بالتہمیشہ تناسب معکوس رہے گا یعنی غم ہمیشہ خوشیوں سے زیادہ ہی رہیں گے۔ غرض بیگم صاحبہ تو کن ہڑتال "شروع" کر دیں گی۔ اس پر بھی اگر ہم نے چپ سادھ لی تو دوسرے دن "یوم احتجاج" منایا جائے گا۔ یوم احتجاج میں عدم تعاون (NON-CO-OPERATION) اور بائیکاٹ بھی شامل رہیں گے۔ بچے جب دیکھیں گے کہ دونوں میں سمجھوتے کی کوئی صورت نہیں نکلتی تو وہ فوراً دونوں کا گھیراؤ کر دیں گے۔ نتیجتہً ہمیں ایک دن کی "ہنگامی چھٹی" (CASUAL LEAVE) لینا پڑے گی۔ فریقین میں سمجھوتے کی کوششیں شروع ہو جائیں گی۔ چند بچے ہماری طرف چند بیگم صاحبہ کی طرف اور کچھ غیر جانبدار ہو جائیں گے۔ گھر اچھا خاصا یو۔ این او بن جائے گا۔ بچے جو غیر جانبدار رہیں گے وہی "ثالث" کے بھی فرائض انجام دیں گے۔ اس طرح صلح ہو جائے گی بیگم صاحبہ ہمیشہ کی طرح وہی ایک سوال دہرائیں گی "اگر آپ کو مجھ سے کوئی تکلیف ہے تو آپ کوئی دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" ان کا یہ "انکار طلب" سوال سن کر ہم کسی فرمانبردار اور سعادت مند ظلم زدہ شوہر کی طرح دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں گے ؎

چھوڑ کے تیرے پیار کا دامن
تو ہی بتلا دے ہم کدھر جائیں

شادی کے بعد بیچارہ شوہر علی الحساب کئی بار مرتا ہے۔ مثلاً پہلی بار اس وقت جب بیگم صاحبہ اپنا گھونگھٹ الٹ کر پلو کمر سے کس کر جملہ حقوق "اپنے نام کر لیتی ہیں۔ دوسری بار اس آن جب بیگم صاحبہ جلوۂ کثرت اولاد" دکھانے لگتی ہیں۔ علیٰ ہذالقیاس۔

دنیا کے تقریباً ہر عقلمند آدمی نے شادی کی مخالفت کی ہے اور دنیا کا تقریباً ہر عقلمند آدمی ہی اچھا اور سعادت مند شوہر ثابت ہو سکا ہے ہر عقلمند آدمی زندگی میں ایک بار شادی کر کے ضرور بے وقوف بنتا ہے اور بعض عقلمند تو بار بار بے وقوف بنتے رہتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ ہر سال اپنی اس بے وقوفی کی سالگرہ بھی بڑے شاندار پیمانے پر مناتے ہیں۔ شادی میں سوائے آپ کی مرضی کے، سب کی مرضی اہم سمجھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات پڑوسیوں اور نوکروں سے بھی اس سلسلے میں مشورہ لے لیا جاتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تاکہ آئندہ پڑوسی کسی قسم کی شکایت نہ کر سکیں اور اس طرح ہمیشہ کے لیے ان کا منہ بھی بند ہو جائے۔

شادی کی دو بڑی قسمیں ہیں (۱) ایک تو والدین کی پسند کی شادی اور (۲) دوسری اپنی پسند کی شادی یعنی "لو میرج"۔ والدین کی پسند کی شادی میں آپ کو فائدہ یہ ہے کہ آپ زندگی بھر والدین کو کوس سکتے ہیں اور شادی کے بعد ہونے والی تمام باتوں کا ذمہ دار والدین کو ٹھہرا سکتے ہیں۔

لیکن "لومیرج" میں بیوی سے آپ کا راست یعنی (DIRECT)مقابلہ رہتا ہے۔ (ویسے عوام الناس کے لیے "لومیرج" میں زیادہ عبرت ہے) لو میرج کی ابتدا فلم سے ہوتی ہے اور فلم پر ہی ختم ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہمارے ایک دوست نے "لومیرج" فلم دیکھ کر لومیرج کی اور "طلاق" فلم دیکھ کر اپنی بیوی کو جو ابتداً محبوبہ تھی طلاق دیدی۔ فلم زدہ لڑکے لڑکیاں فلمیں دیکھ دیکھ کر شادی کرتے ہیں اور فلموں کی طرح ان کی زندگی بھی "فلاپ" ہو جاتی ہے۔

شادی سے پہلے آدمی شادی کے بارے میں آزادی سے لکھ سکتا ہے لیکن شادی کے بعد جب وہ کافی تجربہ کار ہو جاتا ہے تو اس کی لکھنے اور کچھ کہنے کی آزادی سلب کرلی جاتی ہے۔ اس لیے ہماری شادی سے متعلق بہت سی چیزیں سینۂ راز میں رہ گئیں۔ ہمارے اس دوست کی طرح جس کی شکل شادی کے بعد کسی نے بھی نہیں دیکھی خدا خیر کرے۔ ؎

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

آفس میں ہم نے یہ آزما کر دیکھا ہے کہ "شادی شدہ" حضرات بآسانی بڑے صاحب کی گھڑکیاں سہہ جاتے ہیں۔ ایک بات اور' شادی کے بعد آپ کی بیوی کو آپ کے سوا دنیا کی سب عورتوں کے شوہر اچھے معلوم ہونگے کیونکہ وہ اپنی بیویوں کی فرمائشیں پوری کرتے ہونگے، بیگم صاحبہ کے لیے ناشتہ تیار کرتے ہونگے، بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہونگے، جس قدر شوہر "الو کے پٹھے" ہوں گے آپکی بیوی اسی قدر اُن کی تعریف کریگی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے آپکی بیوی یہ چاہتی ہے کہ لوگ آپ کو عقلمند سمجھیں لیکن شادی کے بعد وہ چاہتی ہے کہ آپ عقل استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ شادی کے بعد عقل استعمال کرنے کے بہت ہی کم مواقع نکلتے ہیں۔ ویسے شادی کی بعد والی زندگی کے لیے آپ کی عقل کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ آپ کو اپنی بیوی کی "ناقص عقل" کے سہارے زندگی گذارنا پڑتی ہے۔ اس لیے یہ خانہ خالی ہی رہے تو مناسب ہے۔ عورت آپکی عقل کو اپنی "سوکن" سمجھتی ہے۔ عورت کو زبان نہ دی جاتی تو بیچارے شوہر کے لیے عقل استعمال کرنے کے کافی مواقع نکل سکتے تھے لیکن، شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ اس لیے شادی کے بعد عورت کی زبان کو کچھ اور "طوالت" عطا کر دی جاتی ہے

یورپ اور جاپان کی عورتوں نے مردوں کو نیچا دکھانے کے لیے ہتھیار رکھنے اور "جوڈو" کے داؤ پیچ سیکھنے شروع کر دیے ہیں۔ وہاں کے مردوں کے لیے یہ انتہائی تشویشناک خبر ہے۔ ان کے کانوں پر جوں ضرور رینگنی چاہیئے لیکن ہماری عورتوں کو ہتھیار رکھنے یا "جوڈو" سیکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ ان کے پاس ایک مرد زبان ہے جو دنیا کے ہر ہتھیار سے مہلک اور زہریلی ہے۔ لیکن بعض عورتیں ایسی بھی ہیں جو زبان اور داؤ پیچ دونوں سے لیس ہیں۔ مثلاً ہماری پڑوسن جس نے ایک بار مار مار کر اپنے شوہر کو بے ہوش کر دیا تھا۔ ہم نے فوراً وہ مکان خالی کر دیا کیونکہ اس پڑوسن کا ہمارے ہاں بھی آنا جانا تھا۔ ہماری بیگم صاحبہ اس میں کچھ دلچسپی بھی لینے لگی تھیں۔ اب ہم جس مکان میں ہیں اس سے ملے ہوئے مکان میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ شادی کے بعد پہلی بار ہماری "انا" کو اس منظر سے تسکین پہنچی ہے۔ اپنی بیوی صاحبہ کے کافی اصرار کے باوجود بھی ہم جیتے جی اس مکان کو چھوڑنے پر تیار نہیں۔ ہماری بیگم صاحبہ پر اس ماحول کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ اب انھوں نے اپنی زبان کو کم اور آنکھوں کو زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔

کسی فلاسفر نے کہا ہے۔ "آپ اپنے آپ کو ان لوگوں میں سمجھیے جنھیں بعض اوقات بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔" غالباً یہ بات اس دانشور نے شادی کے بعد کہی ہوگی۔ جسے کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا اسے بیوی ضرور بے وقوف بنا دیتی ہے۔ وہ لطیفہ تو آپنے سنا ہی ہوگا کہ ایک بڑے ہی وضعدار اور عقلمند قسم کے کسی صاحب کا ننھا بچہ گدھے پر بیٹھنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ ان صاحب نے بہت چاہا کہ بچہ یہ نامعقول فرمائش ترک کردے لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ بچہ آخرکار رونے لگا۔ ان کی بیوی سے دیکھا نہ گیا۔ بیوی صاحبہ نے شوہر نامدار سے فرمایا۔ "تھوڑی دیر کے لیے پشت پر بٹھا لیجیے نا! بچہ بہل جائے گا۔"

ہمارے ایک دوست صاحب جو اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہیں۔ ایک دن فرمانے لگے: یار آج کل میں بہت ہی ایڈونچر سے بھر پور یعنی مہم جویانہ واقعات سے پُر خواب دیکھ رہا ہوں۔" ہم نے پوچھا "وہ کیسے؟" کہنے لگے "آج کل میں خوابوں میں کبھی یہ دیکھتا ہوں کہ اپنی مسز کو بری طرح ڈانٹ رہا ہوں۔ وہ ہاتھ جوڑے میرے آگے کھڑی ہیں۔ کبھی یہ دیکھتا ہوں کہ میں انھیں سر دابنے کے لیے کہہ رہا ہوں اور وہ سر داب رہی ہیں۔ کبھی یہ دیکھتا ہوں کہ میری پرچھیں میں بطور خود ٹرسپیکتا ہوں وہ کانپنے لگتی ہیں۔"

(بقیہ صفحہ ۔۔ پر)

گیہوں کی کھیتی

سبز انقلاب

کی طرف قدم

انددجیت لال

ہندوستان میں بونی قسم کے گیہوں کی کاشت زمانہ قدیم سے کی جارہی ہے اس وقت سے جب کہ سندھ وادی کی تہذیب کا زمانہ تھا "ٹریٹی کم سپیروکوکم" قسم کے بونے گیہوں کے بیج موہن جوڈارو کی کھدائی سے دستیاب ہوئے ہیں۔ جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بونی قسمیں اس زمانے میں بھی مقبول تھیں۔ لیکن اس کے بعد یہ قسمیں گوشہ گمنامی میں چلی گئیں اور سیکڑوں سال تک ان کی تاریخ ہندوستان کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ البتہ ہندوستان نے دس بارہ سال پہلے یہ محسوس کیا کہ خوراک کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے ایسی قسموں کو از سر نو اس ملک میں مقبول کیا جائے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس کی داستان یوں ہے:

انڈین ایگریکلچرل انسٹیٹیوٹ نے جسے عام طور پر پوسا انسٹیٹیوٹ کہتے ہیں سنہ ۱۹۶۳ء میں محسوس کیا کہ ہندوستانی گیہوں کی قسموں سے جو پیداوار حاصل ہو رہی ہے۔ اسے آبپاشی کے ذریعہ کاشت کرکے اس سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کے لئے "نورن جین" والی گیہوں کی بونی قسموں کی کاشت ضروری تھی۔ چنانچہ ہندوستان نے راک فیلر فاؤنڈیشن سے کہا کہ ہندوستان میں ایسی قسموں کے بیج بھیجے جائیں۔ وہ کسی ماہر سے کہا کہ ڈاکٹر این۔ ای۔ بورلاگ (جنھیں گیہوں کے موضوع پر دو سال ہوئے نوبل پرائز مل چکا ہے) کو ہندوستان بھیجا جائے۔



ڈاکٹر بورلاگ سنہ ۱۹۶۳ء میں ہندوستان آئے اور انھوں نے ہندوستان کے گیہوں پیدا کرنے والے علاقوں کا دورہ کیا۔ گیہوں کی چار بونی اور نیم بونی قسموں کا ایک ایک سو کلوگرام بیج اور ان کے علاوہ ۶۱۳ قسموں کے پیکٹ حاصل کیے گئے۔ اس بیج کو دلی، لدھیانہ، پوسا، کانپور، پنت نگر، بھووالی اور ولنگٹن میں بویا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے پودوں کی نشو و نما کا مطالعہ کیا گیا۔

سنہ ۱۹۶۴ء میں میکسیکو سے "لرما روہو" اور "سونورا ۔ ۶۴" کی قسموں سے دلی۔ لدھیانہ۔ پوسا اور کانپور میں فی ہیکٹر ۴ ٹن کی پیداوار حاصل کی گئی۔ اس سال ہندوستان بھر میں گیہوں پر ایک ساتھ تجربات کیے گئے۔ اس غرض سے ربیع کے موسم میں بونی قسموں کو ۱۵۵ جگہوں پر بویا گیا۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں ملک بھر میں کیے گئے تجربات کی بنا پر "لرما روہو" اور "سونورا ۔ ۶۴" کی کاشت کی اجازت دی گئی۔ ایسی قسموں کی کاشت سے پوری پوری پیداوار حاصل کرنے کی غرض سے ان کی کاشت کے طریقے بھی مقرر کر دیے گئے۔ سائنس دانوں نے لگ بھگ ایک سو جگہوں پر خود کاشت کرنے کے طریقے عملی مظاہرے کے ذریعہ لوگوں کو دکھائے۔ اس سے کسانوں کو گیہوں کی کاشت کے نئے طریقوں سے

اچھی طرح واقفیت ہوگئی اور انھیں یہ پتہ چل گیا کہ اگر گیہوں کی آبپاشی کی جائے تو اس سے فصل کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ بھارت سرکار نے "لرما روجو" اور سونورا۔۶۴ کا ۲۵۰ ٹن بیج برآمد کیا، جسے ۵ ہزار کسانوں میں تقسیم کیا گیا۔

بونی قسموں کی کاشت سے ۱۹۶۶ء میں کسانوں کو تسلی بخش پیداوار حاصل ہوئی۔ چنانچہ آئندہ ربیع کے موسم میں اس بیج کو زائد پیداوار دینے والی قسموں کے پروگرام کے تحت چار لاکھ ہیکٹر کے رقبے میں بویا گیا۔ اس بار کھاد کا بھی پورا پورا استعمال کیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں پوسا انسٹیٹیوٹ، لدھیانہ اور پنت نگر کے گیہوں پیدا کرنے والوں نے گیہوں کی میکسیکو کی قسموں میں سے سنہرے بیجوں والی، زائد پیدا وار دینے والی اور رتوا بیماری سے بچنے والی جن قسموں کا انتخاب کیا ان میں سے چار قسموں کی کاشت کی اجازت دے دی گئی۔ ان قسموں کے نام تھے "کلیان سونا"، "سونالیکا"، "سفید لرما" اور "چھوٹی لرما"۔ سینکڑوں کھیتوں پر زرعی سائنس دانوں نے عملی طور پر ان کی کاشت کا طریقہ کسانوں کو بتایا۔

بدقسمتی سے ۱۹۶۸ء میں رتوا بیماری کے لگنے کیلیے حالات موافق تھے اس کے باوجود بونی قسموں کی فصلوں پر اس بیماری کا اثر بہت کم ہوا اور ہمارے ملک میں گیہوں کی کافی اچھی پیداوار حاصل ہوئی۔ اس طرح ہندستان میں گیہوں کی پیداوار پچھلے چند برسوں کے مقابلے میں لگ بھگ دوگنی ہوگئی۔ اس اہم کامیابی کی یادگار رہے کے لیے وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے گیہوں کی کھیتی اور پیداوار میں انقلاب کا ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا۔ پچھلے تین برسوں میں بونی قسمیں ہندستان بھر میں خوب کامیاب ثابت ہوئیں۔ کامیاب ترین بونی قسموں کے نام ہیں: "شربتی سونورا"، "سونورا-۶۴"، "سونالیکا"، "کلیان سونا"، "لرما روجو"، "ہیرا"، "موتی"، "لوسالرما" وغیرہ وغیرہ۔ خصوصاً صدر جمہوریہ نے "ہیرا" اور "موتی" قسموں کی راشٹرپتی بھون میں کاشت کرائی جس سے اچھی فصل حاصل ہوئی۔ دراصل اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندستان کی زراعت میں سائنس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے اور آئندہ مستقبل میں خوراک کی ملکی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ارادہ وقومی منصوبہ کامیاب کرکے دکھایا جائے۔ اسی میں ملک کی بھلائی اور خوشحالی ہے۔

ہندوستان میں سونورا-۶۴ "سونالیکا" اور "شربتی سونورا" سب سے جلدی تیار ہونے والی قسمیں ہیں۔ ان فصلوں کو جب دسمبر کے پہلے ہفتہ میں بویا گیا، تب بھی ان کی پیداوار کم نہیں ہوئی۔ ان قسموں کے گیہوں میں جو جلدی تیار ہونے کی خوبی ہے اسکی بدولت انھیں مختلف فصلوں کے ہیر پھیر کے ساتھ بویا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ایک کھیت میں سے ہرا مونگ، دو غلی مکئی اور توریے کے بعد گیہوں بوکر ایک ہی سال میں چار فصلیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ایک فصل کی بجائے ایک سال میں چار فصلیں حاصل کرنے سے ایک ہیکٹر کے کھیت سے اناج، پروٹین سے بھری دال، پھلی دار ہرا طاقتور چارہ اور تلہن حاصل کیے گیے۔ فصلوں کا یہ چکر بہت ہی فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔

بونی قسموں کی ایک خوبی قابل ذکر ہے کہ اس کے پتے سیدھے اوپر کو بڑھتے ہیں اور بالیاں لمبی ہوتی ہیں۔ دوسری اوپر کو بڑھنے والی لمبی گیہوں سے بونی قسمیں بڑھیا ثابت ہوچکی تھیں۔ کیونکہ ایک تو بونی قسمیں زمین پر گرتی نہیں، دوسرے یہ گھنی کاشت میں زیادہ پیداوار دینے کی خاصیت رکھتی ہیں۔

غذائیت کے اعتبار سے مطالعہ کیا گیا ہے کہ گیہوں کی پرانی فصلوں میں لگ بھگ دس فی صدی پروٹین ہوتی تھی۔ یہ پروٹین بونی قسموں میں ۱۳ سے ۱۷ فی صدی تک ہوسکتی ہے۔ جانچ کرنے سے پتہ چلا ہے کہ پروٹین غذائیت میں بھی بڑھیا ہے۔ ان قسموں کے گیہوں کے سو گرام میں ۲۸۶ سے لے کر ۴۸۶ ملی گرام تک امینو ایسڈ لائزین کی مقدار ملتی ہے جو غذائیت میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آٹے میں لائزین کی ایسی مقدار باقی قسموں کی نسبت شربتی سونورا میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

ہندوستان میں گیہوں کی ۹۰ فی صدی کھپت چپاتیاں بنانے میں ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں بوئی جانے والی نئی بونی قسموں میں بڑھیا چپاتی کی خوبیاں ہونی چاہیں۔ بڑھیا چپاتی کے لیے ایسا آٹا چاہیے۔ جو زیادہ پانی جذب کرسکے، اور گوندھنے کے بعد ہاتھوں کو نہ لگے۔ یہ اتنا مضبوط اور لچیدار ہو کہ بیلا جاسکے۔ دوسرے چپاتی کا رنگ بالائی کا سا ہو، چپاتی یکساں ہو اور اوپر سے نہ پھٹے۔ چپاتی نرم ہو اور ۴ سے ۶ گھنٹے تک نرم رہے۔ شربتی سونورا ان سب خوبیوں کو پورا کرتی ہے۔

ان بونی قسموں کے گیہوں میں ڈبل روٹی بنانے کی خاصیت بھی موجود ہے۔ اس طرح یہ بسکٹ بنانے کے کام میں اچھی ثابت ہوتی

ہیں۔ بسکٹ اس آٹے سے اچھے بنتے ہیں جو نرم اور کمزور ہو کر جاذب ہوا در ایسی چیپ کا مالک ہو جس میں لچک کی نسبت پلاسٹک جیسی لوچ زیادہ ہو۔ بسکٹ اگر بڑھیا قسم کے تیار کیے جاسکیں تو ہندستان بسکٹ کی برآمد میں کافی ترقی کر سکتا ہے۔ نئی قسموں کے آٹے کو گوندھنے پر کافی کھینچا جاسکتا ہے یہ آٹا بعد میں اتنی جلدی سکڑتا بھی نہیں اور پکلنے کے بعد بسکٹ اوپر سے پھٹتے بھی نہیں۔ دوسری ان قسموں کے آٹے سے بنائے گئے بسکٹ منہ میں ڈالنے پر فوراً گھل جاتے ہیں۔

آج کل بونی قسموں کے گیہوں کے بیجوں کو زیادہ مقدار میں ہندستان میں پیدا کیا جا رہا ہے تاکہ اس کی بدولت کسان اس سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ زرعی سائنس دانوں کے پیش نظر یہ اصول ہے کہ کسان صرف بونی قسموں ہی کو مقبول نہ بنائیں بلکہ اپنے کاشت کاری کے ڈھنگوں میں ایک نیا پن اور تبدیلی لائیں۔ اس ضمن میں کافی کامیابی ہوئی ہے کیونکہ ہندستان کی اس تحقیق سے متاثر ہو کر پڑھے لکھے شہری لوگوں کا ایک طبقہ گیہوں کی کاشت کی طرف رجوع ہو رہا ہے اور ایک نیا سماجی اور ذہنی ماحول تیار ہو رہا ہے جو اس بات کی کھلی نشاندہی کر رہا ہے کہ گیہوں کی کاشت میں آئندہ برسوں میں ایک انقلاب رونما ہوگا۔

★

شہید آزادی —— (صفحہ ۲۵ کا بقیہ)

دل فدا کرتے ہیں قربان جگر کرتے ہیں
پاس جو کچھ ہے وہ ماتا کی نذر کرتے ہیں

خانہ ویران کہاں دیکھیے گھر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

نوجوانو! یہی موقع ہے اٹھو کھل کھیلو
خدمت قوم میں جو آئے بلا وہ جھیلو

دیس کے صدقے میں آکر جوانی دے دو
پھر ملیں گی نہ یہ ماتا کی دعائیں لے لو

بات تو جب ہے کہ اس بات کی ضدیں ٹھانیں
دیس کے واسطے قربان کریں سب جانیں

لاکھ سمجھائے کوئی ایک نہ اس کی مانیں
کہتا ہے خون سے مت اپنا گریبان سانیں

ناصحا! آگ لگے تیرے اس سمجھانے کو

بسمل کے مختصر انتخاب کلام سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان کی شاعری نہیں بلکہ مادر ہند کا درد ہے۔ ہر ہر شعر سرفروشانہ جذبات سے پھرپور ہے۔ اس میں گل و بلبل، جام و پیمانہ کی محفل طرب نہیں۔ اس میں نامہ بر دصال کی خبر نہیں لاتا ہے بلکہ الفت وطن میں پھانسی کا پروانہ نظر آتا ہے۔ ان اشعار میں ایک سچے عاشق وطن اور من چلے مجاہد کی بیقراریاں اور اضطراب ہے جو دشمن وطن کے ناپاک ارادوں کو متزلزل کیے دے رہا ہے۔ اسی لیے آج بھی بسمل کے نغمات آزادی، رگوں میں حمیت اور غیرت کا لہو دوڑاتے ہیں۔ درحقیقت ہندستان کی جنگ آزادی کی تاریخ اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہو سکتی جب تک کہ بسمل اور ان کے نغمات کا ذکر نہ ہو۔

★

آبگینہ —— (صفحہ ۳۰ کا بقیہ)

تم پر تکوک کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ تم بے وجہ لڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہو بے بات کی بات پر رو دینے لگتی ہو۔ ذرا دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کیا کرو۔ ستیش نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔"

ستیش کے ہاتھوں کے لمس نے اس کے دل کی دنیا بدل دی۔ اسے بچپن کا وہ دور یاد آگیا جب اسے بے انتہا پیار ملا تھا۔

آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے وہ ستیش کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔

★

شادی خانہ آبادی — (صفحہ ۲۸ کا بقیہ)

ہم نے کہا: یہ خواب نہیں ہیں۔ تمہارے تحت الشعور میں دبی ہوئی خواہشیں ہیں جو اس طرح پائے تکمیل تک پہنچ رہی ہیں یعنی ع

کوئی حسرت کہیں نکلی کوئی حسرت کہیں نکلی

والا معاملہ ہے۔

بعض اوقات ہم آدمی کے سر کے متعلق سوچتے ہیں کہ غالباً آدمی کا سر صرف شادی کے سہرے کے لیے بنایا گیا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد اس کا کوئی مصرف نہیں رہتا۔ اور شادی کے وقت سہرے سے دولہا کا منہ جو چھپا دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ اس کے بعد وہ کسی کو منہ دکھانے لائق نہیں رہتا۔

★

(ایڈیٹر کا مراسلہ نگار سے متفق ہونا ضروری نہیں)

کچھ "کلامِ انیس میں تغزل" کے بارے میں

* ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

"نیادور" لکھنؤ مطبوعہ جولائی سنہ ۱۹۶۲ء کے شمارہ میں جناب سجی حسن نقوی[1] کا مضمون "کلامِ انیس میں تغزل" راقم الحروف کی نظر سے گزرا۔ موصوف صفحہ ۳۶ اور صفحہ ۳۷ پر میر مہدی حسین احسن مولف واقعاتِ انیس و مولوی امجد علی اشہری صاحب حیاتِ انیس کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

"میر مہدی حسین احسن نے جو خود میر انیس کے بڑے فرزند میر نفیس کے شاگرد اور جن کے والد میر انیس کے دوستوں میں سے تھے واقعاتِ انیس میں ایک روایت نقل کی ہے جس کی تائید تھوڑے سے تغیر کے ساتھ مولوی اشہری نے حیاتِ انیس میں کی ہے کہ ایک مرتبہ نواب واجد علی شاہ کی والدہ ملکہ کشور جہاں نے مرزا دبیر اور میر انیس دونوں کو مجلس پڑھنے کی دعوت دی۔ میر انیس نے صاف صاف کہہ دیا کہ ذاکری کی حالت میں درباری داری کا حفظِ مراتب مجھ سے نہ ہو سکے گا چنانچہ انھیں اپنی ذاتی پوشاک میں مجلس پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ مرزا دبیر درباری قبا پر عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ انھوں نے منبر پر پہنچ کر پہلے بادشاہ کی شان میں کچھ اشعار مدح کے پڑھے اور اس کے بعد مرثیہ شروع کیا۔ بعد ازاں انیس کی باری آئی۔ انیس نے اول ایک سلام پڑھا جس کا مطلع یہ تھا۔

غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہو کر
مجرائی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر

اور اس کے بعد جب میر انیس نے سلام کا تیسرا شعر پڑھا۔

نعشِ اکبر کو جو دیکھا سرِ زینب و نون
موسے سر کھول دیے ماں نے پریشاں ہو کر

تو مجلس اٹھا کر بادشاہ باہر نکل آئے اور بے ساختہ فتح الدولہ برق سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیوں فتح الدولہ میں نہ کہتا تھا کہ میر انیس لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں۔ دیکھا تم نے یہ زبان انھیں کے لیے خاص ہے۔ بعد ختم مجلس علی نقی خاں کو حکم دیا کہ میر صاحب کو دروازے تک رخصت کرنے کی رسم پوری کریں۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ انیسیوں نے دبیریوں کو نیچا دکھانے کے لیے یہ "افسانہ" اختراع کیا ہے۔ دبیریوں کو اس سے قطعی انکار ہے۔ اور وہ اس بیان کو بے بنیاد سمجھتے ہیں۔ چنانچہ سید افضل حسین ثابت لکھنوی اس کی تردید میں لکھتے ہیں کہ:

"اگر یہ واقعات صحیح ہوتے تو ضرور میر صاحب کے کمال اور مرزا صاحب کے نقص پر دال ہوتے۔ مگر لکھنؤ میں بڑے بوڑھے آدمیوں سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب محض غپ اور غلط ہے۔ مرزا صاحب مدت العمر کبھی کسی رئیس یا بادشاہ کے یہاں لباس درباری سے نہیں گئے۔ مجلس عزا کا تو کیا ذکر ہے۔ ملکہ کشور کے یہاں مرزا صاحب کبھی مجلس میں نہیں پڑھے۔"

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کسی تاریخ یا تذکرہ سے یہ کہیں نہیں ثابت ہوتا ہے کہ کسی شاہی مجلس میں دبیر اور انیس یکے بعد دیگرے بادشاہ کے حکم سے پڑھے ہوں ـــــ اول تو یہ دیکھنا ہے کہ جو سلام میر انیس سے منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی ان ہی کی تخلیق ہے یا اور کسی کی۔ راقم کی نظر سے یہ سلام میر انیس کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مرثیوں اور سلاموں میں

---

[1] افسوس ہو کہ حال ہی میں جناب سجی حسن صاحب نقوی رحلت فرما گئے، یہ مراسلہ مرحوم کی حیات میں موصول ہوا تھا۔ اس میں ارباب تحقیق کے لیے دعوتِ فکر ہے اس لیے شائع کیا جا رہا ہے (ایڈیٹر) "ملکہ" بادشاہ" ہونا چاہیے (حیدری)

نہیں گزرا ہے۔ جناب مہاراجکمار محمد امیر حیدر خاں آف محمود آباد نے انیس کے غیر مطبوعہ سلاموں کو بڑی محنت اور عرق فشانی سے ترتیب دیا ہے۔ راقم نے سلاموں کا یہ مجموعہ دیکھا اس میں "شاہی مجلس" والا سلام بالکل نہیں ہے۔ در اصل یہ میر مونس کی تصنیف ہے اور اسے میر انیس کا تسلیم کرنا صرف غلط ہی نہیں بلکہ گمراہ کن بھی۔ اس سلسلے میں حسب ذیل شہادتیں راقم کے پاس ہیں جن کی بنیاد پر اس غلط اور بے بنیاد واقعہ کی تردید ہو جاتی ہے۔

(۱) مرثیہ میر مونس جلد اول صفحہ ۲۴۹ مطبع نول کشور لکھنؤ مطبوعہ ۱۹۱۲ء میں یہ سلام میر مونس کے نام درج ہے۔ اس میں کل ۲۸ شعر ہیں۔ پہلے دو شعر یوں ہیں ؎

مجرئی بہتے ہیں آنسو دُرِ غلطاں ہو کر
آبرو پائی ہے کیا چشم نے گریاں ہو کر
غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنا حشم کھوئیں سلیماں ہو کر

(۲) میر مونس کے سلاموں کا مجموعہ "دیوان فصاحت عنوان" کے نام سے ۱۹۱۱ء میں مطبع شاہی میں سید عبد الحسین تاجر لکھنؤ محلہ درگاہ سروار باغ کے اہتمام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں صفحہ ۹۷ پر یہ سلام ۲۸ شعر میں درج ہے۔

(۳) میر مونس کا یہ سلام جناب سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں مخطوطہ کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی یوں ہے ع

مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر

(۴) جناب سید مسعود حسن رضوی کے ذخیرۂ مراثی میں اردو کے مشہور مرثیہ گو کے سلاموں کا ایک نادر اور کمیاب ضخیم مطبوعہ مجموعہ موجود ہے۔ غالباً یہ اعد نسخہ ہے اور اس کا کوئی دوسرا نسخہ کہیں نہیں ملتا ہے۔ مجموعہ سلام کا نام "شمع تعزیت" ہے۔ شمع تعزیت کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۶ ہجری نکلتے ہیں۔ یعنی یہ کتاب میر مونس کی وفات[1] کے پانچ سال بعد شائع ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی ضخیم کتاب کی ترتیب، کتابت اور طباعت میں بھی کافی وقت صرف ہوا ہوگا۔ کتاب کی تفصیل یہ ہے۔

سائز ۸ × ۱۰، صفحات ۵۰۸، سلاموں کی تعداد ۵۰۸، مخمسات ۲۹، اس کے علاوہ سراپا کے کئی بند بھی ہیں۔ ابتدا نادر کے سلام سے ہوتی ہے۔

لکھو سلامی وصفِ ابرو ے شہ ذی جاہ کا
ہو سرِ دیواں پہ جلوہ مد بسم اللہ کا

صفحہ ۵۰۸ پر فرحان کی کہی ہوئی تاریخ طباعت درج ہے ؎

خم شمشیر ٹپکتا ہے بڑا مضموں سے — جو سلام اس میں ہے نادرہ بہت عالی ہے
کلک فرحاں نے یہ تاریخ رقم کی اس کی — بس یہ مجموعۂ تالیف متین زیبا ہے

"شمع تعزیت" کا یہ مجموعۂ کلام سید محمد عنایت حسین تخلص متین سہارنپوری نے ترتیب دیا تھا۔ آخر میں "خاتمۃ الطبع" کے تحت یہ عبارت درج ہے۔

"الحمد للہ والمنۃ کہ نسخہ ہذا مسمی بہ شمع تعزیت تالیف سید محمد عنایت حسین صاحب تخلص بہ متین ساکن سہارنپوری سپرنٹنڈنٹ چونگی بریلی بہ تصحیح و سعی بلیغ مؤلف تاریخ ۳۰ ماہ نومبر ۱۸۸۰ء کو طبع ہو کر فرحت بخش مشتاقان بادقار و ناظرین اولی الابصار ہوا۔"

میر مونس کا متذکرہ بالا سلام "شمع تعزیت" میں صفحہ ۵۰۱ پر درج ہے۔ اس میں ۳۵ شعر ہیں۔ دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی یوں ہے ع

مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر

مندرجہ بالا حوالوں میں سلام کے مقطع میں "مونس" تخلص درج ہے۔

ذیل میں مونس کا یہ سلام جسے لوگ غلطی سے میر انیس کے کلام سے منسوب کرتے ہیں درج کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو سکے۔

مجرئی بہتے ہیں آنسو دُرِ غلطاں ہو کر — آبرو پائی ہے کیا چشم نے گریاں ہو کر
غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہو کر — مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر
اژدہا نے جو دیکھا کرم دستِ حسین — پائے اقدس پہ گرا لوٹنے داماں ہو کر
خشکی لعل لب شاہ کا جب دھیاں آیا — اشک خوں گرنے لگے لعل بدخشاں ہو کر
شہ کے مرنے سے مدینہ کی ہوئی بربادی — مل گیا خاک میں وہ شہر گلستاں ہو کر
کس نے دریافت کریں سال جو مرا ہوگا — کوئی پیدا نہ ہوا خاک میں پنہاں ہو کر

---

[1] میر مونس کا انتقال ۱۲۹۱ھ میں ہوا۔

کہیں ملتا نہیں تصویرِ سکندر کا پتا — سب کے منہ دیکھتا ہو آئینہ حیراں ہوکر
چمنِ دہر میں توام ہو سدا شادی و غم — کون سا گل ہے جو دیا نہیں خنداں ہوکر
کہتی تھی دیکھ کے زہرا کے مرقع کو قضا — یہ ورق جمع نہ پھر ہوں گے پریشاں ہوکر
قدرداں داد بھی دیتے نہیں سبحان اللہ — کیا صلے ملتے ہیں دنیا میں سخنداں ہوکر
دی یہ سائل نے صدا لب کے علی سے خاتم — لو گدا باتا ہو سجدے سے سلیماں ہوکر
شاہ فرماتے تھے کیا قہر ہوا از نہرِ فرات — ہم رہے جاتے ہیں پیاسے ترے مہماں ہوکر
شاملِ آلِ محمد ہوئے اللہ اللہ — پا لیا مرتبہ سلماں نے مسلماں ہوکر
دھوپ میں شہ کا جو نورِ رخِ روشن چمکا — رہ گیا مہر چراغاں تہ داماں ہوکر
وصفِ رخسار کیا بعدِ ثنائے لبِ شاہ — جانبِ شہرِ حلب آئے بدخشاں ہوکر
گر پڑا اس نے جسے چشمِ غضب سے دیکھا — دل میں ہر موئے مژہ گڑ گیا پیکاں ہوکر
خلد بھی حُر نے لیا حوض بھی لی کوثر بھی — پڑ گیا لوٹ میں شبیر کا مہماں ہوکر
جا بسے خاک میں شبیر کے بسانے والے — سارے گھر ڈھ گئے سادات کے ویراں ہوکر
بخشا شہادت کی خوشی کتنی پسرِ زہرا کو — شکرِ خالق کیا ہونٹوں نے خنداں ہوکر
ہو گیا کعبہ و بطحا و مدینہ برباد — بستیاں لوٹ لیں جنگل نے گلستاں ہوکر
ذبح کے بعد بھی بانو کی نہ ہوئیں آنکھیں بند — عیدِ قرباں ہوئی معشوق پہ قرباں ہوکر
شاہ جب کہتے تھے بتلاؤ تو تقصیر مری — سر جھکا لیتے تھے بےدرد پشیماں ہوکر
فوجِ اعدا سے کہا حضرت نے یہ دیدہ اری — قتل کرتے ہو مسلماں کو مسلماں ہوکر
عیسئ آلِ محمد کی رہیں گی کے نثار — دینِ احمد کو جلا دے گئے بےجاں ہوکر
سینۂ شہ پہ رکھا شمر نے زانو ہیہات — پاسِ قرآں نہ کیا قائلِ قرآں ہوکر
لاشِ شبیر پہ یہ دھوپ نے قتل کے بعد — جم گئے قطرۂ خوں جسم میں پیکاں ہوکر
کہتی تھی بانوئے بیکس کہ بتاؤ لوگو — صبر کیونکر غمِ اکبر میں کروں ماں ہوکر
اُمتِ احمدِ مرسل کے کٹھ جانب ہے — دھوپ میں لاشۂ شبیر ہے عریاں ہوکر

تشنگی باپ کی سجاد کو بھولی نہ کبھی — جو پیا گھونٹ بھی پانی کا تو گریاں ہوکر
لاشِ اکبر سے کہا ماں نے کہ شادی تھی — واہ صدقے گئی آئے بھی تو بےجاں ہوکر
بانو کہتی تھی برس دن بھی تو اصغر نہ جیے — ہوئے بےجان پہ جینے کے مری جاں ہوکر
فاطمہ دودھ یہ بھی دے نہیں سکتی واری — قید سے آئی ہو ماں بے سر و ساماں ہوکر
زلفِ اکبر کو جو دیکھا سرِ نیزہ پرخوں — سب سر کھول دیے ماں نے پریشاں ہوکر
لبِ شبیر پہ رکھی جو چھڑی حاکم نے — لوگ رونے لگے انگشت بدنداں ہوکر
تھا یہ اس گھر میں اندھیرا کہ غرض الاماں ہم — سر کو ٹکرانے لگے داخلِ زنداں ہوکر
خنجر سے کہتے تھے شہ ذبح کریگا جو مجھے — ابھی دوڑیں گی نبی چاک گریباں ہوکر
حشر کردے گی بپا شیرِ خدا کی فریاد — قہر لائے گا سرِ فاطمہ عریاں ہوکر

رہبری کی جو مقدر نے تو ہم بھی مونس
روضۂ شاہ پہ جائیں گے غزلخواں ہوکر

یہ کہنا غلط اور بے بنیاد ہے کہ دبیر نے مذکورۂ بالا شاہی مجلس میں مرثیہ سے قبل بادشاہ کی تعریف میں کوئی نظم پڑھی تھی۔ اگر فی الواقع دبیر کوئی ایسی نظم مجلس میں پڑھتے تو انیسیوں نے اس کا خوب چرچا کیا ہوتا اور وہ نظم کہیں نہ کہیں محفوظ ہوتی۔ برعکس اس کے جب میر انیس مارچ ۱۸۷۱ء میں حیدرآباد مجلس پڑھنے گئے تو انھوں نے نظامِ دکن اور ان کے وزیر کی تعریف میں یہ دو رباعیاں کہی تھیں[1]

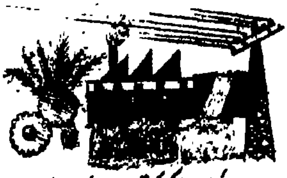
اللہ و رسولِ حق کی امداد رہے — سرسبز یہ شہرِ فیض بنیاد رہے
نواب انیا رئیسِ اعظم ایسے — یارب آباد حیدرآباد رہے

موجود جو کچھ جسے منظور ہے یاں — علم و فضل و عطا کا دستور ہے یاں
مختار الملک و بندگانِ عالی — رحمت رحمت پہ نور پر نور ہے یاں[2]

★

---

[1] واقعاتِ انیس ص ۱۴۱
[2] اگر ہانز ۱۸۹۴ء تک



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

سائنسی اور تکنیکی تعلیم حاصل کرنے کے لیے وزیر تعلیم کی اپیل ●● جھانسی ڈویژن میں بے زمین افراد کے لیے مکانات کے واسطے پلاٹوں کی فراہمی ●●● چاول کی خریداری پر لیوی میں اضافہ ●●● بے روزگار انجینئروں کو روزگار کی فراہمی ●●● پندرہ سال کے اندر تمام تندرست افراد کو روزگار فراہم کر دینے کی توقع ●●● پنچایت سیوکوں کے مہنگائی بھتوں میں اضافہ ●●● خریف کے اناجوں کی خریداری قیمت کا تعین ●●● مجاہدین آزادی کو پنشن ●●● اترپردیش میں بجلی کی کمی کو دور کرنے کے اقدامات پر غور و خوض ●●● سنسکرت کے اساتذہ انگریزی کی استعداد کی شرط سے مستثنیٰ

وزیر اطلاعات و ثقافتی امور نیز وزیر ریاست برائے اعلیٰ تعلیم شری پی ڈی ٹنڈن نے آج شام کو لال باغ گرلس کالج لکھنؤ میں خواتین اور لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق مشاورتی کونسل کے جلسہ میں تعلیم نسواں کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے کہا کہ ماضی میں تعلیم نسواں کو کافی نقصان پہنچا ہے لیکن آج بھی لڑکیوں میں سائنسی یا تکنیکی تعلیم کے لیے بہت زیادہ جوش و خروش نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر سنجیدگی سے توجہ دی جانا چاہیے اور خواتین کو زیادہ سے زیادہ سائنسی اور تکنیکی تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ بیگم قدسیہ اعجاز رسول ایم ایل اے نے اس جلسہ کی صدارت کی۔

شری ٹنڈن نے کہا کہ ملک میں دس سائنس گریجویٹوں میں سے صرف ایک لڑکی سائنس گریجویٹ ہوتی ہے، اور ان میں سے ہر پانچ میں سے چار لڑکیاں تدریس کا پیشہ اختیار کرتی ہیں۔ ان میں سے زیادہ لڑکیاں دیگر پیشے کیوں نہیں اپناتی ہیں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ماہرین تعلیم اور حکومت کو تبادلۂ خیالات کرنا چاہیے۔

❖ ❖ ❖

آزادی کی پچیسویں سالگرہ سال کے دوران جھانسی ڈویژن میں دیہی علاقوں کے بے زمین ہریجنوں اور سماج کے دیگر کمزور طبقوں کو مکانات کے لیے جگہ فراہم کرنے کے لیے ایک پروگرام شروع کیا جا چکا ہے۔ اس پروگرام کے تحت جھانسی، باندہ اور جالون اضلاع میں ۴۴۰ مواضعات کے ۴۱۷۵ خاندانوں کو ۱۲۳٫۲۳ ایکڑ سے زیادہ زمین مکانات کی تعمیر کے لیے فراہم کی گئی ہے۔ ان میں سے بیشتر خاندان ہریجن اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ہیں۔

ضلع جھانسی میں ۱۳۹ مواضعات کے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست، دیہی دستکاروں اور زرعی مزدوروں کے ۱۹۶۰ خاندانوں کو ۵۹٫۷۵ ایکڑ سے زیادہ زمین تقسیم کی گئی۔ اسی طرح ضلع باندہ میں مکانات کی تعمیر کے لیے ۱۴۱ مواضعات میں اقوام مندرجہ فہرست اور ہریجنوں کے تقریباً ۱۲۷۵ خاندان کو ۳۹ ایکڑ سے زیادہ زمین دی گئی۔ ضلع جالون میں ۸۰ مواضعات کے ۹۴۰ خاندانوں کو مکانات کے لیے ۲۴٫۴۸ ایکڑ زمین تقسیم کی گئی۔ ان میں سے ۵۰۰ خاندان اقوام مندرجہ فہرست کے اور بقیہ دستکاروں اور زرعی مزدوروں کے ہیں۔

❖ ❖ ❖

حکومت اترپردیش نے لائسنس یافتہ بیوپاریوں اور چاول ملوں پر لیوی عائد کر کے موجودہ خریف سے چاول خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سستے غلہ کی دوکانوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ مقدار میں چاول خریدنے کے لیے امسال لیوی کے عام فیصد میں ۶۰ سے ۷۰ تک اضافہ کیا گیا ہے۔ گورکھپور غذائی منطقہ اور جھانسی، ہمیرپور اور جالون کے قلت زدہ اضلاع کے لیے لیوی کا فیصد صرف ۳۵ ہوگا۔

کسانوں کو امدادی قیمت کا فائدہ پہنچانے کے لیے ضلعیاتی اشخاص

کو ہٹانے اور وہاں کے تھوک بیوپاریوں کو بیچ اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ امدادی قیمت اسکیم کے تحت محکمہ غذا اتر پردیش امداد باہمی فیڈریشن اور ہندوستانی غذائی کارپوریشن کے توسط سے کھلے بازار میں کسانوں سے براہ راست دھان خریدا جائے۔

ریاستی حکومت نے کسانوں کے لیے کم سے کم امدادی قیمت کی فراہمی کا بندوبست کرنے کے لیے زراعتی قیمت کمیشن کی سفارشات اور مرکزی حکومت کی رضامندی سے مختلف قسم کے باستی دھان کی قیمت خرید ۷۵ روپیہ فی کوئنٹل مقرر کی ہے۔ باستی کے علاوہ دیگر اقسام کے دھان کی فی کوئنٹل قیمت خرید درجہ اوّل کے لیے ۶۸ روپیہ۔ درجہ دوم کے لیے ۶۲ روپیہ درجۂ سوم کے لیے ۵۶ روپیہ درجہ چہارم کے لیے ۵۳ روپیہ اور درجہ پنجم کے لیے ۴۹ روپیہ ہوگی۔

❖ ❖ ❖

وزیر لوکل سلف گورنمنٹ شری بینی سنگھ نے ضلع کان پور میں بیروزگار انجینیروں اور ہنرمند مزدوروں کو روزگار کی فراہمی سے متعلق اسکیم کے تحت دو سڑکوں کی تعمیر کے کام کا افتتاح کیا۔ یہ دو سڑکیں کانپور سے تقریباً ۴۰ کلومیٹر دور باری پال۔ چاندپور اور کانپور سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر گھاٹم پور۔ گجنیر ہیں۔ باری پال۔ چاندپور سڑک ضلع کان پور کو ضلع فتح پور سے ملاتی ہے ان دونوں سڑکوں کی تعمیر محکمہ تعمیرات عامہ کرے گا اور یہ آئندہ ۱۵۔ اگست سے قبل بن کر تیار ہو جائیں گی۔

اس اسکیم کے تحت ضلع کانپور میں ۲۳ کلومیٹر سے زیادہ لمبائی کی پانچ پختہ سڑکیں تعمیر کی جائیں گی۔ سڑکوں کی تعمیر پر ۰۰۰،۷ روپیہ فی کلومیٹر کے حساب سے لاگت آئے گی اور اس سلسلہ میں نصف اخراجات مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔

❖ ❖ ❖

ریاستی حکومت ریاستی منصوبہ بندی کمیشن کے ۱۵ سالہ منصوبہ کے لیے متعین کردہ مقاصد کے تحت ریاست میں سنہ ۷۳-۱۹۷۲ء سے سنہ ۸۹-۱۹۸۸ء تک کی مدت کے دوران تمام تندرست افراد کو روزگار فراہم کرنے کے قابل ہوگی۔ ریاستی حکومت نے چوتھے منصوبہ کے دوران بیروزگاری کے مسئلہ سے نپٹنے کے لیے خصوصی کوششیں کی ہیں۔ دیہی علاقوں میں بیروزگاری دور کرنے کے لیے تیز رفتار پروگرام شروع کیے گیے ہیں۔ پرائمری اسکولوں میں مزید ٹیچروں کی تقرری کی گئی اور دیہی پروگراموں کو جاری رکھا گیا ہے۔

ریاستی حکومت نے سال رواں کے دوران اتر پردیش میں تقریباً ۸۱۴ کروڑ روپیہ کے مصارف سے تقریباً ۱۰ء۱ لاکھ افراد کو روزگار فراہم کرنے کے لیے ایک خصوصی پروگرام شروع کیا ہے۔ ریاستی منصوبہ بندی کمیشن کے اندازہ کے مطابق ان تمام کوششوں کے باوجود جو حکومت روزگار فراہم کرنے کے لیے کر رہی ہے اتر پردیش میں پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے آغاز میں بے روزگار ٹیکنیکل افراد کی تعداد ۹۹۷۰ ہوگی۔ ان میں سے ۴۶۰ ڈگری ہولڈر انجینیر اور ۴۴۰۱ ڈپلوما ہولڈر انجینیر ۱۲۹۸ ایگریکلچر ڈگری ہولڈرس اور ۲۱۲۰ ڈگری ہولڈر تربیت یافتہ ٹیچر ہوں گے۔

❖ ❖ ❖

اتر پردیش میں پنچایت سیوکوں کو جنھیں اکتوبر ۱۹۷۱ء سے سرکاری ملازم قرار دیا گیا ہے اب اسی شرح سے مہنگائی بھتہ ملے گا جو دیگر سرکاری ملازموں کو ۰۰۷۔ ۱۱۵ روپیہ کی شرح تنخواہ میں مل رہا ہے۔ یہ فیصلہ آج یہاں وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی کی صدارت میں منعقدہ ریاستی کابینہ کے ایک جلسہ میں کیا گیا۔ اس فیصلہ پر یکم مارچ ۱۹۷۲ء سے عمل درآمد ہوگا جس کی رو سے پنچایت سیوکوں کو ۵۰ء۳۷ روپیہ کے موجودہ مہنگائی بھتہ کے بجائے ۵۶ روپیہ کی شرح سے اضافہ شدہ مہنگائی بھتہ ملے گا۔

❖ ❖ ❖

ریاستی حکومت محکمہ پرائمری اسکولوں کے لیے جلد ہی ۰۰۰ء۹ ٹیچروں کی تقرری کرے گی۔ یاد ہوگا کہ ان اسکولوں کو حکومت نے حال ہی میں اپنے دائرہ اختیار میں لیا ہے۔ ان ٹیچروں کے انتخاب سے متعلق قواعد و ضوابط کا بھی اعلان کیا جا چکا ہے۔

ضلع کمیٹیوں سے کہا گیا ہے کہ ٹیچروں کے انتخاب کے وقت تربیت یافتہ اور بیروزگار بی۔ ٹی۔ سی اور ایچ ٹی سی ٹیچروں کو اولیت دی جائے۔ اس کے علاوہ ان میں سے ایسے ٹیچروں کو بھی اولیت دی جائے جنھوں نے پہلے تربیت مکمل کر لی ہو لیکن بیروزگار ہوں۔ دیگر زمروں کے معاملات میں اسی صورت میں غور کیا جائے گا جب کسی خاص ضلع میں بی ٹی سی اور ایچ ٹی سی کے ٹیچر دستیاب نہ ہوں۔ بنیادی تعلیم کے ڈھانچہ کو منظم کرنے کے لیے حکومت نے اترا کھنڈ

کے تین اضلاع کو چھوڑ کر ریاست کے تمام اضلاع میں ضلع بیسک ایجوکیشن افسروں کی تقرری کر دی ہے۔ ان افسروں نے کام سنبھال لیا ہے اور ضلع میں بیسک تعلیم سے متعلق کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ بقیہ تین اضلاع میں جلد ہی افسروں کی تقرری کر دی جائے گی۔

✤ ✤ ✤

حکومت اترپردیش نے لائسنس شدہ بیوپاریوں اور چاول ملوں پر لیوی عائد کر کے ۷۳-۱۹۷۲ء کی خریف فصل کا چاول خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ باجرہ اور مکئی کی جزوی طور پر خریداری ہندوستانی غذائی کارپوریشن کے سپرد کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ ریاستی حکومت اپنی ضروریات کی تکمیل کے پیش نظر براہ راست کھلے بازار سے ۲۵۰۰۰ ٹن مکئی بھی کسانوں سے خریدے گی۔

خریداری کے سلسلہ میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آنے پائے۔ اس کے لیے دھان اور چاول کے لیے ریاست کو ایک الگ منطقہ کی شکل میں قرار رکھتے ہوئے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ دھان اور چاول کے موجودہ آٹھ بلاکوں کو ۲۴ چھوٹے بلاکوں میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ اسمگلنگ کو روکا جا سکے اور خریداری میں اضافہ ہو سکے۔

زراعتی قیمت کارپوریشن نے تیسرے زمرہ کے دھان اور چاول کے لیے جن قیمتوں کی سفارش کی تھی اسے حکومت نے منظور کر لیا ہے اور بالترتیب ۵۶ روپیہ فی کوئنٹل کی شرح سے انکی قیمت مقرر کی گئی ہے۔ باجرہ کی قیمت ۶۰ روپیہ فی کوئنٹل اور جوار اور مکئی کی قیمت ۵۰ روپیہ فی کوئنٹل مقرر کی گئی ہے۔

✤ ✤ ✤

کچھ مجاہدین آزادی اور ان کے خاندان کے ارکان سے کہا گیا ہے کہ وہ پنشن اور مالی امداد کی منظوری کے لیے اپنی درخواستیں مقررہ فارموں پر جو ضلع مجسٹریٹ کے دفتر سے حاصل کیے جا سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء تک پیش کر دیں۔

اس سلسلہ میں جو لوگ پہلے کسی اور فارم یا معمولی کاغذ پر درخواستیں دے چکے ہیں ان سے بھی استدعا کی گئی ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے مقررہ فارم پر اپنی درخواستیں دوبارہ پیش کر دیں۔ دیکھا گیا ہے کہ درخواستوں کے فارموں کی مناسب طور سے خانہ پری نہیں کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں سزا کی مکمل تفصیلات اور قید کی پوری مدت واضح طور سے درج کی جانا چاہیے۔

قید کی مدت کے بارے میں ضلع افسر یا جیل سپرنٹنڈنٹ کا سرٹیفکیٹ دستیاب نہ ہونے کی صورت میں درخواست دہندہ اس سلسلہ میں دو ممبران مجالس قانون ساز یا ممبران پارلیمنٹ یا سیاسی پنشن پانے والے مجاہدین آزادی کا سرٹیفکیٹ پیش کر سکتے ہیں۔ جن لوگوں نے معافی مانگ لی ہو وہ کسی پنشن کے حقدار نہیں ہیں۔ لہٰذا درخواست کے فارم میں یہ واضح طور سے درج ہونا چاہیے کہ درخواست دہندہ نے معافی مانگی ہے یا نہیں۔ اس امر سے متعلق فارم کے کالم ۱۲ کو خانہ پری کے بغیر نہ چھوڑا جائے۔

✤ ✤ ✤

وزیر بجلی شری نارائن دت تیواری نے ودھان بھون کے تلک ہال میں اترپردیش ریاستی بجلی بورڈ کے طلب کردہ ایک جلسہ میں کارخانہ داروں سے اپیل کی کہ وہ اترپردیش میں بجلی کے موجودہ بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسے عملی مشورے دیں جس سے پیداوار کا کم سے کم نقصان ہو اور مزدوروں کو کم سے کم دقت ہو۔ وزیر موصوف نے ان سے اپنے مشورے تین دن کے اندر بورڈ کو بھیجنے کے لیے کہا۔

اس جلسہ میں بڑے اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے نمائندوں، چند ممبران مجالس قانون ساز اور آبپاشی زراعت اور گنا ترقی کے محکموں کے افسران نے شرکت کی۔ وزیر موصوف نے جلسہ میں کہا کہ تمام صارفین کو اس امر کو ملحوظ رکھ کر بجلی کی قلت کا یکساں طور سے سامنا کرنا چاہیے کہ نہ تو صنعتی پیداوار کو اور نہ زراعتی پیداوار کو نقصان پہنچے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ مدھیہ پردیش اور کیرالا کو چھوڑ کر دیگر تمام ریاستیں بجلی کی قلت سے دوچار ہیں اور کچھ ریاستوں مثلاً ہریانہ پنجاب میں صورت حال اترپردیش کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خراب ہے۔ دیگر ریاستوں میں بعض مقامات پر بجلی کی فراہمی میں ۶۰ فیصد تک کی کمی کر دی گئی ہے۔

ریاستی حکومت نے تسلیم یافتہ ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کے ایسے تمام سنسکرت ٹیچروں کو جو مطلوبہ شرقی علوم کی استعداد کے حامل ہوں لیکن اترپردیش کے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے تعلیمی بورڈ کے

نصاب میں درج انگریزی کی استعداد رکھتے ہوں نیز ایسے طالب علموں کو جنہوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس نہ کیا ہو گزشتہ تاریخوں سے اس تعلیمی استعداد سے مستثنیٰ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن ایکٹ کی دفعہ ۹ (۳) کے تحت کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں متذکرہ طالب علموں کی ملازمت مستقل کے فوائد حاصل ہو جائیں گے اور وہ متعلقہ گریڈ کے حقدار ہوں گے خواہ وہ انگریزی کی مطلوبہ استعداد کے حامل نہ ہوں۔

★

عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے فارسی کا اخراج — (صفحہ ۲ کا بقیہ)

تک ان میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اس ضمن میں یہ بھی خاطر نشین رہنا چاہیے کہ شاہ آباد ترہت (بہار) کے عوام نے فارسی کے اخراج اور ہندوستانی بخط ناگری کی ترویج کے خلاف احتجاجات کیے تھے۔ ہندوستانی بخط ناگری کی حمایت میں ایک بھی ہندوستانی نے اپنے لبوں کو جنبش دینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ عوامی سطح پر اس کی حمایت انگریزوں کی مزید حکمت عملی کی محتاج تھی اور حقائق کے مطابق یہ اس سے بعد کی بات ہے۔

ابتدا میں بتایا جا چکا ہے کہ ۱۸۳۷ء تک انگریز اگرچہ شمالی ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے لیکن انہیں اپنی گرفت کی کمزوری کا احساس تھا اور ان کے دلوں میں بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے شکوک و خدشات بنے ہوئے تھے۔ گورنر جنرل ہند لارڈ کیننگ نے ۱۸۵۶ء میں کہا کہ "میں اپنے عہد حکومت میں امن چاہتا ہوں۔ میں اپنے ذہن سے اس بات کو نہیں نکال سکتا کہ ہندوستان کے بظاہر خاموش اور پرسکون افق پر بادل کا ایک ٹکڑا بھرے جو دیکھنے میں آدمی کی ہتھیلی سے بڑا نہ ہو مگر بڑھتے بڑھتے پھٹ جائے اور ہمیں تباہی اور بربادی کی دھمکی دینے لگے"۔[1] اور اگلا سال ۱۸۵۷ء ہی انگریزوں کی تباہی اور بربادی کی دھمکی بن کر آیا۔ بہرحال اس قیامت کے گزر جانے کے بعد ہندوستان کے متعدد بڑے بڑے شہروں میں رؤسا اور شرفا نے اصلاحی انجمنیں قائم کیں۔ پانچ سات برسوں میں دلی سوسائٹی، بنارس انسٹی ٹیوٹ، نینی تال انسٹی ٹیوٹ، انجمن مباحثہ الہ آباد، مرادآباد، میرٹھ، شاہ جہاں پور، بہار، لاہور، گوجرانوالہ، بمبئی، انجمن تہذیب لکھنؤ وغیرہ بہتیری اصلاحی انجمنیں دیکھتے دیکھتے نمودار ہو گئیں۔ انگریز حکام شروع شروع میں ان انجمنوں سے دور رہے (حالانکہ یہ انہی کی ایما پر بنائی گئی تھیں) لیکن رؤسا و شرفا کے اصرار پر "بادل نخواستہ" شریک ہونے لگے اور دو چار مہینوں میں صدر اور سکریٹری کی کرسیوں پر جلوہ فرما ہو گئے۔ انہی انجمنوں کے جلسوں میں انگریزوں نے ہندوستانی بخط ناگری کو "ہندی" کے نام سے موسوم کیا اور عوامی سطح پر "اس" کی حمایت کے لیے میدان تیار کیا۔

عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے فارسی کے اخراج کے ساتھ ساتھ "ہندی" یعنی "ہندوستانی" یعنی "اردو" کو لکھنے کے لیے فارسی، ناگری، رومن رسم خط کا جھگڑا کھڑا کر دیا گیا۔ ہر رسم خط کی خوبیوں اور خرابیوں کو خوب اچھالا گیا اور اگلے سو برسوں تک انہی خوبیوں کا کم اور خرابیوں کا زیادہ تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ زبان اور رسم خط کے اس قضیے نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفاق و نفرت کا بیج بو دیا جس نے ایک طرف ہماری قومی سالمیت کو پاش پاش کر دیا اور دوسری طرف اس کا کوئی موزوں حل نہ نکل سکا۔

★

ایشیا ۲۷ — (صفحہ ۲۵ کا بقیہ)

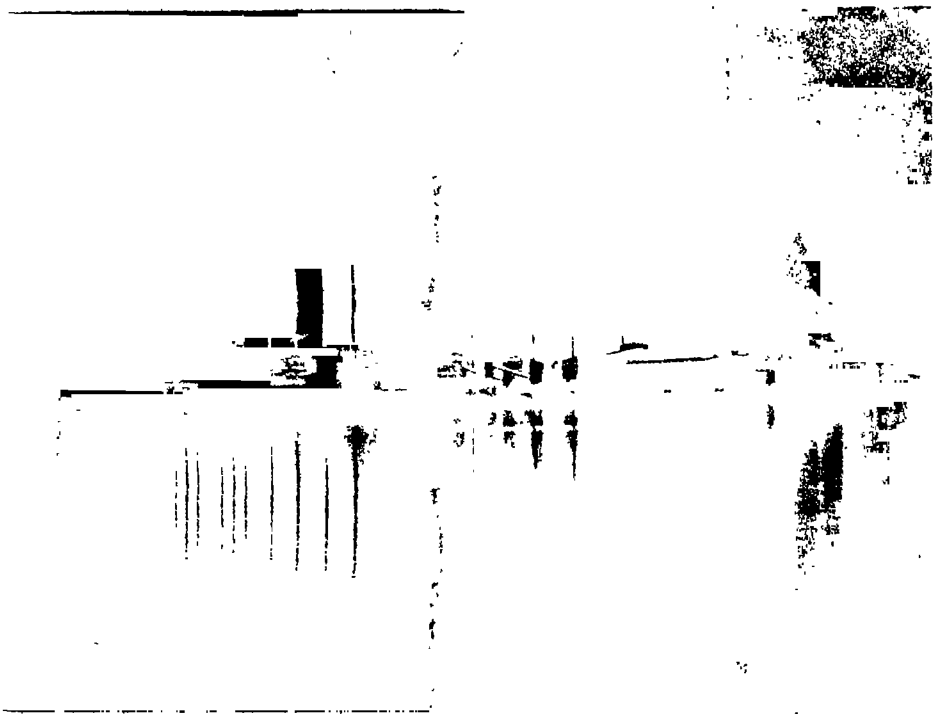
تعمیرات عامہ کے مرکزی محکمے کے چیف انجینئر شری دوراے راج نے ایک ملاقات میں بتایا کہ کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ مسائل کو حل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ تقریباً دس ماہ قبل ایک ڈپلومیٹ نے جو اپنے ملک کے لیے میلے میں جگہ مخصوص کرانے آیا تھا، موصوف سے کہا کہ بھارت جیسے ملک کے وسائل کو دیکھتے ہوئے اتنے بڑے پروجیکٹ کو مکمل کر لینا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ "جناب آپ خواب دیکھ رہے ہیں"۔ اسے بھول جائیے۔ لیکن وہی ڈپلومیٹ جب اکتوبر میں شری دوراے راج سے ملا تو اسے اعتراف کرنا ہی پڑا کہ خواب حقیقت میں بدلا جا چکا ہے۔ ★

---

[1] جمنا داس یا مہتہ، "آج کا ہندوستان" صفحہ ۱۹



Regd. No. L. 319



ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ کے ۵ لاکھ ٹن کے بھلائی فولاد کارخانہ کا ایک منظر



عنوانات

نیا دور

جلد ۲۸ نمبر ۱۱

۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء
۶ ماگھ ۱۸۹۴ شک

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو۔پی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

اپنی بات

جمہوریۂ ہند کے استقلال کو ۲۳ برس ہو چکے ہیں اور ہم ۲۶ جنوری کو جمہوریت کے ۲۴ ویں سال میں قدم رکھنے جا رہے ہیں۔ اپنے لیے ہم نے جو دستور وضع اور قبول کیا اس کا مقصد ہندوستان میں ایک ایسے خوشحال و امن سماج کا قیام ہے جس میں شہریوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق روا نہ رکھی جاتی ہو۔ ہر شخص کو خوش حال زندگی بسر کرنے اور ترقی کرنے کے مساوی مواقع فراہم ہوں۔ ملک سے جہالت، غریبی، امراض وغیرہ کا خاتمہ ہو۔ ان ۲۳ برسوں میں اس مقصد کے حصول کے لیے متواتر اور منظم کوشش کرتے آئے ہیں۔ ہمارے پنج سالہ منصوبے ہمارے اسی عزم و ارادے کا ثبوت ہیں۔ ہماری راہ میں دشواریاں بھی آتی رہی ہیں۔ بعض وقت حالات اتنے سنگین ہوتے کہ ہماری آزادی اور سالمیت ہی خطرے میں پڑ جاتی۔ لیکن ہم ان پر قابو پاتے اور آہستہ آہستہ مگر ہمت و استقلال کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ پچھلا سال (جمہوریت کا ۲۳ واں سال) بھی بڑے تناؤ اور اقتصادی بوجھ کا سال رہا۔ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ختم ہوئی۔ اس جنگ کے نتیجے میں تقریباً ایک لاکھ پاکستانی جنگی قیدیوں کا بوجھ ہندوستان کے سر پر آ پڑا جو اب بھی پڑا ہے۔ اسی کے ساتھ ملک کے وسیع علاقے میں خشک سالی کی وجہ سے زراعت اور اناج کی پیداوار کو نقصان پہنچا۔ ایسے ملک میں جہاں کی ۸۰ فی صد آبادی کا انحصار اب بھی زراعت پر ہو اناج کی پیداوار کو نقصان پہنچنے کا مطلب بہت سے پیچیدہ مسئلے پیدا ہو جانا اور ترقی کے کاموں میں رکاوٹ پڑ جانا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ بڑھتی ہوئی قیمتوں کا ایک چیلنج بھی ہوتا ہے۔ اس کے باوجود نہ پنج سالہ منصوبہ رد کیا گیا نہ ترقیاتی کام بند کیے گئے۔ اور زراعت، بجلی کی فراہمی، صنعت کو بڑھانے، اقتصادی نابرابری کو دور کرنے، امن اور مفاہمت کو فروغ دینے اور روزگار کے مساویانہ مواقع فراہم کرنے کے سلسلے میں ٹھوس اقدامات کیے گئے۔

اتر پردیش بھی غیر معمولی خشک سالی کا شکار رہا۔ پھر بھی اس نے معیشت کے تمام شعبوں مثلاً زراعت، صنعت، آب پاشی، بجلی وغیرہ کی پیداوار وغیرہ میں نمایاں ترقی کی۔ توقع کی جاتی ہے کہ خشک سالی سے اناج خصوصاً خریف کی فصل کو جو نقصان پہنچا وہ اس سال ربیع کی پیداوار سے بہت کچھ پورا ہو جائے گا۔ اس لیے کہ سال گزشتہ کی ربیع کے مقابلے میں اس سال ۲۵ لاکھ ٹن زائد پیداوار ہونے کی امید ہے۔ اسی طرح ریاست میں مزید ۲۲ لاکھ ایکڑ زمین کے لیے آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ریاست کی بجلی کی پیداواری صلاحیت میں بھی ۵۵ میگاواٹ کا اضافہ ہوا۔ صنعتی زمرے میں مرکزی (سرکار) سیکٹر کے پروجیکٹ ریکارڈ تعداد میں پردیش کے لیے حاصل کیے گئے اور سرمایہ کاری کو بھی فروغ دیا گیا جو ریاست کی صنعت کاری کے روشن امکانات کا آئینہ دار ہے۔

اس کے علاوہ جمہوریت کا تیئیسواں سال دیگر متعدد امور کے لحاظ سے ایک قابل ذکر سال تھا۔ یہی وہ سال تھا جب آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ نہایت شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ پردیش میں بھی منائی گئی۔ اس موقع پر خاص طور سے ہریجنوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کی ترقی کے لیے اور انھیں سماج میں باعزت مقام دلانے کے لیے کئی اسکیمیں شروع کی گئیں۔ پانچویں پنج سالہ منصوبے کے مقاصد کے تعین کے لیے ابتدائی کارروائی کے طور پر چوتھے منصوبے کی کامیابیوں اور کمیوں کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا۔ پانچویں پنج سالہ منصوبے کے سلسلے میں ایک بنیادی خاکہ مرتب کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ۷۴-۱۹۷۳ء کے لیے سالانہ منصوبے کا مسودہ تیار کیا گیا۔

اس طرح یہ دیکھا جائے گا کہ ہر اعتبار سے خود کفیل ہونے کے لیے ہماری کوششیں مسلسل جاری ہیں اور ہماری سرگرمیوں کا رخ اس نئے ہندوستان کی تعمیر ہی کی جانب ہے جو فرقہ واریت، نسل پرستی اور علاقائی تنگ نظری سے پاک ہو جس میں ہر شخص کو خصوصاً سماج کے کمزور اور پس ماندہ طبقوں کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں اور جہاں اونچ نیچ، ذات پات، امیر غریب کا کوئی امتیاز اور سوال نہ ہو۔ لیکن اس میں بھی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ اس طرح کے ہندوستان کی تعمیر ضبط و نظم کی پابندی، ڈسپلن اور جمہوری طریقوں ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ تشدد، لاقانونیت اور قومی املاک کی تباہی سے کسی مقصد کو تقویت نہیں پہنچ سکتی بلکہ اس کا الٹا اثر ہی پڑ سکتا ہے۔ اس لیے آیئے جس طرح ہم نے ہندوستان کو خود کفیل، ترقی یافتہ اور باوقار بنانے کا عہد کیا ہے اسی طرح یوم جمہوریہ کے اس مبارک موقع پر یہ بھی عہد کریں کہ ہم اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آئینی اور جمہوری طریقے ہی اختیار کریں گے اور قومی املاک کی تباہی و بربادی کا باعث نہ بنیں گے۔

آہ فرقت کاکوروی

ابھی پروفیسر احتشام حسین صاحب کے غم میں آنسو تھمے بھی نہیں تھے کہ فرقت صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر نے پھر تڑپا دیا۔ جس وقت یہ خبر سننے کا اتفاق ہوا ہم پر کچھ ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ریڈیو سے یہ خبر سنتے ہی آنکھوں کے آگے ایک مصرعہ بے اختیار زبان پر آ گیا جو انھوں نے اپنے کسی عزیز کی موت پر کہا تھا: ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رلا کے اٹھا۔ اس سے پہلے یہ تصور بھی نہیں ہوا تھا کہ ایسا ہنس مکھ، دوسروں کو ہنسانے والا اور زندہ دل آدمی جس نے کبھی کسی کو رنج نہ پہنچایا، کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا ہو سب کو اسی طرح رلا کے چلا جائے گا۔ ان کا انتقال جن حالات میں ہوا اس نے اس سانحہ کو اور بھی درد ناک بنا دیا ہے۔

فرقت صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں میرے بچا نکو بھائی ظہیر صاحب مرحوم ایڈیٹر سرفراز کے ہاں ہوئی تھی۔ دونوں میں بڑے گہرے مراسم تھے اسی اعتبار سے فرقت صاحب کو بھی میں اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا لیکن ان کے مزاج کی سادگی نے تکلف اور بے ساختگی نے خوردی و بزرگی کی حد بندیوں کو توڑ دیا اور کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ بزرگ ہیں۔ اور یہ کیفیت تنہا میرے ساتھ نہیں بلکہ بوڑھا ہو یا جوان، بچہ ہو یا کمسن، فرقت صاحب کا ہم عمر نظر آتا تھا اور ہر شخص کے ساتھ وہ یکساں بے تکلف تھے۔ لیکن یہ بھی انھیں کے ساتھ مخصوص تھا کہ اس بے تکلفی میں بھی انھوں نے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اگر کبھی کوئی موقع ایسا آ گیا کہ بات میں تلخی پیدا ہونے کا اندیشہ ہوا تو فرقت صاحب فوراً خاموش ہو جاتے اور چہرے کی کیفیت صاف بتاتی کہ سنجیدگی سے غور کرنے پر آپ محسوس کریں گے کہ غلطی پر ہیں یا نہیں۔

فرقت صاحب کی دائمی جدائی ان کے چاہنے والوں کا ناقابل فراموش غم ہے۔ یہ ایک بہت بڑا ادبی سانحہ بھی ہے اس لیے کہ انھوں نے طنز و مزاح کے دامن کو جس طرح اپنی تحریروں سے مالا مال کیا اس طرح اب کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ انھیں نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی خصوصاً پیروڈی کے تو وہ بادشاہ تھے۔ وہ قدم اٹھاتے تھے لیکن انھوں نے ہمیشہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور روزمرہ کے واقعات سے مواد حاصل کر کے سماج کی خامیوں اور برائیوں کو اجاگر کیا۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو اردو ادب میں یقیناً ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

ایڈیٹر

۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء

۶ ماگھ ۱۸۹۴ شک

GOVERNOR
UTTAR PRADESH

RAJ BHAVAN
LUCKNOW

ملک کی طاقت اور عظمت کا راز قومی یک جہتی میں ہے

سماج کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیجیے ـــ گورنر اتر پردیش

[جناب اکبر علی خاں صاحب گورنر اتر پردیش نے یوم جمہوریہ کے موقع پر عوام سے حسب ذیل اپیل کی]

ہماری جمہوریت کی تیئیسویں سالگرہ کئی وجہوں سے خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اول یہ کہ گھریلو محاذ پر مختلف آزمائشوں اور مشکلات کے باوجود جمہوریت کا ۲۲واں سال امن و امان کا سال رہا ہے۔ ہماری وزیر اعظم نے پاکستان سے ۱۴ روزہ جنگ کے ختم ہوتے ہی دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور امن کا ماحول پیدا کرنے کے لیے پہل کی۔ اس کے نتیجے میں تاریخی شملہ سمجھوتہ ہوا جس کے تحت دونوں ملکوں کی فوجیں اپنی اپنی سرحد میں واپس گئیں۔ یہ ہماری سب سے بڑی کامیابی رہی جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ شملہ سمجھوتے کے نتیجے میں امن کا جو دور شروع ہوا اس میں پڑوسی بنگلہ دیش کے لیے نہ صرف ایک جمہوری اور سیکولر سماج کی تعمیر کی جانب تیزی سے بڑھنے کا موقع ملا بلکہ بنگلہ دیش کے عوام کو سنہ ۱۹۷۱ء کے دل دوز مصائب کے بعد جس فوری سکون اور راحت کی ضرورت تھی وہ بھی انھیں میسر آ سکی۔

اتر پردیش نے زیر نظر سال میں ہماری معیشت کے تمام بنیادی شعبوں ـــ زراعت، صنعت، آبپاشی، بجلی وغیرہ میں اس سوکھے کے باوجود جس سے پردیش کا ایک بڑا علاقہ متاثر تھا، نمایاں ترقی کی۔ اس سوکھے سے خریف کی فصل کو جو نقصان پہنچا توقع ہے کہ اس کی بہت کچھ تلافی ربیع کی زائد پیداوار سے ہو جائے گی۔ اسی طرح بجلی کی پیداوار میں ۵۵ میگا واٹ کا اضافہ ہوا اور پردیش کا سینچائی کا رقبہ ۲٫۲۷ لاکھ ہیکٹر کے بقدر بڑھ گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم ہر محاذ پر خود کفیل ہونے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اس لیے کہ ہر شعبے میں خود اعتمادی پیدا ہونے سے ہی ہماری جمہوریت کی بنیادیں مضبوط ہو سکتی ہیں اور ہم قوموں کی برادری میں اپنا سر اونچا کر سکتے ہیں۔

جمہوریت میں تمام حقوق عوام میں مرکوز ہوتے ہیں اور ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے حقوق کا صحیح اور فرض شناسی کے ساتھ استعمال کریں گے اور اسی کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی نہ کریں گے اور ملک خصوصاً سماج کے کمزور طبقے کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں گے۔ میں تمام لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ یہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں کہ ملک کی طاقت اور عظمت کا راز قومی یک جہتی اور بلا لحاظ ذات، عقیدہ اور مذہب عوام کی خدمت میں مضمر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری لائق احترام وزیر اعظم کی صحیح رہنمائی میں ملک طاقتور ہوتا جائے گا۔ میں اس مبارک موقع پر تمام لوگوں کو تہنیت پیش کرتا ہوں اور ان کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے دعا گو ہوں۔

جے ہند

اکبر علی خاں

(ترجمہ)

۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء

جنوری

سیدہ حرمت الاکرام

یہ صبحِ روشن کہ زر فشاں ہے
افق پہ سورج کلاہیوں سے
یہ ایک تلوار روشنی کی
حیات کی رزم کوشیوں میں
حصول کو سرخرو کرے گی
بتائے گی رازِ فتح مندی

یہ وقت کی شاہ راہ پر
مشعلیں جلاتی، کراہتی ساعتوں
کے زخموں پہ مسکراتی
اترتی جاتی ہے تیرہ
لمحات کے دلوں میں
جمالِ فردا کا نور لے کر

یہ روشنی جلوہ زرا ہے
بڑھو کہ کتنا سفر پڑا ہے

کامیابیاں اور امکانات

عشرت علی صدیقی

سوشلزم کو ہندستان میں مقبول عام بنانے کا سہرا جواہر لال نہرو کے سر ہے۔ یوں تو ان سے پہلے بھی لوگ سوشلزم کی باتیں کرتے تھے مگر ان کی باتیں زیادہ تر کتابی یا علمی انداز کی ہوتی تھیں۔ جواہر لال جی نے عملی پہلو پر زور دیا، سوشلزم کے اصولوں کو عوام کی زبان میں بیان کیا اور ان اصولوں کی روشنی میں عوام سے متعلق مسئلوں کا حل تلاش کیا۔ ان باتوں میں نظریاتی کٹر پن نہیں تھا۔ وہ نہ تو اصطلاحات کے جھمیلے میں پڑے اور نہ انھوں نے کسی ملک کی آنکھ بند کر کے تقلید کی، جیسا کہ ان کے زمانے کے اور اس سے پہلے اور بعد والے سوشلسٹ کرتے تھے۔ اسی لیے اپنے نام کے ساتھ سوشلسٹ کا لفظ جوڑنے اور سوشلزم کے نظریات کا پرچار کرنے والے ادارے اور افراد سوشلزم کو مقبول بنانے کے لیے اتنا کچھ نہیں کر سکے جتنا کچھ جواہر لال جی نے کیا۔

آج سوشلزم ایک فیشن سا بن گیا ہے۔ پڑھے لکھے اور بے پڑھے لکھے دونوں طرح بیشتر لوگ یہ مانتے ہیں کہ ملک جن مسئلوں سے دوچار ہے ان کا سب سے جلد اور سب سے اچھا حل سوشلزم ہی کے ذریعہ نکل سکتا ہے۔ بین اقوامی سطح پر بھی سوشلزم سے وہ نفرت یا عداوت نہیں پائی جاتی جو روس کے انقلاب کے بعد پائی جاتی تھی اور جس کی جھلک بعض حکومتوں کی پالیسیوں میں ابھی دو سال پہلے تک دکھائی دیتی تھی۔ دنیا میں غیر سوشلسٹ ملکوں میں بھی بعض سوشلسٹ طرز کے اقدامات ہوئے ہیں اگرچہ سماجی ڈھانچہ کی نوعیت سرمایہ دارانہ ہونے کی وجہ سے ان اقدامات سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے۔ جن ملکوں میں صنعتی انقلاب پچھلی صدی میں آ گیا تھا اور جنھوں نے دوسرے ملکوں کے استحصال کا موقع پایا تھا ان میں بھی اگرچہ امیر غریب کا فرق اچھا خاصا ہے اور سوشلزم کے حق میں آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں لیکن وہاں عام معیار زندگی ہندستان جیسے پسماندہ ملکوں سے بہتر ہے اور اسی لیے ابھی وہاں سوشلزم کا گیت مدھم سروں ہی میں گایا جاتا ہے۔ پسماندہ ملکوں میں جنھیں ترقی پذیر ملک بھی کہا جاتا ہے، اس گیت کے سُر خاصے بلند ہیں۔

[illegible] ہندستان میں یہ گیت اتنا عام اور عوام میں اتنا مرغوب ہو گیا ہے کہ جو پارٹیاں اپنی ساخت اور مقاصد کے اعتبار سے غیر سوشلسٹ ہیں وہ بھی سوشلزم کا نام لینے لگی ہیں اور اونچے طبقوں سے جو لوگ سوشلزم کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں وہ بھی عام طور پر اس کی براہ راست مخالفت نہیں کرتے۔ یا پھر ہندستان میں جو سوشلزم لایا جا رہا ہے اس سے ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جن کا اس میں شائبہ تک نہیں ہے۔ مثلاً کبھی سوشلزم کو فرد کی آزادی کے منافی قرار دیا جاتا ہے، کبھی اس کو مذہب کا مخالف کہا جاتا ہے، اور کبھی اس قسم کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ سوشلسٹ سماج میں کسی کو گھر رکھنے، جانور پالنے، کوئی کاروبار کرنے اور کوئی کارخانہ کھولنے بلکہ اپنے بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق پرورش کرنے تک کی اجازت نہیں ہوگی۔ جمہوریت میں ہر شخص کو اپنی بات کہنے کی آزادی ہے اور چونکہ ہندستان کا سوشلزم جمہوری وضع کا ہے اس لیے یہاں سوشلزم کی مخالفت پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی ——— اور اسی لیے اگرچہ سوشلسٹ سماج کی تعمیر میں تاخیر ہو رہی ہے لیکن اس کی بنیادیں روز بروز زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتی جا رہی ہیں۔ ان پر عوام کا عقیدہ اس وجہ سے پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ وہ اپنے دکھوں کے علاج کے دوسرے طریقے آزما چکے ہیں اور سوشلزم کی سمت میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس سے سوشلزم مخالف پروپیگنڈے کی تردید ہو چکی ہے۔

[illegible] سوشلزم کے مخالف اور اس کے بعض حمایتی بھی

اس بنیادی بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ایک مخصوص قسم کا سوشلزم جو یہاں کے قومی مزاج سے مطابقت رکھتا ہے ایک ایسے طریقے سے لایا جا رہا ہے جو دنیا کے لیے نیا ہے لیکن جس کا تجربہ یہاں آزادی کی جدوجہد میں کیا جا چکا ہے۔ اس جدوجہد میں عدم تشدد کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور یہ تجربہ سو فیصدی کامیاب رہا۔ اب سیاسی جدوجہد کے اس طریقے کو معاشی جدوجہد میں اختیار کیا جا رہا ہے۔ دراصل سیاسی جدوجہد کو معاشی جدوجہد سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ معاشی قوتوں ہی سے سیاسی اور سماجی ڈھانچوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ ہندوستان کو برطانیہ نے بنیادی طور پر اپنے معاشی فائدوں ہی کی خاطر تقریباً سو برس تک محکوم بنائے رکھا۔ اور ہندوستان میں چھوت چھات کا رواج ذات پات کے جس نظام کا نتیجہ ہے وہ معاشی اغراض ہی کے تحت قائم ہوا تھا۔ ان اغراض نے آگے چل کر استحصال کی شکل اختیار کرلی۔ اور یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی کہ حکومت کے خلاف سیاسی جدوجہد میں بدیسی مال کے بائیکاٹ کو ایک حربے کی طرح استعمال کیا گیا۔ اس جدوجہد کے دوران ہی معاشی اور سماجی استحصال کے خلاف جدوجہد کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ جن لوگوں کو اچھوت سمجھا جاتا تھا ان کو گاندھی جی نے ہریجن یعنی خدا کے بندے کا لقب دیا اور آزادی کی جدوجہد کے دوران ہی قومی جماعت نے کراچی کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۱ء میں کلیدی صنعتوں کے قومی ملکیت اور کنٹرول میں رکھے جانے پر زور دیا۔ یہ سوشلزم تو نہیں پھر بھی اس کا ایک بنیادی اصول ہے اور ہندوستان کی منصوبہ بندی ۔۔۔ جس کی ابتدا آزادی سے پہلے قومی منصوبہ بندی کمیٹی کے ذریعے ہو چکی تھی آزادی کے بعد اسی اصول پر عمل کیا جا رہا ہے۔

جمہوریہ ہند کے دستور کی تمہید اور اس کے ہدایتی اصولوں میں سوشلزم کا نام لیے بغیر سوشلسٹ مقاصد شامل کیے گئے تھے۔ ہمارے پڑوسی ملک چین میں بھی انقلاب ہوا تھا۔ یہ سرخ انقلاب خون خرابے کی وجہ سے بہت زیادہ سرخ ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے چینی سوشلزم کی تعمیر میں بھی تشدد اور جبر کا عنصر نمایاں رہا۔ ہندوستان نے اپنے مختلف مزاج کی بنا پر اس سے مختلف راستہ اختیار کیا اور چونکہ چین والے انقلاب کی کئی مثالیں دنیا کی تاریخ میں موجود تھیں جن سے چینی لیڈروں کو مدد ملی ہندوستان میں جس طرز کا انقلاب آزادی کی شکل میں آچکا تھا اور منصوبہ بندی کی شکل میں آ رہا تھا اس کی کوئی سابقہ مثال نہیں تھی۔ ایشیا کے دو آزاد ملک تقریباً ایک ہی زمانے سے تاحال لوگ ان دونوں انقلابوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور اس طرح ہندوستان ایک آزمائش اور ایک مقابلے سے دوچار ہو گیا۔ چین بعض معاملوں میں ہندوستان سے آگے نکل گیا ہے مگر انسانی جانوں کے نقصان، فرد کی آزادی کے خاتمے اور طرز زندگی کے انتخاب اور جمہوریت کی بربادی کی شکل میں اسے بہت مہنگے دام ادا کرنے پڑے ہیں۔ آزاد چین کی نسبت آزاد ہندوستان کی حالت زیادہ خستہ اور وسائل نیز بیرونی امداد کے ذرائع بہت محدود تھے ۔۔۔ اور جمہوری قدروں کی پابندی اس پر مستزاد۔ پھر بھی ہندوستان میں سوشلزم کی گاڑی آگے بڑھی ہے۔ دنیا میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے اور اگر مجموعی طور سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی پیش رفت ناکافی ہونے کے باوجود ناقابل لحاظ اور کسی شرمندگی کا باعث نہیں ہے۔

جواہرلال جی نے کہا تھا کہ ہم سوشلسٹ نمونے کا سماج اپنے طریقے سے تعمیر کریں گے۔ یہ اپنا طریقہ اعتدال پسندی کا طریقہ اور ایسا طریقہ ہوگا جس میں ہمیشہ عوام کو اور ان لوگوں کو بھی، جن کے دلوں میں اس طریقے کے متعلق اندیشے یا عداوت ہے، ساتھ لے چلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوشلزم کے متعلق ان کا تصور یہ تھا کہ حکومت کو ہر فرد کو ترقی کے مساوی مواقع ملیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ایسا ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس نظام میں معاشی طاقت چند افراد کے ہاتھ میں مرکوز ہو جاتی ہے اور وہ اس طاقت کا بیجا فائدہ اٹھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس نظام کے حامی جب فرد کی آزادی کی دہائی دیتے ہیں تو دراصل وہ استحصال کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس استحصال کی ایک صورت یہ ہے کہ جب بڑے پیمانے کی صنعتوں اور تجارتوں میں بڑے سرمایہ داروں کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے اور بڑی صنعتیں اور تجارتیں چھوٹے پیمانے کی اور گھریلو صنعتوں اور تجارتوں کو ہڑپ کر جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں پیداوار کے بیشتر ذرائع پر چند افراد کا قبضہ ہو جاتا ہے اور وہ پیداواری نظام میں اپنے نجی منافع کو اولیت دیتے ہیں۔ اس طرح دولت کا گروہ سیاسی اور سماجی میدانوں میں اپنا غلبہ قائم کر لیتے ہیں کہ قوم پر ان کی گرفت مستحکم ہو جاتی ہے اور نابرابری برابر بڑھتی جاتی ہے۔

ہندوستان جب آزاد ہوا ہے تب یہاں اسی قسم کے حالات پائے جاتے تھے۔ برطانوی راج کی سرپرستی میں سرمایہ دارانہ نظام پنپ چکا

بیت گہرائی تک پہنچ چکی تھیں اور دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ ان کو یک لخت
سے کھینچ کر اکھاڑ دینا صرف یہ کہ بے حد دشوار تھا بلکہ اس طرح چاروں طرف
کی زمین بھی تھل پتھل ہو جاتی۔ اور ملک اس وقت جن دوسری دشواریوں
اور پریشانیوں سے دوچار تھا ان پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا۔ پھر بھی حالت
کو جوں کا توں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ان کو بدلنے کے لیے تدریجی طریقہ
اختیار کیا گیا اسی کو ملی جلی معیشت کہا گیا ہے جس میں ایک طرف صنعت و تجارت
اور ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کو برقرار رکھا گیا اور دوسری طرف قومی ملکیت
اور سرکاری کنٹرول میں رفتہ رفتہ توسیع کی جائے گی۔

آزادی کے بعد قومیانے کی کارروائی امپیریل بینک سے شروع ہوئی
اس لیے نہیں کہ اس کا نام 'امپیریل' یا شاہی تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی شاخیں
سب سے زیادہ تھیں۔ اس کو قومیانے کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ملک کے مختلف
حصوں میں پھیلی ہوئی چھوٹی بچت کی اور گھریلو صنعتوں کو امداد دی جائے
اور سرکار کے ایک اہم سوتے کو محض یا زیادہ تر بڑے سرمایہ داروں کے لیے
مخصوص رہنے سے روکا جائے۔ یہی مقصد زندگی کے بیمے کے کاروبار کو قومی
ملکیت میں لینے کا بھی تھا۔ لیکن ان دونوں اقدامات کی حیثیت ابتدائی
اور علامتی تھی۔ ان سے اسی قسم کے دوسرے اقدامات کے لیے راستہ ہموار ہوا
مگر ان دوسرے اقدامات سے پہلے ان کی مزاحمت کی تیاریاں بھی شروع
ہو گئیں۔ بڑے بڑے بینکوں کو قومی ملکیت میں لینے کی کارروائی اگرچہ ایک
ہی جست میں کر لی گئی مگر اس میں تقریباً اتنے ہی سال لگ گئے جتنے فوری
یہ کارروائی تھی [illegible] ہی ضرورت عام بیمے (جنرل انشورنس) کے
کاروبار کو قومیانے کی بھی تھی۔ سرمایہ فراہم کرنے والے ان اداروں کو قومی
ملکیت میں لے جانے کے بعد ان کی طرف سے سرمایے کی فراہمی میں قوم کے وسیع تر
مفاد اور سماجی انصاف کے تقاضوں کو اولیت دینا ممکن اور آسان ہو گیا۔
اب قصبوں اور دیہاتوں میں کثرت سے بینکوں کی شاخیں کھل گئی ہیں اور ایسے
لوگوں کو بھی بینک سے قرض ملنے لگا ہے جن کے پاس کوئی پونجی نہیں ہے۔ یہاں
تک کہ بہت سے لوگ جو پہلے کرایے کے رکشا چلاتے تھے اب بینک سے قرض لے کر
اپنے رکشا چلانے لگے ہیں اور چھوٹی چھوٹی قسطوں میں قرض ادا کرتے جا رہے
ہیں۔ ہینڈلوم اور پاورلوم رکھنے والے بھی بینک سے قرض چاہتے ہیں۔ ان کا مطالبہ
حکومت نے تسلیم کر لیا ہے اور اگرچہ ابھی تھوڑے ہی لوگوں کو قرض مل سکا ہے

مگر جو سلسلہ شروع ہو گیا ہے وہ بند ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق
ڈھانچے کی تبدیلی سے ہے۔

جس طرح امپیریل بینک کا اسٹیٹ بینک بنا دیا جانا ایک
علامتی اقدام تھا اسی طرح سابق والیان ریاست کے صرف خاص اور خصوصی
مراعات کا ختم کیا جانا بھی اتنا سرکاری پیسہ بچانے کے لیے نہیں تھا جتنا کہ
سماجی انصاف اور مساوات کے لیے فضا تیار کرنے کے لیے۔ سوشلسٹ ڈھانچے
میں یہ مراعات بے جوڑ ہیں اور جب ایک بار یہ فیصلہ ہو گیا اور عوام نے اس
کی توثیق کر دی کہ ہندوستانی سماج سوشلسٹ ڈھنگ کا ہو گا تو اس
کی راہ میں جو بھی رکاوٹیں آئیں انھیں دور کرنا ہو گا۔ ایک رکاوٹ سپریم
کورٹ کے ایک اکثریتی فیصلے سے پڑی تھی جس نے دستور میں مندرج
بنیادی حقوق سے متعلق دفعات میں ترمیم کے حق سے پارلیمنٹ کو محروم
کر دیا تھا۔ یہ حق بعض سابقہ فیصلوں میں یہی عدالت تسلیم کر چکی تھی۔ مگر
گولک ناتھ مقدمے کے فیصلے کے بعد پارلیمنٹ کے ترمیمی حق کی بحالی
کے لیے دستور میں ترمیم ضروری ہو گئی تھی۔ ایسی ترمیم پارلیمنٹ نے منظور
کر لی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ کوئی ایسا قانون جو دستور کے ہدایتی اصول
پر عمل درآمد کے لیے پاس کیا گیا ہے اس بنا پر رد نہیں کیا جا سکے گا کہ اس
سے کسی بنیادی حق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ مگر اب ترمیمی ایکٹ کو بھی
سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا ہے اور اسی عدالت میں دو ترمیموں کا معاملہ
بھی زیر سماعت ہے۔ ان میں سے ایک صرف خاص کے خاتمے سے متعلق ہے
اور دوسری میں بحق سرکار حاصل کی جانے والی جائداد کے عوض دیے جانے
والی چیز کو 'معاوضے' کے بجائے 'رقم' کہا گیا ہے تاکہ 'معاوضے' کا جھگڑا
قومیانے کی کارروائی کو روک نہ سکے۔

نابرابری میں کوئی بڑی کمی اور دولت
کی منصفانہ تقسیم ایسی کارروائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملک
میں ابھی ملی جلی معیشت کے تصور کو ترک نہیں کیا گیا ہے اور نہ مستقبل
قریب میں اس کا کوئی امکان ہے مگر دوسرے بنیادی تصورات اور
نظریات کی طرح یہ تصور بھی مطلق نہیں ہے اور حالات کی مناسبت سے
بدلتا ہے کہ یہ تبدیلی بعض بڑی صنعتوں کے قومی ملکیت میں لے لیے جانے
کے علاوہ درآمدی و برآمدی تجارت اور غلے کی تھوک تجارت کے سرکاری

انتظام میں سے لیے جانے میں جھلکتی ہے۔ بڑھتی ہوئی نابرابری اور گرانی سے عوام کو جو پریشانیاں لاحق ہیں انھوں نے ان اقدامات کو ناگزیر بنا دیا ہے۔ جو لوگ اپنے نجی زمرے کو اولیت دیتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ قومی زمرہ نجی زمرے کا مددگار رہے بلکہ اس کا تابع رہے۔ یہ تاویل سوشلزم کے اصول اور منصوبے کی روح اور عوام کی فلاح و بہبود کے خلاف ہے۔ اور قومی زمرے کے عادی ہونے کی جو بات شروع ہی سے کہی جاتی رہی ہے وہ قومی مفاد کے مطابق ہے۔ نجی زمرے کی طرح قومی زمرے کے اداروں میں بھی بعض خامیاں ہیں لیکن یہ خامیاں عمل کی ہیں' اصول کی نہیں۔ اور عمل کی خامیوں کی گرفت اور اصلاح قومی زمرے میں جتنی آسان ہے اتنی نجی زمرے میں نہیں ہے۔ قومی زمرے سے نجی زمرے کو ابھی تک جو امداد ملتی رہی ہے اس کا زیادہ تر فائدہ چند لوگوں کو ملا ہے۔ اس فائدے میں عوام کو شریک کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ حکومت یہ امداد عوام ہی سے وصول کیے جانے والے ٹیکسوں کی آمدنی سے دیتی ہے۔ فائدے میں عوام کی شرکت کی ضمانت انتظام میں حکومت کی شرکت سے مل سکتی ہے۔ اس لیے کہ جمہوریت میں حکومت عوام ہی کے ووٹوں سے بنتی ہے۔

جمہوری سوشلزم جو ہندستان کی خصوصیت ██████████ ہے سست رفتار ہونے کے باوجود اپنے اندر وسیع امکانات رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی تعمیر عوام کے رضاکارانہ تعاون سے ہوگی اس پر نکتہ چینی ہوتے رہنے سے اس کے ڈکٹیٹر شپ بن جانے کا امکان ختم ہو جائے گا اور اس میں کٹر پن نہیں آنے پائے گا۔ چونکہ سب لوگوں کو متبادل سماجی اور معاشی نظام عوام کے سامنے پیش کرنے کی آزادی حاصل رہے گی اس لیے سوشلزم پر عقیدہ رکھنے والوں کو لگاتار اس بات کی فکر رہے گی کہ وہ اسے عوام کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنائیں۔ جمہوری سوشلزم میں جہاں ایک طرف فائدوں کے یہ امکانات ہیں وہاں دوسری طرف اس بات کا خطرہ بھی ہے کہ جمہوریت کی آڑ اتنے زور سے اٹھائی جائے کہ سوشلزم کا سر دب جائے۔ سوشلزم کے مخالفوں نے بعض دوسرے ملکوں میں ایسا ہی کیا ہے اور ہندستان کو اگرچہ کسی ملک کی اندھی تقلید نہیں کرنا ہے مگر وہ دوسرے ملکوں کے حالات اور واقعات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا اور ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

★

نغمۂ آزادی

عزیز سلطانی ★ ★

ہے رہبرانِ وطن کو سلامِ آزادی — انھیں سے ہم کو ملا ہے پیامِ آزادی

وہی جنھوں نے بہایا قدم قدم پہ لہو — انھیں کے نام سے روشن ہے نامِ آزادی

تمھیں نے پھونکی ہے ہر ایک دل میں روحِ عمل — شہید و تم ہو حیاتِ دوامِ آزادی

ہمارے ظرف کا اب امتحان ہوتا ہے — چھلکنے پائے نہ ہاتھوں سے جامِ آزادی

روش روش پہ سبھی ساکنانِ گلشن کو — سُنا رہے ہیں گُل تر یہ پیامِ آزادی

شفق فلک پہ گلستاں میں گل یہ کہتے ہیں — ہمارے دم سے ہے رنگِ دوامِ آزادی

چمن میں جذبۂ عیش و خوشی کو عام کرو — فسردہ دل کو سناؤ پیامِ آزادی

رہے نہ زاہد و بادہ گسار کی تفریق — ہر ایک لب پہ نظر آئے جامِ آزادی

حیاتِ نو کے ترانوں سے گونج اٹھی دنیا — فضا پہ چھا گیا حُسنِ دوامِ آزادی

دیا ہے ہم نے زمانے کو درسِ بیداری — ہمارے نام سے زندہ ہے نامِ آزادی

انھیں وطن کے شہیدوں نے آبرو رکھ لی — انھیں کو کہتی ہے دنیا امامِ آزادی

ابھر رہے ہیں جو آپس میں نظمِ گلشن پر — سمجھ نہ پائے وہ درسِ نظامِ آزادی

عزیزؔ اہلِ وطن کو جگا رہا ہوں میں
ہے میرے شعروں میں روحِ کلامِ آزادی

غزل

* فضا ابن فیضی

کسے خیالِ زیاں، منچلوں کی بستی میں
بنالے ہم نے تو گھر زلزلوں کی بستی میں

تمہارے شہر میں ہم سے ادا شناس کہاں
خریدیں زخم، رسیلے پھلوں کی بستی میں

اداس اداس ملے گیسوؤں کے سائے بھی
کچھ ایسی دھوپ پڑی دل جلوں کی بستی میں

دھواں دھواں نہیں میرا وجود ہی تنہا
ہر ایک شخص ہے گم سانولوں کی بستی میں

یہاں تو سائے بھی دیوار سے گریزاں ہیں
چلو قیام کریں، جنگلوں کی بستی میں

دریچے خوابوں کے کھولو ذرا کہ شام ہوئی
شفق اترنے لگی آنچلوں کی بستی میں

زمین چھوڑے قدم تو کسی طرف نکلیں
ملا مکان ہمیں دلدلوں کی بستی میں

سحر کو شعلۂ نم خوردہ ہو کے اٹھے ہم
وہ برف رات گری ولولوں کی بستی میں

کہیں لہو کی صلیبیں نہ آگ کی زنجیر
بجھا بجھا سا ہوں کم حوصلوں کی بستی میں

وہ لمحے ہائے جو اپنی تلاش میں بیتے
گزار آیا ہوں صدیاں پلوں کی بستی میں

جلا کے شمعِ بصیرت دھواں بنے لوگ
کبھی یہ دھند نہ تھی مشعلوں کی بستی میں

مثالِ آئینہ بے داغ رہنا مشکل تھا
کہ عمر اپنی کٹی کاجلوں کی بستی میں

ہمیں پہ پھینکے گئے سنگِ احتساب بہت
اکیلے ہم ہی برے تھے بھلوں کی بستی میں

اے نجدِ لکھنؤ! وہ بوریا نشین تھا کون
جو سنگسار ہوا مخملوں کی بستی میں

نہیں تھی پرورشِ زہرِ آگہی آساں
میں سانپ بن کے رہا صندلوں کی بستی میں

تجھے ملیں گے کہاں اے شعورِ آوارہ
ہم ایسے اہلِ نظر پاگلوں کی بستی میں

فضا کو آس بھی کیا کیا نہ دوستوں سے مگر
یہ کھیت سوکھ گیا بادلوں کی بستی میں

ہندستانی مصوّری اور قومی یکجہتی

عرش ملسیانی

ہندستانی مصوری کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کے متعدد دور ہیں۔ قدیم فن مصوری، مغل آرٹ، راجپوت یا راجستھانی مصوری۔ پہاڑی اسکول جس میں کانگڑہ، بسوہلی اور گڑھوال کے تینوں مکتبہ ہائے مصوری آجاتے ہیں۔ کشمیری اور دکنی مصوری کے الگ الگ انداز اور دور ہیں۔ عوامی رقص اور لوک گیت کی طرح عوامی مصوری کا بھی جداگانہ مقام ہے۔ ان سب کا دور ارتقا اور ان کا انحطاط بھی مطالعہ طلب ہے۔ آخر میں جدید فن مصوری کا زمانہ آتا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ اس فن لطیف میں بھی ہندستان کے گوشہ گوشہ میں اس کے عوام نے ایک مشترک حصّہ لیا ہے اور یکجہتی کا ثبوت دے کر ہمہ رنگی میں یک رنگی کا ثبوت دیا ہے یعنی اثر قبول کرنے میں ایک دور نے دوسرے دور کی پیروی سے گریز نہیں کیا۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب موہن جوداڑو اور ہڑپا کے مقامات پر مبنی ہے۔ یہ زمانہ ۰۰ ۴ ہزار سے لے کر ۲۲۵۰ قبل مسیح کا ہے۔ ان مقامات کی کھدائی میں بے شمار مہریں دستیاب ہوئی ہیں جو تجارتی سامان پر لگانے کے لیے بنائی جاتی تھیں۔ ان پر سانڈ اور دوسرے جانوروں کی تصویریں بنی ہیں لیکن ان کو چھوڑ کر برتنوں کے جو لاتعداد ٹکڑے ملے ہیں ان پر بہت سے خاکے نظر آتے ہیں جن سے مصوری کا خوش آئند تصور اور ڈیزائن کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ یہ خاکے ہرن، بکری، گیدڑ، اور شیر کے علاوہ پتّوں، درختوں، پرندوں اور بعض اوقات موروں کو ظاہر کرتے ہیں۔

ویدوں میں تصویر کشی کے بہت سے اشارے ملتے ہیں۔ رگ وید میں چمڑے کی بنی ہوئی اگنی دیو کی تصویر کا ذکر موجود ہے۔ مہابھارت میں اوشا اور اس کی سہیلی چترلیکھا کا ذکر پایا جاتا ہے جس میں اوشا ایک خواب دیکھ کر کسی نوجوان راجکمار پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ چترلیکھا نے اسے بہت سے راجکماروں کی تصویریں کھینچ کر دکھائیں۔ اوشا کی نظر کرشن جی کے پوتے انیرودھ پر پڑی اور اس نے اسے پہچان لیا۔ پرانوں میں بھی اسی طرح تصویر کشی کا ذکر آتا ہے۔ پانینی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایک جاپانی محقق نے تو بات ہی صاف کر دی ہے۔ اس میں ویدک رشیوں کی تصویریں ہیں۔ وششٹ کی اور اگستیہ رشی کی تصویر ہے اور اتریہ رشی کی تصویر اس کی اہلیہ کے ساتھ ہے۔ وششٹ کی تصویریں ہیں۔ ایک میں وہ بیٹھا ہے اور ایک میں چل رہا ہے۔ بعد کے زمانے میں چترکش اور شلپ شاستر میں تصویر کشی پر دو مستند کتابیں لکھی گئی ہیں واتسائن کے کام شاستر میں کلا یا مصوری کے اجزا کا مکمل ذکر ہے۔

اس کے بعد بدھ مت کے دور کی مصوری کا ذکر ضروری ہے۔ بدھ بھکشو جب دوسرے ملکوں میں جاتے تو بدھ کے پہلے جنم کے قصے تصویری شکل میں لے جا کر لوگوں کو دکھاتے اور انھیں متاثر کرتے۔ ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ہندستانی مصوری کا اثر جاپانی اور چینی مصوری پر بھی پڑا۔ روایت ہے کہ گوتم بدھ کے ہم عصر راجا بمبسار کے ایک درباری مصور نے بدھ کی پہلے پہل تصویر بنائی۔ سندھ کے ایک راجا کے تحائف کے بدلے میں کپڑے پر بنی ہوئی یہ تصویر بمبسار نے سندھی راجا کو بھیجی۔ یہ خاص طور پر بدھ کی ہدایت کے بموجب تیار کی گئی تھی اور اس میں بڑی ہنرمندی سے رنگ بھرے گئے تھے۔ تصویر کے نیچے کئی طرح کی نظمیں لکھی تھیں اور ان پر بدھ دھرم کے اصول بھی لکھے ہوئے تھے۔ راجا اس تصویر کو پاکر بہت

[illegible] اور ہیں ہے اس کی بڑی دھوم دھام سے شادی کی۔
اجنتا اور باگھ کے غاروں میں کوئی تصویر ایسی نہیں جس میں شہوانی عنصر ہو۔ البتہ اس دور کے معاشرے اور زندگی کی جھلکیاں ضرور ملتی ہیں۔ بھکشوؤں کو ایسے غاروں میں جانے سے منع کیا گیا تھا جہاں تصویروں میں شہوانیت کا عنصر ہو۔

سنگ تراشی اور مصوری کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس کے مظہر ہمارے منقش غار ہیں جن میں اجنتا اور باگھ کے غاروں کا ذکر تو آ ہی چکا ہے ان کے علاوہ اور بھی بے شمار گپھائیں ہیں۔ غار ہیں۔ مثلاً ایلورا، کنہیری، بیدسا، بری محتسار، ایلیفنٹا یہ ایسی جادو کی ڈبیاں ہیں کہ انھیں کھولو تو ہیرے اور جواہر نکلیں گے۔ نقاشی اور سنگ تراشی کے جو خزانے ان میں جمع ہیں وہ کہیں نہیں۔ یہ فن ہندستان کی تہذیبی صورتِ حال کی آئینہ داری کرتا ہے۔ یہاں کے لباس، رہن سہن، مردوں عورتوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ، جانوروں کی اچھل کود، پرندوں کا پھدکنا، دریائی طوفانوں میں مانجھیوں کا زور، عوامی اور قومی رقص کس چیز کو ظاہر نہیں کرتا۔ اجنتا نقاشی کا سب سے بڑا بھنڈار ہے۔

اجنتا کی تصویریں تو ہمارا لازوال تہذیبی ورثہ ہے۔ اطالیہ میں فلورنس اور وینس کے مشہور زمانہ نقاشوں نے بھی فن کے کمال کو معراج پر پہنچا دیا تھا۔ ہمارے یہاں بھی سانچی اور بھارہٹ میں فن کے محیر العقل مظاہرے ہوئے۔ لیکن اجنتا کے ماہروں نے تو اس چلتی پھرتی دنیا کی باتیں کیں۔ انھوں نے تو کسی محیر العقل بات کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ان کی ہر بات میں روزمرہ کی زندگی ہے۔ خواہ وہ مذہبی تقدیس کی بات ہو خواہ دوسری۔ مبصرین ایک تصویر کا تو خاص طور پر ذکر کرتے ہیں جب کہ رانی دم مرگ لیٹی ہوئی ہے اور تیمار دار نبض پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ سارے ماحول کا منظر اتنا غمناک اور فطری طور پر تاسف انگیز بنایا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ عوام، اعزہ اور دوسرے جو موجود ہیں جمع ہیں دل تھامے ہوئے اپنے چہروں پر عجیب کیفیتیں لیے ہوئے ہیں۔ کوئی دعا میں مصروف ہے اور کوئی پیار بھرتا ہے۔ الغرض یہ مرقع بے مثال انسانی جذبات کا اظہار اس سے بہتر دنیا کی کسی تصویر میں نظر نہیں آتا۔ یہیں سے ہماری قومی یک جہتی کی ابتدا ہوئی۔ ہر شخص، خواہ کسی نقطۂ نظر کا مالک ہو ان تصویروں میں جامد و ساکت یا متحرک کناں

[illegible] ہے۔ جانوروں اور پرندوں کی کائنات موجود ہے۔ ایک خیال ہے کہ جس کی قدرتی ابتدا ہوئی۔ ایک معاشرہ ہے کہ جس کا نقشہ کھینچا گیا۔ بدھ، جین، آشک، تانک کسی کی تمیز نہیں تھی۔ زندگی کا عکس جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ہزار رنگوں سے ہے۔ پوجا ہے، شامیانے اور ان کے نیچے اجتماع ہیں، پن گھٹ، کنوئیں، تالاب، بالوں کا سنوارنا، آئینہ الغرض کیا کچھ نہیں۔ اجنتا کا نقاش اس بات سے باخبر تھا کہ ہندستان کے قرب و جوار اور دور دراز کے ملکوں میں نقاشی نے کیا رنگ اختیار کیا ہے۔ خیال آتا ہے کہ کیا اس نے یہ سب کچھ ریاضت کی تعلیم اور گیان دھیان کے لیے کیا تھا یا وہ تقدیس اور سیکولر عناصر کو ہم بغل کرنا چاہتا تھا۔ غالباً اس کے دونوں مقصد تھے اور دونوں عرفانی بھی ہیں اور ارفع بھی۔

دسویں گیارہویں صدی تک مصوری اپنے اس چلن پر چلتی رہی۔ گو اس کے عروج و زوال کے دور بھی آتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کے آنے کے بعد ایرانی اثرات بھی ہمارے فنونِ لطیفہ میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ مالوے میں شادی آباد مانڈو، اتر پردیش میں جونپور جہاں کے شرقی خاندان موسیقی کے پرستار اور فن کار تھے، گجرات میں احمدآباد یہ سب ادبی اور تہذیبی مراکز تھے۔ اس زمانے میں خواص اور عوام کے لیے مصوری نے کچھ قابلِ قدر کوششیں کیں۔ نعمت نامہ اور لورچندا تو خواص کے سلسلے کی مثالیں ہیں۔ عوامی سلسلے میں بڑا یک جہتی کا کام ہوا۔ جین پستکوں کی نقاشی کے علاوہ مہابھارت، رامائن، گیت گووند اور عشقیہ فسانے اور کچھ فارسی کی کلاسیکی کتابوں کے منقش و مصور نسخے تیار ہوئے۔

بابر بڑا صاحب ذوق بادشاہ تھا لیکن اسے ہندستان میں آئے کل چار سال ہوئے تھے کہ اس نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ہمایوں کو شیر شاہ نے مار بھگایا۔ اس کی شکست مصوری کے لیے ایک طرح سے آیۂ رحمت ہوئی۔ شیر شاہ کی مدت کے بعد ہمایوں شاہ عباس صفوی کی مدد سے ہندستان پر پھر فتح یاب ہو گیا۔ ہمایوں پہلے کئی سال کابل میں رہا۔ اکبر اس کے ساتھ تھا۔ ہمایوں ایران کے دو مشہور مصوروں کو ساتھ لے آیا تھا جن کے نام ہیں میر سید علی اور عبدالصمد۔ اکبر ان سے متاثر ہوا اور یہ مغل مصوری کے لیے ہندستان میں فالِ نیک تھی۔

بابر فنون لطیفہ کا بڑا قدردان تھا۔ مصوری میں اس نے بہزاد
کی بہت تعریف کی ہے۔ میر سید علی اور اس کا باپ تصویر بہزاد کے شاگرد
تھے۔ عبدالصمد شیریں قلم کے نام سے مشہور ہے۔ میر سید علی اور عبدالصمد نے
ایک چاول پر چوگان بازی کا نقشہ دکھایا تھا۔ اکبر نے ان کے ذمے حمزہ نامہ
کو مصور کرنے کا کام سپرد کیا تھا۔ اس میں ۱۲۰۰ تصویریں ہیں اور
ان کی تکمیل میں ایرانی اور ہندستانی دونوں قلم استعمال ہوئے ہیں۔ بخارا،
مشہد اور شیراز کا اثر تو ان تصویروں میں قطعی طور پر ظاہر ہے لیکن مصوروں
نے کشمیر اور نیپال کے عناصر داخل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان دو
استادوں کے علاوہ قریب قریب پچاس اور مصور اس کام پر مامور تھے۔
طوطی نامہ کی تصویریں جو ۱۵۷۶ء میں مکمل ہوئیں اس ایرانی اور
ہندستانی مصوری کے امتزاج کو ظاہر کرتی ہیں۔ اکبر چھوٹی چھوٹی تصویروں
کا بڑا عاشق تھا۔ اس نے ۱۵۸۸ء میں دیوانِ انوری کا ایک مصور نسخہ
تیار کروایا جو نہایت ہی نفیس اور باریک کاغذ پر ہے اور جس پر جانوروں، پرندوں
اور پھولوں کی سنہری تصویریں ہیں۔ مصور "بابر نامہ" بھی تیار ہوا تھا۔ بہت
سے مصوروں نے اس میں کمال دکھایا ہے۔ لیکن جہاں جہاں اکبر کی زندگی
کا کوئی ڈرامائی واقعہ مصور کیا گیا ہے وہ بے مثال بھی ہے اور ایسی تصویروں
میں صنعت کی یکسانیت بھی ملتی ہے۔ اکبر کو ہندو مذہب سے بڑی ہمدردی
اور محبت تھی۔ اس لیے اس نے مہابھارت، رامائن، اور ہری ونش
کا فارسی ترجمہ کروایا اور ان میں بہت ہی انمول تصویریں بنوائیں۔ ان سے
ان رزم ناموں کی شان ہی نہیں دوبالا ہوئی بلکہ معاصرانہ رسم و رواج
کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اکبر کے دور میں مصوری کا یہ امتزاج اپنے کمال کو پہنچ گیا۔
ابوالفضل نے آئین اکبری میں بہت سے مصوروں کے نام درج کیے
ہیں جو حسب ذیل ہیں:

میر سید علی، خواجہ عبدالصمد، فرخ قلم، مسکین، دسونت، بساون،
کیشولال، مکند، جگن ناتھ، مادھو، مہیش، کھیم کرن، تارا، سانولا، ہری
ونش اور رام۔

دسونت عبدالصمد کے عزیز شاگردوں میں سے تھا۔ وہ شاہی
ٹکسال کا مہتمم بھی رہا تھا۔ بساون کے باب میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ
طراحی، چہرہ کشائی اور مانند نگاری میں بے مثل ہے۔

[illegible]
اور بساون نے مزین کیا۔ اسی طرح [illegible]
اور [illegible] کی تزئین کاری بھی ہوئی جس پر [illegible]
مامور تھے۔

پھر مختصر شبیہ سازی کا دور چلا۔ اکبر نے اپنے امرا کی شبیہیں
تیار کروائیں۔ امرا کو زریں لباس اور طلائی ہار پہنے ہوئے خوبصورت
گھوڑوں پر سوار دکھایا گیا ہے۔ ایک تصویر میں فیضی اور تان سین کو
اکٹھا دکھایا گیا ہے۔

جہانگیر کے زمانے کی تصویروں میں عورتوں کے حسین چہروں
اور جام و مینا کی جلوہ گری زیادہ ہے۔ مختصر شبیہ سازی اور تزئین
کاری کو بھی فروغ ملا۔ منصور نے جانوروں کی چند تصویریں بنائیں۔ جہانگیر
نے اسے نادر العصر کا خطاب دیا تھا۔ دریاؤں کے مناظر، گھنگھور گھٹائیں اور
پس منظر میں کنول کے پھولوں کی افراط نے ہندستانی اثرات کی فراوانی
کو ظاہر کیا۔ بشن داس اس زمانے میں شبیہ سازی میں یکتا مصور تھا۔
جہانگیر کے زمانے میں مصوری میں یک جہتی اور ہمہ گیری نے عروج پایا۔
راجپوت امرا اور دولت مند تاجروں نے مصوروں کو ملازم رکھنا
شروع کر دیا۔ اس سے کم سے کم فن کی سرپرستی تو ہوئی۔ اس طرح
مغل فن مصوری میں راجستھانی عناصر داخل ہونا شروع ہو گئے۔

شاہ جہاں کے دور میں تعمیرات پر زیادہ توجہ ہوئی لیکن مصوری میں
بھی فقیر اللہ خاں ایسے استاد پیدا ہوئے۔ اس دور کی مصوری میں طلائی
کام بہت ہے۔ شاہ جہاں کا بڑا بیٹا دارا شکوہ مصوری کا دلدادہ
تھا۔ اس کا ذکر غلام محمد کی مشہور تصنیف تذکرۂ خوش نویسان
میں ملتا ہے۔ دارا شکوہ کے مرقع میں ہند ایرانی آرٹ کی چالیس تصویریں
ہیں۔ ان کی مکمل تصنیف بکرماجیت حسرت کی انگریزی کتاب "دارا شکوہ"
میں ملتی ہے۔ اورنگ زیب فطرتاً مذہبی آدمی تھا۔ اس کے اجداد نے
فنون لطیفہ کی جو سرپرستی کی تھی اس نے جلد ہی بند کر دی۔ اس
کے بعد صرف محمد شاہ رنگیلا ان فنون کا دلدادہ تھا جو نادر شاہ کی
لوٹ کھسوٹ کے بعد اس قدر مجبور و قلاش ہو گیا کہ مرکزی
سرپرستی ختم ہو گئی اور فن کار صوبائی دارالخلافوں کی طرف

بنانا گھٹنے لگے۔ اصل میں یوں کہیے کہ مغل آرٹ جو پہلے ہی مرنے لگا تھا اب ہم تقسیم ہو گیا۔

راجپوت اسکول سولھویں صدی عیسوی کے آخر سے اٹھارھویں صدی کے آخر تک اپنے نصف النہار پر رہا بلکہ انیسویں صدی کے آغاز میں بھی باقی تھا۔ مصوری کی یہ شاخ راجپوت شاہی خاندانوں کی سرپرستی سے فروغ پذیر رہی مثلاً اودے پور، چاوند، چتوڑ، میواڑ، بیکانیر، جے پور اور جودھ پور۔ اس کے ساتھ ساتھ راجپوتی رزم و بزم کی شاعری بھی تھی یہ راجستھانی جاگیرداروں کے کلچر کے اظہار کا ایک ذریعہ تھی اور ان کا منبع قطعی نہیں تو زیادہ تر دیشنو دھرم کی گاتھائیں تھیں۔ مصوری میں درباروں کا شکوہ، عشق و محبت میں درباری تفوق، گھوڑے کی سواری، شکار، قلعے کا محاصرہ اور لڑائی کا نقشہ عام تھا۔ اس کی صدائے بازگشت مشرق میں آسام بنگال اور اڑیسہ تک، مغرب میں گجرات اور سوراشٹر تک، شمال میں ہمالہ کے علاقوں میں اور جنوب میں دکن تک پہنچ گئی۔ کیونکہ اس زمانے میں ان علاقوں تک راجپوتی فوجوں اور تجارت نے راہ پیدا کر لی تھی۔

۱۶۰۵ء میں رانا پرتاپ کی سرپرستی میں رنگ مالا سلسلے کی تصادیر تیار ہوئیں معلوم ہوتا ہے کہ ان تصادیر کے فن کار 'حمزہ نامہ' جیسے رزمیہ کو مصور کر چکے ہیں۔ لیکن راجپوتی فن یکساں طور پر ترقی پذیر معلوم نہیں ہوتا۔ فن کاری کے اعتبار سے ۱۶۲۸ء کی تصویریں ۱۶۳۴ء کی 'رسک پریہ' کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ یوں تو سترہویں صدی میں بڑا کام ہوا لیکن اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں راجستھانی تصویروں کی تخلیق بہت زیادہ ہوئی۔ درباروں کے تفریحی مشاغل اور شکار وغیرہ کے علاوہ راجپوت رجواڑوں کی رقص و سرود کی محفلیں بھی ان تصویروں کا موضوع تھیں۔

رنگ مالا کی تصادیر پوری طرح قدیم جذباتی خصوصیت کی حامل ہیں۔ یہ میواڑ اسکول سے تعلق رکھتی ہیں جس کے عام موضوعات میں بھگوان کرشن کی زندگی کے واقعات، عصری شاعری کا نایک نائکہ بھید، راگ راگنیوں کا رحرباتی روپ، مختلف موسم اور عشق و محبت شامل ہیں۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ہاتھیوں، گھوڑوں اور جنگوں کی تصادیر بھی ملتی ہیں۔

داستان قرونِ وسطیٰ میں سرداروں اور راجاؤں کی بہادری اور شجاعت کا زمانہ تھا۔ راجپوتوں نے میدانِ جنگ میں لڑ مر جانا مگر ہر تکلیف و مصیبت سہنے کے انداز سیکھے تھے۔ اس زندگی کو بھاٹوں کی رزمیہ نظموں اور روز روز کی لڑائیوں نے ایک اونچا عزم اور کردار عطا کیا تھا۔ وہ رام اور کرشن کے مثالی بھگت ہو گئے اور ان کی زندگی سے متعلق لاتعداد واقعات اور کیفیتوں کی تصویر کشی کرنے لگے۔ انہوں نے نایک اور نائکہ کو ہجر و وصال، عشق و محبت اور نہ جانے کس کس روپ میں پیش کیا۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ راجپوتی مصوری خالص ہندستانی رہی اور اس پر مغل آرٹ کا سایہ نہیں پڑا۔ زمانی اعتبار سے دونوں کا زمانہ قریب قریب ایک ہے۔ یہ درست ہے کہ قطعی طور پر ایک نے دوسرے کو تبدیل نہیں کر دیا لیکن دونوں میں ہندستانیت کے بڑے اجزا ہیں اور دونوں میں لین دین ہوا۔

سترہویں صدی کی راجپوتی مصوری میں بڑا رچاؤ اور آہنگ ہے۔ خاکے بالکل سادہ نہیں اور رنگ گوناگونی کے باوجود بھڑکیلے اور آنکھوں کو برا لگنے والے نہیں۔ ایک سادگی اور متانت کا اجتماع ہے۔ اس مصوری میں جذبات اور شاہانہ پن ہے لیکن پھر بھی تصویری انداز اس میں زیادہ ہے۔

اٹھارہویں صدی میں مغل دربار سے راجپوتوں کی وابستگی اور مغل آرٹ کے آرٹسٹوں سے راجپوت آرٹسٹوں کے میل جول نے یک جہتی کے لیے ایک نیا میدان پیدا کر دیا جس کے آثار بعد میں قطعی طور پر ظاہر ہو گئے۔ میواڑ، مارواڑ، بونڈی اور کوٹا، بیکانیر، جیسلمیر، جے پور، کشن گڑھ اور مالوے کے الگ الگ انداز تھے۔ امتدادِ زمانہ سے یہ سب اپنا اپنا کمال دکھا کر زوال پذیر ہو گئے اور آج کل جو کچھ باقی ہے اس میں نہ نانڈو کا کلپ سوتر ہے نہ سورن سنگھ اور جگت سنگھ کی مغل ٹکنیک رہی اب تو درختوں، شیروں اور پہاڑیوں کے گہرے بھورے گلابی اور سبز رنگ رہ گئے ہیں جنھیں سستی مصوری کہنا چاہیے۔ لیکن راجپوت مصوری کی ہندستان کو دین ایک لازوال خزانہ

ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا اور جس کا نقش بڑا پائدار ہے۔

یہ راجپوتی مصوری بالآخر گھر کرتی ہوئی ہندستان کے پہاڑی علاقوں میں پہنچ گئی جن میں بسوہلی اور کانگڑہ کی وادی کے علاوہ گڑھوال شامل ہے۔ سترہویں صدی میں بسوہلی میں تصویروں کا ایک سیلاب آگیا اور یہ تصویریں میواڑ کی مصوری سے بہت مماثلت رکھتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اورنگ زیب کے دربار سے موقوف شدہ یا مایوس مصور ادھر چلے گئے یا بسوہلی کے راجہ نے انھیں خود طلب کرلیا۔ بسوہلی جموں کے علاقے میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو اب وہاں کی ایک تحصیل ہے۔

پہاڑی علاقے کے عوامی آرٹ اور مغل مصوری کی تکنیک کے امتزاج سے بسوہلی قلم وجود میں آیا۔ اس اسلوب میں چہروں کی بناوٹ مقامی انداز کی ہے۔ مردوں کے لباس مغل انداز کے ہیں جن میں جامہ اور پٹکا بھی شامل ہے۔ اور عورتوں کے لباس میں چولی، ساری اور گھاگھرے کی طرح کا لہنگا ہے۔ اس طرح مقامی اسلوب کی خاصی نشان دہی ملتی ہے۔ بسوہلی کی تصویروں میں ایک خاص توانائی ہے۔ ان میں 'رس منجری' اور 'گیت گووند' کے موضوعات کو بڑی چابک دستی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ بسوہلی تصویروں کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں بادل بجلی اور بارش کی واضح تصویر کشی کی گئی ہے۔ بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں، بادلوں کے جھنڈ اور ندیاؤں کی چکردار لہروں کی ان تصویروں میں اچھی خاصی منظر کشی ہے۔ جھیلوں کے گرد بگلوں اور کنول کے پھولوں سے آراستگی کی گئی ہے۔ شروع شروع میں تو ان تصویروں میں برج، تختوں والے دروازے جالی دار کھڑکیاں، پتھر کی جالیاں، روغن کیے ہوئے لکڑی کے کھمبے بنائے جاتے تھے۔ یہ سترہویں صدی کی باتیں ہیں۔ ان کا طرز مغل راجستھانی امتزاج والا طرز ہے۔ قالینوں سے سجے ہوئے کمرے، آرام گاہوں میں شراب کی بوتلیں اور سامانِ آرائش و تعیش ہوتا تھا جہاں شہزادے معشوقاؤں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تھے۔ ان تصویروں میں درخت اشارتی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہجراں نصیب محبوبہ بید کی جھکی ہوئی شاخوں کے نیچے کھڑی دکھائی گئی ہے۔ پختہ آم عورت کے جسمانی گداز کی غمازی کرتا ہے۔ ان تصویروں میں عورتوں اور مردوں دونوں کو زیوروں اور مالاؤں سے آراستہ دکھایا گیا ہے۔ ڈوگری انداز کا لباس تو غیر معمولی بات ہے۔ ... مغلیہ دور کا گھیردار پاجامہ اور ... کی ... چوڑی ... عورتیں چست پاجامے میں نظر آتی ہیں۔ دھاری دار چولی اور ... کی پشواز ہوتی ہے۔ جموں کے علاقے کی عورتوں کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں ان کے جسمانی حسن میں اضافے کا موجب دکھانے میں مصوروں نے کمال کردیا ہے۔

کانگڑہ کی مصوری کے تین مرکز گلیر، نورپور اور تراسجان پور ہیں۔ اول الذکر دونوں میدانی علاقے میں ہیں۔ گلیر کی مصوری کی روایت بہت پرانی ہے۔ یہاں کے مختلف مہاراجاؤں روپ چند، بلرام سنگھ، راج سنگھ اور دلیپ سنگھ کی شبیہیں موجود ہیں۔ راجہ گوردھن چاند کے زمانے میں سب سے زیادہ تصویریں بنائی گئیں۔ مغل اسکول کے امتزاج سے کانگڑہ مصوری نمودار ہوئی۔ تراسجان پور میں راجہ سنسار چند کی سرپرستی میں بہت تصویریں بنائی گئیں۔ یہ زمانہ ۱۷۷۵ء سے ۱۸۲۳ء کا ہے۔ دریائے بیاس کے کنارے عالم پور اور نادون کے راجہ ائرودھ چند نے بھی مصوری کی بڑی سرپرستی کی حالانکہ اس کا زمانہ سکھوں کے ساتھ جنگ آزمائی کا زمانہ تھا۔

سرپرستوں کے مذاق کے مطابق اس میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ بالآخر اس مصوری میں ایک غنائیت آگئی۔ خطوط ایجاز اور خوش اسلوبی کے ساتھ کھینچے جانے لگے۔ عورتیں زیادہ دھان پان اور نازک بنائی جانے لگیں۔ ان کی آنکھیں بڑی لانبی اور خمیدہ ہیں۔ گویا یہ حیا کی کرشمہ کاری ہے۔ گہرے رنگ سے رنگی ہوئی انگلیاں بڑی لمبی ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں اس اسکول کی پیدائش اور انیسویں صدی میں اس کا دورِ انحطاط ایک بڑا المیہ ہے۔

کانگڑہ مصوروں کے عام موضوعات یہ ہیں:

۱۔ اپنے سرپرستوں کی شبیہیں یا ان کے درباروں کے منظر

۲۔ اورچھا کے مشہور ہندی شاعر کیشوداس کی مشہور نظم 'رسک پریہ' کے اشعار کی تصویریں جن میں محبوبہ کے ہجر و وصال کی کیفیات کا چابک دستی سے اظہار کیا گیا ہے۔

۳۔ بارہ ماسہ یعنی بارہ مہینوں کی کیفیات کی شاعرانہ عکاسی اور

۴۔ بنگال کے مشہور جے دیو کی معرکۃ الآرا نظم 'گیت گووند' میں

منظر دکھایا گیا ہے۔ رادھا کرشن کے محبت بھرے لمحوں کی تصویر کشی سا اس کے ساتھ ہی پہاڑی زندگی کی سست سی ، بھاگوت پُران اور مشہور رزمیہ نامے رامائن اور مہابھارت کے سین کی تصویر کشی بھی۔

اس وادی کے مصوروں کو فطرت سے خاص لگاؤ تھا۔ دریائے بیاس کی وادی فطرت کے دلآویز مناظر سے بھرپور ہے۔ خم کھاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ان کے اوپر شاخیں پھیلائے ہوئے ہیں، برگد یا آم کے پیڑ۔ ان کی اوٹ میں چھپے ہوئے پہاڑی کسانوں کے گھر، حد نظر تک دور برفانی چوٹیوں کے منظر، برفانی پانی سے بھری ہوئی جھیلیں، ٹیڑھے میڑھے کھیتوں سے گزرتی ہوئی ندیاں، آبی جانور جن میں سارس یا بگلے بھی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سارا مقامی رنگ مغلیہ مصوری کے ساتھ مل کر بنی ہوئی ایک حسین و جمیل مصوری کے شاہ کاروں میں نظر آتا ہے۔

قومی یک جہتی کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ اُوڑیسا (بنگال) اور جے پور کے شاعروں کی رنگین نظموں کو کانگڑہ جیسے دور دراز علاقے میں مصور کیا گیا اور اس مصوری میں منہ ایرانی عناصر بھی ملے ہوئے ہیں۔ یہ تصویریں مسٹر ایم۔ ایس۔ رندھاوا کی کوششوں سے جمع ہوئیں اور وہی انھیں منظر عام پر لائے، ورنہ یہ بیش بہا خزانہ یونہی راجاؤں کی اولاد کے گھروں میں سڑ جاتا۔ ان کے قول کے مطابق یہ عشق و محبت کی غزلیں ہیں جنھیں خطوط اور رنگوں میں بدل دیا گیا ہے۔ ان تصویروں کا آرٹ زندگی اور محبت کا جشن مناتا ہے اور ان کی پوجا کرتا ہے۔ اس آرٹ میں اداسی نام کو نہیں، نہ کہیں افسردگی ہے نہ کوئی روک ٹوک۔ محبت کے بے تاب اور والہانہ جذبے روحانیت سے ہم آغوش ہیں۔

گڑھوال کا بھی الگ پہاڑی اسکول ہے۔ اس کی کھوج کندری لال صاحب نے کی ہے جو وہیں کے متاز باشندے ہیں۔ ان کے قول کے مطابق گڑھوال اسکول کے بانی دارا شکوہ کے لڑکے سلیمان شکوہ کے ساتھ سری نگر (گڑھوال) پہنچے تھے۔ ان کے نام تھے شام داس اور ہرداس۔ پانچ پشتوں کے بعد اس اسکول کا سب سے بڑا ماہر مولارام منظر عام پر آیا۔ اس کا زمانہ ۱۷۴۳ء سے ۱۸۳۳ء تک کا ہے۔ ناقدین کا یہ قول برحق ہے کہ گڑھوال اور کانگڑہ کی مصوری میں بہت زیادہ مشترک قدروں کے باوجود یہ الگ الگ اسکول ہیں۔ اصل میں ایک ہی طرح کی فضا، سبزہ و برگ، جھومتی ہوئی شاخیں، درخت، بیلیں، آنکھوں کے سیدھے پن، ارغوانی، بادامی اور گہرے رنگوں کا استعمال دونوں جگہ ملتا ہے۔ کانگڑہ کی وادی کی طرز غنائیت یہاں بھی موجود ہے۔ لیکن یہاں ایک مدہم سی خواب آلودگی اور سنجیدگی ہے اور یہ روایتی پابندیوں سے آزاد ہے۔ یوں کہیے کہ سعدی کی غزل ہے، جبکہ کانگڑہ کی مصوری حافظ کی غزل۔ مولارام شاعر بھی تھا۔ اس کی دو تین تصویروں کا جو ذکر ذیل میں کیا جا رہا ہے۔ اس سے پورے گڑھوال اسکول کی روح سمجھ میں آجائے گی۔

کرشن کی رادھا سے ملاقات : رادھا سبز گھاگھرا پہنے ہوئے ہے اور اسی رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے ہے جس پر سنہرا کام بنا ہوا ہے۔ اس کے زیورات کی تصویر کشی بڑی دلکش اور نازک انداز کی ہے۔ کرشن ملتجی انداز میں کھڑے ہیں اور سنہری دھوتی میں ملبوس ہیں۔ سر جھکا ہوا ہے۔ پھولوں سے لدا درخت پشت پر ہے۔ پس منظر میں چھوٹے چھوٹے مکان بھی۔

ابھی سار یکا نایکا : محبوبہ رات کو محبوب سے ملنے جا رہی ہے۔ اڑتا ہوا شفاف گھاگھرا، چولی، دوپٹہ، حسین چہرہ، نازک ہاتھ، انگلیاں اور زیورات سب کی تصویر کشی لاجواب ہے۔ اندھیری رات، کالے بادل، چمکتی ہوئی بجلی۔ یہ سب کیفیتیں مصوری کی جان بن گئی ہیں۔

دوسری نایکا کی تصویر کا نام ہے اُتکا نتھا۔ یہ محبوب کے انتظار میں محبوبہ کی تصویر ہے۔

دم پتی : (ایک جوڑا) میاں بیوی۔ گمان غالب ہے کہ راجہ رانی ہیں۔ مولارام کا بڑا شاہکار ہے۔ جے دیو وزیر وہ سفید گھوڑے پر سوار محل کی طرف جا رہا ہے۔

پہاڑی اسکول کی ابتدائی تصویروں میں مغل اثرات بآسانی پہچانے جا سکتے ہیں مگر بعد میں ان کا اپنا مقام اور اپنی روایت ہو گئی تھی۔ افسوس کہ وہ بھی مولارام کے ساتھ ختم ہو گئی۔

دکنی اسکول کوئی واضح اسکول نہیں۔ لیکن یہاں تو تہذیبوں کا سنگم ہوا جب شمال کے مسلمان بادشاہ دکن میں پہنچے تو اپنے خیل و خدم میں شاعر، مصور اور ہر طرح کے عالم اور فن کار ساتھ لے گئے۔ جب جہانگیر نے عادل شاہ کو شہزادہ خرم کے کہنے پر معاف کر دیا تو عادل شاہ نے جہانگیر سے اس کی تصویر مانگی جو اس نے اس پر ایک رباعی اپنے

ہاتھ سے لکھ کر دی۔

لے سوے تو دائم نظر رحمتِ ما — آسودہ نشیں بسایۂ دولتِ ما
سوے تو شبیہ خوشش گردیم ازاں — تا معنیٔ ما بہ بینی از صورتِ ما

قلی قطب شاہ کے دیوان میں تصویریں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں دکنی مصور کیمیاوی رنگ استعمال کرنے لگے تھے۔ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ایک سو دکنی تصویریں ایک کشادہ کمرے میں جمع ہیں۔ لیکن زیادہ تر تصویریں لعل الدکی ہیں۔ تین بڑی تصویریں مشہور مصور دکنی چیلم کی ہیں۔

محاصرۂ قلعۂ اسیر اور محاصرۂ گولکنڈہ کی تصویروں میں زیادہ تر دکنی اثرات ہیں۔ ایک تصویر میں راجہ رام سنگھ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے رسی کے ذریعے چھت پر چڑھ رہا ہے۔ شہزادہ کے شکار اور امرا کے ماہ لقا بائی کے مجرا سننے کی تصویریں بھی اچھی ہیں۔ ٹیپو اور اسی کے وزیر کی تصویریں بھی ہیں۔ اب بات یہ ہے کہ دکنی اسکول تو قدیم زمانے سے قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ اجنتا کی تصویریں آج بھی اس کی شہادت دے رہی ہیں۔ سنگ تراشی اور مصوری ہم رکاب چلتے تھے اس حساب سے دکن میں یہ فنون بڑے قدیم زمانے سے مروج رہے تھے۔

ہندوستانی فن مصوری جب زوال پذیر ہوئی تو بیسویں صدی کے آغاز میں اس کی نشاۃ ثانیہ بنگال میں ہوئی اور اس کے قائد تھے ایک بالغ نظر انگریز جن کا نام تھا۔ ای۔ بی۔ ہیول۔ انھوں نے کہا "ہندوستانیو خواب سے جاگو تم جس آرٹ کی تلاش میں ہو وہ پیرس اور لندن میں نہیں وہ تمہارے گھر میں ہے۔ تمہارے مندروں تمہاری مسجدوں میں ہے۔ تم سے روٹھ کر روپوش ہو گیا ہے۔ وہ تمہاری عمارتوں، تمہارے دیہات اور تمہارے شہروں کی گلیوں میں ہے۔ وہ بڑا عظیم ہے، بڑا حسین و جمیل ہے۔ اپنی روحانیت کو پھر سے اپناؤ"۔ چنانچہ اس آواز کے اثر سے ابنندر ناتھ ٹیگور اور ان کے درجنوں ساتھی پیدا ہوئے۔ یہ لوگ ایک نیا انقلاب تو لائے لیکن روحانیت میں اتنے کھب گئے کہ مادے کو بھول گئے۔ بڑا کام ہوا۔ گگنیندر ناتھ ٹیگور، نندلال بوس، جمنی رائے، مکل چندر ڈے اور کتنے اور تھے۔ ان کے ساتھ پنجاب میں ایک اور فنکار ابھرا تھا۔ عبدالرحمن چغتائی جس نے دیوانِ غالب کے بعض اشعار کی تصویریں بنائیں اور وہ دیوان جرمنی میں چھپا۔

آخر وہ زمانہ بھی آیا کہ جدیدیت کا شور مچنے لگا۔ اس مضمون میں اس کا جائزہ لینا مقصود نہیں لیکن یہ ضرور بتانا ہے کہ اس دور میں مذہب اور ذاتی عقائد سے الگ ہٹ کر پہلے اثر پرستی آئی بعد میں کیوبزم، پیتزم اور فیوچرزم کا دور دورہ ہوا۔ امرتا شیرگل جو ہندی سکھ اور ہنگری والدین کی اولاد تھیں آرٹ کا ترقی پسندانہ اور جدید نظریہ سے کرائی تھیں۔ انہوں نے یورپ اور ایشیا میں اشتراک پیدا کیا۔ افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ اب تو فنکاروں کا سیلاب آ گیا ہے۔ حسین، اکبر پدمسی، سوزا اور ساونت وغیرہ سب اپنے اپنے قلم کے ماہر ہیں۔ تجریاتی گروہ اب آگے بڑھ گیا ہے۔ اور حقیقت پسندی اس کا شکار ہو گیا ہے۔ جب تک آرٹسٹ تخلیق کے ایک زبردست جذبے کے تحت مہارت کے ساتھ وسعت اور عمق نظر سے ماحول کے عناصر کو ایک دوسرے میں سمو نہ سکے وہ صحیح آرٹسٹ نہیں ہو سکتا اور یہی بات یکجہتی اور ہم آہنگی کی مترادف ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کو الٹئے، ہر زمانے میں فن کا رنے مذہب و ثقافت کے زیر اثر کوئی بھی عوامل ہوں، تہذیبی امتزاج میں حصہ لیا ہے۔ مصوری اس میں کسی طرح پیچھے نہ رہی۔ اس میں نہ علاقائی تعصب تھا نہ لسانی عداوت اور نہ مذہبی رکاوٹ۔ یہ ایک ردعمل تھا۔ ہوتا رہا اور ہوتا گیا۔ ہندوستانی قومیت کی بنیاد مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی۔

مآخذ

1. آج کل اردو۔ مصوری
2. Panorama of Indian painting. شائع کردہ پبلیکیشنز ڈویژن
3. Dara Shikoh - by Jit Harsal
4. Kangra valley Painting از: ایم۔ ایس رندھاوا
5. Basohli Paintings از: ایم۔ ایس رندھاوا
6. Magazine March of India
7. The magazine Art Bombay.
8. آج کل

اے ارضِ وطن

اے ارضِ وطن ، خلدِ نظر ، جانِ تمنا
ہر رنگ میں چاہا ہے دلِ زار نے تجھ کو
ہر حال میں ہم تیرے پرستار رہے ہیں
بدلے ہیں زمانے نے بہت رنگ مگر ہم
وابستۂ گیسوئے طرح دار رہے ہیں
اے جان ترے عشق میں سرشار رہے ہیں

تابندہ تجھے دیکھ کے دل شاد ہوئے ہیں
آنسو کبھی آنکھوں میں بھرے ہیں تری خاطر
اے بارگۂ گنگ و جمن ، بزمِ ہمالہ
صدیوں سے جیے اور مرے ہیں تری خاطر

اے جلوہ گۂ امن ترا حسن سلامت
دے دے کے لہو اپنا نکھاریں گے تجھے ہم
قدموں میں بچھائیں گے ترے چاند ستارے
ہر طرح سے ہر طور سنواریں گے تجھے ہم

ہر ذرۂ خوابیدہ کو بیدار کریں گے
تپتے ہوئے صحراؤں کو گلزار کریں گے
عاشق ہیں تو پاسِ نگہِ یار کریں گے
پیکار ضروری ہو تو پیکار کریں گے
ہم زندہ رہیں گے تو تری شان کی خاطر
ہر چیز لٹا دیں گے تری آن کی خاطر

مصحفی کی زبان

نثار احمد فاروقی

ہمارے ایک محترم بزرگ کو اس زمانے کے نقادوں اور محققوں سے یہ شکایت ہے کہ وہ جب تاریخ ادبِ اُردو کے کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کو دوچار صلواتیں سُنانا اور ان کی کتاب آبِ حیات کے پایۂ استناد کو زیرِ بحث لانا من جملۂ واجبات تحقیق جانتے ہیں۔ یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ بعض لکھنے والوں نے اپنے محدود اور ناقص مطالعے کی بنا پر بے سروپا اعتراض کر دیئے اور اس ذمے داری کو محسوس نہ کیا کہ ایک اتنے مقبول مصنف اور مسلّم الثبوت انشا پرداز کی کسی غلطی کا اعلان کرنے سے پہلے یہ بھی اطمینان کر لیا جائے کہ اُن کے حق میں جو دلائل مل سکتے ہیں، وہ بھی تو ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر یہ شکایت اِس نظر سے ہو کہ آزاد کی شخصیت کے گرد کوئی تقدس کا ہالہ کھنچا ہوا ہے اور انھیں تنقید سے بلند و بالاتر رکھنا چاہیے، تو تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جن شخصیات کو واقعی ایسا تقدس حاصل بھی رہا ہے انھیں بھی تنقید سے معاف نہیں رکھا گیا۔ یہ تو اس دَور کی بات ہے جب زندگی کے ہر شعبے کو ہدایات اخلاقیات سے ملتی تھیں اور یہ اخلاقیات مذہب کی ساختہ ہوتی تھی۔ آج کی رفتار یہ بتا رہی ہے کہ مذہب اور اخلاق دونوں اپنی گرفت کھو رہے ہیں، اس لیے لامحالہ کل رائج ہونے والے معیار بھی ہمارے قبضے میں نہیں ہوں گے۔ اگر ہم ان اخلاقی معیاروں کی ساکھ باقی رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف یہی راستہ ہے کہ ہم اس تنقید کا منصب بھی اپنے ہی اختیار میں رکھیں، اور خود احتسابی کی عادت ڈالیں۔

آزاد کے بعض نقادوں کی یہی کمزوری ہے کہ وہ اعتراض کرنے سے پہلے پوری طرح اطمینان حاصل نہیں کرتے، خواہ مخواہ چٹکی لیتے ہیں، تخیل کے بل بوتے پر نکتہ چینی کرتے ہیں، اور آزاد کو زبان اردو کے معماروں میں جو بلند اور لائق احترام درجہ حاصل ہے اُسے ملحوظ رکھ کر بات نہیں کرتے۔ مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو آزاد سے جو جائز شکایات ہیں، ان کا کہنا یہی ہے کہ یہ ساری کمزوریاں ان مرحوم میں بھی موجود تھیں۔ پچھلی چوتھائی صدی میں آزاد کی کتاب آبِ حیات پر جو اعتراضات ہوئے ہیں، یہاں انھیں دہرانا یا شمار کرنا مقصود نہیں لیکن اس کا آغاز شاید مولانا شبلی نے کیا۔ زمانۂ مابعد میں کسی حد تک حافظ محمود شیرانی نے ان کی کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی اور آج سے چند سال قبل قاضی عبدالودود صاحب نے ایک مبسوط مضمون "آزاد بحیثیت محقق" لکھ کر گویا اِس سلسلے کی تکمیل کر دی۔ انفرادی موضوعات پر جن حضرات نے کام کیا، انھوں نے اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کرتے ہوئے علی العموم یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھا کہ وہ اس موضوع پر آزاد کی رائے سے کہاں تک اتفاق نہیں کرتے، یا اُن کی فراہم کردہ معلومات پر کیا اضافہ کر رہے ہیں۔ اِن سب متفرق تحقیقات کو اگر یکجا کر لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شاید آبِ حیات کا ایک صفحہ بھی اعتراض سے نہیں بچا ہے۔ ان سب کوششوں سے دل گرفتہ ہونے کی بجائے، بہتر یہ ہوگا کہ آبِ حیات کا ایک تنقیدی ایڈیشن مرتب کیا جائے اور یہ سب معلومات، متعارض بیانات، یا نئے انکشافات حواشی میں درج کر دیئے جائیں۔

یہاں غیر متعلق مسائل کا اندراج محض کر کے اس تمہید کو زیادہ طول

[illegible] نہیں۔ اگر ان حضرات کو شکایت ہے کہ [illegible] آبِ حیات کو مورد طعن کیوں بناتا ہے تو انھیں صرف ایک نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے: آبِ حیات کو تاریخ اور تذکرے کی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے؛ اگر اسے صرف قصہ کہانی کی کتاب یا زیادہ سے زیادہ "شاعروں کے خاکے" قرار دے دیا جائے تو ان میں سے اسّی فیصدی اعتراضات اپنی موت مر جائیں گے۔ مگر غالباً آزاد کے مداح اس تبدیلی کے لیے تیار نہ ہوں گے، کیونکہ آزاد خود اس کتاب کو "مشاہیر کے سوانح اور زبان کی تاریخ" کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ سوانح بھی تاریخ کا ایک اظہار ہیں، اور تاریخ میں دو باتوں کو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے؛ ایک تو یہ کہ مورخ اپنے تخیل کو اس میں شاہدِ عینی کی طرح پیش کرنے لگے، اور دوسرے یہ کہ وہ افراد یا حوادث سے اپنا جذباتی رشتہ قائم کر لے۔ پہلی بات کے بارے میں مارگولیتھ نے لکھا ہے کہ مورخ کبھی کبھی غیب داں بھی بن جاتا ہے، یا کسی واقعہ کے بارے میں نہایت سنجیدگی اور دیانت سے یہ تصور کر لیتا ہے کہ یہ بات اس طرح ہوئی، کیونکہ ویسی باتیں عالمِ شہود میں اسی طرح ہوا کرتی ہیں۔

دوسری بات یعنی جذباتی وابستگی کے بارے میں، ہندوستان کے ایک مشہور مورخ سے میں نے ایک جلسے میں سوال کیا کہ "آپ اپنی کتاب میں اتنے جذباتی کیوں ہو گئے ہیں؟" ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ یہ راز کوئی ماہرِ نفسیات ہی سمجھ سکتا ہے۔ آزاد کے یہاں اتفاق سے دونوں طرح کی جذباتیت ہے، منفی بھی اور مثبت بھی۔ یعنی انھیں عقیدت ہوتی ہے تو ذوق کے جیکٹ کے داغ بھی گل بوٹے نظر آتے ہیں، اور کسی سے چڑ ہوتی ہے تو مرزا مظہر جیسے بزرگ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "گھر میں دھوبن ڈال رکھی تھی"۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ بیانات ہیں جن سے کوئی تاریخی معلومات نہیں ملتی، اس لیے اگر یہ باتیں فی الواقع درست بھی تھیں تو انھیں بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس اندازِ نظر کا ایک منطقی نتیجہ تضاد ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر آبِ حیات کا مطالعہ اس نظر سے کیا جائے کہ اس میں کہاں تک مربوط اور منضبط تنقید ملتی ہے، تو حیرت انگیز نتائج برآمد ہوں گے۔

میر حسن دہلوی کے ترجمے میں آزاد نے لکھا ہے کہ ان کی زبان صاف [illegible] سے جو کہ اس وقت [illegible] ہی کی علاوہ [illegible] سے ہے جو آج ہم تم بول رہے ہیں۔" (آبِ حیات ۲۵۳-۲۵۴)

انھیں میر حسن نے اپنے بیٹے میر خلیق کو مصحفی سے زبان سیکھنے کا مشورہ دیا تھا، اور یہ کہا تھا کہ اس زمانے میں ان کی نظیر نہیں ہے، جہاں تک ہو سکے ان سے کچھ حاصل کر لو۔ (تذکرۂ ہندی، طبع اول، صفحہ ۹۰) چنانچہ میر خلیق اپنے باپ کے ارشاد کی تعمیل میں زیادہ سے زیادہ وقت مصحفی کی خدمت میں گزارتے تھے۔

میر حسن جو بقول آزاد "خاص دہلوی تھے اور جن کی استادی کا اعتراف تمام اہلِ لکھنؤ کو بھی ہے" وہ تو مصحفی کی زباندانی کے بارے میں محض لفظوں کی حد تک نہیں بلکہ عملاً اس طرح معترف تھے کہ انھوں نے اپنے بیٹے سے تاکیداً کہا کہ ان کی خدمت میں رہ کر زبان اور فن کی تکمیل کرو، مگر آزاد نے مصحفی کے ترجمے میں جو کچھ لکھا ہے اسے ذرا غور و تامل سے ملاحظہ فرمائیے تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ زبان اور ضروریاتِ شعری سے باخبر تھے، اور یہ دلی کے بزرگوں کی صحبت میں حاصل کی تھی۔ خود دلی کے رہنے والے نہ تھے مگر اپنے دہلوی ہونے کا فخریہ اعلان کرتے تھے۔ شاعری میں کہیں میر کا انداز ہے، کہیں سوز کی نقل ہے، کہیں سودا کا چربہ ہے، ان کا اپنا کوئی طرز نہیں۔ "غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے، کسی طرزِ خاص کی خصوصیت نہیں۔ بعض تو صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں، بعض میں یہی معمولی باتیں ہیں جنھیں ڈھیلی ڈھیلی بندشوں میں باندھ باندھ کر شعر پہ شعر کہتے چلے گئے ہیں۔ اس کا سبب یا تو پُرگوئی ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے، یا دلی اور لکھنؤ کا فرق ہے۔" (آبِ حیات ۳۱۲)

دوسری جگہ پھر مصحفی کے امروہوی ہونے پر چوٹ کی ہے، اور کہتے ہیں:

"سید انشا ہمیشہ قواعد کے راستے سے ترچھے ہو کر چلتے ہیں، مگر وہ ان کا ترچھا پن بھی عجب بانکپن دکھاتا ہے۔ یہ بھی مطلب کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں، مگر کیا کریں وہ طبیعت کا امروہہ پن نہیں جاتا۔" (آبِ حیات ۳۱۳) یہ تعمیم کہ انشا ہمیشہ قواعد سے ترچھے ہو کر چلتے ہیں، مبالغے سے خالی نہیں، اور آزاد نے [illegible]

مثالیں بھی نہیں دی ہے۔ جب داری ہی سے ظاہر ہے کہ ایک شاعر کی زبان دانی کی بھی تعریف ہو رہی ہے اور دوسرے کی پابندی ان کے لیے بھی ہے کہ "ہمیں پھیکے ہیں اور کہیں سیٹھے ہیں۔" (آب حیات ۳۴۳) مصحفی کی زباندانی پر اتنے سخت ریمارک دینے کے بعد، یہ ضروری تھا کہ آزاد اس کی کچھ مثالیں بھی پیش کرتے کہ ان کے محاورے میں کہاں جھول ہوتا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر لکھا ہے کہ: "بعض جگہ اپنے وطن کا محاورہ یاد آجاتا ہے اور کہہ دیتے ہیں:

تیغ نے اس کی کلیجا کھا لیا
آتے ہی اس نے مجھے سنگوا لیا

چمن میں چل کے کر اے مصحفی تو نالہ و آہ
جو جی چلا ہو ترا امتحان بلبل کا

نہ میں صحرا میں نہ گلشن میں نکل جاؤں گا
تو گر شہر ہوں، یاں خاک میں رل جاؤں گا

(آب حیات ۳۱۵)

ان مثالوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ:

۱۔ سنگوانا ۲۔ جی چلنا ۳۔ رل جانا

یہ تینوں محاورے دہلی کے نہیں ہیں بلکہ امروہہ کے ہیں یا بالفاظ دیگر ٹکسال باہر ہیں۔ ان میں پہلا محاورہ مصحفی نے جس سیاق میں استعمال کیا ہے وہ بظاہر سینتا، ٹھکانے لگانا، یا قتل کرنا وغیرہ کے معنوں میں ہو سکتا ہے۔ یہ دہلی میں بولا جاتا تھا، اور شاعری سے قطع نظر اس کی سند اس دور کی نثر میں بھی مل سکتی ہے۔ سید جمیل الدین خاں "خاص دہلی کے باشندے تھے اور" محلہ جمیل پورہ عرف چوڑی والان دہلی میں رہتے تھے۔ ان کا "صادق الاخبار" بہت مشہور ہے۔ اس نے ایام "غدر" میں انگریزوں کے خلاف زبردست تحریک چلا رکھی تھی۔ اس اخبار کی ۶ جولائی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ کی اشاعت (جلد ۴ شمارہ ۱ صفحہ ۴) میں ایک خبر درج ہے جس کا اتنا اقتباس مفید مطلب ہوگا:

"باشندے وہاں (لکھنؤ) کے اس فکر میں ہیں جس طرح بنے ان کو وہ رنگو کو سنگوا لیجیے اور مصطفیٰ شاہ، برادر شاہ اودھ کو بادشاہ یہاں کا بنا دیجیے۔"

[illegible] دہلوی تھے [illegible]
کو محروک ترانہ باجلے [illegible]
استعال ہوتا ہے کہ ان میں باہم مماثلت اور مناسبت [illegible]
آزاد نے اگر ایک محاورہ نہیں سنا تھا تو انھیں اس کی تصدیق تو کرنی تھی کہ دہلی میں اس سے لوگ واقف ہیں یا نہیں۔

دوسرا محاورہ "جی چلنا" ہے۔ اس کا مفہوم بھی مذکورہ شعر میں آسکتا ہے۔ یعنی "خواہش پیدا ہونا" اور "تحریک ہونا"۔

نواب میرزا خاں داغ دہلوی کی زبان کو تو آزاد بھی مانتے ہوں گے۔ وہ خود ذوق کے شاگرد، قلعہ معلیٰ کے پروردہ یا محمد حسین آزاد کے خواجہ تاش تھے۔ اصول زبان کے بارے میں سخت تھے کہ انھوں نے ایک روایت کے مطابق، جس کے ناقل عبدالرزاق کانپوری (مصنف: البرامکہ) ہیں، "فرہنگ آصفیہ" کے مؤلف مولوی سید احمد دہلوی کو بھی ناقابل استشہاد بتایا۔ سید احمد صاحب "خاص دہلی" کے نہیں تھے۔ ان کا خاندان ... کے مقبرے کے پاس "عرب سرائے" کا رہنے والا تھا۔ اس لیے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ عرب سرا کے باشندے کی زبان کو سمجھیں اور خود امروہہ کا محاورہ استعمال کر لیں۔ مگر انھوں نے کہا ہے:

ناصح کا جی چلا تھا ہماری طرح مگر
الفت کی دیکھ دیکھ کے افتاد رہ گیا

یہ شعر گلزار داغ کا ہے۔ محاورات داغ مرتبہ ولی اشرف صابر بھی مل سکتا ہے۔ اس محاورے کی حد تک بھی یہ طے ہو گیا کہ اہل دہلی اس سے واقف تھے۔

اب تیسرا اعتراض "خاک میں رل جانا" رہ گیا۔ اس کی اسناد صحیح کون ہوں گی کیونکہ یہ محاورہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ آزاد کا بیا اعتراض اس محاورے کے سلسلے میں کیا ہے؟ اس کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں:

۱۔ رل جانا (بمعنی رل) جیسا کہ مصحفی نے باندھا ہے۔

ریل جانا، بکھر جانا، بدن میں مل جانا، جل جانا
۲۔ رَل جانا (بفتحِ اول)، بہ معنیٔ مل جانا۔ گھل مل جانا وغیرہ
یہ تو حرکات کی صورت ہوئی۔ محاورے کے الفاظ پر بھی اعتراض ہو سکتا
ہے۔ یعنی ان میں سے کون سی صورت فصیح ہے:

۱۔ خاک میں رَل جا ۲۔ خون میں رَل جانا

۳۔ مٹی میں رل جانا ۴۔ قدموں میں رل جانا

۵۔ کانٹوں میں رَل جانا

اگر یہ محاورہ کسی ایک ہی شکل میں آتا ہے، تب تو اوپر لکھی ہوئی باقی سب صورتیں غلط قرار پائیں گی۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ان میں سے ہر صورت میں استعمال ہوا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ اصل (دیدہ) تھا رَل جانا یا رُلنا ہے اور یہ کسی بھی دوسرے لفظ سے مرکب ہو کر آسکتا ہے۔
اگر اس کا استعمال ثابت ہو جائے تو پھر زمانے کی بحث رہے گی۔
لہٰذا ہم اس سے قدیم ترین دَور سے تلاش کرتے ہیں:
حاتم کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ "رہنے والے خاص شاہجہاں آباد کے تھے" (آبِ حیات ۱۱۳) اور ان کی زبان کو فصیح مانا ہے (صفحہ ۱۱۴)، ان کے دیوان قلمی (نسخۂ انڈیا آفس لندن) کے ورق ۵۶ پر یہ شعر ملتا ہے:

مت جاؤ چمن بیچ میاں عطر کو مل کر
اس بو سے تو جاویں گے گُل اب خاک میں رُل کر

خاک میں رَلنا (بفتحِ اول) کی یہ سند غالباً کافی ہوگی۔ مگر حاتم کے وقت کے بہت سے الفاظ اور محاورے میر و مرزا کے عہد میں متروک ہو چکے تھے جیسا کہ خود مذکورۂ بالا شعر میں "ستی" بمعنی "سے" آیا ہے، جو عہدِ میر میں ترک کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ محاورہ "خاک میں رُلنا" میر کے یہاں بھی موجود ہے:

کیوں کہ یک بار وہ جل گیا
کفِ خاک ہو خاک میں رل گیا

(مثنوی شعلۂ شوق)

غالباً میر پہلو ہی ہوں گے جن کی حجت کوئی بھی نہ گنائے گا۔ اور ان کی حیثیت کے بارے میں خود آزاد نے تسلیم کیا ہے کہ "زبان کے مالک تھے" (صفحہ

۲۳۳)، ہو سکتا ہے کہ تینوں تنہا اس محاورے سے باخبر ہوں یا اور دوسرے فصحا کو اس کا علم نہ ہو مگر ان کے معاصرین میں تقریباً سب کے کلام سے اس کی سند مل جاتی ہے۔ مثلاً قائم چاند پوری:

اشک کی طرح تھی یاں تجھ کو ہر اک چشم میں جا
کب یہ معلوم تھا یوں خاک میں رل جاؤں گا

(قوافی، جھل مجل وغیرہ۔ انتخاب صفحہ ۲/۲)

قائم چاند پور کے رہنے والے تھے اور دہلی، رام پور، لکھنؤ سب شہروں میں رہے تھے۔ خود رام پور میں بھی یہ محاورہ رائج تھا۔ چنانچہ مولوی غلام جیلانی رفعت جو پہلے بیدم تخلص کرتے تھے۔ ملا غیاث الدین مؤلف غیاث اللغات کے استاد اور مولوی سید حیدر علی رام پوری خلیفہ حضرت سید احمد شہید بریلوی کے داماد تھے، ان کا انتخاب قدرت اللہ شوق کے تذکرہ طبقات الشعرا میں موجود ہے اور اس میں یہ شعر بھی ہے:

میں خاکِ غربت میں رَل گیا ہوں برنگِ اشکِ روانِ بیدم
کسی کی آنکھوں کے شوق میں آہ، جب سے چھوٹا دیار میرا

(تذکرۂ طبقات الشعرا: مرتبہ نثار احمد فاروقی
طبع لاہور۔ صفحہ ۵۱۳)

رام پور امروہہ کے قریب ہے، ممکن ہے کہ وہاں تک یہ محاورہ پہنچ گیا ہو۔ لیکن عارف الدین خاں عاجز، دکن میں رہتے تھے، ان کا یہ شعر خود میر نے نقل کیا ہے:

مینھ کے برسنے کی باؤ چلی ہو اب آنکھوں سے جان بری نہ چلیں گے
درد کے نیساں کے گوہرِ غلطاں تو مٹی بیچ کنکر دلے آہ رلیں گے

(نکات الشعرا، طبع اول صفحہ ۱۰۳)

اشرف علی خاں فغاں، احمد شاہ بادشاہ کے دودھ شریک بھائی تھے۔ ظاہر ہے کہ قلعۂ معلیٰ میں پرورش پائی تھی۔ آزاد نے لکھا ہے کہ ان کے کمال کی سند اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ مرزا رفیع جیسا صاحبِ کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ (آبِ حیات صفحہ ۱۴۴)۔ انھوں نے رلنا کا استعمال کیا ہے:

پھرتے ہیں آپس میں اس طرح رلیاں جس طرح لڑ رہی ہوں چھپکلیاں

(دیوانِ فغاں، مطبوعہ۔ صفحہ ۱۶۹)

خود سودا نے بھی یہ محاورہ استعمال کیا ہے:

خاک و خوں میں سو تمہیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

(کلیات سودا۔ مرتبہ عبدالباری آسی)

مگر یہ شعر مجموعۂ نغز (جلد ۲ صفحہ ۱۵۲) میں مجذوب کے نام سے منسوب ہوا ہے۔ یہ سودا کے متبنّیٰ اور شاعری میں انہی کے شاگرد تھے۔ ان کا یہ شعر آزاد نے بھی نقل کیا ہے (آبِ حیات صفحہ ۱۸۰) مگر وہاں اسے امروہے کا محاورہ نہیں بتایا۔ میر و سودا کے ایک اور ہمعصر میر ضیا دہلوی نے یوں باندھا ہے:

جنت کا مت دو مژدہ مجھ خاک میں رُلے کو
آرام وہاں بھی معلوم ایسے جلے بلے کو

(نکات الشعرا طبع اول صفحہ ۱۵۲)

میر شیر علی افسوس عہدِ میر و مرزا کے آخر میں ہوئے ہیں۔ یہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے دیوان قلمی نسخۂ انڈیا آفس لندن، ورق ۲۰۰ (حوالہ ۱۵۹/۵، ۲۵۰) میں ایک مرثیہ کا یہ شعر بھی ملتا ہے:

تیرا لاشہ ہے جنگل میں رُلتا، تیرا جُثہ ہے لہو میں گُلتا
زور میرا نہیں کچھ بھی چلتا، میرے پیارے مسافر حسینا

مصحفی نے رَلنا (بفتحِ اول) کے علاوہ رُلنا (بضمِ اول) بھی باندھا ہے ان کا شعر ہے:

گر اُس منہ سے برقع کبھی کھل گیا
تو دیکھو گے مَہ خاک میں رُل گیا

(ابواللیث صدیقی: مصحفی ۱۶۴)

مگر یہ بھی بے سند نہیں ہے۔ اساتذۂ قدیم کے کلام میں اس کا استعمال بھی ملتا ہے۔ چنانچہ نواب آصف الدولہ کی ایک رباعی ہے:

دل آٹھ پہر تری طرف ڈھلتا ہے	تن شمعِ صفت غم سے پڑا گُھلتا ہے
آصف سببِ عشق ہے، ورنہ کوئی	کوچے میں کسی کے خاک پڑ رُلتا ہے

(کلیاتِ آصف الدولہ قلمی، نسخۂ سالار جنگ)

انہی نواب آصف الدولہ کے "بیٹے" نواب وزیر علی خاں نے اسے باندھا ہے:

جیوں سبزہ رُندھے گئے ہیں پیروں کے تلے ہم
اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
جس گل پہ نگہ کرتے ہیں آتا ہے نظر خار
گلشن کے تلے جاتے ہیں کانٹوں میں رُلے ہم

(دیوانِ جہاں، صفحہ ۲۵۶)

غرض اس لفظ کے متعلق غالباً ہر نوع کی مثالیں فراہم ہو گئی ہیں اور ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رُلنا دو طرح (بفتحِ اول و بضمِ اول) دہلی اور لکھنؤ ہی میں نہیں بلکہ دکن تک رائج تھا۔ یا کسی کوئی سند دستیاب نہیں ہے، اور یہ مصحفی نے کہیں لکھا بھی نہیں ہے۔ یہ مصدر کسی بھی دوسرے لفظ سے مرکب ہو کر آ سکتا ہے چنانچہ مذکورہ بالا مثالوں میں اتنی شکلیں ملتی ہیں:

۱۔ خاک میں رُلنا	۲۔ مٹی میں رُلنا
۳۔ خاک خون میں رُلنا	۴۔ جنگل میں رُلنا	۵۔ کانٹوں میں رُلنا

مصحفی نے اس محاورے کو جتنی صورتوں میں برتا ہے سب کی سند یں دوسرے شعرا کے کلام میں مل جاتی ہیں اور اس سے خود اندازہ ہوتا ہے کہ خود ان محاوروں کے وجود سے بے خبر تھے۔ اس لیے انھیں یہ امروہہ کی زبان معلوم ہوئی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آزاد کو اس موقع پر تسامح ہوا ہے۔ انھوں نے یہ تو بجا طور پر محسوس کیا کہ اس محاورہ میں کچھ اجنبیت ہے، مگر اس فیصلے میں عجلت دکھائی کہ یہ امروہہ کا محاورہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ناسخ نے جن محاوروں کو منسوخ کیا تھا ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ ان کے زمانے تک "خاک میں رُل جانا" بولتے تھے، انھوں نے اسے متروک قرار دے کر "خاک میں مل جانا" کو فصیح بتایا۔ (صفیر بلگرامی: جلوۂ خضر جلد ا صفحہ ۱۲۶)

ظاہر ہے کہ جو محاورہ ناسخ کے وقت میں متروک ہوا ہو، اُس کا مواخذہ مصحفی سے نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا محاورہ "جی جلنا" تو خود آزاد کے وقت تک دلی میں بولا جاتا تھا۔ نواب الٰہی بخش معروف کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ ان کا دیوان جو اب رائج ہے وہ تمام و کمال انھیں ذوق کا

غزل

* فنا نظامی

وہ آئے مگر اجنبی کی طرح — اُجالا ہوا تیرگی کی طرح

مرا دل فرشتوں سے ملتا نہیں — ملو مجھ سے تم آدمی کی طرح

مجھے دے گیا جو فریبِ وفا — وہ اک شخص تھا آپ ہی کی طرح

ہمارے مقدر میں لکھ دی گئی — کوئی اور شے زندگی کی طرح

میں مجبور ہوں میکشی کے لیے — مرا جرم ہے خودکشی کی طرح

کوئی شے دو عالم میں ملتی نہیں — محبّت کی پاکیزگی کی طرح

وہی جوش ہو اور وہی ولولہ — کرو دوستی دشمنی کی طرح

فنا آج کی میکشی دیکھ کر
مرا دل بجھا تشنگی کی طرح

مکرّرات و ماخوذاتِ غالب

● ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

غالب کے کلام کو اگر زیادہ غائر نگاہ سے نہ بھی دیکھیں تو بھی ایسے اشعار سامنے آجاتے ہیں جن کے مضامین نئے نہیں معلوم ہوتے بلکہ کچھ ایسا احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے کہیں اور کہی ہوئی بات کو مکرر ارشاد فرمادیا ہے۔ غالب اپنے آپ کو اساساً فارسی شاعر سمجھتے تھے اور اپنے فارسی کلام کو فوقیت و اولیت دیتے تھے ۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

ان کے اس "بے رنگ من است" کلام میں بھی ان کے فارسی کلام کے "نقش ہائے رنگ رنگ" دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ۔

— ۱ —

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اندازہ رود گر پرسش رود از ہر چہ گزشت کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

— ۲ —

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل کچھ ادھر کا بھی اشارہ چاہیے

رمز شناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد محرم آن است کہ رہ جز بہ اشارت نرود

— ۳ —

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے نالہ پابندِ نے نہیں ہے

از نغمۂ مطربِ تجاں لختِ دل افشاند لے نالۂ پریشان رود ہنجار میاموز

— ۴ —

کہتے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

گریہ کرد از فریب و زارم کشت نگہ از تیغ آبدار تر است

— ۵ —

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

توفیق بہ اندازۂ ہر حوصلہ ریزند میخانۂ توفیق خم و جام نہ دارد

— ۶ —

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

— ۷ —

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

آنچہ جز شد فراہم مصرف دیگر نہ داشت ملد را نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کردہ ایم

— ۸ —

رات دن گردش میں ہیں ہفت آسماں ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہفت آسماں بہ گردش و ما درمیانہ ایم غالب دگر مپرس کہ برما چہ می رود

— ۹ —

شہیدِ عاشق سے کوسوں تک جو اگتی ہے حنا کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

لالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پس مرگ تا چہ مایہ در دلِ غالب ہوسِ روئے تو بود

— ۱۰ —

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

فغاں کہ نیست سر و برگِ دامن افشانی و بستہ خویش نفس را بدامِ عریانی

— ۱۱ —

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

تا کس ز تنومندیِ ما بہرہ نشود کس چوں سنگِ سرِ رہ کہ گراں ہست و گراں نیست

[illegible] یہاں ایک غالب
[illegible] اشعار میں بھی نظم ہوا ہے:

دی دوش کہ پرسش ز درد از پیر [illegible] بالا [illegible] حسرت آمیز گفتند
در جواب

اے نکو [illegible] یم ز تماشی بیش آں روز کہ وقت باز پرس آید پیش
مجرم کہ من عیالے دارم باحسرت عیش ہائے ناکردہ خویش

اشعار بالا کو بغیر وقت لفظ سے کام لیے چنا گیا ہے۔ اگر زیادہ تلاش و جستجو کی جائے تو مرزا کے فارسی اور اردو کلام میں اور بھی متعدد ہم معنی اشعار مل سکتے ہیں۔ یہی نہیں غالب کے بعض اردو اشعار بھی جو دوسرے شعرا کے فارسی اشعار سے ماخوذ ہیں تلاش کیے گیے ہیں۔ مثلاً

بیدل : بوے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
ہر کہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست

غالب : بوے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

(ظاہر ہے کہ غالب نے بیدل سے پہلا مصرع بغیر کسی تصرف کے لے لیا ہے اور دوسرے مصرع کا اردو ترجمہ نظم کر دیا ہے)

—— ۱۲ ——

صاف دُردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
نادان حریف مستی غالب مشو کہ او دردی کش پیالۂ جمشید بودہ است

—— ۱۳ ——

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں
از جوے شیر و عشرت خسرو نشاں نماند غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند

—— ۱۴ ——

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے ... اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں
فرصت [illegible] و غنیمت پندار نیست گر صبح بہارے شب ماہے دریاب

—— ۱۵ ——

لطیفہ : [illegible] محبت را سپرس اے [illegible]
[illegible] آلماس [illegible] می کشند

[illegible]

غالب : نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

بیدل : میروم از خویش و دورا اندیشہ باز آمدن
بجو عمر رفتہ یارب برنہ گردانی مرا

غالب : مستانہ طے کروں ہوں رہ وادی خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

(یہاں غالب نے بیدل کے شعر کا بنیادی میلان لے کر ترجمہ کر دیا ہے)

بیدل : ساز ہستی غیر آہنگ عدم چیزے نداشت
ہر نوائے کہ وا دیدم خموشی سے شمرد
عالم انسے برتی تر دامنی ہا نمود
یک دو ساغر آب دادم گریہ مستانہ را

بیدل کے ان دو شعروں کو غالب نے اردو کا لباس بالترتیب دو مختلف شعروں میں یوں پہنایا ہے:

غالب : نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

غالب نے زین العابدین خاں عارف کی موت پر جو غزل بطور مرثیہ کہی اس کا ایک شعر ہے:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن اور

اس کا ماخذ راقم شہیدی کا یہ شعر معلوم ہوتا ہے:

می کند وعدۂ دیدار بہ محشر دا امروز یار جانستہ کہ امروز مرا فردا نیست

اور یہ شعر:

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

بیگا دختر علی حیدر کے ایک شعر کا مرہون منت معلوم ہوتا ہے۔ بیگا کا شعر یہ ہے:

من اگر توبہ ز مے کردہ ام اے سرو سہی
تو خود این توبہ نہ کردی کہ مرا مے ندہی

غالب نے اس شعر کو ؎

تنگ ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب ۔ کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

عرفی کے مندرجہ ذیل شعر کے بنیادی خیال کو لے کر تخلیق کیا ہوگا ؎

چشم نہ بہر خویشتن دم نزع تر شود ۔ ترسم کہ من بمیرم و غم دربدر شود

اسی طرح فارسی کے مندرجہ ذیل شعر پر غالب اور مومن دونوں نے اپنے اپنے انداز میں طبع آزمائی کی ہے:

زضعف تن عجب حال است بیمار محبت را ۔ کہ نتواند کشید از ناتوانی بار صحت را

(نامعلوم)

مومن : اب تو مرجانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

غالب : ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

جامی کا مشہور شعر ہے ؎

گفتی شبے بخواب تو آیم ولے چہ سود ۔ چوں من بعمر خویش ندیدم کہ خواب چیست

غالب نے اکتساب مضمون اس طرح کیا ہے کہ جو کچھ جامی نے محبوب سے کہلوایا ہے انھوں نے فرض کر لیا ہے ؎

وہ آکے خواب میں تسکین اضطراب تو دے ۔ ولے مجھے تپش دل مجال خواب تو دے

غالب نے آذری طوسی کے اس شعر کو ؎

جانے کہ داشت کرد فدائے تو آذری ۔ شرمندہ از تو گشت کہ جان دگر نداشت

اس انداز سے قدرے زیادہ سادہ اور پر اثر کر لیا ہے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی ۔ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

وقوعی تبریزی کا شعر ہے ؎

می نماید کہ سر عہد شکستن داری ۔ خشم ایں بار تو چوں رنجش ہر بار تو نیست

غالب نے اسی مضمون کو اختصار کے ساتھ یوں نظم کیا ہے ؎

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں ۔ لیکن اب کے سر گرانی اور ہے

نظیری نے کہا ہے ؎

نشاط رفتہ زدوراں بہ صبر بستانم ۔ کہ ہر معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

غالب نے اسی مضمون کو لے کر یہ شعر تخلیق کیا ہے ؎

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے

خاص بزم میں کسی کی ہے تیغ فرض ... عرفی کے تین اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ ۔ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

یک لذت ہستی بادہ کشیدن نتواں یافت ۔ مقصود تو از ہستی مقصود زمستان چیست

بیا بادہ کہ جام دے ز نالہ بر آید ۔ ترانہ ز ہر ساز دلے یک پیالہ بر آید

غالب کے علی الترتیب یہ تین شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا ۔ ساغر جم سے مرا جام سفال اچھا ہے

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار ۔ رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

آصفی شیرازی کے اس شعر پر ؎

تو ہم در آئینہ حیراں ز حسن خویشتنی ۔ زمانہ ایست کہ ہر کس بخود گرفتار ایست

اضافہ کرتے ہوئے زانو کو اپنا مونس قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

شکوۂ سنج رشک ہم دیگر نہ رہنا چاہیے ۔ میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

فریدوں خراسانی کے اس شعر کو دیکھیے ؎

از ضعف دل منال فریدوں زبے کسی ۔ میدار دل قوی کہ کس بیکساں خداست

اور غالب کے اس شعر کو دیکھیے ؎

بے دل نہ ہو بیگانگی خلق سے غالب ۔ کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غالب نے ضعف دل کی بجائے بے گانگی خلق کہہ کر دلکش معنویت پیدا کر لی ہے۔

اب غالب کے مندرجہ ذیل اشعار اور ان کے سامنے دیے ہوئے فارسی اشعار پر تقابلی نظر ڈالیے:

غالب	فارسی شعراء
کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے	گفتم بگو نہ بی کشی و زندہ می کنی از یک نگاہ کشتہ نگاہ دگر نہ کرد (امیر خسرو)
تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا	... کتاب ... ز ... فرد ... (میر درد)
۳	
مجھے جنوں کیا ...	از ... عشق ... را

(ہم کو کاشی)

۴	
بہرہ ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات / سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر	اے گوش تیغ تیز کہ آگاہ شدی چو چشم / تا ہر سخن از لب تو مکرر شنیدے (طالب آملی)
۵	
تیرے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا / کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا	بیم از نشاط دارد وعدہ کہ من / انتظار وعدہ تو بقر دائمی ہم (تجلی)
۶	
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو / ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے	خوش دلم زیں کہ بار نامہ نویسیم شب و روز / مقصد نیست کہ مکتوب رسد یا نرسد (حسن بیگ رفیع)
۷	
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق / وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے	باد چو میرم آسودہ می شوم از دور / ندیدہ حال مرا وقت بے قراری حیف (فسونی)
۸	
کچھ نہ کی کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ / ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے	ہست صد منت بجاں از غیبت بدگو مرا / چوں بایں تقریب من آرد بیاد او مرا (شرف قزوینی)

غرض کہ غالب کے کلام میں دوسرے شعرا کے کلام سے معنوی استفادہ کی مثال ڈھونڈنے پر مل سکتی ہیں مگر غالب نے اپنے اعجاز اسلوب اور شدت احساس سے ہر استفادے پر اپنی انفرادیت ثبت کر دی ہے اور ہر اخذ کیے مضمون کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ یہ ماخوذات جہاں غالب کے وسیع المطالعہ ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں وہاں غالب کے شعری مزاج اور شخصیت کو سمجھنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ جہاں تک بیدل کے اس شعر سے

ہوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
ہر چہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست

کا سوال ہے جسے غالب نے دوسرے مصرع کا ترجمہ کرکے اپنا لیا ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غالب کے یہاں اس سرقہ برآمد ہو گیا۔ غالب کے زمانے میں متداول نصاب میں فارسی ادبیات کو نمایاں اور ممتاز جگہ حاصل تھی لہٰذا غالب کے دور کے نصاب میں قریب قریب سبھی بیدل [illegible] کلام سے اچھی طرح واقف رہے ہونگے۔ غالب جیسا فن کار جو اچھا جانتا ہوگا کہ وہ دوسروں کو محض تفنن وقت کے لیے اس مصرع کے فکر کو اردو کے ملبوس میں پیش کرکے داد و تحسین حاصل کرنے کی کوشش میں بجا طور پر رشیں نظر آئے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس طرح کے ترجموں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت تک کتابت کے لیے ایسی علامات وغیرہ وضع نہیں ہوئی تھیں کہ ترجمے کی نشاندہی کی جا سکے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور چراغاں ہو جاتا ہے۔

غالب کے فارسی کلام سے دوسرے ابعد شعرا نے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثال کے لیے مندرجہ ذیل اشعار پر تقابلی نظر ڈالیے :

امیر مینائی: تڑپا میں وقت ذبح تو مجھ سے خطا ہوئی
خنجر کیا نہ تیز یہ کس کا قصور تھا

غالب : بے خود بوقت ذبح تپیدن گناہ من
دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

جگر مراد آبادی: نظر سے ان کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی
کہ جیسے مدتوں سے تھی کسی سے دوستی اپنی

غالب : آشنا بانہ کشد خار رہت دامن ما
گوئی ایں بود ازیں پیش پیرا ہن ما

غالب کے مکررات و ماخوذات سے غالب کو سمجھنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ ایک ہی بات اگر دوسری مرتبہ ایک ہی طرح یا قدرے مختلف انداز سے کہی جاتی ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہم کسی امر کو زور دے کر کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ع

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

کے مصداق دوسروں کے مضامین کو اپنی طرز کاری کے ساتھ اپنا لینے سے بھی ہمارے خطوط فکر و تخیل کا مطالعہ اور نفسیاتی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اس استدلال کی روشنی میں مذکورہ بالا مکررات و ماخوذات سے اسی حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ غالب قدر اول کے خالق جمال اور ایک بہت بڑے فنکار تھے۔ روایت و تجربہ کا حسین و متوازن امتزاج، فن و زندگی کے گوشوں کی تلاش و جستجو، دل و دماغ کی رعنائیاں، مزاج میں بغاوت کے عناصر وغیرہ خصوصیات کی دلکش جلوہ گری یہاں بھی ملتی ہے۔

★

نغمۂ وطن

★——— ساغر مہدی

اے مرے پیارے وطن سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

تیری ہر شام ہے بہکی ہوئی بدست بہار
تیری ہر صبح ہے دنیائے محبت کا خمار
تیری مٹی میں ہے آزاد امنگوں کی پکار
اسی مٹی سے کھلا ہے مرے دل کا گلشن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

میرے عنوان کو کہانی اسی دھرتی پہ ملی
میرے بچپن کو جوانی اسی دھرتی پہ ملی
میرے گیتوں کو روانی اسی دھرتی پہ ملی
میری آواز میں ہے تیرے ہی دل کی دھڑکن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

تیرے نغمات کا بکھرا ہوا سیمیں آنچل
جیسے ٹیگور کے گیتوں کی کھنکتی پائل
غالب و میر کی پیمانۂ در آغوش غزل
جھوم اٹھتا ہے جسے سن کے ہر اک اہل سخن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

گنگناتی ہوئی گنگا ہے تری باہوں میں
مسکراتی ہوئی جمنا ہے تری باہوں میں
تاج کا حسن دوبالا ہے تری باہوں میں
یہ اجنتا و ایلورا کا ابھرتا ہوا فن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

خون سے تیری بہاروں کو سجانے کے لیے
ایک آدرش ہے یہ سارے زمانے کے لیے
اپنی مانگوں کا یہ سیندور لٹانے کے لیے
کتنی اوشائیں اٹھا لائی ہیں اپنے کنگن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

تیرے دامن کی ہواؤں میں ہے ماں کی ممتا
وقت کی دھوپ میں سر پہ ہے ترا ہی سایہ
تیری باہوں کو کوئی غیر نہیں چھو سکتا
تجھ پہ جو آنکھ اٹھائے وہ ہمارا دشمن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

نقشِ محبت

- شاہجہاں
- ممتاز محل
- وزیر سلطنت
- کنیز
- یوسف آفندی

(حزنیہ موسیقی آہستہ آہستہ اُبھرتی ہے)

شاہجہاں۔ (انتہائی کرب اور غم کی کیفیت)۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے ہماری ممتاز چھین لی۔ ہماری ممتاز محل ہم سے جدا ہو گئی۔ وزیر سلطنت ہمارے دل کے نہاں خانہ میں اب کوئی شمع روشن نہ ہوگی۔ ہم کنگال ہو گئے۔ ہم اپنا سب کچھ ہار گئے۔ مغل سلطنت کا تاجدار، اس کی عظمت و وجاہت، اس کا رعب و جلال سرنگوں اور بے دست و پا کھڑے ہیں اور وقت چلو سے ہماری زندگی چھین لی گئی۔ محل کی ساری شمعیں گل کر دو وزیر سلطنت! ورنہ یہ روشنی ہماری آنکھوں کی بینائی چھین لے گی۔

وزیر سلطنت۔ اعلیٰ حضرت! اس طرح غمگین نہ ہوئیے۔ خدائے برتر آپ کے سر پر شہنشاہِ سلطنت کا سایہ ہزاروں برس تک قائم رکھے۔ آپ اتنے اداس نہ ہوں ورنہ ملکۂ عالم کی روح کو صدمہ پہنچے گا۔ [illegible] حوصلہ نہ چھوڑئیے عالم پناہ!

شاہجہاں۔ وزیر سلطنت، ہم تمہاری ہمدردی کے شکر گزار ہیں، لیکن [illegible] کاش ہم بہت دور [illegible] دنیا میں گرفتار نہیں رہ سکیں گے۔ بس ہماری روح کو اب ایک ہی جستجو ہے، ایک ہی لگن ہے۔ کاش ہم اپنی زندگی میں اپنی ممتاز کی دیرینہ آرزو پوری کر سکتے۔ اس نے ہم سے صرف ایک آرزو کی تھی، وزیر سلطنت لیکن ہماری انتھک تلاش اور جستجو کے بعد بھی زمین کے کسی حصہ پر بھی ایسا دماغ نہ ملا جو ہماری ممتاز کے خواب کی تعبیر نقش کر سکتا۔

وزیر سلطنت۔ عالم پناہ! تلاش برابر جاری ہے۔ انشاء اللہ ایک دن شہنشاہِ عالم کی مراد بر آئے گی۔

شاہجہاں۔ کاش! لیکن ہر نقشہ اور ہر تجویز ہمارے لیے مایوس کن ثابت ہوئی ہے۔ وزیر سلطنت! ہم کب تک یوں بھٹکتے رہیں گے۔ ذہن کے پردے پر جو تصویر دیکھ رہے ہیں کاش ہم اسے کاغذ پر اُتار سکتے۔ کاش اسے ہم بیان کر سکتے۔ ایسا لگتا ہے وزیر سلطنت جیسے ہمارے تخیل کا وہ چاند ہمارے دل کے آنگن میں ہمیشہ گہنا کر رہ جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو ہم پاگل ہو جائیں گے۔ ہم نے اپنی جان سے عزیز ممتاز سے عہد کیا ہے وزیر سلطنت، ہم نے اپنی ملکہ سے عہد کیا ہے یا خدا سے برتر!

وزیرِ سلطنت۔ شہنشاہِ عالم [illegible] جہاں پناہ!

شاہجہاں۔ تم جا سکتے ہو وزیرِ سلطنت۔ ہم کچھ دیر کے لیے تخلیہ چاہتے ہیں۔

وزیرِ سلطنت۔ جو حکم عالی جاہ۔

(وقفہ)

(غم انگیز موسیقی ابھرتی ہے)

شاہجہاں۔ تم یقین رکھو ممتاز! ہم اپنی زندگی کی آخری سانس تک جد و جہد کریں گے۔ ہمیں سب کچھ یاد ہے ممتاز، ہماری آنکھوں کے سامنے وہ دن آج بھی گھوم رہا ہے جب تمہاری طبیعت کچھ ناساز تھی اور تم حرمِ خاص میں آرام کر رہی تھیں۔ ہم تم سے ملنے کے لیے آئے تھے لیکن تمہاری کنیز نے ہمیں اندر جانے سے روک دیا تھا۔ اور ہم نے تم سے باریابی کی اجازت چاہی تھی۔

(موسیقی کی ایک تیز لہر کے ساتھ فلیش بیک شروع ہوتا ہے)

کنیز۔ ملکۂ عالم، شہنشاہِ عالم حرمِ خاص میں باریابی کی اجازت چاہتے ہیں۔

ممتاز محل۔ اوہ! شہنشاہِ عالم تشریف لائے ہیں۔ چلو گل رخ ہم خود ان کی قدم بوسی کے لیے چلتے ہیں۔

(ہلکا وقفہ)

شاہجہاں۔ کیا ہم اپنی ملکہ ممتاز سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل کر سکتے ہیں؟

ممتاز۔ بسر و چشم عالم پناہ۔ میں تو بہت دیر سے چشم براہ تھی۔ آیئے تشریف لایئے۔

شاہجہاں۔ ہمیں خبر ملی تھی کہ تمہاری طبیعت قدرے ناساز ہے۔ ہم نے تمہارے آرام میں خلل ضرور ڈالا ہے لیکن دل کی بے چینی جب برداشت نہ ہوئی تو ضبط کے باوجود ہمارے قدم تمہاری آرام گاہ کی جانب اٹھ گئے۔ لیکن تمہارے جاں نثاروں نے ہمیں دروازے پر ہی روک دیا۔

ممتاز۔ کیوں، کون تھا وہ گستاخ؟

شاہجہاں۔ گستاخ نہیں تمہاری وفادار کنیز تھی۔ کہہ رہی تھی ملکۂ عالم کا حکم ہے کہ ان کی خلوت گاہ میں کوئی بغیر اجازت داخل نہ ہو۔

ممتاز۔ [illegible]

شاہجہاں۔ ہم [illegible] جرأت کر سکتے ہیں۔ ہم مغلیہ سلطنت کے تاجدار ہیں [illegible] ہم اتنے بے ادب تو نہیں کہ مغلیہ سلطنت کی ملکہ [illegible] اسی واسطے پہلے ہم نے باریابی کے لیے درخواست کی تھی۔

ممتاز۔ شہنشاہ! مسرت کے جذبات سے مغلوب ہو گئی میرے سرتاج! میری قسمت پر تو شاید قسمت بھی رشک کرتی ہوگی۔ اس ناچیز کے لیے اتنا پیار! میرے دامن میں اتنی وسعت نہیں ہے جہاں پناہ! کہ میں اعلیٰ حضور کی محبت کے بیش بہا پھولوں کو اپنی جھولی میں سمیٹ سکوں۔ مجھے میرے ظرف سے زیادہ مل گیا جہاں پناہ! بہت زیادہ۔ میں کہیں خوشی سے پاگل نہ ہو جاؤں میرے سرتاج۔

شاہجہاں۔ ملکہ!

ممتاز۔ میرے آقا!

(پس منظر میں ہلکی ہلکی حزنیہ موسیقی ابھرتی ہے)

شاہجہاں۔ کاش ہماری محبت تمہیں کچھ دے سکتی ممتاز! کاش ہماری بادشاہی میں ایک بار حسن کی بارگاہ میں کوئی نذرانہ پیش کر سکتی جس سے چند ہی لمحوں کے لیے ہمارا سر بلند ہو سکتا۔ کاش ہمارے سر پر مغلیہ تاج کے بجائے کھلا ہوا آسمان ہوتا۔ کاش پیروں میں جاہ و حشمت کی یہ بیڑیاں نہ ہوتیں تو ہم اپنی ممتاز کو وہ سینہ چیر کر دکھا دیتے جس کے ہر گوشہ میں اس کی محبت کی شمعیں روشن ہیں۔ ممتاز ہم کتنے بدقسمت ہیں کہ ہم اپنی محبوبہ کی محبت کا خاطر خواہ اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ کاش ہم شاہجہاں نہ ہوتے ممتاز!

ممتاز۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں میرے آقا، یہ جملے شاہجہاں کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

شاہجہاں۔ ہمیں احساس ہے ممتاز محل! لیکن ہم اس وقت شاہجہاں نہیں ہیں۔ ہم مغلیہ سلطنت کے تاجدار نہیں ہیں ممتاز! ہم ایک کنگال ہیں جو حسن کی بارگاہ میں بستہ دست و پا کھڑے ہیں۔

ممتاز۔ میرے سرتاج، حسن تو اعلیٰ حضور کی بارگاہ کا ایک حقیر سوالی ہے جس کی تابندگی سلطنتِ مغلیہ کے ہر قدم سے قائم ہے [illegible]

[illegible] کے

[illegible] عالم پناہ [illegible]

[illegible] سلطنت کے ستون ہل [illegible]

[illegible] ممتاز محل کی روح بے چین ہو جائے گی عالم پناہ جب

آنے والی نسلیں یہ کہیں گی کہ کسی محبت کی خاطر شاہجہاں نے اپنے

آباؤ اجداد کی امانت نہ سنبھل سکی۔ اس محبت کے صدقے عالم پناہ،

لیکن ممتاز محل پر یہ داغ نہ لگا دیجیے گا۔ میرے آقا۔

شاہجہاں۔ ممتاز محل!

ممتاز۔ میرے آقا!

شاہجہاں۔ ممتاز محل! شاہجہاں اس بے ادبی کی معافی چاہتا ہے۔
سلطنت مغلیہ کی ناموس سے کھیلنے والے کو تمہارا قانون جو سزا دینا

چاہے، دے۔ مجرم حاضر ہے۔

ممتاز۔ ہم غور کریں گے۔

(دونوں ہنستے ہیں۔ ایک لمحہ خاموشی رہتی ہے پھر ممتاز محل سلسلہ کلام
جاری کرتی ہے)

ممتاز محل۔ میرا دل اس وقت بہت گھبرا رہا ہے اعلیٰ حضور۔ جی چاہتا
ہے کچھ دیر کے لیے باغ میں ہوا خوری کے لیے چلی جاؤں اور....

شاہجہاں۔ اور کیا؟

ممتاز محل۔ اور اعلیٰ حضور بھی میرے قریب ہوں۔

شاہجہاں۔ تو ہمیں اپنے ساتھ لینا ہے؟

ممتاز محل۔ زہے نصیب۔

شاہجہاں۔ ہم انکار نہیں کر سکتے گو ہم مصروف تھے لیکن ہماری
ممتاز محل کی زبان سے زیادہ کچھ بھی ضروری نہیں۔

ممتاز محل۔ شکریہ میرے سرتاج۔

(موسیقی کی لہر ابھرتی ہے اور کچھ دیر تک قائم رہتی ہے)

ممتاز محل۔ وہ صنوبر کا درخت دیکھ رہے ہیں عالم پناہ! اس کے پیچھے
سے نکلتا ہوا چاند کتنا خوبصورت منظر ہے۔

شاہجہاں۔ سبحان اللہ! بہت خوبصورت۔ ہم تو ایک عرصے سے
چاندنی کا مزہ ہی بھول گئے تھے۔ ہمیں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ

تم نے ہمیں ایک نہیں بلکہ دو دو چاند، نیوں سے لطف اندوز
ہونے کا موقع دیا۔

ممتاز محل۔ دوسرا چاند کیسا عالم پناہ؟ صرف ایک ہی چاند تو ہے، وہ
دیکھیے صنوبر کے پیچھے۔

شاہجہاں۔ ہم اتنے دور کے چاند کو کیوں دیکھیں، ہمارے پہلو میں بھی تو
ایک چاند ہے اس سے زیادہ خوبصورت اور اس سے زیادہ روشن،
جس کی چاندنی سے شاہجہاں کی زندگی میں اجالا ہے۔

ممتاز محل۔ بندی تسلیم عرض کرتی ہے ظل سبحانی۔

شاہجہاں۔ ممتاز، ہمارے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دو۔

ممتاز محل۔ یہ لیجیے عالم پناہ۔ آیئے سامنے کی روش سے نکل کر اس
سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھیں گے۔

شاہجہاں۔ تمہیں سنگ مرمر سے عشق ہے ممتاز، کیوں؟

ممتاز محل۔ چاندنی اور سنگ مرمر، جہاں پناہ خود ہی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ
سامنے تخت رکھا ہے۔ کس قدر پاکیزگی اور تقدس ہے اس کے
سفید رنگ میں، اور پھر اس پر چاندنی کی پھوار، کبھی کبھی میرا دل
چاہتا ہے کہ......

(یکبارگی غم انگیز موسیقی کی لہریں ابھرتی ہیں اور پھر کچھ دیر خاموشی
رہتی ہے)

شاہجہاں۔ کہو ممتاز، یکبارگی خاموشی کیسی؟ تم کہہ رہی تھیں کبھی کبھی
تمہارا دل چاہتا ہے کہ......،

ممتاز محل۔ جہاں پناہ!...... (سسکیوں کے ساتھ رونے
لگتی ہے)

شاہجہاں۔ ممتاز، یہ کیا ممتاز! تمہاری آنکھوں میں آنسو، ایسا کیا غم ہے
جانِ شاہ۔ خدارا جلد بتلاؤ ورنہ ہم اس صدمہ کو برداشت نہ
کر پائیں گے۔

ممتاز محل۔ (ضبط کرتی ہیں) عالم پناہ، یہ آنسو مسرت کے آنسو ہیں۔
ممتاز محل اپنی قسمت پر ناز کر رہی ہے میرے سرتاج! میرے مالک
نہ جانے کیوں اب زندگی کا یقین روز بروز دھندلا ہوتا جا رہا ہے
ایسا لگتا ہے عالم پناہ، جیسے ممتاز محل اب چند دنوں سے زیادہ

[illegible] صحت [illegible] گئی ہے ... [illegible]

سا گیا ہے اور اس کی منزل اب زیادہ دور نہیں رہ گئی ہے لیکن عالم پناہ! میری موت کتنی خوبصورت موت ہوگی، وہ لمحہ کتنا عظیم اور مبارک لمحہ ہوگا جب میں اپنے آقا کے قدموں پر آنکھیں موندے پڑی ہوں گی۔

شاہجہاں۔ ممتاز محل، یہ کیا کہہ رہی ہو تم ملکہ من۔

ممتاز محل۔ سچ میرے آقا۔ ممتاز محل کے بطن نے چودہ بچوں کو حضور کے حوالے کیا ہے۔ حال کی ولادت کے بعد سے میری صحت سنبھلنے کو نہیں آئی۔ شاہی طبیبوں کا قصور نہیں ہے جہاں پناہ، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے جسم میں جان نہیں رہ گئی ہے۔ میری آنکھیں موت کو بہت قریب سے دیکھ رہی ہیں عالی جاہ۔

شاہجہاں۔ ہمیں اس طرح ویران نہ کرو ممتاز، نہیں تو اس کے تصور سے ہی ہمارا سینہ پھٹ جائے گا۔ شاہجہاں سے اس کی ممتاز کو کوئی نہیں چھین سکتا۔

ممتاز محل۔ موت برحق ہے میرے سرتاج، اس کے لیے شاہ و گدا سب ایک ہیں لیکن مرنے سے پہلے چاہتی ہوں کہ اپنی ایک خواہش کا اظہار کر دوں ورنہ میری روح کو سکون نہ ملے گا۔ یقین دلایئے کہ آپ میری موت کے بعد میری ایک آرزو پوری کریں گے۔

شاہجہاں۔ ممتاز میری روح، سلطنت مغلیہ کا بادشاہ اپنی زندگی کی ایک ایک سانس تمہیں دینے کو تیار ہے۔ ملکہ جہاں! ان رگوں میں دوڑتی ہوئی بابری خون کی ایک ایک بوند تم پر سے نثار ہے۔ بادشاہی اور تاجوری تمہارے ایک ادنیٰ سے اشارہ کی منتظر ہے۔ اپنے ان حسین لبوں کو جنبش دو۔ دونوں جہاں کے دھڑکتے ہوئے دل تمہارے قدموں میں لا ڈالے جائیں گے۔ شاہجہاں کو تمہاری صدا کا انتظار ہے۔ بولو راحت جاں!

ممتاز محل۔ آپ کو مجھ سے بہت پیار ہے نا، عالم پناہ!

شاہجہاں۔ ہمارے دل پر نظر نہ ڈالو ممتاز۔

ممتاز محل۔ تو اس محبت کو امر بنا دیجیے میرے آقا۔ اس محبت کو لافانی بنا دیجیے۔ جاودانی جو کبھی نہ مٹ سکے۔ ممتاز محل اور شاہجہاں کے

پیار کی داستان کو ایک ایسا مقبرہ بنا کر [illegible] جو ایک ایسا عجوبہ جسے انسانی آنکھ نے کبھی نہ دیکھا ہو جس کا ذکر چاندنی کی پیڑوں سے کیا جائے۔ جس کے سفید سنگ مرمر کے آگے کلیوں کی حیا ماند پڑ جائے۔ ایک ایسا مقبرہ جس کو آنے صدیوں کی گھٹن گھٹے اور وہ احترام کے ساتھ اپنے پاؤں بکھیر جائے۔ چمن زار میں شبنم رات بھر روکے سرگوشی کرتی رہے "اے ہواؤ! یہاں سے آہستہ گزرو یہاں ممتاز محل اپنے محبوب کے ساتھ میٹھی نیند سو رہی ہے۔" بولیے میرے آقا، کیا میری موت کے بعد یہ ممکن ہے؟

شاہجہاں۔ ممتاز میری روح، اگر ہماری ممتاز اپنی کسی کنیز کی خاطر یہ آرزو کرے وہ ستاروں کے بستر پر سونا چاہتی ہے تو قسم ہے عظمت جاوید عظمت کی، قسم ہے خدائے برتر کی، شاہجہاں آسمان کے ستاروں پر شب خون مار سکتا ہے۔ زمین پر کہکشاں اتار سکتا ہے۔ ملکہ! ہم سے ہماری آنکھوں کی روشنی لے لو۔ ہم سے ہماری تلوار کا جوہر اور ہمارے بازوؤں کی طاقت لے لو۔ ہم سے کہو کہ ہم صدیوں کے غاروں میں اپنے گریباں کی دھجیاں بکھیر دیں لیکن خدا کے لیے ہماری ممتاز کو ہماری آنکھوں کے سامنے موت کے حوالے نہ کرو۔

ممتاز محل۔ میرے شہنشاہ!

(فیڈ آؤٹ)

وزیر سلطنت۔ عالی جاہ! وزیر سلطنت باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔

شاہجہاں۔ کون؟ ..... ہمیں کس نے مخاطب کیا۔ اوہ! تم ہو وزیر سلطنت۔ ہم کچھ دیر کے لیے اپنی ممتاز سے ملنے چلے گئے تھے۔

وزیر سلطنت۔ عالم پناہ! یوسف آفندی نامی ایک شخص اعلیٰ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ کہتا ہے ایک نقشہ حضور کی نگاہ سے گزارنا چاہتا ہے۔

شاہجہاں۔ ہم ضرور ملیں گے۔ اسے اجازت دی جائے۔

(وقفہ)

(دستک [illegible] کی آواز)

یوسف۔ سلطان عالم! یہ غلام بادشاہ ہند حضور شاہجہاں کی خدمت

مبارک میں باادب تسلیم بجالاتا ہے۔

شاہجہاں۔ خوش آمدی نوجوان خوش آمدی۔ ہم مشتاق ہیں تمہاری کاوشوں کو ایک نظر دیکھنے کے لیے۔

یوسف۔ عالم پناہ! مغلیہ سلطنت لازوال ہے۔ جب تک کائنات کے ایک ایک ذرے کا دل دھڑکتا ہے۔ حضور شاہ کا اقبال بلند ہے۔ یوسف آفندی کے ان حقیر ہاتھوں نے ایک جرأت کی ہے عالم پناہ۔ ملکہ ممتاز محل کی آخری خواب گاہ کا ایک خاکہ تیار کیا ہے۔ مجھے یقین ہے عالی جاہ، عالم موجودات میں اس حسن و رعنائی کی مثال نہ ملے گی۔

شاہجہاں۔ ہمیں اور نہ تڑپاؤ نوجوان آفندی۔ ہماری روح مضطرب ہے۔

یوسف۔ شہنشاہ عالم! میں نے کتنی ہی بستیوں کی خاک چھانی ہے۔ کتنی ہی زندہ و پائندہ تہذیبوں اور معاشرتوں سے ان کے جگر پارے مانگے ہیں۔ قسم ہے خدائے پاک کی سلطان عالم! اس خاکے کے ایک ایک نقش و نگار میں کتنی ہی قوموں کے فنون لطیفہ کے دل دھڑک رہے ہیں۔ ایران کی محرابوں کے عظم کا حسن، عرب کے گنبدوں کی دلنواز گولائی، مصر کے میناروں کی فلک پیما استواری، طوس کی وادیوں کے لالہ و گل اور ہندستان کی گود میں بہتی ہوئی جمنا کا پس منظر میرے سلطان!

شاہجہاں۔ بس، بس کرو یوسف آفندی! اب ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

یوسف۔ ملاحظہ فرمائیے جہاں پناہ!

(اس کے ساتھ موسیقی ابھرتی ہے)

شاہجہاں۔ مرحبا! آفندی مرحبا! لیکن یہ خواب تو ہمیں ہے آفندی! بخدا بالکل وہی، وہی محرابیں، وہی دیوار و در، وہی نقش و نگار! ہم سچ کہتے ہیں آفندی، تم نے ہماری ممتاز کے خوابوں کو تعبیر بخش دی۔ آؤ، ہندستان کا شہنشاہ تمہارے ہاتھوں پر بوسہ لینے کی اجازت چاہتا ہے۔ وزیر سلطنت!

وزیر سلطنت۔ عالی جاہ!

شاہجہاں۔ جاؤ اور ملک کے کونے کونے میں اعلان کر دو کہ شاہجہاں کو جس کا انتظار تھا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔ سلطنت مغلیہ کے خزانوں کا منھ کھول دو۔ سنگ سازوں سے کہو کہ پہاڑوں کے سینے چیر کر سنگ مرمر نکالیں۔ ہمیں آج مراد مل گئی۔ ممتاز! میری ممتاز محل!

(یکبارگی موسیقی کی ایک تیز لہر ابھر کر ڈوب جاتی ہے)

ممتاز محل۔ اس محبت کو امر بنا دیجیے شہنشاہ! ممتاز محل اور شاہجہاں کے پیار کی داستان کا ایک ایسا مقبرہ جو انسانی تخیل کی معراج ہو۔ ایک ایسا خواب جسے انسانی ہاتھ سنگ مرمر میں ڈھال دیں جس کا فرش چاندنی کے پیروں سے میلا ہو جائے۔ جس کے وقار و تقدس کے آگے کلیوں کی حیا ماند پڑ جائے۔ ایک ایسا مقبرہ شہنشاہ! جس کے پاس سے صدیوں کی گھن گرج ادب و احترام کے ساتھ دبے پاؤں گزر جائے ..... "

(کرب کے ساتھ) ممتاز! ایک لمحہ کے لیے واپس آجاؤ۔ دیکھو ہم تمہارے لیے کیا لائے ہیں۔ ممتاز!

(موسیقی کی تیز لہر ابھر کر آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے)

(فیڈ آؤٹ)

★

جھانسی کی رانی

طویل رزمیہ نظم کا ایک حصہ

وہ بہادر شاہ اپنا تاجدارِ آخری — مغلیہ شاہنشہوں کی یادگارِ آخری
تیری امداد و اعانت کے لیے تیار تھا — حفظِ آزادی کی خاطر برسرِ پیکار تھا
وہ زمیں بانفعہ مردِ دلیر و تیغ زال — وہ جری راجہ کنور سنگھ ایسا تیرا پاسبال
نانا صاحب وہ رفیقِ کہنہ وہ عالی نظر — تیغ در کف تھا حفاظت کے لیے سینہ سپر
آہ! کتنا تانتیا ٹوپی کو تیرا پاس تھا — ایسے مشکل وقت میں تیری ہی کد آس تھا
چاہتے تھے سب کے سب انگریز سے پائیں نجات — ہو نہ آزادی اگر حاصل تو کیا لطفِ حیات؟
سب کی خواہش تھی کہ پھر ہندوستاں آزاد ہو — یہ زمیں آزاد ہو یہ آسماں آزاد ہو

تھا مگر بدکوش نتھے خاں وہ غدارِ وطن — جس کے ہاتھوں ہو گیا پامال گلزارِ وطن
وہ سداشیو راؤ حاکم صوبہ خاندیش کا — بن گیا دشمن کی بدخوئی کو گھاتک دیش کا
ہو گئے سندھیا و ہلکر خود اپنوں سے رشتہ توڑ کر — بن گئے غدار انگریزوں سے ناطہ جوڑ کر
ان کمینوں نے دلایا تجھ کو باغی کا خطاب — کیا نہ تھا ان کے لیے نارِ جہنم کا عذاب؟
لشکرِ انگریز کے ہمراہ یہ دونوں لعیں — جانب جھانسی بڑھے مانندِ مارِ آستیں
اس طرف تو کیل کانٹے سے مگر تیار تھی — دشمنوں کے خون کی پیاسی تری تلوار تھی
پیرہن وہ ارغوانی سر پہ تاجِ زر فشاں — واہ واہ وہ تیرا گھوڑا، واہ تیغِ خونچکاں
وہ دہکتی آگ آنکھوں میں وہ رُخِ پُرجلال — اس بھیانک روپ میں بھی تجھ سے پیدا تھا جمال
دی صدا تو نے اٹھو! اے جاں نثارانِ وطن! — آؤ اب میدان میں ہو جاؤ قربانِ وطن
"اے دلیرو! اے شجاعو! امتحاں کا وقت ہے" — "ہندیو! یہ خدمتِ ہندوستاں کا وقت ہے"
"اقتضائے غیرتِ قومی ہے دشمن سے لڑیں" — "رخ جدھر کر دیں ہماری فتح کے جھنڈے گڑیں"
"بڑھ رہی ہے دشمنوں کی فوج اب گڑھ کی طرف" — "کھول کر پھاٹک بڑھو دشمن کی جانب صف بہ صف"
"دیش کی خاطر ہمیں قربان ہونا چاہیے" — "یہ ہمارا دھرم، یہ ایمان ہونا چاہیے"
رن میں نکلے ننگِ ناموسِ وطن کے پاسباں — سورما، سادات، غازی، مرد میداں تیغ زن
شمعِ آزادی پہ جل مرنے کو پروانے بڑھے — جذبۂ شوقِ شہادت سے کہ متانے بڑھے
باندھ کر سر سے کفن نکلے جوانانِ وطن — پاسبانی کو چلے وہ پاسبانانِ وطن
سونت کر تیغوں کو یہ خیبر شکن آگے بڑھے — صورتِ فیض یاں لشکر شکن آگے بڑھے
دشمنوں کی صف پہ اس تیزی سے دھاوا کر دیا — جس طرف رخ کر لیا، اک حشر برپا کر دیا
تیغِ براں کی روانی برقِ شعلہ بار تھی — دشمنوں کی فوج اک گرتی ہوئی دیوار تھی
دندناتے توپ خانے آگ برسانے لگے — مورچے دالھل کے خاک و خوں میں تڑپانے لگے
پے بہ پے بارود کے پھٹنے سے جلتی تھی زمیں — گرمیِ پیکار سے لرزے میں تھا چرخِ بریں
گولہ باری کا دھواں گھنگھور گھٹا بن کے چھا گیا — بارہ سو ہندو تو پکی تلواروں کے وہ بھرپور وار
غوث خاں کی توپ کے گولے تھے پیغامِ اجل — پی رہے تھے دشمنانِ کینہ خو جامِ اجل
گولہ انداز کی پھرتی برق کو شرما گئی — چیخ کی آہ کرنے والوں کے جگر جھلسا گئی
گھڑ سواروں کے پرے یک لخت پیچھے کر دیے گئے — آگ کے سیلاب میں ستوں کے دستے بہہ گئے!
کٹ رہے تھے سر مڑا دھڑ دھڑا رہے تھے تن شتاب — عرصۂ پیکار میں ہر سو بپا تھا زلزلہ
اس طرح اکھڑے قدم دشمن کے پھر جمنے نہ پائے — بہہ گئے سیلاب میں جوں خار و خس تنکے نہ پائے
لگ گئے کشتوں کے پشتے، خون کے دریا بہے — بھاگ نکلے عرصۂ پیکار سے جو بچ رہے

فتح کا سہرا محبانِ وطن کے سر رہا
جو بھی تھا غدار جا کر دشمنوں میں مر رہا

بابا کرشن گوپال مغموم

یادش بخیر

ستیہ نرائن سنہا

غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہندستان کی سرفروشانہ جدو جہد، جو ایک اعلیٰ اخلاقی سطح پر کی گئی، بہادری اور جانبازی کی ایک ایسی داستان ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ستیہ گرہ کی حکمت عملی نے جس پر عمل پیرا ہو کر لاکھوں افراد نے ناقابل بیان مصائب برداشت کیے اور جانیں قربان کیں، سیاسی جدو جہد کو صداقت اور عدم تشدد کے ایک بے مثل روحانی تجربے میں تبدیل کر دیا۔ مہاتما گاندھی کی حوصلہ افزا قیادت میں اس جدو جہد نے 'ادھرم' کے خلاف 'دھرم'، ناانصافی کے خلاف انصاف اور ظلم پسند طاقت کے خلاف اخلاقی قوت کی شکل اختیار کر لی۔

جلیانوالہ باغ کا سانحہ

جلیانوالہ باغ میں غیر مسلح اور پر امن مردوں، عورتوں اور بچوں پر وحشیانہ فائرنگ نے اور مارشل لا کے تحت عوام پر ڈھائے گئے مظالم نے ہر ہندستانی دل کو رلا دیا۔ قوم کو ناقابل بیان خجالت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ غصے سے بھرے ہوئے لوگ ایک ملک گیر احتجاج کی شکل میں متحد ہو گئے۔

گاندھی جی قوم کے مجروح وقار کے لیے نئی قیادت کی علامت بن گئے۔ اس واقعے نے ان کو، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے، تعاون کے ایک پکے حامی سے پکے مخالف میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے برطانوی سرکار کو شیطانی سرکار اور اس کے اقتدار کو ایک 'لعنت' کہہ کر قوم کے غم و غصے کا اظہار کیا۔ مہاتما جی نے اعلان کر دیا کہ بھارتی عوام "راون راج" کو اب مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اسے ختم کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں گے۔ انھوں نے عدم تعاون کی اپنی تاریخی تحریک شروع کی اور لوگوں سے کہا کہ وہ بیرونی حکومت سے جس کا رہنما خدا نہیں شیطان ہے، "تمام تعلقات منقطع کریں اور اپنی قوم کے وقار کی حفاظت کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ تمام خطابات واپس کر دیں اور کونسلوں، عدالتوں اور تمام سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کریں۔ تاہم ایسا کرنے میں، انھوں نے کہا کہ پوری طرح عدم تشدد پر قائم رہیں۔ گاندھی جی نے قیصر ہند کا میڈل واپس کر دیا جو انھیں پہلی جنگ عظیم کے دوران ممتاز خدمات انجام دینے کے سلسلے میں عطا کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی کی عدم تعاون کی یہ تحریک ہماری جدو جہد آزادی کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔

اس وقت تک سیاسی سرگرمیاں، اہم چند افراد کی خال خال سرگرمیوں کے علاوہ شہری علاقوں میں تعلیم یافتہ طبقوں کے لوگوں کے ذریعہ عموماً عرضداشتیں پیش کرنے تک محدود تھیں۔ گاندھی جی نے سیاسی سرگرمی کو ان محدود علاقوں سے نکال کر قصبوں اور دیہات میں عوام الناس تک پہنچا دیا۔ ستیہ گرہ اور عدم تشدد کے اپنے عقیدے کو پھیلانے کے لیے انھوں نے ملک بھر کا دورہ کیا۔ انھوں نے عوام میں بیداری پیدا کی۔ ان کے دلوں میں جوش بھر دیا۔ جلسے جلوس روزمرہ کا معمول بن گئے۔ لاکھوں طلبا نے اپنے اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا، وکیلوں نے عدالتوں کی اور عام انسانوں نے ہر ممکن انداز میں غیر ملکی اقتدار کی مخالفت کی۔

قومی جدو جہد کے طریق کار میں جب ۱۹۲۱ء کے قریب یہ موڑ آیا تو میں پٹنہ میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون سے میں ذاتی طور پر متاثر نہیں تھا۔ اسکولوں، کالجوں، عدالتوں اور کونسلوں کا بائیکاٹ کرنے کے نظریے نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ تعلیمی

جھانسی کی رانی

طویل رزمیہ نظم کا ایک حصہ

وہ بہادر شاہ اپنا تاجدارِ آخری — مغلیہ شاہنشہوں کی یادگارِ آخری
تیری امداد و اعانت کے لیے تیار تھا — حفظِ آزادی کی خاطر برسرِ پیکار تھا
وہ زمیں باصفوہ مردِ دلیر و تیغ راں — وہ جری راجہ کنور سنگھ ایسا تیرا پاسباں
نانا صاحب وہ رفیقِ کہنہ وہ عالی نظر — تیغ در کف تھا حفاظت کے لیے سینہ سپر
آہ! کتنا تانتیا ٹوپی کو تیرا پاس تھا — ایسے مشکل وقت میں تیری ہی بس اک آس تھا
چاہتے تھے کہ سب انگریز سے پائیں نجات — ہو نہ آزادی اگر حاصل تو کیا لطفِ حیات؟
سب کی خواہش تھی کہ پھر ہندوستاں آزاد ہو — یہ زمیں آزاد ہو، یہ آسماں آزاد ہو

تھا مگر بدکوش نتھے خاں وہ غدارِ وطن — جس کے ہاتھوں ہو گیا پامال گلزارِ وطن
وہ سداشو راؤ حاکم صوبہ خاندیش کا — بن گیا دشمن کی بہبودی کو گھاتک دیش کا
ہو گئے غیروں کے، خود اپنوں سے رشتہ توڑ کر — بن گئے غدار انگریزوں سے ناطہ جوڑ کر
ان کمینوں نے دلایا تجھ کو "باغی" کا خطاب — کیا نہ تھا ان کے لیے نارِ جہنم کا عذاب؟
لشکرِ انگریز کے ہمراہ یہ دونوں لعیں — جانب جھانسی بڑھے مانند مارِ آستیں
اس طرف تو کیل کانٹے سے مگر تیار تھی — دشمنوں کے خون کی پیاسی تری تلوار تھی
پیرہن وہ ارغوانی، سر پہ تاجِ زرفشاں — واہ وا وہ تیرا گھوڑا، واہ تیغِ خوں چکاں
وہ دہکتی آگ آنکھوں میں وہ رُخ پُرجلال — اس بھیانک روپ میں بھی تجھ سے پیدا تھا جمال
دی صدا تو نے "اٹھو! اے جاں نثارانِ وطن! — آؤ اب میدان میں ہو جاؤ قربانِ وطن"
"اے دلیرو! اے شجاعو! امتحاں کا وقت ہے — ہندیو! یہ خدمتِ ہندوستاں کا وقت ہے"
"اقتضائے غیرتِ قومی ہے دشمن سے لڑیں — بیخ جڑ سے کر دیں ہماری فتح کے جھنڈے گڑیں"
"بڑھ رہی ہے دشمنوں کی فوج اب گڑھ کی طرف — کھول کر پھاٹک بڑھو دشمن کی جانب صف بہ صف"
"دیش کی خاطر ہمیں قربان ہونا چاہیے — یہ ہمارا دھرم، یہ ایمان ہونا چاہیے"
رن میں نکلے ننگِ ناموسِ وطن کے پاسباں — سورما، ساونت، غازی، مردِ میداں، تیغ راں
شمعِ آزادی پہ جل مرنے کو پروانے بڑھے — جذبۂ شوقِ شہادت لے کے متانے بڑھے
باندھ کر سر سے کفن نکلے جوانانِ وطن — پاسبانی کو چلے وہ پاسبانانِ وطن

سونت کر تیغوں کو یہ خیبر شکن آگے بڑھے — صورتِ سیلِ رواں لشکر شکن آگے بڑھے
دشمنوں کی صف پہ اس تیزی سے دھاوا کر دیا — جس طرف رخ کر لیا، اک حشر برپا کر دیا
تیغِ براں کی روانی برقِ شعلہ بار تھی — دشمنوں کی فوج اک گرتی ہوئی دیوار تھی
دندناتے توپ خانے آگ برسانے لگے — سورما دل کھول کر خوں میں نہانے لگے
پلہ پہ بارود کے پھٹنے سے ہلتی تھی زمیں — گرمیِ پیکار سے لرزے میں تھا چرخِ بریں
گولہ باری کا دھواں گھنگھور کالی گھٹا — بارش بند و توپ کی تلواروں کے وہ بھرپور وار
غوث خاں کی توپ کے گولے تھے پیغامِ اجل — پی رہے تھے دشمنانِ کینہ خو جامِ اجل
گولہ انداز کی پھرتی برق کو شرما گئی — پیش گامی کر نہ والوں کے جگر جھلسا گئی
گھڑ سواروں کے پرے یک لخت بیچھے مڑ گئے — آگ کے سیلاب میں ستوں کے ستے بہہ گئے
کٹ رہے تھے سر ادھر، دھڑ تھے ادھر تڑپا — عرصۂ پیکار میں ہر سو بپا تھا زلزلہ
اس طرح اکھڑے قدم دشمن کے پھر جمنے نہ پائے — بہہ گئے سیلاب میں جو بن گئے خس تھمنے نہ پائے
لگ گئے کشتوں کے پشتے، خون کے دریا بہے — بھاگ نکلے عرصۂ پیکار سے جو بچ رہے

فتح کا سہرا محبانِ وطن کے سر رہا
جو بھی تھا غدار جا کر دشمنوں میں سو رہا

ڈاکٹر کرشن گوپال مغموم

یادش بخیر

ستیہ نرائن سنہا

غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہندستان کی سرفروشانہ جدو جہد جو ایک اعلیٰ اخلاقی سطح پر کی گئی، بہادری اور جانبازی کی ایک ایسی داستان ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ستیہ گرہ کی حکمت عملی نے جس پر عمل پیرا ہو کر لاکھوں افراد نے ناقابل بیان مصائب برداشت کیے اور جانیں قربان کیں، سیاسی جدو جہد کو صداقت اور عدم تشدد کے ایسے مثالی روحانی تجربے میں تبدیل کر دیا۔ مہاتما گاندھی کی جوشیلی قیادت میں اس جدو جہد نے 'ادھرم' کے خلاف 'دھرم'، ناانصافی کے خلاف انصاف اور ظلم پسند طاقت کے خلاف اخلاقی قوت کی شکل اختیار کر لی۔

جلیانوالہ باغ کا سانحہ

جلیانوالہ باغ میں غیر مسلح اور پرامن مردوں، عورتوں اور بچوں پر وحشیانہ فائرنگ نے اور مارشل لا کے تحت عوام پر ڈھائے گئے مظالم نے ہر ہندستانی دل کو دہلا دیا۔ قوم کو ناقابل بیان خجالت کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ غصے سے بھرے ہوئے لوگ ایک ملک گیر احتجاج کی شکل میں متحد ہو گئے۔

گاندھی جی قوم کے مجروح وقار کے لیے نئی قیادت کی علامت بن گئے۔ اس واقعہ نے ان کو، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے، تعاون کے ایک پکے حامی سے پکے مخالف میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے برطانوی سرکار کو شیطانی سرکار اور اس کے اقتدار کو ایک 'لعنت' کہہ کر قوم کے غم و غصے کا اظہار کیا۔ مہاتما جی نے اعلان کر دیا کہ بھارتی عوام "راون راج" کو اب مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اسے ختم کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں گے۔ انھوں نے عدم تعاون کی اپنی تاریخی تحریک شروع کی اور لوگوں سے کہا کہ وہ بیرونی حکومت سے جس کا رہنما خدا نہیں شیطان ہے "تمام تعلقات منقطع کر لیں اور اپنی نیز اپنی قوم کے وقار کی حفاظت کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ تمام خطابات واپس کر دیں اور کونسلوں، عدالتوں اور تمام سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کریں۔ تاہم ایسا کرنے میں، انھوں نے کہا کہ پوری طرح عدم تشدد پر قائم رہیں۔ گاندھی جی نے قیصر ہند کا میڈل واپس کر دیا جو انھیں پہلی جنگ عظیم کے دوران ممتاز خدمات انجام دینے کے سلسلے میں عطا کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی کی عدم تعاون کی یہ تحریک ہماری جدو جہد آزادی کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔

اس وقت تک سیاسی سرگرمیاں، ہم جو افراد کی خال خال سرگرمیوں کے علاوہ شہری علاقوں میں تعلیم یافتہ طبقوں کے لوگوں کے ذریعہ عموماً عرضداشتیں پیش کرنے تک محدود تھیں۔ گاندھی جی نے سیاسی سرگرمی کو ان محدود علاقوں سے نکال کر قصبوں اور دیہات میں عوام الناس تک پہنچا دیا۔ ستیہ گرہ اور عدم تشدد کے اپنے عقیدے کو پھیلانے کے لیے انھوں نے ملک بھر کا دورہ کیا۔ انھوں نے عوام میں بیداری پیدا کی، ان کے دلوں میں جوش بھر دیا۔ جلسے جلوس روزمرہ کا معمول بن گئے۔ لاکھوں طلبا نے اپنے اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا، وکیلوں نے عدالتوں کی اور عام انسانوں نے ہر ممکن انداز میں غیر ملکی اقتدار کی مخالفت کی۔

قومی جدو جہد کے طریق کار میں جب ۱۹۲۱ء کے قریب یہ موڑ آیا تو میں پٹنہ میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون سے میں ذاتی طور پر متاثر نہیں تھا۔ اسکولوں، کالجوں، عدالتوں اور کونسلوں کا بائیکاٹ کرنے کے نظریے نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ تعلیمی

سرگرمیوں کو خیرباد کہنے کی گاندھی جی کی اپیل کا میں مخالف تھا۔ کانگریس کے ناگپور اجلاس کے بعد ملک گیر دورہ کرتے ہوئے گاندھی جی پٹنہ آئے تو انھوں نے ایک عظیم اجتماع سے خطاب کیا جس میں میں بھی موجود تھا۔ جلسے کے آغاز میں میرے ایک کلاس فیلو منورنجن پرساد نے جو اعلیٰ صلاحیت کا شاعر تھا، ایک بھوجپوری گیت سنایا جو مجھے آج بھی یاد ہے :

کا کرے گاندھی اکیلے تلک پرلوک گئے
ہے ڈھیر لوک نیکے آپسے ہو دبیت گئے

(گاندھی اکیلے کیا کریں، تلک تو پرلوک سدھار گئے۔ اگرچہ ہمارے ہی خواں بہت ہیں لیکن وہ آپس میں تقسیم ہو گئے ہیں)

اس گیت نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا اور میری فکر کے دھارے کو یکسر بدل دیا۔ جلسہ گاہ سے اپنے ہوسٹل واپس آتے ہوئے میں نے پڑھائی چھوڑ کر عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو جانے کا اٹل فیصلہ کر لیا۔ اس اچانک تبدیلی خیالات پر میرے ہوسٹل کے ساتھیوں کو خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ اب ہم سب تحریک میں پوری طرح شامل ہو چکے تھے۔ لیکن ایک سال کے اندر اندر ان میں سے تقریباً سبھی لوگ پڑھائی کے لیے واپس آ گئے لیکن میں باہر ہی رہا۔ انھوں نے خط لکھ کر مجھ پر زور دیا کہ میں بھی کالج میں داخلہ لے لوں۔ میں نے ان سے کہہ دیا کہ میرے لیے اب واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے ضلع کے رہنما نے مجھ سے دیہی علاقوں میں کام کرنے کے لیے کہا۔ میری خدمات کو دیکھتے ہوئے جلد ہی مجھے سب ڈویژنل کانگریس کمیٹی کا سکریٹری بنا دیا گیا۔ بہار کے شہری علاقوں کے مقابلے میں دیہات کے عوام پر گاندھی جی کی تحریک کا اثر زیادہ گہرا تھا۔

گاندھی جی نے عوام سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بھگوت گیتا، رامائن اور کبیر، نانک، نرسی بھگت اور میرا بائی کی تعلیمات پر خاص توجہ مرکوز رکھی اور انھیں قوم کے کاز (مقصد) کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کی ترغیب دی۔ انھوں نے لنگوٹی پہنی اور خود کو سرتا پا غریبوں جیسا بنا لیا۔ ان کے ملک گیر دوروں، بزار تھنا سبھاؤں، تقریروں اور تحریکوں نے آزادی کے لیے ایک تابندہ خواہش پیدا کر دی اور لوگوں کے دلوں میں زندگی کے لیے ایک امید جگا دی۔

یہ وہ لوگ تھے جو پسماندہ اچھوت تھے اور صدیوں پرانی ذہنی اقتصادی اور سیاسی غلامی کے سبب بہت پست ہو چکے تھے۔

ایک عظیم ترین شخصیت

آزادی حاصل کرنے کے لیے لاکھوں افراد کو صداقت اور عدم تشدد پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دینے کا کام تقریباً ناممکن تھا۔ لیکن گاندھی جی نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور غریبی اور جہالت کی زنجیر میں پڑے ہوئے مختلف ذاتوں، فرقوں اور عقائد کے لوگوں کو ایک زبردست جنگی قوت کی صورت میں متحد اور مجتمع کر دیا۔ ان کے ذریعہ جو نفسیاتی انقلاب آیا اس نے ایک قومی جذبے کی تشکیل کی اور ستیہ گرہ، لاٹھی چارج اور فائرنگ وغیرہ قومی زندگی میں آئے دن کا واقعہ بن گئی۔ یہ ان کی شخصیت ہی کا اعجاز تھا کہ جو بھی ان کے قریب آیا ان کی قربت کے فیض نے اسے گوشۂ گمنامی سے نکال کر عوامی زندگی میں ہیرو بنا دیا۔ انھوں نے عوام کو جرأت اور بے خوفی عطا کی اور لوگوں کو تحریک عمل بخشی اور ملک کے لیے جیل جانے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ یہی نہیں تختۂ دار کی طرف جاتے ہوئے بھی ان کے ہونٹوں پر 'بندے ماترم' اور 'بھارت ماتا کی جے' کے الفاظ ہوتے تھے۔

آزادی حاصل کرنے کے لیے عدم تشدد کو اپنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔ تاریخ انسانی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب ملکوں نے پرتشدد ذرائع ہی سے آزادی حاصل کی۔ جب گاندھی جی اپنے ستیہ گرہ کے تصور کے ساتھ ہندوستانی سیاست کے منظر عام پر آئے تو بالخصوص سیاسی جدوجہد کے صف اول کے رہنماؤں نے انھیں شک وشبہہ کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے گاندھی جی کے ستیہ گرہ کے اخلاقی تصور کی، جس میں تشدد کا شائبہ نہ تھا، سیاسی افادیت پر شبہ کیا۔ لیکن دھیرے دھیرے لوگوں نے ستیہ گرہ اور عدم تشدد کو اپنا لیا کیونکہ یہ بھارتی ثقافت اور ہماری روایتوں کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ یہ امر اس وقت اور بھی مشکل ہو گیا جب گاندھی جی نے وسیلے اور مقصود کی پاکی پر زور دیا اور پوری قوم سے عدم تشدد کی راہ پر چلنے کے لیے کہا۔ ہندوستان جیسے وسیع ملک میں اس پر عمل در

ہونا غیر عملی سمجھا گیا۔ یہ شبہ اس وقت صحیح ہو گیا جب چوری چورا میں تشدد کا مظاہرہ ہونے پر گاندھی جی نے ستیہ گرہ تحریک کو معطل کر دیا۔ پرانے رہنماؤں نے کہا کہ انھوں نے بہادر ہندستانیوں کی قربانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پورے معاملے ہی کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ تاہم گاندھی جی نے اصرار کیا کہ ملک جد و جہد کے لیے پوری طرح تیار نہ تھا۔ انھوں نے اعلیٰ ترین قربانی دینے اور اعلیٰ اخلاقی اقدار حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو تیار کرنا جاری رکھا۔ قومی بیداری کے لیے انھوں نے کھادی سے ہریجن سدھار تک ہر قسم کی سرگرمیوں کو فروغ دیا۔

سوراجیہ پارٹی

پرانے رہنماؤں نے اختلاف جاری رکھا اور گیا کانگریس میں کونسل کا بائیکاٹ کرنے کے فیصلے کو پلٹ دینے کی بھرپور کوشش کی۔ گاندھی جی موجود نہیں تھے۔ لیکن ڈاکٹر راجندر پرساد اور شری سی۔ راجگوپال آچاری نے "عدم مخالفت" کے پروگرام کا ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور پارٹی نیز عوام نے اس میں اپنے یقین کا اعادہ کیا۔

گاندھی جی ایک سادھو تھے۔ انھوں نے ہندستانی ثقافت کی بھرپور نمایندگی کی لیکن وہ ایک عظیم سیاست داں بھی تھے اور انھوں نے ان دونوں صلاحیتوں سے موثر انداز میں کام بھی لیا۔

کونسل میں داخلے کے سوال نے کانگریس میں گروہ بندی کو جنم دیا۔ کونسل کے حامی گروپ نے سوراجیہ پارٹی کی تشکیل کی جس کا صدر دیش بندھو سی۔ آر۔ داس کو اور سکریٹری پنڈت موتی لال نہرو کو بنایا گیا۔ حکیم اجمل خاں، وٹھل بھائی پٹیل، این۔ سی۔ کیلکر، ایس سنتیہ مورتی اور ایم۔ آر جیکر اس پارٹی کے ممتاز رکن تھے۔ اس وقت ایک سنسنی خیز واقعہ یہ رونما ہوا کہ ایک دہشت پسند بنگالی گوپی ناتھ ساہا نے پولیس کمشنر پر ایک بم پھینکا جس سے ایک اور انگریز کی موت ہو گئی۔

سوراجیہ پارٹی کے لیڈروں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جوہو اجلاس میں ایک ریزولیوشن پیش کیا جس میں ساہا کی بہادری کو سراہا گیا اور اس طرح بالواسطہ تشدد کو حمایت دی گئی تھی۔ گاندھی جی نے بستر علالت سے ساہا کی تعریف کی لیکن کہا کہ یہ طریقہ ہمیں کہیں کا نہ رکھے گا۔ انھوں نے تشدد کو فروغ دینے کی کوشش کی پر زور مخالفت کی اور اعلان کیا کہ عدم تشدد محض ایک پالیسی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اظہار عقیدت کی ایک شرط ہے۔ یہ ریزولیوشن پاس نہیں ہو سکا۔ دیش بندھو اور پنڈت موتی لال نہرو نے اسے محسوس کیا۔ لیکن گاندھی جی نے ان پرانے لیڈروں پر کامیابی حاصل کر لی۔ ینگ انڈیا کے اگلے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں گاندھی جی نے اپنے اس کرب کا اظہار کیا کہ وہ ان دانشور شخصیتوں کو عدم تشدد کے راستے پر گامزن کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ انھوں نے لکھا کہ اس ناکامی پر انھیں خود بہت ہتک محسوس ہوئی ہے۔

عدم تعاون اور سول نافرمانی سے لے کر ۱۹۴۲ء میں "بھارت چھوڑو" تحریک تک ایک لمبا سفر ہے جہاں قدم قدم پر آزمائشوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ سماجی، اقتصادی اور سیاسی ہر طرح کے مظاہرے اور تحریکیں یکے بعد دیگرے رونما ہوئیں اور ہر ایک نے آزادی کی خواہش کو نئی طاقت اور گیرائی عطا کی۔ اور آخر کار وہ نقطۂ عروج بھی آیا جب ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی آدھی رات کو ہندستان اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور بھارتی عوام کی صحیح معنوں میں نمائندگی کرنے والی مجلس آئین ساز نے خود مختار حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اور جب صدیوں پرانے آزادی کے خواب کی تعبیر ملی تو سارے ملک میں جوش اور ولولے کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں نصف شب کی اس شاندار اور تاریخی تقریب کی یاد، جس میں مجھے کانگریس پارلیمانی پارٹی کے چیف وہپ کی حیثیت سے شرکت کا موقع ملا تھا، میرے حافظہ میں ہمیشہ تابندہ رہے گی۔ لال قلعے کی پُرعظمت فصیل پر جب وزیر اعظم نے قومی ترنگا لہرایا تو وہ منظر دراصل تمام ہندستانی شہریوں کی مقدس خواہشات کی عکاسی کر رہا تھا۔ لیکن جب یہ تاریخی دن آیا تو وہ انسان جس نے اس دن کے حصول کو ممکن بنا دیا تھا بنگال میں تھا اور فرقہ وارانہ جنون کے نتیجے میں زخمی ہونے والوں کی دل جوئی کر رہا تھا۔

گاندھی جی کی شخصیت اس قدر عظیم تھی کہ ان کی شہادت پر بجا طور پر کہا گیا کہ "آئندہ نسلیں اس پر مشکل ہی سے یقین کریں گی کہ واقعی گوشت و پوست کے ایک ایسے انسان نے اس دھرتی پر جنم لیا تھا۔"

★

غزل

نسرینہ ثانی

زندگی خار زار میں گزری
جستجوے بہار میں گزری

کچھ تو پیمانِ یار میں گزری
اور کچھ اعتبار میں گزری

منزلِ زیست ہم سے سر نہ ہوئی
یادِ گیسوے یار میں گزری

پھول گریاں تھے ہر کلی لرزاں
جانے کیسی بہار میں گزری

زندگانی طویل تھی لیکن
موت کے انتظار میں گزری

آپ سے مل کے زندگی اپنی
جستجوے قرار میں گزری

جو بھی گزری بری بھلی ثانی
آپ کے اختیار میں گزری

غزل

مجیب رامشی

عقل کی گمرہیاں جب دینِ انساں ہو گئیں
جسم کی پرچھائیاں تک شعلہ ساماں ہو گئیں

کل میں بے منزل سی خوشبو کی طرح آوارہ تھا
جسم میں اترا تو سمتیں دشمنِ جاں ہو گئیں

خشک لب پر پیاس کا کڑوا نمک بکھرا رہا
بہتی ندیاں گھر کے آنگن سے گریزاں ہو گئیں

کوبکو بھٹکا رہا ہے بے یقینی کا مزاج
فلسفوں کی سازشیں جب ذہن سے عریاں ہو گئیں

یہ صلہ ہے وقت کے ہمراہ چلنے کا صلہ
استخواں آباد ہیں، روحیں بیاباں ہو گئیں

اب بھی آسودہ کہے دنیا تو میرا کیا قصور
رخ پہ ہاتھوں کی لکیریں تک نمایاں ہو گئیں

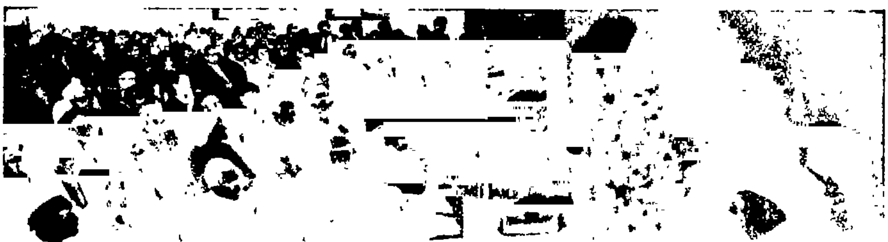
یہ اندھیرا۔ اور یہ ذرات کا رقصِ دوام
اور یہ آہٹ جس سے سانسیں تک پریشاں ہو گئیں



راج بھون میں ۵ جنوری ۱۹۷۳ء کو یوم محمد علی جوہر منایا گیا اس موقع پر گورنر اتر پردیش
جناب اکبر علی خاں صاحب نے حاضرین کو خطاب کیا۔ اوپر کی تصویر اسی موقع کی ہے۔



آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے سلسلے میں انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی کے زیر اہتمام حضرت محل پارک لکھنؤ میں ایک عظیم الشان
نمائش کا انعقاد ہوا۔ تصویر میں بائیں جانب وزیر اعلیٰ یوپی شری کملاپتی ترپاٹھی نمائش کا افتتاح کر رہے ہیں۔
داھنی جانب دستکاری سے متعلق اسٹال کا اندرونی منظر



اساتذہ اردو جامعات ہند کی چوتھی کانفرنس کا جو لکھنؤ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء اور یکم و
۲ جنوری ۱۹۷۳ء کو منعقد ہوئی بیگم حامدہ حبیب اللہ وزیر ریاست و صدر اردو اکاڈمی افتتاح کر رہی ہیں



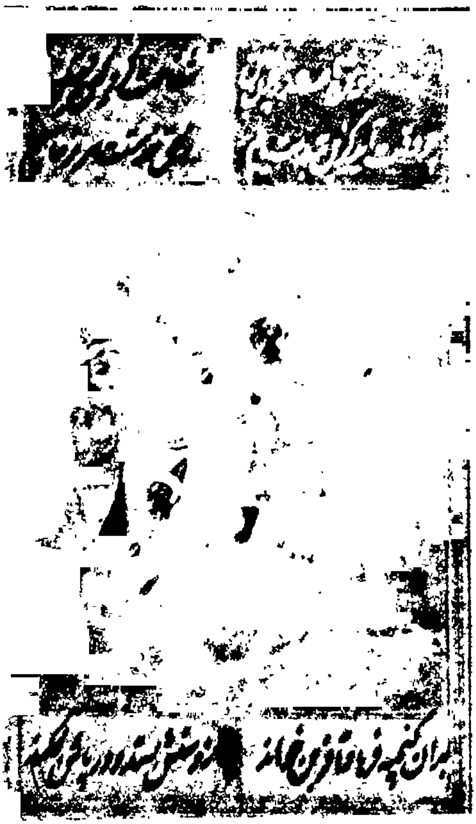
پروفیسر احتشام حسین کے سوگ میں ۱۱ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو گنگا پرشاد
لکھنؤ میں ہونے والے تعزیتی جلسہ کو گورنر یوپی جناب اکبر علی خاں صا
کرتے ہیں

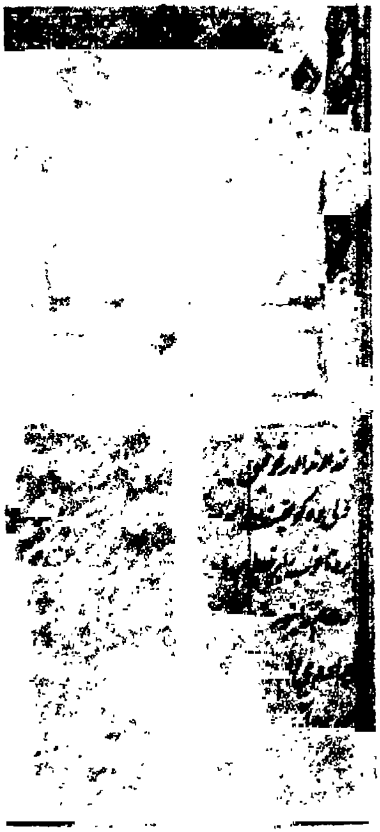
حال ہی میں ریاستی میوزیم لکھنؤ نے شیریں فرہاد کی کہانی
کا ایک نادر منظوم مخطوطہ حاصل کیا ہے۔ یہ مخطوطہ مصور ہے۔
مصور صفحہ کی تصویریں دی جا رہی ہیں

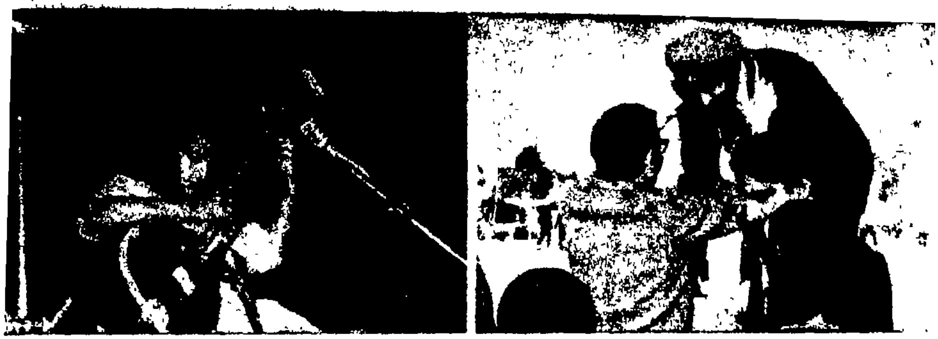


← مدھوبنی فن مصوری کا ایک نمونہ









(بائیں جانب) ماہر سرود نواز شری روی شنکر حضرت محل پارک لکھنؤ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے۔
(داہنی جانب) ڈائرکٹر انفارمیشن یوپی شری شرومنی شرما، سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم لکھنؤ میں یوتھ فیسٹول کے موقع پر
انعامات تقسیم کرتے ہوئے

تارا چودھری ٹھمری رقص میں کتھک اسٹائل پیش کرتے ہوئے



جشنِ جمہور

رہبر جونپوری

ہند ہے آج تصویر فردوس کی
ہے نگاہوں میں رقصاں نئی زندگی
آؤ دنیا کو دیں امن کی روشنی
ختم کر دیں زمانے سے ہر تیرگی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

ذرے ذرے میں ہے آج اک بانکپن
نغمہ زن ہیں ہم آج گنگ و جمن
ایکتا کی ترنگے سے پھوٹی کرن
کھیت و بستی میں ہر شے ہے ڈوبی ہوئی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

ہو گئی سہل ہستی کی ہر رہ گزر
مل گیا ہے ہمیں رہبرِ معتبر
رہبری اب ہے اندرا کی ہر گام پر
کیوں نہ چومے قدم منزلِ آگہی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

دیش میں کارخانوں کی بھرمار ہے
سبز و شاداب کھیتوں کی مہکار ہے
ہر طرف ڈیم کی شمع ضوبار ہے
قریہ قریہ میں جھلکی ہے شہر کی دلکشی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

آؤ زنجیرِ ظلم و ستم توڑ دیں
صلح کی سمت دنیا کا رخ موڑ دیں
نفرت و بغض کی ہر ادا چھوڑ دیں
شمع روشن کریں جگ میں ایثار کی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

اس زمیں سے اہنسا کا آغاز ہے
پنچ شیل محبت کا غماز ہے
"شانتی" اپنے بھارت کی آواز ہے
امن کی راہ دنیا کو ہم سے ملی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

۲۶ جنوری ۱۹[illegible]ء

صبحِ جمہور

رضا امروہوی

تو ہر اک سال نئی شان سے آتی ہے مگر
مفلسوں کے لیے پیغام نئے لاتی ہے
فاقہ کش کے لیے لاتی ہے امیدِ فردا
ذرے ذرے کو عطا کرتی ہے ارماں کی کرن
تیری آمد ہو مبارک یہ دعا کرتا ہوں
آ، کہ تیرے لیے بیتاب رہا کرتا ہوں

تو مرے ہند کی عظمت کا حسیں پرچم ہے
صرف تیرے ہی تحفظ کے لیے دل وا ہے
اپنی جانوں کی نہیں قدر سمجھتے کچھ بھی
یہ مسلّم ہے تقدس کی امانت تو ہے
تیری عظمت کے لیے جان فدا کرتا ہوں
آ، کہ تیرے لیے بے تاب رہا کرتا ہوں

تو مرے عزم و تمنا کا حسیں پیکر ہے
تو مرے خوابوں کی تعبیرِ حسیں، شرحِ جمیل
قصرِ افکار میں رونق ہے ترے جلووں سے
تو مرے فن کا دمکتا ہوا اک ہیرا ہے
تیرے ہی عشق کے اشعار پڑھا کرتا ہوں
آ، کہ تیرے لیے بے تاب رہا کرتا ہوں

میں پرستار ہوں تو دیوی ہے اس مندر کی
جس میں تہذیب و تمدن کے ہیں لاکھوں اصنام
ہند کی عظمت و رفعت کی نشانی تو ہے
عزم و ایثار کی محفل کا اجالا تو ہے
تیری نصرت کے لئے عہدِ وفا کرتا ہوں
آ، کہ تیرے لیے بے تاب رہا کرتا ہوں

[illegible]

اردو خطوط نگاری

محمد رفیع انصاری

خطوط نویسی ایک عوامی اور جمہوری عمل ہے۔ ہر وہ شخص جو تہذیب یافتہ یا نیم تہذیب یافتہ سماج میں رہتا ہے، خط ضرور لکھتا یا لکھواتا ہے۔ انسان جس سماج میں رہتا ہے اس سے اس کا گہرا ربط ہوتا ہے۔ عزیز اقارب اور دوست احباب تو ہوتے ہی ہیں، اس کے علاوہ کاروباری رشتہ بھی ہوتا ہے جو اور بھی وسیع ہوتا ہے۔ ہر شخص کو زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے چاہے وہ زراعت اور دست کاری کرے یا نوکری اور تجارت۔ اس طرح پورے کا پورا معاشرہ اور اس کا ہر ایک فرد ایک دوسرے سے جڑا ہوتا ہے۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ، دوست داری اور کاروباری زندگی نے ساری دنیا کے انسانوں میں ایک باہمی اور بہت گہرا رشتہ قائم کر دیا ہے۔ اس لیے پیغام رسانی کی ضرورت ہر انسان کو ضرور پیش آتی ہے۔

خطوط نگاری کے باب میں کوئی تحقیق اب تک ایسی نہیں ہوئی ہے جس سے پتہ چل سکے کہ اس کی تاریخ کتنی قدیم ہے لیکن اس کی تاریخی حیثیت اتنی ہی قدیم ہو سکتی ہے جتنی کہ تہذیب انسانی اور رسم خط کی ایجاد۔ رسم خط کی ایجاد تہذیب انسانی کی ابتدا کا لازمی جز تھی۔ سماج و معاشرے کی وسعت اور زندگی کی مصروفیات جب بڑھی ہوں گی تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ اپنی بات دوسروں تک بالمشافہ پہنچائی جائے۔ اس لیے تحریر کی ضرورت پیش آئی۔ جب انسان ابتدائی تمدنی دور میں جنگلی زندگی گزار رہا تھا تو نہ اسے لکھنے پڑھنے کی ضرورت تھی اور نہ وہ اس سے واقف تھا لیکن انسان کا ذہن ترقی پذیر واقع ہوا ہے۔ اس نے بہت دنوں تک اس طرح کی زندگی گزارنا گوارا نہ کیا۔ ضرورتیں بڑھتی گئیں اور اسی کے مطابق وہ راہ بھی نکالتا گیا یعنی مائل با ارتقا ہوا۔ سماج و معاشرے کی تشکیل ہوئی۔ اپنی بات یا منہ سے نکلی ہوئی آواز کو پہچاننے کے لیے کچھ نشانات لکیروں کی شکل میں مرتب کیے گئے۔ یہی لکیریں رسم خط کہلاتی ہیں۔ رسم خط منہ سے نکلی ہوئی خالص یا مخلوط آواز کی مادی شکل ہے۔ رسم خط ہی کی مدد سے لفظ متشکل ہوتا ہے اور لفظوں کا بامعنی مجموعہ ایک پوری بات یا جملہ کہلاتا ہے۔ مکمل جملے بذریعہ تحریر ہی ممکن ہیں۔ اس لیے کہ زبانی بات چیت میں ادائے مطالب کے واسطے اشارے کنائے اور حرکات و سکنات کا بھی دخل ہوتا ہے، اور پورا جملہ ادا بھی نہیں ہو پاتا کہ مخاطب مطلب و مفہوم سمجھ لیتا ہے۔ تحریر میں ان معاونین ادائے مطالب کا قطعی گزر نہیں۔ معلوم ہوا کہ مخاطب کی غیر حاضری میں اس سے بات چیت کا ذریعہ تحریر ہی ہے۔ تحریر ابتدا سے آج تک پیغام رسانی ہی کے کام آتی رہی ہے۔ عربوں کے خیال میں تحریر کی ایجاد کا بنیادی مقصد (علم معلومات سے پہلے) محض پیغام رسانی اور جذبات یا معلومات کا ابلاغ تھا۔

جس طرح دیگر علوم و فنون کی ایجاد بقا کے زیر سایہ ہوئی اسی طرح خطوط نگاری کی ابتدا بھی بقا ہی کے سلسلے میں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ قدیم تہذیب کے دوسرے مراکز میں بھی

مکتوب نگاری نے ترقی کی ہو لیکن اس کا پتہ اب تک نہیں چل سکا ہے۔ یہ بات کتنی حیرت انگیز ہے کہ روما میں خطوط نگاری کا آغاز تو ہوا لیکن وہاں اس فن کو عروج نہ حاصل ہو سکا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہاں روم شہری ریاستیں سیاسی اور جغرافیائی حالات کے تحت ٹکڑیوں میں بٹ گئی تھیں۔ ہر ریاست ایک الگ دنیا سمجھی جاتی تھی۔ روم کا معاشرہ اور سماج اگرچہ ہر طرح سے ترقی کے نقطۂ عروج پر تھا لیکن معاشرت محدود تھی۔ عبادت گاہوں میں، کھیل کود اور ورزش کے میدانوں میں، دوستوں کی محفلوں میں لوگ آپس میں مل لیتے تھے اور دل کے غبار اور سر کے بوجھ کو ہلکا کر لیتے تھے۔ اپنے قریوں اور علاقوں کے علاوہ دوسروں کے وجود و عدم وجود کی انھیں فکر نہ تھی۔ خطوط نگاری کے لیے وسیع معاشرہ، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جاننے کی سہولت اور عملی زندگی سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ایسی زبان کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس میں ہر طرح کے خیال کے اظہار کی صلاحیت ہو اور وہ زبان دور و نزدیک بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ بہر حال یہ تمام خوبیاں اور خصوصیات سب سے پہلے روم ہی میں پائی گئیں۔ اس لیے مراسلت کی ایجاد کا سہرا بھی روم ہی کے سر بندھا۔ روم کی زندگی کا عکس اور اس کی معاشرت کی پرچھائیاں سسرو کے خطوط میں ملتی ہیں۔ ان خطوط میں سادگی جو خط کا اصلی جوہر ہے، مفقود ہے۔ رومیوں کے مکاتیب کی زبان خطابت اور روزمرہ کی بول چال سے قطعاً مختلف ہے۔ اس زمانے میں خطابت کے اصول اور بلاغت کے قواعد خواص کی ذہنی تربیت کی پہلی منزل تھے۔ زندگی اپنے خاص ضابطے اور قوانین کی پابند تھی۔ اس لیے خطوط نگاری کے فن کو بھی اسی نہج پر مرتب کیا گیا۔

خطوط نگاری کی بہت سی قسمیں تھیں، جیسے مبارک باد کے خطوط، تعزیت نامے، تہنیتی خطوط، شاہی فرمان اور توقعات وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام طرح کے خطوط اور تحریروں کے لیے آداب و القاب، ابتدا اور انتہا کے اسالیب مقرر تھے۔ القاب و آداب کی کثافت ہی کیا کم تھی کہ بعد کی گفتگو بھی بلاغت کے تمام تر تکلفات سے بوجھل ہوتی تھی۔

انگریزی ادب میں پندرہویں صدی عیسوی میں خطوط نگاری کی ابتدا کا پتہ ملتا ہے۔ اس سے پہلے انگلستان میں جو مکتوب لکھے گئے وہ لکھنے والوں کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔ صرف پندرہویں اور سولھویں صدی کے خطوط رقعات کی شکل میں موجود ہیں لیکن ان میں بھی القاب و آداب کا ہجوم حشر انگیز ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے آغاز میں بہت سے اچھے خطوط نگار رہا کا پتہ چلتا ہے لیکن ان کے مکاتیب بھی آغاز و انجام کے قاعدے میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان میں وعظ و نصیحت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سترہویں صدی میں قدیم اطالوی خطوط کے ترجمے کیے گئے۔ لیکن ان سے بھی خطوط نگاری کے باب میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا۔ جیمس ہال، جو انگریزی میں خطوط نگاری کا پہلا امام مانا جاتا ہے، اسی دور کا آدمی تھا۔ اس کے خطوط میں بھی وہی ادبی نفاستوں کا التزام ہے۔ انھیں بیجا ادبیت اور اصول و ضابطے سے اُوب کر لوگ آسان اور رواں دواں خطوط نگاری کی طرف مائل ہوئے اور آخر کار جون ہیرنگ ٹن، ولیم کوپر، گرے اور چارلس لیمب جیسے خطوط نگار منظر عام پر آئے، جنھوں نے آداب و القاب سے زیادہ نفس مطلب کی طرف توجہ دی اور خطوں کو دو افراد کے درمیان بے تکلف بات چیت کا ذریعہ بنا دیا۔

اردو خطوط نگاری کا جائزہ لینے کے سلسلے میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں نثر نگاری پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔ مجھے اس بات سے قطعی اختلاف ہے کہ کسی بھی زبان میں نثر سے پہلے نظم کا آغاز ہوا۔ کسی بھی زبان میں پہلے پہل بول چال، لین دین و نیز آپس میں گفتگو کا کام چلانے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ سب باتیں نثر میں ہوتی ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کا اپنی تصنیف آبِ حیات میں یہ لکھنا درست نہیں معلوم ہوتا کہ یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے پھر بات کرنا سیکھے؟ اس جملے نے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی زبان کو ابتداءً منقفی اور

موزوں کیسے بولا جا سکتا ہے جبکہ اس کے اجزا بکھرے پڑے ہوں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندستان میں ترکوں، افغانوں اور ایرانیوں کی آمد سے یہاں کی زبان میں ان کے الفاظ شامل ہوگئے اور یہ زبان سودا سلف کے لین دین کے کام آتی تھی۔ یقیناً اس کے لیے برجستہ مصرعہ یا شعر قطعی نہیں پڑھا جاتا رہا ہوگا۔ اصولاً ہر زبان کا آغاز معمولی الفاظ، آسان کاموں اور سہل باتوں سے ہوا کرتا ہے نہ کہ مقفّٰی اور مسجع عبارت یا موزوں مصرعوں سے۔ البتہ یہ ایک معروف امر ہے کہ ہر زبان میں نثر سے پہلے نظم ہی کی تصنیف و تالیف ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ نظم، نثر کے مقابلے میں زیادہ موثر اور دل پذیر ہوتی ہے اور اس لیے لوگ اسے زیادہ پسند کرتے اور جلد ذہن نشین کر لیتے ہیں۔ لہٰذا شاعری کی تخلیق پہلے منظر عام پر آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان میں تاریخی اعتبار سے نظم ہی کو تقدیم حاصل ہے۔

اُردو کی پیدائش، یہ ضرور ہے کہ دہلی، آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں ہوئی لیکن یہاں یہ زبان صرف بات چیت ہی کے کام آتی تھی، تحریر کے لیے فارسی ہی استعمال ہوتی تھی، جبکہ دکن میں اس زبان میں تصنیف و تالیف کا بھی کام شروع ہوگیا تھا۔ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ دکن ہی کا تھا۔ ۱۳۴۷ء میں علاء الدین بہمنی نے دہلی کے پایۂ تخت سے بغاوت کر کے اپنی حکومت دکن میں قائم کرلی۔ یہ حکومت چونکہ بغاوت کر کے قائم ہوئی تھی اس لیے یہاں کے بادشاہ اور امرا نے دہلی سے الگ راہ اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی اردو میں اور دلی کی اردو میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہاں مقامی الفاظ کی زیادہ آمیزش تھی جبکہ دلی کی اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ زیادہ تھے۔ چنانچہ جب دہلی دربار میں فارسی کا دور دورہ تھا، اس وقت دکن کی نئی سلطنت میں اردو کا سرکاری طور پر دخل ہوگیا تھا۔ بہمنی سلطنت ایک اچھے نظام کے تحت چل رہی تھی اس لیے وہاں رفتہ رفتہ اچھے شاعر اور ادیب جو اردو میں لکھتے تھے دربار سے وابستہ ہونے لگے۔

اردو کو ایک طرف سرکاری سرپرستی نصیب ہوئی تو دوسری طرف صوفیوں اور مذہب کے مبلغوں نے جن کا زیادہ تر کام عوام الناس سے ہوتا ہے عوامی زبان میں اپنا تبلیغی کام سر انجام دینے لگے۔ اس طرح اردو کو دوہری سرپرستی ملی۔ اردو نثر کی پہلی کتاب معراج العاشقین ہے جسے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۶ - ۱۴۲۱ء) نے تصنیف کیا۔ کتاب کی تاریخ تصنیف معلوم نہیں۔ معراج العاشقین تصوف کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ اردو نثر کی قدیم کتابوں میں میران جی شاہ کی شرح مرغوب القلوب اور احکام الصلوٰۃ مشہور ہیں۔ اُردو کی پہلی ادبی کتاب وجہی کی سب رس ہے۔ جب بہمنی سلطنت آپس کے جھگڑوں سے ٹوٹ کر پانچ حصوں میں تقسیم ہوگئی تو ان پانچوں درباروں میں قطب شاہی دربار اور عادل شاہی دربار علم و فضل کی سرپرستی کرنے لگے۔ وجہی قطب شاہی دربار سے منسلک تھا۔ جب دکن کی حکومت کمزور ہوگئی تو اورنگ زیب نے دکن فتح کرلیا۔ وہاں کے دربار ختم ہوگئے اور ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع منتشر ہوگیا۔ مغل دربار کی زبان اب تک فارسی تھی لیکن دکن کی اردو نوازی دلّی کے شاعروں اور ادیبوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتی رہی۔ لہٰذا شمالی ہند کی پہلی نثری تصنیف فضلی کی "دہ مجلس" ہے۔ دوسری اہم کتاب محمد حسین عطا خاں تحسین کی "نوطرز مرصع" ہے اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے تحت سلیس اردو میں کافی کتابیں لکھی گئیں۔ میر امن کی "باغ و بہار"، حیدر علی بخش حیدری کی "آرائش محفل" شیر علی افسوس کی "آرائش محفل" وغیرہ کتابیں ہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے باہر سید انشا نے نثر میں "رانی کیتکی کی کہانی" تصنیف کی۔ اس کے بعد ۱۸۳۵ء میں اردو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکاری زبان ہوگئی۔ تب تو قوانین اور دوسرے سرکاری کاغذات بھی اردو میں جاری ہونے لگے۔ اردو کے اخبار بھی دہلی سے نکلنا شروع ہوگئے۔ لکھنؤ کے شاہان اودھ نے علوم و فنون پر بہت ساری کتابیں لکھوا ڈالیں۔ ماسٹر تارا چند نے لسانیات

فزکس (PHYSICS) اور کیمیا (CHEMISTRY) پر کتابیں لکھیں۔ اس طرح اردو میں علمی سرمایہ بھی اکٹھا ہو گیا۔

اردو خطوط نگاری کے سلسلے میں اردو نثر نگاری کا مختصر جائزہ لینے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنے زمانے سے نثری تخلیقیں اور تصنیفیں وجود میں آ رہی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اردو میں خطوط نہیں لکھے گئے۔ دراصل اس وقت تک خط کو لوگ پڑھ کر پھاڑ دینے ہی کی چیز سمجھتے تھے۔ بادشاہوں کے فرمان اور خطوط ضرور محفوظ ہیں لیکن وہ ادبی مصرف کے نہیں ہو سکتے۔ اردو میں غالب سے پہلے خطوط نگاری کا پتہ نہیں ملتا۔ کہا جاتا ہے کہ اردو میں غالب نے ۱۸۵۰ء سے خط لکھنا شروع کیا۔ اس وقت بہادر شاہ ظفر نے انھیں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا تھا۔ اور اسی مصروفیت کی بنا پر غالب کو اردو میں خط لکھنا پڑا۔ لیکن غالب کے دو ایک خط ۱۸۴۸ء اور ۱۸۴۹ء کے لکھے ہوئے بھی مل گئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی غالب نے اردو خطوط لکھے ہوں گے۔ غالب کے اندر چونکہ قوت اجتہاد تھی اس لیے انھوں نے خطوط نویسی میں بھی اپنی ایک الگ راہ نکال لی اور اردو خطوط کو ابتدا ہی میں ہر طرح کی خصوصیت سے معمور کر دیا۔ جس کی وجہ سے اردو خطوط نگاری دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کی خطوط نگاری کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اور اردو میں تو ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی غالب جیسا خطوط نگار پیدا نہ ہو سکا۔

"عود ہندی اور اردوئے معلی۔ ان ناموں سے دو مجموعے چھپ گئے ہیں جن میں مرزا غالب کے خطوط بکثرت موجود ہیں۔ اس شہرت و اشاعت کے بعد ان کے مطبوعہ خطوط کی نقل و تحصیل خاص دیکھنی چاہیے بلکہ اس حیثیت سے کہ اردو زبان میں خطوط نویسی کی ابتدا مرزا نے کی ہے۔ اس کتاب کے موضوع تاریخی کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیے کہ اس بلند خیال اور باکمال موجد نے ابتدا ہی میں وہ نمونہ دکھایا ہے جس سے بہتر اسّی برس کے بعد بھی آج ہم نہیں دکھا سکتے۔ ممکن ہے کہ تھوڑے بہت غور و تامل کے بعد چند لفظی متروکات کی فہرست پیش کی جا سکے مگر غیر ممکن ہے کہ اداے مطلب کی خاطر نشینی اور طرز بیان کی دلکشی اس سے بہتر تو کیا برابر بھی لائی جا سکے ..... نتیجہ کلام یہ ہے کہ اس وقت تک ان کی تحقیقات میں مرزا غالب اردو کے ایجاد مراسلت میں سب پر غالب ہیں۔"[1]

اچھے خط اور اچھے خطوط نگار کی کیا خصوصیت ہونی چاہیے اور ادبی خطوط جو ایک مطالعہ کا اہم موضوع بن گئے ہیں، کیسے کہتے ہیں؟۔ انگریزی کی طرح اردو میں بھی خطوط کی کمی نہیں۔ بہتیرے چھوٹے بڑے ادیبوں کے خطوط چھپ کر منظر عام پر آ چکے ہیں مگر یہ سبھی خطوط مطالعے کی چیز نہیں۔ کیونکہ ادب کا مطالعہ جمالیاتی حس کو بیدار کرنے اور ذوق کی تسکین کے لیے کیا جاتا ہے۔ "دو دونی چار ہوتا ہے۔" یہ جان کر ہمیں کوئی مسرت یا رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح "ہم خیریت سے رہ کر آپ کی خیریت چاہتے ہیں" کا مطالعہ بھی ذہن و دماغ کو محظوظ نہیں کرتا۔ ذہن و دماغ اور روح کو مسرت بخشنے والا ادب ہی ہو سکتا ہے، اور خط بحیثیت خط ادب کی کوئی صنف نہیں۔ کاروباری یا اخباری مراسلے ادب نہیں ہو سکتے۔ ان کے علاوہ وہ خطوط جو دو کے مابین گفتگو کے طور پر لکھے جاتے ہیں، ان میں خلوص اور بے تکلفی رہتی ہے، جو کسی شخص کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کا موقع دیتی ہے۔ اور ہڈسن کے خیال کے مطابق "شخصی اور انفرادی تجربہ ہی ادب کی جان ہے" نجی اور پرائیوٹ خطوط ادب کی جان بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے۔

"خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات[2]

---

[1] تاریخ نثر اردو ص ۳۰۵ احسن مارہروی
[2] محمد التنقیدی اشارے۔ آل احمد سرور ص ۳۳

کا صحیفہ ہے۔ اس میں صداقت و خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔"[1]

اس سے یہ ظاہر ہے کہ جب خط اشاعت کی غرض سے لکھے جائیں گے تو خلوص و بے ریائی جو خط کی جان ہے زائل ہو جائے گی اور اس کی جگہ تصنع اور تکلف لے لے گی۔ آل احمد سرور کے الفاظ میں۔

"اچھا خط وہ کہا جا سکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے جس میں بے تکلفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت، ذاتی تاثرات کی جھلک ہو چنانچہ وہ خط جن میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش، انشا پردازی کی شان، تکلف کا اظہار، خطابت کا جوش دکھایا جائے خط نہیں مضمون ہیں۔"

بہرحال خطوط نگاری ایک ایسی صنف ادب ہے جو دوسری تمام صنفوں سے زیادہ انفرادی اور شخصی ہے۔ اس میں خطوط نگار خود سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بظاہر اس کا ایک مخاطب ہوتا ہے اور من و تو کے درمیان گفتگو شروع ہوتی ہے لیکن آخر میں من ہی من رہ جاتا ہے اور وہ اپنے دلی جذبات و کیفیات کا ہر ایک انداز سے بے تکلف ہو کر اظہار خیال کرتا ہے۔ ایک تو خطوط نگار کو یہ احساس ہوتا ہی ہے کہ خط پڑھنے والا صرف اسی کا مخاطب ہے دوسرے درمیان خط لاشعوری طور پر وہ حجاب کو بھول کر خود سے گفتگو کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے خط کو عبدالغنی صاحب نے "نقطۂ نظر" میں "بالواسطہ خود نوشت[2] سوانح عمری اور انانیتی ادب کی ہیئت" کہا ہے۔

یوں دیکھنے میں خطوط نگاری آسان ترین فن معلوم ہوتا ہے کیونکہ صرف گفتگو کو ضبط تحریر میں لانا کیا مشکل کام ہے، اگرچہ زبان میں صلاحیت پیدا ہو چکی ہے لیکن بے تکلف بات کرنا آسان نہیں تحریری زبان یا تو ادبی نفاستوں سے بوجھل ہو جاتی ہے یا پھر بالکل سپاٹ ہوتی ہے۔ اس میں بہت کم لوگوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ یوں تو ہزاروں لوگ روز ہی خط لکھا کرتے ہیں اور ان کے مخاطبین ان کے مطالب و مفاہیم آسانی سے سمجھ لیتے ہیں لیکن یہاں خطوط کی ادبی حیثیت سے بحث ہے اور وہ بھی ایسی کہ خط کو خط ہی ہونا چاہیے کوئی فن پارہ نہیں۔ جہاں تک ادبی اور معیاری خطوط کا تعلق ہے، یہ ایک مشکل ترین فن ہے۔ یہ ادبی شیشہ گری اور آئینہ سازی سے کہیں مشکل ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ لکھتے ہیں:

"خط نگاری تو بذات خود ایک بڑا فن ہے اور اس میں کامیاب وہی ہو سکتا ہے جو قدرت کی طرف سے اس فن کا فیضان لے کر آیا ہو، خط نگاری کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، اس کے علاوہ اچھی خط نگاری ایک خاص شخصی ماحول پر بھی موقوف ہے، خط نگاری کے فن کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ سب سے آسان فن ہے اور ہر اس شخص کے لیے سہل الحصول ہے جو اس کا قصد کرے۔ لیکن تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہی آسان ترین فن، نازک ترین فن بھی ہے۔ کیونکہ اس میں معیار تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں۔"[3]

دراصل جو بھی علم یا فن بظاہر بہت آسان ہوتا ہے، اس میں معیار تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ سہل ممتنع اسی کو کہتے ہیں۔ اس کی مثال یوں دی جا سکتی ہے کہ اردو شاعری میں غزل سب سے آسان، ہیئتی اعتبار سے معلوم ہوتی ہے اور اسی لیے اس صنف کو ہر شاعر نے اپنایا۔ راہ چلتے قافیہ اور ردیف کے ساتھ مصرعے موزوں کر لیجئے، چلیے غزل کا ایک دو شعر ہو گیا

---

[1] تنقیدی اشارے۔ آل احمد سرور صفحہ ۴۴

[2] نقطۂ نظر، عبدالغنی صفحہ ۳۷۲

[3] میر امن سے عبدالحق تک۔ ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۲۵۲-۲۵۳

لیکن غزل سے معیار تک پہنچنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟ میر سے لے کر آج تک کے غزل گو شعراء کو پڑھو جایئے چند کے نام آئیں گے۔ میر، غالب، حسرت، جگر وغیرہ وغیرہ۔ ویسے تو ہزاروں نے غزلیں کہی ہیں۔ اسی طرح خط ہر ایک انسان لکھتا ہے۔ لیکن اچھے خطوط نگاروں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ داخلی اور خارجی دونوں طرح کے خیالات کا ذریعۂ اظہار ہے۔ اس میں پورے معاشرے اور سماج کی حالت اور کیفیت واضح نظر آتی ہے۔ تاریخی، سیاسی، معاشی اور سوانحی امور کی حقیقت اس کی سطح آب پر موجزن ہوتی ہے۔ خط ہوتا تو ہے شخصی لیکن اس میں آفاقیت اور اجتماعیت کا جلوہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلومات کا خزانہ دستیاب ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کے معیار تک رسائی حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔

"..... خط بڑا نازک فن ہے۔ یہ جگر گدازی بھی ہے اور آئینہ سازی بھی ..... یہ مختصر اور محدود بھی ہے اور وسیع بیکراں بھی ہے۔ یہ حد سے زیادہ شخصی بھی ہے مگر اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی۔ اس میں دانش بھی ہے بینش بھی۔ بظاہر کچھ بھی نہیں مگر اس کا ہر ورق، پھر بھی دفتر ہے معرفت کردگار اور معرفت انسانی دونوں کا۔ یہ لکھنے والے کے لیے محض عرض سخن ہو تب بھی پڑھنے والے کے لیے گنجینۂ فن ہو سکتا ہے"[1]

غالب کے علاوہ سرسید، حالی، شبلی، اکبر الہ آبادی، مہدی افادی، منشی پریم چند وغیرہ کے خطوط کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ لیکن غالب کے خطوط سے ان کا قطعی مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں کچھ مجموعے تو ایسے بھی ملیں گے جو قصداً اشاعت کی غرض سے لکھے ہوئے خطوط کے ہیں۔ مثال کے طور پر ابو الکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ 'غبار خاطر' اور قاضی عبد الغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ پھر بھی اردو خطوط نویسی نے غالب سے کافی استفادہ کیا ہے اور یہ ادب کا ایک اہم موضوع بن گئی ہے۔

[1] برامن سے عبدالحق تک۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۲۳۶

★

مصحفی کی زبان ——— (صفحہ ۲۲ کا بقیہ)

کیا ہوا ہے" (آب حیات صفحہ ۲۴۰) بلکہ آزاد نے اس طرح کے اشارے کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معروف کا تو بس نام ہی ہے کلام تمام تر ذوق ہی کا ہے۔ بہر حال یہ اس بحث کا موقع نہیں۔ معروف کے مستند ہونے میں تو آزاد کو شک نہ ہوگا۔ ان کا شعر ہے:

دوستوں اول تو ہم کو وہ بلا سکتے نہیں
اور بلاتے بھی ہیں تو ہم ہی چلا سکتے نہیں

یہ معروف کے اسی دیوان میں موجود ہے جو بقول آزاد تمام و کمال ذوق کا دیکھا ہوا ہے۔ ان سے بھی پہلے حکیم ثناء اللہ خاں فراق کہہ گئے ہیں:

آنکھ اس شوخ ستم گر سے لڑا بیٹھے ہیں
بس چلے یا نہ چلے، جی تو جلا بیٹھے ہیں

(تذکرۂ آزردہ (قلمی)، کورپس کرسٹی کالج کیمبرج)
عکس ملوکہ مختار الدین آرزو

مصحفی کی زباندانی کے ذیل میں یہ اعتراضات کی تحقیق تھی جو محمد حسین آزاد نے آب حیات میں پیش کیے تھے۔ دوسرے معترضین کے اعتراضات سے آئندہ کسی موقع پر بحث کی جائے گی۔

★

غزل

کمال جائسی

اس سے ملنے کا اگر ذہن بنایا جائے
سرحدِ شوقِ ملاقات پہ ٹھہرا جائے

آج بے کیفیِ حالات سے گزریں کیونکر
چل کے یہ شیخِ خرابات سے پوچھا جائے

سمت و رفتار کے پابند نہیں اہلِ جنوں
وحشتِ دل کے تقاضوں سے نہ الجھا جائے

آ اداس چہرۂ گلنار کے جلووں کا سماں
نکہت و رنگ کے ماحول میں دیکھا جائے

پھر در و بام کو چھوتی ہوئی گزری ہے بہار
میرا ہر زخم جگر کیوں نہ مہکتا جائے

کوئی پیغام کہ جو حسنِ عمل پاس رہے
ڈوب کر سیلِ حوادث میں جو ابھرا جائے

دل کا ہر قطرۂ خوں نذر کر دکھائیں کہ تاک
راہ میں فصلِ بہاراں کو نہ روکا جائے

غزل

کرنل ایس پی سنگھ سوز

بہت اداس بہت بے قرار گزری ہے
خزاں کے رنگ میں ڈوبی بہار گزری ہے

رچی ہوئی ہے فضاؤں میں زلفِ یار کی بو
ابھی ادھر سے نسیمِ بہار گزری ہے

جفائے یار سے گھبرا کے میری عمرِ عزیز
رہِ حیات میں بے اختیار گزری ہے

ہزار بار جلائے بجھائے میں نے چراغ
نہ پوچھ کیسے شبِ انتظار گزری ہے

مجھے نہ بھولے کی بزمِ نشاطِ مے خانہ
مری نگاہ سے کتنی ہی بار گزری ہے

نہ جانے کونسی وہ رہگذارِ الفت تھی
جہاں حیات بھی اے سوزؔ بار گزری ہے

حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی

اکمل اجملی

حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی ہندوستان کے مشہور و معروف خانوادہ شاہ افضل کے چشم و چراغ تھے جس کی بنیاد ہندوستان میں عہد تغلق میں پڑی اور پھر رفتہ رفتہ یہ خاندان ترک وطن کرتا ہوا دلی سے جون پور، وہاں سے سید پور بھتری ضلع غازی پور اور وہاں سے عہد شاہجہانی میں الہ آباد میں آکر اقامت پذیر ہوا۔ اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ مخدوم شاہ تاج الدین غزنی سے ہندوستان آئے اور سید پور بھتری ضلع غازی پور میں مستقل سکونت اختیار فرمائی۔ حضرت مخدوم شاہ تاج الدین کی دسویں پشت میں حضرت شاہ محمد افضل الہ آبادی شارح مثنوی مولانا روم کا نام سر فہرست ہے جنھوں نے سید پور بھتری ضلع غازی پور سے ترک سکونت فرمائی اور حسب الارشاد پیر و مرشد میر سید محمد کالپوی الہ آباد میں مستقل سکونت پذیر ہوئے۔ شاہان مغلیہ اس خاندان عالیشان کے زہد و تقویٰ علم و فضل سے واقف تھے۔ انھوں نے بڑی قدر و منزلت کی اور فرامین جاری کیے۔ بہت کافی زمینیں دیں اور زر سالانہ برائے خرچ درویشان دائرہ مقرر کیا۔ حضرت شاہ محمد افضل الہ آبادی وصال گیارہ سو چوبیس ہجری (۱۱۲۴ھ) مطابق سنہ ۱۷۱۲ء، حضرت شاہ محمد یحییٰ معروف بہ شاہ خوب اللہ الہ آبادی وصال سنہ ۱۱۴۴ھ اور حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی کے نام شاہ جہاں، عالمگیر اورنگ زیب، شاہ عالم، فرخ سیر شاہان مغلیہ کے فرامین دائرہ شاہ اجمل کے سجادہ نشین حضرت مولانا حافظ شاہ سید احمد صاحب اجملی کے پاس موجود ہیں جن سے بادشاہوں کی نگاہ میں ان درویشان دائرہ کے رتبے پر روشنی پڑتی ہے۔ ان بزرگان دائرہ میں حضرت شاہ محمد افضل محضر وصال سنہ ۱۱۲۴ھ، حضرت شاہ خوب اللہ الہ آبادی وصال سنہ ۱۱۴۴ھ، علامہ شاہ محمد طاہر شارح فصول الحکم وصال سنہ ۱۱۴۴ھ، علامۂ روزگار حضرت شاہ محمد فاخر زائر محدث ہندی وصال سنہ ۱۱۶۴ھ، علامہ دہر فرید العصر حضرت شاہ محمد ناصر افضلی مصنف جواہر نفیسہ وصال سنہ ۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۹ء، علامہ شاہ غلام قطب الدین وصال سنہ ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء، حضرت شاہ محمد اجمل وصال سنہ ۱۲۳۶ھ / ۱۸۲۰ء، حضرت شاہ ابوالمعالی عالی وصال سنہ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء، حضرت شاہ غلام اعظم افضل وصال سنہ ۱۸۵۵ء، حضرت سید شاہ مصطفیٰ رضا وصال سنہ ۱۱۹۲ھ / ۱۷۷۸ء، حضرت سید شاہ علی جعفر وصال سنہ ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء، حضرت سید شاہ علی کبیر معروف بہ سید شاہ محمد میرن جان الہ آبادی مصنف خزانۃ الشعر وغیرہ وصال سنہ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء اور حضرت قطب الکبیر سید شاہ محمد بشیر الہ آبادی وصال سنہ ۱۹۱۸ء کے نام سر فہرست ہیں جنھوں نے علم و ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ قوم و ملک بلکہ عالم انسانیت کی خدمت کی ہے۔ ان تمام انفاس قدسیہ نے بلا قید مذہب و ملت ہر فرد کے زخم پر مرہم رکھا ہے۔ اس خانوادہ کا ہر فرد اپنے وقت کا عظیم صوفی، بلند پایہ مصنف، مشہور شاعر اور عظیم محب وطن گذرا ہے۔ ان تمام مشاہیر کرام کے حالات سے مشہور و معروف تذکرے بھرے پڑے ہیں۔

حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی علامہ روزگار فرید العصر حضرت

شاہ محمد ناصر افضلی بن حضرت شاہ محمد یحییٰ معروف بہ حضرت شاہ خوب اللہ الہ آبادی برادر زادہ و داماد علامہ شاہ محمد افضل الہ آبادی شارح مثنوی معنوی "بین الجمہور" کے فرزند تھے۔ نام محمد اجمل کنیت ابوالفضل اور لقب ناصر الدین تھا۔ ولادت آپ کی ۱۱؍ شوال ۱۱۶۱ھ ہجری مطابق ۱۷۴۸ء عیسوی بروز پنجشنبہ اسی دائرہ میں ہوئی جو آپ کے نام نامی و اسم گرامی سے منسوب ہے۔ حاکم الہ آباد نے آپ ہی کے نام نامی پر اس محلہ کا بھی نام دائرہ شاہ اجمل اور سڑک کا نام شاہ اجمل روڈ رکھا۔ آپ کی ذات والا صفات اسم با مسمیٰ تھی۔ فطرتاً نہایت ذہین اور صورتاً بہت حسین تھے۔ والد بزرگوار زمانۂ طفولیت ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔ مادر گرامی کی تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اپنے ہم چشموں میں فائق و ممتاز ہوئے اور مکتب ہی میں آپ کے جوہر نمایاں ہونے لگے ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

آپ کے برادر عمزاد شاہ غلام قطب الدین مصیب بن شیخ المحدثین حضرت شاہ محمد فاخر محدث ہندی بن شاہ خوب اللہ الہ آبادی نے آپ پر شفقت بزرگانہ مبذول فرمائی اور تعلم و ارشاد کی طرف توجہ دی۔ استاد کے فیض و برکات نے چار چاند لگا دیے۔ گیارہ سال کی عمر میں مجالس و محافل میں تقریر کرنے لگے۔ چھبیس سال تک برادر موصوف کی خدمت بابرکت میں کسب کمالات و تحصیل علوم میں مصروف رہے۔ علوم فارسیہ و عربیہ، منطق و فلسفہ، معانی و بیان تفسیر و حدیث، فقہ و عروض غرض کہ جملہ علوم متداولہ آپ نے بدرجۂ اتم حاصل فرمائے۔ برادر موصوف کے علاوہ مولانا محمد فصیح جون پوری و مولانا محمد اسلم الہ آبادی مرید و خلیفہ جد بزرگوار خلیفۂ راستین حضرت مولانا محمد حسین جون پوری مرید و خلیفہ برادر عمزاد مولانا محمد ناصح مرید جد بزرگوار، قاضی القضاۃ محمد مستعد خان شاگرد و مرید حضرت شاہ محمد ناصر افضلی والد بزرگوار حضرت موصوف، نواب محمد عاشق خاں مرید و خلیفہ والد بزرگوار سے بھی استفادہ کیا۔ کسب کمالات ظاہری و باطنی کے بعد سجادۂ مشیخت پر متمکن ہوئے اور اپنی کریم النفسی، سخاوت، دریا دلی، فیاضی، تبحر علمی سے مخلوق خدا کی خدمت کی۔ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ جو فرامین شاہان مغلیہ کے بموجب ہوتی تھی، محتاجوں، غریبوں اور حاجتمندوں کو صبح سے شام تک تقسیم کرتے رہتے۔ دائرہ کا مدرسہ جو خلیفہ منڈی میں قائم تھا اس کے تقریباً آٹھ سو طالب علموں کو دونوں وقت کا کھانا ناشتہ اور کپڑا ماہ بہ ماہ آپ ہی کے ذمے تھا۔ تنور ہر وقت گرم اور غربا و مساکین کو کھانا تقسیم ہوتا رہتا۔ عرب و عجم سے علمائے کرام صوفیائے عظام اور مشاہیر انام آپ کی شہرت سن کر زیارت کی خاطر حاضر خدمت ہوتے اور آپ ہی کے مہمان ہوتے۔ آپ کی ذات والا صفات مرجع خلائق تھی۔

حضرت شاہ صاحب موصوف کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے ایک نہایت پرشور زمانہ تھا۔ سلطنت مغلیہ میں انتشار و زوال کے آثار نمایاں تھے اور ہر طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ فرنگیوں کے ہاتھ تیزی و سرعت سے سلطنت مغلیہ کی جڑ کھودنے میں منہمک و مصروف تھے۔ ان کی طاقت نے شاہ عالم ثانی کو بھی بے دست و پا کر دیا تھا۔ ہر فرد پر انگریزوں کا رعب و دبدبہ چھاتا جا رہا تھا مگر شاہ صاحب موصوف نے کبھی ان کی پرواہ نہیں کی اور تا زندگی غیر ملکی حاکموں کے خلاف صف آرا رہے۔ ایسے وقت میں جانثاران و فدایان وطن کا ساتھ دینا اور روز افزوں بیرونی اقتدار کے خلاف قدم اٹھانا مصیبتوں اور پریشانیوں کو گھر بیٹھے دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن شاہ صاحب نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور مادر وطن کی محبت کو مادی خوشیوں اور راحتوں پر قربان نہیں کیا۔ شاہان اودھ میں سے نواب شجاع الدولہ نے بھی بعض اختلافات کی وجہ سے آپ کی معافی جو سلاطین مغلیہ نے دی تھی، ضبط کر لی لیکن آپ کی فیاضی، کریم النفسی اور دریا دلی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ نے اپنی معافی کی ضبطی کے سلسلے میں ایک قطعہ کی صورت میں شجاع الدولہ کو تنبیہ کی ہے جس سے اس واقعہ کی صحت پر روشنی پڑتی ہے:

اے ضبط نمودہ کہ دیہات مرا   ہم ضبط شود دولتت از قہر خدا

زیں شیوۂ ناصواب باز آ ورنہ تو سزائے خویش یابی با خدا

(اے میرے دیہاتوں (معافی) کو ضبط کرنے والے تیری سلطنت خدا کے قہر سے ضبط ہو جائے۔ اس برے کام سے باز آ ورنہ خدا کی قسم تو اپنی سزا کو پہنچے گا۔)

اس قطعہ کے رقم کرنے کے ایک ماہ بعد نواب شجاع الدولہ راہی ملک بقا ہوا اور آپ کے امتحان کا زمانہ ختم ہوا۔ نواب شجاع الدولہ کے جانشین نواب آصف الدولہ نے معافیاں واگذاشت کر دیں لیکن انگریزوں نے شاہ ابو المعالی کے زمانے میں جو آپ کے بیٹے تھے وہ معافیاں حب الوطنی کے جرم میں ضبط کر لیں۔ معافی کے ضبط ہوتے ہی سارا نظام درہم برہم ہو گیا۔ یہ واقعہ آپ کے خاندان عالی شان کی پریشانی کا باعث ہوا۔ مدرسہ ختم ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ دائرہ کا علم و فضل عروج و کمال سب کچھ ختم ہو گیا۔

حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی علم و فضل، عرفان و کمال میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ہر شخص آپ کی طرف کھنچا چلا آتا تھا جس میں شاہ و گدا، امیر و فقیر، عوام و خواص کی کوئی قید نہیں۔ شہنشاہ ہند شاہ عالم کو آپ سے کمال عقیدت تھی۔ جب بھی الہ آباد میں تشریف لاتے تو دورانِ قیام میں حضرت شاہ صاحب موصوف سے برابر ملاقات رہتی۔ کبھی شاہ صاحب قلعہ میں تشریف لے جاتے اور کبھی شاہ عالم خود درِ شاہ اجمل پر حاضر ہوتے۔ آپ کے برادر عم زاد حضرت شاہ غلام قطب الدین مصیب جب حج کی خاطر حرمین الشریفین جانے لگے تو شاہ عالم کی خواہش پر دہلی تشریف لے گئے اور وہاں شاہ عالم کے خصوصی مہمان رہے۔ شاہ اجمل صاحب موصوف کے بارے میں شاہ عالم نے بہت دیر تک گفتگو کی اور ان کی خیر و عافیت پوچھتے رہے جس کو آپ نے نظم فرمایا ہے:

در عین حوادث زمانہ شد داخل دہلی آں یگانہ
چوں شاہ شنید مقدم او کرد از پئے دیں لو تگ و دو
لیکن از خوف کافر دوں در قلعہ نشستہ بود محزوں
در پیش طلب نمود ناچار اکرام ز حد نمود بسیار
برخاست ز جا و پیش آمد در لطف ز حد و بیش آمد

حرفے کہ گفت شاہ اول پرسید کہ یاں کجاست اجمل
کو یک دم از یں جناب والا ہرگز نگاہے نگشتہ تنہا
القصہ جناب شاہ بسیار
تا دیر ز من نمود تکرار

حضرت شاہ صاحب موصوف سے اور شہنشاہ شاہ عالم سے برابر خط و کتابت رہی۔ بہت سے خطوط نظم کی صورت میں دیوان میں موجود ہیں۔ نوابین اودھ سے بھی آپ کے تعلقات رہے اور خط و کتابت بھی رہی۔ چنانچہ دائرہ میں آپ کی زیارت و ملاقات کی خاطر نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ، نواب حیدر بیگ خاں و دیگر نوابین اودھ، شاہانِ ہند، مشائخ ذوی الاحترام، صوفیائے عظام، علمائے انام و شعرائے کرام تشریف لاتے جن میں شاہ عالم، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، حیدر بیگ خاں، مولانا سید احمد بریلوی، مولانا اسماعیل شہید، مولانا عبد الحی لکھنوی، علامہ احمد یمنی شروانی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی، بحر العلوم مولانا عبد العلی، ملک العلما مولانا مدن لکھنوی، میر باشا را اللہ خاں مصدر، میر انشا اللہ خاں انشا، میر حسن، میر تقی میر، علامہ تفضل حسین کشمیری، امجد علی فروغ اعلام سلاطین صفویہ، مرزا حاتم بیگ دانی، مولوی نور العین واقف، مرزا حکیم بیگ خاں صاحب تذکرۂ مرد مردمیدہ، مرتضیٰ قلی خاں فراق، مرزا اشرف علی فغاں، نواب احمد علی عشرت، مرزا فاخر مکین، مرزا افضل علی ذاکر، نواب محبت خاں شیفتہ، شیخ علی حزیں جیسے مشاہیر کرام سے آپ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ یہ حضرات جب الہ آباد تشریف لاتے آپ سے شرف ملاقات حاصل کرتے یا آپ ان کے دیار میں تشریف لے جاتے تو ان کے مہمان ہوتے۔ ان حضرات سے برابر خط و کتابت رہی۔ بہت سے مشاہیر کرام کے خطوط حضرت مولانا شاہ سید احمد صاحب اجملی سجادہ نشین دائرۂ شاہ اجمل کے پاس موجود ہیں۔ جن سے شاہ صاحب موصوف اور مشاہیر عصر سے تعلقات قلبی دلی پر روشنی پڑتی ہے۔

شاہ صاحب موصوف کو ہندوستان جنت نشان سے بہت

محبت و عقیدت تھی۔ مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے اور غیر ملکی اقتدار پسندوں کے ناپاک ارادوں سے آپ بے حد متفکر ہی نہ رہتے بلکہ ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملانے اور ان شکنجوں سے ملک کو چھڑانے کے لیے آپ برابر کوشاں بھی رہتے۔ آپ نے عملی طور پر ہندستان کی آزادی میں حصہ لیا۔ جب تک جسمِ ناتواں میں جان باقی رہی اپنے پیارے وطن کی آزادی کے لیے سب کچھ کر گزرے اور براہِ راست انگریزوں سے ٹکرائے۔ علی حزیں جیسے مخلص دوست نے جب ہندستان کی ہجو لکھنی اختیار کی تو آپ اسے برداشت نہ کر سکے اور آپ نے علی حزیں کی رباعیوں کا منھ توڑ منظوم جواب دیا جس سے دونوں حضرات میں تلخی بڑھ گئی اور تعلقات خراب ہو گئے۔ مگر آپ نے پرواہ نہ کی۔ آخر میں علی حزیں نے ہندستان کی ہجو سے سکوت اختیار کیا اور آپ کے برادرِ عزیز ادِ قطب الدین مصیب کو ایک خط لکھا جس کا یہ فقرہ "آں جوان الہ آبادی ناطقہ ام بند کردہ است و ارا تیغ باید کرد" بہت مشہور رہے۔ جب آپ کی رباعیاں ہندستان کی مدح کی صورت میں علی حزیں تک پہنچیں تو انھوں نے اپنے طرز کو بدلا اور شاہ صاحب موصوف سے طالبِ معافی ہوئے اور ایک قصیدہ آپ کی شان میں لکھا جس کا یہ شعر مشہور ہے سہ

یا حارلی تو صد قوے حدیث نجد   ذا اجمل الھدایا ہا اکمل الکلامی

فریقین کی رباعیاں درج ذیل ہیں۔ حضرت شاہ اجمل الہ آبادی کی رباعیاں اپنے اندر حب الوطنی، دیش بھگتی، اور مادرِ وطن سے عقیدت و محبت کا جذبہ رکھتی ہیں۔ بیشک مادرِ وطن ایسے مایۂ ناز سپوتوں پر ناز کرے گی اور جب بھی وطن پر کوئی وقت آئے گا ان کی قربانیاں جو انھوں نے علمی اور عملی کی ہیں وہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گی

رباعی علی حزیں

دیدم سوادِ ہند حسرت زار است   روزیکہ دم چوں شامِ ہجراں تار است
بستہ است بکار ہمہ شاہ بخت گرہ   الا گرہے کشادہ در شلوار است

(ترجمہ: ہم نے دیکھا کہ ہندستان کے نظاروں پر حسرت برس رہی ہے اور دن ایسے سیاہ ہیں جیسے ہجر کی شام۔ یہاں کے لوگوں کے تمام کام قسمت کی گرہ سے بندھے ہوئے ہیں سوائے شلوار کی اس گرہ کے جو کھلی ہوئی ہے۔)

رباعی شاہ اجمل

صبحِ طربِ ہند چہرۂ یار است   شامِ خوش او کاکلِ دلدار است
ایں جا مت کشادہ صد ہزاراں در فیض   جز اک گرہے کہ بستہ در شلوار است

(ترجمہ: ہندستان کی صبحِ طرب معشوق کے چہرے کی طرح ہے۔ اور اس کی خوب صورت شام محبوب کی زلف کی مانند ہے۔ یہ جگہ (ہندستان) لاکھوں فیوض کے ساتھ کشادہ ہے سوائے ایک شلوار کی اس گرہ کے جو بندھی ہوئی ہے۔)

رباعی شیخ علی حزیں

ہجرت ز عقوبتم داد بہ ہند   از ہند جگر خارہ مکن یاد بہ ہند
عصیاں ، برہ جحیم می برد مرا   آدم ز قضائے خلد افتاد بہ ہند

(ترجمہ: ہجرت نے سزا کے واسطے مجھے ہندستان پہنچایا۔ ہندستان کے فکر سے میں اپنے کلیجہ کو کھاتا ہوں۔ خدا کی نافرمانی مجھے جہنم کے راستہ کی طرف لے جاتی ہے۔ آدم اپنی نافرمانی سے جنت کی فضا سے ہندستان میں پھینکے گئے۔)

رباعی شاہ اجمل

اے ہاجیِ ہند باش دل شاد بہ ہند   شیراز و صفاہان را مکن یاد بہ ہند
ہند است کہ نعم البدل فردوس است   آدم ز قضائے خلد افتاد بہ ہند

(ترجمہ: اے ہندستان کو ہجرت کرنے والے یا اے ہندستان کی ہجو کرنے والے ہندستان میں خوشی کے ساتھ رہ اور یہاں رہ کر تو شیراز اور اصفہان کو نہ یاد کر۔ ہندستان جنت کا نعم البدل ہے۔ اسی لیے حضرت آدم فضائے جنت سے ہندستان بھیجے گئے تھے۔)

ہر کس کہ ز ملک خویش افتاد بہ ہند   برگشتہ نہ رفت ماند دلشاد بہ ہند
بیروں از خلد کس نہ خواہد گردید   از آنجا ست کہ نیاید وطنش یاد بہ ہند

(ترجمہ: جو شخص اپنے ملک سے ہندستان میں آیا برگشتہ خاطر ہو کر نہیں لوٹا اور ہندستان میں خوشی سے ٹھہر گیا۔ اس خلد یعنی ہندستان سے کوئی جانا پسند نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ ہندستان میں رہ کر

اسے اپنا وطن یاد نہیں آتا۔)

رباعی علی حزیںؔ

دہلی کہ ہوائے زیستش اخگر بیز است　　بادِ خوش او چو تیز گند آمیز است
بر دو دو تف است ہم چو دہلیز جحیم　　آرے دہلی مخفف دہلیز است

(ترجمہ: دہلی جس کی آب و ہوا کانٹوں سے بھری ہوئی ہے اور اس کی اچھی ہوا بھی ناگوار بدبو سے بسی ہوئی ہے، اس پر دوبارہ تف ہے جس طرح جہنم کی دہلیز پر۔ بیشک دہلی دہلیز کا مخفف ہے۔)

رباعی شاہ اجملؔ

دہلی خاکش بخاک خلد آمیز است　　ہر کوچہ سوادِ خوشش عنبر بیز است
پُر روح و ریاحین است چو دہلیز نعیم　　بیشک دہلی مرخم دہلیز است

(ترجمہ: دہلی کی خاک جنت کی خاک سے ملی ہوئی ہے۔ اس کا ہر کوچہ خوش منظر اور عنبر سے بسا ہوا ہے۔ اور یہ جنت کی دہلیز کی طرح زندگی بخش اور ریاحین کی خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ بیشک دہلی دہلیز کا مخفف ہے۔)

خاک دہلی بخاک خلد آمیز است　　دہلیز نعیم است کہ عنبر بیز است
چو مرقد خاصان جنت آں جا است　　دہلی بیشک مخفف دہلیز است

(ترجمہ۔ دہلی کی خاک جنت کی خاک سے ملی ہوئی ہے اور یہ جنت کی دہلیز سے ملی ہوئی ہے اور یہ جنت کی دہلیز ہے جو خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ یہاں خاصان جنت کے مزار ہیں۔ دہلی بیشک دہلیز سے ترخیم ہے۔)

رباعی علی حزیںؔ

از ظلمت ہند شعلہ انگیز مترس　　در تیرگی شب اے سحر خیز مترس
ہرگز با کسے ز دشمنی ہند بدار　　نامرد ز حملۂ ہیز مترس

(ترجمہ: ہندستان کی اور جیسے پن سے بھری ہوئی تاریکی سے نہ ڈر رات کی تاریکی میں اے صبح کے اٹھنے والے خوف نہ کھا۔ ہندستان کی دشمنی سے ہرگز خوف نہ کھا۔ بزدل تو نامرد کے حملہ سے نہ ڈر۔

رباعی شاہ اجملؔ

اے آمدہ در ہند تو گریز مترس　　ہر سو فورسے بہ بیں سحر خیز مترس
مہمان پرور ہند باشد بسیار　　نان می یابد چہ مرد و چہ ہیز مترس

(ترجمہ: اے ہندستان کی طرف آنے والے تو بالکل خوف نہ کر اور نہ بھاگ۔ ہر طرف جادو جگانے والی روشنی کو دیکھو ہندستان بہت مہمان نواز ہے یہاں کیا مرد کیا نامرد سب ہی روٹی کھاتے ہیں۔)

دونوں حضرات کی رباعیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں حضرات کی رباعیوں میں کیا فرق ہے۔ علی حزیں اہل زبان ہیں لیکن ان کی رباعیوں میں وہ زور بیان نہیں ہے جو شاہ صاحب موصوف کے یہاں موجود ہے۔ تخیل کی بلندی کا اندازہ یہیں سے ہوتا ہے کہ علی حزیں کی اڑان سامنے کی ہے وہ بلند مضامین نہیں لا سکے لیکن شاہ صاحب موصوف کے یہاں بے ساختگی کے ساتھ ساتھ بلند مضامین بھی ہیں اور اسی کے ساتھ حب الوطنی کا جذبہ بھی غالب ہے۔ ان رباعیات میں انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب موصوف بڑے زود گو تھے چنانچہ برجستہ اور فی البدیہہ غزلیں کہنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں آپ شعر کہتے تھے۔ آپ کی فارسی کی مشہور غزل جو لکھنؤ میں آپ نے برجستہ کہہ کر پڑھی تھی، پیش خدمت ہے:

خورشید وشم بیم شب تار ندارم　　چوں تیغ زبانم غم زنگار ندارم
گر مشتریم کس نشود ہیچ غمم نیست　　آں جنس گرانم کہ خریدار ندارم
دکانِ دلم ز آتش عشق است فروزاں　　غم نیست اگر گرمی بازار ندارم
کئے حاجتِ حاجب بہ منِ خستہ دربار　　صحرا است مقامم در و دیوار ندارم
دردِ دلِ من عین علاج است دلم را　　اندیشۂ دردِ دلِ بیمار ندارم
دام سرِ زلف تو کار بہ تو دارم　　دیگر بہ کسے ہیچ سروکار ندارم

آئینہ صفت در صفت کوراں منم اجملؔ
معذورم اگر قیمت و مقدار ندارم

حضرت شاہ اجمل صاحب کی تمام تصنیفات و دیوان جناب شاہ سید احمد صاحب اجملی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل کے کتب خانہ میں موجود ہیں جس سے آپ کے تبحر علمی پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب موصوف کی ساری زندگی خدمت خلق

(بقیہ صفحہ ۳۵ پر)

۴۹

ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب

رات کی سیاہی ختم ہو رہی تھی۔ مشرق میں شفق کی سرخی ہندستان کی تاریخ میں ایک نئے دَور کے آغاز کا اعلان کرنے کے لیے مچل رہی تھی۔ شہر (کٹک) کی فضا آدھی رات ہی سے جلوسوں، قومی ترانوں اور سنکھ اور ڈھول کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہاں کی ساری آبادی رات کی سیاہی کو جلد از جلد دور کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ باراتی قلعہ میں واقع اپنی سرکاری کوٹھی پر جھنڈا بچھین لہرانے کے بعد سورج نکلنے سے پہلے ہی میں گورنر کا ٹو سے ملاقات کے لیے نکل پڑا جو ایک دوسرے تاریخی مقام لال باغ میں سکونت پذیر تھے۔ ڈاکٹر کاٹجو برآمدے میں چہل قدمی کر رہے تھے اور جیسے ہی میں وہاں پہنچا انھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بغل گیر ہو گئے اور رقت آمیز آواز میں کہا: "مہتاب صاحب کتنی صدیوں کے بعد؟" میں نے فوراً جواب دیا: "تقریباً ہزار سال بعد" انھوں نے دوبارہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا: "آپ سچے تاریخ داں ہیں۔"

ہم دونوں بیٹھ گئے اور تاریخ کے اس دَور کے بارے میں بات چیت کرنے لگے جبکہ ہندستانی عوام نے گیارھویں صدی کے لگ بھگ سیاست میں دلچسپی لینا بالکل ترک کر دیا تھا اور اگلی صدیوں میں یہ یقین ان کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا تھا کہ انھیں سرکاری معاملات سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا ہے — اور وہ تعلق رکھ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ صرف نوابوں اور راجاؤں کی رعایا تھے۔ گاندھی جی نے اپنے اعجاز سے اس عقیدے کو توڑا۔ یہ عوام ہی تھے نہ کہ کسی راجہ یا نواب کی فوج جنھوں نے آزادی حاصل کی۔ بحیثیت مجموعی ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی عوام کی اس جدوجہد سے الگ تھلگ ہی رہا۔ اور اس وقت جبکہ ہم ان تاریخی واقعات پر غور کر رہے تھے گاندھی جی کا خیال آتے ہی جنھوں نے ایک قلیل مدت میں تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا تھا، ہماری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو اُبل پڑے۔

سارا دن شہر کے تقریباً ہر گھر میں جشن منائے جاتے رہے۔ عام آدمی کی خوشی بیان سے باہر تھی۔ شام کو مقامی تھیٹر میں جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ایک چھوٹا سا ناٹک پیش کیا گیا۔ اس ناٹک کا عنوان تھا "بھارت کے مختلف ادوار" اس ناٹک کی تجویز میری اور شری کچن دتہ کے دماغ کی پیداوار تھی۔ ناٹک سچن دتہ کا ہی لکھا ہوا تھا۔ اس ناٹک کے اختتام پر مجھے اور گورنر صاحب کو تقریر کرنا تھی۔ آخری سین میں ایک چھوٹا سا لڑکا اسٹیج پر آتا ہے اور پوچھتا ہے:

"کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ کیا میں آپ کو یاد آتا ہوں؟ آپ کو ضرورت بھی نہیں۔ میں نے کبھی اس کی توقع بھی نہیں کی۔ بغیر کسی صلے اور انعام کی توقع کے میں سولی پر چڑھا اور جان نثار کر دی۔ میں خودی رام ہوں۔ آپ کو میرا نام یاد رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں مگر میں آج بہت خوش ہوں کیونکہ میری جان بیکار ضائع نہیں ہوئی۔"

جس انداز میں یہ الفاظ کہے گئے تھے اس نے مجھے بیحد متاثر کیا اور مجھے وہ سب لوگ یاد آ گئے جنھوں نے آزادی کے مقصد کے لیے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ میرے آنسو بہنے لگے اور میں ہال سے باہر نکل آیا۔

تمام رات وہ الفاظ "کیا میں آپ کو یاد آتا ہوں؟" میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا "کیا ہم ان کو یاد کرتے ہیں؟" اگلے ہی دن ہم نے سیاسی طور پر مصیبت زدہ لوگوں کو فوراً وظیفے دینے کا منصوبہ بنایا۔ ہم نے کٹک میں شہید میموریل ہال کی تعمیر کے لیے رقم منظور کی جہاں ان تمام لوگوں کے ناموں کی تختیاں دیواروں پر آویزاں کی جانا تھیں جو پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوئے تھے اور جنھوں نے جدوجہد آزادی میں اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ لیکن کیا یہ سب کچھ کافی تھا؟

ہزاروں لوگوں نے اپنے ذریعۂ معاش کو تیاگ دیا تھا اور راستوں پر بھیک مانگنا گوارہ کیا تھا۔ ہزاروں نے اپنی املاک گنوائی

تھی اور خوشی خوشی اس ذلت کو برداشت کیا تھا۔ سینکڑوں کو گولی مار دی گئی تھی اور آزادی کے خواب دیکھنے والوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا تھا۔ آبادی کے ایک بڑے حصے کو جو نئے دور کو خوش آمدید کہتے ہوئے مسرور ہو رہا تھا، سیاست میں قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ آزادی خود ایک انعام تھی جس کو پانے کا انھوں نے تصور کیا تھا۔

ریاست کے دور افتادہ دیہات سے یہ خبریں موصول ہو رہی تھیں کہ وہاں بے ساختہ خوشیاں اور جشن منائے جا رہے ہیں۔ ضلع کوراپٹ میں بالکل الگ تھلگ بسنے والے قبیلے کے لوگ بھی خوشی سے ناچ رہے تھے اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ گاندھی مہاراج ان کے راجہ بن گئے ہیں اور ان کی تمام صعوبتوں کا خاتمہ قریب ہے۔ حقیقت میں یہ بے ساختہ جذبات ان قبیلے والوں تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ تمام آبادی اس سے متاثر تھی کہ ماضی کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ گزری ہوئی رات کے ایک ناخوشگوار خواب کی صورت میں ہونے والا ہے اور یہ کہ نیا دن خوشیوں اور خوشحالی کا دن بن کر شروع ہونے والا ہے جس کی تمنا ہر ایک نے اپنی جد و جہد کے دوران کی تھی۔ اس وقت کوئی امید باندھنا ایسا ہی تھا جیسا کسی پہاڑ کو سر کر نا چنانچہ آزادی حاصل ہونے پر ہمیں محسوس ہوا کہ ہم نے کچھ حاصل کیا ہے۔ اب پچیس سال بعد جب میں ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا ہم عوام کی امیدوں اور عزائم کو پورا کرنے کے سلسلے میں پوری طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں — ؟

بیشک آزادی اپنی جگہ خود ایک انعام ہے۔ ان کروڑوں لوگوں کے لیے بے معنی ہے جو اپنی زندگی مایوسی کے ساتھ گزار رہے ہیں اور جنھیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں رہا ہے۔ کیا وہ خود اعتمادی کے جذبے کو دوبارہ حاصل کر چکے ہیں؟ کیا انھیں احساس ہو گیا ہے کہ یہ ملک ان کا اپنا ہے اور وہی اس کے مختار اور اپنی قسمت کے آپ معمار ہیں؟ پچیس سالہ تاریخ کا فیصلہ مندرجۂ بالا سوالات کے جوابات پر مبنی ہے۔ بہت کچھ حاصل کیا گیا ہے مگر بہت کچھ حاصل ہونا باقی ہے۔ عوام کی خود اعتمادی اور یقینِ محکم اس کا پیمانہ ہیں کیونکہ یہ عوام ہی ہیں جنھوں نے آزادی حاصل کی ہے اور عوام ہی اس کو برقرار رکھیں گے اور وہی اسے پروان چڑھائیں گے۔

★

ایک عظیم محب وطن — شاہ محمد اجمل الٰہ آبادی

(صفحہ ۵۲ کا بقیہ)

و ادب اور خدمت قوم و وطن میں گزری اور آخر اس عالم جلیل اور عظیم محب وطن نے یکم ذی الحجہ سنہ ۱۲۳۶ھ مطابق سنہ ۱۸۲۱ء بروز پنجشنبہ قبل نماز ظہر بعمر پچہتر سال دو ماہ دائرۂ مذکور میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی اور روضۂ قطب الاقطاب حضرت شاہ محمد افضل الٰہ آبادی میں اپنے جد مادری کے پہلو میں دفن ہوئے۔ "دفن الاجمل جنب الافضل" تاریخ وفات ہے۔

صاحب مفتاح التواریخ آپ کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"شاہ محمد اجمل الٰہ آبادی از اولاد شاہ خوب اللہ است و برادر خورد شاہ غلام قطب الدین مصیب ابن شاہ محمد فاخر زائر تخلص ابن شیخ خوب اللہ۔ بزرگی خاندان ایشان عیاں است بصفات حمیدہ موصوف بود در سنہ یک ہزار و دو صدی و سی و شش ہجری در گذشت و ایں تاریخ در فوت او از مولوی فرد است۔ (صفحہ ۲۷۹ ۔ ۲۸۰)

از جہاں چوں محمد اجمل شاہ
رفت سوئے جناں چو تیر از قوس
سال تاریخ رحلتش از فرد
گفت ہاتف برفت در فردوس"

صاحب تذکرۂ روز روشن مظفر حسین صبا گوپاموی نے اپنے تذکرہ میں حالات شاہ اجمل پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے: "شاہ محمد اجمل الٰہ آبادی از مقربان بارگاہ الٰہی بود ولادت باسعادت وی شب پنجشنبہ یازدہم شوال سنہ ہجری و سیتیں و مایہ و الف است وفاتش غرہ ذی الحجہ سنہ ہفت و ثلثین و مایتین و الف بعمر ہفتاد و نہ سال" صفحہ ۲۹۔

اس کے علاوہ شاہ صاحب کے حالات سفینۂ ہندی صفحہ ۱۰، تذکرۂ شعرائے اردو (میر حسن) صفحہ ۱۲، گلشن ہند صفحہ ۴۰، گلشن سخن صفحہ ۴۴، خازن الشعرا قلمی حرف الالف، سیرۃ الاصفیا قلمی، سراج منیر قلمی، اور معارف شمارہ ۶ و ۷ جلد نمبر ۲۸ وغیرہ میں تفصیل سے مل سکتے ہیں۔ اجملی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل معارف ۲ جلد ۲ قسط اول و دوم ۲ جلد ۲۸۔ وغیرہ میں بالتفصیل مل سکتے ہیں۔

★

افسانہ

بھٹکے بھٹکے

سلام بن رزاق

بس کی کیو میں، بس میں اور چلتے وقت فٹ پاتھ پر، ہر جگہ، ہر گھڑی پربھات کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ اور وہ اندر ہی اندر کسی گزرے ہوئے بھیانک خطرے کے تصور سے کانپ کانپ جاتی۔ وہ کبھی اپنی ساڑی کا پلو درست کرنے کے بہانے، کبھی اپنا منی پرس سنبھالنے کے بہانے اُس کپکپی کو اپنے ہی اندر جذب کر لینے کی کوشش کرتی۔ اپنا خیال بٹانے کے لیے پرس سے نکال نکال کر سپاری کے کتنے ہی ٹکڑے چبا ڈالے۔ بس میں بیٹھے بیٹھے، آج ہی کسم سے لیے ہوئے فلمی میگزین کے سارے اوراق الٹ ڈالے مگر بے سود۔ پربھات کے الفاظ اور اس کی سرگوشی بس کی رفتار کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ بس کی کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا میں بھی پربھات ہی کی مستی بھری آواز گھلی ہوئی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ کھڑکی کا شیشہ چڑھا دے مگر پھر محسوس ہوا کہ اتنی تیز ہوا کے باوجود جو کھڑکی سے آ رہی تھی اس کی پیشانی پر پسینہ چھلک آیا ہے۔ اس نے ہتھیلی میں دبا اپنا چھوٹا سا رومال پیشانی پر پھیرا۔ مگر ہتھیلی سے چھوتے پسینے کی وجہ سے رومال پہلے ہی سے کافی گیلا تھا۔ اُسے لگا آج بس بہت دھیرے چل رہی ہے۔ وہ چاہتی تھی بس اتنی تیز چلے کہ خود اُس کے خیالات بھی اُس سے پیچھے چھوٹ جائیں اور وہ بالکل ہلکی پھلکی ہو کر ہوا کے جھونکے کی طرح دور، بہت دور نکل جائے، جہاں اُس کے خیالات بھی اُسے پکڑ نہ سکیں۔ کیوں کہ پربھات کے الفاظ، اُس کی پھسپھساہٹ اِنھیں خیالات کے کندھوں پر سوار ہو کر اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ مگر بس ہر اسٹاپ پر برابر رک رہی تھی۔ بس جب بھی رُکتی وہ اضطراری طور پر پیچھے پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ جیسے اُسے خطرہ ہو کہیں پربھات اُس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ اُس کی نظریں ہر اسٹاپ پر بس میں چڑھنے والے مسافروں کے چہروں کا جائزہ لینے لگتیں کہ کہیں ان میں کوئی پربھات تو نہیں؟ ایک دفعہ اس نے اپنے مضطرب اور بے طرح پراگندہ ذہن کو کچھ راحت دینے کے خیال سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر کھڑکی کے شیشے سے ٹکا دیا۔ مگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آنکھیں بند ہوتے ہی نہ صرف پربھات کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ بلکہ ذہن کے پردے پر اُس کا ہنستا بولتا ہیولا بھی اُبھر آیا۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بس پھر کسی اسٹاپ پر رُکی تھی اور مسافروں کا ریلا بھیڑ بکریوں کی طرح بس کے دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔ بس کی ساری سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ نئے آنے والے مسافروں کے لیے بالکل جگہ نہیں تھی۔ کنڈکٹر کے منع کرتے کرتے بھی آٹھ دس مسافر گھس آئے اور کچھ مزید دروازے کا ڈنڈا پکڑے اندر گھسنے کی ناکام جد و جہد کر رہے تھے۔ کنڈکٹر نے جلدی سے گھنٹی بجا دی اور بس ایک دھچکے کے ساتھ چل پڑی۔ نئے گھس آنے والے مسافروں میں ایک نوجوان بالکل اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ بس کے دھچکوں سے نوجوان کا جسم بار بار اُس کے بائیں بازو سے چھو رہا تھا۔ اُس کے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ بار بار اندر کی طرف سمٹ رہی تھی مگر بھیڑ اتنی تھی کہ ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنے بازو کو نوجوان کے جسم سے رگڑ کھانے سے نہ بچا سکی۔ اُس نے ایک بار گردن اُٹھا کر نوجوان کی طرف دیکھا وہ ایک ہاتھ سے بس کی چھت میں لگے ڈنڈے کو پکڑے تھا اور دوسرے ہاتھ سے کنڈکٹر کو ٹکٹ کے پیسے دے رہا تھا۔ اُس کا دھیان اُس کے بازو کی طرف نہیں تھا۔ آخر تھک کر اُس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ نوجوان کے پتلون کی رگڑ اُس کے بازو کے ذریعے اُس کے سارے جسم میں کرنٹ بھر رہی تھی۔ وہ روزانہ گھر سے آفس اور آفس سے گھر آتے جاتے بس سے سفر کرتی تھی۔ صبح شام اسی طرح کی بھیڑ ہوتی تھی۔ اُس کا جسم کتنی ہی دفعہ اسی طرح مختلف جسموں سے رگڑ کھاتا تھا۔ مگر اُس رگڑ سے کبھی اُس کے جسم میں کسی قسم کا ارتعاش نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پھر آج کیوں ایسا ہو رہا تھا؟ اُس نے محسوس کیا کہ آج پربھات کی باتیں سننے کے بعد سے ہی اُس کی جلد اس قدر حساس ہو گئی ہے کہ غیر جسم کا صرف چھو جانا بھی اُس کے سارے وجود میں ایک نرم گدگدی پیدا کیے دے رہا ہے۔ کملیش جب سے سینی ٹوریم میں داخل ہوا تھا اس کے

پہلے ہی سے اُس نے اپنے جسم کو برف کی طرح سخت و سرد بنا لیا تھا۔ چھ مہینے بیت گئے مگر اُس کے جسم میں کبھی ہوا سا کی کوئی لہر نہیں اُٹھی، یا اُس نے اُٹھنے نہیں دی۔ مگر آج ــــ پربھات کی باتوں نے جیسے اُس کے احساسات پر جمی برف کو آنچ دکھا دی تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا اُس کا دل اُس کے سینے میں کہیں بہت گہرائی میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ اور جوں جوں دل گہرے پانی میں اُترتا جا رہا ہے ایک قسم کی لذت انگیز گدگدی اُس کے پورے سراپا میں تیرتی چلی جا رہی ہے۔ اُس کے کانوں میں جلترنگ سے بجتے جا رہے ہیں اور نیم بے ہوشی میں اُسکی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔

بس پھر ایک دھچکے کے ساتھ رُکی اور اُس نے اپنی بوجھل پلکیں اُٹھائیں۔ اُس نوجوان کا جو اُس کے بازو سے لگ کر کھڑا تھا اب کہیں پتہ نہیں تھا۔ اُس نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ اسٹیشن روڈ مکھیجا کا نیاز نظر آ رہا تھا۔ اگلے اسٹاپ پر اُسے اتر جانا تھا۔ اُس نے ہڑبڑا کر پیروں کو سینڈلوں میں مضبوطی سے جمایا، جھک کر ٹخنوں پر ساڑی کی چُنٹ درست کی اور پرس سنبھالتی ہوئی سیٹ سے اُٹھ گئی۔

وہ گھر میں داخل ہوتے ہوتے بہت کچھ پُرسکون ہو چکی تھی۔ اُسے اُمید تھی کہ گھر میں قدم رکھتے ہی گڈو دوڑتا ہوا آ کر اُس سے لپٹ جائیگا۔ مگر گھر میں جب اُسے گڈو کی آواز سنائی نہ دی تو اُس نے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے پہلے کچن میں جھانکا۔ اسکی بوڑھی ساس آٹا گوندھ رہی تھی۔

"گڈو ابھی اسکول سے نہیں آیا کیا؟"

"آکر پڑوس کی کملا اور اُس کے بچوں کے ساتھ پارک میں گیا ہے۔" بڑھیا سر جھکا کر پھر آٹا گوندھنے لگی۔ اُس کے سفید کھچڑی بال اُس کے مرجھائے چہرے پر جھول رہے تھے اور وہ اپنے روکھے سوکھے ہاتھوں سے آٹا گوندھنے میں مصروف تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ آٹا گوندھنے میں جس قوت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بڑھیا کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ وہ چند سیکنڈ تک وہیں کھڑی ساس کی طرف دیکھتی رہی۔ جانے کیوں آج اُسے اپنی ساس پر کچھ ترس سا آ رہا تھا۔ بڑھیا نے اُسے وہیں کھڑا دیکھ کر پوچھا۔

"چائے بنی رکھی ہے، گرم کر دوں؟"

"میں گرم کر لوں گی، آپ جا کر آرام کیجئے۔ آج روٹیاں بھی میں سینک لونگی۔"

بڑھیا نے ایک لمحے کے لیے حیرت بھری خوشی سے اُس کی طرف دیکھا پھر کچھ رُک کر بولی: "نہیں، نہیں تم کپڑے بدل کر آ جاؤ میں جب تک چائے گرم کیے دیتی ہوں۔"

"میں کپڑے بدل لوں گی۔ مگر آپ سچ مچ آرام کیجیے۔ میرا آج روٹی بنانے کو جی چاہتا ہے۔ کتنے دن ہوئے مجھے چولھے کے پاس بیٹھے۔ آپ صبح سے شام تک کھپتی رہتی ہیں۔ اُٹھیے، آپ ہاتھ دھو لیجیے، میں ابھی کپڑے بدل کر آتی ہوں۔" بڑھیا کے مرجھائے چہرے پر ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے اُسی تھکے تھکے انداز سے کہا: "تم بھی تو تھکی تھکائی لوٹتی ہو۔ جاؤ کپڑے بدل کر آؤ، منہ ہاتھ دھو لو، تب تک میں چائے گرم کیے دیتی ہوں۔ روٹی چاہے بعد میں تمہیں سینک لینا۔"

اُسے آج ساس کے لہجے سے شفقت ٹپکتی نظر آئی۔ معلوم نہیں کیوں اُسے آج اپنے اس گھر سے، اس کی ہر چیز سے اپنی بوڑھی ساس سے بے انتہا محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اُسے لگا اس چھوٹے سے گھر کی ہر چھوٹی بڑی چیز اُس کے وجود سے بہت گہرائی تک جڑی ہوئی ہے اور ہر شئے سے اُس کا اٹوٹ ناطہ ہے۔ بس کی کیبو میں یا بس میں جس بے چینی یا اندرونی اضطراب کا اُسے احساس ہو رہا تھا اُس کا اب کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اب وہ اپنے اس چھوٹے سے گھر میں اُس سپاہی کی سی راحت محسوس کر رہی تھی جو دشمنوں کے نرغے سے نکل کر کسی مضبوط قلعے میں محفوظ ہو گیا ہو۔

وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گئی، کپڑے بدل کر ایک معمولی سی ساڑی لپیٹ لی۔ نل کے نیچے جا کر اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے دو تین چھپاکے دیے۔ منہ پونچھتی آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ پیشانی اور گالوں پر دو تین جھولتی لٹوں کو درست کیا اور کچن میں ساس کے پہلو میں جا بیٹھی۔ بڑھیا نے چائے کا پیالہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چائے کو دھیرے سپ کرتی جلتے ہوئے اسٹوو کی طرف دیکھنے لگی۔ اسٹوو پر شاید سبزی اُبل رہی تھی۔ بڑھیا آٹا گوندھ چکی تھی اس نے جلدی سے چائے ختم کر لی اور بولی:

"ماں جی! اب آپ جا کر آرام کیجیے۔ میں ابھی روٹیاں سینک لیتی ہوں۔ گڈو آتا ہی ہوگا۔ وہ آتے ہی کھانا مانگے گا۔" بڑھیا نے ایک لمبی سانس کھینچی اور چپ چاپ اُٹھ گئی۔ اپنی ساس کی سرد آہ کے پیچھے چھپے ہوئے نکیلے درد کی چبھن کو اُس نے بھی محسوس کیا۔ مگر اب وہ درد

اُسے زیادہ مضطرب نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ پچھلے کئی مہینوں سے اُس نے اُس درد کو چپ چاپ سہنا سیکھ لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بڑھیا بھی بنا کچھ کہے سمجھ گئی کیوں کہ اب وہ ایک دوسرے کی آنکھوں کی زبان سمجھنے لگی تھیں۔ جب الفاظ اپنے معنی کھو دیتے ہیں تو شاید آنکھیں زبان بن جاتی ہیں۔

ساس کے کچن سے چلے جانے کے بعد اُس نے اسٹوو پر سے سبزی کا پتیلا اُتار لیا اور روٹیاں سینکنے لگی۔

اسے پھر کملیش کی یاد آنے لگی۔ دل کی کسی گہری تہہ سے اداسی کی ایک ہلکی سی لہر اٹھی۔ مگر جلدی ہی اس نے اس اداسی کی لہر کو اندر ہی اندر دبا دیا۔ اتنے میں اسے پھر پربھات اور اُس کی باتیں یاد آنے لگیں۔ مگر اب اُن باتوں نے اُس کے اندر کسی قسم کی بے چینی نہیں پیدا کی۔ اُسے تعجب ہونے لگا کہ وہ صرف ایک گھنٹہ پہلے کتنی کمزور اور جذباتی ہو گئی تھی۔ اُس بات کو یاد کر کے اُسے اپنی جذباتیت اور کمزوری پر غصہ آنے لگا۔ اُسے افسوس بھی ہوا کہ اُس نے پربھات کی وہ بات چپ چاپ سہہ کیسے لی۔ اُس نے اُسے اُسی وقت پھٹکار کیوں نہیں دیا۔ مگر، اُس نے پھر سوچا کہ شاید اُس وقت واقعی وہ اُسے پھٹکار نہیں سکتی تھی۔ وہ بات کچھ اتنی غیر متوقع اور اشتعال انگیز تھی کہ ایک لمحے کے لیے اُس کی ساری قوتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اُس کی حالت ایسے پیاسے شخص کی سی ہو گئی تھی جس کے سامنے پانی سے لبالب پیالہ رکھ دیا گیا ہو۔ پانی کو ہونٹوں سے اتنے قریب پا کر وہ بے قابو ہو گئی تھی اور پھر اسے پربھات سے ایسی امید نہیں تھی۔ وہ کملیش کی موجودگی میں اکثر گھر بھی آ چکا تھا۔ اور جب سے وہ اُس آفس میں کام کر رہی ہے شروع میں پربھات ہی نے اُسے سہارا دیا تھا۔ ورنہ دس بارہ اجنبی مردوں کے درمیان بیٹھ کر کام کرنا اُس کے لیے ایک عجیب گھبراہٹ پیدا کرنے والا تجربہ تھا۔ کملیش بار بار اپنے خطوط میں پربھات کا ذکر بڑے احسان مندانہ طریقے سے کرتا، اور آج تک وہ خود بھی پربھات کی ذات کو اپنے گھر والوں کے حق میں رحمت کا فرشتہ سمجھتی تھی کیوں کہ کملیش کے سینی ٹوریم میں داخل ہو جانے کے دو ماہ بعد ہی جب اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ صرف 'انشورنش' سے ملنے والی برائے نام رقم میں گھر کا خرچ چلانا ناممکن ہے تو ایک دن پربھات نے اُسے بتایا کہ اُس کے آفس میں ایک ٹائم کیپر کی ضرورت ہے اور کام زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ اگر وہ نوکری کرنا چاہے تو وہ اُس کی مدد کر سکتا ہے کیوں کہ فرم کے منیجر سے اُس کے اچھے تعلقات ہیں۔ اُس نے دوسرے ہی دن کملیش کو چٹھی لکھی تھی شاید پربھات اُسے پہلے ہی خط لکھ چکا تھا۔ چار روز بعد کملیش کا خط اُسے ملا۔ اُس نے اُسے نوکری کرنے کی اجازت دیتے ہوئے لکھا تھا۔

"پربھات نے میرے حق میں وہ کام کیا ہے جو پچھلے دو مہینوں سے ڈاکٹروں کے انجکشن اور ٹانک بھی نہیں کر سکے تھے۔ اب میں بہت جلد اچھا ہو کر اپنی ممی اور گڈو سے آ ملوں گا"۔ خط پڑھ کر اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے اور اُس نے دوسرے دن سے کام پر جانا شروع کر دیا۔ پربھات کا اُس فرم میں کافی وزن تھا اور سبھی اُس کی عزت کرتے تھے۔ ویسے وہ کمپنی کا 'فرسٹ گریڈ ریپریزنٹیٹو' تھا اور اکثر آؤٹ ڈور ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ مگر ہر دو چار روز بعد منیجر سے مشورے کے لیے اُسے فرم کا چکر لگانا پڑتا۔ اُس نے محسوس کیا کہ پربھات کی وجہ سے اسٹاف کے لوگ اُس کا کافی خیال کرتے ہیں ورنہ اسٹینو مس جولی اور ٹیلیفون آپریٹر مسز بھٹناگر کا تو فقرے بازی کی وجہ سے ناک میں دم رہتا ہے۔ اس نوکری کے بعد سے وہ گھر کے اخراجات کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گئی تھی۔ ان تین چار مہینوں میں وہ کملیش سے چار پانچ دفعہ مل بھی آئی تھی۔ ساس اور گڈو کو بھی وہ ایک دفعہ ملا لائی تھی۔ اُدھر کملیش بھی روبصحت ہو رہا تھا۔ اور گھر کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد سے وہ بھی کافی خوش نظر آنے لگا تھا۔ اب اُس کے خطوط بھی بڑے طول و طویل اور محبت، اُمید اور زندگی سے بھرپور ہوتے تھے۔ وہ مایوسی، پژمردگی اور بے کیفی غائب ہو چکی تھی، جو سینی ٹوریم میں داخل ہونے کے ابتدائی دنوں میں اُس کی تحریر میں نظر آیا کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی صحت یابی کے ساتھ ساتھ اُس کی تحریر میں بھی ایک قسم کی تازگی آتی جا رہی ہے۔ اُس کے خط پڑھ کر اُس پر کبھی کبھی ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اِس یقین کے باوجود کہ اب کملیش بہت جلد اُس سے آ ملے گا، کبھی کبھی راتوں کی تنہائی اُسے بُری طرح ڈسنے لگتی۔ اُسے خود اپنا ہی بستر جلتی چِتا کی طرح لگنے لگتا۔ کمرے کے در و دیوار سے اُداسی برسنے لگتی

ہوئی آتی اور اُس کے وجود کو چاروں طرف سے جکڑ لیتی۔ وہ لاکھ چھٹپٹاتی، ہاتھ پیر مارتی مگر وہ اُداسی اُس کے اندر اور گہرائی میں اُترتی چلی جاتی۔ ایسے وقت وہ اپنے آپ کو دُنیا کی ایک مظلوم ترین عورت سمجھنے لگتی۔ اُسے اپنی ذات پر ترس آنے لگتا۔ دھیرے دھیرے خود رحمی کا جذبہ اتنا شدید ہو جاتا کہ وہ تکیے میں منہ چھپا کر سسکنے لگتی۔ اور پھر پتہ نہیں کب تک اسی طرح آنسوؤں کی بارش میں بھیگتی ہوئی وہ نیند کی آغوش میں کھو جاتی۔

کملیش اپنے ہر خط میں پربھات کا ذکر ضرور کرتا۔ کبھی کبھی وہ پربھات کو کملیش کے خطوط کے وہ پیراگراف پڑھ کر سناتی جس میں پربھات کا ذکر ہوتا۔ اور پھر دونوں دیر تک اُس کے بارے میں باتیں کرتے رہتے۔ آج بھی جب اُس نے پربھات کو وہ پیراگراف پڑھ کر جس میں کملیش نے سینئی ٹریننگ بہت جلد چھٹی پا جانے کی اُمید ظاہر کی تھی تو اچانک پربھات نے کہا۔

" اچھا بھابی! آج چھٹی کے بعد ذرا رک جانا تھوڑا سا کام ہے۔" اتنا کہہ کر وہ منیجر کے کمرے میں چلا گیا۔ اور وہ سوچنے لگی آج وہ پربھات کو اپنے ساتھ ہی گھر لے جائے گی اور کملیش کے اُس خط کی خوشی میں اُسے اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلائے گی۔ یہ سوچ کر اُسے اچھا لگا اور وہ اپنے جوڑے کا کلپ درست کرتی ہوئی پھر فائل پر جھک گئی۔ آفس ختم ہونے کے پانچ منٹ پہلے ہی پربھات منیجر کے کمرے سے نکل کر اس کی میز کے پاس آیا۔ اس نے جلدی جلدی کاغذات سمیٹے، فائلیں لاکر میں رکھ دیں اور اپنا پرس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پربھات چلیے، کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آفس سے نکل آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ پربھات سے اپنے گھر چلنے کے لیے کہتی پربھات نے آواز دے کر ٹیکسی رکوائی تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے، بس سے چلے چلیں گے مگر پھر یہ سوچ کر خاموش رہ گئی کہ ٹیکسی تو رکوائی ہی گئی ہے، اب کچھ کہنے سے کیا فائدہ۔ پربھات پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے اس کی طرف مُڑا تو وہ بغیر کچھ بولے ٹیکسی میں بیٹھ گئی وہ سمجھ رہی تھی کہ پربھات پچھلا دروازہ بند کر کے اگلی سیٹ پر جا بیٹھے گا مگر جب وہ بھی اسی کے برابر آکر بیٹھا تو اُسے کچھ بے چینی سی ہونے لگی۔ پھر جب پربھات نے ٹیکسی والے سے " زمین پوائنٹ"

کہا تو وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی۔

" نہیں پربھات بھیا! گھر چلیں گے، منا اور ماتا جی انتظار کر رہے ہوں گے۔ ماتا جی پریشان ہو جائیں گی۔" مگر ٹیکسی زمین پوائنٹ کی طرف مڑ چکی تھی۔ اس اثنا میں پربھات نے ٹیکسی کی کھڑکیوں کے پردے کھینچ لیے تھے۔ اس نے اپنے پورے بدن میں ایک سنسناہٹ سی محسوس کی اور کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر الفاظ اس کے ہونٹوں تک آتے آتے بے آواز ہو گئے۔ پربھات اُس کے قریب کھسک آیا اور اس کے کان کے پاس جھک کر کہنے لگا:

" دیکھو سُمی! اب کملیش تو کچھ روز بعد آ ہی جائے گا۔ کیا میں تم سے اُس آگ کو بجھانے کی درخواست کر سکتا ہوں جو ایک عرصے سے میرے اندر سلگ رہی ہے۔ کیا میں تم سے تمہارے پیار کی بھیک مانگ سکتا ہوں ـــــ"

اسے ایسا لگا جیسے کسی نے دھکا دے کر اسے نیچے گہرائی میں دھکیل دیا ہو اور وہ بہت گہرے میں کہیں گرتی جا رہی ہو۔ وہ اپنے آپ اتنی کمزور اور نڈھال ہو گئی تھی کہ جب پربھات نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو وہ اپنا ہاتھ تک نہ چھڑا سکی۔ اُسے پربھات کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ پربھات اس پر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اس کی گرم گرم سانسیں اُس کے گالوں کو چھو رہی تھیں۔ مدہوشی کی سی حالت میں اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ ایک ایسی کپکپی اس کے سارے بدن میں سرایت کرتی جا رہی تھی جو اس نے صرف کملیش کی آغوش ہی میں محسوس کی تھی۔ اس کا ہاتھ پربھات کے ہاتھوں میں تھا وہ دھیرے دھیرے اُسے سہلا رہا تھا۔ اور نہ جانے کیا کیا کہتا جا رہا تھا۔ وہ اس کی آواز تو سن رہی تھی مگر کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی! الفاظ پانی کے بلبلوں کی طرح اس کے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر پھوٹ رہے تھے۔ وہ پربھات کو اس سب سے روکنا چاہتی تھی مگر نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ وہ لاکھ کوشش کے باوجود کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ پھر پربھات کا ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد لپٹ گیا تھا اور پربھات نے دھیرے سے اُسے اپنی طرف کھینچ کر سرگوشی کی تھی:

"ممی تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟"

وہ پسینے میں ڈوبی آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اس نے تب بھی پربھات کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس وقت اس پر ایسی کیفیت طاری تھی جہاں اقرار اور انکار کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ جب ہاں اور نہیں جیسے الفاظ اپنے معنی کھو دیتے ہیں۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے شاید پربھات نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اٹھایا تھا اور وہ اس وقت بھی آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت پڑی تھی البتہ اس کا سینہ کسی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ عین اسی وقت ڈرائیور کی آواز پر وہ دونوں چونک پڑے تھے۔ ڈرائیور شیشے میں سے گھورتا ہوا کہہ رہا تھا "بابوجی! برزمین پوائنٹ آگیا۔"

پربھات ہڑبڑا کر اس سے الگ ہو گیا تھا۔ اور وہ بھی چونک کر اپنے آپ میں لوٹ آئی تھی۔ اب اسے ہوش آگیا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک بھیانک حادثہ کا شکار ہوتے ہوتے بچ گئی ہے۔ پربھات نے ڈرائیور سے کہا: "بامبیلی چلو۔" ڈرائیور نے ایک بار پھر اُسے آئینے میں سے گھور کر دیکھا اور ٹیکسی موڑ دی۔ ڈرائیور نے جن نظروں سے اسے گھور کر دیکھا تھا وہ ان کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ وہ ان نظروں کی چبھن اور ان میں چھپی نفرت کو کبھی بھول نہیں سکے گی۔ وہ نظریں اس کے اندر بہت گہرائی میں اُتر گئی تھیں۔ اُسے اچانک ہی محسوس ہوا تھا کہ وہ فرش پر ننگی پڑی ہوئی ہے۔ مادر زاد ننگی اور ڈرائیور کی آنکھیں ان گنت جونکوں کا روپ دھارن کیے اُس کے برہنہ جسم سے چمٹ گئی ہیں۔ اس نے جلدی سے پرس کھولا اور اپنا چھوٹا سا رومال نکال کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگی۔ پھر ساڑی کے پلّو کو درست کرتی ہوئی ٹیکسی کی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ ہوا کا سرد جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ باہر زندگی اسی طرح رواں دواں تھی۔ طوفان تو صرف اس کے اندر اٹھا تھا۔ اچانک اس نے بلند آواز میں ڈرائیور کو مخاطب کیا: "ڈرائیور سامنے والے بس اسٹاپ پر گاڑی روک دو۔" اتنا کہتے کہتے اس کی آواز ہانپ گئی تھی۔ ڈرائیور نے دوبارہ شیشے میں سے اس کی طرف دیکھا اور ٹیکسی میں بریک لگا دیے۔ ٹیکسی ایک چرچراہٹ کے ساتھ بس اسٹاپ کے قریب رک گئی۔ پربھات کچھ بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا: "ارے ارے کیا ہوا؟ ممی! سنو تو ...." اس نے جھپٹ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اپنا پرس سنبھالتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ اترتے اترتے اس نے پربھات کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا: "ارے ممی! کمال ہے بھئی۔ اچھا دیکھو میں کل پھر آؤں گا آفس میں اچھی طرح سوچ لینا۔" اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا اور دو پلٹ کر پربھات کی طرف دیکھا۔ وہ سیدھی بس کے کیو میں جا کر کھڑی ہو گئی اور رومال سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتی رہی۔ پربھات کی ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ اس انجانے بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا دل اب بھی بری طرح دھڑک رہا تھا مگر ساتھ ہی وہ اس مسافر کا سا اطمینان بھی محسوس کر رہی تھی جو راستے میں لٹتے لٹتے بچ گیا ہو۔

یہ سب سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ نکلے تھے۔ اُسے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ اچانک گُٹو کی آواز پر وہ چونک پڑی تھی اور اس نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ گٹو شاید پارک سے لوٹ آیا تھا۔ وہ سیدھا اس کے پاس دوڑا آیا اور "ممی، ممی!! ہم تو گارڈن گئے تھے" کہتا ہوا اس سے لپٹ گیا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی سے اس کی پیشانی چوم لی۔ گٹو اس کی سرخ اور گیلی آنکھوں کی طرف دیکھ کر بولا: "ممی! تمھاری آنکھیں لال کیوں ہیں؟ کیا آج تم روئی تھیں؟" اس نے اُسے دوبارہ پیار کرتے ہوئے کہا: "نہیں بیٹا آج بہت دنوں کے بعد روٹی سینک رہی ہوں نا، اس لیے گرمی سے آنکھوں میں پانی آگیا ہے۔" اس جواب سے گٹو فوراً مطمئن ہو گیا اور پارک میں کملا آنٹی کے بچوں کے ساتھ کھیلے ہوئے کھیلوں کی تفصیل بیان کرنے لگا۔ وہ مسکرا کر اس کی باتوں پر ہوں، ہاں کیے جا رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ آج کھانے کے بعد وہ کملیش کو ایک لمبا چوڑا پیار بھرا خط ضرور لکھے گی اور آفس کو ایک ہفتے کی چھٹی کی عرضی بھی دے دے گی۔

★



غالب کی جدت پسندی اور فارسیت

از :- افتخار احمد "فخر" ایم اے [پروفیسر ایم جے کالج جلگاؤں]

غالب پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اس پر اب مزید اضافہ کے امکانات بہت کم ہیں۔ اور بمشکل ہی گنجائش نکل سکتی ہے۔ "غالب صدی" کے موقع پر جشن غالب مختلف صورتوں سے ہند و پاک میں منایا گیا۔ ہند و پاک کے بیش تر جرائد میں اہل قلم حضرات نے اپنے مخصوص زاویوں سے غالب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جو "غالب نمبر" کی شکل میں محفوظ ہو چکا ہے۔ الغرض مختلف مکاتیب خیال کے ناقدین و محققین نے نئے نئے زاویوں سے اظہار خیال کیا ہے اور اتنا مواد جمع ہو چکا ہے کہ ایک اچھی خاصی الماری پُر ہو جائے گی۔ غالب پر نئی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ غالب کی زندگی میں زمانے نے ان کی وہ قدر نہیں کی جس کے کہ وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتے تھے۔ اس کا انھیں زندگی میں احساس بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اشعار میں بجا طور پر شکوہ بھی کرتے رہے ہیں۔ اور موقعہ بموقعہ اپنی اہمیت پر بھی زور دیتے نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی انھوں نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ ؎

در بزم غالب آے وشعر و سخن گرائے
خواہی کہ بشنوی سخن ناشنودہٗ

یا ؎

ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ زن
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک نغز گو شاعر کی تمام خصوصیات اور صلاحیتیں لے کر آئے تھے جو ایک عہد ساز شاعر میں قدرت ودیعت کر دیتی ہے۔ آج یہ زمانہ ان کی جو قدر افزائی کر رہا ہے اور ان کی شاعری کی جو دھوم مچی ہوئی ہے اس کے پیش نظر غالب کی وہ پیشن گوئی جو انھوں نے کبھی اپنے متعلق کی تھی، حرف بحرف درست اور صحیح ثابت ہو رہی ہے اور ان کی یاد کو تازہ کر رہی ہے۔ انہوں نے غلط نہیں کہا تھا کہ ؎

کوکبم را در عدم اوج قبولی داد ماست
شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

غالب نے جس وقت ہوش سنبھالا، اپنے گھر میں فارسی کا ذوق رچا ہوا پایا۔ ان کی پیدائش کے وقت ہی گویا عہد مغلیہ رو بہ انحطاط تھا۔ بلکہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ فارسی ہی عام طور پر شاعری کی زبان تھی۔ ان کی شاعری کا آغاز ۱۱ برس کی عمر میں ہی فارسی شاعری سے ہوا اگرچہ اس وقت سب کی نگاہیں ریختہ کی جانب لگی ہوئی تھیں، جو ابھی گھٹنوں چلنا سیکھ رہی تھی مگر دلکشی، دلربائی و رعنائی میں آپ اپنا جواب تھی یہ رہتا رہے تھے کہ اس نوخیز کی نگاہوں سے کوئی دل والا بچ نہیں سکتا۔ غالب کو بھی چار و ناچار اس پر فریفتہ ہونے پر مجبور ہونا پڑا تاہم آخر دم تک انہیں اپنی فارسی شاعری پر فخر و ناز رہا۔ اس میں تامل نہیں کہ اگرچہ سعدی و حافظ فارسی شاعری کے بالخصوص غزلگوئی کے الولآ بالتسلیم کیے جاتے ہیں۔ مگر بلحاظ فارسیت و جامعیت غالب کے ہمسر بھی دو چار ہی ملیں۔ یہی چیز تھی کہ انھیں اپنی فارسی شاعری عزیز بھی تھی اور وجہ ناز بھی۔ فرماتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہاے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اور اپنے معاصروں سے یہی کہتے رہے کہ ؎

راست میگویم و سے از راست سر نتواں کشید

ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی غالب کی فارسی شاعری میں اغلاق و مشکل پسندی پر بحث کرتے ہوئے اپنے مقالہ "نقشہائے رنگ رنگ" میں فرماتے ہیں[1] "عالی ظرفی اور مشکل پسندی اس آدم خاکی کا کام ہے۔ راستہ کی دشواریاں اس کی ہمتوں کو بلند کرتی ہیں۔ ناکامیاں اس کے سمندِ شوق پر تازیانہ کا کام کرتی ہیں۔ یہ مشکل پسندی جو ہمیں مرزا کے کلام فارسی میں ان کے جزو ایمان کے طور پر ملتی ہے۔ ان کی شاعری کا نہایت صحت مند اور مثبت پہلو ہے"۔ اور مثال کے طور پر یہ شعر پیش کیا ہے ؎

بہ وادئی کہ دراں خضر را عصا خفت است

بہ سینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفت است

اور اس میں شک نہیں کہ ان کی مشکل پسندی ان کی عالی ظرفی کا تقاضا تھا جو ان کی فارسی شاعری سے ہوتے ہوئے اردو شاعری میں بھی در آیا ہے۔ ہمارا موضوع سخن ان کی فارسی شاعری نہیں ہے مگر یہ فارسی ہی کا اثر تھا کہ اوّل اوّل ان کی اردو شاعری بھی قدرے پیچیدہ اور مغلق تھی اور غالباً اس کا ایک اور سبب بہ تقاضائے فطرت مرزا کا طرز بیدل میں ریختہ کہنا بھی تھا جیسا کہ وہ خود اعتراف بھی کرتے ہیں ؎

طرز بیدل میں ریختہ کہنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا غالب نے زیادہ تر تخیل میں مرزا عبدالقادر بیدل سے استفادہ کیا ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار میں چنانچہ بیدل کے رنگ کی جھلکیاں صاف طور پر نمایاں ہیں۔ تمثیلاً یہ اشعار ملاحظہ کریں ؎

(۱) ذکے وقت مئے پئے ساتھ رقیب کو لیے

آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

(۲) تمہاری طرز ادا جانتے ہیں ہم کیا ہے

قریب ہے پہ اگر لطف تو ستم کیا ہے

(۳) عشق کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

بالآخر عرفی و نظیری کی پیروی نے مرزا غالب کو بیدل کی تقلید سے نکالا جن کی مقبول ترین خصوصیت معاملہ بندی ہے۔

مرزا بیدل کی تقلید پر غالب کو بڑا ناز و افتخار یوں بھی تھا کہ اگر دقت پسندی نے غالب کو گرویدہ بنا لیا تھا اور وہ شاہراہ عام پر چلنے میں عار محسوس کرتے تھے۔ وہ اپنا مسلک سب سے الگ بنانا ہی باعث عزّ و ناز تصوّر کرتے تھے۔ بیدل کے تتبع کا اعتراف انہوں نے کئی جگہ کیا ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیے ؎

(۱) مجھے راہِ سخن میں راہ گمراہی نہیں غالب

عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامۂ بیدل کا

(۲) مضطرب دل نے میرے تار نفس سے غالب

ساز پر رشتۂ بے نغمۂ بیدل باندھا

اور ایک جگہ تو اس طرح کھل کر کہتے ہیں کہ ؎

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے

مجھے رنگ بہار ایجادئ بیدل پسند آیا

اپنے اسی مقالہ میں (نقشہائے رنگ رنگ) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی آگے چل کر بیدل کے تتبع کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ "بیدل کے ہاں جو مشکل پسندی ہے وہ محض لفظی نہیں ان کے ہاں خیال بھی نہایت دقیق ہوتا ہے اور اسی دقت خیال کی وجہ سے کبھی الفاظ کا جامہ ان کے مضامین پر تنگ نظر آتا ہے۔ یہی بات مرزا غالب کے یہاں بھی ہے۔ ان کی مشکل پسندی اکثر و بیشتر خیالات کی ندرت اور دقت سے پیدا ہوتی ہے۔ اور کثر اس لیے کہ انہیں اپنے اسلوب بیان میں بھی اسی جدت اور ندرت کی تلاش رہتی ہے جس کی فکر انہیں مضامین و موضوعات اور اسلوب بیان میں دامن گیر رہتی ہے"۔[2]

فارسی تراکیب کے علاوہ تخیل اور اسلوب بیان کی ندرت میں صوری و معنوی دونوں اعتبار سے وہ بیدل کے پہلے پہل اسیر رہے۔ مگر

[1] "احوال و نقد غالب" صفحہ ۳۴ و ۳۵ بحوالہ "ماہ نو" کراچی۔ [2] "احوال و نقد غالب" مرتبہ محمد حیات خاں سیال صفحہ ۳۴ و ۳۵ بحوالہ "ماہ نو" کراچی۔

اس کے بعد ان کی نگاہیں دوسرے فارسی شعرا کے جانب بھی اٹھتی ہیں۔ جیسا کہ خود انھوں نے اپنے ایک خط میں اس خوشہ چینی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں[1] "شیخ علی حزیں نے مسکرا کر بے راہ روی مجھ کو جتلائی طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادّہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ باندھا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر مجھ کو چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میر کلک رقاص، چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا"

چنانچہ جب وہ اپنی فارسیت پر نازاں ہوتے ہیں تو عجب غرور میں عرفی کا یوں دم بھرتے ہیں ؎

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب   جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

اور ایک جگہ مندرجہ بالا بیشتر شعرا کو گنتے ہوئے یوں معترف ہیں ؎

مارا مدد از فیضِ ظہوری است در سخن   رو شیوۂ نظیری و طرزِ حزیں شناس

ان کی یہ شاعرانہ تعلی بھی قابلِ لحاظ ہے ؎

موں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب   میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

اس سے قطع نظر کہ ان فارسی شعراء کی روش کی وجہ سے غالب کے ہاں فارسیت اور دقت پسندی کا یہ میلان ان کی اردو شاعری کو بھی گرانبار بنا دیتا ہے۔ یہ محض نقالی نہ تھی بلکہ منفرد انداز کی جستجو تھی یہ بھی نہیں کہ اس وقت تک الفاظ و معانی کے صحیح رابطے سے وہ واقف نہ تھے مگر انھیں اس کا احساس شاید نہیں تھا کہ روزمرہ کے عام الفاظ میں بھی بلند سے بلند خیالات کو ادا کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ ان الفاظ میں بھی بے پناہ صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس وقت تک گہرے اور فلسفیانہ خیالات کو نرم اور مترنم الفاظ میں ادا کرنے کا گر نہ سیکھا تھا اور اس کی پرواہ انھیں اس وقت ہوئی جب کہ معترضین نے ان کا ناطقہ بند کر دیا۔ اگرچہ اس وقت بھی ان کو مرزا یہی کہہ کر ٹالتے رہے کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ   گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن جیسے ہی انکی نگاہ میں بلندی پیدا ہوتی ہے اور وہ اس رمز سے آشنا ہوتے ہیں ان کی آنکھوں سے یہ پردہ اٹھتا نظر آتا ہے۔ نسبتاً ان کی زبان میں سلاست اور روانی کے ساتھ صفائی آجاتی ہے۔ مگر انھوں نے ابتدائی فلسفیانہ خیالات کو زبان کی سلاست و بانکپن کی قربان گاہ پر نہیں چڑھایا بلکہ ان کے خیالات اور تصورات اور بھی چمک اٹھے۔ چنانچہ انھوں نے گنجلک تراکیب' اور فارسی کے دقیق الفاظ اپنا اردو دیوان مرتب کرتے وقت نکال دیے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیں ؎

بوئے گُل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالب نے مصرعۂ ثانی اس شعر کا پہلے یوں کہا تھا ؎

(i) . . . .   عشرتِ ایجاد چہ بوئے گل و چہ دودِ چراغ؟

(ii) نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ ویرانی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

اس شعر کا مصرعۂ اولیٰ غالب نے بعد میں بدل دیا ورنہ پہلے شعر یوں تھا ؎

(ii) نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

تہذیب و تکذیب، ترمیم و تنسیخ کا یہ عمل ہر بڑے شاعر کا فطری عمل ہوتا ہے۔ ہر شاعر اپنی شعری تخلیق پر نظر ثانی کے بعد لطف زبان و بیان اور معنی آفرینی وغیرہ کے پیش نظر ردّ و بدل کرتا رہتا ہے۔ اسے خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے بھی اپنی شعری تخلیقات کے ساتھ یہی کیا ہے۔ اور حذف و اضافہ، حک و اصلاح سے اپنے کلام کو مزین کیا ہے۔ ان کی مشہور نظم "مرزا غالب"[2] جو ۵ بندوں پر مشتمل ہے اور "بانگِ درا" کی زینت ہے پہلے اس کے چھ بند تھے۔ بانگِ درا میں درج ذیل بند حذف کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

معجزہ کلکِ تصور کا ترا دیواں ہے یہ   یا کوئی تفسیر رمزِ فطرت انساں ہے یہ
نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ   نورِ معنی سے دل افروزِ سخن داناں ہے یہ
"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

---

[1] "یادگارِ غالب" ص ۱۹۵ [2] ملاحظہ فرمایئے "رختِ سفر" مرتبہ محمد انور حارث، کراچی ۱۹۵۲ء صفحات ۸ و ۹ بحوالہ "ہماری زبان" ۲۲ مئی ۶۹ء مضمون سیدہ حامد حسین)

علاوہ ازیں دو شعر ایسے بھی ہیں جنھیں علامہ اقبال نے اپنی نظم میں باقی تو رکھا تاہم کچھ ترمیم کے بعد ملاحظہ ہو اصل شعر ؂

(۱) دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
صورتِ روحِ رواں ہر شے میں جو مستور ہے

مصرعۂ ثانی مگر "بانگ درا" کی نظم میں یوں ہے ؂

"بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں مستور ہے"

(بند ۱ شعر ۳)

اسی طرح یہ شعر جو بانگ درا کی مشہور نظم "مرزا غالب" کا ———

زبانِ زد خاص و عام ہے ؂

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے شمع یہ سودائیِ دلسوزیِ پروانہ ہے

(بند ۲ شعر ۳)

پہلے یوں تھا ؂

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے شمع یہ جویندۂ دلسوزیِ پروانہ ہے

حال ہی میں نو دریافت شدہ دیوانِ غالب کے نسخۂ امروہہ سے متعلق پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے ہمارے اس نظریہ کی مزید توثیق و تائید ہوتی ہے [۱] پروفیسر موصوف فرماتے ہیں کہ "ایک اور اہمیت نسخۂ امروہہ کی یہ ہے کہ اس سے نسخۂ حمیدیہ کی اولیت کا نظریہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس نسخہ میں جو کلام ہے وہ فارسی آمیز اغلاق اور مشکل پسندی کے اعتبار سے نسخۂ حمیدیہ پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ نسخۂ امروہہ کا غائر مطالعہ ثابت کرے گا کہ غالب فارسیت سے کس طرح دامن بچاتے گئے ہیں۔

متداول دیوان میں جو اشعار انھوں نے بطور نمونہ چھوڑ دیے تھے وہ بھی ابتدائی دور کے کلام کی اصلاح یافتہ شکل تھے۔ یہاں کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب سے پہلے غالب نے کس طرح شعر کہے ہیں اور پھر انھیں کیا اصلاح کرنے کے بعد نسخۂ حمیدیہ میں شامل کیا۔ اشعار نسخۂ امروہہ سے لیے گئے ہیں اور ان کے سامنے قوسین میں وہ شکل لکھی گئی ہے جو نسخۂ حمیدیہ یا نسخۂ شیرانی میں ملتی ہے۔

(i) (باستقبالِ تمثالِ زماہ اختر فشاں شوخی)
تماشا کشورِ آئینہ میں، آئینہ بند آیا
(مژہ اختر فشاں کی، بہرِ استقبال آنکھوں سے)

(ii) تغافل بدگمانی (ہا نظر) بر سخت جانی (ہا) [۲]
نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیمِ گزند آیا
(تغافل بدگمانی بلکہ میری سخت جانی ہے)

(iii) (سوادِ چشم) بسمل (انتخابِ نقطہ آرائی) [۳]
(خرام نازِ بے پروائی) قاتل پسند آیا
(روانی ہائے موجِ خونِ بسمل سے ٹپکتا ہے
کہ لطفِ بے تماشا) رفتنِ قاتل پسند آیا)

(iv) اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ (کوشش ہا) (بے تابی)

(v) (نہیں در پردہ حسن از کوشش شائستگی غافل) [۴]
(کرے ہے حسن خوباں پردے میں شائستگی اپنی)

(vi) (شب کو باندھا یار نے پیمان در خوابِ عدم) [۵]
(شب کو باندھا خواب میں آنے کا کل غافل نے جنام)

(vii) (گویا) صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا [تو کہے]

(viii) خوشی بے کیفیتی ہے اضطرابِ اندیشِ استغنا [۶]
[اضطراب آرا اسد]۔

---

[۱] ماہنامہ "آجکل" دہلی ص ۳
[۲] ایضاً (بحوالہ نسخۂ عرشی ص ۱۱)
[۳] " (بحوالہ نسخۂ عرشی ص ۱۲)
[۴] ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۶۹ء ص ۳۰ (بحوالہ نسخۂ عرشی ص ۲۳)
[۵] ایضاً "آجکل" دہلی جون ۱۹۶۹ء ص ۳۰ (بحوالہ نسخۂ عرشی ص ۲۵)
[۶] " " " " " " " (بحوالہ نسخۂ عرشی ص ۲۵)

وہ نہ جس کا طپیدن ، لغزشِ مستانہ تھا

(آئینہ تھا)

یہ اشعار بلاشبہ ہمارے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں کہ غالب پر فارسیت اور مشکل پسندی کا ابتدائی دور میں کتنا غلبہ رہا ہے۔ اپنے اسی مضمون مطبوعہ "آجکل" دہلی میں آگے چل کر پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب نے تجزیہ کرتے ہوئے بالکل درست فرمایا ہے کہ[1] "نسخہ امروہہ میں جو کانٹ چھانٹ ہے اسے دیکھیے پھر نسخہ حمیدیہ اور اس سے آگے بڑھ کر نسخۂ شیرانی اور "گل رعنا" کو دیکھیے بلکہ نسخۂ امروہہ سے لیکر نظامی پریس کانپور میں طبع ہونے والے ایڈیشن تک، جو غالب کی زندگی ہی میں شائع ہونے والا آخری دیوان ہے۔ حک و اصلاح اور ترمیم و تبدیل کا عمل برابر جاری رہا ہے"۔

صرف اتنا ہی نہیں، مرزا کے ہاں ان کے موجودہ دیوان میں ایسے بیشتر اشعار ہیں جو نہ کہ صرف فارسیت پر دال ہیں بلکہ کہیں کہیں تو تمام و کمال اشعار ایسے بھی ہیں جو قطعاً فارسی ہی کے ہیں محض ردیف میں یا درمیان میں کوئی لفظ اردو کا آگیا ہے۔ اگر ہم اس اردو لفظ کی جگہ فارسی ہی کا کوئی ہم وزن اور ہم معنی لفظ رکھ دیں تو پورا کا پورا شعر فارسی شعر ہو جاتا ہے۔ ورنہ بحالت موجودہ ان کے اردو دیوان کے ایسے اشعار جن کی نشاندہی ذیل میں کی جا رہی ہے ان کو ہم زبردستی اردو کہہ لیں تو اور بات ہے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے چند ایسے ہی اشعار ؎

(۱) شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

(۲) ہوائے سیرِ گل، آئینۂ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

(۳) جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

خط کشیدہ الفاظ ردیف کے "آیا" کی بجائے "آمد" پڑھنے سے بالکل فارسی کے ہو جائیں گے۔ ذیل کے اشعار بھی اسی قبیل کے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

(۱) شب خمارِ شوقِ ساقی، رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یہاں ردیف "تھا" کو "بود" کر دینے سے وہی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں بھی ردیف "ہے" کو "است" یا "ہست" کر دیجیے، فارسی شعر کے زمرہ میں چلے جائیں گے۔ انھیں بھی دیکھتے چلیے ؎

(۱) غنچۂ ناشگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے (است)

(۲) دیدار، بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے (ہست)

—یا— اسی زمین کا یہ مشہور شعر دیکھیں ؎

(۳) ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے (است یا ہست)

اور (۴) نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے
عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
دعوتِ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے
حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے
آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن!
چشمِ واگردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے —یا—

یہ اشعار بھی غور طلب ہیں ؎

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے
موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے
دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

---

[1] ماہنامہ "آجکل" دہلی صفحہ ۲۳ بابتہ ماہ جون ۱۹۶۹ء

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور ...

مجھی ان ملے گرفتاریٔ الفت
دستِ تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے
زبسکہ مشق تماشا جنوں علامت ہے
کشادہ بست مژہ سیلیٔ ندامت ہے
وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنوں ساختہ و فصل گل قیامت ہے

اور یہ شعر ؎

یہ طوفاں گاہ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

ان تمام اشعار کی ردیفیں ہی صرف اردو ہیں جنہیں "است۔ یا۔ ہست" کر دینے سے یہ تمام فارسی ہو جائیں گے۔ "دیوانِ غالب" میں "مانگے" کی ردیف میں تین ہی شعر ہیں۔ مگر ان میں سے یہ شعر دیکھیے ؎
نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
اگر مانگے کی بجائے "طلبد" پڑھا جائے تو کون اس شعر کو اردو کا شعر شمار کرے گا؟

اب کچھ ایسے اشعار مرزا کے ملاحظہ فرمائیں جن کے مصاریعِ اولیٰ یا ثانی میں یا پھر دونوں مصرعوں میں ایک ایک لفظ اردو کی بجائے فارسی کا ہم معنی اور ہم وزن داخل کرنے سے وہ فارسی شعر بن جائیں گے۔ مثلاً یہ شعر ملاحظہ فرمائیں ؎
عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا
مصرعِ اولیٰ میں "کھانا" کی بجائے "خوردن" اور "ہونا" کی بجائے "بودن" پڑھ کر دیکھیں۔ اس طرح کا یہ شعر بھی ہے ؎
ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا
مصرعِ اولیٰ میں "ہے" کو "است" یا "ہست" پڑھیے۔ درج ذیل شعر کے مصرعِ اولیٰ میں "فراہم کر" کو "فراہم کن" پڑھنے سے وہی بات پیدا ہو گی ؎
بہ نالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم
ذیل کے شعر کے دونوں مصرعوں کے آخر میں لفظ "ہے" استعمال کیا گیا ہے۔ اور سوائے اس لفظ کے سب پورا شعر فارسی تراکیب و نغمگیت

سے مملو ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

سرشکِ سر بصحرا دادہ نورالعینِ دامن ہے
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

اور بھی اس قسم کی بیشتر مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر دو مثالوں ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ قصائد کو چھوڑئیے جن میں اردو اشعار کے درمیان ہی کئی کئی شعر فارسی کے بھی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ قصیدہ میں شکوہِ الفاظ و بلندیٔ افکار کی وجہ سے اس کی فضا ہی اس کی متقاضی ہوتی ہے۔ پھر بھی قصائد میں مندرجہ ذیل قابلِ ملاحظہ ہیں۔ وہ قصیدہ جو کہ منقبت میں کہا گیا ہے۔ اور خاص طور پر شاہ ظفر کی شان میں جو قصیدہ غالب نے کہا ہے تو اس حقیقت سے پردہ اٹھتا نظر آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں مرزا کے بارے میں جو رائے دی ہے۔ در پردہ ان کی فارسیت کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ اور جہاں تک مرزا غالب کے دورِ اول کے کلام کا تعلق ہے آزاد کی رائے کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اور اس میں بڑی صداقت نظر آتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنی پہلو دار تحریر، دلکش و دلفریب اسلوبِ بیان اور چٹخارے دار زبان سے اپنے مبالغہ آمیز اعتراض کی شدت کو انشاء کی رنگینی میں چھپا دیتے ہیں۔ "آبِ حیات" کی اصل عبارت یہ ہے[1]

"اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے معانی و معانی کے بیشہ کے شیر ہیں۔ دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔ اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی۔ اور اس سے ان کو طبعی تعلق تھا۔ اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترتیب دیے جاتے ہیں کہ بول چال میں اس طرح نہیں بولتے۔ لیکن جو شعر صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔"

مالک رام صاحب ایم۔ اے نے اپنے ایک مضمون

---

[1] "آبِ حیات" ص ۴۴۲ [2] ... "اعمالِ نقد غالب" ... مرتبہ محمد حیات خاں سیال ۱۹۶۰ء وغیرہ

اردو کلام پر تفصیلی تبصرہ اور تجزیہ (دیکھیے تفصیل کے لیے دیکھیے
ہماری کتاب غالب) "کرو کل کی مذکورہ اشاعت" میں تجزیہ کے
بعد اسی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب (اردو) میں کہنا
چاہتے ہیں کہ ——

(۱) غالب دراصل اردو کے نہیں فارسی کے شاعر تھے۔

(۲) اردو میں ان کا اکثر کلام ناقابلِ فہم یا لفظوں میں معنیٔ
مگر حقیقت صرف اتنی ہی ہے جیسا کہ اوپر کہیں بیان کیا گیا ہے کہ
مرزا الفاظ کے دروبست ان کی غنائیت اور صوتیاتی ہم آہنگی سے بے خبر نہ
تھے۔ بلکہ جیسے جیسے ان کے شعور کو ریختہ یا اردو کے مترادف الفاظ کو برتنے
کا سلیقہ آگیا تو ان کے اشعار میں بلا کی روانی اور حسن پیدا ہو گیا اور ان کے
اشعار میں عذوبت اور شیرینی کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی نشتریت اور دلربائی جو
مرزا کے کلام کا خاص جوہر اور وصف ہے آگئی۔

ان کے فارسی کلام کو ایران و ہندستان میں وہ شہرت نہ مل سکی
جس پر ان کو فخر و ناز رہا اور یہ عجیب سی بات ہے جسے وہ "تنگ اور
بے رنگ من است" کہتے رہے اور سمجھتے رہے وہی زبان اردو ہندستان
میں ان کی شہرت اور مقبولیت کی اساس بنتی ہے۔ انہوں نے اردو
کے بیشتر اشعار اپنے دیوان سے نکال دیے ہیں اور قلمزد کر دیے ہیں جیسا کہ نسخۂ حمیدیہ
اور حالیہ دریافت شدہ نسخۂ امروہہ جو مراد آباد کے مولوی توفیق احمد
صاحب کو بھوپال کے ایک کتب فروش شفیق احسن فضلی صاحب
سے ملا ہے (اور اب جس کی ملکیت ان دنوں ایک ماہ التزام ارنی
ہوئی ہے جیسا کہ بھوپال کے ایک جلسہ میں جو مجلس اردو بھوپال کے
زیر اہتمام حال ہی میں منعقد ہوا تھا اس میں مولوی فضلی صاحب نے
یہ اعلان کیا ہے کہ زیر بحث دیوانِ غالب کا وہ نسخہ جو کہ خود غالب
کی تحریر ہے (اور جسے اب نسخۂ امروہہ کا نام دیا گیا ہے۔) انہوں نے
مولوی توفیق احمد صاحب کو مستعار دیا ہے فروخت نہیں کیا ہے)
ان کے تقابلی مطالعہ سے صاف عیاں ہے کہ مرزا غالب نے بیشتر
اشعار میں حذف و اضافہ کیا ہے۔ یا مرحلہ وار کر دیے ہیں۔ اور
فارسی کے دقیق الفاظ نکال کر ان کی جگہ اردو کے الفاظ داخل
کیے ہیں اور جو کچھ بھی دیوانِ غالب اردو مختصر سا ہمارے پیشِ نظر

ہے یا منظرِ عام پر آیا ہے اسی فنی حضرات اسی کو سرمۂ بصیرت سمجھتے
ہیں اور مرزا کا یہ دیوان نہ صرف شائقینِ اردو بلکہ خود زبانِ
اردو کا بیش بہا سرمایہ اور وہ معیار ادبِ اردو بن گیا ہے جس پر حیرت ہوتی ہے کہ
ایک صدی قبل اس زبان میں ان کے تخیل کی بلند پروازی
اور فلسفیانہ فکر نے جذبات و احساسات کی زبان یعنی شاعری کی ایک
نئی دنیا بسائی تھی۔ اور فکر و فن کے امتزاج کے بعد بڑی چابکدستی
سے ایسا حسین و دلکش اور جاں نواز مرقع پیش کیا کہ جس کی قدر و
قیمت کا صحیح اندازہ مکمل سو برس کے بعد کیا گیا۔ اور اس وقت جس
زبان کو غالب نے خواہی نخواہی اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے
ذریعہ بنایا تھا۔ بقول علامہ اقبال جو کہ ہنوز "منت پذیرِ شانہ" تھی اور
غالباً اب بھی ہے۔ بالیقین اردو زبان و شعر کے ساتھ ساتھ غالب کا
کلام بلکہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقشِ جاوداں بن گئے ہیں۔ دونوں
کی آفاقیت، وسعت، جامعیت اور ہمہ گیری مسلّم ہے۔ اسی اردو دیوان
کی وجہ سے مرزا غالب دنیا کے بڑے شاعروں میں شمار کیے گئے اور انھیں
زندگیِ جاودانی ملی اور ایسا بڑا شاعر صدیوں بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔
بقول میر، ؎

پھرتا ہے فلک برسوں، تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں۔

صہبائے شعر کے دو آتشہ یا سہ آتشہ ہونے کا انحصار اس کی کیفیت پر ہے نہ
کہ کمیت پر اور قطعِ نظر اس کے کہ ؎

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آساں نہیں صاحبِ دیواں ہونا

اسی مختصر سے دیوان کے خالق نے یہ بھی تو کہا ہے کہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

کیا غالب کی خوش نصیبی یہ کم ہے کہ "قبولِ عام و بقائے دوام" دونوں
سے قدرت نے انھیں نوازا ؎

"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا"

ص؎ ملاحظہ ہو "ہفت روزہ" ۲۲ر جولائی ۱۹۶۹ء ص ۲

قطعات

عبدالغفار تحسین

شام کے وقت سطحِ دریا پر
جھلملاتی ہیں اس طرح کرنیں
جیسے قیدی قفس میں گھبرا کر
توڑنا چاہتا ہو ـــــ زنجیریں

مسکراتے ہیں غم و رنج و محن
صحنِ گلزار میں چلتی ہے پَوَن
جب بھی دُہراتا ہے افسانہ کوئی
یاد آتی ہے بہت صبحِ وطن

ساز کہتے تجھے کنول کہتے
ساغر و بزم کا بدل کہتے
کچھ جو ملتی کبھی غموں سے نجات
ہم تجھے میرؔ کی غزل کہتے

خواہشوں کو سدا اچھالا ہے
جذبۂ دل مرا نرالا ہے
بھول سکتا نہیں کبھی اس کو
میری باتوں کو جس نے ٹالا ہے

جتنی خوشیاں بھی اس کو مل جائیں
اس کا ہر غم خوشی پہ بھاری ہے
ٹمٹماتے دیوں کے سائے میں
جس نے بھی زندگی گذاری ہے

قطعات

[illegible]

نئی امنگ نئے حوصلوں کو ساتھ لیے
مناؤ جشنِ مسرت مگر سلیقے سے
قدم قدم پہ جلاؤ محبتوں کے دیے
سجاؤ محفلِ عشرت مگر سلیقے سے

کہیں کسی بھی طرح کی کمی نہ رہ جائے
کہ تم کو صفحۂ تاریخ پر ابھرنا ہے
سنوار دینا ہے امروز کو پسینے سے
لہو سے خاکۂ فردا میں رنگ بھرنا ہے

تم آنکھ کھول چکے ہو تو اب رہو بیدار
رخِ زمانہ ہر آن دیکھنا ہوگا
جو ایک پل کو بھی غافل ہوئے تو ہوگا ستم
جو آنکھ جھپکی تو دشمن کا فائدہ ہوگا

ہزاروں ناگ ابھی رینگتے ہیں گلشن میں
ہزاروں خار ہیں پھولوں کا بھیس بدلے ہوئے
وطن پرستی کے پردے میں ملک دشمن ہیں
ابھی چھپا ہے اصولوں کا بھیس بدلے ہوئے

قدم بڑھاؤ مگر تیشۂ نظر لے کر
کہ تم کو راہ کے روڑوں کو ختم کرنا ہے
سفیرِ امن و محبت پیامِ صدق و وفا
عظیم ملک کے جہاں میں تمھیں ابھرنا ہے

سلطان سلیم (جہانگیر)

ایک باغی بادشاہ کی حیثیت سے

★ حبیب اللہ الدین



سلطان سلیم (جہانگیر) اکبر اعظم کے آخری ایام حکومت میں چند برسوں تک بحیثیت ایک باغی بادشاہ حکومت کرتا رہا۔ اس کا مرکز الہ آباد کا قلعہ تھا۔ اس کی باغیانہ سرگرمیوں کا تذکرہ مورخین نے کیا ہے لیکن بعض جزئی تفصیلات جیسے سلطان سلیم کی تخت نشینی کی تقریب، فرمان اور سکوں کے اجرا وغیرہ کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ جہانگیر نے اپنی تزک میں ۵ ویں سال جلوس کے واقعات کے ضمن میں سنگ موسیٰ کے سیاہ تخت کو الہ آباد سے آگرہ لے جانے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ یہ تخت الہ آباد میں کب بنوایا تھا اور کس مقصد کے لیے۔ البتہ تخت خود ہی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ زمانۂ بغاوت میں بنایا گیا تھا اور اس کے بنوانے کا سال ۱۰۱۱ھ یا ۱۶۰۲ء ہے۔

اعلان بادشاہت کے ساتھ ہی تخت نشینی، فرمان اور سکوں کا اجرا بھی ضروری ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ سلطان سلیم نے بغاوت کے زمانے میں قلعۂ الہ آباد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر یہاں سے متعدد فرمان جاری کیے تھے۔ یہ فرمان کم یاب اور خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

یو۔پی کے سرکاری محافظ خانۂ دستاویزات (STATE ARCHIVES OF U.P.) میں سلطان سلیم کے عہد بغاوت کا ایک فرمان موجود ہے جس کے تفصیلی تذکرہ کے ساتھ یہاں تخت اور سکے کا بھی جائزہ لیا جا رہا ہے۔ یہ فرمان اکبر کے ۴۴ ویں سال جلوس یا ۱۶۰۱ء میں جاری کیا گیا تھا۔ اس فرمان کے مطابق شیخ ادریس کو ۲۳۰ بیگہ زمین پرگنہ صدرپور سرکار خیرآباد میں بطور "مدد معاش" دی گئی ہے جو ہر طرح کے ٹیکس سے معاف تھی۔ اصل فرمان کی نقل درج ذیل ہے۔

یا مالک الملک

حکم جہاں مطاع ابوالمظفر سلطان سلیم شاہ غازی

(مہر مدور)

مظفر الدنیا والدین
سلطان سلیم بادشاہ

دریں وقت فرمان عالیشان واجب الاطاعۃ والاذعان
از کمن لطف واحسان شرف صدور رو عز ورود یافت کہ

موازی دو صد و سی بیگہ زمین افتادہ لائق زراعت بگز الہی بطریق ابتدائی از ابتدائی خریف پارس ئیل از پرگنہ صدرپور سرکار خیرآباد در وجہ مدد معاش مشیخت مآب شیخ ادریس وغیرہ بتفصیل ضمن مقرر و مسلم باشد کہ حاصلات آں را سال بسال صرف معیشت خود ہا نمودہ بدعائی دوام دولت قاہرہ اشتغال نمایند می باید کہ حکام وعمال وجاگیرداران وکروریان حال و استقبال پرگنہ مذکور آراضی مذکور را از محل نیک پیمودہ وچک بستہ بتصرف آنہا باز گذاشتہ مدخل ننمایند وبعلت مال ودہات و اخراجات وعوارضات چہا قلنقہ وپیشکشے وسادری و دہ نیمی و مقدمی وگاؤ شماری وصد دو نیم قانون گوئے وحصہ و رسد وشکار و بیگار و تکرار زراعت وضبط ہر سالہ بعد تشخیص چک وکل تکالیف دیوانی و مطالبات سلطانی مزاحمت نرسانند و ہر سال فرمان وپروانچہ مجدد طلب ندارند دریں باب قدغن تمام لازم دانستہ از فرمودہ صدر بدر نگزرند۔

تحریراً فی التاریخ غرہ اسفندار مذ ماہ الٰہی سنہ ۴۶
در چوکی مقرب الحضرت الخاقانی لعل بیگ و برسالۃ صدارت

پناہ اقامت دستگاہ شیخ نور اللہ نوبت واقعہ نویسی صوبہ سلیم
روز دی ۲۴ ماہ ذی الہی سنہ ۔۔

پشت پر جو پانچ مہریں ثبت ہیں ان میں ذیل کی عبارت
درج ہے:

(۱) "نور اللہ مرید است شاہ سلیم" (۲) "عاقبت محمود مرید است
شاہ سلیم" (۳) "معین الدین مرید است شاہ سلیم" (۴) "....؟...
مرید است شاہ سلیم" (۵) "....؟... مرید است شاہ سلیم"

ان مہروں سے قریب ہی متعلقہ حکام کے دستخط اور تاریخیں بھی درج
ہیں۔ یہ فرمان گوناگوں اہمیت کا حامل ہے جس میں سب سے اہم بات یہ
ہے کہ سلطان سلیم کی بغاوت کے فوراً ہی بعد یہ جاری کیا گیا ہے۔

فرمان کے اوپری حصہ پر اکبر بادشاہ کے نام کا کوئی طغریٰ نہیں ہے
بلکہ صرف "سلطان سلیم شاہ" درج ہے جبکہ اس زمانے میں عام دستور
یہ تھا کہ تمام شہزادے بادشاہِ وقت کے نام کے طغریٰ کے بغیر کوئی حکم نامہ
یا نشان جاری کرنے کے مجاز نہ تھے۔

سلیم کے نام کے ساتھ اس کی کنیت "ابوالمظفر" اور "غازی" کا خطاب شدہ
ہے جس کو صرف مطلق العنان حکمراں لکھتے تھے۔ پورا نام "ابوالمظفر سلطان سلیم
شاہ غازی" درج ہے۔ "بادشاہ" خطاب کا درج کرنا اس کی آزادانہ باغیانہ
روش پر دلالت کرتا ہے۔

فرمان کے ابتدائی جملے ہیں "....فرمان عالیشان.....شرف صدور
.....یافت" درج ہے جس سے ظاہر ہے کہ سلیم نے اس حکم کو خود ہی "فرمان"
کا نام دے دیا ہے۔ اس فرمان کی عبارت اور دیگر شاہی فرامین کی عبارت
میں فرق نہیں ہے۔ سائز بھی عام فرمانوں جیسا ہے۔

پشت فرمان پر مختلف حکام کی جو مہریں ثبت ہیں، ان سب میں "مرید
شاہ سلیم" درج ہے۔ اس سے ان حکام کی سلطان سلیم سے وفاداری اور
ماتحتی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ حکام اسی نے مقرر کیے تھے۔
اس فرمان کے اجراء سے دور دراز مقامات پر سلطان سلیم کے تصرف کا بھی
پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کہاں تک کا علاقہ اس کے زیر نگیں تھا۔

سلطان سلیم کے جو فرامین دستیاب ہوئے ہیں ان کی کم یابی اور نشر و
اشاعت نہ ہونے سے اکثر مورخین کو بھی غلط فہمی ہو گئی۔ فرامین سلاطین
[illegible] مرحوم مولوی بشیر الدین مرحوم کے مطابق [illegible]
سلیم کا ایک فرمان دستیاب ہوا مگر [illegible] سلیم شاہ
سوری کا فرمان قرار دیا ہے۔ فرامین سلاطین [illegible] سلطان سلیم
شاہ کے فرمان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی بشیر الدین مرحوم لکھتے ہیں:

"اس بادشاہ کو اسلام شاہ بھی کہتے ہیں [illegible] تک
حکمراں رہا۔" اسی کتاب کے صفحہ [illegible] پر فرمان کی نقل درج ہے جس کے ابتدائی
جملے یہ ہیں:

"دریں وقت فرمان عالیشان واجب الاطاعت والاذعان
از مکمن لطف (و احسان) شرف صدور یافت کہ......."

خاتمہ پر تاریخ درج ہے:

"تحریر فی التاریخ ۲ امرداد الٰہی سنہ ۴۹"

مذکورہ بالا فرمان کی عبارتیں صرف چند الفاظ مختلف ہیں جو معانی دار
اور زمین کی جائے وقوع وغیرہ سے متعلق ہیں۔ ورنہ دیگر تفصیلات میں قطعاً فرق
نہیں ہے۔ "الٰہی" سن تو اکبر کی ایجاد تھی۔ پھر سال جلوس صاف صاف
لکھا ہوا ہے جو اکبر کے عہدِ حکومت کا سال ہے۔

سلطان سلیم کا تخت

سلطان سلیم کی بغاوت کے زمانے کا سنگ موسیٰ کا سیاہ
تخت آگرہ کے قلعہ میں دیوان خاص کے صحن میں دریا کی طرف
دیوار سے لگا ہوا رکھا ہے جو بیچ سے ٹوٹ بھی گیا ہے۔ اس کا
تذکرہ جہانگیر نے اپنی تزک میں ان الفاظ میں ۵ ۲ ویں سال جلوس
کے واقعات میں کیا ہے:

"اور دولت خاں جو تخت سنگ سیاہ کو لانے کے واسطے
الہ آباد کو گیا تھا چار شنبہ چوتھی تاریخ کو اس کو ہمراہ لا کر باریاب
ملازمت کا ہوا اور تخت کو کمال حفاظت سے لایا۔ عجیب عمدہ
تخت ہے کہ نہایت سیاہ ہے چمکتا ہے۔ اکثر لوگ کسوٹی کا
کہتے ہیں۔ طول چار گز کم چار گز ہے اور عرض دو گز ڈیڑھ طسوج
حجم تین طسوج کا۔ میں نے اس کے کناروں پر سنگ تراشوں سے
عمدہ اشعار کھدوائے اور پائے بھی اسی طرح کے پتھر سے بنوا کر

[illegible]

[illegible]

تخت کی لمبائی ۶ فٹ ۶ انچ، چوڑائی ۹ فٹ ۱۰ انچ اور موٹائی ۶ انچ ہے۔ اس کی موٹائی میں چاروں طرف نہایت خوشخط نستعلیق میں ذیل کے اشعار کندہ ہیں:

"بادشاہے کہ تیغ او سازد — چون دو پیکر سر عدو بدو نیم
پادشاہی سخنگاہ فرخندہ — تکیہ گاہ خدایگان کریم
ملک خسروان پاے ملک — مہر و مہ را عیار بزر و سیم
سند با صفا ز نور و ضیاء — گوہرے بہا چو دُرّ یتیم
پیش تاریخ او بفکر شدم — ہدیہ ہتم از خداے حکیم
تا فلک تخت گاہ خورشید است — گفت مانا سریر شاہ سلیم
سریر حضرت سلطان سلیم اکبر شاہ — ہمیشہ باد منور بنور مہر الٰہ"

تخت کے پایوں پر کافی چھوٹے حروف میں ذیل کی عبارت اور اشعار کندہ ہیں:

"چون شاہ سلیم وارث تاج و تخت — بر تخت نشست بست مکیسی آئین
شد سہم مبارکش چو ذات — در نور خدا لت نقش جلال الدین
سہم سامی پیش از جلوس شاہ سلیم — و بعد از آن نور الدین جہانگیر بادشاہ غازی
بلند مرتبہ باد از فلک بحکم الٰہ
سریر شاہ جہانگیر ابن اکبر شاہ"

مذکورہ بالا دونوں کتبے اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ الگ الگ وقتوں میں تیار کیے گئے تھے۔ تخت کے چاروں طرف جو اشعار کندہ ہیں اس میں "سلطان سلیم شاہ" کا نام آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الٰہ آباد ہی میں کندہ کرائے گئے تھے۔[1]

تخت کے پایوں کی عبارت چھوٹے حروف میں نقش ہے اور اس میں جہانگیر کا نام بار بار آیا ہے اور یہ صراحت بھی ہے کہ جلوس سے قبل "سلطان سلیم" نام تھا۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ یہ تخت بغاوت کے زمانہ ہی میں تیار ہوا تھا۔ اس کے اشعار میں تین مقامات پر "سلیم" کا نام بحیثیت ایک بادشاہ کے آیا ہے۔ یعنی

"سریر حضرت سلطان سلیم اکبر شاہ" "سریر شاہ سلیم" اور "پادشاہ"

سلطان سلیم کے سکے

تخت نشینی کے ساتھ ساتھ سلطان سلیم نے فرمان اور سکے بھی جاری کیے تھے۔ اس عہد کا ایک سکہ اسٹیٹ میوزیم لکھنؤ میں موجود ہے۔ تخت اور فرمان پر "سلطان سلیم" کا ایک ہی جیسا نام درج کیا گیا ہے۔ لیکن سکے کا مطالعہ خاصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس پر بھی فرمان اور تخت والی مندرج عبارتیں موجود ہیں۔ سکے پر نقش ہے

"مالک الملک سکہ زد بر زر
شاہ سلطان سلیم اکبر شاہ" (ضرب الٰہ آباد)

"مالک الملک" فرمان کے سرنامے پر موجود ہے اور سکے کے ایک جانب یہی عبارت نقش ہے۔ "سلطان سلیم اکبر شاہ" اور "شاہ سلیم" تخت پر کندہ ہے اور سکے کے دوسری جانب "شاہ سلطان سلیم اکبر شاہ" کا نقش موجود ہے۔

سکے پر ضرب الٰہ آباد بھی درج ہے جس سے ظاہر ہے کہ الٰہ آباد کے ٹکسال میں سلطان سلیم کا کوئی خاص معتمد عملہ موجود تھا۔ جہاں سے ڈھلنے کے بعد یہ سکے جاری ہوئے ہوں گے۔ اس بات کا امکان ہے کہ متعدد سکے عہد بغاوت کے موجود ہوں اور حافظے کی تباہی پر تحقیق نہ کی جا سکی ہو۔

بہرحال تخت، فرمان اور سکے کی مماثلت اور موجودگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ سلطان سلیم نے عہد بغاوت میں باقاعدہ اور منظم حکمرانی کی تھی۔

★

[1] الٰہ آباد میں سلطان سلیم نے اشوک کی لاٹ پر ایک تحریر نقش کروائی ہے جس میں کاتب کا نام عبداللہ مشکیں رقم درج ہے۔ یہ خطاط عہد اکبری کا نامور کاتب تھا۔ مشکیں رقم کا خطاب اکبر نے دیا تھا۔ تخت اور لاٹ کے کتبوں کے خط میں مماثلت ہے۔ دونوں کا خط انتہائی پاکیزہ ہے۔ گمان غالب ہے کہ اسی کاتب نے تخت کے کتبوں کو بھی لکھا ہوگا۔

آزادی کے بعد

ہندستان میں کرکٹ

وجے مرچنٹ

اس مضمون میں ہندستانی کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان اور ممتاز کرکٹ کھلاڑی وجے مرچنٹ نے ۱۹۲۹ء سے لے کر اب تک ہندستان کے کھیلوں کا جائزہ لیا ہے اور ۶۲-۱۹۶۱ء سے ہندستانی کرکٹ کے بدلتے ہوئے معیار پر روشنی ڈالی ہے۔ قارئین نیا دور کی دلچسپی کے لیے یہ مضمون یہاں شائع کیا جارہا ہے۔ (ایڈیٹر)



دوسری جنگ عظیم کے دوران یعنی ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک ہندستان اور غیر ملکی کرکٹ ٹیموں کے دورے ایک دوسرے ملک میں نہیں ہوئے اور تمام ٹورنامنٹ اور میچ اندرون ملک ہی ہوئے۔ ان میں سے بعض حیرت انگیز تھے۔ مثال کے طور پر پینٹا گلر کرکٹ اور رنجی ٹرافی ٹورنامنٹ۔ ان میچوں اور ٹورنامنٹوں میں خاص کر بہتر بیٹنگ کا مظاہرہ کیا گیا۔ وجے ہزارے، روسی مودی اور راقم الحروف نے نہ صرف انفرادی طور پر بڑے بڑے اسکور کیے بلکہ انھوں نے ایسی استقامت کا مظاہرہ کیا جس کی مثال مستقبل میں سوائے سنیل گواسکر کے اور کوئی بھی پیش نہ کر سکا۔ ان کھیلوں نے ہماری بیٹنگ کی صلاحیتوں کے بارے میں بڑا غلط نقش چھوڑا۔ بڑے بڑے انفرادی اسکور ان وکٹوں پر کیے گئے جو سب کے سب بلے بازوں کے موافق تھے۔ اس لیے میں ان کھیلوں کا ذکر نہیں کروں گا جو صرف ریکارڈ قائم کرنے کے لیے ہیں۔

بہرکیف ایک ریکارڈ کا تذکرہ ضروری ہے اس لیے کہ یہ نہ صرف ایک نمایاں ریکارڈ ہے بلکہ ہندستانی کرکٹ میں نہایت ہی انوکھا بھی۔ روسی مودی نے ۴۵-۱۹۴۴ء کے رنجی ٹرافی میچوں میں ۱۰۰۸ رن بنائے تھے۔ ان میچوں میں ان کا اسکور ۱۶۰، ۲۱۰، ۲۴۵ (آؤٹ نہیں ہوئے) اور ۳۱ (آؤٹ نہیں ہوئے) ۱۱۳، ۹۸ اور ۱۵۱ اور ان رنوں کا اوسط ۲۰۱.۶۰ رہا تھا۔ اس زمانے میں تمام میچ ناک آؤٹ سسٹم (KNOCKOUT SYSTEM) سے ہوا کرتے تھے تو کھیلوں میں لیگ سسٹم پر میچ نہیں کھیلے جاتے تھے۔

جنگ عظیم کے فوراً بعد لنڈسے ہیسٹ (LINDSEY HASSET

کی کپتانی میں آسٹریلیا کی سروسز ٹیم ہندوستان آئی۔ اس میں دو ممتاز کرکٹ کھلاڑی، کیتھ ملر اور کیس میر شامل تھے۔ اول الذکر نے بعد میں بڑا نام پیدا کیا اور آخرالذکر ایک عظیم لیگ اسپن (سوء کے سوء) بالر ثابت ہوا۔ ملر ۳۰۰۰ سے زیادہ رن بنانے والا اور ۲۰۰ وکٹیں لینے والا بین اقوامی کرکٹ کھلاڑی تھا۔ لیکن ۱۹۵۶ء میں وہ قبل از وقت ریٹائر ہو گیا اور اس طرح کرکٹ کی دنیا میں سب سے زیادہ رن بنانے والے اور سب سے زیادہ وکٹ لینے والے کے انوکھے اعزاز سے محروم رہ گیا۔ آسٹریلیا واپس ہونے کے بعد پیر آسٹریلین کرکٹ تنظیم اور وہاں کے سلوک سے نہایت بددل ہو کر انگلستان ہجرت کر گیا جہاں وہ برسوں تک لیگ کرکٹ کھیلا اور شہرت حاصل کی۔

آسٹریلیا کی متذکرہ بالا سروسز ٹیم نے ہندوستان میں تین غیر سرکاری ٹسٹ میچ کھیلے۔ پہلے دونوں میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوئے۔ البتہ تیسرے میچ میں ہندوستانی ٹیم کو غیر متوقع کامیابی حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ممتاز کھیل کا مظاہرہ روسی مودی نے ڈبل سنچری بنا کر کیا، اور اسی میچ میں بنرجی اور سروٹے نے نہایت ہی عمدہ باؤلنگ کی۔

بعدازاں سنہ ۱۹۴۶ء میں ہماری ٹیم انگلستان گئی جہاں ہمارا پرجوش استقبال کیا گیا۔ جنگ سے تھک کر اور مختلف طرح کی پابندیوں سے تنگ آ کر انگریز تفریح کے خواہاں تھے جسے ہندوستانی ٹیم نے خاطر خواہ طریقے سے بہم پہنچایا یا الٹیم لوگوں کو انگلستان کے خلاف بہتر کھیل کو پیش کرنا چاہیے تھا اس لیے کہ انگریز کھلاڑی چھ سالہ جنگ کے نفسیاتی اثرات سے ابھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے تھے وہ ہمارے یہاں گرچہ تجا اور ممتاز کھلاڑی بھی موجود تھے مگر بدقسمتی سے ہم حیثیت ایک ٹیم کے کھیل نہیں سکے اور یہ ہندوستان کی زبردست کوتاہی رہی۔

ہم نے عظیم کرکٹ کھلاڑی پیدا کیے ہیں اور نہایت ہی شاندار انفرادی کھیل کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن ہم ایک ٹیم کی حیثیت سے اتحاد عمل، عزم صمیم اور جنگی اسپرٹ پیش کرنے سے قاصر رہے۔ اب کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہندوستانی کھلاڑیوں میں ہم آہنگی نہیں ہے لیکن ٹیم اسپرٹ اور دوستی دو مختلف چیزیں ہیں۔ ہم یا تو جلد مطمئن ہو جاتے ہیں اور یا پھر اپنی سہل پسندی کی وجہ سے ایک اچھا آغاز ہونے پر بھی اپنی پوزیشن مضبوط نہیں کر پاتے۔

بدقسمتی سے سنہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے دورۂ انگلستان کا آغاز کپتان کے انتخاب کے سلسلے میں سخت اختلافات سے ہوا۔ راقم الحروف سنہ ۱۹۳۷ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک غیر سرکاری ٹسٹ میچوں میں ہندوستانی ٹیم کی قیادت کرتا رہا۔ اچانک سنہ ۱۹۴۶ء میں بورڈ کے چند ارکان نے نواب پٹودی (مرحوم) کو کپتان کے فرائض انجام دینے کی دعوت دی۔ بلاشبہ پٹودی ایک عظیم کھلاڑی تھے مگر وہ جنگ کے دوران اول درجے کی کرکٹ سے غیر منسلک رہے۔ انھیں آخری لمحوں میں کپتان منتخب کر کے ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ چنانچہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ وہ اس دورے میں ناکام رہے اور وہ اپنے معیار کو قائم نہ رکھ سکے۔ وہ صرف ۱۰۹ رن بنا سکے اور رنوں کا اوسط ۱۷،۴۴ رہا جو توقع سے بہت کم تھا۔ علاوہ ازیں اس دورے میں وہ جسمانی طور پر بھی چست نہ رہ سکے۔

اس دورے میں مونکڈ پہلے ہندوستانی کھلاڑی تھے جنھوں نے ڈبل اسکور کیا انھوں نے ۱۱۲۰ رن بنائے اور ۱۲۹ وکٹ لیے یہ کارنامہ سرانجام دینے کے لیے کسی بھی کھلاڑی کو ایک عمر درکار ہوتی ہے۔

راقم الحروف نے کل ۲۳۸۵ رن بنائے جن میں سات سنچریاں شامل ہیں۔ رنوں کا اوسط ۶۸،۵۳ رہا۔ یہ اعداد و شمار ہندوستانی کرکٹ میں ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اب تک کوئی بھی اتنے رن نہیں بنا سکا ہے اور نہ کوئی سیکڑے (سنچری) کی اس تعداد تک پہنچ سکا ہے اور وہ بھی مرطوب موسم میں۔

ہندوستانی ٹیم اگرچہ ہار گئی مگر مجموعی طور پر یہ سفر کامیاب رہا کیونکہ ہمارے کھلاڑیوں نے عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا اور انگریز تماشائیوں کو کافی محظوظ کیا وہ لوگ ہمارا کھیل دیکھنے کے لیے کثیر تعداد میں آئے اور ہماری ٹیم کو ہر طرح کا تعاون دیا اور ہمت افزائی کی۔

مونکڈ اور راقم الحروف کی غیر معمولی کامیابی سے قطع نظر اس دورے کی مزید دو چیزیں توجہ کی مستحق ہیں۔ چند و سروٹے اور شوٹے بنرجی نے اوول میں سرے کے خلاف آخری وکٹ پر ۲۴۹ رن بنائے۔ اس طرح

یہ سب سے زیادہ رن بنانے والوں میں دوسرے نمبر پر رہنے والی جوڑی ثابت ہوئی۔

اس ریکارڈ کا سب سے عظیم پہلو یہ تھا کہ جب دونوں نے پارٹنرشپ میں کھیلنا شروع کیا تو اس وقت دونوں میں سے کسی نے ایک بھی رن نہیں بنایا تھا۔

دورہ انگلستان کے بعد ۴۸-۱۹۴۷ء میں ہندستان کی ٹیم لالہ امرناتھ کی سرکردگی میں آسٹریلیا گئی۔ جس ٹیم کا انتخاب ہوا تھا اس میں سے راقم الحروف (بحیثیت کپتان)، مشتاق علی اور روسی مودی خرابی صحت کے باعث نہیں جا سکے فضل محمود کو تقسیم ہند کی وجہ سے اپنا دورہ منسوخ کرنا پڑا۔ اس طرح ہم لوگوں کو بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ پانچ ٹسٹ میچوں میں ہم لوگ چار ٹسٹ میچ ہار گئے۔ مگر ایڈیلیڈ کے چوتھے ٹسٹ میچ میں ہزارے نے دونوں باری (اننگز) میں (۱۱۶ اور ۱۴۵) سنچریاں بنا کر وہ شاندار کارنامہ سرانجام دیا جس نے اس دورے میں ہمیں رسوائی سے بچا لیا۔ ان ٹسٹ میچوں میں منکڈ نے بھی دو سنچری بنائی۔ بریڈمین غضب کے فارم میں تھے اور انھوں نے ۳۹ برس کی عمر میں ۵، ۱۸۰ کے اوسط سے ۷۱۵ رن بنائے۔

دوسرے سال یعنی ۴۹-۱۹۴۸ء میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم ہندستان آئی۔ راقم الحروف کو کپتان مقرر کیا گیا۔ مگر میں پھر اپنی صحت کی خرابی کے باعث نہیں کھیل پایا۔ خود اپنی سرزمین پر بھی ہم لوگ اچھے کھیل کا مظاہرہ نہیں کر سکے اور وہ واحد ٹسٹ میچ بھی ہار گئے جس کا فیصلہ ہوا۔ باقی چاروں میچ برابر رہے تھے۔

آخری ٹسٹ میچ میں ہم لوگوں کو اپنی جیت یقینی نظر آنے لگی۔ دو وکٹ باقی رہ گئے تھے اور ہم لوگوں کو صرف چھ رن بنانے تھے۔ ہزارے اور مودی نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا اور ان دونوں نے ۶۷،۸۰ کے اوسط سے ۵۴۳ رن اور ۵۶ کے اوسط سے ۵۶۰ رن بنائے۔ سیریز میں سب سے شاندار کارنامہ ایورٹن ویکس نے انجام دیا۔ انھوں نے ۱۱۱،۲۸ کی اوسط سے ۷۷۹ رن بنائے۔ وہ یقیناً ایک شاندار کھلاڑی تھے اور بحیثیت گیند انداز ان کا کارنامہ آنے والے برسوں میں بھی لالا قومی گیند اندازوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔

پھر ۵۰-۱۹۴۹ء میں دولت مشترکہ کی ٹیم جاک لیونگ اسٹون کی سرکردگی میں ہندستان آئی۔ راقم الحروف بھی تین سال کے تعطل کے بعد اول درجے کے کرکٹ کے لیے واپس آ گیا۔

میں نے بورڈ سے درخواست کی کہ مجھے آئندہ کھیلوں کے لیے ہندستانی ٹیم کا کپتان مقرر نہ کیا جائے، کیونکہ میں اول درجے کے کرکٹ سے ۳۸ سال کی عمر میں ریٹائر ہو جانا چاہتا ہوں۔ اس کے باوجود بورڈ نے مجھے دولت مشترکہ کی ٹیم کے خلاف کھیلنے والی ہندستانی ٹیم کا کپتان منتخب کر لیا۔

ہندستان آنے والی دولت مشترکہ کی پہلی ٹیم کے خلاف ہم لوگوں نے بہت ہی عمدہ کھیل پیش کیا۔ تین میں سے دو میچ جیت کر ہم لوگوں نے ربر حاصل کر لیا۔ ہزارے نے غضب کی باؤلنگ کی اور ۲۱ وکٹ لیے انھوں نے ہر وکٹ پر اوسطاً ۲۳،۲۸ رن بنائے۔ پہلے میچ میں راقم الحروف زخمی ہو گیا۔ میری غیر موجودگی میں کپتان کے فرائض ہزارے نے انتہائی شاندار طور پر انجام دیے۔ میں پھر واپس آ گیا اور دوسرے میچ کی دو اننگز میں ۸۷ اور ۷۰ رن بنائے۔ میرے ہاتھ میں شدید چوٹ آئی اور میں آئندہ کھیلوں میں حصہ نہ لے سکا۔

دولت مشترکہ کی ٹیم کی طرف سے فرینک ووریل نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے ۷۱،۷۹ رن کی اوسط پر ۶۸۴ رن بنائے۔ جارج ٹرائب نے بھی بہت ہی عمدہ کھیل پیش کیا اور انھوں نے ۳۵،۵۸ رن کے اوسط پر ۲۴ وکٹ لیے۔

اس کے بعد دولت مشترکہ کی دوسری ٹیم مشہور انگریز بلے باز اور وکٹ کیپر لزلی ایمز کی سرکردگی میں ہندستان آئی۔ ہم لوگ یہ سیریز دو میچوں کے مقابلے میں صفر سے ہار گئے۔ ہزارے، امریگر اور راقم الحروف نے سخت جدوجہد کی۔ ہزارے نے ۹،۲۵ کی اوسط پر پھر ۶۳۴ رن بنائے دوسری طرف جان ایکن جیسے اسٹائلش بلے باز نے ۹،۲۸ کے اوسط پر ۶۲۳ رن بنائے۔ منکڈ ہماری ٹیم کا سب سے اچھے وکٹ لینے والے ثابت ہوئے۔ انھوں نے ۳۲،۳۴ پر ۲۲ وکٹ گرائے۔ ہندستان کو یہ سیریز جیت لینا چاہیے تھی مگر ہم لوگوں کا کھیل جو اگرچہ انفرادی طور پر بہت ہی اچھا رہا مگر معیار پر پورا نہ اتر سکا۔

ایک سال کے وقفے کے بعد ۵۲-۱۹۵۱ء میں انگلینڈ کی کرکٹ ٹیم ہندستان آئی۔ یہ ان کی بہترین ٹیم نہیں تھی اور مدراس میں اسے ایک اننگ اور ۸ رن سے ہرا کر ہندستان نے سرکاری ٹسٹ میچوں میں پہلی فتح حاصل کی تھی۔ بیٹنگ میں پنکج رائے اور باؤلنگ میں وینو منکڈ نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ منکڈ نے ۱۶،۷۹ کے اوسط پر ۳۴ وکٹ لیے۔ مدراس میں ۱۰۸ رن دے کر انھوں نے ۱۲ وکٹ لیے اس طرح اس جیت میں ان کا زبردست ہاتھ رہا۔ مہمان ٹیم کی طرف سے ڈانکنس اور ڈیوڈسن نے شاندار بیٹنگ کی اور ٹیٹرسل نے عمدہ باؤلنگ کا مظاہرہ کیا۔ دہلی کے پہلے ٹسٹ کی اپنی واحد اننگ میں راقم الحروف نے ۱۵۴ رن بنائے اس میچ کے دوران میرا شانہ زخمی ہو گیا اور میں اس سلسلے کے بقیہ میچوں میں حصہ نہ لے سکا۔ اس سیریز کے اختتام پر میں نے فرسٹ کلاس کرکٹ سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا۔

ہم نے ۱۹۵۲ء میں وجے ہزارے کی قیادت میں اپنی ٹیم انگلینڈ بھیجی۔ یہ دورہ نہایت مایوس کن ثابت ہوا۔ ہم تین ٹسٹ ہار گئے اور چوتھے ٹسٹ میں بارش کی وجہ سے ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہزارے اس بار پھر ہمارے اسٹار بلے باز تھے۔ لیکن ان کے اسٹینڈرڈ کے لحاظ سے ان کا یہ سیزن نہایت خراب رہا۔ تمام میچوں میں غلام احمد نے شاندار باؤلنگ کی اور ۸۰ وکٹ حاصل کیے۔ لارڈز کے دوسرے ٹسٹ میں منکڈ نے باؤلنگ اور بیٹنگ دونوں میں شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا اور دونوں اننگز میں بالترتیب ۷۲ اور ۱۸۴ رن بنائے۔ پہلی اننگ میں انھوں نے ۱۹۶ رن دے کر ۵ وکٹ لیے۔ ان کے شاندار کھیل سے انگریز کرکٹ عہدیداران اور تماشائی اتنا متاثر ہوئے کہ اس میچ کو "منکڈ کا میچ" قرار دے کر انھیں "عظیم منکڈ" کا نام دیا گیا۔

پھر ۱۹۵۲ء میں پاکستان ٹیم نے ہندستان کا پہلا سرکاری دورہ کیا۔ ہندستان نے دہلی کا ٹسٹ میچ جیتا۔ دوسرے ٹسٹ میں جو لکھنؤ میں ہوا ہندستان کو شکست ہوئی اور بمبئی کا تیسرا ٹسٹ جیت کر ہندستان نے ایک کے مقابلے میں دو سے سیریز جیت لی۔ اس ٹسٹ میچ کے بعد سے آج تک ہندستان اور پاکستان کے درمیان جتنے بھی ٹسٹ کھیلے گئے وہ سب برابر رہے۔ اور کسی میں ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

بیٹنگ میں کسی نے شاندار کھیل کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن فضل محمود نے ۲۵،۵۱ کے اوسط پر ۲۰ وکٹ اور وینو منکڈ نے ۲۰،۵۶ کے اوسط پر ۲۵ وکٹ لیے اس دورے سے لوگوں میں خاص ہماہمی پیدا ہوئی کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کھلاڑی جو ہندستان کی طرف سے پہلے کبھی ایک ساتھ کھیل چکے تھے اب دو ملکوں کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف کھیل رہے تھے۔ پاکستان کی قیادت عبدالحفیظ کاردار اور ہندستان کی لالہ امرناتھ نے کی۔

وجے ہزارے کی کپتانی میں ہماری ٹیم ۱۹۵۳ء میں ویسٹ انڈیز کے دورے پر گئی۔ ہم سیریز صفر کے مقابلے میں ایک میچ سے ہار گئے۔ یہی نہیں زیادہ تر میچ میزبان ٹیم کی موافقت میں ختم ہوئے امریگر اور آپٹے نے شاندار بیٹنگ کی اور بالترتیب ۵۶۰ (اوسط ۶۲،۲۲) اور ۴۶۰ (اوسط ۵۱،۱۱) رن بنائے۔ سبھاش گپتے ہمارے کامیاب ترین گیند انداز تھے۔ انھوں نے ۲۹،۴۲ کے اوسط پر ۲۷ وکٹ لیے اور ٹی ویکس ہمارے سب سے بڑے حریف ثابت ہوئے۔ انھوں نے ۱۰۲،۲۸ کے اوسط پر ۷۱۶ رن بنائے۔ ویلنٹائن نے سب سے زیادہ وکٹ لیے یعنی ۲۹،۵۰ رن فی وکٹ کے عوض ۲۸۔ ہماری بیٹنگ ٹھیک تھی لیکن کمزور گیند اندازی کی وجہ سے ہم نے بہت زیادہ رن دیے۔ ہماری فیلڈنگ بہر کیف بین اقوامی سیریز میں پہلی بار نہایت عمدہ تھی اور اس میں ہمارے ملک کا کافی نام ہوا۔

ہم نے ۵۴-۱۹۵۳ء میں سلور جوبلی اوورسیز کرکٹ ٹیم پر جو چند میچ کھیلنے کے لیے ہندستان آئی تھی فتح حاصل کی۔ یہ غیر سرکاری سیریز تھی جو ہم نے ایک کے مقابلے میں دو میچوں میں کامیابی حاصل کر کے جیت لی۔ دونوں میں سے کسی ٹیم کے کھلاڑی نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دیا سوائے سبھاش گپتے اور غلام احمد کے جنھوں نے بالترتیب ۲۰،۰۳ کے اوسط پر ۲۷ وکٹ اور ۱۴،۳۰ کے اوسط پر ۲۳ وکٹ لیے۔

اس کامیابی کے بعد ۱۹۵۴ء میں وینو منکڈ کی قیادت میں ہماری ٹیم پاکستان کے دورے پر گئی۔ یہ انتہائی غیر دلچسپ دورہ تھا۔ پانچوں ٹسٹ ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر ختم ہوئے کسی ٹیم نے بھی جیتنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ دونوں ٹیموں کی توجہ کسی طرح شکست سے بچنے پر تھی۔

نتیجے میں یہ دورہ انتہائی غیر دلچسپ رہا۔ کسی کھلاڑی نے اچھا کھیل نہیں دکھایا۔ بس گپتے نے ٦٦ء۲۲ کے اوسط پر ۲۱ اور پاکستان کے خان محمد نے ٥٦ء١٥ کے اوسط پر ۲۲ کھلاڑی آؤٹ کیے۔

کچھ عرصے کی خاموشی کے بعد ٥٦-١٩٥٥ء میں نیوزی لینڈ کی ٹیم ہندستان آئی۔ یہ ہمارے مقابلے کی ٹیم نہیں تھی اور ہم نے صفر کے مقابلے میں دو میچوں سے یہ سیریز جیت لی۔ منٹ کلف اور ریڈ نیوزی لینڈ کے کامیاب ترین بلے باز ثابت ہوئے۔ منٹ کلف نے ٢٠ء٨٠ کے اوسط پر ٦١١ رن اور ریڈ نے ٤٢ء٧٠ کے اوسط پر ٤٩٣ رن بنائے۔ ہندستان کی طرف سے منکڈ نے ٢٠ء١٠٥ کے اوسط پر ٥٢٦ رن بنائے جبکہ سبھاش گپتے اس سیریز کے واحد قابل ذکر گیند انداز تھے۔ انھوں نے ٦٠ء١٩ کے اوسط پر ٣٤ وکٹ لیے۔ وکٹ کے اعتبار سے ان تمام سیریز میں ہمارا کھیل نہایت عمدہ رہا۔ یہی وجہ تھی جو ہمارے کچھ بلے بازوں نے شان دار بیٹنگ کا مظاہرہ کیا۔ مثال کے طور پر منکڈ پہلے ہندستانی کھلاڑی تھے جنھیں ایک ہی سیریز میں دو بار ڈبل سنچری بنانے کا فخر حاصل ہوا۔ مجھے یاد نہیں کہ کسی اور کھلاڑی نے بھی یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔

انگلینڈ سے ١٩٥٦ء میں واپس ہوتے ہوئے آسٹریلیا کی ٹیم ہمارے یہاں ٹھہری اور اس سے تین ٹسٹ میچ ہوئے۔ پہلا میچ آسٹریلیا کی ٹیم آسانی سے جیت گئی۔ دوسرا میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوا۔ اور تیسرا میچ آسٹریلیا کی ٹیم صرف ٩٤ رنوں سے جیت پائی۔ آخری میچ میں ہمارے جیتنے کے امکانات تھے لیکن یہ موقعہ ہم نے کمزور بیٹنگ کی وجہ سے کھو دیا۔ درحقیقت دونوں اننگز میں ہماری بیٹنگ حد سے زیادہ خراب تھی۔ اس کے بعد ٥٧-١٩٥٦ء میں ہماری ٹیم سیلون کے دورے پر گئی۔ ہم لوگوں نے صرف تین میچ کھیلے۔ آخری میچ آل سیلون کے خلاف تھا۔ یہ میچ ڈرا پر ختم ہوا اور کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دیا جا سکا۔

ایک سال کے وقفے کے بعد ٥٩-١٩٥٨ء میں ویسٹ انڈیز کی نہایت ہی مضبوط ٹیم ہندستان آئی۔ اس نے تینوں ٹسٹ میچ جیتے اور غیر مفتوح رہی۔ گارفیلڈ سوبرس عظیم کھلاڑی تھے۔ انھوں نے ٥٥٠ رن بنائے اور ان کے رنوں کا اوسط ٩٢ء٨٣ رہا۔ ہماری طرف بورڈے صرف چار رن کی وجہ سے دونوں اننگ میں سنچری بنانے کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔

گیند اندازوں میں اُدھر ہال اور گلکرسٹ نے بالترتیب ۳۰ اور ۲٦ کھلاڑی آؤٹ کیے۔ اِدھر اس بار پھر سبھاش گپتے ہمارے کامیاب ترین گیند انداز تھے جنھوں نے ۲۲ وکٹ لیے۔ اس سیریز میں ہمیں سوبرس کی لاثانی بیٹنگ کا اندازہ ہوا۔ دیگر بلے بازوں نے بھی عمدہ بیٹنگ کی لیکن کوئی سوبرس کا مقابلہ نہ کر سکا۔

اسی سال ١٩٥٩ء میں ہمارا انگلینڈ کا دورہ انتہائی مایوس کن رہا۔ ڈی کے گائیکواڑ کو ہندستانی ٹیم کا کپتان چنا گیا۔ لیکن ان کے فارم کا یہ حال تھا کہ وہ فرسٹ الیون میں شریک ہونے کے بھی مستحق نہ تھے۔ پچھلے ١٦ ٹسٹ میچوں میں ہم نے آٹھ کپتان آزمائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف لوگوں کی قیادت میں ہندستانی ٹیم سُدھر نہ سکی۔ ہمیں یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہندستانی کرکٹ میں کپتان وہی شخص ہو جس کا انتخاب ٹیم کے لیے ناگزیر ضروری ہو اور جس میں کھلاڑیوں کو کنٹرول کی صلاحیت ہو۔

ہم پانچوں ٹسٹ میچ ہار گئے اور وہ بھی نہایت شرمناک طریقے سے۔ کسی ہندستانی کھلاڑی نے کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا سوائے عباس علی بیگ کے جنھوں نے اپنے پہلے ٹسٹ میچ میں ہی سنچری بنائی۔ عباس کے علاوہ امریگر نے بھی مانچسٹر کے ٹسٹ میں سنچری بنائی۔ انگلینڈ نے نہایت عمدہ بیٹنگ کی۔ فریڈ ٹرومین کے لیے یہ نہایت شان دار سیزن تھا۔ ٧٠ء١٦ کے اوسط پر ۲٤ وکٹ لیے۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ سیزن کے آغاز میں ہی دے سنچریکر کے گھٹنے میں چوٹ آ گئی جبکہ وہ شان دار بیٹنگ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انھوں نے ٥٧٦ رن بنائے اور ان کے رنوں کا اوسط ٦٣ء٩٨ تھا۔ امریگر دوسرے ہندستانی کھلاڑی ہیں۔ جنھوں نے ایک انگلش سیزن میں ۲۰۰۰ رن بنائے لیکن چوتھے ٹسٹ کے بعد زخمی ہو جانے کے بعد وہ بہت کم میچوں میں حصہ لے سکے۔ پہلا کھلاڑی راقم الحروف ہے جسے یہ اعزاز حاصل ہو چکا تھا۔ گپتے نے نہایت عمدہ گیند اندازی کی اور ١٠٠ وکٹوں میں صرف ٥ کی کمی رہ گئی۔ انھوں نے ٥٠ء۲١ کے اوسط پر ٩٥ وکٹ لیے۔

اگلے سال یعنی ٦٠-١٩٥٩ء میں آسٹریلیا کی ٹیم پھر ہندستان کے دورے پر آئی۔ یہ دورہ ذرا طویل تھا اور اس مرتبہ ہم نے پہلی دفعہ کانپور کے ٹسٹ میں انھیں شکست دی تاہم وہ ایک کے مقابلے میں دو

میچوں میں ۵ ہر جیت گئے۔ ہندستان کی یہ فتح دراصل جسو پٹیل کی شان دار گیند اندازی کی مرہون منت تھی۔ دوا ننگ میں ۱۲۴ رن دے کر ۱۴ وکٹ لیے۔ ان کی شان دار گیند اندازی کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے پہلی اننگ میں ½۳۶ اوور پھینکے۔ ان میں سے ۱۶ اوور میں سے کوئی رن نہیں بن سکا، باقی اوور میں انھوں نے صرف ۶۹ رن دیے اور ۹ وکٹ لیے۔ بلّے بازی میں اگرچہ کوئی قابل ذکر مظاہرہ نہیں ہوا لیکن آسٹریلیا کی ٹیم کے گیند انداز ڈیوڈسن اور بنو (Benaud) نے بالترتیب ۷ر۱۱۵ اور ۵۸ر۱۹۱ رن دے کر ۲۹ وکٹ حاصل کیے۔

پاکستان کی ٹیم ۶۱-۱۹۶۰ء میں آخری مرتبہ ہندستان کے دورے پر آئی۔ اس بار بھی پانچوں میچ ڈرا رہے۔ دونوں ٹیمیں شروع ہی سے جیتنے کے لیے نہیں بلکہ میچ کو ڈرا کرنے کے خیال سے کھیلتی رہیں۔ اسی طرح ۱۹۵۲ء کے بمبئی ٹسٹ کے بعد سے ہندستان اور پاکستان کی ٹیموں کے درمیان کوئی بھی ٹسٹ میچ ایسا نہیں تھا جو ہار جیت کے فیصلے پر ختم ہوا ہو۔ ہمارے کرکٹ پر یہ ایک بدنما دھبہ ہے کہ دو عمدہ کرکٹ ٹیمیں شکست کے خیال سے اس قدر خوف زدہ ہوں گویا ہمارا قومی وقار خطرے میں ہو۔ یہ امر افسوس ناک ہے کہ سیاسی اسباب کی بنا پر دونوں ملکوں کی ٹیمیں ایک دوسرے کے یہاں دورے نہیں کر سکیں۔ یہ دورے نہ صرف کھیلوں کے نقطۂ نظر سے بلکہ باہمی تعلقات کے اعتبار سے بھی دونوں ملکوں کے لیے بہت سودمند ثابت ہوتے۔ یہ بھی افسوس ناک امر ہے کہ ہندستان اور پاکستان کی طرح آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ نے بھی کھیل کے میدان میں ہم آہنگی کا ثبوت نہیں دیا اور گزشتہ کئی برسوں میں دونوں ملکوں کی ٹیموں نے صرف ایک سرکاری میچ کھیلا۔ حالانکہ قدرتی طور پر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اتنی قربت کی بنا پر ان دونوں کو اکثر و بیشتر میچ کھیلتے رہنا چاہیے تھا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کے ساتھ کھیلتے ہوئے ۸۲٫۵۰ کے اوسط پر ۳۳۰ رن بنا کر سب سے شان دار کارنامہ چندو بورڈے نے سر انجام دیا جب کہ راما کانت ڈیسائی نے ۲۶٫۹۱ رن پر ۲۹ وکٹ لیے۔ توقع ہے کہ دونوں ملکوں کی ٹیمیں جلدی پھر دو ملک کا دورہ کریں گی۔

ایم سی سی کی ٹیم نے ۶۲-۱۹۶۱ء میں ہندستان کا پھر ایک دورہ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہندستان کی ٹیم برطانیہ کے خلاف سیریز جیتنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس وقت ہندستان نے دو میچ جیتے تھے۔ ڈکسٹر (انگلینڈ کے کپتان) نے کرکٹ کے شائقین کو اپنی ٹیم کے حوصلہ مند کھیل سے بہت محظوظ کیا۔ بیرنگٹن نے ۵۹۴ رن بنائے اور ان کا اوسط ۹۹ رن تھا۔ ہماری طرف سے منجریکر نے ۵۸۶ رن بنائے اور ان کا اوسط ۸۳ رن تھا۔ گیند اندازوں میں ایلن اور لاک نے بالترتیب ۲۱ اور ۲۲ وکٹ لیے اور ہر وکٹ پر انھوں نے ۲۶٫۲۷ اور ۲۸٫۱۵ رن دیے جب کہ درانی نے ۲۳ وکٹ لیے اور فی وکٹ ۲۷٫۴۳ رن دیے۔ ہر ٹسٹ میچ میں تماشائیوں کا بے انتہا ہجوم ہوتا تھا۔ وہی دل چسپی لوگوں میں ابھی تک باقی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ٹیلی ویژن کے آنے سے عوام میں کیا تبدیلی ہوتی ہے۔

ہم نے ۱۹۶۲ء میں ویسٹ انڈیز میں پورے پانچ ٹسٹ میچ ہار کر ایک انتہائی ناکام دورہ کیا۔ وارل، کنہائی اور سوبرس نے شان دار بیٹنگ اور ہال، گبس اور سوبرس نے بہت موثر گیند اندازی کی۔ کسی بھی موقع پر ہماری ٹیم جیتنے کی پوزیشن میں نہیں ہوئی۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہماری ٹیم کے بیرونی ممالک کے دونوں دوروں میں ہماری ٹیم کو دس بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

ایم سی سی کی ایک اور ٹیم ۶۳-۱۹۶۲ء میں ہندستان آئی۔ اس کے کپتان مائک اسمتھ تھے۔ ہندستانی کرکٹ کی تاریخ میں یہ سیریز بے حد اکتا دینے والی اور بے لطف رہی۔ دونوں ٹیموں نے جیتنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور مائک اسمتھ ناکام کپتان ثابت ہوئے۔ اس دورے میں مہمان ٹیم کھلاڑیوں کے زخمی اور علیل ہونے کے باعث کمزور ہو گئی تھی۔ اس لیے کولن کاؤڈری کو جو ٹیم کے ساتھ نہیں آئے تھے برطانیہ سے بلایا گیا۔ کاؤڈری نے ان ٹسٹ میچوں میں دو بار سنچری بنائی اور ۱۰۳ کے اوسط سے ۳۰۹ رن بنائے۔ ٹٹمس نے بہت عمدہ گیند اندازی کی اور ۲۷٫۱۷ رن کے اوسط سے ۲۷ وکٹ لیے۔

ہماری ٹیم میں بدھی کندرن نے بے حد عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ کندرن کی شان دار کامیابی اس بات کی ایک مثال ہے کہ کرکٹ میں قسمت کیا کردار ادا کرتی ہے۔ فاروق انجینئر کی انگلی زخمی ہو جانے پر وہ کھیل نہیں سکتے تھے، اس لیے کندرن کو بالکل آخری وقت پر ٹیم میں

شامل کیا گیا۔ مدراس میں پہلے ٹسٹ ہی میں کندرن نے ۱۹۲ رن بنائے۔ پھر تو انھیں تمام پانچ ٹسٹ میچوں میں انھیں کھیلنے کا موقع ملا جبکہ فاروق انجنیر کسی میں بھی کھیل نہ سکے۔

اس وقت ہندستانی کرکٹ کا معیار بے حد گر گیا تھا۔ میچ ہارنے یا برابر کرنے کے علاوہ کوئی اور صورت ہی نہ تھی جیت تو دور کی بات تھی اور جیتنے کا امکان بہت کم تھا۔

آسٹریلیا کی ٹیم ۱۹۶۴ء میں وطن واپس جاتے ہوئے ہندستان آئی اور تین ٹسٹ میچ کھیلے گئے۔ ان میچوں میں پہلا میچ آسٹریلیا نے جیت لیا اور دوسرا میچ ہار گئی۔ تیسرا میچ برابر رہا۔ اس طرح پہلی بار آسٹریلیا اور ہندستان کے درمیان سیریز برابری پر ختم ہوئی۔

بمبئی میں دوسرا ٹسٹ میچ چندو بورڈے کی دلیرانہ بیٹنگ کی وجہ سے جیتا گیا۔ کسی بھی بلہ باز نے امتیاز حاصل نہیں کیا تاڈکرنی نے اوسطاً ۱۲٫۷۰ رن دے کر ۱۰ وکٹ لیے جو سب سے زیادہ تھے۔

سیلون کی ٹیم ۶۵-۱۹۶۴ء میں ہندستان کے دورہ پر آئی۔ اس نے دو غیر سرکاری ٹسٹ میچ ہارے اور احمد آباد میں کھیلا گیا آخری ٹسٹ میچ جیت لیا۔ سیلون کے باہمت کپتان نے پہلی اننگز ہندستان سے ۴۸ رن کم ہونے کے باوجود ڈکلیر کر دیا اور ہندستانی ٹیم کو دوسری اننگز میں صرف ۶۶ رن پر آؤٹ کرکے ۶ وکٹ سے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ سیلون کی ٹیم کی ہندستان پر یہی ایک جیت ہے۔ سیلون میں غیر معمولی کرکٹ کھلاڑی پیدا ہوئے ہیں مگر وہاں کبھی بھی ایک عمدہ کرکٹ ٹیم نہیں بن سکی ہے۔

نیوزی لینڈ نے ۱۹۶۵ء میں ہندستان کا دورہ کیا۔ ہم نے ایک ہی ٹسٹ میچ جیتا اور بقیہ تین میچ برابری پر ختم ہوئے۔ وینکٹ راگھون نے بہترین گیند اندازی کی اور اوسطاً ۱۹ رن دے کر ۱۲ وکٹ لیے اور دلیپ سردیسائی نے بمبئی میں اس وقت ڈبل سنچری بنائی جبکہ ہندستانی ٹیم کی حالت نازک تھی اور انھوں نے ہندستان کو یقینی ہار سے بچا لیا۔

ویسٹ انڈیز کی ٹیم ۶۷-۱۹۶۶ء میں دوبارہ ہندستان آئی اور ایک کے مقابلے میں دو میچ سے سیریز جیت گئی۔ پہلا ٹسٹ میچ بمبئی میں اور دوسرا کلکتہ میں جیتا تیسرا میچ برابر رہا۔ سوبرس بہترین بلہ باز ثابت ہوئے۔ اس سیریز میں فاروق انجنیر نے مدراس میں لنچ سے پہلے ہی ۹۴ رن بنا لیے تھے۔ اگر دلیپ سردیسائی نے انجنیر کو اور موقع دیا ہوتا تو مجھے یقین ہے وہ آسٹریلیا کے تین ممتاز کھلاڑی وکٹر ٹرمپر، چارلی میک آرٹنی اور ڈان بریڈمین کی صف میں شامل ہو جاتے جنھوں نے ٹسٹ میچ کے پہلے دن لنچ سے پہلے سنچری بنائی ہے۔ سردیسائی کے لیے رن کوئی چیز نہیں تھے۔ مگر فاروق انجنیر اگر ۶ رن اور بنا لیتے تو انھیں لافانی شہرت مل گئی ہوتی۔ چندرشیکھر اور گبس نے عمدہ گیند اندازی کی اور دونوں نے ۱۸ وکٹ حاصل کیے۔

اسی سال یعنی ۱۹۶۷ء میں ہم انگلینڈ کے دورے پر گئے۔ وہاں ہم تینوں ٹسٹ میچ ہار گئے۔ انگلینڈ کے دوروں پر کبھی بھی ہماری ٹیم بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہونے میں کامیاب نہیں ہوئی بلکہ انفرادی طور پر کھلاڑیوں نے اچھی کارکردگی دکھائی مگر مجموعی طور پر نہیں۔ ہندستانی ٹیم کی طرف سے صرف پٹودی نے سنچری بنائی اور چندرشیکھر نے تین ٹسٹ میچوں میں ۱۶ وکٹ حاصل کیے۔ برطانوی بلے بازوں نے ہماری اوسط درجے کی گیند اندازی کے مقابلے میں اچھے اسکور کیے۔

اگلے سال ۶۸-۱۹۶۷ء میں ہماری ٹیم پھر آسٹریلیا گئی اور چاروں ٹسٹ میچ ہار گئی۔ دوسرا ٹسٹ میچ جیتنے کا ایک شاندار موقع ہم نے غیر ذمے دارانہ بلے بازی کی وجہ سے کھو دیا۔ اس میچ میں ہماری ٹیم کو جیتنے کے لیے صرف ۸۵ رن درکار تھے جبکہ ہمارا اسکور ۵ وکٹ پر ۳۱۰ رن تھا اور ابھی ۶ کھلاڑی باقی تھے۔ مگر ہم نے بقیہ چھ وکٹ کھو کر میچ بھی کھو دیا۔ جے سمھا نے، جو دوسرے کرکٹ کھلاڑیوں کے زخمی ہو جانے پر آسٹریلیا پہنچے تھے، اس میچ میں شاندار بیٹنگ کی اور دونوں اننگز میں ۷۴ اور ۱۰۱ رن بنائے۔ پٹودی نے بھی بے حد عمدگی سے بیٹنگ کی اور رسی سرتی نے آل راؤنڈ کھیل کا اچھا مظاہرہ کیا۔ مگر امتیازی کھلاڑی پرسنا تھے جنھوں نے اوسطاً ۲۷٫۴۴ رن دے کر ۲۵ وکٹ لیے۔

آسٹریلیا سے ہماری ٹیم نیوزی لینڈ پہنچی جہاں ہم نے ۳۵ برسوں میں پہلی بار دوسرے ملک میں ٹسٹ میچ جیتا۔ نیوزی لینڈ کو ہم نے ایک کے مقابلے میں تین میچ سے ہرایا۔ حالانکہ نیوزی لینڈ کی ٹیم بین اقوامی کرکٹ

میں حصے بینچے تھی مگر ہماری کامیابیاں ہمارے لیے بے حد تسلی بخش تھیں۔ پھر ایک بار پرسنا ہمارے غیر معمولی کھلاڑی ثابت ہوئے۔ انھوں نے اوسطاً ۱۸،۱۷ رن دے کر ۲۴ وکٹ لیے۔ اس طرح پرسنا نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے دورے میں ۴۹ وکٹ حاصل کیے۔ یقیناً یہ ایک امتیازی کھیل کا مظاہرہ تھا۔

پھر نیوزی لینڈ کی ٹیم ہندستان آئی۔ ہماری ٹیم بمبئی میں پہلا ٹسٹ جیت گئی اور احمدآباد میں دوسرا ٹسٹ ہار گئی اور حیدرآباد میں بہ مشکل تیسرا ٹسٹ برابر کر سکی۔ بارش نے ہمیں ممکنہ شکست سے بچا لیا۔

تین مہینے بعد آسٹریلیا کی ایک ٹیم ہندستان آئی جس کے خلاف ہمارا کھیل اچھا رہا۔ تین کے مقابلے میں ایک جیت دونوں ٹیموں کے صلاحیت کا صحیح پتہ نہیں دیتی۔ ہماری ٹیم نے دلی کے ٹسٹ میچ میں نمایاں طور پر کامیابی حاصل کی۔ مدراس کے ٹسٹ میچ میں ہم ہی کو جیتنا چاہیے تھا جب کہ آسٹریلیا کی ٹیم دوسری اننگز میں ۶ وکٹ پر صرف ۲۴ رن بنا سکی تھی۔ مگر ہم نے کھیل پر اپنی گرفت کو کھو دیا اور آخر کار بری طرح میچ ہار گئے۔ اس سیریز کے دوران پرسنا نے ایک بار پھر عمدہ گیند اندازی کی اور اوسطاً ۸۴،۱۸ رن دے کر ۲۶ وکٹ لیے۔ آسٹریلیا کے آف اسپن گیند انداز میلٹ ایک قدم آگے تھے۔ انھوں نے اوسطاً ۱۹،۱۰ رن دے کر ۲۸ وکٹ حاصل کیے۔ وشواناتھ نے اپنے پہلے ٹسٹ میچ میں ایک سنچری بنا کر اپنی غیر معمولی صلاحیت کی نشان دہی کی۔

اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں ہماری ٹیم نے ویسٹ انڈیز اور انگلینڈ کا دورہ کیا۔ پٹودی کی آٹھ سالہ کپتانی کے بعد اجیت واڈیکر کو کپتان بنایا گیا۔ واڈیکر نے ہندستانی ٹیم کی قسمت ہی بدل ڈالی اور ویسٹ انڈیز اور انگلینڈ میں "ربر" جیت گئے۔ یہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے واڈیکر نے اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کو بہترین کھیل کا مظاہرہ کرنے کے لیے اکسایا اور ہندستانی کرکٹ کی تاریخ میں پہلی بار ہماری ٹیم نے ایک اول درجے کی اور منظم ٹیم بن کر اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ کئی بار انھیں رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑا مگر ہمیشہ ان آزمائشوں سے وہ سرخرو ہو کر نکلے اور اپنی لیرآ کوششوں سے ویسٹ انڈیز میں بھی "ربر" جیت لیا۔

سنیل گاوسکر نے غیر معمولی عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا اور ۱۵۴.۸۰ رن کے اوسط سے ۷۷۴ رن بنا کر ہندستانی بلے بازوں کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ ادھر دلیپ سردیسائی نے اپنی حوصلہ مند بلے بازی سے ہندستانی بلے بازی کا احیا کیا۔ انھوں نے ۸۰،۲۵ رن کے اوسط سے ۶۴۲ رن بنائے۔ وینکٹ راگھون نے اگرچہ ۲۲ وکٹ لیے تھے مگر انھیں گاوسکر اور سردیسائی کے شان دار کھیل کے باعث کچھ اہمیت نہیں مل پائی۔ ہماری ٹیم کی فیلڈنگ بھی بہترین رہی۔

ویسٹ انڈیز میں اپنی کارکردگی کو ہم نے انگلینڈ میں دہرایا جہاں ہم نے پہلی بار ایک ٹسٹ میچ اور "ربر" جیتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم خوش قسمت تھے مگر مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ ایسی سیریز جس میں بارش نے مداخلت نہیں کی تھی، ہماری ٹیم بہتر ٹیم ثابت ہوئی اور ہماری جو جیت ہوئی اس کے ہم مستحق تھے۔ امپائر کے کچھ اہم فیصلے ہمارے خلاف تھے مگر ہمارے کھلاڑیوں نے ناامید ہونے کی بجائے حوصلہ مندی سے کھیلا۔

یہ سال بھارتی کرکٹ کے لیے نمایاں کامیابی کا سال بن کر آیا۔ اسی طرح ۱۹۷۱ء کو ہندستانی کرکٹ کھلاڑیوں کو دو مسلسل دوروں میں ان کی شان دار کارکردگی کے لیے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

انتخاب کرنے والوں کی یہ پالیسی کہ نوعمر کرکٹ کھلاڑیوں کو موقع دیا جائے بے حد کامیاب رہی ہے اور میری بہ خلوص امید ہے کہ اسی پالیسی پر آئندہ بھی عمل کیا جائے گا۔ ہم کو چاہیے کہ ہم تجربہ کار کھلاڑیوں کی بجائے نوجوانوں پر اعتماد کریں۔ مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر ہم اپنے نوجوان کھلاڑیوں کے ساتھ صبر و تحمل کے ساتھ کام لیں تو اس کے شان دار نتائج نکل سکتے ہیں۔

ہم ۱۹۷۱ء میں جس طرح کامیاب رہے ہیں اس کو انگلینڈ کے خلاف نہ صرف اب بلکہ آئندہ برسوں میں بھی دہرایا جا سکتا ہے۔ ہمارے کرکٹ کھلاڑی صرف یہ چاہتے ہیں کہ انھیں مسلسل ہمت افزائی اور مدد دی جائے، نئے باصلاحیت کھلاڑیوں کو موقع ملے اور تجربہ کار کہنہ مشق کھلاڑی خوش اسلوبی سے "ریٹائر ہو کر نئے" اور نوجوان کھلاڑیوں کو جگہ دیں۔ ہم کو چاہیے کہ نوجوانوں پر بھروسہ کریں اور مجھے یقین ہے کہ نوجوان ہمیں مایوس نہیں کریں گے۔

★



ندرت کے ادیب

ایم۔ اے حنان

"ایڈیٹر کے آداب اور معذرت کے ساتھ"۔ یہ وہ قابلِ مطالعہ الفاظ ہیں جو ہمارے ناقابلِ مطالعہ مضامین کے سلسلے میں ملک بھر کے تمام رسائل و جرائد اور اخبارات کے ایڈیٹروں کی جانب سے صبح، دوپہر یا شام کی ڈاک سے موصول ہوتے رہے ہیں اور اس بات کا کامل یقین ہے کہ ہمیں اس قسم کی تحریریں اس وقت تک موصول ہوتی رہیں گی جب تک ہمارے اس تین روپے پچاس پیسے والی قلم میں جان باقی رہے گی یا جب تک ہمارا سرِ قلم نہ ہو جائے گا۔ یا پھر ہمارے دل اور دماغ کو تنِ عزیز سے جدا نہیں کر دیا جائے گا جو اس قسم کی ناقابلِ قبول نگارشات کو صفحۂ قرطاس سے چھپے پیسے تاؤ کے صفحہ پر لانے کے ذمہ دار ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ہم کو اس جائز حق سے محروم نہیں رکھ سکتی۔ کیونکہ بقول فیض ؎

"متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے"
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

ذرا آپ ہی انصاف کیجئے اور صدقِ دل سے کہیے کہ یہ کہاں کی شرافت ہے کہ حضرات ہماری تخلیقات 'رسائی' سے قبل ہی ایک زرِ کثیر خرچ کر کے چھپوا کر تیار رکھی گئی اظہارِ معذرت کی پرچیاں منسلک کر کے لوٹاتے چلے جائیں، اس احساس سے قطعی بے نیاز کہ کس عرق ریزی اور دماغ پاشی کے بعد یہ چند سطریں معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ اور اس وقت تو صورتِ حال انتہائی سنگین ہو جاتی ہے جب ایک ایسے ادیب کی تخلیقات کو مسترد کر دیا جائے جو نہ صرف ادب سے "ایم اے" ہے بلکہ جس نے کافی سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر یہ قدم کیا ہے، جسے نہ صرف زبان پر عبور حاصل ہے بلکہ وہ اپنے اجداد کے سارے ادبی سرمایہ پر جارحانہ قبضہ بھی کر چکا ہے جس نے وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدہ کی شرط پوری کرنے کیلئے نہ صرف اپنے پیشروؤں اور ہمعصروں کے دیوانوں کو کھنگال ڈالا ہے۔ بلکہ دوسرے بے شمار ادیبوں کے لاتعداد ناولوں اور کتابوں سے "تحت بالخیر" کے دیدار کا شرف حاصل کر چکا ہے جسے نہ صرف مغربی ادب سے آگہی حاصل ہے بلکہ وہ مشرقی، مغربی، شمالی، جنوبی ادب سے فراغت پانے اور شہر کے سارے کتب خانوں میں اپنے نقشِ قدم چھوڑنے کے بعد ادبی دنیا میں قدم رکھا ہے ۔۔۔ وہ بھی نئے پیمائشی آلات کے مطابق کافی ناپ تول کر اور پھونک پھونک کر۔

اس طرح صرف نظم اور نثر کے انتخاب میں ہم نے عمرِ عزیز کے کئی قیمتی سال گنوا ڈالے پھر بھی اردو ادب کے مقناطیس کے پولس کی طرح یکساں کشش رکھنے والے اصناف میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کر سکے اور کرتے بھی کیسے؟ نثر کا انتخاب کرتے تو نظم کی ہمہ گیر مقبولیت، نغمگی اور دلکشی دامنِ دل کو چھوڑنے نہیں چھوڑتی تھی۔ نثر کو بھلا کر نظم کا انتخاب کرتے تو نثر کی اہمیت اور انفرادیت راستہ روکے کھڑی ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ "عظیم ناولسٹ" بننے سے محروم رہ جاتے، اور ساتھ ہی فصاحت اور بلاغت کے دریا بہانے کی تمنا تشنہ رہ جاتی۔

جب ہماری عقل و فہم کسی ایک نتیجے پر پہنچنے میں سخت ناکام رہی تب ہم نے قرعہ اندازی کے ذریعہ (جو آج کا دھرم اور ایمان ہے) اس سرکش مسئلے پر قابو پانے کا فیصلہ کیا اور نظم و نثر وغیرہ کی چٹھیاں لکھ کر ایک معصوم کے ہاتھوں قرعہ نکلوایا۔ نثر کے حق میں فیصلہ ہوا اور نثر نگاری ہمارا مقدر بن گئی۔ چنانچہ قدرت کے فیصلے کے عین مطابق ہم نے نثر نگاری کے ذریعہ اپنی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز کر دیا۔ اور ایک بار پھر اپنی انصاف پسندی اور رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے ہم نے بہ اعتبار حروفِ تہجی اندرونِ ملک کے تمام رسائل و جرائد کو کافی اہتمام کے ساتھ اپنی تخلیقات کو بغرضِ اشاعت روانہ کرنا شروع کر دیا اور انھوں

...ان کو ... اشاعت ... اچھا ... ختم کر دیا۔

پہلا ... بھی کے اعتبار سے پہلے رسالہ کی جانب سے مسترد شدہ مضمون کی واپسی سے قطعی دل برداشتہ نہ ہوتے ہوئے اور اس ناکامی کو ایڈیٹر صاحب کی عدم توجہی اور تساہل قرار دے کر ایک اور رسالہ کو ہم نے اپنا دوسرا شہ پارہ بھیجا جو بہت جلد صحیح و سلامت واپس آ گیا۔

ہم چونکہ ادبی دنیا میں نو وارد تھے جان پہچان کسی سے نہ تھی، اس لیے یہ سوچ کر کہ ہماری علمی و ادبی صلاحیت اور بے پناہ قابلیت ان پر آشکار نہیں ہوئی ہے اس حوصلہ شکن تجربہ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہم نے اپنی تیسری تخلیق ایک دوسرے درجے کے میگزین کو روانہ کی۔ یہ "بیرنگ" خط کی طرح پھر ہم تک واپس آ گئی۔ وہی ایڈیٹر کے آداب اور معذرت کی سلپ کے ساتھ۔ لیکن پھر بھی ہم نے ہمت نہ ہاری اور اپنی کوششیں پورے زور و شور سے جاری رکھیں یعنی اپنے رشحات قلم کو کسی نہ کسی کے سپرد کرتے چلے گئے جسکو وہ پھر ہمارے سپرد کر کے اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔

پہلے پہل تو ہماری تخلیقات کی روانگی اور آمد کا وقفہ مہینہ دو مہینے کا ہوا کرتا تھا۔ اور ایک مضمون کی واپسی تک دوسری تخلیق پرواز کے لیے پر تولتی رہتی تھی۔ لیکن اس کے بعد تدریجاً وقفہ تیزی سے گھٹنے لگا۔ دو مہینے کی جگہ ایک مہینے نے لی، ایک مہینہ پندرہ روز میں اور پندرہ روز ہفتہ عشرہ میں بدل گئے اور اب تو اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والا معاملہ ہو گیا ہے۔ اُدھر بھیجا کہ اِدھر واپس آ گیا۔ اس کے بعد تو صورت حال اتنی بگڑ گئی کہ ایڈیٹر صاحبان اور ان کے ماتحتین کو ہمارا پتہ اس قدر یاد ہو گیا ہے کہ دوسروں کے مسترد شدہ تخلیقات اور غیر معیاری مضامین بھی دھڑا دھڑ ہمارے ہی پتہ پر بھیجے جانے لگے ہیں۔

اس نئی مصیبت سے سخت ہراساں اور بدحواس ہو کر جب ہم نے چند ادب نواز دوستوں سے راہ و رسم بڑھائی تو یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ مضمون لکھنے سے قطع نظر مضمون بھیجنے کے بھی چند مخصوص آداب اور خاص طریقے ہیں اور ان اصولوں سے ناواقفیت اور عدم واقفیت ہی ایسے دل شکن واقعات عملاً کو جنم دیتی ہے۔ چنانچہ یہ انکشاف ہماری رہبری کا وسیلہ بنا کہ آئندہ سے ہم مضمون تحریر کرنے کے لیے بالکل سفید لیکن ذرا چکنے کاغذ کا انتخاب کریں۔ مناسب حاشیہ چھوڑ کر حاشیہ آرائی کریں اور حتی الامکان خوشخط لکھنے کی کوشش کریں وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے اگلی بار ان ہدایات پر من و عن عمل کیا۔ لیکن نتیجہ صفر رہا اور پچھلے واقعات کی یاد تازہ کر گیا۔

ایک دوسرے قلمکار جو ایک غزل اور ایک نظم کے خالق تھے انہوں نے فرمایا کہ یوں سیدھے سادے مضامین بھیجنے سے کام نہ چلے گا۔ ان ایڈیٹر حضرات کو مرعوب کرنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ انھوں نے جلد از جلد "نیم پیڈ" (NAME PAD) کے استعمال کا مشورہ دیا۔ اور اب ہم نے اپنے مضامین کے ساتھ "نیم پیڈ" پر خطوط تحریر کرنے کا لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ لیکن سارے "نیم پیڈ" جو کبھی ہماری میز کی زینت تھے ایک ایک کر کے ایڈیٹر حضرات کی نذر ہو گئے پھر بھی کسی کی نظر عنایت نہ ہوئی۔

ایک کرم فرما نے ڈگری رکھتے ہوئے اسے نام کے ساتھ شامل نہ کرنے کو ہماری نادانی اور ناتجربہ کاری پر محمول کیا اور کہا کہ یہ ان ایڈیٹر صاحبان کو زیر کرنے کا انتہائی موثر حربہ ہے۔ وہ ڈگری کے استعمال سے مرعوب ہوتے ہیں کیونکہ خود ان کے پاس کوئی ڈگری وگری نہیں ہوتی اور تخلیقات کی اشاعت یقینی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس عظیم غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے ہم نے بھی اپنے نام کے آگے نہ صرف لفظ "ایم اے" کا اضافہ کر دیا بلکہ اوّل سے ایم اے تک درجہ بدرجہ اچھی طرح بٹھا دیا۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ انھوں نے بھی ہمارے نام کے آگے لفظ "ایم اے" کا اضافہ کر کے ہمارے مضمون کو سپرد ڈاک کر دیا تھا پھر بھلا اب شک لگا اور ... الفاظ ہم تک ... دیا۔

اسی اثنا میں ہمارے ایک مخلص کی زبانی معلوم ہوا کہ اگر ہم کسی رسالہ کے خریدار بن جائیں اور مضامین کے ساتھ خریداری نمبر کا حوالہ دیں تو پھر ہمارا مضمون فہرست اشاعت میں سب سے پہلے نمبر پر ہوگا۔ اس سربستہ راز کے انکشاف پر ہم نے ان کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے ان پرچوں کی خریداری نہ صرف سال دو سال کے لیے بلکہ تاحیات قبول کر لی۔ یہی نہیں کسی نہ کسی طرح منت سماجت کر کے سارے محلے والوں کے نام رسالے جاری کروا دیے لیکن یہ ایڈیٹر صاحبان تو بڑے ہی "نمبری" نکلے۔ انھوں نے اتنے قلیل عرصے میں ڈھیر سارے خریدار فراہم کرنے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ہمارا شکریہ ادا کیا اور اس جذبہ کا پرجوش خیر مقدم کرتے ہوئے ہمارے نام دو سال کے لیے رسالہ مفت جاری کر دیا۔ لیکن مضمون نہیں چھاپا۔

ایک ہمدرد نے جب ہماری حالت زار نہ دیکھی گئی تو انھوں نے ایک

انتہائی اہم علامتیں ہوں تو فوراً کسی خاتون کے نام سے لکھنا شروع کیجیے کیونکہ صنفِ نازک مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ جو ہم نے ادبی مسودہ بھیجا اور کہا کہ اگر آپ ناکامی کا منہ نہ دیکھنا چاہتے ہوں تو فوراً کسی خاتون کے نام سے لکھنا شروع کیجیے کیونکہ صنفِ نازک مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ جو ہاتھ نہ صرف زیر کر سکتی ہے بلکہ زیر و زبر کر سکتی ہے۔ ہمارے مخلص خود بھی یہی کرتے ہیں اور آج کی کامیاب "ادیبہ" ہیں۔ چنانچہ ہم نے بھی ان کے ایک ایک حرف پر ایمان لاتے ہوئے بلا سوچے سمجھے نسوانی نام سے لکھنا شروع کر دیا اور جب تیر نشانے پر لگ گیا تو ان حضرت کی صلاحیتوں کا قائل ہو جانا پڑا۔ چنانچہ پہلی مرتبہ جہاں سے ہم کو نفی میں جواب موصول ہوا تھا اب کی بار انھوں نے اپنے دستِ مبارک کو زحمت دی تھی۔ مضمون کی پسندیدگی اور کسی قریبی اشاعت کی زینت بن جانے سے مطلع کیا تھا۔ یہ خبر پا کر ہم خوشی سے پھولے نہیں سما سکے کہ دوسری ڈاک نے تمام خوشیوں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا ——— واقعہ یہ تھا کہ ایڈیٹر صاحب نے ہم "ادیبہ" سے اپنی تازہ ترین تصویر بھیجنے کی فرمائش کر دی تھی۔ ان مخلص صاحب ——— نے مشورہ تو بہت اچھا دیا تھا لیکن یہ نہیں بتلایا تھا کہ وہ مضمون کے ساتھ تصویر بھی شائع کرنا پسند فرمائیں تو ایسے میں ہمارا کیا ردِ عمل ہونا چاہیے۔ یوں تو ہم بڑی آسانی سے کسی مرحوم خاتون کی نوجوانی کی تصویر خدمتِ عالیہ میں روانہ کر سکتے تھے لیکن نامہ خلوص کے والہانہ پن اور اندازِ تخاطب سے یہ شبہ گزرتا تھا کہ کہیں دل نہ دے بیٹھے ہوں۔ لہٰذا ہم نے ان کے لیے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے والا جواب تجویز کیا۔ لکھ دیا کہ ہم پردہ نشین خاتون ہیں اس لیے تصویر بھیجنے سے قاصر ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے شوہر شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی واپسی اور رضامندی پر ہی تصویر بھیجنے یا نہ بھیجنے کا انحصار ہے۔ ان کی واپسی دو ایک مہینے میں ہوگی اس لیے مضمون بغیر تصویر ہی کے شائع کر دیا جائے تو بے حد مناسب ہے۔ یہ لکھ کر ہم نے ان کے جواب کا لاکھ لاکھ انتظار کیا، جوابی خط لکھے، ٹیلیگرام کیا ——— یہاں تک کہ ٹرنک کال پر ربط پیدا کرنا چاہا لیکن آج تک ہمارے مضمون اور ایڈیٹر صاحب دونوں کی اطلاع نہ ملی کی مسلسل خاموشی سے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کچھ کر نہ بیٹھے ہوں ——!

ان تمام بے ادبیوں کے مرتکب ہونے کے بعد اپنے آپ کو متوجہ کیا تو معلوم ہوا کہ ہم نے ایک اور گناہ کرنے کا قصد کر لیا ہے۔ وہ یہ کہ کبھی کسی کی زبانی سن رکھا تھا یا کسی مضمون ہی میں پڑھا تھا۔ وہ یہ کہ کسی علاقے کے جغرافیائی حدود میں رہنے والے لوگوں میں ایک خاص قسم کا انس یا لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ مشکل میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو "فضلی فضلی" بانٹ لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس نازک موقع پر ہم کو بھی جغرافیہ کے امتحان کی سوجھی۔ آئندہ سے ہم نے جس مقام سے نکلنے والے رسالہ کو اپنا مضمون ارسال کیا اس مقام کا نام اپنے نام میں شامل کر لیا۔ یعنی دہلی کو بھیجے جانے والے مضمون کے ساتھ ہم نے "دہلوی" لکھا۔ لکھنؤ کو بھیجے جانے والے مضمون کے ساتھ "لکھنوی" ہو گئے۔ حیدرآباد سے نکلنے والے رسالہ کو "حیدرآبادی" ہونا بتلایا اور مدراس سے نکلنے والے رسالہ کو "مدراسی"۔ لیکن جب اس کوشش میں ہندوستان کے سارے شہر اضلاع اور دیہات کام آ گئے اور ہمارے نام کے آگے بڑھانے کی کوئی گلی کوچہ نہ بچا تو بڑی خفت اٹھانا پڑی۔

آج کل ہم اپنے مضامین شائع نہ ہونے پر بے حد بدحواس اور پریشان ہیں۔ ہماری گھر والی اور گھر والے بھی ہمارے اس مضامین کے لکھنے لکھانے سے اتنے ہی فکر مند ہیں۔ انھوں نے یہ جواز پیش کر کے اس شوق سے باز رہنے کا مشورہ دیا ہے کہ یہ بڑے لوگوں کا کام ہے۔ اور صرف بڑے نام والوں اور مشہور لوگوں کے ہی مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اس لیے دوبارہ چھپنے چھپانے اور ادیب کہلانے کی کوشش ہمارے لیے خودکشی کے مترادف ہوگی جو ایک سنگین جرم بھی ہے۔ لیکن ہم اپنے فیصلہ پر اٹل اور بضد ہیں کہ اگر صرف مشہور لوگوں کے مضامین شائع ہوا کریں گے تو آخر ہم کب اور کیسے مشہور ہوں گے؟

ان حالات کے پیشِ نظر ہم نے اب بڑے ناموں ہی سے لکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور کسی عظیم شخصیت یا مشہور ہستی کے نام سے لکھنے والے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی آپ کی نظر سے کسی مشہور ادیب یا نامور شخصیت کی تخلیق گزرے تو سمجھ لیجیے کہ یہ ہمارے ہی زورِ قلم اور زورِ بیان کا نتیجہ ہے ——!

★

ہمارا وطن

* [illegible]

تصدق جان و دل جس پر یہ وہ پاکیزہ نعمت ہے
نرالی شان ہے اس کی یہ اس دنیا میں جنت ہے
وطن سے پیار ہے ہم کو وطن سے ہم کو الفت ہے

یہاں کشمیر، رانچی اور نینی تال کا گلشن
برستا ہے یہاں پر گیسوئے بنگال کا ساون
یہاں کا پاسباں دیکھو ہمالہ جیسا پربت ہے

یہاں بہتی ہے گنگا اور جمنا، راوی و جہلم
ہیں تیرتھ گاہ کاشی اور الہ آباد کا سنگم
ہمارے دیس میں بکھرا ہر اک سو حسن فطرت ہے

اودھ کی شام اور صبح بنارس مالوے کی شب
اجنتا، الورا اور تاج، شالیمار، قلعہ سب
یہ وہ شہکار ہیں جن سے وطن کی شان و شوکت ہے

یہ آزاد و جواہر لال اور گاندھی کی دھرتی ہے
یہی نیتا ہیں وہ جن پر کہ دنیا ناز کرتی ہے
وطن کی آج بھی ان کے سبب دنیا میں عزت ہے

وطن یہ سرمد و چشتی کا گوتم اور نانک کا
یہیں پر چاند بی بی لکشمی بائی ہوئیں پیدا
سراج و پرتھوی نے بھی بڑھائی اس کی عظمت ہے

یہاں پر سور تلسی اور رحیمن نے کہے دوہے
ترانے نذرل و اقبال اور ٹیگور کے گونجے
فضا میں میر اور غالب کے نغموں کی حلاوت ہے

کیا تو کھیت میں اپنے دل و جاں سے کر محنت
تبھی شاداب یا روزہ رہے گا گلشن بھارت
تمہاری جانفشانی کی ابھی اس کو ضرورت ہے

ہوا مغرور جو کبھی ہم نے سر اس کا جھکایا ہے
جو لٹنے کے لیے آیا اسے ہم نے ہرایا ہے
ہمارے نوجوانوں میں دلیری ہے شجاعت ہے

وطن ہے یہ ہمارا اس کی خاطر خوں بہا دیں گے
حمید و اصغر و عثمان کی صورت جاں لٹا دیں گے
سمجھتے ہیں کہ ہم پر فرض ہی اس کی حفاظت ہے

مبارکباد آزادی

ناظمہ بیگم انجم

گلوں میں یاسمن میں نسترن میں جان آئی ہے
چمن والو مبارک ہو چمن میں جان آئی ہے
خوشا ان کے قدم جن سے چمن میں جان آئی ہے
کرن موتی کی پھوٹی یا کرن میں جان آئی ہے
یہی کہتی ہوئی گنگ و جمن میں جان آئی ہے
شہیدانِ وطن اٹھو وطن میں جان آئی ہے
وطن کے سرفروشوں کیلیے دست دعا اٹھے
انھیں کے خون سے دار و رسن میں جان آئی ہے
شہیدِ راہ آزادی ہوئے جو ظلم کے ہاتھوں
انھیں کے عزم سے اہلِ وطن میں جان آئی ہے
وطن کا بچہ بچہ اب بھگت ہے اور ہے ٹیپو
ہماری زندگی کے بانکپن میں جان آئی ہے
مبارک ہو وطن والو مبارک ہو چمن والو
چمن تو ہے چمن ہر ایک بن میں جان آئی ہے
بچانا ہے وطن کو دشمنوں کی تند نظروں سے
بڑی مشکل سے ارباب وطن میں جان آئی ہے
رہے قسمت کہ آنجہم اندرا گاندھی کی کوشش سے
جواہر لال نہرو کے وطن میں جان آئی ہے
وطن کو ہم نے پایا ہے بڑی قربانیاں دے کر
ہمارے خون سے اس کے بدن میں جان آئی ہے

کلکتے میں غالب کا مکان

ـــــــ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹا چاریہ

کلکتے کو THE CITY OF PALACES یعنی عالی شان عمارتوں کا شہر کہا گیا ہے اور عہدِ غالب میں بھی یہاں کئی قابلِ دید عمارتیں تھیں۔ لیکن عام لوگوں کے لیے مکانات کی اس دور میں بھی کمی تھی۔ اکثر اردو داں حضرات کا خیال ہے کہ غالب کو کلکتہ میں ایک عالی شان مکان صرف دس روپے کرائے پر مل گیا، جس خیال کی بنیاد غالب کا ایک خط ہے جس میں انھوں نے کلکتہ والے مکان کو ہوادار اور اچھا قرار دیا ہے۔ اس بنا پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان دنوں کلکتہ میں مکانات کی قلت نہیں تھی اور نہایت کم کرائے پر بڑے بڑے مکانات آسانی سے مل جاتے تھے۔ یہ خیال جو سراسر غلط ہے محض اس وجہ سے ہے کہ اُن کے سامنے اُس عہد کے کلکتے کا واضح نقشہ نہیں ہے۔

غالب کے قیامِ کلکتہ کے دنوں کلکتے کی آبادی کیا تھی درست طور پر کہنا ممکن نہیں ہے چونکہ اُن دنوں مردم شماری نہیں کی جاتی تھی۔ ۱۸۳۱ء یعنی غالب کے کلکتے سے چلے جانے کے تقریباً سال بھر بعد کی مردم شماری کے مطابق کلکتے کی آبادی ۲۹، ۲۳۵، ۲ تھی۔ اس آبادی کے مقابلے میں کلکتے میں مکانات کی بڑی کمی تھی۔ اُن دنوں کلکتے میں دو منزلہ عمارتیں برائے نام ہی تھیں۔ متوسط طبقے کے لوگ کچے مکانات میں رہتے تھے اور اُن سے اوپری طبقے کے لوگ ایک منزلہ مکانات میں۔ گھر کو سجانے کے لائق اسبابِ آرائش کی بھی کمی تھی اور جو کچھ تھا وہ نہایت قیمتی تھا۔ اکثر انگلستان سے جو جہاز آتے، اُن کے کپتان یا پھر ملکِ چین سے آمد و رفت کرنے والوں سے آرائشی ساز و سامان نہایت اونچی قیمتیں ادا کر کے خریدے جاتے تھے۔ لہٰذا آرائشی سامان کا ہونا بھی ایک طرح کی عیاشی سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ [illegible] کا کوئی سامان ہوتا وہ اُس پر فخر کرتے یا اسے اپنی عزت، وقار و مرتبہ کا امتیازی نشان سمجھتے تھے۔ مکان کے دروازوں اور کھڑکیوں میں کہیں کانچ کا کام نہیں ہوتا تھا بلکہ کانچ کی جگہ بانس یا بید سے بنی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں کی جالیاں ہوتی تھیں۔ کانچ نہایت قیمتی شے تھی اور جن کے مکان میں کانچ کا کوئی کام ہوتا وہ رئیس کہلاتا۔ قدیم کلکتے کے مکانات کا ذکر پڑھنے پر ہم پاتے ہیں کہ لارڈ وارن ہیسٹنگس کے مکان کی کھڑکیوں میں کانچ لگے ہوئے تھے۔ رات میں گھروں کو چراغاں کرنے کے لیے آج کی طرح بجلی کے قمقمے ہونا تو دور کی بات ہے مٹی کے تیل کے برتن یا قندیل بھی نہیں تھے بلکہ عموماً انگریزوں یا رئیس ہندوستانیوں کے مکانات میں ناریل کے تیل سے چراغاں ہوتا یا پھر موم بتی (شمع) کا استعمال ہوتا تھا، جس کی لَو کو باہر کی تیز ہوا سے محفوظ رکھنے کے لیے لمبی چمنیاں ہوتی تھیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور اوائل انیسویں صدی میں ایک معمولی دو منزلہ مکان کا کرایہ اُس زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ رہا ہے جس سے قلتِ مکان کا مسئلہ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ دو منزلہ پر ایک ہال اور دو چھوٹے کمروں والا ایک معمولی مکان کا کرایہ ماہانہ ایک سو پچاس روپے عام طور پر ہوتا اور اگر ایسا کوئی مکان وائٹ ٹاؤن میں ہو، یعنی ڈلہوزی یا اسپلانڈ کے علاقے میں ہو تو اس کا کرایہ کم از کم تین، چار سو روپیہ ہوتا۔ وارن ہیسٹنگس کے عہدِ حکومت میں کلکتے میں مکانات کا کیا حال تھا اس کا کچھ اندازہ کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر انتھونی کی بیوی محترمہ فے نامی کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے انگلستان میں اپنے خاندان والوں کے نام لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:۔

"اب یہاں کی (کلکتہ) روزمرہ زندگی اور اپنے گھر کے اخراجات کا حال لکھتی ہوں تاکہ کچھ اندازہ ہو جائے۔ مکان کرایہ دو سو روپیہ ہے چونکہ ہمارا مکان شہر کے کسی مرکزی مقام یا درمیانِ شہر میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر تین سو، چار سو روپیہ کرایہ ادا کرنا پڑتا۔ ہاں ہم بہتر مکان کی تلاش کر رہے ہیں۔"

غالب سیر و تفریح کے لیے یا عیاشی کرنے کلکتہ نہیں آئے تھے۔

... حالات ... دنوں ... حضرات ... قرض خواہوں کے
... سے بچ کر کلکتہ آ گئے تھے۔ کلکتہ آنے کے بعد بھی انھوں
نے کئی لوگوں سے قرض لیا تھا۔ کلکتے میں ان کو مقدمے کی پیروی کرنا تھی اور
اس عہد میں مقدمے کی فیس بہت زیادہ تھی۔ پچاسوں انگریزوں کو
خوش کرنے اور رشوت دینے کے بعد ہی ان کی درخواست
پر غور کیا جا سکتا تھا۔ ان کاموں کے لیے غالب کو کافی روپیہ درکار تھا۔
کلکتہ میں ان کی غربت کا حال ان کے مختلف خطوط سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے،
مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں[1] "تنگ دستی کا حال یہ ہے کہ رمضان
آ گیا ہے اور توشہ ختم ہو گیا ہے ..... روپیے انعام، عملہ و خدام
سکریٹری و دیگر رزی میں صرف ہوئے، ہر چند کہ اس میں . . . . فراخ دستی و
کشادہ دلی نہ تھی۔ چار پانچ ماہ کی اقامت کے لیے اسی قدر کافی ہوگا
جو پہلے عنایت ہوا تھا۔ امید ہے کہ آپ یہ رقم روانہ فرمائیں گے" ۔ ایک
اور خط میں لکھتے ہیں[2] "حق یہ ہے کہ یہ روپیے نہ آتے تو سخت
مشکل کا سامنا ہوتا ..... گھوڑا ۱۰۰ میں بیچ دیا۔ ایک سائیس اور
ایک خدمت گار کو برطرف کر دیا اور تین خدمت گار اور ایک کہار
اس وقت میرے پاس ہے اور میں خود آدھا آدمی ہوں ..... فکر
تھی کہ جاڑا آ گیا، کمبل وغیرہ کی ضرورت ہے۔ آپ کی دستگیری نے اس اضطرار
سے رہائی دی۔ قیمت اسپ سامان برگ سرما کی فراہمی اور ربیع الثانی
کے چار مہینوں تک کام دے گی [illegible] سے زیادہ خرچ نہ کرنا طے کر لیا ہے۔"

مذکورہ خطوط سے ظاہر ہے کہ غالب کی مالی حالت زیادہ خراب تھی۔
ان کے پاس دولت کہاں کہ وہ کلکتہ کے مرکزی علاقے یعنی ڈلہوزی اسکوائر،
سیالدہ، دھرم تلہ یا چورنگی کے کسی علاقے میں کوئی اچھا مکان حاصل کرتے
لہٰذا انھوں نے مرکزی کلکتہ سے دور ہٹ کر ایک مزدوروں کی بستی میں
[illegible] باغ کے قریب مکان لیا جو ڈلہوزی اسکوائر یعنی کلکتہ کے
مرکزی علاقے سے کم و بیش ۱½ میل کے فاصلے پر ہے۔ آج کے دور
[illegible] باغ سے ٹیکسی اور مقام سے دو تین میل کے فاصلے
ڈلہوزی یا دھرم تلہ آنا آسان ہے چونکہ سواری کے لیے ٹرام،
بس، ٹیکسی وغیرہ ہیں لیکن غالب کے زمانے میں یہ کام آسان نہیں
تھا۔ تب زیادہ تر لوگ پیدل سفر کرتے تھے اور رئیس گھوڑا یا پالکی
میں بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ غالب بھی ایک خط میں اسی طرف اشارہ
کرتے ہوئے لکھتے ہیں — "بازار شملہ شہر اور بارگاہ حکام سے
دور ہے —" کلکتے میں مکان کا کرایہ زیادہ ہونے کی دوسری
وجہ یہ تھی کہ کلکتہ، ڈھاکہ یا مرشد آباد کی طرح کوئی پرانا شہر نہیں
تھا کہ وہاں کرایہ پر دینے کے لیے مکانات ہوں۔ کلکتہ تو ان دنوں
صرف ایک زیر تعمیر شہر تھا جہاں ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ
آ آ کر آباد ہوتے جا رہے تھے۔ ایسی حالت میں مکان کا ملنا مشکل
ہی تھا اور حکومت بھی اس سے بے خبر نہیں تھی لہٰذا حکومت نے
نے ایسا قانون بھی بنایا تھا کہ کوئی مکان خالی رکھنے نہ پائے اور کرایہ
پر اگر نہ بھی دے تو مکان کا ٹیکس ادا کرے جس کی وجہ سے لوگ مکان خالی
نہیں رکھا کرتے تھے چونکہ خالی مکانات پر بھی ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا
اور گورنمنٹ [illegible] پر چلا ہو تو کرایہ دار سے مالک مکان ٹیکس وصول کر لیتے تھے۔

مالک رام صاحب نے مرزا غالب کے مکان کا ذکر کرتے ہوئے
لکھا ہے[3] "کارنوالس اسکوائر کے تالاب کے سامنے مانک ٹولہ
(انگریزی میں TOLA ٹولہ لکھا جاتا ہے اس لیے مالک رام نے بھی
ٹولہ لکھا ہے، درست تلفظ "تلہ" ہے۔ "تلہ" بمعنی منزل یا مقام)
اسٹریٹ کی نکڑ پر ایک گرجا ہے جس کا نام کرائسٹ چرچ ہے۔ اسی
گرجے کی پشت پر ایک بازار ہوا کرتا تھا جو مانک ٹولہ اسٹریٹ سے
شروع ہو کر شمال کو بیڈن اسٹریٹ کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس کا نام
شملہ بازار تھا۔ بازار اس صدی کے شروع تک موجود تھا۔ اب
اس کے کچھ حصے میں تو عمارتیں بن گئی ہیں اور باقی میں بیتھون رو
(BETHUNE ROW) ہے۔ مرزا علی سوداگر کا مکان غالباً
اسی جگہ تھا جہاں اس وقت بیتھون رو کا مکان نمبر ۱۳۳ ہے۔ اس
کے صحن کا کنواں ۱۹۲۵ء میں پاٹا گیا تھا۔"

غالب نے اپنے کئی خطوط میں احباب کو کلکتے کے مکان کا پتہ لکھا تھا

---

[1] مجموعہ [illegible] دہلی اور غالب — قاضی عبدالودود "غالب نمبر" رسالہ اردو کراچی ۱۹۶۹ء۔
[2] " " " " " " " " "
[3] ذکر غالب — از مالک رام

مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں[۱] "شہر کلکتہ قریب چیت پور بازار در شملہ بازار نزدیک تالاب گول، بحفاظت اسداللہ برسد۔" ساشے کمپنی کے نام اپنا پتہ یوں لکھتے ہیں[۲] "در کلکتہ قریب چیت بازار، در شملہ بازار نزدیک تالاب، در حویلی مرزا علی سوداگر بہ اسداللہ برسد۔" ایک اور خط میں لکھتے ہیں[۳] "آئندہ خط مولوی ولایت حسن کے توسط سے نہیں اس پتے سے بھیجیں، شملہ بازار، گول تالاب، حویلی میرا حمد۔"

غالب کے مکان اور محلہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے[۴] "لارڈ امہرسٹ غالباً پہلے گورنر جنرل تھے جو شملہ گئے۔ اس وقت سے یہ رسم ہو گئی کہ ہر سال نہیں تو ہر دوسرے سال گورنر جنرل گرمیاں شملہ میں بسر کرے۔ اس زمانہ میں ریل نہیں تھی۔ الہ آباد یا کانپور تک دریا کے ذریعے پھر پالکی گاڑی اور گھوڑے پر یہ سفر جس شاہانہ شان و شوکت اور ساز و سامان کے ساتھ ہوتا تھا اُس کی تفصیلات ٹینچر (HENERY POTINGER) وغیرہ کی زبانی ہمیں معلوم ہوئی ہیں۔ ایک پورا شہر کلکتہ سے شملہ تک اور پھر شملہ سے کلکتہ تک متحرک رہتا تھا۔ بہرحال اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مزدوروں اور ملازموں کا ایک بڑا گروہ کلکتہ میں صرف اس سفر کے لیے رہنے لگا اور اُن کے محلے کا نام شملہ بازار پڑ گیا۔ یہ چیت پور روڈ کے اُس حصّے میں تھا جو بعد کو گینڈا تالاب کے نام سے مشہور ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہیں مرزا غالب ٹھہرے تھے۔ اب یہ حصّہ بالکل بدل گیا ہے۔ پُرانے مکانوں کے نام و نشان باقی نہیں۔ ریل کے جاری ہوتے ہی کیمپ کے متعلقات بھی معدوم ہو گئے تھے۔ اس لیے شملہ بازار بھی معدوم ہو گیا۔"

حالانکہ اب شملہ بازار کے نام سے کلکتے میں کوئی بازار نہیں ہے لیکن اب بھی اسی علاقے میں شملہ اسٹریٹ کے نام سے ایک راستہ موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہیں کہیں شملہ بازار بھی تھا اور آج بھی اس علاقے کے ایک ڈاک گھر کا نام شملہ بازار ڈاک گھر (کلکتہ ۶) ہے۔ شملہ بازار کا کیا ہوا اس کے بارے میں کچھ تو یقین سے نہیں کہا جا سکتا لیکن جیسا کہ ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ریل کے جاری ہونے کے بعد یہ بستی اجڑ گئی۔ ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی ۱۸۵۴ء میں قائم ہوئی لہٰذا اسی کے بعد سے یہاں کا اجڑنا شروع ہوا ہوگا اور مزدوروں کے بجائے نئے نئے پیشے کے لوگ یہاں آکر آباد ہوتے رہے ہوں گے۔

کلکتہ میں غالب کو جو مکان ملا اُس سے وہ واقعی خوش تھے یہ غالباً پہلا موقع تھا جب انھیں کوئی اچھا مکان ملا چنانچہ انھوں نے مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام جو خط لکھا اس میں اس مکان کی تعریف کی اور اس کا کرایہ "دہ روپیہ ماہانہ بہم رسیدہ" لکھا ہے۔ اسی خط کی بنیاد پر مالک رام اور دیگر حضرات نے غالب کے اس مکان کا کرایہ دس روپیہ لکھا ہے۔ "پنج آہنگ" کے اس خط کے مطابق اس مکان کا کرایہ دس روپیہ تھا۔ لیکن ایک اور خط میں کرایہ صرف چھ روپیہ درج کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو اُن سے پہلے چھ روپیہ کرایہ لیا جاتا تھا اور بعد میں دس روپیہ لیا جانے لگا یا پھر ممکن ہے کہ اُسی شملہ بازار کے علاقے میں غالب نے اپنا مکان بدل دیا ہو۔ کلکتہ سے تحریر کردہ ایک خط میں انھوں نے اپنے مکان کا پتہ "در حویلی مرزا علی سوداگر" لکھا ہے اور ایک اور خط میں "حویلی میر احمد" لکھا ہے حالانکہ محلہ وہی شملہ بازار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کے دوران ان کے خطوط مولوی ولایت حسن کے توسط سے آتے رہے ہیں۔ جس کا ذکر مذکورہ خط میں کیا گیا ہے۔ جس خط میں انھوں نے کرایہ چھ روپیہ لکھا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں — "منگل ۲ شعبان کو براہ خشکی عظیم آباد روانہ ہوا اور وہاں سے کلکتہ پہنچا۔ وہاں ایک اچھا مکان چھ روپیہ کرائے کا مل گیا[۵]۔" اس سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے وہ جس مکان میں تھے اُس کا کرایہ چھ روپے تھا اور اس کے بعد وہ مرزا علی سوداگر کے مکان میں اُٹھ آئے جس کا کرایہ دس روپیہ درج کیا۔

---

[۱] مجموعہ دھلی اور غالب۔ از قاضی عبدالودود، رسالہ اُردو کراچی "غالب نمبر" ۱۹۶۹ء [۲] غالب۔ از غلام رسول مہر [۳] مجموعہ دھلی اور غالب۔ رسالہ اردو کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء [۴] غالب اور ابوالکلام۔ مرتبہ محمد عتیق صدیقی۔ [۵] مجموعہ دھلی اور غالب۔ رسالہ اردو کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء

★

اترپردیش اردو اکاڈمی کی طرف سے اردو مصنفین کو انعامات

اور

کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو مالی امداد

اردو اکاڈمی نے یکم جنوری ۱۹۶۹ء سے ۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء کے درمیان شائع شدہ کتابوں پر ملک کے ۴۷ اردو مصنفین کو ۴۷ ہزار چار سو پچاس روپے کی مجموعی رقم بطور انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس سے قبل بھی اکاڈمی کی طرف سے دس ہزار کی رقم مختلف مصنفین کو انعام میں دی جا چکی ہے اور ان انعامات کی تفصیلات کا اعلان کچھ عرصہ قبل ہو چکا ہے۔

انعام یافتہ مصنفین کی فہرست حسب ذیل ہے۔ ان کی جن تخلیقات پر انہیں انعام دیا گیا ہے ان کے نام اور ان کی رقم مصنفین کے نام کے آگے درج ہے:

نمبر شمار	مصنف	کتاب	انعام کی رقم
۱۔	جناب سید مسعود حسن رضوی (لکھنؤ)	اسلاف میر انیس	۲۰۰۰
۲۔	جناب مجروح سلطانپوری (بمبئی)	غزل	۲۰۰۰
۳۔	ڈاکٹر یوسف حسین خاں (دہلی)	غالب اور آہنگ غالب	۲۰۰۰
۴۔	ڈاکٹر مغنی تبسم (حیدرآباد)	فانی بدایونی حیات شخصیت و شاعری	۲۰۰۰
۵۔	جناب غلام ربانی تاباں (دہلی)	ذوق سفر	۲۰۰۰
۶۔	جناب باقر مہدی (بمبئی)	آؤ کہ کوئی خواب بنیں	۲۰۰۰
۷۔	جناب شمس الرحمن فاروقی (لکھنؤ)	گنج سوختہ	۲۰۰۰
۸۔	ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری (دہلی)	نقش غالب	۲۰۰۰
۹۔	جناب کبل سعیدی (دہلی)	اوراق زندگی	۲۰۰۰
۱۰۔	جناب ضیاء احمد بدایونی (دہلی)	مباحث و مسائل	۲۰۰۰
۱۱۔	جناب غلام احمد فرقت (دہلی)	قند مکرر	۱۵۰۰

نمبر شمار	مصنف	کتاب	انعام کی رقم
۱۲۔	جناب انور عظیم (دہلی)	پرچھائیوں کی وادی	۱۵۰۰
۱۳۔	جناب رتن سنگھ (لکھنؤ)	پہلی آواز	۱۵۰۰
۱۴۔	جناب اقبال مجید (سیتاپور)	دو بھیگے ہوئے لوگ	۱۵۰۰
۱۵۔	جناب بشیر بدر (علی گڑھ)	اکائی	۱۵۰۰
۱۶۔	جناب زبیر رضوی (دہلی)	خشت دیوار	۱۵۰۰
۱۷۔	جناب شہریار (علی گڑھ)	ساتواں در	۱۵۰۰
۱۸۔	ڈاکٹر مس رشید موسوی (حیدرآباد)	دکن میں مرثیہ اور عزاداری	۱۵۰۰
۱۹۔	جناب اے۔ سی۔ بہار (دہلی)	نسیم بہار	۱۵۰۰
۲۰۔	جناب مجنوں قمر (حیدرآباد)	مرزا غالب	۱۵۰۰
۲۱۔	جناب بھوانی دیال (سیتاپور)	روح سخن	۱۵۰۰
۲۲۔	جناب عابد علی (بمبئی)	مرزا دبیر سے نشتر	۱۵۰۰
۲۳۔	جناب کمال احمد صدیقی (کشمیر)	بیاض غالب	۱۵۰۰
۲۴۔	جناب نثار احمد فاروقی (دہلی)	تلاش غالب	۱۲۰۰
۲۵۔	ڈاکٹر مسیح الزماں (دہلی)	اردو مرثیے کی روایت	۱۲۰۰
۲۶۔	ڈاکٹر منظر عباس نقوی (علی گڑھ)	وحید الدین سلیم حیات اور شاعری	۱۲۰۰
۲۷۔	جناب خلیق انجم و ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی)	کربل کتھا کا لسانی مطالعہ	۱۲۰۰
۲۸۔	محترمہ زاہدہ زیدی (علی گڑھ)	زہر حیات	۱۲۰۰
۲۹۔	ڈاکٹر رضی الدین احمد (رودولی)	نقد ابوالکلام	۱۰۰۰
۳۰۔	ڈاکٹر محمد یٰسین (علی گڑھ)	انگریزی ادب کی تاریخ	۸۰۰

نمبر شمار	مصنف	کتاب	انعام کی تعداد
۳۱	جناب عطا کاکوی (پٹنہ)	کمال غزل	۸۰۰
۳۲	ڈاکٹر شمیم انہونوی (لکھنؤ)	تذکرہ خوش معرکۂ زیبا	۷۵۰
۳۳	جناب اطہر پرویز (علی گڑھ)	فسانۂ عجائب	۷۵۰
۳۴	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی)	فانی کی شاعری	۷۵۰
۳۵	ڈاکٹر احتشام احمد (ندوی) (کیرلی)	تنقیدی نظریات کا مطالعہ	۷۵۰
۳۶	جناب ظفر ادیب (دہلی)	ہمعصروں پر غالب کا اثر	۷۵۰
۳۷	محترمہ عفت موہانی (حیدرآباد)	آخری تحفہ	۷۵۰
۳۸	محترمہ عطیہ پروین (گونڈہ)	مہ لقا	۷۵۰
۳۹	جناب ایم کوٹھیاوی راہی (گورکھپور)	ستل منزل	۷۵۰
۴۰	جناب اختر بستوی (الہ آباد)	نغمۂ شب	۷۵۰
۴۱	جناب احمد یحییٰ (کٹک)	جوئے کہکشاں	۷۵۰
۴۲	جناب گوہر مراد آبادی (کانپور)	آبشار	۷۵۰
۴۳	جناب حبیب الحبیب سہالوی (لکھنؤ)	الکشفیات	۷۰۰
۴۴	جناب پریم پال اشک (دہلی)	روزمرہ و محاورۂ غالب	۶۰۰
۴۵	جناب مجتبیٰ حسین (حیدرآباد)	قطع کلام	۶۰۰
۴۶	محترمہ حبیبہ بانو (لکھنؤ)	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	۶۰۰
۴۷	محترمہ مسرور جہاں (لکھنؤ)	پیکر	۶۰۰
۴۸	جناب ظفر حنفی (بھوپال)	دو خنڈے	۶۰۰
۴۹	جناب ندا فاضلی (بمبئی)	لفظوں کا پل	۶۰۰
۵۰	جناب غلام مرتضیٰ راہی (علی گڑھ)	لامکاں	۶۰۰
۵۱	جناب صبا جائسی (کانپور)	صحرا صحرا	۶۰۰
۵۲	جناب کمال جائسی (کانپور)	نامہ و پیام	۶۰۰
۵۳	جناب پیام فتح پوری (کانپور)	بادۂ شبانہ	۶۰۰
۵۴	جناب شاعر فتح پوری (کانپور)	تیر نیم کش	۶۰۰
۵۵	جناب مطرب نظامی (لکھنؤ)	گل نگر	۶۰۰
۵۶	جناب مرتضیٰ حسین (حیدرآباد)	[illegible] (حصہ اول و دوم)	۶۰۰
۵۷	جناب صفدر حسین (حیدرآباد)	[illegible]	۶۰۰
۵۸	جناب سعادت علی صدیقی (لکھنؤ)	حبیبۂ غالب	۵۰۰
۵۹	جناب دور آفریدی (رامپور)	میدانیاں	۵۰۰
۶۰	جناب ذکی کاکوروی (لکھنؤ)	نسرین و نسترن	۵۰۰
۶۱	جناب عشرت انور (علی گڑھ)	دنیا کہیں جسے	۵۰۰
۶۲	جناب روش سہنا کول (دہلی)	منزلِ نو	۵۰۰
۶۳	جناب کیف احمد صدیقی (سیتاپور)	گرد کا درد	۵۰۰
۶۴	محترمہ طیبہ سہیل (سہارنپور)	رفیع احمد قدوائی	۵۰۰
۶۵	جناب ایس۔ ایچ عباسی (حیدرآباد)	ڈاکٹر ذاکر حسین	۵۰۰
۶۶	جناب کشفی لکھنوی (لکھنؤ)	ساز و نغمہ	۵۰۰
۶۷	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب (دہلی)	ناشاد کانپوری	۵۰۰
۶۸	جناب مظفر الدین (حیدرآباد)	سخن در سخن	۴۰۰
۶۹	جناب جلیل الہ آبادی (پونا)	لہو رنگ	۴۰۰
۷۰	جناب یاس اختر ادیبی (مراد آباد)	چراغ ماہ	۴۰۰
۷۱	جناب ثمر لبوانی (سیتاپور)	ایکتا کا چمن	۴۰۰
۷۲	پنڈت خوشدل (دہرہ دون)	ترانے	۴۰۰

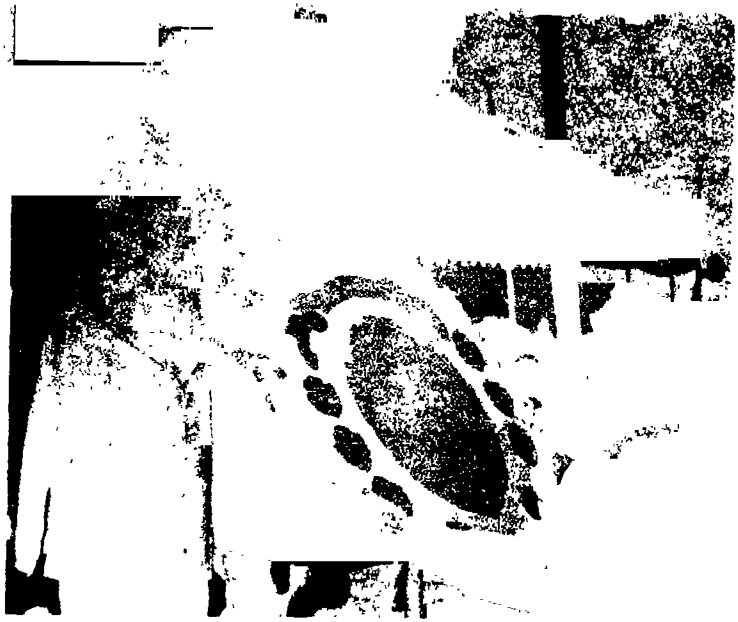
اس کے علاوہ اردو اکاڈمی نے ۸۰ کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو اردو کی کتابیں، رسائل اور اخبارات خریدنے کے لیے کل ۲۵۰۰۰ روپے کی مالی امداد دینا منظور کیا ہے۔ اس سے قبل اکاڈمی نے ۹۴ کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو ۲۶۵۰۰ روپے کی امداد دی تھی۔ اس طرح سنہ ۱۹۸۲ء میں اترپردیش اردو اکاڈمی نے ۱۷۴ کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو ایک لاکھ پانچ ہزار روپے کی امداد منظور کی ہے۔

★



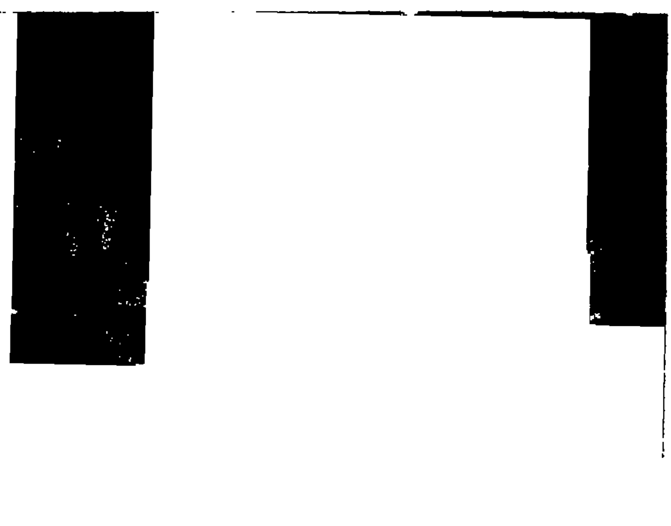
کمشنر بنگلہ دیش متعینہ ہندوستان ڈاکٹر اے۔ آر۔ ملک نے ۱۹ دسمبر ۱۹۷۲ء کو نئی دہلی میں وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کو ایک کار پیش کی۔ تصویر میں ڈاکٹر ملک وزیراعظم کو کار کی کنجیاں پیش کر رہے ہیں۔





گورنر شری اکبر علی خاں لکھنؤ میں پی۔ آر۔ ڈی کے ہیڈ کوارٹر پر منعقدہ ۱۱ویں ریاستی دیہی نوجوانوں کے کھیل کود کے مقابلے
کے اختتام پر نینی تال کو جمناسٹک چیمپین شپ شیلڈ عطا کرتے ہوئے

محکمۂ اطلاعات اور پریس کلب لکھنؤ کے درمیان ایک روزہ کرکٹ میچ کا ایک منظر۔ یہ میچ محکمۂ اطلاعات نے جیتا



جلد ۲۸ نمبر ۱۲

مارچ ۱۹۷۳ء
پھاگن ۱۸۹۴ شک

چندہ سالانہ: پانچ روپے
فی پرچہ: پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری یو.پی

مطبوعہ
... پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

اپنی بات

حسبِ سابق اس سال بھی یومِ جمہوریہ کے موقع پر صدرِ جمہوریہ کی جانب سے ادب، فنونِ لطیفہ اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے کے صلے میں [illegible] افراد کو اعزازات دیے گئے۔ اس سال ملک کا سب سے بڑا اعزاز بھارت رتن کسی کو نہیں ملا۔ ملک کا دوسرا بڑا اعزاز پدم وبھوشن [illegible] ممتاز شخصیتوں کو اور پدم بھوشن ۱۱ افراد کو دیا گیا۔ اس کے علاوہ پدم شری کا اعزاز ۳۳ افراد کو ملا جن میں اردو کے مشہور و معروف شاعر قوم پرست رہنما جناب سلام مچھلی شہری بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے اپنے افکار و خیالات اور اپنی شاعری کے ذریعے ادب کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ قومی اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ملک کی سیاسی سرگرمیاں اور روزمرہ کے مسائل آپ کی شاعری کے خاص موضوع رہے ہیں۔ مادرِ وطن سے محبت کو بھی بیان کرتے رہے ہیں، چنانچہ جب بھی وطن پر وقت پڑا ہے تو انہوں نے خود بھی قلم سے تلوار کا کام لیا ہے اور دوسروں کو بھی "شمشیر چلانے" کی بجائے تلوار اٹھانے اور تقاضے کی تلقین کی ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ سلام صاحب نثر نگاری میں بھی ایک دل کش انداز رکھتے ہیں۔ ہم انہیں اس اعزاز کے ملنے پر ہدیۂ تہنیت پیش کرتے ہیں۔

پدم وبھوشن کا اعزاز پانے والوں میں دیش بندھو سی۔ آر۔ داس کی بیوہ، جنگِ آزادی کی مجاہدہ شریمتی بسنتی دیوی، سابق صدر کانگریس نیز جنگِ آزادی کی ایک اور نامور مجاہدہ شریمتی نیلی سین گپتا اور شری وی۔ این۔ [illegible] سابق صدر کانگریس بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری سابق چیئرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، ڈاکٹر ناگیندر سنگھ جج عالمی عدالت (جو پہلے ہندوستان کے چیف الیکشن کمشنر تھے) اور شری ٹی۔ سوامی ناتھن کو بھی پدم وبھوشن کا اعزاز ملا ہے۔ پدم بھوشن کا اعزاز پانے والے ۱۱ افراد میں ممتاز مصور مقبول فدا حسین، ممتاز صحافی اور مصنف شری بنارسی داس چترویدی (اترپردیش)، ممتاز ادیب شری ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے، ممتاز اخبار نویس مسٹر [illegible] جوزف (بعد از مرگ)، کرکٹ کے ممتاز کھلاڑی شری [illegible] اور شری بی۔ ایم۔ ایس [illegible] (جنگِ آزادی کے مجاہد) شامل ہیں۔ شری سلام مچھلی شہری کے علاوہ پدم شری کا اعزاز جن دیگر افراد کو ملا ہے ان میں ممتاز کرکٹ کھلاڑی نواب پٹودی منصور علی خاں، ممتاز ڈرامہ نویس شری بلونت گارگی (پنجاب)، شاعر [illegible] (اترپردیش) کے ہردل عزیز اور حاذق ڈاکٹر [illegible] ناتھ، ممتاز ناول نگار شری [illegible] ہیں۔ [illegible] ہسپتال اور آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ کے ڈاکٹر [illegible] کالی کٹ یونیورسٹی (کیرالہ) کے صدر شعبۂ ہندی ڈاکٹر محمد عبدالقادر، ملک محمد [illegible] روہتک پنجاب، سابق پرنسپل [illegible] کالج (الٰہ آباد)، شری شیام لال گپتا پرشاد (اترپردیش) اور خواجہ (اترپردیش) کے جینی اور کاٹن کے [illegible] ماہر ڈاکٹر [illegible] ناتھ شرما شامل ہیں۔

اعزازات کا اعلان ۲۶ جنوری کو ہوتا ہے۔ اس کے بعد نیا دور کی پہلی اشاعت مارچ ہی کی ہوتی ہے جس میں اعزاز پانے والوں کو مبارک باد پیش کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ادارہ نیا دور ان سب حضرات کی خدمت میں تہنیت پیش کرنے کی مسرت حاصل کر رہا ہے۔

● حکومت اترپردیش اردو زبان کی ترویج و ترقی اور اس کے پڑھنے والوں کے لیے سہولتیں بہم پہنچانے کی جانب خصوصی توجہ کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں اسکولوں میں اردو پڑھانے کا انتظام، معمر اور مالی پریشانیوں میں مبتلا ادیبوں اور شاعروں کے لیے ماہانہ پنشن کی اسکیم، اردو کتابوں پر انعامات، اردو میں سرکاری گزٹ کی اشاعت، اردو میں درخواستیں اور رجسٹری کے لیے دستاویزیں قبول کرنے کے احکامات، آٹھویں درجے تک نصابی کتابوں کی اردو میں اشاعت، نظامت تعلیمات میں ایک ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) کی تقرری، اردو اکادمی کا قیام، اکادمی کے ذریعے اردو کتابوں پر انعامات، اردو کے ادیبوں اور لائبریریوں و مطالعہ گھروں کی مالی امداد اور اردو کتابوں کی اشاعت کا پروگرام وغیرہ وغیرہ وہ چند اہم اقدامات ہیں جو حکومت اب تک کر چکی ہے۔ اب حال ہی میں اس نے پردیش کے تمام میونسپل بورڈوں کے پرائمری اسکولوں میں ایک ایک اردو ٹیچر مقرر کیے جانے کے احکام بھی جاری کیے ہیں۔ اس فیصلے کے نتیجے میں پردیش کے میونسپل بورڈوں کے تقریباً ۳۰۰۰ پرائمری اسکولوں میں تین ہزار اردو جاننے والے افراد بحیثیت اردو ٹیچر مقرر ہو جائیں گے۔ یاد ہوگا کہ اس سے قبل پردیش کے ۲۵۰۰ پرائمری اسکولوں اور بعض مکتبوں اور مدرسوں میں اردو پڑھانے کا انتظام کیا جا چکا ہے۔ تسلیم شدہ مکتبوں، اردو کے ذریعے تعلیم دینے والے اسکولوں اور مدرسوں کو جنہیں اب تک سرکاری امداد نہیں مل رہی ہے، انہیں امداد دینے کے سوال پر بھی ریاستی حکومت غور کر رہی ہے۔ اس طرح یہ دیکھا جائے گا کہ ریاست میں اردو کی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچانے اور اردو زبان کو فروغ دینے کا جو وعدہ حکومت نے کر رکھا ہے اسے پورا کرنے کی جانب وہ نہ صرف پوری طرح متوجہ ہے بلکہ اس سلسلے میں برابر عملی اقدامات بھی کرتی رہتی ہے۔

● لکھنؤ میں انجمن تکمیلِ ادب کے زیرِ اہتمام ۲۰ جنوری ۱۹۷۳ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال، امین آباد میں یومِ دبیر منایا گیا۔ یومِ دبیر کا افتتاح اترپردیش کے گورنر مسٹر اکبر علی خاں نے کیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں موصوف نے مرزا دبیر کے علم و فضل اور مرثیہ گوئی میں ان کی عظمت پر مختصر مگر جامع الفاظ میں روشنی ڈالی اور مرزا صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مرزا سلامت علی دبیر کا شمار ان کاملینِ فن میں ہوتا ہے جنہوں نے صنفِ مرثیہ کو اس کے کمال تک پہنچا دیا۔ تخیل کی بلندی، الفاظ کی شان و شوکت، اور تشبیہوں کی ندرت آپ کے مرثیوں کی خاص خصوصیتیں ہیں۔ بینیہ مراثی کہنے میں مرزا صاحب کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ مرزا دبیر اس کے یقیناً مستحق تھے کہ ان کا یوم منایا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ انجمن تکمیلِ ادب لکھنؤ نے یومِ دبیر منا کر ایک ادبی فرض ادا کیا۔

● ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان کرکٹ ٹیسٹ میچوں کا حالیہ سلسلہ ہندوستان کی فتح پر ختم ہوا۔ پانچ ٹیسٹ میچوں کے اس سلسلے میں ہندوستان پہلا ٹیسٹ دہلی میں ہارا۔ اس کے بعد کلکتہ و مدراس کے دونوں ٹیسٹ ہندوستان نے جیتے۔ کانپور کا چوتھا اور بمبئی کا پانچواں ٹیسٹ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوا۔ اس طرح ہندوستان نے ایک کے مقابلے میں انگلینڈ کو ۲ میچوں سے ہرا کر ربڑ جیت لیا۔ انگلینڈ کے خلاف یہ دوسرا ربڑ ہے جو ہندوستان نے جیتا۔ پہلا ربڑ اسی نے سرزمین انگلستان پر ۱۹۷۱ء کے ٹیسٹ سلسلے میں جیتا تھا اور اس مرتبہ ہندوستان میں اس کو انگلستان کے خلاف یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ٹیسٹ میچوں کے اس سلسلے میں بہت سے ریکارڈ قائم ہوئے۔ [illegible] ہندوستان کی ٹیم کی "ہیٹ ٹرک" بھی ہوئی۔ وارڈیکر کی کپتانی میں ہندوستان ۱۹۷۱ء میں ویسٹ انڈیز اور انگلستان سے ربڑ جیتا تھا اور اب یہ مسلسل تیسرا ربڑ ہے جو انگلینڈ ہی کے خلاف ہندوستان نے جیتا ہے۔ اس کے لیے کپتان اجیت واڈیکر اور ہندوستانی ٹیم کے تمام کھلاڑی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہندوستان نے کھیل کے ہر شعبے میں بیٹنگ، بولنگ اور فیلڈنگ میں شاندار کارگزاری دکھائی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسے یہ غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ امید ہے کہ ہندوستانی کھلاڑی آئندہ بھی اپنی کارکردگی کو برقرار رکھیں گے اور اس شاندار ریکارڈ کو بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ دوسری طرف [illegible] بھی نوجوان کھلاڑی اس کامیابی سے تحریک حاصل کریں گے اور اپنے کو ان کھلاڑیوں کی جگہ لینے کا اہل بنائیں گے جنہوں نے ہندوستانی کرکٹ کے معیار کو بلند کر دیا ہے اور کرکٹ کی دنیا کی ایک "بڑی طاقت" بنا دیا ہے۔

ایڈیٹر

محمد بدیع الزماں

جناب رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ "آشنائی نغمہ شعریت کا دوسرا نام ہے" مگر یہ شعریت ہے کیا؟ پروفیسر موصوف اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ:

"شعریت "حقیقت آگہی" کا ایک دلکش اور جامع مترادف ہے۔ حقیقت سے باخبر رہنا ایک ایسی نعمت و سعادت ہے اور وہ ہماری مسرتوں کا ایسا لامحدود اور لازوال سرچشمہ ہے کہ اس کے بے دریغ بخششوں کے مقابلے میں زندگی کی ساری تلخیاں ہیچ محسوس ہونے لگتی ہیں شعریت سے مراد منظوم حماقتیں نہیں ہیں اور نہ اس سے شاعروں کا مخصوص امتیاز بد دماغی یا حلیہ ہے۔ ترک موالات کی مانند شعریت ایک طرح کا میلان ذہنی ہے۔ یہ ایک ایسی امید ہے جو کبھی مایوسی میں تبدیل نہیں ہوتی ..... کوئی شخص خواہ وہ عرف عام میں شاعر کہلائے یا سائنسداں، آقا یا غلام، مریض یا تندرست، مخلص یا منافق، موحد یا ملحد کچھ بھی کیوں نہ ہو اگر متذکرہ صدر خصوصیات کا حامل ہے تو وہ شعریت سے بہرہ ور ہے۔

"شعریت..... ایک ذوق، ایک وجدان، ایک قسم کا میلان ذہنی ہے جس کا تعلق براہ راست انسانیت سے ہے۔ یہ ایک افتاد طبع ہے۔ اس وجدان کی صحیح کارروائی اور پھر اس کی صحیح دلکش ترجمانی کرنا اور اس کو مرئی اور متشکل بنانا لیکن اس انداز اور سلیقے سے کہ تصور اور تصویر میں بیش از بیش مناسبت ہو شاعری ہے۔ یہ شاعری کا وسیع ترین مفہوم ہے۔" (مقدمہ باقیات حافظ)

حقیقت پرستی ہی چونکہ ادب کا جوہر ہے اس لیے ادب جذبات کے لطیف پردوں میں رہ کر بھی حقائق سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ اگر شاعر عالم رنگ و بو سے گذر کر فلسفہ و حکمت کے نکتہ ہائے سربستہ اور ہر کیفیت مجردہ کی دلکش ترجمانی کرنے کا اہل ہے تو اس کی حقیقت آگہی ایک عہد کے لیے مشعل اور آنے والے عہد کے لیے نشان راہ بن سکتی ہے۔ اگر شعر کی بنیادیں حقیقت، خلوص، شرافت اور وسیع النظری پر رکھی گئی ہیں تو ضرور ہے کہ شاعر انسان کو داخلی طور پر بدلنے کا اہل ہوگا۔ شاعر اگر بحیثیت انسان کے بڑا ہے، اس کی شخصیت وسیع اور ہمہ گیر ہے، اس کی بصیرت، وجدان اور جمالیاتی احساس میں گہرائی ہے، اگر وہ اپنی قوی تر قوت شاعرہ سے ذہنی نکتوں کی موشگافی کر سکتا ہے، اپنے لطیف احساسات کے ذریعے غیرمادی حقائق سے بھی لذت اندوزی حاصل کر سکتا ہے اور اسی کے ساتھ اگر وہ عرفان کی اس مجموعی کیفیت کی تصویر جدت بیان اور حسن ادا کے ساتھ شعر کے لباس میں ملبوس کر کے دوسروں کی بھی لذت اندوزی کا باعث بن سکتا ہے تو اس کا کلام سحر سے گذر کر اعجاز بن جاتا ہے اور یہی اعجاز بن جانا اس کے کلام میں شعریت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی جب "شعریت ہی ہماری مسرتوں کا..... لامحدود اور لازوال سرچشمہ ہے" اور جب ایسا ہے تو شعریت کا تعلق براہ راست انسانیت سے ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا کہنا ہے کہ: "شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیے" کیونکہ اگر شاعر اس کلیہ کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتا تو ظاہر ہے کہ وہ نہ حقیقت سے باخبر رہ سکتا ہے اور نہ انسانیت کی ترجمانی کر سکتا ہے۔ اور اس طرح جسے شعریت کہتے ہیں اس کی تلاش

بالکل بے معنی ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے اس خیال کی مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ :

"قدر ہی وہ کنجی ہے جس سے زندگی کے سارے طلسم کھلتے ہیں۔ شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیے نہ کہ اس کا مٹانے والا .... ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شعریت تخیلی فکر اور جذبے کی آمیزش کے بغیر نہیں ہو سکتی اور یہی دونوں جز تغزل کی جان ہیں ..... انہی سے حسنِ ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جو ادب کی بنیادی قدر ہے ... تخیلی فکر کی قوت ذہن کی گہرائی میں پوشیدہ ہے۔ یہ قوت صورت پذیری اور نظم آفرینی کے سلیقے اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے جو جب خارجی حقائق کو اپنے اندر جذب کرے تو موضوع و معروض کی دوئی باقی نہیں رہتی۔ اس طرح میں اور حقیقت، فطرت اور آزادی، شعور اور لاشعور، انفرادیت اور اجتماعیت کے تضاد دور ہو جاتے ہیں اور شعر زندگی کا مظہر بن جاتا ہے۔"

(از ماہنامہ نقوش۔ لاہور۔ (ادبِ عالیہ جولائی ۱۹۶۰ء)

ان سب باتوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شعر کی بنیادیں زندگی کی ابدی قدروں اور حیات کی اصلیتوں پر قائم ہیں۔ زندگی کی قدروں، اس کے تنوع اور چڑھاؤ پر اگر شاعر فکر و نظر کی عمارت تعمیر کرکے دلوں کے تاروں کو چھیڑتا اور زندگی کے حسن کو بیدار کرتا ہے تو زندگی کی حقیقتیں بے نقاب نظر آنے لگتی ہیں۔ شاعر تخیل کے سہارے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرکے ایک نامکمل داستان کو اس کے فطری انجام تک پہنچا کر زندگی کی ہمہ گیر ترجمانی کرتا ہے۔ تخیل کا یہی پر تو جذبے کی کارفرمائیوں کو پیچیدہ اور رنگین بنا دیتا ہے۔ یہ تخیل ایک داخلی اور انفرادی اپچ ہے۔ تخیل اور جذبے کی یہی آمیزش شعر کو شعریت عطا کرتی ہے۔

تخیل اگرچہ شعر کا ایک نہایت اہم عنصر ہے مگر محاسنِ شعری کا انحصار یا شعریت کا دارومدار فقط تخیل پر نہیں اور نہ تعقل اور منطق پر ہے بلکہ وجدان سے ہے جس کی تخلیقی منزل کی طرف اشارہ غالب نے اپنے اس شعر میں کیا ہے کہ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

اس تخلیقی منزل کے زادِ راہ میں شعور کو بھی اتنا ہی دخل ہے کیونکہ جہاں وجدان کا سوال ہے شاعری جیسے لطیف فن کی تو پرورش ہی وجدان کی آغوش میں ہوتی ہے۔ اگر شاعر زندگی اور فطرتِ انسانی کی ساری پیچیدگیوں اور تاریخِ انسانی کی قابلِ احترام روایات کو اپنے شعور میں جذب کرکے اور اپنی شخصیت میں رچا کر ان میں حسن اور رنگینی پیدا کرے تو اس کے شعر میں شعریت کا خلیل الرحمٰن اعظمی کے الفاظ میں حال یہ ہوگا کہ :

"اس کے پاؤں کیچڑ میں دھنستے ہوئے بھی اس کا ہاتھ تاروں کی طرف بڑھے گا۔"

حالی مقدمہ شعر و شاعری میں شعریت کا کہیں نام تو نہیں لیتے مگر اس کے جواز میں شاعر کی قوتِ متخیلہ کے عمل اور اس کے ذوق کے متعلق فرماتے ہیں :

"... ہر ایک شے کی روح میں جو خاصیتیں ہیں ان کا انتخاب کرنا اور ان کی تصویر کشی شاعر کا کام ہے ... وہ ہر ایک شے میں سے صرف وہ خاصیتیں چن لیتا ہے جن پر قوتِ متخیلہ کا عمل چل سکے اور جو عام نظروں سے مخفی ہوں جس طرح ایک نیاریا ریت میں سے چاندی کے ذرے نکال لیتا ہے جو کسی کو نہیں سوجھتے، اسی طرح شاعر ہر ایک چیز اور ہر ایک واقعہ میں سے صرف ذوقیات لے لیتا ہے جن میں اس کے سوا کسی کا حصہ نہیں اور باقی کو چھوڑ دیتا ہے۔"

یہ صحیح ہے کہ "حقیقتِ آگہی" یا "تخیلی فکر و جذبہ کی آمیزش" شعریت کو وجود میں لاتی ہے لیکن تنہا یہی کافی نہیں ہے حسنِ خیال کے ساتھ ساتھ مکمل شعریت کا راز حسنِ ادا میں بھی پنہاں ہے۔ شعریت پر آج سے برسوں پہلے جب پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر کلیم الدین احمد میں تبادلۂ خیال ہوا تھا۔ سرور صاحب نے اسلوب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا تھا :

"شعریت سے میری مراد وہ رسیلا پن نہیں ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا بلکہ جذبات کی شدت، وہ والہانہ کیفیت، وہ بات کو اس طرح کہنے کی عادت کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لیے چونک اٹھے اور اس کے سامنے حالات کی ایک پوری دنیا آ جائے۔ غرض وہ سارا اسلوب جو شعر کو نثر ہونے سے بچاتا ہے کم نظر آتا ہے۔"

جناب کلیم الدین احمد نے ماہنامہ معاصر پٹنہ کے جولائی ۱۹۴۱

کے شمارے میں اپنے مضمون میں (جو بعد میں ان کی کتاب "معنی ہائے گفتنی" طبع ۱۹۵۵ء میں بھی شامل کیا گیا) سرور صاحب کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے صرف اس قدر اختلاف کیا کہ:

"شاعری نہ تو شعبدہ بازی ہے اور نہ جادوگری۔ شاعری نام ہے انسانی تجربات، خیالات و جذبات کے اظہار کا اور یہ اظہار الفاظ، نقوش (یا تخیلی پیکروں) اور اوزان کی مدد سے ہوتا ہے .... اگر تجربات میں اصلیت ہو اور شاعر کو الفاظ، نقوش اور اوزان پر قدرت حاصل ہے تو پھر نتیجہ کامیاب شاعری ہے۔ اگر تجربہ میں اصلیت نہیں اور اگر اس میں کسی قسم کا نقص ہے تو یہ نقص، یہ اصلیت کی کمی اسلوب بیان میں ظاہر ہو جائے گی۔ سرور صاحب بجا فرماتے ہیں کہ شعریت کے لیے جذبات کی شدت، ایک والہانہ کیفیت ضروری ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ والہانہ کیفیت یہ "جذبات کی شدت" حقیقی ہو نقلی نہ ہو۔"

حالی نے بھی مقدمہ شعر و شاعری میں اصلیت کو سادگی اور جوش کے ساتھ ایک ضروری عنصر قرار دیا ہے۔ جناب کلیم الدین احمد نے بھی وہی بات کہی مگر توڑ مروڑ کر۔ اگر اصل و نقل کا فرق ایک شاعر نہیں رکھتا تو وہ شاعر نہیں جو کچھ کہا جائے گا۔ حالی نے بھی تو یہی کہا اور واضح طور پہ کہا ہے کہ:

"شعر اصلیت پر مبنی ہو اس سے یہ غرض ہے کہ خیال کی بنیاد ایسی چیز پر ہونی چاہیے جو در حقیقت کچھ وجود رکھتی ہو نہ یہ کہ سارا مضمون ایک خواب کا تماشا ہو کہ ابھی تو سب کچھ تھا اور آنکھ کھلی تو کچھ نہ تھا۔"

در پھر اصلیت پر مبنی ہونے سے ان کی کیا مراد ہے وہ اسے اور بھی واضح کرتے ہیں کہ:

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامر پر مبنی ہونا چاہیے بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدہ میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہو ..."

بات حسن بیان اور شعریت کی ہو رہی تھی جس کا براہ راست تعلق اثر آفرینی سے ہے اور یہ منحصر ہے موزونیت پر۔ موزونیت شعر کو بے پناہ شمشیر بنانے اور وجدان کو کل بوٹوں میں ڈھالنے میں شیرازہ کا کام کرتی ہے۔ شعر میں طرفگی، انجوبیت اور انوکھے پن کے لیے متناسب الفاظ اور الفاظ کی ترکیب کو بہت بڑا دخل ہے اور یہی سب مل کر شاعر کے لب و لہجے میں والہانہ پن اور فریفتگی پیدا کرتے ہیں۔ مگر مکمل شعریت کے لیے شاعر کی شخصیت کا بھی عظیم ہونا ضروری ہے کیونکہ خیال، انداز بیان اور خود شاعر کی شخصیت کے ایک نکتہ پر جمع ہونے ہی سے شعریت وجود میں آتی ہے۔ سرور صاحب نے "چونک اٹھنے" والی بات جو کہی یہ اظہار بیان کے اسی لب و لہجے پر منحصر ہے جو انتخاب الفاظ یا شعری قرینے سے تشکیل پاتی ہے۔ متناسب الفاظ کا انتخاب اور ان کی مناسب ترتیب ہی کا نام شعری قرینہ ہے۔ سودا کے اس شعر سے شعری قرینہ کے ساتھ شعریت کے وجود میں آنے والی بات واضح ہو جاتی ہے ؎

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

شعریت اور آئینہ الفاظ کے تعلق پر فراق گورکھپوری نے کیا خوب روشنی ڈالی ہے:

"عقل و خیال کیفیت کی ضد ہیں لیکن الفاظ شعر عقل و خیالات کی گرفت یا گرانباری سے سو فیصدی آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔ اچھے سے اچھا شعر قریب قریب شعر ہوتا ہے یا شعریت کی طرف اشارہ کر کے رہ جاتا ہے۔ یہی کیا کم ہے .... جہاں تک آئینہ الفاظ یا ساغر الفاظ کا تعلق ہے حقیقی غزل کے اشعار کا حسن شعریت اور بادۂ کیفیت آئینہ گداز و جاں گداز ثابت ہوتے ہیں۔ الفاظ اشعار سوز شعریت میں پگھلتے نظر آتے ہیں۔ کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

لفظ "اتنا" معنویت، شعریت، کیفیت و نشتریت کی شدت سے تھرتھرا رہا ہے۔"

(ماہنامہ نگار، لکھنؤ۔ جنوری و فروری ۱۹۵۰ء اصناف سخن نمبر)

نیز کتاب "انداز ے")

"حسن خیال" اور "حسن بیان" میں شعریت کے لیے جو قدر مشترک ہے وہ ہے شاعر کا خود اپنا "حسن نظر" جو اس کی قوت متخیلہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ قدر مشترک بقول عطا دعبدانی شعریت کی جان اور شاعری کی روح رواں ہو سکتی ہیں:

"جتنی زیادہ حسنِ نظر شاعر میں ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ حسن آفرینی، دلکشی، دل آویزی، کششِ قلبی، وجاذبیت اس کے تصورات اور ان کے مظاہر میں ہوگی۔ شاعر کا حسن نظر شعریت کی جان اور شاعری کی روح رواں ہے" شعریت اور پھر مکمل شعریت پر بھی ان کے خیالات قابل قدر ہیں اور موضوع کا حق ادا کر دیتے ہیں کہ:

"انسان نے خارجی تصورات و تخیلات اور داخلی جذبات و احساسات کو حسنِ بیان کے ساتھ لفظی جامہ پہنایا۔ اس حسین اور لطیف اور موزوں عبارت آرائی کو جو داخلی و قلبی، داخلی اور خارجی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے، حسن بیان اور صوتیاتی توازن رکھتی ہے ہم شعریت کہیں گے اور اس کا بہ تسویہ شاعری تعبیر ہے ....

تسویہ و تحریر میں ترنم، خوش لفظی، صوتیاتی موزونیت، حسین تصور و تخیل اور حسین خیال اور حسن بیان کے ساتھ مکمل طور پر موزونیت تامہ رکھتی ہو ...... خالق شعریت یعنی شاعر کی ذہنی و نفسیاتی صلاحیت کے لیے طبع کی موزونیت اولین وصف اور شعریت کا جزو لاینفک ہے۔ علم و فضل اور فنی صلاحیت کو ثانوی درجہ حاصل ہے"

(ماہنامہ آج کل، دہلی ستمبر ۱۹۶۴ء)

الغرض شعریت شعر کا معنوی و صوری حسن ہی نہیں بلکہ ان دونوں کا حسین امتزاج ہے۔ اور اسی کے انیسؔ طالب رہے تھے ؎

غواص طبیعت کو عطا کردہ آلی
ہو جس کی جگہ تاج سر عرش پہ خالی

اور جب شاعر اس عطیہ سے مالا مال ہو جاتا ہے تو اس کی تخلیق کیا بن جاتی ہے اقبالؔ سے سنیے ؎

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

★

پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (۱۹۵۶ء میں ترمیم شدہ) کی دفعہ ۱۹ ڈی کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ "نیا دور" کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجۂ ذیل تفصیلات شائع کیے جاتے ہیں

(۱) مقام اشاعت — لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت — ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ — شری اشوک ڈر۔ ہندستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری، اترپردیش، الہ آباد۔
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ — شری شرومنی شرما۔ ہندستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش۔ لکھنؤ۔
(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ — شری خورشید احمد۔ ہندستانی۔ اڈیٹر "نیا دور" محکمۂ اطلاعات۔ لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔ — نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کا ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں شرومنی شرما اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) شرومنی شرما (پبلشر)

★

غزل

منہال رضوی

بدل کے بھیس محبت کی چوٹ اُبھر آئی
ہماری بات تمھاری زبان پر آئی

محبت ایک حسیں انقلاب کر آئی
ہمارے حال پہ آج ان کی آنکھ بھر آئی

کسی کو دیکھ کے بے چین ہو گئیں نظریں
کوئی دبی ہوئی چوٹ آج پھر اُبھر آئی

اُسے بھی مصلحتِ حُسن کہہ دیا ہم نے
تری نگاہ جو بدلی ہوئی نظر آئی

وہ زندگی جو عبارت ہے نامرادی سے
جدھر جدھر میں گیا ہوں ادھر ادھر آئی

جنھیں حقیر سمجھتے ہیں اہلِ دیر و حرم
انھیں میں کچھ ہمیں انسانیت نظر آئی

ترے کرم کی تجلی جسے کہا جائے
کبھی قریب کبھی دور پر نظر آئی

ترے خیال کی انگڑائی کہکشاں کی طرح
سنوارتی ہوئی یادوں کے بام و در آئی

بہت سی باتوں کی وسعت پہ خوشی ہے پنہاں
غرورِ شام مٹاتی ہوئی سحر آئی

غزل

سید نقی علی ثاقب

دشت کی دھوپ ہے، جلتا ہوا سناٹا ہے
ہائے کس وقت مجھے تیرا خیال آیا ہے

زنگ بکھرے ہیں نہ ٹوٹا ہے طلسمِ زنداں
رات ابھی رات ہے احساس کہاں جاگا ہے

خنکیِ موسمِ گل ہے کہ ترے جسم کا لمس
نشۂ نیم شبی ہے کہ ترا سایہ ہے

غم کے اظہار سے روکے ہے اُدھر وحشتِ غم
اور اِدھر دل کا ہر اک زخم صدا دیتا ہے

میں وہ اک حرفِ سحر ہوں ورقِ دل پہ ندیم
آج تک موسمِ گل بھی جسے دہراتا ہے

وحشتِ تنہائی میں مضرابِ یقیں ہے تری یاد
تیرے چھو لینے سے سناٹا کھنک جاتا ہے

زندگی رات ہے مقتل کی اسے کچھ نہ کہو
کرب وہ ہے کہ اجالوں کا بدن ٹوٹتا ہے

منشی مسیح الدین بریلوی مرحوم

— جعفر بریلوی —

میرا لڑکپن تھا۔ ہم لوگ اپنے آبائی مکان میں رہتے تھے۔ ۱۹۰۷ء سے پہلے کی بات ہے۔ ایک صاحب لانبا قد ذرا خمیدہ۔ چھریرا بدن۔ کھچڑی داڑھی سفید یا سیاہ شیروانی۔ چوڑی دار پاجامہ پہنے ترکی ٹوپی لگائے ایک چھوٹا سا بیت ہاتھ میں ایک سفید پتلے دبلے ٹٹو ٹانگن پر سوار کوئی نو دس بجے صبح کے دروازے کے پھاٹک سے داخل ہوتے ہیں۔ ایک پاؤں ابھی رکاب میں ہے کہ زبان مبارک سے کوئی فارسی شعر باآواز بلند نکلا۔ ادھر سے میرے والد بزرگوار جو انھیں دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اسی طرح بلند آواز سے کوئی دوسرا فارسی شعر پڑھتے اور مصافحہ کرتے ہوئے لاکر اپنے قریب کرسی پر بٹھاتے ہیں۔ اب دونوں فدائیان فارسی زبان کی گفتگو میں قہقہے اور شعر خوانیاں دیکھنے اور سننے کے قابل ہوتی ہیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے صحبت رہتی۔ پھر وہ بزرگ اٹھ کر رخصت ہوتے۔ والد ماجد پھاٹک تک پہنچاتے۔ میں اس تمام وقت مبہوت سا بنا دیکھتا۔ میری سمجھ میں تو ان کی شعر خوانی کچھ نہ آتی، صرف اتنا ضرور جانتا تھا کہ فارسی زبان ہے۔ لیکن میرے دل و دماغ میں شراب کا سا نشہ سا چھا جاتا تھا اور یہ کیفیت کافی دیر تک سرور رکھتی بس جب کبھی ان بزرگوار کو آتے دیکھتا میں باغ باغ ہو جاتا۔ یہ تھے منشی مسیح الدین بریلوی مرحوم۔

والد ماجد [illegible] میں بریلی کا ؤنسل لندن سے کئی لاکھ کی جائداد کا مقدمہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے خلاف ہار گئے۔ یہ معمولی شکست نہ تھی۔ اس شکست نے خانہ ویرانی، خانماں خرابی اور بربادی کے دروازے کھول دیے جن سے وہ سیلاب داخل ہوا کہ گراں قیمت ساز و سامان، بیش قیمت فرش فروش، گھوڑے گاڑیاں وغیرہ سب بہا کر لے گیا۔

اسی سال موسم سرما میں بریلی میں وبائے طاعون نازل ہوئی۔ بہت لوگ شہر چھوڑ کر دور دور جا کر، جہاں جس کے سینگ سمائے آباد ہو گئے۔ مگر وبا کے دور ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے۔ اطمینان و تسلی کا سانس لیا۔ مگر آہ ہم لوگ ایسے نکلے کہ پھر مکان سکونت کی صورت بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کرایہ کے مکانوں میں تھوڑے تھوڑے عرصے قیام کرتے رہے۔ یہ بہت طولانی اور المناک داستان ہے جس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ یہ جانکاہ ورود ح فرسا اذیتیں [illegible] تک چلتی رہیں جنھوں نے آخر آخر والد ماجد کی آخری سانسیں بھی نکال کر دم لیا۔

حالات سقیم سے سقیم تر ہوتے گئے۔ ہاں میرا سلسلۂ تعلیم کسی نہ کسی طرح جاری رہا اور خدا کا شکر ہے کہ میں [illegible] میں بی۔ اے فائنل میں آ گیا۔ میں نے فارسی ادب، انگریزی ادب اور فلسفہ لیا تھا۔ فارسی کی درسی کتاب میں ایسے ایسے سنگلاخ انتخاب نثر و نظم کے تھے کہ جن کا پڑھانے والا بریلی میں کوئی نہیں تھا۔ بریلی کالج کے فارسی کے پروفیسر ایک ملائے مکتبی سے زیادہ استعداد نہیں رکھتے تھے۔ شہر میں فارسی کے دو استاد معروف تھے ایک منشی قاسم علی خواہاں اور دوسرے مولوی رستم بیگ قیصر۔ اول الذکر سرکاری اسکول بریلی میں فارسی کے معلم بھی تھے۔ اکثر طلبا انھیں دونوں سے اپنی دشواریاں حل کیا کرتے تھے مگر اب کے فارسی کتاب اس قدر مشکل آئی تھی کہ یہ لوگ بھی اس کے پڑھانے سے اپنی معذوری کا اظہار کر چکے تھے۔

میں اور میرے ایک ہم جماعت سورگیہ منشی من موہن لال ماتھر جو بعد کو ایڈووکیٹ ہو کر بریلی میں آفتاب کی طرح چمکے، فارسی کتاب کا مطالعہ

بساط بھر ساتھ دیتے اور اپنی فکر و فہم سے بہت سی دشواریوں کو آسان کر لیتے۔ مگر پھر بھی کچھ حصہ یاد ہو گیا جو آگے چل کر میرے لیے عقدہ کشا بنا رہا۔ اور یہی سطور میں سے پیشتر [illegible] فارسی دانی کے متعلق جو کچھ عرض کر چکا ہوں اس سے یہ تو سمجھ ہی لیا ہوگا کہ ان کو اس زبان کا کافی شوق تھا۔ [illegible] صاحب [illegible] اور اضافہ کر دیا کہ وہ فارسی کے عالم متبحر تھے۔ ان کے [illegible] میں موجود ہے۔ بلکہ یہ کہنا [illegible] اسلوب و بیان ایک فارسی [illegible] بھی تھا جس نے انھیں دنیا اور دنیا سے ہمیشہ بے نیاز بنائے رکھا اور اصلاح حالات کی تدابیر سوچنے کی اجازت ہی نہیں دی۔ [illegible] ایک روز ڈرتے ڈرتے ہمت کر کے عرض کیا کہ میری فارسی درسی کتاب میں متعدد مقامات ایسے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے بغیر [illegible] کرتا ہوں [illegible] میں نہیں آتے۔ آپ انھیں سمجھا دیں تو تھوڑا تھوڑا روز پڑھا کروں۔ فرمایا اے میاں میں [illegible] کے مارے رات دن پریشان رہتا ہوں، دماغ بکھرا رہتا ہے تم منشی سمیع اللہ [illegible] کے پاس چلے جاؤ۔ کہنا ان کا بیٹا ہوں، وہ ضرور تمھاری مشکلات آسان کر دیں گے۔

منشی سمیع اللہ کون تھے؟ اور کہاں رہتے تھے؟ دہلی شہر سے نکل کر جو سڑک بریلی [illegible] کی طرف [illegible] ہے اس کے [illegible] [illegible] کا [illegible] تھا۔ یہ کافی [illegible] رقبہ تھا اور یہاں ایک [illegible] [illegible] ہوئے [illegible] [illegible] جہاں اب دہلی کی ایک شاندار عمارت [illegible] ایک چھوٹی سی عمارت [illegible] منشی صاحب مرحوم گوشہ گیر تھے۔

منشی [illegible] میں ملازم تھے۔ انگریزی سے نابلد [illegible] [illegible] تھے ان کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

ہیں، تھوڑی دیر یہ عالم [illegible] کتاب میں سے کچھ پڑھتا ہے اور [illegible]۔ اسی طرح تمام وقت دونوں شغل جاری رہتے۔ یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے [illegible] کی یہ بات آج تک یاد ہے۔

ایک دن چار بجے شام میں منشی صاحب مرحوم کے دولت کدے، نہیں نہیں دولت کدے تو امرا کے مقسوم ہیں، انھیں عالموں کے آستانے کہنا چاہیے جہاں فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ اسی آستانے کی طرف گزر ہوا۔ اس آستانہ پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ مرحوم تن تنہا ایک کوٹھری [illegible] بیٹھے ہیں اور چاروں طرف سناٹا ہے۔ اتنی گھنی آبادی اس وقت نہیں تھی جیسی اب ہے کہ چپہ چپہ پر شور و غل، خوفناک [illegible] آواز سنائی دیتی۔ آپ مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے پوچھا کون صاحب؟ عرض کیا ان کا بیٹا ہوں [illegible] آؤ بیٹھو اور خود [illegible] ہو گئے۔ پھر فرمایا کیسے آئے؟ میں نے اپنی [illegible] بیان کیں۔ ساتھ ہی ساتھ والد صاحب کی اور اپنی گفتگو بھی بیان کر دی اور اپنی حاضری کی علت غائی بھی۔ پوچھا کس فارسی انشا پرداز اور شاعر کے انتخاب تمھاری کتاب میں ہیں؟ عرض کیا انشائے ابوالفضل، اخلاق جلالی، اخلاق محسنی، سہ نثر ظہوری، چہار عنصر بیدل نثر میں اور جلد ختم ہو پایا تھا کہ بیدل کا نام گوش گزار ہوتے ہی ایک امنگ میں آ کر بیدل کی غزل کا مطلع پڑھا۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درآ
تو ز غنچہ کم ندمیدہ‌ای در دل کشا بہ چمن درآ

اتفاق سے مجھے بھی اس غزل کے کچھ شعر یاد تھے۔ میں نے شعر پڑھا۔

بہ کدام آئینہ مائلی کہ ز فرصت این ہمہ غافلی
[illegible] سنبل [illegible] و [illegible] درآ

فرمایا صاحب [illegible] کو شعر پڑھ دیا۔ میں نے اپنی [illegible] کے مطابق معنی بیان کیے [illegible] [illegible] کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ [illegible] [illegible] تمام مشکلات حل کر لیں گے۔ [illegible] مطلب [illegible] بتاتا ہوں۔ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کو واقعیت حاصل ہو گی

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

[illegible]

ہولی

سید شفیق [illegible]

چمن میں پھر خوشی کا دور آیا ہے
زمانہ پھر نوید عیش دیتا ہے

ہوا گلشن کی ہر سو ہے طرب افزا
بہار آئی ہے آیا روز ہولی کا

جوانی کی امنگوں کا یہ موسم ہے
نشاط و کامرانی کا یہ موسم ہے

مسرت کے پھریرے سب اڑاتے ہیں
خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں

مرادوں کے بر آنے کا زمانہ ہے
جوانی کے لیے ہولی بہانا ہے

فضا سے ہر طرف مستی برستی ہے
مے و ساقی کی خواہش بھی بھڑکتی ہے

مزاج حسن ہولی میں نکھرتا ہے
جنون عشق ہولی میں ابھرتا ہے

جہاں دیکھو وہاں رنگوں کا طوفاں ہے
غضب کا آج یہ رنگ بہار اللہ ہے

عبیر و رنگ سے رخ ہو گیا گلگوں
حسینوں کا بنا ہے جسم بوقلموں

ہنسی ہے دل لگی ہے قہقہے بھی ہیں
پری زادوں کے ہر سو جمگھٹے بھی ہیں

بھلاتے ہیں غم ایام ہولی میں
بہت [illegible] دشنام ہولی میں

بنالے دوستی ڈالے وہ ہولی ہے
کرے جو دشمنی کو دور ہولی ہے

مبارک ہو یہ ہولی اہل بھارت کو
[illegible]

پیارے لال [illegible]

آمد بہار

مختار حسین مختار

پھر نئے انداز سے آئی ہے گلشن میں بہار
ہے ہوا کیسی سبک موسم ہے کتنا خوشگوار

ہے فضا میں کیسی بھینی بھینی پھولوں کی مہک
عطر بیزی کر رہی ہے صحن گلشن میں بہار

بلبلوں کے زمزمے کانوں میں پھر آنے لگے
کر رہی ہے صحن گلشن میں نوا سنجی ہزار

ہیں نئی پوشاک پہنے سب جوانان چمن
اور اوڑھے ہیں مختلف پھولوں کے ہار

محو آرائش کہیں پر تو ہے کوئی سیم تن
اور کہیں مصروف زیبائش ہے کوئی گل عذار

ہو کے دیوانہ کوئی صحرا کی جانب چل دیا
کر رہا ہے بیخودی میں کوئی جامہ تار تار

چھا رہا ہے سر پہ پھر ابر بہاری آج کل
ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی ہے پھر ہوائے خوشگوار

پھول کر مارے خوشی کے ناچتا پھرتا ہے وہ
صحن گلشن میں جو مالی کو نظر آیا نکھار

جس طرف دیکھو جھکے ہیں بہت ساون کے پیڑ
ہو گئی سبزہ فروشوں کی امیدوں میں بہار

پھر گئی کے بعد شادی ہے بعد پژمردگی کے غم
انقلاب روز مرہ ہے یہ دنیا کا مدار

شکر کیجے [illegible] مختار اس اللہ کا
نعمتوں کا جس کی دنیا میں نہیں کوئی شمار

[illegible]



انیس

میر انیسؔ کا غیر مطبوعہ کلام

★ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

میر انیسؔ ان خوش قسمت شعرا میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جن کا دامنِ شہرت دامنِ قیامت سے وابستہ ہے۔ ان کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہو رہی ہے۔

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

انیسؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ان کے پردادا میر ضاحک، دادا میر حسنؔ، والد میر خلیقؔ اور تین چچا میر خلقؔ، میر خُلقؔ اور میر محسنؔ سبھی مسلم شاعری رکھتے تھے اور مرثیہ کہتے تھے۔ انیسؔ نے بالکل بجا فرمایا۔

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؔ کی مداحی میں

مراثی انیسؔ پہلی مرتبہ مطبع نولکشور لکھنؤ سے کئی جلدوں میں چھپے۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں اسی مطبع سے کئی ایڈیشن شائع ہوئے [illegible] بدایوں سے بھی مجموعہ کلام انیسؔ تین ضخیم جلدوں میں آج سے کوئی ۵۰ سال پہلے بڑے سلیقہ و ڈھنگ سے چھپا۔ پاکستان میں بھی یہ چھپے لیکن اس کے باوجود انیسؔ کا کلام کمیاب ہوتا جا رہا ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ دلی میں مرکز کی اعانت سے جناب مالک رام صاحب کی نگرانی میں مجموعۂ کلام انیسؔ ترتیب دیا جا رہا ہے۔

میر انیسؔ کا بہت سا کلام ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب [illegible] کے ذخیرۂ مراثی میں ان کے بہت سے قلمی اور غیر مطبوعہ

زیر نظر خطاطی میں ذیل میں چند ابیات اور غیر مطبوعہ مرثیے درج کیے جاتے ہیں:

لحد میں سامنے جب منکر نکیر حساب آیا — گناہ دیکھ کے کیا کیا مجھے حجاب آیا
پیام مرگ ہے ہوئے سفید او غافل — کبھی سنا ہے کہ پیری گئی شباب آیا
بہ امید شفاعت پہ بخشش آئے گی — خدا نے رحم کیا جب مجھے حجاب آیا
عطش سے [illegible] کھینچی ہے [illegible] — مگر زبان پہ حرف سوالِ آب آیا
عجب جگہ ہے نہ نکلیں مرقدِ شبیرؔ — کہ نامراد گیا جو وہ کامیاب آیا
جہاں سے جاتے ہیں شیعہ تو کہتے ہیں قدسی — یہ قافلہ سوئے جنت بہت شتاب آیا
پکارتا ہے یہ رضواں خوشا نصیب آؤ — تمہارے لینے کو فرزند بوترابؑ آیا
چلو چلو کہ علیؑ منتظر ہیں کوثر پہ — بڑھو بڑھو کہ بہشت بریں کا باب آیا
رضا کی راہ کو چھوڑا ہو شہ کے ماں نے — مسافروں کو بہادر کے خود جواب آیا
سر حسینؑ گیا شام میں جو وقت سحر — پکاری خلق کہ نیزے پہ آفتاب آیا
پئے دعا کو جو وعدہ ہے ہوئے قائم — ملک نے پھول نثاروں کے آفتاب آیا
سیاہ خانۂ زنداں میں جب چلے عابدؑ — ہوا یہ شور کہ ظلمت میں آفتاب آیا
حسینؑ و حُر کی ملاقات تھی کہ عالم نو — ادھر سے چاند بڑھا تھا کہ آفتاب آیا
یہ ہو سرور وہ ہوئے ذی نصیب اے قسمت — کہ اپنے سایے سے جن کو رد حجاب آیا
ندا یہ آئی کہ گردن اٹھا کے پہچانے حُر — معانقے کے لیے مالک الرقاب آیا
رخ حسینؑ سے میں نے کبھی نہ دی تشبیہ — چمک کے سامنے سو بار آفتاب آیا
غم حسینؑ میں جب آہ کی تو برسا اشک — ادھر چمک گئی بجلی ادھر سحاب آیا
ورق الٹ گیا برہم ہوئی ہر اک صحبت — یہ کس طرح کا زمانے میں انقلاب آیا

۱۔ تفصیل کے لیے [illegible] ملاحظہ فرمائیے۔

ادھر چلے لب سرور دل ہے پامال یہیں — ادھر فلک پہ گرجا گیا سحاب آیا
ظہور نور محمد ہوا خلیل کے بعد — چھپا تو چاند [illegible] آفتاب آیا
جب آفتاب میں نکلے محمد عربی — تو چرخ کے سر یہ [illegible] سحاب آیا
نہ سر اٹھا تو پھر جہاں میں اے غافل — صدا یہ دے گیا [illegible] حباب آیا
وہ کیا نمود کرے آہ پھر ہستی میں — جو ایک دم کے لیے [illegible] حباب آیا
فلک پہ شور تھا پہنچے جو کربلا میں حسین — کہ اپنی خاک پہ فرزند بو تراب آیا
جہاں میں رہتی ہے جو دشمنوں کی ماہ صفت — سحر کو چاند چھپا دن کو آفتاب آیا
ملا حجاب گناہ تو سیاہ کاری سے — سفید بال ہوئے موسم خضاب آیا
پھر کی پیاس کو بھولے نہ ایک دم عابد — بھری جگر پہ چلی جب خیال آب آیا
ورق ہیں مصحف ناطق کے اکبر و اصغر — جب ہدیں یہ سوال تو لا جواب آیا
شب آئی جب تو یہ نانی سے کہتی تھی سکینہ — کہ دم الجھنے لگا وقت اضطراب آیا
نہ موت آتی ہے مجھ کو نہ نیند آتی ہے — امیں کو آئی اجل خواب کو بھی خواب آیا
وہ کہتی تھیں کہ میں قربان جاؤں لیٹے ہو — یہ کیا غضب ہے شب آئی کہ اک عذاب آیا
جو زیست ہو تو خدا کا ملے گا [illegible] — سنو گی اب کہ جگر جنہ بو تراب آیا
کسی کا کون ہے اکبر جب ہم کو بھول گئے — گیا تھا جلد سو قاصد بہت شتاب آیا
نہ ماؤں کی علی اکبر مجھے بھلا دیں گے — بغل میں قبر کی جب سو گیا تو خواب آیا
اٹھانے لاشے کو جب پیمبر دل [illegible] — تو سید الشہدا کو عرش سے خطاب آیا
زمیں پکاری لحد میں اتارا جب مجھ کو — نہ ہے نصیب غلام ابو تراب آیا
ادھر چلے لب منکر نکیر بہر سوال — مری زباں یہ برابر ادھر جواب آیا
اٹھائی لذت تلخی تنگنائے جہاں — عرق عرق ہوا شیشے میں جب گلاب آیا
خوشا نصیب تھے حر کے عجب تھا بخت رسا — نکل کے کفر سے سوئے رہ صواب آیا
غش آ گیا یہ چلا کے زینب دلہن صبر — دولہن کو دولہا کے لاشے پہ بھی حجاب آیا
لحد میں صیاد جو تھا قاتل کے پھولوں کا — اٹھائی چادر گل جب جو تو خواب آیا
زمین کہتی تھی [illegible] دیکھ قبر کو دیکھ — کہاں تھا تو کہ مرے خانماں خراب آیا
وطن میں جاؤں گا کس نہ کہتے تھے عابد — علی کے لال کو مٹی میں گرداب آیا
ہیں ایک حال پہ شبیر خدا کے در کے فقیر — خبر نہیں کہ گیا کب کب انقلاب آیا

کوئی ابھی سو تلے ہے مری ہیرا مقتدا ظل
اٹھو انیس اٹھو سر پہ آفتاب آیا

جگہ دبائی جو کثرت میں سانس لینے کی — میان بحر فنا دم نمود حباب آیا

زمیں کانپ گئی جب چلا ملک کی نعت جانشد — مری زباں پہ جو [illegible]
[illegible] سب کے مضمون پہ جو کہ مرے آگے — حرا [illegible]
[illegible] — [illegible] سے جواب
[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible]
[illegible] ہے ہم اس حسرت [illegible] — [illegible]

الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ
انیس ملک سخن میں بھی انقلاب آیا

(٢)

ہم ان کا جو مصیبت میں نام لیتے ہیں — جو ڈوبتے ہیں سفینے کو تھام لیتے
سحر کو اٹھ کے زباں سے یہ کام لیتے ہیں — خدا کے بعد محمد کا نام لیتے
پہنچ کے خلد میں پیاسے حسین کے خدا — علی کے ہاتھ سے کوثر کا جام لیتے
یہ زائران امام زمن کا رتبہ ہے — کہ جن کے سبط محمد سلام لیتے
خوشا نصیب کہ آقا کی اک زیارت میں — ثواب حج کا علی کے غلام لیتے
نکل کے فوج سے حر نے کہا کہ اے غافل — جناں کی راہ علی کے غلام لیتے
کوئی گھڑی میں ہوا کی طرح اڑا کے فرس — رکاب شاہ کو آ کے جھک کے تھام لیتے
سپر کے ہر میں جب تک درد اٹھتا ہے — جگر کو بیٹھ کے شبیر تھام لیتے

انیس ظلم سے اعدا کے مہدی ہادی
ظہور کر کے بس اب انتقام لیتے ہیں

(٣)

غنچے ہوا سے چمن میں جگر لیے ہوئے — بھرائی اپنی چشم گہر سے لیے ہوئے
مجلس میں ہیں نذر شہنشاہ کربلا — دست حر دے سجدے گوہر لیے ہوئے
سر ننگے [illegible] پیغمبر بچے — بیٹے کی لاش سبط پیمبر لیے ہوئے
بھائی کی لاش پہ جو گئے سرور امم — گودی میں [illegible] علی اکبر لیے ہوئے
عبرت کی ہے جا کہ گیا جانب عدم — دنیا سے [illegible] سکندر لیے ہوئے
کہتے تھے شاہ دیکھو کیا مجھ آل کو — [illegible] کربلا کو مقدر لیے ہوئے
عباس ہنس کے کہتے تھے دیکھا یہ مرتبہ — [illegible] لیے ہوئے
نیچے ہے [illegible] کے حسین — [illegible] علی اکبر لیے ہوئے
[illegible] — [illegible] لیے ہوئے

اکبر گئے جوانی میں تو بے نظارہ تھے — ہاتھوں میں برچھیوں کو تنگ لیے ہوئے
یوسف چھپا ہوا تھے مونہہ اپنا نقاب میں — حیران تھا آئینہ کو سکندر لیے ہوئے
حورِ کوثر بھی ہیں منتظر پئے تشنہ لب — ہاتھوں میں اپنے ساغرِ کوثر لیے ہوئے
عباس مشک بھر کے چلے جب بہ شاہ — بھائی ہیں آج دوش پہ کوثر لیے ہوئے
روتی تھی بنت فاطمہ زہرا کے سر کے بال — ہنستا تھا شمر ہاتھ میں چادر لیے ہوئے
ماتم بپا تھے دریا پہ شاہ دیں — ہاتھوں میں اپنے دستِ برادر لیے ہوئے
کس حوصلے پہ صبر کے جوہر دکھا گئے حسینؑ — کھائے تھے زخم تیغ دو پیکر لیے ہوئے
ہنستے تھے کس شکوہ سے زینبؑ کے لاڈلے — ہاتھوں میں نیزوں کو برابر لیے ہوئے
کہتے تھے شاہ شوکتِ عباس دیکھ کر — گویا علم ہے دوش پہ جعفر لیے ہوئے
آئے پھر شاہ خیمہ میں مقتل سے پلٹ کے ساتھ — گودی میں نقدِ جاں علی اصغر لیے ہوئے
اللہ رے زور بازوئے دستِ خدا کا زور — دو انگلیوں پہ تھے درِ خیبر لیے ہوئے
آواز فاطمہ نے دی شہ کو وقتِ ذبح — آئی ہوں لاشِ محسنِ بے پر لیے ہوئے
آنکھیں پھرا کے دیکھتے ہو کیا ادھر ادھر — اماں تو دیر سے ہے ترا سر لیے ہوئے
روحِ نبی پکاری بس اب ہاتھ تھام لو — ماں کھڑی ہے قتل کا محضر لیے ہوئے
نیزے پہ تھا جو دھوپ میں سبطِ نبی کا سر — سورج بھی تھا ظاہر منور لیے ہوئے
کعبہ میں بہرِ شکلی واہ رے عروج — کاندھے پہ تھے علی کو پیمبر لیے ہوئے

چھیڑا سمندِ طبع کو تعریفِ شہ میں جب
مضموں خود آیا سامنے لشکر لیے ہوئے

(۴)

خاکِ درِ شبیر ہے جاگیر ہماری — اے عاصیو کیا خوب ہے تقدیر ہماری
صحرا میں لاکھ آپ تو شہ روکے پکارے — تربت بھی یہیں ہوئے گی تعمیر ہماری
شکوہ کرتے تھے اصغر پلاؤ ہمیں پانی — حالت ہے بہت پیاس سے تغییر ہماری
دم گھٹتے تھے پانی کا ذکر ہی نہیں ہے — ہے تشنۂ خوں آپ کی شمشیر ہماری
کہتی تھی سکینہ ہمیں لا دیجیے پانی — ہے خشک زباں یا شہ دلگیر ہماری
شہ نے کہا مجبور ہیں لاچار ہیں بیٹا — سنتا نہیں یہ لشکرِ بے پیر ہماری
کبریٰ نے کہا بیاہ کے دن رانڈ ہوئے ہم — کیا سو گئی اے صاحبو تقدیر ہماری
مسلم نے کہا بس [illegible] ظلم کرتے ہو اعدا — پھر لاش نہ تم کیجیو تشہیر ہماری
شکوہ [illegible] مجبور نہ سمجھیں — چلتی ہے تو رکتی نہیں شمشیر ہماری
آواز نبی آئی [illegible] امت کو نہ مانو — خاطر ہے جو یا حضرت شبیر ہماری

کہتے تھے نبی لاشۂ اکبر پہ رو رو — افسوس کہ اب مٹ گئی تصویر ہماری
کہتی تھی سکینہ کہ چچا منہ نہ چھپاتے — گر خشک نہ ہوتی ہوئی تسبیر ہماری
تھا دھیان دمِ ذبح بھی یہ شاہِ امم کا — نیزے سے کہیں آئے نہ ہمشیر ہماری
عابد نے کہا ہم کو نہیں طاقتِ رفتار — اور اس پہ کئی من کی ہے زنجیر ہماری
شہ کہتے تھے کیوں ذبح میں کرتا ہے تو ظالم — ثابت ہے بتا کون سی تقصیر ہماری
آئی تھی صدا رن میں گلوئے شہِ دیں سے — گردن تو نہ تھی لائقِ شمشیر ہماری
بے رحم ہے اپنے پیمبر کا نواسا — کاٹی گئی گردن دمِ تکبیر ہماری

ہوتی ہے جو مشکل تو انیس گھبرا کے
کہتے ہیں مدد حضرت شبیر ہماری

(۵)

محراب میں کہتی یہ زہرا کی جائی ہے — سر کٹا ہے یہ بھائی کا نانا دہائی ہے
کہتا تھا شمر فوج سے لڑنا سمجھ کے آج — عباس سے نہیں یہ علی سے لڑائی ہے
کہتے تھے شاہ بچوں کی کیوں کر بجھے گی پیاس — دریا پہ ناریوں نے تو چوکی بٹھائی ہے
اکبر جو آیا رن میں تو لشکر سے بولا شمر — اس کو بھی مار لو تو پھر آگے صفائی ہے
بانو پکاری شاہ کو ڈیوڑھی پہ آن کر — میری تمام عمر کی لٹتی کمائی ہے
دوڑو خبر لو بیٹے کی اے فاطمہ کے لال — برچھی ستم کی سینہ پہ اکبر نے کھائی ہے
کہتی تھی بانوئے بیتاب مارے پیاس کے — اصغر کو میرے موت پہ ہچکی سی چھائی ہے
زینب پکاری کر کے مونہہ اپنا سوئے نجف — جلد آ دیا علیؑ دم مشکل کشائی ہے
کچھ بس نہیں ہے چلتا کھڑی دیکھتی ہوں میں — بھائی پہ میرے فوجِ ستم کی چڑھائی ہے
گھر مصطفیٰ کا ہوتا ہے برباد ظلم سے — رن میں بتول پاک کی لٹتی کمائی ہے
بانو یہ بین کرتی تھی اصغر کی لاش پر — واری گئی یہ ماں ترے لاشے پہ آئی ہے
ہر گز نہ ہو گا صاحبِ اولاد وہ لعیں — جس نے یہ خاک تیری [illegible] لائی ہے
زینب پکاری سبطِ نبی کا کٹا سر — اے شمر [illegible] یہ کیسی حیائی ہے
جو شہ کے سر کو پوچھتا زینب یہ کہتی تھی — لوگو میں کیا بتاؤں کہ یہ میرا بھائی ہے
حاکم نے پوچھا شمر سے اپنا جو منہ چھپائے — یہ کون ہے جو شام کی بندی بنائی ہے
بولا یہ شمر خواہرِ شبیر ہے یہی — زینب اسی کا نام ہے زہرا کی جائی ہے

مداح ہے جو سبطِ پیمبر کا اے انیس
بے شبہ اس کی خلدِ بریں تک رسائی ہے

(۶)

کب بزمِ غم میں شہ کے سلامی کو کل پڑے — جب تک نہ [illegible] سر کے ساتھ ملائک [illegible] پڑے

سر کیوں نہ روز عقدہ کشا دیں سے وہ بنا — اس طرح جب غریب کے چہرے پہ بل پڑے
عباس شہ سے کہتے تھے بھائی قبول ہے — گر مجھ پہ لاکھ تیغ تمہارے بدل پڑے
بانو نے جب سنا علی اکبر ہوئے شہید — نزدیک تھا کہ منہ سے کلیجہ نکل پڑے
خنجر کے نیچے کہتے تھے شبیرؑ یہ دعا — امت کی مغفرت میں یارب خلل پڑے
پانچوں سے کم نہ تھے شجاعانِ دیں — تھے ان میں لاکھوں غول بھی تنہا [illegible] پڑے
میداں میں خوں میں گرتے ہوئے لاشے شہیدوں کے — کہتے تھے کہ خلقت ادھر کو چل پڑے (کذا)[1]
آیا جو سر حسین کا آگے یزید کے (ق) — جس کی نگاہ جا پڑی آنسو نکل پڑے
کھٹکے چھڑی سے ہونٹ جب اس نے حسینؑ کے — زینبؑ پکاری کہ ترا ہاتھ گل پڑے
دریا سے دور تک گئے منہ پھیرے اہل بیت — تا پانی کے لیے نہ سکینہ مچل پڑے
زنداں میں جب بیٹھیں زینبؑ و کلثوم کہتی تھیں — اور ان کے ہوں مدینے میں خالی محل پڑے
فریاد حرم کی یہ کہتے تھے اہل شام — شاید یہ لوگ قید میں پہلے پہل پڑے

ایسا سلام نظم کیا تو نے اے انیس
جو اہل فہم اس کو سنے اور اچھل پڑے

(۷)

سلامی چشم میں آنسو ہمیں یاد آیا چھلکتا ہے — جگر کے داغ ہیں یا کھیت لالہ کا لہکتا ہے
دم تحریر گریہ زینی ہے یا سطروں میں کاغذ پہ — صریر کلک ہے یا باغ میں بلبل چہکتا ہے
چلے تھے کربلا کی راہ کو پہچان کر حضرت — وگرنہ رہبر عالم کہیں رستا بھٹکتا ہے
حرم نے یہ کہا جب آسماں کو دیکھ کر شہ نے — علی اکبر اذاں دو صبح کا تارا چمکتا ہے
کہا صغرا نے شاید میرے بابا جان پیاسے ہیں — گلے میں ساتویں تاریخ سے پانی اٹکتا ہے
زمین کربلا پہ فاطمہ کے پھول بکھرے ہیں — شہیدوں کی یہ خوشبو ہے کہ سب جنگل مہکتا ہے
شہ دیں دیکھتے ہیں شوق سے ہر سمت صحرا میں — کہ جیسے کوئی آنے کی کسی کی راہ تکتا ہے
علی اکبر طلب کرتے ہیں رخصت کو جو کیا جانے — نگہ ہر بار کو بچپن کے غم سے وہ زینب کو تکتا ہے
گل نرگس کا غم میں نوحہ خواں ہر ایک بلبل ہے — صدا فریاد کی آتی ہے جب غنچہ چٹکتا ہے
وہاں جناب طلب تھا یہاں آپ جانے کا — ادھر فاقہ ہے اور کھانا ادھر لشکر میں پکتا ہے
تن رنجور پر ہاتھ اپنا زینب رکھ نہیں سکتی — تپ غم سے بدن سجاد کا ایسا دہکتا ہے
کہا بانو نے تیر چلتے ہیں کلیجے پر — مرا ہو جب یہ بچہ نرگسی آنکھوں سے تکتا ہے
یہ ننھے ننھے دو [illegible] کھاتے ہیں [illegible] — سوکھے ہوئے ہیں گلے [illegible] تالو چپکتا ہے
مروّج وار پہ گردن جو مل جاتی ہے پیاسی — گلے پر سانس جب [illegible] ٹپکتا ہے
[illegible] — [illegible]
دکھایا حضرت عباس یوں جاتے ہیں دشمن پر — کہ جیسے شیر جانب آہو لپکتا ہے
[illegible] — [illegible] بلکتا ہے
[illegible] سلام کرتا ہے — ہر ایک [illegible] زنداں [illegible]

انیس [illegible] کرنے قبر کی منزل
لحد کا دھیان جب آتا ہے [illegible]

میر انیس نے کتنے سلام کہے تھے اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ان کے مطبوعہ مجموعہ مراثی میں چند سلام شامل ہیں۔ نظامی پریس لکھنؤ کے مالک نے چھوٹے سائز ۲۰×۲۶ میں میر انیس کے ۸۰ سلاموں کا انتخاب شائع کیا ہے۔ غالباً صاحب مطبع کو اتنے ہی سلام دستیاب ہوئے تھے کیونکہ انتخاب اچھا نہیں ہے۔

میر انیس کے انتقال کے صرف ۴ سال بعد میر غلام علی نے ۱۲۹۶ھ میں گلبرگہ حیدرآباد میں میر خلیق، میر انیس، میر مونس اور میر نفیس کے چند مرثیے اور کچھ سلام مرتب کیے تھے۔ بعد میں یہ مجموعہ مراثی ذخیرۂ ثواب کے نام سے سید اسد اللہ عرف میر نواب کی فرمائش سے سید مستجاب حسین نے اپنے مطبع دارالصنائع گلبرگہ میں ۱۲۹۶ ہجری میں شائع کیا۔ تاریخ طباعت "ذخیرۂ ثواب" سے ماخوذ ہے۔ اس میں میر انیس کے سات سلام درج ہیں۔ ذخیرۂ ثواب اب نایاب ہے۔ اس کا ایک نادر الوجود نسخہ دار السلام ندوہ میں محفوظ ہے۔

اسی سال سید محمد عنایت حسین تخلص حقیقی، ساکن سہارنپوری نے سلاموں کا مجموعہ شمعِ تعزیت کے نام سے ۱۲۹۶ ہجری میں شائع کیا۔ شمعِ تعزیت کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۶ ہجری برآمد ہوتے ہیں۔ یہ کتاب بھی ابھی نایاب ہے۔ اس کا غالباً واحد نسخہ جناب سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں انیس، مونس، نفیس، باد، آباد، دبیر، خلیق، فصیح، دلگیر، ضمیر، ناظم، افسردہ، قاسم وغیرہ کے ۵۲۰ سلام درج ہیں۔ کتاب بڑے سائز میں ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

جناب [illegible] صاحب محمود آباد کے ذخیرۂ مراثی میں میر انیس کے

---

[1] مصرعہ ثانی اس طرح ہوگا: کہتے تھے کہ ظلمت سے رو بھی چل پڑے۔ لفظ اور کتابت میں ناقص ہے۔

سلاموں کا ایک قلمی اور غیر مطبوعہ دیوان محفوظ ہے۔ راقم الحروف نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ ذیل میں ہر سلام کے مطلع کا پہلا مصرعہ ردیف وار ترتیب سے درج کیا جاتا ہے۔ دیوانِ سلام میں مذکورہ بالا سلام درج نہیں ہیں۔ نسخۂ مسعود سے مطلب وہ سلام جو سید مسعود حسن صاحب رضوی کے کتب خانے میں ہیں۔ شمعِ تعزیت اور ذخیرۂ ثواب سے مراد سلاموں کے وہ مجموعے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

نمبر شمار	مطلع	ردیف	تعداد اشعار	کیفیت
۱	اسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا	دیکھا	۲۱	نسخۂ مسعود نامکمل، شمعِ تعزیت ۱۹ شعر
۲	پڑا جو عکس تو ذرہ بھی آفتاب بنا	بنا	۱۰	
۳	دل سیر ہے گدائے جناب امیر کا	کا	۲۴	شمعِ تعزیت ۲۵ شعر[1]، نسخۂ مسعود میں بھی ہے۔
۴	غم شہ کا جس نے بیان کر دیا	کر دیا	۱۸	
۵	گذر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا	نہ تھا	۲۴	ذخیرۂ ثواب ۱۰ شعر
۶	علی سا بھی نہ کوئی عادل زمانہ ہوا	ہوا	۲۴	شمعِ تعزیت ۲۴ شعر، نسخۂ مسعود
۷	صبر کرتے تھے سلامِ شہ والا کیا کیا	کیا کیا	۳۲	شمعِ تعزیت ۲۶ " نسخۂ مسعود
۸	بیکسی کا شہ کی جس پر چارہ گیا	رہ گیا	۲۲	
۹	گھر سے جب زوار دو منزل گیا	گیا	۱۲	
۱۰	حسین یوں ہوئے اے ہجرؔی وطن سے جدا	سے جدا	۱۸	شمعِ تعزیت ۱۲ شعر
۱۱	اے ہجرؔی ہے سب کا مقدر جدا جدا	جدا جدا	۳۲	مطبوعہ نظامی میں ۱۰ شعر
۱۲	بھرا ہے غم شہ سے سینہ ہمارا	ہمارا	۲۲	نسخۂ مسعود ۱۶ شعر، نسخۂ ثانی ۸ شعر، شمعِ تعزیت ۱۴ شعر
۱۳	ہجرؔی شاہ کا ہوں خلد میں ہے گھر میرا	میرا	۳۱	
۱۴	آب خنجر سے گلا جب شاہ کا تر ہو گیا	ہو گیا	۲۰	
۱۵	کسی کو ہجرؔی ہمدم نہ ہنگام اجل پایا	پایا	۲۲	
۱۶	لحد میں سامنے جب دفترِ حساب آیا	آیا	۳۱	
۱۷	ہجرؔی رن میں شہ پہ ستم بے حساب تھا	تھا	۱۱	شمعِ تعزیت ۱۱ شعر
۱۸	ہجرؔی ڈیوڑھی پہ زینب نے جو آ کر دیکھا	دیکھا	۱۷	
۱۹	ہجرؔی جس نے مزار شہِ ذیشاں دیکھا	دیکھا	۲۴	شمعِ تعزیت ۲۱ "
۲۰	جیتا ہے ہر اک دیدۂ بینا ہے ہمارا	ہمارا	۹	شمعِ تعزیت ۹ "
۲۱	ہجرؔی جبکہ شہ نے سر اپنا کٹا دیا	دیا	۲۰	
۲۲	ہجرؔی شہ کے عوض رن میں جو تھا سر دیتا	دیتا	۴۲	
۲۳	کیا کیا نہ زمانے میں سنا، کیا نہیں دیکھا	دیکھا	۲۶	نسخۂ مسعود ۹ شعر
۲۴	رو کے کہتی تھیں زینب یہ رن میں	میں		
	ہاسے زہرا کے پیارے حسینا		۷	مستزاد نوحہ
۲۵	سنبل تھے پریشاں زلفِ اکبر دیکھ کر	دیکھ کر	۱۸	
۲۶	ہجرؔی مسند ہوں پاس در گاہ	پر	۱۸	

[1] [illegible] مطلع نہیں ہے

نمبر شمار	مطلع	ردیف	تعداد اشعار	کیفیت
۲۷	بر چشم ہے مجرائی کی دریا کے برابر	کے برابر	۳۱	نسخۂ مسعود ۱۹ شعر، شمع تعزیت ۳۱ شعر
۲۸	شہ کہتے تھے جنگاہ سے آؤ علی اکبر	علی اکبر	۱۴	نوحہ
۲۹	کہتی تھی صغرا یہی اے مرے سب سے سرِ پدر	پدر	۱۱	نوحہ
۳۰	کچھ اور جو سخن حسین اہل سخن کے پاس	کے پاس	۱۴	شمع تعزیت ۱۲ شعر
۳۱	خوشا زمین معلی نسب ہے فضائے نجف	نجف	۱۱	
۳۲	شہ کو تا یا مجرائی اعدائے یاں تلک	تلک	۲۶	
۳۳	اے سلامی تیغ دشمن کارگر ہوتی نہیں	ہوتی نہیں	۱۸	
۳۴	شبیرِ امامِ زماں کھینچتے ہیں	کھینچتے ہیں	۳۸	نسخۂ مسعود ۱۹، نسخۂ ثالثہ ۲۶ شعر
۳۵	مرا مازِ دل آشکارا نہیں	نہیں	۱۵	مطبوعہ نظامی ۱۱ شعر
۳۶	ضبط گریہ اتم سرور میں ہو سکتا نہیں	سکتا نہیں	۱۵	ذخیرۂ ثواب ۵، نسخۂ مسعود ۱۱ شعر
۳۷	سلامی کی حسرت کا چارہ نہیں	نہیں	۳۹	شمع تعزیت ص۲۷ ۳۰ شعر
۳۸	سچ دنیا سے کبھی چشم اپنی نم رکھتے نہیں	رکھتے نہیں	۱۹	
۳۹	شبیر کے غم میں رو رہے ہیں	رہے ہیں	۱۳	ذخیرۂ ثواب ۱۸ شعر
۴۰	شاہ تنہا ہیں مددگار نہیں	نہیں	۱۸	
۴۱	نہ منصب سے غرض نے خواہش جاگیر رکھتے ہیں	رکھتے ہیں	۱۸	
۴۲	اشکوں کا شور ہے مری چشم پر آب میں	میں	۲۹	
۴۳	نمود و بود کو عاقل حباب سمجھے ہیں	سمجھے ہیں	۳۳	
۴۴	السلام اے لحدِ اقدس و اعلائے حسین	حسین	۴۰	
۴۵	تحریر کی جو مجرائی شہ کے علم کی شان	کی شان	۱۱	
۴۶	زرد چہرہ ہے نحیف و زار ہوں	ہوں	۳۸	مطبوعہ نظامی ۱۳ شعر
۴۷	کہتی تھیں زینبِ دل خستہ میرے بیر حسین	حسین	۹	نوحہ
۴۸	دور کر دیتا ہے اک ذرہ سب آزاروں کو	کو	۱۴	
۴۹	جب شہ کا حلق مجرائی پانی سے تر نہ ہو		۲۳	
۵۰	سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو	کو	۳۵	مطبوعہ ۱۳ شعر
۵۱	سلامی کہتے تھے اعدا رلاؤ زینبؑ کو	زینب کو	۳۲	نسخۂ مسعود میں خلیق کے نام منسوب ہے لیکن ایک اور نسخے میں انیس کا تخلص مقطع میں درج ہے اس میں ۲۱ شعر ہیں
۵۲	شہ کی یاد آتی ہے جب تشنہ دہانی مجھ کو	مجھ کو	۱۱	
۵۳	مجرائی فوج یوں تھی شہ کربلا کے ساتھ	کے ساتھ	۲۹	نسخۂ مسعود ۲۲ شعر ناتمام، شمع تعزیت ۲۴ شعر
۵۴	سر تھے نیزوں پہ سلامی سرِ شبیر کے ساتھ		۳۶	
۵۵	کوئی انیس کوئی آشنا نہیں رکھتے	نہیں رکھتے	۳۲	
۵۶	ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے	پیدا ہوئے	۱۳	نسخۂ مسعود اول و دوم ۱۱ شعر و نسخۂ دیگر ۱۲ شعر

نمبر	مطلع	ردیف	تعداد اشعار	کیفیت
۵۷	سلامی چشم جسد دیدہ کے خون دل ٹپکتا ہے	ہے	۲۲	نسخۂ مسعود ۲۲ شعر
۵۸	قضا پرنو کربلا ہو گئی	ہو گئی	۳۸	
۵۹	بکائیں کئی شب سحر ہو گئی	ہو گئی	۱۳	
۶۰	جو بخشش کسی سے تو لا نہ چاہیئے	نہ چاہیے	۳۰	
۶۱	صورت آئینہ استغنا کے جوہر کھل گئے	کھل گئے	۶	
۶۲	مجرائی قید سے جب عابد بے پر چھٹے	چھٹے	۳۳،	
۶۳	سلامی خلق کا آغاز و انجام اس پر ظاہر ہے	ہے		
۶۴	عجب وقت ہے اور عجب انجمن ہے	ہے	۴۲	نسخۂ مسعود ۲۵ و نسخۂ دیگر ۴۴ شعر
۶۵	خیال چہرہ شب وقت خواب رہتا ہے	رہتا ہے	۱۱	نسخۂ مسعود ۵ شعر
۶۶	ذکر خوش قامتی شاہ جو چل جائے ابھی	جائے ابھی	۱۵	شمع تعزیت ۱۳ شعر
۶۷	خیال ہے جو حاصل ہوا کمال ہے	ہے	۳۳	ذخیرۂ ثواب ۱۱، نسخۂ مسعود ناقص، شمع تعزیت ۲۶
۶۸	مجرائی جبکہ ماہ عزا ہوتا ہے	ہوتا ہے	۲۵	نسخۂ مسعود ۱۷، نسخۂ دیگر ۲۳ شعر
۶۹	گرد ہے اکسیر خاک کربلا کے سامنے	سامنے	۱۵	نسخۂ مسعود ۱۳ شعر
۷۰	اے سلامی یوں ارم ہے کربلا کے سامنے	کے سامنے	۲۶	
۷۱	گردن کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے	کے چلے	۱۵	نسخۂ مسعود ۱۷، نسخۂ دیگر ۱۷ شعر
۷۲	بیاہ سے مجرائی قاسم کی دلہن کیا جانے	کیا جانے	۲۱	
۷۳	[illegible] ہے	ہے	۴۳	
۷۴	[illegible]	گئے	۱۲	
۷۵	[illegible] زنداں [illegible]	تھے	۱۵	شمع تعزیت ص ۴۵ ۱۶ شعر
۷۶	[illegible] گر داغ دل پر رہے	رہے	۱۹	نسخۂ مسعود ۱۵ شعر کتبہ [illegible] کلکتہ، نسخۂ دیگر ۲۱ شعر
۷۷	[illegible] عشق [illegible] بوتراب ہے	ہے	۸	
۷۸	خود زیب زندگی لا الٰہ تھا میرے لیے	میرے لیے	۱۸	مطبوعہ نظامی ۱۲ شعر
۷۹	سلامی دولت پر گر جائیں گے	جائیں گے	۱۴	
۸۰	شتاب روضۂ فرزند بوتراب لے	لے	۱۴	
۸۱	اعدا حرم کو قتل گنہگار لے گئے		۱۱	
۸۲	مجرائی قتل جب اکبر سا پسر ہو جائے	ہو جائے	۲۳	
۸۳	بھلا سے جو لا فرو دنجور تن بھی ہے	بھی ہے	۲۷	
۸۴	زباں پر مدح ہے باغ علی کے نونہالوں کی	کی	۲۶	نسخۂ مسعود ۱۲، نسخۂ دیگر ۲۳، شمع تعزیت ۱۸ شعر
۸۵	[illegible] تھی بابا چلے گئے	چلے گئے	۱۲	
۸۶	مجرائی گردش فلک پیر دیکھیے	دیکھیے	۲۰	
۸۷	ذکر [illegible] کو رلایا میں نے	میں نے	۱۸	شمع تعزیت ۱۷، نسخۂ مسعود ۲۱ شعر

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

پھاگن ۱۸۹۳ تک

غزل

ساحر بھوپالی

سزاوارِ رشکِ جہاں ہو گئے ہم
ترے عشق میں بے نشاں ہو گئے ہم

فسانۂ غمِ ہجر کا یوں سنا لیا
کہ عبرت کی اک داستاں ہو گئے ہم

شب و روز بڑھتی گئی سوزشِ غم
یہاں تک کہ آتش بجاں ہو گئے ہم

ترے آستاں تک تو لائی تھی وحشت
خدا جانے پھر گم کہاں ہو گئے ہم

یہاں تک بڑھا اعتمادِ محبت
کہ بے فکرِ سود و زیاں ہو گئے ہم

جہاں بھی ذرا ملتفت ان کو پایا
تو خود سے بھی پھر بدگماں ہو گئے ہم

تھے گویا تو یک سر حقیقت نگر تھے
ہوئے چپ تو اک داستاں ہو گئے ہم

سرِ رہ غبارِ پسِ کارواں تھے
ہوئے گم تو منزل نشاں ہو گئے ہم

ہوا موج زن جب کہ دریائے الفت
حدیں توڑ دیں بیکراں ہو گئے ہم

ہماری کوئی ہمسری کیا کرے گا
خود اپنے لیے آسماں ہو گئے ہم

بڑھا دردِ دل بھی تو کب آہ ساحر
کہ جب بے نیازِ فغاں ہو گئے ہم

بھوپال ۲ ۱۹۶۲ [illegible]

سنگم

شکیلہ [illegible]

تجھ پہ سنگم فخر کرتے ہیں زمین و آسماں
تو ہے تیرتھ گاہ، تو ہے نازشِ ہندوستاں
سرسوتی گنگ و جمن سب ہیں تیری آغوش میں
اس لیے قدموں پہ تیرے جھک گیا ہے آسماں

یہ نگینے تیرے دامن میں جواہر ریز ہیں
تیری موجیں ہیں کہ بل کھاتی ہوئی اک کہکشاں
اٹھتے طوفانوں کی منزل تیرا قلبِ مضطرب
تیرے گردابوں کی انگڑائی زبانِ الاماں

سرخیاں ہیں تیرے افسانے کی یہ گنگ و جمن
سنانِ اتحادِ باہمی کا ہیں نشاں
تیرے دامن میں دکھے ہیں تجلی عالم سوز میں
ایک جا دیکھے ہیں ہم نے ماہ و انجم کہکشاں

تجھ میں دیکھی ہے بہارِ جاودانِ آرزو
تیرے ساحل پر نگاہوں کو ہے جنت کا گماں
ماگھ کے میلے کی رونق آج تیرے دم سے ہے
یاتری آتے ہیں جس میں کارواں در کارواں

آج بھی جمنا پہ تیرے سامنے شانِ اشوک
قلعہ کی بارہ دری دہرا رہی ہے داستاں
قوم کے باپو کی جب راکھی تیرے ہاتھوں میں ہے
کیوں نہ اے سنگم کہیں تجھے دنیا کے قومی نشاں

ماہ کے دامن میں دن کی خوشیاں چھپے گئیں
چاند نکلا دوڑنے پھرنے لگیں پرچھائیاں
کر کے ماضی کا تصور بھر کے آہِ سرد اک
میں بھی بیٹھا دل میں تازہ کر کے یادِ رفتگاں

الغرض تخیل یہ تھا ایک حسین اتفاق
ورنہ یہ نظارۂ سنگم کہاں اور ہم کہاں

[illegible] ۱۹۶۳ء

جب بال سفید ہو گئے

عبدالمجیب سہالوی

دیہات کے ہمارے ایک جاننے والے ہیں۔ انھیں جوان بننے کا بے حد شوق ہے۔ ابھی مسیں بھیگ ہی رہی تھیں کہ انھیں اپنے شباب کو سجا بنا کر رکھنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ کریم پوڈر سے چہرے کو چکنا بنانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے داڑھی مونچھ کے روئیں بھی صاف کر دیے اور بنگلہ توڑ کر جوانوں میں شامل ہونے کے بجائے داڑھی مونچھ مونڈ کر قبل از وقت جوانوں میں شامل ہو گئے۔ جب تک جوانی رہی اسے دلہن بنائے رکھا۔ مگر جس کو جانا ہو وہ دور بھاگتا ہے وہی ان بچارے کے ساتھ ہوا۔ ابھی چالیس ہی کے پیٹے میں پہنچ سکے کہ بال سن سفید ہو گئے۔ خیریت یہ ہوئی کہ بتیسی سلامت رہی۔ نزلے کا سارا زور بالوں ہی کی طرف رہا۔ آنکھیں زد میں آئیں لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ عینک سقوطِ حسن کے طور پہلے ہی سے لگاتے تھے۔ مگر انھیں یہ سفید بال کھائے جاتے تھے۔

دیہات میں تو لوگ اپنا کوئی نہ کوئی رشتہ جوڑ کر ایک دوسرے کو پکارتے ہیں۔ کوئی سفید بال دیکھ کر بابا نہیں کہنے لگتا لیکن جب شہر آتے تو ان کے یہ سفید بال جان کا جنجال ہو جاتے۔ بس پر بیٹھتے تو کنڈکٹر کہتا بابا کہاں کا ٹکٹ دوں۔ رکشے والے کہتے بڑے میاں کہاں چلنا ہے۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا۔ ہوا یہ کہ وہ امین آباد میں چوک جانے کے لیے بڑی مشکل سے ٹھہرا کر آدھے پر آئے۔ وہاں رکشے پر ایک ساٹھ ستر سالہ بوڑھے میاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ یہ لپک کر اسی رکشے پر بیٹھ گئے تاکہ دوسری سواری کا انتظام نہ کرنا پڑے۔ رکشا روانہ ہوا۔ ان ستر سالہ بزرگ نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا بڑے میاں نخاس ہی تک جایئے گا یا چوپٹیاں چلیے گا۔ ان کے پوپلے منہ سے اپنے لیے بڑے میاں کا لقب سننا تھا کہ ان کا دل چاہا کہ ابھی رکشے سے کود کر جان دے دیں لیکن انھیں ابھی اور صدمے سہنے تھے اس لیے ہمت نہ پڑی لیکن راستے بھر مارے غصے کے اپنے سفید بالوں کو دل ہی دل میں کوسنے کے ساتھ ساتھ ان بوڑھے میاں پر بھی لعنت بھیجتے رہے جنھوں نے انھیں بڑے میاں کہہ کر گویا انھیں چڑھانے کی کوشش کی تھی۔

ایک مرتبہ یہ بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک صاحب لپ اسٹک اور پوڈر سے لیس ان کی طرف بڑھی چلی آ رہی ہیں۔ انھوں نے فوراً اپنی ٹوپی آنکھ کی طرف کھسکائی اور جھانکتے ہوئے ظالم سفید بالوں کو اندر کی طرف ٹھونس دیا مگر آپ جانتے ہیں کہ انسان سے

لاکھ تدبیر کرے تو کیا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

چنانچہ ان صاحبہ نے قریب آ کر ادب سے پوچھا بڑے صاحب! چار باغ جانے والی بسیں کہاں ملیں گی؟ یہ سنتے ہی ان پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ یہ جواب دینا چاہتے تھے لیکن منہ سے آواز نکل رہی تھی۔ ان کا بس چلتا تو وہ ان صاحبہ کا منہ نوچ لیتے۔ ان کا بے اختیار دل چاہ رہا تھا کہ پوچھیں نیک بخت! آپ کو صرف میرے سفید بال ہی نظر آئے میرا چکنا چپڑا چہرا اور جوڑا چکلا جسم دکھائی نہ دیا۔ مگر انھوں نے سینے پر سل رکھ کر بڑی ترشی سے کہا میں باہر کا آدمی ہوں

غزل

ساغر بھوپالی

سزاوارِ رشک جہاں ہو گئے ہم
ترے عشق میں بے نشاں ہو گئے ہم

فسانۂ غمِ ہجر کا یوں سُنا لیا
کہ عبرت کی اک داستاں ہو گئے ہم

شب و روز بڑھتی گئی سوزشِ غم
یہاں تک کہ آتش بجاں ہو گئے ہم

ترے آستاں تک تو لائی تھی وحشت
خدا جانے پھر گم کہاں ہو گئے ہم

یہاں تک بڑھا اعتمادِ محبت
کہ بے فکرِ سود و زیاں ہو گئے ہم

جہاں بھی ذرا ملتفت ان کو پایا
تو خود سے بھی پھر بدگماں ہو گئے ہم

تھے گویا تو یک سر حقیقت نگہ تھے
ہوئے چپ تو اک داستاں ہو گئے ہم

سرِ رہ غبارِ پسِ کارواں تھے
ہوئے گم تو منزل نشاں ہو گئے ہم

ہوا موج زن جب کہ دریائے الفت
حدیں توڑ دیں بیکراں ہو گئے ہم

ہماری کوئی ہمسری کیا کرے گا
خود اپنے لیے آسماں ہو گئے ہم

بڑھا دردِ دل بھی تو کب آہ ساحر
کہ جب بے نیازِ فغاں ہو گئے ہم

سنگم

[illegible]

تجھ پہ سنگم فخر کرتے ہیں زمین و آسماں
تو ہے تیرتھ گاہ، تو ہے نازشِ ہندوستاں

سرسوتی گنگ و جمن سب ہیں تیری آغوش میں
اس لیے قدموں پہ تیرے جھک گیا ہے آسماں

بکھرے تیرے دامن میں جواہر ریز ہیں
تیری موجیں ہیں کہ بل کھاتی ہوئی اک کہکشاں

اٹھتے طوفانوں کی منزل تیرا قلب مضطرب
تیرے گردابوں کی انگڑائی زبانِ الاماں

سرخیاں ہیں تیرے افسانے کی یہ گنگ و جمن
ستانِ اتحادِ باہمی کا ہیں نشاں

تیرے دامن میں دکھے حسنِ عالم سوز میں
ایک جا دیکھے ہیں ہم نے ماہ و نجم کہکشاں

تجھ میں دیکھی ہے بہارِ جاودانِ آرزو
تیرے ساحل پر نگاہوں کو ہے جنت کا گماں

ماگھ کے میلے کی رونق آج تیرے دم سے ہے
یاتری آتے ہیں جس میں کارواں در کارواں

آج بھی جمنا یہ تیرے سامنے شانِ اشوک
قلعہ کی بارہ دری دہرا رہی ہے داستاں

قوم کے باپو کی جب راکھیں تیرے ہاتھوں میں ہے
کیوں نہ لے سنگم تجھے دنیا کے قومی نشاں

رات کے دامن میں دن کی خوبیاں چھپنے لگیں
چاند نکلا دوڑنے پھرنے لگیں پرچھائیاں

کرکے ماضی کا تصور بھر کے آہِ سرد اک
میں بھی بیٹھا دل میں تازہ کرکے یادِ رفتگاں

الغرض تکمیل یہ تھا ایک حسین اتفاق
ورنہ یہ نظارۂ سنگم کہاں اور تو کہاں

جب بال سفید ہو گئے

عبدالمجیب سہالوی

دیہات کے ہمارے ایک جاننے والے ہیں انھیں جوان بننے کا بے حد شوق ہے۔ ابھی مسیں بھیگ ہی رہی تھیں کہ انھیں اپنے شباب کو سجا بنا کر رکھنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ کریم پوڈر سے چہرے کو چکنا بنانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ڈاڑھی مونچھ کے روئیں بھی صاف کر دیے اور یکھ توڑ کر بچوں میں شامل ہونے کے بجائے ڈاڑھی مونچھ مونڈ کر قبل از وقت جوانوں میں شامل ہو گئے۔ جب تک جوانی رہی اسے اپنا بنائے رکھا۔ مگر جس کو جانا ہو وہ دور بھاگتا ہے دیکھا ان بچارے کے ساتھ ہوا ابھی چالیس ہی کے پیٹے میں تھے کہ بال سن سفید ہو گئے۔ خیریت یہ ہوئی کہ بتیسی سلامت رہی۔ زمانے کا سارا زور بالوں ہی کی طرف رہا۔ آنکھیں زد میں آئیں لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ عینک معنوی حسن کے طور پر پہلے ہی سے لگاتے تھے۔ مگر انھیں یہ سفید بال کھائے جاتے تھے۔

دیہات میں تو لوگ اپنا کوئی نہ کوئی رشتہ جوڑ کر ایک دوسرے کو پکارتے ہیں کوئی سفید بال دیکھ کر بابا نہیں کہنے لگتا لیکن جب شہر آتے تو ان کے یہ سفید بال جان کا جنجال ہو جاتے۔ بس پر بیٹھتے تو کنڈکٹر کہتا بابا کہاں کا ٹکٹ دوں۔ رکشے والے کہتے بڑے میاں کہاں چلنا ہے۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا ہوا یہ کہ وہ امین آباد میں چوک جانے کے لیے بس اڈے پر آئے وہاں رکشے پر ایک ساٹھ ستر سالہ بڑھے میاں پہلے سے بیٹھے تھے یہ لپک کر اسی رکشے پر بیٹھ گئے تاکہ دوسری سواری کا انتظام نہ کرنا پڑے رکشا روانہ ہوا۔ ان ستر سالہ بزرگ نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا بڑے میاں نخاس ہی تک چلیے گا یا چوپٹیاں چلیے گا۔ ان کے پوپلے منہ سے اپنے لیے بڑے میاں کا لقب سننا تھا کہ ان کا دل چاہا کہ ابھی رکشے سے کود کر جان دے دیں لیکن انھیں اکیلی اور صدمے سہنے تھے اس لیے ہمت نہ پڑی لیکن راستے بھر مارے غصے کے اپنے سفید بالوں کو دل ہی دل میں کوسنے کے ساتھ ساتھ ان بوڑھے میاں پر بھی لعنت بھیجتے رہے جنھوں نے انھیں بڑے میاں کہہ کر گویا انھیں چڑھانے کی کوشش کی تھی۔

ایک مرتبہ بس کے انتظار میں کھڑے تھے انھوں نے دیکھا کہ ایک صاحبہ لپ اسٹک اور پوڈر سے لیس ان کی طرف بڑھی چلی آرہی ہیں۔ انھوں نے فوراً اپنی ٹوپی آنکھ کی طرف کھسکائی اور جھانکتے ہوئے ظالم سفید بالوں کو اندر کی طرف ٹھونس دیا مگر آپ جانتے ہیں کہ انسان سے

لاکھ تدبیر کرے تو کیا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

چنانچہ ان صاحبہ نے قریب آکر ادب سے پوچھا بڑے صاحب! چار باغ جانے والی بسیں کہاں ملیں گی؟ یہ سنتے ہی ان پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ یہ جواب دینا چاہتے تھے لیکن منہ سے آواز نہ نکل رہی تھی ان کا بس چلتا تو وہ ان صاحبہ کا منہ نوچ لیتے۔ ان کا بے اختیار دل چاہ رہا تھا کہ پوچھیں نیک بخت! آپ کو صرف میرے سفید بال ہی نظر آئے میرا چکنا چپڑا چہرا اور چوڑا چکلا جسم دکھائی نہ دیا۔ مگر انھوں نے سینے پر سل رکھ کر نہایت ترشی سے کہا میں باہر کا آدمی ہوں

[illegible] اس واقعے سے وہ اتنا
[illegible] بہت [illegible] کر چک روانہ ہو گئے۔

اب وہ بات بھی [illegible] کمال ہو گیا ہے کہ جن [illegible]
میں [illegible] ایوں اور نانا ؤں کی بہیر [illegible] تھی اب انھیں سجا ؤ د
برتن کے لیے بھی ڈھونڈھنے سے کوئی عورت نہیں ملتی۔ ایک دن قریب
کے اسٹیشن پر انھیں ایک پگلی سی عورت مل گئی۔ انھوں نے خیال کر
مانگی مراد ملی اور ساتھ گھر لے آئے۔ بیوی نے بھی یہ سوچ کر چلو ہاتھ
ہی بٹانے گی کچھ نہیں تو سالے پسنے اور برتن مانجنے سے تو چھٹکارا مل
جائے گا بڑے چاؤ سے اسے رکھ لیا۔ لیکن پگلی تو پگلی آتے ہی ایسے
اینڈے بینڈے سوالات شروع کر دیے کہ ان کا ناک میں دم ہو گیا
ایک دن ہمارے دوست دھوپ میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور
ان کے سفید بال دھوپ میں سورج کی طرح چمک رہے تھے اسی وقت
انھوں نے سنا کہ وہ پگلی ان کی بیگم سے باورچی خانے میں بیٹھی پوچھ رہی
تھی کہ 'ای بوڑھو ڈترے کو ہو ہیں؟' بیگم جھنجھلا کر بولیں ہمارے
میاں ہیں اور کون ہوتے۔ اس پر پگلی نے کہا 'ہشو بی بی ہمکا نہ بکاؤ یہ
تو تمہرے ابا ایسے لگت ہیں'۔ یہ سن کر ہمارے دوست کے تن بدن میں
آگ لگ گئی اور غصے سے ادھر مڑ کر جو دیکھا تو ان کی بیگم کے چہرے پر
مسرت نمایاں تھی اور ان کے کھچڑی بالوں سے ایک سیاہ لٹ جھانکتے ہوئے
جھانک کر کہہ رہی تھی کہ 'بات ٹھیک ہے مگر ایسا نہ کہو کہیں برا مان
گئے تو تمہارا پتا کٹ جائے گا'۔ دوسرے دن صبح جب بیگم اٹھیں تو وہ
پگلی عورت غائب تھی۔

ہمارے یہ دوست غلط فہمی سے اپنے کو جوان ہی نہیں بلکہ گبرو
جوان سمجھتے تھے اور اسی دھوکے میں بھی تھے کہ ان کے پاس سے گزرنے
والی کوئی عورت انھیں کنکھیوں سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایک دن
ہر میاں اپنی بوڑھی جوانی کے نشے میں مست جھومتے چلے جا رہے تھے کہ
انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے پیچھے پیچھے کوئی صاحبہ تیز قدم چلی آرہی ہیں
پھر کیا تھا یہ فوراً سمجھ بیٹھے کہ ہو نہ ہو وہ ان کے حسن و جوانی پر فریفتہ ہو کر
ان کا پیچھا کر رہی ہیں حالانکہ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ ہمارے یہاں
کی خواتین ابھی مغربی ممالک کی خواتین سے بہت پیچھے ہیں اور فریفتہ

ہونے کے باوجود اپنے محبوب کا پیچھا نہیں کرتیں
[illegible] گھبرا جاتے ہیں [illegible]
[illegible] تیز قدم کرتے دیکھ کر ان [illegible]
گا۔ یہ دل سنبھلتے تو قدم [illegible]
رکھتے تو دل مچل جاتا۔ یہ دھڑکتے دل اور [illegible] پاؤں سے بہکتے
ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

ان کے قدم اٹھ نہیں رہے تھے اور [illegible] تیزی سے
بڑھتی چلی آرہی تھیں [illegible] یہ ان [illegible] آگے بڑھنے کے بجائے
پیچھے ہٹ رہے تھے لیکن ان کی [illegible] کی اس وقت کوئی حد نہ رہی
جب وہ ان کی للچائی ہوئی [illegible] جواب [illegible] کے بجائے
منہ سکوڑ کر آگے بڑھ گئیں اور آگے جانے والی صاحبہ [illegible]
بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ یہ بوڑھے میاں تو [illegible] معلوم ہوتے ہیں۔
یہ سنتے ہی ان کا دل چاہا کہ اپنے بال نوچ ڈالیں اور آتی ہوئی بس
کے سامنے لیٹ جائیں۔ ابھی یہ ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ان کی نظر
اچانک ایک اشتہار پر [illegible] جوانی
لوٹ کر نہیں آتی اور بڑھاپا آ کر کبھی نہیں لوٹتا' ہمارا [illegible] خضاب
خضاب لگانے اور بڑھاپے میں جوانی کا لطف اٹھائیے۔
یہ اپنے کو بوڑھا تو نہیں سمجھتے تھے لیکن بڑا ہو سفید بالوں کا کہ
ان کی وجہ سے 'بابا' 'بابا' سنتے سنتے تنگ آچکے تھے اس لیے انھوں
نے طے کر لیا کہ بزعم خود جوان ہونے کے باوجود خضاب کا سہارا لیں گے
اور 'بابا' اور 'بوڑھے میاں' کہنے والوں کا منہ بند کر دیں گے۔
وہ خضاب خریدنے شہر نہیں آئے تھے بلکہ اپنی ٹوٹی عینک ٹھیک
کرانے آئے تھے۔ پیسے زیادہ نہیں تھے لیکن پھر بھی انھوں نے طے کر لیا
کہ وہ خضاب ضرور خریدیں گے چاہے چشمہ نہ ٹھیک کرائیں۔ انھوں نے
سوچا اور غالباً ٹھیک ہی سوچا کہ بغیر عینک کے کوئی اندھا نہ کہے گا۔
لیکن بغیر خضاب کے لوگ برابر بوڑھے کہتے چلے آرہے ہیں لیکن اب
وہ ایک منٹ کے لیے بھی اپنے کو بوڑھا کہلانے کے لیے تیار نہیں

(باقی صفحہ [illegible] پر)

راجہ جی — ایک جائزہ

ک۔ رنگا سوامی

شری چکرورتی راج گوپال اچاری، جنھیں لوگ پیار سے سی۔ آر۔ یا راجہ جی کہا کرتے تھے، کے سورگباش ہو جانے کے تھوڑے عرصے بعد کچھ کہنا آسان کام نہیں ہے۔ کئی پہلوؤں سے بھری ان کی سرگرمیوں پر تو کئی کتابیں بھی لکھی جا سکتی ہیں۔ وہ ایک ذہین دانشور، قابل ایڈمنسٹریٹر اور ایک عظیم فلاسفر، مدبر اور ذہین باشعور سیاستدان کے طور پر اپنی ایک چھاپ چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی انتہائی سادہ، پرخلوص اور بامقصد زندگی اپنے دور کی نسلوں کے لیے ہمیشہ قابل تقلید رہے گی۔ کوئی ان سے کتنا ہی متفق ہو یا نہ ہو لیکن جب بھی وہ کسی موضوع پر رائے زنی کرتے تھے تو اس کی طرف دھیان دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا۔

ہمارے ذہن میں سب سے پہلے جو بات آتی ہے وہ ہے ان کے عزم کی طاقت اور نتائج سے بے خوف ہو کر اس راہ پر چلنے کا مصمم ارادہ جسے وہ ایک بار چن لیتے تھے۔ یہ بات تو ابھی کئی لوگوں کو یاد ہوگی کہ ۱۹۴۲ء کی "بھارت چھوڑو" تحریک کی انھوں نے کس طرح ڈٹ کر مخالفت کی تھی اور اس کے خلاف مہم چلائی تھی۔ اسے کئی لوگوں نے پسند نہیں کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب گاندھی جی اور دیگر قومی رہنما جیلوں میں بند ہوں تو راجہ جی جیسے ایک اہم راستے پر چلنے کی وکالت کیسے کر سکتے ہیں جو دراصل برطانوی حکمرانوں کے ساتھ تعاون کے مترادف ہو؟ یہ وہ دن تھے جب وہ اس کے کانگریسیوں نے ان کے "غیر وطن پرستانہ" رویہ کے لیے ان کے خلاف پارٹی کی جانب سے تادیبی کارروائی کرنے کی بات سوچی۔

مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے ایسی کارروائی کی مذمت کی تھی تو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کس طرح غصے سے بھرے ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ راجہ جی کے خلاف لوگوں کا غصہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا جب انھوں نے مسلم لیگی رہنما مسٹر جناح کے ساتھ بات چیت چلائی اور ملک کے مسلم اکثریتی علاقوں میں خود ارادیت کی پیش کش کی بشرطیکہ مسلم لیگ بھارت کی مکمل آزادی کا مطالبہ کرنے میں کانگریس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائے۔



راجہ جی

جناح نے راجہ جی کی تجاویز تو رد کر دیں لیکن وہ ان رعایتوں کو لینے کے لیے اڑ گئے جو راجہ جی کی تجاویز میں شامل تھیں اور برطانوی سرکار نے انہی کو بنیاد بنا کر پاکستان قائم کر دیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ راجہ جی کے اندر اتنی دوراندیشی تھی کہ وہ یہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ راجہ جی کا فلسفہ یہ تھا کہ مخالفت کو جیتنے سے ملک کے مفادات کی خدمت بہتر طریقے سے ہو سکتی ہے۔

تیکھی ذہانت

ان کی تیکھی ذہانت ہر ایک کو لاجواب کر دیتی تھی۔ جب بھی وہ کسی بات کے حق میں یا اس کے خلاف اپنے دلائل پیش کرتے تھے وہ دوسروں کو

قائل اور ان کا جواب دینے کے لیے ان کے پاس دلائل ہوتے تھے اور اس وقت بہت ہی کم لوگ ان کے دلائل رد کر سکتے تھے۔ بھارت چھوڑو تحریک کے خلاف ان کے دلائل اتنے ٹھوس تھے کہ گاندھی جی کی صورت میں اگر کسی کے دماغ پر یک بیک مان لینے والوں کے ذہن کو تو متاثر کرتا ہے لیکن ان کے دل کو نہیں۔ جب راجہ جی نے الگ راستہ اختیار کر کے ایک نئی سیاسی جماعت بنائی تو جواہر لال نہرو نے یہ بہتر سمجھا کہ راجہ جی کی نکتہ چینی کا جواب نہ دیا جائے۔

۱۹۳۷ء میں صوبائی کونسلوں کے چناؤ کے بعد کانگریس پارٹی کو حکومت بنانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی کیونکہ اس کا منصوبہ آئین کو اندر سے کھوکھلا کرنے کا تھا۔ راجہ جی نے غیر کانگریسیوں اور برطانوی حکمرانوں کی طرف سے قائم کی گئی جمہوری وزارت کے خلاف مدراس میں ایک مہم چلائی جس سے پوری ان کی نکتہ چینی کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ باقی ہندوستان میں بھی کانگریسیوں نے اسی طریقے کو اپنا یا انتشار سے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔

راجہ جی بھارت کے آخری گورنر جنرل تھے۔ ملک کے سب سے بڑے عہدے پر فائز رہنے کے بعد بھی جب جواہر لال نہرو نے انھیں مرکزی وزارت میں شرکت کی دعوت دی تو وہ سرگرم سیاست میں لوٹ آئے۔ راجہ جی نے کس وجہ سے یہ وزارت چھوڑی اس کی وضاحت نہ تو خود انھوں نے اور نہ کبھی جواہر لال نہرو نے کی ہے۔ اگرچہ دونوں رہنما بہت اتحاد اور مفاہمت کے ساتھ مل کر کام کرتے رہے تاہم کی تاریخ تھا پھر بعد ہوگئی۔ اس کے کئی برس بعد بھی ذہنی اور جسمانی طور پر راجہ جی استعفیٰ دے دینے کے بعد انھوں نے سوتنتر پارٹی قائم کی اور حکمران کانگریس پارٹی کے ایک زبردست نکتہ چیں بن گئے۔ راجہ جی کو اس بات سے خوشی نہیں ہوئی

بھی کہ کانگریس پارٹی کے متبادل ایک جماعت قائم کرنے کا ان کا خواب پورا ہو سکا۔

ایک متنازعہ شخصیت

ماضی کے واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ راجہ جی ایک متنازعہ شخصیت تھے۔ جب ۱۹۳۷ء میں مدراس کے وزیر اعلیٰ تھے تو وہاں کے سکولوں میں ہندی کو ایک لازمی مضمون بنانے والے سب سے پہلے شخص وہی تھے۔ لیکن اس کے کئی برس بعد انھوں نے ہندی کے خلاف مہم چلائی اور بھارت کی رابطے کی سب سے بڑی زبان کے طور پر انگریزی کو جاری رکھنے کے لیے جدوجہد کی۔ لیکن اپنے نظریات میں اس تبدیلی کو بھی انھوں نے اپنے معمول کے دلائل طریقے سے حق بجانب ٹھہرایا۔

آندھرا میں موجودہ ایجی ٹیشن اور آسام میں لسانی جھگڑے کے ضمن میں کوئی بھی شخص راجہ جی کے اس تبصرے کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ لسانی بنیادوں پر ملک کی از سرِ نو تقسیم ایک قابل خطرہ ہے اور یہ بات انھوں نے ایک ایسے موقع پر کہی جب مدراس کی متحدہ ریاست سے تیلگو بولنے والے اضلاع کی علاحدگی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔

راجہ جی "از موں" کی پروا نہیں کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اعلان کیا کہ کمیونسٹ ان کے دشمن نمبر ایک ہیں۔ وہ بنیادی طور پر قدامت پسند تھے اور نظریات میں روایت پسند بھی تھے لیکن راجہ جی کے بارے میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ ان کی علمی دیانت اور ایسے اقدامات اختیار کرنے کی ان کی ہمت جس سے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا فائدہ ہو سکے۔

کیا بھارت میں پھر کبھی راجہ جی جیسی کوئی شخصیت ہو گی؟

طائر شہرت

ملک شفیع پٹیالوی

کبھی مشک مداں ہوگا ہمارا دو جہانوں میں
اڑے گا طائر شہرت کبھی پھر آسمانوں میں

کیا قربان سر بہر وفا جب سرفروشوں نے
ملائک بھی خوشی سے جھوم اٹھے آسمانوں میں

حفاظت کے لیے اپنے وطن کی جان تک دے دیں
شہادت کا ہے وہ جذبہ وطن کے پاسبانوں میں

غلامی کی مٹی ظلمت، یہ آزادی کی برکت ہے
بہاریں لوٹ کر آئیں وطن کے گلستانوں میں

حیات جاوداں پائی ہے قومی سرفروشوں نے
رہے گا ذکر خیر ان کا وفا کی داستانوں میں

جو ناممکن ہے اس کو بھی بنا سکتے ہیں یہ ممکن
ہے ایسی جرأت بے باک قومی نوجوانوں میں

مشام جاں معطر ہو گیا خوشبوئے الفت کی
کھلے ہیں پھول ایسے اب وطن کے گلستانوں میں

مٹیں گے صفحۂ ہستی سے غدار وطن ایسے
کہ ان کی داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

گلستاں قوم کا محفوظ رہتا ہے اسی دم تک
نہ خود غرضی کی خو پیدا ہو جب تک باغبانوں میں

نگاہیں خیرہ ہوں گی جس سے ساری نسل آدم کی
جلا ہوگی کچھ ایسی قوم کے آئینہ خانوں میں

محبان وطن میں کرشمے عجب دار پہ روشن
تو شوق سرفروشی ہو گیا پیدا جوانوں میں

غزل

محمد قیصر خان قیصر

یہ عشق دوست میں حسن نظر کا عالم ہے
نگاہِ شوق نہیں جلوہ زارِ پیہم ہے

چمن کی سیر کجا قلبِ داغدار کجا
ستم نصیب کو اپنی بہار کیا کم ہے

اگرچہ عشق ہے سر تا بپا الم لیکن
یہی الم ہے جو رازِ نشاطِ عالم ہے

گلا تو ایک طرف شکریہ بھی یاد نہیں
وہ آئے ہیں تو نظام حواس برہم ہے

فسانۂ غمِ الفت ہے میری آہ نہیں
تمام قصۂ دل ایک لفظ مبہم ہے

یہ جلوہ ریزیِ حسن و شباب کیا کہنا
فضائے دہر پہ دوشیزگی کا عالم ہے

سکوں سے واسطہ کیا زندگی کو اے قیصر
کہ اضطراب ہی رازِ حیاتِ عالم ہے

گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

انوار احمد خان - ایم - اے

ناظر ہمارے جدید شعراء میں خاصے اہم شاعر ہیں اور اردو کے ان شعرا میں سے ہیں جو نظیر اکبر آبادی کی طرح کلی طور پر نظرانداز کر دیے گئے اور جن پر ہمارے ادیبوں نے قلم اٹھانا شاید اپنی کسرِ شان سمجھا۔ اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ دونوں غزل سے زیادہ نظم کے شاعر تھے۔

ناظر نے جب ہوش سنبھالا تو سرسید کی اصلاحی تحریک زوروں پر تھی۔ اس کا دائرہ روز بروز پہلے سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے شاعر اور ادیب سرسید احمد خاں اور ان کی تحریک سے متاثر ہو کر اس کے دام میں اسیر ہو چکے تھے۔ ان تمام متاثرین کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے دھارے جو ادھر ادھر آہستہ خرامی کے ساتھ بہہ رہے تھے، اب سرسید کی تحریک میں شامل ہو کر ایک بڑے دھارے کی شکل میں تیزی کے ساتھ بہنے لگے۔ یہ دھارا مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کا دھارا تھا۔ سرسید کی دوررس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان سماجی، معاشی اور اقتصادی طور پر بدحال ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو اقتصادی طور پر خوشحال، معاشی طور پر بہتر اور سماجی طور پر بلند کرنے کا نہ صرف یہ کہ مصمم ارادہ کیا بلکہ فوراً ہی عملی طور پر بھی کام میں جٹ گئے۔ سائنٹفک سوسائٹی اور پھر علی گڑھ کالج کا قیام اسی کا نتیجہ تھے۔ اس تحریک کا اثر مسلمانوں کی زندگی پر اتنا گہرا ہوا کہ ان کی زندگی میں نئے تصورات جنم لینے لگے۔ سوچنے کے انداز کے ساتھ ساتھ زندگی کے معیار اور قدروں میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ اس کا براہِ راست اثر ادب پر بھی پڑا اور جلد ہی ادب بھی نئے راستوں پر گامزن نظر آنے لگا۔ اردو شاعری جو اب تک گل و بلبل کے پھندے اور معشوق کی زلفوں کے پیچ و خم میں الجھی ہوئی تھی اور جو معشوق کی کمر موہوم اور دہن نابود کے پھیرے میں غرق تھی اب نئے راستے پر نظر آنے لگی۔ اس نے زلفوں اور دہن نابود کو چھوڑ کر انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کیا اور زندگی کے دوسرے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش میں رو بہ عمل نظر آنے لگی۔ شاعری کے اس روپ کو جدید شاعری کے نام سے یاد کیا گیا۔ سرسید کی اس تحریک کے زیرِ اثر جدید شاعری کا آغاز انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام ہوا جس میں حالی اور محمد حسین آزاد پیش پیش تھے۔

یہ ماحول تھا جس میں ناظر نے آنکھ کھولی اور اپنی شاعری کی ابتدا کی۔ ناظر پنجاب کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش کا تعین ابھی نہیں ہو سکا ہے۔ انقلابِ ناظر جو سر سید راس مسعود نے ترتیب دیا تھا اس میں ناظر کی پیدائش کے بارے میں مرتب نے لکھا ہے کہ "سال پیدائش تقریباً ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ ہے۔" ناظر کا نام خوشی محمد خاں تھا اور ناظر تخلص۔ یہ مولا داد خاں کے تین بیٹوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کا آبائی گھر پنجاب ضلع گجرات کے ایک قصبہ ہیرو والا میں تھا۔ ابتدائی تعلیم ناظر نے ہیرو والا میں اور پھر لاہور میں رہ کر حاصل کی۔ لاہور سے میٹرک پاس کرنے کے بعد علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔

ناظر کی نظم گوئی کی ابتدا ۱۸۸۱ء سے ہوتی ہے جس کے بارے میں ناظر نے خود ہی واضح طور پر لکھ دیا ہے۔ ۱۸۸۱ء میں انھوں نے جو پہلی نظم کہی وہ اب دستیاب نہیں۔ اس پہلی نظم کا ذکر کرتے ہوئے ناظر لکھتے ہیں کہ:

> میں نے پہلی نظم جناب غوث الاعظم کی مدح میں ۱۸۸۱ء میں لکھی۔ اس کا صرف ایک مصرع یاد رہ گیا ہے

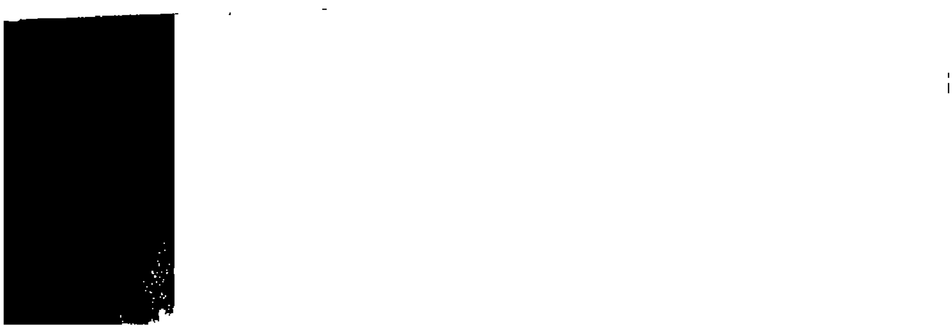


گورنر شری اکبر علی خاں یوم جمہوریہ کے موقع پر پریڈ گراؤنڈ لکھنؤ پر فوج، پولیس اور این سی سی کی مشترکہ پریڈ کی سلامی لے رہے ہیں

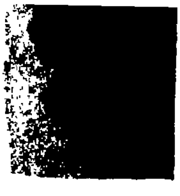


گورنر شری اکبر علی خاں ہارکورٹ بٹلر ٹیکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ، کانپور کی گولڈن جبلی کے آخری دن انسٹی ٹیوٹ کے اوّل آنے والے طالب علم کو سونے کا تمغہ عطا کر رہے ہیں

یوم شہیداں کے موقع پر شہید اسمارک، لکھنؤ کے قریب گورنر شری اکبر علی خاں گومتی میں دیپ دان کرتے ہوئے







ہندستان

اور

ایم سی سی کرکٹ ٹیموں کے درمیان





انڈرووڈ کی گیند پر
کھا رہے ہیں

کانپور
میں
چوتھا ٹسٹ میچ جنوری ۱۹۷۳ء





انگلینڈ

ولسن انڈرووڈ کی گیند



وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی لکھنؤ سے ۱۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر کملاپوری مثالی گاؤں کا افتتاح کرتے ہوئے



اخبار نویسوں نے بخشی تالاب اور موہن لال گنج لکھنؤ میں خاندانی منصوبہ بندی کیمپوں کا معائنہ کیا۔ تصویر میں ایک اخبار نویس نس بندی ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں

بیگم حضرت محل پارک لکھنؤ میں محکمہ اطلاعات کے زیر اہتمام ہونے والی یوم آزادی کی ۲۵ویں سالگرہ کی نمائش کے پنڈال میں ۲ جنوری ۱۹۷۳ء کو راجہ ہریش چند نوٹنکی کا ایک منظر

بلبل طبعم بہ باغ وصف تو بیجا نکرد

ناظر شروع زمانے میں مولوی لطف اللہ صاحب اثر سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ مولوی لطف اللہ صاحب ان کی پھوپھی کے بیٹے تھے اور ان کے پاس رہتے تھے اور وہیں [illegible] کے مشہور عربی فارسی کے عالم اور مدرس رہتے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب کے کہنہ مشق شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ناظر نے یہ نظم جب ان کے سامنے اصلاح کی غرض سے پیش کی تو انھوں نے پہلا مصرع کو بدل کر اس طرح کر دیا تھا:

بلبل طبعم بہ باغ وصف تو رنگیں نواست

محمڈن کالج ڈائرکٹری جو ۱۹۱۱ء میں طفیل احمد صاحب منگلوری نے مرتب کیا اور الہ آباد [illegible] مدرستہ العلوم تیار کی تھی اس سے پتا چلتا ہے کہ خوشی محمد خاں ناظر نے ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ کالج میں انٹرمیڈیٹ کے پہلے سال میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۱ء میں انٹرمیڈیٹ سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور بی۔ اے ۱۸۹۳ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۲ مئی ۱۸۹۳ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایڈیٹر کی طرف سے نوٹ لکھا ہوا ملتا ہے کہ:

"بی۔ اے اور انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ نہایت ہی عمدہ ہے ہم کو نہایت ہی خوشی ہے کہ ہمارے کالج کے طالب علم خوشی محمد بی۔ اے امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے اور انگلش اور فارسی دونوں زبانوں میں آنرز کا درجہ لیا۔ انھوں نے طلائی تمغہ پانے کا اپنے کو پورا مستحق ثابت کیا ہے اور امید ہے کہ وہ ان کو ملے گا۔"

یوں تو خوشی محمد خاں ناظر سرسید کی تحریک سے پہلے ہی متاثر تھے لیکن علی گڑھ پہنچنے کے بعد ان کی تحریک میں عملی طور پر بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں حالی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور اب حالی کے سامنے اپنا کلام اصلاح کے لیے پیش کرنے لگے۔ حالی سے تلمذ کا اظہار انھوں نے نظم [illegible] میں کیا ہے، کہتے ہیں:

پیام استاد حالی کا زبانِ چرخ گرداں سے
سناتا ہوں کہ جس سے کچھ بہرہ ور تم ہو

یہ شعر اس نظم میں شامل ہے جو بتقریب جلسہ جوبلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ناظر نے پڑھی تھی۔

[illegible]

چونکہ سرسید اور حالی شاعرانہ غزل [illegible] کے خلاف اور نیچرل شاعری کے حامی تھے اس لیے اکثر طالب علم [illegible] نیچرل شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔ علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں ناظر نے نظم کے مقابلوں میں حصہ لیا۔ یہ مقابلہ آرنلڈ نے کرایا تھا اس کا مقصد شعراء کو نیچرل شاعری کی طرف راغب کرنا۔ ان مقابلوں میں بہترین نظم پر انعام کا اعلان کیا جاتا تھا۔ ناظر نے دو مقابلوں میں حصہ لیا اور یہ انعام حاصل کیا۔ ان دونوں نظموں کے عنوانات "اخوت" اور "چہار موسم" ہیں جن پر ناظر کو انعام ملا تھا۔ ناظر نے اپنے مجموعۂ کلام نغمۂ فردوس حصہ اول کی تمہید میں لکھا ہے کہ:

"مسٹر آرنلڈ (آنجہانی) نیچرل شاعری کی ترغیب و تربیت میں خاص دلچسپی لیتے تھے اور دو سال متواتر انعامی نظم کا اعلان فرماتے رہے۔ یہ دونوں انعام میں نے حاصل کیے اور یہ دونوں نظمیں یعنی "اخوت" اور "چہار موسم" اسی وقت شائع ہو گئی تھیں۔"

علی گڑھ میں ناظر لانگ فیلو کے لقب سے مشہور تھے اور یہ لقب ان کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا دیا ہوا تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو بعد میں علی گڑھ کے وائس چانسلر بھی رہے خوشی محمد خاں ناظر کے ہم جماعت تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ناظر نے فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا۔ یونین کے جلسہ میں روضۂ ممتاز محل پر ایک نظم پڑھی۔ مطلع تھا:

کچھ بتا احوالِ دل اے منزلِ نامش بیاں
کیوں نظر آتا ہے حسرت خیز تیرا آستاں

ناظر کی اس نظم کا آخری شعر بہت مشہور ہوا۔ یہ شعر فارسی میں ہے اور بقول امتیاز علی خاں عرشی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایرانی نے کہا ہے۔ شعر یہ ہے:

گاہے گاہے باز خواں این دفترِ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را

یونین کے اسی جلسہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ناظر کو لانگ فیلو کے لقب سے نوازا تھا۔ حبیب اللہ خاں کے نام ایک خط میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یونین کلب کے ایک جلسہ میں صاحبزادہ صاحب نے میرے لیے "لانگ فیلو"

۱۔ [illegible]

کا لقب صبح فرمایا تھا۔

ناظر کے اس خط سے یہی پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن جس کا پہلا "برادر ہڈ" نام تھا کا سنگ بنیاد ناظر ہی نے رکھا تھا [illegible] اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ لکھتے ہیں:

"دوسری طرف ایم۔ اے۔ او کالج برادر ہڈ (انجمن اخوان) تھی جس کا سنگ بنیاد رکھنے کا فخر بندہ ناظر کو حاصل ہے۔ میری استدعا پر منشی [illegible] حبیب الرحمن خاں نے برادر ہڈ کا سکریٹری ہونا منظور فرمایا۔ اور اس کا چندہ شروع ایک فی صدی معقول تعداد تک ہونے لگی تھی۔ صاحبزادہ صاحب کے خاص معاون تھے۔ رپورٹ پیش ہونے پر سر سید علیہ الرحمۃ نے ایک نہایت رقت آمیز چٹھی لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا: "بہ حیثیت طالب علم ہونے کے میں ابھی اولڈ بوائے ہوں لہٰذا مجھ کو بھی ممبر برادر ہڈ میں شامل کیا جائے۔" میرے کالج چھوڑنے کے بعد کسی جلسہ میں "برادر ہڈ" کا نام "اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" قرار پایا۔"

ناظر اس ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسوں اور تقریبات میں آخر دم تک شریک ہوتے رہے اور اپنی نظمیں نذرانے کے طور پر پیش کرتے رہے۔ خوشی محمد خاں ناظر علی گڑھ میں پوئٹ لاریٹ کے نام سے مشہور تھے۔ کالج اور اس سے متعلق کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں وہ اپنی کوئی نظم نہ پڑھتے ہوں۔ قومی، ملی اور نیچرل شاعری کو فروغ دینے میں خوشی محمد خاں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حسرت موہانی جو کہ ان دنوں علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے عاشقانہ غزل سرائی میں مست تھے اس لیے ناظر اور حسرت میں بن نہیں سکی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی شاعری پر اپنے اپنے مضامین میں خوب خوب اعتراضات کیے ہیں۔ علی گڑھ میں اس زمانے میں غزل گویوں کی بہ نسبت نظم گویوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یوں بھی سر سید نے عشقیہ غزل گویوں پر کالج کی فضا میں پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ قومی، وطنی اور ملی نظموں کی گونج علی گڑھ کی فضا میں ہی نہیں بلکہ اب علی گڑھ سے باہر بھی چاروں طرف سنائی دینے لگی تھی۔ حالی کے علاوہ چکبست، اقبال، نادر کاکوروی، درگا سہائے سرور اور بہت سے دوسرے اس طرح کی نظمیں شد و مد کے ساتھ لکھ رہے تھے۔ قومی اور نیچرل شاعری کو رواج دینے میں "مخزن" اور "زمانہ" کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ مخزن

[illegible] ادب سے [illegible] زمانہ [illegible] شائع ہوتا [illegible] فارسی [illegible] شامل کی ہے۔ اس زمانے میں [illegible] شائع ہوئی تھی۔

ناظر کی زندگی کا بڑا حصہ ملازمت کے دوران کشمیر میں بسر ہوا۔ [illegible] گلگت بھیجے گئے۔ ناظر کشمیر اور آخر میں جنوبی کی خاک کے پیوند ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ غرضیکہ ملازمت میں مختلف بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ کشمیر میں ناظر نے فطرت کے مختلف مناظر پر بہت سی بصورت نظمیں لکھی ہیں۔ جس طرح علی گڑھ میں بقول ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی "اس نوع کی شاعری کو مقبول عام بنانے میں پہلا علی گڑھ کے ان طلبا نے حصہ لیا جن کے سرگروہ چودھری خوشی محمد خاں ناظر تھے" (علی گڑھ تحریک) اسی طرح کشمیر میں بھی خوشی محمد خاں ناظر نے اس طرح کی شاعری کو مقبول عام بنانے میں بڑا کام کیا۔ کشمیر کے ابتدائی زمانہ قیام میں ہی خوشی محمد خاں ناظر نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک انجمن کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نام "انجمن مفرح القلوب" تھا۔ یہ انجمن تقریباً چھ سال تک اپنی ادبی محفلیں منشی سراج الدین احمد خاں کے دولت خانہ پر یا پھر نشاط اور شالیمار میں منعقد کرتی رہی۔ اس انجمن کا ذکر کرتے ہوئے ناظر لکھتے ہیں:

"ہم نے چند ادب دوست احباب کی ایک لٹریری کمیٹی یا انجمن بنا رکھی تھی جس کا نام "انجمن مفرح القلوب" تھا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک یہ انجمن کشمیر کے باغوں میں مفرحات کی نکہت بکھیرتی رہی۔ اس کے بعد میں لداخ چلا گیا۔"

کشمیر میں اس زمانہ میں خوشی محمد خاں ناظر، مولانا عبدالصمد، مفتی محمد حسین کاشمیری، محی الدین قمر خاں صاحب، منشی سراج الدین احمد خاں سعد الدین سعد، صاحبزادہ عبدالرحمن ذکی اردو شاعری کے روح رواں تھے۔ یہ کشمیر میں اردو ادب کے صدر اولین کے شاعر تھے۔ ان میں مرزا سعد الدین سعد زیادہ تر فارسی میں لکھتے تھے ان کا شمار فارسی کے کہنہ مشق اور پختہ شاعروں میں ہوتا [illegible] اردو میں بھی کبھی کبھی لکھ لیتے تھے [illegible] کبھی کبھی سعد اور ناظر کی اردو میں منظوم خط و کتابت بھی ہوا کرتی تھی۔

پیدائش ۱۸۹۳ء تک

[illegible]

ان کی ایک نظم "حب وطن" جنوری ۱۹۰۲ء کے مخزن میں مستقل عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ناظر کی نظم "جوگن" جس کا حوالہ پہلے بھی دیا گیا ہے، اس کا پہلا حصہ کشمیر کے دوران قیام کے اولین زمانے میں لکھا گیا تھا۔ یہ نظم دسمبر ۱۹۰۲ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ "جوگن" ناظر کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم کے دوسرے بند میں ناظر نے الفاظ کے پردے میں جوگن کے رہنے کی جگہ اور جوگن کی کیسی اچھی حالت تصویر کھینچی ہے کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ الفاظ کی نشست و درو بست اور پھر سادگی بیان ملاحظہ ہو ؎

چٹانوں سے جھرنے گرتے تھے، پربت پہ چھاؤنی چھائی تھی
تھے خیمے ڈیرے بادل کے، کہرے نے قنات لگائی تھی
یاں برف کے تودے گلتے تھے، چاندی کے فوارے چھٹتے تھے
چشمے سیماب اگلتے تھے، نالوں نے دھوم مچائی تھی
یاں قلۂ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی رہنے کو جنگل میں جوگی کی مندر نگ بھبھائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیب کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلق خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی

ناظر نے تقریباً سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا کلام مندرجہ ذیل اجزا پر منقسم ہے "سروش غیب" اخلاق اور صوفیانہ کلام۔ "افکار ملی" قومی اور ملی نظمیں "نیا درنگ" "مراثی" اور قطعات تاریخ وفات۔ "تہنیات درباری" "مدیحہ قصائد وغیرہ" "یاران نجد" "سہرے" "مناظر قدرت" "مطائبات" "متفرقات" "منظومات" "مثنوی بیرا کھا" "مسلمات"۔ ناظر غزل کے حامی تو نہیں تھے لیکن عاشقانہ غزل سرائی سے قطعی مخالف تھے۔ وقت کا عام رجحان غزل کی طرف تھا۔ ناظر نے اس تجزیہ کو اپنی ایک رباعی میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

وہ شعر جو [illegible] | وہ سوز جس کا [illegible]
[illegible] | وہ مجنوں جس کا افسانہ تھا

[illegible] ہے کہ ناظر غزل کے بالکل ہی [illegible] تھے

غزلیں کہتے تھے وہ صاف ستھری ہوتی تھیں۔ ان نظموں کے مقابلے میں غزلوں کا تناسب کم ہے۔ ان کی بعض غزلوں کے اشعار آج بھی لوگوں کے زبان زد ہیں۔ چند اشعار ذیل میں پیش خدمت ہیں ؎

شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کرا دی
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو
خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو
یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

ناظر کے یہاں ان کے اپنے زمانے کے حالات کا شدید درک ہوتا ہے جسے ہم عصری حسیت کہہ سکتے ہیں۔ ہندو مسلم نفاق کا جو بیج انگریزوں نے بویا تھا ہندوستان کا تعلیم یافتہ اور سمجھدار طبقہ اسے ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ناظر میں وطن دوستی اور وطن پرستی کا جذبہ شدید تھا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں میں نااتفاقی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ فرقہ پرستی سے انھیں سخت نفرت تھی۔ ...... اور ایک ملک اور ایک قوم کے حامی تھے۔ ذیل کے اشعار ان کے انھی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

کاش شیخ و برہمن مل کر کریں کچھ روک تھام
ورنہ بھارت پر کوئی بھاری عذاب آنے کو ہے

جن کی لو سے بزم میں لگ جائے آگ
ایسی شمعوں کو بجھانا چاہیے
گو بہت ہوں راستوں کے ہیر پھیر
سب کو اک منزل پہ لانا چاہیے
خود زباں سے بھی زباں مل جائے گی
پہلے دل سے دل ملانا چاہیے

کشمیر سے ریٹائر ہونے کے بعد خوشی محمد خاں ناظر ریاست رام پور چلے گئے تھے۔ رام پور میں وہ دسمبر ۱۹۲۰ء سے دسمبر ۱۹۲۲ء تک افسر آبادی کے عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ پھر کشمیر آ گئے اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے لگے۔ لائل پور میں خوشی محمد خاں کی کچھ اراضی تھی اور کشمیر میں سکونت تھی چنانچہ جاڑوں میں وہ لائل پور چلے جاتے تھے اور گرمیاں کشمیر میں گزارتے تھے۔ خوشی محمد ناظر کا انتقال ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں کشمیر میں ہوا [illegible] دفن ہوئے۔ [illegible]

جو کشمیر کے جانے پہچانے ادیب اور شاعر میرا غلام رسول نازکی نے ایک مختصر مرثیہ لکھا ہے جس کے آخری شعر سے سنہ ہجری اور سنہ عیسوی میں ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ اس مختصر مرثیہ سے ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مرثیہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

دریغا کہ خورد و بزم ادب ہمہ تیرہ از مرگ نامور خسب
بباغ ادب بلبل نغمہ سنج کہ بود شہ دل از سخن گنج گنج
گہر سکرانی ہمہ دل وداد دم نغمہ سنجی بجن اوستاد
بہ دنیائی روشن تجلی نماند زبیداد چرخ ستم گستر نازد
بدل خواستہ ایک حق پرست رسیدن بنزد جلیل رحمت
دلش ہمہ بدل و داور بخیدگی کہ با او شدہ وقتِ ہیچیدگی
کلام بہ نصیب تاریخ شست گو پیدہ و تاریخ آمد بدست
کے ہجری آں "خوش نغمہ" ای عزیز
در عیسوی "شاعر خوش تمیز"
۱۹۶۳ء

★

میرانیس کا غیر مطبوعہ کلام (صفحہ ۱۷ کا بقیہ)

نمبر شمار	مطلع	ردیف	تعداد اشعار	کیفیت
۸	چشموں میں اشک ہیں جو سراسر بھرے ہوئے	بھرے ہوئے	۲۵	
۸۹	فقیری میں دل بادشاہ چاہیے		۱۲	
۹۰	قاسم ناروجاں قتل جو بیاسا ہو جائے	ہو جائے	۱۸	
۹۱	صغرا کہتی تھی جو بابا کی خبر پاتے ہیں	پاتے ہیں	۱۵	
۹۲	شک حلق ہے جو اس غم سے دم ہو دل پانی	پانی	۱۴	
۹۳	اے مجرئی فریاد و فغاں کر کے نہ روئے		۱۷	
۹۴	مجرائی بزم شاہ میں آہ و بکا رہے	رہے	۱۵	شمع تعزیت ۱۳ اشعر
۹۵	کودکی پیری کی جوانی دیکھ لی	دیکھ لی	۱۴	
۹۶	دکھایا ضعف نے رونا اپنا جب مکاں سے چلے		۲۹	ذخیرۂ ثواب ۸ شعر
۹۷	مجرئی خیمے میں جب برچھیوں والے آئے		۱۶	
۹۸	مجرئی تب دل غمدیدہ کا ارماں نکلے	نکلے	۲۰	
۹۹	دنیا میں کیا محشر کا دن آشکار ہے		۹	نوحہ
۱۰۰	اے مجرئی حسین کی بکا کیا جواب ہے		۲۲	

★

اے میرے محنت کش وطن، وقت کے جلوہ نگار

عتیق سہارنپوری

سبزہ زاروں میں بدل دو تم وطن کے ریگ زار
پھر نظر کے موسمِ آجائے گلشن میں بہار
دہر میں بالا کر دو ہند کا عز و وقار
مادرِ ہندوستاں کو ہے اسی کا انتظار

صحنِ گلشن سے مٹا دو اپنے تم موج غبار
رقص فرمائی رہے دلکش ہوا پہ بلبلِ بہار
تذکرہ پھولوں کا کلیوں کا قفس پر آجائے تمہار
رنج و غم کا پھر نہ گلشن میں ہو کوئی بھی شکار

تم اگر چاہو تو مٹ جائیں غریبی کے نشاں
خانماں برباد بھی پا جائیں رہنے کو مکاں
اے مسیحائے گلستاں اے مسیحائے زماں
مہربانی کا تمہاری ہے ہر اک امیدوار

درحقیقت جو پسینے میں تمہارے آب ہے
وہ ہے جو سورج کہیں پر تو کہیں مہتاب ہے
کیا ہو تم، یہ جانتے تو کل جہاں بیتاب ہے
تم اگر چاہو تو توڑ سکتے ہو فلک کا حصار

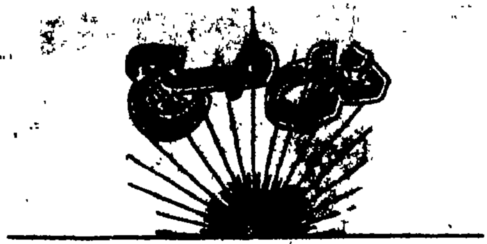
باندھ کر بھاکرا کو تم نے کیا ہے وہ کمال
اہلِ دانش کے لیے جو بن گیا ہے اک سوال
بھاکڑا بھی سرزمینِ ہند پہ ہے بے مثال
کیسے کیسے کر دیے ہیں تم نے پیدا آبشار

نٹ سے وایو دات تم نے ملک میں پیدا کیے
راکٹ و ناپام بھی تم نے وطن کو ہیں دیے
بہت گولے بھی بنائے تم نے بیرون کے لیے
کر نہیں سکتا تمہاری خوبیوں کا میں شمار

چپہ چپہ پر وطن کے ہے تمہیں کل اختیار
ہے وطن کو تم پہ اور تم کو وطن پہ اعتبار
لب پہ آتا ہے تمہارا نام سب کے بار بار
آؤ سب مل کر بنا دیں گلستاں کو لالہ زار
اے میرے محنت کش اے وقت کے جلوہ نگار

لـه نٹ وایو دات، نیٹ ہوائی جہاز

افسانہ



عبدل بھکاری اپنی شکستہ کوٹھری کے کونے میں پڑی ہوئی ٹوٹی جھول کی چارپائی پر بیٹھے پرانے گودڑوں میں اس طرح گر پڑا جیسے کوئی پرندہ مسلسل جدوجہد کے بعد طاقت پرواز ختم ہونے پر بے بس ہو کر گھونسلے میں جا گرتا ہے۔ عبدل آج اپنی زندگی سے بری طرح بیزار تھا۔ زندگی نے اسے کیا بنا کر رکھ دیا۔ کبھی اس کا بھی زمانہ تھا۔ تمنائیں ولولے تھیں، عزم و حوصلہ تھا، امنگیں تھیں، بڑا آدمی بننے کی خواہش تھی۔ لیکن قسمت کے کھیل بھی بڑے ہی عجیب ہوتے ہیں۔ آج وہ بڑا آدمی بننے کے بجائے صرف ایک بدنصیب بھکاری تھا اور صاف ستھرے مکان کی جگہ اس تنگ کوٹھری کے تنگ کونے کو آباد کیے ہوئے تھا جو مغلیہ عہد سے بھی زیادہ قدیم تاریخ اپنے میں چھپائے ہوئے تھی۔ اس کی دیواریں زمانے کی مسلسل چوٹیں سہتے سہتے کسی مظلوم بیوہ کے جسم کی طرح اپنے وجود کے سارے نقوش سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔ کوٹھری کا دھنستے بکھرے کویلوں کی ایک بوسیدہ چھت تھی جس میں سے آسمان اسی طرح نظر آرہا تھا جیسے جسم پر برص کے داغ نمایاں ہوں۔ کوٹھری کا ایک دروازہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ دوسرا تھا بھی تو عبدل کو دن بھر میں کئی دفعہ اٹھا اٹھا کر بڑے سلیقے کے ساتھ جمانا پڑتا تھا کیونکہ دروازے کے گرتے ہی جون جولائی کی تیز اور گرم ہوائیں سارے آداب کو فراموش کر کے رحم و ہمدردی کے تمام اصولوں کو نظر انداز کر کے بغیر کسی رکاوٹ کے اس کی چارپائی پر جابر لشکروں کے بے رحم سپاہیوں کی طرح دندناتی گھس آتی تھیں اور اس کی بوڑھی ہڈیوں میں بندوق کی گولیوں کی طرح پیوست ہو کر اس کی روح تک کو جھنجھوڑ ڈالتی تھیں۔ آج عبدل در در داتاؤں کی خیر منا کر واپس آیا ہی تھا کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے کوٹھری کے کواڑ کو دھڑام سے گرا دیا۔ ویسے بھی بوڑھا بھکاری صبح سے شام تک بھیک مانگتے مانگتے اپنے بوڑھے جسم کی ساری طاقت صرف کر چکا تھا، اس پر مزید بڑھاپے نے زندگی سے اور زیادہ بیزار بنا رکھی تھی۔ وہ چارپائی سے بڑی مشکل سے اٹھا اور دروازے کے پٹ کو دوبارہ اس کی جگہ پر کھڑا کر کے پھر بستر پر گر گیا اور خالی خالی نظروں سے ٹوٹی چھت کو گھورنے لگا۔ داتاؤں کو سینکڑوں دعائیں دینے اور در در آواز لگانے کے بعد بھی آج وہ کچھ نہ پا سکا تھا۔ اس کی جھولی خالی ہی تھی اور خالی جھولی کی طرح اس کا پیٹ بھی خالی تھا۔ بالکل خالی۔

دھیرے دھیرے دن بھر کا تھکا ہوا سورج مغرب کے آغوش میں پہنچ گیا اور عبدل کی تاریک کوٹھری کی روشن چھت سرمئی اندھیروں کے طلسم میں اپنے وجود سے ہاتھ دھو بیٹھی لیکن اس کی نگاہیں مسلسل چھت پر گڑی رہیں، یہاں تک کہ شام کے سرمئی جسم کو رات کی سیاہ زنجیروں نے جکڑ لیا اور چھت کے اوپر پھیلے ہوئے آسمان پر بکھرے تارے چھت کے سوراخوں سے جھانکنے لگے، جیسے عبدل کی بے بسی پر مسکرا رہے ہوں۔ عبدل نے چپ چاپ مسکراتے ہوئے ان ستاروں کو دیکھ کر ایک آہ بھری اور سوچا۔ تارے بھی میری مجبوری کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ تارے جن کے خود کے وجود کی کوئی گارنٹی نہیں، جنہیں خود نہیں معلوم کہ کب ایک کالی گھٹا آکر اچانک ان کی زندگی کو ختم کر دے گی۔ عبدل نے اس تکلیف دہ خیال سے خود کو بچانے کے لیے

گئے سڑک ۔ اور اپنی آنکھیں بند کرلیں ۔ عبدل کے آنکھیں بند کرتے ہی اس کے چہرے پر پڑی ہوئی سینکڑوں جھریوں کی طرح اس کے دماغ میں بھی سینکڑوں آڑی ترچھی لکیریں ایک دوسرے سے مل مل کرنئے نئے نقش بنانے لگیں اور خالی پیٹ سے اٹھنے والی ٹیسیں ان نقوش میں رنگ بھرنے لگیں ۔ اچانک ہی اس کے دماغ کے اسکرین پر داتاؤں کے سخت چہرے ابھرے اور پھر ان کی آوازیں گونجنے لگیں ۔ بھوکا ہے ۔ بڑھاپے ۔ کمزور ہے ۔ کام نہیں بنتا تو مرکیوں نہیں جاتا ۔ مرکیوں نہیں جاتا ؟ مرکیوں نہیں جاتا کی آواز ٹوٹے ہوئے ریکارڈ پر رکھی ہوئی سوئی سے نکلنے والی آواز کی طرح بار بار گونج کر عبدل کے دماغ پر لوہار کے ہتھوڑے کی طرح چوٹیں مارنے لگی ۔ وہ تڑپ کر رہ گیا اس کا دل چاہا کہ وہ تمام لوگوں کا گلا دبادے ۔ اس نے غصہ میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیں ۔ اُف کتنے بے درد اور بے رحم ہیں یہ لوگ ہمدردی اور انسانیت سے تو جیسے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ اور میں کیا کروں ۔ میں بھی تو کتنا مجبور ہوں ۔ کتنا بے بس ہوں ، نہ انھیں کچھ کرسکتا ہوں ، نہ انھیں مار سکتا ہوں ، نہ ہی خود مرسکتا ہوں اور نہ ہی پیٹ کی آگ پر پانی ڈال سکتا ہوں ۔۔۔ نہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرسکتا ہوں ۔ سماج کے بے رحم ٹھیکیداروں نے میری زندگی سے سارے حقوق اس طرح غائب کردیے ہیں جس طرح سائنسی عہد نے انسانی چہروں سے رونق ۔ اُف ! حق ۔ حق ۔ میرا حق مجھے کیسے ملے گا ۔ میں اپنے حقوق کس طرح حاصل کرسکتا ہوں ۔ حق کے لفظ نے عبدل کے دماغ میں داخل ہوکر ایک نئی ہلچل پیدا کردی اور بے اختیار صبح کا ایک واقعہ اس کے دماغ کے پردے پر ابھر آیا ۔ صبح جب وہ ٹیکسٹائل مل کے سامنے سے اپنا خالی کشکول لیے گزر رہا تھا کہ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گیا تھا بہت سے مزدور مل کے دروازے کے سامنے جمع تھے اور ان کے سامنے اونچائی پر کھڑا ایک مزدور لیڈر پرجوش انداز میں کہہ رہا تھا " اس مل پر اور اس مل کی آمدنی پر ہمارا اتنا ہی حق اور اختیار ہے جتنا سیٹھ بلدیو پرشاد کا اگر وہ اس مل کے مالک ہیں تو ہماری ملکیت میں ہمارا بھی حصہ ہے کیونکہ اس میں ہماری محنت مشقت اور خون پسینہ شامل ہے ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سیٹھ تو مل کی بڑھتی ہوئی آمدنی سے عیش کریں اور ہم بڑھتی ہوئی مہنگائی میں فاقے کریں ۔ ہم نے بار بار اس زیادتی کی جانب توجہ دلانے کی کوشش کی اور اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سرمایہ داروں کو ہم سے کوئی ہمدردی نہیں انھیں ہماری اور ہمارے بچوں سے زیادہ اپنی آمدنی کی فکر رہتی ہے چنانچہ ہماری یونین نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم ان کی بے حسی کو ختم کرنے کے لیے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے متحد ہوکر جدوجہد کریں گے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ ہمارے مطالبات منظور نہیں ہوتے ۔ مزدور رہنما کی تقریر تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں ختم ہوگئی ۔ اچانک عبدل کے خیالات کا سلسلہ دھڑام کی آواز سے ٹوٹ گیا اور وہ اپنے تھکے ہوئے جسم کو بستر سے اٹھا کر کھلے ہوئے دروازے کو دوبارہ اس کی جگہ پر جمانے کے لیے چل پڑا ۔ اس ناخوشگوار فرض کو انجام دینے کے بعد ایک دفعہ پھر اس کا پرانا پلنگ اس کے بوجھ کے وجود سے دب کر سسک اٹھا ۔ پھر دھیرے دھیرے رات کی بڑھتی ہوئی سنسان تاریکی نے اس کی بڑھتی ہوئی بھوک کو شکست دے دی اور ہوا کے نرم جھونکوں نے بھوک کے احساس پر غالب آکر اسے خوابوں کی بے فکر دنیا میں پہنچا دیا ۔ خواب میں عبدل بھکاریوں کے ایک بڑے مجمعے کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا " ہم بھی انسان ہیں سماج پر ہمارا بھی حق ہے ۔ انسانیت کے ناطے دنیا کے لوگوں کو جن کے پاس دولت ہے روپیہ پیسہ ہے یہ سوچنا چاہیے کہ اس پر ہمارا بھی حق ہے اور انھیں حقداروں کو ان کا حق دینا چاہیے ۔ ہم مجبور ہیں ، بے بس ہیں کما نہیں سکتے ۔ ہماری مدد کرنا اور ہماری بھوک مٹانا ان کا فرض ہے ۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے یا اس بات کو نہیں سمجھتے تو ہمیں انھیں یہ بات سمجھانا پڑے گی لیکن یہ کام کسی ایک آدمی کے بس کا نہیں بلکہ اس کے لیے ہمیں آپس میں متحد ہوکر یونین بنانا پڑے گی تاکہ ہم میں طاقت پیدا ہو اور ہم اپنے حق کے لیے لڑ سکیں " بوڑھا عبدل بولتا رہا لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے نہ ہی جلسہ تالیوں سے گونج رہا ہے ابھی عبدل اس بات کو محسوس ہی کر پایا تھا کہ مجمع سے فضلو کا لڑکا کا انل جسے اس کے باپ نے اسکول میں داخل کرا دیا تھا نکل کر عبدل کے سامنے

کھڑا ہو گیا اور معصومانہ انداز میں عبدل سے پوچھنے لگا:
عبدل چاچا! تم میں طاقت ہے۔ پھر بنا سکتے ہو تو محنت مزدوری کرکے پیٹ کیوں نہیں بھرتے؟ بھیک کیوں مانگتے ہو؟ بھیک کے لیے تو لڑنے کو تیار ہو۔ مزدوری کے لیے تیار کیوں نہیں ہوتے؟ جب تم کچھ کرتے ہی نہیں تو پھر حق کیسا؟

عبدل کے پاس اسلم کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموش نظروں سے بچے کو دیکھنے لگا۔ سب ہی خاموش تھے۔ عبدل نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ اسلم کی آواز اس کے شعور پر ہتھوڑے کی طرح چوٹیں مارنے لگی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اسے بھرے مجمع میں ننگا کر دیا گیا ہو۔ وہ ذلت اور شرمندگی سے پسینے پسینے ہو گیا۔ اس نے اپنے لیے نئی [illegible] اٹھائیں۔ مجمع چھٹ چکا تھا اور اس کی آنکھوں سے [illegible] دروازے کے باہر کوٹھری کی تاریکی سے دور افق پر سورج کی کرنیں جھلملا کر زندگی کی [illegible] میں مصروف تھیں۔ اس نے گھبرا کر بستر چھوڑ دیا۔ پھر صبح کی سنہری کرنوں نے دیکھا کہ بوڑھا عبدل بھیک کے کٹورے کے بجائے ہاتھ میں تھیلا لیے چہرے کی جھریوں میں مسکراہٹ چھپائے ایک نئے عزم کے ساتھ مزدوروں کے اڈے کی طرف بڑھ رہا ہے۔

★

منشی [illegible]

وہ لوگ جنھوں نے میرے آگے سر ٹیک کر پڑھا آسودہ حال ہو گئے، مل جاتے ہیں تو توقع رکھتے ہیں کہ میں انھیں سلام کروں۔ ان میں ایک رئیس الدین تک طوطی بولتا تھا، جس کا ذکر اوپر کیا، وہ وکیل ہو گیا تھا۔ مکان (رئیس منزل) بھی بنا لیا تھا۔ پھر پاگل ہو گیا۔ شہرت اجڑ گئی۔ ہم گر تم سے یہ اندیشہ ہرگز نہیں۔ تم حاصل باپ کے فرزند ہو۔ پھر [illegible]

سفید بال اور سفید [illegible]

تھے غضب نہیں تو اور کیا ہے کہ ۲۵ سالہ عورت بھی انھیں بڑے میاں کہہ کر پکارتی ہے۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسے بڑے میاں کہنے کا مزا اسی وقت چکھا دیتے لیکن پشاوری کے شدا سپان والے کی دکان پر لگے ہوئے آئینے نے ان کا ہاتھ روک لیا۔ پولیس والے کے ڈنڈے نے ڈرایا اور پان والے کے آئینے نے سفید بال دکھا کر شرما دیا۔

اب وہ شرمندہ کرنے والے سفید بالوں کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے آخری فیصلہ کر لیا کہ وہ ان موذی سفید بالوں کا [illegible] دکھا دیں گے۔ فوراً دکان پر [illegible] کا خواب دیکھتے ہوئے شہر سے رہائش بدل دی۔ جوانی کا زمانہ دل کی بھیڑ بھاڑ جیب میں سیاہ خضاب چھپائے ہوئے۔ باوجود بلا عینک کے بڑھاپا قدم قدم پر ٹھوکریں مارتا اور جوانی کا خواب پاش پاش کرتا رہا۔ پچھتاتے تھے۔ خضاب مسکرا رہا تھا۔ سفید بال اور سفید ہو گئے تھے۔

★

وہ شدتِ الم ہے دعا کو ترس گئے
ساز شکستہ ہیں کہ صدا کو ترس گئے

کب سے کھلا نہیں چمنِ خونِ دل نہ پوچھ
رنگِ حنا و دستِ حنا کو ترس گئے

یہ وحشتِ آرزو، یہ کڑکتی غموں کی دھوپ
گھنگھور گیسوؤں کی گھٹا کو ترس گئے

کیا پوچھتے ہو گوش برآواز کب سے ہیں
جھکے ہوئے لبوں کی دعا کو ترس گئے

یا اپنے دم قدم سے تھی نشو و نمائے زیست
یا زندگی کی آب و ہوا کو ترس گئے

ہر سمت ہے جہاں میں کدورت بھری ہوئی
مدت سے اہلِ صدق و صفا کو ترس گئے

یا ہر ادائے زیست ہمارے ہی دم سے تھی
یا ہم ہی زندگی کی ادا کو ترس گئے

سجتی ہے کب وہ محفلِ یاراں کہ آہ ہم
یارانِ ہم نفس کی صدا کو ترس گئے

ہر رہ گزر کو ہم سے ملی منزلِ مراد
یا ہم ہی منزلوں کی ہوا کو ترس گئے

اے ساکنانِ شہرِ محبت کہاں ہو تم
ہم خلوص و بزمِ وفا کو ترس گئے

غزل

اعجاز اسلام اشک

لے اٹھ رہا ہوں بزم سے میں تشنگی کے ساتھ
ساقی مگر یہ ظلم نہ ہو اب کسی کے ساتھ

ہنس ہنس کے جی رہا ہوں مگر میرے دل سے پوچھ
وابستہ کتنے غم ہیں مری زندگی کے ساتھ

پھر دیکھئے کس قدر ہے سکون بخش زندگی
پہلے کوئی گزار تو لے سادگی کے ساتھ

کھویا ہوں اس کے حسن کی رنگینیوں میں میں
الجھا ہوا ہے وہ بھی مری سادگی کے ساتھ

پیہم ستم نے آپ کے مجھ کو سکھا دیا
ہر امتحانِ غم سے گزرنا خوشی کے ساتھ

میں خود پہ ہنس پڑا ہوں تمہیں دیکھنے کے بعد
اک اجنبی دیار میں اک اجنبی کے ساتھ

حاضر ہے اشک آیئے بسمل بنایئے
کیوں جا رہے ہیں آپ شکستہ دلی کے ساتھ

بھاگلپور ۱۸۹۳ اشک

خصوصی مضامین نمبر

جنگ آزادی کا ایک جانباز سپاہی

مولانا ارشاد ظلیانوی

ہندستان کی آزادی ہزاروں شہیدوں اور لاکھوں جانبازوں کی رہین منت ہے۔ یہ آزادی کے متوالے عیش و عشرت، دھن دولت اور گھر بار کو چھوڑ کر آزادی کی راہ میں نکل پڑے۔ اس راہ میں انھوں نے لاتعداد زخم کھائے، تکلیفیں سہیں اور دار و رسن کی منزلیں طے کیں۔ لیکن اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنا گوارا نہ کیا۔ انھوں نے غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دی۔ ان مجاہدین آزادی میں سے ہزاروں تو شہادت کا جام نوش فرما چکے ہیں مگر کچھ ابھی تک بقید حیات ہیں۔ ان لوگوں میں سے بعض تو نام و نمود اور سیلف پبلسٹی سے بے نیاز گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھی میں سے ایک ہیں مجاہد آزادی مولانا ارشاد ظلیانوی۔

حکیم چودھری ارشاد اللہ خاں ولد چودھری احمد اللہ خاں، مقیم شکر گوئی سارلی گیٹ شہر میرٹھ، ۹ فروری ۱۹۰۸ء کو ظلیانہ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے گاؤں ہی کے مدرسے میں پائی اور پھر اس کے بعد تحصیل علم کے لیے آپ میرٹھ تشریف لائے۔ جہاں سے آپ نے عالم، فاضل اور مولوی وغیرہ کی اسناد حاصل کیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب اپنے اردگرد نظر ڈالی تو ہندستان کو غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا پایا۔ اس وقت گاندھی جی کی تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ نوجوان گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔ آپ بھی اس فضا کو دیکھ کر متاثر ہوئے اور ۱۹۲۳ء میں کانگریس اور خلافت کمیٹی کے ممبر بن گئے۔ یہیں سے آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

آپ کو اردو شاعری سے شروع ہی سے ایک خصوصی لگاؤ رہا ہے۔ آپ زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر کہا کرتے تھے چنانچہ اس موقع پر آپ کے اس ذوق نے بڑا ساتھ دیا۔ آزادی سے قبل کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اردو شاعری صرف "گل و رخسار" تک ہی محدود ہے لیکن مولانا ارشاد نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان اور اردو شاعری دنیا کی کسی زبان سے کم نہیں۔ یہ ہماری زندگی کے ہر مسئلے کو حل کر سکتی ہے اور ضرورت پڑنے پر تلوار سے بھی زیادہ کام دے سکتی ہے۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے نوجوان دلوں کو گرمایا اور نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے آزادی کی شان میں کئی قصیدے بھی لکھے تحریک آزادی کو بڑھانے کے لیے گیت بھی گائے۔ خاص طور سے ان کی یہ نظمیں تو بے حد مقبول ہوئیں۔ میرٹھ کے بچے بچے کی زبان پر یہ اشعار تھے

شیر بکری کا جھگڑا ہوا آج کل — آبرو رکھنا مولا تیرے ہاتھ ہے

جب نرہ بکہ گھر گھر میں چرخہ چلے — لیجے سوراج مہاراج گاندھی چلے

جب ۱۹۲۸ء میں مولانا اسد اللہ خاں گرفتار کر لیے گئے تو میرٹھ کے سرکردہ لیڈر جناب نجم الدین احمد صاحب مرحوم نے زور دیا کہ اس وقت میرٹھ میں سوائے مولانا ارشاد کے اور کوئی شخص نظر نہیں آتا کہ جنھیں جمعیۃ العلماء کا ناظم بنایا جا سکے۔ مولانا موصوف نے لاکھ کہا کہ میں بحیثیت ایک والنٹیر ہی زیادہ بہتر کام کر سکتا ہوں مگر کانگریسی لیڈران کے آگے ان کی ایک نہ چلی [illegible] آپ ناظم بنا دیے گئے۔ ناظم ہونے کے بعد آپ نے میرٹھ اور اس کے مضافات...

کے تڑپتے ہوئے جلسوں میں دھواں دھار تقریریں کیں۔ آپ کی تقریروں میں طنز اور خوش طبعی کا پہلو زیادہ ہوتا تھا اسی لیے عوام آپ کی تقاریر کا بڑے شوق سے انتظار اور خیر مقدم کیا کرتے تھے۔

ایک روز آپ کو علم ہوا کہ میری گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے مگر آپ کو تحصیل باغپت اور تحصیل سردھنہ جانا تھا کیونکہ ان علاقوں میں آپ کی تقریروں کی بڑی ضرورت تھی۔ آپ بے خوف خطر اپنی منزل کو روانہ ہو گئے اور باغپت، بڑوت، چھپرولی اور کوتانہ وغیرہ میں وہ دھواں دار تقریریں کیں کہ لوگ آپ کی ہمت اور شجاعت کو دیکھ کر عش عش کر اٹھے۔ تحصیل باغپت سے فارغ ہو کر آپ تحصیل سردھنہ روانہ ہوئے اور دیہاتوں کو اپنی تقاریر سے گرمانے چلے گئے۔ یہاں سے اکتوبر ۱۹۳۰ء میں لوٹے اور جب یہ دیکھا کہ اب میری کوئی ضرورت نہیں رہی ہے تو کوتوال میرٹھ کو ایک پرچہ لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ میری گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے اور پولیس میری تلاش میں سرگرداں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو میں آزادیٔ وطن کی خاطر اپنے آپ کو بخوشی گرفتار کرانے کے لیے تیار ہوں۔ فوراً کوتوال صاحب میرٹھ معہ چند سپاہیوں کے آئے اور آپ کو گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا گیا۔ مسٹر رام سہائے مجسٹریٹ درجہ اول کے اجلاس میں مقدمہ [illegible] و ۱۹۳، دفعہ ۱۰۸/۱۱۲ ضابطہ فوجداری کر کے آپ پر چلایا گیا، جہاں سے آپ کو ایک سال کی قید کا حکم ہوا۔

جیل کے اندر جھنڈے کی سلامی بلوانے والے کے ساتھ انتہائی تشدد سے کام لیا جاتا تھا۔ جیل کے حکام کی جانب سے یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص جھنڈے کی سلامی بلوانے کی کوشش کرے تو اس پر ڈنڈوں کی بارش کر دی جائے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف طریقوں سے اس کو اذیتیں دینے کا حکم تھا۔ ابتدا میں چند لوگوں نے جھنڈے کی سلامی بلوائی مگر جب یہ حکم ہوا تو کسی کی ہمت نہ پڑی۔ مولانا موصوف نے جب یہ دیکھا کہ کوئی جھنڈے کی سلامی بلوانے کے لیے تیار نہیں تو آپ نے کہا کہ کل سلامی میں بلواؤں گا۔ ساتھیوں نے یہ سمجھا کہ مذاق کر رہے ہیں کیونکہ اس سے قبل مولانا کبھی جھنڈے کی سلامی میں شریک نہیں ہوا کرتے تھے مگر جب آپ بارک سے نکل کر زور زور سے چلا کر

"وجئے وشو ترنگا پیارا   جھنڈا اونچا رہے ہمارا"

تو دوسرے ساتھیوں نے بھی آپ کی آواز پر لبیک کہا۔ آن کی آن میں پچیس تیس ساتھی جمع ہو گئے۔ جیل کے حکام اور سپاہیوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو ڈنڈے اور لاٹھی لے کر دوڑے اور مجمع پر برسانے لگے۔ مگر گیت نے دلوں میں کچھ ایسا جوش بھر دیا تھا کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا اور جھنڈے کی سلامی برابر ہوتی رہی۔ اس موقع پر لاٹھی کھانے والوں نے بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے چلا کر کہا:

"ہم جیتے جی جھنڈے کی سلامی بند نہیں کریں گے۔ کوئی اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہٹے۔"

آخرکار حکامِ جیل کو اپنی ہار ماننی پڑی اور جھنڈے کی سلامی پوری ہوئی۔ اگلے دن مولانا موصوف کو سپرنٹنڈنٹ جیل نے طلب کیا اور کل کے واقعہ کی وضاحت چاہی۔ آپ نے صاف صاف سب کچھ بتا دیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل مولانا کی اس دلیری پر تاؤ کھا گیا اور اس نے جھلا کر پندرہ دن کے لیے ہینگنگ ہینڈ کی سزا دی۔ آپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "تھینک یو۔"

سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا: "اچھا ڈنڈا بیڑی بھی رہے گی۔"

آپ نے پھر فرمایا: "تھینک یو ویری مچ۔" اس پر اس نے ٹاٹ کی وردی کا اور اضافہ کر دیا۔ آپ اسی شان سے تقریباً دس ماہ جیل میں رہے۔ اسی دوران گاندھی ارون پیکٹ ہو گیا جس کے تحت تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے۔ اس کے بعد آپ بسلسلۂ روزگار لاہور چلے گئے اور ۱۹۴۲ء تک برابر سیاسی تقاریر کرتے رہے جس کے صلے میں آپ کو بورسٹل جیل لاہور کی دو مرتبہ ہوا کھانی پڑی۔ کچھ دنوں فیروز پور جیل کا بھی پانی پیا۔ ۱۹۴۵-۴۶ء میں میرٹھ واپس آئے اور تحصیل باغپت کے دیہاتوں میں کانگریسی امیدوار کے حق میں تقریریں کرتے رہے۔ اسی دوران کئی جگہ مخالف پارٹیوں کی طرف سے آپ پر جانی حملے بھی ہوئے مگر ہر بار اپنی سخت جانی کی وجہ سے بچتے رہے۔

حصولِ آزادی کے بعد آپ نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

جواہرات

محمد محمود نیازی

جواہرات جوہر کی جمع الجمع ہے لیکن صرف اردو میں ہی مستعمل ہے۔ جوہر کی جمع جواہر ہے اس کا اطلاق مفرد پر بھی ہوتا ہے۔ جواہرات کو عام طور پر رتن بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا استعمال زمانہ قدیم سے بناؤ سنگار، زیب و زینت، تزئین و آرائش اور نشانِ دولت و عزت کے لیے ہوتا آرہا ہے۔ ان کے زیورات بنائے جاتے ہیں، چاندی اور سونے کے زیورات میں ان کو جڑا جاتا ہے، بادشاہوں کے تاج اور ملکہ کے گلے کی زینت بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ جنگی ہتھیاروں کے دستوں کو منقش کرنے میں، برتن بنانے اور عمارتوں کی پچی کاری میں بھی ان کا استعمال ہوتا ہے۔ ان کے سگریٹ کیس، گلدان، قلمدان، پیپر ویٹ، شیروانی اور قمیص کے بٹن بھی بنائے جاتے ہیں۔ غرضیکہ جواہرات بادشاہوں، سرداروں اور امیروں کے لیے تعیش پسندی کی چیز ہے۔ البتہ غریب لوگوں میں ان کا استعمال دواؤں کی حد تک محدود ہے۔ ہاں ادنیٰ اور کم قیمت رتنوں کا استعمال عام لوگ کرتے ہیں جیسے عقیق، یشب، فیروزہ، مونگا، کچلی و کچے یاقوت اور ان کی چنیاں، تامڑا، پھیکے رنگ کے نیلم و پکھراج، بدرنگے زمرد اور مرجان وغیرہ۔

مشہور ہے کہ آغا خان سوم کو جواہرات کا بہت شوق تھا اور ان کے پاس تھے بھی بہت۔ ایک بار جب وہ میر عثمان علی خاں بہادر نظام حیدرآباد سے ملنے گئے، تو وہاں گفتگو جواہرات کا ذکر بھی ہوا۔ آغا خاں کو نظام کے جواہرات دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ نظام نے اپنے سرہانے کی میز سے ایک میلا کچیلا گرد آلود پیپر ویٹ اٹھا کر آغا خاں کے ہاتھ میں دے دیا۔ آغا خاں نے جب اس کو پانی سے دھو کر صاف کیا تو پیپر ویٹ کا سرخ احمریں رنگ چمکنے لگا، معلوم ہوا کہ وہ پیپر ویٹ ایک ڈلی یاقوت کا تھا۔ آغا خاں اس کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اس وقت دنیا کا مشہور ترین ہیرا "کوہ نور" تاجِ برطانیہ کی زینت ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ہیرا سورج دیوتا نے کسی شخص کو دیا تھا۔ پھر سنہ ۳۰۰۰ ق م اس کو راجہ کرن انگ اپنے گلے میں پہنا کرتا تھا۔ اس کے بعد بکرما جیت کے پاس رہا۔ صدیوں تک اسی طرح بادشاہوں کے قبضہ میں رہتے ہوئے آخر کار ۱۸۴۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ لگا اور اس نے ملکہ وکٹوریا کو نذر کر دیا۔ یہ ہیرا اپنی آب و تاب، جسامت اور قیمت کے لحاظ سے دنیا میں فرد ہے۔ اس ہیرے کے متعلق طرح طرح کی روایتیں اور افسانے مشہور ہیں جو اکثر کتابوں میں مذکور ہیں۔ اسی طرح اور رتنوں کی تاریخی اہمیت، ان کے اثرات اور ان کی چوریوں پر مضامین ملتے ہیں لیکن جواہرات کی اقسام، شناخت، افادیت، افعال و خواص اور نسبت نجوم پر سیر حاصل تبصرہ کم ملتا ہے۔ ان کا استعمال چونکہ ایک مخصوص اور محدود طبقہ میں ہوتا ہے اس لیے عام طور پر لوگوں کو ان سے واقفیت کم رہتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں چند مخصوص اور مشہور جواہرات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۱) لعل: لعل ہندی لال کا معرب ہے۔ اس پتھر کو جواہرات میں قسم اوّل کا سمجھا جاتا ہے۔ اس کا رنگ سرخ، چمک دار اور بیر بہوٹی کی مانند ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لعل کا علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ ایک اور گوہرِ شب چراغ یاقوت کا نام ہے جو نہایت آبدار شفاف اور دہکتے ہوئے انگارے کی مانند سرخ ہوتا ہے۔ بعض کا قیاس ہے کہ سرخ ہیرے کو کہتے ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ مشہور

[illegible] لعل کی آب و تاب اور چمک اس قدر ہوتی ہے کہ اس کے
چاروں طرف اندھیرے میں بھی روشنی پھیل جاتی ہے۔ قدیم کتب میں بھی اس
کا ذکر موجود ہے۔ [illegible] نے لکھا ہے کہ تین سو
سال قبل بدخشاں کا ایک پہاڑ بسبب زلزلۂ عظیم شق ہو گیا تھا اور اس
میں [illegible] ہوئے تھے۔ یہ لعل مختلف الالوان تھے۔ کوئی
پیازی رنگ کا تھا کوئی پیازی رنگ، کسی کا رنگ کھجور کا تھا تو
کوئی سرخ۔ تراشنے کے بعد سرخ لعل سب سے بہتر ثابت ہوئے۔ ان
لعلوں کا رنگ سرخی میں یاقوت سے کسی قدر کم تھا اور اس میں زرد
اور بنفشی رنگ بھی شامل تھا۔ کان میں بھی لعل پیدا ہوتے ہیں لیکن
بدخشاں اور قندھار کے لعل اب بھی مشہور ہیں۔

لعل کی افسانوی اہمیت بھی بہت ہے۔ عربی، فارسی اور
اردو ادب میں جگہ جگہ "لال" کا ذکر موجود ہے۔ میر امن نے
باغ و بہار میں خواجہ سگ پرست کے کتے کا ذکر کیا ہے۔ نیشاپور
کے اس سوداگر نے اپنے کتے کے گلے میں سات سات مثقال وزن
کے بارہ دانے لعل بے بہا کے ڈال رکھے تھے۔ اسی لیے وہ خواجہ
سگ پرست کے نام سے مشہور تھا۔ اب یہ تلمیح ایسے شخص کے لیے استعمال
ہوتی ہے جو اپنے ملازمین اور جانوروں کو اپنے عزیز و اقارب سے برتر
سمجھے اور اشراف کے مقابلے میں رذیل کو فوقیت دے۔

لال کا رنگ چونکہ سرخ احمریں ہوتا ہے اسی لیے لالہ کے پھول
کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ سرخ ہونٹوں کو بھی لب لعل لکھا جاتا ہے ؎

رنگیں لب لعل کی صدا ہے ۔۔۔ کیا خوب یہ لال بولتا ہے (وزیر)

شکل لال ہے وہ منہ بھر بھر ۔۔۔ سمجھتے ہیں سنگ کے یہ لعل بدخشاں یا (جلیل)

ہیرا، الماس (ھیرو)۔ جواہرات میں ہیرے کا تیسرا درجہ ہے اور
اگر لعل کو قیمتی پتھر سمجھ لیا جائے تو ہیرے کا درجہ اول ہو جاتا ہے۔ یہ
سفید، درخشاں، شفاف اور سخت ترین رتن ہے۔ اس کو ہر موسم
میں پہنا جاتا ہے۔ اس لیے اسے "سعادت" کا جوہر کہتے ہیں۔
ہیرے کا شمار سخت ترین نفیس پتھروں میں ہوتا ہے۔
یہ عام طور پر سفید رنگ کا ہوتا ہے اور اس میں سے آفتاب کی مانند
کرنیں پھوٹتی ہیں۔ اس کے رنگ اور قسمیں بھی مختلف ہیں جیسے نیلگوں،
زرد، سیاہ، سرخ، سبز اور گلابی جھلک کا کم رنگ۔ سیاہ ہیرے
کو ہندی میں تیلیا کہتے ہیں۔ سبز، گلابی اور سیاہ جھلک والے ہیرے
چاہے وہ کم رنگ ہوں یا خاص ایک رنگ کمیاب سمجھے جاتے ہیں۔ تیلیا
اور داغ دار سفید کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر داغ سرخ ہوں تو اس
کو دیبی کہا جاتا ہے۔ رنگ کے اعتبار سے یہ مختلف ناموں سے
پکارا جاتا ہے جیسے :

بیش بہا ہیرا۔ زرد رنگ کی جھلک کا ہیرا جو زیتی اور سُلقی
بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے استعمال سے مرض کا فقہ "یرقان" جاتا ہے۔

نوشادری۔ نوشادر کے رنگ کے بالکل سفید ہیرے کا نام ہے جو سب سے
بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اس کو "برہمن ہیرا" بھی کہتے ہیں۔

فلوسی۔ چاندی کے رنگ کا سفید ہیرا جو سفیدی میں "نوشادری"
سے کم ہوتا ہے۔ اسے سیمابی الماس بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بڑے
نگوں کو مقدونی اور رومی بھی کہتے ہیں۔

تو ملی۔ ہیرے کی اس قسم کا نام ہے جو چمک میں کم، سختی میں نرم اور قیمت
میں کم ہوتا ہے۔ یہ ہیرے کی ادنیٰ قسم ہے۔

سب سے بہتر اور قیمتی ہیرا وہ سمجھا جاتا ہے جو سفید، یک رنگ،
شفاف، براق اور وزن میں بڑا ہو۔ ہیرے کے متعلق عام خیال یہی
ہے کہ یہ کوئلہ سے بنتا ہے۔ اسی لیے کوئلہ، ہرتال، صدف اور ابرک کی
مانند اس کے بھی ورق ورق ہوتے ہیں لیکن یہ ورق غیر محسوس
اور باہم پیوستہ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ان ورقوں کو جدا کرنے
میں بھی درک رکھتے ہیں لیکن یہ انتہائی مہارت کا کام ہے۔

ہیرے نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ زمین کو کھود کر وہاں کی خاک
لے لی جاتی ہے اور پھر اس خاک کو زمین پر پھیلا کر پانی چھڑکا جاتا
ہے اور رات آنے کے وقت اس پر نظر رکھی جاتی ہے۔ جس جگہ بھی بجلی
سی کوندتی معلوم ہوتی ہے وہاں کی خاک پر بھی یہی عمل دہرا کر ریزہ
ہائے الماس چن لیے جاتے ہیں۔ ابتدا میں تراش سے قبل ہیرے میں
صفائی و چمک کم ہوتی ہے لیکن اس کی تراش کے بعد اس کے حسن و خوبی
ظاہر ہوتے ہیں۔ ہیرے کی تراش کا کام ہندوستان میں زمانۂ قدیم
سے ہوتا آرہا ہے۔ اس کام کے لیے سورت کا مقام مشہور ہے۔

لیکن بلجیم کے تراشے سفید ہیرے سب سے بہتر اور بیش قیمت سمجھے جاتے تھے۔ ہیرے کی تراش میں اب مسٹر شل کا نام بھی بہت مشہور ہے۔ یہ بات غلط طور پر مشہور ہے کہ ہیرے کو سیسے سے کاٹا جاتا ہے۔ درحقیقت ہیرے کی تراش سیاہ ہیرے سے ہی ہوتی ہے کیونکہ دیگر عمل آگ یا جدید آلات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے لیکن ہندوستان میں مخصوص ماہرین اور فقیر اس کا کشتہ کر لیتے ہیں جو بہترین نافع خیال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں ہیرے کی کانیں دکن اور پنا کی مشہور ہیں۔

ہیرے کی سفیدی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جوش کا شعر ہے۔

رنگ ایسا کہ میلا ہو جسے دیکھ کے الماس
ابر ایسا کہ پی لے شفا خوار و رنجھے بیاس

(۲) یاقوت۔ معدنی پتھروں میں اس نفیس اور عظیم القدر پتھر کا نمبر تیسرا ہے۔ یہ مختلف رنگ اور اقسام کا پایا جاتا ہے جیسے سرخ، زرد، کبود، پستی اور سفید۔ ان رنگوں کی ہر قسم ہر یک رنگ متوسط اور کم رنگ کی ہوتی ہے۔ ان میں سے بہترین قسم بہت زیادہ سرخ رنگ کی ہے جو قندھاری انار کے دانوں کی مانند سرخ ہو۔ قیمت کے تعین کے لیے ضروری ہے کہ سرخ یک رنگی کے ساتھ ساتھ شفاف، بے جرم، بے داغ اور بے رگ بھی۔ وزن میں تگڑا ہو اور اس کے تمام اجزا کا رنگ متبادل ہو۔ الماس کے بعد سختی میں یاقوت کا ہی نمبر آتا ہے۔ ان میں بھی یاقوت کبود سخت ترین ہوتا ہے۔ اس کے بعد سختی میں سرخ، زرد، پستی اور سفید کا درجہ ہے۔ زرد یاقوت کو عربی میں بسراق اور ہندی میں پکھراج کہتے ہیں۔ نیلے یاقوت کو فارسی میں نیلم اور ہندی میں نیلمنی کہا جاتا ہے۔ بہ اعتبار رنگ اس کے مختلف نام مشہور ہیں جیسے:

یاقوت احمر۔ سرخ رنگ کا مائل بہ سیاہی۔ رنگ کی تیزی اس کی آب کو دبا دیتی ہے۔

ارغوانی یا تامڑا۔ تامڑا گھنگے کی کھوپڑی کو کہتے ہیں۔ یہ چمک اور آب میں کم ہوتا ہے۔

دردی یاقوت: سرخ مائل بہ زردی کم قیمت و معمولی۔

یاقوت رمانی: قندھاری انار کے دانوں کی مانند آب دار سرخ، درخشاں۔

کحلی یاقوت: سیاہی مائل۔ عام طور پر دستیاب ہے۔

کوکب یا گوہر شب چراغ: نہایت سرخ و شفاف۔ منور، دمکتے ہوئے انگارے کی مانند جیسے یہی چمکتا ہو۔

لالڑی: یاقوت کی ادنیٰ قسم۔ رنگ پھیکا۔ چمک کم۔ کندھی میں نرم۔

چنی: گہرے سرخ رنگ کے کسور کے دانے کے برابر چھوٹے دانے جو زیورات میں کام آتے ہیں۔

لاجوردی اور پستئی یاقوت کمیاب ہیں۔ یاقوت کبود قیمت میں برتر ہوتا ہے۔ آگ میں ڈالنے سے یاقوت کا رنگ متغیر نہیں ہوتا ہیرے کے علاوہ یہ دوسرے تمام جواہرات کو کاٹ اور پیس سکتا ہے۔

ظفر اس کے لب رنگیں سے ہم تو کام لیتے ہیں
کہاں کا لعل رمانی ہے یاقوت یمن کس کا

(بہادر شاہ ظفر)

یاقوت کا مادۂ پیدائش گندھک اور سیماب ہے۔ مشہور ہے کہ پیگو میں جس جگہ یاقوت کا معدن ہے وہاں پر گندھک کی بو آتی ہے۔ یاقوت کی پیدائش کے لیے یمن، بدخشاں، برما، سیلون اور برازیل مشہور مقامات ہیں لیکن ان سب میں سیلون کا نام سب سے مشہور ہے۔ عربی مصنفوں نے تو اس کا نام ہی جزیرۂ یاقوت رکھ دیا تھا۔ مارکوپولو نے لکھا ہے کہ قوبلا قان نے ایک بڑے یاقوت کی تعریف سن کر اپنا ایک سفیر سیلون بھیجا تھا اور منہ مانگی قیمت دینے کا حکم دیا تھا لیکن وہاں کا راجہ اس کو فروخت کرنے پر راضی نہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس یاقوت کی قیمت اب کروڑوں روپے ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جزیرۂ سیلون میں یاقوت متعدد مقامات سے نکالا جاتا ہے۔ وہاں کی عورتیں یاقوت کے ہار اپنے گلے میں ڈالے رہتی ہیں یہاں تک کہ ہاتھوں میں اس کی چوڑیاں اور پاؤں میں اس کے پازیب بھی پہنتی ہیں۔ سفید ہاتھی کے سر پر سات یاقوت مرغی کے انڈے سے بھی بڑے زیور کے طور پر ہیں۔ یہ ہاتھی وہاں کے راجہ کا خاص ہاتھی ہے۔ ابن بطوطہ

نے بابر کے یہاں ایک پیالی یاقوت کی دیکھی جو ہتھیلی کے برابر تھی اور اس میں عود رکھا جاتا تھا۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں ایک تولہ چار ماشہ گیارہ رتی یاقوت کی قیمت پچاس ہزار روپے قرار دی ہے جبکہ اس کے زمانے میں ایک روپیہ کا کئی من گیہوں فروخت ہوتا تھا۔

یاقوت کی انگشتری کا استعمال تقضائے حاجات، دفع ضررِ صاعقہ اور طاعون کے لیے مفید ہے۔ اس سے تشنگی بھی رفع ہو جاتی ہے اور دل کے واسطے تفریح و نشاط بھی۔ اس کے علاوہ یہ تقویتِ بصر، حفظِ صحت اور تحلیلِ انجمادِ خون کے لیے بھی نافع ہے۔ یہ بدبوئے دہن کو دور کرتا ہے:

(۴) زمرّد۔ زمرد کو ہندی میں پنّا کہتے ہیں۔ رتنوں میں اس کو نفیس اور بہترین قرار دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سونے کی کان میں پیدا ہوتا ہے اور اس کا اصل مادہ بھی سونا ہی ہے جو پکنے سے سبز ہو جاتا ہے اور اکیس سال میں زمرد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بعض لوگ زمرد اور زبرجد کو ایک ہی جنس سمجھتے ہیں کہ اختلافِ مادہ سے علیحدہ علیحدہ صورتیں اختیار کر لیتا ہے لیکن سختی میں برتر ہے۔ زبرجد نرم اور ملائم پتھر ہے۔ جبکہ زمرد سخت ترین ہے۔ پرانی کان کا زمرد سبز تر اور نئی کان کا سفیدی مائل سبز ہوتا ہے۔ اس کا رنگ جتنا زیادہ شفاف اور گہرا سبز ہوتا اتنا ہی قیمتی ہوتا ہے۔ وہ زمرد جو شفاف نہ ہو اور اس کی رنگت میں کمی کا جالا سا ہو وہ عیب دار اور منحوس سمجھا جاتا ہے۔ زمرد کو برسات میں پہنتے ہیں اس لیے اس کو برکھا رُت کا جوہر کہا جاتا ہے۔

زمرد کی اقسام بہ اعتبارِ رنگ مختلف ہیں۔ مثلاً:

ذبابی زمرّد۔ اس کا رنگ ذباب سبز (سبز مکھی) کی مانند ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ ذبابی زمرد پہننے والے شخص پر مکھی نہیں بیٹھتی ہے۔ اس لیے اس کو بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اس کے صاف و شفاف رنگ میں ایک چمک اور دمک معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس میں تھوڑی سی سرخی اور دھاں نظر آئے تو اسے "سعیدی زمرد" کہتے ہیں۔

ریحانی زمرّد۔ اس کو زمرد نوا بھی کہتے ہیں۔ اس کا رنگ برگِ ریحان کے مانند ہوتا ہے۔

سلقی زمرّد۔ چقندر کے پتوں کی مانند مائل بسیاہی رنگ کا۔

زنگاری زمرّد۔ زنگار یعنی طوطیائے سبز اور تانبے کے کساؤ کے رنگ کا۔

کرّاثی زمرّد۔ گندنا اور لہسن و پیاز کے پتوں کے رنگ کا۔

اشنی زمرّد۔ دھان کے پتوں سے مشابہ رنگ کا۔

فستقی زمرّد۔ سبزی مائل بسیاہی رنگ کا یہ زمرد کہنہ ہوتا ہے۔

مرگج۔ یہ زمرد کی مادین ہے۔ اس کا رنگ ہلکا سبز مائل بسفیدی ہوتا ہے۔ اس کو صابونی بھی کہتے ہیں۔ غیر شفاف اور کم رنگ ہونے کی وجہ سے یہ زمرد کی ادنیٰ قسم ہے۔

زمرد کی انگوٹھی کا استعمال رفعِ طاعون کے لیے موثر اور قروحِ خبیثہ کے لیے مفید ہے۔ اگر ایک مثقال (ساڑھے چار ماشہ) زمرد کو ایک ایک مثقال سونا و چاندی ملا کر انگوٹھی میں جب آفتاب طالع میزان کے برج ہوائی میں ہو نصب کیا جائے تو تسخیرِ قلب اور ہیبتِ نظر کے واسطے بے نظیر ہوگی۔ قضائے حوائج کے لیے بھی مجرب ہوگی۔ اس کے علاوہ بے شمار فوائد اور بھی اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ مثلاً مشہور ہے کہ اگر اس انگوٹھی کو پہننے والے کے سامنے زہر آلود طعام آتا ہے تو زمرد پسینے لگتا ہے۔ اس کو پہننے والے کو کبھی معیشت کی تنگی نہیں ہوتی ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ افعی اس کو دیکھ کر اندھا ہو جاتا ہے یا اس کی آنکھوں سے پانی جاری ہو جاتا ہے۔ صاحبِ مخزن نے لکھا ہے کہ انھوں نے افعی کی آنکھوں پر زمرد لگا کر دیکھا تھا لیکن نہ وہ اندھا ہوا اور نہ اس کی آنکھوں سے پانی جاری ہوا۔ زمرد کی انگوٹھی کے مسلسل استعمال سے آنکھوں کی روشنی بھی بڑھتی ہے۔

دواؤں میں زمرد کے استعمال سے جمعیت غریزی اور اعضائے رئیسہ کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مرگی، خفقان، جلندر، یرقان اور کوڑھ کو نافع ہے۔

(۵) موتی۔ موتی کو عربی میں لؤلؤ اور فارسی میں مروارید اور دُر کہا

جاتا ہے یہ معدنی پیداوار نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس کا شمار جواہرات میں ہوتا ہے۔ جواہرات اور موتی میں ایک فرق تو یہ ہے کہ جواہرات دوسرے معدنیات کی طرح کان سے نکالے جاتے ہیں اور موتی ایک سمندری جانور صدف کے جسم میں پرورش پاتا ہے۔ موتی دوسرے جواہرات کی بہ نسبت نرم ہوتے ہیں اور ان پر آسانی سے خراش ڈالی جاتی ہے۔

موتی کی پیدائش کے متعلق زمانۂ قدیم سے طرح طرح کی روایتیں مشہور ہیں، جیسے یہ سمندری جانور صدف کی بیماری کے دانے ہیں یا ابر نیسان کی پہلی بوند سے سیپ میں موتی بنتے ہیں کا فور سانپ میں زہر اور ہاتھی میں گج موتی پیدا ہوتا ہے لیکن یہ ساری روایتیں غلط ہیں۔ جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ موتی ایک خاص قسم کے صدف کے مادے سے تیار ہوتے ہیں۔ یہ مادہ صدف کی تہ میں جمع رہتا ہے جس کو صدفی تہ کہا جاتا ہے۔ جب کوئی خارجی ذرہ یا کیڑا مکوڑا اس صدف میں داخل ہوتا ہے تو صدف ساز خلیے اس ذرہ کو لعاب دار مادے سے گھیر لیتے ہیں اور اس ذرہ یا کیڑے پر مادے کی تہیں چڑھتی رہتی ہیں اور کچھ سال کے بعد موتی بن جاتا ہے۔ موتی کا رنگ بھی وہی ہوتا ہے جو اس صدفی مادہ کا ہوتا ہے۔

عام طور پر موتی تین قسم کے پائے جاتے ہیں۔ اول تو قدرتی موتی جو صدف میں خود بخود بنتے ہیں۔ دوم کلچرڈ موتی جو مصنوعی طور پر صدف کے اندر پالے جاتے ہیں۔ یہ کم وقت میں تیار ہو جاتے ہیں اور ان کی تہیں قدرتی موتیوں سے کم اور موٹی ہوتی ہیں۔ کلچرڈ موتی کی کاشت جاپان میں بہت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ شیشے کے نقلی موتی بھی ہوتے ہیں جو پالش کیے ہوئے بازار میں عام طور پر ملتے ہیں۔

موتی بڑے سے بڑا کبوتر کے انڈے کے برابر اور چھوٹے سے چھوٹا خشخاش کے دانے کے برابر ہوتا ہے۔ بڑے موتی کی قیمت اس کے سائز کے اعتبار سے بڑھتی جاتی ہے اور چھوٹے موتی عام طور پر وزن کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں اور دواؤں کے کام آتے ہیں۔ بڑے موتی زیورات کے کام میں آتے ہیں اور

[illegible] کبوتر کے انڈے کے برابر موتی [illegible] موتی بہت کم گول ہوتے ہیں۔ زیادہ تر [illegible] اور غیر معین شکل کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح [illegible] بھی مختلف ہوتا ہے۔ رنگ اور شکل کے اعتبار سے موتی مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں مثلاً

دُرِ غلطاں۔ بالکل گول موتی جو ہتھیلی پر ایک جگہ قائم نہیں بلکہ غلطاں رہتا ہے۔ اس کو قیمتی خیال کیا جاتا ہے۔

دُرِ شہوار۔ بڑا اور خوش آب موتی جو بادشاہوں کے خزانے میں ہی ملتا ہے۔

دُرِ یتیم۔ وہ موتی جو سیپ میں ایک ہی ہو۔ یہ بڑا اور قیمتی ہوتا ہے۔ اس کو دُرِ یکتا بھی کہتے ہیں۔

شلغمی موتی۔ ایک طرف چپٹا اور ایک طرف سے گول [illegible] طرف سے ٹھیک دار ہو۔

عدسی موتی۔ مسور کے چھلکے کے رنگ کا موتی۔ اس کو ہندی میں کاکا پاسی کہتے ہیں

نجم۔ بالکل سفید بغیر کسی رنگ کا موتی۔

یتمی موتی۔ زردی مائل سفید موتی۔ دو طرف کنارے سے قدرے دبا ہوا۔

رصاصی۔ قوس قزح کے مانند ہفت رنگی جھلک کا موتی۔

رمانی۔ سرخ رنگ کا موتی۔

شمعی۔ دھانی رنگ کی جھلک کا موتی۔

شیر فام۔ دودھ کی رنگت کا سفید موتی۔

عباسی۔ [illegible] رنگ کا موتی۔

موتی کی پیداوار کے لیے [illegible] مقامات ہیں [illegible] ہندوستان میں بھی پیدا ہوتا ہے [illegible] کا موتی اچھا سمجھا جاتا ہے۔

[illegible]

کو دور کرنے میں مفید ہے۔ بواسیر کو نافع ہے۔ اس کا سرمہ اور محلول آشوب چشم میں فائدہ دیتا ہے۔ اسی طرح اس کا سنون بھی مقوی دندان ہے۔ فساد خون کی بیماریوں میں مفید ہے اس کو حل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خوب باریک پیسنے کے بعد ایک شیشی میں بھر کر اس میں آب ترنج بھر دیا جائے۔ اس شیشی کو گلِ حکمت کر کے ایسے برتن میں معلق لٹکا دیا جائے جس میں سرکہ بھرا ہو۔ پھر اس برتن کو گھوڑے کی لید میں دفن کر دیا جائے۔ چودہ روز میں مروارید محلول ہو جائے گا بعض لوگ غیر شفاف اور کم رنگ موتی کو صاف کر کے اس کی قیمت بڑھا لیتے ہیں۔ اس کو صاف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کبوتر یا مرغ کو کھلا دیا جائے۔ اس کے معدہ کی گرمی سے موتی صاف ہو جاتا ہے۔ اول تو وہ پرندہ اپنی بیٹ میں ہی صاف شدہ موتی خارج کرے گا ورنہ پھر اس کو ذبح کر کے پوٹے یا سنگ دانہ سے نکال لیا جائے موتی یا دُر کو اردو شاعری میں خصوصی جگہ ملی ہے:

آبرو اپنے غلاموں کی بڑھانے کے لیے | آج دریائے کرم کا دُرِ غلطاں آیا
پتا ہے کہ آبرو کوئی موتی کی آب ہے | تم نے جو دُر لیے کہا میری عزت بگڑ گئی

(جلال لکھنوی)

(۹) **فیروزہ**۔ یہ مشہور پتھر فیروزی، آسمانی، نیلا اور سبز ہوتا ہے۔ اس کا معدن نیشاپور، خجند، کرمان، شیراز، آذربائیجان اور تبت میں ہے۔ سب سے بہترین اور خوش رنگ فیروزہ نیشاپور کا ہوتا ہے۔ اس کا رنگ صاف اور متوازی ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ ہوا کی صفائی کے ساتھ فیروزہ صاف ہوتا ہے اور ہوا کی کدورت اس کو بھی مکدر کر دیتی ہے۔ مشک کی خوشبو، پسینہ اور چربی سے یہ بدرنگ ہو جاتا ہے۔ اس کو مردہ تصور کرتے ہیں۔ ارسطو کے نزدیک جو رتن بھی مردہ ہو جائے اور اپنا رنگ خراب کرے اس کو نہ پہننا چاہیے۔ اس قسم کے فیروزہ کو ابو اسحاق کہتے ہیں۔ یہ آٹھ قسموں کا ہوتا ہے۔ ازہری، سلیمانی، درنوئی، آسماں گونی یا خاکی، عبدالحمیدی، اندلسی اور گنجینہ۔ آخری قسم سب سے کم قیمت اور ادنیٰ ہے۔ سنہری جھلک والے فیروزہ کو سنیلا اور آسماں گونی فیروزہ کو کنٹیلا کہتے ہیں۔

فیروزہ کا مادۂ تکوین میں کثیر گندھک اور قلیل سیماب ہے اس کا انعقاد نظر زحل سے برودت پاکر سات سال میں ہوتا ہے۔

کرمان اور شیراز کا فیروزہ قدرے سفیدی مائل ہوتا ہے۔ اس کو شیر بوم کہتے ہیں۔ نیشاپوری فیروزہ میں نیلاہٹ زیادہ ہوتی ہے اسے نیل بوم کہتے ہیں۔ یہ حرارت عزیزی، روح باصرہ اور دل ودماغ کے لیے مقوی ہے۔ اس کا استعمال (پہننا) دشمن پر فتح مندی کا سبب ہوتا ہے۔

(۷) **زبرجد**۔ یہ پتھر بھی زمرد کی مانند سونے کی کانوں سے برآمد ہوتا ہے۔ اس کے بھی مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ صاف اور کم رنگ کو معدنی، زردی مائل بہ سبزی کو قبرصی اور زردی مائل بہ سرخی کو ہندی زبرجد کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قمر جب منزل حوت میں ہو تو اس پر صورت طین مرکبی کندہ کر کے انگشتری میں نصب کرنا چاہیے۔ یہ انگشتری باعث تسہیل ولادت اور فرحت قلب وارد ہوتی ہے۔ جب طالع سرطان میں ہو تو اس پر مچھلی کی صورت کندہ کر کے جال میں لگا لیا جائے۔ رانگے میں لپیٹ کر تو مچھلیاں بہ آسانی جال میں آجاتی ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ زبرجد کے پیالے میں شراب پینے سے نشہ نہیں ہوتا ہے۔

ان کا رنگ سبزۂ رخسار گر ہو گیا | جو زبرجد تھا زمرد کا نمونا ہو گیا

(داغ)

(۸) **لاجورد**۔ یہ مخصوص اور مشہور پتھر ہے جو عموماً کاشغر سے درآمد ہوتا ہے۔ اس کا اصلی رنگ نیلا براق نقطہائے طلاء کے ساتھ ہے۔ یہی بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد کبود بہ سرخی بنفشی اور سبزی مائل بھی ہوتا ہے۔

لاجورد کے داخلی و خارجی استعمال سے درد گردہ، وحشت، دغم اور امراض سوداویہ کو فائدہ ہوتا ہے۔ دل و دماغ کو فرحت دیتا ہے۔ آشوب چشم اور جالے و ماڑے کو مفید ہے۔ اس کی بنی ہوئی سلائی پھیرنا آنکھوں کے امراض کے لیے بالخاصہ مفید ہے۔

ــــــــــــــــــــ

[۱] قدیم ہندوستان میں کالا تھیلا قیمتی تصور ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ دور ہو جا، نکل جا

اس کا رنگ بھی تیار کیا جاتا ہے جو فیروزی ہوتا ہے۔ آتش کہتے ہیں رفتہ رفتہ کرتے مصور اس کو تصویر خضر سیاہ ہوتا جو تیرے خط سا کچھ لاجوردیا

(۹) یشب۔ یہ پتھر مختلف الالوان اور سخت ترین ہے۔ اس کا سب سے بہتر رنگ زیتونی سمجھا جاتا ہے۔ پھر سبز مائل بہ زردی اور اس کے بعد سبز مائل بہ سفیدی۔ آخر والے کو کافوری بھی کہتے ہیں۔ یشب کی قیمت اس کے خوش رنگ ہونے، صفائی، صیقلی اور شفاف ہونے پر منحصر ہے۔ کہتے ہیں کہ قمر جب برج آتشی میں ہو تو اس پر صورت انسانی کندہ کرکے انگوٹھی میں نصب کرنا چاہیے۔ یہ انگوٹھی آلام باطنی، وسواس، خفقان اور امراض دماغی کے لیے نافع ہوتی ہے۔ اس کا داخلی استعمال دل اور معدہ کو قوت دیتا ہے۔ بستہ خون کو تحلیل کرتا ہے اور مرگی میں مفید ہے۔

مرجان۔ مرجان کو ہندی میں مونگا کہتے ہیں۔ یہ ایک سمندری درخت ہے مگر اس کا شمار بھی جواہرات میں ہوتا ہے۔ مونگے کا درخت شاخ دار بے برگ و ثمر ہوتا ہے جس کو ایک سمندری جانور اپنے لعاب دہن سے بناتا ہے یا ان جانوروں کا گھر ہے۔ یہ جانور مونگے کے پہاڑ، دیواریں اور جزیرے تک بنا ڈالتے ہیں۔ اس کی جڑ کو بُسد کہتے ہیں۔

مونگے کے مختلف رنگ ہوتے ہیں یعنی سُرخ، سفید اور سیاہ۔ بہترین مونگا بڑا سرخ، بے جرم اور بے سوراخ کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد سفید کا درجہ ہے۔ سیاہ سب سے ادنیٰ سمجھا جاتا ہے۔

اس کا استعمال فالج، لقوہ اور رعشہ کے لیے مفید ہے۔ معدہ، جگر و طحال کو طاقت دیتا ہے۔ بچوں کے گلے میں ڈالنے سے نیند میں چونکنے، دانت نکالنے اور ڈر کر رونے کے لیے نافع ہے۔

(۱۱) **عقیق۔** سرخ رنگ کا ایک پتھر ہے جس کی اکثر مہریں کھودتے ہیں اور انگوٹھیوں میں لگاتے ہیں۔ دوسرے جواہرات کی مانند آگ کا اثر بھی اس پر کم ہوتا ہے۔ سب سے بہتر عقیق یمن کا سمجھا جاتا ہے جو سختی میں بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ سرخ، زرد، سفید و سیاہ۔ ان میں سے ہر ایک جہت رنگ، کم رنگ، صاف و شفاف، مکدر و غیر شفاف ہوتا ہے۔ معدن سے نکلتے وقت کم رنگ ہوتا ہے لیکن اس کو طبخ دے کر رنگین کیا جاتا ہے اور اس کے بعد تراشا جاتا ہے۔ بعض نگوں پر شاخ و درخت کی شکل بنی ہوتی ہے۔ اس کو عقیق شجری کہتے ہیں۔ اکثر عقیق سیاہ کی بالائی سطح کے خطوط سفید ہوتے ہیں۔ ایسے عقیق کو سنگ سلیمانی اور بابا غوری کہتے ہیں۔ اس کی تسبیح بنائی جاتی ہے۔

احادیث میں عقیق کی فضیلت و بے شمار خواص و فوائد مذکور ہیں۔ اس کو پہننے سے غضب و غصہ کی حدت و تیزی کم ہوتی ہے۔ خفقان اور وسواس کو تسکین ہوتی ہے۔ تسخیر قلوب اور استجابت دعوات کے لیے مفید ہے۔ کہتے ہیں کہ عقیق کو مشک و کافور اور روغن زیتون میں بسا کر انگوٹھی میں نصب کیا جائے اور بادشاہ و حکام کے سامنے جاتے وقت اس کو اپنے ہاتھوں اور منہ پر ملا جائے تو قدر و منزلت حاصل ہوتی ہے اور اس کی انگوٹھی کو پہننے والا محبوب خلائق ہوتا ہے۔ اردو شعرا کے یہاں اس کا ذکر بھی اکثر ملتا ہے:

آویزہ تیرے گوش کا ہو اس امید پر کیا کیا عقیق کان یمن سے نکل گیا

(آتش)

سارا جہان نام کے پیچھے تباہ ہے انسان کیا، عقیق یمن سے نکل گیا

(امیر مینائی)

(۱۲) **دہنہ فرنگ۔** دہنہ فرنگ مشہور پتھر ہے جو تانبے اور چاندی کی کان سے برآمد ہوتا ہے۔ یہ مختلف الالوان ہوتا ہے۔ سب سے بہتر رنگ سبز تیرہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد تاؤسی مائل بہ سرخی، پھر زرد رنگ کہ سب سے ادنیٰ ہوتا ہے۔ فولاد پر گھسنے سے یہ سونے، چاندی اور تانبے کا کس دیتا ہے۔ سونے کے کس والا سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے اور اس کے بعد چاندی کے کس کا۔ دہنہ فرنگ جس کس کا ہو اس کو اسی دھات کی انگوٹھی میں پہنا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہ درد گردہ کو جذب کر لیتا ہے یا درد کی شدت سے خود ہی پھٹ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ حافظ روح اور پاک کنندۂ سموم ہے۔ اس کا سرمہ بینائی کو قوت دیتا ہے۔

اردو اکاڈمی کی ایک سال کی سرگرمیوں پر ایک سرسری نظر

اور آئندہ کا پروگرام

اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ کی پہلی میٹنگ ۳۰ جنوری [illegible] کو منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک ایک سال کے عرصے میں اردو اکاڈمی کی کونسل کی ایک میٹنگ (۱۵ جولائی [illegible]) اور مجلس انتظامیہ کی سات میٹنگیں ہو چکی ہیں۔

مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے مطابق اس وقت حسب ذیل دس سب کمیٹیاں اکاڈمی کے مختلف شعبوں کی دیکھ بھال کر رہی ہیں (متعلق مسائل پر پہلے سب کمیٹی غور کرتی ہے اور اس کی سفارش کو مجلس انتظامیہ کے سامنے تحریری صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے بعد کارروائی کی جاتی ہے۔)

(۱) تعلیمی سب کمیٹی (۲) انعامی سب کمیٹی (۳) مسودات سب کمیٹی (۴) لائبریری سب کمیٹی (۵) امداد مصنفین سب کمیٹی (۶) اشاعت کتب سب کمیٹی (۷) رابطۂ عوام سب کمیٹی (۸) تقریبات سب کمیٹی (۹) اکاؤنٹس سب کمیٹی اور (۱۰) تقررات سب کمیٹی۔ ان سب کمیٹیوں کی متعدد نشستیں ہو چکی ہیں۔

اردو اکاڈمی کا بجٹ جو حکومت نے منظور کیا ہے ۵,۱۰,۰۰۰/- روپیہ ہے۔ اس میں سے ۱۰,۰۰۰/- روپے کتب خانوں اور دارالمطالعوں کے لیے اردو کتابیں، رسائل اور اخبارات خریدنے کے واسطے مخصوص کر دیا ہے اور ۵۰,۰۰۰/- روپیہ کتابوں پر انعامات دینے کے لیے دیا گیا ہے۔ لاکھ اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام کتابوں کی اشاعت، اردو کے معذور، اور مالی حیثیت سے پریشان ادیبوں اور شاعروں کو مالی امداد دینے، اردو ریسرچ کے لیے اردو اسکالرس کو مالی امداد دینے، اردو مسودات کی کتابت کے جزوی مالی امداد دینے، اردو کے سلسلے میں سیمینار منعقد کرانے اور جماعت کا کلچر کرانے اور دفتر کے اخراجات کے لیے رکھا گیا ہے۔

اردو اکاڈمی کے پہلے سال یعنی [illegible] میں ۵ لاکھ ۵ ہزار روپے کی رقم دی گئی تھی۔ یہ رقم ٹرزیری سے نکال کر فروری [illegible] کے اخیر میں ایک بینک میں جمع کر دی گئی۔ اس رقم میں ۳۱ مارچ [illegible] تک تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ صرف ہو سکا تھا۔ حکومت نے [illegible] کے بجٹ میں ۵ لاکھ دس ہزار روپیہ اردو اکاڈمی کے لیے منظور کر دیا اور اس طرح مالی سال رواں کے شروع میں اردو اکاڈمی کے پاس تقریباً دس لاکھ انیس ہزار روپیہ موجود تھا۔

اردو اکاڈمی نے اس وقت تک ۱۴۷ کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو اردو کتابوں، رسالوں اور اخبارات خریدنے کے لیے ایک لاکھ پانچ ہزار روپیہ منظور کیا ہے۔ کتب خانوں سے اکاڈمی کے تیار کیے ہوئے فارم پر مالی امداد کے لیے دوبارہ درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔ درخواستیں موصول ہو جانے پر سب کا ایک چارٹ تیار کیا جائے گا اور پہلے لائبریری سب کمیٹی ان پر غور کرے گی پھر مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے بعد مارچ کے اندر اندر ایک لاکھ دس ہزار روپے اور انھیں تقسیم کر دیے جائیں گے۔ جن کتب خانوں کو مالی امداد ملتی ہے ان کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ دوسری درخواستیں اس وقت بھیجیں جب اس کے ہمراہ مجاز آفیسروں کے دستخط سے یوٹیلائزیشن سرٹیفکیٹ بھی منسلک ہو۔

انعامی سب کمیٹی اس وقت تک ۸۳ اردو مصنفین کو جو ملک کے مختلف شعبوں میں پھیلے ہوئے ہیں تقریباً ۸۶ ہزار روپے ان کی شائع شدہ کتابوں پر تقسیم کر چکی ہے۔ یکم دسمبر [illegible] سے ۳۱ دسمبر [illegible] تک کی مدت میں شائع شدہ اردو کتابیں ۲۲ جنوری [illegible] تک طلب کی گئی تھیں اور تقریباً ۱۵۰ کتابوں کی آٹھ آٹھ جلدیں اکاڈمی کے دفتر کو موصول ہو چکی ہیں۔

ہر کتاب کی ایک جلد حسب قاعدہ انعامی سب کمیٹی کے ممبران کو بھیج دی جائے گی اور مارچ کے شروع میں انعامی سب کمیٹی کی میٹنگ بلائی جائے گی تاکہ اراکین ان کے بارے میں رائے دے سکیں۔ سب کمیٹی کی سفارشوں کو مجلس انتظامیہ کے سامنے جو مارچ کے وسط تک بلائی جائے گی پیش کیا جائے گا۔ اور پوری امید ہے کہ ایک لاکھ روپیہ جو ۸۳-۱۹۸۲ء کے بجٹ میں مخصوص کیا گیا تھا مارچ کے اندر ہی خرچ ہو جائے گا۔ اس طرح شائع شدہ معیاری اردو کتابوں پر ان کے مصنفین کو تقریباً دو لاکھ روپیہ تقسیم کر دیا جائے گا۔

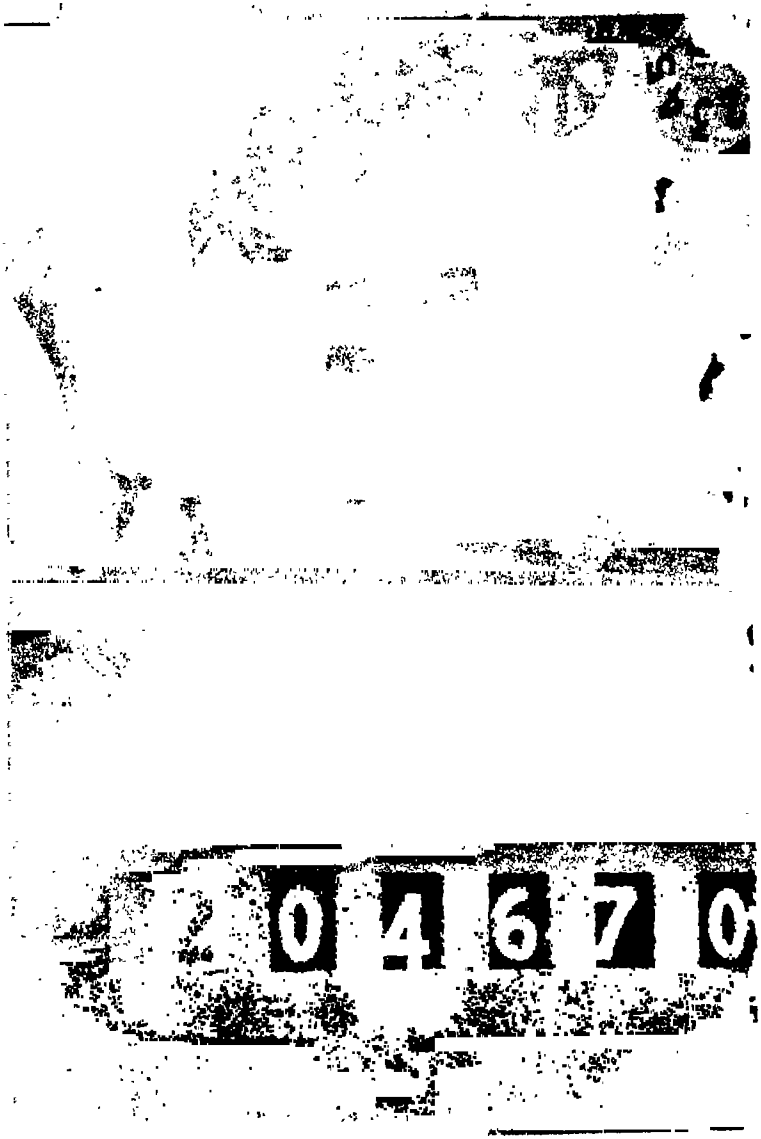
اکاڈمی معیاری اور مفید مسودوں کی طباعت میں اخراجات کے پچاس فی صدی تک مالی امداد دیتی ہے۔ اس وقت تک تقریباً ایک سو بیس مسودے اکاڈمی کو موصول ہوئے اور ۲۳ مصنفین کو ۲۰ ہزار سات سو پچاس روپیہ ان کے مسودوں کی طباعت میں مالی امداد کے طور پر دیا گیا۔ مسودات کی طباعت کے سلسلے میں اکاڈمی کے اپنے کچھ قواعد و ضوابط بھی وضع کیے گئے ہیں۔

معمر، معذور اور مالی حیثیت سے پریشان اردو مصنفوں اور شاعروں کو مالی امداد دینے کے لیے بھی قواعد و ضوابط تیار کیے گئے ہیں اور ان کے مطابق اس وقت تک ۱۴ ادیبوں اور شاعروں کو کل ملا کر سات ہزار آٹھ سو پچاس روپیہ منظور کیا گیا۔ اردو کے ایک مشہور ادیب جناب حامد اللہ افسر میرٹھی کو جو بہت بیمار اور مالی حیثیت سے پریشان ہیں یکم دسمبر ۱۹۸۲ء سے سو روپیہ ماہانہ مالی امداد منظور کی گئی ہے اور ایک دوسرے ادیب و شاعر جناب نشور واحدی کو جو ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور انھیں کوئی پنشن بھی نہیں ملتی اس مہینے سے سو روپیہ ماہانہ دینے کی سفارش کی گئی ہے۔

اکاڈمی کے اغراض و مقاصد میں ایک نہایت اہم مقصد اکاڈمی کے زیر اہتمام مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرانا، دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرا کر کتابیں شائع کرانا، بچوں سے متعلق کتابیں شائع اور نایاب اہم کتابوں کو دوبارہ شائع کرانا شامل ہے۔ اکاڈمی نے اب اس پروگرام پر بھی عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔ اشاعت کتب سب کمیٹی نے اکاڈمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتابوں کے سلسلے میں قواعد و ضوابط وضع کر لیے ہیں۔ ان قواعد و ضوابط کے مطابق جن مصنفین کی کتابیں اردو اکاڈمی شائع کرے گی انھیں کتابوں کی قیمت فروخت پر بیس فی صدی رائلٹی دی جائے گی جس میں حق طبع بھی شامل ہے۔ اکاڈمی نے فی الحال اپنے اہتمام میں تین کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی کتاب جناب مالک رام کے مضامین کا مجموعہ "ہماسا زیانداز" ہے۔ دوسری کتاب جناب علی جواد زیدی کی "تصنیف نگاران اتر پردیش" اور تیسری کتاب ڈاکٹر محمد حسن کی "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ" ہے۔ اکاڈمی اردو کی تعلیم سے متعلق تمام سرکاری احکام یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرانے کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔ ان سرکاری احکام کا اردو ترجمہ ہو گیا ہے۔ اگلے سال سے اکاڈمی کے اس پروگرام پر زیادہ سرگرمی سے عمل درآمد ہوگا۔ کتابوں کے موضوعات طے کیے جائیں گے اور مصنفین سے نئی کتابیں لکھوائی جائیں گی وغیرہ۔

اردو اکاڈمی کی ایک نہایت اہم تعلیمی سب کمیٹی ہے جو اردو تعلیم کے سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہی ہے اور اس پر عمل اپنا فیصلہ کرتی ہے۔ اکاڈمی اس وقت تک اردو تعلیم سے متعلق ۵۰-۶۰ تجویزیں منظور کر چکی ہے ان کا تعلق پرائمری سطح سے لے کر ہائی اسکول کی سطح تک ہے۔ یہ تمام تجویزیں حکومت کے پاس بھیج دی گئی ہیں۔ اردو تعلیم اور اردو سے متعلق دوسرے امور کے سلسلے میں ایک میمورنڈم تیار کرایا گیا ہے، جس میں اردو تعلیم کے سلسلے میں اور اردو کے سلسلے میں عام طور سے پیش آنے والی تمام دقتوں کو بیان کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ یہ دقتیں کیسے دور ہو سکتی ہیں۔

تقریبات سب کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ اردو کو فروغ دینے کے سلسلے میں سمینار، لکچر اور دوسری تقریبات کا انتظام کیا جائے۔ یہ سب کمیٹی حال ہی میں تشکیل ہوئی ہے اور اساتذہ اردو جامعات ہند کی چوتھی کانفرنس کے موقع پر پہلی تقریب اکاڈمی کی طرف سے کی گئی اور ایک مذاکرہ کا بھی اہتمام کیا گیا۔ سب کمیٹی نے اردو کے تعلیمی مسائل آزادی کے بعد، اردو مسائل اور اردو کی موجودہ صورت حال پر سمینار کرنے کے علاوہ ایک شب افسانہ منانے کا بھی پروگرام بنایا ہے جس میں یہ تجویز کی گئی ہے کہ سارے ہندستان سے اردو کے تمام مشہور افسانہ نگار مدعو کیے جائیں اور ان نشستوں میں ان سے غیر مطبوعہ اور تازہ ترین افسانے سنانے کی استدعا کی جائے۔ اس موقع پر اردو افسانہ نگاری پر دو ایک مقالے پڑھوانا بھی پروگرام میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ایک شام غزل



لکھنؤ میں ریاستی اتر پردیش لاٹری کی ۱۸ویں قرعہ اندازی۔ تصویر میں دائی اور زیڈ سیریز ٹکٹ کے نمبران دکھائی دے رہے
ہیں جنھیں اوّل انعام ملے



یوم جمہوریہ کی پریڈ کے موقع پر نئی دہلی میں ملک بھر کے ۳۲ ٹیبلوؤں نے ثقافتی جلوس میں حصہ لیا۔ ان ٹیبلوؤں کے ذریعے
ہندستان کی جدوجہد آزادی کو پیش کیا گیا تھا۔ تصویر میں مختلف ریاستوں کے ٹیبلوؤں کا جلوس راج پتھ سے گزر رہا ہے